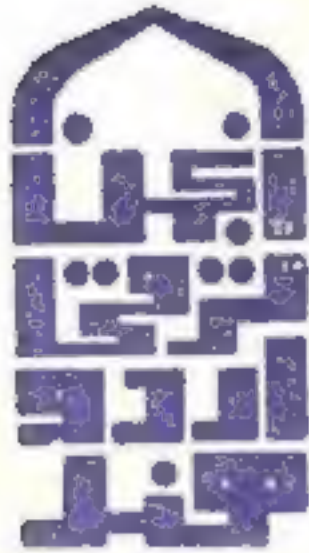


سہ ماہی

اُردو ادب



# اردو ادب

# اردو ادب

(غالب نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

سالانہ قیمت \_\_\_\_\_ پینتالیس روپے  
فی شمارہ \_\_\_\_\_ پندرہ روپے  
موجودہ شمارہ \_\_\_\_\_ پچیس روپے

پرنٹر پبلشر ایم۔ حبیب خاں نے شرافٹ پرنٹرس دہلی میں چھپوا کر انجمن ترقی اردو (ہند)  
اردو گھر راؤز ایونیو، نئی دہلی سے شائع کیا۔



# ترتیب

	حرفِ آغاز	خلیقِ انجم
۹	غالب کی فارسی غزل	سید حامد
۱۰۶	غالب کے فارسی قصائد کا مطالعہ لسانی نقطہ نظر سے	پروفیسر تذیر احمد
۱۲۶	کلامِ غالب بہ خطِ غالب	
۱۲۹	غالب کے کچھ شعروں کا متن	کمال احمد صدیقی
۱۸۳	خطوطِ غالب میں طنز و مزاح	خلیقِ انجم

# حرف آغاز

زیر نظر مجموعے میں غالب پر چار مقالے شامل ہیں۔ پہلا مقالہ میرے محترم سید حامد صاحب کا ہے، عنوان ہے ”غالب کی فارسی غزل“ حامد صاحب نے غالب کی فارسی غزل کے اہم پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ اُنھوں نے غالب کے کچھ اشعار منتخب کر کے اُن کی شرح اس انداز سے کی ہے کہ تنقید کا حق بھی ادا ہو گیا ہے۔ حامد صاحب نے مقالے کے شروع میں لکھا ہے کہ ”غالب نے فارسی پر غیر معمولی عبور حاصل کر لیا لیکن وہ غالب کی زبان نہیں تھی اس لیے اُن کی فارسی غزل میں اُردو غزل کی سی بے لکھنی، برہستگی، اور شکستگی نہیں آتی۔“

حامد صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے ”یہ ٹھیک ہے کہ غالب نے بارہا اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر فخر کیا ہے لیکن ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جہاں غالب نے واضح الفاظ میں اپنی فارسی شاعری کو اُردو شاعری سے بہتر بتایا ہے، اس میں معاصرانہ چشمک کو دخل ہے۔“ جب کبھی فارسی اور اُردو شاعری کا ذکر آتا ہے تو غالب کا یہ شعر نقل کیا جاتا ہے۔

فارسی میں تابہ بینی نقشہای رنگ رنگ      بگزار از مجموعہ اُردو کہ بیزنگہ نیست  
یہ شعر غالب کے انیسویں اشعار پر مشتمل ایک قطعہ کا ہے۔ اس قطعہ کا مطلع ہے :-  
اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتم      کے بہر گوئی فلاں در شعر ہم سنگہ نیست

اس قطعے کے تمام اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مخاطب کوئی ایسا شاعر ہے جو اُردو میں شعر کہتا ہے اور جسے بادشاہ سے قربت حاصل ہے۔ بظاہر ایسے شاعر ذوق ہی تھے۔ میں نے اپنی کتاب ”غالب اور شاہان تیموریہ“ میں ذوق اور غالب کا ادبی معرکہ بیان کرتے ہوئے



اس سے بحث کی ہے۔ حامد صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ غالب اپنی فارسی شاعری کے بارے میں جو رائے دیتے تھے اس میں غالب اور ذوق کی معاصرانہ چشمک کو دخل ہوتا تھا۔ انھوں نے اس اُنیل اشعار کے قطعے کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ

”غالب نے اپنی اردو شاعری کو بے رنگ ٹھہرایا ہے۔ دراصل بات کا محل ذوق سے چشمک تھی۔ غالب کا دل اس فضیلت سے دکھا ہوا تھا جو استاد شہ کو دربار شاہی میں دی جاتی تھی۔ اپنی حق تلفی پر برہم ہو کر انھوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شعر گوئی میں جو کچھ تمہارے لیے سرمایہ افتخار ہے میرے لئے باعث عار ہے۔“

غالب نے اپنی اردو شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اُسے غالب کی معاصرانہ چشمکوں اور قلعہ معالیٰ میں ذوق کو حاصل ہوئی عزت اور اہمیت کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اگر ہم کہیں کہ غالب اپنی اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں واقعی بے رنگ اور حقیر سمجھتے تھے۔ تو یہ غالب کی سخن فہمی شاعرانہ صلاحیت اور اُن کی عقل کو گالی دینا ہے۔ وہ اپنی اردو شاعری کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ انھوں نے اپنی اردو شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ

ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج میں عنذ لبِ گلشن نا آفریدہ ہوں  
غالب کا ایک شعر اور سنیے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کیوں  
جو شاعر اپنے کلام کو بے رنگ سمجھتا ہو کیا وہ یہ شعر کہہ سکتا ہے۔ غالب اپنے ایک دوست منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں۔

”ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر مجھ سے

ریختہ طلب کرتے ہیں، سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں، نئی غزل کہہ کر

بے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے۔ کل یا پرسوں جا کر پڑھو گا۔

تم کو بھی لکھتا ہوں داد دیتا کہ اگر ریختہ پیارے سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی

صورت ہوگی یا کچھ اور شکل۔“



کہتے تو ہوتے سب کہ بہت غالبیہ مو آئے  
 اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ و آئے

اس بحث کا مقصد صرف یہ ہے کہ غالب اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اپنی شاعری کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔  
 غالب کی فارسی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن حامد صاحب کا یہ مقالہ بالکل نئے انداز سے  
 لکھا گیا ہے۔ یہ اُن اساتذہ طلبہ اور اہل ذوق کے لئے بہت مفید ہے جو تھوڑی بہت فارسی تو سمجھ  
 لیتے ہیں۔ لیکن غالب کے شعر کا پورا مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھ پاتے۔

پروفیسر نذیر احمد فارسی اور اُردو کے عالم، محقق اور متنی نقاد ہیں۔ اُنھوں نے ان دونوں  
 زبانوں میں بہت کام کیا ہے۔ اور ان کی ہر کتاب اور اُن کا ہر مقالہ اُردو اور فارسی تحقیق میں ایک  
 اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات پورے ذوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اب ہندوستان تو  
 کیا ایران میں بھی نذیر صاحب کے پائے کا فارسی عالم نظر نہیں آتا۔ نذیر صاحب کا ایک میدان  
 فرہنگ نویسی بھی ہے۔ اُنھوں نے بہت سے مقالوں میں، خاص طور سے غالب کی نظر کے بارے  
 میں جو مقالے لکھے ہیں اُن میں، الفاظ سے حیرت انگیز بحث کی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں اُنھوں نے  
 غالب کے فارسی قصائد کا مطالعہ کیا ہے۔ غالب جدت پسند تھے۔ اُنھوں نے اگر ایک طرف  
 فارسی شاعری کو بے شمار نئے مضامین سے مالا مال کیا تو دوسری طرف بقول پروفیسر نذیر احمد

”سیکڑوں نئی ترکیب ایجاد کر کے اسلوبِ بیان کو ایسا حسین بنا دیا  
 ہے کہ قاری مہوت ہو جاتا ہے۔ ان ترکیب سے زبان کا دامن وسیع ہو گیا  
 ہے۔ اور وہ اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ زیادہ فرصت چاہتا ہے۔“

پروفیسر نذیر احمد نے غالب کی تراشی ہوئی بہت سی ترکیبوں سے بحث کی ہے۔ یہ مقالہ غالب کی  
 فارسی شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

تیسرا مقالہ کمال احمد صدیقی کا ہے جو اُنھوں نے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے مضامین  
 کے مجموعے ”غالب پر چند تحریریں“ کے متعلق لکھا ہے۔ کمال صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں  
 اور انہیں اُردو میں شاعر ہی کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اُنھوں  
 نے اُردو تحقیق اور تنقید میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں میرے خیال میں اُن کا مرتبہ اُن کی



شاعری سے زیادہ بلند ہے۔ اُن کی غالباً پہلی تشری تصنیف ”بیاض غالب“ ہے جس میں اُنہوں نے نسخہء امروہہ کے بارے میں اپنے اعلیٰ درجے کی تحقیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔

یادگار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے غالب کے جو اشعار درج کیے ہیں اُن میں اکثر اشعار کا متن دیوان غالب کے مروجہ نسخوں سے خاصاً مختلف نظر آتا ہے۔ سعادت صاحب کا خیال ہے کہ:-

”۱۔ محمد حسین آزاد کی طرح حالی نے بھی اپنے استاد کے کلام میں تحریف کی۔ ۲۔ غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر حالی سے کلام غالب میں تحریفیں ہوئیں۔ یادداشت نے دھوکا دیا ہو اور کچھ شعر حالی نے الفاظ میں تصرفات کر کے اپنے مذاق سلیم کے مطابق لکھے ہوں گے۔“ کمال صاحب نے سعادت صاحب کے ان خیالات سے اختلاف کیا ہے اور بہت مدلل انداز میں اپنی بات کہی ہے۔ بڑی بات یہ کہ اُن کے لب و لہجہ میں تلخی نہیں۔ ایک عالمانہ خاکساری ہے۔ میں نے جب سعادت صاحب نے مسودہ پڑھا تھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ سعادت صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے۔ میں نے اس کتاب کا جو پیش لفظ لکھا تھا اُس میں کہا تھا کہ:-

”سعادت علی صدیقی صاحب نے ایسے (۴۷) سینتالیس اشعار کی نشاندہی کی ہے جو یادگار غالب میں شامل نہیں اور جن میں حالی نے تصرف کیا ہے۔ کمال صاحب کا مضمون پڑھ کر رائے میں تبدیلی کرنی پڑی۔“

مجھے خوشی ہے کہ اس مجموعے میں پروفیسر نذیر احمد جیسے محقق، ماہر لسانیات، سید حامد صاحب جیسے فارسی کے ماہر اور روشن فکر ادیب اور کمال احمد صدیقی جیسے تخلیق کار نقاد کے مضامین شامل ہیں۔

خلیق انجم

## غالب کی فارسی غزل

غالب نے اپنی فارسی غزل پر بہت ناز کیا ہے۔ اسے اپنی اردو غزل سے بہتر بتایا ہے۔ نقشبائے رنگ رنگ اپنی فارسی شاعری سے منسوب کیے ہیں۔ جس کے مقابلہ میں اردو شاعری کو بے رنگ ٹھہرایا ہے۔ اب قارئین کیا کریں؟ کیا غالب نے اپنی فارسی شاعری کی تعظیم اور اردو شاعری کی تنقیف میں جو کچھ کہا ہے اسے تسلیم کر لیں یا بات کے محل اور انداز بیان کی رعایت کریں، یا شاعر کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ اپنے طور پر کریں؟ وہ شاعر کی شاعری کے بارے میں خود اس کی رائے کو ماننے کے لیے مجبور تو نہیں۔ شاعر کی رائے کو کسی ناقد کی رائے سے زیادہ وزن تو کسی حال میں دینا مناسب نہ ہوگا۔ یہاں بات کا محل اور انداز بیان دونوں قارئین کو اشارہ کر رہے ہیں کہ ”احتیاط“ بہر حال احتیاط۔ بات کا محل ذوق سے چشمک تھی۔ غالب کا دل اس فضیلت سے دکھا ہوا تھا جو استاد شہ کو دربار شاہی میں دی جاتی تھی۔ اپنی حق تلفی پر برہم ہو کر انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شعر گوئی میں جو کچھ تمہارے لیے سرمایہ افتخار ہے، میرے لیے باعث عار ہے۔ انداز بیان کی رعایت کرنا بھی واجب ہے۔ شاعر اپنے کلام پر تنقید کرنے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ مختلف المضامین غزل کہتے کہتے دو ایک شعر اپنی اردو اور فارسی شاعری کی بابت ایک رو میں کہہ گیا۔ وہ کسی تفصیلی اور معروضی موازنہ کے بعد اس فیصلہ پر نہیں پہنچا تھا۔ انسان فطرتاً اپنی محنت اور جفاکشی کی لاج رکھنا چاہتا ہے۔ جو چیز اہل الحصول ہو قدر کی ترازو میں وہ غیر الحصول شے سے ہلکی پڑتی ہے۔

یہاں جستجو کو غزل تک محدود رکھنے میں سہولت ہوگی۔ مقصد غالب کو غالب سے ٹکرانا اور ان کی فارسی غزل کا اردو غزل سے مقابلہ کرنا نہیں ہے۔ مقصد غالب کی فارسی غزلوں کو پڑھ کر حظ اندوز ہونا اور



اپنے حظ میں قارئین کو شریک کرنا ہے۔ شریک کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ فی زمانہ اردو جسنے والوں کی غالب اکثریت فارسی نہیں جانتی۔ اسی لیے جو اشعار منتخب کیے گئے ہیں ان کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔ تنقید کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ یہاں تنقید سے سروکار بھی نہیں، ان سطور کو ایک طویل تعارف سمجھے جنہاں کبھی کبھی موازنہ ہو جائے تو اسے گوارا کر لیجیے۔

غالب کی فارسی غزلیں مجھ میں اردو غزلوں سے بہت زیادہ ہیں۔ غالب نے فارسی پر غیر معمولی عبور حاصل کر لیا لیکن وہ غالب کی زبان نہیں تھی۔ اس لیے ان کی فارسی غزل میں اردو غزل کی سی بے تکلفی برجستگی اور شگفتگی نہیں آتی۔ لیکن اور بہت کچھ آیا جس کا تذکرہ ان سطور میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہے گا۔

بھاری بھر کم لوگوں کی طرح غالب کی فارسی غزل پہلی نظر میں نہیں نکلتی۔ شروع میں آپ کچھ اشعار پر رکیے گا، باقی سے سرسری گزر جائیے گا۔ بعض اشعار کے بارے میں خیال ہوگا۔ یہ کیا بات ہوئی، بعضوں پر مشاقی اور خیال بندی کا گمان ہوگا، کچھ اشعار کو نری موشگافی سمجھیے گا، بہت سوں پر ذوق مشکل گوئی برائے مشکل گوئی کی ہمت رکھے گا، کچھ پر آورد کا دمبہ لگتا ہوا نظر آئے گا، کچھ سے زورِ بیاں کے اظہار کو منسوب کیا جائے گا۔ کہیں رعایت لفظی آپ کو چیں چبیں کرے گی، کہیں رعایت معنوی کے اہتمام پر مسکرائے گا، کہیں کہیں خود ستائی پر طبیعت رکے گی، کبھی اس تذبذب میں پڑ جائے گی کہ یہ شکوہ، یہ زور، یہ بلند پروازی، یہ لب و ہجو، یہ آہنگ، شاید قصیدہ کو زیادہ زیب دیتا، یہ غزل ہے یا کسی قصیدہ کی تشبیہ؟

لیکن ایک بار اگر آپ کے ذوق شعر اور خلوص طلب نے ان شبہات کی مدافعت کر لی اور ان سطحی تاثرات کو سرچڑھانے سے انکار کر دیا، اور خوش خرامی اور سکون کے ساتھ ان غزلوں میں ڈوب کر ان سے حظ اندوز ہونا شروع کر دیا، تو عالم ہی دوسرا ہوگا۔ پھر آپ کسی شعر سے سرسری گزرنے نہیں پائیں گے۔ ہر شعر میں ایک نیا مضمون، ہر ترکیب میں ایک نیا مفہوم، ہر لفظ میں ایک نیا حظ آپ کے پاؤں پکڑے گا۔ بے پناہ آگے بڑھنے کی روش کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ کسی غزل سے بے مہری بستے یا کسی دورا ذکر، خیال پر چیں چبیں ہونے کا یا مانہ رہے گا۔ ہر بڑے شاعر کی دنیا میں داخل ہونے اور وہاں زندگی گزارنے کے اپنے لگ آداب ہوتے ہیں۔ انہیں برتنے لگے تو اکتشافات کے حیرت انگیز اور معنی خیز ابواب کھلتے چلے جائیں گے۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ وہ اشعار بھی جنہیں نادانی کی تاریکی یا ہمہ دانی کے زعم میں آپ نے خاکِ مر سمجھ رکھا تھا وہ بھی چنگاریوں اور لعل و گہر سے بھرے ہوئے ہیں۔ راقم سطور پر کچھ ایسی ہی گزری۔ پہلے اس نے

ان غزلوں کو چند نشستوں میں فر فر پڑھنے کی کوشش کی۔ اس تیز روی میں بھی بعض اشعار دامنِ دل کو چھوتے ہوئے چلے گئے، بعض ایک غزل چھوڑ گئے لیکن بیشتر اشعار نے نو وارد کا اجنبی پن اور سطحِ بینی دیکھ کر ان پھولوں کی طرح جورات کے آنے پر کٹی بن جاتے ہیں، اپنی بساطِ پیٹ لی، نامحرم کو دیکھ کر اپنے سونے زریا پر نقاب ڈال لی۔ خط اندوزی ذوق، ظرف اور فرصت کے بقدر ہی ہوتی ہے۔

حسن اتفاق کہ دل اس سرسری ملاقات سے مطمئن نہیں ہوا۔ نو وارد کو دوبارہ ادھر آنے کا موقع ملا اور ان آداب کو برتنے کی بھی توفیق ہوئی جنہیں برتنے بنا کسی قلم و شعر کا حق ادا نہیں ہوتا۔ پھر کیا تھا۔ انکشافات کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اب ہر شعر پر حریصانہ نگاہ پڑتی ہے، نہ جانے اس کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔ زمیں کھرچ کر تو دیکھو۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار  
گلچین تو از تنگئی دامنِ گدہ دارد

نظر کا دامن تنگ ہے اور تیرے حسن کے گلہائے رنگارنگ بے شمار تیرا گلچین تنگیِ دامن کا شاکی ہے۔  
اب یہ بات سمجھنے میں آنے لگی کہ اپنی فارسی شاعری پر غالب نے جابجا جو فخر کیا ہے۔ وہ محض معاصرہ چشمک کے بطن سے پیدا نہیں ہوا:

فارسی میں تا بہ بینِ نقوشِ ہائی رنگ رنگ  
بگزار از مجموعہٗ اردو کہ بیرنگ من است

میرا فارسی کلام دیکھو تا کہ صد رنگ نقوش تمہاری نگاہ کا خیر مقدم کریں۔ میرے اردو دیوان کو چھوڑ کر میرے نزدیک یہ بے رنگ ہے۔

جسے غالب نے زہریاں اور فارسی گوئی کے نشہ میں بیرنگ کہہ دیا تھا اس کی رنگارنگی نے ایک عام کو مسحور کر رکھا ہے۔ لیکن مضامین نو کا جو انبار غالب نے فارسی غزلوں میں لگا دیا ہے اردو میں ان کا وہ ہجوم نہیں ملے گا ہر شعر میں ایک نیا مضمون ایک نیا پیرایہ بیان۔

معنی غریب مدٹی و خانہ زاد ماست  
ہر جا عتیق نادر و اندر مین بسی است

ہمارے حریف کے خانہ دل میں مضمونِ نو اجنبیانہ داخل ہوتا ہے اس کے لیے مضمونِ اجنبی



ہے جو بھول کر ہی ادھر کا رخ اختیار کرتا ہے۔ ادھر یہ عالم ہے کہ مضامین تو ہمارے گھر میں پیدا ہوتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں اور باقیہ باندھے ہوئے ہماری چشم التفات کے منتظر رہتے ہیں۔ محقق ہر جگہ کم یا بس ہے اور یکن میں بہ کثرت ملتا ہے۔

دھنچہ نبودم ہمہ آں چہ در دل است

در بزم کمتر است گل و در چمن بسی است

میرے خاندن دل میں مضامین کا ازدحام ہے، صنف قرطاس پر جو مضامین قلم بند ہو پاتے ہیں وہ ان کا عشرِ عشیر ہوتے ہیں۔ محفل میں چند ہی پھول سجائے جا سکتے ہیں حالانکہ چمن میں وہ فراوان ہیں۔

مضامین کے اس بحر بیکراں کے لیے جو غالب کی فکرِ خلاق میں موجزن ہے سفینہ اشعار ناکافی ہے۔ شاعر کے دل پر کیا گزرتی ہوگی جب افکار و احساسات کا ساتھ الفاظ نہ دے سکتے ہوں۔ جب تخیل پیرایہ ہاے اظہار کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہو۔ غالب زندگی بھر گرداں رہے بیان میں کچھ اور وسعت کے لیے اپنی فارسی غزل کے روبرو ان کا یہ احساس اور شدید ہو جاتا ہوگا۔

غالب ہنگامِ تقاضہ عرفی، نظیری، ظہوری اور شیخ علی حزیں کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے۔

چوں نہ ناند سخن از مرحمت دہر بہ خویش

کہ برد عرفی و غالب بہ عوض باز دہد

شاعری اس جو دو عطا پر جو لیل و نہار نے اس کے ساتھ کی ہے کیوں نہ ناز کرے زمانہ عرفی کو جہاں سے لے گیا تو اس کی جگہ غالب کو لے آیا۔ خوب سے خوب تر کی طرف یہ سفر شاعری کے لیے سرمایہٴ نانہ ہے۔

بہ فیض نطقِ خویشم یا نظیری ہمزباں غالب

چراغی را کہ دودی ہست در سر زود در گیرد

غالب میں اپنی قادر الکلامی کے فیض سے نظیری کا حریف ہوں۔ جس چراغ کے سر میں دھواں ہوتا ہے وہ آگ جلد پکڑ لیتا ہے۔

کیفیت عرفی طلب از طینتِ غالب

جامِ دگر اں بادہٴ شیراز ندارد

عربی کے حسن بیان کے اگر طالب ہو تو غالب سے رجوع کرو۔ اور کسی کے یہاں صہبائے شیراز  
ملنے سے رہی۔

تو بدیں شیوہ گفتار کہ داری غالب  
گر ترقی نہ کنم شیخ علی رسانی  
غالب اگر ترجیح نہ دوں تو تم اپنے اسلوب سخن میں شیخ علی حزیں کے مانند ہو۔  
غالب کو اس میں تو کوئی شبہ ہی نہ تھا کہ وہ اپنے بمعصروں سے برتر تب بالا تر تھے نیشن ہسی  
است وچمن ہسی است وانی غزل کے مطلع و مقطع میں انہوں نے پُر لطف انداز سے اپنی برتری کا  
اعلان کر دیا۔

گفتم ہر روز گار سخور چو من ہسی است  
گفتند اندریں کہ تو گفتی سخن ہسی است  
میرا یہ کہنا تھا کہ زمانہ میں تجھ جیسے شاعر بہت سے ہیں کہ ہر طرف سے صدائیں بلند ہوئیں  
”تم جو کہہ رہے ہو اس میں ہمیں بہت کلام ہے۔“  
غالب نخورد چرخ فریب از ہزار بار  
گفتم ہر روز گار سخور چو من ہسی است  
غالب میں نے ہزار کہا کہ اس زمانہ میں میرے جیسے بہت سے شاعر ہیں، لیکن آسمان کب  
دھوکا کھائے والا تھا۔ اس نے مان کر نہیں دیا۔

ای کہ راندی سخن از نمکے سرایان عجم  
چہ بہاشت بسیار نہی از کم شان  
تم جو سخوران عجم کی بات کر رہے ہو ان کی کم بضاعتی کا بوجہ ہم پر کیوں ڈال رہے ہو۔  
یہ اشعار بتا رہے ہیں کہ غالب کو فارسی شاعری میں اپنی عظمت کا احساس تھا۔ غالب  
کی غزلوں میں اس کے طرز سخن کے بارے میں اشارے ملتے ہیں :  
در تر ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ  
تا زد یوانم کہ سرست سخن خواہد شدن

غالب! میں نے ہر حرف کی تہ میں مینخاد سجار کھا ہے۔ دیکھیں تو اس میکدہ سے کس کس کو ذوق سخن کے ساغر ملتے ہیں۔

شاعر قارئین کو دعوت دے رہا ہے کہ ڈھونڈھ کر ان مفاہیم و محاسن کو نکالیں جو اس نے ہر حرف کی تہ میں سجار کھے ہیں۔ شاعر کو اپنی مضمون آفرینی اور تہ داری پر بجا طور پر نانا ہے دوسرا وصف جسے تفصیل درکار ہوگی آتش نفسی اور شعلہ آبی ہے

نر شعلہ خیزی دل بر مزار ماچہ عجب  
کہ برق مرغ ہوا راز بال و پر گزرد

مرنے کے بعد بھی ہمارے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ اس سے اب بھی شعلے اٹھ رہے ہیں۔ کیا عجب کہ ہوا میں اڑتے ہوئے پرندوں کے بال و پر سے وہ آگ بجلی کی طرح گزر جائے جو میرے دل سے شعلے اٹھا رہی ہے۔

سوزم از تابِ سمومِ دلِ گرم غالب  
دلِ گرشِ تازگی از اشکِ دمامِ نرسد

اگر دل کو آنسوؤں کی جھڑی سے طراوت نہ پہنچتی رہی تو وہ اس بادِ سموم کی حرارت سے جل جائے گا جو آہ کی شکل میں میرے بہتے ہوئے دل سے نکل رہی ہے۔

ذوقم بہ ہر شرارہ کہ از داغِ می جہد  
دل را نوائی دیر بماند می زند

میرے آتش کدہ دل سے جو چنگاریاں اٹھ رہی ہیں، میرا ذوق آتشِ آشامی دل سے مٹ کر رہا ہے کہ انھیں دیر تک آتش بار رکھیو۔

چوں نیست تاب برق تجلی کلیم را  
کی در سخن بہ غالب آتش فشاں رسد

حضرت مونسِ برق تجلی کو ہی برداشت نہ کر سکے، وہ غالب کی شعلہ نوائی کی تاب کیوں کر لاسکیں گے۔

آتش بند دل کی نہ تھی ورنہ ای کلیم  
یک شعلہ برقِ خرمن صد کوہِ طور تھا

شرارِ آتشِ زردشت در نہاد م بود کہ ہم بہ داغِ مغان شیوہ دلیرانم سوخت  
ایسا لگتا ہے کہ زردشت کی آگ کی چنگاریاں میرے مزاج میں تھیں، جھوٹوں نے مجھے مغان  
شیوہ اور شعلہ خوجو بول کی محبت میں جلا کر خاکستر کر ڈال۔

یہ پوری غزل جس کی ردیف سوخت ہے شرارِ انگیزِ آتش کدہ بنی ہوئی ہے۔

مغان کہ برقِ عتاب تو آنچنا نم سوخت  
کہ رازِ دردِ دل و مغز اندر استخوانم سوخت

فریاد کہ تیرے عتاب کی بجلی نے مجھے اس طرح جلا ڈالا کہ رازِ دل میں اور مغزِ بدیوں میں جل کر رہ گیا۔

چو وارسید فلک کاب در مقامِ علم نیست  
ز جوشِ گرمیِ بازارِ من دوکانم سوخت

آسمان کو کہیں سے پتا چل گیا کہ میرے اثاثہ میں پانی نہیں رہا کیوں کہ آنسو کبھی کے خشک ہو چکے۔ یہ پتا  
چلنا تھا کہ اس نے میری دوکان کو میری ہی گرمیِ بازار سے جلا دیا۔

شنیدہ امی کہ بہ آتشِ سوختِ ابراہیم  
بہ بیجا کہ بے شر و شعلہ نی توانم سوخت

تم نے سنا ہو گا کہ براہیم علیہ السلام آگ سے نہ جل پائے۔ مجھے دیکھو کہ میں بغیر شعلہ اور شرر کے خود کو  
جلا سکتا ہوں۔

غالب کی مضمون آفرینی کا یہ خاص انداز ہے کہ کتری کو برتری میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اور بازار سے بے  
آگے اگر ٹوٹ گیا۔ بے غرجم سے مراجعِ سفال اچھا ہے۔

سوخت کی ردیف شعلہ کی گرمیِ خو کو اس قدر بھاگائی کہ ایک اور دہکتی ہوئی غزل اسی ردیف میں کہہ ڈالی۔  
بہرِ بستِ شرار و نہ بجبا ماندہ رماد

سو ختم لیک نہ دانم یہ چہ عنوانم سوخت  
نہ تو کوئی چنگاری ہی اڑی اور نہ راکھ ہی بچی۔ اس نے مجھے جلا ڈالا لیکن سمجھیں نہیں آتا کہ ڈھب سے۔

دورِ باکشس از ریزدہائی استخوانم اسی ہما  
کیں بساطِ دعوتِ مرغانِ آتشِ خوار است

اے ہما، میری ہڈیوں کے ریزوں سے دور ہو جو چٹخ کر ہوا میں چنگاریوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ میں نے  
یہ دیکھا تو ان طیور کے لیے چنا ہے جن کی غذا آگ ہے۔

نفس مرا بہ سوز کم از برہمن نسیم  
سنگ نہ سو خلق نہ توان در مزار برد

میری نفس کو جلادو، میں برہمن سے کم نہیں ہوں جلانے جانے کا داغ قبر میں نے کر نہیں جاؤں گا۔

سرگرمی خیال تو از نالہ بازداشت  
دل پارہ آتش کہ دودش نماندہ است

تیرے خیال کی گرمی نے مجھے ناک کرنے سے باز رکھا، دل آگ کا ٹکڑا بن گیا ہے۔ لو دینے لگا ہے،  
اب اس میں دھواں کہاں۔

سگنا، جلنا، دھواں دینا، لودینا، چنگاریاں اڑانا، بھڑکنا، تڑکنا، گھٹنا، پگھلنا، گھونا — ان سب کا  
محزن کیا ہے۔ کیا یہ آگ صرف وہی آگ ہے جس کے لیے غالب نے کہا تھا۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجے

یا شیفۃ کی زبان میں: شاید اسی کا نام محبت ہے شیفۃ۔ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔

غالب کی اردو غزلوں میں بھی یہ آگ فروزاں نظر آتی ہے لیکن وہاں فارسی غزلوں کی سی تہزت و حرارت  
اور شدت نہیں ہے۔ وہاں آگ اکثر ایک استعارہ ہے جو تفکر اور ارتقاء کے ذریعہ اکثر آگ کو دھماکا دیتا ہے  
کیا یہ فارسی کا محاورہ تھا جس نے شعلہ کو بھڑکا دیا، یا ایک ایسی زبان میں جو شعری قدرت کے باوجود غالب کی  
مادری زبان نہ تھی۔ اس انداز سے عشق سخن کرنے میں کراساتذہ کو رشک آئے، فکر اور تخیل کو جو جگر گداز ریاضت  
کرنا پڑی تھی اس نے دل و جگر کو دھماکا دیا، پھونک ڈالا، غالب کا ذہن فارسی کے متاخرین شعرا کے ذہنوں سے  
ٹھکرایا اور چنگاریاں اڑنے لگیں۔ کیا شاعر کا دل ناقدریٰ انباتے زمانہ کی وجہ سے سنگ رہا تھا؟

غالب سخن از ہند برون بر کہ کس میں جا

سنگ از گہر و شعبہ ز اعجاز نداند

غالب اپنے کلام کو اس ہندوستان سے باہر لے جاؤ کہ یہاں کوئی شخص نہ ٹھکرا دے موتی اور نہ شعبہ  
اور اعجاز کے درمیان امتیاز کر سکتا ہے۔



اس نے اردو کے مجموعے کو بے رنگ کہہ کر زور تخلیق فارسی شعر گوئی پر صرف کر دیا یہ احساس ضرور رہا ہوگا کہ فارسی زبان شیر مادر کے ساتھ غالب کے ذہن اور نطق کا جزو نہیں بنی تھی۔ اور اس کے باوجود غالب کو اسی زبان میں عرفی، نظیری، ظہوری اور علی حزیں کی زمینوں میں غزلیں کہنی تھیں اور قدرت کلام اور پرواز تخیل کے پرچم بلند کرنے تھے۔ خود یہ خیال ہی اس شخص کو بے تاب اور آتش زیر پا کرنے کے لیے کافی تھا جو بجا طور پر خود کو یگانہ روزگار سمجھتا تھا اور جو یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ شعر و شاعری کے میدان میں متاخرین اور معاصرین میں سے کوئی اس سے آگے نکل سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ متاخرین کے روبرو وہ اعتماد اور افتخار کے ساتھ دادِ سخن دیتا ہے۔ لیکن مقدمین اور توسلین سے شاید ہی کبھی اس نے آنکھ ملائی ہو۔ غالب کے ذوقِ نقد نے یہ بات اس پر واضح کر دی ہوگی کہ سعدی اور حافظ کا دور ختم ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ سخن پر قدرت کے وہ امکانات اور بیان کے وہ اسالیب بھی۔ سعدی کی سی دروہت اور درد و گداز اور حافظ کا سا آہنگ اور انتخاب و ترتیب و امتزاج الفاظ و حسنِ اصوات و سحرِ حلال۔ یہ سب کچھ لاریب معراجِ سخن تھا۔ اس تک متاخرین میں سے کسی کی رسائی نہ ہو سکی تاہم غالب چہرہ رسد۔ اور پھر زمانہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ پرکاری جو سادگی کی کوکھ اور دہانہ محبت کے بادۂ سرچوش سے پیدا ہوتی ہے متاخرین تک جن کا زمانہ زہنی پیچ و خم کا تھا، پہنچ نہیں پائی۔ اب دور دورہ اس پرے کاری کا تھا جو ذہن کے نشیب و فراز اور فکر کے پرتیج تار چڑھاؤ طے کرتی ہوئی آتی ہے۔ غالب کی مشکل پسند طبیعت کو اثر ان کی کج نویدیاں اور اس کے زیر و بمِ راس آئے۔ نکتہ سنجیاں، ہوشگافیاں، بلند پروازیاں، مشکل گوئیاں، اقلیم مضامین میں، اختراعات، انکشافات اور طالع آزمایاں اور ہم جوئیاں، غالب کے حصے میں آئیں اور اس نے متاخرین و معاصرین کو لٹکارا کہ جو دادِ نبرد دے سکتا ہو سلنے آجائے۔

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے یہ مقام بھی آئے ہیں جہاں غالب نے تفاخر میں توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہرزہ مشاب و پی جادہ شناساں بردار۔ اسی کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت بے کار ادھر ادھر مت دوڑو ان کے پیچھے چلو جو راستے سے واقف ہیں۔ تم جیسے ہزاروں شاعری کی اس راہ سے گزر رہے ہیں۔

بہر کیف یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فارسی کے مزاج سے طبعی مطابقت کے باوجود غالب کو اہل زبان نہ ہونے کا احساس تھا۔ اس نے غیر معمولی کاوش کے بعد فارسی محاورہ پر قدرت حاصل کی۔ پھر بھی اہل زبان کی سی

فارسی دانی کے دعوئے کی تائید میں اسے ملا عبدالصمد کی شکل میں وحیل اختراع کرنی پڑی، اور قسطنطنیہ سے محاورہ  
سٹنٹاسی کی بحث میں الجھنا پڑا۔ غالب کے فارسی اشعار کی دروبست اور ان کا شعلہ بیہیرا من ہونا بتا رہا  
ہے کہ فارسی مغز لیس فکری اور ذہنی تناؤ کے عالم میں کہی گئی ہیں۔

ابھی تک جن اسباب کا ذکر ہوا ہے وہ غالب کی آتش نوائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن اس کی  
مکمل توجیہ نہیں کرتے غالب کے مزاج کی تشکیل شعلہ و شرار سے ہوئی تھی اس پر مستزاد نواب رفیع روزگار کی وہ  
بے تابی جو انہیں حصول کمال کے لیے آتش زیر پا رکھتی ہے۔ زندگی کے اختصار کا احساس عزائم کے طول  
سے ٹکراتا ہے تو چنگاریاں ہوا میں اڑنے لگتی ہیں۔

غالب کے پیرایہ شعر اور اس کے اوصاف شاعری کی تشکیل میں نہ جانے کتنے اسباب و عوامل  
شریک ہوئے ہوں گے۔ ہمارے سوال کا آخری جواب لسان الغیب کی زبانی سنئے۔

ازاں بہ دیر مغانم عزیز می دارند

کر آتشی کہ نہ میرد ہمیشہ در دل ماست

آتش پرست مجھے اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ وہ آگ جو کبھی نہیں بجھتی ہمارے دل میں فروزاں ہے۔

دل مرا سوز نہاں سے بے حجابا جل گیا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں

اردو کی طرح فارسی میں بھی غالب جو بات کہتے تھے اس میں کہیں خفیف السخنی کا شائبہ تک نہیں

ہوتا تھا، ہر بات ایک خاص ڈھب سے، ایک بناؤ کے ساتھ، اچھوتے انوکھے، دقیق، بھاری بھر کم

انداز سے، جس کی ایسے غیرے تقلید نہ کر سکیں، نقل نہ کر سکیں، جس کا منہ نہ چڑھا سکیں۔

ماتنگ مایہ بہ در یوزہ خود آرا نہ شود

نرخ پیرایہ گفتار گراں می بایست

پیرایہ بیان کو با وزن ہونا چاہیے تاکہ کم بضاعت شعرا اس کی نقل نہ کر سکیں اور اپنی دکان نہ سمجھ سکیں

عیار فطرت بیشتیاں ز ماحضیر

صفائی بادہ ازیں درویش نشیں پیداست

پہلے آنے والوں کا بر تقدیر، کے منصب سخن اور وضع کلام کو جانچنے کی کسوٹی ہمارا سخن ہے

نہیں بیٹھ جانے والی اس تلچھٹ سے اندازہ لگا لو کہ شراب ناب کیسی تھی۔ غالب کبھی سیدھی سادی بات تو کہتے ہی نہیں، ہر نظر ہر سادہ بات کی تہ میں وہ لہی مفاہیم چھپا دیتے ہیں۔ ”یہ نشیں“ سے ترتیب زمانی کی طرف ذہن جاتا ہے: تلچھٹ سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ہم سے پہلے آنے والے شعراء کے حصہ میں مضامین کی صہبائے ناب آگئی۔ اب جو کچھ بچا کھچا رہ گیا ہے، ہم اسی پر طبع آزمائی کر سکتے ہیں یہاں افتخار اور اعتذار اور انکسار شیر و شکر ہو گئے ہیں: افتخار ہمارا سلسلہ نسب فارسی کے اگلے اکابر شعراء سے ملتا ہے۔ ہم نے ان کے دو ادین کھنگالے ہیں اور اپنے ملک شعری کو ان کی وضع سخن پر ڈھالا ہے، ہم ایران کی طویل شعری روایت اور تسلسل کے امین اور ترجمان ہیں، انیسویں صدی کے ہندوستان کے کوئی خود رو خود ساختہ قافیہ بیابانیں ہیں۔ علاوہ بریں درد و جام کے نشے کو کچھ رنداں سا خورد ہی جانتے ہیں۔

اعتذار ہمارے سخن پر نقد کرنے اگر بیٹھو تو یہ نہ بھولو کہ ہم آخر میں آئے ہیں، اگلوں نے ہمارے لیے چھوڑا ہی کیا تھا؟

انکسار پہلے ہمارے کلام سے عہدہ برآ ہو لو، پھر اگلے شاعروں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ دیکھا آپ نے انکسار سے افتخار دست و گریباں ہے۔ یہاں رنگار اور آئینہ کا رشتہ ملحوظ ہے ہر چند کہ ملحوظ نہیں زبان و مکاں کے اختلاط کا ہوشربا سماں دیکھیے۔ گردشیں دہار کو جام بادہ میں اسیر کر لیا ہے، اردو میں اسے لغو بلکہ شکلا دور بینی انداز کہیں تو بے محل نہ ہو گا۔ اس طریق کو انگریزی محاورہ میں . . . کہا جاتا ہے، مراد یہاں دور تک دیکھنے سے نہیں، اس آلہ کی ساخت سے ہے جس سے دور کی چیز دیکھی جاتی ہے۔ اور جس کے پھیل جانے والے اجزاء سمٹ کر ایک دوسرے کے اندر گھستے چلے جاتے ہیں۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہمیں پھر غالب کی آتش بیانی اور ان کے گنجینہ معانی کی طرف لے جاتا ہے:

نہاد گرم ز شیرینی سخن غالب

بسان موم ز اجزائی رنگبیں پیدا مست

ہماری شیریں کلامی سے ہماری گرمی طبع اس طرح نمودار ہو رہی ہے جس طرح شہد کے اجزاء موم۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ دکتے ہوئے دل سے جو شعر اُبل رہے ہیں ان کی گرمی دلوں میں حرارت پیدا کرتی ہے، اور ان کی شیرینی لہجائی ہے۔ دیکھیے کہ غالب نے موم سے شمع کو شکل پذیر کر کے حرارت کو بھی روشنی میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اس کے اشعار میں گرمی روشنی اور حلاوت بہم پہنچا رہی ہیں ان



دلکش خیالات کا سرچشمہ شہد کی مکھی کا چھتہ ہے جہاں شہد اور موم بہم شیر و شکر ہیں۔ گرمی فیض ہے جذبہ کا،  
روشنی بصیرت کا اور حلاوت ثمرہ ہے الفاظ و آہنگ کا۔

قدِ دیتہ جام کا ذکر غالب کی اردو اور فارسی شاعری دونوں میں آیا ہے اور کئی بار آیا ہے :  
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ۔ ۔ ۔ ہے یوں کہ تجھے قدِ دیتہ جام بہت ہے  
چوں کہ کئی بار آیا ہے اس لیے اس سے سرسری گزربھی نہیں سکتے۔

ہر گونہ حسرتی کہ زایام می کشیم  
قدِ دیتہ پیالہ امید بودہ است

حسرتیں کیا ہیں، صہبائے امید کی تلچھٹ۔ امید ختم ہو جاتی ہے تو باقی کیا رہتا ہے حسرت۔ تخیل کے  
جادو نے یہاں بھی طرفِ زمان کو طرفِ مکاں میں تبدیل کر دیا، وہ بھی آنکھ جھپکاتے۔ غالب کو اپنی صلاحیت  
کا احساس اور اپنی قسمت سے گلہ تھا۔ قدِ دیتہ جام، ایک استعارہ تھا زمانہ کی تینک بخشی اور اپنی محرومی  
کے لیے۔

لیکن ابھی ہم نے اس غزل کو خیر باد نہیں کہا ہے:

ناداں حریفِ مستی غالبِ مشو کہ او  
دردی کشِ پیالہ جمید بودہ است

اے ناداں، غالب کے نشہ میں شرکت کا دعویٰ نہ کر، تو دیوانہ شہ کہاں سے لائے گا؟ وہ بلا نوش  
تو سرشار ہے اس تلچھٹ کے تلخ و تند جرعے سے جو جامِ جم کی تہ میں باقی رہ گئی تھی۔  
دردی کش میں ایک طرف دیر سے وجود میں آنے کا پُر حسرت ذکر ہے، دوسری طرف یہ شانِ  
افتخار کہ ہمارے اقران و امثال یعنی معجز بیاناں پیشین کہی کے آکر چلے گئے۔ ایک میں ہی رہ گیا  
ہوں، لگے وقتوں اور عظمتِ دو شیعہ کی یادگار۔ مجھے وہ دور ملا جس میں شعر سمجھنے اور اس کی قدر کرنے  
والے بھی نظر نہیں آتے۔

ایک بلبل ہے کہ بے محو ترنم اب تک اس کے سینہ میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

لیکن غالب نے ایک مفہوم پر کبھی قناعت نہیں کی۔ جمید کہہ کر غالب نے اپنی فارسی شعر گوئی کی عظمت  
کا پرچم بلند کیا، ایک گراں قدر شعری روایت کی نشاندہی کی اور یہ بات بھی کہہ دی کہ جس پیالہ نے

اسے مد ہوش کر رکھا ہے وہ جامِ جم ہے۔ دوسرے شاعر کے الفاظ میں:

مادرِ پیالہ عکسِ سرِ بختِ یارِ دیدہ ایم

ای بی خبرِ لذت شربِ مدام ما

ایم نے پیالہ میں رُخِ یار کا عکس دیکھ لیا ہے۔ تمہیں کیا خبر کہ ہماری پیہم سے نوشی میں کیسی لذت

ہے۔

پیالہ جیشید کو درمیان میں لا کر غالب نے اس رمز کا اعلان کر دیا کہ بڑا شاعر وہی ہو سکتا ہے جس کی چشمِ بصیرت پر حیات و کائنات کے عقدے وا ہو گئے ہوں، جو ہر لمحہ دیکھ رہا ہو کہ دنیا میں کیا کیا حوادث و قوسا پذیر ہو رہے ہیں، اس میں رہنے والوں پر کیا بیتِ ہی چان کے دلوں پر کیا گزر رہی ہے، زمین چمن کیا گل بکھلا رہی ہے اور آسماں کیسے کیسے رنگ بدل رہا ہے، ارفع شعرو ہی کہہ سکتا ہے جس کی فکر عالمگیر ہو اور جس کی تخیلِ فلک پرواز، جو انسان کی نفسیات سے طبعی طور پر آگاہ ہو، جو دلوں کے اند بھانک سکتا ہو، جو ان سارے امور کے خشک تجزیہ میں اپنے گراں قدر لمحات ضائع نہ کرتا ہو بلکہ جو صہبائے آگہی سے مد ہوش ہو، شاعری قافیہ پیمانی، استدلال، موشگافی یا قادر الکلامی کو نہیں کہتے۔ ایک دوسرا شاعر کہہ گیا ہے۔

ولی با بادۂ بعضی حریفان      خمارِ چشمِ ساقی نیز بیوست

مشموم کہ در اشعارِ این قوم      درائی شاعری چیزی دگر بہت

لیکن بعض حریفوں کی شراب میں چشمِ ساقی نے خمار گول دیا ہے۔ اب اس سے انکار نہ کرو کہ اس قبیل کے شعرا کے کلام میں شاعری کے علاوہ لہجہ اور بھی ہے، غالب نے جو پیالہ جیشید کی بات کی تو اس کا معنی سخن، اور یہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ شعر غالب کے کئی چہرے ہیں ہزار دئے سخن بھی کئی طرف رہتا ہے، خمارِ چشمِ ساقی کی طرف تھا۔ شاعر ایک پل میں استدلال اور ادراک کی گرہیں کھول دیتا ہے اور خواں اور عقل اور منطق کی نارسائی اور حجاب، فگنی کے ظلم کو توڑ دیتا ہے، اس کی بدولت پرانی چیزیں نئی ہو جاتی ہیں ویرانہ چین بن جاتا ہے۔ نظرِ خواہر کو چہرے کی حقیقت کی تہ تک پہنچ جاتی ہے۔

مضمونِ آفرینی اور ندرتِ بیان کی مثالیں دیوان میں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ ان سے اغماض برت کر آگے بڑھنا آسان نہیں لیکن ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔ جاتے جاتے چند شعرا اور سناتے

جاتے ہیں تاکہ غالب کی فارسی غزل سے فارسی ناشناس قارئین واقف اور حظ اندوز ہو سکیں :

داغ از مورد نظر بازی شوقش بہ شکر  
کش بود پویر بدای پائی کہ مرزگاں شدہ است

چونٹی جس شوق سے شکر کے دل نے کود کھیتی ہے اس پر مجھے رشک آتا ہے۔ وہ محبوب کی طرف ان پیروں سے دوڑ رہی ہے جو پلک بن گئے ہیں۔ یعنی دیوانہ وار اس طرح دوڑ رہی ہے کہ نظر ہر لمحہ شکر کے دانہ پر ہے۔ پاؤں کا مرزگاں ہو جانا مؤثر اور دلکش پیرایہ بیان ہے محبوب اور مقصود کی طرف بہ یک وقت نگران اور جادہ سما ہونے کے لیے یہاں جذبہ دل پائے نگاہ کے ساتھ گنتھا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ محبوب سے غالب کو بات کرتے ہوئے دیکھیے، لاکھوں بناؤ نظر آئیں گے۔ حسن و عشق کے معاملات اور روایات کا اظہار غالب کے اشعار میں طرصداری اور بانگین کے ساتھ ہوا ہے۔ عکس ہوتا ہے کہ دل کی بات ذہن سے گزرتی ہوئی قلم تک پہنچی ہے۔ جذبہ کو جوں کا توں صفحہ قرطاس تک منتقل کر دینا غالب کے آئین شعر گوئی اور افتاد طبع کے خلاف تھا۔ وہ جب جذبہ کو شعر کا قالب عطا کرتا ہے تو پہلے اسے ذہن کے دل فریب بیج و خم سے گزرتا ہے۔ وقوع گوئی کو غالب نے شایستگی، بلندی اور لطافت سے مرتع کیا ہے۔

مراد میدان گل در گماں فگند امروز

کہ باز بر سر شاخ گل آشیانم سوخت

گلاب کھلے تو محسوس ہوا کہ جن میں آگ لگ گئی ہے، شاعر کو شبہ ہوا کہیں دوبارہ شاخ گل پر اس کا آشیان تو نہیں جل گیا۔

قفص میں مجھ سے روداد چمن کہتے زور ہمد

گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نگہ بہ چشم نہان وز جبہ چیں پیدا است

شگرفی تو ز انداز ہمد و کیں پیدا است

ایک اور ہوشربا تصویر چشم تصور کے سامنے آگئی۔ نگہ انقعات آنکھوں کے اندر چھپی ہوئی ہے اور جیسے شکلوں سے بھری ہوئی ہے۔ محبوبی کے تمہارے نرالے انداز تمہاری محبت اور اس کے عقب میں خفگی سے ہویا ہیں

رسید تیغ تو ام بر سر وز سینه گزشت

زہی شگفتگی دل کہ از جبین پیدا است

تمہاری شمشیر میرے سر کو دو نیم کرتی ہوئی سینہ سے گز گئی۔ دل کا کھل جانا بڑی خوشنمائی کے ساتھ  
جیوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔

غالب کی فارسی غزل کہہ رہی ہے کہ در و بست کی آن بان الفاظ میں جی نہیں افکار میں بھی ہے  
اور یہ اس کا نشان امتیاز ہے۔

یہ جہنم دیدہ خونبار گشتہ ای مارا

تراز دامن و مارا ز آستین پیدا ست

بظاہر سادہ سا شعر ہے لیکن کتنا پُر لطف۔ تم نے مجھے اس جہنم کی پاداش میں قتل کر دیا کہ میں  
تمہارے راز کو مخفی نہ رکھ سکا۔ شدت درد سے میری آنکھوں سے ہو کے آنسو ٹپک پڑے جو میری آستین  
کو خون آلود کر گئے۔ تمہارا دامن اور میری آستین میرے قتل کی گواہی دے رہی ہے۔ شاعر محبوب کے تغافل یا  
ستم کی بنا پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس خطا پر غضب ناک محبوب نے اسے تہ تیغ کر دیا۔ شاعر کی آستین  
اشکِ خون کی گواہ ہے، اور محبوب کا دامن جو مقتول شاعر کے خون سے داغدار ہے، غالب کہنا  
یہ چاہ رہے ہیں کہ شاعر جو محبوب پر فریفتہ تھا اس کو دیکھ کر بالکل ہی گھائل ہو گیا ہے۔

فتیلہ رگِ جاں سر بہ سر گداخته شد

ز بیج و تابِ نفسہائی آتشیں پیدا ست

شرارہ بردوشِ سانوں کے بیج و تاب سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ رگِ جاں کا فکیل ایک سرے  
سے دوسرے سرے تک پگھل گیا ہے۔ رگِ جاں کو فکیل سمجھنے سے جو آگ پکڑ چکا ہے سویر نہاں کی تباہ  
کاریوں کا سراغ ملتا ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہانتہ و غطا ست

بردار تو اں گفت بہ منبر نہ تو اں گفت

وہ راز جو سینہ میں نہاں ہے کوئی و غلط تو نہیں جسے منبر پر کہہ ڈالیں۔ اسے سولی پر چڑھ کر ہی افشا کر سکے ہیں

جوشِ حسرت بر سرِ حاکم ز بس جانتنگ کرد

پچو نبضِ مردہ دودِ شمعِ جفیدنِ نداشت



اتنی حسرتیں لے کر میں دنیا سے گیا ہوں کہ قبر پر حسرتوں کی بھیڑ لگ گئی ہے جس میں سانس لینا تک  
دوبھر ہے۔ ایسے میں شمع مزار کیوں کر جلتی، اس کے دھوئیں کو ہلنے تک کی جگہ نہیں ہے۔ چناں چہ جس  
طرح زیرِ خاک میری نبض میں حرکت نہیں تھی، اسی طرح میرے بالیں پر جو شمع جلائی گئی، اس کا دھواں بھی  
حسرتوں کے ہجوم کی وجہ سے اٹھ نہیں پایا۔ بد مرگ بھی میں تصویرِ حرام بنا ہوا تھا۔ جو شمع میرے مزار پر جلائی  
گئی وہ حسرتوں کے ہجوم سے کچھ اس طرح بھی کہ دھوئیں کو بھی اٹھنے کے لیے جگہ نہ ملی۔

دلغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

بدیں نیاز کہ با ت ناز می رادم

گما بہ سایہ دیوارِ پادشہ حقت است

تمہاری محبت میرے لیے سرمایہ افتی رہے۔ سائلِ قصر شاہی کی دیوار کے سایہ میں سو رہا ہے۔

جو گا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میٹر کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اس طرح کی تشبیہات جو فکری کو مرنی سے جوڑتی ہیں حواس اور تفکر دونوں کا احاطہ کرنے کی وجہ سے خصوصاً  
دل پذیر ہوتی ہیں۔ غالب کے اردو کلام میں اس قسم کی تشبیہات نسبتاً کیاب ہیں۔ فارسی غزلوں میں کہیں  
کہیں نظر آتی ہیں تو لطف دے جاتی ہیں۔

غالب کی اردو اور فارسی غزلوں میں بہت سی مشابہتوں سے قطع نظر ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اردو کی  
غزلیں بظاہر سکون اور عافیت کے ساتھ فراغت میں کہی گئی ہیں۔ ان میں کشادگی، فرحت اثری اور  
شگفتگی ہے۔ یہاں شاعر تنہا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کی اردو غزلیں نام نہاد ”بے رنگی“ کے باوصف،  
اردو کی شاعری میں عدیم المثال ہیں۔ سودا کی غزلوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ خدائے سخن تیر کا اسلوب  
اور مرتبہ الگ ہی تھا۔ جہاں مضمون آفرینی، موشگافی اور بلند پردازی کے مواقع کم تھے اور ان باتوں کی  
طرف اس نابغہ روزگار کا دھیان بھی نہ تھا۔ معاصرین میں مومن خاں کے یہاں نازک خیالی تغزل گوئی اور  
ندرت آمائی اور طباطبائی ملتی ہیں۔ لیکن ان کے یہاں بھی ایسے اشعار کم ہیں جن میں جذبہ فکر اور اظہارِ باہم  
مل کر استعاراتی انداز کے سائے میں تخلیقِ جمال کے لیے مامور ہو گئے ہوں۔ ذوق کو قصیدہ سے الگ کر لیجیے  
تو وہ کسی شہر و قطار میں نہیں تھے۔ چناں چہ تو اس یہ کہتا ہے کہ اردو غزل کہتے ہوئے غالب کی شاید کبھی یہ  
خیال نہ ہوا ہو کہ ان کا کوئی حریف یا اسالیب بیان میں ان کا کوئی شریک ہے فارسی غزل کی بات الگ

ہے یہاں عصرے قطع نظر غالب کے گرد و پیش زمانی نہ سہی شعری قرب کی وجہ سے عرفی، نظیری، صائب، ظہوری، کلیم، حمزہ، بیدل تھے۔ غالب نے اپنی فارسی غزلیں بالعموم حریفانہ انداز میں کہی ہیں، اس تناؤ کی کیفیت میں جس سے کھلاڑی اہم میچ یا مقابلہ سے بہت پہلے سے گزرنے لگتا ہے، جس کا تجربہ امتحان یا انٹرویو کی شام کو ہر اچھا امیدوار کرتا ہے، اور جو گھوڑ دوڑ سے پہلے سمنڈ کے رگ و پے سے شدت ارتکاز کی شکل میں ٹپکنے لگتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالب کی فارسی غزلوں میں بسا اوقات اردو غزلوں سے زیادہ معنویت، سمشاد، ایجاز، تندرستی، مضمون آفرینی اور دروہیت ہے۔ لیکن ان میں بصیرتیں اور تجربہ آفرینیاں، عقدہ کشائیاں، عادت شکنیاں، رہنمایاں اور شگفتگیاں، اردو غزل کے مقابلہ میں کم دستیاب ہیں۔ نہ وہ زیر لب تبسم جو دنیا کو بہ حیثیت ایک بازیچہ اطفال کے سمجھتا ہے اور شاعر کے ہاں خاندان کو موثر کر دیتا ہے۔ غالب کی اردو غزلیں اس کی فارسی غزل گوئی کی بہ نسبت ہیں، مضمون آفرینی، ربان، تراکیب اور بندش کے لیے لیکن اس کے برعکس کہنا صحیح نہ ہو گا۔ غالب کا کائنات فہم تبسم اور کبھی کبھی اس کا خندہ دندان نما، اردو شاعری میں اپنی فرح بخش، ہر مغز اور رمز شناس آفاق پیمائی کے لیے منفرد ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فارسی غزل میں غالب کا ٹھیل نسبتاً کائنات سے زیادہ اپنی ذات کا طواف کرتا ہو، (طواف نہ بھی کرتا ہو تو اس خیال سے اثر پذیر ہوتا ہو کہ سخنوری میں اقراں و امثال سے نبرد آزمائی کا موقع ہے)، اور اردو غزل میں یہ وضع التفات الٹ جاتی ہو۔ اردو میں اسے اپنے اسلوب میں کوئی حریف نظر نہیں آیا۔ یہاں غالب کو ناقدر دلی انیسائے زمانہ کے ہوتے ہوئے بھی اپنی فوقیت پر اعتماد ہے۔ لیکن فارسی غزل گو یوں کو کیا کیجیے کہ ہر ایک ایک اونچی سطح سے چٹک پرٹلا ہوا ہے۔ کسی کو اہل زبان ہونے پر ناز ہے۔ کسی کو سخن ساز ہونے پر اور غالب کو بزرگم ہے کہ ان کے مطالعہ اور مشق نے انہیں فارسی اللسان شعرا کی صف میں امتیاز کی جگہ دے دی۔ معاصرانہ چشمکیں ایک آدھ اردو معاصر کے ساتھ ہیں لیکن تقابلہ اور رشک و رقابت اور غزوہ مہا ہات کا کاروبار متاخرین شعرا کے فارسی کے ساتھ تھا۔

جہاں تک شعر گوئی کا تعلق ہے اہل زبان ہونے کی اہمیت کو نظر انداز کرنا شاید روانہ ہو۔ زبان اور انسان کو ایک نامیاتی وحدت مان کر چلنے میں ہی صواب ہے۔ جس طرح گھے اور زبان کی ساخت کسی دوسری زبان کے الفاظ کو خندہ پیشانی سے قبول نہیں کرتی اور ان میں تلفظ اور

لب و لہجہ کی کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور کرتی ہے، اسی طرح وہ ذہن جو اپنے معاشرہ اور تمدن کے زیر سایہ پلا بڑھا ہے وہ اپنے آپ کو دوسری زبان سے مربوط جذبات، اقدار طبع اور انداز فکر کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا۔ انسان دراصل اپنی ہی زبان میں سوچتا ہے اور تجربات کو اپنے حواس اور طریقہ اظہار کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ کسی اجنبی کے لیے اپنی زبان کو مقفل کر کے نئی زبان کو اپنے ہاں خانہ دل اور طعم خانہ دماغ میں بسالینا بہت مشکل کام ہے۔ شاعری، بے تکلف، بامحاورہ شاعری جو زبان کی سادگی اور اس کے مزاج کی ہمواری سے کسی غیر اہل زبان سے وجود میں نہیں آسکتی، اور اگر آئی بھی تو اس میں وہ روانی، بے تکلفی، شگفتگی اور آمد نہ ہوگی جو مادری زبان کی دین ہوتی ہے۔ اگر اس بات کو آپ تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہم کسی شاعر کے متعلق اہل زبان کی رائے کو ایک قلم نہیں کر سکتے تا آنکہ دو صورتوں میں سے ایک ہمارے علم میں نہ آجائے۔ (۱) اہل زبان کے ادب شناسوں کی اکثریت ایرانی عصبیت میں مبتلا ہے یا یہ گروہ شے لطیف سے محروم اور ذوق شعر سے معصوم ہے۔

ایرانی ناقد خسرو کے بعد کسی ہندوستانی شاعر کو تمام و کمال تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارے دور میں انھوں نے اقبال کو اپنے شعرا بلکہ بڑے شعرا کی صف میں جگہ دے دی ہے لیکن شمول کی وجوہات خارجی بھی ہیں۔ آیت خمینی کا ایران اقبال کا گرویدہ ان کے شعری محاسن کی وجہ سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ اس کی اسلامی فکر کی بنا پر ہمیں اقبال اور غالب دونوں کے سلسلہ میں اس بات کا انتظار کرنا پڑے گا کہ، ایرانی ناقدین کی رائے ان کے متعلق پایہ ثبات کو پہنچ جائے۔ قرآن یہ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کے رد عمل کے بطور مذہب سے شغف کم ہوگا۔ تو ایران میں اقبال کی مقبولیت گھٹے گی اور فکر شاعر کی پیچیدگی اور تخیل کی بالادستی کا جب شعور پیدا ہوگا تو غالب کی جسے ایرانی کوئی خاص درخور اعتنا نہیں سمجھتے قدر بڑھے گی۔ یہ بات یقیناً حیرت کی ہے کہ ایرانی نقد نے سبکِ ہندی کو منصب اعتبار کیوں نہیں دیا۔ کیا وہ شعر میں فکر کے پیچاک کو قبول نہیں کر سکتے؟

بد بار ہمیں احساس ہوتا ہے کہ غالب کے وہ اشعار جو پردہ بر انداز ہیں، جو زندگی کو دیکھنے پر کھنے اور تو جھنے کے نئے ڈھنگ سکھاتے ہیں جو تھوڑے سے نظموں میں بہت بڑی بات نہایت سلیقہ سے کہہ جاتے ہیں۔ جو دل میں اتر جاتے ہیں جن پر گماں ہوتا ہے کہ یہ تو ہمارے دل کی بات ہے جو روشنی اور رہبری کا کام دیتے ہیں جو ہمیں تحیر سے دوچار کر دیتے ہیں۔ اگر ایسے اشعار کو ڈھونڈنے لگیں تو رد و غزل کی



قلمرو میں جبقو کا دامن جلد ہی موتیوں سے بھر جائے گا کچھ تو اردو اشعار کی تعداد نسبتاً کم ہونے کے باعث کچھ کچھ اس بنا پر کہ فارسی غزلوں میں خواہی کر کے موتی نکال لانا وقت طلب ہوگا۔  
لیکن غالب کی فارسی غزلوں کا کوئی شعر جستجو کو ناکام نہیں لٹاتا۔ اظہار محبت کو نئے ڈھب اور دل پذیر چھب سے بات کہنا اس کا کیا ہے۔

بہر جامی خرامی جلوہ ات درماست پنداری  
دل از آئینہ داری ہائی شوق و دیدہ را ماند  
تم کہیں بھی محو خرام ہو۔ تمہارا جلوہ ہمارے دل میں ہوگا۔ ہمارے دل کا آئینہ کتنے شوق سے ہر لمحہ  
تمہاری تصویر اتار رہا ہے۔ دل گویا آنکھ میں بس گیا ہے جس کے سامنے ہر وقت تم ہی تم ہو۔  
منم بہ وصل پہ گنجینہ یافتہ دزدی  
کہ در ضمیر بود نیم پاس بالمش و لرزد  
وصال یار میں میری وہی کیفیت ہے جو ایک چور کی جو خزانہ تک پہنچ گیا ہو اور پاسبان کے خوف  
سے کانپ رہا ہو۔ غالب کی فارسی غزلوں میں مشاہدہ کا انعکاس اور اس سے استفادہ اردو غزل کی بہ نسبت  
زیادہ ہے۔

لبم از نام تو آں مایہ پرستی کہ اگر  
بوسہ ہر غنچہ ز غنم غنچہ نگین تو شود  
میرے ہونٹ تیرے نام سے اس قدر بھر گئے ہیں کہ اگر میں کلی کو پیار کر لوں تو نگین کی طرح  
اس پر تیرا نام نقش ہو جائے۔

بستہ درہ جرمہ آبی بہ سکندر  
در یوزہ گر سیکدہ مہیا بہ کدو برد  
چشمہ حواں سے سکندر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں ملا، اور میخانہ سے سائل کدو بھر کر شراب  
لے گیا یہاں آب حیات پر شراب ناب کو غالب نے اسی انداز سے تزیین دی ہے جیسے جام جم پر جام سفاں کو۔  
پیمانہ براں رند حرامت کہ غالب  
در بے خودی اندازہ گفتار نداند



غالب اس رند پرے نوشی حرام ہے جو پنی کر بہکنے لگے۔ پینے کے لینے صرف درکار ہے تاکہ نہ زبان بہکے نہ قدم لڑکھڑائیں۔ یہ شعر بھی غالب کے مسلک شاعری کی وضاحت کرتا ہے۔ زبان میں وزن اور الفاظ اور لہجہ میں وقار ہونا چاہیے۔ جذبہ کی طغیانی کو شعر کے شیشہ میں اس طرح اتارنا ہوگا کہ سطح پر سکون رہے۔

دل اسبابِ طرب گم کردہ در بندِ غم ناں شد

زراعت گاہِ دہقان می شود چوں باغ ویراں شد

عیش و طرب کے اسباب کھو کر دل روٹی کی فکر میں لگ گیا۔ باغ ویراں ہو جائے تو اس میں کھیتی کرنے لگتے ہیں۔ باغ سے مراد گل و گلزار ہے جو علامت ہے عیش و عشرت کی۔ زراعت گاہِ دہقان کا جوڑ بند غم ناں سے ہے۔ یعنی روزی کی فکر دامن گیر ہو جائے تو تخلیق کے سونے خشک ہو جاتے ہیں اس شعر میں بھی زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ صرف میں آیا ہے۔

چہ پرسی و بہ حیرانی کہ ہنگامِ تماشایت

نگہ از بے خودی بادرست و پاگم کرد و مژگاں شد

حیرت کا سبب کیا پوچھتے ہو، تم پر آنکھ پڑنی تھی کہ نگہ نے بے خودی میں ہاتھ پیر گم کر دیے اور بلکوں کی شکل اختیار کر لی۔ فرط حیرت سے سکتہ کا یہ عالم ہو گیا کہ نظر صرف مژگاں سے آگے نہ بڑھ پائی۔ کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب وہ نگاہیں دل کپار جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں بعض مصرعوں میں اضافتوں کا تواتر اور ہواالت گراں گزرتی ہے۔ ترکیب کی دولت نے فارسی زبان کو بے حد متمول کر دیا ہے اور جس طرح اردو نے فارسی ترکیب اور فارسی طرز ترکیب سے فائدہ اٹھایا ہے، ایسے استفادہ کی شاید دوسری مثال دنیا کی زبانوں میں سلسلے ترکیب اضافی و توصیفی خصوصاً اضافی تعییرات کی اصطلاح میں گویا بلڈنگ بلاکس ہیں۔ وہ خوش نما اور کارآمد جی بھی تک رہتے ہیں جب وہ ایک متعینہ حجم کا اتباع کریں اگر حجم زیادہ بڑھ گیا تو کیا عجب کہ معنویت بھی بڑھ جائے لیکن حسن اور شعریت، روانی اور شگفتگی، توازن اور تناسب میں کمی آجائے گی۔ غالب کی غزلوں میں ترکیب کبھی کبھی (گو کہ اس کی مثالیں زیادہ نہیں ہیں) جادہ، غتال سے ہٹ گئی ہے۔ لیکن یہ ایک بڑے کمال کا نقص ہے۔

غالب نے فارسی زبان و بیان، صوت و آہنگ، محاورہ اور طرز فکر اور ترتیب الفاظ پر غیر معمولی قدرت حاصل کر لی تھی۔ ان کی فارسی غزل کا ہر شعر اس کی شہادت دے رہا ہے کہ وہ فارسی کے مزاج شناس تھے اور اس میں قادر الکلامی کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ اس کے برعکس اقبال کو فارسی کے محاورہ اور طرز بیان میں زیادہ دخل نہ تھا۔ ان کی فکر کا تسلسل اور بلندی، جذبہ کا زور اور مضمون کا شکوہ ان کے اشعار کو ایک تیز روئندی کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ فارسی مضمون اور نظام فکر میں جذبہ ہو جاتا ہے اور اس کا دھیان زبان اور محاورہ کی طرف نہیں جاتا، اور مضمون خود بھی محاورہ اور زبان کی شاعری کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ غالب کی فکر کو فارسی شعر سے جو مطابقت اور موافقت اور فارسی آہنگ اور لب و لہجہ پر جو قدرت ہے اقبال اس سے بے بہرہ رہے۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ فارسی پر غالب کا عبور اہل زبان کے مادی یا ان کی طرح بے محابا تھا۔ فارسی غزل میں انھیں اردو کے مقابلہ میں ہمیشہ زیادہ کوشش کرنی پڑی اور اس میں شک نہیں کہ یہ کوشش بہار کے برگ و بار لائی۔ فارسی نثر انھوں نے اس وقت ترک کی اور اردو میں نثر لکھنا شروع کی جب ان کے قوائم اضمحلال آ گیا۔ لہذا نافع کو اس نتیجے سے مفر نہیں کہ غالب کی فارسی غزل میں کوشش کا اثر اردو غزل سے زیادہ ہے۔ اس کے معانی و مضامین کے پیچ و خم پر کہیں کہیں آورد کا سایہ پڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ قیاس کرنا شاید بعید از حقیقت نہ ہو کہ فارسی غزل انھوں نے اس طرح آزادانہ اور مختلف بالطبع ہو کر نہیں کہی جس طرح کہ اردو غزل۔

موازنہ تاہم یہاں ختم نہیں ہوتا۔ فارسی غزلوں کا جتنہ جتنہ، حظ اندوزی کے انداز سے اور خوش خرامی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو سیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ ہر شعر میں گنجینہ معنی کا طلسم نظر آتا ہے جس قدر غور کیجیے گئے مفہام الفاظ کے پردوں سے جھانکنے لگتے ہیں جو کچھ کہا ہے اور جو کچھ کہنے سے رہ گیا ہے ان دونوں کی آویزش کی دھوپ چھاؤں اور الفاظ و افکار کا جذبہ اور اور احساس سے ٹکراؤ، اشعار کو رہکا دیتا ہے، چمکا دیتا ہے۔ جا بجا آہگینہ تندگی صہبا سے پگھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

ردیف کے بارے میں یہ بات کانوں میں پڑتی چلی آئی ہے کہ ردیف کا غیر معمولی ردیف کا، برتنا بہت دشوار ہوتا ہے، اور ردیف قادر الکلامی کا ایک پیمانہ ہے۔ ردیف شان کچھ کلاہی کے

ساتھ آتی ہے اور اپنے ہم نفسوں سے آداب و کورنش کا تقاضہ کرتی ہے۔ شاعر کو ردیف کی ٹوک پلک درست رکھنے اور اس کے لفظی و معنوی تشخص کو برقرار رکھنے اور نمایاں کرنے کے لیے داد ملتی ہے۔ ردیف دب گئی تو شاعر کی کور بھی دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض اوقات شاعر خود ردیف کے بوجھ کے نیچے دب جاتا ہے۔ ردیف تخیل کی پرواز اور تکمیل مضمون کی راہ میں حائل ہونے لگتی ہے۔ ردیف کو غالب نے فارسی غزلوں میں تسلسل اور آہنگ کے لیے استعمال کیا ہے۔ غزل کے مزاج کا تقاضہ ہے کہ ہر شعر ایک نئے مضمون پر ناز سے سراٹھاتا ہو نظر آئے۔ غالب کی ردیف اردو میں کم فارسی میں زیادہ ان سرافراشتہ اشعار کو انفرادیت کی بے اعتدالی اور بے راہ روی سے بچاتی ہے۔ ان کو تسن بیان زور بیان اور صوت و معنی کی یک رنگی کی لڑیوں میں پرو دیتی ہے۔ ان کو وہ غزل گیر معنویت اور تسلسل اور ہم آہنگی دیتی ہے جو مختلف اشعار کے انفرادی معنی و مفہوم سے بالاتر ہوتی ہے۔ انفرادی معنی اور اجتماعی کیفیت دونوں کو ساتھ لے کر چلنا، اس طرح چلنا کہ دونوں کے ٹکراؤ سے چنگاریاں اڑتی چلیں۔ لیکن نہ اشعار کی انفرادیت جھلس پائے نہ غزل کے مجموعی حسن اور کیف پر آنچ آئے، غزل کوئی کا یہ ملکہ سرافرازان سخن کو آسانی سے میسر نہیں ہوتا۔ غالب کی فارسی غزل میں یہ ملکہ اپنی پوری تاب و توان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

اردو میں بھی کچھ غزلیں اس رنگ و آہنگ سے کہی گئی ہیں لیکن اس دشوار گزار راہ میں اردو زیادہ دیر تک شاعر کا ساتھ نہیں دے پائی۔ غالب کی اردو غزل ان کی فارسی غزل کی طرح طرح سے احسان مند ہے۔ اس کے محاسن بلکہ رنگ و آہنگ اور ساخت اور اٹھان اور طرز ادا بڑی حد تک فارسی سے متاثر اور مستعار ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں فارسی کو معنویت، وسعت اظہار، اور سبک روی کے لیے استعمال کیا ہے۔ غالب نے فارسی میں غزل اس لیے کہی، منہج اور وجوہ کے، کہ فارسی ان کی طرز ادا کے پر پیچ و خم قول، تہ بہ تہ معنویت، افکار کی آمیزش و آویزش، مفاہیم کے تصادم و اختلاط، جزو گل کے درمیان ٹکراؤ اور ارتباط، الفاظ اور نبوہ الفاظ کے مابین تصادم اور نفایت توازن اور ملاطفت، افکار کی پرواز اور زبان کی سجاوٹ، اسیل معانی اور شکوہ الفاظ —

فارسی غزل کرا ہے بغیر ان سب کا بار اٹھا سکتی تھی۔ غالب کے فارسی کلام کو جبرِ جبروت، بت و رتج بالا حیات اور لطف لے لے کر بڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معاصرہ چشمک ہی نہیں تھی جس نے



ان سے کہلوا یا :

فارسی میں مابینہی نقش ہائی رنگ رنگ

بگنراز مجموعہ اردو کہ بی رنگ من است

میرا فارسی کلام دیکھو تاکہ تمہاری آنکھیں گوناگوں نقوش سے دوچار ہوں۔ اردو مجموعے سے

گزر جاؤ کہ فارسی دیوان کے سامنے وہ بے رنگ ہے۔

بلکہ یہ طغیان اختیار تھا جسے رقابت کا احساس بھی ناگوار ہوتا ہے۔ اس کے مقابل میں ہم اس شعر

کو رکھ سکتے ہیں۔

وہ جو کہے کہ رینختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

بظاہر ایک شعر دوسرے کے برعکس ہے لیکن دونوں شعر صرف حقیقت بلکہ شاعر کے احساس کے ترجمان ہیں

دوسرا شعر کہہ رہا ہے کہ غالب کو اردو شعر کہتے وقت آزادی، شگفتگی، روانی اور بے بندی کا احساس ہوتا ہے اردو میں

کھل کے بے تکلفی کے ساتھ بات کرتے تھے یہاں ظرافت بھی کبھی کبھی د آتی تھی۔ فارسی غزل میں ظرافت کو بارگم ہی

مٹا تھا۔ اردو میں غالب کبھی کبھی ہنسوڑ ہنسوڑ تو نہیں پر مذاق بن جاتے تھے۔ فارسی میں کیا نظم کیا نثر، و ہ

بیشتر متقطع رہتے تھے عبا و چنہ اور چو گوشہ ٹوپی کے ساتھ۔ اردو میں گھر کے ماحول میں ملل کا کرتے

پہنے ہوئے بے تکلف، بیٹھنے کا سا انداز تھا۔ غیب سے مضامین آنے کے لیے یہاں را ہیں

زیادہ کھلی ہوئی تھیں۔ وضع یہاں تین میں خوش خرامی کی سی تھی۔ اردو غزل کے بعض اشعار

اس بے تکلفی اور شوخی کی خبر لاتے تھے جو غالب کے اردو خطوط کو باغ و بہار بنا رہا ہے۔ موزون

کرتے وقت بعض اوقات دردی اور مصیبت کے فرق کا احساس ہوتا ہے۔ فارسی غزل میں بالعموم

زیادہ اہتمام ہے۔ اور اہتمام کی لائی ہوئی کاوشیں، بندشیں اور آرائشیں۔ البتہ ایک استثنا کا

ذکر کر دینا قرین انصاف ہوگا۔ بندشوں کے باوجود گرمی احتلاط کے اشارے یا صراحتیں فارسی غزل

میں زیادہ ملیں گی۔ اگرچہ مجموعے کے تناسب میں وہ پھر بھی نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔

غزل کا حسن اس آمیزہ یا ترکیب یا ایلمگم سے بہت فروں ہو جاتا ہے۔ جو مضمون آفرینی

اور آرائش کے درمیان ترتیب پاتا ہے۔ یہ آمیزہ بڑی کشمکش کے بعد شکل پکڑتا ہے۔ مضمون

اور تزیین کے مطالبات متضاد ہیں۔ دونوں اپنا حق زور و شور کے ساتھ مانگتے ہیں۔ ہر کام یہ

اندیشہ رہتا ہے کہ سجاوٹ اظہارِ مطالب میں حاصل نہ ہو جائے۔ لیکن یہ اندیشہ مستقل بالذات نہیں ہوتا بلکہ گرمی تخلیق کے اثر سے پگھلا پگھلا رہتا ہے۔ ان دونوں کی باہمی صلح کا پیش خیمہ جنگ ہے۔ شاعر کے خصوصاً ایسے شاعر کے، دماغ میں جس کا حافظہ اور جس کا تحت الشعور احساسات، جذبات، مشاہدے اور مطالعے اور تخیل کی بلا دست پروازوں سے مالا مال ہو، بے شمار تضادات، اور مضامین و مفاہیم کی کبھی نہ ختم ہونے والی نہیں سراٹھاتی ہوتی۔ یا جھانکتی ہوتی نظر آتی ہیں ان سب کو ذوقِ مناسب کے ساتھ نہایت اختصار اور غایتِ جہاں کے ساتھ ہونڈوں ترین پیرایہ بیان کا پیرہن دے دینا شاعر کی عظمت اور اس کی خلاقیت کی کسوٹی ہے۔ غالب کی فارسی غزل اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

فارسی دیوان کی غزلوں کو مطلع سے مقطع تک باریک بینی کے ساتھ پڑھ جائیے۔ ہر شعر انتخاب ہے۔ بھرتی یہاں متروک ہے۔ غزل کے مضامین اس کی ساخت کے تحت محدود ہوتے ہیں۔ پڑھنے وال حیران رہ جاتا ہے کہ اس کے باوجود تکرار ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ ہر مضمون میں ایک نئی راہ نکالی ہے لاریب کہ یہ مضمون آفرینی کا اعجاز ہے۔ غالب نے کہا تھا :

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔ ان کی طبع بندشوں اور رکاوٹوں کے درمیان سے کثرت مضامین و مفاہیم و احساسات کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لیے اس طرح سے گزر جاتی ہے جیسے بادِ صبا چمن سے یا رود ہار چٹانوں سے۔ اگر انصاف کی ترازو بد غالب کی فارسی غزل اور اردو غزل کو تولد جائے تو مضامین، آرائش، درو بست اور زور بیان کے لحاظ سے پہلی کا پلہ بھاری نکلے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کی غزل ہمارے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ہمیں زیادہ بھاتی ہے، ہماری سمجھ میں رہاں تک کہ مفہوم کی پہلی تہ کا تعلق ہے، نسبت آسانی سے آجاتی ہے۔ ہمیں خیر توں اور بصیر توں سے ہمکنار کرتی چلتی ہے؛ اور ہم اپنی زبان کا پرچم بھی بلند کرنا چاہتے ہیں۔ غالب کی فارسی غزل کا مجموعی وزن دیہاں حجم کی طرف اشارہ نہیں ہے جو دس گنا ہے، اردو غزل سے زیادہ ہے، اور تمول بھی۔ یہاں تخیل کی پرواز اور مضمون آفرینی کی مثالیں بھی زیادہ ہیں، لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اعلیٰ بصیرتیں، روشنیاں اور حیرتیں اردو غزل میں زیادہ ملیں گی۔ نواسے سروش سے واسطہ اردو غزل میں زیادہ پڑتا ہے۔ لیکن قادر الکلامی، درو بست، مضمون آفرینی، فضا بندی اور تسلسل اور تمول میں فارسی غزل اردو غزل پر بھاری ہے۔ یہ امید کر لے کو جی چاہتا ہے کہ ایران کے اربابِ ذوق کے مزاج کو سبکِ ہندی اور مضمون آفرینی، پہلوداری اور پنہاں نگاری اور

وہی آزمائی سے جو بعد رہا ہے وہ آگے چل کر کسی دور میں مٹ جائے اور غالب کی غزل کی توانائی اور معنویت اس پر ظاہر ہو جائے۔ انگریزی تنقید میں ظن و تخمین تجزیہ اور تحلیل کے معیار اور پیمانے بدلتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ کسی شاعر یا کسی دور کے شعرا بکمال قلم کی مقبولیت اور قدر۔ غالب کی فارسی غزل اس دیر فہم زود پشیمانی کی پیشمانی کا انتظار کرتی ہے۔

ہمارا مقصد اس وقت تخمینہ اور تبصرہ سے بڑھ کر تعارف اور رونمائی ہے۔ ہم اپنی یہی مانگی کے باوصف، تھوڑی دیر کے لیے اس پردہ کو اٹھا دینا چاہتے ہیں جس نے گزشتہ ۲۰ سال میں بالعموم اور پچھلے ۴۵ سال میں بالخصوص غالب کی فارسی غزل کو ڈھانک لیا ہے۔ غالب کی فارسی غزل کا سفر ہم قارئین کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑا بہت تبصرہ جو کیا گیا ہے یا کیا جائے گا اسے ٹی وی کی وضع پر سمجھے نہ کریڈٹ لو کے انداز پر۔ ہم اپنی بے بساطی اور تنک ذوقی کے باوجود آزاد اور رواں دواں ترجمے کے ذریعہ، لیل و نہار کے ڈالے ہوئے پردوں کو ہٹا کر، ہندوستان کے اردو داں طبقے کے سامنے غزل غالب کے ایرانی پیکر کی رونمائی کر رہے ہیں۔ "انا اورن" کا ہمیں حق تو نہیں، نہ اس کی صلاحیت لیکن نیت بخیر ہو تو کچھ پردہ کشائی کرنا ہی اچھا ہے۔ تو لیجیے غالب کے اور اشعار سنیں، ترجمہ کے ساتھ لیکن بدون تبصرہ۔ تبصرہ بالعموم سائبر ہوتا ہے، کاشف شاذ و نادر۔

نہی بینم در عالم نشاطی کا سماں مارا

چو نور از چشم ناینا ز ساعز رفت مہبارا

ہمیں دنیا میں کہیں خوشی نظر نہیں آتی، کیوں کہ ہمارے جام سے آسماں نے شراب اس طرح پوچھ لی ہے جیسے نابینا کی آنکھ سے روشنی۔ جھمیہ میں ندرت بھی ہے اور بے چارگی کا درد بھی مشتبہ کی پر تاثر معنویت کے آگے خود مشتبہ غفل ہے۔ یہاں تشبیہ کی عمومی ساخت کو الٹ دیا گیا ہے، جس نے حیرت کے تاثر کو دو چند کر دیا ہے۔

سراب آتش از افسردگی چوں شمع تصویرم

فریب عشق بازی می دہم اہل تماشا سا

مجھے دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ میرے دل میں محبت نے آگ لگا دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ آگ نہیں آگ کا دھوکا ہے۔ کیوں کہ میں بچہ کر رہ گیا ہوں اور میرا اصل تصویر کی شمع (یا شمع کی تصویر) کا سا ہے جس



میں گرمی نام کو نہیں۔ میں ہنوز دنیا کو اپنی سرگرمی عشق کا فریب دے رہا ہوں۔ سرابِ آتش کی ترکیب تاثر سے بھری ہوئی ہے۔ پیا سا جو ریگستان میں پانی کے لیے بے تاب ہے، اسے بہتے ہوئے دڑوں پر اچانک پانی کا گمان ہوتا ہے۔ وہ آنکھیں لگائے ہوئے اور زبان نکالے ہوئے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ جیوں جیوں وہ آگے بڑھتا ہے، سراب پیچھے ہٹا جاتا ہے۔ شاعر نے سراب کو پانی سے منتقل کر کے اس کی ضد آگ کے ساتھ پیوست کر دیا۔ شمع تصویر کی ترکیب اسی مفہوم کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ ہم شمع کو دیکھ رہے ہیں، لیکن وہ گرمی روشنی اور سوز سے محروم ہے۔

دلِ مایوس راتسکین ہر دن می توں دادن

چہ امید است آخرِ خضر و ادیس و میسار

شدتِ یاس میں عام انسان دل کو تسلی دے دیتا ہے کہ موت آجائے گی تو سارا بکھیرا ختم ہو جائے گا۔ خضر، ادیس اور میسار کو یہ راہِ عافیت، یہ سامانِ تسکین بھی میسر نہیں۔ ساری مصیبتوں کا خاتمہ کر دینے والی موت ان کی دسترس سے باہر ہے۔

جیسا کہ ہم آگے بھی دیکھ چکے ہیں، غالب کے تخیل کی یہ مخصوص کار فرمائی ہے کہ وہ فرد تری کو برتری میں بدل دینے کے پہلو نکال لاتا ہے۔ خضر پر ایک جگہ اور ترس کھا یا ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلقِ اسے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے  
لیکن ہم یکہ کر خاموش نہیں ہو سکتے کہ یہ شاعر کے تخیل کی شگرف کاریاں ہیں، وہ سیاہ کو سفید بنا سکتا ہے۔ بات اس سے زیادہ اہم ہے۔ اور اسے ذہن نشین کرانے کے لیے ہمیں غالب ہی کو یاد دہانا پڑے گا۔

عالم تمام حلقہ دامن خیال ہے۔

زندگی کھیل ہی خیال، فکرِ اقدار اور زاویہ نگاہ کا ہے۔ دیکھنے والے کے زاویہ نظر اور دیکھنے کے مقام اور ڈھنگ میں تبدیلی آنے کے ساتھ افراد اور اشیا کی اہمیت اور حیثیت بالکل بدل جاتی ہے، جن باتوں پر رشک کیا جاتا تھا وہ قابلِ رحم بن جاتی ہیں اور اس کے برعکس بھی۔ زندگی جو نقطہ نظر کے تحت اس قدر تغیر پذیر ہے، ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کے حوادث اور تربیحات کی بنا پر کوئی ملول آداس یا مایوس ہو، یا کسی شخص پر رشک یا اس سے حد کرے۔

ہر خراشی کز رشکِ تنم اقتد بردل  
در سپاس دم تیغِ تو ز بانست مرا

تم تلوار سے پیسا پے مجھ پر وار کر رہے ہو، میرا بدن گھاؤ کے داغوں سے بھر گیا ہے۔ دل کو میرے  
جسم پر رشک آ رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے، کاش تمہاری تلوار کے وار میرے نصیب میں ہوتے۔ گویا رشک  
وحسرت کا ہر داغ، ہر وہ خراکش جو میرے دل کو تمہاری ضربِ شمشیر سے محرومی کی بنا پر لگی ہے، ایک زبان  
بن گئی ہے۔ جو تمہاری تلوار کی دھار کی شکر گزار ہے۔ اگر تمہاری تلوار کی دھار سے لگی ہوئی خراش اتنی  
مطلوب و مرغوب نہ ہوتی تو دل اس کی حسرت سے خلش اندوز کیوں ہوتا۔ شکر و شکوہ، شادی و حرام،  
تشفی و محرومی کو شاعر کے کیا گرتیل نے، بہم شیر و شکر کر دیا ہے۔ گھاؤ کے نشان میں جو نگاہری مشابہت  
شاعر نے زبان کے ساتھ ڈھونڈی ہے۔ وہ اس کے تخیلی مشاہدہ کی نادر کاری پر دلالت کرتی ہے۔

چوں پری ناد کہ در شیشہ فروزش آرند

روئی خوبت بدل از دیدہ نہانت مرا

اس پری کی طرح جسے شیشہ میں اتار دیا جائے، تمہارا نگہ مرادل میں جلوہ فگن ہے لیکن آنکھوں سے  
پنہاں۔ تم چشمِ ظاہر سے اوجھل ہو اور چشمِ باطن کے روبرو۔

بی تو چوں یاد کہ در شیشہ ہم ز شیشہ جدا ست

نبود آمیزشش جاں در تن ما با تن ما

اس شعر میں الفاظ کی چابکا نہ طلسم بندی تو ظاہر ہے، لیکن مفہوم کی دلکشی اس سے بڑھ کر ہے۔  
شراب کو دیکھو کہ ساغر میں ہے اور ساغر سے الگ، انسان کا جسم ساغر ہے اور جان شراب۔ اگر تم نہ ہوتے،  
اگر تم سے محبت نہ ہوتی، اگر یہ محبت جان و تن کو پگھلانے والی نہ ہوتی، اگر آگینہ بندی صہبا سے نہ  
پگھلتا تو میرا بھی صہبا اور ساغر کا سہاں ہوتا، جسم الگ، جان الگ، دونوں ارتباط، اختلاط، آمیزش اور  
شیر و شکر ہونے سے محروم رہتے یہ تمہاری محبت ہے جس نے دونوں کو ملا دیا ہے۔ جان و تن کی دوئی  
اسی وقت تک بنی رہتی ہے جب تک کہ دل محبت سے محروم ہو۔

سخن ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر

نہ شود گردن سایاں ز بیم تو سخن ما



جو بات ہم کہنا چاہتے ہیں وہ غایت لطافت سے الفاظ میں نہیں ڈھالی جاسکتی۔ ہمارا شہ پہ فکر جب گرم سفر ہوتا ہے تو گرو بھی نہیں اٹھتی۔ اس کی تیز گامی سبک سیری کی ہمعناں ہے۔ وہ جب گرم چوٹاں ہوتا ہے تو پاؤں زمین پر نہیں رکھتا۔ ہوا میں اڑتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ انسان کی فہم اس تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ ہماری فکر فلک اس تک نہ ہمارے خامہ گہر بار کی رسائی ہے۔ نہ طاقت گویائی کی۔ غایت لطافت سے ہمارے بیشتر افکار قلمبند نہیں ہو پاتے۔ وہ ہمارے نسبتاً کم لطیف افکار ہوں گے جنہوں نے شعر کا قالب اختیار کر لیا ہے۔

شرقی تخیل کو حسنِ تعلیل بھاتا ہے۔ غالب کے یہاں اس کی مثالیں بار بار سامنے آتی ہیں:

طوطیاں رانہ بود ہرزہ جگر گوں منقار

خوردہ خون جگر از رشک سخن گفتن ما

طوطیوں کی چونچ مفت میں اور رنگ نہیں ہو گئی ہے۔ شیریں زبانی کے ہوتے ہوئے وہ ہماری حلاوتِ سخن کو نہ چھو سکیں۔ جن میں ان کا جگر خون ہو گیا، انہوں نے شدتِ محرومی میں اپنے جگر کو اپنی چونچ سے چھید ڈالا۔

افتخار کی بے اگلے شعر میں اور تیز ہو گئی ہے۔

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد دفن ما

غالب اس حیثیت پر ہم راضی نہیں تھے، نہ ہمارا کوئی ارادہ تھا شاعری کے منصب کو قبول کرنے کا۔ لیکن خود شعر نے خوشامد کی کہ ہمیں قبول کر لیجیے تو مجبور ہو گئے۔

خاکِ وجودِ ماست بخون جگر خمیر

رنگینی قماشِ غبارِ خودیم ما

ہمارے وجود کی مٹی جگر کے خون سے گوندھی گئی ہے۔ اپنے غبارِ وجود کے پیرہن کی رنگینی ہم سے ہے۔ یعنی اگر محبت نے ہمیں جگر خون کرنا سکھایا ہوتا تو ہماری ہستی مٹی خاکی سے زیادہ نہ ہوتی۔ ہماری ہستی اور ہستی کائنات میں بہارِ خون جگر سے دردِ دل سے آئی ہے۔ شاعر کی رنگینی تخیل اور سرعتِ فکر کو کیا کیسے۔ استعارہ سے استعارہ سراٹھاتا ہے۔ فکر کی معنی آفریں دردِ بے ست میں غالب کی

و اسی غزل ان کی اردو غزل کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔

غالب جو شخص عکس در آئینہ خیال

باخوشتن یکے و دو چار خود یکم ما

غالب، ہمارا حال انسان اور اس کی پرچھائیں کا سا ہے۔ خیال کے آئینہ میں ہم اپنا عکس دیکھتے ہیں۔

ہم اور ہمارا وجود ایک ہے لیکن ہم اپنے روبرو بیٹھے ہوئے ہیں۔ سبک صنعتی کی شان دیکھیے۔

زخوی تست نہاد شکیب ناز کشر

بیا کہ دست و دلم می رود ز کار بیا

صبر کا مزاج تمہارے مزاج سے بھی زیادہ نازک ہے۔ آجاؤ کر میرا ہاتھ اور میرا دل کام سے

جار رہا ہے۔ آجی جاؤ۔

وداع و وصل جدا گانہ لذتی دارد

ہزار بار برد صد ہزار بار بیا

جدائی اور ملاپ کا مزہ الگ الگ ہے۔ ہزار بار جاؤ، لاکھ بار آؤ

خوش را چوں موج گوہر گر چہ گرد آوردہ ام

دل پُر است از ذوق انداز پر افشانی مرا

عاشق کی شخصیت محبت کے فشار میں اگر بکھرنے والی ہے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال رہا ہے۔

میں نے اپنے آپ کو موتی کی لہر کی طرح سمیٹ لیا ہے۔ جمع کر لیا ہے۔ ورنہ دل تو فرط بے تاب ہے کچھ جانے

پر تلاح ہوا ہے۔

تذلل بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم

گر بہ موج افتد گمان چین پیشانی مرا

میں پیاس سے بے تاب ہوں اور پانی کی تلاکشش میں ندی کے کنارے پہنچا ہوں لیکن

ہمیری نگاہ اچانک ان شکنوں کی طرف گئی جو ندی کی پیشانی پر پڑ رہی تھیں۔ غیرت نے اپنے نیزے

کھینچ لیے۔ پھر کے پار کر دی۔ غیرت مند انسان انتہائی مجبوری کی حالت میں بھی غیرت پر آنکھ نہیں آنے

دیتا۔ ندی کے ہاتھوں تحقیر برداشت کرنے سے تو میں پیاس سے جان دینے کو بہتر سمجھوں گا۔

نگشت از سجدہ حق جبہ ز تہاد نورانی

چناں کا فروخت تاب بادہ روئی باہ خواراں را

بارگاہ خداوندی میں سجدہ کرنے سے عبادت گزاروں کی جیس اتنی نورانی نہیں ہو پائی جتنا روشن  
صہبائے ناب نے مے خواروں کے چہروں کو کر دیا۔ تخیل نے پھر قدروں اور نقاط نظر کو فرج بخش انداز  
سے الٹ کر رکھ دیا ہے۔

سوار تو سن نازست و بر خاکم گزر دارد

ببال ای آزد چنداں کہ دیایی رکابش را

محبوب سمند ناز پر موار ہو کر میری قبر پر سے گزر رہا ہے۔ اسے نخل آرزو تو بڑھ کر اس کی رکاب کو  
چوم کیوں نہیں یثتا۔ دیکھیے یہاں سارا ساندو سامان خیالی ہے۔ یہ ساری کار فرمایاں تخیل کی ہیں۔ میں  
نے اس کی محبت میں جان دے دی، لیجیے سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا۔ وہ نازداندان کے ساتھ  
میرے سر ہانے سے گزر رہا ہے۔ انسان کے لیے کوئی وضع منظر افتخار اس قدر نہیں ہوتی جتنا گھوڑے  
پر سوار ہونا۔ تو کسن ناز خود ایک معنی خیز استعارہ ہے۔ ناز ایک طرف حسن و شباب پر، دوسری  
طرف تسخیرات پر کہ ہماری محبت میں عاشق نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ فتراک میں ایک  
تجئیر کا اضافہ ہوا۔ لیکن محبت ہار ماننے والی نہیں۔ عاشق نے قبر میں کروٹ لی اور آرزو کو پکارا کہ اپنی  
پوری قامت کو پا جا، اٹھ اور محبوب کے گھوڑے کی رکاب کو چھو لے۔ دوسرا استعارہ شجر اور نمو سے ہے۔  
رکاب کو چھو لینے یا پا جانے میں احترام اور اشتیاق دونوں شامل ہیں اور بالیدن میں اشتیاق اور  
بے مانی اور یہ آرزو کہ محبوب کے تو کسن کو روک لیا جائے، اسے جانے نہ دیا جائے۔

چمن طراز جنونیم و دشت و کوہ از ماست

بہ مہر داغ شقایق بود قبا لہ ما

جنون محبت کے چمن کی بنا ہم نے ڈالی ہے۔ پہاڑ اور صحرا ہماری جاگیر ہیں۔ چٹاں چہ ہماری ملکیت  
کی دستاویز پر لالہ کے داغوں سے تھری لگی ہوئی ہیں۔ جنون کی چمن طرازی، اور دستاویز پر چروں  
کا ثبت ہونا ہمیں ایک ہی لمحہ میں عالم فطرت اور ایوان عدالت کی سیر کرا دیتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ  
محبت اور جنون کی اقاہیم پر ہماری حکمرانی مسلم ہے۔ زمین شعر سے استعارے لالہ ساں سر اٹھارہ ہیں۔

حشرِ مشاقاں ہماں برصحتِ مزگاں بود  
سرز خاک تویشتن چوں سبزہ می رویم ما

تمہاری دید کے مشاق قیامت کے روز پلکوں کی شکل میں اٹھیں گے، یعنی خاک پر سبزہ کی طرح اگیں گے۔ جیسے دنیا سبزہ سمجھ رہی ہے وہ عشاق کی پلکیں ہیں۔ تمہارے عاشق زندگی بھر تک لگائے ہوئے نہیں دیکھتے رہے۔ ادب نے لگا ہوں کو مزگاں بنادیا۔ یعنی وہ پلکوں سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ مرنے کے بعد ان پلکوں نے جو قلیلِ حسرتِ تمنا تمہیں سبزہ کی شکل اختیار کرنی اور وہ اسی طرح تمہاری جانب نگراں ہیں۔

نویذِ التفاتِ شوقِ دادم از بلا جاں را  
کندِ جذبہ طوفاں شمر دم موجِ طوفاں را

مصیبت آئی تو میں نے خود کو بشارت دی کہ محبوب میری طرف ملتفت ہو رہا ہے۔ موجِ طوفاں کو میں یہ سمجھا کہ طوفاں نے مجھے اپنے پاس کھینچنے کے لیے کند پھینکی ہے۔ موجِ طوفاں پر شاعر کو کند کا گمان ہوا۔ (ساحل پر لہروں کو آتے ہوئے جنموں نے دیکھا ہے وہ اس استعارہ کی موزونیت کو داد دیں گے) کہ اس کی طرف کشش چلی آرہی ہے۔ طوفاں کے مرکز یا قلب میں گرد و پیش کی استیا کو اپنے اندر گرداب وار کھینچ لینے کی جو طاقت ہے وہی کند آسائری گردن کا پھندا بن گئی ہے اور مجھے اپنی جانب کھینچے جا رہی ہے۔ مجھ پر بلا آئی تو میں سمجھا کہ یہ جفا پیشہ محبوب کی نگہ التفات ہے۔

بچرم تابِ ضبطِ نالہ با من دادری دار و  
ز شوخی می شمارد زیر لب ذر دیدن افغاں را

محبوب میرے خلاف دادرسی چاہتا ہے۔ جرم یہ ہے کہ میں نے نالہ کو ضبط کیا۔ اس کے حضور نالہ کھینچنا میں بے ادبی سمجھتا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ میں نے اس کا وار خالی کر دیا۔ نالہ ہونٹوں تک آگیا تھا میں نے اسے ضبط کیا، دبا یا تو ہونٹوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ وہ یہ سمجھا کہ میں مسکرا رہا ہوں، اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ اس کے اقتدارِ حسن کی تحقیر کر رہا ہوں۔

تکلف بر طرف لب تشنہ بوس و کنار ستم  
ز را ہم باز چیں دامِ نواز شہائی پہناں را



دھکی چھپی عنایتیں بہت ہو گئیں، دل بھانے کے طریقے بھی ہم نے دیکھ لیے۔ ان سے دل بھر گیا۔ ان کا وقت گزر گیا۔ ان کے جال کو میرے راستے سے ہٹا لو۔ ایسی عنایتوں سے میری تشفی ہو چکی۔ ان سے تو بے تابی اور بڑھ جاتی ہے۔ ان منزلوں سے تو میں پہلے ہی گزر چکا ہوں۔ اب مجھے تکلف ہر طرفہ بوجھ سے درکنار درکار ہیں۔ وہی مجھے دو۔ ہر بات کا ایک عمل ہوتا ہے۔ وہ دور ایک عرصہ ہوا گزر گیا جب تم در پردہ مجھے موہ لینے کے لیے عنایتیں کیا کرتے تھے۔ اب ہمارا معاملہ اس سے آگے بڑھ چکا ہے۔

چمن سا ماں جی دارم کہ دارد وقت گل چیدن  
خرامی کنز ادائی خویش پر گل کردہ داماں را

میرا حشر ماں محبوب اپنے ساتھ چمن لے کر چلتا ہے۔ جب وہ گل چینی کے لیے نکلتا ہے تو اس کا دامن تو بعد میں بھرتا ہے۔ پہلے اس کے پرستار اس کی خوش خرامی کے پھولوں سے اپنے دامن بھر لیتے ہیں۔

دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقش پا      موجِ خرامِ ناز بھی کیا گل کتر گئی  
لیکن فارسی کا یہ شعر اردو کے مذکورہ شعر سے باوجود اس کی بے ساختگی کے زیادہ دلکش اور متمول ہے۔

کبابِ نو بہا ندر تنورِ لالہ می سوزد

چہ فیض از میزبانِ لالہ بانی پیشہ بہاں را

محبوب نے عاشق کو دعوتِ گل گشت دی ہے لیکن وہ خود اتنا لڑھکھ اور لاپرواہ ہے کہ لالہ کے تنور (لالہ کی شکل اور اس کے دہکتے ہوئے سرخ رنگ کو دیکھ کر اس پر تنور گماں ہوتا ہے) میں نوخیز بہار کا کباب جل کر کولہ ہو گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ بیچارے مہمان کے لیے اب کیا بچا۔ لالہ کی تڑپ میں جو سیاد نشان ہے اسے کولہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

نہ باشد دیدہ تاحی میں مدہ دستوری اشکش

چو گوہر سنج کو پیش از گہر سنج ترا زو را

جب تک کہ آنکھ حق میں نہ ہو جب تک کہ وہ سچ اور جھوٹ، بھلے اور برے میں امتیاز نہ کر سکتی ہو، اس وقت تک اشکوں کو اجازت نہ دو کہ وہ آنکھ میں داخل ہوں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ موتیوں کا سوداگر موتی کو کلنٹے میں رکھنے سے پہلے المینا کر لیتا ہے کہ کاٹھا سچا ہے۔ آنسوؤں کی اس سے زیادہ ناقدری

اور سوائی کیا ہوگی کہ وہ ان آنکھوں میں دکھائی دیں جو حق شناس نہیں۔ جو نہ سچی ہیں نہ سچ کو پہچان سکتی ہیں۔ ترازو اگر سچی نہیں ہے تو تول لامحالہ غلط ہوگی۔ معمولی اجناس میں کچھ میر پھیر ہو جائے تو گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن آنسو جیسے بے ہاگو ہر کو تو لے کے لیے ہمیشہ شرط ہوگی کہ ترازو سچی ہو۔ وہ آنکھیں تھپاک ہیں اور حق شناس نہیں ہیں وہ صرف ریائی آنسوؤں اور جھوٹے موتیوں کے لیے موزوں ہیں۔ استعارہ کی بلاغت، پاکیزگی، سادگی، خوب صورتی اور تاثیر بر کوئی تبصرہ کرنا بیکار ہوگا۔

حسرت وصل از چہرہ چوں بہ خیال سرخو شیم

ابراگر بہ ایستد بر لب جو ست کشت ما

ہم تو محبوب کے خیال میں سرشار ہیں، ہمیں وصال یار کی حسرت کیوں ہونے لگی۔ ابراگر تھم بھی جائے رگ جائے، نہ برے تو بھی ہمارا کوئی خاص نقصان نہ ہوگا۔ ہماری کھیتی تو نہر کے کنارے سے ہے، اسے نمی کی کیا کمی۔ ہمارے لیے ہمارا تخیل حقیقت سے بڑھ کر ہے۔ محبت کی اپنی الگ دنیا ہے، بیرونی عناصر اور اثرات سے بے نیاز۔ محبوب کی آمد کا انتظار وہ شخص کیوں کرے جس کا تخیل محبوب سے ایک پہل کے لیے بھی جدا نہیں ہوا۔ وصل کی خارجی شکلیں نو گرفتاروں، نو آموزوں کو مبارک ہوں، جو ابھی تک نہ اپنی ہستی کو مٹا سکے ہیں نہ فاصلے کو۔ ہم تو ہر لمحہ خود کو اس کے رو برو پاتے ہیں۔

گر ہر و گر کیں ہم از دوست قبول ست

اندیشہ جز آئینہ تصویر نما نیست

خواہ محبت ہو خواہ عداوت دوست سے جو کچھ ملے ہم اسے بخوشی قبول کرتے ہیں۔ ہمارا دل ایک آئینہ ہے جو ہر تصویر کو اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے خواہ وہ اچھی ہو خواہ بُری۔ آئینہ اس شکل کو جو اس کے سامنے آتی ہے، بلا تامل اور بے کم و کاست قبول کر لیتا ہے۔

شکستہ رنگ تو از عشق خوش تماشا نیست

بہارِ دہر بہر رنگینی خزاں تو نیست

عشق میں تمہارے رنگ کا اڑنا قابل دید ہے۔ تمہاری خزاں پر دنیا کی بہاریں قربان

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا۔ رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے۔

مضمون دونوں شعروں میں مشترک ہے لیکن اردو شعر میں فارسی شعر جیسی نہ معنویت ہے نہ زور نہ

ستم کشیں سرِ ناموس جوئی خویشتم  
کہ تاز جیب برآمد بہ بند دستار است

میرا سر جسے حفظ آبرو کا سودا ہے مجھ پر ظلم ڈھارہا ہے۔ گریباں کی قید سے نکلا تو دستار کے  
بند میں گرفتار ہو گیا۔ غم سے رہائی ملی تو نخوت نے دامن پکڑ لیا۔

بہ قامتِ من از آوارِ گیت پیر ہنری  
کہ خارِ رہگزشتش پود و جادہ اش تار است

آوارہ گردی کے طفیل میری قامت پر وہ قہار است آئی ہے جس کا تانا بانا کتا ہے اور بانا رستے  
کے کانٹے۔ جو اس اہلِ تخیل، شاہدہ اور اندیشہ عجب حسین انداز سے دست دگریباں ہیں۔ ایسے  
اسالیب تک غالب کے سوائے کس کو دسترس ہے؟

بیا کہ فصل بہار است دگل بہ صحن چمن  
کشادہ روی ترا ز شاہدان بازار است

آبھی جا کہ فصل بہار آگئی اور صحن چمن میں گلاب شاہدانِ بالائیش سے بھی کچھ زیادہ ہی بے حجاب  
اور بے نقاب نظر آتے ہیں۔ تشبیہ کی سمت کتنے دل نشین انداز سے بدل دی ہے۔

قوی قادہ چون بیت ادب جو غالب

ندیدہ کہ سوئی قبلہ پشتِ محراب است

اگر نسبت مضبوط ہو تو ادب کا اہتمام لازم نہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ محراب کعبہ کی طرف پیٹھ کیے  
ہوئے ہے؟ شاہدہ کے سرچشمہ سے شعری استدلال کی لہریں بہ آسانی نکالی جاتی ہیں۔ مضمون آفرینی  
نے غالب کے اشعار میں جو بہت سے بہر و پ بھرے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے۔

تا در آب افتادہ عکسِ قد و بویش

چشمہ بھجھو آئینہ فارغ از روانی ہاست

جب سے اس کے قد و لکشم کا عکس پانی میں پڑا ہے، چشمہ آئینہ کی طرح حیران اور  
ساکت رہ گیا ہے۔

سے نوش و تکیہ بر کرم کردگار کن  
خطِ پیالہ سار قم چوں و چند نیست  
جی بھر کے پیو اور پروردگار کے کرم پر بھروسہ رکھو۔ کیسے اور کب تک کی عبارت پیالہ کی لکیر  
میں ہے ہی نہیں۔ پیالہ کی لکیر کو صراطِ مستقیم سمجھ کر اس پر چلو۔

شوخی اندیشہ خویش سر تا پایِ ما  
تار و پودِ مستیِ ما ہیچ و تابانی بیش نیست  
ہمارا سراپا، ہمارا سارا وجود منحصر ہے ہماری فکر کی شوخی اور تازگی پر۔ ہمارے جامہٴ مستی کا تانا بانا  
ہیچ و تاب کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی نام ہے ہیچ و تاب اور حرکت کا۔ زندگی عبارت ہے گرمی فکر سے۔  
اہل ذوق غالب کے مصرع پر کہ عالم تمام حلقہٴ دام خیال ہے۔ سردھنتے چلے آئے ہیں۔ لیکن شوخی اندیشہ  
و اے شعر کے آگے وہ پھیکا اور ہلکا نظر آتا ہے۔ لاریب کہ یہ بیان کا اعجاز ہے۔

ہم بہ قدرِ جوششِ دریا تو مند است معرج  
تبغِ سیراب از روانیِ بانیِ خونِ بسمل ست  
موج اتنی ہی قداور ہوتی ہے جتنا دریا میں جوشش ہوتا ہے۔ شمشیرِ سیراب ہوتی ہے بسمل  
کے خون کی روانی کے بقدر۔ موج کا شمشیر سے استعارہ بر سبیل محاکات تو ہے ہی۔ لیکن جوششِ  
دریا اور روانیِ خونِ بسمل میں شاعر نے جو مماثلت ڈھونڈی وہ قضا و قدر کے اسرار کی طرف اشارہ کر رہی  
ہے۔ بسمل کے تڑپنے اور موج کے تڑپ کر ساحل کی طرف بڑھنے میں جو مشابہت ہے غالب کے  
مشاہدہٴ تخیل آگیاں سے مخفی نہیں رہی۔ نظام کائنات میں انسان اور قدرت کے مابین جو ہم آہنگی ہے  
وہ ظاہر میں نظروں سے لاکھ پہناں رہے شاعر کی خارا شکاف اور آفاق گیر نگاہ آسے فکر کی ایک اڑان  
میں پا جاتی ہے۔

شادم ز دردِ دل کہ یہ مغزِ خکیب ریخت  
نومیدی کہ راحتِ جاوید بودہ است

میں اپنے دل کے درد سے خوش ہوں کہ اسی نے صبر کے دماغ میں اس ناامیدی کو پیوست  
کر دیا جو میرے لیے لازوال راحت بن گئی۔ مایوسی نے مجھے امید و بیم کے مد و جزر اور خلفشار سے چھٹکارا



سرمایہ ہر قطرہ کہ گم گشتہ بہ دریا

سودیت کہ مانا بزیانت و زیاں نیست

وہ بوند جو سمندر میں گم ہو گئی اس کا سرمایہ وہ نفع ہے جو بظاہر نقصان نظر آتا ہے لیکن دراصل نقصان ہے نہیں۔ بوند نے بظاہر ٹوٹنے کا سودا کیا، وہ اپنا وجود سمندر میں داخل ہو کر کھو بیٹھی لیکن پہلے وہ ذرا سی بوند تھی، اب بحرِ زخار بن گئی ہے۔ کھوئی اس نے ایک بوند اور پا گئی سمندر۔

در شاخ بود موج گل از جوش بہاراں

چوں بادہ بہینا کہ نہانت و نہاں نیست

بہار کے اٹھ سے موج گل شاخ شجر میں رواں رواں ہے۔ مینا میں صہبا کی طرح جو پہنا ہے۔ بھی اور نہیں بھی۔ شاعر اس جوشِ نو، اس شوقِ اظہار کا تصور کر رہا ہے جس کی حامل بہار ہے۔ وہ بہار جو شاخ شجر کی نونوں میں رس کی طرح رواں رواں ہے۔ جوش بہاراں کا عالم صہبا کا سا ہے جو مینا میں مستور ہے اور اس میں سے جھلک بھی رہی ہے۔ جوشِ نو اور ذوقِ بہار جب اظہار پر آمادہ ہوتا ہے تو شاخ پھولوں سے لد جاتی ہے۔ بو جھل ہو جاتی ہے۔ کو نیلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ کلیاں چٹکنے لگتی ہیں، پیڑ لہلہانے لگتے ہیں۔ گو یا قدرت اعلان کر رہی ہے کہ چمن میں بہار آگئی ہے اور اظہار کے لیے بے قرار ہے۔

عنت بہ شہرِ شیخوں زناں بہ ننگِ خلق

عس۔ بخانہ و شرہ در حرم سرا خفت است

ایسے میں جب کہ کوتوال گھر میں اور بادشاہ حرم سرا میں محو خواب ہے۔۔۔ ترجمہ کرنا اس شعر کا خون کرنا ہے عجب کیفیت ہے اس شعر میں، تشریح و توضیح سے بالاتر۔

بہیں ز دور محو قریب شہ کہ منظر را

دریچہ بازو بہ دروازہ اژدہا خفت است

پہلے شعر کی طرح یہ بھی حظ اندوز ہونے کے لیے ہے، بغیر ترجمہ کے دخل در معقولات کے۔

خود اولیں قدح می نوش و ساقی شو

کہ آخر از طرف تست اگر حجابی ہست

اٹھ کر پہلا ساغز کیوں نہیں پی لیتے، خود ساقی کیوں نہیں بن جاتے، تکلف اور تامل تمہاری طرف سے کیوں ہو۔ شاد نے بعد میں اسی طرح کی بات کی۔

یہ بزم ہے یاں کوئلہ دستی میں ہے محرومی جو خود بڑھ کر اٹھالے ہاتھ میں یہ اسی کلمہ

بہار ہند بود بر شگال یاں غالب

دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابی ہست

برسات ہندوستان کا موسم بہار ہے۔ گویا اس خزاں آباد میں بھی ایک فصل نے نوشی کی آتی ہے۔ ہندوستان میں فارسی کے پہلے اہم شاعر امیر خسرو کو ہندوستان سے واہانہ عقیدت تھی۔ یہی بات فارسی کے آخری اہم ہندی شاعر کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی غالب ہندوستان کے موسم سے ہدگاں تھے، اور یہاں کے باشندوں کو وہ ذوق شعر سے بالعموم عاری سمجھتے تھے۔

ہجوم گل بہ گلستاں ہلاک شو قم کرد

کہ جانساندہ وجاے تو ہچناں خالی ہست

چمن میں پھولوں کے ہجوم نے میرے دل میں تیری چاہت کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ چمن پھولوں سے پٹا پڑا ہے، تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے، لیکن تیری جگہ ہنوز خالی ہے یعنی تیری جیسی زرب زینت، عنائی اور بال کا ایک پھول گلستاں میں نہیں، گلستاں پھولوں سے کچھا کھینچ بھرا ہوا ہے۔ تیری جگہ بھر بھی خالی ہے، عجب ماجرا ہے۔

ایمنیم از مرگ تا تیغت جراحات بارہست

روزی تا خوردہ مادرچہاں بسیار ہست

جب تک تمہاری شمشیر جراحاتیں برسا رہی ہے، اس وقت تک ہمیں موت سے کوئی خطرہ نہیں ہے ہماری روزی ہی وہ جراحاتیں ہیں جو تم ہمیں پہنچا رہے ہو۔ اور ابھی جراحات پہنچانے کے نہ معلوم کتنے پہلو ہیں جو تمہاری تہوار کے پھل میں مخفی ہیں اور نکلنے کے لیے بے چین۔ یہی جراحاتیں ہماری روزی ہیں۔ جب تک ہماری روزی ہے ہمیں کون مار سکتا ہے۔

در خموشی تابشِ روئی عرقِ ناکشِ بگر

تا چہا ہنگامِ سرگرمی گفتار ہست

وہ خاموش ہے اور پسینہ کے موتی اس کے رخِ تابناک پر چمک رہے ہیں۔ خموشی میں جب یہ کیفیت ہے تو گرمی گفتار کے وقت کیا عالم ہوگا، یا یوں کہیے کہ نہ معلوم دل ہی دل میں کیا کیا باتیں ہو رہی تھیں، کیا خواب دیکھے جا رہے تھے، جن کی گرمی رخِ تابناک پر چمک آئی ہے۔ جگر نے اس یا اس سے ملتی جلتی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

ہم سے پوچھا ہے نامح دل گرفتگی ان کی ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالم پر آب ان کا

کام نہ بخشیدہ ای گنہ چہ شماری

غالب مسکین بہ التفات نیرزد

پروردگار تو نے میری کوئی مراد پوری نہیں کی۔ اب میرے گناہوں کا شمار کرنے کیوں بیٹھ گیا ہے؟ غالب کے پیچھے نہ پڑو۔ اس کی فریاد نہیں سنی تو اس پر بے یاد کیوں! اس کی خواہشیں جب درخور التفات نہیں تھیں تو اس کی خطاؤں پر باز پرس کیوں کر رہا ہے؟

چوں عکسِ پل بہ سیل بہ ذوقِ بلا برقص

جارا نگاہ دارد ہم از خود جدا برقص

باڑھ آتی ہے تو پل کی پرچھائیں پانی میں ناچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مصیبت آئے تو منہ سے رے کر اسی طرح تم بھی ناچو۔ اپنی جگہ کا دھیان رکھو اور خود سے الگ ہو کر اپنے کو فراموش کرتے ہوئے ناچو، عکسِ پل کی تشبیہ کتنی قدرتی ہے۔ اور شاعر کا مشاہدہ کس قدر نخیل آگیا۔ وہ اشعار شاعر کا مشاہدہ جن میں انعکاس پذیر ہوا ہے اپنا الگ لطف رکھتے ہیں۔ فکری افق کو ارضی استعارات وسیع کر دیتے ہیں۔

فوقیست جتو، چہ زنی دم ز قطعِ راہ

رقار گم کن وہ صدائی درا برقص

مزا تو جتو میں ہے، راہ طے کرنے کی بات کیوں کرتے ہو۔ رقا کو گم کر دو اور آوازِ درا پر آگے بڑھنے کے بجائے رقص میں آجاؤ۔



در عشق انبساط بر پایاں نمی رسد  
چوں گرد باد خاک شود در هوا برقص  
عشق میں خوشی ختم ہوتی ہی نہیں۔ بگولہ کی طرح خاک ہو جاؤ اور ہوا میں ناچو۔  
از سوختن الم ز شگفتن طرب مجوی  
بے ہودہ در کنارِ سموم و صبا برقص

جلنے سے تکلیف کھینے سے خوشی کی امید نہ رکھو۔ سموم و صبا کی بغل میں بے مقصد، بے محابا  
ناچتے رہو، انجام سے بے نیاز ہو کر سر ڈھینکتے رہو، وجد کرتے رہو۔ یہ زندگی اس لائق نہیں اس کے  
یہ گریباں میں منہ یا ماتھے پر بل ڈال کر بیٹھو۔ زندگی کی بے ثباتی کا جواب، اور ذوقِ حیات کا تقاضا  
یہی ہے کہ عمر کو بے محابا رقص کرتے ہوئے پایاں تک پہنچا دو۔

ہنگامِ بوسہ بر لبِ جاناں خورم دریغ  
در تشنگی بہ چشمِ حیواں خورم دریغ

پیار کرتے وقت محبوب کے ہونٹوں پر رحم آجاتا ہے کہ محبت کی جارحانہ یورش میں ان کا کیا حال  
ہوگا۔ اپنی قلمزم آشام پیس کو دیکھتا ہوں تو آبِ حیات کے چشمہ پر ترس آتا ہے کہ یہ ذرا دیر میں  
خشک ہو جائے گا۔ اور بیا سے کی بیا س بجھنے نہ پائے گی۔

آں سادہ روستائی شہرِ محبت  
کز تیج و خم بہ زلفِ پریشاں خورم دریغ

میں ایک سادہ دل، نا تراشیدہ دہقان ہوں جس کو زلفِ پریشاں کے تیج و خم پر ترس آرہا ہے  
مجھ میں وہ صبر اور شایستگی کہاں کہ خود کو زلف کے سر ہونے تک دروک سکوں ایک ندیدہ، ضبطنا آشنا  
دیہاتی الہا ب شوق میں زلفِ جاناں کے تیج و خم کے ساتھ نہ جانے کیا کر ڈالے۔ مجھے ان پر رحم آرہا  
ہے۔

زقارِ گرم و تیشہ تیزم سپردہ اند  
از خولشتن بکودہ دیا باں خورم دریغ

مجھے تیشہ تیز اور زقارِ گرم عنایت کی گئی ہے۔ ٹھہر رہا ہوں کہ میرے ہاتھوں کوہِ دیا باں کا کیا

حشر ہوگا۔ نہ پہاڑ بچے گا، نہ صحرا بے عبور رہے گا۔ دنیا جو کچھ محسوس کرتی ہے، سوچتی ہے، باور کرتی ہے  
میری فکر کا تیشہ اسے گراتے ہوتے، اور میرا قدم اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ جائے گا۔

دل نہ آن تست ہدیہ تن کن کنار بوس

چند از تو بر نواز کشس پنہاں خوم دریغ

میرا دل تو خود تمہاری ملکیت ہے، اس کو اپنی محبت سے بھر دیا تو کیا۔ ہاں جسم ابھی تک میرا ہے  
مجھ پر عنایت کرنی ہے تو میرے جسم کو جو ہنوز تم سے الگ ہے نواز دو، بوس و کنار سے سیراب کر دو۔  
میں کب تک اس غش سے بے چین رہوں کہ مجھ پر صرف درپردہ، اشارت و کنایت میں نوازشیں  
ہور ہی رہیں۔ ان غایتوں کا روئے سخن تو دل سے ہے جو تمہارا ہے مجھے کیا ملا۔

آمدی دیر پر کشش چہ شارت آدم

من و عمری کہ بہ اندوہ وفا گشت تلف

رنگ و بو بود ترا، برگ و لولہ بود مرا

رنگ و بو گشت کہن، برگ و لولہ گشت تلف

گیرم امروز دہی کام دل، آں حسن کہا

اجر نا کامی می سالہ ما گشت تلف

قارئین آج بھی اس غزل میں جس کے تین شعر نقل کیے گئے ہیں، درد کی کراہ سن سکتے ہیں شاعر  
کے دل پر حسرت نشتر لگا رہی ہے۔ اسے گوہر مراد جس کی آرزو ہیں اس نے جوانی ضائع کر دی کب  
حاصل ہوا، جب نہ گوہر میں وہ تابانی رہی، نہ گوہر پرست کی آنکھوں میں وہ روشنی۔ تیس سال کے مسلسل  
انتظار کے بعد محبوب ہاتھ آیا تو اس وقت جب نہ ان ہاتھوں میں غنوان محبت کا جوش اور ولولہ  
اور بے تابانی باقی رہ گئی تھی، نہ خود محبوب میں وہ بانچیں، وہ شا دانی، وہ حسن و شباب۔

تو نے میری پر کشش کے یسے آنے میں دیر کر دی۔ اب میں ہوں اور عمر جو غم محبت میں ضایع  
ہو گئی۔ جیتے جی آتا تو میں بھی قربان ہو جاتا اور عمر کو بھی ہدیہ کر دیتا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا جسے تجھ  
پر بچھاؤ کر دوں۔

تیرے پاس رنگ و بو تھی، میرے پاس ساز و سامان۔ رنگ و بو کہہ ہو گئے۔ ان میں مازگی

اور شادابی باقی نہیں رہی، اور میرے پاس جو ساز و سامان جو ذوق و شوق، جو دم خم تھا، سب ختم ہو گیا فرض کر لیجیے کہ تم آج میرے دل کی مراد دے دینے کو تیار ہو جاؤ گے، تو اب وہ حسن کہاں، ہماری تیس سال کی ناکامی کی جو تلافی ہونا تھی وہی برباد ہو گئی۔

کاش پانی فلک از سیر بماندی غالب  
روزگاری کہ تلف گشت چرا گشت تلف  
کاش آسمان کے پاؤں گردش سے رک گئے ہوتے۔ وہ زمانہ جو برباد ہوا آخر کیوں برباد ہوا؟  
ہن گرائی و وفا جو کہ سادہ برہنم  
یہ سنگ ہر کہ دہد دل بغیرہ چوں نہ دہد  
میری طرف مائل ہو جاؤ اور مجھ سے وفاداری کا تقاضا کر کے دیکھو۔ میں ایک سادہ دل برہن ہوں۔ جو شخص پتھر کو دل دے سکتا ہے اسے ایک جیتے جاگتے محبوب کے ناز و داد پر فریفتہ ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

فراغت بر نہ تا بدہمت شکل پسند من  
زد شواری بجاں می افتد مکاری کہ آساں شد  
میری مشکل پسند طبیعت آسانی برداشت نہیں کر سکتی۔ جو کام آسان ہو گیا وہ میرے لیے جی کا جنجال بن جاتا ہے۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا۔

زما گرمست ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را  
قیامت می دمدا از پردہ خاکی کہ انساں شد  
وجود کی چیل پہل کو دیکھو، یہ ساری گرمی ہنگامہ ہماری وجہ سے ہے۔ قیامت اس خاک کے پردہ سے سراٹھاتی ہے جس کا نام انسان ہے۔

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند	شمع کشتند وز نور شید نشانم دادند
سوخت آتش مدہ ز آتش نفسم غشیدند	ریخت بت خانہ ز نا قوس فغانم دادند
گہرا ز رایت شاہان عجم برچیدند	بعوض خامہ گنجینہ فشانم دادند
گوہرا ز تاج گشتند و بدانش بستند	ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند



غالب کو یہ غلش ستا رہی کہ وہ اس زمانہ میں پیدا نہیں ہوئے جس میں ہونا چاہیے تھا انہیں  
یہ احساس تھا کہ وہ اپنے زمانہ سے آگے ہیں، زمانہ حال ان کی وسعت نظر اور ہیکرائی افق کے تے تنگ  
تھا، ان کی خارا شکاف نگاہ حال کی دیواروں کو چیرتے ہوئے آگے نکل جاتی تھی شاعر محسوس کرتا  
ہے کہ اس کا مزاج اور زاویہ نگاہ آنے والے زمانہ سے ہم آہنگ اور مستقبل کے ساتھ ہم قدم ہے

کو کہم مادر عدم اوج قبولی بودہ است

شہرت شہرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

میرے تقدیر کے ستارہ کو عروج اعتراف عدم میں حاصل ہوا ہے۔ دنیا میں میری شاعری کی قدر  
میرے بعد ہوگی۔ لیکن وہ کائنات گیر اور بے تاب روح مستقبل میں بھی اسیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ اپنی فکر کی  
مستقبل شناسی پر ناز کرتا ہے۔ زمانہ نے جو کروٹ لی ہے، اس کے امکانات اس کی دور بین فکر کو ازبر ہیں۔  
لیکن وہ کسی قیمت پر اپنے ورثہ سے جدا ہونے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ورثہ مشتمل ہے۔ تہذیب و تمدن  
اور علم و دانش پر جنھوں نے ماضی میں اسلاف کے زمانہ میں فروغ پایا ہے۔ مذکورہ بالا غزل کہہ رہی ہے  
کہ شاعر وقت کے اس موڑ پر آیا جب کو اکب اپنی بساطِ پیٹ رہے تھے۔ اور مہرِ حیات کی آمد آمد تھی  
اسے ہم دور جدید کے آغاز سے منسوب کر سکتے ہیں۔ وہ ماضی اور مستقبل کے درمیان اس انداز سے کھڑا تھا کہ  
ماضی کا ثقافتی اور شعری سرمایہ ہو کے ساتھ اس کے رگ و پے میں جاری و ساری تھا اور ایک نئے ہمد  
کے طلوع کا اعلان خورشید کی شعاعیں کر رہی تھیں۔ شاعر جانتا ہے کہ وہ شعری وراثت کا امین اور غائب  
آخری ترجمان ہے۔ اسے اپنی شعری عظمت اور تاریخی اہمیت اور رُخِ مستقبل ہونے پر ناز ہے

ان اندھیری راتوں میں مجھے صبح کی بشارت دی گئی۔ خورشید کی پذیرائی کے لیے شمعیں بجھا دی

گئیں۔ یہاں ایک زاویہ خود ستائی کا بھی ہے۔ جو کام غالب سدا اعتماد کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

ایران کا آتش کہہ جل کر اکھ کا ڈھیر ہو گیا تب جا کر تلافیِ مافات کے طور پر میری سانسوں کو شعلہ بار

کیا گیا۔ بتِ غامضی کا ڈھیر ہو گیا تو ناقوس کی لاج رکھنے کے لیے مجھے مامور کیا۔ ایران کے شہنشاہوں کے

پرچم سے موتی چھڑائے گئے اور ان کے بدے میں مجھے وہ قلم عنایت ہوا جو خزانہ بکھیرتا ہو، چننا ہے

گو یا ایران کو معاوضہ دے دیا گیا۔ ان زرد و جاہر کے نقصان کا جنھیں شاہی پرچموں سے چھڑایا گیا تھا تاج

سے موتی توڑ کر علم کے دامن میں کانک دے گئے۔ جو کچھ بر ملا چین لیا گیا تھا مجھے چھپ کر بخش دیا

گیا۔ شاہی کا دور ختم ہوا، علم، سائنس، ٹکنولوجی کی حکومت شروع ہو گئی۔ پہلے ایران کے لیے مائے امتیاز شہنشاہیت تھی اب اس کے لیے سرچشمہ افتخار علم و دانش کا وہ سرمایہ ہے جو غالب کے اشعار پر مشتمل ہے۔ اپنی ستائش غالب اس انداز سے نہیں کرتے جس انداز سے وہ ممدوحین کی شان میں قصائد لکھتے تھے۔ یعنی ایک صنفِ شعر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے یہ رسمی تعلق نہ تھی۔ اپنی عظمت اپنے نابغہ روزگار ہونے کا احساس ان سے وہ اشعار کہلاتا تھا۔ جنہیں خود ستائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

غالب کے یہاں خود ستائی اور خود شناسی کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ عجم کے تمدن اور تہذیبی ورثہ کا نقطہ عروج دیکھنا چاہتے ہو تو اس کی شاعری خصوصاً غالب کے کلام کا مطالعہ کرو۔

قیاس کہتا ہے کہ مذکورہ بالا غزل، حافظ کی اس غزل کے زیر اثر لکھی گئی جس کا مطلع ہے۔

دو شمس وقت سحر از غصہ سنجہا تم دادند

واندراں ظلمت شب آہیا تم دادند

غالب نے صرف قافیہ بدلا ہے، وہ طریقہ کہ ہم زمین اشعار کا موازنہ کیا جائے۔ اب متروک ہو چلا ہے، اور جب رائج تھا اس وقت بھی تخمیناً شعرا اور سخنوروں کے مرتبہ کی تعیین کے لیے معاون نہ تھا حافظ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے، ویسے غالب کی غزل بھی خوب ہے۔

مالذت دیدار نہ پیغام مگر فتیم

مشاق تو دیدن ز شنیدن آشنا شد

تمہارا پیغام کیا آیا، تم خود رو برو آگے۔ تمہارا عاشق تمہاری محبت سے اس قدر سرشار ہے تمہاری ذات میں اس قدر محو ہے کہ اس کے لیے جہاں تک تمہارا تعلق ہے دیکھنے اور سننے میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ محبت جب فرط اشتیاق سے محبوب کا طواف کرتی ہے اس کی بلائیں لیتی ہے، جب جو اس اور خیال شیر و شکر ہو جاتے ہیں تو دیکھنے اور سننے، سوچنے اور محسوس کرنے چھوٹے اور سونگھنے قریب آنے یا دور ہونے میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

غالب قلمت پردہ کشائی دم عیسیٰ ست

چوں بر روشنی طرزِ خدا داد بہ جنبہ

غالب تیرا خاتم معجز نگار دم عیسیٰ کی پردہ کشائی کرتا ہے، وہ چلتا ہے تو فرسودہ اور مر جھائے ہوئے مضامین ہلہانے لگتے ہیں، تیرے اشعار جاں بخشی کے لیے ممتاز ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب تیرا قلم اس انداز سے چلتا ہے جو خدا نے اسے ودیعت کیا ہے۔ یہاں شاعر آمد اور آمد کے درمیان فرق کر رہا ہے یہ شاعر کے ذوق نقد کا ثبوت ہے۔ یہاں یہ مان لینا بعید از کار نہ ہوگا کہ غالب خود اپنے اشعار کو دو خانوں میں رکھتے تھے۔ ایک وہ اشعار جو انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق جذبہ اور احساس کی رو میں، ایک حد تک برتہ تا ہم پر پیچ و متمول طرز خداداد میں صوت و آہنگ کے ساتھ کہے تھے۔ دوسرے وہ اشعار جن پر آمد اور کاوش کا گمان ہوتا ہے۔ جن کی تشکیل میں ردیف و قافیہ شریک غالب رہے تھے۔

نازم یہ امتیاز کہ بگزشتن از گناہ  
بادیگراں ز عفو و بیا از غرور بود

میں اس شان امتیاز پر ناناں ہوں کہ گناہوں سے اس نے جو درگزر کی وہ دوسروں کے ساتھ بطور معافی اور ہمارے ساتھ بوجہ ناز و انداز۔ قارئین شاید اس بات کی طرف دھیان دیں کہ غالب نے محبت کے مضامین میں نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ ایسا کرنے میں ان کے رفیق دوست تھے، جذبہ یا تجربہ اور تخیل یا پارک بینی۔ خود محبت کے مضمون کا استعمال بطور بادہ و ساعہ کیا گیا ہے۔ برتاؤ یا عمل بظاہر ایک سا ہو تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عمل کرنے والے کی نیت سب کے ساتھ ایک ہی ہے۔ محرک بہت مختلف ہو سکتے ہیں ہذا دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان اس جذبہ یا نیت کی کھوج لگائے جو کسی فعل یا عمل کے پیچھے ہے۔ ہر بڑے شاعر کے یہاں، غالب کے یہاں خاص طور پر محبت کے آئینہ میں زندگی کے ہزاروں پہلوؤں کی تصویریں تیری جھنکی ہیں۔

خیال یار در آغوشم آہنستاں بفشرد  
کہ شرم امشبم از شکوہ ہائی دوش آمد

محبوب کے خیال نے مجھے اپنی آغوش میں اس طرح بھینچ لیا کہ مجھے آج رات ان شکایتوں سے شرم آئی جو میں نے کل کی تھیں۔

از بس بہ شوق روی تو مستست نو بہار  
ہوئی می آید ارداہن غنچہ بوکنند

تمہارے رخ کے اشتیاق میں نو بہار اس قدر سرشار ہو گئی ہے کہ اگر کلی کے منہ کو سونگھیں تو اس سے شراب کی بو آئے۔

ہائی پرکاری ساقی کہ بہر باب نظر

می بہ اندازہ و پیمانہ بہ انداز دہد

ساقی کی ہوشیاری دیکھو کہ وہ اہل نظر کو شراب اندازہ لگا کر یعنی بقدر طرف دیتا ہے اور ان کی طرف پیمانہ بڑے ناز و انداز سے بڑھاتا ہے۔

پردہ داراں بہ فی وساز فشارش دادند

نالہ می خواست، شرح بستمش ساز دہد

نالہ چاہتا تھا کہ محبوب نے فرط ناز میں جو ستم ڈھائے ہیں ان کا ذکر کرے۔ لیکن ان لوگوں نے جو محبت کا پردہ اور بھرم رکھنا چاہتے تھے انہوں نے نالہ کو نے اور ساز کے شکنجہ میں دے دیا نالہ نغمے میں بدل گیا۔ غم ہی دراصل سرچشمہ ہے شاعری اور موسیقی کا۔

پہ خیزد از سخنی کز درون جان نہ بود

بریدہ باد زبانی کہ خوشچکاں نہ بود

ایسے کلام ہے کیا حاصل جو دل کی گہرائیوں سے نہ نکلا ہو۔ وہ زباں جس سے دل کا ہونہ چپکے کٹ جائے تو اچھا۔ وہ سخن جو دل سے نہیں نکلتا بے تاثیر رہتا ہے۔ ایسی زباں جو درد کی ترجمان نہ ہو جس سے ہمدردی کے کلمات نہ نکلیں دہن کے لیے باعث تنگ ہے۔

پئی عتاب ہما نا بہا نہ می طلبد

شکایتی کہ ز ما نیست ہم ہما دارد

عتاب کے لیے وہ شاید بہانہ ڈھونڈ رہا ہے، جو شکایت کہ ہم سے نہیں وہ بھی ہم سے منسوب کی جا رہی ہے۔ اس شعر کو محبت کے سیاق تک محدود کرنا اس کے ساتھ ظلم ہو گا۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک اہل ستم جفا کے جواز کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشتے اور الزام لگاتے رہے ہیں۔ یہ شعر بھی وسیع الاطلاق ہے۔

غائب کی مشکل پسندی شعر گوئی تک محدود نہیں ہے۔ زندگی میں وہ خطر طلبی کی وکالت کرتی ہے۔



چہ ذوقِ رہروی آل را کہ خارخاری نیست  
مرد بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد

اگر راہ میں کانٹے نہیں تو راہ چلنے میں مزا ہی کیا۔ اگر کعبہ کی راہ پر امن ہو تو وہاں کی بھی نیت نہ کرو۔

بیروں میا زخانہ بہ ہنگامِ نیمروز  
ریشک آیدم کہ سایہ بہ پایوس می رسد

جب آفتاب نصف النہار پر ہو تو گھر سے باہر نہ آؤ۔ میں دیکھوں گا کہ پرچھائیں تمہارے پاؤں چوم رہی ہے تو ریشک سے بے چین ہو جاؤں گا۔ مشاہدہ نے غالب کو بتایا تھا کہ دن کے بارہ بجے پرچھائیں چھوٹی ہو کر بیروں کے نیچے آجاتی ہے اس کی فارسی غزل میں مشاہدہ سے شعری استفادہ کے خواہد بار بار ملتے رہیں۔

چہ جویم مراد از شگرفی کہ اود را  
نشستن ز شنگی برفتار ماند

اس نادرہ کار حسینہ سے گوہر مراد کیوں کر حاصل ہو جس کا بانگین کے ساتھ بیٹھنے کا انداز چلنے سے ملتا ہے۔ فردوسی نے سہراب کی شخصیت کی شبیہ ایک چھوٹے سے مصرع میں اتاری تھی :  
”تو گوئی ہمہ تحت سہراب بود“ غالب نے محبوب کے ساتھ یہی کردکھایا۔ نشستن ز شنگی برفتار ماند۔  
عزیز حسن بے صبری بے تاب، التہاب، سیماب، کیفیت، ناز و غمزہ کی لہریں، پہلو بدلتے کی ادائیں، غلبہ کی خواہش، تسخیر کی تمنا، حیا و شوخی کی آویزش، بو قلموں جذبات کی داخلی کشمکش، بیٹھنے کا یہ انداز گویا بحرِ زخار موجیں مار رہا ہے۔

با من میا دینرای پدر فرزند آدم را نگر  
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نگر

والد محترم! مجھ سے میری روش پر نہ الجھنا۔ آؤر کے بیٹے (حضرت) ابراہیم کو دیکھیے جس شخص کو بھی خالق نے اہل نظر بنایا، اسے آبا و اجداد کا دین کبھی نہ بھایا۔ اس شعر میں غالب نے اپنی آزادی فکر کی وثوق کے ساتھ وضاحت کی ہے۔

شاہد ماہمنشیں آرائی و رنگین محفل است  
لاجرم در بند خویش است آنکہ در بندش بود

ہمارا معشوق اپنے ہم نشینوں کو بھی سہا کر رکھتا ہے، اس کی محفل آرائی کے چرچے ہیں جو شخص اس کی طلب میں ہے اور اس پر جان دیتا ہے، اسے پہلے اپنی فکر کرنی ہوگی، خود کو بھی اسی کی طرح سواڑا ہوگا ورنہ اس کی محفل میں بار کیسے پائے گا۔ وسعت اطلاق کی یہ ایک اور مثال ہے۔ جس انسان کو آپ خوش رکھنا چاہتے ہیں خود کو لامحالہ اور بالقصد اس کی وضع پر ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔

یہاں شاعر تھوڑی دیر کے لیے تازگی بخش طور پر اس دریدہ اور فرسودہ اسلوب فکر، اس شعری روایت سے انحراف کر رہا ہے جو عاشق کو خستہ حال اور گریباں دریدہ دکھاتی چلی آئی ہے پھر یہ ایک نفسیاتی حقیقت بھی ہے کہ عاشق، اگر وہ جنوں سے ازکار رفتہ نہ ہو گیا ہو۔ محبوب کے سامنے بن سنور کر اپنی بہترین شکل میں جاتا ہے شیکسپیر کے بقول دس دس بار شیو کر کے (محامت بنا کر)

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گوئی  
گفت گفتاری کہ با کردار پیوندش بود

میں نے عقل سے پوچھا کہ اہل دل کی پہچان کیا ہے۔ اس نے کہا وہ اقوال جو افعال کے ساتھ

جڑے ہوئے ہوں۔

بدیں قدر کہ لبی ترکنی و من بمکم

تراز بادۂ نوشیں چہ مایہ کم گردد

تمہاری صہبا میں کیا کمی ہوگی اگر تم اپنے ہونٹ ترک کر لو اور مجھے انھیں چوسنے کا موقع دیدو۔

غالب نے ”مکیدن“ یعنی چوسنے کا تذکرہ فارسی غزلوں میں کئی بار کیا ہے۔ بس آمادگی کا یہ

مظاہر لطافت تصور، تہذیبِ محبت اور ذوقِ سلیم پر بارگزدہتا ہے۔ اردو غزلوں میں بالعموم احتیاط

برتی ہے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ سہوی عریاں نگاری قافیہ کی لائی ہوئی ہے۔ شاید یہ قیاس

بے محل نہ ہو کہ اس زمانہ میں بھی جب فارسی شعر گوئی کا چلن باقی تھا۔ فارسی سے اخفائے حال کا فائدہ

اٹھایا جاسکتا تھا۔ اردو میں ایسی باتیں کھل کر کہتے تو فوراً گرفت کی جاتی۔ سماج اور معاشرہ ان گلیاں

اٹھاتے لیکن غالب کی فارسی غزل میں بھی لمبیات کا یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھنے پایا، چند مثالوں پر ختم

ہو گیا۔ البتہ کبھی کبھی محبوب سے عامیانه شوخیاں سرزد ہو گئی ہوں تو قارئین احتساب کرنے کیوں بیٹھ جائیں۔ سنیں۔

اگر نہ مایل ہوں لب خود سنت چرا

بہ لب چو تشنہ دمام زباں بگرداند

معشوق اگر اپنے ہونٹوں کا بوسہ لینا نہیں چاہتا تو کیوں پیلسے کی طرح اپنے ہونٹوں پر متواتر زبان پھیرتا رہتا ہے۔ عالمی تفریح گاہوں میں یہ ادائے بے حجابی، یہ اشارہ حسن طلب، شاہانِ رہ نوردے سرزد ہوتا رہتا ہے۔

تو بیک قطرہ خوں ترک وضو گیری و ما

سیلِ خوں از مژہ را نیم و طہارت نرود

خون کی بوند کا ایک دھبہ لگ جائے تو تمہارا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ پلکوں سے خون کا سیداب بہہ جائے پھر بھی طہارت باقی رہتی ہے۔ غالب کا یہ مخصوص انداز ہے۔ فرو ترکہ بر تر ثابت کرنے کا۔

اس شوخی سے قطع نظر کیجئے جو سطح کو چھو رہی ہے، تو شریعت اور طریقت، ظاہر اور باطن کا مولانہ ذہن کی گرفت میں آجائے گا:

مرا گوئی کہ تقویٰ و زرا قربانت شوم خود را

بیارانی و بخلو سخاۃ تقویٰ شعاراں ہر

مجھ سے تم کہتے رہتے ہو کہ حد کے اندر رہو، اپنی عیاناں محبت کے ہاتھ میں نہ دو، تقویٰ اختیار کرو۔ میری جان تم پر قربان، ایک بار اہل تقویٰ کو بھی آزما کر دیکھ لو۔ ذرا بن منور کران کی محفل میں چلے جاؤ۔ شاعر بے ضرر سی فرمائش کر کے خاموش ہو جاتا ہے، لیکن قارئین کی چشم تصور کے سامنے وہ سماں آجاتا ہے جب زلیخا اپنی ہیلیپوں کے ساتھ محفل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ یوسف کے ساتھ زلیخا کی دلنشینی اور فریشتگی پر نکتہ چیں احمد چیں بہ جیں تھیں۔ اس وقت یوسف کا اس محفل میں گزرتا ہوتا ہے۔

دشت را شمع و چراغ شب تارست بہار

در بہت شائے گیسوئی غبارست بہار

نازم آئینِ کرم را کہ بہ سرگرمی خویش

در غمت غازہ رخسارہ پوشمت جنوں

ہم حریفانِ ترا طرفِ باطست چمن      ہم شہیدانِ ترا شمعِ مزارِ مست بہار  
 جہدِ مشکینِ ترا عالیہ سالیست نسیم      رُخِ رنگینِ ترا غازہ نگارِ مست بہار  
 بیانِ کا زورِ ترا کیب کی طلسمِ بندی، آہنگ کی نرمی، لطافت، شگفتگی۔ وہ سماں بندھ گیا ہے جو  
 قادرِ الکلامی کی معراج ہے۔ استعاروں کا ہجوم آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔  
 تمہاری محبت نے جنوں کی جو شکل اختیار کی ہے وہ ہوش کے رخسار کے لیے گلِ گوشت بن گئی ہے تمہاری  
 راہ میں جو غماز اٹھ رہا ہے، بہار اس پر ماہور ہے کہ اس غبار کی زلفوں میں شانہ کرے انھیں سنوارے۔  
 نسیم تمہارے مشکبو گیسوؤں کی عطر فروشِ بادِ نسیم ہے۔ ان کی خوشبو اس نے ایک جہاں میں پھینک دی ہے  
 تمہارے رخِ زیبا کو بہار نے گلگوزے فروزاں کر دیا ہے۔ یہ غزلِ شایہار کو آئینہ دکھائی ہے۔ پھولوں کے  
 تختے حسنِ ترتیب کے ساتھ آراستہ ہیں۔ بہار نے ان میں ایک طوفانِ رنگ و بو برپا کر دیا ہے۔  
 ہر سرِ مرتفع ہونے کے ساتھ ساتھ غزلِ شگفتہ، شاداب اور پُر بہار ہے۔

بیا و جوشِ تنائی دید نم بنگر      چو اشک از سرِ مژگاں چکید نم بنگر  
 زمن بحرِ پیدن کنارہ می کردی      بیا بخاک من دآر مید نم بنگر  
 شنیدہ ام کہ نہ بینی دنا امید نسیم      ندیدن تو شنیدم شنید نم بنگر  
 دید داند و بالید و آشاں کہ شد      در انتظار رہا دام چید نم بنگر  
 نیاز مندی حسرت کشاں نمی دانی      نگاہ من شو وز دیدہ دید نم بنگر  
 بہار من شو و گل گل شگفتنم دریاں      بخلو تم برو ساغر کشید نم بنگر  
 بداد من نہ رسیدی ز درد جاں دادم      بداد طرزِ تغافل رسید نم بنگر  
 تواضعی نکم بی تواضعی غالب      بہ سایہ خم تیغش خمید نم بنگر

آواز دیکھو کہ تمہیں دیکھنے کی تمنا کیا غضب ڈھا رہی ہے۔ اشتیاق دید میں میرا سارا وجود پلکوں پر  
 آگیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں آنسوؤں کی طرح پلکوں سے ٹپک جاؤں گا۔ ابس جرم پر کہ میں بے تابی  
 میں تڑپتا رہتا ہوں تم نے مجھے کنارہ کر لیا تھا اب میری قبر پر آواز دیکھو کہ میں کتنے سکون کے ساتھ  
 بخواب ہوں۔



کیا عجب کہ فانی کو اپنی غزل ”دیکھتے جاؤ“ کے لیے روشنی یہیں سے ملی ہو۔

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے کفن سر کاؤ میری سبے زبانی دیکھتے جاؤ

”دیکھو“ یا ”دیکھ لو“ کو فانی نے دیکھتے جاؤ ”کر دیا ہے۔ فانی کی اتنی اثر انگیز غزل غالب کی اس غزل کے سامنے بھکی اور بے تاثیر نظر آتی ہے۔

میں نے سنا ہے کہ تم میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو گے، مگر میں ناامید نہیں ہوں۔ میں نے تمہارا نہ دیکھنا سُن لیا۔ اب تم میرا سناؤ اور یقین نہ کرنا، دیکھو۔

تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ جنہیں دید کی حسرت ہے وہ تمہیں کتنی نیاز مندی، کیسے اشتیاق کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ذرا دیر کے لیے میری نگاہ بن جاؤ اور دیکھو کہ ان آنکھوں سے میں کس طرح کس محبت اور محویت کے ساتھ دیکھتا ہوں۔

میری بہار بن جاؤ دیکھو کہ میرے دل میں کس طرح بہا ر آئی ہے۔

دیکھو تو میں کس طرح پھول پھول کھلتا ہوں۔ میرا سارا وجود کلی کی طرح آہستہ آہستہ شگفتہ ہوتا ہے۔

مجھے خلوت میں بے جاؤ اور دیکھو کہ میں جبرہ جبرہ میکشی کیسے کرتا ہوں۔

تم میری داد کو نہیں بہو بچے، میں نے مایوس ہو کر تکلیف میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ میں نے تو جان دے کر تمہارے تغافل کو داد دی ہے۔

جب تک میرے ساتھ تواضع نہیں کی جاتی، میں بھی تواضع نہیں کرتا۔ اس کی تلوار نے خم ہو کر میری پذیرائی کی تو میں بھی اس کے سایہ میں جھک گیا۔ یہ غالب ہی کا ظرف تھا کہ نیاز مندی کے دوران بھی آزادی و خود بینی کو نہیں چھوڑا۔

سخن سادہ دلم را نغزید غالب

نکتہ چند ز پیچیدہ بیانی بمن آر

غالب کا دل سیدھی سادی بات کے فریب میں نہیں آتا۔ پیچیدہ در پیچیدہ، تہ بہ تہ بیان سے کچھ نکات اس کی ضیافت طبع کے لیے نکال کر لاؤ۔ فارسی دیوان میں غالب نے اپنے نظریہ شاعری کی بار بار وضاحت کی ہے۔

یارب ایما یہ وجود از عدم آوردہ تست

یوسہ چند ہم از گنج دہانی بمن آر

یارب یہ تمام وجود، یہ ساری کائنات تو نے عدم سے پیدا کی ہے۔ کیا اس عدم سے جس کا نام دہن ہے۔ تو میرے لیے چند بوسے بھی نہیں لا سکتا؟ کمر اوردہن کے روایتی مضمون کا اتنا شوخ و دلکش ارتقاء اس سے پہلے کسی کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔

ایسی غزلیں سامنے آجائیں جو بہ یک وقت معیار اور تسلسل کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوں تو مضمون نگار کی نگاہ انتخاب معطل ہو جاتی ہے۔ سینے۔

شدم سپاس گزار خود از شکایت شوق	زہی زمن بدل بے غمش سرایت شوق
بہ بزم بادہ گریباں کشودنش نگرید	خوشا بہانہ مستی خوشا رعایت شوق
ہر آں غزل کہ مرا خود بخاطر است ہنوز	بہ بانگ چنگ ادائی کند زغایت شوق
دخاں ز آتش یا قوت گردہ عجبست	عجب تراست ازیں بر لبش حکایت شوق
متابع کا سداہل ہوس نہم بر زن	کنوں کہ خود شدہ شحہ ولایت شوق
مکن بہ ورزش ایں شغل چندمی ترسم	کہ چوں رسی بہ خط خطوہ نہایت شوق
تراز پر کشش احباب بی نیاز کند	غور یک دلی و نازش حلیت شوق
سربو بر تراز حرف غالب است بدہر	نجمتہ باد بہ فرق تو ظن رایت شوق

ساری غزل اس مضمون کے محور پر گردش کر رہی ہے کہ محبوب کو خود کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ شاعر خوش ہے کہ محبوب اب محبت کی قدر کرنا سیکھ جائے گا۔ جو کچھ شاعر بد گزری تھی اب اس کے محبوب پر بیت رہی ہے۔ محبت کو وہ شراب ناب میں ڈبو رہا ہے۔ سرشاری کے عالم میں اس کا گریبان کھل جاتا ہے۔ یہ سماں شاعر کے لیے جنت نگاہ ہے جو عاشقانہ غزلیں محبوب نے شاعر سے سنی تھیں اب وہ انھیں خود گارہا ہے کہ دل کی بھر اس کسی طرح تو نکلے۔ غالب کو اس کی خوشی بھی ہے کہ اب محبوب اہل نظر اور ہوا ہوسوں میں امتیاز کرنا سیکھ جائے گا۔ یہ امید بھی بندھ گئی ہے کہ وہ اپنے معشوق کی تلاش میں شب کو نکلے تو راستہ بھول کر اپنے عاشق کے ہاں پہنچ جائے۔ لیکن پھر اچانک یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ سودائے عشق اگر بڑھ گیا تو وہ ہمیں بالکل ہی بھول جائے گا۔

ہمت زدم شیشہ فرہاد طلب کن	مجنوں مشو و مردن دشوار میا موز
از ذوق میاں تو شدن سر پر آغوش	بی حرفن ماست بز تار میا موز

بہل زخراش رخ گلبرگ بہ اندیش  
شغل نگہ شوق بہ منقار میا موز  
مرنا ہے تو مجنوں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان مت دو۔ فرہاد کی مانند تیشہ کی ایک ضرب  
سے کام تمام کر دو۔

اسے بے ہراس دلربا کمر کے لیے سراپا آغوش بن جانے کا گر تو ہمیں آتا ہے تو زنا رکواس  
جسارت کی اجازت کیوں دے رہا ہے؟

اسے بہل تو گلاب کی پنکھڑیوں پر چوچے کیوں مار رہی ہے، وہ چھلنی ہو جائیں گی۔ ہماری نگاہ شوق کا  
مشغلہ اپنی چوچے کو کیوں سکھا رہی ہے؟

درگر یہ از بس ناز کی رخ ماندہ برخاکش نگر  
آں سینہ سودن از پیش برخاکش ناکش نگر  
برقی کہ جانا سوختی دل از جفا سردش بہیں  
شوخی کہ خونار بختی دست از جفا پاکش نگر  
آں سینہ کہ چشم جہاں مانند جہاں بوی نہاں  
لینک بہ پیرا ہن عیاں از رونق چاکش نگر  
باخوبی چشم دلش با گرمی آب و گلشش  
چشم گہر بارش بہ ہمیں آہ شرزناکش نگر  
یہ غزل بھی سسل ہے، ایک سینہ کے خدو خال آنکھوں کے سامنے آتے ہیں جس نے کبھی اچھے دن دیکھے  
تھے اور جو شباب، مال اور جمال سے ایک ساتھ موم ہو گئی۔

وہ اتنی نازک ہے کہ روتے روتے اس کا چہرہ زمین سے لگ گیا ہے۔ اس مٹی پر جو اس کے آنسوؤں  
سے تر ہو گئی ہے وہ بے تابی میں اپنی چھاتی رگڑ رہی ہے۔ وہ ایک بجلی تھی جو دلوں پر گر گئی اور انہیں جلا  
ڈالتی تھی۔ وہ ٹھنڈی ہو گئی ہے جہاں سے آئے ٹھنڈا ہوتے ہوئے دیکھو۔ شوخ و شنگ بھوپہ جو  
رات دن خونریزی کرتی تھی، اس کے ہاتھ حنا کو ترس رہے ہیں۔ وہ جو تنہائی میں خدا سے بھی التجا کرنے  
کو راہنی نہ ہوتی، آسمان کے چور نے اسے ہر کس و ناکس کے سامنے گریہ و زاری کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ  
جو دنیا کی نگاہوں سے اس طرح چھپا ہوا تھا جیسے جسم کے اندر روح، وہ اس کے پیرا ہن کے چاک  
سے جھانک رہا ہے۔ اس کی شراب آہ کو دیکھو۔ اس کی موتی برسانے والی آنکھ پر نظر کرو۔ حیرت یہ ہے کہ  
یہ سب گریہ و زاری، یہ شعلہ افشانی ایک ایسے محبوب سے سرزد ہو رہی ہے جو حسن و جمال کا پیکر ہے اور  
جس کی سرشت میں دل گرمی اور ولولہ ہے۔ اس کا اب یہ حال ہوا ہے۔

حذر از زہر یرسینہ آسودگاں غالب

چہ منتہا کہ بردل نیست جان ناشکیبارا

آسودگی دلوں کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ ان دلوں کے زہر یر سے بچو جو آسودہ مزاج ہیں۔ بے تابی کے دل پر ہزار ہا احسان ہیں۔ اس کی بدولت دل زندہ ہے، دھڑکتا ہے، روشن ہے اور امید و بیم سے تابندہ ہے۔

غالب کو اس بات پر سدا فخر رہا کہ ان کا تخیل نئے نئے مضامین اور اسالیب ڈھونڈھ کر لاتا تھا۔ جہاں ان کے علاوہ کسی کو دسترس نہیں تھی۔

در بزم غالب آئی وہ شعر و سخن گرائی

خواہی کہ بشنوی سخن ناشنیدہ ای

اگر تم چاہتے ہو کہ ایسے اشعار سنو جو پہلے کسی نے نہ سنے ہوں تو غالب کی بزم میں شعر و سخن کا

ذکر چھڑو۔

ہفت دوزخ در نہاد شرمساری مہمراست

انتقامست ایں کہ با جرم مدارا کردہ ای

جرم کو سزا نہ دینا بلکہ تواضع کر کے رخصت کر دینا، بہت بڑا انتقام ہے اب وہ زندگی بھر شرمساری

سے دوزخ میں جلتا رہے گا۔ انسانی نفسیات کا غالب راز داں ہے۔

د زہر یرسینہ آسودگاں نہ ای

آی دل بدیں کہ غمزدہ ای شادیاں نہ ای

وہ لوگ جو آسودہ ہیں، غم سے بے نیاز، ان کا ٹھکانا گویا جہنم کا درکِ اسفل جہاں سردی ہی

سردی ہے، جہاں حرمت کا گزر نہیں۔ اس سے بڑی سزا انسان کے لیے کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا دل غم

کی دوت سے محروم ہو، اسے نہ کوئی تکلیف ہو، نہ فکر۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو غم سے نا آشنا نہیں ہیں

غم اپنے غم کے علاوہ انسانوں کے غم کا احاطہ کرتا ہے دراصل انسانیت اسی سے عبارت ہے۔

گوئی یکیت پیش تو بود و نہ بود من

با من نشنیدہ ای وز من سرگراں نہ ای



تیرے لیے میرا قرب اور میری دوری کیا برابر ہو گئے ہیں؟ تو میرے پاس بیٹھا ہوا ہے اور مجھ پر برہم نہیں ہے۔ عاشق محبوب کی آزدگی اور برہمی کو اپنے لیے نشان امتیاز سمجھتا ہے۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ۔ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا۔

دلم در نالہ از پہلونی دا رخ سینہ تا بستی      بر آتش پارہ چسپیدہ لختی از کبا بستی

غنا نم را نوائی شور محشر ہمنا نستی      بیا نم را رواج شور طوفاں در رکاب بستی

میرا دل آہ و زاری کر رہا ہے، تڑپ رہا ہے کہ محبت کی آگ نے اسے جھلسا ڈالا ہے۔ اسے اس

طرح دہکا دیا ہے کہ سارا سینہ اس کی تابش سے چمک اٹھا ہے۔ چناں چہ دل کی اب یہ حالت ہے جیسے کباب کا ایک ٹکڑا آگ کی ٹو سے پٹ گیا ہو۔

ایک شور قیامت ہی میرے نالہ و فریاد کا ساتھ دے پاتا ہے۔ طوفاں کا ہنگامہ میرے سخن کا ہم نکاب

ہے۔ زور بیان کا یہ عالم جیسے طوفاں آگیا ہو۔

دلم صبح شب وصل تو برکاشانہ می لرزد

درو بامم بوجد از ذوق بوی رخت خواب بستی

میرا دل شب وصل کی صبح کو میرے گھر کی خیر منارہا ہے۔ اندیشہ سے کانپ رہا ہے۔ اس کے

درو بام محبوب کے رخت خواب کی خوشبو پر ہنوز وجد کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مکان اس حالت میں زیادہ

دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا۔ غالب کے یہاں جذبہ اور فکر کی آمیزش نئے نئے زاویوں سے ہوتی ہے

سرجوش محبت کی کیفیت کو تصور شاعر کے دل سے درو بام تک منتقل کر دیتا ہے، جذبہ کی اس طغیانی کو

کیا کہیے جو آسودگی کے بعد بھی تشنہ کام ہے، اندیشہ مند ہے۔

گلویم تشنہ دجان و دلم افسردہ ہی ساقی

بدہ نولیشنہ داروئی کہ ہم آتش ہم آب بستی

میرا حلق پیاسا ہے اور میرے جان و دل افسردہ ہوتی مجھے وہ شراب پلا جو آگ بھی ہے اور پانی بھی

تاکہ حلق تر ہو جائے اور افسردگی دور ہو جائے۔ کون نہیں جانتا کہ شراب پانی بھی ہے اور آگ بھی،

لیکن شاید اس انداز سے پہلے کسی نے یہ بات کہی نہ ہو۔ اور پھر یہ اہتمام، یہ سجاوٹ کہ وہی جرعہ ایک

طرف حلق کی پیاس بھار رہا ہے، دوسری طرف دل میں آگ لگا رہا ہے۔

مگویم ظالمی آتا تو درد دل یودہ و آں گر

دلی دارم کہ ہچوں خائن ظالم خرابستی

میری یہ مجال نہیں کہہ سکوں کہ تم ظالم ہو۔ لیکن اس بات پر غور کرو کہ تم میرے دل میں مکین کی حیثیت سے رہے ہو، اور میرا دل ظالم کے گھر کی طرح تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ ایک ابدی اور اخلاقی حقیقت کو لے کر کہ ظالم کا گھر برباد ہو کے رہتا ہے شاعر نے یہ خیال پیدا کیا کہ میرے دل میں محبوب نے گھر کیا تھا۔ وہ چلا گیا اور میرا دل تباہ ہو گیا۔ مکین ظالم رہا ہوگا۔ جمہی تو مکان برباد ہوا۔ عاشق نے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے معشوق پر لطیف انداز سے ظلم اور بے وفائی کی ہمت لگا دی۔

دبکہ با تو بہر شیوہ آشنا ستمی

بہ عشق مرکز پر کارِ فشتہ ہا ستمی

تمہارے ظلم و ستم کے ہر شیوہ سے تجربہ کی بدولت اس قدر آشنا ہو گیا ہوں کہ میں یہ سچ میں ہوں اور میرے گرداگرد فتنوں کے لامتناہی دائرے کھینچے ہوئے ہیں میری حیثیت دائرہ ہائے ستم کے مرکز کی ہر کہ دائروں سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ تمہارے جو دستم نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔

امید گاہ من واپجو من ہزار یکیت

زر شک در صد ترک مدعا ستمی

یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میری طرح ہزاروں دوسرے بھی تیرے دے سے امید لگائے بیٹھے ہیں انہیں اس کا کیا حق تھا۔ رشک نے مجھے اس پر مجبور کر دیا کہ تجھ سے اُس لگانا چھوڑ دوں۔ رشک کا اعتراف تو غالب نے اپنی زبان سے کیا ہے، یہاں اس انفرادیت اور غیرت کا ذکر کرنا وہ بھول گئے جو ان کے خائن دل کو زرا دیر کے لیے بھی نہیں چھوڑتی اور جو کسی طرح کی شرکت کو گوارا نہیں کرتی۔

بہ سرمہ غوطہ دہیدم کہ دہ سیدہ ستمی

ز سرمہ گینئی چشتی سخن سرا ستمی

حوض میں سرمہ گھول کر مجھے اس میں غوطہ دے دو کہ یہ ستمی میں ہیں اس چشم سرمہ گین کی بات کرنے لگا ہوں۔ سرمہ میں غوطہ دینے میں لطف یہ ہے کہ یہ سزا بھی ہے اور جزا بھی۔ جزا اس لیے کہ اس طرح مجھے اپنے محبوب مشغلہ میں مدد ملے گی، میں کچھ نہ کچھ اس چشم سرمہ سا کا حق اپنے بیان سے ادا کر سکوں گا۔

سزا اس لیے کہ مجھ کو گرفتار سے بڑا جرم یہ سرزد ہوا کہ بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی۔ ان سرگیں آنکھوں کا تذکرہ  
بر ملا کر دیا۔ سترمہ کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ سترمہ کھالیجے تو آواز بیٹھ جاتی ہے۔ اس مجرم کے لیے  
جو طرف کی کمی اور نوعاشقی کے سبب داستانِ محبت کو دہرا رہا ہے، یہی نہیں محبوب کی طرف بر ملا اشارہ  
کر رہا ہے، موزوں سزا یہی ہے کہ اسے گویائی سے محروم کر دیا جائے وہ بھی اسی شے کے فدیہ جس کی  
طرف اشارہ افشائے راز کا باعث بن گیا تھا۔

چکو نہ تنگ تو انم کشیدنت بکنار  
کہ با تو در گلہ از تنگی قبا ستمی

تجھے اپنی آغوش میں کس طرح نہ بھینچ لوں، مجھے تجھ سے تنگی قبا کی شکایت ہے۔ کسی شاعر نے  
کہا ہے۔

گرچہ پیرم تو شبی تنگ در آغوشم گیر  
کہ سحر گر ز کنار تو جواں بر خیزم

میں ہر چند بوڑھا ہوں تو ایک رات مجھے اپنی آغوش میں کس کر کھینچ لے تاکہ میں صبح کو تیرے پہلو  
سے جوان اٹھوں۔

غالب کا کہنا ہے کہ جب طغیانی محبت میں، میں تجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیتا ہوں اس وقت مجھے  
یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ ہمارے درمیان تیری چست قبا حائل ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا حصہ تیری قبا بھ سے  
پہلے اڑا لے گئی۔ یہ ایک نیا رقیب پیدا ہو گیا جو تجھ سے قرب میں مجھ سے بازی لے گیا۔ کہیں رقابت کا یہ  
احساس ہم آغوشی کے لطف کو کرکرا کر دے۔ ناگواری کے اس اظہار میں حسنِ طلب پنہاں ہے کہ اپنی  
تنگ قبا کو جو میری رقیب بن گئی ہے حائل کیوں رہنے دیتے ہو۔ بس کی راہ میں رکاوٹیں کیوں کھڑی کرتے  
ہو۔ قبا کی یہ مجال کہ میرے سامنے تمہیں اپنی آغوش میں کھینچ لے۔

دردِ دلِ تنگ بنگر در قصِ مبتلاں آذری  
زہرہ ما بریں آفتق دادہ فروغِ مشتری  
در طلبتِ تو اں گرفتِ بادیدہ ما بہرِ رہبری  
یہ ہندہ در ہوائِ تومی پردازِ سبکسری

دیدہ در آن کہ تانہ دل بہ شمارِ دلبری  
فیضِ نتیجہٴ درغِ از می و نغمہ یا فیتیم  
ای تو کہ ایچ ذرہ را جزیرہ تو کوئی نیست  
ریشکِ ملک چہ و چرا پچوں بہ تورہ نمی برد

حیف کہ من بخوں تم و تو سخن رود کہ تو اشک بدیدہ بشمری نالہ بہ سینہ بنگری  
 سینم از گداز دل، در جگر آتشی چو سیل غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری  
 دیدہ و اس شخص کو کہتے جس کی نظر جستجوئے جہاں کے ہنگام پتھر کے دل کو چیرتی ہوئی ان مجموں کو جو  
 اس میں پچھے ہوئے، میں رقصاں دیکھ لیتی ہے۔ فن کار کی اس سے زیادہ حسین اور معنی خیز تعریف شاید کبھی  
 نہ کی گئی ہو۔ وہ پہلی نظر میں حسن کو بھانپ لیتا ہے۔ خواہ وہ خوابیدہ ہو، خواہ نہفتہ، خواہ موجود ہو خواہ ممکن۔  
 میڈیم کے تخلیقی امکانات کو فن کار کا تخیل چشم زدن میں پا جاتا ہے۔ یہاں مشاہدہ تخیل اور شکل —  
 یہ دونوں عمل ایک ساتھ شروع ہو جاتے ہیں۔ فن کار چاہے وہ صورت گر ہو یا سنگ تراش، شاعر ہو یا غنا  
 پرداز، محسوسات کو حسن کے انکشاف اور تخلیق و تجسیم کا روپ دینے پر قادر ہو جاتا ہے، چنان میں اسے  
 ہو شر یا مورتیاں ناچتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

تجہ تک پہنچنے کے لیے ہم کسی مرشد کامل کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہیں۔ جب حقیقت یہ ہے کہ  
 ہر ذرہ تیری سمت دواں ہے تو ہم خود صحرا سے جس میں ہم سیکار بھٹک رہے ہیں تیری جانب رہنمائی کا کام  
 کیوں لیں۔ دنیوی زندگی کی بیڑیوں کو کاٹ کر جو شخص تلاش حق میں صحرا کی طرف نکل گیا اسے کوئی راہبر  
 درکار نہیں۔

جس کسی کے سینہ میں دل ہوتا ہے اس کے دل کو تیری محبت کی آگ سے داغ دیتے ہیں، کہ اگر اس  
 کی نیت میں خرابی آئے اور اگر دل وہ تجھ سے ہٹا لے اور کسی دوسرے محبوب کے حوالے کر دے تو تیرے  
 پاس عدالت میں اپنی ملکیت ثابت کرنے کے لیے ثبوت موجود ہو۔ غلاموں اور گھوڑوں اور دوسرے  
 چوپایوں کو شناخت کے لیے مالک کے نشان سے داغ دیا جاتا تھا۔

ہم فرشتوں پر رشک کیوں کریں، وہ تجھ تک تو پہنچ نہیں پاتے، ہوا میں بے کار پر مارتے رہتے  
 ہیں۔ ذہن اس تبصرہ کی طرف جاتا ہے جو غالب کے ہمعصر شیلی پر مبنی تھا،

An ineffectual angel beating in the void his  
 luminous wings in vain.

ایک بے اثر فرشتہ جو خلا میں اپنے چمکدار پر بے کار مارتا رہتا تھا۔

ہر وردگار دنیا یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتی کہ تو عالم الغیب ہے، دانا اور بینا ہے۔ تیرے حکم کے بغیر  
 پتہ کبھی نہیں ہٹتا۔ اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو تیرے احاطہ علم سے باہر ہو۔ تو دلوں کا راز جانتا ہے۔



توسینہ میں نار کو الجھتے ہوئے دیکھ لیتا ہے اور آنکھوں میں ڈبڈباتے ہوئے اشکوں کو شمار کر لیتا ہے اپنی پھر یہ کیوں ہو رہا ہے کہ میں خاک و خون میں تڑپ رہا ہوں اور تو میری خبر نہیں لیتا۔ کتنی ہمدرد ہے یہ فریاد گویا ایک مصیبت زدہ انسان اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے گڑ گڑا رہا ہے، بلک بلک کر اپنے حال زار کی طرف اس کا دھیان دلارہا ہے۔ غالب کی آزاد منشی کا عام تصور اس تصویر کو آسانی سے قبول نہیں کرے گا۔

جب میں فکر شعر میں ڈوبا ہوا ہوں اس وقت اگر آپ میرے ہانخانہ دل میں جھانک کر دیکھیں تو آپ کیا پائیں گے؟ میرے دل کے سوز و گداز سے جگر میں آگ کی وہ لپٹیں جو سیلاب کی طرح موجزن ہیں بڑھتی ہوئی چلی آرہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے وجود کو پگھلا کر اپنے ساتھ بہا لے جائیں گی۔ تخلیق کا عمل ٹھنڈی فکر، سطحی مضمون آفرینی اور سرد قافیہ پیمانی پر مشتمل نہیں ہوتا۔ جذبہ کی شدت، فکر کی حرارت، الفاظ اور تراکیب کی تمازت شاعر کے وجود کو دھکا دیتی ہے، پگھلا دیتی ہے، اور اپنے پگھلے ہوئے وجود کو وہ اشعار کے سانچے میں آندھیلنے لگتا ہے، اس طرح کہ خود وہ سانچہ وہ آگینہ بھی اس آنکھ سے پگھل جاتا ہے۔ اس غزل کے مطلع اور مقطع میں غالب نے عمل تخلیق سے نقاب اٹھائی ہے اور قارئین کو اپنے تخلیقی تجربہ کے اول و آخر سے روشناس کر دیا ہے۔ اور اس تصور کی تردید کر دی ہے کہ مضمون آفرینی اور پوشگافی اور بلند پروازی میں پارہ ہلے دل شامل نہیں ہوتے۔ فکر شعر سارے وجود کو ہلا ڈالتی ہے۔ جذبات، احساسات اور افکار کو الفاظ، وزن، صوت اور آہنگ کے سانچوں میں ڈھالتا جگر گداز ارتکاز اور یکسوئی کا طالب ہوتا ہے۔

آنکہ جوید از تو شرم و آنکہ خواہد از تو مهر

تقویٰ از میخانہ و داد از فرنگ آرد، ہی

جو کوئی تم سے حیا کی امید رکھے، اور محبت تم سے چاہے، وہ گویا خرابات میں پارسائی ڈھونڈھ رہا ہے اور فرنگیوں سے انصاف مانگ رہا ہے۔ غالب کے یہاں بالانشینوں کی محبت کے شواہد ملتے ہیں۔ یہ شعر تو خیر بہت واضح ہے، لیکن شاہد ان زرد طلب کا چہرہ رشک کے آنچل میں اکثر جھلکتا ہے اور ان کا روئے زیبا اس آئینہ در آئینہ صورت حال میں چلیں کورنگین کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ معشوق کا رنگ عاشقی کی تابش سے کھلتا اور نکھرتا جاتا ہے۔ اردو فارسی غزلوں میں معشوق کسی دوسرے پر

عاشق ہوتا ہے۔ فارسی میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں غزلوں کی غزلیں اس کیفیت کی صورت گری کے لیے وقف ہیں۔

دوسرے مصرع میں غالب نے قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ فرنگیوں سے انصاف کی امید رکھنا سراسر نادانی ہے اس میں شاید قومی اور انفرادی دونوں نقاط نظر سما گئے ہیں۔ وہ انگریز جو تجارت کرتے ہوئے آئے اور مکر و فریب اور زور و ظلم سے ہندوستان کے حاکم بن بیٹھے، ان کا تصرف ہی غیر منصفانہ اور غاصبانہ ہے۔ کیا عجب کہ ان کے پیش نظر وہ شخصی ناکامی بھی رہی ہو جس سے انھیں پینشن میں اضافہ کی مانگ پر سابقہ پڑا۔

بنائی بہ گو سالہ پرستاں ید بیضا

غالب بہ سخن صاحب فرتاب کجائی ؛

گو سالہ کی پرستش کرنے والے گرم خواہیں۔ پیغمبر سخن، کلیم معجز بیاں، اسد اللہ خاں غالب کہاں چلا گیا کہ ان گو سالہ پرستوں، ان سامری نژادوں، ان چھوٹے موٹے پڑھداشاعروں کے ظلم کو اپنے ید بیضا کے اعجاز سے توڑ ڈالتا۔

سیرم نہ توان کرد ز دیدار نکو یاں

نظارہ بود شبنم و دل ریگ رواں بانی

خیروں کی دید سے میرا دل بھرتا ہی نہیں کہ وہ ریگ رواں کی طرح ہے، پانی کا پیا سا۔ اور دیدار جیسے شبنم کی چند بوندیں۔ شوقِ نظارہ خواہاں کی آگ ان چند بوندوں سے کیا بجھے گی۔ ذوقِ جمال جب شوقِ نظارہ کی طرف لے جائے تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔

از جنت و سرچشمہ کوثر چہ کشاید

خون گشتہ دل و دیدہ خوانا بہ فناں بانی

میرا دل خون ہو چکا ہے، آنکھیں لہو کے آنسو رو رہی ہیں جنت اور چشمہ کوثر ان زخموں کو بھرنے سے قاصر رہیں گے ؛

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے

نشہ بہ اندازہ خسار نہیں ہے

ای کہ گفتم نہ وہی داد دل آری نہ وہی  
چشمہ نوشش ہمانا نہ تراود ز دلی  
ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند  
سر بہ راہ دم شمشیر جوائی نہ ہی  
آخر کار نہ پیدا ست کہ در تن فسد  
جیف گر تن بہ سگان سر کوئی نہ رسد  
گر تنزل نہ بود، ابر بہاری غالب  
کہ در افشائی وز افشاندہ شماری نہ ہی

زندگی بچا بچا کر کھنے کے لیے نہیں دوسروں کے کام آنے کے لیے ہے۔ کائنات قائم ہی انہی اصول پر ہے۔ تم جو خود کو بچا بچا کر رکھتے ہو اس سے کیا حاصل۔ جو خوش سولی کی زینت نہیں بنادہ رگوں میں ٹھہر کر رہ جاتا ہے۔ آگے چل کر اسی مضمون پر سان رکھتے ہوئے، اس کے مفہوم کو محدود کرتے ہوئے، اسے نئی معنویت دیتے ہوئے اقبال نے کہا:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ  
جو شکست ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

اقبال نے بات دل تک محدود کر دی، غالب نے پورے انسان کا احاطہ کیا تھا۔ ایک شعر کی طرف اور دھیان دیجیے۔ جہاں غالب نے بہ کمال ہنر شیخ شیراز کے اس قطع کی تلخیص کی ہے۔

ابر و باد و وہ و خورشید و فلک در کارند  
ما تو نانی بکف آری و بغفلت نہ خوری  
ہم از ہر تو سر گشتہ و فرماں بردار  
شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

غالب نے ایک شعر میں کہہ دیا کہ دائرہ کائنات میں چاند اور سورج تک بیکار نہیں بیٹھتے۔ پھر تو کون ہوتا ہے کہ خود کو کام کرنے کی زحمت نہیں دیتا۔ آگے چل کر غالب نے اس مضمون میں بانچین کا اضافہ کر دیا ہے، فرماں برداری کے تصور کے ساتھ جاں نثاری کے دستور کو بڑے حسن کے ساتھ جوڑ دیا ہے، جاں نثاری، پروانہ واری، دل افکاری، ان اشعار میں وہی زور بیان، وہی شکوہ ادا، وہی ترصیع وہی تساوی وہی وقار جلوہ گر ہے جسے ہم غالب کی فارسی غزل سے عام طور پر منسوب کرتے ہیں ایک بحر زخار ہے جسے قاری الفاظ و افکار کے دوہرے آئینہ میں موجزن دیکھتا ہے۔ خود شاعر اپنے آپ کو

قادر الکلامی، مضمون آفرینی اور گنج بخشی کے افتخار سے بچا نہیں پایا۔ کہتا ہے، تجھے ابر بہاری سے تشبیہ دینا کہ تو موتی ٹاتا ہے اور ان کا شمار نہیں کرتا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تشبیہ تیرے شایان شان نہیں، مضمون آفرینی محض فکر کا عمل نہیں ہے۔ اس کے لیے جو پا پڑ سیلنے پڑتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دل کو تخیل کے شکنجے میں کس کے پھوڑا لانا۔ یہاں بھی غالب نے آشوبِ تخلیق پر سے نقاب اٹھائی ہے جس فلسفہ حیات پر یہ غزل مشتمل ہے، اس کا اجمال ہے فرض شناسی، ہمدردی، جاں نثاری، سرفروشی، حرکت۔

می چکد فونم رگ ابرست آں فتراک ہائی	می سپد خاکم رم بادست آں شبیر نہئی
ننگ باشد چشم برسا طور و خنجر و ختن	غنچہ آسا سینہ خواہم جراحت نیز نہئی
غمرہ رازاں گوشہ ابرو کشادہ گیر است	آں خرام تو سن وایں جنبش ہمیز نہئی
گفتم آری رونق بازار کسری بشکنی	گرم کردی درجہاں ہنگامہ چنگیز نہئی
غالب از خاک کدورت خیزندم دل گرفت	اصفہاں ہی، یزدی، شیرازی، تبریزی ہی

برق رفتہ محبوب نے مجھے شکار کر کے فتراک میں ڈال دیا ہے، میرا خون ٹپکتا جا رہا ہے، میری مٹی بکھرتی جا رہی ہے۔ دشمن اور خنجر سے امید باندھنا میرے لیے شرم کا باعث ہے۔ ان سے تو اس وہ لگائے جو محبت کی جراحتوں کا ذوق نہ رکھتا ہو، میں تو کلی کی طرح آہستہ آہستہ جگر چاک ہونے سے لذت اندوز ہوتا ہوں۔ اس کے گوشہ ابرو سے غمرہ کس آن بان کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ ہائے رخش کا وہ خرام، ہمیز کی وہ جنبش۔

غالب میرا دل ہندوستان کی کدورت خیز زمیں سے اکٹا گیا ہے۔ یہاں جس دل کو دیکھو کدورت سے بھرا ہوا ملے گا۔ ہائے اصفہاں، ہائے یزد، ہائے تبریز۔ غالب کی افتادہ ذوق اور ان کی شعری دل چسپیاں ایران سے وابستہ تھیں اور اہل ہند کے پارے میں اپنے تجربات کے تحت وہ خوش عقیدہ نہیں تھے۔

ذیل کی غزل میں شاعر نے سکالہ کے بل پر قافیہ اور بدیف کو کتنے پر لطف ہیچ و خم دیے ہیں	
ای کہ گفتمی علم درون سینہ جان فرست ہٹ	خامشیم اتا اگر دانی کہ حق با ما ست ہٹ
ایں سخن حق بود گا ہی بر زبان ما رفت	چوں تو خود گفتمی کہ خوباں را دل از خار است



باری از خود گو کہ چونی، ورزمن پرسی پرس  
 بخت ناساز است آری یار بی پرواست بہت  
 نظم و نثر شور انگیزی کہ می باید بخواہ  
 ای کر می پرسی کہ غالب سخن یکتا است بہت  
 یہ بات سچ ہے لیکن کبھی بھی ہماری زبان پر نہیں آتی۔ اب جو تم نے خود ہی کہہ دیا کہ سینوں کا دل پتھر کا ہوتا ہے  
 تو میں بھی کہتا ہوں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔

پہلے تو اپنا حال بتاؤ کہ تم کیسے ہو پھر اگر میرا حال پوچھنا چاہتے ہو تو پوچھ دیکھو۔ یہاں حال یہ ہے کہ  
 قسمت ناموافق ہے اور محبوب تنافل برت رہا ہے۔ محبوب کی احوال پر سی گویا تقریب تھی، اپنی پتا دہرائی۔  
 اگر ایسی نظم و نثر کی تلاش ہے جو دل میں حشر برپا کر دے تو غالب کے پاس جاؤ۔ تم یہ جو پوچھ رہے  
 ہو کہ غالب شاعری میں یگانہ روزگار ہے، تو اس میں کسے کلام ہوگا۔ اپنی نظم و نثر کے تعارف کے لیے غالب  
 نے شور انگیزی کو چٹا ہے، یعنی وہ وصف جو دل میں ایک تہلکہ برپا کر دے۔

بزم بہشت و بادہ حلالت در بہشت	گر باز پرس رود ہداز من جواب خواہ
در روز ہائی فرخ و شبہائی دل فروز	صبا بروز ابر و شب ماہتاب خواہ
گل بوئی و شعر گوئی و گہر پاش و شاد باش	مستی ز بانگ بربط و چنگ و رباب خواہ
خون سیاہ نافہ آہو سپر بود ہد	از حلقہ ہائی زلف بتاں مشک ناب خواہ
در تنگنائی غنچہ کشالیش ز باد جوئی	در جو تبار باغ روانی ز آب خواہ
از شمع طور خلوت خود را چراغ نہ	از زلف حور خیمہ خود را طناب خواہ

ساری غزل داماں باغباں و کف گل فروش بنی ہوئی ہے جو شش و خموش کے ساتھ ٹھہراؤ اور  
 دھیمہ ہاؤ۔ یہ جرمہ جرمہ لطف اندوزی، کیسا سماں ہے کیا محفل ہے جو غالب کی غزل کی طرح بجی ہوئی ہے  
 گل خوشبوی، شعر آبار، گہر شا ہوار، شراب ناب اور بربط و چنگ و رباب، حلقہ گیسوئی صنم شمع طہ نے  
 اس بزم میں چراغ روشن کیا ہے۔ حوروں کی زلفیں، خیمہ کے لیے طناب کا کام کر رہی ہیں عیش و نشاط  
 حسن و طرب کا بانار گرم ہے۔

شعر کہو، موتی بکھیرو اور خوش رہو۔ بربط و چنگ و رباب کی نواسے مد ہوش ہو جاؤ کہ زندگی کا  
 حاصل اور شادمانی کی معراج یہی ہے۔ مشکناؤ کی جو بگڑا ہوا خون ہے، کیا حقیقت ہے اگر خوشبو کی جستجو  
 ہے تو معشوق کی زلفوں میں تلاکش کرو۔

حداز زہریر سینہ آسودگاں غالب

چہ منتہا کہ بردل ست جانِ ناشکیبارا

غالب آسودہ حال لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ ان آسودوں کا سینہ زہریر کی طرح ٹھنڈا ہے۔

اس میں نہ دلولہ ہے نہ امنگ، نہ خلش ہے، نہ اضطراب، نہ درد نہ محبت نہ آرزو، نہ جستجو ہے صبری اور بے تابی کے دل پر لاکھوں احسان ہیں کہ دل زندہ ہی ان کی بدولت ہے۔

بروئی برگ گل تا قطرہ شبنم نہ پنداری

بہار از حسرتِ فرصت ہندیاں می گزدلبہا

پھول کی پتی پر موتی چمکتے ہوئے دیکھ کر یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ شبنم کی بوندیں ہیں۔ یہ تو فصل بہار کے

دانت ہیں جن سے وہ اپنے گل رنگ ہونٹوں کو کاٹ رہی ہے۔ اس حسرت میں کہ کاش جہن میں ٹھہرنے کی مہلت مل جاتی۔ حسن تعلیل کس قدر دلکش ہے۔

بہ فیضِ شرع بر نفسِ مزور یافتی دستی

چوں آں دزدی کہ گیر دشمنہ نگاہاں بہتالبش

یہ شرع کا احسان ہے کہ اس کی بدولت میں نے اپنے فربہ کار نفس پر قابو پا لیا ہے، اس چور کی

طرح جسے چاندنی رات میں کو تو ال نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو، شرع کی روشنی کو چاندنی رات سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ کون کہہ رہا ہے؟

خرابی چوں پدید آمد، بطاعت داد تن ناہد

خمید نہائی دیوار سراگردید محرابش

جب خرابی ظاہر ہونے لگی، عمر کے بوجھ سے کمر جھک گئی تو زائد ہونے اطاعت کا راستہ اختیار کر لیا

مکان کی دیوار میں خم آگیا تو یکیں نے اسے محراب بنایا۔

قطرہ بکداخت بحر بیگراں نامید مش

من ز غفلت طوطی ہندوستان نامید مش

وہم خاکی ریخت در چشم بیاباں دید مش

بود غالب عند لیبی از گلستانِ عجم

غالب تو ایران کے چمن کا بلبل تھا۔ مجھ سے سہو ہوا کہ میں اسے طوطی ہند کہہ کر پکارنے لگا۔

بنشیں کہ آبِ گردش ساغرِ کینم طرح

در فصل دی کہ گشت جہاں زہریر ازو

سناچند نشنوی تو و صاحبِ حالِ خویش افغانہائی غیر مکرر کنیم طرح  
 از تار و پود نالہ نقابی دہم ساز و زوہرِ سینہ زلفِ معنبر کنیم طرح  
 غالب مشکل زمینوں کو فاتحانہ انداز سے زیرِ قدم لاتا ہے۔ اس کی غزلیں آہنگ افتخار سے  
 پر صدا ہیں۔ غالب کی قادر الکلامی اور اس کے اشعار میں مضامین نو کے انبار دیکھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ  
 افتخار کی نئے برحق ہے۔ جس شاعر کی غزل کا ہر شعر ظاہری دروہیت کے علاوہ معانی کا ایک جہاں اپنے  
 اندر رکھتا ہو۔ جس کی فکر کے تیج و خم کا ساتھ دینا قارئین کے لیے دشوار ہو، وہ اگر فخر و مباہات کا ساز چھیڑے  
 اور پیغمبر کی سخن کا دعویٰ کرے تو کیا عجب۔

اس وجہ سے غالب کی بہت سی فارسی غزلوں میں قصیدہ کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ تراکیب کی معنی  
 خیزی شکوہ الفاظ کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ اسے بجا طور پر ناز ہے کہ وہ ایک ہی بات کو ایک  
 ہی انداز سے دوبارہ نہیں کہتا۔ وہ گلدستہ معنی کو ہمیشہ نئے ڈھنگ سے باندھتا ہے۔ مذکورہ بالا اشعار  
 میں سے دوسرے شعر میں دکھتا ہے۔ تم کب تک نہیں سنو گے میں اپنی داستان سنائے جا رہا ہوں  
 ہر بار نئے انداز سے۔ داستان نہیں سنتے تو انداز بیان کی داد دو دو تخطا طب بیک وقت معشوق  
 اور قاری سے ہے۔

شاعر کو درد اور تخیل کی دولت کیا مل گئی دنیا جہان کا خزانہ مل گیا تخیل نے اسے وہ ذرائع انہاں  
 کر دیے ہیں کہ وہ خود محبوب کی تشکیل و تخلیق کر سکتا ہے۔

تیسرے شعر میں ہم اسے کارِ تخلیق میں منہمک پاتے ہیں اس کے سینہ سے درد کی شدت میں جو  
 دھواں اٹھ رہا ہے شاعر اس دھوئیں کو گیسوے شکیو بنانے کے کام میں لارہا ہے، آہ و زاری کا تانا بانا  
 محبوب کی نقاب کی شکل اختیار کرنے والا ہے۔ اس شعر میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ محبت جیسے جیسے  
 بڑھتی ہے محبوب کا تصور آسان ہوتا جاتا ہے۔

پیمائے رنگیت دریں بزم بہ گردش  
 ہستی ہمہ طوفان بہار است خزاں بچ

مغل کائنات میں ایک پیمانہ جو رنگوں سے لبریز ہے گردش میں ہے۔ ہستی طغیانی بہار کا نام  
 ہے، خزاں کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ یہ وہی خسر کی تصور ہے جس نے ناقدین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے۔

بادہ پر تو خورشید و یا باغ دم صبح  
مفت آناں کہ در آئند بہ باغ دم صبح  
آفتابیم بہم دشمن و ہمدردای شمع  
ماہلاکب دم شامیم و تو دارغ دم صبح  
غالب امروز بہ وقتی کہ صبحی زدہ ایم  
چیدہ ایم ایں گل اندیشہ ز باغ دم صبح  
صبح کا وقت ہے، شاعر میکشی کرہا ہے۔ سحر خیز لوگ چہل قدمی کے لیے نکلے ہیں۔ آفتاب طلوع  
ہو رہا ہے، شمعیں بجھائی جا رہی ہیں۔ مقطع میں شاعر قارئین کو بتا رہا ہے کہ یہ اشعار اس نے صبحی  
کی صحبت میں کہے ہیں۔

صبح کے پیالے سے نور خورشید کی شراب چمک رہی ہے۔ یہ دولت ان لوگوں کو ملنی ہے جو صبح  
کے جن میں داخل ہوتے ہیں۔

اے شمع تہلدار شمع ہم سے کہ مانند خورشید رخشاں ہیں بہ یک وقت دشمنی اور ہمدردی کا ہے ہم  
طلوع ہوتے ہیں تو تم بجھا دی جاتی ہو۔ یہ تو دشمنی کی بات ہوئی کہ ایک کے وجود کو دوسرا گواہ نہیں  
کرتا۔ ہمدردی اس بنا پر کہ شام ہمارے لیے صبح تمہارے لیے پیغام موت بن کر آتی ہے مرگ  
ناگہاں دونوں کا مقدر ہے۔

ہرزہ مجھ جلوہ حسن یگانہ ایست  
گویا طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست  
حیرت بہدہنلی سروپامی برد مرا  
چوں گوہراز وجود خودم آب و دانا ایست  
پابستہ نور دخیالی چو دار ہی  
ہر عالمی ز عالم دیگر فناء ایست  
خود داریم بہ فصل بہاراں غنا گینخت  
گل گون شوق را رگ گل تازیانا ایست  
ہرزہ در طریق وفائی تو مندری  
ہر قطرہ از محیط خیالت کرانہ ایست  
در پردہ تو چند کنم ناز عالمی  
داغم ز روزگار و جراحت بہانہ ایست

کائنات کا ذرہ ذرہ معشوق حقیقی کے حسن بے مثال میں محو ہے۔ گویا کائنات ایک آئینہ خانہ ہے جس

میں جس جہت سے جس زاویہ سے دیکھیے معشوق کا پر تو پڑ رہا ہے۔

خود انحصاری کے مضمون کو پھر دہرایا جا رہا ہے۔ انسان گوہر ہے، بنیاد خود ایک دانہ جس کی  
چمک اس کی آب ہے۔ آب و دانا دونوں فراہم ہیں۔ پھر کیا ضرورت کہ آب و دانا کی تلاش میں انسان  
دیوانہ وار گھومتا رہے۔



دیے تو میں یے دیے رہتا ہوں، خود کو سنبھالے ہوئے۔ لیکن موسم بہار میں میری خودداری  
 خود نگہداری غماں تر دہستی ہے۔ سمندر شوق کے لیے رگِ گل (پھولوں کا نظارہ)، تازیانہ کا کام کرتا ہے۔  
 جتنی دارم کہ گوئی گھر، بروئی سبزہ خراہد      زمیں چوں طوطی بسمل پید از ذوق رقائش  
 بنائی خانہ نام ذوق خرابی داشت پنداری      کز آمد آمد سیلاب در قصت یہ دیوارش  
 اپنے محبوب کی خوبی کیا بیان کروں، یہ عالم ہے کہ اگر وہ سبزہ پر دم گل گشت خرام ناز میں آجائے  
 تو اس کے حسن خرام پر فریفتہ ہو کر زمیں طوطی بسمل کی طرح ٹپٹپے لگے۔ مضمون میں جو غلو ہے اس پر نہ  
 جاسیے۔ یہ دیکھیے کہ محبوب کے حسن خرام سے شاعر کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اندازِ خرام کا تذکرہ  
 غالب نے کئی بار ستائشاً اور حریفانہ کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے میرے گھر کی بنیادیں بربادی کا ذوق پنہاں کر دیا گیا تھا۔ سیلاب کو آتے دیکھ کر  
 اس کی دیواریں وجد میں آگئیں، رقص کرتے لگیں۔ شاعرانہ استدلال غالب کو مرغوب ہے کہ وہ تحلیل  
 کو کار فرمائی کا موقع دیتا ہے۔ مری تعمیر میں مضمون ہے اک صورت خرابی کی۔  
 غم افگند در دشتی کہ خورشید در خشاں را  
 گدازد زہرہ وقت جذب شبنم از سحرش  
 غم نے مجھے ایسے یاباں میں لا ڈالا ہے جہاں خورشید اوس کے قطرہ کو اٹھانے کی کوشش کرتا  
 ہے تو اس کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔

زر شکب سینہ گرمی کہ دارم  
 کشد از شعلہ بر خود خنجر آتش  
 میرے دہکتے ہوئے سینہ کے رشک میں آگ شعلہ کا خنجر اٹھا کر اپنے پہلو میں بھونک  
 لیتی ہے۔ تشبیہ میں کتنی ندرت ہے۔

بان موج می بالم بہ طوفان  
 برنگ شعلہ می رقصم در آتش

موج کی طرح میں طوفان میں فروغ پاتا ہوں۔ آگ کے اندر شعلوں کی طرح ناچتا ہوں۔  
 غالب کی ہنگامہ پسند اور شعلہ خوبصورت کو سکون، سکوت، ٹھنڈک سناٹا اور خاموشی

راس نہیں آتی۔ گھر کی رونق ایک ہنگامہ پر موقوف ہے۔ آگ ایک استعارہ بن گئی ہے گرمی محفل اور دل گرمی اور حرکت اور نشوونما کے لیے، وجد، اور رقص کے لیے اضطراب، خلش، اندیشہ اور بے تابی کے لیے۔ حرکت، خرام، وجد، رقص، موج، طوفاں، بالیدن و کابیدن، ذوق، شوق، آرزو، جستجو، رشک، بے تابی، شعلہ، داغ، سوز، گداز، آتش سیال، تشنگی — یہ کردار غالب کے جہان تخیل میں خفئیہ یا علانیہ گرم کار نظر آتے ہیں۔

شب آتشیں روی گرم زند خوانی ہا ست	کز لبش نواہرم در شرف ثانی ہا ست
در کشاکش ضعفم نگد رواں از تن	ایکدمی نمی میرم ہم ز ناتوانی ہا ست
از حمیدن پشتم روی برفقا با شد	تا چہا دریں پیری حسرت جوانی ہا ست
کشتہ دل خویشم کز ستمگراں یکسر	دیدم دلفریبی ہا گفت ہربانی ہا ست
سوئی من نگہ دارد چیں فلندہ در ابرو	با گراں رکابی ہا، خوش بک عانی ہا ست
با چیں تہی دستی بہرہ چہ بود از دستی	کار ہماز سرمستی آتشیں ثانی ہا ست
ایکہ اندر میں دادی مزوہ از ہما دادی	بر سرم ز آزادی سایہ را گرانی ہا ست
ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیروں	با طہوری وصایب محو ہمزبانی ہا ست

مطلع سے مقطع تک غزل پڑھ جائیے۔ ہر شعر میں کوئی نئی بات ہوگی، نیا مضمون ہوگا، بات کو کہنے کا انداز نیا ہوگا۔ ہر غزل کا یہی حال ہے۔ غالب کے ساتھ تیز روی کی کوشش بہت پر خطر ہے۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ امریکن سیاحوں کی طرح دھیتا چھوتے ہوئے نکل جائیے گا۔ عبرت کے لیے نہیں، عبرت کے لیے، بظاہر اندوزی کے لیے یہاں ہر قدم پر خاک راہی کر برآں می گزری ساکن باش ہر شعر پرز کے بنا کام نہیں چلے گا۔ رکے، غور کیجیے، لفظی اور معنوی محاسن اور مضمرات اور مفاہیم تلاش کیجیے۔ پھر آگے بڑھیے۔ پہلی بار تیزی کے ساتھ ورق گردانی کرنا چلا گیا۔ اکثر آگے نکل جانے کے بعد خیال آیا کہ جس شعر کو ہلکا سمجھ کر چھوڑ آئے تھے وہ گنجینہ معنی کا طلسم تھا۔ چناں چہ واپس گیا۔ آج شب وہ شعلہ و آتش پرستوں کی مقدس کتاب ژند کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کے دامن سے ہر لمحہ چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ جو تصویر کھینچی جا رہی ہے اس کے آب و رنگ ہیں

”آتشیں روی“ ”گرم“ ”شرافتانی“ ”دم“ اور نواز کے سپرد یہ خدمت ہے کہ وہ آگ کو بھڑکاتے رہیں، چنگاریاں اڑاتے رہیں۔ غالب کے یہاں جو بات کہی جاتی ہے وہ منطقی اعتبار سے استوار ہوتی ہے خواہ استدلال شاعرانہ ہو۔ اور قاری کا ذہن تزئینات اور ترصیعات کی طرف نہیں بھٹکتا، لیکن سجاد ثیں اور بناؤ میں خوشی کے ساتھ اپنا کام کر جاتی ہیں۔ صرف سنواری اور سجاتی ہی نہیں بلکہ شعر کے حسن، تاثیر اور تمکّل کو بڑھا جاتی ہیں۔

میری کمزوری کی کشاکش کے باعث جہاں کنی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ روح کا جسم کے ساتھ رشتہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ یہ کمزوری کا ثمرہ ہے کہ میں ابھی تک مر نہیں پایا۔ قولِ محال کا انداز دیکھیے کہ کمزوری جو موت کی معادن اور اس کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ موت کے لیے سدا راہ بن گئی ہے کمزوری کے زیر اثر مرنے والا اس رشتہ کو توڑ نہیں پایا جو جان کو جسم سے جڑا رکھتا ہے۔ شاعر کا محبوب مشغلہ یہ ہے کہ بہت سے مسلمات کو الٹ پلٹ دے، ہمیں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دے، اور یہ سمجھا دے کہ اشیا اور حقیقت کا ادراک زاویہ نگاہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ سوال و جواب کے انداز میں کسی نے کہا تھا۔

چرا خم گشتہ می گردند پیرانِ جہان ندیدہ

بزیرِ خاک می جویند ایامِ جوانی را

جہان ندیدہ بوڑھے جھکے ہوئے کیوں چل رہے ہیں، اپنی جوانی کے ایام کو خاک کے نیچے ڈھونڈ رہے ہیں۔ غالب کہتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے میں اس قدر جھک گیا ہوں کہ چلتا آگے کی طرف ہوں اور دیکھتا پیچھے کی طرف ہوں۔ مشرق کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جائے، پھر دوہرے ہو کر دیکھیے بظاہر سلمے آپ کے مشرق ہے لیکن نظر مغرب آئے گا۔ بریزیل کے شہرہ آفاق کھلاڑی ”پیلے“ نے ایک میچ میں گول اسی انداز سے کیا تھا۔ گیند (فٹ بال) لے کر اس نے اپنے گول کی طرف رخ کیا۔ مخالف سمجھے کہ اپنے کسی ساتھی کو جو پیچھے سے آرہا ہے، بال دے کر خود آگے بڑھے گا۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اس نے دوہرا ہو کر گیند مخالف ٹیم کے گول میں ڈال دی۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بڑھاپے میں جو جھک گیا ہوں، دوہرا ہو گیا ہوں، وہ اس وجہ سے ہے کہ میں پیچھے کی طرف جوانی کی حسرت میں دیکھ رہا ہوں۔

دل نے مجھے مار رکھا ہے، دھوکے پر دھوکہ دیتا رہا ہے۔ معشوق نے مجھے دھوکہ دیا، دل نے کہا کہ وہ تم پر

کرم کر رہا ہے۔ میں ایک ہی سوراخ سے دو بار ڈسا گیا۔ پہلے معشوقوں نے فریب دیا، پھر خود میرے دل نے۔ اس کی نگہ التفات میری طرف ہے، لیکن ابرو پر بل پڑے ہوئے ہیں۔ رکاب اس قدر بھاری اور عنان اس قدر ہلکی۔ نگہ التفات سے ذوق و شوق کی خبر ملتی ہے۔ ہلکی عنان سر پرٹ دوڑنے کا پتہ دیتی ہے۔ چین جبین کی آڑ میں نگہ التفات برق کی سرعت کے ساتھ اپنا کام کر کے چلی گئی۔ چین ابرو کو گراں رکابی سے استعارہ کرنے کا کوئی صوری جواز نہیں ہے۔ لیکن استعارہ حسن تاثیر سے مملو ہے کہ یہاں ذہنی اور وجدانی کیفیات کی تمثیل ملحوظ ہے۔ یہاں نہ قصہ کو دخل ہے نہ ظاہری مشابہت کو۔ رقیب کے ساتھ عتاب، میرے ساتھ حجاب۔ کیا خوب ہے دلربائی کی وہ ادا، کیا قاتل ہے جانفشانی کا یہ انداز۔

ہم تو خالی ہاتھ ہیں، ہمیں زندگی سے کیا ملنے والا ہے۔ ہمارا شیوہ ہے سستی میں، عالم وجد و رقص میں آستین جھاڑ دینا۔ سعدی نے کہا تھا:

قرار در کفِ آزادگان نہ گیرد مال

نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

آزاد منش لوگوں کے ہاتھ میں روپیہ نہیں ٹھہرتا جیسے عاشق کے دل میں صبر جیسے چھلنی کے اندر پانی۔ آستین جھاڑنے کے دو مفہوموں نے شعر کے لطف کو بڑھا دیا ہے اور اس میں تاثیر پیدا کر دی ہے۔ دعوے کو دلیل سے کک ٹلی ہے۔

تم نے مجھے بشارت دی ہے کہ میرے سر پر ہما سایہ نکلے گا یعنی اقلیم سخن کی تابعداری میری قسمت میں لکھی ہے۔ میری شعری عظمت کا ایک عالم اعتراف کرے گا۔ لیکن مجھے اس سے کیا، میرے جیسے آزاد مزاج انسان کو ہما کا سایہ بھی گراں گزرے گا۔

خارج از ہنگامہ سرتا سر بہ بیکاری گزشت

رشتہ عمر خصمہ مد حسابی بیش نیست

حضرت طویل عمری کی اہمیت حساب لگانے سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کی ساری زندگی بیکاری میں اور بے کیف اور بغیر زبرد بزم گزری۔

شوخی اندیشہ خویشست سرتا پائی ما

مار و پود، مستی مانہ سیج و تابانی بیش نیست



ہمارا وجود سر سے پیر تک شوخی اندیشہ، پرواز فکر، قدرت تخیل سے عبارت ہے۔ تیج و تاب ہی ہماری زندگی کا تانا بانا ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جس میں مد و جزر اور نشیب و فراز نہ ہوں۔

گر پس از خور بیا نصاب گر اید چه عجب      از حیا زوی بما اگر نہ نماید چه عجب  
بودش از شکوہ ضرور نہ سری داشت بمن      بزم ارم اگر از حیرت نماید چه عجب  
آنکہ چوں برق بیکجائی نہ گیرد آرام      گلہ اکش در دل اگر دیر نہ پاید چه عجب

اگر وہ ظلم کے بعد انصاف کی طرف مائل ہو۔ یعنی اپنے جو دوستم پر منفعل ہو تو حیرت کی کیا بات ہے  
پشیمانی اور شرمساری کی وجہ سے اگر وہ ہمیں مزید کھائے تو یہ کوئی ایسی بے محل بات نہیں ہے۔ حیا سے ہماری  
طرف رخ نہ کرے تو کیا تعجب۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارا دلبر جو پریشانی ہو تو ہم سے چھپ کر اس نے  
جوڑ میں اور اضافہ کر دیا۔

دوسرے شعر میں بھی شاعر نے محبوب کی ستم ظریفی کو شکوہ کا خراج ادا کیا ہے۔ محبت اسے میری قبر کی  
طرف کشاں کشاں لے آئی۔ زندگی میں وہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ڈر تھا کہ میں شکوہ کر کر کے اسے  
عاجز کر دوں گا۔ حسن تلافی دیکھیے کہ میرے مرنے کے بعد میرے پاس آیا ہے۔

غالب نے معشوق کی ستم ظریفی کا تذکرہ ہمیشہ بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔ بالغ نظر شاعر  
جب کچھ کہتا ہے تو اس کا ناولہ مخاطب سامنے کے سیاق و سباق سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔  
مجازی معشوق کی ستم ظریفی ذہن کو اس معشوق کی ستم ظریفی کی طرف لے جاتی ہے جو پردہ رنگاری میں چھپا ہوا ہے۔ ان لوں  
کو ستم ظریفی کا تختہ مشق بنا نا قدرت کا محبوب شغلہ ہے۔

وہ جو بلی کی طرح ایک پل نہیں ٹھہرتا، اس کی شکایت بھی اگر دل میں نہ ٹھہرے تو یہ حیرت کی بات  
نہیں ہے۔ یہاں بھی شاعر نے عام رد عمل اور روایتی طرز فکر کو پلٹ دیا ہے۔

از ہر بن مو چشمہ خوں باز کشاد م  
آرایش بستر ز شفق می کنم امشب

میرے ہر بن مو سے چشمہ خوں کا فوارہ جھوٹ رہا ہے۔ آج میں بستر کو شفق سے سجا رہا ہوں۔  
مضمون فرسار دلیف اور دشوار خوانی سے عہدہ برآ ہونے کے بعد غالب کو احساس ہوتا ہے کہ  
اس کے ملکہ شعر کو قافیہ پیمانی زیب نہیں دیتی، پچاساں چہ غزل کے اختتام پر لا حول پڑھنے کے انداز سے وہ

اعتراف کرتا ہے کہ قافیہ پیمائی کہہ کے وہ قلم اور کاغذ پر ظلم کر رہا ہے۔

آمد و آورد، اخلاص و تصنع کا فرق اس کی نگاہ سے مخفی نہیں ہے۔ موشگافیاں اور مضمون آفرینیاں برحق، جذبات و تخیل اور ابداع و اختراع پر پابندیاں ناروا۔ کوئی بڑا شاعر اس بات پر راہنی نہیں ہو سکتا کہ قافیہ کو مضمون کا سرچشمہ ٹھہرائے اور قافیہ کے سایہ کے تحت مضمون آفرینی کرے۔ ”شفق“ ”طبق“ ”ورق“ کے قافیوں کے تحت ردیف ”امشب“ کی تاریکی میں درخشاں شعر نکالنے کے باوجود غالب کو یہ بات کھٹک رہی تھی کہ مضمون قافیہ کا تابع فرمان بن جائے۔ اسد خستہ جاں کی آزاد مردی تخلص میں رنگ لائی اور شاعر نے اس طرز شعر گوئی سے اپنی برات کا اعلان کر دیا۔ جس میں قافیہ شعر کی اساس ہو۔ قافیہ شعر کا جزو ہے۔ ایک اہم جزو۔ اور یہ زور آہنگ اور زینت کے کام آتا ہے۔ یہ سب تسلیم لیکن اگر قافیہ کو فکر کا سرچشمہ بنادیا تو فکر مر جھا جائے گی۔ تسلسل تو ٹوٹے گا ہی، وحدت تاثیر بھی متاثر ہو جائے گی۔ قافیہ سے تخیل کی فرماں دہی کا کام یا گیا تو تخیل کے برکت پر جائیں گے۔

کاندر دلم گزشتن بادوست ہم نشینی است  
سیلم برخت شوئی، برقم نخوشہ چہ نیست  
واند کہ جاں سپردن از عافیت گزینیست  
در غمرہ زود رنجی، آری ناز نینیت  
اوسوئی من نہ بیند دانم ز شرم گنیت  
وہیب من بپشتاں خلدی کہ استینیت  
ہنگامہ ام اسیری، اندیشہ ام حزینیت  
چنداں کہ ابر نیساں در گوہر آفرینیت

یاد از عدد نیارم دایں ہم ز دور بینی است  
در عالم خرابی از خیل منما نم  
میرم ولی بہ ترسم کز فرط بدگسائی  
در بادہ دیرستم، آری ز سخت جانیت  
من سوئی او بہینم، داند زلی جیاست  
ذوقیت در ادایت، قاصد تو وضایت  
نہیں خو پچکاں نواہا در یاب ماجرا ایم  
نازم بزود یابی نازد بگوکش و گردن

کتنی پر لطف ہے یہ غزل، عجیب کیفیت ہے۔ مضمون ہر شعر کا مختلف لیکن فضا پوری غزل

کی واحد۔

رقیب کا خیال بھی میں نے دل میں نہیں آنے دیا۔ میرا یہ طرز عمل دورانہیتی کی بنا پر ہے۔ رقیب کو یاد کروں گا، میرے دل میں اس کا گزر ہو گا۔ وہاں اسے میرے محبوب کے ساتھ بیٹھنے کا موقع مل جائے گا جو ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے۔ بظاہر شعر کا حسن خیال آرائی پر مبنی ہے، لیکن ہمارا ذہن اس بیداری

سچائی کی طرف کیوں نہیں جاتا کہ ہم ایسے دل کو جو محبوب کا مسکن ہے کدورت اور عداوت سے ناپاک کیوں کریں۔ محبت، پاکیزہ محبت یکسوئی کی طالب ہوتی ہے۔

اس خراب اور دیران دنیا میں میرا شمار صاحبانِ زر میں ہوتا ہے۔ جبھی تو مجھے سیلاب اور بجلی جیسے ملازمین کی خدمات حاصل ہیں۔ ایک میرے کپڑے دھونے اور دوسرا میرے بچے کچھ سامان کو ٹھکانے لگا دینے پر مامور ہے۔ یہ داستانِ عبرت تھی جو طنز کے پیرایہ میں بیان کی گئی۔

مرنے میں تو مجھے کوئی تامل نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ یادگاہیں محبوب مرحوم کو عافیتِ طلبی پہ محمول کرے گا۔

شراب کا نشہ مجھے دیر سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میری سخت جانی کی وجہ سے ہے۔ ہنگامِ ناز ذرا سی بات پر ناراض ہو جانا تمہارے نازنین ہونے کی بنا پر ہے۔

میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ سوچتا ہے کہ میں بے حیائی کی وجہ سے اسے گھور رہا ہوں۔ وہ میری طرف نظر نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حیا حائل ہے۔ اس کی بدگمانی میری محبت کو بے حیائی قرار دیتی ہے۔ میرا حسنِ ظن اس کی بے مہری کو حیا پر محمول کرتا ہے۔ یہ میں تفادیتِ رہ از کجاست تابجا۔

میرے قاصد آج تو تمہارے انداز میں طرب کا عالم ہے۔ خدا را اس فرد کس کو جیسے تم آستیں میں چھپائے ہوئے ہو۔ میرے گریباں میں ڈال دو۔ نامہٴ محبوب کی شمیم عاشق کے شام تک پہنچ گئی ہے اس کے ذوقِ طلب کی سرستی قاصد کو پُر امید لگا ہوں سے دیکھ رہی ہے۔

ماہِ نیساں کا بادل موتی پیدا کرنے میں کیا مصروف ہو گیا کہ ہم دونوں کی عید ہو گئی۔ میں تو اس پر نازاں اور وجد گناہوں کہ ہر اور مغاں گہرے شہوار دستیاب ہو گئے اور محبوب اپنے کانوں اور گردن پر نازاں ہے کہ ان کے حسن کو موتیوں نے اور چمکا دیا۔

بہ عرضِ شہرتِ خویش احتیاجِ مادارد	چو شعلہ کہ نیازِ اوقد بہ خارِ خویش
صفا نیافتہ قلب از غش و مرا عریست	کہ غوطہ می دہم اندر گداز ہر نفسش
ز رنگ و بوئی گل و غنچہ در نظر دارم	غبارِ قافلہٴ عم و نالہٴ خبرش
جگر ز گرمیِ این جرمہ تشنہ تر گردید	فغاں ز طرزِ فریبِ نگاہِ نیم ریش
بہارِ پیشہ جوانی کہ غالیبش نامند	کنوں بہ بیس کہ چہ خوں می چکد ہر نفسش

اپنی شہرت کے اظہار کے لیے اسے ہماری ضرورت ہے۔ شعلہ کی طرح کہ اسے ظاہر ہونے کے لیے خار و خس کی احتیاج ہوتی ہے۔ استدلال بردوش تشبیہ کس قدر فیصلہ اثر ہے۔

ایک عمر گزری میں اپنے دل کو ہر گھمٹاتی ہوئی سانس میں غوطہ دے رہا ہوں۔ لیکن ابھی تک وہ آلائش سے پاک نہیں ہوا۔ حیرت انگیز ہے شاعر کے ذہن کی رسائی اور صلاحیت ادا چند لفظوں میں کتنی بڑی بات کہہ دی، کتنی اچھی بات جو لفظاً بھی صحیح ہے اور معناً بھی۔

پھول اور کلی کے رنگ و بو کو دیکھ کر میرا ذہن عمر کے قافلے کی گرد اور گوج کی گھنٹی کی طرف جاتا ہے۔ عمر کو اتنی ہی ثبات ہے جتنی پھولوں کو۔

اس کی نیم نگاہ کیسا فریب دے گئی۔ اس جرم نے جل کر کی پیاس کو اور بڑھا دیا۔ وہ باغ و بہار جوان جس کا نام غالب ہے، ہائے ہائے دیکھو اب اس کی ہر سانس سے ہوا ٹپک رہا ہے۔

پھول نہ میرد قاصد اندر رہ کر رشکم بر نہ تافت  
از زبانت نکتہ ہائی دلنواز آوردنش

قاصد کے راستہ میں مار سے جانے پر حیرت کیوں کرتے ہو۔ رشک نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ تہائی زبان سے دلنواز باتیں سننا پھر مجھے سناتا۔ غالب رشک کے مضمون کو بہت سے اردو اور فارسی اشعار میں باندھا ہے لیکن یہ شعر اس لیے منفرد ہے کہ یہ رشک کی اس شدت کی خبر دیتا ہے جس نے قاصد کو قتل کر دیا۔ محبت جو نہ کروادے وہ کہہ ہے۔

آنچه ہمدم ہر شب غم بر سرم می بگذرد  
ہر سحر یکسر بہ دیوار سریش می نویسد  
ای کہ بیایارم خرامی گردل و دست بہت  
نام من در رہز بر خاک پایش می نویسد  
بر کج غالب تخص در غزل بینی مرا  
می خراش آں را و مغلوبی بجایش می نویسد

اے ہم نشیں میرا ایک کام کر دیا کہ۔ ہر شب غم بھر پر جو گزرتی ہے۔ علی الصباح اسے اس کے مکان کی دیوار پر لکھ دیا کہ۔ محبوب کو اپنے حال نام سے ہر روز باخبر رکھنے کی یہ تدبیر پہلے کسی کو نہیں سوچھی تھی۔ دیوار پر تحریر کی یہ نئی تعبیر ہے۔

تم تو میرے محبوب کے ساتھ ٹہلنے جاتے ہو۔ اگر ہمت اور دسترس ہو تو راہ میں اس کی خاک پاؤ



میرا نام لکھ دیا کرو، مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

عزیزوں میں جس جگہ میرا تخلص غالب دیکھو اسے پھیل ڈالو اور اس کی جگہ مغلوب لکھ دو۔ لیل و نہار اور آلام روزگار نے غالب کی کمر توڑ دی۔ وہ شاعر سرفرازی اور افتخار جس کا شیوہ تھا۔ ہتھیار ڈال بیٹھا اور خود کو مغلوب سمجھنے لگا۔

یا پیش ازیں بلائی جگر تشنگی نہ بود      یا چوں من التفات بر جیوں نہ کردہ کس  
یارب بزاہد از چہ دی خلد را نگاں      جو رمتاں ندیدہ و دل خوں نہ کردہ کس  
یا تو اکس سے پہلے بگر کی پیاس کا وجود ہی نہ تھا؛ یا کوئی میری طرح تو نہا ہوا نہ تھا کہ دریا کا دریا  
پنی جائے اور پیاس نہ بچھے۔ محبت کی پیاس، اعتراف کی طلب، شہرت کی تمنا، قدر کی آرزو۔ ان سب  
نے مل کر پیاس کو چہار آفتہ کر دیا تھا۔

یارب زاہدوں کو مفت میں جنت کیوں دی جا رہی ہے۔ پھر یہ کاہے کا انفام ہے، کس بات  
کی تلافی ہے؛ انھوں نے نہ تو حسیں کا ظلم دیکھا ہے، نہ محبت میں دل خوں کیا ہے۔

لطفی بہ تحت ہر نگہ خشمگیں شناس      آرائش جبین شگرفاں ز چین شناس  
بی پردہ تابِ حرقی رانو ما جو      خوں گشتن دل از مرثہ و آسین شناس  
آرایش زمانہ ز بیداد کردہ اند      ہر خوں کہ ریخت غانہ بوئی زمین شناس  
بی غم نہاد مرد گرامی نہ می نمود      نہ ہار قدمہ خاطر اندوہگیں شناس  
غالب مذاق مانواں یافتن ز ما      روشیوہ نظیری و طرز حزیں شناس  
مطلع کتنا درخشاں ہے۔ ہر غضب آلود نگاہ کے نیچے ایک عنایت چھپی ہوئی ہے۔ اسے  
پہچاننے کی کوشش کرو۔ ان طرہ دار حسینوں کا جمال چیں جیں سے دو بالا ہو جاتا ہے۔

دنیا کو ظلم سے زینت دیتے چلے آئے ہیں۔ بہتے ہوئے ہونے سدا ز میں کے پھرہ کے لیے غانہ کا  
نام کیا ہے۔ خونریزیوں کے عقب میں بہا آئی ہے۔ تہذیب کی گلکاری شہیدوں کے ہونے ہوئی ہے۔  
یہ پردہ بر اندازہ شعرا انسانی تہذیب کے ارتقا کا اجمال ہے۔

غم کے بغیر انسان کی طبیعت کو وزن اور وقار نہیں ملتا، خلا غم آشنادوں کی قدر کرنا سیکھو۔ یہ بات  
وہی اہل نظر کہہ سکتا ہے جو انسانی نفسیات پر عبور رکھتا ہو، اور جس نے معنی خیز نگاہوں سے زندگی کو

دیکھا ہو۔

غالب ہمارا ذوق ہم سے پا جاؤ، یہ ممکن نہیں۔ جاؤ پہلے نظیری کے اسلوب اور علی حزیں کے پیرایہ بیان کو پہچانو۔ یہاں بھی زبان کو غدا تلے دبا کر بات کی جا رہی ہے۔ ایک تو سیدھا سادا مفہوم ہے کہ ہم شاعری میں نظیری اور علی حزیں کی روایت کے امین ہیں۔ دوسرے ٹوٹی کے ساتھ وہی افتخار کی لئے جہت لگانا ٹھیک نہیں۔ ہم تک پہنچنا ہے تو منزل بہ منزل آؤ۔ پہلے علی حزیں اور نظیری کو سمجھو، پھر غالب کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ رستم زماں گا ماکا ہی دستور تھا۔ کوئی پہلوان مبارز ہونا چاہتا تھا تو جواب ملتا کہ پہلے حمید سے نر کر دیکھ لو۔

مصنوع کے خاتمہ پر اگر یہ امید کی جائے کہ غالب کی فارسی غزل کی یہ رو نمائی ان قارئین کو جو فارسی زبان سے واقف ہیں غالب کے فارسی دیوان کو پڑھنے پر آمادہ کرے گی۔ تو یہ بات کوئی بے محل نہ ہوگی۔ معذرت البتہ ان قارئین سے کہ نہ سب جس کی دسترس فارسی زبان تک نہیں (اور جن کی تعداد زیادہ ہے) کہ اشعار کا دوسری زبان میں منتقل کرنا بالعموم سعی لا حاصل ہوتا ہے۔ بالخصوص جب وہ اشعار غالب کے ہوں جس کے پیچ و خم، زیر و بم کا ساتھ دینا آسان نہیں۔ غالب کی فارسی غزل، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ طبعی بندئی الفاظ اور سجاوٹوں اور بناوٹوں کے ساتھ مضامین کا خزینہ اور معانی کا گنجینہ ہے کہ چلتی ہے اس کا تخیل بیک وقت بلند پرواز اور طرصار ہے نئے انداز سے بانچین کے ساتھ بات کہنے میں غالب کو خاص ملکہ ہے۔ اسلوب کی تراش خراش، پیرایہ بیان کی کج کلاہی وہ وصف ہے جو غالب پر ختم ہو گیا۔ اس کی اردو غزل میں یہ عمل فارسی غزل سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ غالب کا یہ پُر اعتماد اعلان برحق ہے کہ وہ کسی بات کو دوبار ایک ہی ڈھنگ سے نہیں کہتا۔ اس کا تخیل کان ہے، عقل یمن کی اس کے افکار آسمان پیمانہ کا ایک قلیل حصہ اشعار کا پسیر اختیار کر پاتا ہے۔ اس کا رخانے میں جہاں وہ شعر ڈھالتا ہے مشاہدہ اور تخیل باہم مل کر ایک آمیزہ تیار کرتے ہیں جو ہر آن نئی شکل اختیار کرتا ہے نئے سانچے قبول کرتا ہے، جہاں جو اس کی دریا فتیں فکر کی اڑانوں کے ساتھ گرم اختلاط نظر آتی ہیں۔ جہاں مرنی اور غیر مرنی کا اختلاف ختم اور ارتباط شروع ہو جاتا ہے۔ شاعر نے انسانی نفسیات کا جو ادراک تجربہ کے وسیلے سے حاصل کیا ہے، وہ اشعار میں لطافت کے ساتھ منعکس ہوتا ہے جس دیار کی سیر ہم دیوان کے صفحات میں کرتے ہیں وہاں یا اس اور افسردگی کا گزر ہی نہیں۔ وہ دیار دلوائے، انگ، محبت، حرکت اور شعلہ و شرار سے تابناک ہے۔ یہاں

خلش ہے، رشک ہے، بدگمانیاں ہیں، شکوہ ہے، شوخی ہے، شگفتگی ہے، پھیڑ چھاڑ ہے، محبت ہے جس میں سے کبھی کبھی بے ججائی جھانکتی ہے۔ لیکن بات وزن اور وقار کے ساتھ کہی جاتی ہے کس طرح کہا جا رہا ہے۔ یہ کیا کہا جا رہا ہے سے کم اہم نہیں۔ بات کس طرح کہی جائے، غالب کو اس کا حیرت انگیز اور حسن خیز سلیقہ ہے۔ فارسی میں غزل حریفانہ انداز سے کہی گئی ہے، گویا شعرائے متاخرین سے مبارز ہونا ہے۔ تفاخر کی لئے تیز ہونے کے باوجود گراں نہیں گزرتی۔

پانچ سو ساٹھ غزلیں ہیں، ۳۷۶ صفحات پر پھیلی ہوئی، کوئی چھ ہزار اشعار پر مشتمل۔ فارسی پر شاعر کو تقریباً اہل زبان کی سی قدرت ہے۔

ای کہ نبوی ہر چہ نبود در تماشا لیش پیچ نیست غیر از سیمیا عالم بہ سودا لیش پیچ  
موجہ از دریا شعاع از ہر حیرانی چراست موحاصل مدعا باش و ہر اجزائش پیچ  
آخر از مینا بجاہ و پایہ انسزوں نیستی بندہ ساقی شود گردن زایما لیش پیچ  
خود جب تیرے وجود نہیں تو ان کی طرف گونہ خاطر کیوں، ان کی فکر کس لیے، جو تیری طرح ہے وجود ہیں۔ دنیا تو فریب نظر ہے اس کی تمنا میں کیوں پھنستا ہے۔

موج دریا سے اٹھتی ہے، کرن خورشید سے پھوٹتی ہے۔ تم اس میں حیران کیوں ہو، اصل مقصود میں خود کو محو کر لو۔ اس کے اجزا اور مظاہر سے نا ابلو۔

آخر، تم مرتبہ اور حیثیت میں مینا سے بڑھ کر نہیں ہو، پھر ساقی کے غلام کیوں نہیں ہو جلتے، اس کے اشارے سے سرتابی کیوں کرتے ہو۔ مینا کے تصور کا تاثر ساقی کی گردن تک پہنچتا ہے۔

بادہ پر تو خورشید وایارغ دم صبح مفت آناں کہ در آئند بہ باغ دم صبح  
آفتابیم ہم دشمن و ہمدردای شمع مابلک دم شامیم و تو دارغ دم صبح  
غالب امروز بہ وقتی کہ صبحی زدہ ایم چیدہ ام ایں گل اندیشہ ز بلغ دم صبح

وہ لوگ جو مزا نہ دھیرے باغ کی سیر کو جاتے ہیں۔ انھیں شعاع خورشید کی صہبا اور جام سحر مفت ہاتھ آتے ہیں۔ شاعر کو طلوع خورشید کا حسن منظور کر دیتا ہے۔

اے شمع تم اور ہم ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں اور دشمن بھی ہمدرد اس لیے کہ ہمارے وجود کا آفتاب شام کی بھونک سے بھج جاتا ہے اور شمع کی روشنی طلوع سحر کی نذر ہو جاتی ہے۔ دشمن اس لیے کہ



شمع روشن ہی جب کی جاتی ہے جب آفتاب غروب ہوتا ہے اور بجائی اس وقت جاتی ہے جب آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے وجود سے بیر ہے ہمدرد اس لیے کہ دونوں مظلوم ہیں، دونوں کو ناکردہ گناہ کی سزا دی جاتی ہے۔

ہرزہ محو جلوہ حسن یگانہ ایست  
گوئی طلسمش جہت آئینہ خانہ ایست  
حیرت بدہر بنی سرو پامی برد مرا  
چوں گوہر از جوہر خودم آب ودانہ ایست  
پایسے نور خیالی چو وارسی  
ہر عالمی ز عالم دیگر فسانہ ایست  
خود داریم فصل بہاراں عناں گینخت  
گلگون شوق را گن گل تازیانہ ایست  
ہرزہ در طریق دفائی تو منہ زنی  
ہر قطرہ از محیط خیالات کرانہ ایست  
در پردہ تو چند کشم ناز عالمی  
داغم ز روزگار و فراق تہانہ ایست  
کائنات کا ذرہ ذرہ معشوق حقیقی کے حسن بے مثال میں محو ہے گویا کائنات کا طلسم ایک آئینہ خانہ ہے جس میں جس زاویہ سے دیکھے معشوق کا پرتو نظر رہا ہے۔

حیرت مجھے بیکار دیوانہ وار دنیا میں لے جا رہی ہے۔ یاد خود اس کے کریں موتی کی طرح قائم بالذات ہوں۔ آب ودانہ کی طلب لوگوں سے دنیا کی خاک چھنوا تی ہے۔ موتی کی طرح گوہر یک دانہ میں خود ہوں۔ گوہر کی آب اس کے لیے آب ودانہ فراہم رکھتی ہے۔

ز کنت می تپد نفس کہ بعل و گہر بارش  
ہم تن انتظار جلوہ خویشست گفتارش  
ندانم راز دار کیست دل کز ناشکیبائی  
کشم تا یک نفس لرزد بخود صدرہ ز ہنجارش  
چو بینم زلف خم در خم بعارض ہشوشہ گویم  
کہ ایک حلقہ در گوش کند غبریں تارش  
ز ہم پاشیدن گل افگند و ستاب بلیل را  
اگر خود پارہ ہائی دل فرو ریز در منقارش  
آہتی دارم کہ گوئی گر بروی سبزہ نجرامد  
بنائی خانہ ام فوق خرابی داشت پنداری  
غم افگند و دشتی کہ خورشید درخشاں را  
کمز آمد آمد سیلاب در قصصت دیوارش  
گدازد زہرہ وقت جذب شبنم از سحرش

اس کے موتی برسانے والے لب نعلیں کی رگ رگ کر دھڑک رہی ہے اس کی گفتگو اپنے جلوہ کے انتظار سے گھائل ہے۔ معلوم نہیں کہ شاعر کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ کیا محبوب کے ہکلائے



کی یہ ایک حسین توجہ ہے۔

پتہ نہیں دل نے کس کے راز کو چھپا رکھا ہے، میں ایک سانس بھی لیتا ہوں تو دل خود بخود سوار دھڑکنے لگتا ہے، اس فکر میں کہ راز فاش نہ ہو جائے۔ جب دیکھتا ہوں کہ تم نے خم کھائی ہوئی زلفوں کو رخساروں پر چھوڑ رکھا ہے تو عارض سے کہتا ہوں کہ اس کے عطر آگئیں گیسوؤں کا یہ حلقہ گوش ہے۔ گل کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھ کر ببل بے تاب ہو جاتی ہے، کیا عجیب کہ اس کی چونچ سے دل کے ٹکڑے ٹپک کر گرنے لگیں، یا یہ بچوں کی پنکھڑیاں نہیں ہیں۔ ببل کے دل کے ٹکڑے ہیں جو اس کی منقار سے گرے ہیں۔

اپنے محبوب کی خوبی کیا بیان کروں، یہ عالم ہے کہ اگر وہ سبزہ پر خرام ناز میں آئے۔ تو اس کے حسن خرام پر فریفتہ ہو کر زمین طوطی بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میرے گھر کی بنیاد میں بربادی کا ذوق پنہاں کر دیا گیا تھا۔ سیلاب کو آنے دیکھ کر اس کی دیواریں دھند میں آگئیں، رقص کرنے لگیں۔

غم نے مجھے ایسے بیاباں میں لا ڈالا ہے کہ جب آفتاب اس کے کانٹوں کی نوک سے شبنم کے قطرہ کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو آفتاب کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔

خوشا عالم تن آتش بستر آتش	سپندی گو کہ افشا نم بر آتش
زر شک سینہ گرمی کہ دارم	کشد از شعلہ بر خود خنجر آتش
بہ خلد از سردی ہنگامہ خواہم	برافروزم بگرد کوڑا آتش
دلی دارم کہ در ہنگامہ شوق	سرشتش دوزخ ست و گوہر آتش
بسان موج می بالم بہ طوفان	برنگ شعلہ می رقصم در آتش

کیا ہی اچھا یہ عالم ہے کہ میرا بدن آگ ہے اور بستر بھی آگ۔ نظر نہ لگ جائے، سپند لاؤ کہ آگ پر چھڑک دوں۔

میرے دہکتے ہوئے سینہ کے رشک میں آگ شعلہ کا خنجر اٹھا کر اپنے پہلو میں بھونک لیتی ہے جنت میں اتنی خاموشی، ایسی ٹھنڈک ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کوثر کے پہلو میں آگ جلا دوں، کچھ گرمی تو آئے! کچھ گہا، گہمی تو ہو۔ میرا دل اس وضع کا ہے کہ گرمی شوق سے اس کی سرشت میں دوزخ ہے

اور اس کا خمیر آگ سے اٹھلے۔

موج کی طرح میں طوفان میں فروغ پاتا ہوں۔ آگ کے اندر میں شعلوں کی طرح ناپتا ہوں۔  
غالب کی ہنگامہ پسند اور شعلہ خوبصورت کو سکوت، سکون، ٹھنڈک اور خاموشی راس نہیں آئی  
تھی۔ گھر کی رونق ہنگامہ پر موقوف تھی۔ گرمی محفل اور دل گرمی اور بزم کی رونق کے لیے حرکت اور نشوونما  
کے لیے وجد اور رقص کے لیے آگ ایک استعارہ بن گئی تھی جو اس کے اشعار میں نئے نئے  
پہلوؤں سے سراپت کئے ہوئے ہے۔ حرکت، خرام، وجد، رقص، موج، طوفان، نشوونما، شوق،  
ذوق، شعلہ، آتش، داغ، سوز، رشک، بے مابی، آتشیں یاں، تشنگی، یہی کردار شاعر کی دنیائے  
تخیل میں خفیہ یا علانیہ گرم کار نظر آتے ہیں۔

کز لبش نوا ہر دم در شرفشانی ہاست  
اینکہ من نمی میرم ہم زنا توانی ہاست  
تا پہا دریں پیری حسرت بجانی ہاست  
دید دل فریبی ہا، گفت مہربانی ہاست  
با گراں رکابی ہا خوش بک عنانی ہاست  
چشم سحر پرد از شش بانکتہ دانی ہاست  
وہ چہ دلربائی ہا ہی چہ جانتانی ہاست  
کار باز سرستی آتیں فشانی ہاست  
بر سرم نازادی سایہ راگلتی ہاست  
با ظہوری وصائب جو ہزبانی ہاست  
چشمہ پچو آئینہ فارغ از روانی ہاست

امشب آتش روی گرم زند خوانی ہاست  
در شاکش ضعفم نگسدر رواں از تن  
از خمیدن پشتم روئی برفقا باشد  
کشتہ دل خویشم کز ستمگراں یکسر  
سوئی من نگہ دار و چیں فگندہ در ابرو  
شوخیش در آئینہ عوآں دہن دارد  
بعد و عتابستی وز منش حجابستی  
باچیں تہی دستی بہرہ چہ بود از ہستی  
ایکہ اندریں وادی مژدہ از ہما دادی  
ذوق فکر غالب را برد زانجمن بیرون  
تا در آب افتادہ عکس قد دل جویش

ایسا لگتا ہے کہ آج شب وہ شعلہ و معشوق آتش پرستوں کی مقدس کتب بڑنکام مطالعہ  
کر رہا ہے۔ اس کے دہن سے ہر لمحہ چنگاریاں نکل رہی ہے۔ آتش روی، گرم، شرفشانی سے  
محبوب کی شعلہ فشانی کا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جو تصویر کھینچی جا رہی ہے اس کے یہ  
آب درنگ ہیں۔ ”دم“ اور ”نوا“ کے سپرد یہ خدمت ہے کہ وہ آگ کو بھڑکاتے رہیں چنگاریاں

اڑاتے رہیں۔ غالب کے یہاں جوابات کبھی جاتی ہے وہ منطقی اعتبار سے واضح ہوتی ہے اور قاری کا ذہن تزیینات کی طرف نہیں بھٹکتا، لیکن تزیینات خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر جاتی ہیں نہ صرف کا تزیین بلکہ شعر کے حسن و وزن، تاثیر اور نغزل کو بڑھانے کا کام بھی۔

کنزوری کی کشاکش کی وجہ سے سانس کا دورا ٹوٹنے نہیں پاتا، روح جسم سے الگ نہیں ہوتی یہ بھی کنزوری کا ثمر ہے کہ میں ابھی تک مر نہیں پایا، تخلیق شعریں جب ذہانت کا فرما ہو جاتی ہے تو قارئین کا ساتھ قبول محال کی دلکش مثالوں سے پڑتا ہے۔ اسے صنعت کہہ کر بھی لگے نہیں بڑھ سکتے رشتہ کا محبوب مشغلہ یہ ہے کہ بہت سے سلامت کو الٹ پلٹ دے، ہمیں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دے اور یہ بھاد دے کہ اپنا اور حقیقتوں کا ادراک زاویہ نگاہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے عام تصور تو یہ ہے کہ فلاں شخص اتنا کنزور ہو گیا کہ مرض کی تاب نہ لاسکا اور مر گیا، شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ میرے مرنے میں دیر اس لیے لگ رہی ہے کہ مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ جسم اور روح کے رشتہ کو توڑ سکوں۔

سوال و جواب کے انداز میں کسی نے کہا تھا۔

چرا خم گشتہ می گردند پیران جہاں دیدہ

بہ زیر خاک می جویند ایام جوانی را

سوال جہاں دیدہ بڑھے جھکے ہوئے کیوں چل رہے ہیں؟ جواب، اپنے جوانی کے زمانے کو زمین کے نیچے ڈھونڈ رہے ہیں۔ غالب کہتا ہے کہ بڑھا پے کی وجہ سے میں اس قدر جھک گیا ہوں کہ چھتا لگے کی طرف ہوں اور دیکھتا پیچھے کی طرف ہوں۔

شرق کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جائیے، پھر دوہرے ہو کر دیکھیے، بظاہر سامنے آپ کے مشرق ہے لیکن نظر مغرب آئے گا۔ بریزیل کے شہرہ آفاق کھلاڑی، سیلے، کانسٹنٹ کے ایک میچ میں گولوں کی انداز سے کیا تھا۔ گیندے کو بظاہر اس نے اپنے گول کی طرف رخ کیا، مخالف سمجھے کہ اپنے کسی ساتھی کو چو پیچھے سے آرہا ہے بال دے کر خود آگے بڑھے گا۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اس نے دوہرا ہو کر گیند مخالف ٹیم کے گول میں ڈال دی، شاعر کہتا ہے کہ میں بڑھا پے میں جو جھک گیا ہوں دوہرا ہو گیا ہوں، وہ اس وجہ سے ہے کہ میں پیچھے کی طرف جوانی کی حسرت میں دیکھ رہا ہوں۔

میں تو اپنے دل کا مارا ہوا ہوں، اسی نے مجھے ہمیشہ دھوکے میں رکھا اس نے یہ دیکھتے ہوئے

بھی کہ معشوق مجھے متواتر فریب دے رہے ہیں، کہا تو ہمیشہ یہی کہا کہ وہ مجھ پر مہربانی کر رہے ہیں، مجھے  
دو بار دھوکا دیا گیا، پہلے معشوقوں نے فریب دیا پھر خود میرے دل نے، میں دو دفعہ ڈسا گیا۔

وہ ابرو پر بل ڈال کر میری طرف نگاہ کرتا ہے، رکاب اس قدر بھاری اور غماں اس قدر ہلکی  
چین جیسے سے متاثر، فکر خفگی اور بے دلی کا اعلان ہوتا ہے۔ نگاہ سے التفات، بے تکلفی اور ذوق و شوق  
کی خبر ملتی ہے۔ ہلکی غماں سر پٹ دوڑانے کا پتہ دیتی ہے۔ چین جیسے کی آڑ میں نگاہ التفات برقی کی سرعت  
سے ساتھ اپنا کام کس کے چلی گئی۔ چین ابرو کو گراں رکابی سے استعارہ کرنے کا کوئی صوری جواز نہیں ہے۔  
لیکن استعارہ حسن تاثیر سے ملو ہے کہ یہاں ذہنی اور وجدانی کیفیات کی تمثیل ملحوظ ہے، یہاں نہ قصد کو  
داخل ہے نہ ظاہری مشابہت کو۔

اس کی شوخی دیکھیے، آئینہ میں اس کی نگاہ ذہن سے ذرا دیر کے لیے نہیں ہٹتی۔ ذہن سے  
وابستہ نہ جانے کیا کیا خیالات اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ اس کی جادوئی آنکھیں گویا دروازہ ہیں  
نکتہ بنی کا۔ نکتہ بنی سے اشارہ غنچہ دہنی کی طرف ہے۔

رقیب کے ساتھ عتاب میرے ساتھ حجاب

کیا خوب ہے در ربائی کی وہ ادا، کتنا قاتل ہے جانتانی کا یہ انداز۔ ہم تو خالی ہاتھ ہیں، ہمیں زندگی  
سے کیا ملنے والا ہے۔

ہمارا شیوہ سستی میں آتیں جھاڑ دینا ہے۔ سعدی نے کہا تھا۔

قرار در کعب آزادگان بگیرد مال

نصبر و دل عاشق نہ آب در غربال

آزاد منش لوگوں کے ہاتھ میں مال نہیں ٹھہرتا۔ وہ پہلی فرصت میں آتین جھاڑ کر الگ ہو جاتے

ہیں۔

تم نے مجھے بشارت دی ہے کہ مرے سر پر ہا سایہ فگن ہوگا۔ یعنی اقصیٰ سخن کی تاجداری میری قسمت میں  
لکھی ہے۔ میری عظمت کا دنیا اعتراف کرے گی۔ لیکن مجھے اس سے کیا؟ میرے جیسے آزاد مزاج انسان  
کو تو سایہ بھی گراں گزرتا ہے، خواہ وہ سایہ ہما کا ہی کیوں نہ ہو۔

خارج از ہنگام سرتاسر بیکاری گزشت

رشتہ عمر خضر بنده حجابی بیش نیست



خضر کی عمر کا طول دلوں کو جوڑنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ زندگی ہی کیا جس میں ہنگامہ نہ ہو۔ زندگی کی رونق ہنگاموں پر موقوف ہے۔

شوخی اندیشہ، خویشت سر تا پائی ما  
تار و پود، ہستی ما بیچ و تابانی بیش نیست

ہمارا وجود سرے پیر تک، شوخی اندیشہ سے عبارت ہے۔ بیچ و تاب ہی ہماری زندگی کا تانا بانا ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جس میں بیچ و تاب نہ ہو۔

جلوہ کن بنت منہ از ذرہ کمتر نیست  
حسن با این مابنا کی آفتابی بیش نیست

سامنے آ، جلوہ دکھا، میں ذرہ سے کمتر نہیں ہوں۔ تمہارا روئے تاباں ہر چند درخشاں بھی، خورشید سے بڑھ کر نہیں ہے۔ میں ذرہ سے کمتر نہیں، تم خورشید سے برتر نہیں، تو وہ تعلق تو رکھو جو خورشید ذرہ کے ساتھ رکھتا ہے۔ مجھے اسی طرح منور کر دو۔

ریگ در بادِ عشق روانست ہنوز  
تا چہا پائی دریں راہ بفرسودن رفت

نہ معلوم کتنے پالو اس راہ پر چلتے چلتے گھس گئے۔ عشق کے صحرا میں ریت کے گرم سفر رہنے کا وہی انداز ہے۔

خیال کی بساط نے تمہیں اسیر کر لیا ہے، اگر اس گرداب سے نکلو تو پتہ چلے گا کہ ہر دنیا کسی دوسری دنیا کی داستان ہے۔

فصل بہاراں میں میری خودداری نے مجھے غماں ترلانے پر مجبور کر دیا۔ سمندر گنگوں شوق پر رگ گھلنے سے تازیانہ کا کام کیا۔

ہر ذرہ تیری وفا کی راہ میں ایک منزل ہے، ہر قطرہ تیرے خیال کے قلم کا ساحل ہے۔ تمہارے پردہ میں دنیا کی ناز برداری کب تک کروں؟ میں تو زمانہ کا مارا ہوا ہوں، لیکن جہان بنایا ہے میں نے تمہارے ہجر کو۔

اور بھی غم میں زمانہ میں حجت کے ہوا

شاعر اس نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ہمارے احساسات اور ہمارے جذبات اور افعال کے محرکات اس طرح دست و گریباں اور شیر و شکر ہو جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا اور اعتماد کے ساتھ یہ کہنا کہ اس احساس یا عمل کا سرچشمہ کیا ہے، دشوار ہو جاتا ہے۔ اکثر محرکات اور نتیجے باہم گڈ مڈ ہو جاتی ہیں۔

گر پس از جور با نصاب گراید چه عجب  
از حیا روئی بہ ما گرنہ نماید چه عجب  
بودش از شکوہ خطر ورنہ سری داشت بمن  
بمزارم اگر از ہر بیاید چه عجب  
آنکھ چوں برق بہ یکجائی نگیرد آرام  
گدازش درد دل اگر در نپاید چه عجب

اگر وہ ظلم کے بعد انصاف کی طرف مائل ہو تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ جیسے ہماری طرف رخ نہ کرے تو کیا تعجب وہ خود پریشاں کیا ہوا جو میں اور اضافہ کر دیا۔

یہ ہمارے مفکر کی خوبی ہے اور محبوب کی ستم ظریفی کہ وہ ہمارے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہے تو وہ انصافِ ظلم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

حجت اگر اسے میری قبر کی طرف کشاں کشاں لے آئے تو یہ حیرت کی بات نہ ہوگی زندگی میں جو وہ میرے پاس آنے سے گریز کرتا تھا اس کی وجہ یہ تھی وہ ڈرتا تھا کہ میں چھوٹے ہی اس کی شکایت شروع کر دوں گا۔ غالب نے معشوق کی ستم ظریفی کا تذکرہ ہمیشہ بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔ بالغ نظر شاعر جب کچھ کہتا ہے تو اس کا زاویہ تنقید سامنے کے سیاق و سباق سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ مجازی معشوق کی ستم ظریفی ذہن کو اس معشوق کی ستم ظریفی کی طرف لے جاتی ہے جو پردہ نگاری میں چھپا ہوا ہے۔ انسانوں کو ستم ظریفی کا تختہ مشق بنانا قدرت کا محبوب مشغلہ ہے۔

وہ جو بجلی کی طرح ایک پل نہیں ٹھہرتا اس کی شکایت بھی اگر دل میں نہ ٹھہرے تو یہ حیرت کی بات نہیں ہے۔

از ہر بن مو چشمہ خوں باز کشادم  
می می چکد از لعل لبش در طلب نقل  
مازم سخنش را و نہ یابم دہنش را  
غالب بود شیوہ من قافیہ بندی  
آرایش بتر شفق می کنم امشب  
مشتی ز کواکب بہ طبق می کنم امشب  
خوش تفرقہ در باطل و حق می کنم امشب  
ظلمت کہ بر کلک و ورق می کنم امشب

ہر جن مو سے لہو کا قوارہ چھوٹ رہا ہے۔ آج میں بستر کو شفق سے سجا رہا ہوں، گھٹل کی فرمائش کرتے ہوئے اس کے لب لعلیں سے شراب ٹپک رہی ہے لہذا میں مٹھی بھر ستارے طبق میں لیے کھڑا ہوں۔  
اس کی بات پر مجھے ناز ہے لیکن اس کے دہن تک میں نہیں پہنچا ہوں۔ یعنی میں حق و باطل میں بخوبی امتیاز کر رہا ہوں۔

یاد از عدد نیارم و لہ نہم ز دور بینیت	کاندر دلم گزشتن بادوست ہم نشینیت
در عالم خرابی از خیل منعسا تم	سیلم برخت ثوئی برقم بخوشہ چینیت
میرم ولی ہتر سم کو فرط بدگسائی	فاند کہ جاں سپردن انصافیت گنہیت
در بادہ دیر ستم آری ز سخت جانیت	در غمزہ زودرنجی آری ز ناز نینیت
من سوئی اوجہ بینم داند ز بی حیائیت	او سوئی من نہ بیند دامن ز شرکینیت
زوقیت در ادایت قاصد نو در خدایت	در جیب من بیفشائ خلدی کہ آستینیت
زیں خوچکاں نواہا دریاب صاحب راہا	ہنگام ام اسیری اندیشہ ام حزینیت
نازم بزودیابی نازد بگو کس غس دگرون	چنداں کہ بر نیساں درگو ہر آفرینیت

کتنی پر لطف ہے یہ غزل۔ ہر شعر میں رس بھرا ہوا ہے۔ عجب کیفیت ہے مضمون ہر شعر کا مختلف لیکن فضلہ پوری غزل کی واحد۔ ایک بظاہر بہت اچھا شعر حذف ہو گیا کہ اس کے معنی اطمینان کی حد تک سمجھ میں نہیں آئے۔ راقم سطور نے یہ برتاؤ مختلف غزلوں میں متعدد اشعار کے ساتھ کیا ہے مفہوم سمجھ میں نہ آئے تو کس سے پوچھنے جائے۔ فارسی دانی، تنس پر غزل فہمی، کیا بجنس ہے، طلب صادق اور فرصت مساعد ہو تو اسی دلی شہر میں یا علی گڑھ یا لکھنؤ یا پٹنہ یا حیدرآباد میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو شعر فہمی کی مشکلات کو پانی کر دیں گے۔ طلب تو شاید غیر صادق نہیں لیکن فرصت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ تکمیل میں اس مضمون کے دیر ہو گئی تو ذکر کیا یقین ہے کہ یہ بھی عمر و عیار کی اس زنجیل میں پہنچ جالے جس میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ حذف اشعار کو تو شاید قارئین معاف بھی کر دیں لیکن شارح کی اس غلطی کو کیا کیجیے کہ بعض جگہ مفادیم غلط بیان ہو گئے ہوں یا تشریح نا کافی رہ گئی ہو یا اشعار دہرا دیے گئے ہوں تشریح کی وسعت تو خیر اس مضمون میں منکمل نہیں پائی لیکن اس کا غالب امکان ہے کہ شعر کے ادراک میں وقتاً فوقتاً سہو ہوا ہو۔  
میں رقیب کا خیال بھی میں دل میں نہیں آنے دیتا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے رقیب سے کوئی نفرت ہے۔

میلے طرز عمل دورانہیشتی کی بنا پر ہے۔ میں رقیب کو یاد کروں گا، میرے دل میں اس کا گزر ہو گا۔ وہاں اس کی  
نڈ بھیر محبوب سے ہو جائے گی جو خدا دیر کے لیے بھی میرے دل سے دور نہیں ہوتا۔ اور یہ میں کسی قیمت پر  
برداشت نہیں کر سکتا۔

اس خستہ حال دنیا میں میرا شمار خوشحالوں کے طبقہ میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ سید اب میرے سامان کو  
دھونے اور بجلی میری خوشہ چینی پر مامور ہے۔

مجھے مرجانے میں کوئی تا مل نہیں کہ اس کے علاوہ میرے لیے کوئی چارہ نہیں رہا ہے، لیکن مجھے ڈر  
ہے کہ بدگماں محبوب سمجھے گا کہ میں ایسا آرام طلبی کی وجہ سے کمر ہا ہوں اور محبت کی تکلیفیں میری برداشت سے  
باہر ہیں۔

شراب کا نشہ مجھے دیر سے ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ میری سخت جانی کی وجہ سے ہے ہنگام ناز  
ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جانا تمہارے نازنین ہونے کی بنا پر ہے۔

میں اس کی طرف دیکھتا ہوں، سوچتا ہے کہ میں بے حیائی کی وجہ سے اُسے گھور رہا ہوں۔ وہ میری  
طرف نظر نہیں کرتا، میں سمجھتا ہوں کہ چا حائل ہے۔

میرے قاصد آج تو تمہارے انداز میں طرب کا عالم ہے، خدا را اس فرد کس کو جسے تم آستین میں  
چمپائے ہوئے ہو، میرے گریبان میں الشدد۔ نامہ محبوب کی شمیم عاشق کے مشام تک پہنچ گئی ہے اس  
کی پرامید نگاہیں اپنے ذوق طب کی سرستی کو قاصد تک منتقل کر دیتی ہیں

ان صداؤں سے جو ہو ٹپکار ہی ہیں، تم پر ساری کیفیت روشن ہو جائے گی۔ اگر شور برپا نہ کچھو  
تو جان لو کہ نوا سیر تڑپ رہا ہے، اور اگر نسبتاً خاموشی ہے تو سمجھ لو کہ وہ منہ موم اور فکر مند بیٹھلا ہے۔

ماہ نیساں کا بادل موتی پیدا کرنے میں کیا مصروف ہو گیا کہ ہم دونوں کی عید ہو گئی، میں تو اس پر غرور و وجد  
کر رہا ہوں کہ گہرے شہوار اتنی آسانی سے دستیاب ہو گئے اور محبوب اپنے کالوں اور گردن پر ناز  
کر رہا ہے کہ ان کے حسن کو موتیوں نے اور چمکا دیا۔

چو شعلہ کہ نیاز اوفت بخار و خشش

کہ غوطہ می دہم اندر گداز ہر نفسش

غبار قافلہ عمر و نالہ حیرش

بعض شہرت خویش احتیاج ما وارد

صفا یافتہ قلب از غش و مرا عمر یست

ز رنگ و بلوی گل و غنچہ در لطر دارم



جگر گرمی میں جڑ و تشنہ تر گردید      فغاں ز طرنہ فریب نگاہ نیم رکشش  
 بہار پیشہ جوانی کو غالب بش نامند      کنوں بر ہیں کہ چہ خوں می چکد زہر نفسش  
 اپنی شہرت کے لیے اسے ہماری ضرورت ہے۔ شعلہ کی طرح کرا سے خار و خس کی احتیاج ہوتی ہے۔

ایک عمر گزری میں اپنے دل کو ہر گھمچلتی ہوئی سانس میں غوطہ دے رہا ہوں لیکن ابھی تک وہ آلائش سے پاک نہیں ہوا۔

پھول اور گی کے رنگ و بو کو دیکھ کر میرا ذہن عمر کے قافلہ کی گرد اور کوچ کی گھنٹی کی طرف جاتا ہے۔ عمر کو اتنی ہی ثبات ہے جتنی پھول کو۔

اس کی نیم نگاہ کیسا فریب دے گئی مالا مال۔ اس گھونٹ نے تو جگر کی پیاس کو اور بڑھا دیا۔ وہ باغ و بہار جوان جسے غالب کہتے ہیں۔ ہائے ہائے دیکھو اس کی ہر سانس سے ہو ٹپک رہا ہے۔

امتحان طاقت خویشیت از بیداد نیست  
 خلق را در ناله ہائی جاں گداز آوردنش  
 اس نے جو خلق خدا کو ایسے نالہ و فریاد میں مبتلا کر دیا ہے جو دل کو پگھلا دیتی ہے، یہ نہ سمجھنا کہ اس کا مقصود ظلم و ستم ہے۔ وہ تو اپنی طاقت کی آزمائش کر رہا ہے۔

چوں نمیرد قاصد اندر رہ کہ رشکم بر ستافت  
 از زبانت نکتہ ہائی دلنواز آوردنش  
 قاصد کے راستہ میں مارے جانے پر حیرت کیوں کر ملے ہو۔ رشک نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ تمہاری زبان سے دلنوازی باتیں سنتا۔ غالب نے رشک کے مضمون پر بہت سے اشعار کہے ہیں، لیکن یہ شعر اس لیے منفرد ہے کہ شدتِ رشک نے انھیں قاصد کے قتل پر آمادہ کر دیا ہے۔

آنچہ ہمد ہر شب غم بر سرم می بگذرد      ہر سحر یکسر بہ دیوار سرائش می نویس  
 خواری کا اندر طریق دوست داری نمود ہد      از مداد سایہ بال ہمایش می نویس  
 اکی کہ بایارم خرامی گرد دل در شست ہست      نام من در ہگز بر خاک پایش می نویس

ہر کجا غالب تخلص در غزل بینی مرا      می تراش آنرا و مغلوبی بجایش می نویس  
اسے ہم نشیں میرا ایک کام کر دیا کر، ہر شب غم مجھ پر جو گزرتی ہے، علی الصباح اسے اس کے مکان کی  
دیوار پر لکھ دیا کر۔

دوستی کے راستے میں جو ذلت ہم کو اٹھاتی بڑتی ہے۔ اس کو لکھنے کے لیے بال ہمارے سلیسے سیاہی  
بنا، اور بے کم و کاست قلم بند کر دیے۔ تاکہ اس کا اقبال اور ہمارا ادب ایک قلم الم نشرح ہو جائے۔  
تم کہ مرے محبوب کے ساتھ ٹہلنے جاتے ہو، اگر ہمت اور دسترس ہو تو راستے میں اس کی خاک پا  
پر میرا نام لکھ دو کہ میرے لیے یہ خوش بختی کی انتہا ہوگی۔

غزل میں جس جگہ بھی میرا تخلص غالب دیکھو اسے چیل ڈالو اور اس کی جگہ مغلوب لکھ دو۔ بیل و نہار  
اور آلام روزگار نے غالب کے ولولوں کو اس درجہ پست کر دیا کہ وہ شاعر سرفرازی و افضلی جس کا شیوہ تھا ہتھیار  
ڈال کر خود کو مغلوب سمجھ لگا۔

یا پیش ازین بلائی جگر تشنگی نہ بود      یا چوں من التفات بہ جیوں نکرده کس  
یارب بنا ہدان چہ دہی غلد را نگان      جو رہتاں ندیدہ و دل خون نکرده کر،  
غالب ز خیرتی چہ سرائی کہ در غزل      چوں او تلاشش معنی و مضمون نکرده کس  
یا تو اس سے پہلے جگر کی پیاس کی بیماری کا وجود ہی نہ تھا، یا میری طرح کسی نے خود کو جیوں آشامی پر  
مبور نہیں پایا۔ نتیجہ واحد ہے۔

اس سے پہلے عشق کی آگ نے کسی کے دل و جگر کو اس طرح جھلسا نہیں تھا کہ وہ دریاپانی جائے  
اور پیاس نہ بجھے۔

یارب زاہدوں کو مفت میں جنت کیوں دی جا رہی ہے۔ انھوں نے نہ تو حسینوں کا ظلم دیکھا ہے، نہ  
محبت میں دل فوں کیا ہے غالب حیرتی مصطفیٰ خاں شیفہ کی کیا بات کرتے ہو کہ غزل میں اس کی طرح معنی  
و مضمون کی تلاش کسی نے نہیں کی۔

آرایش جیسے رنگیناں ز چیں شناس      ہفتی بہ تحت ہر نگہ خشمگیں شناس  
خون گشتن دل از مرزہ و آتیں شناس      بی پردہ تاب محرمی راز مساجوئی  
ہر خون کہ ریخت غارہ ردئی زمین شناس      آرایش زمانہ ز بیدار کردہ اند

دوراء عشق شیوہ دانش قبول نیست      حیف است سعی رہو پا از جبین شناس  
بی غم نہاد مرد گرامی نمی شود      ز نہارت در خاطر اندو گیں شناس  
غالب مذاق مانتواں یافتن ز ما      رو شیوہ نظیری و طرز حزیں شناس

مطلع کتنا درخشاں ہے۔ ہر غضباً لودنگاہ کے نیچے اک طرز التفات چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اسے پہچاننے کی کوشش کرو۔ ان طرحدار حینوں کا حسن چین جبین سے دو بالا ہوتا ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ ہم عرم راز ہیں یا نہیں، اس کی امید رکھو کہ ہم اس کا بر ملا اعلان کریں گے۔ اگر وہ دیکھنا ہے کہ ہمارا دل خون ہوا ہے تو ز دل میں جھانکو ز باں ٹٹولو۔ یہ راز پلک سے پوچھو یا آئین سے دنیا کو ظلم سے زیب و زینت دیتے چلے آئے ہیں، بہتے ہوئے ہونے میں کہہ چہرہ کے لیے غازہ کا کام کیا ہے۔ خون ریزیوں کے عقب میں بہا آئی ہے۔ فردوس برہمن میں خون ریزی بہار دیکھیے۔ غم کے بغیر انسان کی طبیعت کو وزن و وقار نہیں ملتا۔ خدا کا غم آشنا دل کی قدر پہچانے۔

غالب، ہمارا ذوق ہم سے پا جاؤ یہ ممکن نہیں۔ جاؤ پہلے نظیری کے اسلوب اور علی حزیں کے پیرائے زباں کو پہچانے۔

داغ تلخ گویا نم لذت سم از من پڑس      محو تند خو یا نم حیرت رم از من پڑس  
نوحی از شراب بستم نہتی از کباب بستم      شور من ہم از من جوئی سوز من ہم از من پڑس  
بوسہ از لبانم دہ عمر خضر از من خواہ      جام می بہ چشم نہ عشرت جم از من پڑس  
میں تلخ گولیوں پر فریفتہ ہوں، زہر کی لذت مجھ سے دریافت کرو، میں تند خو معشوقوں پر فدا ہوں  
رم کی حیرت کی لذت مجھ سے پوچھو۔

میں شراب کی ایک بوج ہوں، کباب کا ایک ٹکڑا ہوں میرے ہنگامہ کی کیفیت مجھ سے ہی پوچھو، میرے دل کے سوز و گداز کا حال مجھ سے ہی دریافت کرو۔

اپنے ہونٹوں کا بوسہ مجھے دے دو، پھر عمر خضر کے بارے میں مجھ سے سوال کرو۔ میرے سامنے جام رکھ دو پھر مجھ سے عشرت جمشید کی بات کرو۔

پھر دیکھیے اندازِ گفتار      رکھ دو کوئی پیما نہ وہبامرے آگے  
عشرت جم سے مراد عیش و عشرت اور شان و شکوہ ہے اور اشارہ ہے اس باخبری اور بصیرت کی طرف جام جم

سے جو حاصل ہوتی تھی۔

دماغ شوق تو بہ آرائشیں دہا سرگرم  
زخم تیغ تو بہ گلگشت جگر ہا گستاخ  
با خبر باشش کہ دردی کہ زبیدرذی تست  
نالہ را کرد ز اظہار اثر ہا گستاخ  
شاد گردم کہ بہ خلوت نہ رسیدست رقیب  
بینش چوں بہ تو در راہ گند ہا گستاخ  
ہای ایں پنجر کہ با حیب کشا کش دارد  
بود باد امن پاکت چہ قدر ہا گستاخ  
لوطیاں در شکوہ آئند بہ غالب کا و راست  
بے از لطف بہ تاراج شکر ہا گستاخ  
تمہاری محبت کے دماغ دلوں کی زینت بن رہے ہیں۔ تمہاری تلوار کے زخم گلگشت جگر میں بے باک  
ہیں۔

نہیں ذریعہ راحت جراحۂ پیکاں  
یہاں تیغ جگر کشائی کا کام کر رہی ہے۔ تیغ کے وارے جگر کیا کھل چن بن گیا جس کی سیر تلوار کے لگائے  
ہوئے زخم کر رہے ہیں۔

خود کوزہ و خود کوزہ گرد خود گل کوزہ  
زخموں نے ہی جگر کو گلزار بنا دیا  
اور زخم ہی اس گلزار کی سیر کر رہے ہیں۔ عمل اور اثر، فعل اور انجام اس طرح دست دگر یہاں ہو گئے  
ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہے۔ یہ انداز بیان اختصار اور بلاغت کی معراج ہے۔ اس پر  
مستزاد شکوہ درو بست اور ترصیع، سنگلاخ زمین کو کس قادر الکلامی کے ساتھ پانی کر دیا ہے۔  
ذرا ہوشیار رہنا اس درد سے جو تمہاری بے دردی نے ہمیں دیا ہے۔ اب نہ بندشوں سے  
آزاد ہو گیا ہے، لہذا بے باکی کے ساتھ اثر کر کے رہے گا۔

رقیب بوا ہوس سر راہ تمہارے ساتھ بے باکی اور بے حجابی کا برتاؤ کر رہا ہے۔ (فرنگ کی رگزاروں  
میں یہ منظر بہت عام ہے) لیکن مجھے یہ گستاخی ناگوار نہیں، میں تو یہ سوچ کر مطمئن ہوں کہ وہ تمہاری خلوت  
تک نہیں پہنچا ہے۔ اگر اختلاط سے آلودہ ہو چکا ہو تا تو یوں نگوں بھوکوں کی طرح سر راہ بے تابی بے حجابی  
کی باتیں نہ کرتا۔ دیکھیے شاعر نے عام رد عمل کو کس طرح الٹ دیا ہے۔ مضمون مختلف ہے لیکن انداز وہی  
ہے۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پیر زبان مصرعے  
ہے زینتِ خوشش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں



حیف کہ یہ باتھ جو تیرے دامن سے بے باکیاں کرتے تھے اب میرے گریبان میں الجھے ہوئے جنوں میں جامہ دردی کمد ہے ہیں۔

طوطیوں کو غالب سے شکر رنجی ہے اس کی شکر شکنی کی بنا پر۔ غالب کی سی شیریں گفتاری وہ کہاں سے لائیں۔  
حافظ نے کہا تھا۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند

زیر قند پارسی کہ ہر بنگالہ می رود

شاید غالب کو گمان ہے کہ قند پارسی کو جو بنگال جا رہی تھی اس نے دلی میں روک دیا لیکن گمان غالب یہ ہے کہ ایسا ان سے پہلے نظیری کر چکا تھا جس کا ذکر غالب کی فارسی غزل میں کئی بار آیا ہے ہم آگے چل کر دکھائیں گے کہ نظیری کا اسلوب سخن کیسا ہے۔

غالب کے کلام کی عام اس سے کہ وہ فارسی سے یاداردو، سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے، بڑی سچ دھج، نوک یلک اور یا کچن کے ساتھ کہتا ہے۔ تخیل کا عمل خیال یا فکر تک محدود نہیں رہتا وہ اپنی شگرف کاری انداز بیان میں بھی دکھاتا ہے فکر اور پیرایہ بیان کے لیے ہر شعر میں ایک نئی راہ نکلتی ہے۔ فارسی اشعار میں اس وصف کا رنگ کچھ اور زیادہ گہرا ہے۔ نازک خیالی ہے، بلند پروازی ہے۔ استدلال ہے، شعری منطق اپنے کلمات کا اظہار کرتی ہے، یہ اشعار اصرار کرتے ہیں کہ قارئین کے دل و دماغ دونوں بہ یک وقت حظ اندوز ہوں، جو نشتر دل پر لگتے ہیں وہ دماغ سے گزرتے ہوئے اپنی دھارتیز کرتے جائیں۔ لیکن دوران کار پیچیدگیاں، اور مو شکا فیاں ان اشعار میں آپ کو نہیں ملیں گی۔ غالب کا ملکہ شعرائے شعری کرتب سے دور رکھتا ہے۔ فارسی غزل میں ڈھونڈنے پر بھی ایسے اشعار نظر نہیں آتے جو مشکل گوئی کی خاطر کہے گئے ہوں یا جہاں جذبہ اور احساس کو بخوڑ کر ٹپکا دیا گیا ہو، خشک عقلیت اور بے جان استدلال اور بے رس پروانہ سے شاعر کا دامن کھل بے داغ ہے۔ غالب کی فارسی غزل کو پڑھتے وقت قارئین کا رد عمل سرسری ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ وہ پوری یکسوئی اور ارتکاز کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کی پذیرائی ادھوری شخصیت یا ادھوری توجہ سے نہیں ہوتی۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں اس کو واضح کرنے کے لیے طب سے مدد لینا شاید ناروا ہو۔ شعرا و طب میں

کوئی ایسی مغرت بھی نہیں ہے۔ پہلے ہمارے یہاں نصاب تعلیم میں شعر و ادب اور طب کو یکساں اہمیت دی جاتی تھی۔ یوں بھی طب کا طریق کار جسمانی بیماریوں کا بالقصد علاج ہے، اور شعر بلا ارادہ بلکہ ضمناً اخلاق کو سنوارتا ہے یا کم از کم احساسات، تجربات اور خیالات سے اثر لینے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ دلی اور لکھنؤ میں اہلکے دو بڑے خاندان یا یونانی طب کے دو ممتاز دبستان گزرے ہیں۔ شریفیہ اور عزیز میزہ لکھنؤ میں علاج بالعموم مفردات سے کرتے تھے اور دلی میں مرکبات ہے۔ غالب کے اشعار دل و دماغ پر بیخار مرکبات کے ذریعہ کرتے ہیں، جذبہ فکر کا ساتھ نہیں چھوڑتا، نہ تخیل ان دونوں کا۔ جذبہ اور فکر کا اتنا متوازن آمیزہ اور تخیل اور اظہار کا ایسا متناسب اتحاد کہ اگر اس کی فضا میں کچھ عرصے سانس لے لیں تو پھر دوسروں کی تخیقات کی دنیا میں دل نہیں لگتا۔ راقم سطور کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ غالب کو پڑھنے کے بعد نظیری کے دیوان کی ورق گردانی کی۔ دل بستگی اس درجہ حرارت کو نہ چھو پائی۔ جہاں غالب نے پہنچا دیا تھا۔ حالاں کہ نظیری کا مرتبہ غزل گوئی میں غالب سے بڑھ کر ہے۔ نیت یہاں موازنہ کی نہیں۔ ہر شاعر غزل سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کی بسائی ہوئی دنیا میں بود و باش اختیار کرے۔ وہاں کی فضا میں سانس لے، وہاں کے لب و لہجہ اور بریت رواج کو پہچانے بلکہ انہیں اختیار کرے۔ اس کے بعد وہ اس کی شاعری سے لطف اٹھا سکتا ہے۔ اور اس کی قدر شناسی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ موازنہ اس لیے تنقید کے ان بہت سے عوامل میں سے ہے جو شعر کا خون کر دیتے ہیں۔

تبدیل ذائقہ کے لیے نظیری کے چند شعر سن لیجیے۔

از کفم سرشہ گفتار بیدوں رفتہ است      ہر گرہ کزد دل گشادم بر زباں اندا ختم  
راہبرد لاں کالابود و رہزن مشتری      درمپن راہ بار کارواں اندا ختم  
میرے ہاتھ سے گفتگو کا سرائگل گیا ہے۔ دل سے جو گو بھی میں سے کھولی وہ زباں پر لگادی۔

رہزن میرے مال کا گاہک تھا اور رہبرد لاں اس لیے میں نے راستہ میں ہی اپنا سامان گرا دیا۔

در چمن معذور دارندم اگر گردم ملول

نغمہ سنج کوہ و دشتم از گلستاں نیستم

گر چمن میں مجھے افسردہ دیکھو تو مجھے معذور سمجھو۔ میں کوہ و صحرا میں نغمہ سنجی کرتا چلا آیا ہوں، میرا تعلق

گلستاں سے نہیں۔

کتنی بڑی بات کہتے دھیمے لہجے میں کہہ دی گئی۔

تو افریقہ بود رفتنی بخانه دوست

دروں اگر نگرند آستان دریاب

تہہ رافرض تو یہ ہے کہ در حبیب پر جاؤ۔ اگر اندر نہ جانے دیں تو چوکھٹ پکڑ لو۔

ہر شب برب و رخسار و گیسوی زخم بومر

گل و نسیم و سبیل را صبا در خرمین است

رات بھرب و رخسار و گیسو کو پیار کرتا رہا ہوں۔ آج رات ہوا گلاب پھیلی اور سبیل کے خرمین میں

چلتی رہی۔ محبت کی پُراہتاب وارفعل کو انداز بیان کی لطافت، خوب صورتی اور شائستگی نے ڈھانک

لیا ہے۔

بدل طرح وصال جادوانی نقش می بندم

گرم خود دوست می آید بخلوت دشمن است

اپنے دل میں وصال جادوانی کی نیو ڈال رہا ہوں۔ ایسی حالت ہیں اگر خود محبوب میرے پاس آجائے تو

میرے لیے وہ غیر ہوگا۔

فرض و سنت ز تماشائی تو از یادم رفت

پردہ بر روی فلک یازمن ایماں مطلب

تمہیں دیکھ کر میں فرض اور سنت سب بھول گیا۔ یا تو چہرہ پر نقاب ڈال لو یا مجھ سے ایمان کا مطالبہ

نہ کرو۔

گو خضر دشت پیمایاں مطلب

آب حیواں ز کف درد کشاں می جوشد

دو دہل سرمہ کن و کھل صفاں مطلب

لحنت دل قوت کن و شکر احباب مخواہ

کشتی لوح ز شد ساختہ طوفان مطلب

جلوہ از حوصلہ بیش است نظیری ہشیار

بلا نوشوں ر تلچھٹ پی جانے والوں کے ہاتھ سے آب حیات آتا ہے خضر سے کہہ دو کہ آب

حیات کی تلاش میں صحرا و بیاباں کی خاک چھاننا بند کر دیں۔

احباب سے شکر مانگنے کے بجائے دل کے ٹکڑے کو اپنی غذا بنا لو۔ اصفہان سے سرمہ طلب

کرنے کی جگہ سُنگتے ہوئے دل کے دھوئیں سے سرمہ کا کام لو۔  
 نظیری ہوشیار جلوہ اتوہلے اور تاب و تواں سے پڑھا جا رہا ہے۔ پہلے کشتی نوح بنا رکھو  
 پھر طوفان کو دعوت دو۔

از حلقہ ہائی زلفِ طلسمی بہ چنگ آر

وز شغلِ آں زو سوسہ دل اماں طلب

ہر گاہ یوسفی ز تو دور راہ مانده است

شیون کن وز گشده خود نشاں طلب

زلف کے حلقوں سے ایک سحر بنا لو جس کے اثر سے دل بہلا رہے اور دوسوسوں میں گرفتار نہ ہونے پائے۔  
 جس وقت تمہارا یوسف راستے میں رہ جائے تو نالہ و زاری کی مدد سے اپنے کھوئے ہوئے  
 محبوب کا نشان مت ڈھونڈو۔

ننگست در طریقِ کریماں معاملات

جاں از نظیری ار طلبی را یگاں طلب

کریموں کے مسلک میں معاملہ کرنا شرم کی بات ہے۔ اگر نظیری سے جان طلب کر رہے ہو تو اس  
 کے عوض میں کچھ دینے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔

خمار بنے بنیم قفل زدایا غ کجاست

کیدر سیکدہ گم کردہ ام چراغ کجاست

شراب کے خمار نے میرے ذہن پر قفل لگا دیا ہے۔ ساغر کہاں ہے، میرے ہاتھ سے مینخانہ  
 کی چابی گر گئی، چراغ لاؤ کہ اسے ڈھونڈیں۔ استعاروں کا جمال گرمی اور روشنی دیدنی ہیں۔  
 ہر کجاہست غمی در بدرخانہ ماست  
 ہر کرامی گرمی در جوی دیوانہ ماست  
 آنکہ ناید بدر از نرم تو پروانہ ماست  
 آنچه دام دگراں ساختہ ای دانہ ماست  
 آفتاب از ہمہ جاروی بہ ویرانہ ماست

شہر ویراں شدہ گریہ مستانہ ماست

از ہمہ سورہ بخولہ و صہرا ایستند

باں و پر سوختہ ہر یک بکناری رفتند

بہ تماشا فی جہاں باز نہا نیم از تو

ماکہ نورشید بہ بستیم بہ محفل چہ کنیم



شہر ہمارے گریہ مستان سے ویراں ہو گیا۔ جہاں کہیں بھی غم کو دیکھو جان لو کہ ہمارے گھر سے نکالا ہوا ہے۔

ہر طرف سے صحرا اور بیابان کی راہ بند کر دی گئی ہے۔ غریب دیوانہ اب کہاں جائے جسے دیکھو دیوانے کے درپے ہے۔

سارے پروانے تمھاری محفل میں پر جلا کر ایک کنارے ہو گئے۔ ہم ہی ایک ایسے پروانے ہیں جو تمھاری بزم کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔

دنیا کے نظارے ہمارے دھیان کو تم سے ہٹا نہیں سکتے، دوسروں کے لیے جس شے کو تم نے دام بتایا ہے کہ اس میں پھنس کر رہ جائیں، ہمارے لیے وہی قوتِ لایوت ہے۔ دنیا کے نظارے اور تماشے، گہما گہمی اور چہل پہل تمھاری ذات سے ہماری وابستگی اور انہماک اور تمھاری کشش کو اور بڑھا دیتے ہیں۔

ہم جو خورشید سے لو لگائے ہوئے ہیں، محفل ہمارے کس کام کی۔ ہمیں تو ویرانہ ہی راس آتما ہے جہاں سورج کی کرنوں کی راہ میں نہ چھت حائل ہے نہ دیواریں۔ ہر زاویہ اور ہر سمت سے آفتاب عالمتاب ہماری طرف رخ کرتا ہے۔ حقیقی محبت اور جذب کی نئی نظیر ہی کے یہاں کتنی معتبر اور مستند ہے۔ غالب کے یہاں یہ نئے اس وثوق اور بانگین کے ساتھ نہیں ملے گی۔ محبت ہر دو طرف سے جلوہ گر ہے۔ شاعر نے مجلس و محفل، دنیاوی تزئینات و روابط، آسائشوں اور ہمہوں کو ترک کر کے محبوب سے لو لگال ہے۔ اور خود محبوب کا یہ عالم ہے کہ شاعر کو ہم وقت اور ہم جہت انداز سے تحت نظر التفات رکھ رہا ہے۔ حالاں کہ غالب کے یہاں موشگافی، استدلال اور باریک بینی زیادہ ہے تاہم اس کے اشعار نظیر ہی کے اشعار کی سادہ بلاغت کو شاذ ہی پہنچ پاتے ہیں۔

آسود می اگر نخودم کس گزاشتی

از جور او گشندہ نرم رحم مرؤست

میں آرام سے رہتا اگر لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتے۔ میرے لیے محبوب کے ظلم سے

زیادہ قاتل مہربانوں کا رحم اور دوستوں کا اظہار ہمدردی ہے۔ ایک عالمگیر نفسیاتی حقیقت کو

نظیر می نے محبت کے رنگ و آہنگ میں بیان کر دیا ہے۔ جن لوگوں کو مصیبتوں اور سانحوں سے پالا پڑا ہے اور کس کو نہیں پڑا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اظہار ہمدردی کتنے ہی اخلاص اور خوش نیتی کے ساتھ کیا گیا ہو وہ غم کو طول دیتا ہے، زخموں کو گریہ کرتا ہے اور دل کو بہنے اور سنبھلنے نہیں دیتا۔ جس کے ساتھ بار بار ہمدردی کی جاتی ہے وہ غریب عاجز آ جاتا ہے، جھنجھلا اٹھتا ہے۔

آں دہد در گریہ پندہ ما کہ با مادرشن است

ہر کہ می گیرد شناور را بدر یا دشمن است

اور مصیبت زدوں کے لیے اظہار ہمدردی سے زیادہ تکلیف دہ، بلکہ ہلک، ہجوم نفاہیح ہوتا ہے۔ ہمارے دل کو چوٹ لگی ہے اور وہ پھوٹ بہا ہے، ایسے میں ناصحان مشفق ترک کر یہ و ترک محبت کی ہدایت کرتے ہیں۔ یہ بے وقت کی راگنی دل کو چھیدتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ جی بھر کے رویتے تو دل کو قرار آ جاتا۔ یہ ظالم ہند گویہ بھی گوارہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ضبط گریہ سے دل گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں روتے ہوئے دیکھ کر جو شخص ضبط کی تلقین کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ تیراک کو سمندر میں پکڑ لینے والا اس کی جان لے کر رہتا ہے۔

مجزدان سبک سیر از جہاں رفتند

گہر بہ قعریم و خس بہ ساحل افتادست

جو لوگ کہ دنیا سے بے نیاز ہیں، وہ بغیر کسی رکاوٹ کے یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ موتی ڈوب کر سمندر کی تہ میں پہنچ جاتا ہے اور وہیں مقید رہتا ہے۔ خس و خاشاک سمندر کی سطح کے اوپر بے نیازانہ تیرتے ہوئے لہروں کے ساتھ ساحل پر پہنچ جاتے ہیں، سمندر کے قید و بند اور علاقے سے آزاد۔ یہاں وہی غالب کا سا انداز ہے کہتر کو بہتر بنا دینے کا۔ اس پر مستزاد ہے قلندر می انداز اور خریدی شان جہاں تک غالب کی دسترس نہیں تھی۔ یہ بات شاید معنی خیز ہے کہ جس طرح غالب کے لیے سرمایہ اختیار اس کا مسئلہ شعر ہے، اسی طرح نظیر می کو دنیا سے بے نیازی اور دستگیری فخر کا باعث ہے۔

اندیشہ از قرارِ خریا گذشتہ ایست

کو تا ہی کہ بہت ز تقریر پست ماست

غالب اور دوسرے بڑے شاعروں کی طرح نظیری کو بھی یہ احساس رہا کہ الفاظ اور اشعار فکر اور تخیل کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ ہماری فکر تو تریلے آگے نکل گئی۔ کمی جو کچھ ہے وہ ہمارے بیان میں ہے۔

مال و عصمت رازِ لیا بد دریں سودا نہ باخت

ماہِ کنعان برون از خیلِ خریداران خوش مت

اس سودے میں عصمت اور مال کو ٹٹا کر زینا ٹوٹے میں نہیں رہی۔ خریداروں کے ہجوم میں سے ماہِ کنعان (یوسف) کو اڑا کر لے جانا بڑی بات ہے۔

تمنایش چو گردد گردِ خاطر مضربِ گردم

چو محتاجی کہ گردد در سرایش مہساں پیدا

اس کی تمنا جب میرے دل میں داخل ہوتی ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں اس محتاج کی طرح جس کے گھرا جانا نہ مہمان آجائے۔ تشبیہ کی دلکش سادگی سے قطع نظر سادے ارمان اور جذبات چند الفاظ میں کہنچ کر چلے آئے ہیں، وہ 'آئیں گھر میں ہمارے سے' کے آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا، تک۔ اشتیاق اور اہتمام پذیرائی ہر لفظ میں پُرفشاں ہے۔

نظیری خاطر می از داغِ دل آزرده تر دارد

قدم ہشیار نہ اینجا کہ درخوں می نہی پارا

نظیری کا دل روٹھا ہوا ہے زخموں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے دل میں قدم رکھ تو رہے ہو، لیکن خدا را ہوشیاری کے ساتھ نہیں تو پاؤں خون میں لت پت ہو جائیں گے۔

نوازشی ز کرم می کند محبت نیست

تو ان شناختن از دوستی مدارا را

اس کی عنایت سے دھوکے میں نہ آجانا، مدارات اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اس طویل مضمون کا مقصد نقد و نظر نہیں صرف نظر ہے۔ اہم سطور نے کتاب اس مطلب سے کھولی

اور قلم اس نیت سے اٹھایا تھا کہ غالب کی فارسی غزلوں سے خط اندوز ہو اور اس خط میں

قارئین کو اپنے ساتھ شریک کرے۔ نظیری کے چند اشعار اس لیے نقل کر دیے گئے کہ قارئین کو

دو اساتذہ کی افتادِ طبع، زاویہٴ نظر اور اسلوبِ نگارش کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ موازنہ ملحوظ نہ تھا۔ لیکن مضمون کے بیشتر صفحات میں ہوش و گوش غالب کو رہن کر دینے کے باوصف اخیر اخیر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بحیثیت غزل گو کے نظیری کو غالب پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ ”دل و دماغ“ والی فرسودہ لیکن بکار آمد اصطلاح کو اگر استعمال کیا جائے تو یہ کہنا شاید حقیقت سے بعید نہ ہو کہ نظیری کی پروازِ تخیل میں دل کا عمل دخل زیادہ ہے اور غالب کے یہاں دماغ کا۔ نظیری کی غزلیں دل گردا خشکی کا پتہ دیتی ہیں، غالب کی غزلیں ذہنِ ساطع کا۔ غالب کے یہاں کاوش اور آؤر و کا سرائی لگانا مشکل نہیں ہے۔ نظیری کے یہاں آمد کا عمل دخل ہے۔ یا شعر کی تکمیل تک کاوش کے نقشِ قدم مٹ جاتے ہیں۔ نظیری کی سادہ بلاغت بنیادی حقیقتوں کا انعکاس مسور کن انداز سے کرتی ہے۔ اس کے یہاں نظر کی تازگی تصوف مزاجی کے سرچشمہ سے بھوٹتی ہے۔



## غالب کے فارسی قصائد کا مطالعہ لسانی نقطہ نظر سے

غالب فارسی قصیدہ گوئی میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، ان کے قصیدوں میں قدما کے قصائد کی پیروی ملتی ہے، اور اس حد تک کامیاب ہیں کہ بعض قصائد پر فارسی کے قدیم بڑے شاعروں کے قصیدوں کا دھوکا ہوتا ہے، یہ تو بھی جانتے ہیں غالب کا خاص میدان غزل گوئی ہے اور اس میدان میں ان کے مقابل کم شغل نظر آتے ہیں، اور ان کی قصیدہ نگاری کا ایک قابل ذکر وصف یہ ہے کہ ان میں غزل کے آداب کی پوری رعایت ملتی ہے، ان کا ایک قصیدہ حافظ کی ایک غزل کی پیروی میں نظم ہوا، اور حافظ کے ایک مصرعے کی تفسیر کی ہے:

ہم ازینجا ست کہ دانادل شیراز سرود

بندہ طلعت آن باش کہ آئی دارد

حافظ کی غزل اور غالب کے قصیدہ کے چند اشعار بالقابل درج کیے جاتے ہیں ان سے غالب کے مرتبے کا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا۔

غالب (۲۳۷، ۲۳۸)

حافظ دیوان ص ۸۵

شاہد آن نیست کہ موئی و میانی دارد

بندہ طلعت آن باش کہ آئی دارد

شیوہ خورد پری گر چہ لطیفست ولی

خوبی آنست و لطافت کہ مرانی دارد

چشمہ چشم مرا ای گل خنداں دریاب

کہ بامید تو خوشش آب روانی دارد

در بہار ان چمن از عیش نشانی دارد

برگ ہر نخل کہ بینی رگ جانی دارد

غنیچہ مشکین نفس ولالہ بخورش گلبوی

انجمن مجمرہ و غالیہ دانی دارد

باد را راہ بہ خلوت کدہ غنیچہ پیراست

گم نہ با شاہد گل راز نہانی دارد

سبزہ را نامیہ انداختہ بادی در سر  
 بر خود از ہم سری سر و گمانی دارد  
 گریہ ہر چند ز شادیت ولی ابر بہار  
 نیز چون من مژدہ اشک فغانی دارد  
 بر خیزد ز ریش گرد دم قطرہ زدن  
 ادمم ایہ کہ از برق عنانی دارد  
 تاک از باد خورد آب خوشابادہ فروش  
 مایہ در باغ و بہ بازار دکانی دارد  
 لامکان گزنتوان گفت توان گفت کہ شاہ  
 بر تر از ہر چہ توان گفت مکانی دارد  
 روی خوش باید و تاب کم و طرز خرام  
 نبرد دل ز کف ارمونی و میانی دارد  
 نطق تنہا بود مشق سخن را کافی  
 سخن اینست کہ این تیر کمانی دارد  
 گوی خوبی کہ برد از تو کہ خورشید آنجا  
 نہ سوار یست کہ در دست عنانی دارد  
 دل نشان شد سخنم تا تو قبولش کردی  
 آری آری سخن عشق نشانی دارد  
 خم ابروی تو در صنعت شیر اندازی  
 بردہ از دست ہر آن کس کہ کمانی دارد  
 درہ عشق نشد کس بہ یقین محرم راز  
 ہر کسی بر حسب فکر گمانی دارد  
 با خرابات نشیناں ز کرامات ملا ف  
 ہر سخن وقتی و ہر نکتہ مکانی دارد  
 مرغ زیرک نرند در چہ پیش پردہ سرای  
 ہر بہاری کہ بدنبال خزانہ دارد  
 مدعی گو لغز و نکتہ بحافظ مفروش  
 کلک مانیز زبانی و بیانی دارد

حال ہی میں راقم السطور پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی خواہش پر غالب کی فارسی قصیدہ نگاری پر لکھنے بیٹھا تو خیال ہوا کہ فارسی قصیدہ نگاری کے جائزے کے بغیر غالب کی فارسی قصیدہ نگاری پر تنقید نامکمل رہے گی۔ چناں چہ پہلے قصیدہ نگاری پر لکھا تو وہ ضخیم ہو گیا اور اس کو غالب دالے مضمون سے الگ ایک کتابچہ کی شکل میں شایع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی چناں چہ اسلامک اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ کے تحت وہ چھپ رہا ہے۔ غالب کی قصیدہ نگاری پر مقالہ بھی کافی طویل ہو گیا اس کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ ان کے قصیدوں کی ادبی، تاریخی اور شعری خصوصیات پر مشتمل اور دوسرا حصہ لسانی خصائص کا حامل تھا۔ اسلوب احمد صاحب نے اپنے لیے پہلا حصہ مخصوص کر لیا اور یہ دوسرا حصہ اردو ادب میں بغرض اشاعت روانہ کیا جا رہا ہے۔

لسانی اعتبار سے غالب کے قصائد کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں، انھوں نے اس صنف

کے ذریعہ فارسی زبان کی بڑی خدمت انجام دی ہے، یہ تو معلوم ہے کہ غالب بڑے جدت طراز شخصیت کے مالک تھے، بات میں بات پیدا کرنا، ان کی جتنی طبعیت کا خاصہ تھا، اور جس طرح انھوں نے اختراع مضامین سے شاعری کو دلکش و جاذب نظر بنا دیا ہے۔ ان کی جدت پسند طبعیت نے سیکڑوں نئی نئی تراکیب ایجاد کر کے اسلوب بیان کو ایسا حسین بنا دیا ہے کہ قاری مبہوت ہو جاتا ہے۔ ان تراکیب سے زبان کا دامن وسیع ہو گیا ہے۔ اور وہ اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ زیادہ فرصت چاہتا ہے۔

پردہ رسم پرستش ۱، حسن بی نشان ۱، نطع پیدائی ۱، قالب ابداع ۱، پوئے دشت خیال ۲، شکر دست ۲، نشہ وصف جلال ۲، نر ہنگاہ تسلیم رسول ۲، قرعہ سوزن شکوہ ۲، سودا پیشگان ہمت دیود ۲، آوازہ سود و زیان ۳، شمعہ عشق ۳، گلخن افروزان داغ ۳، گذار نالہ آتش فشاں ۳، ساغر معنی ۴، کاسہ دریا و کان ۴، سرایہ کردارہ ۵، داغ ناشکیبی ۵، لذت جگر خواری ۶، مایہ بخشی دل ۶، بندہ پالائی ۷، خصم گداز ۷، ہنگامہ سنج خوشن ۷، دوزخ پیشانی ۷، سونات خیال ۷، کار گاہ ارژنگی ۷، شرکاری ۷، دفتر جاہ ۸، عین بیداری ۸، مغائر شماری ۸، جادہ مقصود ۸، چراغ غم خواری ۸، جلوہ حجاب گداز ۹، سایہ شرع ۹، اثر سنجی ۱۰، فیض کحل ولا ۱۰، جامع قانون عالم آشوب ۱۱، صاحب فرہنگ مردم آزاری ۱۱، نخل امید ۱۱، اشتم بخت ۱۱، رنگ رنگ نثرندی ۱۱، بند بند فتنہ ۱۱، بلند و پست سرفرازی و گونہ ساری ۱۱، ادای مغان ۱۳، روز نامہ اندودہ و انتظار ۱۳، نرخ چمن ۱۳، جریدہ رقم آرزو ۱۳، قلم و ہوس مژدہ کنار ۱۳، گلشن نظارہ ۱۳، لالہ کار ۱۳، در آستین ۱۳، کرشمہ بار ۱۳، تردستی مژدہ ۱۳، آشوب گاہ ہم ۱۳، گرد فتنہ ۱۳، وقف شکن ۱۳، کتاب لالہ زار ۱۵، بیچ و تاب عجز ۱۵، دلفریبی شوق جنوں مزاج، پشت گرمی جان امیدوار ۱۵، زہر عریدہ ۱۵، پردہ چار ۱۶، دوش شوق، جہنم بخت ۱۶، منتهای ہمت سستی ۱۶، جہان جہان گلہای شیشہ ۱۶، مغز کوہ ہار ۱۶، زماں زمان ۱۷، قانون نطق ۱۷، فیض بخشی نفس، دنوازی کرم ۱۷، فرہنگ آفرینش، شرح روزگار ۱۸، دفتر وجود ۱۸، برات بار ۱۸، عشرت رضا ۱۹، سپیدہ روی سید کار ۱۹، شاہد مدح ۱۹، بیچ و تاب عرض جنوں ۱۹، شمار شوق ۱۹، نہیب حوصلہ آرز ۱۹، نیک دور باش ۱۹، سکوت وجود ۲۰، محیط نور ۲۰، خم و بیچ فغان و آہ ۲۰، جیب مواد شب ۲۰، گوہر کردہ راز ۲۱، سیما بیان ۲۱، تلخاب رگ قلزم ۲۲، خونابہ کان ۲۲، کشور لطف ۲۲



رواج زرد بیکاری آهن ۲۳ بی برگی ایمان ۲۴ تیج و خم، مستی و نوم ۲۵ رخ ناشسته ۲۶ غوغای رؤر  
 انبساط و جد ۲۷ خوشش پهن ۲۸ جبین دل ۲۸ بطانه توفیق ۲۹ کافور فرایزدی ۲۹ خشکی بنداهین ۲۹  
 گران مائی دل ۳۱ پرواز سویدا ۳۱ شراندا ۳۱ رگ ابرگداز جگر ۳۲ رگ هتتاب ۳۳ اعجاز اثرهای  
 قبول ۳۳ نظارگی جلوه اسرار خیال ۳۴ گل کده گل ۳۴ راه تنام ۳۴ رگ خارا ۳۴ افسانه آوارگی آدم  
 و حواء ۳۵ طرفی نتوان بست ۳۵ نمکده لا، ریشه الا ۳۵ گرانمایگی ناز ۳۵ آئینه تصویر نمائی ۳۵ انگاه  
 دل ۳۶ خم خانه تولا ۳۶ افسرنا ۳۶ خطه غبرا، ۳۶ ذوق ظهور ۳۶ شفق زاء، ۳ الف صیقل ایمان  
 جلوه الا، ۳۷ کوکبه کفر، ۳۷ گران مانگی قدر ۳۸ ذوق رخ یوسف، رگ خواب زینجا ۳۸ طربگاه سپید  
 ۳۰۴، آئینه اسرار نبوت ۳۹ سوداگر ایمان ۳۹ حاصل در یوزه فردا ۳۹ سبزه گفتار ۴۰ آرایش دوی  
 ۴۰ آرایش غوغا ۴۰ با سلیق شکایت ۴۱ رگ مژه ترا ۴۱ نورد بال کبوتر ۴۱ طوار شکوه نفس ۴۱  
 دست تظلی ۴۲ ستیزه کاری اختر ۴۲ بخیال ۴۳ تیج و خم نقش ۴۳، منشور سرفرازی بنجر ۴۳  
 اندوه چیره دستی اعدا ۴۳ رقص شرر ۴۳ غوغای پایه سخی قیصر ۴۴ درد تنخابن ۴۵ خار حرت ۴۵  
 جلوه که مدعا ۴۵ نیایش نگار ۴۶ دارغ غم ۴۶ منع ریزش راز، ۴۶ گنج گهرهای راز، ۴۶ مشت مشت گل ۴۶  
 گنج لب، ۴۷ دجله خون، ۴۷ ترکش سخن ۴۸ ناصیه ارغوان ۴۸ نهال قد خارزار خوی، ستاره و کش  
 آسمان نهاد ۴۸ خون آشتی ۴۹ پروردگار ناطقه سارغان ۴۹ متاع نظر بردکان، ۵۰ کوس بلند پایگی جاه  
 ۵۰ قهرمان سبله و توانان ۵۰ عنقای قاف قدر ۵۰ قحط خریدار ۵۱ نرخ گوهر نطق ۵۱ مزد جگر  
 کادی ۵۱ سپاس هزار ارمان ۵۱ مسند فراز تخت که خاوان ۵۲ همشاره ریگ روان ۵۲ شاهراه  
 مدح ۵۳ پایه سنج مستی ۵۳ باغ وجود ۵۴ خروش مرگ، غریب یاس ۵۴ طوفان ناامیدی ۵۴  
 خروش مرگ ۵۴ طلوع نشر بیم هلاک ۵۴ هیلاج دیده متاد ۵۴ ناوک غم ۵۵ رخ نقد قبول، گرد  
 کساد ۵۵ انتقام باروت ۵۵ سیلی کیوان ۵۵ دور باش موکب ۵۵ گزارش هوس ۵۶ ماتم دانش ۵۶  
 باد نهیب ۵۶ سرمایه گرانی کوه، ۵۶ نیروی تیشه فرهاد، ۵۶ نطح ادیم، تاب سبیل، ۵۶ حوصله دل  
 ناصیه بخت، ۵۶ گوش تاب طبیعت، ۵۶ بور و توبه تغافل ۵۸ معافه داد، سنگلاخ شکایت، مرغزار  
 و داد ۵۸ آب روی دانش و داد ۵۸ بلج تشنه لبی ۵۹ محراب سازی آقطاب، سجاده بانی او تاد ۵۹  
 چراغ بزم عزرا ۵۹ عتبه بوسی مهر ۵۹ لوائ قدر، جهان جاده ۵۹، اجل نهیب ۵۹ قوی اساس ۵۹



صورت کشای صلح ۶۰ معنی نای جہد ۶۰ نیز مہر ۶۰ حوصلہ لطف ۶۰ شوخی ابرام ۶۰ قسم راستی بنیاد ۶۰  
گدایان کوی غفلت ۶۱ طریق استبعاد ۶۱ تازہ روی بستانیان مہر و وفاق، زندانیان بطن و عناد ۶۱  
شہرت دم برق درخش ۶۲ انتشار شمیم، انتعاش مشام، ہتزاز نبات و انقباض جماد ۱۰۶۲ استواری  
دانش، کست عہد ی و ہم، آب در غربال، عید در اشتاد ۶۳ فرورفتگان بارغ مرد ۶۳ مشیمہ  
غیب ۸۴ صومعہ مدح، حراب دعا ۵، زاغان دژم ۵، فراز بام امید ۸۴ شہ سوار نظر گاہ ۹، لافتی ۹  
صحرائی خیال ۱۱۳ کارگر روز و شب ۱۳۹ دیدہ امید ۱۳۹ شاہد افعال ۱۳۹ ہواداری بلیں ۱۱۳  
لذت آزار ۱۱۳ رنج جلو داری مجنوں ۱۱۴ نازش جادو رقی ۱۱۵ شمع بخت جگر تشنہ ۱۱۶ منظر اوج قبول  
عید نگاہ ۱۱۹ رہ اندیشہ وصف ۱۱۹ ناقہ شوق ۱۵۵ تاجر نطق، کشور جان ۱۵۶ خلوت گر فکر ۱۵۶  
کشتہ تیغ وفا ۱۵۰ ہفتتیں خرگاہ، سرمہ آرزوی یغون ۱۵۰ سجدہ ابروی چاہ ۱۵۵ رنج جلو داری  
مجنوں ۱۱۴ تنگ ہم طرحی مرغان گر قار ۱۱۴ و لولہ نازش جادو رقی ۱۱۵ اوج قبول، عید نگاہ ۱۱۶  
لب تشنگی بادہ گل رنگ ۲۰۰ دائرہ دور مدح ۲۰۸ طرار صورت ری ۲۱۳ ہندوی غم، کعبہ دل ۲۱۳  
ہجر الاسود سویدا ۲۱۳ زہراب غم ۲۰۲ متاع یغنا ۲۱۲ ولولہ رستخیز، معرکہ شوق ۱۵۰ خضر بیابان ۱۵۰ میا بخی  
گری خار ۱۵۰ تشنہ لبان نبات ۱۱۹ شاداب فیض ۱۲۲ جرء فشان می ۲۰۴ سرزین خیال ۲۰۲ جگر گاہ  
دیو ۲۰۴ آغوش روزگار ۲۰۹ درخواہ ابرو ۲۰۱ بندار بہار ۲۰۴ سرخوش خواب عدم ۲۲۸ پرسش  
پہناں ۳۰۵ قرطاس استغنا ۱۸۲ خار خار غم ۲۲۴ خار خار چاک ۳۰۵ ...

ان کے یہاں ایسی تراکیب اتنی ہیں کہ اگر سارے کلام سے اکٹھے کر لی جائیں تو ایک کتابچہ  
تیار ہو سکتا ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی کوششوں سے فارسی زبان میں بڑی وسعت  
پیدا ہو گئی ہے، غالب کے کلام کا اس حیثیت سے مطالعہ بڑا مفید ہے۔

اب، غالب کے قصائد میں ایسے الفاظ کافی مل جاتے ہیں جو قدما کے یہاں عام طور پر مستعمل ہیں۔  
مگر ۱۸-۱۹ صدی میں وہ اتنے عام نہ تھے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

وایہ ۱ : مراد و مقصد صاحت

دیگر آں وایہ و من مزد دعا می خواہم بر در دوست سوالم بہ تقاضا ماند (۱۴۵)

گر وایہ رسد بمن ز سویت با غالب خستہ جان نگویم (۳۶۶)

بہنہاں دہندوایہ بیاران تنگدست (۴۵)

ہجیر : بضم بمعنی خوب و نیک و زبدہ و خلاصہ :

گمراہ چنان خوش و آبی چناں نکو رذی چیں مبارک وقتی چیں ہجیر (۳۰۲)

منوچہری کے دیوان ص ۳۴ ہرگز بارہمیں معافی آمدہ

اشتم : زبردستی کوئی چیز لے لینا، تندی، تعدی و ظلم

اگرچہ ز اشتم بختی زیم ناکام (۱۱)

اشتم انتظار گل بود از نہ دیدہ ز گس ز حد قچوں بدون آمد (۳۶۴)

ترسم چرا ز اشتم متکرو نکیر (۳۸۵)

پاساد : صیانت، برہان میں ہے مگر فرہنگ معین میں نہیں آیا۔

دوئی نبود و سرش ہمچناں بہ سجدہ فرود ز ہی اسام وز ہی استواری پاساد (۵۸)

برہان میں اس کے یہ معانی درج ہیں :

پاساد بمعنی صیانت باشد و آن محافظت کردن است خود را از سخنان ہزل و قبیح و افعال

شنیدہ و قبیح، غالب کے شعر میں استواری پاساد بمعنی استواری صیانت ۔

بندار : بضم اول کیسہ دار خانہ دار، صاحب تجل و کنت : غالب

وقت آنست کہ بندار بہار آراید نو ہالان چن را بعروسانہ حلل (۳۷۷)

جہانگیری ۷۹، پر یہی معنی درج ہیں، ناصر خسرو :

بر سر گنجی کہ یزدان در دل احمد نہاد جز علی گنجور نبود جز علی بندار نیست

حاشیہ بیایہ اشعار درج ہوئے ہیں :

گرگ : ن و ضیاغ تو بخورد گرگ صعب تو میر و بندار است (نظامی)

بر سردار دان بر سر ہنگ در بن جاہ ہیں تن بندار (سنائی)

حیف نبود کہ چوں تو سرداری طلبد کہنہ کفش از بندار (خواجہ)

اوباریدن : غائب کے یہاں آدم اوباری اس طرح آیا ہے :

چو ساحران ہمد اشغل آتش افشانی چو اژدہا ہمد ز ذوق آدم اوباری

او باریدن بمعنی ناچا دیدہ فرو بردن، یو باریدن نیز بہین معنی

سنائی؛ نیست اندر نگار خانہ کن صورت و نقش مومن و کفار

ز آنکہ در شرط بحر الا لشد لائہنگی است کفر و دین او بار

خواہد؛ غوطہ خور در محیط استغنا خیمہ زن در جہان استغفار

تا ہنگی شوی محیط آشام تا پلنگی شوی جہاں او بار اہانگیری ۹۳

یو باریدن فرو بردن، او باریدن نیز، عربی بلع، منوچہری؛

خشم او چون ماہی فرزند داود البنی گر یو بار در جہاں گوید کہ ہستم گر سہ (ایضا ۲۳۳)

سنائی؛ گر آن ماہی کہ یوش یو باریدہ دریا یو بار در ترا چون او ازین سفلی علی بابانی

(دیوان ص ۳۱۸)

مکاتیب سنائی؛ نہنگ لا الہ الا اللہ ہمہ رویہا و سویہا در پیش سراپردہ سبحانیت یو باریدہ است

(ص ۱۰۲)

ذیل میں چند اور الفاظ جو قدما کے یہاں برابر استعمال ہوتے ہیں درج کیے جاتے ہیں؛

نیا ۱۸۶، رو سپید ۵۹، خلقہ ۵۹، غریو ۵۴، انبا ز ۴۸، بہینہ ۸۳، جباہ ۵، زاوہ ۱۳۱، باد افراہ ۹۵

ساو ۵۰، خیزبان ۱۰۸، راق ۱۰۹، سیکہ ۱۰۶، نواندی ۲۱۱، چنبر ۲۳۲، سبے ۲۳۲، زہرینہ ۲۰۸،

سفالینہ ۲۰، بی نوایانہ ۲۲، کچہ ویارہ ۲۳۰، سطح اغیز ۲۳، مرغورہ ۲۲۸، جنبیت ۲۳۴، گونہ ۲۸۲،

لای پالا ۲۱۱، نگاور ۲۳۴، اخلگند ۲۳۳، گونہ ۳۸۴، وسادہ ۲۴۷، در خورد ۲۴۰، ستوہ ۲۴۲

رج، غالب کے قصیدوں میں علمی اصطلاحات کی بھرمار ہے، اس وصف کی وجہ سے ان کا وقار

بڑھ جاتا ہے انھوں نے متداول تلمیحات میں نئے نئے نکتے پیدا کئے ہیں۔ مثلاً

باسلیمان زند دم از بلقیس در رہ مور شکر اندازد

باز لیخا اگر شود ہمسراز طسرح کاخ مصور اندازد (۲۳۵)

وحشت تفرقہ در کاخ مصور سنجند مجمع انس برنی بست زلیخا بینند

نستوہند اگر ہمرہ جنوں گردند نخر و شند اگر محل لیلہ بینند (۲۴۳)

جام چو نید وز رندی نگر ایند بزهد  
سبوح انجم اگر درید بیضا بینند (۲۲۳)

نظم را موجد سرچشمہ حیوان فہمند  
ز بسکہ بند گیش دارد آرزو محمود  
نثر را نسخہ اعجاز مسیحا بینند (۲۲۴)

اگر نہ چرخ پلایہ سریر آورد  
بر آن سرست کہ خود را بدل کند بہ ایاز (۲۲۶)  
طلای دہد ہی آفتاب را بگداز (۲۲۸)

گمان کنم کہ خدا خود نیا فریدہ بہشت  
وہ بہشت برویم اگر کنند فسراز (۲۲۹)

چوں بدانند کہ عامت ندانند زہر  
قشقہ را رونق ہنگامہ بند و خوانند  
روی گرمی اگر از مہر بخوز اینند  
بادہ را شمع طربخانہ مہر سا بینند  
برسم وز زمزمہ و قشقہ وز تار و صلیب  
خرقہ و سہو و سواک و مصلایینند (۲۳۳)

آں موجد کہ بہشتش دم کار  
بگمانی دوی عطارد را  
تیشہ از دست آذر اندازد  
از فراز دو پیکر اندازد (۲۳۳)  
(د) غالب کے اشعار میں نئے نئے تجربات ملتے ہیں، مثلاً انتہائی سردی میں شراب پینے کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے :

عبارت ہم بہ طراوت چو لالہ دبستاں  
معانیم بہ لطافت چو بادہ دیدہ ماہ (۹۷)  
اس کے ساتھ بعض قدیم روایت کی جھلک ان کے یہاں مل جاتی ہے، مثلاً مے خوار جب شراب پیتا ہے تو کچھ شراب زمین پر ڈھال دیتا ہے۔ شعرا نے اس سے عجیب عجیب نکتے پیدا کیے ہیں۔ حافظ کہتے ہیں :

اگر شراب خوری جرء فشاں بر خاک  
از آں گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک  
(دیوان طبع فردوسی ۲۰۸)



رستم بر من بچکان بادہ گلزنگ بنو کش

جرمہ بر خاک فشاندن روش اہل مفاست (ص ۲۰۳)

اس امر سے کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے، غالب نے اس طرح فائدہ اٹھایا ہے۔

ز حق عطیہ پذیرد چو ماہتاب ز مہر

بہ خلق بہرہ رساند چو آفتاب بہ ماہ

۱۵۱ بعض الفاظ ہندوستانی معنی میں بھی نظر آئے جیسے شایگان جس کے معنی مفت کے ہیں۔

بہ مشتری چہ رسم ترک چرخ در راہ است

کہ جان و جامہ و جاہر سہ رایگان گیرد (ص ۳۵۴)

لیکن ص ۵۲ پر رایگان بمعنی بیکار سا ہے :

دود چراغ در شب و خون جگر بروز سی سال خوردم و فلکش رایگان نہاد۔

یہاں رایگان بمعنی مفت نہیں ہے

غصہ جس کے معنی اردو میں غیظ و غضب ہیں

چوں خود مرا بغصہ فنا کرد روزگار (کلیات ص ۱۳۶)

فرہنگ معین میں غصہ اور اس سے متعلق الفاظ کے یہ معانی ہیں :

غصہ : جو گلے میں پھنس جائے، حزن و ملال

غصہ افروندن غم و اندوہ زیادہ کرنا

غصہ خور اندوہ گیں، جو رنج و غم دل میں رکھتا ہے اور ظاہر نہیں کرتا۔

غصہ خوردن غم کھانا، رنج و غم دل میں رکھنا

غصہ خوری غمخواری، دل سوزی

غصہ دار مغموم

غصہ فرو خوردن غم کھانا

غصہ کاہ جو غم و اندوہ کم کرتا ہے۔

عقہ کشیدن رنج اٹھانا  
عقہ گار غم خوار، غمگین  
عقہ مرگ شدن غم سے مرجانا  
عقہ مند و عقہ ناک، اندوہ گیں

ان مثالوں سے واضح ہے کہ عقہ بمعنی غیظ و غضب فارسی میں مستعمل نہیں۔ لیکن غالب نے عقہ بمعنی غم و اندوہ بھی لکھا ہے: کمال میں کہ بدین عقہ ہای جانفرسا۔ ص ۹۰  
شبگیر: سحرگاہ، ہنگام سحر، صبح زود، شبگیری: سفر کردن بہ سحرگاہ  
ہزار فائدہ شوق می کند شبگیر (سرفی)

یعنی شبگیر کردن = سفر کردن (فرہنگ معین)

غالب کے ان دونوں شعر میں یہ لفظ ان دونوں میں سے کسی میں نہیں آیا۔ بظن قوی بمعنی شب،

شبگیر مدح قوت بخت سخنوریت راہی بردشنائی اختر گرفتہ ایم (۹۳)

پای خوابیدہ مدد کرد سرآمد شبگیر بپوچہ ختم آخرازیں انجمنستان رفتیم (۱۱۴)

لیکن ان دونوں ابیات میں شبگیر بمعنی سفر میں ہے:

وہم در شبگیر دشتش برغان انداختہ گوئی رمضان رفت بہ شبگیر و دریں راہ الخ (ص ۲۰)

(۱) تکرار الفاظ جس سے کثرت کے معنی یہ جاتے ہیں، ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، چند مثالیں یہ ہیں:

کا کا و کا و ۲۰ خار خار ۲۰ پایہ پایہ ۲، رقعہ رقعہ ۳، بند فتنہ ۱۱، چمن چمن ۱۱، طبق طبق ۱۱، رنگ

رنگ ۱۱، پوی پوی ۲۱۸، فوج فوج ۱۱۲۹، خار خار غم ۲۲۴، گو نہ گو نہ ۲۶۱، دجلہ دجلہ ۲۸۱، قطرہ قطرہ ۲۸۱

خار خار خاک ۳۵۰، عصو عصو ۳۸۴ وغیرہ کبھی کبھی دونوں نفلوں کے درمیان الف کا اضافہ ہو جاتا

ہے جیسے گونا گوں رنگا رنگ، مالا مال، اور کبھی بہ کے اضافے سے دونوں لفظ بڑھ جاتے ہیں جیسے

روز بروز، رنگ برنگ، یہ صورتیں اردو میں بھی یکساں رائج ہیں۔ البتہ خار خار سے کثرت کے بجائے

خواہش مراد ہے۔

(۲) دساتیری الفاظ جیسے سمراد ص ۵، فرتاب ص ۱۹۵، ۲۷۸، ۳۷۹۔

ح، غالب نے ایک جگہ باسلیق کا لفظ استعمال کیا ہے، یہ اصلاً یونانی ہے جو ایک مخصوص رنگ کا نام ہے، غالب کا شعر یہ ہے

نشر بہ باسلیق شکایت فرد برم

خون دل از رنگ مژہ تر برآمد (ص: ۴۱)

مربنگ معین میں "باسلیق" یونانی لفظ ہے۔

کہتے ہیں، بمعنی سیاہ رنگ جو محور بازو کے مقابل جلد کے نیچے ہوتی ہے۔

میں اس کے لیے BASILIC ہے

دستور زبان کے بعض مسائل غالب کے قصائد میں قابل توجہ ہے۔

بعض فعل قدیم انداز کے ہیں جیسے ندیدستی، درخرا با تم ندیدستی خراب، یا منستی بجائے

منی = من ہستی (۳۰۸)

اب، اضافہ ابنی مانند یوسف یعقوب یعنی یوسف بن یعقوب، گہم چو یوسف یعقوب در چہ

اندازد (غالب ص ۳۱۸)

ناموں میں اس اضافت کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ جیسے مسعود سعد سلمان یعنی مسعود بن

سعد بن سلمان۔

ج، اضافت مقلوب کی مثال: دعوی ہستی ہمہ بت بندگیست ۳۵۴ بت بندگی = بندگی بت

بالش ز نخل اربود خشت قحط نیست

باری بود سری کہ بالیں تو اں نہاد (ص ۵۲)

خشت قحط یعنی قحط خشت، اور اضافت کی صورت میں یہ ترکیب درست بیٹھتی تھی، مگر نہ جانے

کیوں غالب نے صورت بدل دی۔ غالب مضاف مضاف الیہ کی ترکیب کو الٹے اور دونوں کے درمیان

علامت را کے اضافے کے شائق تھے، چنانچہ ان کی فارسی کی نثری اور منظوم تصانیف میں یہ عمل

دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں:-

ایں عبودیت نامہ را قماش سلام روستائی است و دائرہ ہر حرفش را پرداز کار گدائی۔

یعنی قماش ایں عبودیت نامہ، پرداز دائرہ ہر حرف

قصائد غالب سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں

تعامہ رمتاع نظر بر دکان نہاد (۵۰)

یعنی متاع نظر عامہ

چوں خواست بام کاخ ترا نردبان نہاد (۵۱)

یعنی برای بام کاخ تو

رنج و الم را فرا لیش اعداد (ص ۵۵)

یعنی فرا لیش رنج و الم

بہ پشت چشم نہادیم شکوہ را بنیاد (۵۸)

یعنی بنیاد شکوہ نہادیم

بود ز لخت جگر ناله را براہ تو زاد (۵۹)

یعنی براہ تو از لخت جگر برای ناله زاد بود

اندیشہ را عنان نگاور گرفته ایم (۹۳)

یعنی عنان نگاور اندیشہ

اندیشہ را نقاب زرخ (۹۳)

یعنی نقاب از رخ اندیشہ

سبزہ پزمرده را روح بقالب دوید (۱۲۹)

یعنی روح سبزہ پزمرده

ظائر اندیشہ را شعلہ بہ شہپر گرفت (۱۳۲)

یعنی بہ شہپر ظائر اندیشہ شعلہ گرفت

دلیران سپاہش را ہنر با جملہ بہرامی فراستان جاہش را بنا با جملہ کیوانی (۱۳۴)

یعنی ہنرهای دلیران سپاہ ، بناهای فراستان جاہ

تانا طقہ را روی دہد نادرہ زائی (۱۵۱)

یعنی نادرہ زائی تانا طقہ روی دہد



خاک را سبزہ بر آئینہ برگردون روکش  
 تاک را خوشہ ہمانا بہ ثریا مانا ست (۲۰۳)  
 یعنی سبزہ خاک، خوشہ تاک  
 گفتار مرا جائزہ (۲۰۴)

یعنی جائزہ گفتار من

(د) بعض اضافی ترکیبوں میں مضاف الیہ انگریزی زبان کے لفظ ہیں جیسے:

کارگر روز و شب نقش دسمبر گرفت (۱۲۹)

تاما اسد اللہ خان نام گورنر گرفت (۱۳۱)

(هـ) صفت مقلوب کی چند مثالیں قصائد سے پیش کی جا رہی ہیں: فارسی میں موصوف پہلے اور صفت بعد میں آتی ہے لیکن ترتیب بدلنے کی صورت میں بعض جگہ وہ لفظ مفرد بن جاتا ہے جو اسم فاعل قرار پاتا ہے، جیسے بولے خوشیہ خوشبو (یعنی ابھی مہک والا) سعدی: گل خوشبوئی در حمام روزی یعنی چمکنے والی مٹی۔ غالب نے ترک متباہ اندیشہ (۵) میں یہی صورت اختیار کی ہے یعنی بیکار خیالات والا ترک صفت مقلوب کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اما پنی کشایشس این معنوی طلسم فطرت شگرف قاعدہ کرد اختیار (۱۷)

معنوی طلسم طلسم معنی، شگرف قاعدہ، قاعدہ شگرف

چاک افگنم زناہ برین نیلگون پرند (۵۰) یعنی پرند نیلگون نیلے رنگ کی تریر

فرخی سیستانی: چون پرند نیلگون بر روی پوشد مرغ زار

پرنیان ہفت نگ اندر سرآرد کو ہزار

صام را بخواص از آں فرخ آگیز (۳۸۲) فرخ آگیز: آگیز فرخ۔ ایں خسروی نوا غزل از برگرفتہ ایم من ۹

یعنی غزل خسروی نو، خسروی نوا میں بھی صفت مقلوب ہے یعنی نوا می خسروی

(ح) قدم شعرا کی طرح غالب کے یہاں کبھی کبھی مجرد جار سے پہلے آتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

فلک بہ لرزہ در ازوی ز دستبرد علم (۹۶)

مہر بجدی اندرون عرض رو پیکر گرفت (۱۲۹)

پر بکلاہ اندرش جنبش پر بر سرکش (۱۳۰)

بکہ بزم اندر تیں بذلہ فثالت لب (۱۳۰)

بکہ بہ رزم اندر ش حربہ گزارست کف (۱۱)

متمای جہاندار نہ بینی بہ جہاں در (۱۹۴)

ان مثالوں میں در، اندرون، اندر، اندر، اندر، در حروف جار ہیں جو مجرور کے بعد آئے ہیں،  
قدما کے یہاں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

سراجی خراشالی کا ایک قصیدہ ہے جس میں ردیف اندر ہے، اندر جار ہے اور سارے مجرور  
جو مقدم ہیں قافیہ کے طور پر آئے ہیں (ص ۷۷، بعد)

چہ آفتست بدان جزع دلستان اندر

چہ حالتست بدان لعل بانفشان اندر

مجرور مقدم کی صورت میں بھی ان کے پہلے حرف جار "بہ" برابر آتا رہا ہے، گو یا دو جار ہیں، ایک  
مقدم بر مجرور اور دوسرا موخر۔

مولنس الاحرار ج ۱ ص ۲۱۷ تا ۲۲۳ پانچ قصیدے نقل ہیں اور ان پانچوں میں جار مجرور کے بعد  
آیا ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ قصیدے "رایہ" ہیں اور تشبیہات کے ذیل میں نقل  
ہوئے ہیں۔ ہر قصیدے کے مطلع درج ذیل ہیں :

نوروز فراز آمد و عیدش باثر بر بریکہ گروہ روزدہ یک بد گمہ بر (عنصری)

ای تازہ تر از برگ گل تازہ بہر بر پروردہ تراخان فردوس بہر بر (معری)

ای سلسلہ شک فگندہ بہ قمر بر وای قفل زمرزدہ بروج در بر (مختاری)

ای خندہ زبان نوش تو بر تنگ شکر بر وای لکن کنان بوس تو بر تنگ قمر بر (سنائی)

ای بند نہادہ سز لفت بہ سحر بر عتاب تو آوردہ قیامت بشکر بر (سیف اعرج)

(ط) صنائع شعری میں غالب حسن تعلیل و لف و نشر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

حسن تعلیل کی مثالیں :

گو ہر فشان گلوی کہ ابر بہار را از بس شتاب آبلہ پا کرد روزگار (۱۲۳)

از شکل ماہ نو بہ گمانم کہ ماہ را بر در گہ تو ناصیہ سا کرد روزگار (۱۳۵)

گر از بیم عدلش نباشد هراسان چرا شعله بر خویش خنجر بر آرد (۱۴۶)  
 گر جنونی هست گو باش این همه سوز از کجاست  
 نیست گراز خاک گلخن غنصر سودای من (۱۴۷)

ای که در نطقم روانی دیده دانی که چیست  
 می خورم خون دل و می ریزد از لبهای من (۱۴۸)

بود از گهر به بطن صدف نقش بند ابر  
 گشت از شفق بر اوج هوا لاله کار باد (۱۴۹)

عیار کعبه رواں تا به تشنگی گیرند  
 نداده اند در آن دشت راه دریا را (۱۵۰)  
 لف و نشر که نمونے

به نقد و نسیه جهان شاد شد که داد خدا  
 به من شراب و بز تا دمشرده تسنیم (۱۵۱)

از برون سو آیم اما از درون سو آتشم  
 ماهی از جوی سمندر یابی از دریای من (۱۵۲)

جاده راه و پرچم علمش  
 افق غربی و طلوع هلال (۱۵۳)

غم چو گیرد سخت نتوان شکوه از دلدار کرد  
 گل چو ماند دیر، گردد بردش باز آید  
 بهر آسانی اساس آسمان انداخته  
 بهر تجدید طرب طرح خزاں انداخته

(۱) تفتن طبع کے لیے غالب گاہے ایک حرف سے شروع ہوئے الفاظ ایک سلسلے میں لاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

داوران داور عدیم مثال      سروران سرور محال ہمال (۱۲۳)  
 دارای فریدوں فر فرزائے فر فرخ      کز فر فرادان لقبش بو ظفر آمد  
 ہمتاے جہاندار نہ بینی بہ جہاں در      کز فر فرہنگ جہانی دگر آمد (۱۲۴)

چو صلح اصل صلاحیت فتح چوں نبود      صلاح بین کہ ہماں فتحہ دارا از اعواب (۱۲۵)  
 سکندر در دارا در ہماں (۱۲۶)

فرد فرہنگ فریدوں دہا سائش خلق (۱۲۷) کہ جان و جامہ و جاہر سر را یکاں گیرد (۱۲۸)  
 اس مصرع میں دال کی تکرار قابل توجہ ہے :

درد ایرہ دور قدح دیر نگنجد ۲۰۸

ایک ایک لفظ کی تکرار کی مثالیں :

در حضرت شاہ ہمہ داں وہمہ آرای      کاندہ ہمہ جاد رہمہ بخشی سمر آمد (۱۲۹)  
 حق جوی و حق شناسم و حق گوی و حق گزار (۱۳۰)  
 اسی سلسلے میں یہ مثالیں بھی قابل توجہ ہیں :

ایمن از فتنہ عیاری عیار انم      با چنین تجر بہ کز یاری یاران رفتم (۱۳۱)  
 نہ بکا شائے کشیدم نہ بکا شان رفتم (۱۳۲)  
 بر مکید نہ ہمہ بر مکیان نہ ہرزہ رشک (۱۳۳)

خافیہ کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب نے واو معروف و مجهول کے قوافی ساتھ ساتھ استعمال کئے ہیں مثلاً ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے

تجلی کہ ز موسیٰ بود ہوش بطور      بشکل کلب علی خاں دگر نمود ظہور

اس کے دوسرے قوافی یہ ہیں :

نور، سطور، سرور، منصور، ظہور، ماہور، ظہور، دستور، مزدور، شعور، کافور، زہور،



قبور، گور، مشہور، ساطور، صدور، زبور، دجور، گنجور، مغفور، دہور، معذور، صبور، مور، قصور،  
دور، مشکور، سور، ہور، ظنور۔

ان میں گور بمعنی قبر اور مور بمعنی چینوٹی وادجھول سے ہیں، بقیہ تمام قوافی میں واد معروف آیا  
ہے، وادجھول والے دو شعر یہ ہیں:

جہاں قافی دجان جہاں عجب بنود  
کہ ازورود تو ہر مردہ رقص اندر گور

کفی بدست تھی ترز کیسہ دلاک

دلی بسینہ بسی تنگ ترز دیدہ مور

مگر قدما کے یہاں مجھے معروف دجھول کے قافیہ نظر نہیں آئے، مثلاً

نخیب جرباد قافی کا قصیدہ	چو چتر روز فرد گشت ازین حدیقہ لور
رشید و طواط کا قصیدہ	زہے بخود تو ایام مکرمات مشہور
ظہیر فاریابی کا قصیدہ	سپیدہ دم کہ شدم محرم سرای سرور
نخیب جرباد قافی کا قصیدہ	بیارغ صورت بادام و خوشہ انگور

عرفی نے ۸۷ شعر کا ایک قصیدہ اس مطلع کے ساتھ تحریر کیا ہے:

سپیدہ دم کہ زدم آستین بشمع شعور

شنیدم آیت لا تقنطوا زعالم نور

(۶۱ - ۶۹)

اس میں کوئی قافیہ وادجھول سے نہیں ملتا۔

فارسی شاعری میں صنف قصیدہ اس کا طرہ امتیاز ہے، فارسی شاعروں نے اس صنف  
کو ہر قسم کے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔ عارفانہ، اخلاقی، سیاسی، ملکی و ملی، تاریخی  
موضوعات پر اظہار خیالات کے لیے قصیدہ سے بہتر کوئی اور صنف نہیں، اور حق تو یہ ہے کہ  
ایرانی شاعروں نے اس صنف کی ترقی میں جو ردل ادا کیا وہ محتاج بیان نہیں، فارسی قصیدے  
مضامین و موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے، غالب کی قصیدہ نگاری کو

اگر فارسی قصیدہ گوئی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کا شمار بڑے قصیدہ نگاروں میں نہیں ہو سکتا اس لیے کہ موضوعات کے اعتبار سے ان کا دائرہ محدود رہا ہے۔ البتہ ضرور ہے کہ ان کی ذہانت و طباعی قدم قدم پر اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ان کے قصائد مضموناً و فری نازک خیالی، جدت ادا کے نمونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اسی بنا پر یہ قصیدے اکثر غزل کے حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بعض اوقات غزل کی زمینوں میں قصیدے لکھے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک مثال حافظ کی ایک غزل ہے۔ جو قبلاً نقل ہو چکی ہے غالب نے اس کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے ہر شعر میں آداب غزل کی پوری روایت ملحوظ رکھی گئی ہے، اور یہ بات محتاج ثبوت نہیں کہ غالب کا مزاج غزل کے لیے سازگار تھا خود داری، خود ستائی ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ مگر حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے قصیدے لکھے اور مستحق اور غیر مستحق سب کی مدح کی، مگر اس مدح میں اخلاص نہ تھا۔ وہ فطری تقاضے سے مدحیہ شاعری نہیں کرتے، خلاصہ یہ کہ غالب غزل گو شاعر کی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتے، لیکن قصیدہ گوئی میں وہ اس بلند مقام تک نہیں پہنچ سکے جہاں قدیم فارسی شاعر پہنچ چکے تھے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ شاعری کا ملکہ ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس لیے قصیدہ میں بڑے خوب صورت اشعار ملتے ہیں۔ مگر یہ اشعار قصیدے کے مزاج سے کتنے سازگار ہیں اس کا فیصلہ نقاد سخن ہی کر سکتا ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ غالب کا کلام مطالعے کا وافر سامان اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جتنا غور کیجیے زبان و ادب کے تعلق سے نئے نئے نکات مل جاتے ہیں، یہ اس شاعر کا کمال ہے جس میں وہ یگانہ و یکتا ہے۔ اس کی داد نہ دینا بڑی نا انصافی ہوگی۔

## حواشی:

۱۔ بندرہ ازی نامی ایک شاعر ہے جو عبداللہ لدھی کا مداح تھا (وفات ۴۰ھ)  
 ۲۔ کلیات غالب ج ۲ ص ۲۹۳ آدم ادباری کے بجائے آدم ادباری ہے اور اس کتاب کے مصنف جناب فاضل لکھنوی نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

”قصیدہ کے دونوں ماخذیں ”ادباری“ ہے لیکن جناب وزیرالحسن عابدی نے خلاف نسخہ قلمی ”ادباری“ بنایا ہے، حاشیہ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے اصل قصیدے میں اس کے یہ معنی لکھے تھے:

”آدم ادباری“ ادباریدن بمعنی ناخائیدہ فرو بردن، ادبار صیغہ امر و در آخر تختانی مردم آ ارشد۔ فاضل مصحح کی فارسی دانی تو ملاحظہ ہو کہ باوجود پروفیسر وزیرالحسن عابدی کے توجہ دلانے کے وہ آدم ادباری کو غلط اور آدم ادباری کو صحیح قرار دے کر اسے متن ٹھہرایا، پھر غالب پر یہ تہمت صریح کہ انہوں نے بھی آدم ادبار۔ ادباریدن لکھا تھا، مصحح صاحب اگر کوئی فارسی کا لغت دیکھ لیتے تو ان کی ساری الجھن ختم ہو جاتی، لیکن اتنی زحمت کون گوارا کرے۔ فاضل محترم کے تصحیح شدہ نسخے میں تصحیف اور غلط خوانی کی متعدد اور بھی مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً

ص ۱۷۸ بجائے دروا کے دردا : دل دروای من

ص ۲۰۳ پھر بجائے دردا دردا : ورنہ درسیہ دل ہرگز بہینی درد است

ص ۳۰۶ بجائے آذر برزین کے آذر برزین : مغاں آور برزین

ص ۵۶ بجائے دیباہ کے دروی ماہ : گزارش ہوسم نو بہار دروی ماہ

۱۷۷ ان اصطلاحات میں بڑا تنوع ہے، نقیصہ و عرفان، مذاہب و ادیان، فلسفہ و علوم وغیرہ کی سیکڑوں اصطلاحات سے نئے نئے معنایں پیدا کیے ہیں، یہ خود الگ بحث کا موضوع بن سکتا ہے۔

۱۷۸ غالب کے ایک شعر میں رایگان دوبار آیا ہے، ایک بار ہندوستانی معنی میں، دوسری بار فارسی معنی میں :

در اجرا ینکہ کوشش نماز رایگان زلفت خواہم ز حق حیات ابد رایگان تو (۱۳۹)

دوسرے مصرع میں رایگان برائی تو ہونا چاہیے پہلے مصرع میں رایگان بھنی برباد و ضائع دوسرے میں بمعنی مفت ہے۔

۱۷۹ پنج آہنگ، آہنگ پنجم نامہ بنام نواب سید اکبر علی خاں موتی امام بارہ ہو گلی بندہ

۱۸۰ شمس الدین التمش کے دور میں وارد ہند ہوا تھا، اس کے دیوان کے دو نسخے ملتے ہیں، راقم نے ان کی مدد سے اس کا دیوان مرتب کر کے ۱۹۰۱ء میں شائع کر دیا ہے۔ یہ شاعر عہد مملوک کا شاید

سب سے قدیم حقیقی صاحب دیوان شاعر ہے۔

۷۔ اسی بطبع باغ کون از بہر برہان حدوث طرح رنگ آمیزی فصل خزاں انداختہ عرفی،  
فصل خزاں کی طرح رنگ آمیزی کی جو علت عرفی سے بتائی ہے وہ زیادہ حکیمانہ ہے۔

۸۔ مونس الاחרار ج ۱ ص ۱۷۸ - ۱۸۱

۹۔ ایضاً ص ۱۸۱ - ۱۸۲

۱۰۔ ایضاً ج ۲ ص ۵۷۴ - ۵۷۵

۱۱۔ ایضاً ص ۵۸۵ - ۵۸۸

۱۲۔ مرزا محمد قزوینی نے لکھا ہے کہ حافظ یای جہول اور یای معروف کے قافیے نہیں لاتے ہیں

یادداشتہای قزوینی ج ۱۰ ص ۲۴۶ - ۲۴۷۔



کلام غالب بخط غالب



کوئے قید پر نہیں آئے آگے آئے تھے دل میں سے  
کوئے مرتے نظر نہیں آئے اس کے تیرے تیرے

سوال اگر نظر نہیں آئے  
جانتا ہوں تو ہر ایک کو  
کچھ دیکھ رہا ہوں  
کچھ دیکھ رہا ہوں  
کچھ دیکھ رہا ہوں

مقام شکر ہی سناں خطہ خاک

۲۔ رہا ہی زور سی ابر ستارہ بار برس

کھنچا ہی ساقی مہوش کھنچا ہی مہوش  
۳۔ بیار لافنی گلزار گونہ بیار برس ۵ امیر کلب علیخان جبین ہزار برس

خدا فی سجدو عطا کی ہی گوہر شانی فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں

مقام شکر ہی سناں خطہ خاک ۴۔ کئی ہزار برس بلکہ بیشمار برس

خدا اک کعبہ ایسا ہے جس کا  
مقام شکر ہی سناں خطہ خاک  
۵۔

# غالب کے کچھ شعروں کا متن حالی کی تحریروں میں

غالب پر چند تحریریں ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے مضامین کا مجموعہ ہے، جو انجمن ترقی اردو ہند نے اپنی روایات کے مطابق بہت خوب صورت چھاپا ہے۔ سب سے اہم اس کتاب کا پہلا مضمون ہے یادگار غالب اور مقدمہ شعروں شاعری میں غالب کے بعض اشعار۔ فاضل مصنف تحقیق کے طریقہ کار اور آداب سے واقف ہیں۔ آپ نے ایم ٹ اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے لیے رسمی اور باقاعدہ تحقیق کی ہے، اس لیے انہوں نے یقیناً بہت چھان پٹشک کر، ماخذوں سے کام کی باتیں نکالی ہوں گی۔ ایسے مصنف موصوف کی چھان بین سے استفادہ کریں۔ لیکن پہلے ان کا نقطہ نظر سمجھ لیں۔ مصرعوں میں اختلاف نسخ کی نشاندہی کرنے سے پہلے، کچھ اہم باتیں انہوں نے لکھی ہیں:

”یادگار غالب اور مقدمہ شعروں شاعری میں، حالی نے غالب کے جو اشعار درج کیے ہیں، ان میں اکثر اشعار کا متن، آج کے مصنفہ نسخوں میں موجود متن سے خاصا مختلف نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ محمد حسین آزاد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے استاد ذوق کے کلام کو جب مرتب کیا، تو جگہ جگہ اس میں لفظی تصرفات کرتے گئے۔۔۔۔۔ کبھی سماعت، یا جس چیز کو مذاق سلیم یا خوش مذاقی کہا جاتا ہے، اور جو دراصل انسان کی ذاتی پسند یا ناپسند کا دوسرا نام ہے، اس کی کرشمہ کاریاں بھی ایسے اختلافات کی ذمہ دار ہوتی ہیں مولانا حالی کو مرزا غالب سے جو ربط خاص تھا، وہ جس قدر ان کے قریب تھے۔ اور کلام غالب سے ان کو جو تعلق خاطر تھا، ان سب کی بنا پر، ان کے درج کردہ اشعار کے متن کو بھی اہمیت حاصل



ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان اختلافات کو ترجیح رکھا، نہ دی جاسکے، اور اصل متن کا درجہ انہیں حاصل نہ ہو سکے۔۔۔۔۔

مصنف موصوف نے بڑی شائستگی سے ان باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

- ۱۔ محمد حسین آزاد کی طرح حالی نے بھی اپنے استاد کے کلام میں تحریف کی۔
- ۲۔ غیر شعوری، اور غیر ارادی طور پر حالی سے کلام غالب میں تحریفیں ہوئیں۔ کچھ یادداشت نے دھوکا دیا ہوگا، اور کچھ شعرا حالی نے الفاظ میں تصرفات کر کے، اپنے مذاق سلیم کے مطابق لکھے ہوں گے۔

مصنف موصوف نے موثر انداز میں، انشا پر دازی یا لغامی کے بغیر شہانہ میں پیش کر دی ہیں۔ اگر مزید چھان بین کی جائے، تو قاری ان کے ہمنوا ہو جائیں گے، جس کی مثال اور ثبوت حرف آغاز ہے۔ لیکن اس کے بارے میں معروضات آخر میں پیش کی جائیں گی، جن اختلافات نسخ کی نشاندہی کی گئی ہے، ان کے مطالعے کے بعد۔

مالک رام اور امتیاز علی خاں کے مرتب کیے ہوئے دیوان غالب کے نسخوں کو مصنف موصوف مصدقہ سمجھتے ہیں۔ مالک رام کا خیال ہے کہ مفتی محمد انوار الحق کا مرتب کیا ہوا دیوان غالب جدید، نسخہ حمیدیہ، جامع الغلاط کہلانے کا مستحق ہے: حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب کا کام اولین اور بنیادی ہے۔ اگرچہ اغلاط سے پاک نہیں ہے، لیکن اتنی غلطیاں نسخہ حمیدیہ میں نہیں ہیں، جتنی ہر دو فاضل مرثبین کے نسخوں میں ہیں، علم و دانش (سری نگر) کی جلد اول (شمارہ ۱)، جنوری ۱۹۷۳ء میں اس عاجز کی کتاب ”روزِ غالب“ کا ایک باب شائع ہوا تھا۔ اس میں کچھ ایسے اشعار کی نشاندہی، تقطیع کے ساتھ کی گئی تھی جو ان دو نسخوں میں غلط قرائتوں کے ساتھ درج ہوئے ہیں۔ سب مثالوں کو نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ مصنف موصوف سے گزارش ہے کہ جن نسخوں کو وہ مصدقہ تصور فرماتے ہیں، ان میں ان اشعار کی قرات دوبارہ ملاحظہ فرمائیں:

صد سال یادگار غالب ایڈیشن میں غزل نمبر ۹، میں ص ۶، پر شعریوں لکھا ہے:

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل

گر سی بزم ہے ایک قصہ شر ہوتے تک

نسخہ عرشی میں ص ۵، پر اسی غزل کا مطلع یوں لکھا ہے:

آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہوتے تک  
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

مل مثنیٰ مجنون محذوف: فاعلاتن فعلاتن فعلن (۲ بار) میں دونوں مصرعوں کی تقطیع ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ گرمی بزر فاعلاتن، مہ اک رق فعلاتن، ص شر ہو فعلاتن، تے تک فعلن،

۲۔ آہ کو چار فاعلاتن، ہے اک علم فعلاتن، را اثر ہو فعلاتن، تے تک فعلن،

ایک دونوں جگہ واضح طور سے غلط ہے۔ پہلی مثال میں اک فعلاتن میں لک کے مقابل ہے۔ دوسری مثال میں بھی اک اسی مقام پر لک کے مقابل ہے۔ جب اعراب بالحروف لکھے جاتے تھے تو اک اور ایک، دونوں کی کتابت ایک ہوتی تھی۔ دوسری مثال میں غلطی دوہری عبرتناک ہے، اس لیے عرشی مرحوم عین صحیح عرّج سے بولنے پر قادر تھے۔ عام طور سے اردو میں عین اور الف کی ایک ہی صوت ہے یہاں عین کو الف کی طرح پڑھ کر عین موصول بنا دیا گیا۔ حالاں کہ عین کی صوت موصول نہیں ہوتی۔ الف مصوّتہ ہے، اگرچہ اور کوئی مصوّتہ، واو عطف، کسر، جو دراصل الف مضموم ہے، موصول ہوتا ہے عین مصمتہ ہے۔ یہ موصول نہیں ہوتا۔ نسخہ عرشی کی اس قرأت کی وجہ سے اگر کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ غائب عین موصول کے قائل تھے، تو نا درست ہوگا۔

صرف ایک ایک مثال نقل کی گئی ہے۔ یہ کوئی نادر مثال نہیں۔ دونوں نسخوں میں بہت سے مقامات ایسے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ شعرا ہنگ میں نہیں پڑھے گئے۔ اعراب بالحروف کو محذوف اصلی پڑھا گیا یا بے معروف و مہول کا خلط کثرت سے ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں بھی ان فاضل مرتبین سے تسامح ہوا۔ مثلاً ایک شعر ہے:

گدا سمجھ کے وہ خوش تھا، مری جو شامت آی

اٹھا، اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے!

دونوں نسخوں میں شامت آی کی جگہ شامت آسے لکھوایا گیا ہے۔ حالاں کہ اس سے مصرع کا مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ نظم طباطبائی (مرحوم) شرح میں اس شعر کی صحیح قرأت بہت پہلے درج کر چکے تھے۔

اعراب بالحروف پڑھنے میں جو تسامح، ان فاضل مرتبین سے ہوا، اس کی وجہ سے ڈاکٹر سعادت علی

صدیقی سے بھی لغزش ہوئی، اور انھوں نے اک کی جگہ نسخہ عرشی میں ایک۔ دیکھ کر اسے اختلاف نسخ سمجھا۔ یہ مفروضہ بھی گمراہ کن ہے کہ اس نسخے میں اختلاف نسخ کے تحت شعر کی تمام قراءتوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے عرشی

نے "یادگار غالب" کو بھی معتبر ماخذ تسلیم کیا ہے، اور اختلافات کی نشاندہی کی ہے، اگرچہ سب کی نہیں۔  
اب ہم ان اشعار کو لیتے ہیں جن کی قرارت میں مصنف موصوف نے یادگار غالب اور نسخہ عرشی کے  
درمیان اختلاف دکھایا ہے :

آئے ہو کھل، اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں  
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

یہ قرارت نسخہ عرشی (ص ۱۱۰) اور نسخہ مالک مام (ص ۵۹) کی ہے۔ یادگار غالب میں حاتی نے دوسرا مصرع یہ  
لکھا ہے :

مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

دیوان غالب جدید، یعنی نسخہ حمیدہ میں مفتی محمد انوار الحق نے بھی ص ۷۷ پر یہی مصرع لکھا ہے۔ مفتی صاحب کا  
ماخذ دیوان غالب کا کوئی نسخہ تھا، یادگار نہیں۔ عرشی نے یادگار کا اختلاف نسخ تو دکھایا ہے، لیکن حمیدہ  
کا نہیں۔

مالک رام اور عرشی کے نسخوں میں ایک شعریوں ہے :

۲۔ تم کون سے تھے ایسے کھرے دادوتد کے

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

یادگار میں حاتی نے پہلا مصرع یوں نقل کیا ہے :

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے دادوتد کے

عرشی نے اس اختلاف نسخ کی نشاندہی نہیں کی ہے، جو ان کے نسخے کے اس اعتبار سے کامل نہ ہونے کی طرف  
اشارہ ہے۔

۳۔ ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب

قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

حاتی نے یادگار میں پہلا مصرع یہ نقل کیا ہے :

ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب

عرشی نے اس اختلاف نسخ کی نشاندہی کی ہے۔

یہ غزل عارف کا مرثیہ ہے۔ متداول دیوان میں، بشمول مطلع و مقطع، یہ دس شعروں کی غزل ہے۔ یادگار میں  
حالی نے نو شعر نقل کیے ہیں۔ یہ شعر متداول دیوان کا اس میں نہیں ہے۔

مٹ جائے گاسر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا

ہوں درد پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

یہ شعر غزل کا ہے، اور اگرچہ قنوطی فضا کا ہے، لیکن عارف کا مرثیہ یقیناً نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے حالی نے  
نقل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی شعرا اس کا غزلیاض میں رہے ہوں گے، جو حالی کے پیش نظر تھارتھی۔ حالی  
نے یہ بھی لکھا ہے

”زمین العابدین خاں عارف سے مرزا کو غایت درجے کا تعلق تھا۔۔۔۔ اسی لیے جب وہ

جوان عمر میں فوت ہو گئے، تو مرزا اور ان کی بی بی پر سخت حادثہ گزرا۔ مرزا نے ان کے مرنے پر ایک

غزل بطور نوحے کے لکھی ہے، جو نہایت بلیغ اور ہدناک ہے۔ چنانچہ اس کے چند شعراہم اس

مقام پر نقل کرتے ہیں۔“

ظاہر ہے اگر یہ غزل صرف دس شعروں پر مشتمل ہوتی، اور نو شعر نقل کیے گئے ہوتے۔ تو حالی چند شعر نقل

کرنے کی بات نہ کرتے، حالی کے بیان پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان کے بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا حقیقت

سے دور نہ ہوگا کہ اس غزل میں پندرہ، سترہ یا اس سے بھی زیادہ شعر رہے ہوں گے۔ چند کا مطلب یہ ہے کہ

جتنے شعر نقل کیے گئے، ان سے کہیں زیادہ نہیں، تو خاصی تعداد میں شعر چھوڑ دیے گئے۔ حالی نے ظاہر ہے اپنی

یادداشت سے یہ شعر نہیں لکھے ہوں گے۔

اپنے عجز کا اقرار اس زمیلی سرخی کے تحت (ص ۱۰۴) حالی نے ذکر کیا ہے کتباً مجتہد العصر

سید محمد صاحب کی فرمائش پر مرزا نے مرثیہ لکھنا چاہا۔ مشکل سے تین بند لکھ سکے :

”۔۔۔۔ قویٰ میں انخطاط شروع ہو گیا تھا۔ مشکل سے سڈس کے تین بند لکھے جن میں سے

پہلا بند ہم کو یاد ہے، اور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔“

حالی نے ایک بند اپنی یادداشت سے لکھا ہے، اس لیے اس بات کا ذکر کر دیا، کہ ایک محتاط ادیب کی

حیثیت سے یہ ان کا فرض تھا۔ یہ اس خیال سے کیا کہ مبادا مرثیے کے یہ بند کہیں نقل کیے جائیں، اور ایک آدھ

لفظ میں اختلاف ہو، تو ان پر تحریف کا الزام نہ لگایا جائے۔



۴۔ وحشت و شیفۃ اب مرثیہ کہیں شاید

مرگیا غالب اشفۃ نوا، کہتے ہیں

یادگار میں شاگردوں کی کثرت کے تحت حاتی نے لکھا ہے :

” . . . . . نواب مصطفیٰ خاں مرحوم، جنہوں نے مومن خاں مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام

فارسی ہو یا اردو مرزا ہی کو دکھایا۔ یا جیسے سید غلام علی خاں مرحوم، متخلص بہ وحشت، جو مرزا

کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد، اور ان کی صحبت سے مستفید رہے تھے، مرزا نے

انہیں دو صاحبوں کی طرف اپنی ایک اردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے، اور کہا ہے :

وحشت و شیفۃ اب مرثیہ لکھیں شاید

یادگار لکھتے وقت مرزا کا جو کلام حاتی کے پیش نظر رہا ہو گا۔ اس میں کہیں نہیں لکھیں ہی رہا ہو گا

اس ایک لفظ کی تبدیلی سے شعر میں سے آسمان پر نہیں پہنچ جاتا۔ حاتی نے اپنے استاد کے کلام میں

اصلاح کی ہو، ایسا سوچنا بھی، کسی شہادت یا سراغ کے بغیر زیادتی ہوگی۔

نسخہ عرشی میں زیر نظر شعر میں اختلاف نسخ نہیں دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک اور اشارہ اس نسخے کے

کامل نہ ہونے کی طرف ہے۔

یادگار لکھتے وقت خواجہ الطاف حسین حاتی کے سامنے کوئی ایسی بیاض بھی شاید تھی۔ جو فوجدار مرزا خاں

کے کتب خانے والا نسخہ (نسخہ بھوپال) لکھے جانے سے پہلے کی تھی۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ

اس میں مرزا کا کلام جمع کیا، لکھا جاتا تھا۔ یادگار میں کچھ اشعار کی قرأت، ان کے کلام کے نسخوں کی قرأت

سے کہیں کہیں مختلف ہے۔ یادگار میں کہیں کہیں ابتدائی قرأت ان اشعار کی ہے، جب کہ دوسرے

نسخوں میں اصلاح / اصلاحوں کے بعد کی ہے۔

یادگار کے دیباچے میں حاتی نے لکھا ہے :

” . . . . . کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات، جس قدر

معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں، اور ان کی شاعری و انشا پر دازی کے متعلق جو امور کہ احاطہ بیان

میں آسکیں، اور انہیں زمانے کے فہم سے بالاتر نہ ہوں، ان کو اپنے سلیقے کے موافق قلم

بند کروں۔ پچھلے برسوں جب میں دہلی میں مقیم تھا، بعض اجاب کی تحریک سے اس

خیاں کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ میں نے مرزا کی تصانیف کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا، اور جس قدر اس میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا، ان کو قلم بند کیا اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں، یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں، ان کو بھی ضبط تحریر میں لایا۔ مگر ابھی ترتیب مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اور کاموں میں مصروف ہو گیا، اور کئی برس تک وہ یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔“

خواجہ حاتی دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دوبارہ جب دوستوں نے اس طرف توجہ دلائی تو: ”میں نے ان مٹھوں کو کھولا، اور ان یادداشتوں کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ان کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کے سوا کچھ اور کتابیں بھی درکار ہوں گی۔ میں نے دئی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا، اور انھوں نے ہر بانی فرما کر میری تمام مطلوبہ کتابیں، اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم ہو سکے، لکھ کر میرے پاس بھیج دیے۔۔۔“

حاتی نے اگر تفصیل دی ہوتی کہ ان کے پیش نظر کیا میٹیریل تھا، تو آج مرزا کے بارے میں خود ان کے بارے میں، اور اس عہد کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی۔ ان اطلاعات کے براہ راست فراہم نہ ہونے کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ماخذ معتبر ذرائع سے جمع کئے تھے، اور ان کی جہان بین بھی کی ہوگی۔

دیوان کی اشاعت کے لیے مرزا نے خود اپنے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ ایک دوسرے زاویہ سے انھوں نے شعر میں کہا۔

کہتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

جو کلام مرزا نے نظری کر دیا تھا وہ ضائع نہیں ہوا۔ سب نہیں تو اس کا بڑا حصہ حاتی کے مٹھوں تک پہنچا اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ابتدائی کلام کے نمونے کے طور پر سات شعریہ نگار میں پیش کیے ہیں۔

”کرے گر فکر تعمیر خرابیہاے دل گردوں

نہ بھلے خشتِ مثلِ انجواں بیرونِ رقا بہا

یہ شعر بلکہ غزل نسخہ شیرانی میں نہیں ہے۔ نسخہ حمید یہ (ص ۳۱) میں نسخہ بھوپال کا یہ مصرع درج ہے :

نہ شکستہ خشت مثل استخوان بیرونِ قافلہ

یادگار میں ظاہر ہے نسخہ بھوپال سے پہلے کا مصرع ہے۔ نسخہ عرشی میں، نسخہ بھوپال کے حوالے سے، دوسرا مصرع وہی لکھا گیا ہے، جو یادگار میں حاتی نے دیا ہے۔ کسی اختلاف نسخ یا اصلاح بعد کتابت کی نشاندہی بھی نہیں کی گئی ہے۔ نسخہ بھوپال غائب کر دیا گیا ہے، اور حوالے کے لیے فراہم نہیں ہے۔ نسخہ شیرانی کا عکس یہی ہے، لیکن نسخہ بھوپال کا نہیں۔ اس لیے ہم مفتی انوار کے نسخہ حمید یہ اور عرشی کے نسخے میں ان کے اظہار پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں۔ حمید یہ اور نسخہ عرشی، دونوں اغلاط سے پاک نہیں ہیں۔ عرشی نے حمید یہ نسخہ بھوپال کی قراءتوں میں اس وضع اختلاف نسخ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ وہی نتیجہ اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ نسخہ بھوپال میں ابتدائی قراءت ”بیرونِ قافلہ“ تھی، جو ”بیرونِ قافلہ“ اصلاح سے کی گئی۔ لیکن اگر ایسا ہوتا، تو کیسے ممکن تھا کہ مفتی انوار اور عرشی، دونوں اس کا اظہار کرنا بھول جاتے ! عرشی نے یادگار کی قراءت کو مرتجح سمجھ کر اپنے نسخے میں لکھا، لیکن اختلاف نسخ کے تحت اس کا اظہار کرنا بھول گئے۔ کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔ دونوں صورتوں میں حاتی نے جو مصرع لکھا ہے، وہ ابتدائی قراءت ہے، نسخہ بھوپال سے پہلے کی۔ دونوں صورتوں میں سے جو بھی درست ہو، حمید یہ اور یادگار کی قراءتوں میں اختلاف کا نہ دکھایا جانا نسخہ عرشی کے کامل نہ ہونے کی دلیل ہے۔

یادگار کا جو نسخہ میرے سامنے ہے، اس کے فٹ نوٹ میں اس بات کا اظہار ہے کہ مرزا نے اپنی ایک غازی غزل میں مندرجہ صدر زیر بحث شعر کو یہ روپ دیا :

کندِ فکر تعمیرِ خرابیہا سے ماگر دوں

نیاید خشت مثل استخوان بیرونِ قافلہ

یہ ناممکنات میں سے نہیں اس کی وجہ سے عرشی نے یادگار کی قراءت کو مرتجح جانا، گو اس کا حوالہ نہیں دیا۔ طوالت سے بچنے کے لیے باقی شعر نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ ساتویں شعر کا ذکر آگے آئے گا۔

۵۔ شبِ خمارِ شوقِ ساقی رستخیزِ اندازہ تھا

تا محیطِ بادہ صورتِ خائِ خمیازہ تھا

یادگار میں مصرع اولیٰ ہے :

شبِ خمارِ چشمِ ساقی رستخیزِ اندازہ تھا

سعادت علی صدیقی کے مضمون میں شوق اور چشم، دونوں کسرۃ اضافت سے محروم ہیں۔ یادگار والے مصرع میں شمار بھی کسرۃ اضافت ہے،

مصرع ادنیٰ جیسا کہ مرقبہ دیوان میں ہے، ویسا ہی نسخۂ حمیدہ (ص ۱۳) اور نسخۂ شیرانی (ورق ۵۵) میں ہے نسخۂ عرشی اختلاف نسخ کے باب میں ناقص ہے، کہ اس میں یادگار کی قرأت کے بارے میں کوئی اظہار نہیں ہے یادگار کے مصرع میں چشم کی وجہ سے ارضیت زیادہ ہے، جب کہ متداول دیوان کا مصرع شوق کی وجہ سے زیادہ بایبہ اور بلند آہنگ ہے۔ چشم، نسخہ بھوپال سے پہلے کی قرأت ہوگی، ورنہ حاتی اس مضمون کو روایتی تلامذہ رخصت چشم ساقی کی سطح پر نہ لاتے۔ غالب کی فکر کا سفر ہے لفظ آفرینی سے خیال آفرینی کی طرف۔ حاتی جیسا عزیز شاگرد، اور عقیدہ مند جو مرثیہ میں کہتا ہے:

شر میں نامتسام ہے حاتی

غزل اس کی بنائے گا اب کون

صرف استاد کی غزل بنانا، بلکہ استاد کے ذہنی سفر کا رخ، اور وہ بھی ماضی میں بدلنے کی کوشش کرتا، حاتی کا مقصد اصلاح معکوس سے ماقبل کی قرأت دکھانا نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ حاتی کے پاس جو کلام مرزا کا تھا، اس میں اسی طرح مصرع ہوگا۔ اگلی مثال سے اس کی وضاحت ہوگی:

۶۔ ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا

تو کہے صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

حمیدہ میں ص ۳۳ پر اور نسخۂ عرشی میں ص ۲۵ پر (گنبدینہ معنی) یہی قرأت ہے۔ نسخۂ شیرانی (ورق ۳۱) میں بھی شعر کے الفاظ یہی ہیں۔ آغاز معروضات میں یادگار میں، مرزا کے ابتدائی کلام سے مثالوں میں جو سات اشعار کا ذکر کیا گیا تھا، ان میں ساتواں اور آخری شعر حاتی نے یہ لیا تھا۔

۷۔ ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا

گو نیا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

مصنف موصوف نے ایک تو گویا کو گویا لکھا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سہو کہتا بہت ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ اس لفظ کو حاتی کی اصلاح / تحریف سمجھتے ہیں۔ عرض ہے کہ یہ مصرع گویا کے ساتھ ہی نسخۂ بھوپال کے متن میں لکھا گیا تھا۔ پروف خود غالب نے پڑھا، اور ساتھ ساتھ نظر ثانی بھی کی۔ اور اس وقت گویا فلمز ذکر کے تو کہے لکھا گیا۔



نسخہ حمید یہ میں اس بات کا اظہار ہونے سے رہ گیا ہے۔ لیکن عرشی نے نسخہ بھوپال دیکھنے کے بعد جو یادداشتیں مرتب کی تھیں، ان کی بنیاد پر انھوں نے اپنے نسخے کے اختلاف نسخے کے باب میں ص ۴۰۴ پر اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے ؟

اس سے ثابت ہوتا ہے، اور کسی شک و شبہ کے بغیر، کہ حاتی کے سامنے جو مخطوطہ مخطوطے تھے، اس ران میں مرزا کا ابتدائی کلام بھی تھا، نسخہ بھوپال کی اصلاح یافتہ صورت سے پہلے کا۔

جب یہ ثابت ہے، تو دوسرے اشعار کے سلسلہ میں بھی یہ گمان کرنا کہ حاتی نے کوئی تحریف کی ہوگی، درست نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حاتی نے بعض شعروں کی منسوخ قرأت دی ہے۔ اصلاح سے پہلے کی، لیکن یہ کوئی ایسی لائق مواخذہ بات نہیں۔ منسوخ قرأت ایک بات ہے، اور اصلاح غیر بالکل دوسری نوعیت کی بات ہے۔ جو فعل قبیح ہے۔ حاتی نے اپنے استاد کا کوئی مجموعہ مرتب کیا ہوتا، اور بعد کی قرأتوں کے بجائے قبل اصلاح کی قرأتیں دی ہوتیں، تو بات قابل گرفت ہو سکتی تھی۔ انھوں نے تو غالب کے کلام کی خصوصیات، اور ان کے ذہنی ارتقا اور ذہنی رویے کی بات کی ہے، اور مثالیں اسی سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں کثرت سے تو مرزا نے اپنی اصلاحوں کو کالعدم نہیں کیا ہے، لیکن اپنی کچھ اصلاحوں کو بھی انھوں نے منسوخ کیا ہے ایسا بھی ہوا کہ ایک شعر میں پورا مصرع بدل کر ایک ناشر کو دیوان چھاپنے کے لیے دیا۔ اور دوسری جگہ سے اسی زمانے میں جو دیوان چھپا، اس میں اصلاح سے پہلے کا مصرع برقرار رہا۔ اگرچہ اس میں معنوی سقم تھا۔ لیکن مرزا خود اصلاح کر کے بھول گئے !

۴۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یادگار میں اس مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے :

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا

نسخہ بھوپال کی اس غزل کی ایک اہم بات یہ ہے کہ نسخہ بھوپال میں لکھے جانے کے بعد مرزا نے کبھی کسی شعر میں کوئی لفظ نہیں بدلا، نسخہ شیرانی میں یہ غزل درق ۱۲ ب اور ۱۳ الف پر ہے۔ متبادل دیوان کے سب نسخوں میں غزل وہی ہے۔ دشوار فارسی لغت ہے اور مشکل عربی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مرادف ہیں۔

حالی کے سامنے محفوظ یا کائنات میں، اس غزل کے مطلع میں ”مشکل ہے ہر اک“ نسخہ بھوپال سے پہلے کی قرأت ہوگی۔ نسخہ بھوپال اور متداول دیوان کا مصرع زیادہ رواں اور چست ہے، اور یادگار کے مصرع کی اصلاح یافتہ شکل ہے۔ اس لیے یہ احتمال بے بنیاد ہوگا کہ حالی نے مصرع میں تحریف یا اصلاح کی۔ یہ اختلاف نسخ بھی نسخہ عرشی میں نہیں دکھایا گیا ہے، اور یہ بات بھی اس کے کامل نہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔

۸۔ رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یادگار میں دوسرا مصرع ہے :

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

پہلی بات جو توجہ کی مستحق ہے، یہ ہے کہ نسخہ عرشی میں ص ۱۹۲ پر دوسرا مصرع یوں لکھا ہے :

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

غلط نامہ جو بڑی محنت سے تیار کیا گیا ہے، اس میں طباعت کی کوئی غلطی اس مصرع میں نہیں بتائی گئی ہے۔ مصنف موصوف نے نسخہ عرشی کا حوالہ دے کر پڑی کے بجائے پڑیں لکھا ہے۔ یہ تحقیق کے آداب کے منافی ہے۔ یادگار لکھتے وقت حالی کے پیش نظر جو نسخہ تھا رہا ہوگا اسی سے انھوں نے اس قرأت کے ساتھ یہ مصرع نقل کیا ہوگا۔ یہ قرأت صرف حالی کے تصنیف میں نہیں، یہی مصرع نسخہ حمید یہ میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ص ۱۳۹ پر نواں مصرع :

ڈاکٹر عبدالرحمن بخوری کے بارے میں مفتی محمد انوار الحق نے نسخہ حمید یہ میں ص ۲۸ پر لکھا ہے :

” . . . جب انجمن ترقی اردو نے دیوان غالب اردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا، تو

نظر انتخاب مرحوم ہی پر پڑی، اور انھوں نے بھی اس ملکی اور ادبی خدمت کو بطیب خاطر قبول کیا۔

.. مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سرانجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوان غالب

کے مختلف اور متداول نسخے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط سے اس کی تصحیح کی، اور اس کے

ساتھ ہی غالب کی شاعری پر ایک ضخیم اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا . . .“

انجمن ترقی اردو نے بخوری کا مرتب کیا ہوا متداول دیوان شائع نہیں کیا، ان کا لکھا ہوا تبصرہ نسخہ حمید یہ میں

شامل ہے۔ بجنوری۔ ۱۱، نومبر ۱۹۱۸ء کو ہوا تھا۔ ان کے مقدمہ پر جو محاسن کلام غالب کے نام سے شائع ہوئے، اور مفتی محمد انوار الحق کی تمہید یا بجنوری کے تعارف کے خاتمہ پر کوئی تاریخ یا سنہ ہے۔ البتہ دو باتیں ہمیں معلوم ہیں۔ ایک یہ کہ نسخہ حمید یہ ۱۹۳۱ء میں آگرہ کے ایک پریس میں چھپا تھا۔ دو: یہ کہ بقول مفتی بجنوری وفات سے دو برس قبل بھوپال پہنچے تھے۔ ”یادگار غالب“ کی اشاعت کا سنہ ۱۹۱۷ء ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں بجنوری نے متداول دیوان کے نسخے جمع کر کے تصحیح و ترتیب کا کام شروع کیا ہوگا۔ ان کے مقدمہ میں حاتی سے استفادہ واضح ہے۔ ان کے مقدمہ کا ایک اہم حصہ یادگار کی گونج ہے، اگرچہ حاتی مبین تھے اور بجنوری شعلہ جوار۔ اشعار کی قرأت کے سلسلے میں بجنوری نے یادگار سے زیادہ اثر نہیں لیا۔ نسخہ حمید یہ میں نسخہ بھوپال، مخطوطے، کے علاوہ متداول کلام بھی شامل ہے۔ بجنوری نے جو ذخیرہ جمع کیا تھا، اور جو دیوان مرتب کیا تھا، اگر یہ کام مکمل ہوا ہو، اس سے مفتی نے استفادہ نہ بھی کیا ہو، تو بھی ان کے سامنے غالب کے کلام کے مختلف ایڈیشن رہے ہوں گے۔ اس پس منظر کے بعد ہم موضوع حاضر پر واپس آتے ہیں۔

۱۔ نسخہ حمید یہ میں ص ۱۳۹ پر اس شعر کا مصرع ثانی وہی ہے، جو یادگار میں حاتی نے لکھا ہے۔

۲۔ ”غالب کے خطوط“، غالب انٹی ٹیوٹ، جلد اول میں ص ۱۹۷ پر مرتب خلیق انجم نے بھی شعر ”اک

ذرا پھیرے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے“ کے تحت، یادگار اور حمید یہ کی قرأت کے مطابق لکھا ہے۔

۳۔ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

یادگار غالب میں مصرع ثانی یہ ہے :

جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

حاتی کے پیش نظر جو ماخذ ہوگا، اس میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہوگا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں

میں سے کون سا مصرع بہتر ہے۔ یادگار کی مختلف قرأت کے بارے میں کوئی اندراج نسخہ طرغی میں نہیں

ہے۔ یہ ایک اور نقص اختلاف نسخہ کے باب میں ہے۔ ایک نقص اور بھی ہے، جو نہایت گمبھیر ہے اور اس سے

واضح ہوتا ہے کہ کلام غالب کے مرتب مصرع آہنگ میں بڑھنے پر قادر نہیں تھے۔ غیر موزوں کر کے

مصرع تین میں لکھے میں اور دوسرے نسخوں کے موزوں مصرعوں کو غیر موزوں سمجھ کر ہر کتابت کا شکار بنایا

ہے۔ چنانچہ اس شعر کے سلسلے میں اختلاف نسخہ کے باب میں ایک گمراہ کن اندراج ہے پہلے

مصرع میں آئے، ہمزہ کے ساتھ، دوسرے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۶ء) کے آخر میں، نسخہ رام پور جدید (۱۸۵۵ء) اور پانچویں مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۳ء) میں عرشی نے ۳ ہوکاتب بتایا ہے۔ جنہیں عروص کی شد بد سے وہ بھی اسے ۳ ہوکاتب نہیں سمجھیں گے۔ خود ان کے اور مالک رام کے نسخے میں کئی مقامات پر جہاں ہمزہ ہونا چاہیے، نہیں ہے، اور جہاں نہیں ہونا چاہیے ہے۔

اس مصرع میں آئے بھی درست ہے آئے بھی۔ اگر کالف موصول ماقبل کے ایک زائد مصمتے یا مصوتے کو خود میں ضم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تفتیح کے آئینے میں پہلا مصرع دیکھ لیں۔

۱۔ اور بانا (فاعلاتن) ریں لے آ (فعلاتن) لے اگر ٹو (فعلاتن) ٹ گیا (فعلاتن) لے رگر ٹو (فعلاتن)۔

۲۔

مصنف موصوف نے ایسے نسخے کو کامل سمجھ کر، اسے حوالے کی کتاب سمجھا، تو یہ ان کی صواب دید کی بات ہے۔

۱۔ ترے سرو قامت سے اک قد آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

یہ شعر مرزا کا ہے، اور اسی قرأت سے حالی نے یادگار میں رکھا ہے۔ مصنف موصوف نسخہ عرشی کی قرأت

ترے سرو قامت سے یک قد آدم

کو مرتجح اور درست سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے:

۱۔ نسخہ شیرانی (۱۸۳۶ء) میں ورق ۴۹ الف پر یک قد آدم ہے

۲۔ چوتھے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۳ء) میں اک ہے

۳۔ پانچویں مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۳ء) میں اک ہے

تدوین کا اصول یہ ہے کہ متداول دیوان کو مرتب کرتے وقت اس قرأت کو متن میں رکھا جائے، جو آخری ہو،

اور جس پر مرزا نے صاد کیا ہو۔ آخری قرأت مطبع نظامی کا پور (۱۸۶۳ء) اور مطبع مفید الخدایق آگرہ (۱۸۶۳ء)

و اسے ایڈیشنوں کی ہے۔ عرشی نے ۱۸۶۳ء کی قرأت پر ۱۸۳۶ء کی قرأت کو ترجیح دی اور مصنف موصوف نے

اس پر تبصرہ کیا، اور نہ اس کی تحقیق کی۔ شاید اختلاف نسخ کے باب میں ص ۴۴ پر اندراج بھی ملاحظہ نہیں

فرمایا۔ عرشی نے اظہار کیا ہے کہ پہلے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۱ء) میں ایک ہے۔

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوہ گر کو میں



مصرع یہ تھا:

تیرے سرو قامت سے ایک قدم آدم

مخطوطہ شناس اس بات سے واقف ہیں کہ اس زمانے میں اعراب با محروف کا رواج تھا۔ اس کو اس لکھتے تھے۔ ترے کو تیرے، اور تیرے کو بھی اسی طرح لکھتے تھے۔ اک اور ایک دونوں کو ایک لکھتے تھے۔ یوزوں طبع اس زمانے کی تحریر کو درست پڑھنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ اس مصرع کو:

ترے سرو قامت سے اک قدم آدم

یہی پڑھیں گے۔ بے شک تیرے اور ایک کتابت کیا ہوا ہو۔ یہاں ایک میں یاے مہول نہیں، یاے کسرہ ہے۔ یاے مہول پڑھیں تو مصرع وزن سے خارج ہے۔ غرضی کے نسخے میں ایسے اندراج اور بھی ہیں۔

کرتا ہے بک باغ میں تو بے حجابیاں  
آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے

یادگار میں مصرع ادلی ہے:

کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں

یادگار میں اتنے شعر ہیں اور ایک ترتیب کے ساتھ کہ یادداشت سے کھنگال کر ان کو لگانا اور لکھنا قرین قیاس نہیں۔ پہلا مصرع حاتی نے ماخذ ہی سے نقل کیا ہوگا۔ اس ماخذ میں اشعار کی وہ صورت ہوگی جو نسخہ بھوپال کی کتابت سے قبل تھی۔ نسخہ شیرانی میں بھی درق، الف پر الفاظ دی ہیں، جو متداول دیوان کی غزل کے اس شعر کے ہیں۔

۱۳۔ نہ مارا جان کر بے جرم غافل، تیری گردن پر

رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

یادگار میں پہلے مصرع میں غافل کی جگہ قائل ہے۔ یہ شعر نسخہ بھوپال کا ہے۔ حمیدہ میں ص ۱۲ پر دوہم طرح غزلیں ہیں۔ شیرانی میں بھی درق ۱۵ ب، ۱۶ الف اور ب رخنوں پر دو غزلیں ہیں۔ حمیدہ، شیرانی اور متداول دیوان میں اس زمین کے اشعار پر نظر ڈالیں تو شیرانی کے اس شعر پر ٹھہر جاتی ہے

دہان ہر بت پیغدارہ جو زنجیر رسوائی

عدم تک بے وفا غوغا ہے تیری بے عفتانی کا

متداول کلام میں غوندہ نہیں چرچا ہے۔ اس سے نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ مرزا نے اصلاح سے غوغا کو چرچا کیا، ایک معنوں میں یہ اصلاحی قرأت کا حصہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے نسخہ بھوپال کے شعر میں جو اصلاح کی تھی، وہ متداول دیوان کے لیے کلام کا انتخاب کرتے وقت کا عدم کردی۔ نسخہ بھوپال میں چرچا تھا۔ ایسی مثالیں کثرت سے نہیں، لیکن ہیں کہ مرزا نے اصلاح کا عدم کر کے پھل خواندگی کو برقرار رکھا۔ نسخہ بھوپال کی کتابت سے پہلے بھی انھوں نے یقیناً کچھ اصلاحیں کی ہوں گی۔ یہ باور کرنے میں کوئی موانع نہیں کہ حاکمی کے پاس جو ذخیرہ مرزا کے کلام کا تھا، اس میں سے کچھ نسخہ بھوپال سے پہلے کا بھی تھا۔

۱۳۔ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یادگار میں اس طرح شعر لکھا ہے مصنف موصوف کو دوسرے مصرع میں یہ کھٹکتا ہے رکوں نسخہ عرشی میں یوں ہے بجنوری جو کام متداول دیوان کی تصحیح کا کر رہے تھے، اور جو تبصرہ انھوں نے لکھا تھا۔ اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس میں ص ۱۱۷ پر شعرا کی طرح لکھا ہے، جیسا یادگار میں ہے، اگرچہ حمید یہ کی غزل کے متن میں ص ۴۴ پر یوں ہے۔ نسخہ عرشی میں یادگار یا بجنوری کی قرأت، اختلاف نسخہ میں نہیں دکھائی گئی ہے۔ اور یہ اس کے کامل نہ ہونے کا ایک، در ثبوت ہے۔ مالک رام نے آزاد کتاب گھر والے نسخے میں، یوں کی جگہ یہ دکھایا ہے۔ اسی صفحہ ۶۴ پر اور اختلافات کے لیے فٹ نوٹ میں ماخذوں کے حوالے ہیں، اس کے لیے خاموشی ہے اس غزل کا ایک شعر مالک رام کے دونوں نسخوں میں اس قرأت کے ساتھ ہے :

جمع کرتے ہو کیوں، قیوبوں کو

ایک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

ملا مت کسرہ کو یا بے مچول پڑھنے کی وجہ سے اک کو ایک لکھا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے دوسرا مصرع وزن ساقط ہے۔ پہلا کن فاعلاتن ہے۔ اک تماشا کا وزن فاعلاتن ہے۔ ایک کا وزن فاعل ہے۔ پھر تماشا نہیں سنا کیوں کہ لاتن، فعلن، وزن ماضی کا ہے۔ ت کی گنجائش نہیں رہتی۔ اک ت کا وزن فاعل ہے۔ اس لیے اک سے مصرع موزوں ہے۔

ایسے بہت سے مقامات مالک رام اور عرشی کے نسخوں میں ہیں۔ حاکمی شاعر ہی نہیں، بڑے شاعر تھے۔ سے قربت رکھتے تھے، اور شاعری کو پر کھنے کے لیے انھوں نے کوئی مقرر کی ان کے نقل کیے ہوئے

اشعار کو ایسے نسخوں سے ملانا، جن میں وزن سے ساقط کلام ہو، کچھ بہت خوب نہیں۔

۱۴۔ غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو

بھے دماغ نہیں خند ہلے بیجا کا

اس طرح مرزا کا شعر یادگار میں لکھا ہے۔ مصنف موصوف نے پہلا مصرع تینوں اضافتوں کے بغیر لکھا ہے یہاں تک اضافت کا کوئی محل نہیں ہے۔ پہلی اضافت کے بغیر تو مصرع ساقط الوزن بھی ہو جاتا ہے۔ موصوف نے یہ مصرع، نسخہ عرشی کے متن سے ملایا ہے جو اس طرح نقل کیا ہے۔

غم فراق میں تکلیف سیر باغ مت دو

ایک تو تینوں اضافتیں (جن کا ذکر اوپر ہوا ہے) ضروری ہیں۔ مت نادرست قرات ہے۔ اس کی جگہ یہ ہے۔

غم فراق میں تکلیف سیر باغ مت دو

یادگار میں حاتی نے جو مصرع لکھا ہے، وہی نسخہ بھوپال میں بھی تھا۔ نسخہ حمید یہ میں ص ۱۴ پر ملاحظہ فرمائیں نسخہ شیرانی میں یہ غزل نہیں ہے۔

اس شعر سے یہ حقیقت اور بھی مستحکم ہو جاتی ہے کہ حاتی کی دسترس میں ایسے ماخذ تھے، جن میں مرزا کا ابتدائی کلام بھی تھا۔ اور آخری دور کا کلام بھی۔ اگر یہ ذخیرہ مہیا ہوتا، یا حاتی نے مثالوں میں اور زیادہ کلام نقل کیا ہوتا، تو اس کی بنیاد پر ہم مرزا کے شعروں کی ابتدائی قرات تک پہنچ سکتے تھے۔ حاتی جیسا ثقہ آدمی نادرست مصرع کیوں لکھتا!

۱۵۔ مرنے کی اسے دل اور ہی تدبیر کر، کہ میں

شایان دست و بازو قاتل نہیں رہا

یہ قرات یادگار میں ہے۔ مصنف نے مصرع ثانی، نسخہ عرشی سے ملایا، اور اختلاف پایا۔ عرشی نے یہ مصرع نقل کیا ہے:

شایان دست و خنجر قاتل نہیں رہا

نسخہ شیرانی کے ورق ۱۹ کے رخ الف پر مصرع ہے:

اب لائق توجہ قاتل نہیں رہا

عرشی نے ص ۲۲۹ پر اختلاف نسخ کے تحت اظہار کیا ہے کہ نسخہ بھوپال میں بھی یہی مصرع تھا یہ اظہار بھی ہے کہ گنر غنار (۱۸۳۹ء) نسخہ رام پور (۱۸۳۳ء) پہلے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۱ء) تیسرے ایڈیشن (۱۸۶۱ء) اور چوتھے ایڈیشن (۱۸۶۲ء) میں مصرع وہی ہے جو یادگار میں ہے، لیکن عرشی نے یادگار کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ جو خامی ہے!

حمید یہ میں ص ۲۶ پر شعر کی قرأت وہی ہے جو حالی نے یادگار میں دی ہے۔ عرشی نے اظہار کیا ہے کہ یہ قرأت حاشیے پر ہے۔ متن میں مصرع وہی تھا جو نسخہ شیرانی میں نقل ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ حالی نے جو قرأت دی ہے، وہ قدیم ترین ہے، دست و بازو ہے، کی جگہ لائق توجہ ”بھوپال اور شیرانی میں، اور دست و خنجر“ عرشی کے اظہار کے مطابق حاشیہ نسخہ بھوپال پر تھا۔ لیکن یہ نسخہ فراہم نہیں ہے۔ اس لیے تصدیق نہیں ہو سکتی۔ البتہ مالک رام نے صد سالہ یادگار غالب ایڈیشن میں حالی کا مصرع چوتھے مطبع نظامی کانپور، ایڈیشن سے نقل کیا ہے۔ بازو سے کی جگہ خنجر شیونرائن والے ایڈیشن میں ہے۔ ایک بات اور عرض کر دی جائے کہ نظم طباطبائی نے اپنی شرح میں ص ۳۸ پر حالی کی قرأت ہی رکھی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ حالی نے تحریف نہیں کی۔ انھوں نے ابتدائی قرأت لکھی، اور اسی پر اصلاحیں کا لعدم کر کے، بالآخر مرزا واپس آئے۔

۱۶۔ حریف جوشش دریا نہیں خود داری سائل

جہاں ساقی ہو تو، دعویٰ ہے باطل پوشیاری کا

نسخہ بھوپال حمید یہ ص ۱۱۸ نسخہ شیرانی اور ق ۲۱ رنخب سے متبادل دیوان کے نسخوں تک، دوسرا مصرع ہے:

جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ پوشیاری کا

حمید یہ میں ہو کی جگہ ہے قرأت ہے۔ نسخہ بھوپال کی بازیافت کے بعد ہی تصدیق ہو سکے گی کہ اس میں کیا لفظ ہے حالی ثقہ اور ذمہ دار، دیب تھے۔ انھوں نے جو مصرع لکھا ہے، اسے محرف نہیں، بلکہ ابتدائی قرأت تصور کرنا چاہیے۔

۱۷۔ یارب نہ وہ سمجھے میں، نہ سمجھیں گے مری بات

و سے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مصنف موصوف نے پہلا مصرع نسخہ عرشی میں درج مصرع سے ملایا ہے:



یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات

حاتی نے جو مصرع لکھا ہے، وہی مرزا کے ذہن میں بھی گونجنے لگا۔ نہ صرف حاتی کے ماخذ میں یہ مصرع تھا، بلکہ انھوں نے اپنے استاد سے بھی اسی طرح سنا ہوگا۔ دیوان میں وہ نہ لکھے جانے کے باوجود مرزا کی زبان پر نہ وہ چڑھا رہا۔ انھوں نے ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ جون ۱۸۶۱ء کے خط میں علاراندین خان عدنی کو فارسی اور اردو کا جو کلام بھیجا۔ اس میں وہ غزل بھی تھی۔ جس میں یہ شعر ہے۔ اور پہلا مصرع وہی ہے۔ جو یادگار میں ہے۔ ۱۸۶۱ء کے خط میں مرزا کا خود اپنے قلم سے مصرع اس طرح لکھا، اس بات کا ثبوت ہے کہ حاتی کی کتاب میں درج شعر کا متن مستند ہے، استناد کا اعلیٰ ترین درجہ رکھتا ہے۔

۱۸ قاصد کے آتے آتے خطا آگ اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

شعر اس طرح یادگار میں لکھا ہے مصنف موصوف نے پہلے مصرع کو نسخہ عرشی میں درج مصرع سے ملا ہے جو یہ ہے :

قاصد کے آتے آتے خطا ایک اور لکھ رکھوں

مطبع نظامی کا پورے ایڈیشن میں چوں کہ آگ ہے، اس لیے مانک نام نے آگ رکھا ہے۔ لیکن آزاد کتاب گھر والے ایڈیشن میں ص ۲۳ کے فٹ نوٹ میں بتایا ہے کہ شیونرائن رائگرہ، والے ایڈیشن میں ایک ہے۔ عرشی نے اختلاف نسخ کے تحت اس بات کا اظہار کیا ہے کہ چوتھے ایڈیشن میں جو مطبع نظامی کا پورے چھپا تھا، اکتے ہے۔ لیکن عرشی نے اپنے نسخے کے متن کے لیے، ۱۸۴۷ء کے دوسرے ایڈیشن کا ایک چنا۔ تیسرے، اوجان والے، ایڈیشن اور چوتھے، مطبع نظامی، ایڈیشن کے جو عکس میرے سامنے ہیں، ان سے ایک بات واضح ہوتی ہے۔ یاے مہول اور یاے معروف کا خلط تو چوتھے ایڈیشن میں ہے، لیکن تیسرے ایڈیشن تک جو اعراب بالحروف کا طریقہ تھا، وہ چوتھے ایڈیشن میں یاے کسرہ کی حد تک ترک کیا گیا۔ آخر مصرع میں اکٹ اور ایک دونوں آسکتے ہیں۔ لیکن آخر مصرع میں ایک ہی مرتجح ہے۔ شروع یا درمیان مصرع میں ایک اور اکٹ، ایک ہی مقام پر صرف اس صورت میں آسکتے ہیں، جب اس لفظ کے بعد کا لفظ الف سے شروع ہوتا ہے تاکہ سبب خفیف کے مقام پر ایک رکھا گیا ہو، تو کاف کی صوت الف میں مہول ہو جائے۔ ورنہ ایک سبب خفیف کے مقام پر یعنی اکٹ کے بجائے نہیں رکھا جاسکتا۔ غالب کو اپنے

کلام کے جو مرتبین، خاص طور سے اس عہد میں ملے، ان سے تدوین کے بعض بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی ہوئی، شاید شعوری طور پر ان سے ایسا نہ ہوا ہو۔

۱۔ چون کہ تیسرے ایڈیشن تک اک اور ایک کی کتابت کا روپ ایک تھا، اور چوتھے ایڈیشن سے ایک اور اک الگ الگ طرح سے لکھے جانے لگے۔ اس لیے یہ طے ہو گیا کہ مرزا نے کہاں ایک رکھا ہے اور کہاں اک۔ جب مرزا کاغذیہ واضح ہو گیا۔ تو جہاں مرزا نے اک رکھا وہاں ایک رکھنا کلام غالب پر اصلاح کرنا، اس میں تحریف کرنا ہے۔ یہ تحریف مرتبین نے کی ہے۔ اور اس کی قباحت کا انھیں احساس نہیں۔

۲۔ عہد غالب کے املا کے بارے میں ایک اہم گزارش، ان معروضات کے ساتھ کہ شعری نسخوں کی تدوین اور تدوین سے متعلق تنقید کے لیے عروض کی بنیادی باتوں سے آگہی لازمی ہے، ورنہ ایسی افسوسناک اور حسرتناک سچویشن پیدا ہوتی ہے۔ جیسی یہاں ہے۔

مطبع احمدی دہلی (اموجان) ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں غالب کی غزل، آٹھویں شعر کے پہلے مصرع میں ایک ہے : ردیوان سے عکس، ص ۱۳۰۔ تیسرا ایڈیشن ۔

<p>بہ سو زدن ہی سانی کو نر کی باب میں          ستاد شستہ جا ہی جناب میں          رود صدا اسمانی ہی چنکٹ باب میں          لہ نہ باگ بر ہی نہ پا ہی رکاب میں          بتنا کہ وہم غیر سی ہون بیج و تاب میں          حیران ہون پرستادہ ہی کس حساب میں          رہان کیا دہرا ہی قطر موج حساب میں          ہن کسی بی حجاب کہ ہن یون حجاب میں          پیش نظر ہی اکینہ داریم نقاب میں          ہن خواہم ہن جو جاگ ہن حجاب میں          مشغول حق ہون بند کی بو تراب میں</p>	<p>بھلکی ہی کر تاج نہ خست شراب میں          ہن آن کیون بیل کہ مل کس تہی پسند          جہان کیون بکھنے مانتی ہی تن سیم سلاح          روہن ہی رشت عمر کہاں دیکھی تہنہ          ادنا ہی بھگو اپنی حقیقت سی جد ہے          ہن دشت و نہا ہر دشت ہوا ایک ہے          ہی مشعل نمود صور برد جو و بحر          شرم ایک ہی بار ہی اپنی سی سی ہی          آرایش جمال سی فانی حسین ہنوز          ہی عیب غیب جسکو سمجھتی ہن ہم شہود          عیاں لرب نہ ہم دوسرے آتی ہی ہی</p>
--	--

مطبع نظامی کا پور ایڈیشن ۱۸۹۲ء میں غالب کی غزل آٹھ شعر میں اک پہلے مصرع میں ہے۔ (دیوان سے عکس ص ۳۶) : چوتھا ایڈیشن غزل سے ۹۲ :

کل کی لی کر آج زشت شراب میں	ہو سودن ہی ساقی کوثر کی باب میں
ہیں آج کیون ذلیل کہ کل تک تھی پسند	گستاخی فشتہ باری جناب میں
جان کیون گھٹتی لگتی ہی تھی دسماع	گرد و صدا سائی ہی چنگ رہا باب میں
رزمین ہی خوش عمر کمان دیکھی شکلی	فی الحقیقت پر ہی نہ پایا ہی رکاب میں
اتو نہا ہی تجھ کو اپنی حقیقت سی بعد ہی	جتنا کہ وہم غیر سی ہوں بیچ و تاب میں
اہل شہر و شاہر و مشہور ایک ہی	حیران ہوں ہر شاہر و ہر کسی حساب میں
ہی شہر و مشہور پر وجود و محسوس	یاد کیا دہریہ نظر و موج و تاب میں
شہر و مشہور ہی تھی ہی ہی ہی ہی	ہیں کشنی لی مجاب کہ میں ہوں جناب میں
آرایش مجال سی فانیخ نسیم ہنوز	پیش نظر ہی آئینہ دار نقاب میں
ہی غیب غیب جسکو سمجھتی میں ہنوز	ہیں خواب میں ہنوز جو جاگی میں خواب میں
غالب : نہ ہم دست بکالی کا، آواز	مشغول تھی ہوں تہگی بو تراب میں

اک کا وزن (سبب خفیف) ہے۔ ایک کا وزن فاع (و تہ) ہے۔ ایک درمیان مصرع میں واقع ہو، تو کاف متحرک ہو جاتا ہے، اس طرح فاع وزن پر ہو جاتا ہے، جس میں عین بھی متحرک ہو۔ آخر مصرع میں اک اور ایک، دونوں رکھے جاسکتے ہیں۔ (مبادل کی حیثیت سے) کیوں کہ دو متصل مسکن ختم مصرع پر ہوں، تو یہ بغیر وزن نہیں، اور اس کی اجازت ہے۔ سالم اور مبالغہ / مذاں، مخدوف اور مقصور، مکسوف اور موقوف وغیرہ کا خلط جائز ہے۔

منعم و مفلس کا ہے میخانہ ایک

ایک ساقی، ایک خم پر میخانہ ایک

منعم و مفلس (فاعلان) اس ک ہے (فاعلان) خان ایک (فاعلان)

ایک ساقی (فاعلان) ایک خم پر (فاعلان) مان ایک (فاعلان)

اسی بحر میں ردیف اک ہو، تو آخری رکن فاعلان (مقصود) کے بجائے فاعل (مخدوف) ہوگا۔

منعم و مفلس کا ہے میخانہ اک

خم بھی اک، ساقی بھی اک، پر میخانہ اک

یہ مثال صرف نکتہ کی وضاحت کے لیے دی گئی ہے۔ مصرع کا آخری لفظ ایک ہی رکھا جاتا ہے۔ مصرع کے شروع یا درمیان میں اک کی جگہ ایک بھی رکھا جاسکتا ہے، اگر فوراً بعد الف سے شروع ہونے والا لفظ ہو درمیان مصرع میں اک اور ایک موصوع حاضر ہے۔ غالب کے شعر کی مثال سامنے ہے۔ شروع مصرع کی مثال دیکھیں:

آئید کی خوشی نے نہ مرنے دیا ہمیں

ایک اور رات وصل کی شاید نصیب ہو

اک اور رات وصل کی شاید نصیب ہو

اک اور مفعول رات وصل (فاعلات) کب شاید نہ (مفاعیل) صیب ہو (فاعلن)

اسے کور مفعول، . . . . . ایضاً . . . . .

غالب کا زیر گفتگو شعر عروضی اعتبار سے اسی نوعیت کا ہے۔ ایک کے بعد آور ہے جس کا الف ماقبل کے کافی کی صوت کو موصول کر لیتا ہے۔ اک تو واضح طور سے بحر میں ہے۔ ایک بھی مابعد کے آور کے الف موصول کی وجہ سے بحر میں ہے۔

قاصدک (مفعول) آت آت (فاعلات) رخ ملک اور (مفاعیل) لکھ رکھوں (فاعلن)

. . . . . ایضاً . . . . . رخ طے کور (مفاعیل) . . . ایضاً . . .

خط کی ط کی صوت بھی اک اور ایک کے الف میں منم ہو جاتی ہے۔

آج اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ غالب نے آور کے الف موصول سے عروضی فائدہ اٹھا کر ایک رکھا تھا یا اک، اگر ان کے عہد کے پھپھے ہوئے دیوان کے ایڈیشن میں یا یادگار میں اک نہ ہوتا۔

نامناسب نہ ہوگا، بلکہ مفید ہوگا، اگر اس بات کی طرف ایک بار پھر توجہ دلائی جائے کہ عہد غالب میں اعراب بالحروف لکھے جاتے تھے۔ اس لیے ایک اور اک، دونوں کا املا یکساں تھا۔ انہیں کے آخری زمانے میں املا میں فرق کیا جانے لگا۔ خود غالب ان دو کے یکساں طور سے لکھے جانے سے پریشان تھے۔ چنانچہ ان کی اس پریشانی کا اظہار واپی رامپور یوسف علی خاں تالیم کے خطوں میں ہے۔ یہ خط امتیاز علی خاں عرشی نے مرتب کر کے ”مکاتیب غالب“ کے نام سے چھاپے تھے۔ یہ مجموعہ اس وقت مہیا نہیں ہے، لیکن اس کا حوالہ میں نے تحقیقی جائزہ<sup>۱</sup> میں ۱۹۷۱ء میں دیا تھا۔ یہ عبارت وہیں سے نقل کی جاتی ہے:

”مکاتیب غالب“ مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی کے چھٹے ایڈیشن (۱۹۴۹ء) کے ص ۴۷ پر



ناظم کے کلام بہ اصلا حیں درج ہیں۔ ناظم کا ایک مطلع تھا:

یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایک عیش و عشرت کا شریک

دوست کہتے ہیں اُسے جو ہو مصیبت کا شریک

غالب نے پہلے مصرع میں ہر ایک کو ہر ایک کر دیا، اور لکھا۔ جہاں ہر ایک اچھی طرح نہ آئے وہاں ہر ایک لکھیے۔

ناظم کا ایک اور مطلع تھا:

پیری میں بھی بے ولولہ شوق نہیں ہم

رکھتے ہیں ابھی ایک دل ہنگامہ گزیر ہم

غالب نے دوسرے مصرع میں ایک کو اک سے بدل دینے کا شورہ دیا۔ اس سلسلے میں

انہوں نے لکھا۔: یہاں ایک کی جگہ اک بے یای تخیانی درست ہے۔ مگر ہر کے ساتھ

ہر ایک ہو، نہ ہر اک۔ غالب

دربارِ امپوسے غالب کے تعلقات اوائل ۱۸۵۷ء میں قائم ہوئے تھے۔ اعراب بالحرور لکھے جانے سے غالب خوش نہیں تھے۔ اگرچہ سلسلہ ان کے دیوان کے چوتھے ایڈیشن میں ترک کیا گیا۔ تیسرے ایڈیشن میں بھی شاید وہ یہی چاہتے تھے، لیکن کاپی میں جو درستی انہوں نے کی تھی، اس پر عمل نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے وہ اس سے شاک تھے ناظم کے اس پہلے شعر میں ایک پڑھا جائے تو عیش کا مین، الف کی طرح موصول ہوگا، اور یہ بات غالب کے نظریے کے خلاف ہے۔ دوسرے شعر میں اک ہی ہے، جو یار کسرہ سے لکھا گیا ہے۔

غالب کے زیرِ مطالعہ شعر:

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

عرشی نے علامتِ کسرہ کو یارِ مجہول پڑھا ہے۔ جب بعد کے مطبوعہ دیوان میں صاف اک ہے۔ تو انہیں سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ایک قرأت، غالب کے منشا کے مطابق نہیں ہے۔ انہوں نے تیسرے ایڈیشن میں یار کسرہ کو یارِ مجہول پڑھا اس لیے بعد کے ایڈیشن میں اک کو اختلافِ نسخ سمجھا۔ یہ واضح غلطی ہے۔ کم از کم یادگار کی قرأت کا تو احترام کرنا ہی چاہیے تھا۔ لیکن انہوں نے اسے لائقِ توجہ اور قابلِ اعتناء نہ جانا۔

ایسے ناقص نسخے کی شہادت پر حاتی کی قرأت کو درست یا نادرست قرار دینے کا خیال بھی جڑت  
 بے جا ہے۔ تیسرے مطبوعہ ایڈیشن میں نہ صرف اس شعر میں ایک ہے۔ بلکہ دوا و شعروں میں بھی ایک ہے  
 ”ہے ایک شکن ... الخ“ میں اک نہیں، ایک پر طبعی تو مصرعہ ساقط الوزن ہو جائے گا۔  
 دیوان غالب تیسرے مطبوعہ ایڈیشن: مطبع احمدی، دہلی: ۱۸۶۱ء کے ص ۳۰ کا عکس۔  
 تین شعروں میں ایک ہے۔ اک بھی یاد کسرہ سے ایک ہی لکھا ہے۔

<p>حاصل کی آئی آتی خط ایک رکبہ کہن          مجھ تک اور نئی نرم میں آتا ہوا دو جام          جو شکر و فاقہ ہو قریب سوچ کیا چلی          میں مضطرب ہو صلیب جو قریب سے          میں اور خط و وصل خدا ساز بات ہی          ہی توری جڑ ہی جوئی اندر نقاب کے          لاکھوں نگاہ ایک چرانا نگاہ کا          وہ نالہ و ملین سس کی برابر جگہ نیابی          وہ سحر و عاقلے میں نہ کام آئی          غالب چوٹی شراب پر اب بھی کہی کہی</p>	<p>میں جاتا ہوں جو وہ کیسے جو امین          ساقی فی کچھ لاندیا ہو شراب میں          کیوں پر کمان ہوں دھوکے شہر کے باب          تو الا ہی نکو و ہم فی کس بیج تاب میں          جان پذیر و نی بول کیا مضطرب میں          ہی ایک شکن بڑی ہوئی طرف نقاب میں          لاکھوں بنا و ایک بڑا نقاب میں          جس نالہ سی شکاف پڑی آفتاب میں          جس سحر سی سفیدہ روان ہو شراب میں          جتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں</p>
--	---

نسخہ شیرانی کے ورق ۱۰۹ الف کا عکس۔ یاد مہول کی جگہ بھی یاد معروف لکھی گئی ہے  
 ان دونوں کا خلط روا تھا، اور اعراب بالحدوف لکھے جاتے تھے۔

<p>داد دیوانی ان کہ ترا جگر          کسی ہی ہو سکتی ہی حاجی مروج خدا          یا علی صلیب معاصی جہد اللہ          شوقی عرض مطالب میں کی طلب          دی دعا کو میری و تر جہ قبول</p>	<p>از دوسری باز ہی ہو سکتی پر امین          کسی ہی ہو سکتی ہی حاجی مروج خدا          کہ سو اتیری کوئی اسکا خیر و نیشن          ہی تیری جو صانع منزل از کبک          کہ اجابت کبی ہر حرف سو بار</p>
--	--

غم شیریں ہو سہ نہ بیاگم لیر	کہ ہر من و خن جگر میری اکمین
طبع کو الفت دلین سرکرمی	کہ جانتا ہے اوسے نہ مجھ جی
دل الفت نہ سہ تو خینا	کہ یہ جہرت و نفس کن
صرف مدثر شود و دود و درج	
وقت جاب کل روز و تیر	

۱۹: چھوڑا نہ شک نے کہ ترے گھر کا نام لوں

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کہہ کر کو میں

یادگار میں حالی نے شعر کی یہی قرأت دی ہے۔ اختلاف نسخ کے باب میں ص ۴۴۴ پر عرشی کے نسخے میں اندراج ہے کہ ”دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن سے پانچویں ایڈیشن تک اک تھا۔ لیکن تیسرے ایڈیشن کے غلط نامے میں غالب نے یک بنایا۔ لیکن بعد کے دونوں ایڈیشنوں میں اس کی تعمیل نہیں ہوئی۔“

عرشی نے جو اظہار کیا ہے، وہ نادرست نہیں ہوگا۔ ناظم کے نام ایک خط میں بھی، جس کی متعلقہ عبارت پہلے نقل کی گئی ہے۔ غالب نے مشورہ دیا ہے کہ ہر اک نہیں، ہر یک لکھنا چاہیے۔ لیکن خود انھوں نے اس پر کتنا عمل کیا، یہ اس بات سے واضح ہے کہ کانپور سے دیوان چھپے آیا، تو انھوں نے ایک دوست کو بھی نہیں لکھا کہ ہر اک کو ہر یک پڑھیں۔ تیسرے ایڈیشن کے غلط نامے میں جو ہدایت ہے اس پر عمل ہوتا تو جو تھے ایڈیشن میں ہوتا، جو مطبع نظامی کانپور میں چھپا تھا۔ پانچواں ایڈیشن، جو شیونرائن نے اگرہ سے چھپا تھا۔ اس کی بنیاد وہ قلمی دیوان تھا جو مرزا رامپور سے نقل کر کے لائے تھے۔ اور میرٹھ میں چھپنے کے لیے شیفتہ کو دیا تھا۔ شیفتہ کو یہ نسخہ دینے سے پہلے یقیناً مرزا نے اس کی تصحیح کی تھی۔ ایک مصرع کی تبدیلی پر اسی مضمون میں گفتگو ہے۔ یہ شیفتہ کو نسخہ دیتے وقت اور ان سے منگوا کر شیونرائن کو بھیجتے وقت مرزا نے ہر اک کو ہر یک کیا۔ تیسرے ایڈیشن کی تصحیح بہت جلدی میں ہوئی تھی۔ لیکن اگرہ سے چھپنے والے دیوان پر بہت توجہ سے نظر ثانی کی گئی تھی۔ اس لیے ہر اک ہی کو درست قرأت سمجھنا چاہیے۔

شعر کے متن کے بارے میں عرشی کے نسخے کو کامل ترین نسخہ سمجھنا، خوش عقیدگی نہیں، ایمان کا تقاضہ کرتا ہے۔  
 شعر کے الفاظ کیا، نثر کی عبارتوں کے الفاظ بھی نادرست ہیں۔ تیسرے راجہ جان والے، ایڈیشن میں تصحیح کرنے  
 کے بعد جب کانپور سے چوتھا ایڈیشن چھپنے والا تھا، تو مرزا نے محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی کو ایک خط لکھا تھا  
 غلام سول تھر کی کتاب سے جو عبارت اس خط کی نسخہ عرشی کے دیباچے میں ص ۱۰۵ پر نقل ہوئی ہے، وہ بھی نادرست  
 ہے۔ اور آزاد کتاب گھر والے ملک رام کے نسخے کے مقدمے میں ص ۲۶ پر جو عبارت ہے، وہ بھی نادرست ہے،  
 یہ خط دیوان ۱۸۶۱ء کے آخری صفحے کے حاشیے پر مرزا نے لکھا تھا۔ اس کا عکس اس حقیر کو مروجہ دست، مجہدی  
 عبد القادر سروری نے حیدرآباد سے لا کر دیا تھا۔ تحقیقی جائزہ میں اس کا عکس شامل کر دیا گیا ہے، اور اس حقیر نے  
 اپنے قلم سے یہ وضاحتیں کر دی ہیں

۱۔ خط کے مخاطب میں "خاب محمد حسین خان"

۲۔ نسخہ ملک رام کے مقدمے میں "مولوی" الحاقی لفظ ہے۔

۳۔ نسخہ عرشی کے دیباچے میں دو جگہ اسی کے بجائے آں ہے۔

۴۔ نسخہ عرشی میں "بیکار محض" کی جگہ صرف بیکار ہے

۵۔ نسخہ کو نسخے لکھا گیا ہے۔

۶۔ "چھاپی جائے گی" کی جگہ چھپے گی لکھا ہے

جو حضرات نثر کی چار سطر کی عبارت کا متن درست نقل کر سکیں، اور ماخذ سے رجوع کرنا ضروری سمجھیں، ان کے  
 نسخے اگر اشعار کے نادرست متن رکھتے ہیں۔ تو کوئی ایسی حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن یہ بات حیرانی کی ضرور  
 ہے کہ تحقیق کے آداب کی باقاعدہ تربیت پایا ہوا کوئی اسکالر، چھان بین کئے بغیر ان نسخوں کو غالب  
 کامل یا صحیح غالب سمجھ لے، اور ان کو کوئی بنا کر حالی کو پرکھے۔

یہاں اطلاقاً عرض کر دیا جائے کہ نسخہ عرشی کے دوسرے ایڈیشن میں اس حقیر کی کتاب "بیاض غالب" تحقیقی  
 جائزہ سے ملا کر دیباچے کی عبارت درست کر دی گئی ہے۔ اور یہ اہم کام خود عرشی نے کیا تھا۔ یہ دوسری بات  
 ہے کہ مہوف نے تدوین کے آداب سے روگردانی کی، اور اس تصحیح کے لیے اس حقیر کے کام کا حوالہ نہیں  
 دیا۔ استفادہ کرنا اور حوالہ دینا، ایک عالم کے شایان شان نہیں، اور ضمیمہ اقلبی کا ثبوت ہے۔  
 یہ تو بات درمیان میں آگئی، لیکن گزارش کرنا ضروری تھی، کیوں کہ موضوع حاضر سے اس کا گہرا تعلق ہے۔



عرش کو لے کا مقصد یہ ہے کہ مصنف موصوف نے خوش عقیدگی کے ساتھ جس طرح متداول کلام غالب کے ان دونوں پر تکیہ کیا ہے، وہ ایک محقق کا شیوہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان دونوں میں آج کے اسلوب میں بہت سے اشعار کا متن غالب کا متن نہیں، مرتبین کا متن ہے۔ اس لیے محرف ہے۔ غزل کل کے لیے کر آج رخت... الخ جس طرح دیوان غالب کے تیسرے اور چوتھے ایڈیشنوں میں چھپی ہے۔ ان کے عکس جو پہلے نظر سے گزر رہے ہوں گے ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں۔ یہ غزل کا آٹھواں شعر ہے تیسرے ایڈیشن میں شعر کا متن یہ ہے:

شرم ایک ادا ہے نانہ لپٹے ہی سے بھی

ہیں کتنے بے حجاب، کہ میں یوں حجاب میں

ایک بعد ادا ہے... کا الف موصول ہے، اس لیے ایک کے ساتھ بھی شعروں ہے:

شرمے ک (مفعول) دل سے ملاز فاعلات) ہ اپنے ہ (مفاعیل) سے یہی (فاعل)

لیکن جب مطبع احمدی میں دیوان چھپ جانے کے بعد مرزا نے اپنے قلم سے اک کر دیا، اور چوتھے ایڈیشن میں اک چھپا جس میں یا علامت کسرہ کے طور پر نہیں لکھی گئی، تو یہ طے ہو گیا کہ تیسرے ایڈیشن تک بھی لفظ ایک نہیں تھا۔ بلکہ علامت کسرہ حرف دیا، سے لکھے جانے کی وجہ سے ایک املا تھا۔ یہاں یا مکتوبی تھی، یا ملفوظی نہیں، اک ہی شیوہ زاین (اگرہ والے)، پانچویں ایڈیشن میں بھی ہے۔

عرشی نے اپنے نسخے میں پہلے ایڈیشن، ص ۱۸۹ اک کے بجائے ایک لکھا ہے۔ یہ غالب کے شعر کا درست متن نہیں، محرف متن ہے!

۲. چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

پہیانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

مصنف موصوف نے نسخہ عرشی میں پہلا مصرع ص ۱۹۰ پر یہی جو نادکھایا ہے۔ یہ واضح طور سے کتابت کی غلطی ہے اگر مصنف موصوف کو عرشی کی اس بھیانک غلطی سے چشم پوشی کرنا مقصود ہوتی۔ تو وہ اس مصرع (اوئی، کو نظر انداز ہی کر دیتے۔ عرشی نے اپنے نسخے میں پہلا مصرع یہ لکھا ہے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ

عرشی نے ایک بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ اختلاف نسخ کے باب میں ص ۴۴۴ پر اظہار کیا ہے کہ مطبع نظامی کا پور واے ایڈیشن میں یعنی چوتھے ایڈیشن میں ہر اک "لکھا ہے۔ اس بات کی اطلاع انہیں تھی اس

کے باوجود انھوں نے تیسرے ایڈیشن اور اس کے قبل کے نسخوں میں جب اعراب بالحدوف کی وجہ سے اک کو ایک لکھتے تھے، کیوں کر یا علامت کسرہ تھی۔ اس شعر میں لفظ اک ہی ہے ایک میں یا کسرہ مکتوبی ہے، ملفوظی نہیں ایک سے مصرع ساقط الون ہو جاتا ہے، اس کے باوجود دوشی نے اختلاف نسخ سمجھ کر ایک کو بہتر لفظ تن کے لیے سمجھا۔ تیسرے اور چوتھے ایڈیشنوں میں اس غزل کے عکس ملاحظہ فرمائیں۔

مطبع احمدی دہلی سے طبع ہونے والے دیوان غالب کے تیسرے ایڈیشن سے عکس

جیران ہون لکھو دوں کہ پیون جگر کو مین چوڑا نہ رشک نے کہ تری گہر کا نام لون	مقدور ہو تو نہ تہہ پہون جگر کو مین ہر اک سے پوچھا ہون کہ جاؤں گے کھر مین
جانا ہزار قریب کے در پر ہزار بار ہی کیا جو سکے باندھی سیری بلا قدر لو وہ بھی کہنی مین کہ یہ بی تنگ نام ہے چلتا ہون تھوڑی دور ہر اک تیرہ کی ساتھ خواہش کو اجتنون فی پستش و یا قرار پر پنجو دین بول گیا راہ کو سی بار انہی پر کر رہا ہون قیاس اہل و ہر کا تعالیٰ خدا کر ہی کہ سوار مست نہ مار	ای کا ش جانتا نہ تری رگدڑ کو مین کیا جانتا نہیں ہون نہاری کمر کو مین یہ جانتا اگر تو لٹا تا نہ کمر کو مین پہچانتا نہیں ہون یہی راہ بزرگ کو مین کیا پوچھا ہون اوس بت بیدار کو مین جانا و گرنہ ایک دن انہی خبر کو مین سمجھا ہون و پھر بر نہار ہنر کو مین دیکھون علی مبارک عالی کمر کو مین

مطبع نظامی کا پورے چھپنے والے دیوان غالب کے چوتھے ایڈیشن سے عکس

جیران ہون لکھو دوں کہ پیون جگر کو مین چوڑا نہ رشک نے کہ تری گہر کا نام لون	مقدور ہو تو نہ تہہ پہون جگر کو مین ہر اک سے پوچھا ہوں کہ جاؤں گے کھر مین
جانا ہزار قریب کی در پر ہزار بار ہی کیا جو سکے باندھی سیری بلا قدر لو وہ بھی کہنی مین کہ یہ بی تنگ نام ہے چلتا ہون تھوڑی دور ہر اک تیرہ کی ساتھ خواہش کو اجتنون فی پستش و یا قرار	ایکا ش جانتا نہ تری رگدڑ کو مین کیا جانتا نہیں ہون نہاری کمر کو مین یہ جانتا اگر تو لٹا تا نہ کمر کو مین پہچانتا نہیں ہون یہی راہ بزرگ کو مین کیا پوچھا ہون اوس بت بیدار کو مین

اپنی پھر کر رہوں قیاس بل دہر کا	جاتا وگرنہ ایک ن اپنی خبر کو میں
عالم خدا کری کہ سوار ہست ناز	سجھا ہوں و پسند یر شاع ہنر کو میں

دیکھو ن غسلی بجا د عالی گھر کو میں

متن کی تدوین واقعی جو کھوسا کا کام ہے۔ اس کے اسلوب کے عہد بہ عہد ارتقا کی پوری واقفیت پہلی شرط ہے اسی کے ساتھ نسخوں کو ترتیب زمانی سے رکھ کر دیکھنا ضروری ہے۔ اعراب با حروف کا دستور رہا ہو اور کلام موزوں کی تدوین ہو تو آہنگ کا لحاظ رکھنا بھی لازمی ہے۔ اگرچہ تھے اور پانچویں ایڈیشن فراہم نہ بھی ہوئے تو یہ مقام ایسا ہے کہ یہاں ایک ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ غالب نے ساقط الوزن شعر نہیں کہے ہیں اور بحر میں صرف اک رکھا جاسکتا ہے۔ ایک نہیں۔ عرشی سے دافوسکناک غلطیاں اس شعر کے سلسلہ میں ہوئی ہیں۔ انھوں نے ایک متن میں رکھ کر، ناموزوں مصرع پسند کیا۔ ۲۔ جب مطبع نظامی داسے ایڈیشن میں واضح طور سے اک قرأت ہے، تو انھیں اس سے پہلے کی تحریر میں ایک کی یا کو مصوٰۃ نہیں، علامت کسرہ ہی پڑھنا چاہیے تھا۔

فاضل مصنف مصوف نے اعراب با حروف کو حرف صحیح پڑھا، اور وہاں اختلاف نسخ انھوں نے دریافت کیا، جہاں اختلاف نسخ تھا ہی نہیں۔ چوتھے ایڈیشن سے قبل کے نسخوں میں بھی اک ہی ہے۔ اگرچہ مکتوبی شکل ایک کی ہے!

غالب کی اسی غزل کے مطلع کا مصرع ثنائی پڑھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔

۲۱ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے  
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نسخہ عرشی میں پہلا مصرع ہے:

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

یادگار میں "وہ آئیں گھر میں"۔ الخ ہے۔ یہی مصرع نسخہ حمید میں بھی ص ۱۳۶ پر ہے۔ آزاد کتاب گھر والے ایڈیشن میں مالک رام نے بھی متن میں آئے، ایک زاید شوئے، اور اس پر ہمزہ کے ساتھ دکھایا ہے۔ لیکن فٹ نوٹ میں حمید میں آئیں، ایک زاید شوئے اور ہمزہ کے ساتھ، اختلاف نسخ دکھایا ہے۔ عرشی نے

اختلاف نسخ میں یادگار اور حمید یہ میں آیں، ہونے کا اظہار نہیں کیا ہے، اور اس اعتبار سے یہ نسخہ ناقص ہے۔  
البتہ انہوں نے ص ۴۴۳ پر ایک ماخذ میں مصرع کی یہ قرأت دکھائی ہے:

وہ گھر میں آئے ہمارے، خدا کی قدرت ہے

۲۲۔ نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں

جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

یادگار میں شعر کی یہ قرأت ہے۔ لیکن نسخہ عرشی میں دوسرا مصرع ہے:

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

نادر ات غالب مرتبہ آفاق حسین: ادارہ نادر ات، کراچی: ۱۹۴۹ء، میں منغی نبی بخش حقیر کے نام غالب

کے خط ہیں۔ ایک خط میں ۱۶ شعروں کی یہ غزل بھی غالب نے بھیجی تھی، اس تعلق کے ساتھ:

”بجائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے، تو میر و میرزا کیا کہتے تھے اگر وہ ریختہ

تھا، تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شہزادگان تیموریہ میں سے، لکھنؤ سے

یہ زمین لائے حضور نے خود بھی غزل کہی، اور مجھے بھی حکم دیا۔ سو میں حکم بجالایا، اور یہ غزل لکھی۔“

زیر بحث شعر کی قرأت یہ ہے:

نیند اس کی ہے، نصیب اس کے ہیں راتیں اس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

اس خط کے لکھنے کا زمانہ اگست، ستمبر ۱۸۵۲ء مقرر کیا گیا ہے۔

نسخہ عرشی میں یہ غزل، نسخہ لاہور کے حوالے سے ص ۱۹۱، ۱۹۲ پر نقل ہوئی ہے۔ زیر بحث شعر کے بارے میں، اختلاف نسخ کے باب میں، نادر ات میں مختلف خواندگی ہونے کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن یادگار کی خواندگی کا ذکر نہیں ہے۔ اس اعتبار سے نسخہ عرشی ناقص ہے۔

اس غزل کے بعد کی کوئی غزل اس نسخے میں نہیں ہے، اور اس کا ۱۸۵۲ء میں لکھا جانا ثابت ہے

نبی بخش حقیر کے خط کے علاوہ یہ غزل ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء کے اردو اخبار روتی، میں بھی ملتی ہے (دیباچہ نسخہ عرشی

ص ۸۵) نصیب اس کے ہیں ”کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں، اس لیے اسے پہلی قرأت سمجھنا شاید نادر است۔“

ہو گا۔ نسخہ لاہور میں مصرع مطبوعہ متداول دیوان والا ہی ہو گا، ورنہ نسخہ عرشی میں ”نادر ات“ حقیر کے نام



مرزا کے خط کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ نسخہ قاضی عبدالودود نے بھی دیکھا تھا۔ اور اس کے بارے میں "متفرقات" کے عنوان سے، نقوش لاہور، کے اکتوبر ۱۹۵۸ء کے شمارے میں لکھا تھا۔

نسخہ لاہور لاہور یونیورسٹی کی لائبریری میں تھا۔ لیکن نسخہ بھوپال کی طرح اٹھایا جا چکا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر سید عبدالشکر نے بھی ایک تعارفی مضمون ۱۹۵۴ء میں لکھا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں جب سید معین الرحمن نے اسے دیکھنا چاہا، تو یہ مخطوطہ کتب خانے میں نہیں تھا۔ انھیں بتایا گیا کہ سید عبدالشکر کی تحویل میں ہے۔

نسخہ لاہور کے فوراً آگے پیچھے کا ایک اور مخطوطہ ہے، جو سید معین الرحمن کے پاس ہے۔ اس کا تعارف انھوں نے "نسخہ خواجہ کی حیثیت سے کرایا ہے۔" سوا شعروں کی یہ غزل اس میں بھی ہے۔ لیکن تفصیل سامنے نہیں آئی ہے۔ اگر حقیر کے خط میں درج غزل کا زیر بحث مصرع، اس نسخے میں ہے، تو یہ واضح ثبوت اس کے نسخہ لاہور پر تقدم کا ہوگا۔ نسخہ خواجہ، نسخہ لاہور سے فوراً پہلے کا ہے۔ تو اس میں اگر مصرع وہ نہیں ہے، جو حقیر کے خط میں ہے، تو اس مصرع کے ہونے کا امکان بھی ہے۔ جو یادگار میں ہے۔ اگر ایسا نہ ہو، تو بھی حاکمی کے تحریف کرنے کا تصور بلا وجہ کی قیاس آرائی ہوگی، کیوں کہ حاکمی سنجیدہ اور ثقہ شاعر، مبصر، ناقد اور سوانح نگار تھے۔

۲۳ ہوں مخوف نہ کیوں رہ درہم صواب سے  
میڑھا لگا ہے قلم سر نوشت کو

متداول دیوان میں مصرع ہے :

ہوں مخوف نہ کیوں رہ درہم صواب سے

نسخہ سرشی میں کسی اختلاف نسخ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ یادگار کی بھی نہیں! — اور یہ واضح نقص ہے۔ حاکمی نے جو مصرع نقل کیا ہے معنی کے اعتبار سے وہ یقیناً بہتر ہے۔ یادگار لکھتے وقت حاکمی کے سامنے جو ماخذ تھا، تھے، یقیناً وہاں صواب ہی رہا ہوگا۔ یہ بات بعید از امکان نہیں کہ مرزا نے

۱۔ غالب انسٹیٹیوٹ، دہلی کا مجلہ غالب نامہ جلد ۹ شماره ۲، غالب کے اہل لاتی دیوان کا نام دلی نسخہ از ڈاکٹر سید معین الرحمن۔  
۲۔ ایضاً۔ ۳۔ ایضاً۔

خود صواب لکھا ہو، یا اگر کسی اور نے یہ غزل لکھی، تو مرزا نے تو اب بولا، اور لکھنے والے نے صواب لکھا، موضوع حاضر سے جڑا ہوا موضوع یہ ہے کہ حاتی کے سامنے غالب کے کلام کا جو ذخیرہ تھا، کیا وہ مستند تھا، کیا حاتی مستند اور غیر مستند — معتبر اور غیر معتبر متن ہیں، اور وہ بھی اپنے استاد کے کلام میں تمیز نہیں کر سکتے تھے؛

۲۴۔ سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست

لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

مالک رام اور عرشی کے نسخوں میں تری جلوہ گاہ نہیں، ترا جلوہ گاہ ہے۔ آزاد کتاب گھر والے دیوان میں، ملک رام نے ماخذ کی نشاندہی کیے بغیر فٹ نوٹ میں اختلاف نسخ تری دکھایا ہے۔ عرشی نے کوئی اختلاف نسخ نہیں دکھایا ہے، اور اس اعتبار سے ان کا نسخ ناقص ہے۔ نسخہ حمید کے متن میں بھی تری ہے۔ عبدالرحمن بخوری نے اپنے مقدمہ محاسن کلام غالب، میں "تری جلوہ گاہ" رکھا ہے: بخوری چون کہ متداول کلام مرتب کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے کلام غالب کے نسخے اور ماخذ جمع کیے تھے۔ غالب راہ گزر کو مذکر باندھ سکتے تھے، تو جلوہ گاہ کو بھی مذکر نظم کر سکتے تھے۔ ترا کا درست ہونا شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن تری کا فرمودہ غالب ہونا بھی، خاص طور سے آخری دور میں، جب دیوان مرتب ہو رہے تھے، اور چھپ رہے تھے، اور وہ خطوں میں بھی اجاب کو کلام بھیج رہے تھے، نا درست نہیں ہو سکتا۔ تری صرف یادگار میں نہیں ہے۔ اس لیے حاتی کی تحریف تو ہو ہی نہیں سکتی!

۲۵۔ زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

آج کے مرقعہ نسخوں میں پہلا مصرع ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

عرشی نے اپنے نسخے میں ص ۴۰ پر انہار کیا ہے کہ گب<sup>۱</sup> میں، پہلے مصرع میں "اس رنگ سے" ہے یعنی مصرع وہی ہے جو یادگار میں حاتی نے لکھا ہے۔ گویا یہ بھی حاتی کی تحریف نہیں ہے، واضح طور سے!

متداول دیوان میں صرف یہ مقطع اس طرح میں ہے۔ اس کلام میں، جو دیوان کے لیے انتخاب کے وقت نظری کر دیا گیا تھا، اس طرح میں کوئی شعر نہیں ہے۔ گویا یہ متفرق شعر ہے۔ بہت ممکن ہے یہ شعر بر جستہ ہو گیا ہو۔

۱۔ شاید گلشن سے خار انواب مصطفیٰ غاٹا شیفہ کا لکھا ہوا تذکرہ، ترجمہ کے لیے کلام کا انتخاب خود مرزا نے کیا تھا۔

اور خط میں لکھنے کے لیے تو یہ مخزوں نہیں کیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ جب یہ وجود میں آیا مرزا خط فارسی میں لکھتے تھے۔ ہاں بات چیت میں استعمال کے لیے یہ یقیناً استعمال ہوتا رہا ہوگا۔ اور جب مرزا نے اردو میں خط لکھنا شروع کیا تو ان میں بھی یہ موقع محل پر کام آیا ہوگا۔ اس شعر میں ضرب المثل بوجہ ان کی تمام خصوصیات موجود ہیں چنانچہ اسے یہ درجہ مل بھی گیا۔ البتہ کسی باقاعدہ نزل کا شعر نہ ہونے کی وجہ سے اس کی قرائتیں بدلتی رہیں۔ اسی شکل اور اسی رنگ، تو مرزا کی خواندگی کا حصہ تھے، اور اس کا دستاویزی ثبوت بھی ہے۔ لیکن طہر سے اسی ڈھب سے جو اسی طرح جو بھی سننے میں آیا، اور ان فقروں کے ساتھ شعر لکھا ہوا بھی مختلف قریروں میں دیکھا گیا۔ صاحب عالم مارہروی کے روزنامے میں ”اسی طرح جو“ ہے۔ عرشی نے ص ۴۴ پر اس روزنامے کی قرات کا اظہار کیا ہے۔

۲۶۔ فرداودی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا

تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

یادگار میں شعر کی یہ صورت ہے۔ لیکن مرقہ دیوان میں، جن میں حمید یہ بھی شامل ہے، شعریوں ہے:

فرداودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا

کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی (گزر گئی)

مالک رام کے نحو میں ذرا اور باقی نسخوں میں زعمانیوں میں ہے۔ عرشی نے اپنے نسخے میں یادگار کی خواندگی اختلاف نسخ میں نہیں دکھائی ہے۔ اور یہ نقص ہے۔ مصنف موصوف کی نظر بھی مصرعِ اولیٰ میں اک اور ایک کے اختلاف پر نہیں گئی۔ حالی کے ماخذ میں شعر اسی طرح ہوگا، جیسا انھوں نے یادگار میں نقل کیا۔ ظاہر ہے ایک مرتب کتاب غالب پر لکھنے کے لیے مثالیں انھوں نے ماخذ / ماخذوں سے چنی ہوں گی۔ زبانی سنے ہوئے اشعار اپنی یادداشت سے یقیناً انھوں نے نہیں لکھے۔ مٹھوں کا ذکر انھوں نے کیا ہے، اور دوستوں سے مرزا کی تصانیف اور کلام جمع کرنے کا بھی، حالی نے شعر جس طرح لکھا ہے، وہ اس کی پہلی خواندگی بھی ہو سکتی ہے۔ اور پانچویں ایڈیشن کے چھپنے کے بعد کی بھی۔

۲۷۔ اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل

میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

یادگار میں پہلا مصرع ہے:

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل

غالب نے اپنے خطوط میں 'الفاظ کی نشست میں ایسی تبدیلیاں کی ہیں۔ حالی کے پیش نظر ماخذ میں مصرع کا اسی طرح ہونا ناممکنات میں سے نہیں، بلکہ عین ممکن ہے۔ خواجہ ایسی تحریف وہ کیوں کرتے، جس سے شعر فنی اور معنوی حیثیت سے شمر برابر بلند نہیں ہوتا۔ اپنے استاد کے کلام پر اصلاحیں کرنا جیسی محمد حسین آزاد نے اپنے استاد کے کلام میں کی تھیں، حالی کی افتاد طبع سے بعید ہے۔ آزاد نے اپنے استاد کے کلام کے حجم میں بھی اضافہ کیا۔ حالی نے ایک مصرع بھی گڑھ کر اپنے استاد کو نہیں "بخشا" جو مرثیہ میں یہ اعتراض کرے :

شعر میں ناتمام ہے حالی غزل اس کی بنائے گلاب کوں؟

۵۵۔ اپنے استاد کی غزلیں بناتا؟

۲۸۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مداول دیوان میں مقطع کی قرأت یہ ہے۔ مصنف موصوف نے ناظر کیا ہے کہ یادگار کے پہلے ایڈیشن (سال اشاعت ۱۹۱۷ء کے ص ۱۵۹) میں مصرع ثانی ہے :

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مصنف موصوف نے ص ۳ پر لکھا ہے : "یادگار غالب پہلی بار ۱۹۱۷ء میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی

اور مقدمہ شعرو شاعری" ۱۸۹۳ء میں مطبع انصاری، دہلی سے میں نے انہیں اولیں ایڈیشنوں کو بنایا ہے۔"

مصنف موصوف کا بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ "یادگار غالب" پہلی بار محمد رحمت اللہ رحمد کے نامی

پریس کانپور میں ۱۸۹۷ء میں چھپی تھی، ذکر ۱۹۱۷ء میں مصنف موصوف نے اپنا ماخذ یادگار کا پہلا ایڈیشن بتا دیا ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ یہ بیان درست نہیں ہے۔

"مقدمہ شعرو شاعری" کے بارے میں بھی مصنف موصوف کا بیان حقیقت نہیں ہے۔ ۱۸۹۳ء میں مطبع

انصاری، دہلی سے حالی کا دیوان پہلی بار چھپا تھا، اور مقدمہ اسی میں شامل ہے۔ مقدمہ بعد میں الگ سے کتاب کی

۱۷۔ لکھنؤ میں گھر نہیں گڑھ بولتے ہیں

۱۸۔ یہ ایڈیشن احمد مسدس مدوجز اسلام، دونوں کتابیں زمانہ طالب علمی کے اوایل میں پڑھی تھیں۔ اب تفصیل یاد

نہیں۔ یہ حوالہ "یادگار غالب" مکتبہ جامعہ، ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۰ سے نقل کیا جا رہا ہے۔



صورت سے چھاپا گیا (جس طرح نسخہ حمید یہ میں شامل بخوری کا مقدمہ کتابچے کی صورت میں چھاپا گیا، اور نام اس کا "محاسن کلام غالب" رکھا گیا،

ہم شعر کے مصرع ثانی پر واپس آتے ہیں۔ یادگار غالب (حصہ اردو) میں جو مکتبہ جامعہ نے ستمبر ۱۹۶۸ء میں شائع کی، اس کے اندرونی ٹائٹل پر تصحیح مالک رام لکھا ہے اس میں ص ۸۰ پر دوسرا مصرع وہی ہے جو آج کے متداول کلام کے نسخوں میں ہے :

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یادگار کے پہلے عکسی ایڈیشن میں جو غالب انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۸۶ء میں چھاپا ہے، ص ۱۵۹ پر مصرع ہے :

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مصنف موصوف نے بھی اس مصرع کے لیے ص ۱۵۹ کا حوالہ دیا ہے۔ شاید ان کے پیش نظر یہی ایڈیشن رہا ہو قطع نظر اس کے مالک رام نے یادگار کے متن میں جو تصحیح کی ہے۔ اس کی وجہ سے مکتبہ جامعہ کا یہ ایڈیشن مشتبہ، غیر معتبر اور تحریف کا شکار ہو گیا ہے۔ تدوین متن کے سلسلے میں، یہ تصحیح نہیں، بلکہ کھلی ہوئی تحریف ہے۔ متن میں مصرع اسی طرح رہنا چاہیے تھا جیسا کہ حاتی نے درج کیا تھا۔ حاشیہ میں متداول کلام کا متن دکھایا جاسکتا تھا یہ خاصی پیچیدہ اور محال قسم کی صورت حال ہے۔ ایک طرف آج کے متداول کلام کے کچھ نسخوں میں یادگار سے قرأت حاشیوں میں نقل کی جاتی ہے۔ اور مالک رام نے یادگار کے متن میں مصرع بدل دیا اگر اسی قسم کی تصحیح خطوط غالب میں بھی کر دی جائے تو کیا ہوگا؟ کیا خطوط غالب اس تحریف کے بعد معتبر رہیں گے؟

حاتی نے "دل کے بہلانے" یقیناً ماخذ سے نقل کیا ہوگا، اور ان کا ماخذ معتبر تھا۔ اس کے بارے میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بارے میں بھی شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ دیوان کے پانچویں ایڈیشن کی اشاعت کے بعد مرزا نے خود مصرع میں ترمیم کی ہوگی، یہ نہیں کہ حاتی اس بات سے ناواقف تھے کہ مطبوعہ دیوان میں مصرع "دل کے خوش رکھنے" ... الخ ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یادگار کے پہلے ایڈیشن کے ص ۱۵۸، پر سطر ۶ میں مقطع "دل کے خوش رکھنے" ... الخ "قرأت رکھتا ہے۔ صرف اس وجہ سے بھی دل کے بہلانے" ... الخ "والا مصرع جوں کا توں رکھنا چاہیے تھا۔ کسی محلو طے یا مطبوعہ نسخے کی تصحیح اس طرح کرنا شاید تدوین کے آداب کے عین مطابق نہیں۔ کلیات مرتب کر کے وقت، مصنف کی لغزش قلم، یا مہو کتابت درست کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ دیوان مرتب کرنے وقت آخری قرأت متن میں رکھنا، اور ماقبل کی قراءتیں حاشیوں میں دکھانا

چاہیے۔ غالب کے مقتدر مرتبین نے تدوین کے اس بنیادی اصول سے ایک جگہ نہیں کئی جگہ انحراف کیا ہے۔  
کچھ مثالیں اس مضمون میں پیش کی جا چکی ہیں۔ ایک مثال اور :

مرزا نے ۴ نومبر ۱۸۶۱ء کے خط میں عباس رفعت کو ایک مشہور غزل کا مشہور مطلع یوں لکھا :

سب کہاں کچھ لار دگل میں مسایاں ہو گئیں

صورتیں، کیا خاک میں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بعض نسخوں میں کہ بجائے جو ہے۔ لیکن دوسرا مصرع دیوان میں یہ ہے :

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

نسخہ عرشی میں غالب کے خط میں دوسرے مصرع کی ہیئت کو اختلاف نسخ کے باب میں درج کے لائق بھی  
نہیں سمجھا گیا۔ اس نسخے کے کامل یا ناقص ہونے کے بارے میں فیصلہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ  
اس مصرع کو اہم نہیں سمجھا گیا۔

۴ نومبر ۱۸۶۱ء وہ تاریخ ہے، کہ کئی جہتیں پہلے مطبع احمدی (دلی) سے دیوان کا تیسرا ایڈیشن چھپ چکا  
تھا۔ اور اسے دیکھ کر ان کا خون کھولا تھا کیوں کہ اس میں وہ اغلاط درست نہیں کی گئی تھیں، کاپی میں مرزا نے  
جن کی تصحیح کی تھی۔ اسی دیوان کے آخری صفحے پر محمد حسین خاں کے نام خط ہے۔ ایک نسخے میں غلطیاں درست  
کی گئیں۔ یہ سارا کام دو دن میں، اور دیوان کی اشاعت کے فوراً بعد ہی ہوا۔ ۴ نومبر ۱۸۶۱ء سے پہلے کیوں کہ  
مطبع نظامی کا پورے پانچواں ایڈیشن جون ۱۸۶۲ء میں چھپ کر تیار ہو گیا۔ دلی سے تصحیح کئے ہوئے دیوان کے  
کا پورے جانے اور وہاں لکھے جانے، اور اس کی تصحیح میں وقت تو لگا ہی ہوگا۔ پھر تیسرا ایڈیشن غلط چھپنے کی وجہ  
سے مرزا دل برداشتہ تھے، اس لیے صحبت متن پر زیادہ توجہ دی گئی ہوگی۔ اور ظاہر ہے اس میں وقت لگا ہوگا،  
پانچواں ایڈیشن اگر وہ سے چھپا تو ۱۸۶۳ء میں لیکن ملی نسخہ شیونز این کو جون ۱۸۶۰ء میں بھیجا جا چکا تھا غم

عباس رفعت کے نام خط میں مطلع کی جو قرارت ہے، وہ آخری ٹھہرتی ہے، اور تداول دیوان میں وہی  
دکھائی جانا چاہیے، متن میں۔ اور اگر متن میں نہیں، تو حواشی میں ضرور دکھائی جانا چاہیے۔

۱۷ غالب کے خطوط : غالب انٹی ٹیوٹ : ص ۳۲

۱۸ شیونز این کے نام خط (غالب کے خطوط) غالب انٹی ٹیوٹ ص ۱۰۸۳، ۱۰۸۴

اگر مرزا نے خود اپنے شعروں میں ایسی اصلاحیں کی ہیں، تو وہ مصرع بھی یقیناً مرزا ہی کا ہے جو حالی نے یادگار میں لکھا ہے۔ جو ماخذ حالی کو فراہم تھے، وہ ہمیں نہیں ہیں۔ یہ ہماری محرومی ہے، اور اس محرومی کی وجہ سے حالی پر شک کرنا مناسب نہیں ہے۔

۲۹ رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر ہو کیا ہے؟

متداول دیوان میں دوسرا مصرع ہے:

جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر ہو کیا ہے؟

عرشی نے یادگار کی قرأت کو اس لائق نہ سمجھا کہ اختلاف نسخ میں اسے دکھاتے۔ البتہ بیدر نے کو اہم تر سمجھا، اور بتایا کہ پہلے مصرع میں دوڑنے اور دوسرے مصرع میں پہلا لفظ گر ہے

اشارے میں اشخاص کے تحت حالی اور کتب کے تحت یادگار غالب کا اندراج ہے۔ لیکن بیدر نے کے بارے میں خاموشی ہے۔ غالب نے وہ غزل جس میں یہ شعر ہے ۱۱۴ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں شیونز این کو بھیجی تھی۔ شعر کی قرأت بعینہ وہی ہے، جیسا یادگار میں ہے۔ نسخہ حمید یہ میں بھی دوسرا مصرع یادگار کے مطابق ہے، لیکن پہلے مصرع میں دوڑنے ہے۔ حمید یہ کی قرأت بھی عرشی نے اختلاف نسخ میں نہیں دکھائی ہے۔ ان یک نسخے کا یہ نقص ہے۔

حالی کے یہاں مصرع چوں کہ دی ہے۔ جو مرزا نے اپنے قلم سے لکھ کر غزل میں شیونز این کو ۱۱۴ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں بھیجا، اس لیے حالی نے جو قرأت دی ہے، وہ مرخ ہے!

۳۰ پلا دے اوک سے ساقی جو بہم سے نفرت ہے

پیار گر نہیں دیتا، ندے شراب تو دے

یادگار میں پہلا مصرع ہے:

پلا دے اوک سے ساقی جو بہم سے نفرت ہے

معنی تو خیر اس مصرعے بھی کھینچ تان کر نکالے جاسکتے ہیں۔ بے معنی اور جعلی کلام کی لمبی آخر نہیں

نکسی گنتی ہیں۔ اور ہمارے ایک دوست نے تو اس میں اس حد تک یدِ طولیٰ حاصل کر لیا ہے کہ شعوری طور پر بے معنی شعرا الفاظِ تقویٰ تھاپ کر ان کی خدمت میں کلامِ غالب کہہ کر پیش کر دیجیے۔ وہ معنی ڈال دیں گے۔ یادگار میں سہو کتابت کا ہونا ناممکن نہیں۔ قیاسی اصلاح ہرگز مقصود نہیں۔ ہم کی جگہ میں یا تجھ اور تم کی جگہ، غالب کے شعروں میں، اختلاف نسخ کوئی نادر بات نہیں ہو سکتا ہے حالی نے اس زمانے کے اسلوبِ املا میں تجہ لکھا ہو، کہ تجہ قرأت کے ساتھ یہ شعرا انھیں ملا ہو۔ کاتب نے تجہ کو منہہ کر دیا۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے

وگر نہ خوفِ بد آموزی عدد و کیا ہے

شیونز این کو مرزا نے یہ غزل بھیجی، تو اس میں تم نہیں تجہ ہے۔ اور اس زمانے میں تجہ یا تجہ لکھا جاتا تھا۔ حالی اس شعر میں ہم کی جگہ منہہ نہیں رکھتے۔ انھیں تجہ یا تجہ قرأت کے ساتھ یہ شعر ملا ہوگا۔ مطبعِ مجتہبی دہلی، سے چھپنے والے خطوطِ غالب کے مجموعہ اردو سے معنی کی ترتیب اور طباعت کی نگرانی میں حالی کا ہاتھ بھی تھا۔ ۱۸۹۹ء کلکتہ نسخہ ۱۰، ۱۹۰۹ء میں دیکھا تھا۔ اب تفصیلِ ذہن میں نہیں۔ اس ماخذ سے نقل ہوئے خطوط اور اقتباسات مختلف مجموعوں اور تالیفوں میں ہیں۔ یہ بات یقیناً حالی کے علم میں رہی ہوگی کہ مرزا نے علاء الدین خان علانی کو لکھا تھا:۔

... پیچاس برس کی بات ہے کہ ابھی بخش خاں مرحوم نے زمین نکالی حسبِ الحکم غزل لکھی۔

بیت الغزل یہ:

پلا دے اوکدے ساتی، جو ہم سے نفرت ہے

پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے۔

یادگار کے دیباچہ میں حالی لکھتے ہیں:

”میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا، اور جس قدر اس میں اُن کے

حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا، ان کو قلمبند کیا، اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں



یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں، ان کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا۔۔۔ کئی برس تک دو یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔۔۔ میں نے ان مٹھوں کو کھولا، اور ان یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ان کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی، اور اس کے سوا کچھ اور کتا میں بھی درکار ہوں گی۔ میں نے دلی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا، اور انھوں نے مہربانی فرما کر، میری تمام مطلوبہ کتا میں اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم ہو سکے، لکھ کر میرے پاس بھیج دیئے۔“

حالی نے ایک محتاط ادیب کی طرح، معتبر ماخذوں سے میٹیریل جمع کیا۔ اور اس شعر کے بارے میں تو ان کی وابستگی دور ہری تھی، بلکہ سوا۔ ان کے ماخذ میں ہم کی جگہ تجر یا مجہ تھا۔ یہ بات کسی قدر یقین سے شولہ کے بغیر عرض کی جا رہی ہے، منہ ہوتا تو وہ چونکتے۔ علانی کے نام یہ خط ان ۵۶ خطوں میں سے ہے، جو اردو سے معلیٰ کے پہلے ایڈیشن میں شامل تھے۔ اس ایڈیشن کا دیباچہ حالی کے ہم وطن اور خواجہ تاشن، میر مہدی مجروح نے لکھا تھا۔ خطوں پر ایک نظر غالب نے بھی ڈالی۔ قراین اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگرچہ اردو سے معلیٰ کا پہلا ایڈیشن مرزا کی وفات کے دو روز کم تین ہفتے بعد شائع ہوا، لیکن اس بات کا امکان قوی ہے کہ کچھ فرسے چپے ہوئے ان کی نظر سے بھی گزرے ہوں، کیوں کہ عود ہندی، اور اردو سے معلیٰ، دونوں کی ترتیب میں ان کی سرگرم شرکت رہی تھی۔ خود حالی کی بھی سرگرم شرکت کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تیس برس بعد جب دو حصوں میں یہ کتاب پھر چھپی، تو حالی کا ہاتھ اس کام میں تھا۔ دوسرے حصے میں تو مہتمم مطبع بمبائی (دلی) نے اعلان کیا:

”۔۔۔ جب اردو سے معلیٰ مرزا غالب، ہندوستان کے سعدی، مولانا حالی کی اجازت سے مطبع میں چھپی، تو مولانا موصوف نے ایک قلمی مسودہ مرزا غالب کے رقعات کا اپنے پاس سے بھی عنایت فرمایا، جس کو احقر نے حصہ دوم اردو سے معلیٰ کے نام سے نامزد کر کے اس کے آخر میں شامل کر دیا۔“

حالی یقیناً اس شعر کی قرأت سے واقف تھے۔ ہم کی جگہ تجر یا مجہ ان کے ماخذ میں ہو سکتا تھا۔ منہ ہوتا، تو وہ

اس کی تصحیح کرتے، کہ غلط مصرع یادگار میں رکھتے۔ یہ چند ناقص خیالات ہیں، جو پیش کیے گئے۔ ادبے معنی کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن تک رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ وثوق سے بات تو اصل مآخذ کو دیکھنے کے بعد ہی کی جاسکتی ہے بلکہ

۳۱۔ ہاے، واں بھی شور محشر نے ندم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

یادگار (پہلے ایڈیشن ۱۸۹۷ء) میں مصرع ادنیٰ ہے :

ہاے، واں بھی شور محشر نے ندم لینے دیا

دوسرا لفظ وحّاں، ہائے ہوئے سے اس لیے لکھا گیا ہے کہ ہا، ہوئے اور دو چشمی کا خلط ہوتا تھا، آج کے اسلوب میں یہ واں لکھتے ہیں۔

مصنف موصوف نے دونوں جگہ شور محشر میں فکب اضافت سے کام لیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ہو کتابت ہو۔ یادگار غالب (مکتبہ جامعہ ایڈیشن) میں مالک رام سے متن کی تصحیح کرتے ہوئے، وہ ہو ہوا ہے۔ جو غالب کے دیوان کے مرتب کی حیثیت سے ایک طرح سے ان کی پہچان بن گیا ہے۔ پچاس چھ ص ۸۳ پر پہلا مصرع یوں لکھا ہے :

ہائے، وہاں بھی شور محشر نے ندم لینے دیا

وہاں سے مصرع آہنگ میں سلامت نہیں رہتا۔ آج کے اسلوب میں واں چاہیے، اور ہائے، ہمزہ کے بغیر :

ہاے، واں بھی، فاعلاتن، شور محشر (فاعلاتن)، نے ندم لے (فاعلاتن)، نے (دیار فاعلن)،

حالی کے سامنے جو مآخذ رہا ہوگا ۱۰ اس میں ہائے ہی رہا ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ تحریف کرتے۔

گر اے حاں کی تحریف تسلیم کر لیں، تو اردوے معنی تو سراسر مشتبہ قرار پائے گی، اور وہ خطوط حاں

کی تصنیف قرار پائیں گے جو انہوں نے ہتہتم مطبع کو فراہم کیے تھے۔

۵۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے لیے غالب کے خطوط مرتب کرتے وقت ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ نسخے یا ان کے

فوٹو اسٹیٹ دیکھے ہوں گے۔ اپنی یادداشتیں دیکھ کر وہ اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ رکال،

۳۲ وہ بیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جائے

نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہتے؟

متداول دیوان میں شعرا اس طرح ہے۔ لیکن یادگار میں پہلے مصرع کا آخری لفظ جاوے کے بجائے جائے ہے۔ اسے تحریف سمجھا گیا ہے!

نبی بخش حقیر کو مرزا نے ۱۲۲ اپریل ۱۸۵۳ء کو جو خط لکھا تھا، اس کے ساتھ اپنی تین غزلیں بھیجی تھیں۔

دولال قلعہ کے طرحی مشاعرے کی، ایک فارسی، اور ایک اردو، اور ایک اردو غزل کی زمین میں، جس میں ردیف کے ایک حصے کو قافیہ کیا۔ یہ شعر اسی غزل کا ہے، اور پہلا مصرع ہے۔

وہ بیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جائے

نادر آت غالب سے یہ خط ”غالب کے خطوط“ میں نقل ہوا ہے۔ غزل مذکورہ ص ۱۱۲ (جلد سوم) پر ہے۔

ایک بات جاوے، جائے اور جائے کے بارے میں، جاوے اور جائے، ہمزہ کے ساتھ ہم وزن ہیں۔ اور ان کی عروضی قیمت فعلن رہ سکون عین، ہے جائے، ہمزہ کے بغیر شروع یا درمیان مصرع میں فعل، رہ سکون دوم و تحریک آخر ہے۔ آخر مصرع میں جائے کا وزن فاع فعل، رہ سکون دوم و آخر ہے۔ غالب نے جہاں ایسے الفاظ رکھائے، آئے، آی وغیرہ، واد کے بغیر لکھے ہیں، ان کے کلام کے مرتبین نے یا پر ہمزہ لگا کر بہت سے مقامات پر نادرست اشباع کیا ہے اور اگر مکتوبی حروف کو پڑھا جائے تو شعر آہنگ میں نہیں رہتا۔ لیکن وہ دوسری کہانی ہے۔ غالب اپنے عہد کے املائے مطمئن نہیں تھے۔ خود ان کی وجہ سے نیا املا نو پذیر ہوا۔ یہ بھی دوسری کہانی ہے، لیکن کئی طور پر غیر متعلق نہیں۔ فعلن، رہ سکون عین، وزن پر آوے طرح کے الفاظ لکھے جاتے تھے، اور بولے بھی جاتے ہوں گے۔ لیکن غالب نے آئے، جائے چھپائے، نگائے، بنائے، سنائے، لکھنا اور بولنا شروع کر دیا تھا۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل، او سکونائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

یہ غزل غالب کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی فراہم ہے۔ یا بھول اور یا معروف کا غلط ہے۔ یا بھول کتر لکھی





نسخہ عرشی میں آتے ہیں، اور مالک رام کے نسخوں میں ایسے ہیں۔ نسخہ عرشی میں وہ قرأت ہے جو نسخہ شیرانی میں مرق ۹۴ رخ ب پر ہے۔ نسخہ بھوپال میں یہ غزل نہیں تھی۔ عرشی نے یہ اظہار بھی کیا ہے کہ رشید کے گلشن بے خار گبہ میں آتے نہیں ایسے ہیں۔ نسخہ شیرانی کی یہ غزل ۱۸۲۱ء اور ۸۳۶ء کے درمیان کی ہے۔ اور عرشی نے اس کی قرأت کو ۱۸۶۲ء کے چوتھے مطبوعہ ایڈیشن (مطبع نظامی کاپنور) کی قرأت پر ترجیح دی! یہ تمدن کے اصول کے مطابق نہیں ہے۔ عرشی کا ذوق ماوران کی پسند و ناپسند کے بنیادی اصول سے زیادہ اہم ان کے لیے ہوں تو ہوں، کلام غالب کے طالب علموں کے لیے نہیں۔

حالی نے جو قرأت دی ہے۔ وہ مرعج ہے۔ اور عرشی نے جو قرأت دی ہے۔ وہ زاید المعاصی ہے اور اختلاف نسخ میں دکھائی جانا چاہیے تھی، متن میں نہیں! تحریف حالی سے نہیں، عرشی سے ہوئی ہے!

۳۴۔ روک دو گر غلط چلے کوئی

ڈھانک لو، گر خطا کرے کوئی

یادگار میں شعر اس طرح ہے۔ جب کہ مرقہ دیوان میں شعریوں ہے۔

روک تو گر غلط چلے کوئی

بخش دو گر خطا کرے کوئی

حالی نے جو میٹیریل معتبر لوگوں سے جمع کیا تھا اس میں شعر اسی طرح ہو گا۔ جیسا حالی نے نقل کیا ہے۔ حالی کو اصلاح ہی کرنا ہوئی تو وہ جزوی تقابل ردیفین کا عیب اپنے استاد کے کلام سے دور کرتے۔ ایسی تحریف کیوں کرتے، جسے نہ پین کے کھاتے میں ڈالا جاسکتا ہے، اور نہ پاپ کے۔

۳۵۔ بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا

اگر اس طرہ پر تیرے ختم کا پہنچ ختم نکلے

یادگار میں شعر اسی طرح لکھا ہے۔ مرقہ نسخوں میں پہلا مصرع یہ ہے،

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا

مصنف موصوف کو اختیار ہے کہ وہ تیری اور تیرے کو اختلاف نسخ سمجھیں۔ عرشی نے بھی کچھ

عرشی نے اپنے نسخے میں مخفف گب کی کلید فراہم نہیں کی ہے کہ نسخہ کاپورا نام کیا ہے۔

مقامات پر ایسا ہی سمجھا ہے، جب وہ یار مجہول اور یار معروف کے خلط کو اختلاف نسخہ سمجھے۔  
ایک غزل جو ۱۸۶۱ء کے تیسرے مطبوعہ ایڈیشن میں ہے، اس کا عکس ملاحظہ فرمائیں:

ذکر میرا بہ بدی ہی اوی منطور نہیں وعدہ سیر گلستان ہی خوش طالع شوق شاہد ہستی مطلق کی کمر ہی عالم قطرہ اپنا ہی حقیقت میں ہی بالیکن حسرت اسی ذوق خرابی کہ وہ طاقت ہے میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینے قیامت میں نہیں علم کر علم اگر لطف درین آتا ہو صاف دردی کش پانچ ہم میں ہم لوگ ہوں مٹھو کی مقابل میں خفا کی غالب	غیر کی بات بگڑ جائی تو کچھ دور نہیں شرودہ قتل مقتدر ہی جو مذکور نہیں لوگ کہتی ہیں کہ ہی پر ہمیں منظور نہیں ہم کو تقلید تنگ ظرفی منظور نہیں عشق پر عہدہ کی گون تن رنجور نہیں کس عونت سی وہ کہتی ہیں کہ ہم جو نہیں تو نفاق میں کسوں کے سے منظور نہیں وہی وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں میری دعویٰ یہ بہت ہی کہ مشہور نہیں
---	--

مطبع نظامی کانپور میں چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۲ء میں چھپا تو اس میں یہ غزل یوں چھپی عکس ملاحظہ فرمائیں:

ذکر میرا بہ بدی ہی اوی منطور نہیں وعدہ سیر گلستان ہی خوش طالع شوق شاہد ہستی مطلق کی کمر ہی عالم قطرہ اپنا ہی حقیقت میں ہی بالیکن حسرت اسی ذوق خرابی کہ وہ طاقت ہے میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینے قیامت میں نہیں علم کر علم اگر لطف درین آتا ہو صاف دردی کش پانچ ہم میں ہم لوگ ہوں مٹھو کی مقابل میں خفا کی غالب	غیر کی بات بگڑ جائی تو کچھ دور نہیں شرودہ قتل مقتدر ہی جو مذکور نہیں لوگ کہتی ہیں کہ ہی پر ہمیں منظور نہیں ہم کو تقلید تنگ ظرفی منظور نہیں عشق پر عہدہ کی گون تن رنجور نہیں کس عونت سی وہ کہتی ہیں کہ ہم جو نہیں تو نفاق میں کسوں کے سے منظور نہیں وہی وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں میری دعویٰ یہ بہت ہی کہ مشہور نہیں
دعویٰ	میری دعویٰ یہ بہت ہی کہ مشہور نہیں

آج کے اسلوب اعداد و اسلوب کثابت کے حساب سے پڑھیں تو بڑی افراتفری ہوگی۔ یار مجہول  
اور یار معروف کے خلط کی حقیقت کو نظر انداز کر کے اس عہد کے نسخے نہیں پڑھے جاسکتے۔ ہر شعر پر گفتگو  
طوالت کا باعث ہوگی تیسرے شعر کو لیں۔

چوتھے ایڈیشن میں پہلا مصرع ہے :

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم

تیسرے ایڈیشن میں پہلا مصرع ہے :

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم

کیا اسے اختلاف نسخہ سمجھنے کا جواز ہے ؟

تیسرے ایڈیشن میں چٹا شعر یوں لکھا ہے :

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں

کس رعونت سے وہ کہتی ہیں کہ ہم سو رائیں !

کیا اس سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ غالب کے محبوب نے تائید کے صیغے میں گفتگو کی ؟

عرشی اور مالک رام، دونوں سے ایک شعر کے سلسلے میں افسوسناک غلطی ہوئی۔ شعر یہ ہے :

گدا بچھ کے وہ خوش تھا۔ مری جو شامت آئی

آٹھا۔ اور آٹھ کے قدم میں نے پاسبان کے لیے

ان دونوں نے شامت آئے کے ساتھ پہلے مصرعوں کی قرأت اپنے نسخوں میں رکھی ہے، حالانکہ اس کی وجہ

سے شعر کا مفہوم ضبط ہو گیا ہے۔

ایک اور مثال۔ مالک رام کے یادگار (صدی) ایڈیشن میں ایک شعر ہے :

مدح سے مددوح کی دیکھی شکوہ

یہاں عرض سے رتبہ جو ہر کھلا

عرشی کے نسخے میں پہلا مصرع یہی ہے۔ لیکن دوسرے مصرع کا پہلا لفظ یہاں ہے، اور وزن سے

ساقط نہیں۔ ان دونوں مقدم مرتبین غالب نے نہ معنی پر غور فرمایا، اور نہ اس بات پر کہ شکوہ مذکور اسم صفت

ہے۔ یہاں تسامع یہ ہوا کہ یار مجہول کے بجائے یار معروف پڑھی۔ میری ناقص رائے میں، درست قرأت شعر

کی یہ ہے۔

مدح سے مددوح کی دیکھی شکوہ

یاں عرض سے رتبہ جو ہر کھلا

حالی نے چوں کہ غائب کی آنکھیں دیکھی تھیں، ان کے گفتگو کا شرف انہیں حاصل تھا۔ اس لیے اگر حالی کے نسخے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے قنات کو تانیث کے صیفے میں نظم کیا ہے، تو ہمیں چاہیے کہ جو دیوان ہمارے پاس ہے، اس کی قرأت درست کر لیں۔

۳۶۰ کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ

ہے یوں، کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے

یادگار میں پہلا مصرع ہے :

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھ کو

ورنہ کے ساتھ متداول دیوان کی قرأت اصلاحی — بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ مجھ کو کے بغیر بھی بات پوری ہوتی ہے، اس لیے یہ حشو تھا۔ اگرچہ قبیح نہیں۔ ورنہ سے یہ قسم دور ہو جاتا ہے۔ سوا اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ حالی کے پاس یادداشتوں میں اولین قرأت کے ساتھ یہ غزل تھی۔

اگر حالی کو اصلاح ہی مقصود ہوتی، تو وہ حشو مجھ کو، نہ رکھتے۔ اور آتی کو آتے کرتے، کیوں کر آتی کی سی ساقط ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے سقوط کی اجازت ہے، لیکن یہ سقوط گراں گزرتا ہے۔

۳۷۰ دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے

بنا ہے عیشِ تحملِ حسینِ خاں کے لیے

متداول دیوان کے نسخوں میں شعر اس طرح ہے۔ لیکن یادگار میں پہلا مصرع ہے :

دیا ہے اور کو بھی تا اسے نظر نہ لگے

یہ مرزا کے آخری عہد کی غزل ہے۔ حالی نے جو مصرع لکھا ہے، اسے پہلے سودوں میں سے سمجھنا چاہیے۔ مروجہ دیوان میں اصلاح کے بعد خلق رکھا گیا ہوگا۔ صیفہ و احد میں اور کھٹکا ہوگا۔ جمع اوروں رکھنے سے مصرع سقوطِ صوت آخر کی وجہ سے رواں نہیں رہتا۔ شاید اسی لیے خلق رکھا گیا ہوگا۔ اور کو ابتدائی قرأت کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ اس سے ایک بات اور بھی ابھرتی ہے کہ حالی کے پاس، یادداشتوں میں غزلوں کی ابتدائی قرائتیں بھی تھیں، یا مرزا غزل سرانجام پانے کے بعد خود مخصوص احباب کو بھیجتے تھے، یا لکھوادیتے تھے۔ یادگار لکھتے وقت کوئی ایسا بستہ (یا بیاض) حالی کو کسی نے بھیج کر ان کی مدد کی۔



۳۸۔ زمانہ عہد میں اس کے مجوز آرائش

نہیں گے اور تارے اب آسمان کے لیے

یادگار میں پہلا مصرع ہے :

زمانہ عہد میں ہے اس کے مجوز آرائش

ما قبل کے شعر کی طرح یہ مصرع بھی پہلی قرات کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ وہی ہیں اور حالی کا مصرع بہتر نہیں ہے، اس لیے اصلاح اور تحریف کا الزام نگانے کی گنجائش نہیں۔

۳۹۔ گو ایک بادشاہ کے سبغا نہ زاد ہیں

دربار دار لوگ ہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام

اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

مصنف موصوف نے دوسرے شعر میں اختلاف نسخ کی نشاندہی کی ہے۔ یادگار میں مصرع اولیٰ میں دھرتے کی جگہ رکھتے ہے۔ اور دوسرے مصرع کی ابتدا یوں ہوتی ہے، "ہے اس سے .. الخ" اگر موصوف نے توجہ فرمائی ہوتی تو پاتے کہ پہلے مصرع میں بادشاہ نہیں پادشاہ ہے۔

عرشی کے نسخے میں یہ تینوں اختلاف نسخ دکھائے گئے ہیں۔ بادشاہ کے بجائے پادشاہ ہونا، اس

بات کی طرف اشارہ ہے، کہ یادگار میں ابتدائی قرات ہے جو نظر ثانی کے بعد دیوان میں لکھی گئی۔

۴۰۔ افطارِ سوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو

اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو

روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

مصنف موصوف نے اس بات کی درست نشاندہی کی ہے کہ یادگار کے چوتھے مصرع میں نہ کھائے

کی جگہ نہ کھاوے ہے۔

منشی نبی بخش حقیر کو دو خطوں میں جون ۱۸۵۴ء اور جولائی ۱۸۵۴ء مرزا نے یہ قطعہ بھیجا۔ پہلا

مصرع ہے :

افطار سوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو

باقی تینوں مصرعے وہی ہیں، جو متبادل دیوان میں ہیں، اور اوپر نقل ہوئے ہیں۔

نسخہ عرشی میں یہ قطعہ نسخہ رامپور جدید کے حوالے سے نقل ہوا ہے، جس کی ترتیب کتابت کا سنہ ۱۸۵۵ء ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عرشی کے نسخے میں اصلاح کے بعد کا متن ہے۔ حقیر کے خط میں جو متن ہے، وہ پہلے کا ہے، اور یہ پہلے مصرع کی سافت سے واضح ہے۔ نادرات کے خطوط کے عکس فراہم نہیں ہیں۔ قیاس چاہے ہے کہ ان میں کھاوے ہوگا۔ جو موجودہ اسلوب میں کھائے لکھا گیا۔ یادگار میں ابتدائی قرات ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے مصرع میں جسے کی سے ساقط ہے۔ اور مصرع مکمل ہو جاتا ہے۔ اور چوتھا مصرع کھاوے کی سے ساقط ہونے کی وجہ سے رواں نہیں رہتا۔

(۱) افطار (مفعول) سوم کی (ج) (فاعلات) سی کچھ دست (مفاعیل) گاہ ہو (فاعلن)

(۴) روزہ (مفعول) گرن کھاو (فاعلات) ت ناچار (مفاعیل) کیا کرے (فاعلن)

اصلاحی قرات میں یہ دونوں سقم دور ہو گئے۔ کچھ کے بعد اگر کا الف موصول ہے اور کھائے میں واؤ نہیں ہے۔ اس لیے اس کی جگہ یا بھول نے لے لی۔

یادگار کی قرات، نادرات اور نسخہ رامپور جدید کے درمیان کی ہے۔

بھیجی ہے مجھے جو شاہ جمجاہ نے دال -۴۱-

ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال

ہے دولت و دین و دانش و دار کی دال

یادگار میں غالب کی رماخی کی یہ صورت ہے مصنف موصوف نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ نسخہ عرشی میں پہلا مصرع یہ ہے:

بھیجی ہے مجھے جو شاہ جمجاہ نے دال

رباعی کے چوبیس اوزان ہیں۔ ایک وزن مفعول مفاعیل مفعول ہے۔ یادگار اور نسخہ عرشی میں اس رباعی کے پہلے مصرعے اسی وزن پر ہیں:

بھیجی (مفعول) مجھے (مفاعیل) جمجاہ (مفاعیل) دال (مفعول)

۲۔ بھیجی (مفعول)، رُج بھرک شا (مفاعیل)، ہجم جاہ (مفاعیل)، بن دال (فعل)،  
دوسرے مصرع کے متن میں بھی اختلاف ہے، لیکن مصنف موصوف کی نظر اس پر نہیں گئی۔ نسخہ عرشی میں  
دوسرا مصرع ہے :

ہے لطف و عنایت شہنشاہ پہ دال

یادگار میں عنایات ہے۔ نسخہ عرشی میں عنایت ہے۔ عرشی نے نشاندہی کی ہے کہ چوتھے ایڈیشن میں  
عنایات ہے۔ مالک دہام نے عنایات ہی رکھا ہے۔ عنایت پہلے مطبوعہ ایڈیشن کی قرأت ہے۔ اور عرشی  
نے چوتھے ایڈیشن کی قرأت پر پہلے ایڈیشن کی قرأت کو ترجیح دے کر، اصول تدوین کی خلاف ورزی  
کی ہے۔ متن میں چوتھے ایڈیشن کی، یعنی مرزا کی طے کی ہوئی آخری قرأت ہی رکھنا تھی۔ پہلے کی قرأت  
اختلاف نسخ میں دکھانا تھی۔ لیکن عرشی نے اس کے برعکس کیا۔ اور یہ بڑی خامی، اور بڑا نقص ہے۔ ۱۸۴۲ء  
کے اصلاحی مصرع کے بجائے ۱۸۴۱ء کے نسخے کے مصرع کو ترجیح دینا نسخہ عرشی کو پایہ اعتبار سے اتار  
دیتا ہے۔

رباعی کے دو بنیادی اوزان ہیں مفعول مفاعیل مفاعیل فعل اور مفعول مفاعیل مفاعیل  
فعل۔ یادگار کا مصرع، جو چوتھے مطبوعہ ایڈیشن میں بھی ہے۔ پہلے وزن میں ہے، اور نسخہ عرشی کا مصرع  
دوسرے وزن میں ہے۔

۱۔ ہے لطف (مفعول)، عنایات (مفاعیل)، شہنشاہ (مفاعیل)، پہ دال (فعل)۔

۲۔ ہے لطف (مفعول)، عنایت (مفاعیل)، ————— ایضاً —————

حائق سامنے ہیں۔

۳۲۔ کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر

جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

میری تنخواہ میں تہائی کا۔

ہو گیا ہے شریک سا ہو کار

یادگار میں قطعہ کے دو شعر جو ذرا فاصلے پر ہیں، اس طرح ہیں مصنف موصوف نے درست

نشاندہی کی ہے کہ نسخہ عرشی میں شعریوں ہیں :

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر

تازہ دے یادِ مہرید آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش

جسم رکھتا ہوں اسے اگرچہ نزار

میری تنخواہ میں چہارم کا

ہو گیا بچہ شریک سا ہو کار

یہ بات واضح ہے کہ حاکمی نے تحریف نہیں کی۔ درمیان کا ایک مصرع ثانی اور ایک مصرع اولیٰ لکھنے سے رہ گیا۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ تسامع خود ان سے ہوا۔ یا کاتب سے سہو ہوا۔ عرشی نے اختلافِ نسخ کے باب میں ص ۴۸ پر اظہار کیا ہے۔

”سہو اگلے شعر کا دوسرا مصرع لکھ دیا“ عرشی نے اس بات کی نشاندہی بھی کی ہے کہ چار نسخوں میں تہائی ہے۔ ان چار نسخوں میں یادگار بھی شامل ہے۔ حاکمی صرف اپنے نسخے میں تحریف کرنے پر قادر تھے، باقی تین نسخوں میں نہیں۔ واضح ہے کہ حاکمی کی قرأت تین اور نسخوں میں بھی ہے۔ اس لیے تحریف نہیں ہے!

مصنف موصوف نے ”مقدمہ شعرو شاعری“ اور متداول کلام کے نسخوں میں بھی اختلافِ نسخ کی نشاندہی کی ہے۔ یادگار سے تقابل کے تحت، ”مردہ دیوان سے جو مصرعے لیے گئے تھے۔ ان سے پانچ کی انہیں قراتوں کو مقدمہ شعرو شاعری کے تحت بھی یا گیلے یہ مصرعے ہیں۔

۱۔ جامِ جم سے یہ مراجع سفاں اچھا ہے۔

۲۔ آن کے آنے سے جو آجاتی ہے رونقِ منہ پر

۳۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

۴۔ زمانہ عہد میں ہے اس کی مجھ آرایش

یادِ جہول اور یادِ معروف کا خط اس زمانے میں عام تھا۔ عادتاً مقدمہ کا کاتب اس کے کو اس کی لکھ گیا۔ اس زمانے میں یہ بھی اس کے پڑھا جاتا تھا۔ مصنف موصوف اسلوبِ املا سے واقف نہیں اس لیے ان سے یہ نادانستہ غلطی ہوئی۔



۱۵) دھوئے گئے ہم آئیے کہ بس پاک ہو گئے

ان اشعار کے سلسلے میں جن کے یہ مصرعے ہیں، معروضات پیش کی جا چکی ہیں، اس لیے ان سے دوبارہ بحث نہیں کی جائے گی۔ ہاں ایک بات کی طرف قارئین کرام کو توجہ ضرور دلانا چاہوں گا کہ اپنے دیوان کے مقدمہ میں حالی نے مرزا کے ان شعروں کو، اسی متن کے ساتھ لکھا، جو سوانح حیات میں درج شعروں کا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے یادداشت سے شعر نہیں لکھے تھے۔ ان کے پیش نظر غالب کا کلام تھا۔ مقدمہ اور مرزہ دیوان میں جس اختلاف نسخ کے بارے میں مصنف موصوف نے لکھا ہے، ان کا مطالعہ کریں۔

۱۔ جلد سے لڑتے ہیں نہ داعظ سے جھگڑتے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس رنگ میں جو کہ

مقدمہ میں حالی نے شعریوں نقل کیا ہے۔ متداول کلام کے نسخوں میں شعر یوں ہے:

جلد سے ڈرتے ہیں نہ داعظ سے جھگڑتے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو کہ

اس غزل میں مرزا نے خاصی اصلاحیں کی تھیں۔ حالی نے یہ شعر معتبر ماخذ سے نقل کیا ہوگا۔ یہ ماخذ ہمارے

علم میں نہیں ہے، لیکن صرف اس وجہ سے مقدمہ کی قرأت کو ہم غیر معتبر یا غیر اہم قرار نہیں دے سکتے۔ مرزا کے مطبوعہ دیوان اُس وقت موجود تھے جب حالی کا دیوان چھپا۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ مرزا نے دیوان کی ایک جلد اپنے ہاتھ سے مصرعوں میں کچھ تبدیلیاں کر کے کسی کو دی ہو، اور وہ حالی تک پہنچا ہو۔ یہ صرف ایک امکان ہے، اور بہت دور کا امکان نہیں۔ یا کچھ خط ان کے پاس ایسے بھی ہوں، جنہیں اردو سے معنی کے دوسرے حصے میں شامل نہیں کیا گیا، لیکن ان میں مرزا نے شعر لکھے ہوں۔ یہ بھی صرف ایک امکان ہے، اور قابل غور بھی ہے۔

نادرات میں حقیر کے نام ۱۸۵۱ء کے ایک خط کے ساتھ وہ غزل ہے جس میں یہ شعر ہے ”غالب کے خطوط“

میں مرتب خلیق انجم نے خواجہ غلامی میں ص ۳۴ پر یہ اظہار کیا ہے کہ یہ غزل دہلی اردو اخبار کے ۱۱ مئی ۱۸۵۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ عرشی نے اپنے نسخے میں ”شرح غالب“ کے تحت ص ۳۶۳ پر یہی اظہار کیا ہے۔ حقیر کو مرزا نے یہ بھی خط میں لکھا:

”ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے رنجہ

طلب کرتے ہیں۔ سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں، نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج  
میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی۔ کل یا پرسوں جا کر غزل پڑھوں گا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں۔ داد  
دینا۔ اگر ریختہ پایہ سحر یا اعجاز کو پہنچے، تو اس کی یہی صورت ہوگی، یا کچھ اور شکل۔“

اور پھر غزل ہے :

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ تو آے  
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ دو آے

نسخہ عرشی میں ص ۴۶۰ پر اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ نادرات، یعنی حقیر کے خط میں اور دیوان کے پانچویں  
۱۸۶۳ء کے ایڈیشن میں، دوسرے مصرع کا پہلا لفظ آگ ہے۔ پھر بھی عرشی نے اپنے نسخے میں یکت  
رکھا ہے۔ مالک رام نے بھی اپنے نسخوں میں یکت رکھا ہے۔ آزاد کتاب گھر والے نسخے میں البتہ فٹ نوٹ میں  
آگرہ والے ایڈیشن میں اک ہونا دکھایا گیا ہے۔ ان دونوں نسخوں میں اک کے بجائے یکت کا متن میں  
رکھا جانا، تدوین کے اصول کے منافی ہے۔

ایک بار پھر اس حقیقت پر توجہ دلائی جائے کہ آگرہ والا ایڈیشن ۱۱۱ں مخطوطے سے لکھا گیا تھا۔ جو  
رام پور کے نسخے سے نواب ضیاء الدین خاں نیر و رخشاں کے لیے مرزا نے نقل کرایا تھا، اور اطمینان سے  
اس پر نظر ثانی کی تھی۔ مہی وہ ماضی ہے۔ جو میرٹھ سے دیوان کی اشاعت کے لیے مصطفیٰ خاں شیفتہ کو، اور  
پھر واپس منگا کر شیونرائن کو آگرہ بھیجا گیا تھا۔ اک مرزا کا نام کیا ہو متن ہے اور چوں کہ یکت کو اک مرزا نے  
اطمینان سے نظر ثانی کے بعد کیا تھا۔ اس لیے اک مرتجح قرأت ہے۔ ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی دہلی سے جو تیسرا  
ایڈیشن چھپا تھا۔ اس کا ماخذ ان معنوں میں مجہول ہے، کہ دیوان کے آخر میں مرزا نے جو کچھ لکھا، اس میں یہ  
جملے بھی ہیں :

”..... اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں، لیکن ہر کا پی میری نظر سے گزرتی رہی

ہے، اور اخلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔۔۔“

جب دیوان چھپ کر آیا، اور مرزا نے دیکھا، تو جھجھکا گئے۔ میر مہدی مجرد کو لکھا :

”... ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا۔ متوسط، بوکاپنی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق تصنیف ایک تجھ کو ملا، غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ ہوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔“

اس سے کچھ عرصہ پہلے ہی انھوں نے آگرہ سے چھپنے والے دیوان کے لیے نسخہ دیکھا تھا۔ اور بڑی توجہ سے اس کا متن فائنل کیا تھا۔ نسخہ میرٹھ سے منگا کر ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کو پارسل سے شیونرائن کو بھیجا۔ دو شنبہ ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کے خط میں انھوں نے شیونرائن کو لکھا:

”میں تمہارا گناہگار ہوں، تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی کوشش سے اس (دیوان) کو وہاں (میرٹھ) میں، چھپنے نہ دیا، اور منگوایا۔ آج پیر کے دن ۲۵ جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے۔۔۔“

مطبع احمدی سے جو دیوان ۱۸۸۱ء میں چھپا۔ اس کا ماخذ آگرہ سے چھپنے والے دیوان سے زیادہ معتبر نہیں تھا۔ کاپی کی تصحیح کے مرحلے پر کتنی تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں؟ — بہت ہی محدود؛ اور پھر غضب یہ ہوا کہ مرزا نے جو تصحیح کی، اس پر عمل نہیں ہوا۔ مرزا کے بیان سے ایسا ہی لگتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ بیان حتمی ہو، ہو سکتا ہے مرزا نے روادری میں کاپیاں دیکھی ہوں، اور کام پیشایا ہو، کاپی کی غلطی مصنف کو اتنی نظر نہیں آتی۔ جتنی دوسروں کو، اگر وہ کم استعداد نہ ہوں۔ بہر کیف؛ اس ناقص چھپے ہوئے دیوان پر ”دو دن رات“ میں تصحیح کی اور پھر کانپور میں چھپا۔ آگرہ چھپنے کے لیے جو خطوط انھوں نے بھیجا تھا، اور جس میں کئی اہم تبدیلیاں کی تھیں وہ ظاہر ہے ان کے ذہن میں نہیں تھیں، ورنہ وہ تبدیلیاں بھی کانپور والے دیوان کے لیے کی جاتیں، ان تبدیلیوں میں یکتا کو اک کرنا بھی ہے۔ اک کو ہی آخری قرأت سمجھنا چاہیے۔ ایک مثال اور:

حقیر کو جو غزل بھیجی ہے، اس میں تیسرا شعر ہے:

ہے ساقی و شعلہ و سیماب کا عالم

آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو کہے

شیونرائن کے مطبع مفید الخدائق، آگرہ کے ایڈیشن میں پہلا مصرع ہے:

ہے زلزلہ دوسرے صلاب کا عالم

ظاہر ہے یہ اصلاح مرزا کو یاد نہیں رہی۔ اسی وجہ سے مطبع نظامی کا پورے چھپنے والے چوتھے ایڈیشن میں پہلے ہی کامصرع بحال رہا کیوں کہ مطبع احمدی کے ایڈیشن میں ایسا تھا۔ اپنی اس اصلاح کے یاد نہ رہنے سے پانچویں ایڈیشن میں اس شعر کے پہلے مصرع کا متن مسترد نہیں ہوتا۔ بلکہ وہی مصرع مرتجح ہے۔

یہ اصلاح مرزا نے کیوں کی؟ غور کریں تو وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ بجلی چمک کر معدوم ہو جاتی ہے۔ اسی بجلی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ پھر چمکتی ہے، تو دوسری بجلی چمکتی ہے۔ شعلہ بھی بجھ جاتا ہے۔ دوبارہ جو بجھتا ہے، وہ دوسرا شعلہ ہوتا ہے۔ نہ ساعقہ آتا ہے، نہ شعلہ آتا ہے اور نہ سیلاب آتا ہے۔ زلزلہ آتا ہے، گزر جاتا ہے، مصرع چلتی ہے، آگ آتی ہے، گزر جاتی ہے۔ سیلاب بھی آتا ہے، گزر جاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں آتا ہے۔ صاعقہ، شعلہ اور سیلاب، تینوں میں آتا ہے مطابقت نہیں۔ متداول دیوان میں اگر وہ پانچویں ایڈیشن کا پہلا مصرع متن میں رکھنا چاہیے۔ صاعقہ.... الخ والا مصرع حواشی میں دکھایا جانا چاہیے۔

یہ کوئی اطمینان کی بات نہیں کہ غالب کے نام پر اتنے ادارے ہیں، لیکن نہ ابھی تک غالب پر مبنی تنقید ہوئی، اور نہ ان کے کلام کا صحیح متن کسی دیوان میں رکھا گیا۔ متن کی تدوین کے نام پر کاپی نویسی ہو رہی ہے۔ جبرائیل کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اگلے ایڈیشن میں، حوالے کے بغیر درست کر دی جاتی ہیں۔ یہ تو امانت کا عالم ہے اور دیانت کا!

پانچواں شعر متداول دیوان میں ہے:

جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جوئے

حقیر کے خط میں دوسرا مصرع ہے:

سمجھے ہوئے ہیں ہم اے جس بھیس میں جوئے

گو یا مختلف اوقات میں مرزا نے مختلف قرائتیں رکھیں۔ یادگار میں حاتی نے مصرع اولیٰ میں ڈرتے کی جگہ لڑتے، اور مصرع ثانی میں رنگ رکھا، تو ان کے ماخذ میں یہی الفاظ ہوں گے۔ کسی مرحلے پر غالب نے یہ قرائت بھی رکھی ہوگی، جو انھوں نے کسی کو خط میں لکھی، یا کسی نے اپنی یادداشت یا ضمیمہ میں لکھی۔



۳۔ کوئی ویرانی تے ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گم یاد آیا

مصنف موصوف کی نظر یادگار کے پہلے مصرع میں تے پر ٹھہری، اور انھوں نے متداول دیوان میں تسی سے موازنہ کیا! نسخہ شیرانی میں ورق ۱۸ الف پر یہ شعر اس املا سے لکھا ہے:

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی

تھا میں مہرا میں کہ گم یاد آیا

دوسرا مصرع معرض بحث میں نہیں ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ شاید بھائی، اور کاتب (یقیناً) املا کے نئے اسلوب کے باوجود، کہیں کہیں یا بھول اور یا معروف کا خلط کر جاتے تھے۔ عادتیں دیر میں چھوٹی ہیں لیکن آج متنی تنقید کرنے والوں کو اس عہد کے اسلوب املا سے تو واقف ہونا ہی چاہیے۔ یادگار میں تے نہیں تھی ہی لکھا ہے، اور نسخہ شیرانی میں تھی نہیں بلکہ ہے لکھا ہے۔ اسی کو یا بھول اور یا معروف کا خلط کہتے ہیں۔

یہ معروضات اس لیے پیش کی گئیں کہ آج ادبی تنقید اور متنی تحقیق بھی کتابوں سے کتابیں بنانے والے گروہوں کی ہربانی سے باقاعدہ کاروبار ہیں۔ ذاتی منفعت نے علمی کاوش کو ہپا کر دیا ہے، اور تحقیق و تنقید باقاعدہ اجناس ہیں۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی تحریر میں اگر متاثر کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو یہ مضمون تحریر کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ جب غالب کے خطوط کے مرتب، ڈاکٹر خلیق انجم وہ راسے قائم کر سکتے ہیں، جس کا انھار انھوں نے ”غالب پر چند تحریریں“ کے حرف آغاز میں کیا ہے، تو غیر تربیت یافتہ قاری نے حالی کے بارے میں نہ جانے کیا راسے قائم ہوگی خلیق انجم نے اس کتاب کے حرف آغاز میں لکھا ہے:

”سعادت علی صدیقی صاحب نے ایسے ۴ اشعار کی نشاندہی کی ہے، جو یادگار غالب میں شامل ہیں، اور جن میں حالی نے تصرف کیا ہے۔ اسی طرح صدیقی صاحب نے، غالب کے وہ اکٹھا اشعار نقل کیے ہیں، جو حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں شامل کیے تھے اور جن میں تصرف کیا ہے۔ صدیقی صاحب نے دیوان غالب، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، اور دیوان غالب مرتبہ مالک رام سے ان اشعار کا موازنہ کر کے، اختلاف نسخ بیان کیے ہیں۔

اگرچہ سعادت صاحب کا یہ مضمون بہت چھوٹا ہے، لیکن غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے، اور حالی کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ یہاں میں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی اہم حقیقت کا علم مجھے سعادت صاحب کے اس مضمون سے ہوا۔

ڈاکٹر خلیق انجم کو، اور ان کی طرح دوسروں کو، یہ مضمون پڑھنے کے بعد حالی کے بارے میں بدگمان نہ ہونا چاہیے۔ حالی ثقہ، سنجیدہ اور ایماندار شاعر، محقق، نقاد اور سوانح نگار تھے۔ شبلی نے حیات جاوید کو مدلل مداحی، حالی کی ضد سے زیادہ سرسید کی ضد میں قرار دیا تھا۔ شبلی کا فقرہ جتنا مشہور ہے، شاید اتنا ہی حقیقت سے دور بھی۔ حالی کے نظریات سے اختلاف کرنے کا حق یہ لائسنس کسی کو نہیں دیتا کہ ان کی دیانت پر شک کیا جائے۔

ان معروضات میں جو شہادتیں پیش کی گئی ہیں، ان سے حالی کے ثقہ اور معتبر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں رائے قائم کرنے میں شاید مدد ملے۔

آخر میں شیو زائیں کے نام غالب کے ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط کے ایک اقتباس پر توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

ہوں۔

”صاحب! میں ہندی غزلیں بھیجوں کہاں سے۔ اردو دیوان چھاپے کے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم اور اکمل تھے، وہ ٹٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہوا نظر آجائے، لے لو۔ تم کو بھی لکھ بھیجا۔۔۔ ایک دوست کے پاس اردو کا دیوان چھاپے کے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہیں کہیں سے مستودات متفرق بہم پہنچا لیے ہیں۔ چناں چہ پنہاں ہو گئیں، دیواں ہو گئیں، یہ غزل مجھ کو اُسی سے ہاتھ آگئی ہے۔ اب میں نے اس کو لکھا ہے، اور تم کو لکھا ہے، اور تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خط لکھ کر رہنے دوں گا۔ جب اس کے پاس سے ایک غزل یا دو غزل آجائے گی، تو اسی خط میں ملفوف کر کے بھیج دوں گا۔۔۔“

یہ بات بعد از امکان نہیں کہ ”یادگار غالب“ اور اپنے مجموعہ کلام کا مقدمہ لکھتے وقت یہ ذخیرہ حالی کو فراہم رہا ہو!

## خطوط غالب میں طنز و مزاح

غالب سے قبل اردو زبان طبع زاد اور تخلیقی نثر سے محروم تھی۔ داستانوں اور مذہبی موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا لیکن یہ نثر فارسی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ تھی یا پھر دوسری زبانوں کے مذہبی اور داستانوی ادب پر مبنی تھی۔ ہاں اردو شاعری میں طنز و مزاح بھرپور شکل میں موجود تھا۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور مشکلات اور ان کے تضادات کے عرفان سے ایک ایسا ادبی رویہ بھی جنم لیتا ہے جسے ہم طنز و مزاح کا نام دیتے ہیں۔

غالب کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ابتدائی دور کے فارسی خطوط میں طنز و مزاح کی وہ چاشنی نہیں ہے جو آگے چل کر ان کے اردو مکتوبات کی ایک امتیازی خصوصیت قرار پائی۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے زندگی کے تجربات اور مشاہدات میں اضافہ ہوا۔ غالب کے فکر و خیال میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی اور زندگی کے تلخ حقائق سے دوچار رہنے کی کیفیت کا احساس شدید ہوتا گیا۔ غالب تقریباً ساری زندگی مصائب و آلام سے نبرد آزما رہے۔ عمر کے آخری حصے میں ان کے بہترین ہتھیار طنز و مزاح تھے۔

مردانہ وار زندگی گزارنے کا جو ہر اور سلیقہ شاید یہی ہے کہ انسان نہ تو زندگی کے حقائق سے منہ موڑ کر بیٹھ جائے نہ صرف زندگی بھران کے خلاف دفاع میں مصروف رہے اور نہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کہ وہ اپنی اعلا حوصلگی سے ان کو شکست دے دے گا۔ یہ تلخیاں انسانی زندگی کا ایک ایسا حصہ ہیں جو زندگی بھر ہمارے ساتھ رہتا ہے اور جس کے لیے غالب نے مختلف اشعار میں یہ بات کہی ہے کہ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟ یا وہ مصرعہ ”شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک“

نغمہ ہائے غم کو ہی اسے دل غنیمت جانیے  
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

غالب ساری زندگی پورے توازن کے ساتھ غم و آلام سے نبرد آزما رہے۔ جس کی مکمل تصویریں ہمیں ان کے طنز و مزاح میں نظر آتی ہیں۔ ان کے مصائب و آلام کی داستان اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ وہ ابھی نوجوان تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی مصیبتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ پنشن کے مقدمے میں ان کی شکست، دو دفعہ کا حادثہ اسیری، ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب اور اس میں بے شمار دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کا قتل، جو باقی بچے تھے، ان کی مفارقت، زندگی بھر کی تنگدستی اور بڑھاپے کی مسلسل بیماریاں غالب جیسے حساس انسان کو پاگل کر دینے یا کم سے کم انہیں دنیا سے متنفر کر دینے اور قنوطی بنانے کے لیے کافی تھیں لیکن زندگی کے آخری دنوں تک غالب کے ہوش و حواس اس لیے قائم رہے کہ ان میں غیر معمولی قوت ارادی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے زندگی کے ساتھ مکمل طور پر مفاہمت کر لی تھی۔ یہ صرف ان کا خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ تھا کہ زندگی کا پورا حقیقی معنوں میں غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں میں ہی پروان چڑھتا ہے اور ان میں بھی دھوپ یعنی غم کو ہی خوشی پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج  
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اس شعر میں محض شاعرانہ مضمون نہیں باندھا گیا بلکہ یہ غالب کی زندگی کی تفسیر ہے۔ غالب زندگی اور اس کے مسائل کو ایک باشعور اور دانشور انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اسی لیے مسلسل مایوسیوں اور ناکامیوں سے تنگ آکر انہوں نے زندگی سے فرار حاصل نہیں کیا۔ زندگی کے مصائب و آلام نے ان کی فکر میں بالیدگی پیدا کی اور ان میں زندہ رہنے کا عزم اور حوصلہ جگایا اور وہ صبر و تحمل اور استقلال پیدا کیا جو ہر کڑی سے کڑی مصیبت کو ہنس کر جھیلنا سکھاتا ہے۔ ایسا ہی آدمی یہ شعر کہہ بھی سکتا تھا:

تاب لائے ہی بنے گی غالب  
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز



غالب نے ”جان عزیز“ کے لیے آرزو اور شکست آرزو، خوشی اور غم، کامیابی اور ناکامی کے درمیان زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو ہدفِ ستم ہائے روزگار ”نہیں بلکہ رہیں ستم ہائے روزگار“ کہتے ہیں۔ اس ”ستم ہائے روزگار“ سے ان کی زندہ دلی اور بندہ سنجی اور ان کی حسِ مزاح ماند نہیں پڑی بلکہ اور تیکھی ہوئی چلتی گئی۔ ایک حقیقی مزاح نگار کی طرح غالب زندگی کی ان تمام ناہمواریوں اور کھردرے پن پر سے ہنستے ہوئے برہنہ پا گزر جاتے ہیں، جن پر چلتے ہوئے پاؤں بولہ بان ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے تضادات کا احساس اور عرفان ہی ان تضادات کی نشتریت بھی ہے اور اس نشتریت کا اندازہ غالب نے ہمیں اپنی تحریروں میں خوب خوب کرایا ہے۔ غالب کے مزاح میں پھکڑپن نہیں بلکہ زندگی کی بصیرتوں کا اور اس کی تلخ اور شیریں حقیقتوں کا، تلخ زیادہ اور شیریں کم۔ حوصلہ مندانہ اور برہنہ اظہار ہے۔ غالب کے طنز اور ان کی شوخی طبع دونوں کا سرچشمہ زندگی کی محرومیاں اور غم و آلام ہیں۔ اسی لیے ان کا مزاح تو انا اور جاندار ہے۔

غالب خط لکھتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ اپنی مصیبتوں کے بیان سے دوسروں کو بے وجہ پریشان نہ کریں۔ وہ اپنے دکھڑے بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ میر سر فراز حسین کے نام خط میں اپنی تنہائی کا ماتم کرتے ہیں، ان دوستوں کا ذکر کرتے ہیں، جنہیں انقلاب زمانہ نے ان سے جدا کر دیا۔ پھر ایک دم بات کا رخ بدل دیتے ہیں،

اللہ، اللہ، اللہ! ہزاروں کامیں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔

سنو غالب! رونا پیٹنا کیا، کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔

غالب کی ساری زندگی اپنی انا کی نگہداری میں گزری۔ لیکن علی زندگی میں جب غالب کی انا بادِ حوادث کے تھپیڑے کھائی ہے تو غالب اپنا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے۔ مزاح قربان علی بیگ خاں سالک کو اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ

تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا

غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔

بہت اتر اترتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب

نہیں۔ لے، اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا  
 لمحہ مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرام گاہ"  
 و "عرش نشین" خطاب دیتے ہیں، یوں کہ یہ اپنے کو "شاہ قلم و سخن" "جانتا تھا، سقر مقر"  
 اور "ہادیہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

آئیے، نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرض دار بھوک  
 سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اتنی، حضرت نواب صاحب کیسے، اوغلان  
 صاحب آپ سلوٹی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو، کچھ تو  
 بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندمی سے گلاب، بزاز سے کپڑا،  
 میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچنا ہوتا، کہاں  
 سے دوں گا۔"

اس خط میں غالب کی انا کے شیش محل کے چکنا چور ہونے کی جھنکار صاف سنائی دے رہی ہے۔  
 بظاہر غالب نے اپنی کمزوریوں، معاشی بد حالیوں اور محرومیوں کا مضحکہ اڑایا ہے، لیکن اس بذلہ سخی  
 اور شوخی بیان کی تہہ میں ناقابل بیان ذہنی کرب اور محرومی کا شدید احساس ہے۔ یہ صرف غالب کی  
 داستان نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد کے اس پورے طبقے کی داستان ہے، جو کبھی  
 سند اعتبار پر جلوہ افروز تھا جسے سلوٹی اور افراسیابی ہونے پر ناز تھا جسے اپنی ذہنی صلاحیتوں پر  
 گھمنہ تھا اور جواب قرض پر زندگی بسر کر رہا تھا۔

کامیاب ترین طنز وہی ہے جس کا شکار طنز نگار کی اپنی ذات ہو۔ کوئی دوسرا شخص ایسی بے حسی  
 سے غالب کا مذاق نہیں اڑا سکتا تھا جیسا کہ اس خط میں خود غالب نے اپنا مذاق اڑایا ہے۔

غالب نے نواب علار الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں اپنی عزت اور معاشی بد حالی  
 کا اس طرح مضحکہ اڑایا ہے :

"بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، ادھر  
 درباری مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالوٹی۔ ہر ایک پاس تسک  
 مہری موجود۔ شہد گداؤ، چاٹو، نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ

بالکل بھو بھی کے سر۔ باا میں ہمہ بھی خان نے کچھ دے دیا۔ بھی الور سے کچھ دلوادیا بھی  
 ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں ادرباسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سوچے  
 نام پور کے قرض دینے والا ایک میرا مختار کار وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول میں  
 قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکی دار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے  
 جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد و ہی ایک سو باسٹھ تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا  
 کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں، کہاں سے گنجائش نکالوں؟ تھرور ویش بہ جان دریش  
 صبح کی تبرید؟ متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب وکلاب موقوف، بیس  
 بائیس روپیہ مہینا بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ  
 پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ ہلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح پیو گے؟ جواب  
 دیا کہ جس طرح وہ ہلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گزرا مٹاکہ رام پور سے علاوہ  
 وجہ مقرری اور روپیہ آگیا، قرض قسط ادا ہو گیا، متفرق۔ باخیر ہو صبح کی تبرید،  
 رات کی شراب جاری ہو گئی، گوشت پورا آنے لگا۔

برسات کا موسم ہے اور غالب کا مکان بوسیدہ ہے۔ ان کے کمرے کی چیت چھلنی ہو گئی ہے غالب  
 نے ایک خوبصورت استعانت کی مدد سے انداز بیان کو کیسا دلچسپ بنا دیا ہے۔ مرزا بھرگوپال ٹفٹہ کو  
 لکھتے ہیں،

مہینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینڈروں مکان گرتے اور مہینہ کی نئی صورت، دن رات میں  
 دوچار بار برسے اور ہر بار اس زور سے زندگی مارتے پڑ گئیں۔ بالآخر خانے کا جو دالان  
 میرے بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اُتر چہ گرا نہیں، لیکن  
 چھت چھلنی ہو گئی، کہیں لگن، کہیں چلپی، کہیں اگا لدان رکھ دیا قلم دان، کتابیں اٹار  
 تو شے خانے کی کوٹھری میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں، شتی لوح میں  
 تیں جینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب جات ہوئی۔

مزے لے لے کر اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذکر کرنے کے لیے بہت بڑا کلیجہ چاہیے۔ لیکن اپنی بات  
 میں تاثیر محض کلیجے کے زخم بیان کر دینے سے نہیں پیدا ہو جاتی اس کے لیے کلیجہ چیر کر دکھانا پڑتا ہے

اور غالب ہم کو اپنا طرف دار بنانے کے لیے یہی تو کرتے ہیں۔  
 غالب کی صرف بڑھاپے کی تصویریں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان تصویروں سے اندازہ ضرور ہو جاتا  
 ہے کہ جوانی میں وہ بہت دجیہہ اور خوبصورت آدمی رہے ہوں گے۔ غالب کی جوانی کا حلیہ انہیں کے  
 الفاظ میں ملاحظہ ہو :

میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے . . . . جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا  
 اور دیدہ و رنگ اس کی ستائش کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے  
 تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔“

بنام مرزا حاتم علی قہر

بڑھاپے کا آغاز ہوا، نو جوانی کے ساتھ ساتھ چہرے اور جسم کا حسن بھی رخصت ہونے لگا، ڈاڑھی اور مونچھ  
 میں بھی سفید باں آنے لگے۔ دانت ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ غالب نے مرزا حاتم علی قہر کے نام خط میں  
 بتاتے ہوئے حلیے کا نہ صرف مضمک اڑایا ہے بلکہ اپنی شخصیت کی انفرادیت کا بھی اظہار کیا ہے۔ غالب  
 لکھتے ہیں :

”جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر  
 آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچاڑھی بھی چھوڑ  
 دی اور ڈاڑھی بھی، مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملا،  
 حافظ، بساطی، پیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیاریہ، جولا، کنجڑا، منہ پر ڈاڑھی، سر پر بال،  
 فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی، اسی دن سرمٹا دیا“

غالب کے ایک دوست مرزا حاتم علی قہر نے غالب کو خط لکھا اور خط میں کچھ ایسی باتیں لکھیں  
 جن سے غالب کو اندازہ ہوا کہ قہر کو کسی معاملے میں اور غالباً عشق میں ناکامی ہوئی ہے۔ اس لیے غم و اندوہ  
 کا شکار ہیں۔ غالب خط کا جواب لکھتے ہیں اور اپنے خط کے پہلے فقرے ہی سے قہر کا موڈ بدلنے کی  
 کوشش کرتے ہیں لکھتے ہیں :

”بندہ پرورد! آپ کا خط پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا کتنا شتاب لکھتا ہوں۔  
 مطالب مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے۔ پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی



خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے۔ بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں درخوارائش ہے۔ بقول غالب علیہ الرحمہ

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو  
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر نہ میں زباں کیوں ہو

ہے ہے حسن مطلع :-

ہر فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے  
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے اور اگر خدا نخواستہ باشد غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہم درد ہو۔ ہم اس بوجھ کو، مردانہ اٹھا رہے ہیں۔ تم بھی اٹھاؤ، اگر مرد ہو۔ بقول غالب، جوم

دلایہ درد و الم بھی تو معنم ہے کہ آخر  
نہ گریہ سحری ہے، نہ آہ نیم شبی ہے

غالب نے اس خط میں جو کچھ لکھا ہے، وہ تھر کو تسلی دینے کی باتیں نہیں یہ ان کا عقیدہ ہے، وہ واقعی بڑے سے بڑے غم کو مردانہ وار جھیل جاتے ہیں۔ اس خط کے آخر میں غالب نے جو شعر نقل کیا ہے۔ اس کا مفہوم انھوں نے اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار میں ادا کیا ہے اس مفہوم کا ایک اور شعر ہے۔

نغمہ با غم ہی کو اسے دل غنیمت جانے  
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز بہتی ایک دن

دنیا میں شاید ہی کسی نے ایسے خطوط لکھے ہوں جن میں کسی کی موت کی اطمینان دی گئی ہو یا جو تقریباً نامے ہوں اور ان میں مکتوب الہیہ کا موڈ بدلنے کے لیے مزاح سے کام لیا گیا ہو۔ غالب کو شش کرتے تھے کہ ان کے خطوط غم آگیں مضامین سے زیادہ بوجھل نہ ہو جائیں۔ غالب کے ایک رشتہ دار اور عزیز دوست تھے علی بخش خاں۔ ممکن نہیں کہ غالب کو ان کی وفات کا صدمہ نہ ہوا ہو۔

علی بخش خاں کو دروغ گوئی کی عادت تھی اور بعض اوقات ان کی دروغ گوئی سے دلچست صورت حال پیدا ہو جاتی تھی۔ نواب علاء الدین خاں ملانی کے نام ایک خط میں چند لفظوں میں علی بخش خاں کی وفات کا ذکر کر کے اس صدمے کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے علی بخش خاں کی دروغ گوئی کا ایک دلچسپ

واقعہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”علی بخش خاں مھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے انہتر واں برس شروع ہوا ہے۔ اس نے چھیا سٹھ برس کی عمر پائی۔ نئی تقریر و تحریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ جنرل لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہونکر سے جو محاربات ہوئے ہیں، اس میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے، ورنہ اگر قبا و پیر ہن اتار کر دکھلاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بے جاتلوار اور برچھی کے زخم ہیں، وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی۔ اُن کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب ہم راسا جانتے ہیں کہ تم جنرل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس کے ہو گے۔ یہ سن کر آپس لے کہا کہ درست، بجا ارشاد ہوتا ہے خدائیش بیا مرزا دودین دردغ ہائے بے نک ملیراد۔“

(بنام نواب علار الدین خاں علانی)

مرزا حاتم علی بیگ تہر کی محبوبہ کا انتقال ہو گیا۔ تہر نے خود غالب کو لکھا یا کہیں سے اطلاع ہو گئی غالب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ تہر کو اپنی محبوبہ کی موت کا بہت صدمہ ہے، غالب خط میں محبوبہ کی موت کی تعزیت کرتے ہیں، مگر دیکھیے کس انداز میں۔ لکھتے ہیں:

”مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں، پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالم رنگ و لہو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو نہ دور و دور منظور نہیں، ہم مانع خلق و فجور نہیں، بیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو، میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشان، کہاں کی مرثیہ خوانی آزادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہوؤ ”چنا جان“ نہ سہی ”منا جان“ سہی، میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک چورلی، اقامت جاودانی ہے

اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے، ہے وہ حور شیریں ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہی زمر دیں کاخ اور وہی طوبی کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زن نوکن، اسے دوست در ہر بہار

کہ تقویم پار میں نہ ناید یگار

میر کے نام غالب نے یہ تعزیت نامہ ایسے دلچپ انداز میں لکھا ہے کہ اس میں تعزیت بھی ہو گئی، غم و اندوہ کا اظہار بھی ہو گیا اور کچھ پھیر چھاڑ بھی مقصد غالب کا یہ تھا کہ قہر کا غم کچھ ہلکا ہو اور ان میں سب و ضبط کا حوصلہ اور غم و آلام کی اس دنیا میں زندہ رہنے کا سلیقہ پیدا ہو۔ غالب کے ایک دوست تھے امراء سنگہ۔ ان کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب مرزا تفت نے غالب کو لکھا کہ امراء سنگہ تیسری شادی کر رہے ہیں۔ غالب جواباً لکھتے ہیں۔ "امراء سنگہ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ التدایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پسند آگے میں پڑا ہے تو نہ پسند ابھی ٹوٹا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے، اس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچے کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

غالب کی ایک عزیزہ کا جو رشتے میں پھوپھی تھیں، انتقال ہو گیا۔ غالب منشی بن بخش حقیر کو ان کی وفات کی اطلاع کس انداز میں دیتے ہیں۔

"بھائی صاحب!

میں بھی تہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن اٹھارہ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی، کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھیں، مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پر سوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادا یعنی اس

مرحوم کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے  
میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یک بار مر گئے۔ انا بشر وانا الیراجعون۔“

بنام منشی نبی بخش حقیر،

ظفر و مزاج سے کام لے کر غالب اپنے چھوٹے چھوٹے مسئلے حل کر لیا کرتے تھے۔ مرزا پر گوپال تفتہ کا  
پہلا دیوان مرتب ہوا تو غالب نے اس کا دیباچہ لکھا، لیکن جب تفتہ نے دوسرا دیوان مرتب  
کر کے غالب سے دیباچے کی فرمائش کی تو غالب نے معذرت کر لی۔ منشی نبی بخش حقیر نے دیباچے  
کی سفارش کی تو غالب انہیں لکھتے ہیں:

”واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا  
قابل فرزند عطا کیا ہے۔۔۔ ہا دیباچہ، تم کو میری خبر ہی نہیں۔ میں اپنی جان سے  
مرتا ہوں۔“

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل

کہاں کی رہا گی، کہاں کی غزل

یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں اور مجھ کو معاف رکھیں۔ خدا نے مجھ پر  
روزہ نماز معاف کر دیا ہے کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کرو گے؟

بنام منشی نبی بخش حقیر،

غالب عام طور سے خیال رکھتے ہیں کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھ دیں، یا کوئی ایسا واقعہ یا  
لطیفہ بیان کر دیں جسے پڑھ کر مکتوب الیہ کچھ دیر کے لیے خوش ہو جائے۔ غالب نواب یوسف  
مرزا کے نام خط کے شروع میں یوسف مرزا کے لڑکے کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہیں، پھر  
مولانا فضل حق کی دوام جس کی سزا کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر سک کہنے کے اس الزام کا ذکر کرتے ہیں، جو  
ان پر عائد ہوا تھا اور جس کی وجہ سے انہیں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خط بہت بو جھل  
ہو گیا تھا، اس لیے غالب ایک ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں، جس سے یوسف مرزا کا غم کچھ کم  
ہو سکے۔ لکھتے ہیں:

”ایک لطیفہ پرموں کا سنو۔ حافظ نمونے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے، حاکم



کے سامنے حاضر ہو کرتے ہیں۔ اہلاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہیں، مسل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا۔ حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کریں۔ پھر پوچھا کہ حافظ نمونہ کون؟ عرض کیا کہ میں اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ نمونہ مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ نمونہ بھی تم۔ سب جہاں بھی تم، جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مسل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ہوا اپنے گھر چلے آئے۔“

خواجہ بخش درزی بہت موٹے تھے۔ کسی کام سے غالب سے ملنے آئے دیکھے غالب کس انداز میں یوسف مرزا کو اس واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”ہاں صاحب، خواجہ بخش درزی کل سر پہر کو میرے پاس آیا میں نے جانا کہ ایک ہاتھی کو ٹھٹھے پر چڑھ آیا، کہتا تھا کہ آغا صاحب کو میری بندگی لکھ بیجنا۔“

غالب اپنے دوست خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام خط میں لکھتے ہیں؛

”حضرت وہ شعر جنگانی زبان کا لو۔ ۱۱۶۹ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کھائے تھے اور مغاں لایا ہوں۔ صحیح یوں ہے؛

تم کہے تھے رات میں آئیں گے سو آتے نہیں  
قبل بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھا۔ نہیں“

غالب نے شہزادہ بشیر الدین کو اپنی تصویر ڈاک سے بھیجی۔ خط آیا کہ وہ تصویر نہیں ملی اس اطلاع پر غالب کا رد عمل اور انداز بیان ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔

”آج منگل ۱۴ جون ۱۸۷۷ء بارہ بجے عنایت نامہ آیا منزل رو دیکھ کر سفیدہ صبح مراد سمجھا۔ سنگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹھی کے بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر سنگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر چھوڑتا اور کہیں کر اس غم کی تاب لاتا کہ میں نے اپنے کو کچھو کر بصورت تصویر لپ کی خدمت میں بھجوا۔ لفافہ انگریزی، اقبال نشان شہاب الدین خاں سے لکھوا کر بیرنگ ارسال کیا۔ اس فرمان میں اس لفافے کی رسمید نہ پائی۔ ظاہر ڈاک پر ڈاکو گسے اور میرے پیکر بے روح کے

ٹکڑے اڑا دیے۔ بے تاب ہو کر یہ عبارت حضرت کی بھیجی ہوئی، رفاغیہ میں لپیٹ کر روانہ کی۔ اب جب آپ اور رفاغیہ بھیجیں گے تو مطالب باقی کا جواب مع اوراق اشعار بھیجوں گا۔“

ص ۵۳

نواب انور الدولہ عبدالدین خاں بہادر شفیق کے نام خط ایک خط میں تقریباً یہی انداز بیان ملاحظہ ہو۔  
”پیر و مرشد!“

بارہ بجے تھے، میں ننگا اپنے پٹنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا، بھلے کو انگر کھایا کر تلکے میں رہتا تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا، میرا نقصان ہوتا۔“

غالب کی ایک ملازمت تھی، بی وفادار بہت دلچپ شخصیت کی مالک۔ علانی کے نام ایک خط میں غالب نے ان کی شخصیت کا دلکش خاکہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں۔

بی وفادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمہاری پھوپھی نے انہیں وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور منساہ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف ہنر کی سیر نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں۔ اور نہ کہیں کہ: ”یہ پھول تائی چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں“ شرح، تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں!

میر ہمدی مجروح نے اپنے ایک دوست حکیم میر اشرف کو غالب کے پاس ملاقات کے لیے بھیجا غالب مجروح کو اس ملاقات کا حال کس دلچپ انداز میں لکھتے ہیں:

”دو خط تمہارے ہر سیبل ڈاک آئے۔ کل دو پہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانوے سلونے، ڈاڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمہارا خط دیا صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا فرمایا: ”اشرف علی قومیت کا استفسار ہوا۔ معلوم ہوا سید ہیں، پیشہ پوچھا۔ حکیم نکلے، یعنی حکیم میر اشرف علی، میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔“

کچھ ہی دن بعد غالب نے اپنی حکیم میرا شرف علی کے بارے میں لکھا:  
 ”کل حکیم میرا شرف علی آئے تھے۔ سرمٹا ڈالا ہے۔ محققینِ روضہ سکیم پر عمل کیا ہے  
 میں نے کہا کہ سرمٹا دیا ہے تو دارمھی رکھو۔ کہنے لگے دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔  
 والشان کی صورت قابل دیکھنے کے لیے۔“

ایک دفعہ ڈاکے نے غالب کو پکتان ہونے کی مبارک دی۔ اس کی داستان غالب کی زبان  
 سینے۔ نواب انوار الدولہ شفیق کو لکھتے ہیں۔

ایک لطیفہ نشاط انگیز سنئے۔ ڈاک کا ہرکارہ جو بتی باروں کے محلے کے خطوط پہنچاتا ہے۔  
 حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دریا اور اس نے خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ  
 بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو جیسا کہ دئی کے بادشاہ نے نوابی کا  
 خطاب دیا تھا۔ اب کا لپی سے خطاب ”پکتانی“ کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے۔  
 سرنامے کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم مخدوم نیاز کیشاں ”لکھا تھا۔ اس قوم ساق  
 نے اور الفاظ سے قطع نظر کہ ”کیشاں“ کو پکتان ”پر بھیا۔

دو جانے میں غالب کے کسی سسرانی عزیز کی شادی تھی۔ غالب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ غالب  
 نہیں پہنچے۔ غالب کے وہاں نہ جانے کی غالب کوئی وجہ بھی تھی۔ علانی نے خط لکھ کر شکایت کی تو  
 غالب پھٹ پڑے۔ لکھتے ہیں۔

”دو جانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار یہ بھی شعبہ ہے انھی  
 نطنوں کا جس سے تمہارے چچا کو گمان ہے مجھ پر جنوں کا جاگیر دار میں نہ تھا کہ ایک  
 جاگیر دار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا سازد سامان سے کہ چلا جاتا۔ دو جانے  
 جا کر شادی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرتہ مار ہو۔ لو ہارو بھائی کے دیکھنے کو  
 نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو۔“

”برہان قاطع“ کے ادبی معرکے میں میرٹھ کے جیم بیگ نے غالب کے خلاف ایک رسالہ  
 ساطع برہان ”لکھ کر شائع کیا تھا۔ اس لیے غالب ان سے بہت ناراض تھے۔ ساطع برہان ”کے  
 جواب میں غالب نے ”نامہ غالب“ نامہ سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے

عبدالرزاق شاگر کو لکھتے ہیں۔

نامہ غالب کا مکتوب الیہ جیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد دیتا ہے اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دوائے اس بیچ پوچھ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و وقار ہو۔

(بنام عبدالرزاق شاگر)

ایک دفعہ غالب رام پور سے واپسی پر میرٹھ ٹھہرے۔ یہاں عظیم الدین احمد نامی ایک شخص نے غالب کا دیوان اردو شائع کرنے کی ضرورت سے لی۔ غالب نے دئی آکر دیوان عظیم الدین کو بھیج دیا۔ نہانے کیوں عظیم الدین نے خاموشی اختیار کر لی۔ دیوان واپس کیا نہ اسے چھاپا۔ غالب ایک خط میں اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”دیوان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص نا آشنا، موصوم عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں ہے، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطوبع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے، تم دعا مانگو۔ زیادہ کیا لکھوں۔“

غالب خط میں ادھر ادھر کی بے مقصد باتیں پسند نہیں کرتے۔ ان کے خط ہمیشہ مختصر ہوتے اور ان میں مطلب کی بات کہی جاتی۔ میر مہدی مجروح نے ایک خط میں طوالت سے کام لیا اور مطلب کی کوئی بات نہیں کی۔ غالب غصے میں مجروح کو جواب دیتے ہیں:

”اے حضرت! کیا خط لکھا ہے۔ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا، میرا بھونا مجھ کو ملا، میرا حجام مجھ کو ملا، میرا بیت الخلا مجھ کو ملا، رات کو وہ شور کوئی آئیو، کوئی آئیو — فرد ہو گیا۔ میری جان بچی، میرے آدمیوں کی جان بچی۔ لاجل و لا قوۃ

(بنام میر مہدی مجروح)



مرزا تفتہ اصلاح کے لیے اپنا کلام غالب کو بھیجتے رہتے تھے۔  
 غالب نے کئی بار معذرت کی، لیکن تفتہ نہیں مانے، دیکھے نفے میں کیسے آگ بگولا ہو رہے  
 ہیں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں۔

”لاحول ولا قوہ! کس ملعون نے بہ سبب ذوق شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں  
 شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بہ طریق قہر و دوش بہ جان دردیش  
 لکھا تھا، جیسے اپنی جو رو بروئے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمہارے  
 ساتھ وہ معاملہ ہے۔“

اگر کوئی شخص غالب کا پتا بہت تفصیل سے لکھ دیتا، یا غالب سے ان کا پتا پوچھ لیتا، تو  
 ان کی آنا کو بہت ٹھیس پہنچتی پوچھنے والے سے کہتے کہ میرا نام اور دتی لکھ دو، خط پہنچ جائے گا  
 ایک دفعہ ان کے قریبی رشتہ دار اور شاگرد مرزا علار الدین علانی نے خط میں ان کا پتا پوچھ لیا غالب  
 کو علانی سے یہ امید نہیں تھی۔ غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ لکھتے ہیں:

”منو صاحب! حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امر کو دو چار برس گن کر دیکھتے  
 ہیں، جانتے ہیں کہ جو ان سے لیکن بچہ سمجھتے ہیں یہ حال تہبائی قوم کا ہے۔ قسم  
 شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری تہبویک نزدیک  
 ثبات اور مستحق ہے اور تم صاحب ہی جانتے ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو  
 اور اس مسخرے کو گناہ و ذلیں نہ سمجھو تو تم کو چین نہ آئے گا بیچاس برس سے دتی  
 میں رہتا ہوں۔ ہزار باخط اطراف و جوانب سے آتے ہیں بہت لوگ ایسے ہیں کہ  
 محد نہیں لکھتے، بہت بیگ ایسے ہیں کہ محد سابق کا نام لکھ دیتے ہیں، حکام کے  
 خطوط فارسی اور انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور  
 میرا نام یہ سب مراتب تم جانتے ہو۔ اور ان خطوط کو تم دیکھ چکے ہو۔ اور پھر مجھ سے  
 پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔“

نواب انور الدولہ شفق نے غالب کا پتا ذرا تفصیل سے لکھ دیا۔ اب دیکھیے کل افشانی کتنا  
 لکھتے ہیں:

”خط کا عنوان دیکھ کر میں سمجھا کہ شاید پھر کے رحلیوں، محلات کی کوئی فہرست یا پڑوسیوں کے جمع و خرچ کا حساب ہے۔“

مرزا قلیں کی وجہ سے تب سوچتے ہیں خاص غصوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اگرچہ قتل کے انتقال کو عرصہ ہو چکا تھا، درغائب کی ان سے ملاقات بھی نہیں ہوئی پھر بھی غائب ساری زندگی قتل کی مخالفت کرتے رہے بلکہ نوبت یہاں تک آگئی کہ ان کا نام آتے ہی جھڑک جاتے اور کبھی کبھی تو کابیوں پر اتر آتے مرزا قلیں نے ”یک زمان“ کے بارے میں غائب سے استفسار کیا، غائب جھلا کر جواب دیتے ہیں۔

سنو میاں، میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادی غازی دانی میں دم ماستے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں، جیسا وہ گسا گس، اتو عبد الواع بانسوی غلط نامراد کو غلط کہتا ہے اور یہ اتو کا پٹھا قتل ٹھوٹ کدہ و شفقت کدہ، و نشہ کدہ، کو اور ہر عام و نیمہ جا کو غلط کہتا ہے، یہاں بھی ویسا ہی ہوں جو یک زمان کو غلط کہوں گا؟

مرزا قلیں سے کچھ الفاظ پر بحث ہو گئی، ان الفاظ پر گفتگو کر کے غائب کانٹے ہیں،  
”یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو ملکہ گئے ہیں، وہ حق ہے، کیا آگ آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے۔“

مرزا گوپال قلیں اپنی تصانیف چھاپتے پر تلے ہوئے تھے، غائب وہ بات پسند نہیں تھی، انہوں نے قلیں کو سمجھایا تھا، مگر وہ باز نہیں آتے مرزا قلیں نے ”چپ چکی تھی اور سلساں زیر طبع تھی“ قلیں نے غائب کو اس کی اطلاع دی، انہیں غصہ آ گیا، لیکن قلم سنبھال کر دل کی بات کہہ دی  
مرزا قلیں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

صاحب!

تسار اندیزہ سے آیا مرزا قلیں کا تاشادیا سلساں کا چھاپا اندام کو مبارک کرے، اور خدہ ہی مبارک آرد کا بیان ہے۔ بہت گزری تھی تو زری رہی، چھی گزری ہے ابھی گزری جاوے گی میں تو یہ بت ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے

عرفی کے کیا ہاتھ آیا۔ جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا، سعدی نے  
 "بوستان" سے کیا پھل پایا، جو تم "سنبلتاں" سے پاؤ گے؟ اللہ کے سوا جو کچھ ہے  
 ، موم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے، نہ سخنور ہے، نہ قصیدہ ہے، نہ قصیدہ ہے۔"

غالب کو جب غصہ آتا ہے تو گل افشانی گفتار میں اور بھی انصاف ہو جاتا ہے۔

شہاب الدین خاں شاقب اور غلام نجف خاں غالب کے فارسی دیوان کی نقل کر رہے تھے  
 انھوں نے دیوان میں کچھ ایسے اشعار بھی شامل کر دیے جو غالب کے نہیں تھے۔ غالب کو جب اس  
 کا علم ہوا تو انھوں نے شہاب الدین شاقب کو خط میں لکھا،

"بھائی شہاب الدین خاں، واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے  
 میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولد الزنا  
 نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے  
 ہیں اور اگر حاشیے پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے  
 بھی جاویں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون نے اصل کلام کو پھیل کر یہ تراعات لکھ دیے  
 ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا اور پردادا پر  
 لعنت اور ہفتاد پشت تک ولد الحرام اس کے سوا اور کیا لکھوں۔ ایک توڑکے  
 میاں غلام نجف خاں اور دوسرے تم۔ میری کم بختی بڑھاپے میں، فی کرمہا کلام  
 تمہارے ہاتھ پڑا۔"

(بنام شہاب الدین شاقب)

غالب بہت دلچسپ انداز میں حسن طلب سے کام لیتے ہیں۔ انہیں نابا بیکانیر کی مصری بہت  
 پسند تھی اور جانتے تھے کہ نواب عبدالمعین خاں عدائی کے ہاں اعلیٰ درجے کی مصری ہوتی ہے  
 اب ان کا حسن طلب ملاحظہ ہو۔ عدائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

خشتی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیاز سے، پیلاؤ، کباب، جو کچھ تم کھا رہے ہو۔  
 مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہے۔ خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا  
 تم کو میسر نہ آیا ہو۔ کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میرزا جان صاحب اس مہر کی ٹکڑے

چارہ ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجا چاہنے لگتا ہوں۔  
اس حسن طلب کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاقائی نے کچھ ہی دن بعد ایک ٹھلیا میں سوا دو سیر مصری  
بھیج دی۔

غالب کے ایک شاگرد میر احمد حسین میکش کے ہاں خرے بنے، نہ جانے میکش کے ہی  
میں کیا آئی کہ ان خرموں کا قطعہ تاریخ کہا اور اصلاح کے لیے فوراً غالب کو بھیج دیا۔ غالب کو  
جب خرے بننے کا علم ہوا تو ان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ دین محمد میکش کا خط لائے تھے  
غالب نے انھی کے ہاتھ جواب بھیجوا دیا۔ جواب میں لکھا:

بھائی میکش، آفریں، ہزار آفریں، تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خرے کس مزے  
کے ہوں گے، جن کی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب

قلندر ہرچہ گوید، دیدہ گوید

تاریخ دیکھی اس کی تعریف کے خرے کھائیں گے، اس کی تعریف کریں گے، کہیں یہ  
تمہارے خیال میں آؤ گے کہ یہ حسن طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد عزیز کو دوبارہ  
تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے۔ ابھی خرے لے کر آؤ گے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ  
اگر یہ فرض محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میان دین محمد صاحب کے ہاتھ خرے  
بھجو آؤ گے تو ہم بھی کہیں گے۔ تازہ شے بہتر بارہ سے بہتر۔

کوئی صاحب تھے، جن سے غالب اور ان کے شاگرد مرزا بہر گوپاں تفتہ کو کسی ادبی معاملے میں  
اختلاف تھا۔ غالب نے اس سلسلے میں ان صاحب کو خط لکھا اور پھر تفتہ کے نام خط میں اس خط کا  
ذکر کیا۔ ایک محاورہ کیا ہے تکلف اور شگفتہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:  
بہر حال وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اس کو بھیجا۔ اس کی ماں مرے اگر میرے  
اس خط کا جواب لکھا ہو۔

غالب انسانی رشتوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ ان سے کوئی ایسی  
بات نہ ہو، جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ اس طرح اگر کوئی دوست یا شاگرد ایسی بات کرتا، جس  
سے غالب کو ذہنی تکلیف ہوتی تو وہ طنز و ظرافت کے پردے میں اپنی ناراضگی یا ناپسندیدگی کا



اظہار کر دیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ غالب کسی پر برس پڑے ہیں۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔ کسی نے نواب انور الدولہ شفق کو غالب کی وفات کی غلط خبر دے دی۔ شفق نے بہت دن سے غالب کو خط نہیں لکھا تھا۔ جب یہ خبر غلط ثابت ہو گئی تو انھوں نے غالب کو خط لکھا، اور اس میں اس افواہ کا ذکر کر دیا۔ اس واقعے پر غالب کا حسن اظہار ملاحظہ ہو:

”آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا، میری خبر نہ لی :  
 علی گڑھ کے صدر امین شیخ مومن علی دہلی آئے ہوئے تھے۔ اور غالب سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔  
 شیخ صاحب کی اس حرکت سے غالب کی انا کو تھیس پہنچی۔ علی گڑھ کے اپنے ایک دوست منشی  
 نبی حقیر کو غالب لکھتے ہیں :

”اگر آپ سے شیخ مومن علی کی ملاقات ہو تو فرمائیے گا کہ اسد اللہ رویاہ بعد  
 سلام عرض کرتا ہے کہ وہ رتبہ میرا تو کہاں کہ میں آپ سے شکوہ کروں کہ مجھ سے مل کر  
 آپ نہ گئے، مگر ہاں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو خبر کیوں نہ ہوئی، ورنہ تو دیر کو پہنچتا۔

غالب اپنے چھوٹوں سے بھی چھیڑ بھاڑ کر کے دل کو بہلاتے رہے جس شخص کے سر سے موج خوں گزر  
 گئی ہو۔ اس کے لیے ہنسنے ہنسانے کی باتوں کے لیے واقعی بڑا حوصلہ چاہیے۔ میرن صاحب کی کسرال  
 غالب کے گھر کے پاس ہی تھے۔ میرن صاحب دلی سے پانی پت روانہ ہوئے۔ رخصت ہونے کے  
 واقعات غالب کی زبانی سینے۔ میر ہمدی مجروح کو لکھتے ہیں :

”یہاں ان کی کسرال میں قہقہے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے  
 آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوش دامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں۔ سایاں کھڑی ہوئی  
 دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند صورت دیوار چپ، جی چاہتا ہے پیچھے کو مگر ناچار  
 چپ۔ وہ غنیمت تھا کہ شہر دیران، نہ کوئی جان نہ پہچان۔ در نہ ہم سائے میں قیامت  
 برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آئی۔ امام فاضل علیہ السلام کا  
 روپیہ بازو پر باندھا گیا۔ گیارہ روپے خرچہ راہ دیے، مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن  
 صاحب اپنے جد کی نیاز کار روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول میں گئے اور تم سے

صرف پانچ روپے ٹا ہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کس جائے گا۔ یہی ہوگا کہ میرا صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے۔ اور وہ محلِ غم ہے۔ اس عزیز نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرا صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے۔ اور قلاقند تمہاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے۔ بھائی میں دتی سے آیا ہوں۔ قلاقند تمہارے واسطے لایا ہوں، زہار بادور نہ کیجیو۔ مال مفت سمجھ کر لئے لیجو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلویا زکے سر پر قرآن رکھو۔ کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دور۔ بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔

غالب کی ذاتی زندگی تورنج والہم کی ایک داستان تھی، ان کا پورا معاشرہ بھی غم اور افسردگی کا شکار تھا۔ قتل، غارتگری، لوٹ مار اور ان سب کا نتیجہ بربادی، دیرانی اور بے رونقی، ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں غالب موت کا حکم ہونے سے بچ گئے، لیکن انہیں موت سے بڑی سزا ملی، یعنی ان جیسے حساس انسان کو ان تمام خونی واقعات کا پہلے خاموش تماشائی اور پھر اجڑی ہوئی دتی کا ماتم دار بننا پڑا۔ اپنے ماحول اور معاشرے کی بربادی اور تباہی پر غالب خون کے آنسو روئے ہیں لیکن انہوں نے سبر و ضبط سے بھی کام لیا ہے۔ حادثات کی ان تند و تیز آندھیوں میں بھی انہوں نے اپنی شوخی و ظرافت اور خن مزاج کے چراغ کو بجھنے نہیں دیا۔

غالب زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کو جس شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اتنی ہی جرات مندی سے ان کے ساتھ جینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ اور جینے کا یہی حوصلہ وہ اپنے ان احباب کے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں، جن سے وہ اپنے خطوط میں مخاطب ہیں۔ آج جب کہ خطوط غالب اردو نثر کا ایک گراں قدر سرمایہ بن چکے ہیں۔ خطوط غالب کے مخاطب بھی صرف وہ لوگ نہیں رہے جن کے نام یہ خطوط ہیں۔ بلکہ آج خطوط غالب کا ہر قاری ان کا مخاطب ہے۔ اور غالب کی حوصلہ مندی ان سب کی مشترکہ میراث۔

# URDU ADAB QUARTERLY

*EDITOR*

**Khaliq Anjum**

**ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)  
NEW DELHI**

سہ ماہی

# اُردو ادب





# اردو ادب

# ادو ادب

اڈیٹر  
خلیق انجم

انجمن ترقی اردو دہلی

۱۹۹۱ء

شمارہ (۳)

سالانہ قیمت

فی شمارہ

پینتالیس روپے

پندرہ روپے

پرنسٹن یونیورسٹی لائبریری، حبیب خان، سٹراٹفورڈ، پنسلوانیا، یو ایس اے  
راؤز ایجوکیشنل ٹرسٹ، نئی دہلی سے شائع کیا۔

## ترتیب

حصہ اول آغاز

- ۷ خلیق انجم
- ۸ کمال احمد لہقی
- ۹ ڈاکٹر گوہر نوشاہی
- ۱۰ ڈاکٹر سید شاہد اقبال

نما اقبال سے منسوب کچھ خطوط ایک مطالعہ  
میں پیش کی ایک نادر تصنیف  
بہارِ دانش گاہوں میں رد و تحقیق (آغاز سے ۹۹۰ تک)



## حرف آغاز

اردو ادب ۱۹۹۱ء کا یہ تیسرا شمارہ ہے۔ اس میں تین مقالے شامل ہیں۔ پہلا مقالہ علامہ اقبال سے منسوب کچھ خطوط کمال احمد صدیقی صاحب نے تحریر کیا ہے کمال احمد صاحب شاعر، نقاد اور محقق ہیں۔ ان کی تحقیقی صلاحیتوں کا اظہار غالباً پہلی بار اس وقت ہوا جب انھوں نے ”بیاض غالب“ کے نام سے کتاب شایع کی جس میں غالب کے نسخہ ”امروہہ“ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ خطوط جعلی ہے۔ زیر نظر مقالے میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ لمعہ حیدر آبادی کے نام اقبال کے خطوط جعلی ہیں۔ اس مقالے کی اشاعت سے بعض پیشانیوں پر بل پڑیں گے لیکن اس جعل سازی کا انکشاف کرنا محقق اور مدیر دونوں کی ذمہ داری ہے۔ مگر کوئی حقیقت ان دونوں کے سامنے آئے اور وہ کسی مصلحت سے اس کو چھپالیں تو اس سے بڑا اور کوئی جرم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقالہ شایع کیا جا رہا ہے۔

دوسرا مقالہ ڈاکٹر گوہر نوشا ہی کا ”مول چند منشی کی ایک نادر تحریر“ ہے۔ مول چند اپنے زمانے کے ایک ممتاز شاعر تھے مگر افسوس ہے کہ تاریخ ادب اردو نے ان کے ادبی کارناموں کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ کچھ دنوں سے ہمارے محققین نے ان کی طرف توجہ کی ہے اور ان پر کچھ تحقیقی مضامین شایع ہوئے ہیں لیکن ابھی تک منشی مرحوم شاہ نصیر دہلوی جیسے صف اول کے شاعر کے شاگرد اور شاہ عالم آفتاب سے متوسل تھے۔ ۱۸۳۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ عہد شاہجہانی میں توکل بیگ بن توکل بیگ حسینی نے شاہنامہ فردوسی کا تاریخ دلکشائے شمشیر خاں کے نام سے شاہنامہ فردوسی

کا خلاصہ کیا تھا۔ اس خلاصے کو شمیر خانی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ مول چند مرحوم نے اس خلاصے کا منظوم ترجمہ کیا جس کا ڈاکٹر نو شاہی نے تعارف کرایا ہے۔ میں نے مول چند منشی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ معلومات بھی گوہر نو شاہی صاحب کی فراہم کردہ ہیں۔

بہار کی یونیورسٹیوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے جو مقالے منظور ہو چکے ہیں شاہد اقبال صاحب نے ان کی فہرست اس طرح مرتب کردی ہے کہ اس میں مقالوں کے موضوعات، مقالہ نگاروں اور نگراں حضرات کے نام مل رہے ہیں۔ مقالہ نگار کو کس سن میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔ تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ فہرست بہت اہم ہے۔

خلیق انجم  
اڈیسر

## علامہ اقبال سے منسوب کچھ خطوط ایک مطالعہ

شاعر (مجہدی)، کے شاندار اقبال نمبر جلد اول (۱۹۸۸) میں اکبر رحمانی کے مرتب کیے ہوئے انتخاب کلام معہ حیدر آبادی اور موصوف ہی کے مضمون "اقبال بنام معہ حیدر آبادی" سے ذہن کو جھٹکا لگا تھا۔ ۸ جولائی کے ہماری زبان میں موصوف کا مضمون "عکسی مکتوب اقبال بنام معہ حیدر آبادی کا تنقیدی جائزہ" پڑھنے کے بعد مندرجہ صدر عنوانوں کے تحت پھینے والے دونوں مضامین کی طرف دھیان گیا۔ ماسٹر آخر کی معرکہ الاراقہ تصنیف "اقبال کے کرم فرما" کی طرف بھی دھیان گیا، جس میں انھوں نے بڑی عرق ریزی سے چھان بین کی ہے۔ اور دیدہ ویدی کا ثبوت دیا ہے۔

ہماری زبان کے ایڈیٹر، ڈاکٹر خلیق انجم خطوط کے متن اور عکس کی اہمیت سے واقف ہیں انھوں نے غالب کے خطوط "مرتب کیے ہیں۔ تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے بنیادی نسخوں کے متون کے ساتھ ساتھ دوسرے نسخوں میں پاسے جانے والے اختلاف نسخ کی نشاندہی کی ہے۔ اور جن خطوں کے عکس فراہم ہیں، وہ بھی اس تالیف میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ مصنف کے قلم سے لکھی ہوئی عبارت سے بڑھ کر، کوئی اور عبارت مستند نہیں ہوتی۔ ہماری زبان میں اقبال کے عکسی مکتوب کا ذکر ہے۔ عکسی مکتوب کی ترکیب میری ناقص رائے میں نادرست ہے۔۔۔ لیکن میں ساقی پہلو پر گفتگو نہیں کروں گا، اقبال کے خط کا عکس اگر موضوع ہے تو مضمون کے شروع میں یہ عکس دیا جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے بجائے، چوکھٹے میں "اصل خط کا متن" دیا گیا ہے۔ خط کا عکس دیکھ جانے میں نہ کوئی قباحت تھی، اور نہ کوئی موانع تھے۔ بلکہ اردو کاتب کو انگریزی میں سرنامہ، بھونڈے سے خط

میں لکھنے کی زحمت نہ کرنا پڑتی۔ لکھنے کے زمانے میں بھی ایسے اہم موضوع پر ہلاک کے چر بے دیے جاتے تھے۔ اب تو فوٹو آفٹ کا دور ہے۔

اقبال کے اس خط کا عکس شاعر اقبال نمبر میں ص ۵۱ پر ہے۔ اس میں نیچے کے دائیں گوشے میں بخط غیر، لکھا ہے،

(نوٹ،

”حضرت اقبال کا گرامی نامہ

ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے نام“

ہماری زبان میں پروفیسر اکبر رحمانی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اقبال کے اس خط کے مکتوب الیہ واقعی لمعہ ہی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی اور ماسٹر اختر نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے، وہ بلاوجہ ہے۔ اکبر رحمانی لکھتے ہیں،

آج تک کسی محقق نے مکتوب الیہ کا نام نہ ہونے کی بنیاد پر کسی مکتوب اقبال کو مشتبہ نہیں قرار دیا ہے۔ یہ نئی تحقیق صرف عبدالقادر دسنوی اور ماسٹر اختر ہی نے دنیا سے اقبالیات میں پیش کی ہے۔ کمال یہ ہے کہ انھوں نے اقبال نامہ کے عکسی مکتوب میں درج نوٹ کو بھی شعوری طور پر نظر انداز کر دیا، جب کہ مولف اقبال نامہ نے اس نوٹ میں واضح طور پر تحریر کیا ہے: ”حضرت اقبال کا گرامی نامہ ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے نام اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خط لمعہ ہی کے نام ہے۔ پھر یہ مذکورہ بالا مکتوب اقبال نامہ اول میں اس مقام پر شائع ہوا ہے۔ جہاں مکاتیب اقبال بنام لمعہ شائع ہوئے ہیں۔ مزید اس کے مقابل صفحہ پر نقل کردہ متن ہے۔

محولہ بالا عکسی مکتوب اقبال کے لمعہ حیدر آبادی کے نام ہونے کی تائید درج ذیل تاریخی

ثبوت سے ہوتی ہے،

(۱) راقم الحروف کو اصل خط لمعہ کے ورثے دستیاب ہوا ہے۔ اقبال نامہ کے عکسی مکتوب، اور اصل خط میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خط کے آخر میں ”دائیں گوشے میں وہی نوٹ درج ہے، جو عکسی مکتوب میں ہے۔ اس خط کے لمعہ کے نام ہونے کا مزید



ثبوت اس لفافے سے ملتا ہے، جس میں یہ خط لمعہ کو بھیجا گیا تھا۔ اس لفافے پر انگریزی میں لمعہ کا درجہ ذیل پتہ تحریر ہے، اور یہ انگریزی تحریر بھی علامہ اقبال ہی کی ہے۔

لفافے کا ڈاک ٹکٹ کسی شوقین نے نکال لیا ہے۔ اس سے پتہ نہیں چل سکا کہ یہ خط لاہور کے ڈاک خانے سے کب روانہ ہوا۔ لفافے کی پشت پر خط کی تاریخ ۱۴ جون ۱۹۳۲ء وقت صبح آٹھ بجے درج ہے۔ اور دوسری مہر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط اسی تاریخ کو یعنی ۱۶ جون ۱۹۳۲ء کو ٹوٹا ہوا پورہ پہنچا۔ . . .

اکبر رحمانی کے بیان کو رد، یا نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ مثبت نہیں، منفی بات ہے۔ اکبر رحمانی کے بیان کو نہ مصدق سمجھا جاسکتا ہے، اور نہ قبول کیا جاسکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اقبال کا زیر گفتگو خط ان معنوں میں مشتبہ ہے کہ ہے تو اقبال کی تحریر، لیکن مکتوب لہ کے بارے میں شکوک کا اظہار یک گیلٹ ہے۔ اور اکبر رحمانی نے جو ثبوت فراہم کیا ہے، اس نے شکوک کم کرنے کے بجائے، ان میں اضافہ کیا ہے۔ موصوف نے متنازع فیہ خط کے سلسلے میں اپنے موقف کی تائید میں یہ دستاویزی ثبوت پیش نہیں کیے۔ جو پیش کیے جانا چاہیے تھے کہ ان کے بغیر ان کے کسوٹی نہیں بن سکتے؛

۔ اقبال کے خط کا جو عکس شائع ہوا ہے، وہ براہ راست خط کے بلاک سے نہیں چھاپا ہے خط کے فوٹو گراف سے بلاک تیار کیا گیا تھا جو اقبال نامہ میں شائع ہوا۔ ہو سکتا ہے یہ بلاک فوٹو گراف پرنٹ کے فوٹو گراف سے تیار کیا گیا ہو۔ شاعر میں جو عکس ہے، وہ شارپ نہیں ہے۔ یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال نامہ میں بلاک جس پرنٹ سے بنا، اس میں کوئی قلع و بریدہ حروف کا کام میں نہیں لائی گئی تھی۔

اکبر رحمانی نے اعتراف کیا ہے کہ اصل خط ان کو لمعہ کے دستاویز سے دستیاب ہوا۔ انہیں حق ہے کہ وہ اس خط کو اپنے ذخیرے میں رکھیں۔ لیکن انہیں اپنے ذخیرے کے بارے میں معذرت فراہم

کرنا چاہتے تھیں۔

اقبال کی ولادت کا صدر لڑیشن اتنے بڑے پیمانے پر ایک سال نہیں، سند ولادت میں اختلاف کی وجہ سے کئی برس منایا گیا۔ ہندوستان میں بھی، وہ پاکستان میں بھی۔ کہا اس نادر اور قیمتی دستاویز کو ہوائے دی گئی؟ یہ خط نامش کے لیے کہیں رکھا گیا؟ اس کا جواب اگر نفی میں ہے، اور یقین نفی میں ہے۔ تو اس کی وجہ؟

۲۔ اکبر رحمانی کو اس بات پر اصرار ہے کہ لفافے پر انگریزی میں پتہ خود اقبال نے لکھا ہے۔ لیکن ٹکٹ کسی شوقین نے لگا دیا۔ (اتفاقات میں زمانے کے، لفافے کا عکس پھر بھی پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ اس لفافے کو بھی خط کے ساتھ کسی نمائندگی کی زینت ہونا چاہیے تھا۔

اگر محمد عباس علی خاں لعل نے ڈاکٹری پاس کر لی تھی، تو پتہ یہ ان کے نام سے پہلے ڈاکٹر کیوں نہیں ہے۔ شاعر کے ص ۱۷۰ پر اکبر رحمانی کے نام لعل کے دو خطوں کے عکس ہیں۔ یہاں ہر سہ یہ عکس اکبر رحمانی نے فراہم کیے ہوں گے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء کے خط میں مکتوب نگار نے فطریہ حتم کیا ہے۔ "خاکسار ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لعل۔"

شاعر ہی میں اکبر رحمانی نے لعل کے نام لاہور سے لکھ ہوا۔ پہلی فروری ۱۹۳۱ء اقبال کا خلیہ نقل کیا ہے۔ جو ص ۱۷۳ پر ہے۔ اس کی عبارت اقبال سے منسوب کرنے کے لیے اقبال کو اردو ادب و عربی سے نا بلند تسلیم کرنا ہوگا۔ ایسی جرات اکبر رحمانی کی نہیں کے علماء اور فاضل کر سکتے ہیں کسی قدر تفصیل سے گفتگو آگے آئے گی۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ مکتوب ایہ کو اس طرح مخاطب کر لیا گیا ہے۔

"مائی ڈیر ڈاکٹر عباس علی خاں"

کام "مائی ڈیر لعل یا مائی ڈیر عباس یا مائی ڈیر عباس علی خاں سے بھی چل سکتا تھا۔ لیکن یہاں ڈاکٹر موجود ہے۔ اور پتے میں، جہاں ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا، نہیں ہے۔

خطوں کے عکس ۱۰ اور لفافوں کے عکس پیش کرنے سے اس درجہ احتیاذ کیوں؟ کس بات کی پردہ داری مقصود ہے؟

اکبر رحمانی نے ایک اور استدلال پیش کیا ہے۔

(۳) دوسرا اہم اور ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ خود بالخط میں قرآن شریف کے جس

تھے کا ذکر ہے، وہ آج بھی علامہ اقبال میوزیم مایور میں محفوظ ہے۔ پہلے یہ جاوید منزل  
تھی، جہاں علامہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔ اس میوزیم میں علامہ  
سے متعلق تمام اشیاء جن میں ان کی ڈگریاں، سندیں، خطوط، لباس، تصاویر، کتابیں  
غریبچہ وغیرہ محفوظ ہیں۔ رقم کو گزشتہ سال مئی جون ۱۹۸۹ء ۱۰ پٹے دور پاکستان  
کے وقت یہ میوزیم دیکھنے کا موقع ملا۔ میرے ہمراہ پروفیسر ظفر جی زی، ریکچر، گورنمنٹ  
کالج سمندری فیصل آباد، تھے۔ اس میوزیم میں علامہ کی خوب گاہ ہیں، مسہری کے  
قریب ایک آبنو کی اساری ہے، جس میں وہ منتخب کتابیں ہیں، جو اکثر علامہ کے  
نہایت مطالعہ رستی تھیں۔ انہی میں قرآن کریم کا وہ تحفہ بھی ہے جسے معائنہ صدر کی  
خدمت میں بھیجا تھا۔ اس قیمتی تحفے کے بارے میں میوزیم کے کمپلگ میں درج دیں  
تفصیل ضرور ہے۔

V-5 HOLY QURAN  
AN ILLUMINATED COPY  
PRESENTED TO ALLAMA IQBAL  
BY MR. ABBAS ALI KHAN IN 1932

غیر ضروری تفصیل جس کا موضوع حاضر کے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اکبر  
رحمانی نے درج کی ہے، حذف کی گئی ہے: کہاں،  
قرآن کریم کا یہ نسخہ کس قدر قیمتی تھا، اس کا اندازہ شیخ عطا اللہ کے بیان سے ہوتا ہے۔  
وہ فرماتے ہیں:

یہ نسخہ ڈاکٹر لغتہ کو نورانا محمد علی مرحوم سے ملا تھا۔ اور ایک بلند تاریخی قدر و منزلت  
کا حامل تھا۔ کیونکہ حضرت ورنگ نیرب عالمگیر کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا  
اقبال کی نظر میں یہ تحفہ کس قدر محبوب ہو گا۔ اس کا اندازہ اہل دل ہی کر سکتے ہیں جہنمت  
عالمگیر کو اقبال نے

چوں براہیم اندریں بت خانہ بود

کہہ کر یاد فرمایا تھا، روحاں کی میں حوالہ، دیباچہ قبل نامداؤں صفحہ ۱۰، بندہ ہرستدال منطقی



معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا ہے نہیں۔ شیخ عطار اللہ اقبال کے بڑے بھائی تھے۔ محقق نہ تھے۔ اقبال کے خطوط جمع کرنے میں انھیں جذباتی دلچسپی تھی، اور انھوں نے اس سلسلے میں اہم کام کیا۔ سر عبدالقادر ایڈیٹر مخزن کی سرپرستی میں ادارہ اقبال قائم کیا گیا تھا۔ ادارے کے صدر میر کبر علی خاں اور نائب صدر عباس علی خاں ملے تھے۔ شیخ عطار اللہ اس کے سرگرم رکن تھے۔ وہ خطوط جمع کرنے کے لیے حیدرآباد بھی گئے، اور وہیں لمعے سے ملاقات ہوئی۔ لمعے نے خطوط جمع کرنے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اقبال نامہ کے دیباچے میں شیخ عطار اللہ نے لکھا ہے کہ لمعے نے نہ صرف مکاتیب اقبال کا ایک گراں قدر مجموعہ مرتب فرمایا، بلکہ دوسروں سے مکاتیب حاصل کرنے میں تعاون کیا۔

لمعے نے اپنے نام اقبال کے ساتھ خطوں کی نقلیں شیخ عطا محمد کو دی تھیں۔ اس میں سے آیتیں خط اقبال نامہ میں شامل کیے گئے۔ جب اہل علم وراقبایات کے ماہروں نے ان خطوں کی بلیو فیکل تفصیلات کا مطالعہ کیا، تو تضاد پائے، اور یہ خطوط، جو لمعے کے نام میں مشتبہ جعلی اور وضعی قرار پائے۔ مزید بحث خط لمعے کے نام لکھا گیا تھا۔ اس بات کا تشفی بخش ثبوت فراہم نہیں ہے۔ یہ خط کس کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ بات ابھی تک عقدہ ہے۔

اقبال کے کرم فرما میں ص ۱۵۰، ۱۵۱ پر ماسٹر اختر نے اقبال ریویو، جنوری ۱۹۷۲ء ص ۱۶۷ کے حوالے سے عبدالواحد معینی کا یہ اقتباس دیا ہے :

”لمعہ صاحب کے نام، علامہ کے خطوط، بیشتر جعلی ہیں، اور خود عطار اللہ صاحب کذا، اس کے معترف تھے۔“

ماسٹر اختر نے اقبال کا فکر و فن (ص ۱۵۱) کے حوالے سے اس موضوع پر ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی تحریر کا اقتباس بھی دیا ہے :

”مؤلف شیخ عطا محمد نے اصل خطوط نہیں دیکھے۔ حیدرآبادی صاحب (لمعہ) نے خود نقل کر کے بھیج دیے، اور اسی طرح شائع کر دیے گئے۔“

لمعہ کا انتقال ۱۹۷۷ء میں ہوا۔ اقبال نامہ کا پہلا حصہ ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ برصغیر سیاسی اقلیتوں میں تھا۔ تقسیم و فسادات کی قیامتیں گزریں۔ لیکن ان کے باوجود ان خطوں کا بڑی توجہ اور ہار یک بینی سے مطالعہ کیا گیا۔ اور لمعہ کے نام خط اقبال وضعی قرار



پائے۔ لمعہ کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اپنے نام پر لگا ہوا یہ کلنک دھوتے، اور اپنی صفائی میں ان خطوں کی نمائش کرتے۔ اور ان خطوں کے عکس شائع کرتے۔ وہ مدعی تھے۔ لیکن انھوں نے خاموش رہ کر اقبال مجرم کاروں ادا کیا۔ ان کی خاموشی ان کے ادبی جعل کے اعتراف کا ثبوت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اکبر رحمانی لمعہ کی طرف سے بڑی جہتی کے ساتھ گواہی بھی دے رہے ہیں، اور سرگرمی سے وکالت بھی کر رہے ہیں۔

رحمانی نے اقبال میوزیم کی غیر ضروری تفصیلات دی ہیں۔ شاید موصوف پر و فیسراور لکچرار کے فرق سے بھی واقف نہیں۔ اس مضمون پر مصنف کی حیثیت سے ان کے نام سے پہلے پر و فیسراور مرقوم ہے۔ اور اقبال میوزیم میں ان کے ہمراہ پر و فیسراور حجازی د لکچرار گورنمنٹ کالج سمندری فیصل آباد تھے۔ غیر ضروری تفصیل اس وقت دی جاتی ہے، جب اہم اور ضروری معلومات کا فقدان ہو۔ جب لمعہ کے نام اقبال کے خطوط وضعی قرار پائے۔ اور جو خط واقعی اقبال کی تحریر ہے، اس کا لمعہ کے نام لکھا جانا یقینی نہیں۔ دوسروں کے نام اقبال کے جو خطوط انھوں نے جمع کیے تھے۔ انھی میں سے ایک کا مکتوب ایہ خود کو بتایا۔ اور چون کہ شیخ عطا محمد نے لمعہ پر اعتماد کر کے خطوط کو اقبال نامہ میں شامل کر لیا تھا، اس لیے اسی کی بنیاد پر کلام پاک کے اس نسخے کا الحاق میوزیم میں ہوا تو لمعہ کا نام بھی کٹیلاگ میں درج کیا۔ تھوڑے یا زیادہ عرصے کے لیے نادرست انتسابات بھی ہو جاتے ہیں۔ اقبال میوزیم کوئی استثنیٰ نہیں۔ لات، منات، عزتی جیسی دیویوں کو وسیدہ بنانے کی شیطانی آیات جب آیات ربانی کا درجہ پا گئیں۔ اور بعد میں منسوخ کی گئیں، تو اقبال میوزیم کے کٹیلاگ میں یہ اندراج کیا حقیقت رکھتا ہے، جس بنیاد پر یہ اندراج ہوا ہے، جب وہی معرض نزاع میں ہو تو، اسے ثبوت کے طور پر پیش کرنا اعلیٰ معیار کی وکالت یقیناً نہیں۔

لمعہ کے نام اقبال کے وضعی خطوں کے بارے میں جو واقع کا ماسٹراکٹر اور ڈاکٹر عبد القوی دستوی نے کیا ہے۔ اس میں اضافے کی گنجائش ہے۔ ان خطوط کے متن کا اور گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ماسٹراکٹر نے فرداً فرداً ہر خط کا جائزہ لیا ہے۔ کچھ اور ابھی ایسے نکات ہیں، جن پر غور کیا جانا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر تیسرا خط، جو انگریزی سے ترجمہ بتایا گیا ہے۔ ترجمہ کا متن یہ ہے: "اقبال نامہ فراہم نہیں ہے۔ متن ماسٹراکٹر کی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے،"

لاہور

۲۰ مئی ۱۹۳۰ء

مائی ڈیر عباس علی خاں

آپ کا نوازش نامہ ابھی ابھی موصول ہوا جس کے بے نمون ہوں۔ میں نے آپ کی کتاب جو آپ نے مجھے تحفہ بھیجی، مطالعہ نہیں کی۔ لیکن میں اسے نہایت خوشی سے پڑھوں گا۔ اور امید ہے اس سے منفعت بھی حاصل کروں گا۔ آپ کے والد بزرگوار کے انتقال کی اطلاع سے قلق ہو۔ جسے آپ بچہ کہتے ہیں اس کے پیرد ایک بہت بڑی کائنات کا ہتمام ہے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ اپنے ذہن کی نوعیت سے کما حقہ گاہ ہے۔

RECEIVED

RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM

پر میرے پھر شائع ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کا امریکن دوست زمانہ حال کے اسد سے دلچسپی رکھتا ہے، تو اسے ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مبارک علی، تاجر کتب، لاہور سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

مخلص خدایاں

ماسٹر اختر کا خیال ہے:

"اس تحریر کو انگریزی خط کا ترجمہ بتایا گیا ہے۔ اس لیے القاب و آداب اور زبان و بیان پر توجہ دینے کا کوئی مطلب نہیں۔ متن کے اعتبار سے بھی اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اس لیے اس تحریر کو عداۃ اقبال کے خط کا ترجمہ نہ ماننا آسان نہیں۔"

قطع نظر اس کے کہ اقبال کے خط کی اہمیت ان کے الفاظ اور ان کی تحریر کی وجہ سے ہے۔ شیخ عطا محمد اپنے برادرِ خرد کے سلسلے میں جذباتی تھے۔ اصول اور ترجمہ کی قدر و قیمت میں جو فرق ہوتا ہے، اس سے واقف نہیں تھے۔ اس لیے وہ لغت کے دام میں آ گئے، اور انھوں نے یہ ترجمہ اقبال نامہ میں شامل کر لیا۔ انگریزی میں کوئی ایسا فقرہ نہیں ہے جس کا ترجمہ "والد بزرگوار" ہو۔ یہی بات "وہ اپنے ذہن کی نوعیت سے کما حقہ آگاہ ہے" کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ یہ کہہ کر بھی پیچھا نہیں پھوٹ سکتا کہ ترجمہ کی

غلطی ہے، کیوں کہ کتاب کا نام انگریزی میں لکھا ہے — اس لیے نام غلط ہے۔ اقبال اپنی کتاب کا نام غلط نہیں لکھ سکتے تھے۔ لمعہ جیسا کہ استعداد شخص ہی THOUGHTS جمع کے صیغہ میں لکھ سکتا تھا۔ اور پھر کتاب کا نام THE سے شروع ہوتا ہے۔ کتاب کا نام ہے :

THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN SLAM

اگر کتاب کا نام انگریزی حروف میں نہیں لکھا گیا ہوتا، تو اسے مترجم کی غلطی ماننے میں کوئی قیادت نہیں ملتی، یہ انگریزی میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے مبینہ انگریزی خط سے نقل کیا جانا ناگوار کیا گیا ہے۔ مبینہ خط، جس میں کتاب کا نام غلط ہو، اقبال کے قلم سے نہیں ہو سکتا۔ شیخ عطاء محمد کی زندگی کا بڑا حصہ نقوش اور منڈروں میں گزرا تھا۔ اقبال نامہ کو انھوں نے ادبی دستاویز کے بجائے MANUAL زیادہ سمجھا۔ جب ذہنی تربیت اور رویہ سب سے کم رقم کا ٹنڈر منظور کرنے کا ہو، تو دستاویز کے اسناد کی طرف دھیان ہی نہ جانا قدرتی ہے۔ اور نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ حیدر آباد گئے بھی، اور لمعہ کی فراہم کی ہوئی خطوں کی نقلوں کو اصل سے ملانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ انگریزی کا وہ خط بھی نہ دیکھنا چاہا، جس کا یہ ترجمہ ہے !

شیخ عطاء محمد سابق سب ڈپویشنل آفیسر، ملٹری ورکس نے لمعہ کے نام مبینہ خطوں کو اقبال نامہ میں شامل کرنے سے پہلے معمولی سی احتیاطیں بھی نہیں برتیں۔ ماسٹر اختر کی کتاب اقبال کے کرم فرما سے دوسرا خط، اور اس پر تبصرہ نقل کیا جاتا ہے :

جناب من ڈاکٹر لمعہ

السلام علیکم۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔ فی الحال اصلاح اشعار سے معاف فرمائیے کہ فرصت بالکل نہیں ہے۔ کسی فرصت کے وقت دیکھوں گا۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص محمد اقبال لاہور

۱۹۲۹ء

یہ خط دو خاص وجوہات کی بنا پر قابل بھروسہ نہیں ہے۔ اول تو یوں کہ اس خط میں لمعہ کو ڈاکٹر لمعہ کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے، جو غلط ہے۔ کیوں کہ لمعہ اس وقت ڈاکٹر



نہیں تھے۔ اکبر رحمانی صاحب کی زبانی منع فرماتے ہیں رجوالہ تحقیقات و تاثرات،  
”اقبال سے میری ملاقات جنوری یا فروری ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔“

اس وقت میں انٹرنس کا طالب علم تھا۔“

کسی مزید تبصرے کی گنجائش نہیں، سو اس کے کہہ سکتا ہے اقبال نے یہ خط کسی اور کو لکھا ہو، جو  
اقبال سے اصلاح لینے کا معنی ہو۔ منع نے جو خط اکٹھا کیے۔ ان میں یہ خط بھی ہو۔ اور انھوں نے  
خود کو، اس نقل میں مخاطب قرار دیا، جو عطا محمد کو دی گئی۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو یہ خط وضعی اور جعلی ہے۔  
چوتھا خط شاعر میں ص ۲۷۳ پر نقل ہوا ہے،

”لاہور“

یکم فروری ۱۹۳۱ء

مائی ڈیر ڈاکٹر عباس علی خاں

نوازش نامہ، اور اس کے ملفوظات کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ مگر محمد علی کا خاتمہ  
بغیر ہوا۔ اگرچہ ان کی سیاست کا کبھی مداح نہ تھا، لیکن ان کی اسلامی سادگی، اور آخری  
سالوں میں اپنی بعض آراء کے بدل لینے میں، جس امانت و دیانت کا انھوں نے ثبوت  
دیا۔ بہت احترام کرتا ہوں۔ اپنے متعلق ان کی پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی ہے،  
اور اس سے بھی قوم میں ان کا وقار بڑھ گیا ہے۔ مسجد اقصیٰ میں آخری آرام گاہ کا میسٹر  
آنا، ان کی خوش نصیبی ہے، جس سے ان کا رتبہ بلند تر ہو گیا ہے۔

اب تو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے ان کا رتبہ نہایت ارفع ہو چکا ہے۔  
اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

امید ہے آپ آج کل سیاست سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے ہوں گے۔

مخلص

محمد اقبال

۱۔ شاعر میں یہ لفظ ملفوظات ہی ہے۔ ماسٹر اختر نے اپنی کتاب میں ص ۴۰ پر ملفوظات نقل کیے ہیں۔  
۲۔ شاعر کی نقل میں جہاں ہیں ختم ہوتا ہے، لیکن ماسٹر اختر کی کتاب میں ہوئی کے بعد سے بھی لکھا ہے۔ رکھا آ،



ماسٹر اختر نے اس انٹرویو کے حوالے سے جو لمحہ نے اکبر رحمانی کو دیا تھا، لمحہ کا سنہ ولادت ۱۹۱۱ء بتایا ہے۔ یہ جو شخص ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوا ہو، اور ۱۹۲۹ء میں، یعنی اٹھارہ برس کی عمر میں میٹرک میں ہو، اس کی ذہنی استعداد کے بارے میں کچھ کہنا ضروری نہیں۔ ۱۹۲۹ء ہی میں انھوں نے میٹرک کرنے کے بعد بمبئی میڈیکل کالج میں ڈپلومہ کورس میں داخلہ لیا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی کالج چھوڑ دیا یا وہاں سے خارج کر دیے گئے۔ اور یہ اطلاع اُس بیان پر مبنی ہے، جو لمحہ نے معین کو دیا تھا۔ جب لمحہ نے ۱۹۲۹ء ہی میں میڈیکل کالج چھوڑ دیا تھا تو اس خط میں وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے کیوں مخاطب ہیں؟ یہ تو ۱۹۳۱ء کا خط ہے کیا لمحہ اپنے بارے میں اقبال کو دھوکا دیتے رہے؟ جس شخص کا کردار یہ ہو، اس کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی کوئی دستاویز، اس وقت تک قابل قبول نہیں ہو سکتی، جب تک اصل سے اسے ملایا نہ جائے۔ حیرت ہے کہ اقبال کے برادر اکبر نے اپنے مرحوم بھائی کی محبت کے جوش میں تحریر غیر کو بھائی کی تحریر سمجھ لیا۔ اور پسکھے بغیر اسے اقبال نامہ میں شامل کر لیا۔

خط کا پہلا جملہ ہی بے معنی ہے۔ اقبال تریل کے فن کے ماہر تھے۔ نشر میں بھی اور نظم میں بھی۔ ”نوازش نامہ اور اس کے ملفوظات / ملفوفات کے لیے سراپا سپاس ہوں“ اقبال کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر نہیں ہو سکتی۔ ملفوفات کی غراہت اور مضحکہ خیزی، پٹھانوں اور دیہی بھائیوں میں روزانہ چل یار پٹ کی زبان ہے۔ ”ملفوفات کے لیے فدی سراپا سپاس ہے۔“ بھی اقبال سے لکھو یا جا سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں نہیں لکھوایا گیا۔ لیکن ہم ماسٹر اختر کی کتاب کو نظر انداز کر سکتے ہیں، چاہے یہ لفظ اقبال نامہ ہی میں کیوں نہ واقع ہوا ہو، کیوں کہ اقبال نامہ ثانوی ماخذ ہے۔ جہاں تک اقبال کے خطوط بنام لمحہ کا تعلق ہے۔ غلطی دو جگہوں پر ہو سکتی ہے۔ لمحہ سے نقل کرنے میں غلطی ہو سکتی تھی۔ اقبال نامہ کے کاتب سے غلطی ہو سکتی تھی۔ اکبر رحمانی کا دعوٰی ہے کہ انھیں لمحہ سے قریب حاصل تھا۔ لمحہ نے اپنی ادبی تخلیقات کے علاوہ کچھ اصل خطوط بھی ان کے حوالے کر دیے تھے۔ اور نقلیں تو بہر حال ان کے دسترس میں تھیں۔ اس لیے ملفوظات کو ترجیح دینی چاہیے۔ لفظے میں نوازش نامہ کے ساتھ ملفوظات تو بھیجے جا سکتے تھے لیکن اقبال نے یہ بات نہیں لکھی ہے۔ اقبال یقیناً

لعوفات کے معنی سے واقف تھے۔ لمعہ بیس برس کی عمر میں کسی ایسے روحانی مرتبے پر فائز تھے نہیں کہ ان کے نوازش نامے کے مندرجہ تہ کو اقبال سفوفات کا درجہ دیتے۔ یہ قطعاً جعلی خط ہے۔ یا یہ حملہ الحاقی ہے۔

لمعہ نے ابھی دو برس پہلے میٹرک کا اعلیٰ امتحان پاس کیا تھا۔ اب پرچہ ان کی نظر تھی، وہ تو ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ سیاست پر، ان کو کتنا مجبور ہو سکتا تھا۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غلو قیاس کر لیں۔ تب بھی محمد علی کی وفات پر اقبال کا ان سے تبادلہ خیال کرنا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ سر اکبر حیدری کو تو یہ خط لکھا جاسکتا تھا۔ سر اس مسعود کو بھی ایسا خط لکھا جاسکتا تھا۔ لیکن لمعہ کو؟ لمعہ کون سے ایسے دانشور اور سیاسی رہنما تھے کہ اقبال یہ ایسا کرتے کہ یہ صوف اپنے آپ کو سیاست سے بچائے ہوئے ہوں گے۔ ۱۹۳۱ء کو اقبال کا وہ زمانہ ہے، جب وہ بڑی سرگرمی سے سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔

امیر خسرو اور حسن بخاری کے تعلقات کے بارے میں ایک ناقابل شاعت قصہ بھی ہے۔ اور اس کا ذکر، تردید کے ساتھ، شبلی اور ڈاکٹر وحید منیر دونوں نے کیا ہے۔ لمعہ کے نام اقبال کے خطوط سے کچھ ایسا ہی تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ شاید شعوری طور پر۔ خسرو اور حسن، ہم عمر تھے۔ اقبال اور لمعہ میں کئی پیرچھوں کا فرق تھا۔ روایت ہے کہ حسن کو شاید پشاور میں کوڑے لگوائے گئے، نشان خسرو کے ہاتھ پر پڑے، گرچہ وہ وہاں موجود نہ تھے۔ لمعہ کے جعل کو برہنہ کر کے، جو کوڑے سفوف کے لگائے جا رہے ہیں، ان سے اقبال کی سیرت و جو وضعی خطوں کی وجہ سے داغدار ہوئی ہے، بعد از غ ہو جائے گی۔

خط ع ۷۱

لاہور

۱ ستمبر ۱۹۳۱ء

مالی ڈیر عباس علی خاں صاحب

ڈاکٹر کیو فورڈ مانشرٹ کی کتاب کے تحفے کے لیے دلی شکریہ قبول فرمائیے۔  
اس کتاب "عالمگیر انسانی برادری" BROTHERHOOD کی بہت ضرورت تھی۔  
نظم کے لیے بھی جو آپ نے بھیجی ہے اور جو میں نے بے حد پسند کی ہے،  
شکریہ قبول کیجیے۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

### مخلص ہمدان قبل

ماسٹر اختر نے ص ۲۲ پر زندہ رد و دص ۲۳) جاوید اقبال کا بیان شہادت میں پیش کیا ہے :  
اقبال کا ارادہ تھا کہ سفر یورپ کے لیے یکم ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور سے روانہ ہو کر ۵ ستمبر  
۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچیں گے۔۔۔۔۔ لیکن پروگرام ۵ ستمبر کا بنا، لاہور سے چلنے سے  
چند گھنٹے قبل اقبال کو بخار آگیا۔ اس لیے ۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کو روانگی ملتوی کرنا پڑی  
آخر کار ۸ ستمبر کو لاہور سے روانہ ہوئے۔

اس شہادت سے لغتہ کے نام یہ خط جعلی قرار پاتا ہے۔ چوں کہ اس خط کی نقل خود لغتہ نے عطا محمد کو فراہم  
کی تھی اس لیے دوسرے خط بھی اس وقت تک مستند تسلیم نہیں کیے جاسکتے۔ جب تک اقبال کے  
قلم کی تحریر پیش نہ کی جائے۔

یہ شہادت زندہ رد و دص فراہم نہ بھی ہوئی، تو بھی یہ خط جعلی ہی قرار دیا جاتا۔ اگر اقبال کو  
کتاب مذکور درکار ہوئی، اور وہ اس کی فراہمی کے لیے خط لکھتے تو کتاب کے نام کے ترجمے کے  
ساتھ انگریزی میں وضاحت کرتے۔ یہ بات کسی حد تک (صرف کسی حد تک) قابل قبول ہو سکتی تھی۔  
جب BROTHERHOOD انگریزی میں لکھ سکتے تھے، تو پورا نام انگریزی میں کیوں نہ لکھتے؟  
کتاب کی رسید اور شکریہ کے لیے "عالمگیر انسانی برادری" ترجمہ کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ  
خط چھپے تو اردو خواں سمجھ سکیں؟ یہ نجی خط تھا یا قارئین کے لیے وضع کیا جا رہا تھا؟ یہ اندرونی  
شہادت، جاوید اقبال کی شہادت سے زیادہ اہم ہے۔ اکبر رحمانی کو یقیناً یہ کتاب اقبال میوزیم  
میں نہیں ملی ہوگی، اور نہ کٹیدگ میں اندراج ہوگا کہ لغتہ حیدر آبادی یا عباس علی خاں نے تحفے  
میں علامہ کو بھیجی تھی! لیکن ہوں کہ موصوف اس خط کو جعلی یا وضعی نہیں سمجھتے، اس لیے انہیں  
استدلال پیش کرنے کی دھت دی جاتی ہے۔



اقبال کی طرف سے اپنے نام خط لکھنے کی تاریخ کا تعین لمتعہ نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ہوا یہ کہ اقبال ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو جولاہور سے روانہ ہوئے، تو بمبئی اُن کی آخری منزل نہیں، درمیان کی منزل تھی۔ انھیں دوسری گول میز کانفرنس میں شریک کے لیے لندن جانا تھا۔ ۱۰ ستمبر کو بمبئی پہنچے اور خلافت ہاؤس میں ٹھہرے۔ ان کے اعزاز میں عطیہ فیضی نے ایوانِ رفعت میں ایک عہرانہ دیا۔ حیدر الدین برنی نے اس پارٹی کی روداد لکھی۔ ان سے ایک غلطی ہو گئی۔ یہ عہرانہ لندن جاتے وقت دیا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے لکھا،

”گول میز کانفرنس سے لوٹتے وقت، علامہ موصوف نے بمبئی میں چند دن قیام فرمایا تھا۔ اس موقع پر محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے ان کے اعزاز میں اپنے تاریخی مکان ایوانِ رفعت میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔“

برنی نے جو روداد لکھی، وہ ۱۹۵۶ء میں، اقبال میں بھی شامل کی گئی۔ گول میز کانفرنس سے واپسی کی جو بات ہے، اس کا تدارک تاریخ سے ہو جاتا ہے کیوں کہ برنی نے ۱۰ ستمبر کی تاریخ دی ہے۔ اس فروگزاشت کا احساس انھیں بعد میں ہوا، لیکن اس وقت تک لمتعہ اپنے نام اقبال کا خط تحریر کر چکے تھے۔ اور عطا محمد اقبال نامہ میں اسے شائع کر چکے تھے، اور اکبر رحمانی قلم کی شمشیر برہنہ لے کر لمتعہ کی حمایت میں نہ صرف سینہ سپر ہو چکے تھے۔ بلکہ محققوں پر حملہ آور بھی ہو چکے تھے۔ عطیہ فیضی کی کتاب اقبال کے اردو ترجمہ میں بھی اس عہرانہ کا ذکر ہے۔ اس بنیاد پر لمتعہ نے ایک کہانی بھی بنائی، ۱۹۵۶ء میں اپنے کتاب اہام و حدیث اکبر رحمانی کو سنائی۔ وہ نہ صرف خود اس پر ایمان لے آئے، بلکہ یہ ایمان دوسروں پر لادنے کے لیے تحقیقات و تاثرات رص ۵۰ پر، یہ حدیث بیان کی ہے۔ لمتعہ کی زبان سے :

”عطیہ فیضی نے اپنے دولت کدہ ایوانِ رفعت میں اُن (اقبال) کے اعزاز میں ایک چائے پارٹی دی تھی۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس پارٹی میں شہر کے اکابرین اور فضلا شریک تھے۔ یہ پارٹی ایک حسین اور خوب صورت لان پر دی گئی تھی۔۔۔“



لان سے پھر حاضرین ہال میں پہنچے۔ وہاں رقص و سرود کا انتظام تھا اس محفلِ رقص و سرود میں علامہ اقبال کی موجودگی سے میرے دل کو بڑی تکلیف پہنچ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح اپنے جذبات کو علامہ تک پہنچاؤں کہ عطیہ فیضی میرے پاس آئیں۔ اور ایک کاغذ مجھ کو تھما دیا۔ جس پر ذیل کے اشعار درج تھے۔

ترسم کہ تو می رانی زورق بہر آب اندر  
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر  
برکشت و بیا باں پیچ بر کوہ بیا باں پیچ  
ہر تھے کہ بخود ہی سجد میرد بہ سحاب اندر  
ایں صوٹ دلا دینے از زخمہ مطرب نیست  
بہجو بہ جلال خورے نالہ بہر باب اندر

یہ اشعار اقبال نے تحریر کیے تھے۔ پڑھ کر فوری طور پر ایک شعر نے میرے ذہن میں جنم لیا، جسے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے، اس چٹ کو عطیہ فیضی کی طرف بڑھا دیا۔ اقبال نے وہ چٹ اقبال تک پہنچا دیا رکھا، اقبال کچھ دیر تک وہ شعر پڑھنے کے بعد گم سم رہے۔ آج بھی وہ شعر مجھے یاد ہے۔

از مطرب دینے معہ مارا پھر سرود کاریم  
با چشم جنوں دیدم مطرب بہر باب اندر

عطیہ بیگم سے انھوں نے دریافت کیا کہ لہجہ کہاں ہے۔ مجھے بلایا، اور بر محل و موزوں شعر کہنے پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ مجھے طاؤس در باب سے کبھی سرود کار نہیں رہا۔ مگر آج یہاں صرف میزبان کے جذبات کے احترام میں بیٹھا ہوں۔

ماشاء اللہ نے یہ نہایت معقول اور جائز نکتہ اٹھایا ہے :

۱۔ موصوف اپنا تخلص عام طور سے ہائے مفتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں، قاع / فعل کے وزن پر۔ یہاں ہائے ہوز کے ساتھ فعلن وزن پر لکھا ہے۔ (کمال)

عطیہ فیضی کی تحفل میں اول تو اٹھارہ سالہ طفل دبستان، لمعہ کی موجودگی ہی حیرت انگیز ہے، جہاں وقت کے بلند پایہ سیاست دانوں، دانشوروں، نوآبوں اور راجاؤں کا جم گھٹا تھا۔۔۔ اس مٹھکے خیز صورت حال کا اندازہ فرمائیے کہ ان سبکی موجودگی میں اقبال کو اپنے وقار کا خیال بھی نہ رہا۔ اور لمعہ سے پرچہ بازی کی سوجھی، اور اس پرچہ بازی کا ذریعہ کون بنا؟ بیگم عطیہ فیضی۔۔۔

انٹرنیٹ نے رحمانی اور لمعہ کے ساتھ بہت رعایت برتی ہے۔ اور ان کو ہلکا پھوڑا دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسر من گھڑت کہانی ہے۔ اور تحقیق طلب یہ امر ہے کہ اس کہانی کے مصنف لمعہ ہیں یا رحمانی۔ یہ عبارت ان وجوہ سے قابل قبول نہیں۔

۱۔ رحمانی اور لمعہ، دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اقبال سے لمعہ کی یہ دوسری ملاقات تھی۔

۲۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی ملاقات حیدرآباد میں ہونا بیان کیا گیا، جب عباس علی خاں (لمعہ)، میٹرک کے طالب علم تھے۔

۳۔ موصوف نے اسی سال میٹرک کا اعلیٰ امتحان پاس کرنے کے بعد بمبئی میں میٹرکس کے ڈپلومہ کورس میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن یہ گاڑی ایک ٹرم بھی نہ کھینچی۔ کوئی حرج نہیں لمعہ بمبئی میں کرتے کیا تھے؟ رحمانی ان کے سیرت نگار ہیں۔ وہ اس بارے میں خاموش ہیں، اور یہ بھی نہیں بتاتے کہ عطیہ فیضی اور ان کے مدد و ح کے درمیان قدر مشترک کیا تھی؟ اقبال نے موصوف کے نام کسی مبتدئہ خط میں عطیہ فیضی کا ذکر نہیں کیا۔ اور نہ عطیہ فیضی سے ان کا تعارف کرایا۔ اس خاتون سے موصوف کی ایسی یگانگت کیسے ہوئی کہ اقبال تو طفل میں انھیں پہچان نہ سکے، اور عطیہ پرچہ لے کر ان کے پاس سیدھی پہنچیں۔

۴۔ اور اب لمعہ کے بیان بقلم رحمانی میں وہ اندرونی شہادتیں، جو اسے جھوٹ کا پلندہ ثابت کرتی ہیں:

۱۔ اگر لمعہ پہلے پہنچے تھے تو — اور بعد میں پہنچے تو — اقبال سے جا کر نیاز مندانہ کیوں نہیں ملے؟

بے لعلہ یا رحمانی اگر ذرا اور ہمت کرتے، تو نیپکن پر شعر لکھ کر اقبال کو عطیہ فیضی کے ٹوٹ سے بھجاتے، وراقبال سرد ہٹنے کے بعد اپنے اشعار موزوں کرتے اسی وقت وہیں جب کہانی ہی لکھنا تھی، تو زیادہ پٹ پٹی لکھتے !

ج۔ معلوم نہیں یہ شعر کس سے موزوں کر یا گیا تھا اور کب؟ پہلے مصرع میں ”مارا چہ سرو کاہم“ جمع کے صیغے میں ہے، اور دوسرے مصرع میں ”باہشتم جنوں دہم“ واحد کے صیغے میں ہے۔ مگر چراقبال شاید پرتی میں دوسرے گون کے نہ تھے، اور لعلہ کے ساتھ خلوتِ خاص میں بھی نہ تھے۔ لیکن لعلہ کی تحریر دیکھ کر اور پھر لعلہ کا چہرہ زیادہ دیکھ کر اس حد تک ہوش و حواس کھو بیٹھے کہ فارسی بھول گئے، اور بر محل و موزوں شعر گربانی شعر کہنے پر مبارکباد دی !

د۔ ایک کاغذ تھے تھما دیا، جس پر ذیل کے اشعار درج تھے ”یہ بولی جانے والی نہیں، لکھی جانے والی زبان ہے۔ مندرجہ صدر اور مندرجہ ذیل کون بولتا ہے؟ میں تیس برس سے زیادہ الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ رہا ہوں۔ اہم ذمہ داریاں میرے سپرد رہی ہیں۔ اسٹاف ٹریننگ انٹی ٹیوٹ میں انفرادی لکچروں کے علاوہ قومی پیمانے پر پروڈیوسروں اور پروگرام اگزیکیوٹو ٹونز کے لیے ورکشاپ اور سیمی ناردوں کی ترتیب اور نگرانی بھی میرے فرائض میں شامل تھی۔ عطیہ یا صحیح، ابلاغ عامہ کی زبان کے سلسلے میں مجھے معتبر سمجھا گیا۔ اخباروں میں مضامین کے علاوہ ہفتہ وار اور روزانہ کالم بھی لکھنا رہا ہوں۔ مختلف ریڈیو سٹیوں میں فیلو یا مہمان استاد کی حیثیت سے ابلاغ عامہ سے متعلق مضامین بھی پڑھاتا رہا ہوں۔ لکھی جانے والی زبان اور بولی گئی عبارت کی زبان پہچاننے میں کسی کو بھی دشواری نہیں ہوتی، ہوا اس کے جو جعل کرتا ہے۔ ابلاغ عامہ کے پیشے میں جو رہا ہو وہ فوراً اسے پہچان لیتا ہے، اور جب اس کی نشاندہی کرتا ہے، تو لوگ بھی اس نکتے تک فوراً پہنچ جاتے ہیں۔ (ڈاکٹر ٹیٹ کے لیے میرا تحقیقی مقالہ بھی نر سیل کی زبان کے بارے میں تھا)



ذیل کے اشعار درج تھے۔ بولی جانے والی زبان نہیں ہے۔ اکبر رحمانی کا یہ بیان سراسر نادر مستحکم ہے کہ لقمہ نے کوئی انٹرویو دیا تھا۔ جو انہوں نے قلمبند کر لیا۔ اگر مسلمہ کذاب پیغمبر نہیں تھا تو اکبر رحمانی بھی حدیث لقمہ کے کاتب نہیں ہیں۔

اکبر رحمانی کو یہ اطلاع نہ تھی کہ ضیاء الدین احمد برنی سے جو غلطی ہو گئی تھی، وہ بعد میں انہوں نے درست کر دی تھی۔ اور ۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو یہ ماقبال پر جو مضمون انہوں نے انہیں اسلام ہائی اسکول بمبئی کے ہال میں پڑھا تھا، اس میں یہ درستی موجود ہے۔ یہ مضمون شاعر کے اقبال نمبر میں شامل ہے۔ ص ۵۳۸ - ۵۳۹ سے یہ عبارت نقل کی جاتی ہے :

گولی میز کا نفرنس کے لیے جانے وقت علامہ موصوف نے بمبئی میں چند دن قیام فرمایا تھا، اس موقع پر محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے ان کے اعزاز میں اپنے تاریخی مکان ایوانِ رفعت میں ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا تھا جس میں رخصت ساوہارا جگان کے علاوہ اسلامی حاکم کے قونصل اور مرزا علی اکبر خاں مرحوم جج ہائی کورٹ بمبئی، مولانا محمد عرفان مرحوم، ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی جیسے بہت سے فاضل حضرات بھی تشریف فرما تھے۔ اس وقت جب حاضرین سے ان کا تعارف کرایا جا رہا تھا، تو میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ان سے نہایت عقیدہ مند احترام سے مل رہے تھے حالانکہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے، جنہوں نے علامہ کا صرف نام ہی سنا تھا اور ان کے شاعرانہ کمالات سے مطلع واقف نہ تھے۔ مجمع نے علامہ موصوف سے درخواست کی، کہ وہ بذریعہ تقریر اپنے رشادات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں اور کوئی پیغام بھی عطا کریں۔ جواب میں علامہ نے انگریزی میں ایک مختصر تقریر کی، اور فرمایا کہ بطور انعام کے میں صرف ایک شعر پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ وہ شعر یہ ہے :

پناں بڑی کہ اگر مرگِ تست، مرگِ دوام

خدا ز کردہ خود شرمسار تر گزداد

... جب علامہ تقریر کر چکے تو دوست احباب نے انہیں گھیر لیا کہ اس شعر کا



انگریزی ترجمہ بھی کر دیا جائے۔ چنانچہ علامہ نے ان کی درخواست کو شرف پذیرائی بخشا، اور ذیل کا ترجمہ لکھوایا۔ فرماتے ہیں :

LIVE SO BEAUTIFULLY  
THAT IF DEATH IS THE END OF ALL  
GOD HIMSELF MAY BE PUT TO SHAME  
FOR HAVING ENDED THY CAREER

اس کے بعد چائے نوشی ہوئی، اور اقبال حاضرین سے خوش گیتیاں فرماتے رہے۔ جب چائے نوشی کا سلسلہ ختم ہو گیا تو ایوانِ رفعت کے ہال میں رقص و سرود کا انتظام کیا گیا۔ رقص و سرود کے دوران میں علامہ اقبال نے فی البدیہہ مہین اشعار قلم بند کر کے عطیہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کیے۔ وہ شعر یہ ہیں۔

ترسم کہ تو می رانی ز ورق بسراب اندر  
راوی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر  
بر کشت و خیاباں تیج، بر کوہ و سیاہاں پیچ  
بر تے کہ نہ تھو پیچد میرد، بساب اندر  
ایں صوبت دلاوینے از زخمہ مطرب نمیت  
ہجور جہاں تھر سے نالہد بر باب اندر

عہد اقبال در دولت کردہ عطیہ بیگم

بمبئی، ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

ضیاء الدین احمد برنی کے مضمون کے اس اقتباس سے متعجب و حیرت منی کے درود بخ ترکیبی کی ہیں اور کھلتی ہیں۔ سبزہ زار پر چائے نوشی ہوئی تھی۔ پھر لوگ اٹھ کر ہال میں گئے تھے، جہاں رقص و سرود کی محفل آراستہ کی گئی تھی۔

اور اس رقص و سرود کی محفل میں اقبال کی موجودگی سے متعجب کے دل کو بڑی تکلیف پہنچی تھی اور اسی کے دوران میں اقبال نے پرچہ پر تین شعر لکھ کر بدست عطیہ فیضی مدہ

کو بھجواتے تھے، اور جب لکھنے ”جواب آں اشعار بھجوا یا تو قبل نے میزبان خاتون  
سے پوچھا کہ لکھ کہاں ہے؟“  
آٹھواں خط

لاہور

۱۹۳۲ء اگست

مترجم ہندو ٹی اکٹر عباس علی خاں صاحب  
تسلیم آپ کا نوادش نامہ ابھی ملا۔ آپ کی طویل علالت کی خبر سن کر مجھے افسوس ہوا۔  
نارو کا مرض واقعی بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ صفائی کا خیال رکھیے یہ اپنی مقررہ  
مدت میں اچھا ہوتا ہے۔ خدا سے امید ہے، وہ جلد آپ کو شفا یاب فرمائے گا۔  
اتنی سخت علالت میں آپ کے مشاغل نہایت قابلِ مبرا کبار ہیں۔ اس سے  
معلوم ہوتا ہے کہ آپ عقل و حواس پر قابو پار ہے ہیں۔ تکلیف و خوف کا احساس  
آپ سے دور ہو رہا ہے۔ ماشاء اللہ۔ اس کا آپریشن نہ کرائیں، ورنہ پیر کا معاملہ ہے  
میں نے لاہور کے ایک حکیم صاحب سے دریافت کیا تھا۔ آپ پر علاج ضرور کیجیے۔ ۳ ماہ  
ہنگ کو پیانہ میں رکھ کر گرم کر لیجیے۔ اس کے بعد روزانہ کھا لیجیے۔ صرف تین دن استعمال  
کریں۔ تیل اور ترشٹی وغیرہ کا ہر مہینہ ہے۔

جس جگہ نارو ہے اس پر چنبیلی کے پھول روزانہ شرب میں باندھ لیں۔ الشاء اللہ جلد  
صحت یابی ہو جائے گی۔

آپ کی نارو والی نظم بہت دلچسپ ہے۔ باقی خیریت ہے۔ خدا حافظ۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

نارو سے متعلق نظم درج ذیل ہے۔ لکھ

یہ درد کیا ہے، تارِ محبت کا سلسلہ  
سوزش بھی اس کی سودِ محبت کی ہے زیاں

نارو کے درد کا بھی عطیہ ہمیں ملا  
سہ سوز اس میں آتشِ نمرود کا نہال

نارو کا تار عشق کی زندہ مشابہ ہے      ہا پیچیدگی میں اس کی قیامت کی پہاں ہے  
بچپن سے جو کہ آتش نمرود میں پیدا      خائف وہ درد سے کہیں نارو کے ہی ہوا

ڈاکٹر لکھنؤ

اقبال کے قلم سے اس نظم کے بارے میں دلچسپ کا لفظ لکھو یا گیا ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ  
یو ایمر وہ پہاں ہے خوشی ہو یا بادی، یا نارو یا سوزش اور جن دے اور اعراف کو اگر علیہ کہا جائے  
تو سوال پیدا ہوگا کہ کس کا علیہ؟ محبت کا لفظ خالص جسمانی اور میتزن معنوں کا حامل ہو سکتا  
ہے۔ تار نظر تو ہوتا ہے۔ دامن اور گریباں کا تار ہوتا ہے۔ قوام کا اور نہاری کا تار ہوتا ہے۔ یہ  
محبت کا تار کیا ہے۔ اور پھر تار نہیں، بلکہ تار کا سلسلہ زیادہ معنی تلاش کیے جائیں تو ذم کے پہلو  
نکلنے لگیں گے۔ اقبال سے اس نظم کو دلچسپ قرار دیا گیا ہے۔ اور سود محبت کی زیاں سوزش  
بھی ہے۔ پر تیز کو اقبال نے بے شک ایک جگہ تائیت کے صیغے میں نظم کیا ہے۔ لیکن زیاں کو  
تائیت کے صیغے میں اگر وہ دیکھتے تو یقیناً دلچسپ کہتے۔ لیکن یہ خط چوں کہ اقبال کے قلم سے نہیں  
ہے۔ اس لیے آگے گفتگو فضول ہوگی۔ پہلے محبت کا تار تھا۔ اب نارو کا تار آگیا۔ نارو کی بیماری میں  
بدن پر جہاں پھنسی ہوتی ہے۔ اس میں سے تار نکلتا ہے۔ جو کیرہ ہوتا ہے۔ تکلیف دہ بیماری  
ہے۔ اس کا ذکر ذوق سلیم پر بار ہے۔

آتش نمرود اقبال کے یہاں استعارہ ہے کہ اس سے گلزار خلیل کہتا ہے۔ آتش نمرود  
عشق کی آزمائش کا بھی استعارہ ہے۔ لیکن یہاں کچھ اور ہی بات ہے۔ تیسرے مصرعے میں آتش نمرود  
کی توصیف کا پہلو ہے۔ اور ساتویں مصرعے میں نہایت مبہم اور اپنے دین کو گانی نظم کی گئی ہے  
اس لیے بچپن سے آتش نمرود میں پلنے کا ذکر ہے۔

نہایت غیر معیاری زبان اور بیان کی خامیوں سے چھلکتی ہوئی نظم ہے۔ اس سے ملمع کی  
شاعر صلاحیت یا عدم صلاحیت واضح ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے پست معیار کی  
اسلوب اقبال کی پیروڈی کہہ سکتے ہیں۔

نظم کے آخر میں مصنف نے خود کو ڈاکٹر کے خطاب سے سرفراز فرمایا ہے۔  
اقبال کی طبیعت میں شوخی تھی، اور جب ان کی رگب نظر انت پھرکتی تھی، تو اکبر آبادی کے



رنگ میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ اُن کی شرام ٹیوٹ سے سنجیدہ پیرائے میں ہے۔ ۲۳ سالہ نوخیز عباس کو ”محترم بندہ ڈاکٹر عباس علی خاں“ لکھ کر مخاطب کرنا قرین قیاس نہیں۔ علامہ اردو زبان پر نظم اور نثر دونوں میں قادر تھے۔ کپ کی طویل علالت کی خبر سن کر مجھے، فوکس ہوا ”ایسا جملہ ہے، جس سے اس خط کا اقبال سے منسوب کیا جانا قطعاً نادرست ہو جاتا ہے، خبر پڑھ کر نہیں خبر سن کر۔ کس سے سن کر؟“ لمعے کے کسی خط کا یہ جواب علامہ کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ اگر نارو والی نظم کا ذکر اس میں نہ ہوتا تو کھینچ مٹان کر اکبر رحمانی کے لیے اس پر اصرار کرنے کی گنجائش ہوتی کہ علامہ نے اپنے حلقے کے کسی ادب نواز سے شاعرِ نارو کی عدالت کی خبر سنی ہوگی۔ لیکن ایسی گنجائش قطعی نہیں ہے۔

”تکلیف اور خوف کا احساس آپ سے دور ہو رہا ہے۔“ یہ جملہ بھی اقبال سے منسوب نہیں کیا جاسکتا خوف کا احساس تو کم یا دور ہو سکتا ہے، لیکن جب تک تکلیف ہے۔ تکلیف کا احساس کیسے دور ہو سکتا ہے؟ آخر عمر میں اقبال ذہنی طور سے فعال تھے۔ وہ ایسا جملہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ لمعے ایسے لوگ ایسا لکھ سکتے تھے، اور اکبر رحمانی جیسے لوگ ہی اسے اقبال سے منسوب کرنے کی نازیبا جرات کر سکتے ہیں۔

لاہور کے کسی حکیم، بمبئی میں رہنے والے کسی مریض کے علاج کے سلسلہ میں مشورہ اقبال کرتے؟ اس وقت جب وہ خود بھی بہت صحت مند نہ تھے! اور پھر علاج ملاحظہ فرمائیے۔

”تین ماشہ ہینگ کو پیاز میں رکھ کر گرم کر لیجیے۔“ اکتنا۔ اور کتنی دیر، اور کس طرح؟ کہ چھ میں؟ دو سکوروں میں، براہ راست آنچ میں دستے سے پکڑ کر، یا انگاروں پر رکھ کر، ڈھاک کے انگاروں پر یا اپلوں پر؟ دہکتی ہوئی آگ میں، یا نرم آنچ پر، بجھے ہوئے چولھے کی گرم رکھ پر؟ کچھ نہیں۔ بس گرم کر لیجیے۔ ”اس کے بعد روزانہ کھالیجیے۔“ یہاں لیجیے اقبال کی زبان نہیں ہے۔ یہ لمعے کے گاؤں کی زبان ہے۔ اکبر رحمانی کو یہ نہیں کھٹکی اس لیے ان کی بھی یہی بولی ہوگی۔

”ادب زبان کا دھماکہ خیز استعمال، جو شاعرِ مشرق سے کرایا گیا ہے؛

”اس کے بعد روزانہ کھالیجیے۔“ صرف تین دن استعمال کریں“ صرف تین دن استعمال کرنا

ہے تو روزانہ کھالیجیے کیا معنی!

کیا ۱۹۲۴ء میں یہ اقبال کی زبان ہے!



نواں خط

عزیزم عباس علی خاں صاحب سلمہ

السلام علیکم۔ رجسٹر اور خط موصول ہوا۔ نظمیں ایک جگہ سب کی سب محفوظ ہیں۔  
انتخاب آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ نظم ہو یا غزل، مختلف مضامین کی، میں ہونا  
ہے، اور ناظرین یا سامعین کی طبع مختلف، اس لیے میرے خیال میں اشعار کا  
انتخاب مشکل کام ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مدایج کے لحاظ سے منتخب کیا جائے  
آپ کا ایک خاص رنگ ہے۔ اور آپ کے اکثر اشعار ایک وجدانی کیفیت رکھتے  
ہیں اپنے مجموعہ کلام کے لیے آپ نے جو نام تجویز فرمائے۔ ان کی ایک طویل  
فہرست ہے۔ اور سب نام ایک سے ایک بہتر نظر انتخاب کہیں جیتی نہیں۔  
میری رائے میں آپ اپنے جملہ کلام کو، ایک ہی نام سے معنون کریں "تقدیرِ اہم"  
موزوں نام ہے۔

میری صحت بحمد اللہ اچھی ہے۔ اور موسم ناگوار نہیں ہے۔ خصوصاً صبح میں  
ابھی سردی رہتی ہے۔ آپ کا خیال درست ہے۔ پہل قدمی ضرور مفید ہوگی  
انشاء اللہ آپ کی ہدایت پر ضرور عمل کروں گا۔ یہاں سب خیریت سے ہیں۔  
امید ہے کہ آپ بھی بعافیت ہوں گے۔  
نگہر! یاد آوری کا شکریہ

آپ کا مخلص

محمد اقبال ماہر

۲ فروری ۱۹۳۳ء

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر خط میں اقبال سے لمحہ کی دلداری کرائی جاتی ہے۔ ہر بات میں  
توصیف، ہر بات میں تائید۔ ناردوانی نظم صرف اس لیے نقل کی گئی ہے کہ ایسے کلام بلاغت نظام  
کا اقبال کو شیدائنا بت کیا گیا ہے، اور ایسے کلام کے لیے ان سے تقدیرِ اہم جنرل ٹائٹل اقبال  
سے تجویز کر لیا گیا ہے۔ شاید تقدیرِ اہم کو موزوں اور مناسب ثابت کرنے کے لیے ہی بعد میں نظم

نار و لکھی گئی۔ شاید علامتی طور پر یہ کہنا مقصود ہو کہ امتِ مرتدہ نار و میں مبتلا ہے، لیکن معذرت  
اسنے پڑھے لکھے تھے، اور نہ ان کا ذہن یہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ ان کے سامنے تو بال جبریل کا  
یہ شعر رہا ہوگا۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اہم کیا ہے  
شمشیر و سناں اول، طاؤس و بابِ آخر  
اور اسی سے انھوں نے اپنے بے وجود سے مجموعہ کلام کے لیے تقدیرِ اہم کو چن لیا۔ اور اقبال  
سے یہ نام تجویز کر دیا۔ اکبر رحمانی کو اس بات پر اصرار ہے کہ یہ خط کھرا ہے، اور اقبال نے لاہور  
سے ۲ فروری ۱۹۳۳ء کو لکھا تھا۔

ماسٹر اختر نے ص ۵۲ پر زندہ رود سے جاوید اقبال کا یہ اقتباس پیش کیا ہے۔  
”۱۰ فروری ۱۹۳۳ء کو وینس سے بحری جہاز کو سنٹے دردی پر اقبال، سوار ہوئے،  
اور ۲۳ فروری ۱۹۳۳ء کو بمبئی پہنچے۔“

ماسٹر اختر نے واضح کیا ہے کہ جس تاریخ کو معہ کے نام اقبال کا یہ خط لکھا جاتا ہے۔ اور  
لاہور سے لکھا جانا ظاہر کیا جاتا ہے، اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد پیرس  
میں تھے۔ اقبال، ۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء سے ۲۵ فروری ۱۹۳۳ء تک لاہور میں تھے ہی نہیں۔  
شاید اکبر رحمانی کوئی جواز کوئی استدلال کوئی توجیہ پیش کرنا چاہیں۔ حیرت تو علاوہ  
اقبال کے برادر اکبر شیخ عطا محمد پر ہے، کہ انھوں نے اقبال نامہ میں جعلی خطوں کی بھرمار کر دی۔  
انھوں نے معمولی احتیاط بھی نہیں برتیں!

دسوال خط

محبتی معصاحب

تسلیم۔ آپ کا عنایت نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ

خدا کا شکر ہے کہ آپ خیریت سے ہیں۔ یہاں گرمی شروع ہو چکی ہے۔ لیکن  
رات نسبتاً تکلیف دہ نہیں ہے۔ اپریل اور مئی کے یہ دو مہینے یہاں سخت  
تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ دیہات میں تو گونا گوسم اچھا ہوتا ہے یہاں

مرض چھپک کی وجہ سے لوگ بہت پریشان ہیں۔ اب کے کسی سرور مقام پر جانے کی فکر میں ہوں۔ مگر اب تک مقام تجویز نہیں ہوا۔ اگر جانا ہوتا تو آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ کے خطوط اور خیالات کو پڑھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس اخلاق کا شکر گزار ہوں۔ ہاں۔ آج کل کیا مشاغل ہیں۔ آپ بھی جوان اور آپ کی شاعری بھی جوان۔ مجھے تو آپ کی نظموں میں ایک خاص جذبہ نظر آتا ہے۔ اور زبان کی سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ جاتے ہیں، بالیقین کہہ جاتے ہیں۔ اسی کا نام آدہ ہے۔ یہ کیفیت متجانب اللہ ہے۔ کوشش سے حاصل نہیں ہوتی۔ رند کہتا ہے شعر:

مشق کر مشق کر تا لطف سخن پیدا ہو۔

خود بخود شعر میں بیاختہ بن پیدا ہو

عید الفطر کی پیشگی مبارکباد بھیجتا ہوں۔ یا شاید وقت پر ہی پہنچ جائے۔ خدا حافظ

آپ کا مخلص

محمد اقبال

۱۹ مارچ ۱۹۳۳ء

عید الفطر کی پیشگی مبارکباد اقبال سے ۱۹ مارچ ۱۹۳۳ء کو دیو اکرم، لمعہ نے اپنے جمل کے لیے ایک بہت واضح سراغ اس خط میں چھوڑ دیا۔ تقویم کی رو سے اس سال شواہ کی پہلی تاریخ ۲۸ جنوری کو تھی۔ اور اس روز شنبہ تھا۔ ملاحظہ فرمائیں تقویم، ہجری و عیسوی، مرتبہ ابوالنصر محمد خاندی بنظر ثانی محمود احمد خاں رائن ترقی اردو ہند، دہلی، ص ۶۸۔

۱۔ یاد فرمائی نا درست نہیں ہے۔ لیکن رائج نہیں ہے۔ یاد فرمانے کے لیے شکر یہ یا یاد آوری کے لیے شکر یہ معیاری فقرے ہیں۔

۲۔ رات نسبتاً تکلیف دہ نہیں ہے، اس طرح منفی معنوں میں اس طرح کا بیان اقبال کے قلم سے منسوب کرنے میں تردد ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ اسلوب علامہ کا نہیں۔ رات نسبتاً کم تکلیف دہ ہے یا رات نسبتاً ٹھنڈی / آرام دہ ہے۔ یہ زبان اقبال کی ہو سکتی تھی۔

۳۔ چچک فارسی لغت ہے اور مرض چچک، اضافت کے ساتھ قواعد کی رو سے درست ہے، لیکن اقبال چچک کا مرض لکھتے۔ یہ نہ بھونا چاہیے کہ اقبال پنجابی تھے، لیکن دماغ کے شاگرد بھی تھے، اور چاہتے تو خاص زبان کی شاعری کرنے پر بھی قادر تھے۔

۴۔ چچک کی وبا ایسا موضوع نہیں تھا کہ اقبال خط و کتابت میں حشو کے طور پر استعمال کرتے۔ اب کے بھی زبردستی رکھا گیا نظر آتا ہے۔

۵۔ ”کسی سرد مقام پر جانے کی فکر میں ہوں، مگر اب تک مقام تجویز نہیں ہوا ہے“ اقبال نے تکلفی سے موٹل خط لکھتے تھے، عبارت آرائی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ایک ہی جملے میں دو جگہ مقام ہرگز نہ لکھتے۔ تجویز بھی اس جملے میں نہیں لکھتے طے لکھتے۔ یہ انشا درست کرنے کی کوشش نہیں، بلکہ ان کے اسلوب کے پیش نظر محل نظر مقامات کی نشاندہی کی جارہی ہے۔

۶۔ پھر وہی آپ بھی جوان اور آپ کی شاعری بھی جوان، اقبال ایسی چمکانہ اور بے تکلیفی کو ہرگز پسند نہ دیتے۔ لمحہ نے اپنی شاعری کی تعریف اور توصیف میں جو جیسے اقبال کے اس جعلی خط میں لکھے ہیں، ان کا انطباق ان گٹھل، کہیں کہیں وزن سے ساقط اور غیر مربوط شعروں اور مصرعوں پر نہیں ہوتا۔ جو شخص میرے اور مرے کا فرق نہ جانے — اور اس میں اکبر رحمانی بھی ان کے شریک ہیں — وہ تو شاعروں کی سطح سے بھی کچھ نیچے ہے۔

۸۔ اقبال کے کلام، اور ان کے خطوط سے، خاص طور سے جو صلاح چاہنے والوں کو لکھے ہیں، یہ ثابت ہے کہ وہ شعر میں حشو کو بہت قبح سمجھتے تھے۔ آپ کے خطوط اور خیالات کو پڑھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے: اقبال کے قلم سے جہ نہیں ہو سکتا۔ خیالات کو پڑھ کر، ایسا فقرہ ہے، جس کے مفہوم سے لمحہ اور رحمانی بے شک آشنا نہ ہوں، لیکن، قبال بخوبی واقف تھے ’خیالات پڑھنا‘ قیافہ شناسی تو نہیں، لیکن اسی کی قسم سے ہے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے، بھی اقبال کا اسلوب نہیں ہے مسرت ہوتی ہے، یا خوشی ہوتی ہے۔ کے بجائے بے حد نصنع آمیز جملہ اقبال سے منسوب نہیں کیا جاسکتا، خواہ مخواہ جملے کو طوالت بخشنے کے لیے حاصل کا حشو بھی ٹھونک

دیا!

۹۔ ہاں، آج کل کیا مشاغل ہیں، بھی خطوں میں اقبال کا اسٹائل نہیں لمحہ ثابت کیا کرنا



چاہتے تھے؟ اقبال ان سگوتیاری تھے؟

ان شہادتوں اور تجزیے کی بنا پر یہ خط جعلی قرار پاتا ہے۔ مارٹر اختر نے ص ۵۴ پر ایک ایسا ثبوت بھی فراہم کیا ہے، جو مطلق ہے۔ لاہور سے ۹ مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال یہ خط لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ زندہ رود میں جاوید اقبال نے ص ۵۰۶ پر لکھا ہے۔

”۸ مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال، ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر جامعہ ملیہ میں رؤف بے کے دو خطبوں کی صدارت کے لیے دہلی پہنچے۔۔۔“

اکبر رحمانی اس خط کو کھرا مانیں تو یہ غیر متوقع نہیں۔ کیوں کہ وہ ملعہ کے ہمزاد یا قائم مقام ہمزاد ہیں۔ فوسس اس بات کا ہے کہ اقبال کے برادر اکبر نے یہ جعلی خط اقبال نامہ میں شامل کیا۔

پندرہواں خط

مکرم بندہ، ڈاکٹر ملعہ

تسیم۔ نوازش نامہ کا شکریہ

خدا کا شکر ہے کہ میری صحت عائد اب اچھی ہے۔ مگر حلق کی تکلیف ہنوز باقی ہے آپ کے افسانے اور کلام بعد مطالعہ واپس کر رہا ہوں۔ ماشار اللہ خوب ہیں۔

ریوز فطرت کا اک مبہر تر سے خیالوں میں گام رہا ہے

تو خود شناسی سے اپنی دنیا کو مازاںال تبار رہا ہے

امید ہے کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔ خدا حافظ۔

مخلص محمد اقبال لاہور

۱۳ اپریل ۱۹۳۴ء

یہ خط صرف اس بنیاد پر جعلی قرار پاتا ہے کہ صحت عامہ اردو میں ایک اصطلاح ہے۔ اگرچہ اقبال نے عربی میں ایم۔ اے کیا تھا، لیکن عربی کے ذیل الفاظ وہ عربی قواعد کے مطابق نہیں، اردو قواعد اور رواج کے مطابق استعمال کرتے تھے۔

مکرم بندہ، ملعہ جیسے لونیگز، سبزینگ وائے کے لیے اسٹ پٹا طرزِ مخاطب ہے۔ ہنوز باقی

ہے، میں ہنوز بھی حشو ہے۔ یہ اقبال کا کیا شاگرد ہے، جسے وہ صرف کلام کی داد دیتے ہیں،

اس پر اصلاح نہیں دیتے۔ کسی خط میں زبان و بیان اور خیال کے بارے میں کوئی نکتہ نہیں  
اس بیت کا لغو کی شاعری سے کیا تعلق؟۔ یہ بیت بھی تحقیق طلب ہے کہ کیا اقبال اسے  
اس خط میں نقل کرتے؟

امید کہ مزاج بخیر ہوگا اقبال کا اسلوب ہو سکتا ہے۔ یہ جناب کیوں؟  
سو اہواں خط

لاہور

۱۹۳۲ء

مکرم بندہ

آپ کا گرامی نامہ مل گیا۔ میری طبیعت بحد الشراب اچھی ہے۔  
حکیم نابینا صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں۔ فرق ضرور ہے، مگر عام طور پر  
گفتگو کرنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ جناب کی گراں قدر رائے کا شکریہ۔  
انشاء اللہ ضرور بھوپال جاؤں گا، اور بجلی کے علاج سے بھی استفادہ حاصل کروں گا  
میں نے صحت کی مجبوریوں کے باعث ولایت جانے کا قصد ترک کر دیا ہے۔  
میں نے آپ کا تازہ کلام دیکھا ہے اور تازہ تر نظمیں بھی۔ مجھے شعریت سے  
زیادہ معنویت نظر آئی، اور میں بے حد متاثر ہوا، میری یہ خواہش ہے کہ اس  
قدرتی عطیہ کو آپ بہترین طریقے سے استعمال کریں۔ آپ کے اشعار وجدان کے  
حامل ہیں۔

آپ کے وقتاً فوقتاً ہدایات کے لیے میں جناب کا شکر گزار ہوں۔

مخلص

محمد اقبال لاہور

خط بنانے والے سے، چار کی کے باوجود پہلی چوک یہ ہوئی کہ جب ابتدا میں مقام (لاہور)  
دائیں کونے میں، اوپر لکھا ہے، تو دستخط کے بعد لاہور کیوں ہے۔ اقبال ہرگز ایسا نہ کرتے۔ یہ  
خط یقیناً پیڈ پر لکھا ہوا پلان نہیں کیا گیا تھا۔ سرنامے کی عبارت اس میں نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد دریں تاثیر نے بہت صحیح محاکمہ کیا ہے اقبال استفادہ حاصل کروں گا نہیں کہہ سکتے تھے، اس لیے یہ خط جعلی ہے۔

خود لغت کم استعداد انسان نے۔ اقبال نے عربی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ استفادہ عربی لغت ہے اور اس کے معنی ہیں فائدہ حاصل کرنا۔ حاصل کا مفہوم اس لفظ میں شامل ہے۔ استفادہ کیا جاتا ہے۔ حاصل نہیں کیا جاتا۔ اشک کا شعر ہے۔

پتہ چھتے ہی پتہ چھتے پہنچے مکاں یار تک

استثراہ کرتے کرتے استفادہ ہو گیا

لمعہ نے کئی خود نوشتہ خطوں میں، جو اقبال کی طرف سے لکھے ہیں اقبال سے استفادہ حاصل کرایا ہے یا لمعہ کے استفادہ حاصل کرنے کی بات ہے۔ ظاہر ہے یہ سب خط جعلی ہیں، کیوں کہ اپنی کسی اور تحریر میں علامہ نے استفادہ حاصل نہیں کیا ہے۔

ماسٹر اختر نے ص ۶۸ پر لکھا ہے :

”کچھ حضرات حیات اقبال اور مکاتیب اقبال کے مطالعے، اور ان کے سیاق و سباق

میں جانے بغیر یہ مانتے ہیں کہ محض ایک غلطی کی بنا پر لمعہ کے نام کے تمام خطوط کو جعلی

قرار دے دینا، ان کے ساتھ نا انصافی ہے۔ مثلاً اکبر رحمانی صاحب فرماتے ہیں۔

خطوں کے متن میں اس قسم کی غلطیاں ناقص یا کاتب سے سرزد ہوئی ہیں

اور خطوط اقبال کا کوئی بھی مجموعہ غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔

اختر نے اس عبارت کے لیے شاعر اقبال نمبر ۷۸، ص ۷۷ کا حوالہ دیا ہے۔

یہ عبارت اکبر رحمانی سے منسوب کر کے ان سے جلدی میں افسوسناک نتائج ہوا ہے۔ یہ

افتہاس شاعر کے ادارتی نوٹ سے جو لیا گیا ہے، جس کا عنوان ہے، اقبال بنام لمعہ حیدر آبادی،

اد پرک نصف صفحہ پر ادارتی نوٹ ہے۔ اور نیچے کے نصف صفحہ پر ۱۳ جون ۱۳۳۷ء کے خط کا

عکس ہے۔ (جو اقبال کی تحریر ہے) اور جس سے اس مقالے کا آغاز ہوا ہے، مثلاً ادارتی نوٹ

کی اہمیت کے پیش نظر اسے نقل کیا جاتا ہے۔

اقبال کے خط کا یہ عکس اقبال نامہ حصہ اول مطبوعہ ۱۹۴۴ء، صفحہ نمبر ۱۲، مرتبہ

شیخ عطا محمد سے لیا گیا ہے۔ اقبال کے لئے کے نام خطوط کو جعلی اور وضعی کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اقبال نامہ دھواؤں، پراٹھارائے کرتے ہوئے، ان خطوں کو جعلی قرار دیا ہے۔ اقبال کا فکر و فن، مرتبہ افضل حق قریشی، مطبوعہ ۱۹۷۱ء، لاہور، ۲۳ فروری ۱۹۳۵ء کا رکذا ہے، خط بنام لئے میں اقبال نے ایک جگہ تحریر کیا ہے۔

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ مثنوی مولانا سے روم سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں

خط میں ایک ٹکڑا رکذا اٹکڑے، استفادہ حاصل کرنا کو بنیاد بنا کر تمام خطوط کو جن کی تعداد ۲۹ ہے جعلی اور وضعی قرار دینے کو عبدالواحد معینی نے بھی درست تسلیم کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

”ڈاکٹر تاثیر قطعی طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ اکثر خطوط، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اقبال نے ڈاکٹر لوما کو لکھے تھے جعلی ہیں۔“

نقش اقبال از عبدالواحد معینی مطبوعہ ۱۹۷۹ء لاہور

محض ایک ٹکڑے کو بنیاد بنا کر بہت سے خطوط و شواہد کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ بعض ثقہ ماہر اقبالیات عبدالواحد معینی کو درست مانتے ہیں۔ معینی صاحب نے لئے کا نام کئی جگہ غلط یعنی لوما تحریر کیا ہے۔ خطوں میں اس نوع کی غلطیاں ناقل یا کاتب سے سرزد ہوتی ہیں، اور خطوط اقبال کا کوئی بھی مجموعہ غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔“

اس ادارتی نوٹ کو، جو بہ ظن غالب، افتخار رام صدیقی کا لکھا ہوا، ماسٹر اختر نے اکبر رحمانی کی تحریر سمجھا۔ یہ تسامح شاید اس وجہ سے ہوا کہ ص ۸ پر ترتیب کے تحت اقبال بنام معینہ راہادی کا مصنف اکبر رحمانی کو بتایا گیا ہے۔ اس عنوان سے جو مضمون ہے وہ ص ۱۶۳ سے شروع ہوتا ہے۔ اسی عنوان کے تحت اقبال کے قلم سے خط کا عکس بھی ص ۱۵۷ پر ہے۔

ہم پھر دسمبر ۱۹۳۴ء کے خط کی طرف واپس آتے ہیں۔ استفادہ حاصل کرنا درست



ہے۔ اسے قدم کی لغزش بھی تصور نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ یہ فقرہ اور خطوں میں بھی ہے۔ یہ اقبال کی نہیں لمحہ کی زبان ہے۔

”حکیم نابینا صاحب زبانی والے“ بھی بمبئی اور اطراف کی زبان ہے۔ اقبال لکھتے تو دہلی کے حکیم نابینا لکھتے۔ اور دہلی کے بھی کیوں لکھتے؟ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بھائی، حکیم نابینا اپنے زمانے کے مشہور حکیم تھے، اور صرف حکیم نابینا کے عرف سے مشہور تھے۔

یہ بار بار ہنزقرینین اپنے یہ اقبال کی طرف سے گراں قدر رائے، جیسے فقرے لکھتے ہیں اور بجلی کے علاج کی بات بھی جلتی نظر ہے۔ لاہور اور دہلی میں بجلی سے علاج کرنے والے معالج موجود تھے

”میں نے آپ کا تازہ کلام دیکھا اور تازہ تر نظمیں بھی“ نہایت حادہ زبان ہے، اور اقبال سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ تازہ کلام میں تازہ تر نظمیں شامل نہیں تھیں تو کیا مخصوص بیمار یوں کے لئے لکھے تھے؟

شعریات سے زیادہ مثنویت بھی بے ہودہ فقرہ ہے۔ اشعار میں وجدان کی بات ہے جو سراسر جعلی ہے۔

آخر میں پھر وہی ”آپ کے وقتاً فوقتاً ہدایات کے لیے میں جناب کا شکر گزار ہوں“ جناب قطعاً مشو ہے۔ اقبال نے اس طرح گڑ گڑا کر کسی کی نہ تو تعریف کی ہے اور نہ اس طرح بکھینچ گئے ہیں۔

یہ خط سراسر جعلی ہے۔

خط نمبر ۱

لاہور

۱۱ دسمبر ۱۹۳۲ء

جناب من۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمد للہ میری صحت عامہ ابھی ہے۔ مگر گھٹے کی شکایت ابھی۔ فح نہیں ہوئی۔ گو کسی قدر بہ نسبت سابقہ فرق ضرور ہے حکیم نابینا صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں، اور صحت کا یقین دالتے ہیں۔ میں

ولایت اب کے سال نہ جاسکوں۔

### عہد اقبال

۱۔ صحت عامہ اصطلاح ہے۔ اسی کو انگریزی میں پبلک ہیلتھ کہتے ہیں ہو سکتا ہے جنرل ہیلتھ کو حیدرآباد میں صحت عامہ کہتے ہوں۔ بمعہ علامہ اقبال کی جانب سے اپنے نام پر خط خود ہی لکھا ہوگا۔

۲۔ ”کسی قدر بہ نسبت سابقہ فرق ضرور ہے“ یہ جملہ بھی اقبال سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔  
 ۳۔ حکیم نابینا صاحب دہلی والے، پچھلے خط میں بھی یہ فقرہ تھا۔ اقبال یہ نہیں لکھ سکتے تھے اگر پچھلے خط میں دہلی کے حکیم نابینا لکھا ہوتا تو دوسرے خط میں دہلی کے بھی نہ لکھتے۔  
 ۴۔ ”علامہ اقبال کے مکاتیب“ کے عنوان سے شاعر میں ص ۲۰۲ سے ص ۲۴۲ تک علامہ کے پیچھے اعجاز احمد نے اپنی یادداشتیں لکھی ہیں، اور علامہ کے خط بھی دیے ہیں۔ اقبال حکیم نابینا صاحب دہلی والے نہیں کہتے تھے، اور نہ لکھتے تھے۔ ص ۲۳۹ سے یہ یادداشتیں :  
 ”شعر میں، میں دہلی میں بطور سب جج تعینات تھا۔ میری اہلیہ کے بدن پر گاہے گاہے . . . بھی قسم کے علاج کرائے، لیکن کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ایک دفعہ چچا جان سے اس کا ذکر آیا تو فرمایا۔ تم دہلی میں تعینات ہو۔ حکیم عبدالوہاب صاحب کو کیوں نہیں دکھاتے . . . اپریل میں دو تین دن کے لیے دہلی آئے۔ افغانستان کے قونصل جنرل ان کے دوست تھے۔ ان کے ہاں قیام فرمایا۔ وہاں سے بذریعہ ڈاک مجھے یہ خط میرے دہلی کے چٹے پر لکھا :  
 . . . آج حکیم صاحب نابینا سے ملاقات کی ہے، اور تمہاری بیوی کے متعلق ان سے مفصل کہہ دیا ہے . . . اس خط میں حکیم صاحب کے نام بھی ایک خط ملفوف ہے . . .“

اس خط کا متن ان کا قلمی نہیں کسی اور سے لکھوایا گیا۔ لیکن دستخط ان کے ہیں۔

قونصل خانہ کاپتہ، اور تاربخ تحریر خط بھی ان کی قلمی ہیں . . .“

حکیم عبدالوہاب صاحب یا حکیم صاحب نابینا کے علاوہ کچھ اور اقبال کے قلم سے منسوب نہیں کیا

جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ دہلی کے حکیم سے پہلے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ وہ بھی پہلے خط میں، بعد کے خط میں نہیں۔ واضح طور سے یہ اس اقبال کا خط نہیں ہے۔ جسے علامہ اقبال رڈ کٹر سر محمد اقبال کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اٹھ رہا خط

مخدومی

تسلیم۔ میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں۔ اس سے قبل بھی آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ ملا ہوگا۔ آپ کی تازہ نظم میں بڑھ کر بہت خوش ہوا کہ آپ مشنوی مولائے روم سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ دنیا کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، وہ آپ کی عمر کی لحاظ سے بالکل درست ہے۔ مگر آپ کو خیال رکھنا چاہیے کہ دنیا ایک بہت اہم مقام ہے۔ اور اس سے صحیح استفادہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں اللہ بن کا مل بننے کی کوشش کرنا چاہیے۔ مولانا رومیؒ کو بغور پڑھیں اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیے کہ جو کچھ آپ کا ضمیر اس خصوص میں آپ کو مشورہ دے، اس سے انکار نہ ہو۔ میرے گلے کی حالت اب رو بھرت ہے۔ آپ کے گراں قدر مشوروں کا شکریہ۔

نگہدار آں چہ در آب و گل تست      سرو بہ سوز و مستی حاصل تست  
نہی دیدم سبویٰ ایں و آں را      مے باقی بہ مینائے دل تست  
آپ نے میرا حال دریافت فرمایا ہے۔ شکریہ۔

زندہ یوں، دل مضحل، مسرت فنا، اللہ اللہ خیر صدا۔ خدا حافظ

مخلص محمد اقبال لاہور

۲ فروری ۱۹۳۵ء

جمل سازی معنے کی تھی، اس لیے اس طرف ان کا دھیان نہیں گیا کہ خط کا بھوپال سے لکھنا دکھایا گیا ہے۔ پہلی سطر میں۔ اور مکتوب نگار "مخلص محمد اقبال لاہور" ہے یعنی مکتوب نگار خط لکھتے وقت تو بھوپال میں تھا، اور خط کے اختتام کے وقت لاہور میں۔

یہ نہایت واضح پہلو ہے اس جعلی خط کا، جو اکبر رحمانی کے علاوہ سب کو پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے۔ ماسٹر اختر نے ص ۳ پر اس کی نشاندہی کی ہے۔

اس شہادت کے بعد جعلی کردار کی وضاحت کے لیے اور اندرونی شہادتیں پیش کرنا لازمی نہیں ہیں۔ مخطوطہ نسخہ شناسی کے طلبہ کے لیے ان کی شانہ جی کرنا مفید ہوگا۔  
۱۔ ”میں یہ سن کر بہت خوش ہوا“ اقبال نہیں لکھ سکتے تھے۔ بھوپال میں اقبال کو لمعہ کے بارے میں کون مانتا کون سناتا؟ سر اس مسعود؟ نواب حمید اللہ شاہ؟ یا مفتی محمد انوار الحق؟ بہتر قرین لمعہ کو بڑھ کر اور سن کر کا بھی فرق نہیں معلوم تھا اور اکبر رحمانی بھی شاید اس فرق کی اہمیت سے آگاہ نہیں۔

۲۔ اس خط میں بھی لمعہ پر استفادہ ص کرنے کی دھن سمائی ہوئی ہے۔

۳۔ یہ جملہ بے ہودہ ہے۔ ”جو کچھ آپ کا ضمیر اس خصوص میں آپ کو مشورہ دے گا اس سے انکار نہ ہو“ اس جملے کو اقبال سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ جو خطوں میں براہ راست ترکیب کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ گنجلک جیسے، چپا چاکر کا غز پر نہیں لگتے۔ خصوص کا یہ استعمال اقبال کے یہاں نہیں ملتا، اور اقبال کے اسلوب سے بعید ہے۔

۴۔ ”گلے کی حالت ب رو بھت ہے“ اقبال کیا، کوئی ادیب نہیں لکھے گا۔ ”گلا بہتر ہے اب میں رو بھت ہوں“ رو بھت مرہض ہوتا ہے، کوئی مؤلف نہیں ہوتا۔

۵۔ خیر سدا میں سے ہے۔ حق سے نہیں۔ اسے کی یہ غلطی لمعہ اور اکبر رحمانی جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اقبال نہ بان اور محاورے کے بارے میں بہت محتاط تھے۔

جو حضرات اللہ اللہ خیر سدا میں حق سے قدام لکھتے ہوں، وہ درست املا کی تصدیق کیے بغیر لغات اور فرہنگ آصفیہ سے رجوع کریں۔ فرہنگ آصفیہ میں رخ کے تحت خیر سدا دیکھیں۔ فیروز اللغات میں بھی خیر سدا اسی اسے سے ملے گا۔

۶۔ آخری سطر اقبال کے اسلوب میں ہے ہی نہیں۔

۷۔ خط اگر بھوپال سے لکھا گیا ہوتا، تو اس پر بھوپال کا پتہ ضرور ہوتا، اور یہ اطلاع بھی ہوتی کہ بھوپال میں کب تک قیام رہے گا۔ بھوپال پہنچنے کی تاریخ کے علاوہ بھوپال کے حالات



خاص طور سے علاج کے سلسلہ میں کوئی فقرہ یا جملہ ہوتا۔

۸۔ اور سب سے آخر میں نظم کے اصلاح سے مستغنی ہونے کی بات حقارت سے نظر انداز کرتے ہوئے، القاب و آداب کی بات۔ اس سبز قرنین کو شاید مخدومی کے معنی بھی نہیں معلوم تھے اور مولاناے روم سے استفادہ حاصل کرنے کا عزم؛

انیسواں خط

مکرمی لمعہ صاحب

اسلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ ابھی ابھی ملا۔ آپ کی بار بار یاد فرمائی کا بے حد ممنون ہوں یہاں اب گرمی شروع ہو چکی ہے۔ نو دس بجے صبح خاص گرمی رہتی ہے۔ ایسے موسم میں علی العموم میرا معدہ اور بھی خراب ہو جاتا ہے۔ آپ کا خیال درست ہے، اور میرا بھی یہی تجربہ ہے۔ دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مجھ کو تسکین غذا مفید ہوتی ہے۔ اسی پر عمل پیرا ہوں کسی دوا کا سردست استعمال نہیں ہے۔ گوشت تو میں نے ترک کر دیا ہے۔ البتہ مرغ اور مچھلی استعمال میں ہے۔ اور میں صرف ایک دفعہ دوپہر میں جو کچھ کھانتا ہوں، کھانتا ہوں۔ درشب میں خافہ۔ اس طریق عمل سے مزاج صاف رہتا ہے۔ مگر تولیدِ ریاح اور قبض بدستور۔ غیر خدا کو جو منظور ہے، ہو رہے گا۔ آپ کے حسبِ الحکم . . . . . (پڑھا نہیں جاسکا) . . . کی گولیوں کا استعمال جاری ہے۔ اور لسی بھی استعمال کرتا ہوں جس سے احتیاج میں ضرور افاقہ ہے۔ اس کے ساتھ آپ کی حسبِ خواہش، آٹو لے کا مربہ بھی استعمال کر رہا ہوں۔ آپ کا کلام میرے حذ مذاق تک بہت پر لطف ہے۔ اس کی اشاعت میں مماثل کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ آپ کے شوق کی بات ہے۔ میں نے حتی الامکان جہاں جہاں ضرورت معلوم ہوئی، ترمیم کی ہے۔ لیکن آپ کے تخیل کو مجروح ہونے سے بچایا ہے۔ طبع کے وقت مکرر غور بھی ممکن ہے، اور انتخاب بھی۔

یہ سب چیزیں بالمشافہ انشا باللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص عہد اقبال لاہور

۲۳ مارچ ۱۹۳۵ء

خط ہی میں اس کے جعلی ہونے کے سراغ موجود ہیں، ماسٹر اختر نے اپنی کتاب میں ص ۴، اور ص ۵، پر اندرونی شہادتیں پیش کی ہیں۔ سب سے اہم شہادت یہ ہے کہ تاثر یہ دیا گیا ہے کہ اقبال وہ گولیاں استعمال کر رہے ہیں جو ملوے نے تجویز کی ہیں، لیکن خود ہی ان گولیوں کا نام نہ پڑھ سکے۔ احتیاط کے طور پر انھوں نے اس جعلی خط میں دوا کا نام نہیں لکھا، حالاں کہ کسی بھی کمپنڈ سے پوچھ کر لکھ سکتے تھے، تاکہ گرفت نہ ہو۔ لیکن اس کے لیے انھوں نے جو ڈرامائی ترکیب کی، وہ ان کی نا تجربہ کاری کی دلیل ہے۔

خط زبان اور بیان کی خامیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اقبال کے کرم فرمایں ان خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان باتوں کا اور اضافہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔ "تقلیل غذا مفید ہوتی ہے" مفید کا یہ استعمال اٹ پٹا ہے۔ "تقلیل غذا" مثبت نہیں، منفی حالت ہے۔ اس کے لیے مفید کا استعمال محو و سرے کے خلاف ہے۔ پھر "تقلیل غذا" بول چال کی ترکیب نہیں ہے۔ اقبال کے خطوں میں روزمرہ کا استعمال ہوا ہے۔ غذا کم کرنے سے مجھے آرام ملا، یا ایک وقت، اور وہ بھی ہلکی غذا سے مجھے فائدہ ہوا، کچھ اس طرح اقبال لکھتے۔

۲۔ مرغ اور مچھلی استعمال میں ہے، یہ بھی زبان و بیان کے اعتبار سے، اقبال کا سلوب نہیں جو چیز استعمال میں ہوتی ہے، وہ استعمال سے ختم نہیں ہوتی۔

۳۔ اس طریق عمل سے مزاج صاف رہتا ہے، — یہ جملہ بھی اقبال سے منسوب نہیں کیا

جاسکتا۔ مزاج صاف رہنا کوئی روزمرہ نہیں ہے۔ طریق عمل بھی اقبال نہیں لکھتے۔ اقبال لکھتے تھے: ایسا کرنے سے سکون ملتا ہے۔

۴۔ "خیر خدا کو جو منظور ہے، پورے گا" — یہ بھی اقبال کا اسلوب نہیں ہے۔

۵۔ حتی الامکان کے ساتھ جہاں جہاں ضرورت معلوم ہوتی، بھرتی کا فقرہ ہے۔ اقبال



گویا سنہ ۳۲ء ہی میں سبز قرنین بمبئی سے مشرقی خاندیش، اپنی جاگیر میں آکر رہنے لگے تھے۔ ایک کچ بھٹی یہ کی جاسکتی ہے کہ نہیں صاحب۔ اُن کا قیام بمبئی ہی میں تھا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں اپنی جاگیر کے انصرام پر نظر ڈالنے کے لئے مشرقی خاندیش آجاتے تھے۔ چلے مان یا اگرچہ میڈیکل اسکول کے طالب علم نہیں رہے تھے، پھر بھی گرمیوں کی تعطیلات میں جاگیر پر جاگیر داری کرنے آجاتے تھے۔ لیکن سنہ ۳۵ء میں تو انھیں اس زمانے کے خاندیش، اور آج کے جلگاؤں میں ہونا چاہئے تھا۔ ان کی جاگیر (اگر کوئی تھی) بمبئی اور بھوپال کے تقریباً وسط میں تھی۔ جتنا فاصلہ جھانسی اور بھوپال کے درمیان ہے۔ تقریباً اتنا ہی فاصلہ جلگاؤں/کھنڈوا اور بھوپال کے درمیان میں ہے۔ یہ سبز قرنین کیا کٹھوردل تھا کہ وہ اقبال، جس کو اپنے کلام بلاغت نظام کو ارفع و اعلیٰ بتانے کے لیے اس نے بے دریغ استعمال کیا۔ وہ بھوپال آیا تو اس کو اپنا چہرہ زیبا دکھانے کے لیے خاندیش سے بھوپال تک نہ جاسکا۔ اور اس خط میں بالمشافہ ٹھیک ہو جائیں گی، کا ذکر ہے۔ ہے نا نہایت سنجیدہ مذاق؟ ہو سکتا ہے تو لیدر یا ح اور قبض سے لمحہ کے کلام کا حد مذاق تک پر لطف ہونے کا کوئی رشتہ ہو کہ دونوں ہم آہنگ ہوں، اور بالمشافہ یہ آہنگ اور درست ہونے کا امکان ہو!

بیسواں خط

لاہور

۱۱ مئی ۱۹۳۵ء

محترمی بندہ

تسلیم۔ آپ کا نوازش نامہ مل گیا۔ بحمد اللہ۔ میری صحت اب بہتر ہے۔ آپ کے مشورے کا شکریہ۔ انشاء اللہ آپ کے حسبِ خواہش ضرور بھوپال جا کر بجلی کا علاج کراؤں گا۔

آپ کے افسانوں اور مثنوی سے میں نے استفادہ حاصل کیا ہے۔ افسانے نہایت دلکش اور موثر ہیں۔ زبان شستہ ہے۔ مثنوی کا آغاز بہت اچھا ہے۔ خدا کرے اس کا اختتام بھی اچھا ہو۔ آپ کے خطوط کے درود سے مجھے بے حد



خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور میں آپ کے خیالات کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔

لندن کا سفر ملتوی کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کے ایسا پر ٹیگور میری مزاج پر ہی کے لیے لاہور آئے تھے۔ مگر میں لاہور میں موجود نہ تھا۔ اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ انہیں مطلع کر دیں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

نیازمند

محمد اقبال لاہور

اقبال، سماجی روابط کے آداب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اگرچہ لعلہ کے نام، ان کے خطوط، جو اقبال نامہ میں ہیں، یا تو جعلی یا وضعی — یا کسی اور کے نام ہیں، جو ترمیم کے ساتھ یا ترمیم کے بغیر لعلہ نے اپنے کھاتے میں ڈال لیے ہیں۔ لعلہ کے کچھ خطوں کا جواب اقبال نے دیا ہوگا۔ اگر اقبال کو خط لکھے گئے ہوں، کیوں کہ علامہ خطوں کا جواب ضرور دیتے تھے۔ اگر ولایت جانے سے پہلے یہ بات ان کی عادت میں تھی، تو دوران قیام یورپ میں یہ ان کی سرشت میں داخل ہو گئی۔ اگر ٹیگور اقبال سے ملنے لاہور گئے ہوتے تو وہ خود ٹیگور کو خط لکھتے۔ سبز قرنین کے توسط سے، اور سبز قرنین کے قلم سے مطلع نہ کراتے۔ یہ تک نہیں کہ ”میر اسلام پہنچائیں“ اور شکریہ ادا کریں۔ میں بھی ان کے نیاز حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ اقبال کو انتہائی بد لحاظ اور بد اخلاق ظاہر کیا گیا ہے۔

لعلہ اپنے خطوط کے ورود کے بجائے خطوط کے ورود مسعود کا فقرہ بھی لکھوا سکتے تھے۔

حوالہ الفاظ، فقرے اقبال کے اسلوب سے باہر ہیں، یا غوی اعتبار سے نادرست ہیں، ان پر خد کھینچ دیا گیا ہے۔ شاعر میں اقبال کے خط اپنے والد، اپنے برادر بزرگ اور بیٹے کے نام شامل ہیں۔ ان میں انہوں نے کہیں محمد اللہ نہیں لکھا ہے۔ الحمد للہ۔

اقبال کی ایک عادت اور ہے۔ مکتوب الیہ کے لیے ایک ہی القاب و آداب قائم رکھتے ہیں۔ مثلاً حبیب الرحمن خاں شیردانی کو محمد دوم مکرم خاں صاحب، جناب قبلہ خاں صاحب، اور لعلہ جیسے سبز قرنین نے خود کو محمدومی سے مخاطب کر دیا۔ اور ہر خط میں القاب و آداب بدلوائے ہیں

یہاں تک کہ محترمی بندہ اور کرم بندہ جیسے القاب کا غبن بھی کیا۔

اگر مئی کے اس خط میں یہ لحاظ بھی نہ رکھا کہ سبز قرنین بھوپال سے ۲۰ فروری کو ایک خط علامہ سے اپنے نام لکھوا چکے تھے!

اس خط میں ٹیگور کا ذکر ہے۔ اور ٹیگور کے خطوط بھی سبز قرنین کے نام ہیں، اس لیے اس مقام پر اگر ٹیگور بنام لمعہ کی مراسلت کو پرکھ لیں تو مفید ہوگا۔

عطا محمد کو لمعہ نے خوب خوب چرایا۔ اپنے نام ٹیگور کا خط یا اس کا عکس دینے کے بجائے اس کا ترجمہ دے دیا۔ اور وہ انھوں نے آنکھوں سے لگا کر اقبال نامہ کے دیباچہ میں شامل کر دیا۔ سرنامے القاب و آداب اور آخر خط کے بغیر *BODY OF THE LETTER* دیباچہ میں ہے۔

ماہنامہ نیرنگ خیال دلا بھر کے سالنامے میں پورا خط ہے۔ عبارت میں جزوی اختلاف ہے، لیکن اسے یہ کہہ کر اس سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے کہ دو مختلف ترجمے ہیں۔ نیرنگ خیال میں چوں کہ پورا خط ہے، اس لیے اقبال کے کرم فرما کے صفحات ۱۰۳ اور ۱۰۴ سے نقل کیا جاتا ہے:

دشوا بھرتی

شانتی نکیتن۔ بنگاں

۶ فروری ۱۹۳۳ء

عجبتی ڈاکٹر مخاں

آپ کے خط اور نظم نے میرے دل پر خاص اثر کیا۔ مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ میری اور اپنے شاعر اعظم سر محمد اقبال کی نظموں کے درمیان ایک خاص اندرونی تعلق پاتے ہیں۔

چوں کہ میں اس زبان سے نا بلند ہوں، جس میں وہ اپنا کلام فرماتے ہیں۔ اس لیے میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں ان کی اس کی گہرائی یا ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکوں۔ لیکن ان کی عالمگیر شہرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں جاودانی علم و ادب کی عظمت ہے۔

بارہا اس چیز نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے کہ نقادوں کی ایک جماعت میری اور سر محمد اقبال کی ادبی کوششوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر غلط فہم

بھیلانے کی کوشش کرتی ہے، اور یہ رویہ اس ادب کے متعلق بالکل غلط ہے، جو  
انسانی دل و دماغ کے عالمگیر پہلو سے بحث کرتا ہے۔ اور اس طرح تمام ملکوں  
اور زبانوں کے شعراء اور اہل فن کو ایک برادری میں منسلک کرنے کا سامان پیدا  
کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ سر محمد اقبال اور میں ادب میں صداقت اور حسن کی خاطر کام  
کرنے والے دو دوست ہیں، اور اس جگہ یکجا ہو جاتے ہیں، جہاں انسانی دماغ  
اپنا بہترین ہدیہ جاوداتی انسان کے حضور میں پیش کرتا ہے۔

خیر اندیش

رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور کے اصل انگریزی خط کو اخفا میں لکھا گیا۔ کسی غلط بیان دینے کے بعد  
اکبر رحمانی نے بڑی بچھاڑیں کھائیں، اور آخر رنج ہو کر ٹیگور کا یہ خط پیش کیا:

VISVA BHARATI  
SHANTINIKETAN  
BENGAL

February 7, 1933

My dear Dr. Khan,

Your letter and poem have touched my heart. It has given me  
deep pleasure to know that you have found an inner affinity between my  
poems and those of your great poet Sir Mohammad Iqbal.

Not knowing the language in which he writes his original poems,  
I am not in a position to reach the depths of his creative productions or  
properly evaluate them but I am assured through wide fame they have  
won that they carry the majesty of eternal literature.

... trying to create  
... of a Mohammed  
Iqbal on a competitive basis. This is an entirely erroneous attitude towards  
... and times can fraternise.

I am sure, both myself and Sir Mohammed Iqbal are comrades  
... to the shrine of the eternal

With kind regards,

Sincerely yours,

Sd. Rabindernath Tagore

Dr. M. Abbas Ali Khan Lamma Esqr.



قومی زبان کراچی، جنوری ۱۹۷۸ء میں ص ۳۲ پر اکبر رحمانی نے یہ اظہار کیا ہے کہ ڈاکٹر لغتہ مرحوم نے مرنے سے چند ماہ قبل اصل خط راقم الحروف کے حوالے کیا تھا۔

چوں کہ یہ خط متنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اس لیے اس دستاویز کے مالک اور معنے کے ادبی وکیل ہونے کی حیثیت سے ان پر واجب تھا کہ اس خط کا عکس پیش کرتے۔ میں نے اکبر رحمانی کو تین خط لکھے ہیں، اور ان سے گزارش کی ہے کہ اس معاملہ پر واضح بیان دیں، اور اعلان دیں کہ اقبال کے کرم فرما میں ص ۱۱ پر ٹیگور کے خط کا جو متن انگریزی میں ہے، وہ اصل کے مطابق ہے یا اس میں اور اس نقل میں علامت وقاف سمیت کوئی فرق ہے۔ اگر ٹیگور کے اس خط کا وجود ہے تو رحمانی اس کا عکس بھیج دیں گے۔

سرسری نظر ہی سے یہ خط جعلی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کم استعداد طالب علم یا مدرس نے اردو عبارت کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

ٹیگور انگریزی زبان کے مزاج سے آشنا، اور اس کے اد شناس تھے یہاں تک کہ ٹھا کر کو انگریزی یا کر ٹیگور کر لیا گیا تھا۔ غائب نے کچھ لوگوں کو متصدیوں والی فارسی لکھنے کا طعنہ دیا تھا۔ ٹیگور سے منسوب یہ خط متصدیوں والی انگریزی کی اچھی مثال ہے۔ فقروں اور جملوں کی ساخت سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا عرض کر دیا جائے کہ MYSELF ایک لفظ ہے، مرکب لفظ، ضمیر متکلم۔ اس خط میں دو مفرد لفظ لکھے ہیں۔ یہی طرح Plat form ہائفن کے ساتھ ٹیگور نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس طرح لغتہ یا اکبر رحمانی کی استعداد ہی کے لوگ لکھ سکتے تھے۔

آخر میں with kind regards نیم سرکاری خطوں میں لکھا جاتا ہے۔ ذاتی خطوں

میں kind regards کی جگہ Warmest good wishes یا good wishes

وغیرہ لکھتے ہیں۔

یہ اہم نکتے ہیں، لیکن خط کے مکتوب نگار سے انشاپ، اور اس کے استناد کے سلسلے میں

ان کو پس پشت ڈالا جاسکتا ہے۔  
آخری پیرا گراف یوں شروع ہوتا ہے،

I am sure, bothe my self and Sir Mohammed Iqbal are comrades

ٹیگور ہی نہیں کوئی بھی شخص جو انگریزی کچلے اور زبان کے مزاج کے واقف ہے آداب کی ایسی خلاف ورزی کر کے خود کو غیر مہذب، ورنہ نائراٹھ نہیں ثابت کرے گا ایسے موقعوں پر مہذب گفتگو میں اور تحریر میں بھی اپنا نام یا ضمیر متکلم بعد میں رکھتے ہیں MYSELF دیہاں (My SELF) بھی متصدیقوں والی انگریزی ہے۔ قواعد کی رو سے و اور بول چال کی رو سے ME درست ہے۔ ٹیگور یہی جملہ لکھتے تو کچھ یوں لکھتے:

I trust, Sir Mohammed Iqbal and I, bothe are comrades

اس میں تو کسی حد تک مفروضے کو دخل ہے کہ ٹیگور اگر یہی مفہوم ادا کرتے تو یک عبارت لکھتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ گنوارہ انگریزی میں قبال کا نام ضمیر متکلم کے بعد نہ لکھتے  
اگر زبان و بیان اور آداب نگارش کی یہ بھسٹ غلطیاں نہ بھی ہوتیں تو آخر میں:

Dr. M. Abbas Ali Khan Lamma Esqr.

سے بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔

ESQR مخفف ہے ESQUIRE کا۔ اور یہ رتہ عظمیٰ ہے۔ یہ رتہ عظمیٰ  
صرف اس صورت میں لگتا ہے جب کوئی سابقہ عظیم نام سے پہلے نہ لگا ہو۔ لغت نے تعظیم کا اس  
لپنے نام کے ساتھ بندھا رکھنے کے لیے نام سے پہلے، سابقہ ڈاکٹر بھی لکھوا دیا اور بعد میں لاحقہ لگا کر  
بھی لکھ دیا۔ ٹیگور کو لغت اپنی سطح پر اٹھائے۔ اور آتم کی سطح پر اکبر رحمانی خود اٹھائے۔ اس نقی  
خط کو نوٹ نہ ٹیگور رش بہت کرنے کے لیے۔ یا ہو سکتا ہو۔ صحت کو نیچے ترنے کی زحمت نہ  
کرتا پڑی ہوا!

لاحقہ کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے انگریزوں تو اس طبقہ یقیناً واقف ہو گا۔ اکبر رحمانی اور اسی قماش کے دوسرے محققوں کو فوری استفادے کے لیے مشورہ ہے کہ شاعر ص ۳۵۴، ۳۵۵ اقبال کی اسناد کے عکس ملاحظہ فرمائیں۔ جن حضرات کے ناموں سے یہ سیر دی رائٹ آنریبل سر کا سابقہ لگا ہے۔ ان کے ناموں کے بعد اسکوائر کا لاحقہ نہیں ہے۔

پھر سب سے بڑی بات ہے کہ آئندہ نرائین مدائن نے شاعری کی ابتدا اس صدی کی دوسری دہائی میں شکوہ کے انگریزی ترجمے سے کی تھی۔ سکسن اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے تھے۔ لغہ قبل کو تو کتابیں بیچ کر تے تھے۔ انھوں نے ٹیگو کو کلام قبل کے ترجمے بھیجے ؟<sup>HF</sup> ٹیگو سے ان کی خط و کتابت ہوئی تو یہ کتابیں انھوں نے ضرور بھیجی ہوتی ہیں !

RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS, and

کی جلد ٹیگو کو بھیجی یا اگر

### اکیسویں خط

محبتی لغہ صاحب سلمہ

تسلیم۔ ابھی محبت نامہ صبح صبح ملا حلال کر میرے لب تبسم آتشا نہیں ہیں۔ تاہم آپ کے خط سے متبسم ہو جاتے ہیں۔ آپ کی نثر بھی نظم سے کم نہیں ہوئی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ !

آپ کی نظم و نثر کی بیاض محفوظ ہے۔ کہیں کہیں درست کرنے کی ضرورت پڑی ہے۔ پس کرنے میں خوف ہو رہا ہے۔ کیا واپس ہی کر دوں ؟ لیکن پہنچنے نہ پہنچنے کا میں ذمہ دار نہیں۔ یا رہنے دیجیے۔ یا جب آپ سے ملاقات ہوگی درست بدست لے لیجیے۔ بہر حال جو مناسب ہو مطلع فرمائیے۔

آپ کے مشاغل کیا ہیں۔ کیا شاعری جاری ہے ؟ کبھی کبھی جب طبیعت لگے ضرور شعر کہیے۔ آپ کی طبیعت شاعری کے مناسب ہے، اور آپ کی نظموں میں جھڑک و طغیاء آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی نثر میں لکھیے۔ آپ کی نظم بھی دلچسپ ہوتی ہے۔

خدا نے آپ کو ادب کی خدمت، محنت کی خدمت (ڈاکٹری) کے ساتھ ساتھ  
 کر لے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور جوانوں کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ خدا حافظ  
 مخلص محمد اقبال لاہور

۳۱ جون ۱۹۰۷ء

عباس علی خاں کا سنہ پیدائش ۱۲۹۷ء ہے۔ سنہ ۱۳۰۷ء ہی نے غلط لکھا، یا مرتب / کا تب راقبال  
 نامہ سے غلطی ہوئی۔

۱۱ مئی ۱۹۰۵ء کے خط میں تو لٹے نے اپنے افسانوں اور مثنوی سے استفادہ حاصل کرایا تھا۔  
 افسانے نہایت دلکش اور موثر ہونے کی داد بھی۔ قبائل سے حاصل کی تھی۔ ۲۳ مارچ کے خط میں  
 کلام بلاغت نظام پر حتی الامکان جہاں جہاں ضرورت تھی ترمیم بھی کرائی تھی۔ ایسا تاثر یہ خط دیتے ہیں  
 کہ اقبال کو اس سبز قرین کی نشرو نظم کی تعریف کرنے کا مایہ نوا یا تھا۔ اگر اقبال مایہ نوا کے مرثیوں اور  
 مرثیوں تھے، تو یہ خط اقبال کا ہے۔ اگر قبائل ان امراض کا شکار نہیں تھے تو مکتوب الیہ کو یہ امراض لاحق  
 تھے۔ اور در مدح خود، یہ خط شاید ان ہی کی تصنیف ہیں۔

”ڈاک سے واپس کروں تو تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے“ کیا یہ مضامین اقبال ادا نہیں کر سکتے  
 تھے؟ کیا اقبال جیسا قادر الکلام شاعر، جس نے فلسفے اور اقتصادیات پر انگریزی میں سہی تحقیقی  
 مقالے لکھے اور اردو میں جس کی تحریریں اتنی ہیں کہ ایک کتاب میں نہیں سماتیں، خوف اور اندیشے  
 کے فرق سے واقف نہیں تھا؟ پھر ایک چیز جبری بھی ہوتی تھی، ادبیرنگ خط بھی اس لیے لکھے  
 جاتے تھے کہ ڈاک میں گم یا ضائع نہ ہوں۔

بائیسواں خط

عزیزم ڈاکٹر عباس علی خاں صاحب موعود،

نوازش نامہ مل گیا۔ محمد الہ سب غیر مت ہے۔ آپ کے انگریزی نظموں کا مجموعہ  
 میں نے بغور دیکھا ہے۔ اور ٹیکو کے خطوط بھی۔ ٹیکو آپ سے بے حد خوش ہیں  
 اور کیوں نہ ہوں۔ انگریزی زبان پر آپ کو بھی اچھا خاصا عبور ہے۔ بڑی خوشی  
 کی بات ہے۔



”شق کے جائے۔ درجو کچھ آپ کا ضمیر آپ کو لکھائے، فوراً قلم بند کر لیا کریں مگر ایک بات یاد رکھیے۔“

آپ چند روز کے لیے آرام کر لیں۔ ورنہ آپ کی صحت پر بہت بار پڑے گا۔ میری صحت ٹھیک ہے، مگر روز بروز انحطاط محسوس کر رہا ہوں اور یہاں استعمول کر رہا ہوں۔ میں تجیید حیات اور شباب کا قائل نہیں ہوں۔ فطرت کا قانون اٹل ہے۔ نواب عزیز یار جنگ کے کلام کا مجموعہ ”معارف عزیز“ سے آپ نے تحفہ مجھے بھیجا ہے۔ بلا شکریہ۔ ان کی ہستی سید آباد کے لیے مایہ ناز ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ خدا حافظ

مخلص محمد اقبال لاہور

، جولائی ۱۹۳۵ء

ٹیگور کے خطوط کی جو نقیصیں اقبال کو بھیجی گئی تھیں، لیکن ان کے مفہوم لغتہ نہیں سمجھتے تھے؛ ٹیگور آپ سے بے حد خوش ہیں، ایسا جملہ ہے، جو ریکارڈ کے لیے اقبال کے قلم سے لکھوایا گیا ہے، تاکہ سند ہے، انگریزی پر عبور کی جو سند حاصل کی گئی ہے، اس کی حقیقت تو ٹیگور کے اس خط سے آشکارا ہو گئی، جس پر گفتگو ہو چکی ہے۔ لغتہ کو ایسا عبور حاصل تھا کہ انھوں نے اپنے نام سے پہلے ڈاکٹر کا سابقہ لکھوایا، اور نام کے بعد اسکو ”مر کا لہ“ بھی! جعل سازی کے لیے صرف عقل سے کام نہیں چلتا، علم کی بھی تھوڑی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

”جو کچھ آپ کا ضمیر آپ کو لکھائے“ اقبال کے قلم سے نہیں ہو سکتا۔ دس لکھائے، یا جذبہ لکھائے ہونا چاہیے تھا۔ ضمیر کی تودہائی دی جاتی ہے، سچ بولنے، حقیقت کا اظہار کرنے کے لیے۔ یہ عجیب بات ہے۔ لغتہ صحت کے سلسلے میں علامہ کو مشورہ دیتے تھے۔ اور یہاں علامہ چند روز آرام لینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ چند روز کیوں؟ آرام لیں، اقبال کی زبان نہیں ہے۔

پہلے ایک خط میں (۱۹۱۵ء) اقبال سے لکھوایا گیا ”آپ کا خیال درست ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا“ پھر اسی خط میں اپنی تجویز کی ہوئی وہ گویاں بھی لکھوا دیں۔ جن کا نام پڑھانہ جاسکا۔ اور معالج کو یاد بھی نہ رہا کہ اٹکل سے پڑھ لیتا۔ زیر نظر

خط میں ہے۔ ”ادویات استعمال کر رہا ہوں۔“

یہ جملہ حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ ”میں تجدید حیات اور شباب کا قائل نہیں ہوں۔“ مافیہ پر گفتگو سے پہلے، جملے کی ساخت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ جس سال کا یہ خط اقبال کا بتایا جاتا ہے۔ اس سال میں امیر لدوہ اسد علی ہانی اسکول میں ثانوی سطح کا طالب علم تھا۔ اور قواعد میں عطف و اضافت کے بارے میں سبق پڑھ چکا تھا۔ اگر یہ جملہ غلطی درست کرنے کے لیے امتحان میں دیا جاتا تو برعکس طلبہ کی طرح میں بھی تجدید حیات اور شباب سے اور ہٹا کر تجدید حیات و شباب کر دیتا۔

ظاہر ہے قواعد کی رو سے ایسا ناقص جملہ اقبال نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس طرح کی ایک خامی بھی ان کے ذخیرہ نظم و نثر میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کسی خط میں واقعی علالت نے لمعہ کو مسورہ دیا ہو کہ مشتق کریں۔ یہ جملہ انھوں نے ایک جگہ سے زیادہ جعلی اور وضعی خطوں میں اقبال کی طرف سے لکھوایا ہے۔ انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ واد عطف کی جگہ عطف اور لکھنے کی ایسی فاش اور فاحش غلطی صرف اس سے سرزد ہو سکتی تھی جس کے مبلغ علم کی عالی ترین سطح وہ ہو، جو ڈاکٹر عباس علی لمعہ سلم کی تھی۔ یا جو اکبر رحمانی کی ہے، کہ وہ ان خطوط کا مکتوب نگار ڈاکٹر سر شیخ محمد قبال ایم اے (دہلی)، ایم اے (فلسفہ)، پی ایچ ڈی کو سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مکتوب نگار اور مکتوب ایہہ دونوں سبز قرنین عباس علی خاں لمعہ ہیں۔ ”روز بروز انحطاط محسوس کر رہا ہوں۔ ادویات استعمال کر رہا ہوں۔ میں تجدید حیات و شباب کا قائل نہیں ہوں۔ فطرت کا قانون اٹل ہے۔“

تجدید حیات شاید کایا کلپ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ صحت مند قوی سے اقبال کو چڑ نہیں تھی۔ اور اسے وہ فطرت کے قانون کی خداف و رزی نہیں سمجھتے تھے، اگر کبر سنی میں بھی کوئی صحت مند رہنے کی کوشش کرے۔ قدرت کا قانون اگر اٹل ہے تو ادویات استعمال کرنے کی کوئی منطقی وجہ نہیں۔ جن لوگوں نے اقبال کو بڑھا ہے وہ اقبال کے خیالات سے واقف ہیں۔ صرف ایک مثال: اپنے ہر جون ستر کے خط میں انھوں نے اپنے والد کو لکھا،

مقبلہ و کعبہ اسلام علیکم

آپ کا والا نہ مدد! اے اللہ کہ آپ کی صحت ابھی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سر پر رکھے گا۔ بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظامِ خوراک و غیرہ کے بارے میں لکھا تھا۔ یہ طریق بہت اچھا ہے، اور اسی کو دستورِ عمل بنانا چاہیے۔ میں نے یورپ کے ایک مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے وہ کہتا ہے کہ انسان میں ایسے جراثیم ہیں، جو قاطع حیات ہیں، اور دہی کی لسی ان جراثیم کے لیے بمنزلہ زہر کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبتاً طویل العمر اور تندرست ہیں۔ علی بخش نے کل مجھے بتایا کہ اس کی چچی کی بی عمر ہوئی۔ اور آخر میں اس کا گزران زیادہ تر لسی پر تھی۔ رکنا، ترش لسی تو شاید آپ کے لیے مفید نہ ہو کہ آپ کا گلا خراب ہے۔ البتہ میٹھے دہی کی لسی اگر صبح پی جائے، تو شاید مفید ہو۔ اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیے۔ . . میری خواہش تھی کہ سال کا زیادہ حصہ آپ میرے پاس بسر کیا کرتے۔ ذرائع کا انتظام ٹھیک ہو جائے، تو انشاء اللہ آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ . . روحانی کیفیات کا سب سے بڑا حمد و معادون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے۔ بنی کریم کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔ میں خود اپنی زندگی، کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔ . .

ایک تو سیرِ غورِ جملے میں واؤ عطف کی جگہ ادر ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ جملہ اقبال کے قلم سے نہیں ہے۔ پھر مندرجہ صدرِ اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی — انفرادی زندگی کی بقا کے لیے ان کا جو نظریہ تھا، لمعہ کے نام خط میں یہ جملہ اس کی نفی کرتا ہے۔ اس میں تقدیر پر قانع رہنے کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ جو اقبال کے فلسفہ خودی کے سراسر خلاف ہے۔ اعلیٰ مقصد سے خودی کی نمود ہوتی ہے، اور اعلیٰ مقاصد کے لیے انفرادی زندگی کی بڑی اہمیت ہے۔ کارِ جہاں درانہ ہے۔ تو اسے سراسر انجام دینے کے لیے ابدی نہیں تو عمر دراز ضرور چاہیے۔

اقبال کے ذخیرے میں عباس علی خاں لمعہ کی نذر "ارمغانِ عزیز" تھی ضرور، جو انھوں نے اپنے

بھتیجے اعجاز کو دے دی تھی۔ اس پر مہمان نے تحفہ پیش کرنے کی تاریخ، ۱۹ اگست ۱۹۳۴ء لکھی ہے  
 قباں نے شکر یہ کا خط ۳۲ اگست ۳۴ء میں لکھا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ رسمی خط ہوگا۔ اس کو دبا کر اس کی  
 جگہ مہمان نے ۳۲ اگست ۳۴ء کی کسی تاریخ کو اقبال کا خط بنایا ہوتا، تو شاید انھیں شک کا فائدہ بھی  
 کچھ لوگ دے دیتے۔ یہ ۳۲ اگست ۳۴ء کا نہیں، جولائی ۳۵ء کا خط ہے !  
 مزید چھان بین یا تبصرے کی ضرورت نہیں۔

### تیسواں خط

میرے عنایت فرما سدا اللہ تعالیٰ  
 رجسٹر و خط ابھی ابھی ملا، جس میں چند نظمیں ملفوف ہیں۔ اس سے قبل بھی ایک رجسٹر اور  
 دو خط مع اشعار موصول ہوئے ہیں۔ آپ کے جواہر پارے گنج سخن میں محفوظ ہیں، اور میں  
 دیکھ کر محفوظ ہو رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اقبال

۱۹ نومبر ۱۹۳۵ء

اقبال و آداب کے بارے میں تو سارے خطوں کی ابتدائی خواندگی کے بعد بات ہوگی۔ یہاں اس بات کی طرف  
 توجہ دلانا ہے کہ خط کا دوسرا جملہ گوہر دے رہا ہے کہ یہ خط اقبال نے نہیں لکھا تھا۔ علامہ بڑی پابندی سے  
 خطوں کا جواب دیتے تھے۔ کوئی اہم بات تفصیل سے نہ لکھنا ہوا، تو پوسٹ کارڈ لکھ دیتے تھے۔ مہمان نے تو  
 ہوا یا نہ دھری ہے کہ اقبال ان کے خطوں سے تسکین حاصل کرتے تھے۔ یہاں ایک رجسٹر و ایک نہیں  
 دو دو خط آئے اور انھوں نے جواب نہیں دیا۔ رجسٹر میں اتنی نظمیں اور غزلیں، اور انھوں نے رطب المساقی  
 نہیں کی! یہ پاک طینت عاشق کلام مہمان پر کیا افتاد پڑی — یہ وہ رات دن رجسٹر میں درج کلام بل غنت  
 نظام کا ورد کرتے رہے۔ اور زندگی کے سارے قابل ذکر اور ناقابل ذکر معمولات بھول گئے، جن میں رجسٹر  
 کی رسید اور دو خطوں کے جواب بھی تھے !

گنج سخن میں محفوظ ہیں، اقبال کا اسلوب نہیں۔



ایک اور اہم نکتہ۔ جس طرح غالب پہلی تاریخ کسے یہ آؤں نہیں لکھتے تھے۔ جعلی دیوان غالب بخط غالب میں ایک یہداشت کی تاریخ آؤں صفر ہے۔ جسے ملک رام درویشی نے بخط غالب تسلیم کیا ہے۔ ان کا موقف نا درست ثابت ہوا۔ اقبال بھی پہلی تاریخ آر نہیں لکھتے تھے۔ یہ عادت کی بات ہے ضرب کلیم کی ایک جگہ انھوں نے عمود آباد کے راجہ محمد امیر احمد خاں کو پیش کی تو پہلی تاریخ تھی۔ انھوں نے یکم لکھی ہے۔ ”لغے کے نام“ جو تھے خط میں تاریخ یکم فروری ۱۹۳۱ء لکھوائی گئی ہے۔ لیکن آٹھویں خط میں ۱۹۳۲ء لکھوائی گئی۔ سو ہویں خط میں پھر ۱۹۳۳ء ہے۔ لغے کو آر لکھنے کی عادت رہی ہوگی۔ اقبال یکم لکھتے تھے۔

#### چوبیسواں خط

لاہور سے ۱۸ نومبر ۱۹۳۲ء کو انگریزی میں یہ خط لغے نے اپنے نام اقبال سے لکھوایا ہے اقبال میں اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ اگرچاس میں CAT معنی بلی اور RAT معنی چوہا درج نہیں ہیں۔ لیکن بکری اور بھیڑ کا ذکر ضرور ہے۔ عام سے لکھوایا گیا ہے۔ جس کا ترجمہ ہے۔

”آپ نے میرے لیے بکری کا دودھ تجویز فرمایا ہے۔ A یا بھیڑ کا؟ بہر نوع بالکل سیاہ بھیڑ کا میسر آنا تو نہایت مشکل نظر آتا ہے۔ آپ کا جواب آنے پر اس باب میں آپ کو اطلاع دوں گا۔“

یہاں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں:

لغے نے میڈیسن میں داخلہ کیا تھا یا WITCH DOCTOR بننے کی تربیت لی تھی؟ انگریزی اور اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کے تحت بھیڑ، بکری، دونوں آئیں۔ جس کی وجہ سے اقبال کو لغے کے خط کا مفہوم سمجھ میں نہ آیا ہو۔ استعارہ کے طور پر BLACK SHEEP سے مراد خود لغے کی اپنی ذات تو نہیں تھی؟ کیا ہم یہ فرض کریں کہ اقبال اتنے سادہ لوح تھے کہ ۲۴ برس کے سبز قرین کے مشورے پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اس سبز قرین کے، جس نے اگر میڈیسن میں ڈیپلومہ کورس کر بھی لیا تھا، تو نا تجربہ کار تھا۔ جب کہ اقبال کو بہترین معالجوں کی خدمات مہیا تھیں۔

اقبال نامہ (حصہ اول) کے مرتب یقیناً اس بات کے لیے مبارکیا دے مستحق نہیں ہیں کہ انھوں نے اقبال کا انگریزی خط، ان کی اپنی تحریر میں شامل کرنے کے بجائے اس انتہائی مشتبہ اردو خط کو

شامل کیا۔ جو ترجمہ بتایا جاتا ہے۔ اردو میں بھیڑ اور بکری کے لیے کو مشترک لفظ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا جعلی ہونا ثابت ہے۔

### پچیسواں خط

یہ بھی انگریزی خط کا ترجمہ بتایا جاتا ہے۔ حالاں کہ اردو کی عبارت ایسی ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ چونکہ یہ ترجمہ ہے۔ اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

### پچیسواں خط

لاہور

۳۰ اگست ۱۹۳۶ء

محبتی

تسلیم۔ آپ کی نظم آج ہی ملی۔ دیکھ کر آج ہی واپس کر رہا ہوں۔ بار بار پڑھا۔ شرف آیا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ میری صحت اب بہتر ہے۔ مگر آواز میں ترقی نہیں ہوئی آپ کے مشورہ کا شکریہ۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص محمد اقبال

اکبر رحمانی نے ”اللہ کرے زور قلم اور زیادہ“ کے بعد نقشے دیے ہیں دشاعر ص ۱۶۸ اور اگلی سطر میں لکھا ہے۔

اب ذرا وہ نظم اور علامہ کی اصلاح ملاحظہ فرمائیے۔

انتخاب کلام لمعہ شاعر ص ۱۵۶ کا پہلا جملہ اکبر رحمانی کے ذوق شعری کلید ہے :

”ڈاکٹر عباس علی خاں حیدر آبادی ایک بلند پایہ شاعر، نثر نگار، اور نثر پرداز تھے۔“

اب شاعر ص ۱۶۹ پر کلام بلاغت نظام، اور علامہ سے منسوب اصلاح پر ایک نظر :

اصلاح اقبال

لمعہ بنیپین ہے اور آرزو ہے وصال ہے

موجیں ہیں زور زور کی، موسم برشگاں ہے

مشق خرام بنیپین، موسم برشگاں ہے

ساحل بنیپین پر آج عشق کا اور حال ہے

دو دنوں کی کشمکش میں آج ذوق بھی پامال ہے

لب پہ سرور سرمدی، حسن سے قیں قیں ہے  
 موجیں ہیں نغمہ زنِ ادھر، ابدادھر ہے اشکبار  
 دو دنوں کی کشمکش میں آج، حسن بھی پامال ہے  
 بریلِ دل میں لعل کے نغمے ہیں وہ سنئے تھے  
 جس کا قصہ ہے کارِ ساز، جس میں خودی کا حال ہے  
 سوزِ شمع نے مری شمع کو بھی بجھا دیا  
 میرے صداے درد میں ہے تو یہی کمال ہے  
 علم کی جان و جسم میں میرا قیام ہے مدام  
 تنکدہ ہیں شمس ہے گر، دل میں مرے جمال ہے  
 جھستے گن ہنگارِ پرف سے تری نوازِ شبن  
 دل بھی دیا دماغ بھی اجاہ بھی ہے منال ہے  
 اس کے سوا نہیں کوئی، در تو میری آرزو  
 وصل بودید کا مجھے دید مرا وصال ہے  
 جان کے دس کارِ زدہ مجھے یہ پوچھتے ہیں پھر  
 آپ چھپا رہے ہیں کیوں، آپ کا کیا سوال ہے  
 دل بھی دیا دماغ بھی اجاہ بھی اور منال بھی  
 میری اگر ہے کوئی شے، آرزو کے وصال ہے  
 عشقِ مجاز نے مجھے ذوقِ طلب عطا کیا  
 دل پر جگر میں تنکدہ میں ایک ترخیل ہے  
 عرشِ خیالِ شعر پر لعل ہے آج جلوہ گر  
 یک قلم سے زلفِ لب از خودی کا حال ہے

جان کے بھی وہ نازِ دل مجھ سے پوچھتے ہیں پھر

ہم اس وقت اس بات سے بھی بحث نہیں کریں گے ان اشعار میں، جنہیں موعود اور اکبر رحمانی، دونوں نظم کہتے ہیں۔ مصنف نے اپنا تخلص ہائے محقق سے نظم کی تین مصرعوں میں، حالاں کہ ایک مقطع میں ہائے ہوز سے ایک اور جگہ نظم کیا ہے۔ (شاعر: ص ۱۶) :

اقبال ہوں، رومی ہوں کہ غالب ہوں کہ لمعہ

ہے سب کی فغاں یک تو ندانہ بیاں اور

یہ اسیم عام نہیں، اسیم خاص ہے۔ اور اس میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ خضر کے دو تلفظ کی بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ورنہ نظیر میں خاقانی کے دوسرے تخلص خاقانی کا توالہ برحق ہوگا۔ موعود بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے۔ انہیں شاید احساس بھی نہ ہو، اور اس بات کا علم بھی نہ ہو کہ ان کے تخلص کا وزن کیا ہے جب انہیں اطلاع نہیں تھی، تو ان کے گواہ رحمانی کو۔

پہلا مصرع ہی مضحکہ خیز ہے۔ لمعہ ہے، نیپین ہے اور آرزوے وصال ہے۔ وصال کس سے؟ وصال کے دو معنی ہیں۔ ایک: محبوب سے خلوت صحیحہ۔ وہ معنی یہاں بڑے عجیب سے ہوں گے کیونکہ ہجرہ نیپین کے کنرے خلوت صحیحہ! وصال کے دوسرے معنی اللہ کے عشق میں جاں بحق ہو جانا۔ یہ معنی کچھ کچھ نکالے جاسکتے ہیں۔ کیوں کہ آنکھ میں آنکھوں میں نہیں۔ کس آنکھوں میں دائیں میں کہ بائیں میں۔۔۔ یہ لمعہ نے راز رکھا ہے، شمس تبریز، ہے اور دل میں جمال ہے (اور جمال سے ان کی مراد جلال الدین رومی ہیں، جب چشم و دل میں شمس تبریز اور جلال الدین رومی ہوں، تو کوئی بھکوا معشوق، تو انسان کے روپ میں ان کا ہم عصر ہو، کیسے آرزوے وصال کا موضوع بن سکتا ہے لیکن پھر عشق مجازی نے انہیں ذوق سفر دیا۔ وہی مہمنون ہو گیا۔ چھوٹی گھوڑی بھوسیلے کھڑی۔ شمس تبریزی اور رومی کو چھوڑ چھاڑ، گاڑی پچھاڑی تڑا۔ دایں آگے عشق مجازی کے تھان پر۔ اور محبوب کا خیال دہی میں نہیں جگر میں بھی اور آنکھ (صیغہ واحد) میں بھی پیوست ہو گیا۔ خیال دہی و دہی میں رنٹاوری کی روایت کے مطابق، ہوتا ہے۔ لیکن لمعہ نے میڈیسن میں داخلہ تھا ANATOMY اور PHYSIOLOGY کی کتابیں دیکھی ہوں گی۔ جگر اور آنکھ میں بھی ایک تیراخیان ٹرانس پلانٹ کرنے کا گڑ بیکھ یا ہوگا۔ اگرچہ اعف کا ٹرانس پلانٹ ان کے زمانے میں نہیں ہوتا تھا۔

اقبال سے اصلاح بھی دیوائی گئی ہے۔ عشق خرام نیپین، موسم بر شگال ہے کہ اقبال سے



موجیں ہیں زور زور کی، موسم برشکاں، گردادیا ہے۔

اکبر رحمانی صاحب خاص ہوسے نوٹ کر لیں موسم برشکاں، اکاف فارسی سے کہاں رہنے نہ دیتے۔  
ورشا کاں، سنسکرت کا مرکب لفظ ہے۔ اس کا مفہم برشکاں ہے۔ پڑھے لکھے شاعر، برشکاں، اکاف  
عربی سے لکھتے ہیں۔ لہذا مبلغ علم فارسی سے ظاہر ہے کہ انھوں نے برشکاں لکھا۔ کہاں نے اگر واقعی اصلاح  
دی ہوتی، تو ان مصرعوں کو یک قلم، قابل اصلاح قرار دیتے۔

اور یہ اصلاحی مصرع ملاحظہ فرمائیں۔ موجیں ہیں زور زور کی، موسم برشکاں ہے۔  
سربفلک ہر ایک موج، موسم برشکاں ہے یا سربفلک ہے موج موج، موسم برشکاں ہے، یا کوئی مصرع  
لکھا جاسکتا تھا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو باقی مصرعے بھی معنوی اعتبار سے درست کرنا پڑتے۔ یہ حیرت کی بات  
ہے کہ مصرعے اگرچہ بے نیکی ہیں، لیکن ہیں وزن میں۔ حیرت اس لیے ہے کہ رحمانی نے لہجہ کی شاعرانہ عظمت  
کی گواہی میں جو کلام نقل کیا ہے، اس میں ناموزوں مصرعے بھی ہیں۔ چند مثلاً اس کلام بلاغت نظام سے  
جو اکبر رحمانی نے فخریہ نمونے کے طور پر پیش کیا ہے،

رسول خدا بھی ہے قرآن بھی میرا

دو عالم بھی میرے خدا بھی ہے میرا

ردیف تو میرا ہے قافیہ کیا ہے، اگر غیر مرد فہم ہے تو دونوں مصرعوں میں ایک ہی قافیہ !

نگہ دار اپنا نہ اموال اپنا

یہ دنیا ہے والٹر دین بسیرا

نگہ دار یا گھر دار، دونوں یہاں نا درست ہیں۔ اموال جمع ہے مال کی۔ اور اپنا صیغہ واحد میں ہے۔ دوسرا مصرع  
بکھرے سا قسط ہے۔

مقارب کا سب سے آسان آہنگ ہے۔ اس میں لہجہ کا یہ حال ہے۔

میں جو ہوا تو کیا ہوا، اور نہ ہوا تو کیا ہوا ہونے سے میرے بھڑپہ ہی باب خودی کا دا ہوا

ہو کے شریک سب میں میں، سب سے سدا جہا ہوا پا کے خودی کے باب کو، عشق کا باب دا ہوا

میر خدا خودی میری، میری خودی میرا خدا خود میں عیاں ہوا ہوں میں رہ کے جہان سے جد

قطع نظر اس کے اقبال کے مضامین، کچھ غائب کے خیال آمیز کر کے، اقبال کی پیروڈی کی گئی ہے لیکن یہاں

ان نکتوں پر توجہ دلانا ہے۔

۱۔ لے معہ سدس کے فارم سے بھی واقف نہیں، دوسرے وہ چوتھے مصرعوں میں ایک ہی قافیہ دآ ہے، جو لے معہ کے کلام کے اقبال کی نظر سے نہ گزرنے کا ثبوت ہے۔ اقبال سے جتنی تعریف و توفیق لے معہ کے کلام کی کرئی گئی ہے، وہ اقبال کے جعلی خطوط میں ہے۔ اکبر رحمانی نے بھی ان نظموں کو شاہکار قرار دے کر صرف یہ بات ثابت کی ہے کہ موصوف بھی فن شاعری سے نابلد ہیں۔

۲۔ ٹیپ کے شعر میں، پہلا مصرع یوں نوزدوں ہے :

میر خدا، خودی مری، میری خودی، مری خدا

ایک اٹل بند ہے۔

دکس فروش، ستر، علم فروش جامعات کھوکے خودی کو اپنے سب بن گئے لٹ منات مرد کی ہمتیں ہیں پست، مرد کی روح سرد ہے مغربیت کے رنگ میں زن بہ صفات مرد ہے بخری مصرع بڑی معنویت کا حامل ہے۔ موصوف کو شیکسپیر کے درس پر بھی غمراں ہے! بالیقین کا ملا نہ لے معہ کو معلوم تھا اور نہ اکبر رحمانی کو۔ حاصل نہ کیجیے دھر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو! اگر جامعات علم فروش ہیں، تو جب تک علم طلبہ کو قیثا بھی فراہم ہے تو مزہ بونے کی کیا بات ہے۔ خیر ان باتوں کو جاننے دیجیے۔ بیک وقت اکبر آبادی اور اقبال کی پیروڈی ہے۔ اور ہمیں یاد کرانے کی کوشش کی گئی یہ، اس کلام پر یا تو اقبال نے اصلاح کی، یا اسے اصلاح سے مستعنی سمجھا! اور یہ بھی کہ وہ اس سے مخلوط ہوئے، اور اس سے استفادہ بھی حاصل کیا۔

تیسرے مصرع کا عروضی پہلو توجہ چاہتا ہے۔

کھوکے خودی (مفتعلن)، ک آپ ل سب (مفاعن)، بن گئے لا (مفتعلن)، ت وامانات (مفاعلان) وعطف کو یک حرفی کے بجائے لے معہ نے وا دو حرفی نظم کیا ہے۔ یہ غلطی تو اوسط درجے کے متشاعر سے بھی نہیں ہوتی۔ دعویٰ ہے کہ یہ کلام اقبال کا اصلاح کردہ ہے۔ اور اسے سر لہتے ان کا قلم نہیں ٹھکتا تھا۔ جتنی نامعتبر لے معہ کی سخن گوئی ہے۔ اگر اس سے زیادہ نہیں تو، اتنی ہی نامعتبر اکبر رحمانی

کی سخن سنی ہے۔

لمعہ نے طرز غالب کی بھی ریڑھ ماری ہے، اور اکبر رحمانی نے اسے بھی شاہکاروں میں شمار کیا ہے۔  
ایک شعر ہے :

پندارِ مہمات عقدہ کشا ہائے نفس ہے کھونا ہے یہاں اور تو پا نل ہے وہاں اور  
پہلا مصرع وزن سے ساقط ہے، کیوں کہ عقدہ کے عین کو الف موصول کی طرح رکھا گیا ہے۔ عین موصول  
نہیں ہوتا۔

پندارِ مفعول، مائقہ (مفاعیل) کشا ہائے نفس ہے (فعلن)  
حشو کے پہلے مفاعیل میں مائقہ پڑھا جاتا ہے۔ عین غائب ہے۔ اس کی اجازت نہیں ہے۔ اس  
لیے یہ مصرع وزن سے ساقط ہے۔

لمعہ نے اپنا کلام اپنے دستِ برک سے لکھ کر اکبر رحمانی کو سند اور یادگار کے طور پر دیا تھا جو امر  
لال نہرویر، اقبال کی ایک مشہور زمین میں طبع آزمائی فرمائی گئی ہے۔ ۱۵ جولائی کو جو شاہکار رقم کیا گیا اس  
کا آخری شعر ہے۔

دیر و حرم کے بیکر، صاحبِ دل سمجھ گیا دیر کو رم رام ہے کعبہ کو سلام ابھی  
لمعہ کی طرف سے اکبر رحمانی یہ دیل نہیں دے سکتے کہ ابھی یہاں کوئی معنی نہیں دیتی، نہ سہی لیکن ردیف  
ہے، اس لیے آئے گی تو !

پانچ شعروں کی اس نظم میں ردیف کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا ہے۔ تیسرا شعر ہے :  
حبِ خدا سے ہے خروں حبِ طن کا احترام پینے دو مومنوں کو بھی شو شلزم کا جام ابھی  
پہلے مصرع میں ہے چھوٹ گیا تھا رحمانی نے فٹ نوٹ میں درست نہیں کیا۔ وہ ہے کے بغیر ہی اس شاہکار  
مصرع کا درد فرماتے ہوں گے۔ دوسرا مصرع پیٹ بھر کر ناموزوں ہے :

اکبر رحمانی نے یہ بڑا احسان کیا کہ لمعہ کا کلام، انھیں کے خط میں شائع کر دیا۔ جو ۱۹۷۲ء میں ایسا  
ناموزوں طبع ہو، وہ چالیس پر کس پہلے کس قیامت کا ناموزوں طبع ہوگا کیا اقبال لیے شاعر کی تک  
بندی پر داد و تحسین کے ڈونگمے برسا سکتے تھے ؟

اپنی زبان میں جو اس پائے کی شاعری کرے۔ شو شلزم کو شو شلزم لکھے، اس نے انگریزی

میں جوتیں مارے ہوں گے، ان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ماسٹر اختر نے ص ۹۱ پر اعتراض کیا ہے۔ بمبئی میں نیپٹین نام کا کوئی دریا نہیں ہے  
 ہمارے ہاں کی پشت پر سمندر کا کنارہ ہے۔ اس کنارے کو آج بھی نیپٹین سی کہا جاتا ہے۔ یہ اعتراض درست  
 نہیں ہے۔ دریا فارسی خت ہے۔ اور بحیرہ کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تفصیل میں نہ  
 جلتے ہوئے، صرف ”عمور دریاے شور“ کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

سائیمواں خط انگریزی کا بتایا گیا ہے۔ جس کا ترجمہ اقبل نامہ میں درج ہے۔ بالواسطہ اندازہ  
 میں اس کلام بلاغت نظام کی تعریف کی گئی ہے، جس کے کچھ نمونوں پر ابھی گفتگو ہوئی ہے۔ لطف لینے  
 کے لیے یہ جملہ ملاحظہ فرمائیں:

”مجھے امید ہے کہ آپ کی نظمیں بارگاہ خسروی میں مقبول ہوتی ہیں، اور اعلیٰ حضرت  
 آپ کو بیرون ملک جانے کے لیے وثیفہ مرحمت فرمائیں گے۔“  
 لو نے تکلف سے کام لیا۔ خط میں لکھوا سکتے تھے کہ حضور نظام اگر فصاحت جنگ جلیل کے بجائے  
 آپ کو استاد مقرر کر لیں تو دولت آصفیہ کو چار چاند لگ جائیں گے۔

### اٹھائیسواں

مکرم بندہ۔ تسلیم۔ نوازش نامہ ابھی ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب جناب کی والدہ صاحبہ قبلہ  
 کی صحت اچھی ہے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ایک روز تک ہمارے  
 عزت کدہ میں وہ کیفیت تھی، جس کو غائب نے شاید ہماری محبت کے بارے میں  
 موزوں کیا ہوگا۔

اے ممانہ واردان بساطِ ہوائے دل

سے آغار کیا، اور

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی ٹوکشس ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عجیب قسم کی فرض کامیڈی کا ٹریجڈی پر مبنی انجام ہے۔  
 جس ڈراما کی ایکٹنگ ہم آپ جیسے انسان انجام دے رہے ہیں۔ اس کے  
 ڈائریکٹر کی احسان نوازی پر محرمین چاہیے کہ اس نے اپنے ڈراما کی شوٹنگ کے لیے



انسان کو منحصر فرمایا۔ دنیا میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ دونوں بے معنی لفظ ہیں، اور اس دھن میں دنیا کی اکثریت لگی ہوئی ہے۔

انسان صرف جو یا سے محبت، اور اپنے یا حقیقی کی دھن میں لگا رہا ہے۔ باقی تمام عبت، اور خیالی دنیا کا ہے ہودہ فلسفہ ہے۔ ہم اس کو ڈھونڈتے رہیں، جو ہم کو ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ اس کو ڈھونڈ میں خوب ڈھونڈیں اور اتنا ڈھونڈیں کہ اپنے آپ کو پالیں۔ آپ کی چند ساعت صحبت میں میرے دل کو سرور حاصل ہوا۔ آپ درحقیقت مسرت فروش ہیں۔ خدا آپ کو ہر طرح بامراد اور کامیاب رکھے۔ میری صحت خراب ہو رہی ہے بینائی میں فرق آگیا ہے۔ اختلاج بہت بڑھ گیا ہے۔ پرہیز کا میں قائل نہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ امتحان کا وقت قریب آگیا۔ تقرب نصیب ہو رہا ہے۔ ہم آغوشی بھی مل جائے گی۔

آپ کی وادہ صاحبہ قبلہ کی خدمت میں میری جانب سے قدم بوسی عرض کیجیے۔

مخلص محمد اقبال

۲، مئی ۱۹۳۷ء

القاب و آداب کے سلسلے میں ہر مکتوب نگار کی کچھ عادتیں ہوتی ہیں۔ آئیے دیکھیں اقبال کا کیا طریق تھا۔  
۱۳ جون ۱۳۷۷ء کے خط میں اعجاز احمد کو ۱

”تمہارا نام کامیاب طلبا میں دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ . . . الحمد للہ تم نے پہلی منزل طے کرنی۔ . . . اپنے ابا سے میرا سلام کہنا، اور ان کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد دینا۔ والد مکرم اور والدہ کی خدمت میں مبارک باد کہنا۔“

۳ اگست ۱۳۷۷ء کے خط میں اعجاز احمد کو :

”والد مکرم کی خدمت میں عرض کرنا کہ میں ۵ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ان کی خدمت میں پہنچوں گا۔ تم اسٹیشن پر آ جانا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔“

۵ اپریل ۱۳۷۹ء کے خط میں شیخ عطاء محمد کو ۱

برادر مکرم السلام علیکم۔ الحمد للہ آپ مع الخیر سیالکوٹ پہنچ گئے۔ . . . والد مکرم کی خدمت

میں سلام عرض کریں  
۵ مئی ۱۹۷۷ء کو والد شیخ نور محمد کو :

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم

پوسٹ کارڈ مل گیا ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آج ہی ملا ہے۔ وہاں بھی خدا کے  
فضل و کرم سے خیریت ہے۔ یہاں سب لوگ بفضلہ خیریت سے ہیں، اور سب کی  
طرف سے آپ کو آداب عرض ہے۔

۱۳ مئی ۱۹۷۷ء

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا تھا خدا کے فضل و کرم سے سب خیریت ہے۔ . . . .

۱۰ مئی ۱۹۷۷ء

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ سب خیریت ہے۔ . . . .

۸ جولائی ۱۹۷۷ء کے خط میں اعجاز احمد کو :

برخوردار اعجاز کو بعد دعائے عمر درازی کے واضح ہو کہ تمہارا خط مل گیا تھا۔ . . . میں  
انشار اللہ ۲۹ جولائی کو یہاں سے سیالکوٹ آنے کا قصد رکھتا ہوں۔ . . باقی خدا کے  
فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں میری طرف سے آداب کہیں۔ . .

۲۰ جولائی ۱۹۷۷ء کے خط میں والد کو :

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ یہاں پر بھی خدا کے فضل سے ہر طرح  
خیریت ہے۔ . . .

۲۶ جولائی ۱۹۷۷ء

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم

۔ . . ۲۸ جولائی کو لاہور میں ایک مقدمہ ہے۔ اس سے فارغ ہو کر انشار اللہ ۳ جولائی

کو حاضر خدمت ہونے کا قصد ہے۔

۱۹ اگست ۱۹۷۱ء کے خط میں اعجاز احمد کو :

برخوردار اعجاز احمد طال عمر

کل میں نے تمہیں تار دیا تھا۔۔۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کرنا۔۔۔

۱۹ اگست ۱۹۷۱ء کے خط میں :

برخوردار اعجاز طال عمر

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ خیریت ہے۔۔۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب۔۔۔ والدہ مکرم کی خدمت میں عرض کریں کہ میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ دوسرے روز ایک مقدمہ مل گیا۔۔۔

۱۹ اگست ۱۹۷۱ء کے خط میں :

برخوردار اعجاز طال عمر

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ والد مکرم کا خط بھی ساتھ ملا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔

ان قتب سات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اقبال کا اسلوب سادہ عبارت لکھنے کا ہے۔ چھ دار عبارت کا نہیں۔ ایک تو موعہ کالا ہو رہا تھا۔ پھر اقبال ان کے رخصت ہونے کے بعد غزوں کے مضامین والا خط لکھتے۔ اور اپنے دل کی دیرانی اور یاسی کے لیے غالب کے قطع کا سہارا لیتے ؛ فرض نہیں فرمائی ہونا چاہیے۔ کامیڈی کا ٹریجڈی بے معنی اصطلاح ہے COMICO-TRAGEDY کو میکو ٹریجڈی موعہ نے کہیں پڑھا ہوگا۔ اس خط میں نقل کرتے وقت غلطی ہو گئی۔ ایک تو یہ عبارت اقبال کے مزاج اور ان کے اسلوب کی نہیں ہے۔ بالفرض وہ لکھتے بھی تو جملہ کچھ اور ہوتا اور کامیڈی کا ٹریجڈی نہیں کو میکو ٹریجڈی لکھتے۔ پتہ نہیں جو یا سے محبت، یا حقیقی کی دھن اور باقی تمام عبث اور خیالی دین کا فلسفہ کس عبارت کا الٹا سیدھا ترجمہ ہے۔ کیا جملہ ہے۔ آپ کی چند ساعت محبت میں دل کو سرور حاصل ہو !

آپ کی والدہ صاحبہ قبلہ کی خدمت میں میری جانب سے قدمبوسی عرض کیجیے۔ اپنی والدہ صاحبہ۔  
 .... کہ جگہ آپ کی، انگریزی کا براہ راست ترجمہ ہے۔ اور قدمبوسی عرض نہیں کی جاتی یہ اقبال  
 کے جیسے نہیں ہو سکتے۔ اور اقبال نے قدمبوسی کبھی عطیہ فیضی کی نہیں کی۔ صرف اپنے والد کے لیے لکھا ہے  
 کہ قدمبوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ اپنے بھتیجے اور بھائی کے خطوں میں والدہ کو آداب عرض لکھا ہے۔  
 ان چند وجوہ کی بنا پر، یہ اقبال کا لکھا ہوا خط نہیں ہے۔

### انٹیموواں اور آخری خط

میور وڈ۔ لاہور

۳۱ اگست ۱۹۳۷ء

جناب من۔ ضعیف بھارت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے  
 منع کر دیا ہے۔ اس واسطے وہ اپنے دستخط آپ کو خط نہیں لکھ سکے۔ دیوان غالب  
 کی ترسیل کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں، اور آپ کے ملاقات کی آرزو رکھتے ہیں۔

والسلام

محمد شفیع ایم۔ اے

رسمی جواب ہے۔ چوں کہ اقبال نے خود نہیں لکھا ہے۔ اس لیے اس پر گفتگو کی ضرورت بھی نہیں۔ البتہ  
 ”آپ سے ملاقات کی آرزو“ سے یہ بات بڑی حد تک ثابت ہو جاتی ہے کہ پہلے خط میں جس ملاقات  
 کا ذکر ہے، وہ معرکہ خیالی دنیا کی بات ہے۔

اکبر رحمانی چوں کہ ابھی تک اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ ان کے سبز قرین موکل کے نام  
 علامہ اقبال کے سارے خطوط کھرے ہیں، اور ان کا موکل، جس کی شاعری کی اتنی تعریف و توصیف  
 شاعر مشرق نے کی ہے۔ عظیم المرتبت شاعر تھا، اس لیے یہ معروضات پیش کی گئیں۔



## مول چند منشی کی ایک نادر تصنیف

شاہنامہ فردوسی، حماسہ نگاری میں ایک عہد آفریں تصنیف ہے۔ رزمیہ شاعری میں شاہنامہ کی عظمت کے شعری نمونے بہت کم دستیاب ہیں۔ یہ بے مثال تصنیف اگرچہ فارسی زبان کے حصے میں آئی لیکن اس نے حماسی اور رزمیہ ادب کی جس عظیم الشان روایت کو جنم دیا اور پوری دنیا کے ادب کو جس طرح متاثر کیا، اس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے ادب میں نہیں ملتی۔

برصغیر میں شاہنامہ فردوسی کا رواج اور قبول عام ایک خاص تاریخی پس منظر رکھتا ہے اس خطے میں شاہنامہ کے تعارف غالباً اس کے زمانہ تصنیف سے ہی ہو چکا تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں جہاں ایران و توران کے اہل علم، ادبا اور شعراء کی بڑی تعداد موجود تھی وہاں برصغیر کے بلند پایہ صاحبان علم و فضل بھی موجود تھے۔ جن کی برصغیر کے مختلف علوم و فنون اور زبانوں پر ماہرانہ دسترس غزنوی دربار کے لیے طرہ افتخار تھی۔ غزنوی دربار میں جہاں فارسی کے بلند پایہ ادیب اور شاعر اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے تھے وہاں سنسکرت اور برصغیر کی دیگر مقامی زبانوں کے شعراء کو بھی سلطان اور اہل دربار سے داد و تحسین حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ دورہ غزنوی کے مستند ماخذ "تاریخ بیہقی" میں ایسے واقعات موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے سلطان محمود اور اس کے جانشین نہ صرف برصغیر کی زبانوں میں لکھی گئی تخلیقی کاوشوں کے قدردان تھے بلکہ خود بھی کافی حد تک سنسکرت اور اس ملک کی دیگر

مقامی زبانیں جانتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دربار غزنی سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں میں بھی باہمی استفادے اور فیض رسانی کا سلسلہ جاری تھا۔ پنجاب کے دربار غزنی کے ساتھ الحاق کے بعد یہ عمل اور زیادہ تیز اور وسیع ہو گیا تھا۔ غزنوی عہد کے اکابر شعراء کے کلام میں برصغیر کے مقامی الفاظ کی موجودگی اس بات کا بین ثبوت ہے۔ فرخی، عجمی، انوری، مسعود سعد سلمان، فردوسی کوئی شاعر ایسا نہیں جس کے کلام میں برصغیر کی زبانوں کے الفاظ موجود نہ ہوں۔ یہ الفاظ آج بھی اردو زبان کا حصہ ہیں۔ بطور مثال مسعود سعد سلمان اور فردوسی کا ایک ایک شعر پیش خدمت ہے۔

مسعود سعد سلمان :

چوں رعد زابر بغرید کوس محمودی  
برآمد از پس دیوار حصن "مارمار"

فردوسی :

ز سر "شارہ ہندوی" برگرفت  
پیادہ شد و دست بر سر گرفت

فردوسی کے ہاں برصغیر کی تہذیب کے اثرات اور برصغیر کی تاریخ سے متعلق بعض اطلاعات اس امر کا ثبوت ہیں کہ شاہنامہ کے مصنف کو اس علاقے کی تاریخ، ثقافت اور زبان سے خاص دلچسپی تھی۔ غزنوی دربار میں قصیدہ نگاری کے بعد جس ادبی فن پارے کو سب سے اہم اور بلند مقام حاصل تھا وہ شاہنامہ فردوسی تھا بلکہ دربار کی ادبی سیاست اور شعراء کی باہمی رقابت نے اسے ہر دور دشمن کی توجہ کا محور بنا دیا تھا۔ شاہنامہ فردوسی اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے یقیناً اس دور کے ادب کا سرمایہ افتخار تھا اور اس دور کا کوئی اہل علم اور اہل ادب اس کی عظمت کے سحر سے اپنے آپ کو باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ چنانچہ جب پنجاب نے علمی، ادبی اور تہذیبی سرمایہ کاری کے اعتبار سے غزنی ثانی کا درجہ حاصل کیا تو فارسی ادب کی درختان روایت کے طور پر شاہنامہ فردوسی نے بھی اپنی ادبی اور لسانی فتوحات کا دائرہ پنجاب اور اس کے بعد غزنوی خاندان کی دیگر سیاسی سرحدوں

تک پھیلا دیا۔ برصغیر کے سنسکرت زبان میں لکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کے آثار میں شاہانہ فردوسی کا اثر و نفوذ اس بات کا بین ثبوت ہے۔ چنانچہ سنسکرت اور ہندی زبان کی قدیم کتابوں؛ راجا ولی، راج ترنگنی، راجا ولی پتا کا اور پرکھی راج راسا پر شاہنامہ فردوسی کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ تصانیف گیارہویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک پھیلی ہوئی ہیں۔

برصغیر کے قدیم فارسی گو شعرا بھی شاہنامہ فردوسی کی عظمت کے معترف تھے۔ ڈاکٹر شہریار نقوی مرحوم نے مسعود سعد سلمان، ابوالفرج رونی، تاج الدین ریزہ، بدر چاچ اور امیر خسرو دہلوی کے کلام میں شاہنامہ فردوسی کے کرداروں، داستانوں اور تاریخی واقعات کی نشاندہی کی ہے۔ علاء الدین خلجی کے دور میں فخر الدین قواسی نے ”فرہنگ نامہ قواس“ ترتیب دیا جو شاہنامہ فردوسی کے مطالب اور اس میں شامل پہلوی الفاظ کی تشریح ہے۔ قواس کا بیان ہے۔

”نخست شاہنامہ را کہ شاہ نامہ ہا است پیش آوردم و از سر تا پایا بخانہ فرد خواندم۔ آں چہ از سخن پہلوی بود، ہمہ راجہ گانہ بر کاغذ نوشتہم۔ فرہنگ نامہ ہا سے دیگر کہ آں را فرہنگ نامہ نیشہ اند در زبان تازی و پارسی ترجمان کردہ ہمہ را فرد فرد یکان یکان در خانہ کاغذ نگار آوردم و آں را بخش بخش و گو نہ گو نہ و بہرہ بہرہ کردم“

”فرہنگ نامہ قواس“ کی طرح ایک اور لغت ”گنج نامہ“ بھی شاہنامہ فردوسی کی فرہنگ ہے جس کے مصنف سلطان عبداللہ قطب شاہ دان گو لکنڈہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصنف کا نام علی بن طیفور بسطامی ہے۔

برصغیر میں مغلیہ عہد شاہنامہ شناسی کے ایک نئے دور سے وابستہ ہے۔ ہمایوں کی ایران سے واپسی اور مغلیہ خاندان کے برصغیر میں اقتدار کی بحالی کے بعد یہاں اگر ایک طرف ایران کے تہذیبی، فکری اور علمی اثرات نے رواج پایا تو دوسری طرف فارسی زبان و ادب کو بطور خاص فروغ حاصل ہوا۔ شاہنامہ فردوسی ان اہم تصانیف میں سے ایک تھا جسے ادب



اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے خواص و عوام نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ برصغیر کے فارسی ادب پر شاہنامے کے اثرات سے متعلق ڈاکٹر احمد شمیم داری کا مقالہ قابل قدر معلومات رکھتا ہے۔ یہ مقالہ بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہو جائے گا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دور میں جہاں شاہنامے کی ادبی، لسانی اور فنی خوبیوں کو سراہا گیا وہاں اس کا طول کلام مغلیہ دور کے نفاست پسند معاشرے کو گراں گزرا چنانچہ ۱۷۱۰ء کے بیٹے اکبر بادشاہ کے دور میں ہی محسوس کیا گیا کہ اس عظیم لیکن ضمیمہ تصنیف کا اختصار اور خلاصہ تیار ہونا چاہیے۔ اس ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے تقی شیشتری نے شاہنامے کا فارسی نثر میں خلاصہ تیار کیا۔ یہ شاہنامے کا اولین خلاصہ تھا۔

شاہنامہ فردوسی کا دوسرا اہم خلاصہ اکبر کے پوتے شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں ہوا۔ اس کتاب کا نام "تاریخ دکنشائے شمشیر خاں" یا تاریخ شمشیر خانی ہے اسے بطور اختصار محض "شمشیر خانی" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مصنف توکل بیگ بن توکل بیگ حسینی ہیں۔ شمشیر خانی کے اثرات چوں کہ اپنے بعد پیدا ہونے والے ادب پر براہ راست ہوئے، اس لیے اس کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ بے موقع نہ ہو گا۔

شمشیر خانی ۲۶۔ جلوس شاہجہاں ۱۰۶۳ھ میں تصنیف ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شہزادہ داراشکوہ کو قندھار کی ہم سر کرنے کے لیے صوبہ دار کا بل بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس زمانے میں غزنی کا حکمران جسے شاہجہاں نامہ کے مصنف نے "تھانہ دار غزنین" لکھا ہے شمشیر خاں ترین تھا۔ اسے مغل دربار سے سہ ہزاری کا منصب حاصل تھا۔ محمد صالح کنبو کے مطابق ۲۴۔ جمادی الثانی ۱۰۶۲ھ مطابق ۲۔ جون ۱۶۵۳ء کو شاہجہاں کے دربار سے شمشیر خاں ترین کو خلعت اور نقارہ عطا ہوا۔ اور اسے غزنی پہنچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ شمشیر خاں نے اپنے امین اور واقعہ نویس توکل بیگ سے فرمائش کی کہ وہ شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ نثر میں تیار کریں چنانچہ سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:۔

"پوشیدہ نامہ کہ امیں رسالہ مختصر در ہنگام سنہ ہزار شصت و سہ ہجری مطابق سنہ بیست و شش جلوس ہمایوں صاحب قرآن ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی در وقتیکہ



صوبہ دار الملک کابل بشہزادہ والا گھر جہاں پناہ کثورتان درۃ التاج نینت الملت  
والدین آن کہ عالم جہاں صاحبقران این چنین جہاں باں در پیچ مکانی ندیدہ  
و در پیچ قرنی نشیدہ، یعنی شہزادہ دارہ شکوہ سلم اللہ و البقا۔ بادشاہ پدر  
بزرگوار آن گوہر والا نثراد تفویض فرمود، اقل العباد یعنی توکل دار شہزادہ بلند  
اتجال بہت خدمت، مینی واقع بیسی بلکہ غزنین تعین نمودہ بودن، باتمام  
والنصرم رسید۔ باعث این تحریر و مقصد این تقریر بدان بود کہ امارت و ایالت  
پناہ حثت و اجلال دست گاہ، شوکت اشتباہ خان، عالی شان سمو الملکان شمشیر  
خان حاکم غزنین کہ متحلی بحلیہ عدالت و قوت و مزین بزینت سخاوت و شجاعت  
است و در خلق و حلم نظیر و ہمتا نہاشت۔ با اینہہ صفت ہاے حمیدہ کہ ایزد  
متعال طبع بلند و ادراک عالی بخان مشار الیہ نیز عطا فرمودہ لہذا دایم الاوقات  
ذہن مستقیمش بدریافت مطالب اعلیٰ و مقاصد عظمیٰ توجیہ داشت۔ روزی خاں  
رفیع المقدر برسبیل اتفاق بیاران سخندان کہ در مجلس جنت آشنائش حاضر  
بودند، اشاعت نمودند کہ اگر کتاب تاریخی بہ ہم رسد کہ از احوال پادشاہان  
ایران و توران بطریق اجمال و بلغت اختصار توان برکیف آن وقوف یافت  
بسیار خوب است۔ احضار مجلس جواب دارند بر حصول این مطلب بہ از شاہنامہ  
حکیم فردوسی ایچ مکانی ندارد۔ و امارت پناہ مشار اللہ گفت کہ شاہنامہ را حکیم  
فردوسی بسیار طولانی گفتہ است۔ عرض مصنف فصاحت و بلاغت شعر است  
بنا بران بعضی مطالب اندک ازہ برائے شاعری و قدرت ہمیں نمودن در لغت  
بسیار آوردہ است۔ حاصل کلام بعد از دیر و انتظار بسیار مفہوم میشود و از خواندن  
و شنیدن این پارسی سامع را ملال دست میر بہ خصوصاً اہل حکومت را کہ  
ہمیشہ در تمدن ہیر مملکت داری اشتغال دارند و فرصت مطالعہ کتب کمتر و می ہر  
اگر کسی ترجمہ نظم شاہنامہ را با س نثر پوشانیدہ بہ عبارت موخر و مختصر ربط  
دارد بیان نماید بس نیکو باشد۔ یاران خاموش ماندند۔ این خاکسار محض

برسے رضامندی آں والا جاہ رس معنی قبول نموده محرر این نسخہ گردید تاہر کرا شوق و  
ارادہ اطلاع بر احوال تاریخ پادشہان ماضی شود۔ ازین مختصر باستی و خوبی تمام  
مقصد کلام معلوم خود حاصل سازد و این رسالہ را بتاریخ دل کشای شمشیر خاں نام  
نہاد و امید از قاریان محقر آں است کہ ہر جاہ کہ سہوی و خطای بیند باصلاح  
کوشند۔

اس تفصیل کے مطابق شمشیر خانی کی تالیف کا سبب ایک تو شاہنامے کی طوالت سے بچ کر اس کے  
مطالب تک براہ راست رسائی ہے اور دوسرا اس لؤل کلام سے پیدا ہونے والی اکتاہٹ  
سے اپنے ممدوح کو بچانا ہے۔

۴ صفر ۱۰۶۳ھ مطابق ۸ بہمن ۱۰۴۲ شمسی ۶۱ - جنوری ۱۶۵۳ء کی جشن و زین شمسی سے  
فراغت کے بعد شاہجہاں بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ شہزادہ دارا شکوہ کو شہر قندھار کی ہم پروردانہ  
کیا جائے چنانچہ اس مقصد کے لیے شہزادہ دارا شکوہ نے ۳ ربیع الاول ۱۰۶۳ھ مطابق  
یکم فروری ۱۶۵۳ء کو لاہور سے کوچ کیا اور ۵ جمادی الثانی ۱۰۶۳ھ مطابق ۳ مئی ۱۶۵۳ء کو قلعہ  
قندھار کی حدود میں داخل ہوئے۔ توکل بیگ نے لکھا ہے کہ شمشیر خانی کا خلاصہ ۲۶ جلوں میں  
شاہجہانی ۱۰۶۳ھ کو اس وقت تیار کیا گیا جب شہزادہ دارا شکوہ کو کابل کا سو بہ دار مقرر کیا گیا  
تھا۔ اس جگہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ یکم جمادی الثانی ۱۰۶۳ھ کو ستائیسواں جلوس شاہجہانی  
شروع ہو گیا تھا۔ اس اعتبار سے ۳ ربیع الاول ۱۰۶۳ھ سے یکم جمادی الثانی تک تقریباً دو ماہ  
تائیس دن بنتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں تاریخ شمشیر خانی تصنیف ہوئی۔ دارا شکوہ بھی  
اورنگ زیب کی طرح قندھار کی ہم میں ناکام ہوئے۔ اور محمد صالح کنہو کے مطابق تاریخ پانزدہم  
شہر محرم الحرام سنہ یک ہزار و شست و چار داخل دولت خانہ در السلطنت لاہور شد۔ تمام  
قرائن پر غور کرنے کے بعد یہ کہیں واضح نہیں ہوتا کہ تاریخ شمشیر خانی شہزادہ دارا شکوہ کی فرمائش  
پر لکھی گئی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ شمشیر خان ترین نے کتاب کا نسخہ اپنے طور پر قندھار میں شہزادے  
کی خدمت میں پیش کر دیا ہو۔ کیوں کہ برصغیر میں اس کتاب کے قلمی نسخوں کی بکثرت تعداد اس امر  
کو واضح کرتی ہے کہ کتاب نے اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا۔ آقے احمد منزوی

کی فراہم کی ہوئی تفصیل کے مطابق صرف پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں اس کتاب کے پچاس سے زائد قلمی نسخے موجود ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں قیام مشہد کے دوران میری نظرت اس کتاب کا ایک مصیر نسخہ گزرا تھا جو بے تاریخ ہونے کے باوجود معاشرہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ مشہد کے مشہور عتیقہ فروش آقاسے جبر سمار کی ملکیت تھا۔ تاریخ شمشیر خانی اپنے اختصار اور اسلوب کے اعتبار سے مقبول ہوئی چنانچہ برصغیر میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ہی اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے پر توجہ دی گئی۔ ان تراجم میں تھانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک زیر نظر کتاب دوسری مرزا مہدی مقبول کا اردو شاہنامہ اور دوسری رجب علی بیگ سرور کی تصنیف ”سرور سلطانی“ اس سے پہلے کہ ان تینوں تصانیف کا ذکر کیا جائے اور زیر نظر کتاب پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے اردو ادب کی تاریخ میں شاہنامہ فردوسی کے تراجم کے رواج پر مختصر گفتگو نامناسب نہیں ہوگی۔

اردو ادب میں شاہنامہ فردوسی، تراجم، مطاب اور اسلوب تینوں صورتوں میں داخل ہوا۔ سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں برصغیر میں دکن اردو ادب کے فروغ کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں فارسی ادب کی روایت نے اردو کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ جب سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر ملک خشتود نے امیر خسرو کی یوسف زلیخا اور ہشت بہشت کو دکنی اردو میں منتقل کیا تو گویا یہ اردو ادب کو فارسی زبان کے اسلوب میں ڈھالنے کے منشور کا اعلان تھا۔ اردو زبان کے تخلیقی دائرہ عمل کو وسیع کرنے کے لیے یہ امریوں بھی ناگزیر تھے۔ ہندوی زبان جس سے اردو زبان کو تہذیبی اور سیاسی قربت تھی، اس کے تخلیقی سوتوں میں سنسکرت خون خشک ہو رہا تھا۔ لہذا اردو زبان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی نقائے حیات کے لیے فارسی زبان کے گرم جوش اور حیات بخش خون سے استفادہ کرے۔ اردو کے مصنفین اور شعراء نے اپنے ادب کو فارسی کے مقام پر لانے کے لیے سب سے پہلے تراجم کے عمل کو اپنایا۔ دکن میں سلطان محمد عادل شاہ کا دور فارسی ادب سے اردو تراجم کے لیے امتیازی اہمیت رکھتا ہے۔ کہاں خان رستمی کا خادرجا اس دور کی اہم یادگار ہے جو ابن حزم کی تصنیف خادرجا نامہ (۱۱۳۴ء) کا اردو روپ ہے۔ ابن حزم نے اپنی کتاب کی بنیاد شاہنامہ فردوسی پر رکھی تھی۔ لہذا یہ بات قابل توجہ ہے کہ خادرجا نامہ رستمی اردو ادب میں شاہنامہ فردوسی کا قدیم ترین نقش ہے۔ اس ترجمے میں شاہنامے کی روح اس قدر



سرايت کیے ہوئے ہے کہ اس سے شاہنامے کے اس دور کی تہذیبی زندگی میں ایک اہم تخلیقی قوت ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ بلوچ مثال خاوند نامہ ابن حاتم اور خاوند نامہ رستمی کے چند اشعار آٹھ سائے رکھ کر ملاحظہ فرمائیے۔ یہ شعراء اردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر جمیل جاہلی نے انتخاب کیے ہیں۔

خاوند نامہ رستمی

خاوند نامہ ابن حاتم

رکھے کوہ زریں کمر کے اوپر  
کہ ہیں تاج مشکیں کہ ہیں تاج زر  
کہوں راز کی چرخ کا کھول کہ  
زمین سات طبقات رکھیا قول کہ  
عروس بہار آکر سے انجمن  
زمین پر اسے لار و نستر

ہند بر سر کوہ زریں کمر  
گہی چتر مشکیں گہی تاج زر  
چہ می گویم از راز چرخ بلند  
نگ کن بریں تیرہ خاک نژاد  
بر آید عروس بہار از چمن  
بروید گل و لار و نستر

ان اشعار میں ابن حاتم کے وسیلے سے رستمی شاہنامے کی بحر، اسلوب اور تخلیقی جوہر تینوں کو اپنے کلام میں کور ہے ہیں۔ گویا یہ تہذیبی شاہنامے کی زبان کی ہی اردو میں آمیزش نہیں بلکہ اس تہذیبی عمل کی شرکت بھی ہے۔ جس نے آگے چل کر اردو شاعری کو اسایب کی رنگارنگی اور قوت ظہار کی فراوانی سے مالا مال کیا۔ چنانچہ اسی دور میں نصرتی نے مثنوی "علی نامہ" لکھی جو علی عادل شاہ کی حکومت کے ابتدائی دس برسوں کی منظوم داستان ہے۔ اس مثنوی میں بھی شاہنامہ فردوسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ نصرتی نے شاہنامے کے معیار کو سامنے رکھ کر نہ صرف اس کے لب و لہجے کو اپنا لیا بلکہ اس کی مثال زمرہ ردایت و حماسی اسلوب سے بھی استفادہ کیا۔ ڈاکٹر جمیل جاہلی کے بقول "میدان جنگ کے نقشے فوجوں کی معرکہ آرائی، قلعوں کے محاصرے، تلواروں کی برش، تیروں کی برش، گھوڑوں کی چستی، فوجوں کا دبدبہ اور ساری کیفیات و منظر کی جیسی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔"

دکنی ادب کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں جتنے بھی فارسی ادب سے منظوم اردو تراجم ہوئے ان میں سے بیشتر کی بحر شاہنامہ فردوسی کے مطابق رکھی گئی اور ان میں شاہنامے کے اسلوب سے بطور خاص استفادہ کیا گیا۔ ان تصانیف میں سے چند ایک کے



نام درج ذیل ہیں۔

۱۰۲۵ھ	تصنیف	غواصی	سیف الملوک بدیع الجہال :
۱۰۳۵ھ	"	قطب رازی	تحفۃ العاشقین
۱۰۴۵ھ	"	غواصی	طلوٹ نامہ
"	"	محمد نصرت نصری	گلشن عشق
۱۰۹۱ھ	"	غلام علی دکنی	پدماوت
۱۰۹۵ھ	"	غلام	ظفر نامہ
۱۱۰۰ھ	"	سید محمد عاجز	قصہ ملکہ مصر
۱۱۴۳ھ	"	عشق اللہ عشق	اشارات الغافلین
۱۳۱۳ھ	"	محمد علی خاں شوق	مثنوی چہار درویش

دکن سے اردو شاعری کی بھرپور روایت جب شمالی ہند میں پہنچی تو شاہنامہ فردوسی کی ترویج بھی اس کے ساتھ موجود تھی۔ ۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں جب میر حسن نے اردو کی معرکہ آرا مثنوی سحرالبیان تصنیف کی تو شاہنامہ فردوسی کو نہ صرف بطور لسانی اور ادبی ماخذ استعمال کیا بلکہ اس کے اسلوب خالص اور روح مطالب سے بھی استفادہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں پرہیزگار بات یہ ہے کہ سحرالبیان کی بحر بھی شاہنامہ فردوسی ہی کی ہے۔ فردوسی کا شعر ہے :

زنقارہ آواز آید بروں

کہ دون است دون است گردون دون

اس شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے مثنوی سحرالبیان کا مندرجہ ذیل بیت ملاحظہ فرمائیے۔

کہا زیر نے ہم سے بہر شگون

کہ دون دون خوشی کی خبر کیونہ دوں

دونوں اشعار کے مفہوم جدا ہیں لیکن آہنگ اور صوتی تاثر کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ہم دست نظر آتے ہیں۔

برصغیر میں شاہنامے کے مطالب کا باقاعدہ اور رسمی ترجمہ تاریخ شمشیر خانی کے توسط سے ہوا۔ شاہنامے کا قدیم ترین اردو ترجمہ اگرچہ لالہ بہیم چند کا تھا جس کی اطلاع دکن میں اردو کے مصنف نصیر الدین ہاشمی اور فارسی ادب کے منظوم اردو تراجم (تحقیقی مقالہ) کے مصنف ڈاکٹر بشیر حسین نے دی ہے۔ لالہ بہیم چند دیو گڑھ کے قلعہ دار برہان شاہ کا متوسل تھا۔ یہ ترجمہ ۱۲۰۰ھ میں مکمل ہوا، لیکن اس کا کوئی مخطوطہ اس وقت برصغیر کے متعارف کتب خانوں میں موجود نہیں ہے۔ اس کے باسے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مکمل شاہنامے کا ترجمہ تھا یا منتخب حصوں کا۔ ساتھ ہی یہ کہ لالہ بہیم چند نے اہل شاہنامے کو مد نظر رکھا یا تاریخ شمشیر خانی کو۔ ان سب نکات کے جواب مثنوی کا متن حاصل ہونے کے بعد ہی دیئے جاسکتے ہیں۔

تاریخ شمشیر خانی سے براہ راست جن تین اردو تراجم کا ذکر کیا گیا تھا ان میں قدیم ترین مثنوی مولچند کا زیر نظر ترجمہ ہے۔ دوسرا ترجمہ منظوم ترجمہ مرزا مہدی خاں مقبول کا ہے جو ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں مکمل ہوا۔ مقبول، محمد مرزا لکھنوی کے فرزند اور اردو کے معروف شاعر امام بخش ماسخ دہلوی ۱۸۳۸ء کے شاگرد تھے۔ کتاب کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس مائبریری لندن میں موجود ہے۔ "میسر ترجمہ سرور سلطانی" اردو کے نامور انشا پرداز جب علی بیگ سرور نے سلطان واجد علی شاہ اختر تاجدار اودھ کی فرمائش پر کیا۔ تینوں تراجم کا مقصد اپنے ماخذ شمشیر خانی کے تتبع میں شاہنامے کو بطور اختصار قارئین تک پہنچانا ہے سرور سلطانی کے مصنف نے سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"بعد چندے کہ سنہ ہجری بارہ سو چونسٹھ (۱۲۶۲ھ) تھے حکم قضا شہم صادر ہوا کہ شمشیر خانی زبان اردو میں لکھ لیکن طول نہ ہو، تا قاری وسامع ملول نہ ہو۔ اگرچہ فقیر کو یہ بیاقت نہ تھی۔ مگر فیض ارشاد ہدایت بنیاد سلطان عالم حامی ومددگار ہوا، یہ نسخہ تیار ہوا۔ نگینی اور نثاری سے یہ نثر اور فقیر عاری ہے، خلاصہ مضمون اور مطلب نگاری ہے۔ جو کچھ فردوسی سخن داں نے نظم کیا ہے، وہی مضمون "شمشیر خانی" ہے۔ لیکن اس تحریر حال میں مقدمہ ثانی ہے۔ کہ حسب و نسب شاہان نام دار میں تحقیق کی طرف بصیحت متوجہ نہیں ہوئی۔ فقط شاعری کی طاقت سے موقع بنایا ہے۔ ہر مصرع تصویر تحریر کے دکھایا ہے۔ لہذا کتب تواریخ معتبر سے کہ ان کا نام موقع اور محل پر آجائے گا۔

دیکھ کے لکھا کہ ناظرین کے نزدیک اس کا عروج و وقار ہو۔ شک باقی نہ رہے۔ نسخہ ذی اعتبار ہو۔ امید خالق ہیں و نہار سے یہ ہے کہ سلطان عالم کو پسند ہو تو خاص و عام کو مقبول ہو۔ جاں نثار کی محنت و مشقت بے کار نہ جائے، ناموری حصول ہو جس دم تمام یہ ترجمہ ”شمشیر خانی“ ہوا، نام اس کا ”سرور سلطانی“ ہوا۔

سرور سلطانی اور اس کے مصنف کے بارے میں تفصیلات محاکمہ آغا سہیل کے فاضلہ مقدمہ میں موجود ہیں جو انھوں نے کتاب کا تازہ ایڈیشن مرتب کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”سرور سلطانی“ تاریخ شمشیر خانی کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ مطالب کو مزید اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی مزید معلومات اس انداز سے درج کی گئی ہیں کہ اصل متن ان توضیحات کا محض تمہید کی شذرہ معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مزید گفتگو ذرا آگے چل کر ہوگی۔

(۳)

زیر نظر کتاب کے مصنف لالہ مولچند منشی کا کسٹہ، دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ نصیر دہلوی (۱۷۸۱ء تا ۱۸۳۸ء) کے شاگرد اور شاہ عالم آفتاب کے تلامذہ میں سے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ بادشاہ کی شان میں قصیدے کہتے تھے اور بادشاہ ہی کے عہد میں شاہنادر فردوسی کے مطالب اردو میں نظم کیے۔ قلعہ شاہی میں آمد و رفت بے تکلف تھی۔ ۱۸۳۲ء میں انتقال کیا چونکہ اس کے علاوہ منشی کی سوانحی تفصیلات دستیاب نہیں لہذا تذکرہ نگاروں کی اصل عبارتیں درج ذیل ہیں :

گلشن بے خار : نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ  
 ”منشی تخلص مولچند از شاگردان نصیر کاسنی است، دردہلی قصص شاہنامہ را  
 بر بحر نظم کردہ است“

گلستان بے خزاں : قطب الدین باطن  
 ”منشی تخلص لالہ مولچند نام، فیض یافتہ صحبت شاہ نصیر مرحوم قوم کا کسٹہ دہلوی  
 جن کے سخن کی یہ تاثیر منشی انشا پرداز کا شاعر طبع ناظم ہے۔ اس کی نظم  
 بھی تحریر کرنی لازم ہے“

گلستان سخن : قادر بخش صابر :

”منشی، تخلص منشی مولچند قوم کا ستھ شاگرد ازلی شاہ نصیر مرحوم اور ملازم ابدی

سرکار فیض آثار سلطانی حضرت شاہ عالم بادشاہ کے حضور میں قصائد مدحیہ پڑھنا

رہا۔ شمشیر خانی کو اردو میں نظم کیا ہے۔ عرصہ بعید ہوا کہ عالم باقی کی طرف جدت کی

ارمغان گوکل پر شاد : گوکل پر شاد رسا

منشی، مولچند شاگرد نصیر کاستی کے ہیں، دہلی کے سہنے والے ہیں، شاہنامہ

فردوسی کا ترجمہ اردو میں نظم فرمایا جو مشہور و عام پسند ہے۔ ”ستھ

خوش معرکہ زیبا : سعادت خاں ناصر

”منشی، مولچند، سخن اس کا عام پسند، لالہ مولچند، تخلص، منشی، شاگرد

نصیر دہلوی“ ستھ۔

یا دگار شعراء : سپرنگر

منشی، مولچند کا ستھ، شاگرد نصیر بادشاہ کے حکم سے ایک قصہ نظم کیا (قاسم،

دلی میں شاہنامے کو ریختہ میں نظم کیا، گلشن بے خار، ریختہ میں ایک دیوان کہا

(ذکا) ۱۸۳۲ء کے قریب انتقال کیا : ۲۳

طبقات الشعراء ہند : کریم الدین

”منشی تخلص، مولچند کا ہے جو نصیر کے شاگردوں میں ہے۔ وہ کا ستھ تھا

اس نے شاہ نامہ اردو زبان میں نظم لکھا ہے۔ دلی کا رہنے والا ہے۔“ ست

جامع الاشعار : ایڈورڈ سیل

منشی، تخلص ہے۔ منشی مولچند قوم کا ستھ ساکن دہلی شاگرد شاہ نصیر دہلوی

مرحوم اور ملازم سلطانی حضرت شاہ عالم بادشاہ کے اکثر ظل بھائی کے حضور

میں قصائد مدحیہ پڑھتے رہے۔ بہت ممتاز تھے۔ بہت سے شاہی فرمانوں پر

ان کے دستخط موجود ہیں۔ انھیں نے شمشیر خانی کو اردو نظم میں کیا ہے۔ ۱۸۳۲ء

د اٹھارہ سو بتیس، عیسوی میں انتقال کیا : ۲۴



## مجموعہ نغز : قدرت الشرفا کم

منشی، لارہول چند، ولے کا بیٹھ زادہ ایست رباحلم و حیا، آراستہ و بہرہ و وفا  
پیراستہ۔ نہایت یکسر و بغایت خوشخو۔ بیاریار و خوش تقریر۔ شاگرد رشید محمد نصیر الدین  
الدین نصیر۔ در قلعہ مبارک آمد و رفت دارد و حسب الحکم ارفع اقدس قصہ منظوم سازد۔  
شمشیر خانی کا زیر نظر ترجمہ مول چند منشی نے ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں کیا۔ تاریخی نام قصہ  
خروان، عجم ہے۔ شاہ عالم ثانی آفتاب ۱۲، جون ۱۷۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۲ دسمبر ۱۷۵۹ء میں  
تخت نشین ہوئے۔ ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کو انھیں غلام قادر روہیلہ نے معزول کر کے اندھا کر دیا  
۳ دسمبر ۱۷۸۸ء کو دوبارہ تخت پر بیٹھے اور ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔  
اس اعتبار سے مول چند منشی کا یہ منظومہ جو مثنوی کی ہیئت میں ہے، شاہ عالم کے دور حکومت  
کے آخری برسوں کی یادگار ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بادشاہ کو رجسٹری کے باعث قصہ کہانیاں سننے  
میں دلچسپی لیتے تھے اور خود بھی گزراوقات کے لیے تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ نابینا  
ہونے کے بعد انھوں نے ۱۷۹۴ء میں اپنے ہندی کلام کا مجموعہ ”نادرآت شاہی“ مرتب کروایا۔  
دیوان فارسی کا ایک نسخہ بھی ۱۷۹۵ء میں کتابت ہوا۔ علاوہ ازیں عجائب القصص کا مسودہ ۱۲۰۴ھ مطابق  
۱۷۹۲ء کو املا کرایا۔ جس میں شہزادہ شجاع الشمس اور ملکہ نگار کی داستان محبت بیان کی گئی ہے۔ شاہ  
عالم ثانی ادیبوں اور شاعروں کے قدرداں تھے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ایسے بعض واقعات  
نادرآت شاہی کے دیباچے میں لکھے ہیں۔ مول چند منشی سبب تالیف میں لکھتے ہیں :

بہم محفل آرا تھے ہنگام شب	جیتا تھا اسباب جشن و طرب
وہ مجلس تھی رشک بہار سخن	ہر ایک لفظ اتقا ذکر شعر و سخن
تواریخ کا بھی جو مذکور تھا	تو پھر ہر کسی نے بیاں یوں کیا
کہ ہے شاہ نامہ تماشا کتاب	عجب نظم و لکشم ہے با آب و تاب
ولے ہر کسی کو میسر نہیں	یہ تماریح فرخ نہیں ہر کہیں
توکل کہ مرد سخن سنج تھا	کیا ترجمہ اس نے شہ نامہ کا
لکھا نثر میں نسخہ مختصر	کہ احوال معلوم ہو سر بسر

ہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے  
 یہ سن کر برادر مرے ہر باں  
 کہ زور آور ان کا جہاں میں ہے نام  
 یہ بولے کہ اسے منشی اس نام کو  
 کرو نظم ترتیب یا آب و تاب  
 وہ سلطان کہ ہے تاج شاہنشاہ  
 چراغ شہستان سلطان تھر  
 خدا نے جسے شاہ اکبر کیا  
 سنایہ سخن جب تو با صد طرب  
 ہوا میں دل و جاں سے مصروف کار  
 بحر فکر اشعار شام و سحر  
 معانی شناسان فرخ نہاد  
 ہوئے سن کے اس نظم کو شاد کام  
 کہ والشہ یہ نام نہ دل پذیر  
 بجا ہے جو ہوا پہ گوہر نثار  
 مرتب یہ جب شاہنام ہوا  
 تو پھر ہاتھ غیب نے صبح دم

تمام اس میں احوال مرقوم ہے  
 سخن فہم و دانش و نکستہ داں  
 بخلق پسندیدہ مشہور عام  
 تم اب ریختہ کی زباں میں لکھو  
 بنام شہنشاہ گردوں جناب  
 وہ خاقان کہ ہے خسرو خرواں  
 جہاں دار بخشنده لعل و در  
 خداوند اورنگ وافر کیا  
 وہیں کر کے شمشیر خانی طلب  
 لکھی نظم یہ دلکش و آبدار  
 نہ تھی مجھ کو زہار فکر و گم  
 سخن آشنا یان بادیں و داد  
 رہ منصفی سے یہ بولے تمام  
 بہت خوب ہے بلکہ بے بے نظیر  
 کہ ہے یہ بنام شہ نامدار  
 کیا فکر تب سال و تاریخ کا  
 کہا "قصہ خسروان عجم"  
 ۱۳۲۵ھ

سبب تالیف سے واضح ہوتا ہے کہ "قصہ خسروان عجم" یعنی شاہنامہ اردو کی تصنیف کے  
 محرک منشی کے بے لکھ دوست تھے جن میں ایک دوست "زور آور" نام کے اصرار پر یہ  
 تصنیف معرض وجود میں آئی۔

قصہ خسروان عجم جیسا کہ کتاب کے سبب تالیف سے بھی ظاہر ہے توکل بیگ کی تاریخ شمشیر  
 خانی کا ترجمہ ہے۔ منشی توکل بیگ اور شاہ نامے کے اسلوب سے اس قدر متاثر ہے کہ

ہوری مثنوی پران دونوں کتابوں کی عمومی فضا محیط ہے۔ منشی نے سرور سلطانی کے برعکس شہر خانی کے زیادہ سے زیادہ مطالب کو تسلیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ نامہ فردوسی کی فضا کو اس قدر قائم رکھا ہے کہ بے شمار اشعار اور مصرعے اردو کی بجائے فارسی زبان کے ہو گئے ہیں برصغیر کے داستان نگاروں کی ایک روش یہ بھی ہے کہ وہ ٹوٹا دستاویزوں کے عنادین فارسی میں لکھتے ہیں۔ آج بھی پنجابی زبان کی جو داستانیں اور قصے شائع ہوئے ہیں ان کے عنادین فارسی میں ہی ہوتے ہیں یہ ایک روایت ہے جس کا سبب شاید تصنیف کو علمی اور ادبی ثقافت دینا ہے۔ اسی روایت کے تحت مول چند منشی نے بھی ”قصہ خسروان عجم“ کے سارے عنوان فارسی میں ہی تحریر کیے ہیں۔ مثلاً،

”آمدن سلطنت ایران ضحاک و آوار شدن جمشید و رسیدن تنہا در شہر زابل  
بلباس دیگر و ثنا ختن اور ادھر شاد زابلستان و عقد بستن با او۔“  
”خواب دیدن ضحاک و رسیدن از آں خواب ہوناک“  
نشستین فریدون بر تخت کیان و گرفتار ساختن ضحاک را و تسخیر کردن ملک  
بنائیدن زداں وغیرہ۔

خردمند دا نشور و ہوشیار  
سپہ دار اقلیم فرمان دہی  
شہ کا مران خسرو و ذوالکرام  
جوانان جنگ آور و صف شکن  
بفرمان فرماں روا ی جہاں

جہاں ندار جمشید عالی وقار  
خداوند اورنگ و شاہنشاہی  
سپہ دار مرتاش نمازی بنام  
زرہ پوش مردان شمشیر زن  
سوئے گرگ ران مازندران

فارسی مصرعے بطور مثال :

خردمند مثل پدر نامور  
کیو موت کا جان دل سے عزیز  
وہ لایا بہت لشکر دیو سار  
بصد فرہنی مالک تاج و تخت

یامک تھا اس شاد کا اک پسر  
دیو و ہنرمند و ابل تمیز  
سپہ رزم شاہنشاہ نامدار  
ہوا جب کہ ہوشنگ فیروز تخت



ان اشعار میں اگر ایک آدھ لفظ تبدیل کر دیا جائے تو پورے کے پورے فارسی ربان کے ہو جاتے ہیں۔

منشی نے ترجمے کو شمیر خانی کے متن کے قریب رکھا ہے۔ شاہ نامہ فردوسی کے مطابق نہیں کیوں کہ ایسا کرنے سے شمیر خانی کے مقاصد کو نقصان پہنچتا تھا۔ منشی بعض جگہ اصل سے مختصر تر ضرور ہوئے ہیں لیکن یہ اختصار ایسا نہیں کہ فارسی کو سرور سلطانی کی یاد دلائے۔ ڈاکٹر بشیر حسین مرحوم نے منشی کے متن کا فردوسی سے مقابلہ کر کے محاکے کا صحیح طور پر حق ادا نہیں کیا اس لیے کہ ”قصہ خسروان بزم“ تو شاہ نامہ فردوسی کے ان مطالب کا ترجمہ ہے جو تاریخ شمیر خانی میں درج ہوتے ہیں نہ کہ خود شاہ نامے کا۔ بہر حال اس جگہ بے وقوع نہ ہوگا اگر فردوسی، توکل بیگ مول چند منشی اور حبیب علی بیگ سرور کا ایک ایک اقتباس سامنے رکھا جائے تاکہ زیر نظر متن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔

شاہ نامہ فردوسی ۱

۱۔	خروشید جو شید جامہ در ید	ہزاری باں کو دک نار سید
	بر آورد بانگ و غریب و خروش	زماں تا زماں نہ دی رفت ہوش
	فرو بردہ ناخن دو دیدہ بہ کند	بر آورد بالا در آتش فگند
	ہر آن زلف چوں تاب دادہ کند	ہر انگشت پیچیدہ و از بن بکند
	بہ سر بر فگند آتش و بر فروخت	ہمہ موی مشکیں بہ آتش سوخت
	ہمیں گفت کای جان مادر کنوں	کجائی سر شستہ بخاک و بخوں
	ہمیں گفت و می خست و می کند موی	ہمی زد کف دست بر خوب روی

۲۔ تاریخ شمیر خانی ۱

”بعد چند گاہ چوں ایں خبر بہادر بہر اب رسید، ہماندم آتش زد۔ مردم اورانی اٹل از آتش کشیدند و موی او تمام سوخت و بدن او داغ داغ شد۔

بہ سر خاک زد آتشی بر فروخت	ہمی جو موی سیاہش سوخت
دو زلفش کہ بد تا بدادہ کند	ہر انگشت پیچیدہ از بن بکند



۳۔ قصہ خسروانِ عجم ۱

گنتی جب یہ سوئے سمنگاں خبر  
کہ آتش و ہیں کر کے افروختہ  
یا کھینچ مردم نے پھر دوڑ کر  
تن نازنین بھی ہوا داغ داغ  
تو ہمینہ کو غم ہوا اس قدر  
گری آگ میں بادل سوختہ  
لیکن چلے سر بسر موی سر  
جہاں اس کی نظروں میں تھا بے چراغ

۴۔ سرورِ سلطانی :

”اس رہراب کی ماں کا یہ سن کے عجب حال ہوا۔ ایک دم جینا محال ہوا،  
سہر سمنگاں کو آگ لگا دی۔ اس آتش سوزاں میں وہ دل جلی کو دپڑی۔ لوگوں  
نے گوجلدی نکالا تھا مگر سر سے پاؤں تک بدن میں ہزار پھالا تھا۔“

ان اقتباسات پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ توکل بیگ نے محض امر واقعہ کو بیان کیا ہے اس میں  
مصنوعی رنگ آمیزی نہیں کی اور اسی کا ترجمہ منشی نے اور سرور نے کیا ہے۔ دراصل نفس  
مضمون کا ابلاغ ہی ان تینوں کا بنیادی مقصد ہے۔

”قصہ خسروانِ عجم“ کے بارے میں ایک نکتہ یہ عرض بھی کرنا چاہنا ہوں کہ مول چند منشی ہر  
چند کہ غیر مسلم ہے لیکن اس کے فکر و فن پر اسلامی تہذیب و ثقافت کی گہری چھاپ موجود ہے۔  
ممکن ہے یہ شاہ نصیر کا فیضان ہو یا اس کی اپنی افتاد طبع یا فکری اور روحانی وابستگی۔ کتاب کے  
آغاز میں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں منشی کے بیان میں اس قدر  
عقیدت اور گہرا وجود ہے کہ اس پر قلب او مومن دماغش کا فراسٹ کی مثال صادق آتی ہے۔  
حالاں کہ شمشیر خانی میں حمد و نعت الگ الگ عنوانات کے تحت موجود ہی نہیں ہیں اور سرور سلطانی  
میں حمد و نعت عالمانہ تفسیر میں معلوم ہوتی ہیں۔

## حواشی

۱۔ نفوذ و تاثیر شاہنامہ فردوسی در ہندوستان : سخنرانی ہای سو بین دورہ

سخنرانی و بحث درباره شاہنامہ فردوسی،

وزارت فرهنگ و ہنر تہران ۔

۲۷۔ فرهنگ نامہ قوس : دکتر نذیر احمد : مجلہ فکر و نظر (اردو) جولائی ۱۹۶۵ء

۲۸۔ فرهنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان : مطبوعہ وزارت فرهنگ و ہنر تہران ۔

۲۹۔ بحوالہ فہرست مشترکہ نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان : احمد منزوی

مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان ، اسلام آباد ۔

۳۰۔ شاہجہاں نامہ رعل صالح ، محمد صالح کنیو : جلد سوم ص ۱۱۱ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء

۳۱۔ تاربخ دل کشائے شمشیر خاں رشمیر خانی : ص ۱ تا ص ۳ ، مخطوطہ مکتوبہ جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ

جنوری ۱۹۲۳ء ، مخزن و نہ کتاب خانہ گنج بخش ، اسلام آباد ۔

۳۲۔ شاہجہاں نامہ ص ۱۲۲ و ص ۱۲۳

۳۳۔ ایضاً ص ۱۲۱

۳۴۔ ایضاً ص ۱۳۲

۳۵۔ فہرست مشترکہ نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان : احمد منزوی : جلد ۱۱ ، مرکز تحقیقات فارسی ایران

پاکستان ، اسلام آباد ۔

۳۶۔ تاربخ ادب اردو جلد اول ص ۲۶۶

۳۷۔ ایضاً ص ۳۴۲

۳۸۔ دکن میں اردو : نصیر الدین ہاشمی ص ۳۷۳ ،

فارسی ادب کے منظوم اردو تراجم : ڈاکٹر بشیر حسین : مخزن و نہ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

۳۹۔ فہرست بلوم ہارٹ ص ۸۹ ۔ بحوالہ مذکورہ ماقبل

۴۰۔ سرور سلطانی : ص ۵۴ تا ص ۵۵ ، مرتبہ آغا سہیل ، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء ۔

۴۱۔ ایضاً : مقدمہ

۴۲۔ گلشن بے خار : ص ۱۹۲ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۴ء

۴۳۔ گلشن بے خزاں : ص ۲۳۳ " " ۱۳۹۱ء

۴۴۔ گلستان سخن : ص ۲۳۵ ، مطبوعہ

- ۳۰ ارمغان گوگل پرشاد : ص ۸۳، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۵ء
- ۳۱ خوش معرکہ زیبا : ص ۱۷۹، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۲ء
- ۳۲ یادگار شعراء : ص ۱۹۶، مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۳ء
- ۳۳ طبقات الشعراء ہند : ص ۳۸۹، مطبوعہ
- ۳۴ جامع الاشعار : ص ۴۲، مطبوعہ نظام المطابع مدراس ۱۸۸۳ء
- ۳۵ مجموعہ نغز : ص ۲۲۲، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ء
- ۳۶ عجائب القصص : مقدمہ ڈاکٹر سید عبداللہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء
- ۳۷ نادرات شامی : مطبوعہ ہندوستانی پریس رام پور ۱۹۲۲ء

# بہار کی دانش گاہوں میں اردو تحقیق

(آغاز سے ۱۹۹۰ء تک)

ریاست بہار کی دانش گاہوں میں مختلف نوعیت کی زبان اردو میں ادبی تحقیقات کو ایک منظم اور جاندار ادبی روایت کی حیثیت حاصل ہے، پچھلے ۳۵ برسوں میں تین سو سے زائد مقالات تحقیقی عالم وجود میں آچکے ہیں۔ فی زمانہ یہ تحقیقی کام تیزی سے جاری ہے۔

اس اہم ادبی کام میں ایک یونیورسٹی کے شعبہ کا دوسری یونیورسٹی کے شعبے سے عدم تعلق اور عدم رابطہ کی وجہ سے نہ صرف معیار تحقیق میں گراؤٹ آگئی ہے بلکہ ایک ہی موضوع پر کاموں کی تکرار بھی کم نہیں۔ اس پس منظر میں اس بات کی ضرورت ہے کہ تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا جائے اور ان منظور شدہ تحقیقات ادبیہ کی توضیحی فراہنگ ترتیب دی جائے۔

راقم کی تیار کردہ اس نوع کی پہلی فہرست جو مگدھ یونیورسٹی سے متعلق ہے، ہماری زبان (ہفتہ وار۔ نئی دہلی) بابت ۸، اگست ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ مذکورہ فہرست کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر "بہار کی دانش گاہوں میں اردو تحقیق" کی مکمل فہرست (مطبوعہ غیر مطبوعہ) ایک ساتھ پیش خدمت ہے۔



# پٹنہ لوئی ورٹی، پٹنہ (قائم شدہ ۱۹۱۷ء)

نمبر شمار	موضوع	مقالہ نگار	نگراں	سال
۱	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء (مطبوعہ)	ڈاکٹر اختر اورینوی		۱۹۵۷ء
	آغاز سے ۱۸۵۷ء تک ڈی ٹ			
۲	جمیدار دو افسانہ نگاری	فردوس فاطمہ نعیم	ڈاکٹر اختر اورینوی	۱۹۵۷ء
۳	راسخ عظیم آبادی بحیثیت ثنوی نگار (مطبوعہ)	ممتاز احمد	پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۹۵۸ء
۴	متحدہ تہذیب اردو ادب کی روشنی میں	محمد یوسف خورشیدی		۱۹۶۱ء
۵	شاہ آیت اللہ جوہری، حیات اور شاعری (ڈی ٹ)	سید صدر الدین فضا		۱۹۶۱ء
۶	ہریم چند کی افسانہ نگاری	محمد شکیل الرحمن		۱۹۶۲ء
۷	راسخ کے دو شاگرد محسن اور فرحت	محمد طبع الرحمن		۱۹۶۲ء
۸	شاہ رکن الدین عشق، حیات اور شاعری (مطبوعہ)	قریشہ خاتون		۱۹۶۲ء
۹	شیر علی افسوس، عصر حیات اور شاعری (مطبوعہ)	سید ظہیر الحسن		۱۹۶۴ء
۱۰	فضل حق آزاد، حیات اور شاعری (مطبوعہ)	روحی حسن مجید	اختر اورینوی	۱۹۶۴ء
۱۱	بہار میں اردو شاعری کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۷ء تک	کلیم احمد عاجز		۱۹۶۴ء
۱۲	صوفی منیری حیات اور شاعری (مطبوعہ)	خالد رشید صبا		۱۹۶۴ء
۱۳	صوفی منیری کے نثری کارنامے (مطبوعہ)	محمد طیب ابدالی	اختر اورینوی	۱۹۶۸ء
۱۴	صغیر بلگرامی بحیثیت شاعر و ادیب (مطبوعہ)	ظفر ادگانوی	جمیل مظہری	۱۹۶۸ء
۱۵	اردو نثر میں طنز و مزاح اور رشید احمد صدیقی کا حق (مطبوعہ)	اقبال اختر	سید صدر الدین فضا	۱۹۶۸ء
۱۶	راجندر سنگھ بیدی، حیات اور خدمات (مطبوعہ)	سید شام مصطفیٰ	اختر اورینوی	
۱۷	جبرارت بحیثیت ثنوی نگار	محمد یونس	ممتاز احمد	۱۹۶۹ء
۱۸	شاہ اکبر دانا پوری حیات اور شاعری (مطبوعہ)	محمد ظہیر رضوی برقی	جمیل مظہری	۱۹۷۰ء
۱۹	اردو شعرا کا تنقیدی شعور (ڈی ٹ)	ممتاز احمد	کلیم الدین احمد	

۲۰ بہار میں اردو نثر کا ارتقا ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک ، پروفیسر سید مظفر اقبال پروفیسر کلیم الدین احمد ۱۹۷۰ء  
(ڈی لٹ) مطبوعہ

- ۲۱ قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب " شاہ شکیل احمد " سید صدر الدین فضا ۱۹۷۱ء  
۲۲ اردو ڈراما آغازِ شکر کے بعد (مطبوعہ) " قمر اعظم ہاشمی " اختر اورینٹی ۱۹۷۱ء  
۲۳ اردو میں واسوڈت نگاری " محمد زین العابدین " سید صدر الدین فضا ۱۹۷۲ء  
۲۴ آتش لکھنوی حیات اور شاعری " محمد شعیب راہی " اختر اورینٹی ۱۹۷۳ء  
۲۵ ظہور الحق پھلواڑی حیات اور خدمات " وقاسم احسن واریٹ " مطبع الرحمن " ۱۹۷۳ء  
۲۶ اردو ناول ۱۹۲۷ء تا ۱۹۷۷ء " اسلم آزاد " اختر اورینٹی ۱۹۷۴ء  
۲۷ اردو نثر کا اسلوب محمد حسین آزاد سے ابوالکلام آزاد تک " عبدالحق " جمیل مظہری " ۱۹۷۴ء  
۲۸ بہار میں انیس کے بعد مرثیہ نگاری " سید افضل حسن " مطبع الرحمن ۱۹۷۵ء  
۲۹ اردو میں قصیدہ نگاری آغاز سے ۱۹۷۵ء تک " محمد کمال الدین " اختر اورینٹی " ۱۹۷۵ء  
۳۰ محمد جعفر خاں راغب اور اردو میں ان کی ادبی خدمات " محمد کاظم حسین " کلیم الدین احمد " ۱۹۷۵ء  
۳۱ تدوین دیوان ہمدی بخش تسلیم (مطبوعہ) " حمیرا خاتون " " " " ۱۹۷۵ء  
۳۲ امیر اللہ تسلیم حیات اور شاعری " سید فضل امام رضوی " " " ۱۹۷۶ء  
۳۳ سرشار کے نسوانی کردار " ثریا جہاں مظہری " یوسف خورشیدی " " ۱۹۷۶ء  
۳۴ ناسخ کے شاگرد بحر لکھنوی " حمیدہ خاتون " سید صدر الدین فضا " " ۱۹۷۶ء  
۳۵ اردو افسانہ ۱۹۲۷ء کے بعد " قدوس جاوید " " " ۱۹۷۶ء  
۳۶ اردو تنقید حالی کے بعد (ڈی لٹ) " سید نواب کریم " " " ۱۹۷۷ء  
۳۷ اردو غزل میں فکری عناصر (ڈی لٹ) " یوسف خورشیدی " " " ۱۹۷۷ء  
۳۸ اردو مرثیہ اور خاندان دبیر " سیدہ بیگم " یوسف خورشیدی " " ۱۹۷۷ء  
۳۹ شاہ محمد ہاشم بہاری بحیثیت شاعر " دیشان فاطمی " " " ۱۹۷۷ء  
۴۰ میر حسن کی غزلیات مع تعارف (ڈی لٹ) " محمد ذکی الحق " " " ۱۹۷۷ء  
۴۱ رنجور عظیم آبادی حیات اور فن (مطبوعہ) " ثریا جہاں " ممتاز احمد " ۱۹۷۷ء





۶۴ ماہنامہ ندیم گیارہ کی ادبی خدمات (مطبوعہ)

۶۵ نصیر الدین حسین نصیر حیات اور شاعری

۶۶ عبدالغفور شہباز حیات اور خدمات

۶۷ عبدالحق بحیثیت محقق

۶۸ البریج کی ادبی خدمات

۶۹ عظیم آباد میں اردو

۷۰ بہار میں اردو شنوی نگاری کا ارتقار

۷۱ شوق نیوی حیات اور شاعری

۷۲ سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری

۷۳ خلیل الرحمن اعظمی حیات اور شاعری (مطبوعہ)

۷۴ واقف دہلوی، احوال تدوین دیوان و تنقید کلام

۷۵ پروفیسر محمد مجیب حیات و خدمات

۷۶ ترتیب و تدوین دیوان رضیہ خاتون جمیلہ خدابخش

۷۷ احادیث نبوی کے تراجم و تشریحات

۷۸ بہار میں اردو صحافت

۷۹ بہار کا اردو ادب ۱۹۴۷ء کے بعد

۸۰ پریم چند کے نمایندہ کردار تاول کی روشنی میں

۸۱ یاس بہاری حیات اور شاعری

۸۲ اردو میں مرصع نثر کی روایت

۸۳ اکبر بحیثیت شاعر

۸۴ سر سیر کا بری حیات اور شاعری

ڈاکٹر عظیم الحق داؤدی پروفیسر ممتاز احمد ۶۱۹۸۴

۶۱۹۸۴ " ناصر رضا جلالی " کلیم الدین احمد " " "

۶۱۹۸۴ " عظیم الحق داؤدی " کلیم عاجز " " "

۶۱۹۸۴ " رومانہ زرین " قریشہ خاتون " " "

۶۱۹۸۴ " محمد عمر ابدالی " ممتاز احمد " " "

۶۱۹۸۵ " محمد معز الدین " ذکی الحق " " "

۶۱۹۸۵ " محمد قمر الزماں " سیدہ بیگم " " "

۶۱۹۸۵ " رابعہ اہم آہ " جمیل مظہری " " "

۶۱۹۸۵ " محمد حبیب الحق " اعجاز علی ارشد " " "

۶۱۹۸۵ " اسلام عشرت " اسلم آزاد " " "

۶۱۹۸۵ " شکیب ایاز " کلیم الدین احمد " " "

۶۱۹۸۵ " صادقہ ذکی " ممتاز احمد " " "

۶۱۹۸۶ " محمد اسرائیل رضا " " " " " "

۶۱۹۸۶ " محمد عاصم اعظمی " " " " " "

۶۱۹۸۶ " جاوید حیات " " " " " "

۶۱۹۸۷ " نسیم اختر " یوسف خورشیدی " " "

۶۱۹۸۸ " عبدالستار " اسلم آزاد " " "

۶۱۹۸۸ " انیس صدوی " ممتاز احمد " " "

۶۱۹۸۸ " ممتاز احمد خاں " " " " " "

۶۱۹۸۹ " محمد انوار عالم " " " " " "

۶۱۹۸۹ " نشاط عابدین " یوسف خورشیدی " " "



## مندرجہ ذیل مقالات برائے پی. ایچ. ڈی داخل کیے جا چکے ہیں

- |   |                                     |                |                    |
|---|-------------------------------------|----------------|--------------------|
| ۱ | کرشن چندر کی ناول نگاری             | اشفاق احمد خاں | پروفیسر ممتاز احمد |
| ۲ | غالب کے خطوط میں عصری حیثیت         | بیگم حسنین     | "                  |
| ۳ | "آج کل" کی ادبی خدمات               | شمویل احمد     | • کلیم عاجز        |
| ۴ | بہار میں اردو مرثیہ آزادی کے بعد    | شہناز بیگم     | " یوسف ثور شہری    |
| ۵ | اردو مرثیہ میں بہادیر اور ساقی نامہ | شہناز بانو     | "                  |
| ۶ | اردو افسانے پر تقسیم ہند کے اثرات   | ظفر سعید       | • قریشہ خاتون      |
| ۷ | بہار میں اردو تحقیق                 | زابدہ بانو     | • حمیرا خاتون      |
| ۸ | احمد جمال پاشا حیات و خدمات         | ظفر کمالی      | • اعجاز علی ارشد   |
| ۹ | دبستان عظیم آباد کے ادبی گلدے       | عفت وہاب       | • شریا جیل         |

## بہاریونی ورثی (منظر پور) قائم شدہ ۱۹۵۲ء

- |   |   |                      |                        |       |
|---|---|----------------------|------------------------|-------|
| ۱ | مرزا محمد علی فدوی عصر حیات اور شاعری             | ڈاکٹر سید محمد حسنین | پروفیسر کلیم اللہ احمد | ۱۹۵۲ء |
| ۲ | مقصود خانہ شاعری میں تصور عشق                     | "سید احمد حسن        | "                      | ۱۹۵۱  |
| ۳ | بہار میں اردو ناول نگاری                          | • آصفیہ زکریا        | "                      | ۱۹۵۲  |
| ۴ | مرزا مسیح فطرت سوزی حیات اور کارنامے              | "مطیع احمد           | "                      | ۱۹۵۲  |
| ۵ | دیوان عبدالوہاب پکیر کی تدوین                     | شمیم احمد            | "                      | "     |
|   | (ڈی لٹ) مطبوعہ                                    |                      |                        |       |
| ۶ | اردو شری ترقی میں شاعر عظیم آبادی کا حصہ (مطبوعہ) | "وہاب اشرفی          | • اختر قادری           | "     |
| ۷ | عبد الغفور شہباز حیات اور کارنامے (مطبوعہ)        | • محمد اختر الحسن    | "                      | "     |
| ۸ | نظیر کی شاعری میں فطرت اور تہذیب کے عناصر         | • محمد سلیمان        | • شمس الدین احمد       | "     |
|   | (ڈی لٹ)   |                      |                        |       |

- 4 پریم چند کے بعد اردو افسانہ ڈاکٹر محمد حامد پروفیسر اختر قادری ۱۹۶۹
- ۱۰ بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز و ارتقاء (مطبوعہ) عبدالواسع ۱۹۷۱
- ۱۱ اردو شاعری میں جدید رجحانات (مطبوعہ) انوار حسین محمد سلیمان ۱۹۷۳
- ۱۲ اردو مثنویوں میں کردار نگاری نجم الہدیٰ اختر قادری ۱۹۷۳
- ۱۳ جدید اردو ادب پر وجودیت کے اثرات خورشید عالم ۱۹۷۴
- ۱۴ منشی دیپ شکر نسیم حیات اور کارنامے ایس احمد ۱۹۷۵
- ۱۵ سید سلیمان ندوی حیات اور خدمات علی وردی خاں ۱۹۷۵
- ۱۶ فوق البشر کا تصور اور اقبال کا مرد مومن حاتم رامپوری ۱۹۷۶
- ۱۷ فیض احمد فیض کی شاعری میں تشبیہ استعارہ بی جہاں ۱۹۷۶
- ۱۸ دیوان ریاض حسن خاں خیال ترتیب و تدوین فاروق احمد صدیقی شمیم احمد ۱۹۷۸
- ۱۹ نظیر اکبر آبادی کی خدمات بحیثیت نظم گو جمیلہ محمد جان محمد سلیمان ۱۹۷۸
- ۲۰ اختر اورینوی حیات و خدمات سیظا حسین شمشاد قمر اعظم ہاشمی ۱۹۷۸
- ۲۱ بہار میں اردو مثنوی نگاری کا ارتقاء (مطبوعہ) احمد حسین دانش شمیم احمد ۱۹۷۸
- ۲۲ اقبال بحیثیت غزل گو منظور عالم نعمانی نجم الہدیٰ ۱۹۷۸
- ۲۳ جمیل مظہری حیات اور شاعری محمد سلیم اشرف عبدالواسع ۱۹۷۹
- ۲۴ سید احتشام حسین حیات اور کارنامے اقبال احمد ریاض نجم الہدیٰ ۱۹۷۹
- ۲۵ اردو ناول میں خاتون کا حصہ محی الدین انصاری شمیم احمد ۱۹۷۹
- ۲۶ اردو ناولٹ فن اور ارتقاء سید مہدی احمد قمر اعظم ہاشمی ۱۹۷۹
- ۲۷ ن.م. راشد فن اور شاعری محمد اسرار حیدری ۱۹۸۱
- ۲۸ انیس سے خوشی تک اردو مرثیے کا ارتقاء شریا جمال مظہری محمد سلیمان ۱۹۸۱
- (۱۸۵۰ء سے ۱۹۵۷ء تک) ڈی لٹ محمد زبیر گلوہر قمر اعظم ہاشمی ۱۹۸۱
- ۲۹ اردو میں دیوتاثر نگاری فن اور ارتقاء عبدالقادر اختر زبیر احمد قمر ۱۹۸۱
- ۳۰ احسان حسن خاں اور ان کی شعری خدمات

- ۳۱ مخدوم محمد الدین حیات اور کارنامے (مطبوعہ)
- ۳۲ مرزا عظیم بیگ چغتائی حیات اور کارنامے
- ۳۳ اردو ناولوں میں ہندوستانی زندگی کا عکس
- ۳۴ اردو خطوط نگاری میں عبدالغفور شہباز کا حصہ
- ۳۵ ترقی پسند تحریک اور اردو کی افسانوی روایت
- ۳۶ آزادی کے بعد اردو ناول کی ترقی میں خواتین ناول نگار کا حصہ
- ۳۷ اردو افسانے میں انسانی نفسیات کے عناصر
- ۳۸ مرزا دبیر اور ان کی مرثیہ نگاری (مطبوعہ)
- ۳۹ جدوجہد آزادی میں اردو شعرا کا حصہ
- ۴۰ آزادی کے بعد اردو ناول میں رجحانات
- ۴۱ امداد امام اثر حیات اور کارنامے (ڈی لٹ مطبوعہ)
- ۴۲ جمیل مظہری کا فن
- ۴۳ اختر اور نیوی کی تنقید نگاری
- ۴۴ اردو میں اشتر کی تنقید
- ۴۵ اردو ظرافت اور رشید احمد صدیقی
- ۴۶ سید سلیمان ندوی کی سوانح نگاری
- ۴۷ پریم چند کے بعد ناول میں کردار نگاری کا فن
- ۴۸ اردو کی انقلابی شاعری
- ۴۹ سید شاہ شاہد علی فانی گورکھپوری حیات اور خدمات
- ۵۰ بہار میں اردو صحافت ارتقا
- ۵۱ اردو کے تاریخی ناول کا ایک جائزہ
- ۵۲ جگن ناتھ آنادہ شخصیت اور شاعری
- ڈاکٹر عطاء الرحمن پروفیسر عبدالواسع ۱۹۸۲ء
- ریحانہ یاسمین محمد سلیمان
- محمد غیاث الدین قمر اعظم ہاشمی
- ایس جابر حسن
- سید علی عباس عبدالواسع ۱۹۸۳ء
- محمد شمیم احمد
- رفعت جہاں آرا بیگم محمد سلیمان
- نفیس فاطمہ
- مقصود احمد انصاری ۱۹۸۴ء
- محمد تہذیب ہاشمی
- اختر قادری
- سلیم اشرف عبدالواسع
- سامر صدیقی
- ایم اے صدیقی
- قطب الدین اشرف
- ظفر الدین انصاری
- محمد سلیم اللہ قمر اعظم ہاشمی
- الوری
- منصور حسن
- ولی اللہ صدیقی شمیم احمد
- محمد شاکر
- سید محمد رضوان اللہ محمد سلیمان ۱۹۸۵ء

- ۵۳ رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں کردار نگاری  
 ۵۴ ارشد تہذیب شاد عظیم آبادی  
 ۵۵ سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری  
 ۵۶ اردو شاعری میں احتجاجی شعور  
 ۵۷ اردو نظم میں وجودیت  
 ۵۸ جوش ملیح آبادی کی نثر نگاری  
 ۵۹ شفیق عہد پوری حیات اور ادبی خدمات  
 ۶۰ شبلی نعمانی کی نثر نگاری  
 ۶۱ ثنوی نل دین از بھگوت رائے راحت کا تنقیدی مطالعہ محمد رئیس  
 ۶۲ قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارناموں کا تنقیدی جائزہ شمیم کمال  
 ۶۳ امداد علی بھٹکھنوی حیات اور شاعری  
 ۶۴ ڈاکٹر عبدالحق بحیثیت تنقید نگار  
 ۶۵ شبلی نعمانی بحیثیت مورخ اسلام  
 ۶۶ اردو افسانہ روایت اور امکانات  
 ۶۷ بہار میں اردو مرثیہ نگاری  
 ۶۸ اردو افسانے میں کردار نگاری کا فن  
 ۶۹ بہار میں جدید نظم کا ارتقاء ۱۹۴۷-۱۹۷۷  
 ۷۰ عبدالمجید اختر حیات اور خدمات  
 ۷۱ محمد علی جوہر حیات اور کارنامے  
 ۷۲ بہار کی اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کا اثر  
 ۷۳ پیمیم چند کے ناولوں میں عورت  
 ۷۴ اجتبی رضوی حیات اور شاعری  
 ۷۵ اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عنصر
- ڈاکٹر محمد ابو شاہد پروفیسر محمد سلیمان ۱۹۸۵  
 ابو منور گیلانی عطاء الرحمن  
 قیصر جمال عبد الواسع ۱۹۸۶  
 محمد مظاہر الحق قمر اعظم ہاشمی  
 محمد شفیع حسن  
 اسرائیل حسن شمیم احمد  
 محمد ثوبان فاروق عبد الواسع  
 محمد نصیر  
 قمر اعظم ہاشمی  
 زبیر احمد قمر ۱۹۸۷  
 نور الحسن شمیم احمد  
 محمد وجیب الحق قمر اعظم ہاشمی  
 غلام غازی خاں عطاء الرحمن ۱۹۸۸  
 محمد سلمان متین احمد صبا  
 سید حسن عباس عبد الواسع  
 مزامیمہ  
 دلی احمدولی قمر اعظم ہاشمی  
 سید مظہر الحق انور  
 نسیم بانو  
 شمس الغنی شمس جالوی  
 اختر کمال بانو عبد الواسع  
 اظہار احمد  
 مہنبی احمد محمد سلیمان



۷۶ اردو ظرافت پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

۷۷ سید محمد حسن شفا گویا، روی حیات اور شاعری

۷۸ سجاد ظہیر کی ادبی خدمات

۷۹ برج نرائن چکبست کی قومی شاعری

۸۰ حیات، اندر نصاری حیات اور خدمات

۸۱ اردو نثر میں طنز و مزاح

۸۲ احتشام حسین کی تنقید نگاری

۸۳ سید شاہ عطاء حسین عطا کاوی حیات اور کارنامے

۸۴ مولانا مناظر حس گیلانی کی سوانح نگاری

۸۵ پنہیم چند کے ناولوں کا نمایندہ کردار۔

ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر ابو البرکات پروفیسر ناز قادری ۱۹۸۸ء

محمد امان اللہ قادری " " " ۱۹۸۹ء

محمد تنویر لور " " " " " " " " " " " "

خورشید انور " " " " " " " " " " " "

جلال اصغر فریدی " " " " " " " " " " " "

اقبال حسن آزاد " " " " " " " " " " " "

حامد الرحمن " " " " " " " " " " " "

محمد یونس الرحمن " " " " " " " " " " " "

انور جہاں " " " " " " " " " " " "

عبدالمسیح صدیقی " " " " " " " " " " " "

## مگدھ پوٹن ور سٹی، بلودھ گیا (قائم شدہ ۱۹۶۲ء)

۱ اکبر الہ آبادی سماجی اور سیاسی مطالعہ مطبوعہ

۲ بہار میں افسانہ نگاری

۳ اردو منزل و رشتہ: عظیم آبادی کا فن

۴ بہار میں مزاح نگاری و ہنرمندان پوری

۵ عظیم عظیم آبادی عصر حیات اور شاعری مطبوعہ

۶ بہار میں تذکرہ نگاری (مطبوعہ)

۷ سعادت یار خاں رنگیں، حیات اور شاعری

۸ ڈی لٹ (مطبوعہ)

۹ اردو شاعری کے رجحانات

۱۰ علیم اللہ حالی " " " " " " " " " " " "

(۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۷ء تک)

- ۹ غالب کی اردو شاعری میں نیکو تراشی  
۱۰ امیرالدین دہد، حیات اور شاعری  
۱۱ عرفان اسلام پوری حیات اور شاعری  
۱۲ اردو قصیدہ نگاری پر فارسی قصیدہ نگاری کے اثرات

- ۱۳ رومان اور اردو کے چند معروف رومانی شعرا  
۱۴ ریختی کی ابتدا ارتقا اور زوال  
۱۵ ڈرامے کا فن، تکنیک اور اردو کے چند اہم ڈرامے  
۱۶ مولانا مناظر حسن گیلانی، حیات اور ادبی خدمات  
۱۷ مشرقی مینیری حیات اور شاعری (مطبوعہ)  
۱۸ سدس حالی اور اردو کی قومی و ملی شاعری  
۱۹ اردو تنقید میں بہار کا حصہ  
۲۰ علامت نگاری کا تصور نئے اردو افسانے کے خصوصی مطالعے کے ساتھ

- ۲۱ اقبال کی شاعری میں خودی کا تصور  
۲۲ بہار میں اردو فکشن ایک تنقیدی جائزہ  
۲۳ آل احمد سرور کی تنقید نگاری  
۲۴ شکیلہ اختر، حیات اور خدمات  
۲۵ حکیم عبدالحمید شہدائیسہرانی، حیات و خدمات  
۲۶ حضرت سید شاہ ایوب ابدالی نیز اسلام پوری شخصیت اور شاعری  
۲۷ حضرت بدرالدین اوگھٹ شاہ دارق حیات اور کارنامے

- ڈاکٹر حسن امام ڈاکٹر افصح ظفر ۱۹۷۷  
ملک غلام مصطفیٰ شاہ شکیل احمد  
سید محمد اختر احمد ضوی محمد طیب ابدالی ۱۹۷۸  
سید شاہ مطیع الرحمن سید محمد حسنین

- سید منصور عالم ۱۹۸۰  
آفتاب احمد افصح ظفر  
شکیل احمد خاں وہاب اشرفی  
محمد نور الہدیٰ محمد قاسم حسن وارثی ۱۹۸۱  
ابو عبیدہ ابدالی سید محمد حسنین  
ضیاء الدین محمد صابر محمد طیب ابدالی ۱۹۸۲  
سید غلام مرتضیٰ محمد ظفر رضوی برق ۱۹۸۳  
حسین الحق افصح ظفر ۱۹۸۴

- اشتیاق احمد ۱۹۸۴  
احمد حسین آزاد  
سید غنی حیدر زکریا وہاب اشرفی  
فریدہ محسن سید ظہیر حسن  
محمد فصیح الزماں سید محمد حسنین  
محمد احسان اللہ محمد طیب ابدالی  
کبیر الدین خاں محمد ظفر رضوی برق

۲۸ مذہب احمد ایک مترجم قرآن

ڈاکٹر منور حسین خاں ڈاکٹر محمد رفیع رضوی برق ۱۹۸۷

۴۹ اردو تنقید کے ارتقاء میں خلیل الرحمن اعظمی کا حصہ

عرفت آراشمی • وہاب اشرفی • •

۳۰۔ جمیل مظہری۔ حیات اور شاعری

ففضیل احمد      سید محمد حسین      " "

۳۱ جوش ملیح آبادی کی شاعری سماجی اور سیاسی

محمد منظر حسین      " افسح ظفر "

پس منظر میں

۳۲ فرقت کا گرومی، عصر حیات اور ادبی خدمات

» سید اقبال واحد « علیم الدہلوی » »

۳۳ عطا بہاری، حیات اور شاعری

سید اعلیٰ ابدالی      محمد طیب ابدالی

۳۴ اردو شنومی میں استحصاا جنس

محبوب علی قریشی ، سید محمد حسنین ۱۹۸۵

۳۷ غائب کی شاعری میں فکری آہنگ

سید اقبال احمد • سید آل احمد •

۳۰ شد و عظیم آبادی بحیثیت مرثیه نگار

”محمد متوازن احمد خاں • سید محمد حسین •“

۳۰ محسن دانا پوری، حیات اور شاعری

سید شمیم گوهر . محمد طیب ابدانی .

سم عبدالماری ساقی جات اور خدمات

توفیق احمد خاں " سید محمد حسین " " "

۴۴ شاد عظیم آبادی کے تین شاگرد

” محمد بن المديني ، عليه السلام ”

(سید جان بیٹاب، عطا کا کوی، محمود علی خاں صاحب)

۴۴ اختر اور سنو کی بحیثیت کہانی کار

محمد سراج الدین " الفصحی ظفر ۱۹۸۶

۴ ڈاکٹر اختر قادری حیات اور ادبی خدمات

محمد اسد اللہ

۴۴ پریم چند کے ناولوں میں زندہ جاوید کردار

"جہا یوں رشید"      ۱    ۲    ۳

۴۱ اردو تنقید کی نشوونما میں سید احتشام حسین کا حصہ

نسیم اختر

۴۲ سید شاہ شاہد علی فانی گورکھپوری حیات اور کارنامے

ہید محمد کلام الدین شمر . محمد طیب ابدالی .

۴۷ بہار کے اردو افسانوں کا اسلوبی مطالعہ

معشوق زمانی ، علیم اللہ حامی

۴۴ سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری

محمد اشرف الدین • سدائل احمد •

م قوس حمزہ یوری حیات اور کارنامے

محمد اشرف علی

۴ آراء۔ ایک مقدمہ مرکز ادب اردو

سید محمد نظام الدین، طرہ صوفیہ برقی،

- ۲۹ ماہنامہ نگار کے ۲۵ سال
- ۵۰ اردو شاعری پر تصوف کے اثرات، دی تا اقبال، حافظ محمد شمیم، فصیح الزماں ۱۹۸۸
- ۵۱ عشرت گیاروی کی حیات اور شاعری کا تنقیدی مطالعہ، سید شاہد اقبال، محمد محفوظ الحسن، ۱۹۸۸
- ۵۲ شفق و دپوری بحیثیت غزل گو، سید سلیمان بلخی، حسین الحق، ۱۹۸۸
- ۵۳ الیاس اسلام پوری حیات اور کارنامے، محمد اشتیاق، محمد طیب ابدالی، ۱۹۸۸
- ۵۴ بہاؤ الدین کلیم حیات اور شاعری، ظفر اللہ پالوی، ۱۹۸۸
- ۵۵ اردو داستانوں میں ویلن کا تصور، سید شفیق احمد، فصیح ظفر، ۱۹۸۸
- ۵۶ ناوک حمزہ پوری شخصیت اور ادبی خدمات، محمد حفیظ الرحمن، محمد فصیح الزماں، ۱۹۸۸
- ۵۷ فن خطاطی، اردو میں اس کی ابتدا اور ارتقاء، عبدالرشید انصاری، فصیح ظفر، ۱۹۸۹
- ۵۸ شبلی نعمانی کی سوانح نگاری، اشرف الہی، عبدالواسع، ۱۹۸۹
- ۵۹ نور علی یاس آروی حیات اور کارنامے، خواجہ صغیر الدین، محمد محفوظ الحسن، ۱۹۸۹
- ۶۰ مخدوم محی الدین کی جدید شاعری میں خدمات، محمد مناظر الحسن، شکیل احمد غار، ۱۹۸۹
- ۶۱ شفیع تمنائی حیات اور کارنامے، محمد ربیع، طلحہ ضوی برق، ۱۹۸۹
- ۶۲ ثاقب عظیم آبادی حیات اور خدمات، شاہین حیدر، ۱۹۸۹

## پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے لیے مقالے جو داخل کیے گئے

- ۱ بہار میں اردو کے ہندو شعرا اور ان کی خدمات، محمد محفوظ الحسن، سید محمد حسین، ڈی لٹ

- ۲ حکیم بدیع الزماں قمر نعمانی حیات اور خدمات، محمد مظفر حسن، فصیح الزماں
- ۳ بہار کی اردو صحافت میں گیا کا حصہ، نعیم شاہد، فصیح ظفر
- ۴ خدیجہ مستور بحیثیت ناول نگار، محمد بشیر الدین، غنی حیدر
- ۵ ہوش عظیم آبادی حیات اور خدمات، سید ارشد علی جعفری، اقبال، نشر
- ۶ قتیل دانا پوری حیات اور شاعری، محمد صلاح الدین حیدر، طلحہ ضوی برق



# راپنی یونیورسٹی، راپنچی (قائم شدہ ۱۹۶۲ء)

۱۹۶۸ء	-	ڈاکٹر سید صابر حسین	اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کا تقابلی اور	۱
		، شین اختر	تجزیاتی مطالعہ	
۱۹۷۵	-	طلعت جہاں	فیض کی شاعری میں پکیر تراشی	۲
۱۹۷۶	ڈاکٹر احمد سجاد	، رفعت سجاد	حکیم عبدالحی ہاتف حیات اور شاعری	۳
۱۹۷۷	-	سید سمیع الحق	سید فخر الدین سخن دہلوی حیات اور خدمات	۴
۱۹۷۸	-	، شان احمد صدیقی	مولوی کریم الدین حیات اور کارنامے (مطبوعہ)	۵
" "	-	، عذرا پروین	جیدانی بانو کی افسانہ نگاری	۶
" "	-	، سید حسن امام	فراق کی رباعیوں کا تنقیدی جائزہ	۷
۱۹۷۹	-	، محمد توحید	ماہل خیر آبادی کی نثری خدمات	۸
۱۹۸۲	، شین اختر	، محمد شمیم الدین	چھوٹا ناگ پور میں اردو افسانے کا آغاز و ارتقاء	۹
" "	، وہاب اشرفی	، مسعودہ صفدر امام	آغا حشر کے ڈراموں میں انسانی کردار	۱۰
" "	، شین اختر	، محمد صدیق مجیبی	چھوٹا ناگ پور میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء	۱۱
" "	، وہاب اشرفی	، شاہ حسن عثمانی	حضرت شاہ کمال علی دیوردی حیات اور شاعری	۱۲
۱۹۸۳	" "	، سید سراج الدین	خلیل الرحمن اعظمی فن اور شخصیت	۱۳
" "	" "	، محمد مجاہد	شکاید اختر حیات اور کارنامے	۱۴
" "	" "	، فزانیہ جعفری	اردو ناول میں شعور کی رو	۱۵
۱۹۸۴	" "	، محمد مرتضی ہاشمی	اردو نثر کے ارتقاء میں غالب کا حصہ	۱۶
" "	" "	، عبداللہ	پریم چند اور شرف چند ایک تقابلی مطالعہ	۱۷
" "	" "	، پروین اختر	اردو افسانوں میں آدمی باسی زندگی	۱۸
" "	، سمیع الحق	، عقیل اشرف	رضا نقوی و آہی شخصیت اور شاعری	۱۹
" "	، احمد سجاد	، حسن رضا	شین مظفر پوری بحیثیت افسانہ نگار	۲۰

- ۲۱ سید فصیح الدین بلخی حیات اور ادبی خدمات  
۲۲ سجاد ظہیر حیات اور خدمات (مطبوعہ)  
۲۳ مانوس سہسرامی، شخص اور شاعری (مطبوعہ)  
۲۴ بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری  
۲۵ جدید اردو ادب پر وجودیت کے اثرات  
۲۶ اردو میں بچوں کا ادب  
۲۷ اختر شیرانی کی رومانی شاعری (مطبوعہ)  
۲۸ اردو پہلیوں میں سماجی اور ثقافتی اثرات (مطبوعہ)  
۲۹ ذکی النور اور ان کی ناول نگاری  
۳۰ وفا حسین آبادی حیات اور شاعری  
۳۱ اردو شاعری میں معشوق کا تصور  
۳۲ اردو میں تحریکی شاعری ایک تنقیدی مطالعہ  
۳۳ منٹو کے افسانوں کے نسوانی کردار کے روایتوں کا نفسیاتی مطالعہ  
۳۴ نسیم انھونی فن اور شخصیت  
۳۵ اردو کے نفسیاتی ناولوں کے فروغ میں ممتاز مفتی کا حصہ  
۳۶ بہار کی نفسیاتی افسانہ نگار  
۳۷ جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (مطبوعہ)  
۳۸ مہجور کشنی، حیات اور شاعری  
۳۹ کرامت علی کرامت، فن اور شخصیت  
۴۰ خواجہ احمد عباس کی ناول نگاری  
۴۱ مون سہیل کے مضامین کا تنقیدی جائزہ
- ڈاکٹر سید مظفر بلخی ڈاکٹر احمد سجاد ۱۹۸۴  
عبدالقیوم ابدانی ابوذر عثمانی  
خالد سجاد  
رشاد و شاد عثمانی وہاب اشرفی  
جمیل اختر  
سعدیہ مشہدی  
قمر جہاں وہاب اشرفی  
انور عیادی  
شبیر احمد تادم بلخی  
ایاس انصاری  
روشن آرا  
مظفر مہدی احمد سجاد ۱۹۸۶  
مسرت رحمن وہاب اشرفی  
عبدالجبار ابوذر عثمانی  
محمد حبیب وہاب اشرفی  
انوری بیگم  
خورشید جہاں  
محمد اقبال وارث  
محمد عزیز الرحمن  
ممتاز انصاری  
اسے رحیم انصاری

- ۲۲ اختر انصاری، حیات اور ادبی خدمات  
 ۲۳ حیات اللہ انصاری حیات اور ادبی خدمات  
 ۲۴ اردو غزل کے فروغ میں جگر مراد آبادی کا حصہ  
 ۲۵ کلیم الدین احمد بحیثیت تنقید نگار  
 ۲۶ اسالیب غزل  
 ۲۷ روپ کی رباعیات  
 ۲۸ اردو ادب میں سوانح نگاری  
 ۲۹ پرویز شاہدی بحیثیت شاعر  
 ۵۰ نذیر احمد کے نودانی کردار  
 ۵۱ اردو میں مارکسی تنقید کا ارتقا  
 ۵۲ اردو نثر کے ارتقا میں کلیم عاجز کا حصہ  
 ۵۳ اقبال کی شاعری کا استعاراتی نظام
- ڈاکٹر محمد منصور عمر • ابوذر عثمانی ۱۹۸۸  
 • • • • رحمن حمیدی  
 • • • • محمد مہتاب انصاری • وہاب اشرفی  
 • • • • عامر مصطفیٰ صدیقی  
 • • • • منظر کاظمی  
 • • • • شہناز رعنا  
 • • • • قاضی عبدالہادی • شہین اختر ۱۹۸۹  
 • • • • نشاط بانو • وہاب اشرفی  
 • • • • شاہدہ بیگم  
 • • • • اسلم پرویز • ابوذر عثمانی ۱۹۹۰  
 • • • • محمد نعیم الدین • وہاب اشرفی  
 • • • • قاضی محمد شعیب

## بھاگلپوریونی ورٹی، بھاگلپور (قائم شدہ ۱۹۴۳ء)

- ۱ ڈاکٹر محمد اقبال کا سماجی فلسفہ ایک تنقیدی جائزہ • عبدالعلیم بلال ۱۹۶۴  
 ۲ عبدالعلیم شرر بحیثیت شاعر، مطبوعہ  
 ۳ احوال و افکار و آثار شاہ عبدالعلیم حاکم رموری  
 ۴ معین الحسن جذبی، حیات اور کائنات  
 ۵ اردو ناول کی روایت اور قزوین حیدر  
 ۶ سہیل غنیم آبادی کی فنکارانہ اور تخلیقی تہذیب  
 ۷ ترتیب و تدوین کلیات پرویز شاہدی  
 ۸ نذیر احمد بحیثیت اخلاقی ناول نگار  
 ۹ اردو نظم میں عازمت نگاری ۱۹۷۵ء تک
- • • • مناصر عاشق ہر گاونی • شمیم افرا قمر ۱۹۸۱  
 • • • • محمد اسد اللہ ۱۹۸۲  
 • • • • محمد عارف حسین • شمیم احمد ۱۹۸۳  
 • • • • محمد زاہد خاں • لطف الرحمن ۱۹۸۸  
 • • • • شبیر احمد ۱۹۸۴  
 • • • • محمد عباس • رئیس انور ۱۹۸۵  
 • • • • محمد علی امام ۱۹۸۸  
 • • • • غلام مصطفیٰ صدیقی ۱۹۸۸

۱۰ اردو تنقید میں جدید رجحانات بہار کے حوالہ سے ڈاکٹر شاداب رضی ڈاکٹر لطف الرحمن ۱۹۸۸ (دہلی لٹ)

۱۱ عصمت چغتائی کی ناول نگاری محمد نوشاد عالم آزاد ۱۹۸۹

۱۲ اقبال اور تصوف محمد حسن اختر ۱۹۸۹

۱۳ فراق گورکھپوری بحیثیت اردو تنقید نگار محمد پرویز احمد شمیم احمد ۱۹۸۹

۱۴ بہار میں اردو افسانہ ۶۰ کے بعد جی جی مہر نگار مناظر عاشق ہرگانی ۱۹۸۹

## ایل۔ این میٹھلایونی ورٹی، در بھنگا ر قائم شد ۱۹۷۵ء

۱ تفہیم اقبال۔ ایک جائزہ اور تنقید غلام قدوس نجم ابدی ۱۹۸۰

۲ مراٹھی شاد میں فکری عناصر اظہار احمد محمد مطیع الرحمن ۱۹۸۳

۳ مطالعہ اقبال۔ تاریخ اسلام کی روشنی میں محمد رضوان صدیقی محمد طیب صدیقی ۱۹۸۴

۴ محسن در بھنگوی حیات اور شاعری عبد القیوم ۱۹۸۵

۵ نواب سعادت علی خاں حیات اور خدمات عبد المنان طرزی محمد مطیع الرحمن ۱۹۸۶

۶ سلام سندیلوی حیات اور خدمات سید حسین احمد ۱۹۸۶

۷ سلطان جان حیات اور شاعری (ڈی لٹ) محمد طیب صدیقی ۱۹۸۶

۸ ریاست علی ندوی حیات اور کارنامے محمد علفر شبلی محمد طیب صدیقی ۱۹۸۶

۹ بہار کے طنز و مزاح نگار نذیر احمد انجم شاکر خلیق ۱۹۸۶

۱۰ در بھنگا میں اردو کا ارتقا (۱۹۰۱ء سے ۱۹۷۵ء تک) عبد الطہیر ناشاد ۱۹۸۶

۱۱ بہار میں اردو دشمنی نگاری کا ارتقا محمد سہیل اختر ۱۹۸۸

۱۲ بہار میں اردو لغت گوئی محمد نسیم عبد المنان طرزی ۱۹۸۸

۱۳ عبد الباقی مظفر مظفر پوری حیات اور خدمات محمد ظفر العلام ظفر محمد طیب ابدالی ۱۹۸۸

۱۴ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں عورت کا تصور محمد معین الدین محمد مطیع الرحمن ۱۹۸۸

۱۵ بہار میں اردو نثر کا ارتقا (۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک) محمد عبد الرحمن محمد طیب صدیقی ۱۹۸۸



- ۱۴ ساحر لدھیانوی حیات اور شاعری
- ۱۵ اردو کی ادبی تنقید اور جدید ذہن
- ۱۸ مظہر امام کی تحقیقات کا تنقیدی مطالعہ
- ۱۹ جدید شاعری کی ہیئت اور ترقی
- ۲۰ منظری شاعری پر تخصیص اقبال
- ۲۱ شبلی نعمانی سوانح نگار اور مورخ کی حیثیت سے
- ڈاکٹر سید ضیاء الرحمن ڈاکٹر محمد طبع الرحمن ۱۹۸۹
- محمد عمیر احمد محمد طیب صدیقی " "
- سید اعجاز حسن مام عظیم " " " "
- رفیع اللہ محمد طبع الرحمن " "
- محمد فیاض ظفر محمد طیب صدیقی ۱۹۹۰
- محمد جمیل اختر " " " "

# URDU ADAB QUARTERLY

*EDITOR*

**Khaliq Anjum**

**ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)  
NEW DELHI**

سہ ماہی



# اردو ادب



# اردو ادب

(بابائے اردو مولوی عبدالحق نمبر)

اڈیٹر  
خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (بہت ساری دلی

شماره (۱)

۱۹۹۳ء

شماره (۳)

۱۹۹۱ء

سالانہ قیمت \_\_\_\_\_ ۴۵ روپے  
فی شمارہ \_\_\_\_\_ پندرہ روپے  
موجودہ شمارے کی قیمت \_\_\_\_\_ ۵۰ روپے

پرنٹر و پبلشر ایم حبیب خاں نے ٹرافیڈ پرنٹرس دہلی میں چھپوا کر انجمن ترقی اردو (دہندہ) اردو گھر  
راؤزا پورہ نوئی دہلی سے شائع کیا۔

# فہرست

۷	خلیق انجم	حرف آغاز
۱۳	پروفیسر نادر آزاد	مولوی عبدالحق
۳۰	پروفیسر عبدالمغنی	عبدالحق کی تنقید نگاری
۳۸	پروفیسر نثار احمد فاروقی	مولوی عبدالحق کا اسلوب
۵۶	ڈاکٹر خلیق انجم	مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری
۶۴	پروفیسر عنوان چشتی	مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری
۷۳	ایم۔ حبیب خاں	مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو ہند کا دلی میں ورود
۸۵	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے
۹۰	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	مولوی عبدالحق اور ترقی پسند تحریک
۱۰۰	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	بابائے اردو کے رسالے
۱۲۶	مرزا سلیم بیگ	اردو کی ادبی تاریخیں اور مولوی عبدالحق
۱۳۳	مسرت فردوس	مولوی عبدالحق کی خدمات
۱۴۳	شجیاع احمد زریبا	مولوی عبدالحق اور اردو کا لٹریچر کراچی
۱۸۵	عتیق احمد جیلانی	دبستان شبلی اور مولوی عبدالحق
۲۰۸	ڈاکٹر محمد صدیق شبلی	مولوی عبدالحق کی قواعد نویسی
۲۱۵	صوفی عبدالرشید	بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم

# حرف آغاز

مولوی صاحب اردو کے صف اول کے ادیب، نقاد، ماہرِ کنیات، محقق، لغت نویس، مترجم، ماہرِ صرف و نحو، تبصرہ نگار، خاک نگار اور ادبی صحافی کے ساتھ ساتھ اردو تحریک کے زبردست علم بردار تھے۔ ان کی ساری زندگی اردو اور انجمن ترقی اردو کی خدمت میں گزری۔

انجمن ترقی اردو، نمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ادبی شعبے کی حیثیت سے قائم ہوئی تھی۔ اس کے پہلے صدر ماس آرٹس اور سکریٹری علامہ شبلی نعمانی منتخب ہوئے اور نائب صدر کے عہدوں کے لیے منشی ذکا اللہ، ڈپٹی نذیر ہاشم اور مولانا الطاف حسین حالی کو منتخب کیا گیا۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۰۵ء میں مصروفیات کی وجہ سے علامہ شبلی نعمانی مستعفی ہو گئے اور اس عہدے کے لیے حبیب الرحمن خاں شیروانی منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں شیروانی صاحب نے بھی استعفادے دیا اور عزیز مرزا صاحب کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی۔ بد قسمتی سے دو سال بعد ہی عزیز مرزا صاحب کا انتقال ہو گیا اور اس بار قرعہ خاں مولوی عبدالحق کے نام پڑا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے انجمن کا چارج لیا تو انھیں ایک ٹپن کا ٹوٹا ہوا صندوق ملا تھا جسے رسی سے باندھ رکھا تھا صندوق کے اندر دو ایک جسٹر پینڈ پرانے بغیر مرتب کیے مسودات، ایک قلم اور باقی بس اللہ کا نام۔ یہ تھی کل کائنات جو انجمن کے نئے سکریٹری یعنی مولوی صاحب کو ملی تھی۔ مولوی صاحب انجمن کو اپنے ساتھ اورنگ آباد لے گئے۔ انھوں نے انجمن کے جنرل سکریٹری کے عہدے کا چارج نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ لیا تھا۔ مولوی صاحب نے چند ہی روز میں انجمن کو ایک فعال اور سرگرم ادارہ بنا دیا۔ وہ انجمن جس کی کل کائنات ایک ٹوٹا ہوا صندوق تھا، باقاعدہ ایک جدید انداز کے دفتر میں بدل گیا۔ مولوی صاحب نے عزیزوں، دوستوں اور صاحب اقتدار لوگوں سے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ حیدر آباد ریاست سے درخواست کی اور تین ہزار روپے سالانہ کی امداد انجمن کو ملنی شروع ہو گئی۔ مولوی صاحب کی سب سے بڑی تمنا اور کوشش یہ تھی کہ اردو ایک جدید علمی زبان بن جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ انجمن شایسی کتابیں شایع ہوں جن کا مصیاریورپ کی اعلیٰ مطبوعات کی سطح پر ہو۔ اس لیے انجمن کا چارج لیتے ہی



مولوی صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ انگریزی کی اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرتے کا پہلا وگرام بنایا۔ اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ اردو میں اصطلاحات کی کمی تھی۔ اگرچہ یہ شکل اس سے پہلے دہلی کالج کی ورنائیو ٹرانسلیشن سوسائٹی اور سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی اور بعض دوسرے اداروں کو درپیش آئی تھی۔ لیکن کسی نے اصطلاحات سازی کا کام منظم طور پر نہیں کیا تھا۔ مولوی صاحب نے اصطلاحات علمیہ کی ایک لغت مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اس سلسلے میں خاصا کام ہوا۔ مختلف علوم پر کی چھوٹی چھوٹی کتابیں شایع ہوئیں۔ مولوی صاحب نے اصطلاحات سازی کے فن پر مولانا وحید الدین سلیم سے ایک کتاب بھی لکھوا کر شایع کی۔ اپنی نوعیت کا اردو میں یہ پہلا اور آخری کام ہے۔ اصطلاحات علمیہ کی لغت تیار کرنے کا خیال اردو میں پہلی بار مولوی صاحب کو آیا تھا۔ بہر حال انجمن نے کام کرنا شروع کیا۔ مولوی صاحب نے خود بھی ”اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۴۹ء میں شایع ہوئی پہلی بار ۱۹۱۴ء میں مولوی صاحب کو یہ خیال آیا کہ انجمن کا صرف ایک مرکزی دفتر ہی کافی نہیں ہے۔ مختلف شہروں میں اس کی شاخیں بھی قائم کی جانی چاہیں۔

ضلع پر بھتی (مہاراشٹر) میں ۱۹۱۴ء میں انجمن کی پہلی شاخ قائم کی گئی، پھر بھوپال، کانپور، جالندہ اور لکھنؤ میں شاخیں قائم ہوئیں۔ ۱۹۲۰ء میں ان شاخوں کی تعداد چالیس کے قریب پہنچ گئی خدا کا شکر ہے کہ مولوی صاحب کا لگایا ہوا یہ پودا اب تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس وقت ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، انگلینڈ اور کینڈا میں انجمن کی شاخیں قائم ہیں۔ صرف ہندوستان میں ہی ہر صوبے اور تقریباً ہر شہر میں انجمن کی شاخیں موجود ہیں اور ان شاخوں کی تعداد چھ سو بیس سے زیادہ ہے۔

مولوی صاحب نے انجمن میں اردو ادب کی ترقی کے لیے کام شروع کیا تھا لیکن بہت جلد انھیں اردو زبان کے لیے بھی کام کرنا پڑا۔ کیوں کہ ہندوستان کے بعض حلقوں سے اردو کی مخالفت زور پکڑ رہی تھی۔ مولوی صاحب اردو کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے منظم طور پر اردو تحریک کا آغاز کر کے انتہائی باقاعدگی کے ساتھ اردو مخالفت طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ مولوی صاحب کو اس سلسلے میں اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے ہندوستان کے شہر شہر اور قصبے قصبے کا دورہ کیا۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اردو کے فروغ کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں کے دورے نہیں کیے تھے۔

اب میں چند ایسے امور کا ذکر کروں گا جن میں مولوی صاحب کو اولیت یا غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

اگرچہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کئی انگریزی اور ہندوستانی لغتیں شایع ہوئیں، ان کی تفصیل مولوی عبدالحق نے انگلش اردو ڈکشنری کے دیباچے میں دی۔ مولوی صاحب نے مشرقین اور ہندوستانیوں کی تیار کردہ سولہ لغتوں کے نام دیے ہیں۔ ان میں آخری لغت رینکنگ کی انگریزی ہندوستانی لغت ہے جو ۱۹۰۵ء میں شایع ہوئی تھی ان میں سب سے اہم لغت ڈاکٹر فیلس کی نیو انگلش ہندوستانی ڈکشنری ہے جو ۱۸۸۳ء میں بنارس سے شایع ہوئی۔

۱۹۳۰ء میں مولوی صاحب کو خیال آیا کہ انگریزی اردو کی پرانی لغتیں وقت کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ اس لیے ایک نئی لغت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے بہت بڑے پیمانے پر انگریزی اردو ڈکشنری کا ڈول ڈالا۔ ۱۹۳۷ء میں یہ لغت تیار ہوئی اور انجمن ترقی اردو سے شایع ہوئی۔ یہ اردو کی پہلی جامع انگریزی اردو لغت ہے۔ تقریباً پچیس سال گزرنے کے باوجود اس کی اہمیت برقرار ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ضرورت پڑتی ہے وہاں یہی لغت استعمال کی جاتی ہے۔

مولوی صاحب نے "لغت کبیرہ" کے نام سے کئی جلدوں میں ایک اردو لغت کا کام بھی شروع کیا تھا لیکن یہ کام دو جلدوں سے آگے نہیں بڑھا۔

جون ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں ترقی اردو بورڈ کے نام سے ایک خود مختار ادارہ قائم کیا گیا اس ادارے کا مقصد آکسفورڈ ڈکشنری کے انداز پر اردو کی ایک لغت کی تدوین بھی تھا۔ اس لغت کے مدیر اعلیٰ مولوی عبدالحق اور مشیر ادبی جوش ملیح آبادی مقرر ہوئے۔ مولوی صاحب کی زندگی میں بڑے پیمانے پر کام شروع ہو گیا تھا لیکن اس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں شایع ہوئی۔ اب تک اس لغت کی تیرہ جلدیں شایع ہو چکی ہیں اس لغت کی تدوین کی تکمیل کے لیے اردو ڈکشنری بورڈ کے نام سے ایک علاحدہ ادارہ قائم کر دیا گیا ہے۔ آج کل اس ادارے کے سربراہ اردو کے ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر فرمان فتحپوری ہیں۔

مولوی صاحب کی ایک کتاب "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" بہت مختصر ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اردو میں پہلی بار صوفیائے کرام کے ملفوظات اور سوانح سے اردو کے وہ فقرے نکالے گئے ہیں جو صوفیاء کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے پہلی بار ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو کے چلن کو عام کرنے میں صوفیائے کرام کا بہت اہم رول رہا ہے۔ بعض صوفیاء حضرات اپنے گھر کے لوگوں اور اپنے مریدوں سے اردو ہی میں بات کرتے۔

میرامن نے ”باغ و بہار“ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ امیر خسرو کے مرشد حضرت نظام الدین اولیا کی طبیعت ناساز ہوئی تو ان کا دل بہلانے کے لیے امیر خسرو فارسی میں ایک داستان سنا تے رہے جو ”قصہ چار درویش“ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس واقعہ کو بہت شہرت حاصل تھی۔ مولوی عبدالحق نے بعض اہم دلائل پیش کر کے پہلی بار ہماری توجہ اس طرف متوجہ کرائی کہ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اس داستان کے مصنف امیر خسرو ہیں۔ بعد کے محققین نے مولوی صاحب کے اس شبہ سے کو درست ثابت کر دیا۔ اس طرح یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ ”باغ و بہار“ فارسی کی ”چار درویش“ کا اردو ترجمہ ہے خود میرامن نے ”باغ و بہار“ میں لکھا ہے کہ انھوں نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر فارسی قصے کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ”باغ و بہار“ کے مقدمے میں پہلی بار ثابت کیا ہے کہ میرامن کا یہ بیان درست نہیں ہے کیوں کہ ”باغ و بہار“ فارسی قصے کا ترجمہ یا اس سے ماخوذ نہیں بلکہ اس کی بنیاد میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی اردو داستان ”نوطرز مرصع“ پر ہے۔ میر تقی میر کا ذکر تذکروں میں تو ملتا تھا، ان کے دیوان کا پہلا نسخہ فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۱۱ء میں اور پھر ۱۸۴۷ء میں مکتبہ نول کشور سے شایع ہوا لیکن میر تقی میر کی شخصیت اور فن پر بھرپور تحریریں مولوی عبدالحق ہی کی ہیں۔ انھوں نے میر کی دو کتابیں نکات الشعرا اور ذکر میر مرتب کر کے شایع کیں اور میر کی شاعری کا ایک بھرپور انتخاب، انتخاب کلام میر کے نام سے مرتب کیا اور اس پر تفصیلی مقدمہ لکھا۔ میر کو اہل اردو سے پہلی بار اس انداز میں مولوی صاحب ہی نے متعارف کرایا تھا۔

مولوی صاحب کا یہ عظیم ادبی کارنامہ ہے کہ انھوں نے دکنی ادب کی تصنیفات دریافت کیں۔ دکنی اردو کے بیش بہا مخطوطات ذاتی اور خانقاہوں کی لائبریریوں کی الماریوں میں دیمک کی نذر ہو رہے تھے۔ مولوی صاحب نے اردو میں پہلی بار دکنی ادب کے مخطوطات حاصل کر کے انجمن کی لائبریری میں داخل کیے۔ انھوں نے دکنی ادب کے ایسے بہت سے شہکاروں اور شاعروں کا اردو والوں سے تعارف کرایا جن کے نام سے بھی کوئی واقعہ نہیں تھا اور جن کی تصنیفات اردو کا پیش بہا سرمایہ ہیں۔ مولوی صاحب نے انجمن کے سہ ماہی رسالے اردو میں دکنی تصانیف اور مضامین پر خاصی تعداد میں مقالے تحریر کیے۔ انھوں نے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان قطب قلی شاہ کے دیوان پر تبصرہ لکھ کر اردو ادب میں اہم ترین اضافہ کیا۔ مولوی صاحب نے ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء کے سہ ماہی اردو کے مختلف شماروں میں دکنیات پر کئی اہم مضامین لکھے۔ مولوی صاحب اردو کے پہلے محقق ہیں، جنھوں نے دکنی ادب کا اہل اردو سے تعارف کرایا۔ انھوں نے نصرتی پر ایک مستقل کتاب



لکھی اس کے علاوہ ملاوچی کی سب رس اور قطب مشرقی، نصری کی گلشن عشق اور علی کا نامہ وغیرہ مرتب کر کے شایع کیں۔

مولانا کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بہت سے تذکروں کے مخطوطات کا ترجمہ کیا اور انھیں مرتب کر کے شایع کیا۔ مرزا علی دلف کا تذکرہ گلشن ہند، مصطفیٰ کا تذکرہ ہندی، تذکرہ ریاض القضا اور عقد ثریا، میر تقی میر کا نکات الشعراء اور لکشمی نرائن شفیق اور نگ آبادی کا چہستان شعراء، نور الدین حسین خاں قلیق رضوی کا مخزن شعراء، اسد علی تمنا اور نگ آبادی کا گل عجائب مرتب کر کے شایع کیے۔ وکنیات میں ان تمام کتابوں اور اردو تذکروں کے تعارف سے مولوی صاحب نے تاریخ ادب اردو میں دو سو، ڈھائی سو سال کا اضافہ کیا۔

اردو میں سرسید پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اپنے ادیبوں کا ایک حلقہ بنایا اور انھیں اہم ادبی کاموں کی ترغیب دی۔ سرسید کے ان رفقاء میں مولانا لطاف حسین حالی کا نام سرفہرست ہے۔ سرسید کے بعد اس سلسلے میں دوسرا نام عبدالحق کا ہے۔ سرسید کے مقابلے میں مولوی عبدالحق کے رفقاء کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولوی صاحب صرف ادبی کام کرنے کی ترغیب ہی نہیں دیتے تھے بلکہ انجن ترقی اردو سے اس کام کو بہت اچھی طباعت کے ساتھ شایع بھی کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق کے رفقاء میں مولوی وحید الدین سلیم سید و ہاج الدین، مولوی محمد حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولوی غلام یزدانی، مولوی سید ہاشمی، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، شیخ چاند، سید سراج الدین، ڈاکٹر عبدالستار، حافظ محمود شیرانی، مرزا فرحت اللہ بیگ، مولانا عبدالمجید دریا آبادی، ڈاکٹر لطافت حسین خاں، مرزا محمد مہدی کوکب اور محمد الیاس برنی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنے بعض رفقاء سے مستقل موضوعات پر کتابیں لکھوا کر شایع کیں۔ بعض رفقاء سے انگریزی اردو ڈکشنری کی تیاری میں مدد ملی اور بعض حضرات سے سہ ماہی "اردو" اور ہمارے زبان کے لیے مضامین لکھوائے۔

مولوی عبدالحق پہلے اور آخری اردو ادیب تھے جنھوں نے اپنے ہم عصروں سے اتنے بڑے پیمانے پر ادبی کام کمال کے شایع کیا۔

آخر میں شاید یہ کہنلے جائے ہو گا کہ مولوی عبدالحق اردو زبان و ادب کی وہ میثا ہیں جو ہندوستان اور پاکستان میں مساوی تقسیم ہوئی ہے۔ جس طرح ہندوستان کی قدیم تہذیب کی یادگاریں ہڑپا اور



مولوی نوح وارڈو پاکستان کی سرزمین پر ہمیشہ محفوظ رہیں گی اس زبان اور ادب کی تاریخ میں ہندوستان میں بھی مولوی عبدالحق کا نام زندہ اور تابندہ رہے گا اس لیے کہ خود انجمن ترقی اردو (ہند) دراصل مولوی عبدالحق ہی کا دوسرا نام ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے ادبی کارناموں سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ترقی اردو کے معنی زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان جملہ اصناف ادب کی ترقی بھی ہیں جن کی ترویج میں مولوی عبدالحق نے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں اور جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں تفصیل کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

---

# مولوی عبدالحق

(یادوں کے آئینے میں)

۱۹۳۷ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے میں داخل ہونے کے لیے لاہور آیا تو یہاں کی فضا نے کالج کی طرف رہنمائی کرنے کی بجائے آوارہ گردی کے راستے پر ڈال دیا۔ چنانچہ کچھ مدت لاہور میں بے مقصد رہنے کے بعد میں پھر واپس راولپنڈی جا پہنچا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ پہلے سلسلہ ایک پرائیویٹ کارپوریشن کے طور پر والی۔ ایم۔ سی۔ اے کے ہال میں شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد سرکاری ادارہ بن گیا۔ سید احمد شاہ بخاری اس کے کنٹرولر تھے جو بعد میں ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ میں نے ملازمت کے لیے ان کے نام اپنی درخواست بھیج دی۔ بخاری صاحب نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا۔ والد نے مجھے مولوی عبدالحق کے نام ایک خط دیا کیوں کہ اس وقت دہلی میرے لیے ایک نیا شہر تھا، اور دہلی آنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔

اس زمانے میں انجمن ترقی اردو (ہند) اپنے پورے شباب پر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی (دریائے گنج) میں اس کا دفتر تھا۔ اس میں مولوی صاحب کا قیام تھا۔ علامہ برج موہن کی بھی مرحوم بھی وہیں فروکش تھے۔ میں خط لے کر حاضر ہوا تو مولوی صاحب بڑی محبت سے ملے اور فرمانے لگے تمہارا قیام یہیں میرے یہاں ہوگا چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے جا کر کہنے لگے۔ یہ بڑا تاریخی کمرہ ہے اس میں کانگریس کمیٹی کے دنوں میں جواہر لال نہرو ٹھہرے تھے۔ تم اسی میں جب تک چاہو قیام کرو۔ پھر اس کوٹھی کے دوسرے کمرے کا ذکر کر کے بتانے لگے کہ فلاں کمرے میں مولانا محمد علی مرحوم، فلاں میں پنڈت موتی لال نہرو اور فلاں میں مہاتما گاندھی فروکش تھے۔ مجھے اس سے پہلے اتنے بڑے مکان اور بالخصوص اتنی تاریخی حیثیت کے مکان میں

قیام کرنے کا کہاں موقع ملا تھا۔ دیر تک ایک حیرت آمیز مسرت کی کیفیت رہی۔ سب سے زیادہ مسرت کا سبب،  
تو مولوی صاحب کی وہ شفقت تھی جس کا مجھے پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

باتوں کے دوران میں آپ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا انٹرویو کب ہے۔ میرے یہ بتانے پر کہ جناب انٹرویو کی  
تاریخ تو گذر چکی ہے، بہت ہنسے اور بولے پھر تم آئے ہی کیوں ہو۔ میں نے کہا ”بخاری صاحب سے جا کر کہہ دوں گا  
دفتر کی چٹھی راولپنڈی میں ملی۔ میں لاہور میں تھا، دوبارہ راولپنڈی جانا پڑا اور اب وہاں سے دہلی آ رہا ہوں۔“  
کہنے لگے تم ابھی کالج کے ماحول سے باہر آئے ہو، تمہیں دنیا کا تجربہ نہیں۔ ان باتوں کو کوئی نہیں سنتا۔ تمہیں تو دفتر  
کے لوگ بخاری صاحب تک پہنچنے ہی نہ دیں گے۔ وہ یہی کہہ کے کہ انٹرویو کی تاریخ گذر چکی ہے، تمہیں واپس  
روانہ کر دیں گے لیکن چلو اس بہانے دہلی کی سیر تو ہو جائے گی۔ انجمن کا کتب خانہ بھی اطمینان سے دیکھتے رہو۔ اس  
کمرے میں تاریخی کتابیں ہیں، اس میں تنقیدی کتابیں، فلاں کمرے میں نادر کتابوں کا ذخیرہ ہے اور فلاں میں قلمی  
مسودے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

رات کو کھانے پر پانچ سات حضرات موجود تھے۔ علامہ کشفی اور رحم علی الہاشمی صاحب کے علاوہ اور جو  
حضرات تھے ان کے نام مجھے یاد نہیں۔ میں کھانے کی میز پر اور ویسے بھی اس ماحول میں دبکا دبکا سا رہتا تھا۔ اٹھا  
انیس برس میری عمر تھی۔ ان علمی شخصیتوں سے بات کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا۔ اس وقت اگرچہ ”ادبی دنیا“ لاہور  
اور ”زمانہ“ کانپور میں میری دو چار غزلیں چھپ چکی تھیں لیکن ان دو چار غزلوں کے سہارے مولوی عبدالحق  
اور علامہ کشفی مرحوم ایسے علما کے سامنے لب کشائی کی جرات ٹھوڑا ہی ہو سکتی تھی۔ اور اس وقت کا کیا سوال، آج بھی  
میرے لیے یہ کہاں ممکن ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق کے روبرو حوصلے سے بات کر سکوں۔

تو خیر دوسرے دن میں انٹرویو کے لیے براڈ کاسٹنگ ہاؤس جا پہنچا۔ اس زمانہ میں ریڈیو کے تمام اداکار ایک ہی  
جگہ نہ تھے بلکہ شہر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ کنٹرول روم آف براڈ کاسٹنگ کا دفتر اسکندرا روڈ پر تھا۔  
اور دہلی ریڈیو اسٹیشن انڈر ہل روڈ پر۔ مجھے چونکہ کنٹرول روم کے دفتر سے بلاوا تھا اس لیے اسکندرا روڈ پہنچا مولوی  
صاحب کی بات حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ وہاں صورت حال یہ تھی کہ سہ

سگ دور باں بھ یاقینہ غریب

ایں گریباں گرفت و آں دامن

جس کمرے میں گیا یہی جواب ملا کہ بخاری صاحب سے ملاقات ممکن نہیں۔ انٹرویو تو پورے سوں تھا۔ آپ آج آرہے ہیں

جن امیدواروں کا انٹرویو ہونا تھا ہو چکا۔ بورڈ کے اراکین اپنے اپنے شہر کو واپس جا چکے۔ اب انٹرویو کا کیا سوال۔ نہ م راشد اور کرشن چندر انڈر بل روڈ والی بلڈنگ میں تھے، ورنہ ان سے کچھ مدد حاصل کرتا۔ آخر بخاری صاحب کے سکریٹری سے میں نے کہا کہ میرا کارڈ انڈر بھیج دیں۔ بخاری صاحب نہ ملنا چاہیں گے تو نہ ملیں گے۔ کارڈ انڈر بھیجنے میں آپ کو کیا اعتراض ہے۔ میں نے کارڈ پر اپنے نام کے ساتھ والد کا نام بھی لکھ دیا تھا اور یقین تھا کہ انٹرویو ہو نہ ہو ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔

کارڈ انڈر گیا تو دو چار منٹ ہی میں بخاری صاحب نے بلا لیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو اخلاق اور تہذیب کے ایک دل نشین پیکر کو اپنے سامنے دیکھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے بخاری صاحب کو پہلی بار نیکر پہنے دیکھا۔ دو اب کا یہ عدیم المثال مزاج نگار، پطرس کے مضامین کا مصنف، مجھے اس وقت متانت اور سنجیدگی کی ایک تصویر نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے بات تو وہی کہی کہ انٹرویو کی تاریخ گزر چکی ہے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی حدود میں داخل ہو کر کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ غالباً دل نوازی کا سلیقان کے لہو میں کار فرما تھا۔

غیر واپس آ کر مولوی عبدالحق صاحب کو ساری داستان کہہ سنائی۔ بہت محفوظ ہوئے، کہنے لگے مجھے اس بات کا یقین تھا کہ تاریخ مقررہ کے بعد انٹرویو ممکن نہیں لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں روکا کہ اس قسم کا تجربہ زندگی میں ضروری ہے۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ تمہاری ملازمت کے بارے میں اب میں کچھ سوچوں گا۔ چنانچہ دوسرے دن انھوں نے خود مجھ سے اس موضوع پر بات کی۔ کہنے لگے کہ ڈاکٹر شانتی سرورپ بھٹناگر کا دفتر بونی ورسٹی انکلیو میں ہے۔ تم ان سے جا کر ملو۔ میں تمہیں خط دے دیتا لیکن تم اپنے والد کا نام بتا دینا۔ میرے خط کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس ہدایت کے مطابق میں اگلے صبح ڈاکٹر بھٹناگر کے وہاں جا پہنچا۔ ڈاکٹر بھٹناگر میرے والد کے مداحوں میں سے تھے۔ لاہور میں ایک دو بار ان سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ یہ اپنے دفتر میں بجلی کی سرعت سے کام کر رہے تھے۔ چند لمحوں میں انھوں نے نہ جانے کتنی فائلیں نکال ڈالیں۔ کتنے ہی لوگوں کے ٹیلی فون سنے اور کتنے ہی لوگوں کو ٹیلی فون کر ڈالا۔ میری جانب متوجہ ہوئے تو میں نے کہا کہ مولوی عبدالحق صاحب کی ہدایت کے مطابق حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے میری مختصر سی بات بڑی توجہ سے سنی۔ اور کہنے لگے ڈاکٹر عبدالحق کی بات تو میں کسی طرح نہیں ٹال سکتا۔ تم اس مضمون کی ایک درخواست مجھے دے دو۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور سیکریٹریٹ میں ملازمت آسانی سے مل جاتی تھی۔ میں اگلے دن درخواست لے کر حاضر ہوا۔ انھوں نے درخواست پر کچھ لکھا اور اپنے کسی ماتحت کو بلا کر



اس کے سپرد کر دی۔

مجھے یقین تھا کہ ملازمت مل جائے گی۔ مولوی صاحب کو بھی امید تھی کہ ڈاکٹر بھٹناگر ان کی بات کا یقیناً خیال کریں گے۔ لیکن تیسرے دن ہی یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بھٹناگر بہ کار سرکار یورپ تشریف لے گئے ہیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے بھئی اب تمہارا کام کچھ مشکل ہو گیا ہے۔ یہ دفتری نظام ہی ایسا ہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر کے جانے کے بعد تمہاری درخواست کو کوئی اٹھاکے بھی نہیں دیکھے گا۔ اور وہ جس فائل میں ہے اسی میں دفن ہو جائے گی۔

اس کے بعد میں کوئی دو چار روز دہلی میں رہا اور روزانہ میں لے یہ دیکھا کہ ہر مکتب فکر کے لوگ مولوی صاحب سے ملنے آتے تھے۔ ان میں سیاسی جماعتوں کے لوگ بھی ہوتے تھے۔ مولوی صاحب ہر ایک کے ساتھ ایک ہی موضوع پر بات کرتے تھے۔ اور وہ تھا ہندوستان میں اردو کی ترقی کا مسئلہ۔ میں نے انھیں کبھی کسی سیاسی جماعت کی حمایت یا مخالفت کرتے نہیں دیکھا۔ ان سے ملنے والوں میں کانگریسی، مسلم لیگی، کیونسٹ اور مہاسبھائی ہر انداز فکر کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ لیکن مولوی صاحب کبھی سیاسی بحث میں نہیں الجھتے تھے۔ ویسے بھی انھیں کسی سیاسی جماعت سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ حتی الامکان سیاست سے دور ہی رہتے تھے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے مرحوم جناح صاحب دلی آ رہے تھے۔ انجمن کے بعض لوگ کسی اور مہمان کو پہنچانے اسٹیشن جانا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ تم لوگ اسٹیشن پر نہ جاؤ تو اچھا ہے، بعض لوگوں کو یہ گمان گذرے گا کہ انجمن ترقی اردو کے اراکین جناح صاحب کا استقبال کرنے آئے ہیں۔

اس قیامِ ادہلی کے بعد مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع لاہور میں ملا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ مولوی عبدالقادر قسوری کے دولت کدے پر ان کا قیام تھا۔ میں ایک دوست کے ہمراہ ان کے وہاں حاضر ہوا۔ آپ انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخ قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں پہنچا تو بہت مصروف تھے۔ اندر بلا تو لیا لیکن زیادہ وقت نہ دے سکے۔ فرمانے لگے شام کو میاں بشیر احمد کی کوٹھی پر آ جانا، وہاں ایک بہت اہم جلسہ منعقد ہو گا۔ اسی جلسے میں انجمن کی صوبائی شاخ کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا تھا۔

تین برس بعد آپ پھر لاہور تشریف لائے۔ غالباً قیام ان کا ایک ہی دن رہا۔ مجھے ان کی آمد کا علم نہ تھا۔ شام کو استاذ مقرر مولانا تاجور نجیب آبادی کی صدارت میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ہم لاہور کے شعرا اس میں شریک تھے۔ تھوڑی دیر میں مستظہین مشاعرہ کے ہمراہ مولوی عبدالحق صاحب تشریف لے آئے۔ انھوں نے مشاعرے کے اختتام پر اردو کے متعلق ایک ایسی پُر مغز تقریر کی کہ اہل لاہور نے شاید ہی ایسی تقریر کبھی سنی ہو۔

پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ اب میں ہندوستانی تھا اور قبلہ ڈاکٹر صاحب پاکستانی۔ ایک ہی خاندان کے افراد دو قوموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کی گونڈن جوہلی کی تقریب تھی۔ ہندوستان سے ڈاکٹر اعجاز حسین، حضرت جگر مراد آبادی، جناب جوش ملیانی، جناب روشن صدیقی اور راقم التحریر کو شرکت کی دعوت ملی۔ میرا پاکستان کا یہ سفر ایک عجیب کیف و نشاط سے لبریز تھا۔ کراچی میں انجمن کی جوہلی کے بعد کارڈن کالج راولپنڈی میں مشاعرہ تھا۔ اور پھر واپسی پر پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایک مشاعرہ تھا۔ کارڈن کالج راولپنڈی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور تو وہی درس گاہیں ہیں، جہاں میں تے بات کرنے کا طریقہ سیکھا۔ چنانچہ مولوی صاحب سے ملاقات کی مسرت اور کارڈن کالج اور پنجاب یونیورسٹی کی زیارت کا شوق پھر پھر واز بن گیا اور میں براہ راست کراچی جا پہنچا۔

اب کے میرا قیام پھر انجمن ترقی اردو کے دفتر میں تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ عمارت بھی جس میں انجمن کا دفتر ہے، ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے باتوں باتوں میں یہ راز افشا کیا کہ انجمن کی یہ عمارت بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا دہلی میں تو آپ نے مجھے جواہر لال نہرو کے کمرے میں ٹھہرایا تھا۔ اب میرا قیام کس کمرے میں ہے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ میں کس کمرے میں ٹھہرایا گیا ہوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ پہلی منزل پر بائیں ہاتھ کا کمرہ ہے۔ فرمانے لگے اس عمارت کا اصل نام گاندھی آشرم ہے اور جس کمرے میں تم فروکش ہو اسی میں بیٹھ کر مہاشا گاندھی پرارتھنا کیا کرتے تھے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اس پرارتھنا میں شریک ہوتے تھے۔ مختلف کمروں میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے ان کی آواز پہنچتی تھی اور وہ قرآن کی آیت اور وید کے منتر اسی کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔

کراچی میں اب کے میرا قیام کئی روز کا تھا۔ راولپنڈی کے مشاعرے میں ابھی کوئی دس گیارہ روز باقی تھے اور دہلی واپس آکر راولپنڈی جانا آسان نہ تھا۔ راولپنڈی کے بعد لاہور میں بھی مجھے رکنا تھا اس لیے ایسے پروگرام کا ارادہ ترک کر دیا جو بھانگم بھاگ پر مشتمل ہو، چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین، حضرت جوش ملیانی اور روشنی صاحب کی واپسی کے بعد میں ہندوستان والوں میں تنہا کراچی میں رہ گیا۔

اب کے مولوی صاحب کو اور زیادہ مدت کے لیے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی پابندی اوقات، ان کی مسلسل محنت، ان کا علی الصبح بیدار ہو کر سمندر کی سیر کو جانا، ان کی کم خوری یہ تمام باتیں میرے لیے بڑی حیرت کا باعث تھیں۔ کھانا تو وہ ایک زمانے سے ایک ہی وقت کھاتے ہیں۔ رات کو، دن کو وہ کھانا نہیں



کھاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ دن کا کھانا طبیعت میں گرانی پیدا کرتا ہے اور یہ گرانی روزانہ کے کام میں سارج ہوتی ہے رات کا کھانا بھی اتنا کم کھاتے ہیں کہ خوردن برائے زیستن کا اس پر پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔ میرے لیے تو اتنی کم خوری حیرت کا باعث تھی۔ ایک دو بار میں نے ارادہ کیا کہ صبح ان کے ساتھ ہوا خوری کے لیے جاؤں لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ صبح ۴ بجے حوائج ضروری سے فارغ ہو کر سیر کے لیے گھر سے چل دیتے ہیں تو مجھے اپنا ارادہ منسوخ کرنے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ جو کام ہلکے سیر و تفریح اتنی برس کی عمر میں وہ بہ آسانی کر لیتے تھے وہ میرے لیے چونتیس برس کی عمر میں ممکن نہ تھی۔ میری روانگی کے روز جب انھیں معلوم ہوا کہ میں برہنائے کاہلی اپنا ارادہ پارہ پل تک پہنچانے سے قاصر رہا ہوں تو انھوں نے صبح کی سیر اور مناظر سے لطف اندوزی کی لذت کو کچھ اس سحر آفریں انداز سے بیان کیا کہ دہلی واپس آکر میں نے سچ سچ صبح کی سیر شروع کر دی اور کئی ماہ تک اسے جاری رکھا۔

اسی سفر کا ذکر ہے ایک دن شام کو میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ ہندوستان میں اردو کے مستقبل کا ذکر چل نکلا۔ اردو کی بقا اور ترقی کے متعلق ہندوستان میں جو کام ہو رہا ہے اس کی روش صاحب نے بڑی واضح اور عمدہ تصویر پیش کی۔ آپ ساری روداد بہ غور سنتے رہے۔ کہیں کہیں اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے۔ بعد میں کہنے لگے ہاں لیکن یہاں (یعنی پاکستان میں) جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میں بالکل غیر مطمئن ہوں۔ چنانچہ غالباً یہی وجہ تھی کہ انھیں اپنے خلاف مزاج اردو کے سلسلے میں ایک ایسی ٹینشن چلانا پڑی اور سیکریٹریٹ تک ایک جلوس کی رہنمائی کرنا پڑی۔

اس مختصر قیام میں مجھے اس کمرے میں بھی حاضری کے مواقع ملے جس میں مولوی صاحب دن بھر گرمی سردی، برسات سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہیں۔ یہ کمرہ سادگی اور نفاست پسندی کی ایک دلکش تصویر تھا خطوط، کتابیں، فالیں، مسودے ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے موجود اور مولوی صاحب اس انہماک سے لکھنے یا پڑھنے میں مشغول ہیں کہ انھیں کسی کی آمد کا احساس تک نہیں ہے۔ دو ایک بار تو ایسا ہوا کہ میں کمرے میں ایک آدھ منٹ توقف کے بعد انہی قدموں واپس لوٹ آیا کیوں کہ کام میں ان کی یک سوئی نے مجھ میں اتنی ہمت ہی نہ پیدا ہونے دی کہ میں ان کے انہماک میں مغل ہو سکوں۔

یہ میں آج سے سات برس پہلے کی بات بتا رہا ہوں۔ پھر اس کے بعد کئی بار ڈھاکہ، چٹاگانگ اور لاہور جانے کا اتفاق ہوا لیکن میں کراچی نہ جاسکا۔ ایک بار گیا تو یوں کہ مشاعرے میں شرکت کے بعد علی الصباح وہاں سے روانہ ہوا۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر میں اس دن کے قیام کے بعد مجھے مولوی صاحب کی خدمت

میں حاضری کا موقع نہ مل سکا۔ اور اب موجودہ حالات کے پیش نظر کیا کہا جاسکتا ہے کہ کب یہ سعادت نصیب ہو۔  
ع کشتی شکستگانیم اسے بادِ شرطِ برحیز

نئی دہلی

۲۴ دسمبر ۱۹۶۰ء

## حواشی

۱۔ ڈاکٹر سرشانتی سرودپ بھٹناگر مرزا ہر گوپال تفتہ کے خاندان سے تھے۔ شاعر بھی تھے۔ اور شاعروں کے ہمدرد بھی۔ ایک مدت تک آپ لاہور میں رہے۔ پھر دہلی آ گئے۔ یہاں وہ بورڈ آف سائنٹی فک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں منسٹری آف ایجوکیشن کے سکرٹری بنے۔ ریٹائر ہونے سے قبل ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ ”لاجوتی“ آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر نظمیں ان کی رفیقہ حیات لاجوتی کے انتقال پر ہیں۔

۲۔ پہلی منزل سے میری مراد گراؤنڈ فلور ہے۔ ہم اردو والے گراؤنڈ فلور ہی کو بالعموم پہلی منزل کہتے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ (ج.ن.ا۔)



# عبدالمنفی کی تنقید نگاری

شبلی اور حاکمی کے بعد اردو ادب کے جس تنقید نگار پر نگاہ ٹھہرتی ہے وہ بابائے اردو مولوی عبدالمنفی ہیں۔ وہ ادب میں حاکمی کی اخلاقیات اور شبلی کی جمالیات کے جامع ہیں۔ وہ حاکمی سے بہت زیادہ اور براہ راست مغربی تصورات سے واقف ہیں۔ لیکن ان کا اسلوب بیان اپنی مشرقی نفاست میں شبلی سے قریب تر ہے، گرچہ اس میں رنگینی کم اور سادگی زیادہ ہے۔ بہر حال، شبلی ہی کی طرح وہ بھی ایک محقق ہیں اور ان کی تنقید کو تحقیق سے بالکل الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ درحقیقت عبدالمنفی کی تنقید نگاری میں ایک تحقیقی وزن ہے اور ان کی تحقیق میں ایک تنقیدی نظر ہے۔ وہ صرف ادیب نہیں، عالم بھی ہیں۔ علم و ادب کا یہ امتزاج ہی انھیں بیک وقت شبلی اور حاکمی دونوں کا جاں نشین بناتا اور اردو تنقید کا تاریخ میں ایک منفرد و ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اس مقام کی ایک نمایاں خصوصیت مشرق و مغرب کی ہم آہنگی بھی ہے۔ عبدالمنفی شبلی و حاکمی کی بہترین تنقیدی روایات کے نہ صرف وارث بلکہ ان میں کچھ توسیع کرنے والے بھی ہیں۔ یہی چیز انھیں جدید اردو تنقید کے بانیوں اور ان کے بعد آنے والے جدید ترماد و ناقدین کے درمیان ارتقا کی ایک اہم کڑی بنادیتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کم عمر ہم عصروں میں کوئی ان کا جاں نشین نہیں نظر آتا ہے۔

عبدالمنفی نے کوئی تنقیدی کتاب نہیں لکھی، نہ ان کا کوئی مستقل تنقیدی مقالہ دست یاب ہے۔ بالعموم اور بہ کثرت انھوں نے یا تو مقدمے لکھے ہیں یا تبصرے۔ ان مقدموں اور تبصروں میں وہ سب باتیں ہیں جو مقالات و مضامین میں پائی جاتی ہیں۔ یہ علمی و ادبی کاوشیں اپنے موضوعات کے تحقیقی و تنقیدی مطالعات ہیں۔ ان میں معتد بہ تحریریں موضوع کے تمام اہم پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔ عبدالمنفی نے جس کتاب پر قلم اٹھایا ہے، عام طور پر اس کے مصنف کی سیرت کا تعارف کراتے ہوئے اس کے مواد کی اس طرح تشریح کی ہے کہ فکر و فن،

اخلاقیات و جمالیات اور اقدار و مسائل کے تراویح واضح ہو گئے ہیں، روایات پر بھی بحث کی گئی ہے اور تجربات پر بھی، قدیم کی بھی قدر شناسی ہے اور جدید کی بھی، نظریاتی و معاشرتی امور کے ساتھ ساتھ لسانیات اور محاورات سے بھی اعتنا کیا گیا ہے۔ یہ مطالعات و افسرانہ و تہذیبی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان میں تجزیہ، موازنہ اور فیصلہ سمجھی کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ ایک مرکب، متوازن اور مکمل تنقید کے نمونہ ہیں۔ یہ حقیقی قدر شناسی کی مثالیں ہیں، جن میں نہ کسی کی رہایت و مروت ہے نہ کسی پرست و شتم۔ عبدالحق کا انداز تنقید معروفی ہے، اگرچہ ان کی اپنی ترجیحات عیاں ہیں، ان کے کچھ مفروضے ہیں، ان کی پسند و ناپسند بھی ہے۔ مگر بالکل شخصی تفصیلات کم سے کم ہیں اور افراط و تفریط تقریباً مفقود۔ عبدالحق کی رائوں سے اختلاف ضرور کیا جاسکتا ہے مگر ان پر الزام نہیں رکھا جاسکتا، ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا، ان کی طرف التفات مفید ہوگا۔

ناقدانہ صلاحیت کے متعلق عبدالحق کا یہ خیال حقیقت افروز ہے :-  
 ”تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دور ہیں، جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو، جس نے ایک مدت مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہے اور وہ اس رائے کے بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دل نشیں کر سکتا ہے۔“

”روح تنقید“ - تنقیدات عبدالحق

مرتبہ محمد تراب علی خاں بازار، ص ۹۹

اس مختصر سے بیان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تنقید نگاری کے لیے حسب ذیل اوصاف مطلوب ہیں :

۱۔ ادبیات سے شغف۔

۲۔ کثرت مطالعہ۔

۳۔ غور و فکر۔

۴۔ کافی تجربہ۔

۵۔ ذوق سلیم۔

۶۔ وسعت نظر۔

۷۔ قوت فیصلہ۔

۸۔ قدرت بیان۔

اس سلسلے میں عبدالحق ایک ہتے کی بات یہ بھی بتاتے ہیں کہ:

”تنقید پر کتابیں پڑھنے سے تنقید نہیں آتی، بلکہ اعلا درجے کا کلام اور

اعلا پائے کی تنقیدیں پڑھنے سے اس کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔“

(ص ۱۰۱، ایضاً)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ براہ راست تخلیقی اور تنقیدی دونوں قسم کی اصل متون کا مطالعہ کرنے سے تنقیدی حس بیدار ہوتی ہے اور تنقیدی شعور پیدا ہوتا ہے، ورنہ ادب کی تاریخوں وغیرہ میں بالواسطہ دوسروں کی رائیں پڑھ لینے سے تنقیدی استعداد حاصل نہیں ہوتی۔ اس معاملے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ”اعلا درجے کا کلام“ اسے ساتھ ساتھ ”اعلا درجے کی تنقیدیں“ کو بھی ذوقی تنقید کے نشوونما کا ایک وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدالحق تخلیق کے علاوہ تنقید کی اصلیت و اہمیت کے بھی قابل ہیں۔ یہ ادب و تنقید کا جدید ترین اور صحیح ترین نقطہ نظر ہے جس کا علم و احساس بہت فام نہیں ہے۔ اس سے ادب میں تنقید کے کردار پر روشنی پڑتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ ناقد کی حیثیت فن کار سے کم تر نہیں ہے، بلکہ وہ ادب و تہذیب کی ترقی و ترویج میں فن کار کے ساتھ شریک ہے اور اس کا معاون ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادب اور زندگی دونوں کے لیے تنقید کی ضرورت و افادیت کا اقرار عبدالحق ان لفظوں میں کرتے

ہیں :

”تنقید کئی خدمتیں انجام دیتی ہے۔ خود نقاد اور ادیب کے حق میں بھی اصلاح کا باعث ہے۔ اسے ذاتی اظہار کی قدر کرنے کا موقع دیتی ہے اور ضبط کھاتی ہے۔ ایک طرف وہ سنت قدیم پر غیر ضروری شیفٹنگ سے بچاتی اور دوسری طرف جدت یا جذبات کے زور میں تمام حدود کو توڑ کر شکل جانے سے روکتی ہے، یعنی بریک کا کام دیتی ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے تفریح اور تعلیم کا سامان مہیا کرتی ہے اور تہذیب کا ذوق بیدار کرنے میں مدد دیتی اور تحریک بن کر ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ غرض ادب کے فروغ و ترقی کے لیے



(اردو تنقید کا ارتقاء - مقدمات عبدالحق)

مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص (

تنقید کو تعلیم کے ساتھ ساتھ "تفریح" کا ایک ذریعہ قرار دے کر ایک بار پھر عبدالحق نے تنقید کی تخلیقی نوعیت پر تاکید کی نشان لگایا ہے۔ یہ ان کے نظریہ ادب کی وسعت کا ایک ثبوت اور ان کی تنقیدی باریک بینی نیز روشن خیالی کی دلیل ہے۔

مشرقی و مغربی تنقید کی بحث عبدالحق کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور جدید تعلیم یافتہ ناقدین اپنی کوتاہ نظری سے مشرقی تنقید کی تحقیر کر رہے تھے۔ ایک اچھے مسجے اور بڑے ناقد کی طرح عبدالحق نے اپنے ہم عصروں کو اس مسئلے پر اس طرح خبردار کیا:

"مشرقی کلام کی تنقید میں کیوں نہ مشرقی اصطلاحات اور معانی و بیان کے

الفاظ سے کام لیں یہ ہمارے ادب میں شروع سے مستقل ہیں اور ان کا

مفہوم معین ہے۔ پڑھنے والے ان الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم بلاتا مقل

سمجھ جاتے ہیں۔ کیا تمام مشرقی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال ترک کرنے

اور سراسر مغربی الفاظ و اصطلاحات کے اختیار کرنے ہی سے تنقید قابل

قبول ہو سکتی ہے؟"

(ص ۴۷۲ ایضاً)

یہ ایک چبھتا ہوا سوال ہے جس نے جدت پرست نقادوں کو شرمندہ کیا ہو یا نہیں، مگر باذوق قارئین ادب کو ضرور ایک حقیقت سے آگاہ کر دیا اور انھیں معلوم ہو گیا کہ اردو تنقید میں مغرب پرستی کا رواج عقل و دانش سے خالی ہے۔ اس موضوع پر عبدالحق کے یہ نکات بصیرت افروز ہیں کہ مشرقی کلام کی تنقید میں مشرقی اصطلاحات کا استعمال بالکل مناسب و موزوں ہے اور فی الواقع یہی الفاظ و اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم واضح ہونے کے سبب وہ بہ آسانی قارئین کی سمجھ میں آجاتے اور انھیں متاثر کرتے ہیں۔ اس بیان میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ نامانوس اور اجنبی قسم کے مغربی الفاظ و اصطلاحات نہ تو ٹھیک ٹھیک قارئین کی سمجھ میں آتے ہیں نہ انھیں متاثر کرتے ہیں اور نتیجتاً ان کی افادیت محدود ہو جاتی ہے، جب کہ یہ بھی ممکن ہے کہ مغربی انداز کی پیروی کی بجائے بیان دراصل پرانے خیال کے سبب ہو، یعنی اس انداز



کے تنقید نگاروں کی فکر واضح نہیں ہے، لہذا اس کے اظہار میں ابہام ہے۔

تنقید میں طرز بیان کی وضاحت پر عبدالحق بہت زیادہ زور دیتے ہیں، اور خیال کی اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اس کے اظہار کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہیں :

”اس میں شبہ نہیں کہ اصل غایت خیال ہے اور حسن بیان ذریعہ۔ لیکن طرز بیان کے محاسن اور اسقام اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔ ان کا تعلق جسم و روح کا سا ہے۔ جسم کو روح سے اور روح کو جسم سے الگ نہیں کر سکتے۔ اس لیے تنقید میں نقاد اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔“  
(ص ۲۷۰، ایضاً)

ادب و تنقید کا یہ ترکیبی نقطہ نظر تازہ ترین بھی ہے اور بہترین بھی۔ موضوع و اسلوب کے درمیان جسم و روح کا رشتہ بتا کر دونوں کی ہم آہنگی کا جو تصور عبدالحق نے پیش کیا ہے وہ حقیقت پسندانہ اور بصیرت مندانہ ہے۔ عبدالحق کے دور میں اخلاقی، معاشی اور نفسیاتی تنقیدوں کے مکاتب فکر کے درمیان جو معرکہ آرائی شروع ہوئی اس میں غلو، مبالغہ اور افراط و تفریط سے اس درجہ کام لیا گیا کہ تفریق اور فتنے کی صورت پیدا ہو گئی جس سے علمی و قارئین اور ادبی توازن برہم ہونے لگا۔ یہ گویا قدیم و جدید کی کش مکش تھی جس کی تہہ میں مشرق و مغرب کی آویزش پنہاں تھی۔ عبدالحق اس عبوری دور میں ایک ایسی شخصیت رکھتے تھے جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کی عناصر و اقدار کی جامع تھی۔ لہذا انھوں نے انتہا پسندیوں کے درمیان ایک نقطہ اعتدال پیش کیا اور چاہا کہ حریف مکاتب کے مابین مفاہمت و مصلحت ہو جائے، تاکہ ناقدین ایک شغول مشترک میں باہمی تعاون کی راہ اختیار کریں اور اس طرح ادب و تنقید کی ترقی صحیح رخ پر ہو۔ انھوں نے اپنے وقت کی ادبی نزاع کو ایک آفاقی تناظر میں دیکھا اور اس کا ایک عمومی جائزہ لے کر اصلاح احوال کی کوشش کی :

”افلاطون کے وقت سے لے کر اب تک تنقید کے بیسیوں مسلک وجود میں آچکے ہیں، مثلاً جمالیاتی، وجدانی، تاریخی، ماحولی، تاثراتی، نفسیاتی وغیرہ وغیرہ اور اس زمانے میں فراہڈ اور مارکس کے نظریوں نے بھی تنقید کو متاثر کیا ہے اور جیسے جیسے حالات بدلتے رہیں گے ادب اور تنقید پر نئے نظریوں اور سائنس کے اکتشافات کا بھی اثر پڑتا رہے گا۔ افلاطون، ماحول، تعلیم و تربیت

وصحبت کی بنا پر انسان کا رجحان ایک خاص جانب ہو جاتا ہے اور جب اس میں غلو ہوتا ہے تو وہی مسلک یا مذہب بن جاتا ہے۔ اس لیے تنقید کا کوئی مسلک جامع نہیں۔ ایسے نقاد اپنے رجحان یا ذوق کے زیر اثر ایک طرف جھک جاتے ہیں اور دوسرے رخ پر یا تو سرسری نظر ڈالتے ہیں یا اسے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ صحیح تنقید اسی وقت ہوگی جب ادب کے ہر رخ کو دیکھا اور جانچا جائے گا۔ اگر ایک گروہ دوسرے کو الہامی، مادی، روحانی، جہد بانی کہتا اور اسے ماضی پرستی یا روایت پرستی کا ملزم قرار دیتا اور اس کی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتا تو دوسرا گروہ جو فرایڈ اور مارکس پرستی میں مادیت پرستانہ زور دیتا ہے کہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی تنقید بھی ادبی تنقید نہیں رہتی، کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ بے شک ادب کا کام صرف ذوق اور وجدان کی تسکین کا سامان پیش کرنا نہیں لیکن اس کا کام محض مادیت کا پرچار بھی نہیں۔ یہ دونوں کا خدام ہے۔ کیا تنقید کے لیے لازم ہے کہ نقاد کسی خاص مسلک کا مقلد ہو؟

(ص ۷۰-۷۱، ایضاً)

یہ حالات اور حقائق کا ایک متوازن، عالمانہ اور مفکرانہ تجزیہ ہے۔ چند لفظوں میں مابہ النزاع مسئلے کی ایک معروضی تشریح بھی ہے اور اس کے ایک معقول حل کی طرف اشارہ بھی۔ یہ ایک منصفانہ رویہ ہے، جس میں نہ جانب داری ہے نہ تعصب، مگر چہ حقیقت پسندی کے پیش نظر معاشی و نفسیاتی نظریہ بازوں اور حربہ اندازوں کی جارحیت کے مقابلے میں اخلاقی نقطہ نظر کا دفاع کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ بے اعتدالی اور زیادتی مارکس اور فرایڈ کے ماننے والوں سے سرزد ہوئی ہے اور ان کی بے جا شدت نے تنقیدی توازن کو برہم کیا ہے۔ اس سلسلے میں روایت و جدت اور روحانیت و مادیت کی کش مکش کا نقشہ جس طرح کھینچا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحق کی ہمدردی ممکن ہے ان کے مظلوم ہونے کے سبب، روایت و روحانیت کے ساتھ ہے۔ مگر چہ جدت و مادیت کی حقیقت سے انھیں انکار نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ادب میں معاشی تجزیہ اور تسکین نفسی کا عمل داخل الہامی و اخلاقی ذوق و وجدان کے تحت ہو، تاکہ حد سے بڑھی ہوئی جمالیات و اقتصادیات کی بے راہ روی ادب و تہذیب کی تباہی کا

سلمان نہیں کرے اور روحانیات و اخلاقیات کے اصول و اقدار انسانیت کو تعمیر کے راستے پر گامزن رکھیں۔ اس بحث میں عبدالحق نے بہت ہی موزوں الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ادب و تہذیب اور علوم و فنون کی ترقیات سے اچھی طرح واقف ہیں اور اپنا نقطہ نظر موثر طریقے پر پیش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے انتہا پسندانہ اشتراکی و نفسیاتی تنقید کے محض تنقید ہونے سے نہیں، ”ادبی تنقید“ ہونے سے انکار کیا ہے، یعنی مارکس اور فریڈ کے نظریات ادب کی اصلیت کی تشریح میں بہت زیادہ مفید نہیں، اس لیے کہ وہ ادب کے سرچشمہ ابہام و وجدان سے آگاہ نہیں یا اس کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ اشارہ کرتے ہیں کہ نقاد کے لیے کسی خاص مسلک کا ”مقلد“ ہونا ”لازم“ نہیں، اگرچہ وہ ذاتی غور و فکر سے کام لے کر زندگی اور ادب کا کوئی معین موقف اختیار کر سکتا ہے، بلکہ اسے کرنا چاہیے۔

عبدالحق کے ان تنقیدی تصورات پر مبنی تنقیدی مطالعات کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے نظریات کا اطلاق کرنے میں کس حد تک کامیاب ہیں اور ان کی فکر کس پیمانے پر بروئے عمل آتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اقبال کے پہلے مجموعہ ”کلام“ ”بانگ درا“ اور ”انتخاب کلام میر“ پر ان کے تبصرے اور مقدمے کا تجزیہ کافی ہوگا۔ اس سلسلے میں عبدالحق کے یہ جملے بہت فکر انگیز ہیں اور ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ:

”جس شاعری کی ابتدا کو ہمارا ہو اس کی انتہا کیا ہوگی؟ میں اقبال کے لیے اس میں نیک شگون پاتا ہوں، وہ محاسن جو ہم نے بعد میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اقبال کے کلام میں نکالے ان سب کے بیچ اس نظم میں نظر آتے ہیں۔ تخیل، تشبیہات، بندش اور خیالات سب آئندہ کی غمازی کر رہے ہیں۔“

(”بانگ درا“ تنقیدات عبدالحق، ص ۵۷)

بعض ناقد ”ہمارا“ کو پہلی نظم اور ”بانگ درا“ کو پہلا مجموعہ سمجھ کر ان کی اہمیت کم کر دیتے ہیں۔ یہ ایک غلط انداز تنقید ہے۔ اس کے برخلاف عبدالحق حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں اور صحیح طور پر نظم اور مجموعے دونوں کو ان کے بنیادی محاسن کا سراغ لگاتے ہیں جو بعد میں بلاشبہ زیادہ وسیع پیمانے پر برگ و بار لائے۔ یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی جو خصوصیات ابتدا ہی میں ظاہر ہوئیں انہی کا ارتقا انتہا تک ہوتا رہا، فکر و فن دونوں کے اعتبار سے ”بانگ درا“ کی تخلیقات اردو میں بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغانِ حجاز کی منظومات کی پیش رو ہیں، جبکہ فارسی میں ”پیامِ مشرق“ جیسا اہم مجموعہ اعلا پاپے کی نظموں اور غزلوں کے ساتھ پہلے ہی شائع ہو چکا تھا۔ آگے چل کر عبدالحق اقبال کے سوانح پر روشنی ڈالتے



ہوئے ان عمرانی احوال کا نقشہ پیش کرتے ہیں جن میں اقبال کی شاعری رونما ہوئی اور اس کے ذہنی ارتقا میں شاعر کے ہم سفر بن کر اس کے اشعار کی ٹھیک ٹھیک تشریح کرتے ہیں، چنانچہ قوم پروری کی طرف اقبال کے میلان کی توجیہ وہ اس طرح کرتے ہیں :

”وہ یورپ کی وطنیت اور قومیت سے جس کا اثر تمام یورپ پر پھیلا ہوا ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی پھیلتا جاتا ہے، سخت بیزار ہیں۔ وہ اس تنگ نظری اور خود غرضی کو دنیا کے لیے باعثِ ہلاکت اور موجبِ آفت خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کی جنگِ عظیم سے جو بربادی یورپ اور تمام طولِ ہند دنیا پر نازل ہوئی اس کا بدیہی ثبوت ہے۔ اس بیزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی اخوت و مساوات کی طرف مائل ہوتے ہیں اور یورپ کی معاشرتی اور معاشی اور سیاسی زندگی جو بے روح اور صداقت سے خالی ہے انھیں اس عقیدے پر اور مستحکم کر دیتی ہے۔ اس طوفانِ سرمایہ داری و استبداد میں انھیں ایک ہی روشنی نظر آتی ہے جو دنیا کو نجات دے سکتی ہے اور جو جغرافیہ محدود اور نسل و رنگ کے قیود سے بالا ہے۔“

(ص ایضاً)

پیامِ اقبال کی اس ہمدردانہ ترجمانی کے باوجود، عبدالحق اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ کہیں اقبال اپنے وطن ہندوستان اور اس کی آزادی سے بالکل صرف نظر نہیں کر لیں۔ اس معاملہ میں وہ ترانہ ’ہندی اور ترانہ‘ متی کے فرق پر زور دیتے ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ بھی ہے کہ فارسی کے ساتھ وابستگی کے سبب اقبال اردو کو نظر انداز نہ کر دیں۔ یہ دونوں اندیشے ایک غلط فہمی پر مبنی تھے اور غلط ثابت ہوئے۔ ملک کی آزادی میں اقبال کا حصہ فکر و عمل دونوں میں ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے مفکر یا رہنما سے ذرا بھی کم نہیں بلکہ بعض جہتوں سے بہت زیادہ ہے۔ غلامِ ہندوستان کو انقلاب کا نعرہ اور آزادی کا ترانہ اقبال ہی نے دیا، جس کے بغیر دلوں میں وہ حرارت و جرات پیدا نہیں ہو سکتی تھی جس نے بالآخر تحریکِ آزادی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ شاعر کے علاوہ بحیثیت ایک سیاست دان کے بھی اقبال کا تدبیر بہ یک وقت وطن دوستی اور ملت دوستی سے مرکب ہے اور اگر سیاسی پارٹیوں کے بعض بڑے رہنما، خواہ وہ کانگریس کے ہوں یا لیگ کے، انگریزوں یا مخصوص برطانوی سامراج کے آخری وائسرائے کے شریفانہ



فریب میں نہیں آجاتے تو اقبال کی وفات کے ٹو سال بعد برصغیر کی خوں ریز تقسیم نہیں ہوتی۔ اسی طرح بانگ درا کے بعد اردو شاعری نے کلام اقبال کے بہترین نمونے پیش کیے۔

بہر حال اقبال کے نقطہ نظر پر قدامت پرستی کے الزام کو عبدالحق اس طرح رد کرتے ہیں:

"ان کی قدامت پرستی مردہ نہیں ہے جو دلوں میں یاس اور اداسی پیدا کرتی۔

ہے بلکہ وہ ان اہولوں کی پیروی ہے جن کی صداقت پر شاعر کو کامل یقین

ہے۔ وہ اپنے پیام میں عہد ماضی کی روشن مثال دکھا کر بار بار انھیں عمل اور

جوڑ دیتا اور ثبات پر آمادہ کرتا ہے۔"

(ص ۷۶، ایضاً)

یہ اقبال کی روایت پسندی کی بہت معقول توجیہ ہے۔ لیکن "قدامت پرستی" کا لفظ انگریزی لفظ "کنزروٹیزم" کا ترجمہ ہوتا

ہو، اسی طرح ناموزوں ہے جس طرح "پیٹریٹزم" کا ترجمہ "وطن پرستی"، اس لیے کہ کم از کم اقبال کے معاملے میں قدامت پرستی

کے ساتھ کوئی دوسری "پرستی"، حتیٰ کہ خودی کی "خود پرستی" بھی جمع نہیں ہو سکتی اس کا ترجمہ "قدامت کا جنون"

ہونا چاہیے۔

عبدالحق نے اقبال اور ٹیگور کا جو موازنہ کیا ہے اس سے ان کی انصاف پسندی کی کوشش کے باوجود ان کے تعقل

کی حدود بھی آشکار ہوتی ہیں:

"ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن ٹیگور

کا جذبہ محبت کو بہت گہرا اور بے تحاشہ ہے، لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر کبھی

اگے نہیں نکل جاتا اور باوجود کیف و وجد کے آپ سے باہر نہیں ہونے پاتا۔

اقبال کا مطلق نظر اگرچہ مقابلہ محدود ہے، مگر زیادہ قوی زیادہ پر زور اور زیادہ

شور انگیز ہے۔ ٹیگور کے یہاں نازک سے نازک موقع پر بھی عقل کی پرچھائیں

اس پاس ضرور نظر آتی ہے، مگر اقبال کے یہاں جذبات کے تلاطم کے سامنے

بعض اوقات بے چاری عقل اپنی آبرو بچانے کے لیے اچک کر الگ جا کھڑی

ہوتی ہے۔ وہاں جذب و کیف کے ساتھ خود داری ہے اور یہاں ذہنی و شغلی

(ص ۷۹، ایضاً)

اس تجزیہ میں ٹیگور کے یہاں نسائیت اور اقبال کے یہاں مردانگی کی بات ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ لیکن دونوں کے کلام میں عقل و عشق کی حدود، جنون و خرد کے فرق اور محدود و لامحدود کی جو تمیز کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں تضاد بھی ہے اور پرآگندہ خیالی بھی۔ اگر اقبال کا سطح نظر نسبت محدود ہے تو ان کا کیف و وجد ہر حد سے آگے کیسے چلا جاتا ہے، جب کہ ٹیگور کا جذبہ ایک حد کے اندر رہتا ہے؟ اقبال کے نظریہ خودی کی انتہا یہ ہے کہ انسان خدا کے قریب پہنچ جائے اور زندگی بھر اس کا شریک کار اس معنی میں رہے کہ اس کی مشیت کی تعمیل و تکمیل کے لیے اس کے احکام بجالاتا رہے، جب کہ ٹیگور انسان کی خودی کو خدا کی ہستی میں ضم کر دیتا ہے۔ یہ دراصل اسلام اور ویدانت کا فرق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور کا سطح نظر بہت محدود اور معمولی بلکہ رسمی طور پر صوفیانہ ہے، جس کے اندر ہندو جھکتی کا فنا سے شخصیت کا تصور کام کر رہا ہے۔ اس کے برخلاف اقبال انسان کی خودی کو اس درجہ مستحکم دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کائنات کے ارتقا میں خدا کے ساتھ مستقل بالذات طور پر تعاون کرے اور اس طرح اپنی خودی کے آفاقی اسکانات کو رو بہ عمل لائے، جس کے آگے اور پیچھے کوئی حد نہیں ہے، وہ ازلی اور ابدی ہے۔ ٹیگور عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا سمجھتا ہے، لیکن اقبال کا قطرہ ایک دریا سے ناپید کنار بننا چاہتا ہے۔ یہ تشریح واضح کرتی ہے کہ عبدالحق کی رائے کے برعکس "خودداری" اقبال کے یہاں ہے، جب کہ "وارفتگی" ٹیگور کے یہاں۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالحق کے بیان کے برخلاف اقبال کے اندر یہ نظر میں عقل و عشق یا جنون و خرد کا جو توازن ہے وہ ٹیگور کے اندازِ نظر میں مفقود ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عبدالحق کو اقبال اور ٹیگور کا کوئی گہرا اور وسیع تقابلی مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور انھوں نے اپنے دور کے بعض سطح ہیں ادیبوں کی خیال آرائیوں سے متاثر ہو کر کافی غور و فکر کے بغیر ایک غلط رائے قائم کر لی۔

ایسی ہی غلط رائے کا اظہار عبدالحق نے اقبال کے فن شاعری کے بعض پہلوؤں کے متعلق بھی کیا ہے:

"تخیل کی بلندی، تشبیہات و استعارات، لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ کلام پر مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔ وہ گویا مرزا کے مفنوی شاگرد ہیں اور پڑھنے والا جسے ذوق سخن ہے بہ آسانی اسے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن بندش میں وہ ہشتی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ مرزا کے طرزِ ادب میں جو خاص نزاکت ہے وہ نہیں پائی جاتی اور نہ وہ سوز و گداز اور دروہ جو ہم حالی کے کلام میں پاتے ہیں، اگرچہ کہیں کہیں تکلف کی جھلک نظر آتی ہے اور فارسی ترکیبیں اعتدال سے آگے نکل جاتی ہیں، مگر شان و شکوہ، زور اور شور اُمڈتے ہیں۔"

جذبات کی ادائی، حکیمانہ نظر اور شاعرانہ انداز بیان میں اقبال کے کلام کا جواب  
نہیں۔ (ص ۷۸-۷۷، ایضاً)

اقتباس کا آخری جملہ قبل کے جملوں کی تردید کرتا ہے۔ یہ تضاد بیان ایک ابھرنے کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ  
عبدالحق اقبال کے فنی تجربات کی داد دیتا چاہتے ہیں، مگر اردو تنقید نیز شاعری کی روایات انھیں روکتی ہیں۔ بندش  
کی جستی، نزاکت اور سوز و گداز کا ایک خاص مفہوم اور ماضی کے بعض شاعروں پر اس کا اطلاق متعین ہو چکا ہے جو  
ایک معیار بن گیا ہے، لہذا عبدالحق اسی معیار پر اقبال کے تجربے کو جانچنے لگتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اقبال کے  
اشعار میں ابتدا سے الفاظ و تراکیب کی جو جوش اور روانی ہے وہ غالب کے یہاں بھی ان کے کلام کے دور متوسط سے  
قبل پیدا نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر اقبال کی نظم ”ہمالہ“ کی تراکیب کا موازنہ غالب کے ابتدائی کلام سے کیا جائے تو  
حقیقت واضح ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ فن شاعری کو جہاں پر غالب نے ترقی دے کر چھوڑا تھا وہاں سے اقبال نے  
شروع کیا اور بہت دور تک آگے گئے۔ اردو شاعری کی روایت میں اقبال کی انفرادیت کا کمال یہی ہے۔ جہاں تک  
نزاکت کا معاملہ ہے، اس کے لیے روایتی تصورات میں بھی غالب نہیں، میر مشہور ہیں۔ ممکن ہے عبدالحق کا مفہوم لطافت  
ہو، مگر اس کے لیے انھوں نے صحیح لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ اس کے علاوہ نزاکت کا لفظ بجائے خود محض اس ملائمت کے  
لیے وقف نہیں جس کا اثبات کلام میر میں خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک زیادہ وسیع لفظ ہے اور اس میں نفاست  
کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس معنی میں اقبال کے یہاں نزاکت کسی اردو یا فارسی شاعر سے کم نہیں ہے۔ یہی حال لطافت  
کا ہے۔ اقبال کے یہاں ہرگز وہ تکلف اور بے اعتدالی نہیں ہے جس کا احساس عبدالحق کو ہوا ہے۔ اسی طرح سوز و  
گداز اور دردمندی میں اقبال کا ”شکوہ“ اسی کیف کا حامل ہے جو مستس حالی میں محسوس کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ  
”تصویر درد“ سے ”ذوق و شوق“ تک سوز و گداز اور درد کی جو روانی ہے اس کا تھوڑا ہی سا حصہ حالی کے کلام  
میں، اس کا بیجا نہ محدود ہونے کے سبب پایا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے تنقیدی مطالعات میں عبدالحق  
روایات تنقید میں کوئی اجتہاد نہیں کر سکے، شاید اس کے لیے وہ اصلاً ایک محقق اور عالم تھے، لہذا روایت میں کچھ  
توسیع کے باوجود اس کی تجدید اور بہت زیادہ ترقی کے لیے درکار صفات اپنے اندر نہیں پیدا کر سکے۔

عبدالحق کا مطالعہ میر زیادہ متوازن، واضح اور بھرپور ہے، اس لیے کہ یہ ایک نسبتاً قدیم شاعر کا مطالعہ  
ہے، جس کی کچھ روایات بن چکی ہیں۔ اس میں سب سے پہلے میر کے سوانح اور احوال کی تفتیش کی گئی ہے اس کے بعد  
اردو شاعری کی تاریخ میں ان کے امتیاز پر بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح میر کا کلام اور حقیقت ان



کی میرت کا آئینہ ہے یا ان کے کردار کی زیبائی ان کے کلام کی رعنائی کا باعث ہے۔ اسے ایک تاریخی یا شخصی مطالعہ بھی کہا جاسکتا ہے، مگر یہ حقیقی بن جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ناقد نے شاعر کی زندگی سے اعتنا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے فن کا بھی معروضی تجزیہ کیا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ تجزیے کے ہر پہلو سے پورا اتفاق نہیں کیا جائے، خاص کر جہاں درد اور انیس کے ساتھ میر کا موازنہ کیا گیا ہے۔ بہر حال، جس تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ عبدالحق نے میر کے ایسا شاعری کا جائزہ لیا ہے وہ عمومی طور پر قاری کو مطمئن کر دیتا ہے کہ ایک بڑے فن کار کی قدر شناسی کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مطالعہ میر میں عبدالحق نے جو تنقیدی نکات پیش کیے ہیں ان پر اب تک بسط و کتابیں بھی کوئی اضافہ نہیں کر سکی ہیں۔ یہ ایک ایسا حالانہ و محققانہ مطالعہ ہے جس میں تنقیدی بصیرت بہت نمایاں ہے۔ یہ مقدمات عبدالحق کا ایک اہم ترین نمونہ اور ایک بہترین ادبی کارنامہ ہے :

”یوں تو میر صاحب کے تمام نامور ہم عصروں کے کلام میں سادگی، صفائی اور روزمرے کی پابندی پائی جاتی ہے، لیکن محض سلاست اور زبان کی فصاحت کام نہیں آسکتی، جب تک کہ زبان میں تازگی، ادائے مطلب میں تسکینگی اور خیال میں بلندی و جدت نہ ہو۔ میر صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں یکجا جمع ہیں اور پھر اس پر درد اور تاثیر خدا داد معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے تمام ہم عصروں میں ممتاز اور اردو شاعروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں اور ان کی اس ممتاز خصوصیت کو اب تک کوئی نہیں پہنچا ہے۔ البتہ خواجہ میر درد ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے سلاست و فصاحت زبان کے ساتھ اخلاقی مضامین اور صوفیانہ خیالات کی چاشنی دی ہے اور کلام میں درد پیدا کیا ہے۔ بیان میں جدت اور تازگی بھی پائی جاتی ہے جس سے وہ میر صاحب کے لگ بھگ پہنچ جاتے ہیں، لیکن بیان میں وہ گھلا نہیں جو میر صاحب کے یہاں ہے اور نہ غایت درجہ سلاست و سادگی کے ساتھ وہ سوز و گداز ہے اور نہ تخیل کی وہ شان ہے جو شاعری کی جان ہے خصوصاً بیان کا وہ الوکھا انداز جس میں خاص نزاکت ہوتی ہے نظر نہیں آتا۔ میر صاحب کا بڑا کمال اسی میں ہے۔ میر انیس بھی جن کا فصاحت میں



بہت بلند درجہ ہے اور جو سوز و غم کے بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے میر صاحب کو نہیں پہنچتے۔ میر انیس میں پھر بھی تصنع اور تکلف آجاتا ہے۔ میر اس سے بالکل بری ہے۔ وہ خود سوز و غم کا پتلا ہے اور اس کا شعر سوز و غم کی صیح اور سچی تصویر ہے جس میں تکلف کا نام نہیں۔ میر انیس کے یہاں خیال کے مقابلے میں الفاظ کی بہتات ہے اور خیال سے پہلے لفظ پر نظر پڑتا ہے۔ لیکن میر کے اشعار میں الفاظ و خیال کے ساتھ اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے اور اسے لفظ و خیال سے الگ نظر نہیں آتا۔ میر انیس کے یہاں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہے۔ میر کے یہاں سکون اور خاموشی ہے اور اس کے شعر چپکے چپکے خود بخود دل میں اثر کرتے چلے جاتے ہیں، جس کی مثال اس نظم کی سی ہے جس کی دھار نہایت باریک اور تیز ہے اور اس کا اثر اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ دل پر جا کر کھٹکتا ہے میر انیس رلاتے ہیں۔ میر خود روتا ہے۔ یہ آپ بیتی ہے اور وہ جگ بیتی۔

(انتخاب کلام میر۔۔۔ مقدمات عبدالحق، ص ۹۵-۹۴)

اس بیان میں میر کی جتنی خوبیاں بیان کی گئی ہیں سب صیح ہیں اور ان سے کلام میر کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔ سادگی اسے ساختگی، درد و غم، سوز و گداز، تازگی و شگفتگی یقیناً اشعار میر کے امتیازی نشانات اپنے مجموعی کیف و کم کے لحاظ سے ہیں۔ لیکن میر کے ساتھ موازنہ کے لیے درد اور انیس کا انتخاب بہت موزوں نہیں۔ درد کا تصور اور انیس کی رزمیہ نگاری میر کے تفرق سے مختلف چیزیں ہیں۔ چنانچہ درد کو میر کے لگ بھگ قرار دینا تنقیدی شعور کی دلیل نہیں۔ اسی طرح میر انیس کے یہاں تکلف اور تصنع کا سراغ لگانا تنقیدی ذوق کا ثبوت نہیں۔ میر غزل گو ہیں اور انیس نظم نگار، لہذا انیس کی شاعری لازماً جگ بیتی ہوگی اور میر کی آپ بیتی، مگر کہاں فن کے لیے یہ فرق فیصد کن نہیں، نہ انیس میر کی دروں بینی میں دخل دے سکتے ہیں نہ میر انیس کی جہاں بینی میں، دونوں اپنی اپنی سلطنت کے سلطان ہیں اور ان کے ممالک کا سرحدیں ایک دوسری سے نہیں ملتیں۔ جہاں تک الفاظ و خیالات کے باہم دگر پڑستہ ہونے کا تعلق ہے وہ جس حد تک میر کے یہاں ہے اسی حد تک انیس کے یہاں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے موضوع کے موثر اظہار کے لیے انیس کا اسلوب اتنا ہی فطری ہے جتنا میر کا اپنے موضوع کے لیے۔ شاید عبدالحق

نے شبلی کے معرکہ آرا تنقیدی کارنامے ”موازنہ انیس و دسیر“ کا مطالعہ بہ غور نہیں کیا، ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ اردو مرثیہ نگاری بجائے خود ایک عظیم صنفِ سخن ہے اور اس کی عظمت کے معیار انیس ہی ہیں جنھوں نے المیہ نگاری کے ساتھ رزمیہ نگاری اور فطرت نگاری کو ملا کر اعلا پائے کی نظم نگاری کا ثبوت دیا ہے، جس کا کمال غزل نگاری کا ہرگز محتاج نہیں اور نہ کوئی غزل گو، یہاں تک کہ میر بھی اس نظم نگاری کا مقابلہ اس کے اپنے دائرہ کار میں کر سکتا ہے۔ میر کی مثنویوں پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالحق کہتے ہیں :

”مثنوی اصنافِ سخن میں بہت مشکل ہے۔ میر صاحب نے خوب نبھایا

ہے۔ اردو زبان میں میر صاحب کی مثنویاں سب سے پہلا اور عمدہ نمونہ

ہیں۔ مثنوی کی انہی کی بدولت ترقی ہوئی۔ میر حسن اور شوق وغیرہ سب انہی

کے مقلد ہیں۔ البتہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر کی مثنوی ”خواب و

خیال“ ایک ایسی نظم ہے جو روزمرہ کی صفائی اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے

کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن وہ ہجر و وصل، راز و نیاز، تفاعل معشوقانہ اور سراپا

کی داستان ہے، جس میں قصے کا سا کوئی تسلسل نہیں اور اس لیے میر صاحب

کی مثنوی ”شعلہ عشق“ کو کسی طرح نہیں پہنچتی بلکہ اس سے مقابلہ کرنا ہی فضول

ہے۔“ (ص ۲۰۲، ایضاً)

مثنوی نگاری میں اثر کے ساتھ میر کا جو موازنہ عبدالحق نے کیا ہے اور اس سلسلہ میں میر کی فضیلت کا جو نتیجہ جس جہت سے انھوں نے نکالا ہے وہ صحیح اور اعلا تنقیدی بصیرت پر مبنی ہے، اس لیے کہ تخلیقاتِ نظم کے اجزاء کے بجائے کل کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس معاملے میں میر حسن پر میر تقی میر کی ترجیح محلِ نظر ہے اور میر حسن کی سطح پر شوق کو رکھنا موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میر غزل کے بادشاہ اپنی خاص حدود کے اندر ہیں، مگر مثنوی کی بادشاہت کا تاج بھی ان کے سر پر رکھنا مناسب نہیں۔

بہر حال، مثنویوں کی قدر شناسی کے باوجود عبدالحق نے مسدس حالی پر مقدمہ لکھتے ہوئے زبان کی سادگی کے معاملے ان کی خدمات کو نظر انداز کرتے ہوئے حالی کی سلاستِ بیان کے سلسلے میں یہ مبالغہ کیا کہ ”حالی نے زبان کو وسعت نہیں دی، ایک نئی زبان پیدا کی ہے۔“ (مقدمات ص ۲۵۵)۔ لیکن ”خطوطِ سرسید“ کے اسلوب پر تنقید کرتے ہوئے عبدالحق نے انصاف سے کام لیا ہے :

”جس طرح ان کی طبیعت میں تصنع اور تکلف کو دخل نہ تھا اسی طرح ان کی عبارت ہنرنا عیب سے خالی نہیں۔ وہ بلا تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں اور لکھتے وقت جو خیال جس طرح ادا ہو گیا اسی طرح ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن اس بے تکلفی اور بے ساختہ پن میں بعض وقت عجیب عجیب فقرے ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں۔“

(ص ۵۳، تنقیدات)

خواجہ حسن نظامی کی شہر پر بھی عبدالحق نے جچی تلی دلائے دی ہے اور قبل کے دو شریکاروں کے اسالیب کے ساتھ اس کا موازنہ انھوں نے بصیر مندی کے ساتھ کیا ہے :

”بعض کہتے ہیں کہ آزاد کا رنگ اڑا ہوا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے ورنہ اصل میں اس سے بالکل الگ ہے۔ آزاد میں تصنع زیادہ ہے۔ خواجہ صاحب کے جملے اور فقرے بھی اگرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں ہوتے لیکن اسے خوبی سے چھپایا ہے کہ بے تکلفی اور بے ساختہ پن قربان ہو جاتا ہے، بلکہ دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ ہنرنا غالب سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی نہیں مگر اس کے بجائے سوز و گداز ہے۔“

(ص ۳۷۳ ”مقدمہ سی پارہ اول“۔ مقدمات)

”اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام“ عبدالحق کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے، مگر اس علمی مطالعے میں انھوں نے تنقیدی نظر کا ثبوت دیا ہے۔ وہ بالکل صحیح کہتے ہیں :

”یہ بزرگ اس زبان کے بڑے ادیب اور شاعر نہ تھے یا کم سے کم ان کا مقصد اس زبان کی ترقی نہ تھی، نہ انھیں اس کا کچھ خیال تھا۔ ان کی غایت ہدایت تھی۔ لیکن اس ضمن میں خود بخود اس زبان کو فروغ ہوتا گیا اور عہد بہ عہد نئے نئے اضافے اور اصلاحیں ہوتی گئیں اور ان کی مثال نے دوسروں کی ہمت بڑھائی، جس سے اس کے ادب میں نئی شان پیدا ہو گئی، گو اب یہ ایک بھولی بھری داستان ہے لیکن اردو زبان کا مورخ ان کے احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا۔“



یہ ایک لسانی تجزیہ ہے جو تاریخی زاویہ نگاہ سے کیا گیا ہے۔ اس کا ناقدانہ انداز واضح ہے جس کے مطابق قدر شاہی میں قدر افزائی کا مبالغہ نہیں کیا گیا ہے اور تحقیق کو حقیقت پسندی کی حدود میں رکھا گیا ہے۔ اس سے ایک عالمانہ تفکر کے منبہ و احتیاط کا پتہ چلتا ہے، جو عام طور پر عبدالحق کے کثیر التعداد اور متنوع مقدمات کا طرز امتیاز ہے۔ وہ ان معدودے چند محققوں میں ایک ہیں جو اپنی محنت کے نتائج شخصی جوش و خروش کے بجائے بالعموم حکیمانہ تحمل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مقدمہ نگاری میں تحقیق و تنقید کا یہ توازن بہت ہی نادر ہے۔ یہ ایک نہایت باذوق اور باشعور شخصیت کا اشاریہ ہے۔ اس میں ذہانت و متانت کا وہ امتزاج ہے جو ادب کے با اصول معروضی مطالعے کے لیے ضروری ہے۔

ان مباحث کے پیش نظر ہم بلا خوف تردد یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر شبلی و حالی کے بعد عبدالحق اردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں اور انھوں نے اپنے دونوں بزرگوں کے مشرقی و مغربی رجحانات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے ایک جامع تنقیدی نصب العین کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ بعد کے ناقدین نے اس نمونے پر پورے طور سے عمل نہیں کیا، ارشید احمد صدیقی اور نیاز فتح پوری کا انداز مشرقی رہا، جب کہ کلیم الدین احمد اور احتشام حسین نے مغربی رویہ اختیار کیا اور آل احمد سرور صاحب مشرق و مغرب کے درمیان تذبذب میں پڑ گئے۔ اس طرح عبدالحق تک اردو تنقید کی جو سیدھی لکیر آئی وہ اپنے رخ پر آگے نہیں بڑھ سکی اور ہیچ و خم کا شکار ہو گئی، خواہ اس کے حجم میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہو۔ اس صورت حال کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبدالحق کے بعد تحقیق و تنقید کا یہی ربط ٹوٹ گیا، ناقد اور عالم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ممکن ہے کسی حد تک تہذیبی قدروں کے ساتھ وابستگی کا مسئلہ بھی اس سلسلے میں درپیش رہا ہو۔ اس معاملے میں ایک بہت بڑا سوال شخصیت کا بھی ہے۔ عبدالحق اپنے پیش روؤں کی طرح پورے معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے ایک تحریک اپنی خاص لسانی و ادبی جہت سے چلا رہے تھے۔ لہذا ان کے سامنے زندگی اور ادب کا ایک مجموعی تصور تھا جو ان کی حقیقت پسندی اور استقامت کا باعث تھا۔ ان کے بعد آنے والے ناقدین اس تصور سے بہرہ ور نظر نہیں آتے۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا ہم عبدالحق کو ناقدِ کامل کہہ سکتے ہیں؟ کلیم الدین احمد نے کہا ہے :

”جس نقاد کی اردو دنیا شظر ہے وہ عبدالحق نہیں۔“

(ص ۱۳۹، اردو تنقید پر ایک نظر، اشاعت ۱۹۸۳ء)

یہ بیان اس نکتے پر مبنی ہے کہ عبدالحق نے پرانی قدروں میں انقلاب برپا کر کے نئی قدریں نہیں پیش کیں۔ ظاہر ہے کہ کلیم الدین احمد قدروں کی آفاقی اہمیت سے واقف نہیں، نہ قدیم و جدید کا کوئی اصول معیار ان کے سامنے ہے۔



ان کا مفہوم یہ ہے کہ عبدالحق کا نقص حالی کی دکھائی ہوئی بیرونی مغربی راہ پر بہت آگے نہیں بڑھنا ہے۔ بجائے خود نقص کے یہ دلیل ناقص ہے اور اس کا منبع ایک خام قسم کی مغرب پرستی ہے، جو توازن سے خالی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جس چیز کو کلیم الدین احمد عبدالحق کا عیب سمجھتے ہیں وہ دراصل ان کا ہنر ہے۔ عبدالحق اگر ناقدِ کامل نہیں ہیں تو اس کی وجہیں دوسری ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کا کوئی نظام تنقید نہیں ہے، جس میں اصولی اور نظریاتی مباحث کے ساتھ عملی اور تجرباتی مطالعات مستقل و منظم طور پر یکجا ہوں، دوسرے یہ کہ ان کی کوئی باضابطہ ہموار اور استوار فکر نہیں ہے جس سے حیات و کائنات کے متعلق ان کے معین تصورات کی وضاحت ہو۔ چنانچہ ان کے سرمایہ تنقید میں جو کچھ ہے وہ صرف باذوق تبصروں اور چند اخلاقی بیانات پر مشتمل ہے، اگرچہ یہ تبصرے اور بیانات اپنی جگہ بہت اہم اور باعث امتیاز ہیں۔

بہر حال تذکروں سے شبلی و حاکمی تک کی اولیں تنقیدی کوششوں کے فوراً بعد کسی ناقدِ کامل کا ظہور متوقع نہیں تھا۔ کلیم الدین احمد نے وقت سے پہلے اس کا انتظار کیا اور مایوس ہوئے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی تنقیدوں کو حقیقتِ منظر سمجھتے ہوں اور ناقدِ کامل کی حیثیت سے نمایاں ہونے کی آرزو رکھتے ہوں۔ ان کی حقیقت ہمیں معلوم ہو چکی ہے اور ان کی آرزو پوری نہیں ہوئی۔ جس مقام تک بعض تاریخی وجوہ سے عبدالحق کی رسائی نہیں ہو سکی اس مقام تک ان کے بعد آنے والے ناقدین بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔ لہذا عبدالحق کی اہمیت یہ ہے کہ اپنے وقت میں انھوں نے اردو ادب کی تنقیدی روایات کو فروغ دیا، ان میں کچھ توسیع کی اور مستقبل کے ارتقا کے لیے صحیح رخ کی طرف اشارے کیے۔ یہ رخ مشرقی تصور کی بنیاد پر مغربی تجربات کر کے ایک جامع نقطہ نظر اور آفاقی معیار کا حصول تھا، تاکہ اخلاقیات اور جمالیات کے امتزاج سے مطالعہ ادب کے بہترین اور مفید ترین طریقے کا سراغ لگ سکے اور تہذیبی قدریں نہ صرف پورے طور پر واضح ہوں بلکہ ان کے ساتھ وابستگی اتنی عام ہو کہ فرد اور معاشرہ دونوں کی ترقی استقامت کے ساتھ ایک نقطہ عروج کی طرف ہوتی رہے۔ اس جہت سے عبدالحق کے تمام علمی و ادبی کارناموں کے مکمل مطالعے کی اشد ضرورت ہے۔

اس مطالعے میں عبدالحق کا اسلوب نگارش ہماری کافی مدد کر سکتا ہے۔ عام طور پر ان کی نثریں وہ نفاست پائی جاتی ہے جو شبلی سے منسوب ہے، اس میں وہ ناہمواری نہیں جو سرسید اور حاکمی کی تحریروں میں بہ کثرت نظر آتی ہے، اگرچہ شبلی کی شوخی اور شگفتگی کے بجائے عبدالحق کے اسلوب میں مقابلہ سادگی اور قدرے خشکی نمایاں ہے۔ نفاست کے ساتھ متانت کی خصوصیت عبدالحق کے طرزِ اظہار کو ان متنوع مطالعات کے لیے سازگار بناتی ہے جو ان کے کثیر التعداد مقدموں اور دیباچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک کاروباری نثر ہے جو ہر قسم کے تبصروں میں کام آ سکتی ہے۔ اس سے ایک ایسی شخصیت کے کام لیا جس کی دلچسپیاں وسیع تھیں اور وہ اپنے وقت کے اکثر علوم و فنون کی تصنیفات کے

تعارف پختگی اور عمدگی کے ساتھ، بالعموم باذوق اور باشعور طریقے سے کرائی تھی۔ لسانیات اور قواعد کے مقابل کے مذہب و سائنس کے معرکے تک کوئی چیز اس کے دائرہ عمل سے باہر نہیں تھی۔ ادب میں شاعری، تذکرہ، تنقید، تحقیق، تاریخ، افسانہ سب پر اس کی توجہ تھی۔ عبدالحق کا اسلوب فی الواقع ایک تحریک کا ترجمان تھا۔ تنقید نگاری میں ایک تحریکی حرارت، شبلی و حالی کی طرح عبدالحق کی وہ خصوصیت ہے جو انھیں اپنے پیشرووں کا وارث، ہم عصر اور قاید اور بعد میں آنے والوں کے لیے ایک نمونہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ وہ روایات کے امین، حالات کے مبصر اور ترقیات کے علم بردار تھے۔ اردو تنقید میں ان کا مقام مستحکم، منفرد اور ممتاز ہے۔

---

## مولوی عبدالحق کا اسلوب

اسلوب یا طرز نگارش کا مسئلہ ایسا نہیں جس پر کوئی فیصلہ کن اور دو ٹوک بات کہی جاسکے۔ آسان لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشین بھی ہو اور منفرد بھی ماسی کو انگریزی میں (Style) کہتے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے طرز یا اسلوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی اور جدید فارسی میں ”سبک“ کہتے ہیں۔ ان الفاظ پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلوب میں ”صناعی“ (Ornamentation) کا مفہوم شامل رہا ہے۔

سب سے پہلے انگریزی لفظ (Style) کو سمجھیے۔ یہ یونانی لفظ (Stylus) سے نکلا ہے، جو ہاتھی کے دانت، لکڑی یا کسی دھات کا بنا ہوا ایک ٹکڑا اوزار ہوتا تھا جس کے ذریعہ موم کی تختیوں پر حروف و الفاظ یا نقوش کندہ کیے جاتے تھے۔ کچھ لوگ اس کی اصل (Stylus) بتاتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔

..... امتداد انسان سے وہ آلہ جس سے نقش بٹھا دیا جاتا تھا، خود ان نقوش، جملوں یا عبارت کا مفہوم لدا کرنے کو استعمال ہونے لگا اور ایک عمل جو ابتداً میکانیکی تھا، رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوراتی بن گیا۔ یہ نقوش یا ٹوا جا کر ہوتے تھے یا دھندلے اور ناتواں جھنچھن بعد کو (Stylus) کے دوسرے کندہ حصے سے سدھا دیا جاتا تھا۔ ادب میں یہی کاٹ چھانٹ، دماغ سوزی اور باریک بینی خود ادیب کی اپنی ذہنت کی پرکھ بن جاتی ہے۔ اس تعریف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹائل میں ہمیشہ کاوش، صناعی اور مرصع کاری کا عنصر ضروری سمجھا گیا ہے۔ خیال تو خیر بنیادی چیز ہے، مگر اس کے ساتھ، قوت اظہار اور پیرایہ بیان کی ندرت و انفرادیت بھی جب تک شامل نہ ہو، اچھا ادب وجود میں نہیں آسکتا۔



جدید فارسی اور عربی زبان میں اسٹائل کے لیے "سبک" استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں یہ عربی لفظ ہے۔ سبک، یسبک (ضرب یضرب) کے لغوی معنی ہیں دھات کو بگھلانا اور سانچے میں ڈھالنا چنانچہ ایسا سونا جسے کٹھانی میں ڈال کر میل سے پاک کر لیا جاتا ہے سبک یا مسبوک کہلاتا ہے۔ اور دھات کی چیزیں ڈھالنے والی (Foundry) فونڈری کو مسبکتہ کہتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال بھی صنعت گری کا مفہوم ادا کرتا ہے اور اب اس کا مطلب کلام کو حشو و زوائد سے پاک کرنا، یا جانا ہے۔

اب دوسرا لفظ "طرز" لیجیے۔ طرز یعنی رسم، یا سبب استعمال کرنے کو کہتے ہیں۔ طرز اور طرز (تفعل) کپڑے پر بیل بوٹے بنانے یا زردوزی کرنے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ الطرازہ زردوزی کے لیے اور الطرز بیل بوٹے بنانے کے لیے زردوزی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسے طور طریقہ، ہیئت یا ترتیب کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً عربی میں کہیں گے "هذا علی طراز ذالک" یعنی "یہ اس کے طریقے پر ہے" طراز عربی جدید میں فیشن کے معنی بھی دیتا ہے۔

یہاں ضمنی بات بھی دلچسپی سے خانی نہ ہوگی کہ یہی طرز ترکی زبان میں پہنچا اور زردوزی کے علاوہ خیاط کے معنوں میں بھی مستعمل ہوا، ط اور د کی آوازیں قریب المخرج اور متبادل ہیں۔ ترکی سے اردو میں آیا وہاں طرزی تھا، یہاں زری ہو گیا۔

اب اسلوب کا لفظ دیکھیے۔ یہ طریقہ، راستہ، روش اور ڈھنگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسالیب اس کی جمع ہے۔ یہ فی الاصل متعین و متیقن روش کے لیے ہے۔ اسی لیے جب عربی میں کہتے ہیں "ان فی اسلوب" یعنی "اس کی ناک ایک ہی ڈھنگ سے رہتی ہے" (یا وہ مغرور و تکبر ہے) تو اس میں انفرادیت کا تصور شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ ادب میں بھی کسی کے مخصوص انداز نگارش کے واسطے بولا جاتا ہے۔ جس میں لکھنے والے کی شخصیت کے منفرد خط و خال نظر آئیں۔

کیا ہرج ہے اگر نگے ہاتھوں یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ ہندی میں اس کے لیے کون سے الفاظ استعمال

۱۔ اس لفظ کے لغوی معنوں کی خصوصیات پر غور کیجیے تو دھات کو تپانا اسے حشو و زوائد سے پاک کرنا اگھانا پھر ڈھالنا اور ایک خوش نما شکل دے دینا، ایسا عمل ہے جو اچھے اسٹائل میں اسی طرح لفظوں کے ساتھ بھی دہرایا جاتا ہے۔ اسی میں اسلوب کی نفاست، پختگی اور ہائنداری کا راز مضمر ہے۔



ہوتے ہیں۔ پہلے تو لفظ ”ریتی“ استعمال کیا جاتا تھا اور سنسکرت ادب میں اب بھی زیادہ تر، یہی لفظ اسلوب کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے لیکن مغربی اصول نقد و نظر کی اشاعت کے بعد ہندی میں ”سبک“ یا ”طرز“ کے لیے شیلی بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہندی میں (پہلے موجودہ مفہوم کے لیے) زیادہ پرانا نہیں، اگرچہ اس کی اصل لفظ شیل ہے جو اصول، برتاؤ، ڈھنگ اور ڈھب کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ جیسے ”ہینج شیل“ میں ہے۔ شیلی کا مفہوم عین میں وہی ہے جو عربی میں اسلوب کا ہے۔

ان الفاظ کی تشریح و تعبیر میں اتنی لمبی تمہید سے مدعا یہ تھا کہ (Style) کے لیے ہندی ”سنسکرت“ عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، وہ فی اصل یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی اسلوب بغیر ”تضع“ یا آورد کے نہیں بنتا۔

یہاں یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اردو میں اس کے لیے ایک لفظ ”انداز“ بھی مستعمل ہے۔ میر تقی میر، اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے یہ لفظ ان مخصوص معنوں میں استعمال کیا،

”... بس ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہم صنعتہا ست تجنیس، تر صیغ  
تبشیر، مصلے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، خیال و غیرہ این ہا ہمہ در ضمن ہمیں است  
و فقیر ہم ازیں دتیرہ محظوظم ...“

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے شاعروں میں سب سے پہلے میر نے طرز کو اہمیت دی اور اور سختی سے کار بند رہا۔ بعد ازاں دوسروں نے تتبع کیا۔

میر شاعر تھا اور اس نے طرز پر کار بندی غزل ہی میں کی لیکن (Style) کے لیے انداز کا لفظ میر نے بہت مناسب اور نوزوں تجویز کیا۔ یہ لفظ اسلوب (شلی)، یا طرز سے زیادہ انفرادیت کا غماز ہے۔ اب مختصر یہ دیکھنا چاہیے کہ مختلف زبانوں اور زمانوں میں (Style) کی کیا تعریف کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور قول ڈاکٹر بوخان (Buffon) کا ہے جو اس نے ۱۷۵۳ء میں فریچ کاڈی کے افتتاحی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا،

(Le style Est L'homme meme) یعنی ”اسلوب خود انسان ہے“۔ بوخان کا مطلب یہ تھا کہ مصنف

۱۔ میر انکسات الشعراء۔ ۱۸۰۔ طبع ثنائی۔ ۲۔ اثر لکھنوی اچھان بین۔ ۳۷۔

کی شخصیت اپنے تمام نشیب و فراز اور رنگ و آہنگ کے ساتھ الفاظ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ ایمرسن نے یہی بات ذرا سی تبدیلی کے ساتھ کہی تھی اور ہمارا خیال ہے کہ وہ صحیح تشریح کرتا ہے :

A man's style is his mind's voice اسلوب کو ذہنی آواز "کہانیوں بھی زیادہ قرین حقیقت ہے

کہ اس میں انفرادیت اور افتاد ذہنی کا پرتو اسی کی سفارش کرتے ہیں۔ ایک خیال مشترک ہو سکتا ہے۔ اس کے اظہار کے الفاظ بھی وہی ہو سکتے ہیں، اگر فلا بیر کا قول تسلیم کر لیا جائے کہ ایک فعل، ایک اسم اور ایک حرف ایک ہی مفہوم کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ ذہنی اختلاف ہے جو طرز ادا میں علیحدگی پیدا کرتا ہے اور مصنف کی انفرادیت کو منعکس کر دیتا ہے۔ ملک الشعراء محمد تقی بہار نے یہی بات ان الفاظ میں کہی ہے :

"بک در اصطلاح ادبیات عبارت از روش خاص ادراک و بیان افکار بوسیله ترکیب

کلمات و انتخاب الفاظ و طرز تعبیر۔ بک اثر ادبی و جہ خاص خود را از لحاظ صورت و معنی

القاء می کند و آن نیز بنویز خویش و البتہ بطرز تفکر گویندہ یا نویسنده در بارہ حقیقت "

"می باشد"۔

لیکن یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ تھامس جیفرسن کا خیال تھا کہ بچپن میں جب انسان کا ذہن اثر پذیری کی زیادہ صلاحیتیں رکھتا ہے، ہر چیز کا نقش جلد قبول کر لیتا ہے، اور طبیعت میں بھی بولانی ہوتی ہے، اسی وقت سے اس کے طرز یا اسلوب کی نشو و نما شروع ہو جاتی ہے۔

ایمرسن کے مذکورہ بالا قول، اور جیفرسن کی رائے کو ذہن میں رکھیے، پھر غور کیجیے تو یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ اچھے اسلوب کے واسطے الفاظ پر حاکمانہ اقتدار، لکھنے پر پوری قدرت، اظہار میں کامل سہولت، دروہیت کی صلاحیت اور انتخابی ملکہ ناگزیر ہے۔ تھامس گرے کی مشہور (Elegy) کا ایک

مصرعہ :

The ploughman homeward plod's his weary way,

ایک جگہ اس طرح لکھا گیا تھا کہ یہی الفاظ، قواعد کی صحیح ترتیب کے ساتھ (۶) صورتوں میں آ سکتے ہیں لیکن

صرف موجودہ صورت ایسی ہے جو نہ صرف مفہوم کو پورا پورا ادا کرتی ہے بلکہ جس ترتیب سے الفاظ رکھے گئے ہیں۔ شاعر کا مقصود بھی اسی ترتیب اور درجہ میں کلام کا زور پیدا کرنا ہے۔ مثلاً :

His weary way the ploughman homeward plods.

مگر اس میں زور (Weary way) پڑتا ہے، جو شاعر کا مقصود نہیں۔ دقت علیٰ ہذا۔  
الفاظ کی ترتیب اور انتخاب کا سلیقہ یقیناً بنیادی اہمیت رکھتا ہے (Homer) نے کہا تھا کہ :

”Not can one word be chang'd but for a worse.”

الفاظ کے انتخاب اور درجہ و بہت کا یہ کمال حافظ، سعدی، فردوسی، میر، اور انیس کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ نثر میں غالب، آزاد، محمد حسین، عبدالحق اور ابوالکلام کی تحریروں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ اردو کا کوئی نثر نگار اردو کے شاعروں کی طرح الفاظ کے انتخاب کا اعلیٰ معیار پیش نہیں کرتا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نثر کی نسبت نظم میں فکر و تامل کے لیے زیادہ مہلت ملتی ہے۔

انتخابیت کے لیے علم اور تجربے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے میں نے شروع میں اس بات پر زور دیا کہ کوئی اچھا اسٹائل بغیر محنت یا آدرد اور محنت کے نہیں بن سکتا۔ گویا وہ مصنف کے ذہن کی گونج بعد میں ہے۔ محنت اور مرہم کاری کا طالب پہلے۔ میرے اس خیال کی تائید ایڈورڈ گین کی تشریح سے بھی ہوتی ہے یہ

اور سوائفٹ (Swift) کے نزدیک تو (Style) عبارت ہی انتخاب سے ہے۔ وہ اسلوب کی تعریف  
”Proper words in proper places“ کرتا ہے یہ

الفاظ کے انتخاب میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ خیال کو مصور کر دیں۔ اگر ان کی صوتی کیفیت کا پورا خیال رکھا جائے تو عبارت میں زور، دل نشینی اور اثر انگیزی پیدا کی جاسکتی ہے مثلاً ظفر علی خاں کا یہ شعر جس میں جنگل کے کسمان ہونے کا نقشہ ایسے مناسب لفظوں میں کھینچا گیا ہے کہ شاید اس سے بہتر پیرایہ ممکن نہ ہو۔

ہو کا عالم تھا وہاں کرتا تھا جنگل بھائیں بھائیں!  
سنسنی اٹھتی تھی، سن سن کر ہوا کی سائیں سائیں!

اس میں "ہو"، "بھائیں بھائیں"، "سنسنی"، "سن سن کر"، "سائیں سائیں" یہ سب الفاظ بھرپور  
صوتی کیفیت رکھتے ہیں۔ یا مثنوی سحرالبیان کا یہ شعر۔

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی  
کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

اور گلزار نسیم کا یہ مرقع:

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی  
خود راگنی آکھڑی ہوئی تھی

اسی طرح فارسی کا یہ شعر۔

زنقارہ آواز آمد بروں

کہ دون است دون است گردون دون

اسی طرح میر کے وہ اشعار جو "نصویریت" لیے ہوئے ہیں۔ یہ سب لپچھکنے والے ہیں۔ الفاظ کی یہ  
اہمیت اتنی بات سمجھانے کے لیے ظاہر کی گئی کہ اچھے خیال کا حسن پوری طرح دوسرے کے ذہن میں  
منتقل کرنے کے واسطے اچھے الفاظ بہت ضروری ہیں۔ انگلینڈ پر پوپ کا یہ مشہور قول ایک بار ڈارڈچسٹر  
جیلڈ نے بھی اپنے خط میں ۲۴ نومبر ۱۸۴۹ء لکھا تھا کہ:

Expression is the dress of thought, and still Appears more decent as more

قابلہ قابلہ

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر فلا بیر نے کہا کہ طرز و اسلوب، خیال کا لباس ہی نہیں اس  
کی کھالی ہے۔ یعنی اگر وہ نہیں تو نہ خیال "جدامی" معلوم ہوگا۔ اسٹائل کی اہمیت پر زور دینے

نے مزید تفصیل کے لیے، اثر لکھنوی، مقدمہ مزامیر جلد اول اور شبلی نعمانی، شعرا لعمامہ اور موازنہ انیس و دہیر۔



والوں میں انگرنڈر سمجھتے یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتا کہ خیال سے زیادہ پائدار اور لازوال شے ادب میں اسلوب ہے۔“

لیکن اس تمام بحث کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اسٹائل محض صنعت گری، ترصیع، محنت، انتخاب الفاظ یا بازی الفاظ کا ہے۔ JOUBERT کی یہ بات توجہ کی مستحق ہے کہ الفاظ کا صحیح استعمال، مناسب خیال کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ ”کوئی اچھا لفظ استعمال کرنے سے پہلے اس کی اچھی جگہ تلاش کر دیا“

بعض مخصوص الفاظ کسی مصنف کے ذہن کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی دو طرح کے ہیں۔ یا تو وہ عام استعمال کے الفاظ ہوں گے مگر ایک مصنف کی تحریر میں اتنے استعمال ہوں گے کہ اس کی مخصوص افتاد ذہنی، طبعی رجحان اور زاویہ فکر کا نشان بن جائیں گے یا بعض مصنفوں کے فن پاروں میں نئے اور غیر مانوس الفاظ ایسی خوبی اور خوب صورتی سے استعمال ہوں گے کہ نہ صرف اس کے اسٹائل کو دل پسند اور دل نشیں بنادیں گے بلکہ اس کی انفرادیت کو زیادہ نمایاں کر دیتے ہیں۔ اردو میں اس کی مثال ہمدی افادی، سجاد الفاری، عبدالحق اور ابوالکلام کی تحریروں سے دی جاسکتی ہے۔ ہمدی اور سجاد الفاظ وضع کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ ابوالکلام اکثر پرانے سکوں کو نیا صیقل دے کر چلاتے ہیں مگر عبدالحق سکے رائج الوقت کی قیمت کے شناسا ہیں۔ وہ نامانوس الفاظ سے اپنی تحریر میں وزن پیدا نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے ہمدی افادی کا اخراجی کارنامہ لائق تحسین ہے مگر نئے الفاظ کی وضع و تراش بہت نازک معاملہ ہے Ben Jonson نے کہا تھا کہ ”نئے الفاظ وضع کرنا اور انھیں رواج دینا، بہت محنت اور کم فائدے کا کھیل ہے کیوں کہ اگر وہ نئے الفاظ قبول عام کی عورت پائے گئے تو وضع کو اس کا کریڈٹ شاذ و نادر ہی ملتا ہے، لیکن اگر نامقبول ہوئے تو نفرت و حقارت بھی یقینی ہے۔“

مولوی عبدالحق کا تعلق، سرسید تحریک سے ہے اور وہ حالی کے سچے وارث و جانشین ہیں۔ اس لیے ان کے اسلوب نگارش کے محاسن اور عناصر ترکیبی سے بحث کرتے ہوئے ان کے پیشرو حضرات پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں نشاۃ ثانیہ کا جو زبردست کام ہوا، اس کے

کہ تا دھرتا سرسید احمد خاں مرحوم تھے۔ سرسید کے مقابلے میں، کوئی دوسری ہستی اتنی جامع حیثیات پیش نہیں کی جاسکتی۔ سرسیدؒ ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی اصلاحی کوششوں کا آغاز ۱۸۵۸ء سے ہوتا ہے۔ جب انھوں نے ”سارہ اسباب بغاوت ہند“ لکھا یہ مسلمانوں کی وکالت میں پہلا قدم تھا جو مثبت انداز میں نہایت دوراندیشی اور عاقبت بینی کے ساتھ اٹھایا گیا۔ اس کے بعد ہی سرسید کا رابطہ عوام سے قائم ہوا اور انھیں سادہ، عام فہم اور سلیس عبارت لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسلوب و انداز میں سرسید کی نثر آرٹ کا نمونہ نہیں ہے لیکن وہ کلاسیکی حیثیت رکھتی ہے اس کے قوم کا ذہن بنایا۔ اس میں وسعت اور گہرائی پیدا کی اور اس کے اثر سے بہت سے اعلیٰ درجے کے نثر نگار اردو کو نصیب ہوئے۔ تعلیم اور سیاست کے میدان میں سرسید کی جتنی خدمات ہیں، ادب میں اس سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان کے اثرات بہت دیر پا ہیں۔ اس دور میں ہندوستان کے مسلمان کسی ایک فرد کے افکار سے اتنے متاثر نہیں ہوئے جتنا سرسید نے ان کے ذہنوں کو بھنجوڑا۔ ان کی تحریک نے اردو کو عالی، شبلی، وقار الملک، محسن الملک، وحید الدین سلیم ندویر احمد، ذکار اللہ، چرمن علی، ظفر علی خاں، خوشی محمد ناظر، سید علی بلگرامی جیسے فاضل خطیب، ادیب مقرر اور انشا پرداز، شاعر اور مفکر دیے۔ مولوی عبدالحق اس سلسلہ طلباء ناب کی آخری کڑی ہیں۔

”... سرسید اپنے دور کے منفرد شخص ہیں۔۔۔ ان کی زندگی کے (۴۵) برس میں بلکہ پوری انیسویں صدی میں کوئی دوسرا مصنف ایسا نہیں ہے جس نے تعداد میں اتنی زیادہ مضامین میں اتنی مختلف ضخامت میں اتنی گراں، خوبوں میں اتنی اعلیٰ، فوائد میں اتنی کثیر، اثر میں اتنی وسیع تصنیف کی ہوں۔ یہ تمام محاسن و فضائل کسی ایک مصنف میں جمع نہیں ہیں۔“

سرسید اسکوں نے جن لوگوں کو پیدا کیا ان میں اسلوب نگارش کی انفرادیت کے لحاظ سے اول نمبر پر شبلی نعمانی کا نام آتا ہے۔ دوسرے ندویر احمد ہیں، پھر الطاف حسین حالی۔ بقول حامد حسن قادری علامہ شبلی اپنے زمانے کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلوب تحریر کی اہمیت کو سمجھا

۱۔ تفصیلی مطالعے کے لیے Syed Abdullahi Spirit and Substance of Urdu prose under the

۲۔ حامد حسن قادری: داستان تماریح اردو (۱۳۱۳) Influence of Sir Syed Ahmad Khan. (1940)

۳۔ ایضاً (۱۳۳۰)

شبلی کا اسلوب کیا ہے، نثر میں شاعری ہے۔ کہیں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ کبھی نازک تشبیہیں اور لطیف استعارے لاتے ہیں، کہیں خطابت کا جو ش اور بیان کا سحر دکھاتے ہیں۔ الفاظ کے درو بست اور ان کی نشست سے جتنا شبلی واقف ہیں ان کے عہد میں کوئی نہیں۔ پھر یہ کہ انھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ اسکلام، المامون، الفلوقی، شعرا بعم، موازہ، مقالات، سیرت، لبنی۔ ان سب کے موضوعات مختلف ہیں تو اسلوب بیان بھی جدا ہے۔ کہیں نرے جذباتی ہیں کہیں پورے منطقی۔ کبھی دل میں چٹکی لیتے ہیں، کبھی ذہن کو تھنجھوڑ دیتے ہیں۔ حالی کے اثر نے مولوی عبدالحق کو پیدا کیا اور شبلی کے اسلوب میں ہمیں ابوالکلام کے طرز کا نقش اولیں ملتا ہے۔

حالی اپنی زندگی میں جتنے متین، جذب، سنجیدہ اور نستعلیق تھے، اتنی ہی ان کی تحریریں سادہ، صاف، شائستہ و دلآویز ہیں۔ ان کا نمایاں وصف، سادگی، متانت اور اثر انگیزی ہے۔ حامد حسن قادری نے لکھا ہے:

انھوں نے غور و فکر کے ساتھ اردو زبان و ادب کا جائزہ لے کر اس کی خامیوں کو دیکھ کر ضرورتوں کو سمجھ کر، دوسری زبانوں سے مقابلہ کر کے جدید موضوعات کی کتابیں لکھ دیں لیکن اپنی تحریر و اسلوب کے لیے کوئی روش خاص پیدا نہ کر سکے۔ صاحب طرز بننے کے معنی ہیں تقلید چھوڑ کر موجد بننا۔ موجودہ روش سے بغاوت کرنا اور اپنی راہ الگ نکالنا۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری اُپج ہو۔۔۔ اور اسی صفت کے نہ ہونے سے مولوی ذکار اللہ اور مولانا حالی صاحب طرز نہیں ہیں۔

نثر کی حد تک نہ سہی لیکن ادبی روایات کا طلسمی حصار توڑنے میں حالی نے فکری جہاد بھی کیا اور اپنا الگ راستہ بھی نکالا۔ سرسید کی طرح ان کے پیش نظر بھی یہ نہیں تھا کہ کس طرح کہا جائے بلکہ وہ کیا کہا جائے۔

پرنظر رکھتے تھے۔ شاعری کے بارے میں ان کے خیالات نے نئی نسلوں کو بہت متاثر کیا اور آج ادب جدید کا نقشہ حالی کی فکر ہی سے استوار ہوا ہے۔ اسی طرح نثر میں انھوں نے سادہ و سہل نثر کو رواج دیا۔ حالی نے جس عہد میں آنکھ کھولی تھی، وہ تصنع، تکلف، بناوٹ اور سجاوٹ کا زمانہ تھا۔ اس لیے حالی کی نثر کے

سہ شبلی کے اسلوب پر تفصیلی مطالعے کے لیے، سید عبداللہ بخت و نظر (۳۳)، و بعد نیز خورشیدالاسلام، تنقیدیں



دیر پا اور دور رس اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مولوی عبدالحق، حالی کے سچے جانشین ہیں۔ وہ بے شہر ایک "صاحبِ طرز" انشا پرداز ہیں۔ ان کی تحریر میں حالی کی صداقت اور سادگی متانت اور وقار، شبلی کی رنگینی اور اداسی، ہمدی کی لطافت و نفاقت، نذیر احمد کی محاورہ بندی، رشید احمد صدیقی کی رعایتِ لفظی اور صوفی توافقی کا لحاظ، عبدالمجید دریا بادی کے طنز اور فرحت اللہ بیگ کے مزاح کا نہایت دل نشین اور خوش گوار مرکب ملتا ہے۔ وہ اس طرح لکھتے ہیں کہ اسٹائل کے سامنے موضوع کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ صحیح، صاف، سادہ، دل نشین اور سنجیدہ نثر لکھنے کی جو روش عبدالحق نے ایجاد کی ہے۔ اسے اردو کی معیاری نثر کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اردو کو ایسا لب و لہجہ دیا ہے جو ذاتی خطوط، تقریر، خطبات، علمی مضامین، تنقید و تحقیق اور تاریخ و سیرت نگاری سب، صاف نثر کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ عبدالحق کی شگفتگی، ان کے خطوں میں اپنے شباب پر ہوتی ہے اگر ان کے بے تکلف خطوط کا ایک عمدہ انتخاب شائع کیا جائے تو وہ غالب، ہمدی افادی اور محمد علی اردو لوی کے خطوط کا نہایت نفیس مرکب ہو گا۔ ان کا اسٹائل اظہار و ابلاغ کے لیے بہت موثر ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، بھرپور لفظوں میں بے تکلف کہہ دیتے ہیں اور یہی اسٹائل کا مقصد و منتہی ہے۔

میں نے اس مضمون کے آغاز میں اسلوب کے لغوی معنی سے بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس میں مرصع سازی، محنت اور صنائی کا مفہوم شامل رہا ہے لیکن یہ بات کم سے کم اردو کی حد تک صرف کلاسیکی سرمائے کے بارے میں قطیعت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ دورِ حاضر میں انگریزی ادبیات کے مفکروں نے اسٹائل کے تصور اور عناصر ترکیبی پر جو کچھ لکھا ہے، وہ قدیم تصورات سے قدرے مختلف ہے۔ جدید نقادوں میں (F. L. Lucas) نے اسٹائل کے موضوع پر بہت اچھی کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ تمام عناصر کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ اچھے اسلوب کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں۔ سلاست (Clarity) بلاغت

(Brevity) متانت (Urbanity) اور سادگی (Simplicity)

مگر اس کے ساتھ ہی لوکس (Lucas) نے لب و لہجے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ شخصیت یا انانیت کا پرتو دراصل لہجے ہی میں محسوس بھی ہوتا ہے۔ سادہ نثر میں اتنا واضح لہجہ پیدا ہونا بہت مشکل ہے جتنا ہمیں ابوالکلام کی تحریروں میں ملتا ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق کے اسلوب کی یہی خوبی ہے کہ



اس کا مفرد لب و لہجہ ہے۔ ان کے خطبات، مقدمات، مضامین اور خاکوں میں یہ لہجہ، موج تہہ نشین کی طرح سرایت کرتا رہتا ہے۔ اس میں خطیبانہ جوش یا واعظانہ ”سرپرستی“ نہیں بلکہ ایسا پرسوز انداز ہے جیسے کوئی صاحب دل ”نجد و یاران نجد“ کی حکایت کہہ کر درود یوار کو وجد میں لارہا ہے۔

ان کے علاوہ بھی عبدالحق کی نشر کے کچھ بنیادی اوصاف ہیں جو ان کی تحریر میں اس طرح رپے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے متاثر کرنا بہت مشکل ہے :

مشکل حکایتیں است کہ ہر ذرہ عین ادست

اما نمی توان کہ اشارت با و کنند

وہ ابوالکلام یا شبلی کی طرح ”انتخاب الفاظ“ پر زیادہ زور نہیں دیتے، جس سے تحریر میں حسن تو پیدا ہو جاتا ہے۔ گفتگو میں جاذبیت بھی آسکتی ہے مگر بسا اوقات اثر انگیزی میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور سامع پر براہ راست اثر نہیں ہوتا لیکن انتخاب الفاظ کی بات بھی ایک درجے میں اگر اضافی و اعتباری ہی ہو جاتی ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ کسی زبان میں کوئی دو لفظ مترادف نہیں ہوتے، تو اس کا مقصد یہی ہے کہ ان میں کوئی نہ کوئی لطیف فرق ضرور ہوتا ہے۔ انس، محبت، عشق، جنوں، الفت، شیفتگی، وارفتگی، یہ سب ایک ہی جذبے کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں اور ان سب میں بہت ہی نازک فرق ہے جسے محل استعمال میں صرف وجدان ہی محسوس کر سکتا ہے۔

دراصل خیال ایک مجرد (Abstract) شے ہے۔ الفاظ کے قالب میں ڈھل کر ہی وہ دوسروں تک پہنچ سکتا ہے۔ فنون لطیفہ کی ایجاد، اس بات کی شاہد ہے کہ انسان کبھی اپنے خیالات اور محسوسات و مددکات کی تبلیغ کا حقہ نہیں کر سکا۔ رقص و سرود، موسیقی، نقاشی، مصوری، تمثیلیں اور شاعری یہ سب اظہار و تبلیغ احساس ہی کے ذرائع ہیں۔ رقص میں حرکات و سکنات کے ذریعے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی میں ہوا کی لہروں کو پیپر کہ وجدان کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ نقاشی میں بھی کام بے جان نقوش سے لیا جاتا ہے۔ مصوری میں مو قلم اور رنگ مل کر جذبے کی تصویر بناتے ہیں۔ شاعری ان سب کا لطیف مرکب ہے۔ اس میں موسیقی، حرکت (رقص)، مصوری اور نقاشی سب فنون کا امتزاج ہوتا ہے۔ اچھا شعر بھی وہی ہے جس میں یہ سارے اوصاف موجود ہوں اور جذبہ پوری طرح الفاظ میں ڈھل گیا ہو۔ بعض شعرا لیے ہوتے ہیں جن کا خیال نہ رقص میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ نہ موسیقی سے ادا ہو سکتا ہے۔ نہ مصور کا مو قلم اس میں رنگ بھر سکتا ہے۔

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جا لے ہے  
جا لے نہ جانے گل ہی نہ جانے بلغا تو مارا جا لے

سوائے شعر کے، فنون لطیفہ کی اور کون سی صنف اس خیال کی متحمل ہو سکتی تھی؟ جوش ملیح آبادی کی ایک نظم کا تقیم (Theme) یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں افکار کی جو اصل (Original) شکل اور لطیف نوعیت ہوتی ہے وہ شعر کی صورت میں ڈھلے ڈھلے اور لفظ و عبارت کے قالب میں آتے آتے بالکل ہی مسخ ہو جاتی ہے۔ وجدانی لطافت اور نزہت لفظوں کے کھردرے پیکر میں سما ہی نہیں سکتی۔ جوش نے اظہار واقعہ میں تھوڑا سا شاعرانہ مبالغہ بھی کیا ہو تو بھی اس میں شک نہیں کہ ہزاروں لکھنے والوں میں سے کسی ایک ہی کو یہ منصب ملتا ہے کہ وہ اپنے احساس کو دوسروں تک پہنچا سکے اور اپنے افکار کو الفاظ کے قالب میں جوں کا توں منتقل کر دیے ورنہ ٹوٹا مٹا ہی احساس باقی رہ جاتا ہے کہ :

زباں زلفق فردماند دراز من با قیست  
بضاعت سخن آخر شد و سخن با قیست

اسی لیے الفاظ کے انتخاب کا معاملہ کسی ضابطے یا اصول کا پابند نہیں۔ اگر لکھنے والے کا خیال پہنچائی کی منزل تک آگیا ہے تو وہ جزر ظاہر ہو کر بھی گہرا تاثر چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر ذہن نا پختہ تھا، خیال خود ہی مبہم و مبہوم تھا یا اس کی لطافت میں کثافت کی نا پختگی باقی رہ گئی تھی تو وہ بار بار اور طرح طرح سے ظاہر کرنے پر بھی تاثر کی گمٹی اور تاثر کے گداز سے محروم رہتا ہے۔

شاعری میں فن اور قواعد کی قیود کے ساتھ کچھ ہولیتیں بھی ہیں مثلاً یہ کہ شاعر اپنے خیال کو بلا واسطہ (Direct) ظاہر کرنے کا پابند نہیں۔ اگر وہ رمز و ایما کے پردے میں کہے یا بالواسطہ (Indirect) اظہار کا طریقہ اختیار کرے تو یہ اکثر پسندیدہ ہوتا ہے۔ لیکن نثر نگار جتنی وضاحت سے اور بلا واسطہ اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکے اتنا ہی وہ قابل ستائش ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحریریں پڑھ کر ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تحسین کلام کے لیے، یا عبارت کو دلچسپ بنانے کے لیے کبھی ادھر ادھر نہیں دیکھتے۔ نہ وہ اپنی نثر میں غیر ضروری تشبیہا استعمال کریں گے نہ استعارے سے کام لیں گے۔ نہ عربی فارسی کی بھاری بھر کم ترکیبوں سے اسے سجائیں گے۔ ابوالکلام کی طرح وہ الفاظ کے جوڑے بھی نہیں لاتے، نہ محمد حسین آزاد کی طرح مجرد (Abstract) تصورات کو

متحرک کرتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ جیسا مبالغہ بھی نہیں کرتے۔ نہ استفہام انکاری و اقراری سے نشر میں خطیاء  
 اہنگ پیدا کرتے ہیں۔ انھیں اپنے قلم پر اعتماد ہے، اپنے خیال پر اعتماد ہے، اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے  
 بے تکلف ادا کر دیتے ہیں۔ ان کی نشر کا یہ حال بھی نہیں کہ مبتدا کہیں سے خبر کہیں۔ اس میں عموماً تعقید،  
 ابہام یا لف و نشر بھی نہیں ہوتا۔ اس کی مثال میں ابوالکلام کی یہ عبارت دیکھیے :

”وہ ذلت کا زخم نہ تھا، بلکہ نامرادی کا زخم لگانے والا ہاتھ تھا۔ وہ مظلومی کی تڑپ نہ تھی بلکہ ظلم کو تڑپانے  
 والی شمشیر تھی۔ وہ مسکینی کی بے قراری نہ تھی بلکہ دنیا کو بے قرار کرنے والوں نے اس سے بے قراری پائی۔ وہ درد  
 و کرب کی کروٹ نہ تھی بلکہ درد و کرب میں مبتلا کرنے والوں کو اس سے بچھینی کا بستر ملا۔ وہ جو کچھ لایا، اس  
 میں غم گیتی کی پیچ نہ تھی، ناتوانی کی بے بسی نہ تھی، اور حسرت و مایوسی کا آئینہ نہ تھا، بلکہ یکسر شادمانی کا غلغلہ تھا  
 جتن و مراد کی بشارت تھی، کامیابی و عیش فرمائی کی بہار تھی، طاقت اور فرماں روائی کا اقبال تھا۔ امید اور یقین  
 کا خندہ عیش تھا، زندگی اور فیروزمندی کا بیکر و تماشال تھا۔ فتح مندی کی ہمیشگی تھی، اور نصرت و کامرانی کی دائمی“  
 اتنی طویل عبارت میں جو تقریباً (۱۲۵) لفظوں پر مشتمل ہے، ایک ہی بات بار بار کہی گئی ہے اور اسے  
 اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ ذہن میں ابھی طرح مرسم ہو جائے۔ اس کے برعکس مولوی عبدالحق کی یہ عبارت ملا تظہ  
 فرمائیے :

”وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی  
 تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرخان اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کے بڑھاپے  
 پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں انگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی  
 اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے  
 جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیا اچھا آدمی تھا۔ تو میں ایسے ہی لوگوں  
 سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نورخاں ہوتے۔“

ان دونوں عبارتوں میں ”اسٹائل“ موجود ہے مگر فرق یہ ہے کہ پہلی عبارت میں الفاظ زیادہ ہیں،  
 مضمون کم ہے اور دوسری میں مفہوم زیادہ، الفاظ کم ہیں۔ پہلی عبارت خوب صورت ہے مگر دوسری سائیک



ہے۔ عبدالحق کی نثر میں یہی صحن ہے کہ وہ سائنٹفک ہوتی ہے۔ وہ کبھی دور از کار، پادر ہوا اور مغلق بات نہیں کرتے، نہ حشو و زوائد سے بچپی کاری کا نوز پیش کرتے ہیں۔

حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم نے محمد حسین آزاد کے طرز نگارش کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا، ”کو صیفی اور تشبیہی ترکیبوں سے جو حش کے طور پر جملوں میں اضافہ کر دی جاتی ہیں، ادنیٰ سافقہ، حسن و لطافت کی تصویر بن جاتا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے کا ابتدائی فقرہ ہے: ”آناد ہندی نہاد کے بزرگ، فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔“ اس فقرے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی بہاؤ ترکیب صفتی ہے۔ زبان کو تیغ کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کا لازمہ جوہر لایا گیا۔ ان زواید کو نکال دینے سے اصل جملہ رہ جاتا ہے۔ آزاد کے بزرگ فارسی کو اپنی زبان جانتے تھے۔ اس حالت میں یہ جملہ بالکل روکھا پیسکا معلوم ہوتا ہے مگر صرف چند زوائد کے لانے سے جنہیں نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں، سارا جملہ چمک اٹھتا ہے۔“

جملہ چاہے چمک اٹھے اور یہ اسلوب لاکھ محاسن رکھتا ہو لیکن اسے Oliver Wendel Holmes کے الفاظ میں ”دلیل سوز“ کہنا چاہیے۔ اسے صحیح کہا ہے کہ Eloquent may self-reason اس لیے یہ انداز نگارش تحقیقی و تاریخی کتابوں کے لیے موزوں نہیں ہے اور قدم قدم پر گمراہ کرتا ہے۔ شبلی کی رنگینی بیاں کا منکر کون ہو سکتا ہے مگر یہی محمود شیرانی جو محمد حسین آزاد کے اسلوب کو اپنے انداز کے آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم“ بتاتا ہے ہیں، شبلی کی شعرا بجم میں ہزاروں تاریخی غلطیاں شمار کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان میں بیشتر غلطیاں وہ ہیں جو ذریعہ بیان اور فصاحت نے کرائی ہیں۔ پھر محمد حسین آزاد بھی ایک خیالی دنیا کے باشندے ہیں۔ ان کا اسٹائل اردو میں بے عدیل و نظیر ہے مگر تاریخ و تحقیق کا دشمن ہے۔ چناں چہ ”در بار اکبری“ ”سخن دان پارسی“ ”نگارستان سخن“ اور ”آب حیات“ میں ان سے ہر قدم پر بھرت ناک غلطیاں ہوتی ہیں۔ کچھ انھوں نے زریب داستاں کے لیے اضافے بھی کر دیے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی نثر چوں کہ سائنٹفک ہے اور حشو و زوائد سے معری ہے۔ اس لیے وہ تنقید و تحقیق اور تاریخ یا علمی مضامین کے لیے نہایت مناسب واقع ہوئی ہے۔ تحقیق میں غلطی عبدالحق سے بھی ہو سکتی ہے



اور ہوتی ہے، لیکن اس کی ذمہ داری، ان کی سحر طرازی یا طلاقت لسانی پر عائد نہیں ہوتی۔

الفاظ بھی من جملہ اسرار کائنات ہیں۔ لفظ اپنی جگہ کوئی چیز نہیں۔ ایک مہل آواز اور بے معنی صوتی حرکت یا ارتعاش اور بے جان و غیر مرنی سی شے ہے۔ ایک لفظ کا وہی مطلب ہے جو ہم نے ٹھہرایا ہے یعنی وہی مہوم (Hume) والا فلسفہ اشیاء ہے کہ سلسلہ کائنات ہمارے خیال پر قائم ہے ہمارا خیال کائنات سے نہیں۔ الفاظ تابع ہیں خیال کے، اور خیال آزاد ہے۔ وہ کسی قید میں نہیں سما سکتا۔ فن تحریر کی ایجاد نے یہ سہولت پیدا کی تھی کہ ہم دور بیٹھ کر بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکیں یا اپنے خیال کو محفوظ کر سکیں۔ ابتدا میں یہ کام نقوش و تصاویر سے کیا گیا اور رفتہ رفتہ حروف تہجی وجود پذیر ہوئے۔ پھر ان سے الفاظ بنتے گئے۔ اس طرح ہم نے اپنے خیالات کو اشاروں میں ظاہر کرنے اور دوسروں تک پہنچا دینے کا ایک وسیلہ ایجاد کر لیا۔ اسی لیے الفاظ صرف خیال کا ”آرہ“ نہیں، خیال ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چند انسان ایک ہی خیال کو مختلف لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جملہ لیجے کہ آسمان پر تارے چمک رہے ہیں۔ یہ ایک خیال ہے جو الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔ ہندی، سنسکرت، انگریزی، لاطینی، فرانسیسی، اطالوی، ایرانی، سریانی، عربی، فارسی، ہر زبان میں مختلف الفاظ یہ خیال ظاہر کر کے لیے استعمال ہوں گے۔ ان کے لب و لہجے میں، آواز کے زیر و بم میں، قواعد کی ترتیب میں بھی فرق ہوگا۔ لیکن ”خیال“ جو اصل غٹے ہے۔ ہر جگہ مشترک ملے گا۔ الفاظ بدلتے جائیں گے یہ نہیں کہ ہمارا یہ اردو کا جملہ ہر ملک اور ہر زبان والے کی سمجھ میں آجائے۔ وہ جب اس خیال کو ادا کرے گا تو اپنے الفاظ استعمال کرے گا۔ اسی معمولی سی مثال سے واضح ہو گیا کہ خیال، الفاظ کا تابع نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک خیال، ایک مخصوص لفظ کا تابع ہوتا اور زبانوں کا اختلاف اس میں حائل نہ ہو جاتا۔

پھر دوسری دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ انسان کی شخصیت اور سیرت، ذہن اور مزاج کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کسی خیال کی گہرائی میں اتر جائیے اور کہنے والے نے جن لفظوں میں اس بات کو ادا کیا ہے، اس کا تجزیہ و تحلیل، جزئیات کی حد تک کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس شخص کی افتاد ذہنی کیا ہے اور کیسی ”شخصیت“ کا انسان ہے۔ اس مطالعے کے بعد ہی اندازہ ہوگا کہ بوفان نے کتنی سچی بات کہی تھی

جب یہ کہا تھا کہ ”اسلوب خود انسان ہے“

دو باتیں اور ہمارے سامنے آتی ہیں۔ جب ہم کسی بات یا کسی خیال کو دوسروں تک منتقل کرنا چاہتے ہیں اور زور ہمیں خیال پر دینا ہوتا ہے تو نئے نئے اسالیب تراشتے ہیں۔ کہیں ابہام، کہیں تشریح، کبھی ٹکمار، کبھی اطناب، کہیں ایجاز، کہیں تشبیہ و استعارہ۔ مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ ہمیں کہنا ہے، وہ سننے والے یا پڑھنے والے تک پہنچ جائے۔ کبھی ”خیال“ پر زور نہیں دیتے اور صرف لفظی پینترے سے، وہ نظر ہوتے ہیں تو نئی نئی صنعتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ پُر تکلف عبارتیں اسی لیے وجود میں آئی ہیں کہ لکھنے والا خیال سے زیادہ الفاظ کی اہمیت سمجھتا تھا۔

قرآن نے اپنے احکام کی تبلیغ کے لیے طرح طرح کے پیرائے اختیار کیے ہیں۔ کہیں تمثیل ہے، کہیں تشبیہ، کہیں حکایت، کہیں تفصیل و تشریح، کبھی تاکید، کبھی اختصار و ایجاز۔ ان سب کا مقصد یہی ہے کہ اصل مدعا واضح ہو جائے۔ چنانچہ کہا گیا کہ: **ان الله لا يستحي ان يقرب اليكم امثله ما بعوضه من عند الله وما فوقها**۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس سے بھی نہیں شرماتا کہ تم پر پھر کی مثال دے یا اس سے بھی حقیر و کمتر کسی چیز کو تمثیل میں پیش کرے۔

اگرچہ اچھے اسلوب کی تشکیل میں بہت سے عناصر کارفرما ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن عہد جدید کے نظریات، اساتذہ قدیم سے بنیادی طور پر مختلف واقع ہوئے ہیں۔ آج کے نقاد الفاظ پر خیال کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی اسٹائل کو سائیکسک تسلیم کرتے ہیں جو اظہار خیالات کے لیے آسان، سبک، سادہ اور مختصر ہو۔ ذیل میں ہم اسلوب کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کے مختلف عناصر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

### اسلوب

خیال (۱)				الفاظ (۲)			
اختصار	سلاست	صفائی	سادگی	خطابت	زور بیان	موسیقیت	
قوت ابلاغ				شکاف	تشبیہ و تمثیل	مبالغہ	
ترصیع	ترکیب	الفاظ کے جوڑے	استفہام انکاری	استفہام اقراری	لف و نشر		
ہمتی	پرکاری	عکاسی	خوش آہنگی	۲ ہنگ و صوت	ہم خرج حروف		
سینیدگی	اعتاد	لطیف مزاح	انتخابیت	شعریات			
	انانیت	گفتگی					

مولوی عبدالحق کا اسٹائل جدید نظریہ اسالیب سے زیادہ قریب واقع ہوا ہے۔

وہ اپنی نثر میں نذیر احمد کی طرح جاوے جا محاورہ نہیں ٹھونسے لیکن آسان اور سادہ ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ان کی کتاب ”چند ہم عصر“ سے بعض عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں ان میں خط کشیدہ الفاظ خصوصیت سے قابل توجہ ہیں جنہوں نے ان کی نثر کو موثر اور شگفتہ بنانے میں حصہ لیا ہے۔

(۱) منشی صاحب سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ کے دربار میں بھی باریاب ہوئے۔ اس باریابی کی وجہ غائبانہ کی دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدیۃ السلطان ہوئیں۔ یہ دو کتابیں آج کل کہیں نہیں ملتیں اور نہ یہ بتا سکتا ہے کہ ان میں لکھا کیا ہے۔ غالباً یہ بادشاہ کی کتابوں کی شرحیں ہیں۔ واجد علی شاہ کی عجیب عادت تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے اور ادھر ادھر سے چند کتابیں اٹھالیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کر لے۔ اسی طرح جو کتاب سامنے آئی۔ اس میں سے کچھ حصہ نقل کر لیا۔ وہ اس بات کا مطلق لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا میں نے مختلف مضامین اور علوم کی کتابوں کے اقتباس بے ٹھکانے جمع کر دیے ہیں۔ عرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود نیز ان کے درباری ان کتابوں کو اعلیٰ تصانیف میں سے خیال کرتے تھے۔ ایسی انمل بے جوڑ کتابوں کی شرح لکھنا اور ان میں ربط و سلسلہ قائم کرنا، منشی صاحب مرحوم ہی کا کام تھا۔

(۲) اس کا علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا وہ زندہ انسانی کلو پیڈیا تھا اور اس لیے اس کی باتیں اور گپ شپ نہایت دل چسپ اور کسی فن کی بحث اس کے سامنے پیش کیجیے، وہ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سمجھا دیتا تھا۔ اور اس کی ظرافت بھی عجیب شان کی ظرافت تھی۔ اس کے ایک ٹھٹھوں میں وہ وہ مضمون و نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے مطالعے اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں اکثر روزمرہ کے الفاظ بڑا حسن پیدا کر دیتے ہیں مثلاً: ”اس کے ڈھے جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا جتنا ایک کھنڈر کے گر جانے کا۔ وہ اپنے بھادریں رعایا کے حق میں اسے عین انصاف اور نیکی سمجھتے تھے۔“ رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے نہ ملتے تھے گویا وہ رائے، پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔“



”مولوی صاحب مرحوم پھر چپ سادھ گئے۔“ مگر مولوی صاحب مرحوم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ”جب دیکھا کہ یہاں داں گلتی نظر نہیں آتی۔“ اس کے نیچے ایک ترخانہ بنا ہوا ہے جس میں کایکباڑ اور ڈیرے نیچے بڑے رہتے تھے۔“ تحقیقی و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے، اس کی تہ تک پہنچتے اور مالہ و مالہ علیہ کے سراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے۔“

میں سمجھتا ہوں، یہ چند مثالیں ادراستی و وضاحت، مولوی عبدالحق کے اسلوب نگارش و شس کی بنیادی خوبیوں کو سمجھنے کے لیے کافی ہوگی۔ میں نے مثالوں کا انبار لگانے کے مقابلے میں یہ ضروری سمجھا کہ اسٹائل کے محاسن اور عناصر ترکیبی سے بحث کروں اور چند ایسی بنیادی باتیں کہہ سکوں جن کی روشنی میں بابائے اردو کے اسلوب کا واضح خاکہ ان کی تحریر میں پڑھنے والے کے ذہن میں بن جائے۔

---



## مولوی عبدالحق بحیثیت خاکہ نگار

اردو میں خاکہ نگاری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ سب سے پہلی تحریر جسے ہم "خاکہ" یا "اسکیچ" (Sketch) یا "پین پورٹریٹ" (Pen portrait) کہہ سکتے ہیں مرزا فروغ اللہ بیگ کا مضمون "نذیر احمد کی کہانی" ہے۔ فروغ اللہ بیگ سے پہلے بعض تحریریں ایسی ضرور مل جاتی ہیں جن پر "خاکہ" کا گمان ہوتا ہے مثلاً اردو شعرا کے تذکرہ نگاروں نے بعض شاعروں کے متعلق کچھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں کہ اگر ان تحریروں میں "خاکہ" کی تمام شرائط پوری کی جاتیں تو یقیناً یہ بڑے کامیاب خاکے ہوتے۔ ان تذکروں میں قدرت اللہ قاسم کا "جموعہ نغز" سعادت خاں ناصر کا "تذکرہ خوش معرکہ نریبا" اور آزاد کی "آب حیات" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قاسم اور ناصر نے شاعروں سے متعلق وہ تمام معلومات دی ہیں جن کا انھیں علم ہے۔ لیکن وہ اتنی تشنہ ہیں کہ شاعر کی پوری شخصیت ہمارے سامنے نہیں آتی۔ محمد حسین آزاد پہلے تذکرہ نگار ہیں، جنھوں نے شاعر کا حیلہ، عادات و اطوار، عقائد و نظریات اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمارے سامنے اس کی پوری شخصیت آ جاتی ہے۔ لیکن عام طور پر بعض شخصیتوں کو دلچسپ بنانے کے لیے اپنی انشا پردازی کے زور میں انھوں نے واقعات اور لطیفوں کا اختراع کیا ہے۔ بعض لوگوں پر طنز و تعریف بھی کی ہے۔ اور بعض قابل عزت شخصیتوں پر فنکارانہ طریقے سے ستم ظریفیاں بھی کی ہیں۔ چون کہ مصنف کی "غیر جانبداری" اور صداقت و حق گوئی "خاکے" کی بنیادی شرط ہے۔ اس لیے اردو کا پہلا خاکہ نگار ہونے کا شرف، آزاد کو حاصل نہ ہو سکا۔ "خاکہ" کیمرے کی ایک تصویر کی طرح غیر جانب دار ہوتا ہے۔ اگر مصنف کسی کی بے وجہ تعریف کرتا ہے اور قابل ذکر خامیوں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ "مدح سرائی" ہے جسے انگریزی میں (Prose panegyric) کہتے ہیں اور اگر خاکہ نگار، دانشمند طور پر اس کی خرابیوں کو مبالغہ کے ساتھ نمایاں کر کے پیش کرتا ہے تو یہ "نثری ہجو" یا (Caricature) ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "خاکہ نگار" اور "مورخ" میں کیا فرق ہوتا ہے۔ دونوں کے لیے غیر جانب داری اور حق گوئی لازمی ہے۔ لیکن خاکہ نگار میں انسان کی شخصیت کا ادراک بہت زیادہ ہوتا ہے

اور یہ ادراک ہمدردانہ ہوتا ہے جسے ہم (Sympathy & Understanding) کہہ سکتے ہیں۔ مورخ کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ اس کا پڑھنے والا خوش ہو یا نہیں یا پڑھنے والے میں اس مخصوص انسان کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو کے یا نہیں۔ لیکن خاکہ نگار صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے، جب وہ پڑھنے والے میں بھی وہی ہمدردی کے جذبات پیدا کر دے جو خود اس میں ہیں۔ ہمدردانہ رویہ اور غیر جانب داری میں بہت نازک فرق ہے۔ ایک ہمدردانہ رویہ رکھنے والا خاکہ نگار کسی شخصیت کے تمام برے اور بھلے پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالے گا کہ پڑھنے والے کو اس سے نفرت نہیں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مورخ کا اصل مقصد واقعات کو پیش کرنا ہے۔ ان واقعات سے متعلق جتنی شخصیتیں ہیں وہ دوسرے درجہ کی اہمیت رکھتی ہیں، لیکن خاکہ نگار کا اصل فوکس کوئی شخصیت ہوتی ہے اور وہ صرف ان واقعات کو پیش کرتا ہے جس سے اس شخصیت کے بعض اہم پہلو اجاگر ہو سکیں۔ خاکہ نگاری کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہوتا ہے جس میں ایک خاکہ نگار کے لیے قوت مشاہدہ، ادراک و فہم غیر جانبداری، ہمدردانہ رویہ اور انداز بیان میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ فراہم کیے ہوئے مواد میں ضبط و نظم کا پیدا کرنا ضروری خصوصیات ہیں۔ خاکہ نگار بعض ایسے اہم پہلوؤں کا انتخاب کرتا ہے جن سے کسی انسان کی پوری شخصیت، ذہنی اقدا، افکار و نظریات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک کامیاب خاکہ نگار مولانا عبدالحی کے حکیم امتیاز الدین کے خلع کی طرح ڈیڑھ صفحہ پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے اور فرحت اللہ بیگ کے ”نذیر احمد کی کہانی“ کی طرح پوری ایک کتاب پر بھی پھیلایا جاسکتا ہے۔

اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں فرحت اللہ بیگ کے بعد اگر کسی پر نظر ٹھہرتی ہے تو وہ مولانا عبدالحی ہیں۔ مولانا کی پوری زندگی تحقیق اور تنقید کے میدان میں گزری ہے اور بقول ہمدی الاخادی وہ ہمیشہ ”مقدمہ بازی“ کرتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی اس مقدمے بازی کے طفیل کلاسیکی ادب کے وہ گوہر ہائے نایاب ہمارے ادب کی رونق ہیں جو ان سے پہلے بعض کتب خانوں کی زینت اور بعض اشخاص کی ذاتی ملکیت تھے۔ اگر انھیں مرتب کر کے شائع کیا جاتا تو باقی تمام ذخیرہ کی طرح یہ بھی دست برد زمانہ کی نذر ہو جاتا مگر مولانا کی انتھک کوشش، لگن، خلوص اور ایمانداری کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس اردو شاعروں کے لکھے ہوئے بیشتر تذکرے موجود ہیں۔ دکن اور شمالی ہند میں لکھی جانے والی نثر اور نظم کے جواہر، مولانا ہی کے توسط سے ہم تک پہنچے ہیں اور اردو پران کا وہ احسان ہے جس سے اہل اردو کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر مولانا چند ہم عصر کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تب بھی اردو میں ان کا نام ہمیشہ عزت اور احترام سے صاحب طرز انشا پردازوں کے ساتھ لیا جاتا۔

”چند ہم عصر“ میں اٹھارہ خاکے ہیں، جو ۱۹۰۰ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا شمار اردو کے کامیاب ترین خاکوں میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب خاکے ایسی شخصیتوں کے ہیں جنہیں مولانا خوب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں اور مولانا کو جن سے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان خاکوں میں مولانا محبت و نفرت، بغض و عناد، ذاتی تعصبات سے بلند اور غیر جانبدار ہیں۔ انھوں نے ان تمام شخصیتوں کی خوبیوں اور خرابیوں کو بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔

بعض اوقات مصنف خاکے کو اپنی ذات اور شخصیت کی اہمیت دکھانے کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ وہ خود اس طرح بھجا جاتا ہے کہ خاکہ مصنف اور اس شخصیت کے تعلقات اور مصنف کی اپنی شخصیت کا مطالعہ معلوم ہونے لگتا ہے اور اکثر کامیاب ترین خاکے محض اس وجہ سے ناکام تحریریں بن جاتی ہیں۔ لیکن مولانا اس معاملے میں بہت محتاط رہتے ہیں۔ خاکے کے کینوس پر وہ خود بہت کم نظر آتے ہیں اور اگر کبھی ان کا عکس نظر بھی آتا ہے تو تصویر کو اور زیادہ رنگین اور دلچسپ بنانے کے لیے۔ یا اس تصویر کے بعض اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے۔ مولانا کے حواس دل، وسیع قلب اور انسان دوست ذہن میں ایک سپاہی، ایک مالی سے لے کر حانی اور سرسید جیسی عظیم ہستیوں تک، سب کی گنجائش ہے۔ حیدرآباد کے فوجی ملازموں میں بہت سے کرنل، میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدے دار موجود تھے۔ لیکن ان کی ملمع کی ہوئی چمکدار شخصیتیں اور کھوکھلا وقار، مولانا کو متاثر نہیں کر سکا۔ ان کے معیار انسانیت پر صرف ایک معمولی سپاہی نور خاں اترتا ہے۔ جو کچھڑ میں گمراہ ہوا ہیرا، گدڑی میں چھپا ہوا لالہ ہے۔ جو بظاہر کچھ بھی نہیں لیکن اہل نظر کے لیے بہت کچھ ہے۔ نور خاں کی نیک نفسی، حق گوئی، خودداری شرافت، ایمانداری اور مزاج کے میٹھے پن نے زندگی بھر انھیں مصائب و آلام میں گرفتار رکھا۔ ان کی گردن کئی بار کٹی مگر جھکی ایک دفعہ بھی نہیں۔ بقول مولانا :

”وہ صاحب کے کمرے، بات کے کمرے اور دل کے کمرے تھے۔“

ان کی یہی ادا اور یہی خوبی مولانا کو عزیز ہے اور اسی نے مولانا سے یہ خاکہ بھی نکھوایا۔

مولانا کی قوت مشاہدہ جس قدر تیز ہے، اتنی ہی اس کے بیان پر بھی انھیں قدرت ہے۔ بعض خاکوں کی ابتدا ہی میں چند الفاظ میں پوری شخصیت کا جائزہ اس طرح لے لیتے ہیں کہ اگر صرف وہی چند الفاظ نہ سن دیے



جائیں تب بھی اس شخصیت کا مکمل خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

”مرحوم بڑے کمسن سے ذہین و ذکی مشہور تھے طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنے ہم سروں میں ممتاز رہے۔ ان کی کارروائی اور کارگزاری، ریاست حیدرآباد دکن میں ضرب المثل ہے۔ وہ کام کرنے میں بکلی اور محنت کرنے میں آندھی اور طوفان تھے۔ معاملات کی ترقی اس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے انہی معاملات کا ہفتوں اور مہینوں مطالعہ کیا تھا، وہ بھی دیکھتے رہ جاتے۔“

مولانا نے ایک اور خاکے ”نواب محسن الملک“ کی ابتدا اس طرح کی ہے:

”قدرت نے نواب محسن الملک مرحوم کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں۔ ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی ان کی ایسی عام اور نمایاں صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا۔“

جو لوگ شیخ غلام قادر گرامی مرحوم کی شخصیت اور عادات و اطوار سے واقف ہیں، وہ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا نے کس طرح چند الفاظ میں ان کی شخصیت کا مکمل اور جامع عکس اتار دیا ہے۔ انہوں نے گرامی کے خاکے کی ابتدا اس طرح کی ہے:

”گرامی سچا شاعر تھا۔ ہمارے ہاں شاعر کے لیے جو بوجہ و اوزام سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے۔ بے نیاز، بے پروا، دنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر، لا بالی، اگرچہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا، مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا۔“

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ خاکہ نگاری مدح سرائی یا ہجو نگاری نہیں ہوتی۔ ایسا بھی نہیں کہ خواہ مخواہ توازن قائم کرنے کے لیے دو چار خوبیوں کے ساتھ، دو چار خامیاں بھی بیان کی جائیں۔ مولانا ہر شخصیت کا مطالعہ، ایمان داری سے کرتے ہیں۔ ہم مولانا کی رائے سے تواضع کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی نیت پر کبھی شبہ نہیں کر سکتے۔ مولانا کو ان لوگوں کے ساتھ خلوت اور جلوت دونوں میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انہوں نے ان شخصیتوں کو جیسا دیکھا اور سمجھا ہے، بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اسی لیے مولانا انسانی خوبیاں ہی نہیں، خرابیاں بھی بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں حکیم امتیاز الدین اور مولانا محمد علی کے خاکے کامیاب ترین ہیں۔ یہ دو شخصیتیں ایسی تھیں کہ جہاں خاکہ نگار کی ایمان داری، صداقت اور غیر جانبداری



کا امتحان تھا۔ مولانا اس امتحان میں پورے اترے، وہ حکیم اثیا نالدین کے بارے میں لکھتے ہیں،  
 اگرچہ طبیعت کا کمزور اور لاابالی تھا مگر دوستی کا سچا اور دھن کا پکا۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کے  
 کام کا نہ تھا، مگر خیال میں اس نے ایک ایسا عالم بنا رکھا تھا کہ عالم مثال بھی اس کے سامنے  
 بیٹھ تھا۔ اس میں ہر بات انتہائی تھی، محبت تھی تو انتہا دہے کی، عداوت تھی تو انتہا دہے  
 کی، میاں روی سے وہ بالکل آشنا نہ تھا۔“

مولانا محمد علی کے خلعے میں ابتدائی چند سطروں میں مولانا نے ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کر لیا ہے جن  
 لوگوں نے مولانا محمد علی کو قریب سے دیکھا ہے اور جو ان کی سیرت اور شخصیت سے واقف ہیں، وہی  
 عبدالحق صاحب کے ادراک اور ژرف نگاہی کی داد دے سکتے ہیں۔ وہ محمد علی مرحوم کے بارے میں  
 لکھتے ہیں،

”وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ  
 یا گلیشر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ ہوگا۔ ۲۰۰۰۰ دو ٹونوں میں عظمت و شان ہے۔ لیکن  
 دو ٹونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے۔ . . . وہ آزادی کا دلدادہ اور جمہور استبداد  
 کا پکا دشمن تھا۔ لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔“

مولانا نے بعض شخصیتوں کا ذکر بہت غلو سے کیا ہے۔ ان کے قابل ستائش اوصاف کو  
 ہر ممکن طریقے سے سراہا ہے۔ لیکن ان شخصیتوں میں بھی جہاں مولانا کو کچھ خامی یا کمی نظر آتی ہے۔ مولانا نے سید علی  
 بلگرامی کی قابلیت اور علمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

”بلگرامی مرحوم ہندوستان کے عہد جدید کے ان نامور علماء میں سے ہیں جنہوں نے علم و السنہ  
 مشرقیہ و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدن، علمی ترقی اور روشنی خیالی میں ایک نئی شان  
 پیدا کی ہے۔“

لیکن اسی خاکے میں مولانا لکھتے ہیں،

”لیکن جب ان کے کلام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے  
 کہ ان کے علم کے مقابلے میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طبعاً بخاکینی  
 اور علمی کام کی طرف کم راغب تھے۔ دوسرے دکن کی آب و ہوا . . . . مرحوم میں ایک

بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متکون مزاج تھے۔ اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے  
بھٹک جاتے تھے۔ یا بہت جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے، جو ان کی شان کے شایانہ  
ہوتی تھیں۔

اسی طرح مولانا نے خواجہ غلام الثقلین کے بارے میں لکھا ہے:  
خواجہ صاحب طبعا ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ ان پر بعض اوقات ناکامیابی کا بہت برا  
اثر پڑتا تھا۔ اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی صحت خراب رہتی تھی۔ وہ زیادہ دیر ناکامیابی کا  
مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

سوانح عمری اور خاکہ میں فرق یہ ہوتا ہے کہ سوانح نگار کسی شخصیت کی ولادت، جائے ولادت، ابتدائی  
تعلیم و تربیت اور اس کی زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن خاکہ نگار کو ان تمام  
حقائق سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کسی نے ایک سنگ تراش سے پوچھا کہ تم ایک پتھر سے اتنی خوب صورت  
مورتی کس طرح تراش لیتے ہو۔ اس نے جواب دیا، مورتی تو خود اس پتھر میں موجود تھی۔ میں نے تو صرف زائد حصہ کو  
ملاحظہ کر دیا ہے۔ بالکل یہی کام خاکہ نگار کا ہوتا ہے۔ وہ سوانح عمری میں سے زائد حصہ کو اس طرح الگ کر دیتا  
ہے کہ وہ شخصیت اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مولانا نے مزے سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے  
خاکے واقعات کی کھتونی نہیں ہیں۔ لیکن واقعات، سوانح کے بعض اہم پہلوؤں سے برا بھی نہیں۔ بعض خاکوں  
میں کسی شخصیت کے مختصر سوانح بھی دیے جانے ضروری ہوتے ہیں۔ کیوں کہ عام طور پر عوام اس شخصیت سے  
واقف نہیں ہوتے اور اگر وہ اس کی سوانح عمری پڑھنا چاہیں تو ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی بہترین مثال مولانا کا  
خاکہ پیر و فیسر ہیرت مرزا ہے۔ ان کی ولادت، ابتدائی سوانح اور بعض واقعات کا دینا ضروری تھا۔ کیوں کہ عام  
لوگ سب سے باہر لوگ ان سے متعارف نہیں تھے اور پھر ان تمام چیزوں نے پیر و فیسر ہیرت کی شخصیت کی تعمیر  
میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

اور بھی کچھ خلکے ہیں جن میں مولانا نے بعض واقعات بیان کیے ہیں۔ ان کے انتخاب میں مولانا بہت  
معاظ ہیں اور صرف ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے کسی شخصیت کے اہم پہلو اجاگر ہو سکیں۔ حافی، سرسید  
اور محسن الملک کے خاکوں میں انھوں نے ایسے ہی واقعات بیان کیے ہیں۔

ادب کی کوئی صنف اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک مصنف کو اپنے موضوع اور قوت

بیان دونوں پر پورا عبور ہو۔ خاص طور پر خاکہ کا فن بہت مشکل اور کمشن فن ہے۔ اسے اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں محدود الفاظ میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح خاکے میں بھی مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔ اس لیے خاکہ لکھنا بہت آسان ہے لیکن اول درجہ کا خاکہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ مولانا کو موضوع کی طرح بیان پر بھی پوری قدرت ہے۔ اردو کے صاحب طرز انا پر دازوں میں ان کا شمار صرف چند ہم عصر کی وجہ سے ہوگا۔ کیوں کہ تذکروں اور دوسری علمی اور ادبی کتابوں پر ان کے مقدمے تحقیقی نوعیت کے ہیں، جہاں انا پر دازی کا دخل نہیں، اور جہاں اسلوب کی سنگت کی خوبی نہیں، خرابی شمار کی جاتی ہے۔ جہاں مصنف، انا پر دازی کے زور میں قیاس کے طوطے بیٹا اڑانے لگتا ہے اور جہاں وہ واقعات اور حقائق کو اپنے اسلوب بیان کے سانچوں میں ڈھالنے پر مجبور ہوتا ہے۔

مولانا کے خاکوں میں جو بیان کی سنگت کی اور شیرینی ہے، کہیں کہیں سنجیدہ ہزل بھی اور شوخی گفٹار ہے، تشبیہات و استعارات کا برجستہ استعمال، لب و لہجہ کی بے ساختگی اور محاوروں کی چاشنی ہے، وہ ان کی اور تحریروں میں نہیں ہے۔ انھیں خوبوں نے خاکوں کو انشا پر دازی کی بہترین مثال بنا دیا ہے۔

ان خاکوں کی ایک اور بڑی خوبی ہے۔ جس کی طرف ڈاکٹر عابد حسین نے ”جوہر“ کے عبدالحی نمبر میں توجہ دلائی ہے اور وہ یہ کہ ان خاکوں میں خود مولانا کی شخصیت بھی جھلکتی ہے۔ ان کا تصور نیک و بد، انسان کی صفات، زندگی کے بارے میں ان کے نظریات، ایک نیک اور صالح آدمی کے اوصاف وغیرہ کا تصور بھی معلوم ہوتا ہے۔ میں یہاں صرف دو تین اقتباسات پیش کروں گا۔ تاکہ مولانا کے افکار و عقائد پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ جس لگن اور خلوص کے ساتھ مولانا کو اردو ادب کی خدمت کرتے ہوئے ادھی صدی سے زیادہ بیت گئی ہے۔ اس خلوص کی جھلک ان الفاظ میں دیکھیے۔ پروفیسر سرتھارن مرزا کے خاکے میں مولانا، ملٹن کا ایک قول پیش کرتے ہیں کہ :

”شہرت، شریف النفس انسان کا آخری ضعف ہے۔“

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی میدان میں شہرت پانے کے بعد، انسان کو اپنے مقصد اور اپنے فن سے پہلا سا لگاؤ نہیں رہتا۔ مولانا، ان خوش قسمت لوگوں میں ہیں جنہیں بحیثیت ادیب، نقاد اور محقق بہت کم عمری میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، لیکن یہ شہرت ان کے مقصد، خلوص، انتھک محنت پر قطعی اثر انداز نہ ہو سکی، اور کبھی ان کی کمزوری نہ بن سکی۔ انھوں نے کام اس لیے کیا ہے کہ یہ انسان کی زندگی کا مقصد ہے



اس لیے نہیں کہ انھیں شہرت اور دولت حاصل کرنی تھی۔ وہ سید محمود کے خاکے میں لکھتے ہیں :  
 ”شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ایمان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ  
 تقریباً ہر سینے میں مشعل ہے، وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے۔“

مولانا کے یہ الفاظ سید محمود کے لیے نہیں، خود اپنی ذات کے لیے بھی ہیں۔ ان کی پوری زندگی اس کی  
 آئینہ دار ہے۔ مولانا کو نور خاں اس لیے پسند ہے کہ وہ ”دل کا کھرا اور بات کا کھرا ہے“ اس میں صداقت اور  
 ایمانداری کے ساتھ ساتھ خود داری بھی ہے۔ نام دیو مالی ان کو اس لیے عزیز ہے کہ وہ کام کو کام کی خاطر کرتا ہے،  
 دولت حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ جب نام دیو مالی اپنی پوری محویت کے ساتھ بارغ میں کام کر رہا تھا، تو شہید کی  
 مکھیوں کا ایک جھڑ اس سے چٹ گیا اور اسے اتنا کاٹا کہ وہ مر گیا۔ اس کی وفات پر مولانا نے بڑی معنی خیز بات  
 کہی ہے، جو خود ان کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

”مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ، اس عزیز پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا، اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر  
 اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اسے شہادت نصیب ہوئی۔“

آخر میں صرف اتنا کہ جاسکتا ہے کہ ”چند ہم عصر“ کا شمار اردو کے بہترین خاکوں اور انشا پردازی کے  
 بہترین نمونوں میں ہے۔



## مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری

مولوی عبدالحق کے تنقیدی افکار میں فنکار کی شخصیت، اس کے ماحول اور عہد نیز ذریعہ اظہار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ شخصیت کے وسیلے سے ان کا ذہنی رشتہ نفسیاتی تنقید ہے، ماحول اور عہد کے واسطے سے ان کا فکری تعلق سماجی اور تاریخی تنقید سے نیز ذریعہ اظہار کی نسبت سے ان کا تنقیدی رشتہ اردو کی کلاسیکی تنقید سے قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی تنقیدی تحریروں میں نفسیاتی اور سماجی تنقید کا شعور کم ہے۔ پھر بھی انھوں نے شخصیت اور عہد کی اہمیت پر خاصا زور دیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

”جب ہم شعریا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی طبیعت، اس کے خصائص اور عادات پر نظر ڈالیں۔۔۔ اور اس کے بعد۔۔۔ اس کے عہد کے واقعات و حالات و تغیرات و انقلابات کا ذکر کم سے کم اس حد تک ضرور کریں جہاں تک ان کا تعلق اس کی شاعری سے ہے۔ کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس کی شاعری اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہو کے بغیر رہ سکے۔“

(تنقیدات عبدالحق ص ۱۵۲)

اس میں شک نہیں کہ فنکار کی تخلیق پر اس کی شخصیت یعنی شعور و لا شعور اور عہد یعنی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی میلانات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ”انتخاب میر“ کے مقدمہ میں میر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی ”شخصیت اور عہد“ کے میلانات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ اور میر کی شاعری پر شخصیت و عہد کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے میر تقی میر کے بارے میں لکھا ہے۔

۱۔ ”میر صاحب کی زندگی مصائب و آلام کا سلسلہ تھی۔ جس کا تار بچپن سے لے کر لکھنؤ جلنے

تک کبھی نہ ٹوٹا۔“ (انتخاب کلام میر ص ۱۳)

۲۔ اس وقت دلی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ

کی راجدھانی تھی۔ مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں، پر بیواؤں سے کہیں زیادہ دکھیا رہی ہے۔ (انتخاب کلام میر ص ۱۲)

اس ضمن میں مولوی عبدالحق نے میر کی زندگی کے مدوجز اور ان کے عہد کے امار چٹھاؤ کے تناظر میں اس کی شاعری میں درد و درغ، خشکی و بے بسی اور غم زدگی و بے چارگی کا سراغ لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر میر کی شاعری کو اس کی زندگی اور عہد کے مرقع میں سمجھا کر دیکھیں تو آسانی سے یہ راز سمجھیں آسکتا ہے کہ میر کی شاعری میں دل اور دلی کے نوحے کیوں ملتے ہیں؟ مولوی عبدالحق نے بار بار شخصیت و عہد کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

۱۔ ان (میر تقی میر) کا کلام میں ایسا درد بھرا ہوا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹی لگتی ہے۔ جو لطف سے خالی نہیں۔ (انتخاب کلام میر ص ۱۸)

۲۔ شگفتگی اور زندہ دلی تیر صاحب کی تقدیر میں نہ تھی۔ وہ سراپا یاس و حرماں تھے۔ اور یہی حال ان کے کلام کا ہے۔ گویا ان کا کلام ان کی طبیعت و سیرت کی ہو ہو تصویر ہے۔ (انتخاب کلام میر ص ۱۹)

۳۔ ان کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویر ہیں۔ زبان سے نکلتے ہی دل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ (انتخاب کلام میر ص ۲۱)

مولوی عبدالحق نے میر کی شاعری پر ان کی شخصیت اور عہد کے اثرات کی نشاندہی تو ضرور کی ہے۔ لیکن ان کی تنقیدوں میں نفسیاتی تنقید اور سماجی تنقید کا واضح اثر نہیں ملتا۔ نفسیاتی تنقید میں فنکار کی شخصیت کے تشکیلی محرکات، اس کے ذہن و فکر کے نفسیاتی عوامل اور تخلیقی عمل کا تجزیہ شامل ہے۔ عبدالحق کی تنقیدوں میں نفسیاتی تنقید کے یہ اصول کارفرما نہیں ہیں۔ اسی طرح سماجی تنقید کے نقطہ نظر سے عبدالحق نے مادیت زندگی کی کشمکش اور مقصدیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اور سادہ انداز سے شخصیت اور عہد کے اثرات کی چھان بین کی ہے۔

مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری کا تیسرا اصول ذریعہ اظہار کی حرمت ہے۔ انھوں نے بار بار اپنی تنقیدی تحریروں میں زبان کی صحت اور بیان کی لطافت پر اصرار کیا ہے۔ جس کا رشتہ اردو کی کلاسیکی تنقید سے مل جاتا ہے۔ عبدالحق کی تنقید نگاری کا غالب رجحان یہی ہے۔ اردو تنقید کا کلاسیکی دبستان لسانی،

فنی اور عرونی پہلو پر مشتمل ہے۔ لسانی پہلو میں روزمرہ اور محاورہ کی صحت، زبان کے درست استعمال اور قواعد کے اصولوں کی خاص اہمیت ہے۔ فنی پہلو میں جمالیات اور شعریات نیز بدیع، بیان اور معانی کے اصولوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔ عرونی پہلو میں حروفِ علت کے سقوط، شکست نارما اور اوزن و بحر کے مسائل شامل ہیں۔ بنیادی طور پر اردو تنقید کا کلاسیکی دبستان شاعری کی ہیئت کے حسن پر اصرار کرتا ہے۔ اس کو زیادہ دل نشیں اور کیف آفریں بنانے پر زور دیتا ہے۔ اساتذہ کی اصلاحوں، ادبی معرکوں اور تذکروں نے اس کو پروان چڑھایا ہے۔ مولانا حالی اور شبلی کی تنقیدی تحریروں پر ان اصولوں کا خاصا اثر ہے۔ حضرت موبائی نے ”نکاتِ سخن“ کی شکل میں اس دبستان کی بوطیقا پیش کی ہے۔ مولوی عبدالحق اگرچہ اردو تنقید کے کلاسیکی دبستان کے روایتی علم بردار نہیں۔ لیکن ان کے تنقیدی افکار پر اس دبستان نقد کا گہرا اثر ہے۔ مولوی عبدالحق کے تبصروں، دیباچوں، مقدموں اور تنقیدی مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم اردو تنقید کے دو پہلوؤں یعنی لسانی اور فنی پہلو پر خاص توجہ مبذول کی ہے۔ لیکن عرونی پہلو کو قدسے نظر انداز کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تنقیدوں میں بار بار زبان کے لغوی اور تخلیقی استعمال کی بحث اٹھائی ہے۔ انھوں نے منشی احمد علی شوق قدوائی کے دیوان ”فیضانِ شوق“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مرے منہ پر کسی سے لے کے شجر کو بان کھانا تھا      ترے ہونٹوں کو میرے خون کا بیڑا اٹھانا تھا  
یہ آپس چنڈ میں نے کھینچ دیں صرف اوپر کدل سے      اثر کی کب تمنا تھی، فقط اس کو ڈرانا تھا

ان اشعار میں زبان کے محل استعمال پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”آپس کھینچ دینا یا کھینچ لینا، دونوں ٹھک نہیں۔“ آپس کھینچی ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں ”مرے منہ پر“ بھی اچھا نہیں ہے۔“

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۵۳)

اسی مضمون میں مولوی عبدالحق نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے۔

گل ہو کے میں کیا ہنتا، ایسا نہ تھا غم میرا  
شبِ غم کی طرح گزرا، روتے ہی جنم میرا

انھوں نے شوق قدوائی کے مندرجہ بالا شعر کی زبان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے۔



”اس شعر میں جنم گندا“ باندھا گیا ہے۔ خدا جانے یہ کہاں تک بہ لحاظ زبان ٹھیک ہے۔“ (تنقیدات عبدالحق، ص ۵۶)

مولوی عبدالحق نے جوش ملیح آبادی کی کتاب ”روح ادب“ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی زبان اور اس کے استعمال پر اس طرح اعتراض کیا ہے۔

بعض مقامات پر عبارت میں خامی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ زیادہ قابلِ لحاظ نہیں تاہم نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ عجیب شیرینی“ کا پہلا جملہ ”ایک رنگین عارضوں والی دو شیزہ“۔ یا۔۔ اس شعر میں ”اٹک“ کا لفظ

تمہارے سامنے کیوں ”اٹک“ میرا بہ نہیں سکتا  
اے محسوس کر سکتا ہوں لیکن کر نہیں سکتا“

(تنقیدات عبدالحق، ص ۱۲۷)

مولوی عبدالحق محض نکتہ چیں ہی نہ تھے۔ بلکہ نکتہ رس تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ زبان کے تخلیقی استعمال کی داد دی ہے۔ اور زبان کی مجازی ظکوں کو سراہا ہے۔ انھوں نے ”بانگ درا“ پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کی تین نظموں (شمع و شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام) کو پسند کیا ہے انھوں نے ان نظموں پر جو رائے دی ہے، وہ مشرقی شعریات کے اصولوں پر مبنی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے ”جن تین نظموں کا میں نے نام لیا ہے، وہ ایسی ہیں کہ ان میں اقبال کی شاعری کی تمام

خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تخیل کی بلندی، تشبیہات و استعارات لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔“ (تنقیدات عبدالحق، ص ۱۲۵)

واقع رہے کہ تخیل پر حاکمی اور شبلی نے بالترتیب مقدمہ شعرو شاعری اور شعرا لعم میں اچھی خاصی بحث کی ہے۔ لیکن جہاں تک تشبیہات و استعارات نیز لفظی ترکیبوں کا تعلق ہے۔ یہ مباحث تو خالص مشرقی شعریات کے ہیں۔ جن میں زبان کے تخلیقی استعمال کا حسن ہے۔ مولوی عبدن۔ م۔ راشد کے شعری جوئے ”ماورا“ پر تبصرہ کرتے ہوئے نکتہ رسی کی لے کو اور تیز کیا ہے۔ اور اس تبصرے میں انھوں نے خیالات کے ساتھ ”طرز بیان“ کی جذبات اور زبان کے نئے پن کا خیر مقدم کیا ہے۔ انھوں نے ”ماورا“ پر لکھا ہے۔



انھوں نے م۔ زائد، نے نظریات اور خیالات میں بھی جدت دکھائی ہے۔ بعض نظمیں عاری (یعنی بلینک ورس) میں لکھی ہیں۔

اڑ کے پہنچوں میں وہاں روح کے طیارے میں

سرعت نور سے یا آنکھ کے پلکارے میں

”پلکارے“ کا لفظ نیا ہے۔ اور خوب بنایا ہے۔ (تنقیدات عبدالحق۔ ص ۱۳۶)

مولوی عبدالحق نے جہاں نئے خیالات کا خیر مقدم کیا ہے، وہیں انھوں نے نئے اسالیب کا استقبال بھی کیا ہے۔ ”ماویا“ پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے عاری نظموں (بلینک ورس) کی پذیرائی کی ہے۔ واضح ہے کہ یہ وہی مولوی عبدالحق ہیں، جنھوں نے نظم معرا کی تحریک پر عبدالحلیم شرر کی حمایت کی تھی۔ اور جن کے مشورے سے شرر نے بلینک ورس کا نام ”نظم معرا“ تجویز کیا تھا۔ ان مباحث کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے نکتہ چینی کے ساتھ نکتہ رسی کا حق بھی ادا کیا ہے۔ اور ہیئت کے جمال آفریں عناصر اور اسالیب کو سراہا ہے۔

اردو تنقید کا تیسرا رکن ”عروضی“ ہے۔ مولوی عبدالحق نے روایتی انداز میں عروضی مباحث پر اظہار خیال نہیں کیا۔ لیکن ان کی تنقیدی تحریروں میں گہرا شعور، آہنگ کا فرملہ ہے۔ میر تقی میر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

”الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے“

(انتخاب کلام میر۔ ص ۱۸)

اس میں شک نہیں کہ موسیقی اور شاعری کا بولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں نے ”میر تقی میر: داخلی موسیقی کا شاعر“ عنوان سے اپنے ایک مقالے میں اس انداز فکر کی تھوڑی سی وضاحت کی تھی۔

”موسیقی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مجرد آوازوں کی باقاعدہ ترتیب سے پیدا ہونے والی

موسیقی۔ اور دوسری یا معنی آوازوں یعنی لفظوں کی باقاعدہ ترتیب سے ابھرنے والی ”لسانی“

موسیقی۔“ شاعری میں دونوں طرح کی ”موسیقیت“ کا منگم ہوتا ہے۔ حروف کی موسیقی مجرد

آوازوں کی موسیقی ہے۔ نیز الفاظ، تراکیب اور مصرعوں کی موسیقی یا معنی موسیقی کے دائرے

میں آتی ہے۔ اس با معنی موسیقی میں مجرد آواز یعنی حروف کی موسیقی لازمی طور پر شامل ہوتی ہے

اسی طرح شاعری میں لسانیاتی موسیقیت اور اس کی تمام قسمیں جو ہر کی طرح پیوست ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب اور باشعور شاعر، اپنی شاعری میں آواز اور اس کی اشاریت کے جملہ امکانات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جس کو شعری آہنگ بھی کہا جاتا ہے۔ میر ہمارے ان بڑے شاعروں میں ہے، جس کو نہ صرف آہنگ کا بھرپور شعور ہے۔ بلکہ وہ اس کو برتنے کا فن بھی جانتا ہے۔ شعری آہنگ بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک داخلی آہنگ، جس میں جذبے کا آہنگ بھی شامل ہے۔ اور دوسرا خارجی آہنگ، جس میں حروف، الفاظ، تراکیب کے آہنگ کے ساتھ بحر و قوافی کا آہنگ، جس میں ہے۔ شعری آہنگ ان دونوں کے ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک اکائی بن جانے سے وجود میں آتا ہے۔“

(معنویت کی تلاش ص ۱۰)

اگر مولوی عبدالحق کے اصول و الفاظ کا صحیح استعمال اور خاص ترتیب سے پیدا ہونے والی موسیقی، کو ٹوٹا میر کی کل شاعری اور خصوصاً بحر میر پر وارد کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ مولوی عبدالحق کے شعور آہنگ کا قائل ہونا چڑتا ہے۔ بلکہ اس سے میر کی شاعری کے بارے میں دلکش نتائج بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس بحر میں میر تقی میر کی تقریباً ۱۸۳ غزلیں ہیں۔ بظاہر یہ بحر متقارب ہے۔ لیکن میر نے ارکان کی غیر رسمی و غیر روایتی ترتیب سے عروضی آہنگ کے جو پیٹرن ایجاد کیے ہیں۔ وہ انہیں کا حصہ ہے۔ یہ بھی مولوی عبدالحق کی تنقیدی بھرت ہے کہ انہوں نے میر کے شعری آہنگ کی انفرادیت کو محسوس کیا اور اس شعور آہنگ کو اپنی تنقیدی بصیرت کا حصہ بنایا۔ مولوی عبدالحق نے راشد کے ”ادرا“ پر تبصرہ کرتے ہوئے ”شعور آہنگ“ پر چند خیال انگیز اشارے کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے:

”راشد صاحب کا یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ بد قسمتی سے ہمارے ملک کی شاعری خصوصاً اردو شاعری اپنی خارجی اصل کے سبب ہمارے ”قومی شعور و نغمہ“ کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی بلکہ ایک میکا نکی علم عروض پر مبنی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ عروض اور نحو سب میکا نکی ہوتے ہیں۔ پہلے شعر ہے اور اس کے بعد عروض اسی طرح پہلے زبان ہے اور اس کے بعد صرف و نحو، منطق ہو یا صرف و نحو۔ عروض ہو یا موسیقی، یہ سب ہماری بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ اٹل نہیں، تغیر پذیر ہیں جب زندہ زبان

اور ادب ایک حال پر نہیں رہ سکتے اور ان میں تغیر لازم لازم ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ موسیقی کے اصول ایک حال پر قائم رہیں۔“  
(تنقیدات عبدالحق ص ۱۳۸)

مولوی عبدالحق نے یہاں بڑے چتے کی بات کہی ہے۔ ایک تو انھوں نے یہ سوال اٹھایا کہ ہے کہ ”قومی شعور“ نغمہ یا ہندوستانی مزاج موسیقی ”کیا ہے؟ اس پر آج تک گفتگو نہیں ہوئی دوسرے انھوں نے ”عروسی آہنگ“ کی تائید کرتے ہوئے واضح طور پر کہا ہے کہ زبان اور شاعری زمانے کے ساتھ چلتی ہیں۔ اور بدلتی رہتی ہیں۔ انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ جب زمانے کے ساتھ زبان اور شاعری کا رنگ و آہنگ بدلتا ہے تو قواعد اور عروسی کو بھی بدلتا ہوگا۔ لیکن یہ تبدیلی ضروری اور فطری ہوگی۔ تبدیلی برائے تبدیلی نہیں۔ چونکہ شاعری کی حیثیت نامیاتی ہوتی ہے۔ آہنگ جو ہیئت کا حصہ ہوتا ہے، وہ بھی نامیاتی ہوتا ہے۔ زندگی کے ساتھ زبان اور شاعری، زبان اور شاعری کے ساتھ صرف و نحو نیز آہنگ شاعری نامیاتی انداز سے بدلتا رہتا ہے مولوی عبدالحق کے اس انداز نظر سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا تصور آہنگ معتدل تھا۔ روایتی یا انقلابی نہیں تھا۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے اردو تنقید کے دو اصول یعنی لسانی اور فنی توجہوں کے توں قبول کر لیے تھے۔ لیکن عروسی اصول کو من و عن تسلیم نہیں کیا تھا۔ بلکہ ان کے شعور آہنگ پر روایتی اور انقلابی تصور آہنگ کا اثر ہے۔ وہ رگی عروسی کے زندہ عناصر کو بائی رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر نئے تصور آہنگ کا استقبال بھی کرتے ہیں۔

فنون لطیفہ میں وسیلہ اظہار کی بجا اہمیت ہے، اس سے ہر فنکار واقف ہے۔ موسیقی میں آواز کے زیر و بم، سر اور تال کی، رقص میں حرکات بدن میں توازن اور ہم آہنگی کی، مصوری میں رنگ، خطوط اور الوان کی ترتیب و توازن کی، بت گری میں سنگ تراشی کے ضابطوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح شاعری میں زبان کی صحت، آہنگ و بحر کے اصولوں اور فن کے دیگر لوازمات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایک موسیقار اپنے ذریعہ اظہار یعنی آواز کے اتار چڑھاؤ اور سر تال سے چشم پوشی کرتا ہے، وہ اپنے فن کے ساتھ کیا خاک انصاف کر سکتا ہے؟ اگر ایک رقص اپنے بدن کی حرکات و سکنات میں کسی ترتیب مناسب اور ہم آہنگی کی قائل نہیں تو وہ کیا دادر قص دے سکتی ہے۔ اگر ایک مہنور اپنے ذریعہ اظہار یعنی رنگ و الوان کے استعمال میں اگر کسی اصول اور ضابطے کا پابند نہیں تو وہ اپنے فن کے ساتھ کیا انصاف کر سکتا ہے؟ یہی حال نقاشی اور صنم سازی کا ہے۔ آج کل شاعری



کے میدان میں ایک حشر برپا ہے۔ اکثر شعراء ذریعہ اظہار کی حرمت کے قائل نہیں۔ زبان اور بیان کے اصولوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ فن کی تاریخ شاہد ہے کہ جو فنکار اپنے فن کے ذریعہ اظہار کا احترام نہیں کرتا، فن بھی اس کا احترام نہیں کرتا۔

مولوی عبداللہ کے نظریہ تنقید پر یوں، تو نفسیاتی اور سماجی تنقید کے اصولوں کا معمولی سا اثر ہے۔ یعنی انہوں نے فنکار کی شخصیت اور عہد کے وسیلے سے فن تک رسائی پر زور دیا ہے۔ لیکن ان کے تنقیدی افکار پر اردو کی کلاسیکی تنقید کا اثر ہے۔ انہوں نے زبان و بیان پر ہیئت و اسلوب کی صحت اور جمال آفرینی پر زور دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زبان اور شاعری کو اگرچہ بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن یہ زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اور قواعد اور عر و عن بھی ان تبدیلیوں کو انگیز کرتا ہے۔ اس لیے انہوں نے روایتی شعور آہنگ کے زندہ عناصر کے ساتھ نئے آہنگ کا غیر مقدم بھی کیا ہے۔ اردو کے نئے شعراء اور نقادوں فن مولوی صاحب کے تجزیہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔



# مولوی عبدالحق

اور

## انجمن ترقی اردو ہند کا دلی میں ورود

مولوی عبدالحق، سرسید اور حالی کے زبردست حامیوں میں تھے، طالب علمی کے زمانے میں سرسید سے علمی اور ادبی زندگی کے جو آداب انہوں نے سیکھے تھے ان کو بعد میں اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ سرسید کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے مولوی صاحب نے بہت سی عادتیں سرسید کی اپنائیں، اس لیے عبدالحق کی شخصیت کی تعمیر میں سرسید اور حالی کا زبردست ہاتھ ہے۔ کالج کی جب چھٹیاں ہو جائیں تو سرسید، عبدالحق کو گھر جانے سے روک دیتے اور اپنے علمی کاموں میں مشغول رکھتے۔ اس سے ان میں علمی و ادبی کام کرنے کی لگن پیدا ہو گئی۔ شیخ چاند نے عبدالحق کی علمی زندگی اور سرسید سے قربت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

”آپ کا زیادہ تر وقت سرسید کے ساتھ گزرتا تھا۔ تعطیل میں عموماً یہ صاحب آپ کو گھر جانے سے روک دیتے تھے اور مختلف علمی کاموں میں مشغول رکھتے یہی وجہ ہے کہ آپ پر سرسید کی آزاد خیالی اور روشن دماغی کا خاص اثر پڑا۔“

یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق کو اردو سے رغبت پیدا ہوئی اور انجمن ترقی اردو کا سکریٹری ہونے کے بعد اردو کی خدمت کے جذبے کو جلا ملی جس کا ثبوت ہمیں ان کی علمی اور لسانی خدمات سے ملتا ہے۔

## اورنگ آباد سے دلی منتقلی

مولوی عبدالحق اپنی ملازمت کے دوران اردو کی خدمت شروع کرتے رہے لیکن اردو کے فروغ اور اس کی ترقی کا جذبہ اس وقت پیدا ہوا جب وہ ۱۹۱۳ء میں انجمن ترقی اردو کے اعزازی سکریٹری مقرر ہوئے۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں اس وقت آل انڈیا اردو کانفرنس کے سکریٹری تھے، ان کی وساطت سے مولوی عبدالحق نے سکریٹری شپ کا عہدہ سنبھالا۔ اور مولوی صاحب انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر کو علی گڑھ سے اورنگ آباد دکن لے گئے جہاں رابعہ درانی کے مقبرے کے ایک گوشے میں انجمن کا دفتر قائم کیا۔ یہاں انھوں نے از سر نو انجمن کی تشکیل کی اور شب درویش کی محنت اور اپنے اثرات سے اس میں نئی جان ڈالی اور یہ ادارہ پورے ہندوستان کی نمائندگی کرنے لگا۔ غرض مولوی صاحب کی لگاتار محنت اور توجہ نے اردو کو انجمن کے پلیٹ فارم سے دور دور تک پہنچا دیا اور انھوں نے اپنے علمی اور ادبی کارناموں سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔ اورنگ آباد جیسے دور دراز مقام سے اردو کی ترقی و ترویج کو پھیلانا آسان کام نہ تھا، یہ کام وہی شخص انجام دے سکتا تھا جسے اردو سے محبت اور لگاؤ ہو۔ مولوی صاحب نے ۲۴ سال تک اورنگ آباد میں رہ کر اردو کی مقبولیت اور ہر دل عزیز کی کارسکے لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۶ء تک اورنگ آباد میں ملازمت کا سلسلہ جاری رکھا اور اردو کا پرچار بھی کرتے رہے اور عوام کے دلوں میں اس کی اہمیت اور اس کے علمی خزانے کی قدر و قیمت کو واضح کرتے رہے۔ اب انھیں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند میں رہ کر اردو کے فروغ میں پیدا شدہ اڑچنوں کو دور نہیں کیا جاسکتا اس لیے انھوں نے ملازمت سے سبک دوش ہونے کا تہیہ کر لیا اور انجمن ترقی اردو ہند اور اس کی شاخوں کو قائم کر کے اردو کی ترقی اور فروغ کا بیڑا اٹھانے کا ارادہ کر لیا۔

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں مولوی صاحب نے آل انڈیا اردو کانفرنس علی گڑھ میں منعقد کی جہاں دور دراز مقامات سے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ اردو اور ہندی سے محبت کرنے والے جمع ہوئے۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انجمن ترقی اردو کا صدر مقام اورنگ آباد کے بجائے دلی میں ہونا چاہیے اور حالات کے پیش نظر شمالی ہند میں اردو کی طرف توجہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے مولوی صاحب نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔

انجمن کے بچتے صدر سر اس مسعود ۱۹۳۷ء میں انتقال فرما گئے۔ یہ اردو کے سچے پرستار اور عاشق تھے اردو سے ایک رشتہ ان کا یہ بھی تھا کہ وہ سرسید کے پوتے اور سید محمود کے فرزند تھے۔ ان کے انتقال سے انجمن اپنے ایک محسن اور مربی سے محروم ہو گئی۔ ان کے انتقال کے بعد سر اکبر حیدری کی تجویز پر انجمن کی مجلس نظمانے سترجی بہادر پٹو

کو انجمن کا صدر منتخب کیا۔ یہ انجمن کے پانچویں صدر تھے۔ اس وقت سے یہ روایت قائم ہو گئی کہ ایک ہندو صدر انجمن کا منتخب ہونے لگا۔ گودشتور میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند کے مرکزی دفاتر دہلی منتقل کر دیے گئے۔ جب ۱۹۱۳ء میں انجمن کا دفتر مولوی عبدالحق علی گڑھ سے اورنگ آباد لے گئے تھے تو اس کا کل اثاثہ ایک پرانا اور بوسیدہ صندوق تھا اور چند قلم دوات۔ انجمن دلی لائی گئی تو اس کی شائع شدہ کتابیں اور دوسرے سامان مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لا کر دلی لائے گئے۔ دلی میں دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کر لیے پرلی گئی۔ چند مہینے بعد جنوری ۱۹۳۹ء میں ”ہماری زبان“ کے نام سے ہندو روزہ اخبار مولوی صاحب نے جاری کیا۔ مولوی صاحب کا دلی آنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس زمانے میں اردو اور ہندی کا تنازعہ بہت بڑھ گیا تھا اور اردو کو سیاست کا شکار بنا کر ہر ممکن نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اب انجمن کے دو مقاصد ہو گئے ایک علم و فن کی خدمت دوسرے اردو زبان کا تحفظ۔ ان کے علاوہ مولوی صاحب اردو کے مخالفوں سے اور اس کے راستے میں اڑھن پیدا کرنے والوں سے مقابلہ کرتے رہے۔ اس طرح مولوی صاحب جو مکھی لڑائی بڑی کامیابی اور مستعدی کے ساتھ لڑتے رہے۔ اردو کا مخالف ان کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

### اردو ہندی تنازعہ

مولوی عبدالحق نے اردو ہندی کے تنازعہ کو روکنے کے لیے گاندھی جی سے اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ مولوی عبدالحق گاندھی جی کے آدرشوں کا کھلے دل سے احترام کرتے تھے اور ان کے خلوں اور احترام کا یہاں تک عملی ثبوت ملتا ہے کہ ساہتیہ پریشد کے جلسے ۱۹۳۶ء سے پہلے ان کے کمرے میں چرخا اور ایک لٹیر رکھی رہتی۔ یہ دونوں چیزیں وہ تھیں جو لوک مانیہ تک۔ سیاسی روپوشی کے زمانے میں چھوڑ گئے تھے۔ اور مولوی صاحب نے ان کو حاصل کر کے اپنے کمرے کی زینت بنا لیا تھا۔ کھدی کا لباس بھی مولوی صاحب اسی پابندی اور احترام سے پہنتے جس طرح گاندھی جی کا آدرش تھا۔ ہندوستانی کی وظائف کہتے ہوئے انھوں نے ریڈیو سے جو تقریر کی اس کے جسٹہ جستہ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اردو اور ہندی کا فرق واضح ہو سکے :







اور اس تعریف کو اکثر ان لوگوں نے قبول کر لیا ہے جو ہندوستانی کے حامی ہیں۔۔۔۔۔ نتیجہ  
یہ کہ آسان اردو کا نام ہندوستانی ہوا۔۔۔۔۔ اس کے بعد اگر کوئی مجھ سے پوچھے گا کہ ہندوستانی  
زبان کسے کہتے ہیں تو میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ جس زبان میں میں نے آج تقریر  
کی ہے یہی ہندوستانی ہے۔<sup>۱</sup>

مولوی عبدالحق ناگپور کے ساہتیہ پریشد اجلاس سے پہلے ۱۹۳۶ء تک ہندوستانی زبان بنائے جانے کی  
اصول پر قائم رہے۔ انھوں نے کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہ کی، یہ ان کے اصول اور شعار کے  
خلاف تھا البتہ جب اس کی مخالفت کی گئی اور اس کے رستے میں روڑے اڑکائے گئے تو انھیں مجبوراً اس کی مدافعت  
کرنی پڑی۔ حفاظت اور سلامتی کے لیے مدافعت لازم ہے۔ ۱۹۳۵ء میں گاندھی جی کے مشورے سے منشی کنہیا لال  
جو اس وقت غذائی وزیر تھے مولوی عبدالحق صاحب سے حیدرآباد ملنے گئے اور انھوں نے ایک ایسی انجمن بنانے  
کے بارے میں گفتگو کی جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کی زبان اور اس کے ادب سے  
واقفیت حاصل ہو سکے۔ چونکہ یہ ایک نیک کام تھا اور ادبی معاملہ تھا مولوی صاحب نے اسے منظور کر لیا۔ مولوی  
صاحب ناگپور کی رپورٹ میں اس واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

”۱۹۳۵ء میں مسٹر کنہیا لال منشی (غذائی وزیر) مجھ سے حیدرآباد آکر ملے۔ اور یہ  
کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک  
دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ آپ اس کی ورگنگ  
کمیٹی کے ممبر ہو جائیے۔ چونکہ ادبی معاملہ تھا، میں نے منظور کر لیا۔“

گاندھی جی مشہور و ممتاز سیاست داں تھے لیکن ان کے ادبی مشیروں میں کے۔ ایم۔ منشی اور کا کا لیکر کے  
نام نمایاں تھے۔ ان میں سے ایک گجراتی اور دوسرا مرہٹی کا مشہور مصنف تھا۔ ان حضرات نے ہندوستانی کے خلاف  
گاندھی جی کو بھڑکایا۔ یہ دونوں ہندی ساہتیہ سمیلن کے روح رواں تھے انھوں نے گاندھی جی کو اس بات پر آمادہ

۱۔ ہندوستانی (ریڈیائی تقریریں) مکتبہ جامعہ۔ دہلی، ص ۲۶، ۲۷، ۳۰۔

۲۔ مکتوبات عبدالحق؛ جیل قدوائی، ص ۲۲۸۔

۳۔ رپورٹ تیسری کل ہند کانفرنس۔ ناگپور، ص ۱۱۲۔

کر لیا کہ سہتیاہ پریشد کے اجلاس کے ساتھ ہندی سہتیاہ سیمین کا اجلاس بھی رکھ لیا جائے۔ غرض سہتیاہ پریشد کا اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء کو ناگپور میں ہوا جس میں گاندھی جی اور ہندی سہتیاہ سیمین کے ممبروں کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو، منشی پریم چند، آچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر احمر حسین رائے پوری اور مولوی عبدالحق وغیرہ شامل تھے۔ جلسے میں ہندی کے طرفداروں کی تعداد کافی تھی اس لیے بحث و مباحثے کے بعد ہندی کو منظور کر لیا گیا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے سہتیاہ پریشد کی ورکنگ کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ مولوی صاحب نے اس کی پوری روداد لکھی ہے۔ یہاں اس اجلاس میں گاندھی جی اور مولوی عبدالحق کی بحث کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

”۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگپور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا۔ اس

انجمن کا نام اکھل بھارتیہ سہتیاہ پریشد تھا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ پریشد کی زبان کیا ہونی چاہیے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا ”ہندوستانی“ گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں۔ میں نے کہا اس لیے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا پرزور لیوشن ہے کہ کانگریس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۳۱ میں صاف طور سے یہ درج ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا گیا تو کام کیسے چلے گا۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینٹر ابدلا اور ایک نئی زبان اور نیا نام تجویز کیا یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا، ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے، بول چال میں نہیں، پھر میں نے پوچھا ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ زبان جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے کہا تو پھر ہندی، ہندوستانی زبان کیا ہوئی۔ فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر انھوں نے جھنجھلا کر کہا، میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے عرض کیا۔ جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں۔ اس پر انھوں نے ایسا عجیب و غریب جواب دیا جس کی ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ فرمایا کہ مسلمان چاہیں تو اردو رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ اس کے بعد بحث کی گنجائش باقی نہ رہی اور میں نے اکھل  
بھارتیہ سہتیہ پریشد کی کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اب ہماری آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا  
کہ زلمے کا رنگ کچھ اور ہے۔

سہتیہ پریشد کا اجلاس صبح سے شام تک جاری رہا اور طویل بحث کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا۔ دوسرا  
اجلاس سہ پہر کے بعد شروع ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ مولوی عبدالحق گاندھی جی  
کے بعد پنڈت نہرو کا احترام اسی طرح کرتے تھے جس طرح گاندھی جی کا کرتے تھے اس لیے انھیں یہ امید تھی کہ حیثیت  
صدر کانگریس وہ عبدالحق صاحب کی تائید کریں گے۔ لیکن جب پنڈت نہرو کی طرف سے خاموشی دکھائی دی تو  
انھیں بڑا دکھ ہوا۔ جب کہ اس موقع پر تین تین صدر کانگریس موجود تھے۔ اور ان میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ حق  
اور سچائی کی موافقت میں اظہار خیال کرے۔ اس لیے ہندی کثرت رائے سے منظور کر لی گئی۔

اس اجلاس کے بعد مولوی صاحب بد دل ہو گئے۔ جن باتوں پر تکیہ کیا تھا وہی ہوا دے گئے۔ اس کا علاج  
کسی کے پاس نہ تھا۔ اب مولوی صاحب کی توجہ شمالی ہند کی طرف زیادہ ہو گئی۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا  
اردو کانفرنس علی گڑھ میں اسی غرض سے بلائی کہ اس میں صورت حال کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ کانفرنس کے اجلاس میں  
یہ رزلوشن پاس ہوا کہ انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد کے بجائے دہلی منتقل کر دیا جائے تاکہ مولوی صاحب یہاں  
رہ کر اردو کے فروغ کے لیے کام کر سکیں۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ ناگپور کے جلسہ سہتیہ پریشد نے ان کی  
آنکھیں کھول دیں۔ اور جگہ جگہ اپنی تقریروں میں ناگپور کو جاکپور کا نام دیا۔

مولوی عبدالحق کو اردو سے محبت جنون کی حد تک تھی اس لیے انھوں نے انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے  
ملک کے مختلف مقامات کے دورے کیے۔ بنگال، بہار، اتر پردیش، سندھ، کشمیر، گوالیار، صوبوں کے علاوہ  
جنوبی ہند میں مدراس، آندھرا پردیش، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، تامل ناڈو اور ٹراونکور کے دورے کیے اور  
اردو میں تقریریں کیں اور لوگوں کو اردو کی امداد کے لیے آمادہ کیا۔ جہاں انجمن کی شاخیں نہیں تھیں وہاں شاخیں  
قائم کیں۔ اس طرح مولوی صاحب نے ہندوستان میں انجمن کی شاخوں کا جال بچھا دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت  
چاروں طرف ان کے ہم خیال موجود تھے اور ہندوستان کے کونے کونے سے اردو کے حق میں آوازیں بلند ہونے لگیں۔



چنانچہ نومبر ۱۹۳۸ء میں مولوی صاحب نے انجمن کا صدر دفتر دہلی منتقل کر دیا۔ یہاں حالات کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے ۲۰ جنوری ۱۹۴۰ء میں ناگپور میں اردو کانفرنس منعقد کی جہاں طے کیا گیا کہ ہندوستان میں کسی موزوں مقام پر اردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس تاریخی تجویز کا ملک کے طول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ مولوی صاحب کی عمر بھی خاصی ہو چکی تھی اور کام اب پہلے کے مقابلے میں کافی بڑھ گیا تھا۔ مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اس سلسلے میں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

”روز بروز کام اس قدر بڑھتا جاتا تھا کہ بعض وقت گھبرا جاتا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیوں کر سمیٹوں۔ میں تو کبیل کو چھوڑتا ہوں، کبیل مجھے نہیں چھوڑتا۔ انجمن کے کام اور اس کی مشکلات اس قدر بڑھتی جاتی تھیں کہ مجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسب کروں۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے یا نو بجے سے جو بیٹھتا تو کام کرتے کرتے شام ہو جاتی۔ بیچ میں چلنے پینے اور اخبار پڑھنے کے لیے ایک گھنٹہ مل جاتا پھر بھی کام پورا نہیں ہوتا تھا۔“

ساتھ ہی پریشد کے اجلاس کے بعد مولوی صاحب اردو کے تحفظ کے لیے مکرہستہ ہو گئے اور انھوں نے ناگپور ہی میں پے درپے کئی اردو کانفرنسیں کر کے اردو عوام طبقے کو بیدار کر دیا۔ انھوں نے ناگپور میں ۳۸ء اور ۴۰ء کی کانفرنسوں کے بعد جنوری ۱۹۴۲ء میں کل ہند ہیمانے پر بڑا بھاری اجتماع کیا۔ جس میں تین سو سے زیادہ مندوبین نے شرکت کی۔ حالانکہ عالم گیر جنگ کے خاتمے پر جو بربادی ہوئی اس کے اثرات زندگی کے مختلف شعبوں پر پڑے۔ اس کے باوجود مہانوں کے قیام و طعام کا انتظام بڑی فراخ دلی سے کیا گیا۔ برقی روشنی کی کثرت سے چاروں طرف پنڈال کے وسیع شامیانے میں دن کا سماں نظر آتا تھا۔ کانفرنس کا افتتاح نواب مرزا یار جنگ حیدر آباد نے کیا۔ اور ۱۹ جنوری کے جلسے کی صدارت نواب حیدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی رئیس حبیب گنج علی گڑھ نے کی۔ مولوی عبدالحق نے سکریٹری کی حیثیت سے پوری روداد ساتھ ہی پریشد جس میں گاندھی جی نے اردو کی مخالفت اور ہندی کے حامی کی حیثیت سے رول ادا کیا تھا، پڑھ کر سنائی۔ انھوں نے عوام کو مٹی کی گولیاں پھینک کر کہا۔

”وہ (گاندھی جی) ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنا کر رہیں گے۔ ہمیں خواب

خروگوش سے بیدار کیا۔ اس وقت ہماری آنکھیں کھلیں اور ہم سمجھے کہ کروں میں بیٹھ کر کاغذ



سیاہ کرنے اور قلم گھسنے سے کیا حاصل اور یہ سب کچھ کس دن کے لیے اور کس کے لیے۔  
تب انجمن کے مقاصد میں اشاعت و حفاظتِ زبان کا مقصد بڑھاپڑا اور انجمن میدان  
میں آئی۔ پہلی مہم کا آغاز اسی شہر سے ہوا جسے میں نے اس کے بعد سے ”جاگ پور“ کا نام  
دیا۔ کیوں کہ اس نے ہمیں اور آپ کو جگادیا۔

اس تقریر کا اثر اردو طبقے پر خاص طور پر پڑا۔ اب انجمن ترقی اردو کے حامیوں کی تعداد خاصی بڑھ گئی تھی  
اخباروں اور رسالوں میں اردو کی افادیت پر زور دیا جانے لگا یہاں تک کہ اردو سحر یک اس زوروں پر چلی  
کہ گاندھی جی کے خیالات میں زبان کے مسئلے پر تبدیلی پیدا ہوئی۔ بالآخر ۱۹۴۴ء کے آخر میں گاندھی جی کو اپنی غلطی کا  
احساس ہوا اور فروری ۱۹۴۵ء کو انھوں نے ہندوستانی لٹریچر بورڈ قائم کیا جس کے دس ممبروں میں ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر  
ذکر حسین پنڈت سندھ لال، ڈاکٹر اختر حسین دہلوی وغیرہ تھے۔ گویا دس برس کے بعد اس بات کا احساس ہوا کہ  
ہندوستان کی ہندی کے بجائے ہندوستانی زبان ہونی چاہیے۔ گاندھی جی نے اس سمجھا کا اجلاس ۲۶ فروری کو داروہا میں بلایا  
تھا اور اس میں جو تقریر انھوں نے کی اور جو بات ناگپور میں رد کر دی تھی یہاں کھلے دل سے اس کا اعلان کیا کہ ”مولوی صاحب  
کو دوست کر کے بلایا تھا وہ دشمن ہو کر گئے، غلط میری تھی۔ میں ان کی بات کو نہیں سمجھا۔“ اس اجلاس میں ڈاکٹر تارا چند  
کے اصرار پر مولوی عبدالحق صاحب نے شرکت کی تھی۔ غرض ہندو مسلم مفارقت کے لیے گاندھی جی نے یہ قدم اٹھایا تھا  
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم طبقہ خاصی بڑی تعداد میں کانگرس کے خیالات کا حامی ہو گیا لیکن اردو سے محبت اس کا پرچار اس کا  
نصب العین قرار پایا۔ مولوی عبدالحق کے ساتھ پنڈت برج موہن دتا تریا کیفی اور مولوی ہاشمی فرید آبادی ان کے ہم نوا  
تھے۔ اردو کی لسانی خدمات میں ان کا بڑا اہم رول رہا ہے کبھی کبھی ان حضرات کو دھمکیاں بھی دی جاتیں کہ وہ اردو کے  
پرچار اور اس کو عوامی طاقت بنانے سے گریز کریں۔ مگر ان حضرات نے ان دھمکیوں کی کبھی پرواہ نہیں اور وہ برابر  
مولوی صاحب کے شانہ بہ شانہ اردو کی خدمت کرتے رہے۔

۱۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو مولوی عبدالحق کے دوست کے بیٹے نے ہوائی جہاز سے حیدر آباد جانے کے ڈوٹکٹ  
منگوا لیے۔ دوسرے دن ہوائی جہاز سے روانہ ہونا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتے تھے مولوی صاحب کا بیان  
ہے کہ ”میں اس لیے بھی ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا کہ وہ میرا ٹکٹ خرید لیتے ہیں اور رقم نہیں لیتے۔ میں ان کے

والد کا دوست ہوں۔ یہ میرے سامنے کے بچے ہیں۔ لیکن انھوں نے میری اور انجمن کی ایسی محبت اور خلوص سے خدمت کی ہے کہ میں بعض اوقات ان کی بات ملتے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

مسئلہ یہ تھا نواب سر مرزا اسماعیل نے انجمن کی سالانہ مالی امداد بند کر دی تھی اس کے اجرا کا بھی موقع تھا اس لیے مولوی صاحب کو حیدر آباد جانا پڑا۔ اس کے علاوہ اردو کی ترقی و اشاعت کے لیے ایک مٹھی کپنی بنانے کا ارادہ تھا۔ ان تمام کاموں سے اگست ۴۷ء تک نجات مل پائی۔ اسی دوران انگریز حکومت نے ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ ۳ ستمبر ۴۷ء کو ٹرین کے ذریعہ حیدر آباد سے بھوپال روانہ ہوئے۔ سفر میں سید علی شبر حاشمی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ تقسیم کے اعلان کے بعد ہی ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑا۔ مسلمان ہجرت کر کے پاکستان جانے لگے۔ دونوں طرف سے قتل و غارت گری ہونے لگی۔ بارہ دن تک بھوپال میں شعیب قریشی صاحب کے اصرار پر رکے رہے۔ پھر وہیں مولوی صاحب کو ملیر یا ہو گیا اچھا ہوتے ہی وہ ۲۵ ستمبر کو پھر حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گئے کہ وہاں کچھ کام باقی رہ گئے تھے ان کو مکمل کر دیا جائے، ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد دلی کی حالت بہتر ہو جائے چاروں طرف قتل و غارت اور وندیزی کا بازار گرم تھا۔ بالآخر ۹ نومبر ۴۷ء کو مولوی صاحب حیدر آباد سے دلی کے لیے روانہ ہوئے۔ دلی میں ان کا قیام مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں ایک ہفتے رہا۔ مولوی شبر حاشمی ایک روز پہلے دلی پہنچ چکے تھے۔ اسی دن ۱۰ نومبر کو انجمن کا دفتر دیکھنے گئے تو وہاں پر بھارت انشورنس کمپنی لاہور نے پوری کوٹھی پر قبضہ کر رکھا تھا۔ انجمن کے سرکاری کاغذات منتشر حالت میں پڑے ہوئے دیکھ کر مولوی صاحب کو سخت افسوس ہوا کہ کتابیں اور قلمی مسودات بے لاریوں میں بند تھے۔ لیکن آہنی تین لاریوں کے سوا باقی لکڑی کی لاریاں تھیں جن کی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ مولوی عبدالحق انجمن کے دفاتر کے کمروں کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”میرا جی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری ان کتابوں کا کیا حشر ہوا جو میرے کمرے میں تھیں، جس کمرے میں کام کرتا تھا وہ بہت بڑا اور وسیع تھا۔

کوٹھی بھر میں اس سے بڑا کوئی ہال تھا اس میں کتابوں کی متعدد لاریاں تھیں کھلی لاریوں کے سوا ڈوبڑی فولادی

۱۔ پنجاب سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۱۷۱۔

بڑی فولادی (آہنی) لاریاں دو نہیں تھیں جن میں قلمی کتابیں تھیں۔ بلواؤں نے ان کو باہر دوسرے سامان کے ساتھ کھلی جگہ پر ڈال دیا تھا جہاں بارش کی وجہ سے اندر کے قلمی نسخے بہت خراب ہو گئے۔ بڑی مشکل سے ان کو علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد علاحدہ کرایا گیا اور ان کی جلد بندی کرائی گئی۔

الہامیاں جن میں خاص خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم قرآین اور کاغذات اور بعض نامور  
اشنی ص مثلًا ناسخ، غالب، سرسید، حالی، 'مجن الملک'، اقبال، سر تیج بہادر سپہ و وغیرہ  
کے خطوط اور اسی قسم کی بہت سی عزیز اور بیش قیمت اشیا تھیں، ان کے علاوہ کئی بڑے  
صندوق تھے۔<sup>۱</sup>

گویا مفسدوں نے انجن کا بیشتر حصہ برباد کر دیا تھا۔ مولوی صاحب اپنا ذاتی کتب خانہ دو تین مرتبہ  
میں کراچی لے گئے باقی ساز و سامان علی گڑھ میں مولانا آزاد کے توسط سے منتقل کر دیا گیا۔ اور اس کے سکریٹری قاضی  
عبد الغفار مقرر ہوئے۔ صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کو بنایا گیا، خطوط اور قرآین مولوی صاحب سب ساتھ لے گئے یہاں اس  
قسم کا سامان علی گڑھ میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ انجن کے کتب خانے کی شیرازہ بندی میں کئی سال کی محنت اور  
جدوجہد کے بعد کرپایا۔ نادر اور قلمی نسخے جو بلواؤں کی زد سے باقی بچ گئے تھے ان کو علی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ دہلی میں  
کتب خانے کی کتابوں اور دوسرے سامان کی جو بربادی ہوئی اس کی تفصیل انجن ترقی اردو کے ذیل میں کر دی  
گئی ہے۔ مولوی عبدالحق اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"جب حیدر آباد پر بھارت نے قبضہ کر لیا تو میں (عبدالحق) ۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو  
دہلی روانہ ہو گیا۔ سب معاملات کا تصفیہ کرنے کے بعد ۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو دہلی سے رخصت  
ہوا۔ بھوپال اور بمبئی میں کچھ دن قیام کر کے ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو کراچی پہنچا۔ میں اپنے  
ساتھ اپنا کتب خانہ بھی لیتا آیا جو نادر و نایاب خطوط اور مطبوعات پر مشتمل ہے۔<sup>۲</sup>

غرض ہندوستان میں جب اردو کی خدمت اور اس کے فروغ کی سب کوششیں بے کار ہو گئیں تو کافی غور  
خوض کے بعد مولوی صاحب نے طے کیا کہ اب پاکستان میں رہ کر ہی اردو کے فروغ کا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ  
۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو وہ ہوائی جہاز سے کراچی چلے گئے، ہوائی اڈے پر شعیب قریشی، ہیر حسام الدین راشدی، سید  
ہاشمی فرید آبادی اور عبداللطیف خاں ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ کراچی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ کراچی میں  
پرائی عمارت ۱۰ مارچ ۱۹۴۸ء سے پہلے مولوی عبدالحق کے قبضے میں سید علی شہر عاتمی کی کوشش اور مصلحت شناسی کی



وجہ سے قبضے میں آچکی تھی۔ اور یہاں انھوں نے انجمن ترقی اردو پاکستان قائم کر کے کام شروع کر دیا۔ اس طرح مولوی صاحب نے یہاں نئی مہم کا آغاز کیا۔ یہ پُرانی عمارت بڑی کشادہ اور کئی منزلیں پر مگرے بھی کافی ہیں۔ اسی جگہ میں ایک طرف مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام اردو کالج قائم کیا۔ اور پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شروع کے یوں بڑے صبر آزما اور مصیبت کے تھے، مولوی صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

”مصیبت بعض اوقات رحمت ثابت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ یہ تازیانے کا کام

دیتی ہے جس سے سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور اٹی ہوئی سوتیں کھل جاتی ہیں۔

۔۔۔ جو کام پہلے اُن ہونے معلوم ہوتے تھے وہ آسان نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ہم پر بھی

ایسا ہی آیا تھا۔ یہ درحقیقت ہمارے امتحان کا وقت تھا۔ میں سدا کا پردہ سی ہوں۔ نہ

کبھی گھر بنایا اور نہ کبھی گھر میں رہنا نصیب ہوا۔ ایک جھونپڑا تھا سو خدا کا شکر ہے

وہ بھی نہیں (رہا) انجمن کے ایک لڑے پٹے قافلے کی طرح پاکستان پہنچی اور کراچی آکر

اطمینان کا سانس لیا۔ باوجود بے سروسامانی اور ناداری اور باوجود طرح طرح کی مشکلات

کے ہم ہمت نہیں ہارے اور کچھ دنوں کے بعد انجمن نے پھر اپنا کام شروع کر دیا۔۔۔۔۔

مولوی عبدالحق زندگی بھر اردو کی خدمت اور اردو تحریک کو فعال بنانے میں مصروف رہے اور اردو

کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لیکن اپنی کبھی پروا نہیں کی۔ اپنے لیے نہ گھر بنوایا اور نہ سر چھپانے کے لیے کوئی ایسا

آسرا تلاش کیا جہاں آرام و سکون سے زندگی بسر کر سکتے، انجمن کا دفتر، ان کی زندگی اور یہی ان کا گھر تھا۔ کراچی میں

انجمن ہند کے زیر سائے اردو کالج قائم کیا، کالج کیا قائم کیا بیٹھے بٹھائے مصیبت مول لے لی۔ ان کی عجلت ہی

ان کے لیے مصیبت بنی۔ کسی یونیورسٹی نے اردو کالج سے الحاق کرنا منظور نہیں کیا۔ اس سے ان کی ہمت اور ہمت

ہوتی چلی گئی۔ کالج کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

”پہلے ہی پریشانیاں کیا کم تھیں۔ یہ کالج قائم کر کے میں نے بیٹھے بٹھائے ایک

پریشانی اور مول لے لی۔ کوئی یونیورسٹی اس کے الحاق کے لیے آمادہ نہیں تھی، سندھ یونیورسٹی

نے انکار کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی حدود سے باہر تھا۔۔۔۔۔ ہم ہندوستان سے لٹ پٹ



کے برباد ہو کے آئے تھے، توقع تھی پاکستان ہمارے آنسو پونچھے گا اور ہمت افزائی کرے گا لیکن اب جو دیکھا تو یہاں کارنگ ہی کچھ اور تھا۔۔۔۔۔ کہاں تک نکھوں بڑی طولانی داستان ہے۔

کالج کے الحاق کے لیے مولوی صاحب ایک سال سے زائد عرصے تک لڑتے رہے اور اس عرصے میں اور اس عرصے میں شب و روز محنت اور کوشش کرتے رہے۔ کالج کے طلبہ بھی ان کی اس ہمت اور حوصلے کی قدر کرتے اور ان کو دیکھتے تو خاموش ہو جاتے مگر مولوی صاحب بھی ان کو الحاق کا برابر یقین دلاتے رہے۔ کالج کے تمام مضامین کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ دی جاتی انجمن کا یہ بڑا کارنامہ تھا۔ کالج کے پرنسپل میجر آفتاب تھے۔ مولوی عبدالحی انجمن کے صدر اور کالج کے نگران تھے۔ مولوی صاحب کو کالج کے حسابات کے بارے میں گڑ بڑ کا علم ہوا تو انھوں نے ایک تحقیقاتی کمیٹی کی سفارٹ ج کالج کے حسابات اور حالات کی تفتیح کر کے مجلس نظما میں اس کی رپورٹ پیش کرے مولوی صاحب کا اس کمیٹی کے مقرر کرانے کا یہ منشا تھا کہ کالج کے حسابات درست ہو جائیں اور آئندہ کوئی گڑ بڑ نہ ہو لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ میجر آفتاب اور ان کے رفیقوں نے مولوی صاحب اور انجمن کے خلاف غلط پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ غلط پروپیگنڈے اور سازش سے مجلس عامہ میں اپنی اکثریت بڑھالی اور تخریبی کارروائیوں کا جال بچھا دیا۔ سید محمود صاحب کو معتمد بنایا۔ محمود صاحب مولوی صاحب کے خلاف تھے غرض کالج اور انجمن دونوں کے خلاف مولوی صاحب کو آگے کار بنایا۔ انجمن اور کالج کا سارا روپیہ ان تخریبی کاموں میں صرف کر دیا اور انجمن کے پاس اب اتنی رقم باقی نہیں رہی کہ کتابیں چھاپ سکے۔ پریس کی حالت بھی ابتر تھی اس کا درست کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔ مولوی صاحب کو اذیت پہنچانے اور ان کو پریشان کرنے میں تخریب کاروں کو لطف محسوس ہوتا۔

# ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے

حکایت از قدآن یار دل نواز کنیم  
بایں فسانہ مگر عمر نود و راز کنیم

بابا سے اردو کو لوگ اردو کے خدمت گزار اور عاشق زار کی حیثیت سے جتنا جانتے ہیں، اتنا محقق کی حیثیت سے نہیں۔ سچ پوچھیے تو بابا سے اردو کا بڑا کارنامہ اردو ادب کے ان شعراء اور محققین کو زندہ کی عطا کرنا ہے جو معنوی طور پر مر چکے تھے۔ اس طرح وہ اردو کے "بابا" ہی نہیں مسیحا بھی ہیں، جنہوں نے اپنی تحقیقات سے کئی مردوں کو زندہ کیا، کئی جان بہ لب مریشوں کو چنگا کیا۔ ان کی بے گور و کفن لاشوں کو منبر مقصود پر پہنچایا اور اردو کے جد بے جان میں زندگی کی روح پھونکی۔ اردو کا قدیم دور ان ہی کی تحقیقات کی بدولت زندہ ہے۔ مولوی صاحب کی ذات ہزار شیوہ اور ہزار رنگ ہے۔ انہوں نے انشائیہ بھی لکھے۔ سیرت نگاری بھی کی، تنقیدیں بھی کیں، لسانیاتی بحثیں بھی چھیڑیں، تراجم بھی کیے، وہ لغت اور قواعد نگاری کے بھی رمز اشاریں لیکن تحقیق کا پد سب پر بھاری ہے۔ ان کی تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسی "لچک" ہے کہ وہ ہر زمانے میں زندہ رہ سکتی ہے۔ حالاں کہ تحقیق میں "حرف آخر" نہیں ہوتا، کیوں کہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی "بہت کچھ" کہنے کی گنجائش باقی رہتی ہے اور پچھلے نظریے باطل ہو سکتے ہیں۔ مولوی صاحب آنے والوں کے لیے بہت کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رکھتے۔ وہ اپنے موضوع کا پوری طرح مطالعہ کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی تحقیق اتنی جامع ہوتی ہے کہ پھر مزید تحقیق کی گنجائش نہیں رہتی۔

ان کی تحقیقات، اردو زبان کے متعلق بھی ہیں اور ادب کے تعلق سے بھی۔ دونوں میں ان کا طریقہ استخراجی

(Inductive) بھی ہے اور اشتقاقی (Derivative) بھی۔ یعنی وہ اندرونی اور بیرونی، دونوں ٹواہد (Evidence)

سے کام لیتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ تحقیق میں مبہوت یعنی "ٹھنکی" نہیں پیدا ہونے پاتی بلکہ شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے ان کی تحقیقات "محقق" اور "معلم" سے قطع نظر، عام آدمی

(L y man) کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ ان کے پیش رو اور مابعد کے محققین میں بھی، بحریند کے، بہت کم ہیں، یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ حالی اور آزاد کے پاس شگفتگی ہے لیکن دقت نظر نہیں شبلی کے پاس دقت نظر ہے۔ لیکن شگفتگی کا فقدان ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحقیق، حالی اور شبلی دونوں کا سنگم ہے۔ وہ اپنے اسکول کے آپ بانی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عبدالحق اسکول "کا انثر زیادہ تر جامعہ عثمانیہ ہی کے اساتذہ پر پڑا۔ جنہوں نے میسائے اردو سے فیض حاصل کیا۔ یوں تو مولوی صاحب کے تحقیقاتی کارناموں کی ہزست طویل ہے۔ لیکن مضامین سے قطع نظر، میں یہاں صرف مستقل تصانیف میں ویل کے نوادر قابل قدر ہیں :

(۱) اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام (۲) مرحوم دہلی کالج (۳) نصری (۴) مقدمہ قطب مشتری (۵) سب رس (۶) مقدمہ بارغ و بہار (۷) مقدمہ معراج العاشقین (۸) قواعد اردو (۹) مقدمہ گلشن ہند (۱۰) مقدمہ خطبات گلزار سان دتاسی (۱۱) مرہٹی کا اثر فارسی زبان پر۔

### اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام

مولوی صاحب کی یہ تصنیف بیک وقت سیرت بھی ہے، تذکرہ بھی اور ٹھوس تحقیقی بھی نہ صرف یہ اردو کے آغاز پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ سانیاتی پہلو سے بھی یہ بہت اہم کارنامہ ہے۔ کیوں کہ اس میں نہ صرف اردو کے ابتدائی "ردپ" نظر آتے ہیں بلکہ مسلمانوں کی آئس کے بعد کے ہندوستان کی سماجی و معاشی حالت سے بھی آگہی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ان میں ان بزرگوں کی حیات کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ جنہوں نے اہل بھارت کے ذہنوں کو روشنی بخشی اور ایک نئے سماج کی تعمیر کی۔ تاریخی اعتبار سے یہ کافی اہم ہے۔ کیوں کہ اس نے اردو کی قدامت کو مستحکم کر دیا۔ مواد جمع کرنے کے لیے مولوی صاحب نے کس قدر محنت کی۔ اس کے ہر ورق سے ظاہر ہے۔ نہ صرف انہیں تواریخ کا مطالعہ کرنا پڑا بلکہ بزرگان دین کے ملفوظات اور تصانیف کو بھی کھنگانا پڑا جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اس تصنیف نے اردو کے آغاز کے پہلے نظریوں کو بھی باطل کر دیا۔ کیوں کہ مولوی صاحب نے نویں اور دسویں صدی عیسوی کے نمونے فراہم کیے اور اردو کی اشاعت کے ایک اہم ادارہ (Institution) یعنی صوفیا کی مساعی کو بیان کیا ہے۔

سب رس : دوسرا اہم کارنامہ دکنی شاعر و جہی کی تصنیف "سب رس" ہے۔ مولوی صاحب نے ہی دکنی دور کو کھوج کر نکالا اور ثابت کیا کہ دکنی دراصل اردو ہے۔ ورنہ بہت سے عالموں کو، دکنی کو



اردو ماننے میں شامل تھا جن میں علامہ نیاز فتح پوری بھی شامل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دکنی سے اردو کا دائرہ  
ملانا ایسا ہی ہے جیسا کہ انسان کو بندر کی ارتقا یا فہ شکل بتانا۔ یہ مولوی صاحب ہی کی تحقیق اور تجسس  
تھا جس سے دکنی دور کا پورا ادبی سرمایہ فراہم ہو سکا۔ ان کے جملائے ہوئے دیوں کو ان کے جانشینوں  
ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری اور پروفیسر سید محمد صاحب نے فروزاں و تاباں کیا۔

”سب رس“ مولوی صاحب کی تحقیق کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ سب سے پہلے مولوی صاحب نے کتاب  
کا ماخذ ڈھونڈا ہے اور بتایا ہے کہ یہ وجہی کا ابھی کارنامہ نہیں بلکہ فارسی قصہ ”حسن و دل“ کا ترجمہ ہے۔  
پھر انہوں نے قصہ ”حسن و دل“ کے مختلف نسخوں سے جن میں نظم و نثر دونوں اصناف شامل ہیں، بحث کی ہے  
بعد میں وہ وجہی کے زمانے اور اس کے حالات کی تحقیق، اسی تصنیف کے اندرونی شواہد (Internal  
Evidences) سے کرتے ہیں۔ آخر میں نفس قصہ سے بحث کی ہے، جو فلسفیانہ نقطہ نگاہ کی حامل ہے۔ یہ  
بحث بہت دلچسپ ہے۔ ساتھ ہی مولوی صاحب کا انداز بیان اتنا لکھنؤ اور سلیس ہے کہ تحقیق کی خشکی  
محسوس نہیں ہونے پاتی۔

### مقدمہ قطب مشتری :

اس کے بعد مولوی صاحب نے اسی مصنف کی دوسری تصنیف ”قطب مشتری“ کا سراغ لگایا ہے  
اور اس میں خشک نہیں کہ قطب مشتری بیک وقت تحقیق بھی ہے اور تنقید بھی کیوں کہ فرہنگ میں انہوں  
نے متروک دکنی الفاظ کی شرح کی ہے۔ بلکہ نظم کے محاسن شعری کی وجہی کے نقطہ نظر سے وضاحت بھی کی  
ہے۔ یہ اتنی جامع ہے کہ بعد کے آنے والے علماء اور معلم، شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔

### نصرتی :

دکنی دور ہی کے متعلق ان کا معرکہ الآرا تحقیقی کارنامہ ”نصرتی“ ہے جس میں نصرتی کی شاعری کے جملہ  
اصناف، قصائد، مثنوی، غزل، رباعی، مرثیوں وغیرہ کا جائزہ لیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس ہمد کے بہت  
سے واقعات کی تفصیل بھی اسی کی تصانیف کے حوالے سے دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کے لیے  
انہیں پورے عادل شاہی دور کی توارخ دیکھنی پڑی ہوں گی اور معاصر شعرا کے کارنامے دیکھنے پڑے  
ہوں گے۔ مرض مولوی صاحب کی ایک ادنیٰ تصنیف بھی کئی سو کتابوں کے مطالعے، تفحص و تحقیق کا نتیجہ  
ہوتی ہے۔ اس محنت و کدوکاوش کی قیمت کو پُر لطف انداز بیان اور بڑھادیتا ہے۔ مثلاً ”سب رس“



کے دیباچے میں وجہی کے متعلق لکھتے ہیں :

ملا صاحب نے نظام کو اسے ایسے پیش کیا ہے کہ جیسے ان کی تصنیف ہو۔ لیکن دراصل یہ

.... فارسی مصنف کا ترجمہ ہے۔

### مرحوم دہلی کالج :

بھی اسی نوعیت کی تحقیق ہے۔ اس میں مولوی صاحب نے انگریزوں کی آمد کے فوری بعد کے نثری

اور علمی کارناموں کا اور ان مصنفین کا حال بیان کیا ہے جنہوں نے اردو میں ٹھوس کارنامے پیش کیے۔ مثلاً

ماسٹر رام چند جنہوں نے پہلی مرتبہ اردو میں ریاضی جیسے مشکل فن کو روشناس کروایا۔

### متذکرہ نگار ہند :

مرزا علی لطف کا تحریر کردہ ہے جو فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں شامل تھے۔ اس پر مولوی صاحب

نے بڑی دقت اور محنت سے پیش لفظ لکھا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مصنف کی کوتاہیاں اور لغزشیں بھی

واضح کی ہیں۔ مصنف نے جہاں کسی شاعر یا ادیب کے حالات میں غلطی کی، وہاں مولوی صاحب نے

دوسرے تذکروں سے مقابلہ و موازنہ کر کے اصلاح کی ہے۔ اسے اردو میں تحقیق در تحقیق کہہ سکتے ہیں

یعنی انہوں نے صرف مواد کی پیش کش پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مواد کو بھی کھوجا اور جانچا ہے۔

### مقدمہ معراج العاشقین :

ان سب سے اہم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے قلمی رسالے معراج العاشقین کی دریافت اور اس کی

اشاعت ہے۔ خواجہ صاحب کے اردو رسائل کے متعلق بڑے شبہات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ خود مولوی صاحب

نے بھی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ڈرتے ڈرتے اس گتھی کو سلجھایا ہے۔ مگر ان کا قیاس ہی آنے والے علماء

کے لیے "یقین" بن گیا۔ اور اردو کے تسلسل کی ابتدائی گڑیاں جو گم گشتہ تھیں، پھر سے جڑ گئیں۔ درہ بعض انگریز

اور ہنگالی علماء کی تحقیقات نے اردو کی ابتدا کو بہت پیچھے لا ڈالا تھا اور وہ کھڑی بولی کے روپ، ہندی کا

مابعد روپ سمجھی جاتی تھی۔ کم از کم اس سے یہ مسلم ہو گیا کہ کھڑی بولی کے وہ علاحدہ علاحدہ ارتقا پائے

ہوئے روپ، اردو اور ہندی ہیں۔ کیوں کہ ان کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔ یہ نہیں کہ ہندی کے بعد اردو

کا ارتقا ہوا۔ یہ دریافت بجائے خود ایک عظیم تحقیق تھی جس نے دوسروں پر تحقیق کے راستے کھول

## مقدمہ یاغ و بہار

قصہ چہار درویش کا ایک ترجمہ عطا حسین خاں تحسین نے "نوطرز مرصع" کے نام سے کیا تھا لیکن یہ اپنے مرصع اسلوب کی وجہ سے مقبول نہیں ہو سکا۔ میرامن نے سلیس اور با محاورہ اسلوب میں لکھ کر جدید نثر کی گویا داغ بیل ڈالی۔ اس طرح مولوی صاحب نے اس کتاب کو شائع کر کے نثر کے سادہ اسلوب کو رواج دیا۔ ساتھ ہی وہ اردو، ہندی کے تعلق سے بڑی پستے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔

## لکات الشعراء

میر کے تذکرہ پر مولوی صاحب کی تحقیق اپنی نوعیت کی آپ ہے۔ اس میں بھی تحقیق پر تنقید کا رنگ غالب ہے۔ میر نے جن شعرا کا تذکرہ اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ مولوی صاحب نے مقدمے میں ان لکھنے والوں کے متعلق بھی اشارے کیے۔ ساتھ ہی میر کے زمانے اور ان کے حالات زندگی کو بڑی محنت سے یکجا کیا اس تذکرے کے علاوہ مولوی صاحب نے قدیم شعرا کے اور بھی کئی تذکرے چھاپے۔ ادب کے علاوہ اردو زبان کی قواعد کی تدوین مولوی صاحب کا شاندار تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں اردو حروف، تہجی، اردو افعال اور ادو صرف و نحو کا جس طرح مولوی صاحب نے مطالعہ کیا ہے، وہ اردو لسانیات کے متعلم کے لیے مشعل ماہ ہے۔ یہ اردو کی بڑی جامع اور مانع قواعد ہے۔ اس کے بعد، یوں تو بہت سی قواعدیں لکھی گئیں لیکن سب قواعد نویسوں نے اس کی خوشہ چینی کی اور ان ہی کے فراہم کردہ مسائل سے عمارت تعمیر کی۔ اسی نوعیت کی تصنیف "مرہٹی کا اثر فارسی زبان پر" ہے، جو بڑا اچھا لسانیاتی مطالعہ ہے۔ "خطبات عبدالحق" میں اکثر جگہ مولوی صاحب نے محققانہ رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ بھی اردو کے تحقیقاتی ادب کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مولوی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ نہ صرف وہ خود تحقیق کے رسیا ہیں بلکہ اپنے طالب علموں میں بھی تحقیق کی لگن، لگا دیتے ہیں۔ اس کی مثال مرحوم شیخ چاند، پروفیسر عزیز بڑا احمد، ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں ہیں۔ متذکرہ بالا اصحاب بھی میدان تحقیق میں یکتا ہیں۔

مختصراً اردو زبان جب تک زندہ رہے گی اس کے متعلم، اس محقق اعظم کو فراموش نہیں کر پائیں گے جس نے اردو کو نہ صرف آن بختی بلکہ "جان" بھی دی اور صحیح معنوں میں وہ مسیح ہے۔

# مولوی عبدالحق اور ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی مراحل و منازل پر اردو کے جن بزرگ و شہرت یافتہ ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کے سرپرہ ہاتھ رکھا اور اسے اپنی علمی و علمی سرپرستی سے نوازا ان میں پریم چند، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کا نام بہت اہم ہے۔ پریم چند، حسرت موہانی جوش ملیح آبادی ہی سے سماجی، باغی اور انقلابی تھے اور ان کے افکار و تخلیقات کے سلسلے میں تقریباً ایک رائے اور شناخت قائم ہو چکی تھی چنانچہ ان بزرگوں کی شرکت اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور پر دستخط کر دینا زیادہ تجرّ آمیز نہ تھا لیکن مولوی عبدالحق ایسے بزرگ ضرور تھے جن کی سرپرستی اور وابستگی کو اکثر مسرت اور کہیں کہیں حیرت کی نظر سے دیکھا گیا۔ خود سجاد ظہیر نے اپنی کتاب روشنائی میں، انجمن ترقی پسند مصنفین کے تئیں جہاں ان کی شفقت، سرپرستی اور اہول پسندی کو سنہرے حروف میں لکھا ہے اور ان کی اردو دوستی۔ ادب دوستی کی خوب خوب تعریف کی ہے تو ساتھ ہی اردو اور انجمن ترقی اردو کے تئیں ان کے مخصوص نقطہ نظر اور غیر جمہوری انداز فکر پر بھی روشنائی خرچ کی ہے جس کی روشنی میں مولانا کی متضاد شخصیت ابھرتی ہے اور شاید یہ تضاد مولانا میں تھا اور تضادات سے تو صرف مولانا ہی کیا اس عہد کے تقریباً تمام اکابرین مبرا نہ تھے خواہ وہ اقبال ہوں یا ٹیگور۔ حسرت پر یہ الزام تو اور بھی آسانی سے لگا دیا جاتا ہے، عظیم فن کاروں میں یہ تضادات اکثر مل جاتے ہیں۔ اس مضمون میں مولانا کے تضاد سے تھوڑی دیر نظر بھاگے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کی حقیقی معنوں میں دلچسپی اور وابستگی کا اظہار مقصود ہے اور اس اظہار کے حوالے سے مولانا کی باریش اور شیردانی میں بند شخصیت کو اردو کے قدامت پرست اور روایتی ادیب کے کھانچے سے نکال کر ان کی صاف اور بے باک شخصیت کا ایک اور زاویہ پیش کرنا ہے۔ جو کہیں بابائے اردو کے خطاب، انجمن ترقی اردو کی لازوال خدمات اور کہیں اردو کی مشرقی روایت اور سیاست کے تلے دب گیا اور ترقی پسند تحریک کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود خود مولانا اور تحریک دونوں کا لوٹ حصہ نہ بن سکا جب کہ وہ اس انجمن کی



ابتدائی تعمیر و تشکیل کے ہر مشکل قدم پر ساتھ رہے اور حقیقی معنوں میں اپنے اور پختل فکر و خیال سے آراستہ کرتے رہے اور راہیں ہموار کرتے رہے۔

ترقی پسند تحریک کو جنم دینے والے ان چند و شیعے اور باغی قسم کے نوجوانوں کی حمایت کا پہلا اعلان تو مولانا نے ایک طرح سے اسی وقت کر دیا جب ۱۹۳۲ء میں انگارے شایع ہوا اور اس کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے اور بات اتنی بڑھی کہ رجعت پرستوں نے مسجدوں کے خلاف زولیشن پاس کیے۔ مولانا بعد ازاں دریا آبادی تو باقاعدہ خم ٹھونک کر ترقی پسندوں کے خلاف سامنے آ گئے۔ قتل کی دھمکی دی جانے لگی اور بات اتنی بڑھی کہ بالآخر صوبہ متحدہ کی حکومت سے انگارے ضبط کر دی گئی۔ اس ہنگامہ خیزی اور خوف و ہراس کے لمحوں میں جب خود کہانیاں لکھنے والوں میں سے بعض سہم گئے اور گوشہ نشین ہو گئے۔ کچھ اور ترقی پسند ادیب اپنی سرکاری ملازمتوں اور کچھ دوسری مصلحتوں کی وجہ سے خاموش ہو گئے ایسے میں مولوی عبدالحق نے اپنے رسالے اردو اور دیانرازن نگم نے زمانہ میں باقاعدہ انگارے پر ستائشی تبصرے شایع کیے۔ افسوس کہ تنگی وقت کی وجہ سے مجھے وہ تبصرہ دستیاب نہ ہو سکا ورنہ وہ مولانا کی حق پرستی اور خورد نوازی کے اچھے ثبوت فراہم کرتا۔ پروفیسر قمر رئیس ضرور ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”نو کہانیوں کا یہ مجموعہ صرف ۳۲ صفحات پر مشتمل تھا اور ایک ہزار کی تعداد میں نظامی پریس لکھنؤ سے شایع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق کے رسالے اردو اور دیانرازن نگم کے زمانہ میں اس پر جو ستائشی تبصرے ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف نوجوانوں نے اس باغیانہ تصنیف کو بیک کہا بلکہ محتاط اور اعتدال پسند ادیبوں نے بھی کھلے دل سے اس کی توصیف افزائی کی۔“ (اردو افسانے میں انگارے کی روایت)

۱۹۳۵ء میں لندن سے باقاعدہ واپس آنے کے بعد جب سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کے لیے باضابطہ عمل پیرا ہوئے تو الہ آباد میں اپنے گھر پر باقاعدہ ایک میٹنگ کی۔ ہندوستانی اکادمی الہ آباد کی ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے پریم چند۔ جوش اور مولوی عبدالحق، ان دنوں الہ آباد میں تھے ادنیٰ تینوں حضرات بقول سجاد ظہیر — اپنے ادبی وقار اور بزرگی کے لحاظ سے اردو زبان میں اس وقت ان سے بڑھ کر اور کون ترقی پسند تھا۔“

سجاد ظہیر اور رشید جہاں کی دعوت پر ان تینوں حضرات نے اس میٹنگ میں شرکت کی ظاہر ہے



ان سب کی شرکت سے وہ ایک بے حد دلچسپ، یادگار اور تاریخی میٹنگ ثابت ہوئی۔ اس میٹنگ کی مختصر روداد سجاد ظہیر کے لفظوں میں ملاحظہ کیجیے۔

”ہم نے کافی ڈرائنگ اور جھجک کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ کچھ چوٹا منہ اور بڑی بات معلوم ہوتی تھی کہ ہم ان بزرگوں سے ترقی پسند ادب کی تحریک کے مجوزہ مقاصد اور تنظیم کی گفتگو کریں۔ ایسی صورت میں مینی فیسٹو کا مسودہ ہمارے بڑے کام آیا۔ ہم نے اس کی ایک ایک کاپی سب کو پڑھنے کے لیے دے دی۔ مولوی صاحب اپنی صاف گوئی کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے اسے پڑھ کر فوراً کہا: ”یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن آپ چاہتے کیا ہیں؟“ میں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اگر آپ سب اس سے متفق ہیں تو اس پر دستخط کر دیں ہم ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں سے اس پر دستخط کر کے شایع کریں گے۔“ مولوی صاحب نے فوراً قلم اٹھا کر اپنے دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد اور صاحبوں نے بھی دستخط کر دیئے۔ مولوی صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی نوجوان کسی بڑی اور اچھی ادبی اسکیم کو لے کر ان کے پاس جاتا ہے تو ہمیشہ اس سے کہتے ہیں کہ بڑا اچھا خیال ہے اس پر ضرور عمل کرو لیکن تجربے نے بتایا ہے کہ زیادہ تر ایسے لوگ ٹھوس کام سے گھبراتے ہیں علم و ادب بڑے جان لیوا آقا ہیں۔ ان کی پی خدمت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ چناں چہ انھوں نے ہمیں یہ نصیحت کی کہ اعلان شایع کرنے، انجن بنانے اور جلے کرنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم اس ادب کی تخلیق کے لیے محنت کریں جو ہمارے نزدیک صحیح اور ضروری ہے۔“

(روشنائی سے ماخوذ)

اس اقتباس کے آخری جملے میں مولوی عبدالحق کی گراں قدر نصیحت پوشیدہ ہے اور جو مولوی صاحب کی ترقی پسند اور پریکٹیکل ایپروچ کی غمازی کرتا ہے اور جہاں اس مینی فیسٹو پر اس عہد کے سربراہ اور وہ ادیبوں نے دستخط کرنے میں ہچکچاہٹ برتی یا میں نے نکالا وہاں مولوی صاحب کا فرادہ دستخط کر دینا اور پریم چند و قوش جیسے ادیب و شاعر کی موجودگی میں زبان و ادب اور سماج اور معاشرے کے لیے کچھ کر دکھانے کے لیے ٹھوس کام کی نصیحت کرنا مولانا کی جرات، فعالیت اور روشن خیالی میں ثبوت فراہم کرتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ پریم چند اور قوش نے کوئی نصیحت نہیں کی یا مولانا کی نصیحت کے بعد مزید کسی نصیحت کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ سجاد ظہیر کے یہ تاثرات

معمولی نہیں ہیں۔ ان میں مولانا کی ترقی پسندی کا برملا اعلان تو ہے ہی ساتھ ہی ان کی عظمت اور بزرگی کا بھی جس نے انھیں پریم چند اور جوش کے منصب پر پہنچا دیا تھا۔

اس میٹنگ اور اس انجمن سے مولانا کی وابستگی، مولانا کی فراخ دلی اور روشن خیالی کا ثبوت تو پیش کرتی ہی ہے ساتھ ہی انجمن کی آزاد خیالی اور جمہوریت پسندی کا بھی ثبوت پیش کرتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ ابتداء سے ہی اس میں ہر طرح کے عقائد کے لوگ تھے۔ مولانا کی شرکت اور حمایت۔ ادب اور ادبی تحریک کے درمیان ایسے ہی سلجھے ہوئے صحت مند تصور کی خوب صورت مثال تھی۔

ان بزرگوں کی سرپرستی نے نوجوانوں کے حوصلے بلند کر دیے اور انھوں نے اس میٹنگ کے فوراً بعد ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی شاندار اور یادگار کانفرنس منعقد کی — کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ مولوی عبدالحق جنھوں نے انجمن کی پہلی نشست میں پورے زور شور سے دلچسپی لی اور اپنی خوشی و رضامندی کا اظہار کیا وہ فوراً بعد ہونے والی اس پہلی اور تاریخی کانفرنس میں شرکت کیوں نہ کر سکے۔ سجاد ظہیر نے اس کانفرنس کی روداد انتہائی تفصیل سے لکھی ہے لیکن اس تفصیل میں وہ ان تین بزرگوں میں سے مولوی عبدالحق اور جوش کی عدم شرکت کی وجہ نہ لکھ سکے۔ بعد میں ان کی وابستگی کو دیکھتے ہوئے اس عدم شرکت کو محض اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

لکھنؤ میں انجمن کی پہلی کانفرنس ہوئی اور بے حد شاندار ہوئی جس نے پورے ملک کے ادیبوں و شاعروں اور دانشوروں کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور اس سے زیادہ سوچنے پر مجبور ہوئی اس وقت کی انگریز حکومت — جس کے سامنے تمام دانشوروں کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا اور علاقائی مخالفت و آزادی کی حمایت میں متحد ہونا ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا — چناں چہ ان کو جو کرنا تھا انھوں نے کیا۔ مرکزی خفیہ پولیس نے اپنا کام دکھایا۔ انجمن اور ترقی پسند ادیبوں کے خلاف اس وقت کے معروف اخبار اسٹیٹس مین STATESMAN میں دو مضامین ایسے چھپے جس میں ترقی پسند نقطہ نظر کا سخت مخالفت کی گئی اور اس انجمن کو غیر مذہبی، غیر تہذیبی سماج دشمن، ملک دشمن وغیرہ قرار دیا گیا اور ہوشمند ادیبوں کو ان سے خبردار رہنے کو کہا گیا۔ ان مضامین کی تلخی بلکہ دھمکی سے بڑے بڑے ہل گئے اور خاص طور پر وہ جو سرکاری ملازم تھے۔ ترقی پسندوں پر سخت آزمائش کا وقت پڑا خاص طور پر اس وقت جب خود ان کی صفوں میں درار یہ بڑھنے لگیں۔ اس نازک مرحلے پر بھی ان نوجوانوں نے صبر اور حوصلے سے کام لیا۔ مضامین کے جواب دیے گئے نظریات کو واضح کیا گیا۔ مقاصد

مزید روشن ہوئے اور پھر تھوڑے سے تزلزل کے بعد وہ یہ محسوس کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ  
 ”یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انگریز سامراجیوں کے اس حملے سے ہماری تحریک  
 کو نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہوا۔ ملک کے وہ مقتدر ادیب جنہوں نے ہماری تحریک کی سرپرستی  
 کی تھی۔ پریم چند، جوش، عبدالحق، قاضی عبدالغفار وغیرہ، اس قسم کے الزامات سے جیسے کہ  
 ان مضامین میں کیے گئے تھے، اگر متاثر بھی ہوئے تو تحریک کے حق میں ہی۔ وہ جانتے تھے کہ  
 یہ جلد محض نوجوان ترقی پسندوں پر نہیں بلکہ بالواسطہ ان پر اور تمام محب وطن لکھنے والوں پر تھا۔“  
 (روشنائی)

اس لمبی گفتگو سے کام کی بات یہ نکلتی ہے کہ ایسے نازک وقت پر ان ادیبوں کا ساتھ دینا جو غیر سرکاری ملازم تھے  
 اتنی حیرت کی بات نہ تھی۔ لیکن سرسید اسکول کے پروردہ، انگریزوں اور نوابوں وغیرہ کی حمایت و عنایت  
 سے اردو کی خدمت کرنے والے اور پوری زندگی کو ایک خاص مشن سے چلانے والے مولوی عبدالحق نے اس وقت  
 بھی ترقی پسندوں کے مشن اور انگریز دشمنی میں برابر سے شریک رہے یہ ضرور مقام حیرت ہے اور مقام شہر  
 بھی اور یہ ہیں سے اصل عبدالحق کو یا عبدالحق کے اصل مشن کو سمجھنے اور پہچاننے کا ایک نیا سرا ہاتھ آتا ہے جسے  
 ہم نے مدتوں سے پھوڑا دکھا ہے۔

مولانا کی اسی جرأت اور حمایت کا نتیجہ تھا جب ۱۹۳۴ء میں الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری  
 کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں بجائے ایک صدر کے تین افراد پر مشتمل صدارتی ٹیم کا اعلان کیا گیا۔  
 سنسکرت کے عالم اور سوشلسٹ لیڈر آچاریہ نریندر دیو اور ہندی کے نامور شاعر اور گیت کار رام تریش تریپاٹھی  
 اور اردو کے مولوی عبدالحق۔ ظاہر ہے کہ یہ انتخاب، یہ اعزاز انہیں حسرت، جوش، قاضی عبدالغفار جیسے مقتدر  
 ادیبوں کی موجودگی میں ملا اور محض ان کے سچے اور کھرے۔ بے خوف اور بے باک ہونے کی وجہ سے ملا۔ یہ الگ  
 بات ہے کہ یہ ان کی اور انجمن دونوں کی بدقسمتی تھی کہ وہ عین کانفرنس کے دنوں بیمار ہو گئے اور اس میں  
 شرکت نہ کر سکے لیکن انہوں نے اپنا صدارتی خطبہ بھیجا جو پڑھا گیا اور جو یقیناً ایک یادگار خطبہ ہے۔ اس میں وہ  
 بہت صاف طور پر کہتے ہیں کہ

”ہمارے اصول اور عقائد، ہمارے خیالات کیسے ہی اعلیٰ اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں اور خواہ ہمیں  
 وہ کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں اگر زمانے کے اقتضا کے مطابق ان میں جدت اور تازگی پیدا نہیں



کی جائے گی تو ایک روز بند پانی کی طرح ان میں سڑاؤ پیدا ہونے لگے گی اور ان میں ایسے زہریلے جراثیم پیدا ہو جائیں گے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔“

آگے لکھتے ہیں :-

ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ وہ گزشتہ ادب کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ کن چیزوں کا ترک کرنا مناسب ہے اور کن فرائع سے اسے بلند مقام پر پہنچانے کی ضرورت ہے کیوں کہ جو چیز آپ کو درائنات ہے اگر آپ اس کے حق و قبح سے واقف نہیں تو اصلاح کس کی اور انقلاب کیسا — ہم صرف حال ہی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں آئندہ کے بھی جواب دہ ہیں۔ اس لیے زندگی کے جس شعبے میں ہاتھ ڈالیں ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہمارے اعمال و افعال کا اثر آئندہ نسلوں پر کیا ہوگا۔ کیوں کہ آئندہ زمانے میں ہمارے کاموں کی تنقید و تنقید اسی اصول پر ہوگی۔“

ایک جگہ اور لکھتے ہیں :-

ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں آنے کے لیے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرات سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آپ نے مقبولیت یا ہر دل عزیز یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے کے لیے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میدان ظاہر کیا تو یاد رکھیے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے۔ . . . رجعت پسندی کے بل پر کھڑے ہونے سے بہتر ہے کہ آپ کھڑے نہ ہوں۔“

ان تحریروں میں مولانا کی علم و ادب کے تئیں ان کا سچا ایمان و عرفان۔ احساس و آگاہی جھلکی پڑتی ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی بزرگی یا شفقت کی نیت سے محض نوجوانوں کو خوش کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا سے وہ اپنی بات کہتے نظر آتے ہیں۔ جس سے ان کی اپنی اور بھل فکر کا عکس صاف دکھائی پڑتا ہے۔ اور اصلاً مولوی صاحب کا سچا اور کھرا روپ سامنے آتا ہے۔ مولوی صاحب کی اسی ہمت افزائی اور رہنمائی کے تحت ہی سجاد ظہیر نے پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ مولوی صاحب کی عظمت اور قدر و قیمت کے بارے میں چند صفحہ ترقی کیے جس کا چند سطریں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

مولوی عبدالحق کی ذات ہماری ادبی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اردو زبان کی ارتقا کی



تاریخ میں ان کی ایک مستقل جگہ ہے۔ مولوی صاحب کی شخصیت میں دل چسپی اور دلکشی ان کی مختلف اور متضاد خصوصیتوں کے سبب سے ہے۔

وہ علی گڑھ یونیورسٹی اور علی گڑھ تحریک کی سرسید احمد خاں اور مولانا حالی کے زمانے کی ان روشن خیال روایت سے وابستہ ہیں جن کے برے انیسویں صدی کی انگریزی فلسفیانہ آزاد خیالی سے ملتے جلتے چناں چہ وہ مذہبی ایجابیت کی اس تحریک کو ناپسند کرتے ہیں جو مولانا شبلی کے زیر اثر علی گڑھ اور شمالی ہند کے مسلمانوں میں جاری ہوئی۔ . . . وہ چاہتے ہیں کہ جدید آزاد فکر اور جدید سائنس کے خیالات اردو کے ذریعہ زیادہ۔ زیادہ ملک میں پھیلیں۔ ملاحیت اور مذہبی تعصبات اور تنگ نظری کے وہ سخت مخالف ہیں اور اس لحاظ سے ان کا مولوی کا لقب بالکل ناموزوں ہے۔ . . . وہ جدید اشتراکیت کے علمی فلسفہ کو بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں چناں چہ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے ڈاکٹر محمد اشرف کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے معاوضہ دے کر اس کام پر متعین کیا کہ سوشلزم کی ایک علمی اور مبسوط تاریخ لکھیں۔ . . . پاکستان آنے کے بعد اور اس ضعیفی کے عالم میں بھی مولوی صاحب نے اپنی اس آزاد خیالی کے مسلک کو ترک نہیں کیا تھا چناں چہ کربھی کی رجعت پرست فضا میں بھی جب روسی ادب کا نام لینا ہی خطرناک سمجھا جاتا ہے انھوں نے تین سال ہوئے ”یوم میکسم گورکی“ کے جلسے کی صدارت کی۔ . . . انھوں نے ادیبوں کو گورکی کی ادبی عظمت اور حقیقت نگاری کی پیروی کرنے کی تلقین کی۔ جب پنجاب گورنمنٹ نے لاہور کے ترقی پسند سالوں ادب لطیف۔ سویرا اور نقوش کو ایک جنبش قلم سے بند کر دیا تو اس کے حکم کے خلاف پاکستانی ادیبوں کے ساتھ احتجاج نامہ پر انھوں نے بھی دستخط کیے اور جب ۱۹۵۲ء کے پر آشوب حالات میں پاکستان ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل پاکستان کانفرنس کراچی میں ہوئی تو پھر مولوی عبدالحق نے عبدالمجید سانک کے ساتھ اس کی صدارت کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے ان کی دلچسپی اور ہمدردی اس کے آغاز سے لے کر آج تک بدستور قائم ہے۔“

(روشنائی)

اور یہ سچ ہے کہ پاکستان میں عرصہ دراز سے معطل رہنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں جب انجمن کی دوسری کانفرنس ہوئی تو

مولوی صاحب نے باقاعدہ اس کی صدارت کی اور خطبہ صدارت پیش کیا۔ اس خطبہ میں پندرہ سال کی مدت، تجربہ مشاہدہ اور بزرگی کا لہجہ بولتا دکھائی دیتا ہے۔ اس خطبے میں وہ کہتے ہیں کہ

”ترقی پسند مصنفین کی انجمن، اس کی پیدائش میرے سامنے ہوئی اگرچہ اس کے بننے میں میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ شروع شروع میں اس کا بڑا زور و شور تھا اور ترقی پسند خود پسند ہو گئے تھے اور بہت خود سر تھے۔ ان خود سر لانی بھکڑوں نے رجعت پسندوں کی بہت خبر لی وہ بھی جلدے اور انھوں نے بھی ان کی خبر لی اس زمانہ میں سب کو بڑی حیرت تھی کہ یہ کیا طوفان پیدا ہو گیا ہے۔ خیر یہ ہوتا رہا۔ جب انھوں نے ان پر حملہ کیا تو ان کے مویدین نے ان پر حملہ کیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ رجعت پسندوں کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے کہا کہ ہم اپنی اصلاح کرتے ہیں اور انھوں نے بھی ادب کی خدمت کی۔ اس میں شک نہیں کہ شروع میں ترقی پسند ادیبوں میں بعض نقائص تھے جو ناگوار گزرتے تھے اور اس کی وجہ سے یہ بہت نامقبول ہو چکے تھے لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی اصلاح کی ان چیزوں پر متنبہ ہوئے اور انھوں نے رفتہ رفتہ ترک کیا۔۔۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ہمارے ادب کی خدمت کی ہے اور اس کا درجہ بلند کیا۔ وقار کو بڑھایا اور ادب میں وسعت پیدا کی اور خاص کر تنقید میں ان کا کام نہایت قابل قدر ہے۔“

قدیم تہذیب و ادب کے علمبردار مولوی عبدالحق پورے پندرہ سال بعد اپنی عمر کی انتہا پر بھی ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کی حمایت کی یہ الگ بات ہے کہ اس خطبے میں بزرگی اور نصیحت زیادہ بولتی نظر آتی ہے، ایسا فطری بھی شاید انھیں اس بات کا احساس تھا کہ ترقی پسندوں کے درمیان انھیں آئندہ بولنے کا موقع ملے یا نہ ملے جس کا انھوں نے اظہار بھی کیا ہے چوں کہ مولانا بذات خود زبان و ادب کے مرد مجاہد تھے۔ جنون کی حد تک کام کرتے تھے اس لیے وہ ترقی پسندوں کی بھی اس جنونی کیفیت کو پسند کرتے تھے تبھی تو انھوں نے اپنے خطبے کے اخیر میں کہا تھا کہ

”اُن ترقی پسندوں میں بھی شیطان ہے۔ یہ کام کرنے میں آندھی ہیں، بھوت ہیں، شیطان ہیں اور کبھی کبھی خیطنت بھی کرتے ہیں جو ادب و فن کے لیے ضروری ہے۔“

مولانا کے ارشادات و ہدایات اور ان کی نصیحتیں ترقی پسندوں کے لیے گراں قدر سرمایہ تھیں کم از کم مولوی صاحب

کی زندگی تک تو ترقی پسندوں نے ان نصیحتوں پر عمل بھی کیا مگر سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ  
 ”میرے خیال میں ترقی پسند مصنفین کی پندرہ سال کی تاریخ اس کی شہادت دے گی  
 انھوں نے حتی المقدور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی۔“

لیکن سجاد ظہیر نے ساتھ ہی ایک سوال بھی اٹھایا ہے  
 کاش کہ مولوی صاحب انجمن ترقی اردو میں بھی کسی حد تک سہی وہی جذبہ پیدا کر سکتے جس  
 کی وہ ہماری انجمن سے بجا طور پر توقع رکھتے تھے۔“

سجاد ظہیر کے اس اعتراض کی وضاحت تو انجمن ترقی اردو کی تاریخ میں تلاش کی جا سکتی ہے لیکن مولانا ایسا  
 کیوں نہ کر سکے اس کی وضاحت اگر اس چار روزہ سمینار میں ہو جائے تو دونوں مرقومین کی روح کو کسی حد  
 تک سکون مل سکتا ہے۔

ایک مسئلہ جیسے نوجوان طالب علموں اور ترقی پسندوں کا ہے جس کی طرف ابتدا میں اشارہ کیا جا چکا  
 ہے، عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی کا پورا حصہ جتنا ادب کے لیے وقف کیا اتنا ہی  
 زبان کے مسائل کے لیے بھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ زبان کی ترویج و ترقی اس کی بقا اور ارتقا کے لیے انھوں  
 نے زیادہ ہی ایشار و قربانیاں دیں تو غلط نہ ہو گا۔ ادب و سماج، ترقی پسندی اور رجعت پسندی وغیرہ  
 کے سلسلے میں اتنا واضح تصور، اتنا صاف نظریہ رکھنے اور ابتداء سے انتہا تک ترقی پسند تحریک کی حمایت  
 کرنے والے مولوی عبدالحق زبان کی ترقی، تبدیلی کے لیے وہ عوامی، جمہوری اور پھیلا ہوا تصور کیوں نہ رکھ  
 سکے جیسا کہ ان سے کل کے اور آج کے بھی ترقی پسند توقع رکھتے تھے۔ مثلاً وہ اس بات پر تو فوش  
 ہوتے تھے کہ انگریزوں نے، جان گل کہ سٹ نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے وہ اس بات پر بھی ناز کرتے  
 تھے کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ عثمان علی خاں نے ریاست حیدرآباد سے انجمن ترقی اردو کو عطیہ دیا اور اردو نوازی  
 کا ثبوت پیش کیا۔ لیکن وہ اس عوام کی طرف متوجہ اور مخاطب نہیں ہوئے جس کے کیف و کم اور  
 پیچ و خم کے درمیان زبان پھلتی پھولتی ہے اور جن کے جذبات و احساسات کا اظہار اردو ادب میں اور بالخصوص  
 ترقی پسند ادب میں ہوتا ہے۔ وہ اس تخلیقی ادب کو پسند کرتے تھے، لیکن اپنے قلم میں اور اپنی نگاہ  
 میں وہ وزن نہ پیدا کر سکے خاص طور پر زبان کے سلسلے میں عام طور پر ان کا رویہ غیر جمہوری اور غیر ترقی پسندانہ  
 رہا اور شاید یہی وجہ ہے کہ کم از کم ان کے عہد تک انجمن ترقی اردو بقول سجاد ظہیر اردو سامراج اور اس کی



سیاست سے الگ نہ تھی۔ اسی بنا پر انجمن ترقی اردو اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے درمیان فاصلے رہے اور ترقی پسند ادیبوں کا اس سے کوئی تعلق نہ پیدا ہو سکا۔

مولانا کی عملی زندگی کا یہ تضاد ایک غور طلب امر ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو بھی باعمل ہوتا ہے اس کی کچھ مشکلات بھی ہوا کرتی ہیں۔ مولانا ایک باعمل اور فعال انسان تھے اور ایک ہی وقت میں بہت سارے کام کرنا چاہتے تھے۔ اردو کے لیے وہ اپنی زندگی میں بہت کچھ کر لینا چاہتے تھے اس لیے انہیں یقیناً بہت سارے سمجھوتے بھی کرنے پڑے ہوں گے اور بہت ساری سیاست بھی کرنی پڑی ہوگی ان سے بھی غلطیاں ہوئیں تبھی تو وہ اپنے آخری خطبے میں کہتے ہیں۔

”ایک بات میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ غلطی کو کبھی اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ یہ بہت معمولی چیز ہے۔ سب غلطیاں کرتے ہیں بڑے بڑوں نے غلطیاں کی ہیں۔ اولیاء اور پیغمبروں نے غلطیاں کی ہیں غلطیاں بھی ترقی میں مدد ہوتی ہیں۔ غلطی وہ کرتا ہے جو کچھ کرنا چاہتا ہے اور جو کچھ نہیں کرتا وہ غلطی نہیں کرتا۔“

زبان و ادب کے تئیں ان کے بے پناہ علوم و لگن اور عمل اور جتن سے بال بھر ان کی زندگی کے پیش نظر ان کے بعض عملی تضادات ان کے عملی نظریات پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوئے دکھائی دیتے جو گزرتے ہوئے وقت کی دھول میں مٹتے ہی چلے جائیں گے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشو و نما اور اس کے لالہ پالنے میں جو انہوں نے شفقت و معاونت برقی اور پوری ترقی پسند تحریک کی جس طرح انہوں نے سہولت کی وہ ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی اور ان کے ارشادات و ہدایات کی کل بھی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے اور آج بھی اس کی قدر و قیمت میں کمی نہیں دکھائی پڑتی۔



## بابائے اردو کے رسالے

بابائے اردو مولوی عبدالحق ایک متنوع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اردو کے مرد مجاہد تھے۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں آپ کی خدمات اتنی وسیع اور اتنی مختلف النوع ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں۔ آپ نے اپنی مادری زبان کی اتنی زیادہ اور اتنے طویل عرصہ تک خدمت کی کہ خادم سے مخدوم بن گئے اور بابائے اردو کے لقب سے مشہور ہوئے۔

مولوی صاحب کی خدمات کا اعتراف مختلف نوع سے کیا گیا ہے اور ان کے ہر پہلو سے سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود اب بھی کتنے ہی گوشے ایسے ہیں جن میں ہمارے ناقدین اور محققین کی توجہ کم ہوئی ہے۔ ایسا ہی ایک گوشہ ان کی صحافت اور وہ رسائل ہیں جن کو انھوں نے جاری کیا یا کسی نہ کسی طرح ان سے وابستہ رہے۔ مولوی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی صحافت سے کیا۔ اور زندگی کے آخری مرحلے تک مختلف رسائل سے متعلق رہے۔ اس طرح چھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ تک اپنے خونِ جگر سے صحافت کے وسیلے سے اردو زبان و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مولوی صاحب کا جن رسالوں سے تعلق رہا۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں :

۱۔ افسر ۲۔ اردو ۳۔ سائنس ۴۔ معاشیات

۵۔ ہماری زبان ۶۔ قومی زبان ۷۔ تاریخ و سیاست

ذیل میں ان سب پر تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے۔

### افسر

یہ وہ رسالہ ہے جس سے مولوی صاحب سب سے پہلے وابستہ ہوئے اور جس سے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ اسے مولوی صاحب نے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ خیال

صحیح نہیں ہے۔ اسے افواجِ اصفیہ کے سپہ سالار نواب افسر الملک نے جاری کیا اور ان ہی کی فرمائش پر مولوی صاحب نے اس کی ادارت قبول کی تھی۔

عبداللہ نے ۱۸۹۲ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور تلامذہ اش میں بھی پہنچے جہاں نواب محسن الملک، جو اس زمانے میں ریاست حیدرآباد میں معتمد مالک تھے، تبدیل آب و ہوا کی عرض سے مقیم تھے۔ انہوں نے عبدالحق کی دستگیری کی اور وقتی طور پر اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنایا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد نواب صاحب کا سفارشی خط لے کر وہ حیدرآباد پہنچے۔ اس زمانے میں ریاست حیدرآباد کے مہتمم سکریٹری مولوی عزیز مرزا تھے۔ مرزا صاحب ایک اچھے منتظم ہونے کے ساتھ ادب کا بھی نہایت سحرانوق رکھتے تھے۔ خود صاحب طرزِ نظر نگاہ تھے اہل علم کی قدر کرتے تھے اور ادبی لوگوں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ ہمارے بہت سے ادیب اور شاعر آپ کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے اور آپ کی علم نواری سے مستفیض ہوئے۔ عبدالحق کی بھی آپ نے پندیرائی کی اور اپنے دفتر میں انتظامی امور سے وابستہ کر لیا۔ اسی دوران ان کی ملاقات ریاست حیدرآباد کے کمانڈر ان چیف نواب افسر جنگ سے ہوئی جو اپنی فوجی ذمہ داریوں کے ساتھ، افسر کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکال رہے تھے۔ یہ خالص فوجی رسالہ تھا۔ اس میں فوجیوں کے لیے مضامین اور پریٹک وغیرہ سے متعلق معلومات دی جاتی تھیں۔ افسر جنگ ایک ہی ملاقات میں مولوی عبدالحق کی علمیت اور کام کرنے کی صلاحیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں رسالہ افسر کی ادارت پیش کر دی۔ یہ کام چونکہ مولوی صاحب کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے انہوں نے فوراً اسے قبول کر لیا۔ اسی کے ساتھ افسر الملک نے اپنے قائم کردہ مدرسہ اصفیہ کا انہیں صدر مدرس بھی بنا دیا۔

رسالہ افسر، ۱۸۹۴ء میں جاری ہوا۔ ابتداء میں افسر الملک کے معتد خاص مولوی محبوب حسین نے اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں مولوی عبدالحق اس سے متعلق ہوتے لیکن رسالہ پر ان کا نام بحیثیت ایڈیٹر جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے سے درج ہونا شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں مولانا ابوالہد صابری نے تاریخ صحافتِ اردو (جلد سوم) میں حسب ذیل معلومات فراہم کیے ہیں۔

حیدرآباد سول ملٹری کلب ملک پیٹ سے یہ ماہانہ رسالہ، ۱۸۹۴ء کو نمودار ہوا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر محبوب حسین تھے۔ دو سال بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم مقرر ہوئے یہ رسالہ انگریزی چینی کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس رسالہ میں علمی، اخلاقی، تاریخی

فلسفی، تمدنی اور فوجی مضامین درج ہوتے تھے۔ کتابوں پر ریویو بھی کیا جاتا تھا۔ ہر ماہ سب سے بہتر مضمون کے لیے ایک اشرفی مقرر تھی۔ یہ رسالہ نواب میجر افسر الدولہ سی۔ آئی۔ اے کمانڈر انچیف نظام حیدر آباد کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔

مولانا نے اس کا سالانہ اجرا تو بنادیا لیکن ماہ کا تعین نہ کر سکے۔ اسی طرح ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے تخمینہ لگایا ہے کہ یہ جنوری، ۱۸۹۶ء میں جاری ہوا ہوگا۔ لکھتے ہیں:

”مجھے پانچویں جلد کے دو پہرے ملے ہیں۔ نمبر ۶ اور ۷۔ یعنی مئی اور جون ۱۹۰۱ء کے شمارے۔ ان ہی پرچوں سے میں نے یہ بات متعین کی ہے کہ افسر کی پہلی جلد، ۱۸۹۶ء کی جنوری میں شروع ہوئی ہوگی۔“

بیدار صاحب کا نشانہ یہاں صحیح نہیں بیٹھا۔ دیگر شواہد سے پتا چلتا ہے کہ رسالہ افسر جنوری میں نہیں بلکہ اپریل، ۱۸۹۶ء میں جاری ہوا۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ مولوی صاحب اکتوبر ۱۸۹۹ء میں اس سے متعلق ہوئے۔ اسی ماہ کے شمارے میں منیجر دفتر رسالہ افسر، محمد عطا صاحب کی جانب سے ایک بہت ہی اہم نوٹ شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا:

”... اس کے متعلق تمام خط و کتابت جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے ریسنڈون

مڈلسٹ) ہیڈ ماسٹر مدر سہ آصفیہ ملک پیرٹ سے کرنا چاہیے۔“

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی صاحب اکتوبر، ۱۸۹۶ء میں اس سے وابستہ ہوئے لیکن بحیثیت ایڈیٹر ان کا نام جنوری، ۱۹۰۰ء کے شمارے سے شائع ہونا شروع ہوا۔ مولوی صاحب کے کلی طور پر قبضہ میں آنے کے بعد رسالہ کی ہیئت یکسر بدل گئی۔ اب اس میں علمی اور ادبی مضامین پر زیادہ توجہ دی جانے لگی اور صفحات کی تعداد ۳۲ سے بڑھا کر ۴۸ کر دی گئی اور صرف آٹھ صفحے فوج سے متعلق مضامین کے لیے مختص کیے جانے لگے۔ جنوری، ۱۹۰۰ء کے شمارے کے سرورق پر ”عبدالحق بی۔ اے ایڈیٹر رسالہ افسر“ کی جانب سے ایک اطلاع ضروری، شائع ہوئی جس میں رسالہ کی تبدیلی ہیئت کے بارے میں اہم معلومات دیے گئے تھے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:

رسالہ افسر تین سال سے بہ سرپرستی جناب افسر الدولہ بہادر سی۔ آئی۔ ای کمانڈر انچیف افواج باقاعدہ سرکار عالی و بہ اہتمام کیپٹن نواب ممتاز جنگ بہادر جاری ہے۔ اب تک صرف فوجی



مضامین کے لیے مخصوص تھا لیکن اب جناب ممدوح نے ہالکلیٹ ہمارے حوالے کر دیا ہے اور ہمیں اجازت دی ہے کہ چند صفحہ فوجی مضامین کے علاوہ باقی حصہ کو جیسے چاہیں استعمال کریں۔ چونکہ حیدرآباد میں اس وقت ایک علی میگزین کی بہت ضرورت ہے۔ اس لیے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اسے جہاں تک ممکن ہو ایک اعلیٰ درجہ کا میگزین بنانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۰۰ء سے اس کی ہیئت بالکل بدل دی جائے گی اور اس کے قالب میں علمی روح نظر آئے گی۔ اس میں ہر قسم کے عمدہ عمدہ علمی، تاریخی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین لکھے جائیں گے جن کی اردو زبان کو بے انتہا ضرورت ہے اور جو خاص کر ہمارے ہم وطنوں کے لیے زیادہ مفید ہوں۔ اس غرض سے اس کا حجم بھی بڑھا دیا جائے گا۔ یعنی بجائے ۳۲ صفحے کے ۴۸ صفحے کر دیے جائیں گے جن میں صرفہ صفحے میں فوجی مضامین ہوا کریں گے لیکن یہ فوجی مضامین بھی اس قسم کے ہوں گے جو عام طور پر دلچسپ اور مفید ہوں، بلکہ یہ بھی ایک قسم کے علمی مضامین ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہم نے یہ بھی انتظام کیا ہے کہ ہر ماہ اعلیٰ درجہ کے مضامین کے لیے ایک اشرفی نذر کی جائے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا مولوی صاحب سے قبل مولوی محبوب حسین اس کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یہ تعلیم نسوان، اور شفیق، نام کے دور سالے خود بھی لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ نواب افسر الملک کے دفتر میں بحیثیت مترجم بھی کام کرتے تھے۔ اس لیے رسالہ افسر کے ادارت کی ذمہ داری پوری توجہ اور دلچسپی سے ادا نہیں کر پاتے تھے لیکن چونکہ ان کو تصنیف و تالیف اور طباعت وغیرہ کا تجربہ کافی تھا۔ اسی لیے مولوی عبدالحمید کے مدیر مقرر ہو جانے کے بعد بھی اس نوع کی ذمہ داری ان ہی کے سپرد رہی۔ اور سرورق پر ”مترجم افسر الملک“ محبوب حسین مترجم اسٹاف کمانڈر انچیف سرکار نظام، بدستور شایع ہوتا رہا۔

جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے میں اطلاع ضروری کے تحت اعلان کیا گیا تھا کہ ہر ماہ سب سے اچھے مضمون پر ایک اشرفی بطور انعام دی جائے گی۔ چنانچہ اس کے تحت سب سے پہلا العام سید بنظیر شاہ واری کو ان کی نظم حکمت ظاہری و باطنی، پر دیا گیا۔ یہ نظم جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارہ میں شایع ہوئی تھی۔

مولوی صاحب کی مساعی سے رسالہ افسر کے قلمی معاونین کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا۔ اس کے لکھنے والوں میں نواب افسر الملک اور مولوی محبوب حسین کے علاوہ مولوی قہر اختر، مولوی علی جمیل، نواب عماد الملک



مولانا ظفر علی خاں، مولوی عزیز مرزا، نظیر حسین فاروقی، مولوی چمران علی، نظام الدین حسن، عبدالغنی خاں رافضی جیسے بلند پایہ نثر نگار اور صاحب طرز ادیب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شعر میں حضرت بے نظیر شاہ دارٹی، غلام قادر گرامی اور عبدالغفور شہباز کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولوی صاحب کے زمانہ ادابت میں جو مضامین افسر میں شائع ہوئے ان میں سے اہم مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے:

- ۱۔ دارالعلوم اسلامی از نواب عماد الملک۔ جنوری ۱۹۰۰ء
- ۲۔ سنگتنگ کا استعمال از محب حسین " "
- ۳۔ اشرف المخلوقات از ظفر علی خاں فروری "
- ۴۔ فلسفہ قیافہ از نظیر حسین فاروقی اپریل "
- ۵۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور جدید انتظام از عبدالحق " "
- ۶۔ جنگی تاریخ از محب حسین جون "
- ۷۔ حروف مقطعات و علامات معدنی و آلات تحریر و طبع از نظام الدین حسین " "
- ۸۔ گورنمنٹ از مولوی ذکار اللہ جولائی "
- ۹۔ قوموں کی پندرہ مشہور علامتیں اور نژاد کی نشانیاں اور اسباب از خواجہ غلام ثقلین " "
- ۱۰۔ اردو ناول پر ایک نظر از مولوی عزیز مرزا اگست "
- ۱۱۔ اخلاقی قوت غیر فانی ہے۔ از منور خاں " "
- ۱۲۔ پروفیسر میرزا حیرت کے مختصر حالات " مولوی عبدالحق اکتوبر "
- ۱۳۔ پیرائہ سالی " قطب الدین علی قسلی دسمبر "
- ۱۴۔ مسئلہ ازدواج پر ایک نظر " محمد اختر مئی ۱۹۰۱ء
- ۱۵۔ غوروں کی نسبت سرسید احمد خاں کے خیالات " محب حسین اپریل "
- ۱۶۔ ایک ستارہ پرست قوم " علی شبیر مئی "
- ۱۷۔ مصنفین کی نسبت غائبانہ خیال " عبدالحق جون "

رسالہ افسر میں کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم تبصرہ مولانا جامی کی یادگار تالیف احیاء جاوید پر اردو لٹریچر کی سب سے اعلیٰ کتاب کے عنوان سے مولوی عبدالحق کا ہے۔ یہ تبصرہ کافی

طویل ہے اور اس کی نوعیت ایک روایتی تبصرہ سے بڑھ کر مستقل مضمون کی سی ہے۔ مولوی صاحب نے بڑی تفصیل سے اس میں حیاتِ جاوید کا جائزہ لیا ہے اور اس کے محاسن پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی صاحب کی یہ رائے بڑی دقیق ہے کہ،

مولانا حالی کے طرزِ بیان میں ایک خاص بات ہے جس پر عام طور پر نظر نہیں پڑتی، اسے میں استادِ ضبط سے تعبیر کرتا ہوں جس سے میرا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اس قدر بات کو پھیلاتے ہیں کہ مضمون پھس پھسا اور پھیکا ہو جائے اور لوں ناگوار گزرتے، اور نہ اس قدر مختصر کہ ادھر اور ناقص معلوم ہو، بلکہ نہایت اعتدال کے ساتھ اپنے مضمون کو اس خوبی اور ترتیب سے بیان کرتے ہیں کہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوتا۔ مگر پھر ضبط اس قدر ہے کہ اس کا پھیلاؤ اعتدال سے بڑھنے نہیں پاتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو سرسید کی لایف باوجود اس قدر مواد کے اس خوبی کے ساتھ اتنی ضخامت میں نہ آ سکتی تھی۔ اور باوجود اس کے تحقیق و تنقید کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہمارے موجودہ مصنفین میں صرف مولانا حالی ہی ایک ایسے شخص ہیں جن میں کمرٹی سزم (تنقید) کی قوت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ مولانا حالی سرسید کے سچے قدر داں اور بہت بڑے مداح ہیں مگر ان کی لایف میں انھوں نے انصاف کو مد نظر رکھا ہے۔ نہ بے جا طرف داری کی ہے اور نہ بے جا بدگمانی ہے۔ جہاں انھوں نے غلطی کی ہے اسے صاف ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن جہاں خوبیاں اس کثرت سے ہوں کہ عیب اس کے مقابلے میں ایسے ہیں۔ جیسے پہاڑ کے سامنے رائی کا دانہ، تو وہاں سوائے اس کے کہ خوبیوں کی تعریف اور اس کی مدح سرائی کا جلسے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ سرسید کے احسانات ہماری قوم پر اس قدر ہیں کہ اس کا حق کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔“

مولانا حالی کو یہ تبصرہ بہت پسند آیا۔ انھوں نے مولوی عبدالحق کو اس سلسلہ میں ایک خط بھیجا جس میں اپنے مخصوص انداز میں انکسار سے کام لیتے ہوئے اس تبصرہ کی تعریف کی اور اس پر اظہارِ تشکر فرمایا۔ لکھتے ہیں،

”مئی۔ جون ۱۹۰۱ء کا افسر پنچا۔ اس میں حیاتِ جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بہ تقاضائے محبت تصنیف و مصنف کے حق میں بے اختیار قلم سے ٹپک پڑے ہیں، اگرچہ

میں اپنے تئیں اس کا مستحق نہیں سمجھتا، لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہل ایمان یا رفوشتی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک چھڑک کر بچتا کہتے ہیں۔ . . . حیات جاوید پر آپ کے ریویو کی تعریف محمد کو دینا نہیں ہے درمشل وہی ہوگی ”من ترا حامی بگویم تو مرا حامی بگو“۔

حیات جاوید کے علاوہ جن کتابوں پر افسر میں تبصرے شائع ہوئے ان میں حسب ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

- |                    |                        |              |
|--------------------|------------------------|--------------|
| ۱۔ سیرت رسول       | مصنفہ نظیر حسین فاروقی | جون ۱۹۰۱ء    |
| ۲۔ اختیار الہیامین | حاجی ریاض الدین (مدیر) | اپریل ۱۹۰۰ء  |
| ۳۔ سفر نامہ باندہ  | مصنفہ حسام الدین       | مئی ۱۹۰۰ء    |
| ۴۔ اہارون          | مترجمہ مصباح الدین     | جون ۱۹۰۰ء    |
| ۵۔ سیر ظلمات       | از مولانا ظفر علی خاں  | ستمبر ۱۹۰۰ء  |
| ۶۔ دیوان ہمدرد     | از میر صدیقی مجروح     | اکتوبر ۱۹۰۰ء |

رسالہ افسر کا حصہ نظم بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس میں غزلیات کے مقابلے میں منظومات پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اس میں سب سے زیادہ کلام بے نظیر شاہ ولد فی کا شائع ہوا۔ ان کے علاوہ غلام قادر گرامی کے کلام کو بھی مولوی صاحب نے درخود اعتنا اور لائق اشاعت تصور فرمایا۔

اوایل ۱۹۰۲ء میں رسالہ افسر ابدی نیند سو گیا۔ مولانا حالی نے اس سانحہ کا ماتم ان الفاظ میں کیا:

ہندوستان میں کوئی عمدہ رسالہ نہیں چل سکتا۔ معارف، ادیب، حسن اور دیگر عمدہ عہدہ میگزین چند روز کی ہوا کھا کے فوت بہ فوت راہی ملک عدم ہو گئے۔ پھر افسر کے چنے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا، اس کا رونق اور فروغ چاہنا معلوم ہے۔

۱۔ مکاتیب حالی از عبدالحق (مشمولہ: فروغ اردو۔ حالی نمبر چھٹا) ص ۳۲۸۔ ۳۲۹

۲۔ بحوالہ اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار، از ڈاکٹر عابد رضا بیدار۔ ص ۱۳۲

مولوی عبداللطیف ۱۹۱۳ء میں انجمن ترقی اردو کے معتد عمومی مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انجمن میں از سر نو جان آئی مولوی صاحب نے انتہائی لگن، جانتھانی، اور شب و روز کی محنت سے اس میں نئی روح پھونکی، اسے فعال بنایا اور اس کے دائرہ کار کو وسعت دے کر اسے ملک گیر تحریک بنایا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اعلا اور معیاری کتابوں کی اشاعت کی جانب بھی خصوصی توجہ مبذول کی جس کے نتیجہ میں انجمن کے زیر اہتمام بڑی تعداد میں کتابیں شایع ہونے لگیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے انجمن کی طرف سے ایک علمی اور ادبی رسالے کے اجرا کی تجویز بھی پیش کی جس کو مجلس منتظر نے منظوری عطا کی اور حالات سازگار ہوئے، ہی اسے جاری کرنے کی اجازت دی۔ لیکن کافی عرصہ تک حالات نے مساعدت نہ کی جس کے سبب رسالہ جاری نہ کیا جاسکا۔ ۱۹۱۷ء کی انجمن کی سالانہ رپورٹ میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ:

”اگر ارکان اعانت کی کافی تعداد بہم پہنچ جائے تو ارادہ ہے کہ انجمن کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا جائے جس میں اعلا و سب کے ادبی مضامین لکھے جائیں جن سے اہل ملک کے ذوق میں اصلاح ہو، نیز وہ دوسرے ممالک کی ادبی اور علمی ترقی سے آگاہ ہوں، اپنے ادب پر نظر ڈالیں اور اس میں جان ڈالنے کی کوشش کریں۔ بہت سی علمی اور ادبی بحثیں ایسی ہیں جو کتابوں میں نہیں آسکتیں، وہ اس رسالے کے ذریعہ سے اہل ملک کی خدمت میں پیش کی جائیں علاوہ اس کے انجمن کے مقاصد و اغراض اور اردو زبان کی اشاعت بھی اس سے مقصود ہوگی۔“

اس کے بعد یہ طے کیا گیا کہ اکتوبر ۱۹۲۰ء سے ”اردو“ نام کا دو سو صفحات پر مشتمل ایک رسالہ جاری کر دیا جائے جو سربست سہ ماہی ہو۔ لیکن بعد میں ماہانہ کر دیا جائے۔ مگر اس کے سرورق کا جو بلاک تیار کر لیا جا رہا تھا وہ وقت پھر نہ مل سکا۔ لہذا بحالت مجبوری اس کی اشاعت کو تین ماہ کے لیے موخر کر دینا پڑا اور پھر اکتوبر ۱۹۲۰ء کے جنوری ۱۹۲۱ء میں شایع ہوا۔

”اردو“ کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا، اس کو فروغ دینا اور انجمن ترقی اردو کے اغراض و مقاصد کی ترویج و اشاعت قرار پاریا۔ اس کے ساتھ عوام و خواص میں ادب کا صالح ذوق پیدا کرنا اور ان میں صحیح تنقیدی شعور بیدار کرنا بھی اس کے فرایض میں شامل کیا گیا۔ اور یہ بات حیرت انگیز بھی ہے اور



مرتب افزا بھی کہ تقسیم ملک سے قبل ۲۰ سال تک اور اس کے بعد سے اب تک یہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے مقصد کے تفصیل میں مصروف ہے۔ اس کے مقاصد کی تشریح اور اس کے مشمولات کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے پہلے ہی شمارے میں مولوی عبدالحق نے لکھا تھا:

”سب سے پہلے یہ بتادینا ضروری ہے کہ یہ رسالہ خالص ادبی ہوگا۔ یہ مثل کشکول کے نہ ہوگا جس میں ہر قسم کے رطب و یابس اور اٹل بے جوڑ مضامین بھر دیے جاتے ہیں اور کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔ صرف پیشانی پر اس قدر لکھ دینا کافی ہے ’ادبی‘، ’اخلاقی‘، ’تاریخی‘، ’معاشی‘، ’سیاسی‘ رسالہ میں نے یہ تعریف نہیں کیا۔ ملک کو ایسے رسالوں کی بھی ضرورت ہے۔ مگر انجمن کا رسالہ ادب اور اس کے متعلقات کی حد سے آگے بڑھنا نہیں چاہتا اس پر اکثر صاحبوں نے اعتراض کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ کاغذ کی یہ نادرگب تک چلے گی اور یہ مضمون کب تک مساعدت کرے گا۔“

مولوی صاحب نے اس اعتراض کا مدلل جواب دیا اور فرمایا کہ یہ صحیح ہے کہ اردو زبان و ادب سے متعلق بہت کام ہو چکا ہے تاہم اب بھی ایسے متعدد گوشے باقی رہ گئے ہیں جن پر مزید روشنی ڈالنے اور تفصیل سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ملاحظہ ہو، مولوی صاحب فرماتے ہیں:

”میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان صاحبوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا اور روش عام اس رائے کا باعث ہوئی ہے۔ . . . نظر کوئی نہ کرے تو بہت سے ایسے غزلے ہیں جو ابھی تک پردہ خفا میں ہیں اور جنہیں ہوا تک نہیں لگی۔ . . . کون انکار کر سکتا ہے کہ بہت سے الفاظ اور محاورے ابھی تحقیق طلب ہیں۔ بہت سے ایسے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک بساط قدردانی تک نہیں پہنچا۔“

بہت سی کتابیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشہ گنہامی میں رہ گئیں یا شایع ہوتے ہی ناپید ہو گئیں۔ زبان کا رسم الخط، املا، اور انشاء میں بہت سی باتیں اصلاح طلب اور مشورہ اور بحث کی محتاج ہیں۔ اردو کی تاریخ اور اس کی نشوونما میں بہت سی منزلیں ابھی طے کرنی باقی ہیں۔

شاہراہ زبان سے مختلف شاخیں ایسی پھوٹی ہیں جن کا سراغ لگانا ضروری ہے مثلاً خود اردو اور اس کی بہنیں کس خاندان کی ہیں، ان میں باہم کیا تفادت اور تعلق ہے اور ملک میں اس کا

کیا درجہ ہے...

تنقید جو ادب کی جان اور ذوقِ سلیم کی روئے ورداں ہے۔ ابھی ہمارے یہاں ابتدائی مرحلوں میں ہے۔ اسے صحیح رنگ میں دکھانا بہت بڑا فرض ہے۔ اس کے بغیر ادب کی خدمت ادا ہوتی ممکن نہیں۔

اردو کے بہت سے ایسے محسن ہیں جن کے حالات اور کارنامے ملک کے سامنے پیش ہونے چاہئیں اور خاص کر جو خدمت انھوں نے اردو کی کی ہے اسے وضاحت کے ساتھ دکھانے اور ان کے کلام پر ہمدردانہ تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت باقی ہے۔

اس کے علاوہ غیر زبانوں کے ادب میں ایسے انھوں جو ابھر رہے ہیں جو صاحبِ نظر ادیب اور شائقینِ ادب کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں اردو کے لباس میں پیش کیا جائے تاکہ ہمارے اہل ملک ان کے اسلوبِ بیان، طرزِ تخیل و ادارے مطلب سے حظ حاصل کریں اور متمتع ہوں۔

پھر ایک بات اور ہے کہ بعض انشا پرداز ایسے بلند نظر اور پاکیزہ مذاق ہیں جو اپنے جگر پارے معمول اخباروں اور عام رسالوں کے حوالہ کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے لیے بھی آخر کوئی سامان ہونا چاہیے۔

مختصر یہ کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ رسالہ اردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالا مال ہو کہ شائقینِ ادب اسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں اور اہل ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو اور وہ دن آئے کہ لوگ اس کو ڈھونڈتے پھریں۔

مولوی صاحب اپنے مذکورہ بالا مقاصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔ رسالہ اردو نے اردو میں تحقیق و تنقید کا جو معیار قائم کیا وہ بلاشبہ فقیدِ انثال ہے۔ اس نے ہمارے کاروانِ ادب کے لیے مقدمۃ الجلیش کا کام کیا۔ مولوی صاحب کی یہ خواہش بھی پوری ہوئی کہ وہ دن آئے کہ لوگ اس کو ڈھونڈتے پھریں۔ یہ حقیقت بھی اب کسی سے پوشیدہ نہیں کہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کے سلسلہ میں سب سے زیادہ خواہے اردو میں شایع شدہ مضامین کے ہی دیے جاتے ہیں۔

رسالہ اردو کا پہلا شمارہ علی گڑھ میں مولوی محمد رفیع خاں شہر وئی کے زیرِ اہتمام انٹرنیٹ پر پریس سے

چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے بعد اورنگ آباد میں ہی طبع ہونے لگا۔ ۱۹۳۸ء تک یہ وہیں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۹ء میں انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہو گیا۔ اسی کے ساتھ رسالہ اردو بھی دہلی آ گیا اور دسمبر ۱۹۳۹ء تک یہیں سے طبع ہو کر شائع ہوتا رہا۔ اس طرح جلد ۱ سے جلد ۱۵ تک اورنگ آباد سے اور جلد ۱۶ سے جلد ۲۰ تک دہلی سے شائع ہوا۔

رسالہ اردو نے اپنے مضمولات کا معیار ہمیشہ بلند رکھا۔ مولوی صاحب کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کم تر وجہ کی کوئی چیز کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کرتے تھے۔ رسالے کے مضامین کے لیے بھی ان کا معیار بے حد بلند رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی طویل مدت میں اردو میں ہزاروں مضامین شائع ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی مضمون ایسا نہیں ہے جسے ہم دوسرے درجہ کا کہہ سکیں۔

۱۹۴۰ء تک 'اردو' میں تازہ مطبوعات پر تبصرے بڑی پابندی سے شائع ہوتے تھے۔ رسالہ کا چھ بڑا دلچسپ اور خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ یہ تبصرے بڑے جاندار اور غیر جانبدار ہوتے تھے۔ دراصل جس طرح مولوی صاحب نے کتابوں پر مقدمے لکھ کر مقدمہ نگاری کی کو ایک مستقل فن اور ادبی صنف کی حیثیت عطا کی۔ اسی طرح انھوں نے اردو میں تبصرو نگاری کو بھی نئی جہت عطا کی اور اسے فن و وقار بخشا۔ ان تبصروں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان مطبوعات کا محض تعارف کرانے پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا، نہ ہی ان میں صرف تعریف و توصیف ہوتی تھی بلکہ ان میں تصویر کے دونوں رخ پیش کیے جاتے تھے۔ اور بڑی تفصیل سے ان کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی جاتی تھی اور اس طرح غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تبصرہ نگاری کا حق ادا کیا جاتا تھا۔

رسالہ اردو اپریل ۱۹۴۰ء تک ہندوستان سے پابندی کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس کے بعد تقسیم ملک کا حادثہ پیش آ گیا۔ اس ہنگامے کے دوران انجمن کا کام معطل رہا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مولوی صاحب پاکستان چلے گئے اور وہاں انھوں نے از سر نو انجمن کی داغ بیل ڈالی۔ وہاں قدم جمانے کے بعد مولوی صاحب نے رسالہ اردو کو کراچی سے جاری کیا۔ اس نئے دور کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا اور جلد اور شمارہ کے تسلسل کو ۱۹۴۰ء کے شماروں سے مربوط رکھا۔ اپریل ۱۹۴۰ء کے شمارے کی جلد کا نمبر ۲ تھا۔ چنانچہ کراچی سے شائع ہونے والے جولائی ۱۹۴۹ء کے پرچے کو جلد ۲۸ کا پہلا شمارہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں جب انجمن کا احیا ہوا تو رسالہ اردو کو بھی جاری کیا گیا لیکن کراچی والے اردو سے امتاز کرنے کی غرض سے اس کا نام 'اردو ادب' تجویز کیا گیا۔ اس کے اڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور مقرر ہوئے۔ اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۵۰ء میں



شایع ہوا۔ اس نے جلد اور شمارے کا سلسلہ از سر نو شروع کیا چنانچہ جولائی ۱۹۵۰ء کا شمارہ جلد اول کا پہلا شمارہ قرار دیا گیا۔ اپنے 'خروف آغاز' میں اس کے ابراہیم متعلق سرور صاحب فرماتے ہیں :

جب یہ طے ہوا کہ موجودہ حالت میں انجمن ترقی اردو کا کام ہندوستان اور پاکستان میں بالکل علاحدہ اور خود مختار حیثیت سے ہوگا۔ تو علی گڑھ میں اس کا صدر دفتر قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین والس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس کے صدر اور قاضی عبدالغفار اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ مجلس نظما کی نئے سرے سے تشکیل ہوئی۔ انجمن کا نیا دستور وضع ہوا اور یکم مئی ۱۹۵۰ء کے جلسہ میں متفقہ طور پر منظور ہوا۔ انجمن کا پندرہ روزہ اخبار 'ہماری زبان' جنوری ۱۹۵۰ء سے نکل رہا ہے۔ اور اب جولائی ۱۹۵۰ء سے اس کا سہ ماہی رسالہ 'اردو ادب' شایع

کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد 'اردو ادب' کے دائرہ کار، اس کے مقاصد اور معیار کی وضاحت کرتے ہوئے سرور صاحب فرماتے ہیں :

ہماری کوشش ہوگی کہ 'اردو ادب' رسالہ اردو کے اعلیٰ و تحقیقی معیار کو برقرار رکھے اور اسے جدید ادبی ضروریات و میلانات سے ہم آہنگ کرے۔ ہم ہندوستان کے تمام ادیبانہ فکر و نظر کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اردو ادب کی فتح روشن کرنے میں ہماری مدد کریں۔۔۔

'اردو ادب' ادیبانہ فکر و نظر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خاص طور پر اصلاح زبان، اصداغ رسم الخط قدیم اردو ادب کے شہ پاروں، اظہار ہویں اور انیسویں صدی کی ذہنی اور ادبی زندگی بیسیویں صدی کے اہم میلانات، ہندوستان کی جدید زبانوں کی موجودہ خصوصیات، مغربی اور مشرقی ادبیات کے رجحانات پر مضامین لکھیں۔

اردو ادب کے اس 'خروف آغاز' سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں مقاصد کم و بیش وہی رہے جو اس پیشرو 'اردو' کے تھے اور اس نے خود کو بنیادی طور پر 'اردو' کا ہی ایک تسلسل جانا۔ رسالہ اردو نے تحقیقی و تنقیدی کا جو اعلامیہ قائم کیا تھا، اردو ادب نے اسے نہ صرف برقرار رکھا، بلکہ اس میں صحت مند اضافے بھی کیے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ سے نئی دہلی منتقل ہو گئی۔ اسی کے ساتھ اس کی انتظامیہ میں بھی تبدیلی عمل میں آئی۔ اب سرور صاحب کی جگہ ڈاکٹر خلیق انجم اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اسی کے ساتھ اردو ادب کا ادارت بھی ان کے سپرد ہوئی۔ اور اب تک وہ ان فرایض کو بحسن و خوبی نباہ رہے ہیں۔



مولوی صاحب نے کراچی سے جب اردو کا ایجا کیا تو انھوں نے کسی کو اس کا ایڈیٹر مقرر نہیں کیا بلکہ ایک مجلس ادارت تشکیل دی جس کے صدر وہ خود تھے اور قاضی احمد میاں اختر جو ناگڑھی معتمد۔ ان کے علاوہ دیگر اراکین مجلس کی تعداد چھ تھی۔ جولائی ۱۹۴۹ء کے سرورق پر جو مجلس ادارت درج کی گئی تھی، وہ اس طرح تھی:

صدر	معتمد اعزازی راجن ترقی اردو پاکستان	ڈاکٹر عبدالحق
رکن	شریک معتمد۔ اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان	شیخ محمد اکرام
"	شریک معتمد۔ فینانس حکومت پاکستان	ممتاز حسین
"	معتمد تعلیمات حکومت مشرقی پاکستان۔ ڈھاکہ	ڈاکٹر فضل احمد کریم فضل
"		مولوی سید ہاشمی فرید آبادی۔
"	صدر شعبہ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی	ڈاکٹر وجاہت حسین غازیب شادانی
"	ریڈر پنجاب یونیورسٹی	ڈاکٹر سید عبداللہ
معتمد		قاضی احمد میاں اختر جو ناگڑھی
		خصوصی شمارے

رسالہ اردو نے خصوصی شمارے بھی شائع کیے۔ ۱۹۴۷ء تک اس کے صرف دو خصوصی شمارے نکلے۔ ایک سرسید احمد خاں کے پوتے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سراس مسعود کی یاد میں اور دوسرا شاعر مشرق علامہ اقبال کے انتقال پر۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی سے اردو نے اور اردو ادب نے علی گڑھ اور نئی دہلی سے متعدد خصوصی شمارے طبع کیے۔ یہ تنہم شمارے بہت اہم ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں ان کی فہرست پیش کی جاتی ہے:

### اردو اورنگ آباد

جلد ۱۷	شمارہ ۴	(اکتوبر)	۶۱۹۳۷	۱۔ مسعود نمبر
" ۱۸	" "	" "	۶۱۹۳۸	۲۔ اقبال نمبر
				اردو کراچی
جلد ۳۱	شمارہ ۲	(اپریل)	۶۱۹۵۲	۱۔ حالی نمبر
" ۳۲	" ۳	(جولائی۔ اکتوبر)	۶۱۹۵۳	۲۔ جوبلی نمبر

۶۱۹۶۳				۳۔ بابائے اردو نمبر
۶۱۹۶۹	(جنوری)	شمارہ ۱	جلد ۴۵	۴۔ غالب نمبر حصہ اول
" "	(اپریل)	" ۲	" "	۵۔ غالب نمبر (حصہ دوم)
۶۱۹۷۵	(اکتوبر)	" ۴	" ۵۱	۶۔ شمارہ خاص: یاد خسرو
۶۱۹۷۷	(نومبر)	" "	" ۵۳	۷۔ اشاعت خاص (دانا سے راز)
۶۱۹۸۰	(اکتوبر)	" "	" ۵۶	۸۔ شیرانی نمبر
۶۱۹۸۷	(جولائی)	" ۳	" ۶۳	۹۔ نعت نمبر حصہ اول
۶۱۹۸۷	(اکتوبر)	" ۴	" "	۱۰۔ نعت نمبر حصہ دوم

## اردو ادب

۶۱۹۵۲	(جولائی تا دسمبر)	شمارہ ۲	جلد ۲	۱۔ حسرت نمبر
۶۱۹۵۹	"	"	" ۸	۲۔ مولانا آزاد نمبر
۶۱۹۶۳	"	" ۴	"	۳۔ تخلیق نمبر
۶۱۹۶۴	"	" ۳-۴	"	۴۔ نبرد نمبر
۶۱۹۶۵	"	" ۴	"	۵۔ تخلیق نمبر
۶۱۹۶۶	"	" ۴	"	۶۔ تخلیق نمبر
۶۱۹۶۹	"	" ۱-۴	"	۷۔ غالب نمبر
" "	"	" ۳	"	۸۔ ذاکر نمبر
۶۱۹۷۲	"	" ۴	"	۹۔ سیدینا نمبر
۶۱۹۷۴	"	" ۱-۲	"	۱۰۔ دہلی کے اردو خطوط کی وضاحتی فہرست
۶۱۹۷۹	"	" ۱-۴	"	۱۱۔ اقبال نمبر
۶۱۹۸۱	"	" ۱-۴	"	۱۲۔ حسرت نمبر
۶۱۹۸۳	"	" ۱-۲	"	۱۳۔ خاص نمبر
۶۱۹۸۴	"	" ۲	"	۱۴۔ فراق نمبر
۶۱۹۸۴	"	" ۲	"	۱۵۔ فیض نمبر

# سائنس

مولوی عبدالحق علی گڑھ کالج کے ماضی پر داخہ تھے۔ علی گڑھ تحریک کے مثبت اور صحت مند عناصر ان کے رگ و ریشہ میں بیوست تھے۔ سرسید کی طرح وہ بھی سائنس کی تعلیم کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ سرسید کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ موجودہ سائنسی ترقیات کے دور میں اگر ہم اس جانب متوجہ نہ ہوں گے اور اس طرف سے بے رخی و بے اعتنائی برتیں گے تو ہم دیگر اقوام سے صدیوں سے پیچھے جا پڑیں گے۔ لہذا وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم سائنس کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دیں اور اس میدان میں ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش کریں۔ مولوی صاحب چاہتے تھے کہ سائنس کی تعلیم بھی مادری زبان میں ہو اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ سائنسی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ یہ وہی کام ہے جسے سرسید نے سائنٹی فک سوسائٹی کے ذریعہ انجام دینے کی کوشش کی تھی۔ مولوی صاحب نے بھی ان ہی سطور پر کام کیا۔ اس سلسلے سے متعلق مختلف موضوعات پر معیاری اور معلوماتی مضامین شائع ہوتے۔ یہ طبعاً ادبی ہوتے اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی۔

رسالہ سائنس کی اشاعت کے پس منظر اور اس کے اجرا کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر مظفر الدین قریشی جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارے میں 'عرض واجب' کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں :

ہم اپنی نسبت کچھ ہی کہیں لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ ہم 'سائنس' کے علم و عمل میں اس قدر پیچھے ہیں کہ گویا ترقی کرنے والی قوموں کے سامنے طفل مکش ہیں۔ ہماری گزشتہ تعلیم کا بہت بڑا حصہ منطق، فلسفہ، ادب و شاعری وغیرہ کی نذر ہوتا تھا۔ اور اب بھی ان مضامین کو ہمارے نظام تعلیم میں بہت کچھ دخل ہے اس لیے جنیل نے عمل کی جگہ بھی گھیر لی ہے۔ ایشیائی اور خاص کر ہندی دماغوں کا علاج سائنس ہے۔ اس سے نہ صرف سائنس کی معلومات کا حاصل ہوتا مقصود ہے بلکہ اس طریقہ تحقیق کی تعلیم بھی مد نظر ہے جو سائنس ہمیں سکھاتا ہے اور جو علم کی شاخ اور معاشرت کے ہر شعبے کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان کے کالجوں میں سائنس کی بڑی تعلیم ہوتی ہے، اگرچہ وہ بھی ناقص ہے تاہم جو کچھ ہے غنیمت

ہے لیکن ان درسگاہوں کے باہر اندھیرا گھپ ہے۔ چشم بد دور اردو میں رسالوں کی تعداد کافی ہے اور ہر چہینے کوئی نہ کوئی نیا رسالہ جاری ہوتا رہتا ہے مگر وہ زیادہ تر ادب اور تاریخ وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ سائنس کے لیے کوئی مخصوص نہیں ہے۔ مشکل یہ پیش کیا جاتی ہے، اور صحیح بھی ہے کہ سائنس کے مضامین کو اپنی زبان میں کیوں کر ادا کریں۔ اس مشکل کو عثمانیہ یونیورسٹی نے رفع کر دیا ہے لیکن اس کا دائرہ بھی کالج کے احاطے تک محدود ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فیض کو عام کریں۔“

اس کے بعد رسالہ 'سائنس' کے اجرا کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں:

”اس خیال سے انجن ترقی اردو نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کی مساعی کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ہم اس رسالے کو ڈرتے ڈرتے اہل ملک کے سامنے پیش کرتے ہیں اس لیے ابھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم کہاں تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے ہیں ایک مقصد تو یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو سائنس کے معلومات سے نیز ان ایجادات و اختراعات سے آگاہ کرتے رہیں جو دنیا میں سائنس کے متعلق روز بروز ہوتی رہتی ہیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ خود ہمارے لوگ اپنی تحقیقات کو ملک کے سامنے پیش کریں یا سائنس کے مختلف شعبوں پر محققانہ مضامین لکھیں۔ کوششیں یہ کی گئی ہیں کہ مضامین عام فہم ہوں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں۔ تجربہ ہوتے ہوئے معلوم ہو گا کہ ہمیں اس کا کیا ڈھنگ رکھنا چاہیے۔ جامعہ عثمانیہ نے جہاں اصطلاحات وغیرہ کی وضع میں آسانی پیدا کی ہے، وہاں یہ مشکل بھی آپڑی ہے کہ ہم ان الفاظ اور اصطلاحات کو استعمال کرتے کرتے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ باہر والوں کے لیے یہ کہاں تک عام فہم ہیں۔“

ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اور اہل ملک کے ذہنوں میں سائنسی شعور بیدار کرنے کے عزم معہم کے ساتھ جنوری ۱۹۲۸ء کو اورنگ آباد کی سرزمین سے سہ ماہی رسالہ 'سائنس' نمودار ہوا۔ اس نے ابتداء سے ہی اپنے مقرر کردہ مقاصد کی تکمیل کو پیش نظر رکھا اور ہر ممکن طریقہ سے ملک میں سائنسی علوم کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اس نے علوم جدیدہ کے سلسلہ میں ایک تحریک کو جنم دیا اور ملک



ویرون ملک کے سائنسدانوں سے مضامین لکھا کر علوم کو سائنسی تجربات اور جدید ایجادات سے آگاہ کیا۔ ان تمام امور کی وضاحت خود اڈیٹر نے بھی رسالہ کے پہلے شمارہ کے 'شذرات' میں کر دی ہے۔ فرماتے ہیں:

”رسالہ سائنس کے پہلے نمبر کو قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے یہ کہنا غالباً کچھ مبالغہ تصور نہ کیا جائے گا کہ اس رسالے کے اجرا سے ایک نئی تحریک وجود میں آئی ہے جس کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی۔ اردو کے ذریعہ ملک میں جدید علوم بالخصوص تجربی علوم کی اشاعت کا کام جس قدر اہم ہے۔ اسی قدر مشکل بھی ہے۔ ابھی تک ان مشکلات سے مقابلہ کرنے کی پوری طرح کوشش نہیں کی گئی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام اس قسم کی پہلی کوشش ہے۔ اس کوشش سے بہت سی ابتدائی مشکلات حل ہو گئی ہیں۔ لیکن درس و تدریس کے علاوہ اشاعت علوم کا ایک بہت بڑا ذریعہ اخبارات اور رسالے ہوتے ہیں جو علمی معلومات کو درس گاہوں کے محدود حلقے سے نکال کر عامۃ الناس کے وسیع حلقوں تک پہنچاتے اور اہل ملک میں علمی ذوق و شوق کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ جہاں تک جدید علوم اور خاص کر سائنس کی اشاعت کا تعلق ہے، اردو میں ابھی تک کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جس سے یہ غرض پوری ہوتی تھی۔ بالآخر انجن ترقی اردو نے سائنس کے اجرا سے اس کمی کے پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔“

اپنی تحریک کو درجہ استناد عطا کرنے اور رسالہ سائنس کے معمولات کو مزید وزن و وقار بخشنے کی خاطر نہ صرف ہندوستان کے صف اول کے سائنسدانوں، بلکہ دوسرے ممالک کے بھی ماہرین علوم جدیدہ سے ربط قائم کیا گیا اور ان سے مضامین حاصل کر کے ان کے ترجمے شائع کیے گئے۔ اس کی اطلاع بھی 'شذرات' میں دے دی گئی تھی:

”اس سلسلہ میں یورپ کے چند ممتاز سائنسدان حضرات کو بھی خطوط لکھے گئے تھے جن میں رسالے کے اغراض و مقاصد کا ذکر کیا گیا تھا۔ ہم ان حضرات کے بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے باوجود گونا گوں مصروفیتوں کے ہماری درخواست کی طرف توجہ کی اور اس تحریک سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ انگلستان کے ممتاز کیمیا داں پروفیسر ای۔ ایم۔ آرم

سرورنگ نے ہماری درخواست کو نہایت خوشی سے قبول فرمایا ہے اور ایک خاص  
مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہے جو غالباً آئندہ نمبر میں شائع ہوگا۔

رسالہ سائنس کے منتظمین کی یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور یورپ، بالخصوص انگلستان کے ماہرین  
علوم جدیدہ کا تعاون اسے حاصل ہوا اور کافی تعداد میں ان کے مفایین اس میں شائع ہوئے۔ ان میں  
سے اہم مفایین کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

- ۱۔ دورنمائی از پروفیسر ای۔ این۔ ڈرسی انڈرید۔ جلد ۱ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۳۸ء
  - ۲۔ مصر قدیم کا علم طب اور فنِ جراحی از ڈبلیو۔ آر۔ ڈاؤسن جلد ۲ شمارہ ۲ اپریل ۱۹۳۸ء
  - ۳۔ مادے اور لیٹر کا باہمی تعلق از سرالیور لاج " " " " ۳ جولائی " " "
  - ۴۔ فنِ جراحی پر سب سے پہلی کتاب از جیمز ہنری برلیٹڈ " " " " ۴ اپریل ۱۹۳۹ء
  - ۵۔ طبیعیات کا نیا نقطہ نظر از سرالیور لاج " " " " ۱ جنوری " " "
  - ۶۔ حشرات میں عقل و شعور از آر۔ سی۔ کیڈ والڈر " " " " ۲ اپریل ۱۹۳۸ء
  - ۷۔ انسانی جسم میں پیوندکاری از ڈاکٹر ورنر فاف " " " " ۳ مارچ ۱۹۴۱ء
  - ۸۔ آریوٹین از کلیمنٹ یارک " " " " ۴ جون " " "
  - ۹۔ سیاروں کے طبیعی حالات از سوچمنز جینز " " " " ۳ مارچ ۱۹۴۲ء
  - ۱۰۔ رابن ایروٹائیکل سوسائٹی از لارڈ بیرنولن " " " " ۱۹ " " " " ۸ اگست ۱۹۴۲ء
  - ۱۱۔ برطانیہ میں صنعتی ترقی از ڈاکٹر ایچ۔ بکلی " " " " ۱۹ " " " " ۹ ستمبر ۱۹۴۲ء
- ان کے علاوہ ہندوستان کے ممتاز ماہرین علوم جدیدہ جن کا علمی تعاون حاصل رہا ان میں سے حسب  
ذیل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

- ۱۔ پروفیسر مظہر الدین قریشی
- ۲۔ جناب حبیب خان قریشی
- ۳۔ پروفیسر محمد طاہر رضوی
- ۴۔ جناب سلیم الزماں صدیقی
- ۵۔ جناب عبدالحق
- ۶۔ سر دار بلدیو سنگھ
- ۷۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید
- ۸۔ جناب محمد نعیر احمد
- ۹۔ پروفیسر منہاج الدین
- ۱۰۔ جناب بک موہن لال پتھویری
- ۱۱۔ جناب محمد فاروق
- ۱۲۔ جناب مرتضیٰ راؤ
- ۱۳۔ پروفیسر محمد بابر مرزا
- ۱۴۔ جناب رفعت حسین صدیقی
- ۱۵۔ جناب فرحت علی

ان حضرات کا قلمی تعاون رسالے کا اعلامیہ برقرار رکھنے کا ضامن ہے۔

رسالہ سائنس میں چند مستقل عنوانات ہو سکتے تھے جن کے ذریعہ سائنس سے متعلق مختلف نوع کے دلچسپ اور اہم معلومات فراہم کیے جاتے تھے۔ ان میں 'سائنس کی دنیا' اور 'دلچسپ معلومات' وغیرہ عنوانات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ 'سوال و جواب' کے باب میں سائنس سے متعلق قارئین کے سوالوں کے جوابات دیے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں علوم جدیدہ سے متعلق تازہ ترین اور اہم معلومات پر تبصرے بھی شائع کیے جاتے تھے۔ ان تمام عنوانات کے تحت فراہم کردہ اطلاعات اور معلومات کا مطالعہ قارئین کی معلومات عام میں بے انتہا اضافہ کا باعث ہوتا تھا اسی کے ساتھ غیر ملکوں میں تخلیق کیے جانے والے سائنسی لٹریچر سے بھی انھیں آگاہی ہوتی رہتی تھی۔

ابتداء میں رسالہ سائنس کا وقفہ اشاعت سہ ماہی تھا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء تک یہ سہ ماہی ہی رہا۔ جنوری ۱۹۴۱ء سے یہ ماہانہ ہو گیا۔ یہ رسالہ بیس سال کے طویل عرصہ تک مسلسل پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ تقسیم ملک کے بعد نامساعد حالات کے سبب اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو اس کا آخری شمارہ شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ ابدی نیند سو گیا۔ اس کے سرورق پر ہمیشہ یہ عبارت درج ہوتی تھی:

”سب سے خوش نصیب وہ انسان ہے جو نئے حقائق کا انکشاف کرتا ہے اور دوسرے درجے پر وہ ہے جو پرانے تعصبات کو ترک کرتا ہے۔“

## ہماری زبان

مولوی عبدالحق کی نگرانی میں انجمن ترقی اردو سے شائع ہونے والے دونوں رسالے اردو اور سائنس خاص ادبی پرچے تھے۔ ان کا دائرہ کار اردو ادب کو فروغ دینے اور سائنسی لٹریچر کو عام کرنے تک محدود تھا۔ ان میں اردو تحریک سے متعلق عام خبریں شائع نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن جب مولوی صاحب کی قیادت میں مہبان اردو کی مساعی اور جدوجہد سے اردو تحریک کو فروغ حاصل ہوا اور اس نے ملک گیر حیثیت حاصل کرنی، تو اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس قسم کی تمام سرگرمیوں سے عوام و خواص کو باخبر رکھا جائے۔ بچاں چہ مولوی صاحب کی تحریک پر انجمن ترقی اردو نے ایک پندرہ روزہ ترجمان جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور چوں کہ اس کا کام خالص اردو سے متعلق خبریں شائع کرنا تھا اس لیے اس کا نام 'ہماری زبان' تجویز کیا گیا۔ یہ یکم اپریل ۱۹۴۹ء کو جاری ہوا۔



اس کا وقفہ اشاعت پندرہ روزہ تھا اور یہ کل بیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ تھا اور قیمت فلیپر پر تین پیسے مقرر ہوئی۔ اور چونکہ اس زمانہ میں انجمن ترقی اردو دکن سے منتقل ہو کر دہلی آگئی تھی، اس لیے 'ہماری زبان' بھی دہلی سے ہی نکلنا شروع ہوا۔ اس کی پیشانی پر سر شیخ بہادر پیرو کا یہ مقولہ بالا التزام درج ہوتا تھا۔

اردو زبان ہندو مسلمان دونوں کی اپنے آپا واجہاد سے ایک مشترکہ اور مقدس محرکہ کی حیثیت سے لی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے۔

ہماری زبان نے جلد ہی عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کے آخر سے اس کی تعداد اشاعت میں تیزی سے اضافہ ہوا اور صرف ایک سال کی قلیل مدت میں اس کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے متجاوز ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ تعداد ساڑھے پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کی مقبولیت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اس کے اعلامیہ کار کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ اس نے انجمن ترقی اردو کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس میں ادبی لسانی اور ثقافتی مضامین بھی شائع ہوتے تھے لیکن اس کا بنیادی کام اردو دنیا کی خبریں شائع کرنا تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس نے خبروں اور مضامین دونوں کو حسب ضرورت اہمیت دے کر دونوں حصوں میں توازن برقرار رکھا۔

ہماری زبان کے پہلے مدیر ریاض الحسن صاحب مقرر ہوئے۔ ان کے بعد رفیق الدین صاحب، پنڈت برج موہن دتا تریہ کپڑی، سید ہاشمی فرید آبادی اور طفیل احمد صاحب نے علی الترتیب اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

فروری ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی تیسری کل ہند کانفرنس ناگپور میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر ہماری زبان کا خصوصی شمارہ کانفرنس نمبر شائع ہوا۔ جس کو عام طور پر پسند کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں یہ بند ہو گیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں حالات معمول پر آنے پر انجمن ترقی کا از سر نو ایسا ہوا۔ اس کا صدر دفتر علی گڑھ منتقل ہو گیا اور دیگر سرگرمیوں کو شروع کرنے کے ساتھ ہی 'ہماری زبان' کو بھی از سر نو جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۵۰ء کو علی گڑھ سے انجمن ترقی اردو (ہند) کا ترجمان 'ہماری زبان' جاری ہوا۔ اس وقت انجمن کے سکریٹری قاضی عبدالغفار تھے لہذا وہی ہماری زبان کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں



قاضی صاحب کے بعد پروفیسر آل احمد سرور انجمن کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس حیثیت سے آپ نے ہماری زبان کے اڈیٹر کے فرائض بھی انجام دیے۔ آپ کی ہندوستان سے غیر موجودگی کے زمانے میں کچھ عرصہ تک پروفیسر مسعود حسین خاں نے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۷، ۱۹ء میں انجمن کی انتظامیہ میں تبدیلی ہوئی جس میں پروفیسر آل احمد سرور کی جگہ ڈاکٹر خلیق انجم اس کے جرنل سکریٹری بنائے گئے۔ اسی کے ساتھ اردو ادب اور ہماری زبان کی ادارت بھی آپ کے ذمہ آگئی۔ ۱۷، ۱۹ء سے آج تک یہ آپ ہی کی ادارت میں انتہائی پابندی اور کامیابی سے نکل رہا ہے۔ آج کل اس میں مضامین کے مقابلہ میں اردو دنیا کی خبروں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

’ہماری زبان‘ ابتدا میں ہفت روزہ تھا لیکن دسمبر ۱۹۵۷ء سے اسے پندرہ روزہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد پندرہ روزہ اور بعد میں ہفت روزہ کر دیا گیا جو ابھی تک شائع ہو رہا ہے۔ اس عرصہ میں اہم موضوعات پر ’ہماری زبان‘ کے متعدد خصوصی شمارے بھی شائع ہوئے ہیں جو ہر لحاظ سے معیاری ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر مدستادہ بنی حیثیت رکھتے ہیں۔

## قومی زبان

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد مولوی صاحب پاکستان چلے گئے۔ وہاں انھوں نے انجمن ترقی اردو کی از سر نو شیرازہ بندی کی۔ اور کراچی میں باقاعدہ انجمن قائم ہو جانے کے بعد آزادی سے قبل انجمن سے شائع ہونے والے رسالوں کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ۱۹۴۹ء میں سرمایہ اردو کا احیا کیا نیز ۱۹۵۰ء میں پندرہ روزہ ’قومی زبان‘ جاری کیا۔ یہ دراصل ہماری زبان کا ہی تسلسل تھا۔ چونکہ علی گڑھ سے ’ہماری زبان‘ دوبارہ شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے مولوی صاحب نے اپنے رسالے کا نام بدل کر ’قومی زبان‘ کر دیا۔ اس کی نوعیت محض ایک خبرنامے سے بڑھ کر ادبی رسالہ کی کر دی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں اس کا وقفہ اشاعت بجائے پندرہ روزہ کے ماہانہ کر دیا گیا۔ اب اس کی حیثیت خالص ادبی، تحقیقی اور تنقیدی رسالہ کی ہو گئی۔

یوں تو ’قومی زبان‘ میں سیکڑوں اعلیٰ اور معیاری مضامین شائع ہوئے، لیکن اس میں دو سلسلے مفید اور معلومات افزا شروع ہوئے جن کی نظیر دوسرے رسائل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک سلسلہ ’گنجائے گرانمایہ‘ کے عنوان سے تھا جس میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتاب خانے میں محفوظ خطوط

کی وضاحتی فہرست شایع ہوتی تھی۔ بعد میں بالاقساط شایع ہونے والی یہ فہرست کتابی شکل میں شایع ہوئی۔ دوسرا سلسلہ 'نئے خزانے' کے عنوان سے تھا جس میں اخبارات اور رسائل میں شایع ہونے والے مضامین کا فوار اشاریہ دیا جاتا تھا۔ اس نوع کے اشاریے دانشوروں اور تحقیقی کام کرنے والے حضرات کے لیے بے انتہا اہم ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ 'قومی زبان' میں سائنسی علوم سے متعلق انگریزی۔ اردو مصطلحات بھی بالانتظام شایع ہوتی تھیں۔

'قومی زبان' کے کثیر تعداد میں خصوصی نمبر بھی شایع ہوئے۔ ان کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

جلد ۳۱	شمارہ ۳ - ۶	(اگست - ستمبر)	۱۹۶۲ء	۱۔ بابائے اردو نمبر
۲۵	۴ - ۱۰	(ستمبر - اکتوبر)	۱۹۶۳ء	۲۔ " "
۳۵	۱۱ - ۱۳	(نومبر - دسمبر)	" "	۳۔ ہاشمی فرید آبادی نمبر
۳۱	۲	(اگست)	۱۹۶۴ء	۴۔ آزادی نمبر
" "	۳	(ستمبر)	" "	۵۔ بابائے اردو نمبر
۳۳	" "	( )	۱۹۶۸ء	۶۔ " "
۳۴	۲	(فروری)	۱۹۶۹ء	۷۔ بیاد غالب
" "	۳	(مارچ)	" "	۸۔ " "
۳۶	۲	(اگست)	۱۹۷۰ء	۹۔ بابائے اردو
۴۲	۹	(ستمبر)	۱۹۷۳ء	۱۰۔ " "
۴۴	۸	(اگست)	۱۹۷۴ء	۱۱۔ " "
۴۵	۱	(جنوری)	۱۹۷۵ء	۱۲۔ بیاد ممتاز حسین
" "	۸	(اگست)	" "	۱۳۔ اشاعت خاص
" "	۱۳	(دسمبر)	" "	۱۴۔ بیاد امیر خسرو
۴۶	۱۳	( )	۱۹۷۶ء	۱۵۔ خصوصی شمارہ (صد سالہ جشن پیدائش قائد اعظم)
۴۷	" "	(نومبر)	۱۹۷۷ء	۱۶۔ اقبال نمبر
۴۸	۱۳	(دسمبر)	۱۹۷۸ء	۱۷۔ اشاعت خاص (مولانا محمد علی جوہر)

۱۹۔ اقبال نمبر	شمارہ ۴۹	جلد ۴	اپریل ۱۹۶۹ء
۱۹۔ پیاد باباے اردو مولوی عبدالحق	"	"	اگست
۲۰۔ اشاعت خاص (علامہ اقبال)	"	"	نومبر
۲۱۔ شیرانی نمبر	۵۰	۱۰	اکتوبر ۱۹۸۰ء

## معاشیات

بابائے اردو بڑے وسیع القلب اور وسیع النظر انسان تھے۔ آپ کی فکر میں ہمہ گیری اور نظریات میں بلندی کے ساتھ ہمہ جہتی بھی ملتی ہے۔ وہ دور اندیش بھی تھے اور دور بین بھی۔ اپنے اہل وطن کی ترقی کا وہ ایک واضح نقشہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم کے ذریعہ ہی اپنی قوم کی ترقی ممکن ہے اور ترقی یافتہ ممالک سے ہمہ دوش ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں سائنس کی تعلیم عام ہو۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ سماجی علوم کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات علم کی یہ دونوں شاخیں اپنی اپنی اہمیت اور افادیت رکھتی ہیں۔ اور ان میں کسی ایک کو بھی نظر انداز کر کے ہم صحیح معنی میں ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ لہذا ہمہ جہت ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم دونوں میں توازن قائم رکھیں اور سائنسی علوم کے ساتھ سماجی علوم میں بھی درک حاصل کریں۔ اور چوں کہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی مسئلہ معاشیات کا ہوتا ہے۔ اس لیے سماجی علوم میں آپ نے سب سے زیادہ زور معاشیات پر دیا۔ چنانچہ اپنے اہل وطن کو جدید معاشی نظریات اور موجودہ معاشی نظام کے گونا گوں مسائل سے لوگوں کو آسان زبان میں واقف کرانے کے لیے آپ نے نچن ترقی اردو کی جانب سے ایک ماہانہ 'معاشیات' کے عنوان سے جاری کیا۔

رسالہ 'معاشیات' جنوری ۱۹۴۶ء کو جاری ہوا۔ رسالہ 'سائنس' کی مانند یہ رسالہ بھی اردو میں اپنی نوعیت کا واحد رسالہ تھا۔ اس میں معاشیات اور معاشی مسائل سے متعلق بڑے مفید اور معلومات افزا مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے ایڈیٹر طفیل احمد خاں صاحب مقرر ہوئے جو صحافت کا وسیع تجربہ اور معاشی مسائل پر گہری نظر بھی رکھتے تھے۔ الہ آباد سے شائع ہونے والے ہفت روزہ 'آبزرور' کے مدیر کی حیثیت سے آپ کو ملک گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ مولوی صاحب اور طفیل احمد خاں صاحب کی مساعی سے 'معاشیات' کو قبول عام نصیب ہوا۔ اسے ملک اور بیرون ملک کے ماہرین معاشیات کو



قلمی تعاون حاصل ہوا۔ ان لکھنے والوں میں:

۱۔ پروفیسر عطاء اللہ ۲۔ مارگٹ ہمن من ۳۔ پنڈل مون ۴۔ مورس ڈوب

۵۔ پروفیسر برج نرائن ۶۔ ڈاکٹر ابوسلم ۷۔ رمیل نرائن مانٹر ۸۔ شفیق الرحمن

جیسے ہندوستان گیرادر بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین فن کے اسماء گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں

مولوی صاحب بھی اکثر اپنی تحریروں سے اسے نوازا کرتے تھے۔ اس میں جن موضوعات پر مضامین شایع ہوتے

تھے ان میں عالمی معاشی مسائل، عالمی معاشی نظریات، معاشی منصوبہ بندی، صنعت و حرفت کی صورت حال،

تجارت کے امکانات وغیرہ شامل تھے۔ اسی کے ساتھ مستقل عنوان کے تحت ملک کی معاشی صورت حال کا

جائزہ بھی پیش کیا جاتا۔ ان کے علاوہ ان موضوعات سے متعلق تازہ مطبوعات پر تبصرے بھی کیے جاتے۔

معاشریات کے عمومی طور پر تقسیم ملک سے قبل، اپرچے شایع ہوئے۔ یہ مئی ۱۹۴۷ء تک پابندی

سے شایع ہوتا رہا۔ اس کے بعد بند ہو گیا۔ پاکستان مستقل ہو جانے کے بعد اگست ۱۹۴۹ء میں انجمن

ترقی اردو پاکستان کی جانب سے مولوی صاحب نے اسے دوبارہ جاری کیا۔

## تاریخ و سیاست

مولوی صاحب سماجی علوم کو کتنی اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے

کہ کراچی میں اردو کا نچے قائم کرنے کے بعد آپ نے وہاں ایک 'مجلس تاریخ و تعلیم' کی اور اس کی جانب سے ایک

سہ ماہی رسالہ 'تاریخ و سیاست' جاری کیا۔ اس مجلس کا افتتاح اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ

سر محمد ظفر اللہ خاں نے کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے تاریخ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے

انھوں نے کہا تھا:

صاحبان! جس طرح مسلمانوں نے دنیا میں علمی سائنس کی بنیاد قائم کی اور یورپ کو جس پر

کئی صدی سے تاریکی چھائی ہوئی تھی، علم و حکمت کی روشنی سے مستفیض کیا۔ اسی طرح مسلمانوں

نے فلسفہ تاریخ کی بنیاد رکھی اور بتایا کہ زندہ قوموں کے لیے تاریخ کا مطالعہ کس قدر ضروری

ہے۔ ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ آج بھی مورخین کے لیے مشعل راہ کا کام دے رہا ہے

مسلمانوں میں جب سیاسی و اجتماعی زوال اور تہود آیا تو انھوں نے اپنی تاریخ سے



غفلت برتنا شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دورِ حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کی مستند تاریخیں  
غیر مسلم مورخین نے مرتب دیں یا لکھیں اور اپنے خواہشی کے ساتھ انہیں شائع کیا۔ نتیجہ  
ظاہر ہے کہ آج دنیا میں مسلمان اور اسلام ان ہی تاریخوں کے ذریعہ مٹھون ہیں۔“

آگے چل کر آپ نے فرمایا،

”ہماری قومی تاریخ سے ہماری تہذیب اور تمدن وابستہ ہیں۔ گزشتہ تاریخ اور ہمارے  
قدیم کارنامے حال اور آئندہ کی ماسی میں ہماری رہنمائی اور مدد کر سکتے ہیں۔“

سر لفظ اللہ خاں کے اس افتتاحی خطبے کو ہم رسالہ تاریخ و سیاست کے اجرا کی ضرورت، اس کے پس منظر  
اور اعراض و مقاصد کی تشریح و توضیح قرار دے سکتے ہیں خصوصیت اس لیے بھی کہ خود رسالہ میں نہ اس کی  
اشاعت کے اعراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں، نہ اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا پہلا شمارہ  
اپریل ۱۹۵۱ء کو شائع ہوا۔ اس کا کوئی علاحدہ سے ایڈیٹر مقرر نہیں ہوا بلکہ ایک مجلس ادارت تشکیل دی گئی  
جس کے صدر مولوی عبدالحق تھے اور اسی حیثیت سے وہ رسالہ کی ادارت کے فرایض بھی انجام دیتے تھے۔  
مجلس کے ارکان حسب ذیل تھے،

- |                            |      |
|----------------------------|------|
| ۱۔ مولوی عبدالحق           | صدر  |
| ۲۔ ڈاکٹر محمد حسین خاں     | رکن  |
| ۳۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی | ”    |
| ۴۔ مسٹر ایم۔ بی۔ احمد      | ”    |
| ۵۔ ڈاکٹر معین الحق         | ”    |
| ۶۔ ڈاکٹر ریاض الحسن        | ”    |
| ۷۔ سید حامد الدین راشدی    | ”    |
| ۸۔ قاضی احمد میاں اختر     | ”    |
| ۹۔ سید ہاشمی فرید آبادی    | معتد |

رسالہ تاریخ و سیاست، نے شروع سے ہی اعلامیہ کو برقرار رکھا۔ اس کو ابتدا سے ہی اپنے  
عہد کے ممتاز دانشوروں اور نامور ادیبوں کا قلمی تعاون حاصل رہا۔ جس رسالے میں ایسی نابردور کارٹھیا

کے مضامین شائع ہوتے رہے ہوں۔ جیسے علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر محمد اشرف، مالک رام، سید معین الحق، ڈاکٹر وحید قریشی، نصیر الدین ہاشمی، مولوی عبدالحق، ایڈورڈ زرخاؤ، نمکین کاکلی، محمد علی قصوری، مفتی انتظام اللہ شہابی، باقر علی ترمذی، حام الدین راشدی اور عبدالرحمن صدیقی وغیرہ تو اس کے معیار کے بارے میں گفتگو کرنا سیر حاصل ہو گا۔ ان حضرات کا قلمی تعاون کسی بھی رسالے کے معیار کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر کر دے گا۔

تاریخ و سیاست میں جن موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے، وہ بھی بہت اہم تھے ان میں قدیم تاریخ اور عالمی تہذیب کی بازیافت بھی ہوتی تھی اور عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کے تمدنی جلووں کی جھلک اور ان کے مختلف النوع کارناموں کی تلاش و تحقیق بھی۔ اس میں طبعاً مضامین پر زیادہ زور دیا جاتا تھا لیکن دوسری زبانوں، بالخصوص انگریزی سے ترجمہ شدہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ جن موضوعات پر زیادہ مضامین شائع ہوتے تھے ان میں بین الاقوامی سیاست، بین الاقوامی قوانین، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و تمدن، ہندوستان کی تاریخ، ہندوستان کی ثقافت و معاشرت، وسط ایشیا کی تاریخ اور وہاں کی سیاسی صورت حال، خلافت عباسیہ، مسلمانوں کا نظام تعلیم اور تاریخی شخصیات کے سوانح اور ان کے تاریخی کارنامے جیسے اہم عنوانات شامل ہیں۔ رسالہ میں تازہ مطبوعات پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے لیکن ہر شمارے میں ان کا التزام نہیں کیا جاتا تھا۔

# اردو کی ادبی تاریخیں اور مولوی عبدالحق

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء) ایک ہمہ جہت شخصیت تھے، ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر متعدد ماہرین و مشاہیر روشنی ڈال چکے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ذیل میں ہم بابائے اردو کی تحریروں کی مدد سے اردو ادب کی تاریخ نویسی اور ادبی مورخ کے دائرہ کار سے متعلق ان کے نظریات کا تعین کریں گے۔

ہر چند کہ اس موضوع پر ان کی کوئی مستقل تصنیف یا باقاعدہ مضمون دستیاب نہیں ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان کے بیش تر مضامین سے متعدد ایسے علمی اور ادبی مباحث کا آغاز ہوا جن کے نتائج زبان اور ادب کی تاریخ پر اثر انداز ہوئے۔

مثلاً اردو زبان و ادب سے متعلق ان کے مضامین جو خاصی تعداد میں ہیں اور اردو کی لسانی و ادبی تحقیق میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، نیز سرمایہء دکنیات اور قدیم شعراء کے تذکروں پر مقدمے اور ادبی تاریخوں پر ان کے تبصرے وغیرہ جن کی روشنی میں تاریخ ادب کے کئی تاریک گوشے منور ہوئے، کئی ادبی مغالطوں کا خاتمہ ہوا اور کئی ادبی گتھیاں سلجھ گئیں۔ اس تمام تحریری سرمایے کو اگر یک جا کر کے جائزہ یا جائے تو باآسانی زبان و ادب کی تاریخ اور ادبی مورخ کے دائرہ کار کے بارے میں ان کے نظریات متعین کیے جاسکتے ہیں۔

بابائے اردو کی نظر میں تاریخ ادب کی ترتیب و تدوین کا جو معیار تھا اس پر پورا اثر نامہ کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رام بابو سکسینہ کی تالیف **A HISTORY OF URDU LITERATURE** مطبوعہ ۱۹۲۷ء سے لے کر ان کی وفات ۱۹۶۱ء تک شایع ہونے والی کوئی ادبی تاریخ بجز چند ایک تاریخوں کے مثلاً حکیم شمس اللہ فاروقی کی تصنیف "اردو کے قدیم" (۱۹۲۵ء) ان کے معیار پر پوری نہیں اتر سکی۔ اس کے ثبوت کے طور پر سالہ اردو میں ان تاریخوں پر شایع شدہ تبصرے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جن

میں نہ صرف ان تاریخوں کی خامیوں کی طرف واضح اشارے کیے گئے ہیں بلکہ بعض مقامات پر اخلاط کی تفصیحات بھی کی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر اس موضوع سے ان کی گہری دلچسپی اور اس پر ان کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے، اس کی تفصیل اس مضمون میں مناسب موقع پر آگے آئے گی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ مولوی عبدالحق نے کبھی بھی ادبی تاریخ کو اپنا موضوع نہیں بنایا، لیکن پھر بھی وہ اس میدان میں ہونے والی ترقی سے بے خبر نہیں تھے، جہاں چاہے جب نواب نصیر حسین خاں خیال نے اپنے ایک خطبے کو جو انھوں نے ۱۹۱۶ء میں لندن ترقی اردو کے سالانہ جلسے میں ”دستان اردو“ کے نام سے پڑھنے کے بعد ”مغل اور اردو“ کے نام سے شائع کیا تو مولوی عبدالحق نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا:

یہ خطبہ دراصل اردو زبان کی تاریخ کا سرسری خاکہ تھا اردو داں طبقے میں اس کا ذرا کچھ چرچا ہوا وہ محض اس وجہ سے کہ اس وقت تک تاریخ ادبیات اردو کا مواد زیادہ روشنی میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اب اس موضوع پر کئی مشہور ادیبوں نے تحقیقات شروع کر دی ہے اور اس قدر عجیب و غریب نتائج برآمد ہو رہے ہیں کہ کبھی سان گمان بھی نہ تھا کہ تاریخ زبان اردو کے میدان میں اس قدر وسعت ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ نویسی اور ادبی مورخ کے بارے میں ان کا معیار جتنا بلند ہوتا گیا اتنا ہی ہمارے ادبی مورخوں کے لیے اس پر پورا اترنا مشکل ہو گیا، حتیٰ کہ جب سید اعجاز حسین کی کتاب ”مختصر تاریخ ادب اردو“ انڈین پریس الز آباد سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی تو بابائے اردو نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی مایوسی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

تاریخ ادب اردو پر حال میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ افسوس ہے کہ یہ موضوع جس قدر مشکل ہے اسی قدر آسان سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔



غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ایک ادبی تاریخ کو پرکھنے کے لیے بابائے اردو کے معیارات پر پورا اترنا کوئی ناممکن بات نہ تھی، کیوں کہ ایک ادبی تاریخ سے ان کے مطالبات صرف یہ تھے کہ ”کتاب پڑھنے کے بعد صاف طور پر معلوم ہو کہ اس کا موضوع کیا ہے اور اس کے لکھنے سے مؤلف کا منشا کیا ہے۔“ (اردو، ۱۹۲۶ء، ص ۱۸۴) اسلوب ادا سنجیدہ اور پختہ ہو۔“ (اردو، جنوری ۱۹۳۲ء، ص ۲۱۷) ”ماخذات کے حوالے دیے گئے ہوں“ (ایضاً ص ۳۴) ادبی تحقیق ماخذات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اسی اہمیت کے پیش نظر بابائے اردو نے متعدد جگہ ماخذات کی نشان دہی پر زور دیا ہے چنانچہ ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

”ایسے مصنف و مؤلف جو حقیقی علم کا ذوق رکھتے ہیں وہ اپنے ماخذوں کے حوالے دینے میں کبھی غفل نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ عالی ظرفی سے کام لیتے ہیں۔“<sup>۱</sup>

ضروری معلوم ہوتا ہے گفتگو کو مزید آگے بڑھانے سے تاریخ ادب کے نظریے کی وضاحت کر دی جائے اس سلسلے میں علی جواد زیدی اپنے ایک مضمون ”تاریخ ادب کی تدوین“ میں رقم طراز ہیں کہ:

تاریخ کا ایک مفہوم تو وہ ہے جس کا تعلق تقدم و تاخر زمانی سے ہے لیکن تاریخ صرف زمانے کی ترتیب کے ساتھ واقعات کے یکجا کرنے کا نام نہیں ہے، ہر واقعہ زمان و مکان کی قیدوں میں گھرا ہوا ہے یہ واقعات تاریخ اسی وقت بنتے ہیں، جب ان کے باہمی تعلقات کو سمجھ کر انہیں ایک رشتے میں اس طرح پرودیا جائے کہ یہ ارتقائے مسلسل عمل کی نشان دہی کرنے لگیں۔۔۔ گرد و پیش کے ماحول سے لے کر عالمی اثرات تک تاریخ کی تشکیل و تعمیر میں اسی طرح حصہ لیتے ہیں جیسے انسانی حیات کی تعمیر و پخت میں۔<sup>۲</sup>

تاریخ کا مذکورہ نظریہ جو آج رائج ہے مولوی عبدالحق بہت پہلے ایک ضمنی ذکر میں بیان کر چکے ہیں لیکن چونکہ اب تک ان کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اس لیے اس پر مزید کام نہ

<sup>۱</sup> مولوی عبدالحق ”چند تنقیدات عبدالحق“ طبع اول، دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۹ء، ص ۳۱۔

<sup>۲</sup> علی جواد زیدی، ”تاریخ ادب اردو کی تدوین“، سہ ماہی تحریر، دہلی، علمی مجلس، جلد ۳، شمارہ نمبر ۱،

ہو سکا۔ ذیل میں تاریخ کے اس نظریے سے متعلق جو دراصل مغرب سے ماخوذ ہے۔ اور اب ہمارے ہاں پورے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ بابائے اردو کے الفاظ نقل کیے جا رہے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ تاریخ کے بارے میں ان کا نظریہ کتنا جدید اور واضح تھا؛

شاعری کے انقلابات اور تغیرات زمانے کے انقلابات اور تغیرات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شعر کو شاعر اور اس کے زمانے سے جدا کر کے دیکھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو اس کے اجاب اور عزیزوں اور اس کے وطن سے جدا کر دیا۔۔۔۔۔ جب ہم شاعری کی تاریخ لکھتے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی طبیعت، اس کے خصائل اور عادات پر غور کی نظر ڈالیں اور اس کے بعد اس کے عہد واقعات و حالات اور تغیرات و انقلابات کا ذکر کم سے کم اس حد تک ضرور کریں جہاں تک ان کا تعلق شاعر اور اس کی شاعری سے ہے کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس کی شاعری اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔“

ان کے علاوہ بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کا براہ راست ذکر مولوی عبدالحق صاحب نے نہیں کیا لیکن جہاں کہیں نظر آئیں ان کا نوٹس لیا اور اس پر اپنی رائے دی مثلاً ادبی تاریخ کے ادوار کی تقسیم کو لیجئے، جتنی ادبی تاریخوں پر انھوں نے اپنی رائے دی اس پہلو کو ضرور مد نظر رکھا حتیٰ کہ بعض تاریخوں کے سلسلے میں تو ان کے ماخذ کی نشان دہی بھی کر دی مثال کے طور پر گزہ ہم نیلی کی تالیف ”اردو لٹریچر“ پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں جہاں تک ابتدائی اردو کا تعلق ہے، ادوار کی تقسیم میں ”اردو قدیم“ کا اتباع کیا ہے۔“

ادوار کے ساتھ ساتھ ابواب کی تقسیم میں بھی ان کی ذاتی موجودگی تھی، اس سلسلے میں وہ اس بات کے خواہشمند تھے ابتدا میں ایک باب زبان کی تاریخ سے بھی متعلق ہو جس زبان سے متعلق بحث ہو جیسے تغیر و تبدل کے اسباب وغیرہ۔

سہ ماہی ”اردو“ اورنگ آباد دکن، انجمن ترقی اردو ہند، بابت ۱۹۲۶ء، ص ۱۸۲

سہ مولانا عبدالحق، ”چند تنقیدات عبدالحق“، طبع اول، ادبی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۹ء، ص ۵۶۔

ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ بابائے اردو کی تحریروں میں ایسے اثناء بھی دستیاب ہیں جنہیں ایک جاکر کے ہم ایک ادبی مورخ کی نمایاں خصوصیات بھی متعین کر سکتے ہیں مثلاً،

”مؤلف اپنی ذاتی معلومات کو کافی نہ سمجھے، جدید تحقیقات سے جو وقتاً فوقتاً رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں پورا استفادہ کرے۔ اردو، اپریل ۱۹۳۶ء، ص ۲۹۲) مؤلف کو اپنے قلم پر قابو چاہیے، اردو، جنوری ۱۹۳۶ء، ص ۲۱، مؤلف ایک وسیع المطالعہ شخص، زبان کے فطری ارتقار کی باریکیوں سے واقف ہو۔۔۔ اس کی نظر میں اردو زبان کی ترقی کے مدارج اور اس کے ارتقائی رجحانات بھی ہوں۔ اردو، جنوری ۱۹۳۶ء، ص ۲۱۳، ۲۱۶) مؤلف میں ضبط و متانت اور کمین و تحمل ہو، ورنہ کتاب میں خطیبانہ جوش اور افراط بلند آہنگی درآتی ہے۔ جو کتاب کے لیے اچھی علامت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بابائے اردو ادبی مورخ سے اس بات کے بھی متقاضی تھے کہ اگر اسے پچھلے مورخین کے کاموں میں کوئی فروگزاشت نظر آئے تو اس کی اصلاح کرے نہ کہ اس پر طنز کرے، چنانچہ لکھتے ہیں:

خطا تحقیق کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اگلوں کی تحقیق پچھلوں کی رہ نمائی کا کام دیتی ہے، اگر اس میں کوئی فروگزاشت رہ گئی ہے تو آنے والے اس کی اصلاح کر دیتے ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ تحقیق اگلوں کی ہو یا پچھلوں کی، قابل قدر ہے، اگر اس میں کوئی خطا ہے تو قابل اصلاح ہے نہ کہ لائق سب و شتم۔“

ادب کے صفحات میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحریروں کی مدد سے ایک ادبی تاریخ اور ادبی مورخ کے بارے میں ان کے خیالات کو یک جا کیا گیا اور منہا یہ جائزہ بھی لیا گیا کہ ان کی زندگی میں جتنی ادبی تواریخ شائع ہوئیں ان کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے کیا تھی۔ یہاں مولوی صاحب کا ایک بیان نقل کیا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں جامع ادبی تاریخ کی کمی کا احساس کتنی شدت سے تھا،

”افسوس ہے آج تک اردو زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی جو اردو شاعری کے تمام انقلابات و تغیرات کو نمایاں کرتی اور اس سے یہ معلوم ہو سکے کہ انواع شاعری کی ترقی کے لحاظ سے موجودہ زبانوں میں اردو کا کیا درجہ ہے۔“

مولوی عبدالحق، باب نثر اردو، سراہی اردو اور رنگ آباد دکن، بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء، ص ۱۸۳۔

ایضاً، بابت ۱۹۳۶ء، ص ۱۸۴۔

ہر چند یہ بیان ۶۵ برس پرانا ہے، لیکن کیا اس کے بعد اس معیار کی کوئی تاریخ لکھی گئی۔ اور وہ  
یہ تکمیل کو پہنچی؟ اگر نہیں تو اسے ایک ایسا قرض سمجھنا چاہیے جس کا اٹانا ابھی باقی ہے۔

## کتابیات

۱۔ عبدالحق، مولوی: ”چند تنقیدات عبدالحق“، طبع اول، دہلی، انجمن ترقی اردو دہندہ، ۱۹۳۹ء

## رسائل

- ۱۔ سماجی اردو، ادراک آباد رکھن، انجمن ترقی اردو، جلد ۴۔ بابت ۱۹۳۶ء
- ۲۔ ایضاً \_\_\_\_\_ جلد نمبر ۶۔ نمبر ۲۳، بابت جولائی ۱۹۳۶ء
- ۳۔ ایضاً \_\_\_\_\_ اکتوبر ۱۹۳۸ء
- ۴۔ ایضاً \_\_\_\_\_ جلد ۱۳۔ نمبر ۵، بابت جولائی ۱۹۳۳ء
- ۵۔ ایضاً \_\_\_\_\_ جلد ۱۴۔ نمبر ۵۳، بابت جنوری ۱۹۳۴ء
- ۶۔ ایضاً \_\_\_\_\_ جلد ۱۶، نمبر ۶، بابت اپریل ۱۹۳۶ء
- ۷۔ سماجی تحریر، دہلی، علمی مجلس، جلد ۳، شمارہ نمبر ۱، بابت اکتوبر دسمبر ۱۹۴۹ء



# مولوی عبدالحق کی خدمات

## قیام اورنگ آباد کے دوران

مولوی صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار مختلف مقامات پر گزرے ہیں۔ زمانہ طالب علمی کی ابتداء پنجاب سے کی لیکن علی گڑھ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تلاش معاش کے لیے بمبئی گئے اور حیدر آباد میں ملازمت کی۔ تعلیمی میدان کی دل چسپی اور ملازمت نے انھیں اورنگ آباد پہنچا دیا پھر کیا تھا اورنگ آباد کی سرزمین نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے اورنگ آباد سے دلی منتقل ہو گئے۔ جب تک دلی میں رہے اردو کی ترقی کے لیے متفکر اور مصروف رہے لیکن تقسیم ملک کے حالات نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ پاکستان چلے جائیں۔ وہاں جا کر نئے سرے سے کام کا آغاز کیا۔ یوں تو تمام عمر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تنگ و دو، کوشش اور جدوجہد کرتے رہے لیکن خاص طور سے اورنگ آباد کا زمانہ ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا زمانہ رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے تین اہم عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ ایک بحیثیت صدر مہتمم تعلیمات (۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۳ء تک) دوسرے معتمد انجمن ترقی اردو (۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۸ء تک) اور تیسرے پرنسپل عثمانیہ انٹر میڈیٹ کالج (۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۹ء تک) دارالترجمہ عثمانیہ کی خدمات، عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کی پروفیسری اور اردو لغت یہ ایسے کام ہیں جو حیدر آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب کی کام کی لگن اور ذمہ داری کے احساس نے حیدر آباد اور اورنگ آباد کے درمیان کے فاصلے کو کم کر دیا تھا ان کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ اورنگ آباد سے حیدر آباد کئی چکر کرتے تھے لہذا ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ اورنگ آباد کا ہی دور کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد بھی ۱۹۴۰ء تک ہر سال اورنگ آباد آتے رہے۔ محمد علی کے نام ایک خط تحریر کرتے ہیں کہ:

”میں نے بے شک تم سب کو ہدایت کی تھی کہ اورنگ آباد نہ چھوڑنا لیکن زمانہ کا انقلاب ہے کہ پہلے مجھے ہی چھوڑنا پڑا۔ مگر اس کی محبت اب تک میرے دل میں ہے بید ہاشمی

کہا کرتے تھے اورنگ آباد کے قدردان اورنگ زیب عالمگیر تھے یا عبدالحق آگے لکھتے ہیں کہ ۔

یہ بھی تم جانتے ہو کہ بڑا بھلا کام جو کچھ بھی مجھ سے بنا پڑا اس کا زیادہ تر حصہ اورنگ آباد میں بیٹھ کر کیا پھر میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔

مولوی صاحب علی گڑھ سے بی۔ اے کی ڈگری لے کر بمبئی روانہ ہوئے۔ پھر حیدر آباد دکن آئے حیدر آباد میں مدرسہ الکھفہ کے صدر مدرس رہے یہاں رسالہ افسر کی ادارت کی۔ ہوم آفس کی مترجمی پر مامور ہوئے اس وقت مشرعی جیری ہوم ڈپارٹمنٹ کے وزیر تھے کسی بات سے ناراض ہو کر مولوی صاحب نے حیدر آباد چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا انھی دنوں میں میر سعادت علی نے ڈاکٹر سراج الحسن ناظم تعلیمات سے سفارش کی کہ مولوی صاحب کو محکمہ تعلیم میں لیا جائے۔ مولوی صاحب کا حیدر آباد سے اورنگ آباد آنے کا واقعہ بھی دلچسپ ہے ریاست حیدر آباد کا ایک صوبہ میڈک تھا گو بنہ رام صاحب کالے اس صوبہ کے مہتمم تعلیمات تھے۔ گو بنہ رام کالے صاحب نے تین ماہ کی رخصت لی تو مولوی صاحب منصرم بنا کر بھیجے گئے۔ مئی ۱۹۱۱ء کو مولوی صاحب نے مہتممی تعلیمات صوبہ میڈک کا جائزہ دیا۔ خطوط عبدالحق مرتبہ اکبر الدین صدیقی میں درج ہے کہ محمد علی تعلیمات میڈک میں اہل کار تھے کالے صاحب نے اپنی رخصت میں توسیع کرنی چاہی تو محمد علی کو خط لکھا کہ اطلاع دو کہ کتنی رخصت اولیٰ بجا کرتی ہے لہذا کالے صاحب کی چھ ماہ کی رخصت منظور ہوئی اور چند دن بعد کالے صاحب کا تبادلوں اورنگ آباد ہو گیا اس لیے کارگزار مہتمم مولوی عبدالحق کو اورنگ آباد جانا پڑا لہذا ۱۹۱۱ء میں مولوی صاحب اورنگ آباد آگئے۔

اورنگ آباد میں کام کی نوعیت یہاں کی فضا اور یہاں کا ماحول مولوی صاحب کے مزاج اور افتاد طبع کے عین مطابق تھا چنانچہ اورنگ آباد کا قیام صحیح معنوں میں ان کی زندگی کا عہدِ زریں ثابت ہوا۔ یہاں تعلیم سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو ایک تحریک میں بدل دیا۔ مولوی صاحب ابتداء ہی سے فطرت کے حسین اور دلکش ماحول کو بہت پسند کرتے تھے اورنگ آباد شہر پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے باغوں کی کثرت ہے جگہ جگہ حوض،

۱۔ خط بنام محمد علی کراچی، دسمبر ۱۹۵۸ء خطوط عبدالحق مرتبہ اکبر الدین صدیقی ص ۲۱۰

۲۔ بیاد عبدالحق از محمد حبیب اللہ رشیدی ماہنامہ قومی زبان ستمبر ۱۹۶۶ء

۳۔ ہندوستانی ادب کے معمار عبدالحق از مختار الدین احمد ساہتیہ اکادمی ص ۲۵

فوارے، بھرنے خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں زمین دوز نہروں کا انتظام ملک غنبر کا ہے ڈاکٹر سر اج الحسن کے مشورے پر مقبرہ رابعہ دورانی کو جسے اورنگ زیب نے تاج محل کے نمونے پر تعمیر کیا تھا رہنے کے لیے منتخب کیا یہ بڑا ہی خوب صورت اور پرفضا مقام ہے مکان مقبرے کے شمال مشرقی سرسے برا حاطہ کی چار دیواری سے متصل تھا اس کے نصف حصہ میں مولوی صاحب کی سکونت تھی اور نصف حصہ میں انجن کا دفتر تھا۔ مقبرے کی حسین عمارت کے پیچھے پہاڑیاں دور تک پھیلی ہوئی ہیں اس زمانے میں یہ علاقہ اتنا غیر آباد تھا کہ مسعود حسن ہاشمی لکھتے ہیں کہ ایک وقت شیر باغیچہ کے حوض سے پانی پینے آیا تھا۔ مولوی صاحب کو یہ مقام بہت پسند تھا یکم نومبر ۱۹۵۸ء میں کماچی سے ساجد علی کے نام خط لکھتے ہیں کہ

اورنگ آباد کا وہ مقام جہاں میرا قیام تھا یعنی مقبرہ رابعہ دورانی اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کی صاف ستھری ہوا، غنبری نہر کے لطیف پانی، اس کے دلربا ماحول میں ایسی کشش تھی کہ حیدر آباد چھوڑنے کے بعد بھی میں ہر سال کچھ دن وہاں بسر کرتا اسے اپنی صحت توانائی اور مسرت کا ضامن سمجھتا اب بھی کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اورنگ آباد جاؤں اور چند روز مقبرے میں جا کر رہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسرت میرے ساتھ قبر میں جلے گی۔ باغبانی سے آپ کو خاص دل چسپی تھی یہ شوق بھی یہاں پورا ہوا آپ حکومت کی طرف سے اس باغ کے اعزاز میں نگران کار تھے۔ نام دیوا اسی باغ کا مالی تھا۔

مولوی صاحب صوبہ اورنگ آباد کی مہتممی تعلیمات پر فائز ہوئے تو اس زمانہ میں صوبہ کے چار ضلعوں کے لیے صرف ایک مہتمم تعلیمات مقرر تھا۔ مولوی صاحب چاروں اضلاع کا دورہ کرتے تھے زیادہ تر تھناتی مدارس تھے، جن میں چونکی تک تعلیم ہوتی تھی۔ گنتی کے وسطانیہ مدارس بھی تھے سر اکبر حیدری وزیر فینانس بنے تو محکمہ تعلیمات کے لیے خزانہ کا منہ کھول دیا۔ ہر سال مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کام بڑھ جانے کی وجہ سے صوبے بھر کے لیے چار انسپکٹر آف اسکولس مقرر ہوئے اس کے سال دو سال بعد ہر صوبے

۱۔ کچھ عرصہ بابا سے اردو کے ساتھ از مسعود حسن ہاشمی، قومی زبان اگست ۱۹۸۷ء ص ۱۱۹

۲۔ خط بنام ساجد علی خطوط عبدالحی مرتبہ اکبر الدین صدیقی ص ۱۷۵

۳۔ عظیم انسان از غلام ربانی سہ ماہی بابا سے اردو نمبر ۱۹۲۲ء ص ۴۲



کے لیے ایک صدر مہتمم تعلیمات مقرر ہوا۔ مولوی صاحب نے اورنگ آباد کے اضلاع کے علاوہ تعلقوں کے چھوٹے چھوٹے تختانی مدرسوں تک کا دورہ کیا۔ مولوی صاحب کا طریقہ تھا کہ پر بھنی اور نانہ بیڑ کے دوپے پر ٹرین سے جاتے تھے مگر اورنگ آباد اور بیڑ کے تعلقوں کا بڑا دلچسپ دورہ کرتے ایک خوب صورت ٹانگا اپنے لیے رکھ لیا تھا۔ نوکر پیشہ لوگ بیل گاڑیوں میں ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ بعض مقامات پر آپ کو پیدل بھی جانا پڑتا تھا۔ مولوی صاحب ہمیشہ اپنے کیمپ کے لیے دریا کا کنارہ پہاڑیوں کی وادی یا پُر فضا مقام تلاش کرتے اور آبادی سے باہر ڈیرے لگواتے تھے۔ آپ کے دوروں سے متعلق دلچسپ معلومات واقعات آپ کے مانتھین نے درج کیے ہیں۔ شیخ چاند مرحوم نے ہٹن ضلع اورنگ آباد کے دورہ کا ذکر ایک جگہ اس طرح کیا ہے۔

مولوی صاحب تعلیمات موبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تھے۔ دورہ کی تقریب میں وہ ہٹن سال میں کم از کم ایک بار ضرور تشریف لاتے۔ ان کی آمد آمد سن کر مدرسین کی سرگرمیاں بڑھ جاتی تھیں۔ ہر شخص اپنی کارگزاری کے اظہار میں سبے چین رہتا تھا۔ شہر کے باخبر لوگوں میں چرچے ہوتے تھے ہم پر ان چیزوں کا بڑا اثر ہوتا تھا وہ آتے تو معلوم ہوتا کہ علم و فضل کا دیوتا آرہا ہے۔“

مدرسے کی کتاب المائے میں ہدایاتیں لکھنے کے بجائے مولوی صاحب اساتذہ کو زبانی سمجھاتے تھے۔ اس طرح سے اساتذہ کو بھی کھلے دل سے اپنے مسائل پیش کرنے کا موقع ملتا تھا۔ تعلیم کے اھول بہت کار آمد تو ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات مقامی حالات کے پیش نظر ان پر عمل کرنا دشوار ہوتا ہے مولوی صاحب ان دشواریوں کو خوب سمجھتے تھے اپنی ہدایات میں آزادی عمل کی گنجائش رکھتے تھے۔

ڈاکٹر رحیم الدین کہاں نے لکھا ہے کہ ”اگر مولوی صاحب کی کتاب المائے میں مکھی ہوئی تحریریں ایک جگہ جمع کرنی جائیں تو فن تعلیم اور علم و ادب کے لیے ایک بہت ہی مفید ذخیرہ ثابت ہوں گے۔“ لیکن انوس کہ اب یہ دیکھنا ڈرستیاب نہیں ہے۔

نانہ بیڑ ضلع میں بیٹنا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں ایک مدرسہ وسطانیہ تھا مولوی صاحب نے وہاں

۱۔ بابا سے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کے چند حقیقت افروز پہلو از ڈاکٹر رحیم الدین کہاں سے ماہی اردو



کے مدرس کے طریقہ تعلیم کو بہت پسند کیا اور کتاب الہائے میں لکھا کہ ”مجھے غر ہو تا اگر میں ان کی ماتحتی کرتا“  
 موثر طریقہ تدریس اور اصول فن تعلیم سے واقف کر دانے کے لیے مولوی صاحب نے اورنگ آباد میں اساتذہ  
 کی ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس انجمن میں ایک مدرس علی سبق دیتا دوسرے مدرسین اسے دیکھتے اور آخر تنقید  
 کرتے مولوی صاحب اپنی صدارتی تقریر میں اس سبق پر نکتہ چینی اور غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ شیخ اقوام کو آگے  
 بڑھانے اور ترقی دینے کا خیال بھی مولوی صاحب کو تھا وہ مہتممان اصلاح کو زبان اور تحریر کی ہدایت کرتے  
 کہ تعلیمی رپورٹوں میں ان طلباء کی تعلیمی حالت کا خاص تذکرہ کیا جائے سید ساجد علی لکھتے ہیں کہ میں نے  
 ایک مرتبہ رپورٹ میں ان کی تعلیم کا ذکر علاحدہ سرخی قائم کر کے نہیں کیا بلکہ ضمناً کر دیا تو مجھے لکھا کہ  
 ”میں نے آپ کو ہار ہا تاکید کی ان بے بس اور بے کس شیخ ذاتوں کی تعلیم کا ذکر رپورٹ میں  
 خصوصیت سے کیا جائے مگر آپ نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ کیا سید بھی برہمن  
 ہو گئے ہیں“۔

مولوی صاحب اساتذہ کی خوب عزت کرتے تھے اس سلسلہ میں ساجد علی صاحب اور ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے  
 واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک انگریز ماہر تعلیم مسٹر میہو تھے مولوی صاحب کے ساتھ دوسرے پرستے اور کسی گاؤں  
 پر پہنچتے۔ مسٹر میہو کو کوئی بات بری لگی اور وہ بھری جماعت میں استاد پر برس پڑے مولوی صاحب یہ  
 دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور اپنے خیمہ میں واپس ہو کر مسٹر میہو کو لکھ بھیجا کہ وہ اسی وقت واپس ہو رہے ہیں۔  
 جب مسٹر میہو نے سبب پوچھا تو مولوی صاحب نے کہا کہ آپ استاد کو اس کے طالب علموں کے سامنے ڈانٹتے  
 ہیں اس طرح میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

مولوی صاحب تعلیم بالغان کی اہمیت سے بھی واقف تھے۔ تعلیم بالغان کے ذریعہ اردو کی اشاعت  
 کرنا بھی مقصود تھا۔ مڈلنگ پورہ کے بالغوں کو جمع کر کے مولوی صاحب انہیں خود پڑھاتے تھے۔ مولوی صاحب  
 نے اردو کا قاعدہ جدید طریقے پر بڑی محنت، توجہ اور مشوروں سے تیار کیا تھا اور اس کے ساتھ کلید قاعدہ بھی

۱۔ عظیم انسان از غلام ربانی سماہی اردو بابائے اردو ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۴۳

۲۔ مولوی صاحب اور تعلیمات از سید ساجد علی سماہی اردو ۱۹۶۲ء ص ۲۰۲۔

۳۔ بابائے اردو کی مقصد زندگی کے چند حقیقت افروز پہلو از محمد الدین کمال سماہی اردو ماہ اگست ۱۹۶۳ء ص ۳۶

چھوایا تھا اس قاعدے کا ذکر انجمن کی رپورٹیں اور خطوط میں ملتے ہیں۔

صدر مہتممی تعلیمات کے عہدہ کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب ۱۹۱۲ء سے معتد انجمن ترقی اردو کی اہم ذمہ داری بھی سنبھال رہے تھے۔ حیدر آباد کی عظیم شخصیتوں سر اس مسعود اور سر اکبر حیدری سے مولوی صاحب کے قریبی تعلقات تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی کوششوں سے مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کو انٹر میڈیٹ کالج بنادیا۔ اس کالج کی صدارت یا پرنسپل کے لیے ان سے زیادہ موزوں شخص کوئی نہیں تھا۔ پھر در فوج کی مجبوری کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے مولوی صاحب صدر مہتمم تعلیمات سے صدر عثمانیہ انٹر میڈیٹ کالج بن گئے۔ تعلیمی یا علمی میدان سے متعلق یہ ان کی دوسری اہم ذمہ داری تھی۔

جامعہ عثمانیہ سرکار عالی کے سال نامہ ۱۳۳۴ ف جلد اول میں درج ہے کہ حسب تحریک ناظم صاحب تعلیمات و منظور مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ میں تین انٹر میڈیٹ کالج قائم کیے گئے۔

۱۔ سٹی انٹر میڈیٹ کالج

۲۔ اورنگ آباد انٹر میڈیٹ کالج

۳۔ مدرسہ نسواں نام ہیں۔

اورنگ آباد میں امتحاناً دو سال کے لیے انٹر میڈیٹ کالج قائم کیا گیا ہے مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے جو صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات تھے کالج کے صدر مقرر ہوئے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو انٹر میڈیٹ کالج کی ابتداء ہوئی۔ پروفیسر عبدالقوی دستوی، محمد حبیب اللہ رشدی، اور اورنگ آباد میں مولوی صاحب کے شاگردوں مثلاً غلام جیلانی ہاشمی، عزیز الدین مغربی، شیخ احمد اورنگ آبادی سے ملاقات کرنے پر انھوں نے بتایا کہ اس وقت اورنگ آباد میں دو اسکول تھے۔ ایک مدرسہ فوقانیہ اور دوسرا انگلش ہائی اسکول۔ مدرسہ فوقانیہ کے صدر مدرس ملا شیخ داؤد تھے اور ہائی اسکول صدر الیس۔ آر۔ پیٹرک تھے۔ ہائی اسکول کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا اور فوقانیہ کا تعلق سلطنت آصفیہ کے ڈائریکٹر تعلیمات سے۔ حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو جانے کے باوجود اسکولوں اور کالجوں کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے رہا۔

وہاں کی دونوں اسکولوں کو ملا کر ایک بڑے اسکول ایک انٹر کالج بنادیا گیا۔ انٹر میڈیٹ کالج موجودہ ٹیٹو پریز اسکول اورنگ آباد کی عمارت کے دوسرے منزلہ پر کھولا گیا جب کالج کی پہلی جماعت قائم ہوئی تو مولوی صاحب نے اپنے خرچ سے ان تمام طالب علموں کو پچاس سال فوقانیہ کی تعلیم ختم کر کے جاپکے تھے واپس اورنگ آباد بلایا۔ غلام جیلانی ہاشمی نے دوران ملاقات بتایا کہ مولوی صاحب کو اختیار دیا گیا کہ اساتذہ ان دونوں اسکولوں میں متناسب ہوں اور لیے جائیں اس کے باوجود اگر اساتذہ کی ضرورت ہو تو باہر سے بلائیں مولوی صاحب لایق اساتذہ کو شمالی ہندوستان سے بلایا جامعہ عثمانیہ کے سال نامہ میں اساتذہ کے نام درج ہیں۔ ڈاکٹر نظرائیں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

مولوی صاحب چون کہ ایک طویل مدت تک محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے تھے لہذا وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اداروں سے اشخاص نہیں بلکہ اشخاص سے ادارے تشکیل پاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کا طرہ امتیاز و سرمایہ اقتدار اس کے ذی علم اساتذہ ہوتے ہیں کالج کی بدولت اورنگ آباد میں علمی و تہذیبی فضا پیدا ہو گئی۔“

عزیز الدین مغربی نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب کو طلباء سے اتنی محبت تھی کہ ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی شکایت برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور تو اور اس معاملہ میں اساتذہ کو بھی نہیں بخشنے۔ ایسے افسوس کو خطا وار ٹھہراتے اور کہتے کہ طالب علم کی غلطی تمہاری نااہلیت کا ثبوت ہے۔ طلباء تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کی جان ہے وہ کبھی کسی سے نہیں کھاتے تھے مگر طلباء سے گھل مل جاتے تھے۔ یہ

محمد شرف الحق صاحب لکھتے ہیں کہ

اورنگ آباد کالج کا وہ کیا دور تھا کالج نہیں بلکہ ایک بڑا مشترکہ خاندان تھا۔ اسٹاف ہو کہ طلبہ یہ ناممکن تھا کہ مولوی صاحب قبلہ کے اشارے کے خلاف چلنے کا خیال بھی دلوں میں لائیں۔ مولوی صاحب کو کالج والوں سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہ تھی کوئی ہینہ ایسا نہ ہوگا جس میں طلباء مولوی صاحب کے روپے ہڑپ نہ کر جاتے ہوں۔ مقیم طلبہ تو اس



معاملے میں بہت آگے تھے جہاں روپیوں کی ضرورت ہوتی مولوی صاحب کی خدمت میں  
دست سوال دراز کر دیا۔

غلام جیلانی ہاشمی کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کو طلباء اور پروفیسر صاحبان کو کھانا کھلانے کا بڑا شوق تھا۔  
جب بھی بورڈنگ کے بڑکوں کا دل چاہتا مولوی صاحب کے بنگلے پر چلے جاتے تھے۔ کئی مرتبہ مولوی صاحب  
طلباء کے طعام کے لیے بہترین اور عمدہ انتظامات کر کے تھے اور اس کام میں انھیں دلی خوشی ہوتی تھی۔  
جس بھی طالب علم کو ضرورت مند دیکھتے فوراً روپیوں سے اس کی مدد کرتے تھے۔ پارٹیوں اور دعوتوں  
کے کئی دلچسپ قصے ان کے شاگردوں نے سناے اور تقریر کیے ہیں۔ مسعود حسن ہاشمی لکھتے ہیں کہ  
”طلبہ کو مولوی صاحب کی طرف سے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا اور انجمن کے ذریعہ بھی طلباء کی امداد کی جاتی تھی۔  
کہیں کتابوں کی، کہیں نقد رقم سے اور کہیں کتابوں سے۔ مولوی صاحب کی نگرانی میں کالج ڈے بڑے  
اہتمام سے منایا جاتا تھا اس کی تیاریوں میں مولوی صاحب طلباء، اساتذہ اور دوست اجاب پوری دلچسپی  
اور توجہ سے مصروف رہتے تھے۔ ۲۵/۲۳ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا ۱۳۶۱ھ کا  
دلی کا آخری یادگار مشاعرہ ”پیش کیا گیا یہ مشاعرہ اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسے میں شب کے  
وقت اسی شان سے کیا گیا جو اس زمانے کی تہذیب اور وضع داری کے شایان تھا۔ اس میں خاص طور پر  
یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ہر چیز اسی زمانے کی ہو اور ہر شاعر اسی طبع اور وضع قطع میں آئے جو اصل میں تھی۔  
رحیم الدین کمال کا کہنا ہے کہ اس کے انعقاد میں ذوق اور حوصلہ کا ثبوت دیا گیا۔“

اس موقع پر کئی مہمان حیدرآباد، علی گڑھ اور دلی سے تشریف لائے گئیں راد تھتے کا کہنا ہے وہ  
دن یوم کالج سے زیادہ یوم اردو تھا اردو کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر اس تقریب میں شریک تھے  
طلباء کی علمی داد دینی پرورش کے لیے مولوی صاحب کالج سے ایک دو ماہی رسالہ ”نورس“

۱۔ مولوی صاحب قبلہ از محمد شرف الحق سماہی اردو بابائے اردو نمبر ص ۶۸ ۶۱۹۶۲

۲۔ کچھ عرصہ بابائے اردو کے ساتھ از مسعود حسن ہاشمی قومی زبان ۱۹۸۷ء ص ۱۳۰

۳۔ بابائے اردو کی زندگی کے حقیقت افروز پہلو از رحیم الدین کمال سماہی اردو ۱۹۶۲ء

۴۔ علی آدمی از گنیش راد تھتے قومی زبان اگست ۱۹۶۳ء ص ۷۳



شایع کر دیتے تھے۔ "نورس" کا نام انھوں نے بیجا پور کے شاہی فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تصنیف 'نورس' سے مستعار کیا تھا۔ ۱۹۲۵ء سے یہ رسالہ شروع ہوا اور انجمن کے مطبع میں چھپتا تھا۔ رسالہ معارف میں اس کے متعلق درج ہے کہ

اورنگ آباد کالج سے بیوہ نورس بہیم پہنچا ہے، اور اس لحاظ سے اورنگ آباد کالج اپنے اصل یعنی جامعہ عثمانیہ سے آگے بڑھ گیا ہے۔  
خطوط عبدالحی میں مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ

"اس کا نام میں نے بہت ہی مناسب رکھا ہے آپ سن کر بہت خوش ہوں گے 'نورس' ہر لحاظ سے مناسب ہے۔"

ایک مرتبہ ۱۳ جون ۱۹۲۸ء جہانگیر سرکشن پرشاد کی آمد پر ایک شاندار مشاعرہ کا انعقاد مقبرے میں کیا گیا اس کی منتخب غزلوں کا مجموعہ اور مشاعرے کے حالات محوی صدیقی نے تحریر کیے ہیں لکھتے ہیں کہ سرکشن پرشاد کی آمد پر مولوی صاحب نے شاندار مشاعرے کا انعقاد مقبرے میں کیا۔ گرمی کی ٹھنڈی اور پر کیف رات تھی۔ مشاعرہ ایک گوں حوض پر کیا گیا تھا یہ حوض بہت خوب صورت اور تقریباً دو فٹ گہرا ہے چاروں طرف خوش نما کنگرے بنے ہوئے ہیں۔ تمام حوض صاف و شفاف پانی سے بھر رہا تھا۔ آب بالکل سفید مرمریں نظر آتی تھی۔ کنگروں کے درمیان میں جو خلا تھا ہر ایک میں پانی کے اندر مختلف رنگ کی برقی روشنی کے قمقمے آویزاں تھے۔ ہر ایک کا رنگ جداگانہ تھا۔ ہوا کے جھونکے جب سطح آب کو خفیف جنبش دیتے تھے تو رنگین روشنیاں موجوں اور لہروں میں مل کر اپنی بوقلمونیوں کی عجیب بہار دکھاتی تھی۔ چوں کہ آسمان چاندنی سے محروم تھا۔ اس وجہ سے صاحب مشاعرہ کی جدت پسند دماغ اور ذوق سلیم لطافت مذاق نے عجیب لطف سے اس کی تلافی کر دی مقبرے کے سربلک و کوہ پیکر گنبد پر سرچ لائٹ اس صحن سے ڈالی گئی تھی کہ گنبد قلعہ نور نظر آتا تھا۔

۱۔ علی آدمی از گیش راؤ تھتھے قومی زبان اگست ۱۹۶۳ء ص ۷۳

۲۔ خطوط عبدالحی مرتبہ اکبر الدین صدیقی ص ۱۲۵

۳۔ ایضاً

غرض بڑا ہی حسین اور پر لطف منظر محوی صدیقی نے پیش کیا ہے مشاعرہ کا مصرعہ طرح  
اپنے رقیب آپ سے ہے ہم جہاں رہے۔

تھامہ مشاعرہ نے شعراء حضرات کو ہمرو کا تھان عطا کیا۔ مقبرہ کا مشاعرہ ۱۲ تیر کو ہوا اور ۵ تیر ۳۳، ۳۴ ف کو  
کالج میں کالج کے اساتذہ نے مشہور و مقبول ”ندامہ نکاح بالجبر“ دکھایا سرکشن پر شاد کے غیر مقدم کے لیے کالج کو  
دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا۔

محمد احمد سبزواری کہتے ہیں مولوی صاحب کا خطاب ”بابا سے اردو ابھی انھیں اور نگ آباد کالج کے ہوٹل  
سے ہی ملا تھا۔ ایک مرتبہ طلباء نے مولوی صاحب کو ہوٹل میں کھانے پر مدعو کیا کھانے کے بعد مولوی صاحب  
نے دریا مندرائیکم ہندی ہندوستانی کے متعلق اظہار خیال کیا طلباء جوش میں آ گئے ایک نوجوان محمد یوسف نے  
نعرہ لگایا ”اردو زندہ باد“ بابا سے اردو زندہ باد، پس پھر کیا تھا ساری محفل بابا سے اردو زندہ باد کے نعروں سے  
گو بھنے لگی۔ جب اس واقعہ کی خبر اور نگ آباد کے ایک ہفتہ وار مقامی اخبار میں شائع ہوئی تو سرخی تھی ”بابا سے  
اردو کا کالج کے طلباء سے خطاب“ پھر یہ خطاب حیدر آباد پہنچا اور وہاں سے اردو کے ساتھ ساتھ سانسے بڑھ کر  
میں پھیل گیا۔

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں مولوی صاحب وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے۔ رسالہ نورس کا عبداللہ بنبر  
شائع ہوا جس میں الوداعی جلسہ کی تفصیل اور تقریریں چھپی ہیں۔  
مولوی صاحب نے اپنی الوداعی تقریر میں کہا۔

”میری حالت اس مالی کی سی ہے جسے ایک بنجر زمین کے ٹکڑے پر باغ لگانے کے لیے  
مامور کیا گیا اس نے اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دیں اور چند برسوں میں ایک نہایت خوب  
صورت باغ پہلنے لگا۔ عین ایسے وقت اس مالی کو زبردستی ہٹا دیا گیا۔“

۱۔ بزم مشاعرہ یعنی مشاعرے کی منتخب غزلوں کا مجموعہ بمقام مقبرہ اور نگ آباد ۱۲ تیر ۳۳، فصل منعقد ہوا۔  
۲۔ ایضاً

۳۔ چند تاثرات از محمد احمد سبزواری قومی زبان اگست ۱۹۶۳ ص ۲۳

۴۔ مولوی صاحب قبل از شرف الحاق سے ماہی اردو بابا سے اردو نومبر ۱۹۶۳ ص ۶۹

یوں تو انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء میں قائم ہو گئی تھی مولوی صاحب ۱۹۱۳ء میں اس کے چوتھے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ملازمت اور انجمن کی ذمہ داری ساتھ ساتھ سنبھالنے کے لیے مولوی صاحب نے انجمن کو اورنگ آباد منتقل کر لیا یا یوں کہیے کہ بوسیدہ رسی سے کسا ہوا صندوق اور ذمہ داری کے احساس کو لے کر اورنگ آباد آگئے۔ انجمن کے آتے ہی اورنگ آباد علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ساجد علی کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

”یہ ایک نیچ تھا جو اڑنا اڑنا اورنگ آباد کی زرخیز زمین میں آپڑا تھا۔ چند ہی روز میں یہاں کی خوش آب و ہوا کی بدولت اس میں کوئی نپلین نکلیں اور ہوتے ہوتے یہ ایک تناور درخت بن گیا اور اس نے وہ نشاط انگیز بہاریں دیکھیں جو کم اداروں کو نصیب ہوتی ہیں۔“

انجمن کا قیام انجمن کے بے عطیوں اور چندوں کا وصول کرنا۔ انجمن کے لیے ارکان کی تلاش۔ دورے کرنا۔ مختلف مقامات پر کتب خانے اور شاخیں قائم کرنا۔ نایاب اور دیگر زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرنا۔ انجمن میں چھاپا خانہ لگوانا۔ انگلش اردو کثرت کی تالیف، اردو قواعد اور اردو لغت جیسی اہم کتابوں کی ترتیب و تدوین و کئی شعرا و شہسازوں کے متعلق کتابیں تحریر کرنا، دور دراز مقامات سے خطوط کی تلاش اور انھیں بصیرت افزا و مقدموں کے ساتھ شائع کرنا۔ جامعہ عثمانیہ کے لیے نصاب تیار کرنا۔ اردو اور سائنس جیسے معیاری رسالوں کی ادارت اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے کانفرنسیں، تقریریں، کانگریسی لیڈروں سے بحث و تکرار اور انجمن کی دلی منتقلی یہ تمام اتنے واقعات ہیں کہ اس مختصر وقت میں ان تمام وسیع موضوعات کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا اس کی تفصیل کے لیے علاحدہ مقالہ درکار ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کی کوششیں بھی مولوی صاحب کا اورنگ آباد میں رہ کر ایک اہم کارنامہ ہے اور دارالترجمہ عثمانیہ کی نظامت بھی ایک مکمل باب ہے۔ طوالت کے پیش نظر انداز کیا جاتا ہے۔



شجاع احمد زریبا  
سابق پرنسپل اسلامیہ کالج، کراچی

# مولوی عبدالحق اور ادو کا کالج کراچی

مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس نظام کے فیصلے کے مطابق انجمن کا صدر دفتر حیدر آباد دکن سے دہلی لے آئے تھے اور دریا گنج (ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی دارالسلام میں کراہیہ دار کی حیثیت سے مع انجمن مقیم ہو گئے تھے۔ حسن اتفاق سے تقسیم ہند کے موقع پر مولوی صاحب ۱۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو بذریعہ طیارہ حیدر آباد کی گرانٹ کے سلسلے میں حیدر آباد گئے ہوئے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں دہلی میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی واپسی کے لیے حیدر آباد سے بذریعہ ریل روانہ ہوئے ابھی بھوپال کے اسٹیشن پر پہنچے تھے کہ وہاں کے احباب نے دہلی کے فسادات کی خبر سنا لی اور انھیں بھوپال سے آگے جانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً بارہ دن انھیں بھوپال میں ٹھہرنا پڑا۔ وہ دہلی آنے کے لیے بے چین تھے۔ باہمی مشورے سے طے ہوا کہ کسی کو دہلی بھیج کر امن وامان کی حالت کی صحیح کیفیت معلوم کی جائے۔ علی شبر جاتھی معلوماتی مشن پر ۱۹ ستمبر کو دہلی گئے اور حالات کا مشاہدہ کر کے ۲۳ ستمبر کو بھوپال واپس پہنچے اور دہلی کے احوال سے اطلاع دی اور بتایا کہ انجمن کے دفتر پر پنجاب سے آنے والے مہاجرین نے حملہ کر کے تباہی پھیلادی ہے چنانچہ فی الحال مولوی صاحب کا دہلی جانا مناسب نہیں۔ مجبوراً مولوی صاحب حیدر آباد واپس چلے گئے۔ انجمن کے دفتر اور کتب خانے کی تباہی نے مولوی صاحب کو سخت رنجیدہ کر دیا تھا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پھر بھوپال واپس آئے اور وہاں سے مولانا آزاد کے سکرٹری اجمل خاں کو خط لکھا کہ میں دہلی آنا چاہتا ہوں۔ اگر مولانا آزاد کو اعتراض نہ ہو تو سر دست ان کے ساتھ ٹھہر جاؤں۔ اجمل خاں صاحب نے جواب دیا کہ مولانا کو کوئی اعتراض نہیں تو مولوی صاحب ۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو علی شبر جاتھی کے ساتھ دہلی آکر مولانا آزاد کی کوٹھی پر قیام پذیر ہوئے۔ اس زمانے میں مولانا آزاد کی مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ ساتھ رہتے ہوئے بھی مولوی عبدالحق صاحب سے ہفت روزہ چاند منٹ کی ملاقات میسر آتی تھی مولوی صاحب مولانا آزاد کے ساتھ قیام کو بے سود اور نامناسب سمجھتے ہوئے ایک ہفتے بعد



نظام پولیس گیسٹ ہاؤس میں اٹھ آئے۔ حیدر آباد پولیس کے گیسٹ ہاؤس میں آنے کے صرف چار روز بعد ہی انھیں معلوم ہوا کہ حیدر آباد کا ایک اعلیٰ اختیاراتی وفد حکومت ہند سے گفت و شنید کے لیے دہلی آ رہا ہے اور ان کا گیسٹ ہاؤس میں قیام ممکن نہ رہے گا۔ دہلی میں تلاش کے باوجود کوئی جگہ رہنے کے لیے نہ مل سکی۔

ابھی وہ حیدر آباد میں تھے کہ حکومت پاکستان کی وزارت تعلیمات کی جانب سے ایک اہم تعلیمی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ مل چکا تھا۔ اس کانفرنس کی شرکت کے لیے وہ ۱۵ روز دہلی میں رہ کر ۲۶ نومبر کو کراچی پہنچے۔ ۲۷ نومبر سے یکم دسمبر ۱۹۴۷ء تک کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک ہوئے جس میں برصغیر کے سربراہ اور وہ علما اور ماہرین تعلیم کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے بعد کراچی میں انھوں نے پرانے دوستوں اور شناساؤں سے ملاقاتیں کیں۔ غلام محمد صاحب سے ان کی پرانی یاد تھی۔ اب وہ پاکستان کے وزیر خزانہ بھی مقرر ہو چکے تھے۔ ان سے مولوی صاحب کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے دہلی میں انجمن کے صدر دفتر کی تباہی پر اظہار افسوس کیا اور مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ اب ان کا کیا ارادہ ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں میں اپنا کام نہیں چھوڑ سکتا اور جس طرح بھی ہو گا اس دفتر کو دوبارہ جماؤں گا۔ جناب غلام محمد صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ کانگریس ہندوستان کارپوریٹیشن پاس کر چکی ہے اور پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنانے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ گو ملک کی تقسیم عمل میں آچکی ہے مگر جہاں تک زبان اور تہذیب کا تعلق ہے اس کی تقسیم ممکن نہیں۔ آپ کی تحریک خالصتاً تہذیبی اور لسانی ہے اور آپ کا دائرہ کار دونوں ممالک تک وسیع ہے اور آپ پر دونوں ملکوں کی لسانی و تمدنی تحریک کے فروغ کے لیے جدوجہد کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آپ ہندوستان میں بھی اپنا کام جاری رکھیں اور پاکستان میں بھی اپنی تحریک کو منظم کریں۔ یہ بات اس لیے بھی مولوی صاحب کو پسند آئی کہ وہ اس وقت تک اردو کو ہندو مسلم اتحاد کی ایک روشن علامت تصور کرتے تھے اور ان کے عقیدے کے مطابق لسانیات کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انھوں نے کراچی میں اپنے احباب سے مشورہ کیا اور صلاح یہ ٹھہری کہ کراچی میں پاکستان کے لیے ایک مرکز قائم کیا جائے جو پاکستان کی شاخ ہائے انجمن کو کنٹرول کرے۔ اسی غرض سے قاضی فضل اللہ صاحب نے اپنی طرف سے طبر میں دس ایکڑ زمین دینے کا وعدہ کیا مگر پیر الہی بخش صاحب نے سردست کراچی کی کسی متروکہ عمارت کے الاٹ کرانے کا مشورہ دیا تاکہ کام فوراً شروع ہو سکے۔ مولوی صاحب کو انجمن کے لیے ہسپتال روڈ پر ساردامندر کے متروکہ اسکول کی بلڈنگ مل گئی مگر اس کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی بڑی تعداد آباد ہو گئی۔ اس عمارت کا خالی کرنا خود حکومت کے بھی بس سے باہر تھا۔ مگر علی شیر جاتی نے حکمت عملی سے کام لے کر ایک

ڈیڑھ ماہ کے اندر عمارت خالی کرائی اور اس طرح انجمن کا کراچی دفتر قائم ہو گیا جو صرف پاکستان کے لیے تھا۔ مولوی صاحب ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو زائد حسین صاحب کے ساتھ دہلی واپس آ گئے ان کا خیال تھا کہ کراچی کے دفتر میں پنڈت برنج موہن دتا تریہ کیفی اور مولوی سید ہاشمی فرید آبادی کو انچارج بنا کر خود ہندوستان کی انجمن میں رہیں اور ضرورت پڑنے پر کراچی آتے جاتے رہیں۔ دہلی میں وہ چند روز زائد حسین صاحب کے ساتھ ٹھہرے۔ پھر چند روز کے لیے علی گڑھ گئے وہاں ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہمدردان اردو کا جلسہ ہوا۔ مولوی صاحب یہ جاننا چاہتے تھے کہ دہلی کی کشیدہ فضا کے ہوتے ہوئے کیا انجمن کو علی گڑھ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اُس وقت یونیورسٹی کے وقار کا تقاضا یہ تھا کہ انجمن کو علی گڑھ نہ لایا جائے۔ لیکن شرکائے جلسہ نے اس امر سے اتفاق کیا کہ مولوی صاحب بدستور ہندوستانی محاذ پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۲۸ جنوری کو وہ سر سنج بہادر سپرو ویدرا انجمن سے صلاح مشورہ کے لیے لاہور آئے اور اٹاواہ ہوتے ہوئے ۳ فروری ۱۹۴۸ء کو دہلی واپس ہوئے۔ ۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو وہ سید ہاشمی فرید آبادی کے ساتھ لاہور گئے اور وہاں سے ۹ مارچ کو کراچی گئے تاکہ کراچی کے نئے دفتر میں ہاشمی صاحب کو بٹھادیں۔ وہاں سے ۲۳ مارچ کی صبح لاہور واپس آئے تاکہ پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس کی صدارت کریں۔ ۳۰ مارچ کو کراچی آئے اور یکم اپریل کو احمد آباد (گجرات) کے لیے روانہ ہوئے۔ ۳ اپریل کو گجرات اردو کانفرنس کی صدارت کی۔ اس موقع پر سید ہاشمی فرید آبادی اور پنڈت برنج موہن دتا تریہ کیفی صاحب بھی شریک تھے۔ ۴ اپریل کو وہ مع پنڈت کیفی کے کراچی گئے اور طے پایا کہ کیفی صاحب کراچی ہی میں قیام کریں۔ اسی زمانے میں کراچی کے جہانگیر پارک میں کیفی صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں کیفی صاحب نے صدارتی تقریر اس مصرع پر ختم کی۔

پروانہ چراغِ حسرم دار نہ داند

اس زمانے میں مولوی صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی ڈاکٹروں نے بحالی صحت کے لیے کوئیٹہ جانے کا مشورہ دیا۔ اگست میں کراچی واپس آئے۔ دہلی واپسی کے لیے طے ہوا کہ پہلے کیفی صاحب وہاں جا کر حالات کا جائزہ لیں اور رپورٹ بھیجیں۔ ۱۳ ستمبر کو حیدر آباد کے خلاف پولیس ایکشن ہوا۔ کئی ماہ سے فضا میں کشیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ کیفی صاحب نے لکھا کہ ہرگز ادھر کا رخ نہ کرنا۔ جو لوگ حیدر آباد سے تعلق والے ہیں دہلی میں ان پر سختی ہو رہی ہے۔ مولوی صاحب دہلی آنے کے لیے بے چین تھے بالآخر ۳ اکتوبر کو دہلی واپس ہوئے اور اس دفعہ سوئی والان کے ایک مکان خلیق منزل میں مقیم ہوئے۔ ان کا ارادہ دہلی میں انجمن کے لیے کوئی مکان حاصل کر کے از سر نو دفتر اور کتب خانے کا انتظام کرنا تھا۔ لیکن دہلی میں انجمن کے لیے کوئی مکان دینے کو تیار نہ تھا۔ عام افواہ یہ تھی کہ حکومت



انجمن کے خلاف ہے۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب کو ارباب حکومت سے مل کر معاملات کو صاف کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ انجمن کے کارکنوں کو پولیس نے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا اور مولوی صاحب کی دائرہ داری اور شیردانی دیکھ کر دہلی کی ہندو آبادی کی طرف سے تعجب کا اظہار ہوتا تھا۔ بہر حال وہ ۵ مارچ کو مولانا آزاد سے ملے۔ مولانا نے مولوی صاحب کی سرگذشت سننے کے بعد بقول مولوی صاحب یہ کہا کہ آپ کی ایک ٹانگ پاکستان میں ہے اور ایک ہندوستان میں۔ آپ کی نسبت بدگمانیاں بڑھ رہی ہیں۔ مولانا کو معلوم ہو چکا تھا کہ انجمن کے لیے کراچی میں مکان الاٹ ہو چکا ہے اور وہاں بھی مولوی صاحب مرکز قائم کر چکے ہیں۔ انھیں اس کا بھی شہرہ تھا کہ مولوی صاحب نے پاکستانی قومیت اختیار کر لی ہے۔ حالاں کہ واقعہ یہ تھا کہ مولوی صاحب کے پرمٹ پر جو پاکستان میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر شری پرکاش صاحب کے دستخطوں سے جاری ہوا تھا مولوی صاحب کو ہندوستانی باشندہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن مولانا آزاد نے مولوی صاحب کے پرمٹ کا اندراج دیکھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ جہاں تک کراچی کے مرکز کا تعلق ہے وہ پاکستانی شاخوں کے علاحدہ کنٹرول کے لیے تھا اور مولوی صاحب اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اردو کو ایک غیر سیاسی مسئلہ اور انجمن کو ایک غیر متنازع ادارہ سمجھتے ہوئے ان کے اس ارادے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ دونوں ملکوں میں کام کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک کی تقسیم واضح طور پر عمل میں آچکی تھی اب تو دونوں ملکوں کی اپنی اپنی علاحدہ لسانی پالیسیاں اور مصلحتیں تھیں۔ جہاں تک ایک مشترکہ قومی زبان کا تعلق ہے ہندوستان نے اب بجائے ہندوستانی کے ہندی کا تفوق قائم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مولوی صاحب قسم کے پرانے خیال کے لوگ جو اب تک ہندوستان اور پاکستان کے لسانی اتحاد اور تمدنی اکائی کے خبط میں مبتلا تھے، بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے میں دیر لگا رہے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اب سمجھنے کو کیا رہ گیا تھا۔ تبدیلی کو دیکھتے ہوئے بھی پرانی روایت کو سینے سے لگائے وہی ضد کیے جا رہے تھے جو تقسیم سے پہلے ان کا شعار تھا۔ مولانا آزاد سے ملاقات کے بعد مولوی صاحب کو احساس ہوا کہ وہ جو کچھ سمجھ رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں وہ ان حالات میں ممکن العمل نہیں یعنی :

۱۔ سب سے پہلے انھیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک مملکت کا انتخاب کریں۔ اور اسے اپنا سرگرمیوں کا مرکز بنائیں۔

۲۔ ذہنی اور عملی طور پر یہ خیال فوراً دل سے نکال کر پھینکنا پڑے گا کہ وہ بیک وقت دونوں ملکوں میں

یکساں قابل قبول ہوں گے۔

۳۔ کیوں کہ دونوں ممالک اب اپنی اپنی حکمت عملی اور مقاصد میں قطعاً آزاد اور خود مختار ہو چکے ہیں اس لیے انھیں بھی اپنی آزادی اور دائرہ اختیار کا تعین کیے بغیر ان ملکوں میں کوئی موثر اور قابل عمل عوامی تحریک شروع کرنے اور چلانے کا حق باقی رہ گیا یا نہیں۔

۴۔ مولانا آزاد کا یہ کہنا کہ ”آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں“ اور یہ کہ ”بدگمانیاں بہت ہیں“ آزاد ہندوستان کے نئے رہنماؤں کے طرز فکر کا عکاس ہے۔ اور مولوی صاحب کو اندر میں حالات یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا کہ کیا وہ ہندوستان میں رہ کر اپنی پُرانی روش کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

۵۔ انجمن کا صدر دفتر دہلی میں تھا جسے فسادات میں نقصان پہنچ چکا تھا۔ چونکہ مولوی صاحب ۱۹۴۷ء سے پہلے اسی دفتر میں کام کرتے تھے ان کی اپنی کتابیں بھی وہیں رہ گئی تھیں۔ مولوی اسد سید ہاشمی اور پنڈت دتاتریہ کیلی کی ذاتی کتابیں بھی وہیں پڑی تھیں۔ لہذا اب ناگزیر طور پر وہ پاکستان جاتے ہیں تو انجمن کے اثاثوں اور کتب خانے وغیرہ کا کیا ہوگا۔

مولوی صاحب نے اپنے ارادوں اور مجبوریوں کو مولانا آزاد سے بیان کیا۔ مولانا آزاد اپنی تمام تر ہمدردیوں کے باوجود اس پر قدرت نہ رکھتے تھے کہ مولوی صاحب کے ماضی کو اپنے اور ہندوستان والوں کے ذہن سے یکسر محو کر سکیں۔ یہ واقعہ تھا کہ مولوی صاحب نے زندگی بھر ہندی کی جارحانہ پیش دستی کی مزاحمت کی تھی اس لیے انھوں نے براہ راست گاندھی جی سے مجادلہ کیا تھا۔ خالص ہندی پرستوں کو وہ ہندو مسلم اتحاد کا دشمن سمجھتے اور کہتے رہے۔ انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور دلوں کو پھیلانے اور منوانے پر صرف کی تھیں۔ کیا نیا ہندوستان انجمن ترقی اردو اور اس کے رہنما کے اس طرز عمل کو برداشت کر سکتا تھا۔ تقسیم کے بعد اردو والوں کو تو یہ کہنا تھا کہ وہ ہندی کے حریف نہیں حلیف ہیں۔ اور اگر ہندی کے بجائے اردو کو بھی صرف جینے کا حق دے دیا جائے تو وہ اسی پر قانع اور مطمئن ہیں۔ کیا مولوی عبدالحق اس نئے انداز نظر کو قبول و اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے وہی فیصلہ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ کیوں کہ فیصلہ تو حکومتی سطح پر ہو چکا تھا اور اردو کو ہندی کے مقابلے پر حریفانہ کھڑا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ مولانا آزاد نے مولوی صاحب کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ پاکستان جانا چاہیں گے تو انجمن کی منصفانہ تقسیم میں بھی کوئی دشواری نہ ہوگی۔ لیکن دہلی پولیس نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو انجمن کا کتب خانہ سربراہ کر دیا اور پہرے پر دو سپاہی مقرر کر دیے گئے کہ اب مولوی صاحب اس کے کتب خانے میں داخل نہ ہو سکیں۔ انجمن کے دفتر اٹاک اور کتب خانے کی تقسیم کبھی عمل میں نہ آ سکی۔ سر تیج بہادر سپرو صدر انجمن نے ڈاکٹر تارا چند





اہم اور تاریخ ساز باب ملک کے سیاسی انقلاب کی زد میں آکر بند ہی نہیں ہوا مٹ گیا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کی تشکیل و تنظیم جس انداز میں کی تھی اور جس طرح اسے ایک ملک گیر ادارہ بنایا وہ ایک ہی جھٹکے میں مسمار ہو گیا تھا۔ اس کی بربادی اور تباہی مولوی صاحب کے درخشاں ماضی کی مکمل نفی تھی۔ ایک تو یہ غم تھا کہ اب وہ گھوم پھر کر اسی مقام پر آگئے تھے جہاں سے یہ سفر شروع کیا تھا۔ انجمن کی بربادی سے بڑا سانحہ عثمانیہ یونیورسٹی کے انقلاب کا تھا اس طوفان میں جو ریاست حیدرآباد کے خلاف ہندوستان کی "پولیس کارروائی" کے جلو میں آیا پہلا کاری وار جامعہ عثمانیہ پر ہوا۔ حیدرآباد کے مٹری گورنر نے ریاست پر قبضہ ہوتے ہی حکم جاری کر دیا کہ اردو ذریعہ تعلیم کے اس کامیاب تجربے کو جو ملک بھر میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثال تھا اور ملک کی کسی دوسری زبان نے اس قسم کا قدم اٹھانے کی ابھی تک ہمت ہی نہ کی تھی بہ یک جنبش قلم خارج از آہنگ سمجھ کر مٹانے کا حکم جاری کر دیا۔ جامعہ عثمانیہ مولوی عبدالحق صاحب کی عمر بھر کی جدوجہد اور سرگرمیوں کا ماحصل تھی۔ کسی زبان کی زندگی اور موت کے لیے اس سے محبت کرنے والوں اور اسے بولنے والوں کی کثیر تعداد کے علاوہ اسے ذریعہ تعلیم کے بطور اختیار کرنے والوں کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق کی جہد و کوشش کا نتیجہ تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی پہلی درخواست جو حضور نظام کی منظوری کے لیے پیش کی گئی تھی وہ مولوی عبدالحق ہی کے تراش قلم کا شاہکار تھی۔ پھر جامعہ کے قیام کے ہر مرحلے میں مولوی صاحب نے اس باب جامعہ کے ساتھ تعاون کیا ہر دشواری کے حل میں مدد دی اور مکمل تعاون کیا۔ اس جامعہ کی کامیابی اردو تالیفات و تراجم کے بغیر ممکن نہ تھی۔ چنانچہ ایک دارالترجمہ اور مطبعہ کا قیام عمل میں آیا جہاں ہر علم و فن کی کتابیں تیار کر کے شائع کی گئیں۔ اس میں مولوی صاحب اور ان کے رفقا کا مکمل تعاون نمودار و نمایاں تھا۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ مولوی صاحب کی امیدوں اور آرزوؤں کا ایک ایسا حسین مرقع تھی جس پر اگر مولوی صاحب یہ سمجھتے کہ ریحہ تادم از زندگی خویش کے کارے کر دم، تو بے جا نہ تھا۔ اس جامعہ کو اب سیاسی مصلحتوں کی بمینڈ چڑھایا جا رہا تھا۔ اعلان ہو گیا تھا کہ اگلے تعلیمی سال یعنی ۱۹۴۹-۵۰ سے اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کا سلسلہ قطعاً بند کر دیا جائے گا۔ دارالترجمہ کو حکم ہوا کہ اپنا کام فی الفور بند کر دے۔ کیونکہ اگلے سال سے ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگی اور اس کے لیے کتابوں کی تیاری کے لیے کسی الگ شعبے کے قیام ہی کی ضرورت نہیں۔ مولوی صاحب نے آخر جنوری ۱۹۴۹ء تک ہندوستان میں رہ کر یہ تماشا دیکھا۔ ہر چند کہ وہ اس پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ زبانیں حکومت کے احکام کی پابند نہیں ہوتیں۔ ان کا بنانا یا بگاڑ ناسرکاری فرامین پر منحصر نہیں ہوتا۔ دنیا میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہن دبا کر قوموں کے منہ سے ان کی زبان چھین لی جائے اور اگلے لمحے دوسری زبان رواج پا جائے۔ لیکن تاریخ کے مطالعہ نے ان کو



یہ بھی بتایا کہ یورپ کی قومی ریاستوں میں (دنیا کی تاریخ میں پہلی بار) زبان کی بنیاد پر بھی جنگیں لڑی گئی ہیں اور مفتوحہ قوم کی زبان کو مٹانے اور پامال کرنے میں ریاستی جبر کا استعمال ہوا۔ اساس، دولزین، چیکو سلواکیہ، ٹیرول اور پولینڈ میں صرف زبان کی خاطر بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ پولینڈ میں اس سلسلے میں سب سے زیادہ تشدد ہوا لیکن پول ایک زندہ قوم تھے انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کی زبان کا سرعام بولنا قانوناً ممنوع ہے تو گھروں کے اندر اور تہہ خانوں میں بیٹھ کر اپنی زبان کے شعرا کا کلام پڑھا اور بچوں کی تربیت خاموشی کے ساتھ اپنی زبان میں کرتے رہے تاکہ ان کی زبان مٹ نہ سکے۔ البتہ اب دنیا کے حالات بدل گئے تھے۔ نئے دور میں حکومتوں کے پاس کچھ ایسے آلات اور ذرائع ہیں کہ وہ بہت جلد ایک زبان کے رواج کو ختم کر کے ایک نئی اور اجنبی زبان کو رائج کر سکتے ہیں۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ اور نصاب کو کنٹرول کر کے خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اور اب یہ کہنا کہ ایسا نہیں ہو سکتا حقائق سے آنکھیں چرانے کے مرادف ہو گا۔ مولوی صاحب نے جو قیاس کیا تھا اس کے بارے میں ہندوستان کے گزشتہ ساڑھے تینتالیس سال کا لسانی نقشہ ہمارے سامنے ہے۔ دوسری زندہ مثال اسرائیل کی ہے جہاں ایک ہزاروں سال پرانی مردہ زبان کو اس کی قبر سے اکھاڑ کر اس میں از سر نو زندگی کی روح پھونکی گئی ہے اور آج ریاست کے اندر جگہ کاروبار اسی زبان میں انجام دیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں گوہندی کی ترویج کی رفتار اسرائیل کی نسبت سست تر ہے اور گواہ چالیس سال پہلا سا جوش و خروش قدرے ماند پڑ گیا ہے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جدید ہندی کی بنیادیں مضبوط کی جا چکی ہیں اور اس کا سفر متعینہ راستے پر آہستہ روی مگر کمال احتیاط کے ساتھ جاری ہے۔ یوپی کے علاقوں کے وہ بچے جو آزادی کے بعد پیدا ہوئے ہیں اردو لکھنے پڑھنے سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اب نئے بچے پاکستان خط بھیجتے ہیں تو ہندی رسم الخط استعمال کرتے ہیں جسے وہاں پڑھنے والے میسر نہیں آتے۔ چند سال بعد واقعی یہ دونوں ملک صحیح معنوں میں ایسے ملک ہو جائیں گے جہاں تہذیب و تمدن، افکار و خیالات وغیرہ میں یکسانی کی کوئی رقی بھی باقی نہ رہے گی۔ مولوی عبدالحق صاحب اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک مشترک تہذیب کے فروغ کی ضرورت محسوس کرتے رہے کہ اس کا ذریعہ ان کے نزدیک مشترکہ زبان تھی۔ انھیں نظر آ رہا تھا کہ ہندوستان آہستہ آہستہ ایک نئی زبان مروج کر رہا ہے۔ اور اس زبان میں مشترکہ تہذیب کی چھاپ نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ جامعہ عثمانیہ کاسب کیا دھرا اس طرح مردہ اور بے کار ہو جائے گا اس سرمائے کو بچانے کے لیے انجمن ترقی اردو پاکستان کے پہلے ہی اجلاس میں جو کراچی میں ۱۳ جنوری ۱۹۴۹ء کو ملک غلام احمد کی زیر صدارت ہوا، یہ فیصلہ کیا گیا کہ انجمن کی طرف سے ایک اردو کالج قائم کیا جائے نیز صدر جلسہ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ تمام کان ہندوستان سے لسانی روابط قائم رکھنے

کی کوشش کی جائے جو نہ صرف زبان اردو کی حفظ و بقا بلکہ عام تہذیبی اور مجلسی تعلقات کے لیے بھی مفید ہوگی۔  
انجمن ترقی اردو پاکستان کے پہلے اجلاس میں جو حضرات شریک ہوئے اس میں انجمن کے سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کے علاوہ جناب ملک غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان، جناب شعیب قریشی صاحب، جناب چودھری خلیق الزماں صاحب، جناب حکیم محمد حسن صاحب، جناب صدیقی علی خاں صاحب، جناب پیر الہی بخش صاحب، اور جناب مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی شامل تھے۔ اس اجلاس کے پہلے فیصلوں میں اردو کالج کا قیام یہ ظاہر کرتا ہے کہ مولوی صاحب اسے کتنا اہم اور ضروری سمجھتے تھے پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ تجویز کے صرف چھ ماہ کے اندر اندر اس تجویز کو عملی صورت بخش دی گئی اور یوں کہا جاسکتا ہے کہ کراچی آکرا انجمن کا اہم ترین کارنامہ اردو کالج کی بنا اور اہتمام تھا۔

میں ۱۹۶۸ء میں اردو ڈان میں بحیثیت سب ایڈیٹر ملازم ہوا اور ۳۱ مارچ ۱۹۶۹ء کو تخفیف میں آگیا۔ اس وقت حکیم اسرار احمد صاحب کمریوی مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں لے گئے، مولوی صاحب کراچی میں انجمن کی بنیاد میں رکھ رہے تھے۔ انھیں اپنے ذاتی کتب خانے کی کتابوں کی ترتیب کے لیے ایک آدمی کی ضرورت تھی بہت کم مشاہرے پر میرا تقرر کیا اور اپریل کے شروع میں مجھے مولوی صاحب کے ساتھ ان کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں اردو کالج کے انتظامات شروع ہوئے۔ مولوی سید تقی الدین صاحب جو اس وقت انجمن کے شریک مستند انتظامی تھے کالج کے انتظام و انصرام میں ہمد تن مصروف ہو گئے۔ ۲۹ مارچ ۱۹۶۹ء کالج کے ہال میں بہت سے افراد کو مدعو کیا گیا جس میں مولوی صاحب کے ایما پر میں بھی شریک ہوا اور طے پایا کہ مولوی محی الدین صاحب جو کراچی آگئے تھے، کالج کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں۔ اس جلسے میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جناب نجم الہدی صاحب مرحوم، مولوی عبدالرشید صاحب فاضل مرحوم، جناب مولوی فصیح الزماں خاں، مولوی محمد عارف صاحب مرحوم، مولوی عبدالسلام صاحب اور مولوی منظر علی صاحب کامل اور مولوی منتخب الحق قادری وغیرہ شریک ہوئے۔ جلسے کے شرکائے نئے کالج کی تشکیل کا خیر مقدم کیا اور اس کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ طے پایا کہ کالج کے داخلے شروع کر دیئے جائیں اور جب معقول تعداد فراہم ہو جائے تو تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ مولوی صاحب کراچی آکر پہلے ہی کالج کے نصاب تعلیمی و مصارف نیز عمارت کی اسکیم تیار کر چکے تھے اس میں انھوں نے سندھ مسلم کالج کے ڈاکٹر ہاشمی سے مدد لی تھی۔ ۳۱ مارچ کو انھوں نے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ابو بکر احمد عبدالعظیم صاحب سے ملاقات کی اور ان سے کالج کے قیام کی تجویز پر تہا دل خیال کیا وائس چانسلر نے جامعہ سندھ کی شرائط الحاق کے



کاغذات اور الحاق کے فارم دے دیے۔ مولوی صاحب نے شرائط الحاق کا بغور مطالعہ کر کے اس کی جملہ شرائط کی تکمیل کی اور الحاق کا فارم ۲ مئی کو پُر کر کے علیم صاحب کو پیش کیا انھوں نے مشورہ دیا کہ فارم میں بطور خاص اردو ذریعہ تعلیم کی صراحت کی جائے تاکہ کالج کی خصوصیت خاصہ کا پورے طور پر اظہار ہو جائے چنانچہ یہی کیا گیا۔ اس کے بعد ۲۳ جون کو کالج کی مجلس انتظامی کا اجلاس بلایا گیا جس میں حسب ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

- ۱۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی
- ۲۔ جناب شعیب قریشی صاحب
- ۳۔ جناب عبدالواحد صاحب ناظم جنگلات
- ۴۔ جناب سید تقی الدین صاحب
- ۵۔ جناب سید محی الدین صاحب
- ۶۔ جناب قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی
- ۷۔ جناب سیٹھ عبداللطیف رداوی
- ۸۔ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
- ۹۔ جناب عاتم علوی صاحب
- ۱۰۔ جناب ڈاکٹر محمود حسن خاں صاحب

مجلس انتظامی نے طے کیا کہ چونکہ یونیورسٹی کا تعلیمی سال شروع ہونے والا ہے اس لیے کالج جلد از جلد قائم کر کے یونیورسٹی کو مطلع کر دیا جائے سال اول اور سال سوم کے لیے طلبہ کا داخلہ شروع کر دیا جائے چنانچہ جب خاصی تعداد میں طالب علم داخل ہو گئے تو تدریس کے آغاز کے لیے مولوی صاحب سے اقتتاحی کلمات ادا کرنے کی درخواست کی گئی چنانچہ ۲۵ جون ۱۹۴۹ء کو صبح کے گیارہ بجے طلبہ اور اساتذہ کالج کے ایک کمرے میں جمع ہوئے سید تقی الدین صاحب شریک معتمد انتظامی اور ان کے برادر بزرگ مولوی محی الدین صاحب جنھیں عارضی طور پر کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا شریک جلسہ تھے مولوی صاحب کی تشریف آوری کے بعد تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا پہلے مولوی سید محی الدین صاحب پرنسپل نے کالج کے اغراض و مقاصد پر مختصر گفتگو کی اس کے بعد جناب مولوی صاحب نے فرمایا:

”ہم آج ایسی تحریک کا آغاز کر رہے ہیں جو پاکستان کے لیے بالکل نئی ہے ہم نے اس کو نہایت سادگی سے شروع کیا ہے۔ اگر ہم چاہتے تو بہت بڑا ہنگامہ، دعوتیں منیافتیں کر سکتے تھے لیکن ہم نے ان ہنگاموں اور طرح طرح کے شور و غل کے مقابلے میں سادگی کو پسند کیا اس لیے کہ ہم لٹ کر اور پٹ کر یہاں آئے ہیں ہم نے مصائب اور آلام برداشت کیے ہیں ہم نے اپنی آنکھوں سے قتل و غارت کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم خون کی ندی تیر کر یہاں پہنچے ہیں ہمارے لیے ہنگامے اور دعوتیں زیادہ نہیں۔

دوسرے یہ کہ ہم دعوے سے پہلے عمل سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جو کام جو

تحریک ہم نے شروع کی ہے وہ کس قدر قابل عمل ہے اور ہماری قومی زبان اور پاکستان کے لیے یہ کس قدر ضروری اور مفید ہے اس کو ثابت کرنے کے بعد ہم کو حق حاصل ہوگا۔ لیکن عمل سے پہلے بڑے بڑے دعوے کرنے کا حق ہمیں حاصل نہیں۔ ہم کو چاہیے کہ جو لوگ شک و شبہ میں ہیں ان کو اپنے عمل سے یہ بتادیں کہ ان کے شبہات غلط اور بے بنیاد ہیں۔“

مولوی صاحب نے مزید فرمایا کہ :

”اس کالج کے قائم کرنے سے ہمارا مقصد ایک نو قومی زبان کی برتری ثابت کرنا ہے اور دوسرے اس زبان کے ذریعہ علم کی اشاعت ہے۔ ہم کو ایک غیر زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اور پاکستان بننے کے بعد بھی دی جاتی ہے یہاں تک کہ عربی فارسی اردو زبان و ادب کی تعلیم بھی انگریزی زبان کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ انگریزوں نے ہماری حکومت اور تہذیب و تمدن کو مختلف طریقوں سے ختم کیا۔ اس میں خود ہماری غداری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ مادی فتح اور دولت و قوت ہمیشہ قائم رہنے والی نہ تھی۔ انگریز دوسرے فاتحوں سے زیادہ ہوشیار تھے۔ اس لیے انھوں نے انگریزی زبان کے ذریعہ روحانی اور ذہنی فتح حاصل کی۔ یہ سب سے زیادہ خطرناک تھی اور اس کے اثرات اب تک برقرار ہیں اور ہمارے ذہن اور دماغ پر مسلط ہیں۔“

انھوں نے کہا کہ :

”غیر زبان سیکھنا عیب نہیں ہم نے بہت سی غیر زبانیں سیکھیں اور سیکھتے ہیں لیکن کسی غیر زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے سے نہ ہم اس زبان پر عبور حاصل کر سکے اور نہ علوم پر۔ بس طوطے کی طرح کچھ چیزیں رٹ لیں اور انگریزی تہذیب و رسم و رواج اور زبان کو اختیار کر لیا اور ہم میں سب سے بڑا شخص وہ سمجھا جانے لگا جو زیادہ سے زیادہ انگریز کی تقلید کرے اور دل میں اپنے آپ کو انگریز سمجھے۔ اس طرح ہم میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس کی زبان، عادات و رفتار کردار سب انگریز کے تھے۔ انگریز نے جب ہماری تعلیم کو اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس نے یہ صاف صاف اعلان کیا کہ ہم انگریزی زبان

کے ذریعہ اہل ہند کو تمام علوم سکھانا چاہتے تھے تاکہ وہ ہمارے جیسے ہو جائیں یعنی کہ خود اپنے  
تہذیب و تمدن کو بھولی جائیں اس ضمن میں سب سے زیادہ کوششیں عیسائی مشنریوں  
نے کیں کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے میں آسانی ہوگی۔  
اگرچہ ہم عیسائی نہیں ہوئے لیکن ہماری تہذیب اور فکر و خیال انگریز یا عیسائی.....  
ہو گئے۔ یہ انگریز کی بہت بڑی فتح ہے۔“

انھوں نے کہا کہ :

”اس کالج کے قیام سے ہمارا مقصد اس ذہنیت اور رجحان کو مٹانا اور اپنے اخلاق و عادات  
اور تہذیب کی تجدید کرنا ہے۔ قومی زبان کی اہمیت اور قوت سے بہت کم لوگ  
واقف ہیں۔ یہ صرف بات چیت کرنے یا کتابیں پڑھنے تک ہی محدود نہیں۔ قومی زبان  
میں تو قوم کے سارے کردار ہوتے ہیں اور اس کا بولنے والا اس کی نمائندگی کرتا ہے۔“

مولوی صاحب نے اس کے بعد یاد دلایا کہ مسلمانوں کے دور حکمرانی میں کسی زبان پر جبر نہیں کیا گیا تاریخ کے  
مطالعے سے ثابت ہو جائے گا کہ سنسکرت اور ہندی کے اعلا درجے کے ادیب اور شاعر اسلامی عہد حکومت میں ہوئے  
ہیں۔ بنگالی زبان کو پنڈتوں اور برہمنوں نے بالکل مٹا دیا تھا۔ وہ بنگال میں سنسکرت پھیلانا چاہتے تھے مسلمان حکمرانوں  
نے بنگالی کو دوبارہ زندگی بخشی بڑے بڑے ادیب بلائے سنسکرت کی اہم کتابوں کے ترجمے کرائے اور اس زبان کے  
ادیبوں کو انعامات اور منصب عطا کیے۔ اس طرح بنگالی زبان کو عروج ہوا۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے بتایا کہ ملک  
گیری کے لیے تو جنگ و جدال ہوتی تھی مگر زبان کے لیے جنگ یورپ سے آئی ہے۔ الساس، لوزی، چیکو سلواکیہ، پول  
اور پولینڈ وغیرہ میں صرف زبان کی خاطر بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں زندہ قوموں نے اس کے لیے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں  
جرمنوں نے پولینڈ میں قانوناً حکم نافذ کر دیا تھا کہ کوئی شخص نہ پولستانی زبان بولے نہ لکھے اس حکم کے منوانے کے لیے  
سزائیں دی گئیں، لوگوں کو جیل میں ڈالا گیا، کوڑے مارے گئے مگر پولینڈ والوں نے اپنی زبان نہ چھوڑی انھوں نے اپنے  
شعرا کا کلام تہہ خانوں میں بیٹھ بیٹھ کر نقل کیا۔ پولیس رات کو بھی گشت کرتی تھی اور پولستانی زبان بولنے یا لکھنے پڑھنے  
والوں کو پکڑتی تھی یہ لوگ پولیس سے محفوظ رہنے کا انتظام کرتے تھے اور اپنی زبان کی حفاظت کے لیے بڑی کوشش کرتے  
رہے انتہائی سختیاں برداشت کیں مگر پولش زبان کو زندہ رکھا۔ یہ قومی زبان کا روحانی پہلو ہے۔ لسانیات و سیاسیات  
کے ماہرین یہ نہیں جانتے کہ زبان کا ایک روحانی پہلو بھی ہوتا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو لوگ زبان کے لیے اتنی محبتیں کیوں



برداشت کرتے ماہرین لسانیات الفاظ کے اشتقاق، اصل مانتے اور ساخت کی الجھنوں میں پڑے رہتے ہیں اس کے روحانی پہلو پر اس کی نظر نہیں جاتی۔ مولوی صاحب نے زور دے کر کہا کہ جو لوگ آقاؤں کی زبا خوشامد یا ذاتی اغراض کے لیے سیکھتے اور اپنی زبان سے شرماتے ہیں وہ بے غیرت اور بے آبرو ہیں اور بے آبرو لوگ مردہ ہوتے ہیں ان میں زندگی نہیں ہوتی ہے جو قومیں مردہ ہو جاتی ہیں ان میں قومی زبان کی روحانی قوت نہیں رہتی۔ ہندوستان میں ہماری زبان کو جس طرح فنا کیا جا رہا ہے اس سے آپ سب بخوبی واقف ہیں اگر ہم میں قومی زبان کی روحانی قوت باقی ہے تو عدالتوں دفتروں سے اردو کو ختم کرنے سے اردو فنا نہ ہو جائے گی۔ جس طرح پولینڈ میں مائیس دروازے بند کر کے بچوں کو اپنی زبان سکھاتی تھیں اسی طرح یہاں بھی ہر دشواری کے باوجود اپنی زبان سکھانی ہوگی۔

انھوں نے مزید کہا کہ :

”اب ہم پاکستان میں ہیں ہماری ذمہ داری اور فرض ہے کہ اپنی قومی زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے کوشش کریں بلکہ تمام ملک میں پھیلائیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ اس زبان کو پاکستان میں لائے ہیں یہ یہاں کے کسی علاقے کی زبان نہیں مگر ہندوستان میں بھی یہ کسی علاقے کی زبان نہ تھی۔ بلکہ تمام ملک کی زبان تھی اسی طرح یہاں (پاکستان) تمام ملک کی مشترکہ قومی زبان ہے۔ زبان کی ترقی ایک تو اس کے بولنے والوں سے ہوتی ہے جو اس پر پورا ایمان رکھتے ہیں دوسرے زبان کی صلاحیت سے۔ زبان کبھی کوتاہی نہیں کرتی۔ کوتاہی اہل زبان کی طرف سے ہوتی۔ ہماری زبان نے کبھی کوتاہی نہیں کی جب صنایع بدائع کا زمانہ تھا تو اس کا ساتھ دیا پھر سادگی کا دور آیا تو اس کے سانچے میں ڈھل گئی اب جب علم و فن کا زمانہ آیا تو اس میں بھی کامیاب اتھری جامعہ عثمانیہ میں اس کا مکمل تجربہ کیا اور ثابت کر دیا کہ یہ علوم و فنون کی تعلیم کے لیے ہر طرح موزوں ہے۔ اب جامعہ عثمانیہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی لیکن ہم پاکستان میں اس کے کام کو باقی رکھیں گے ہم یہاں ایک نئی جامعہ بنائیں گے بھوئی ہوئی چیز حاصل کرنا آسان نہیں اس مقصد میں کامیابی کے لیے صبر و استقلال اور محنت و خلوص لازمی ہیں۔

جب ہم نے یہ کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو مجھ سے کہا گیا کہ سرمایہ کہاں ہے،



کتا ہیں کہاں ہیں، اساتذہ کہاں ہیں ہمارا سب سے مقدم سرمایہ ہمارا ایمان ہے ہمارا دوسرا سرمایہ یہ طالب علم اور اساتذہ ہیں یہ اس کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ ہمارا مقصد صرف چند کتا ہیں پڑھا دینا نہیں نصاب کی پانچ چھ کتا ہیں پڑھ کر کوئی عالم نہیں بن جاتا ایک اوسط درجے کی لیاقت کا شخص اپنے مطالعے اکتب خانوں اور اخباروں کی مدد سے اس قدر قابلیت حاصل کر سکتا ہے جو کالج کے طالب علم میں ہوتی ہے مگر یہ قابلیت اور ذہانت انسانیت کے لیے کافی نہیں اس کے لیے اخلاقی قوت اور اخلاقی جرأت سچے عزم و استقلال کی ضرورت ہے۔ اخلاقی جرأت یا نیکی بدی کی تمیز کتا ہیں پڑھنے یا کالج کے لیکچروں سے حاصل نہیں ہوتی یہ صاحب علم اور صاحب اخلاق اصحاب کی صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا سامان ہم نے خاص طور پر آپ کے لیے مہیا کیا ہے۔

آپ کی یہ خوش نصیبی ہے کہ آپ کے اساتذہ ایسے ہیں جو صاحب علم ہونے کے علاوہ صاحب کردار بھی ہیں انھوں نے اس کالج کے لیے ایشیا کیا ہے بعض نے بلا معاوضہ اور بعض نے جو حالات سے مجبور تھے بہت ہی کم معاوضہ لے کر کام کرنا منظور کیا ہے۔ یہ بڑا ایشیا ہے اور ایشیا کردار کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ پاکستان کے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے بہترین نمونہ پیش کریں۔ آپ جب باہر نکلیں تو آپ کے ایشیا کردار و اخلاق سے یہ ثابت ہو کہ اس کالج کے طالب علم ایسے ہوتے ہیں اساتذہ اور طلبہ سب میں یہ بات ہونی چاہیے کہ ہر دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ اپنی قومی زبان اور تہذیب و اخلاق کا نمونہ ہے آپ ہم نہ صرف اپنے کالج بلکہ تمام پاکستان کی عزت کا لحاظ لازم ہے۔

یاد رکھیے کہ قومی زبان ہی ایک وہ چیز ہے کہ پاکستان کے تمام فرقوں اور حصوں میں اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ آپ اس رشتے کو انتہائی مستحکم بنائیں اگر آپ صبر و استقلال اور عزم و ہمت سے کام کریں گے تو انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گے اور اس کالج اور پاکستان کا نام روشن کریں گے۔“

مولوی صاحب کی افتتاحی تقریر کچھ اتنی موثر اور دل میں اتر جانے والی تھی کہ حاضرین جلسہ پر اس کا بہت اثر ہوا۔

اساتذہ اور طلبہ کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ہم صرف ایک تعلیمی ادارے نہیں بلکہ ایک قومی تحریک کے کارکن ہیں اور ہمارے فرائض شہر اور ملک کے دیگر کالجوں سے بہت حد تک مختلف ہیں کالج کی مجلس انتظامی کے لیے جو نام یونیورسٹی کو تجویز کیے گئے وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ مولوی عبدالحق صاحب صدر ۲۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ۳۔ چودھری خلیق الزماں صاحب ۴۔ جناب شعیب قریشی صاحب ۵۔ جناب قاضی فضل اللہ صاحب، وزیر تعلیم سندھ ۶۔ پیر الہی بخش صاحب ۷۔ جناب حاتم علوی صاحب ۸۔ محترمہ مسز حاتم علوی ۹۔ حکیم محمد احسن صاحب ۱۰۔ جناب ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نائب وزیر خارجہ ۱۱۔ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نائب وزیر داخلہ ۱۲۔ جناب ہاشم رضا صاحب ناظم کراچی ۱۳۔ جناب ہاشم صاحب رکن مجلس دستور ساز ۱۴۔ جناب عبداللطیف باوانی صاحب ۱۵۔ مولوی سید محی الدین صاحب سابق معتمد وزارت تعلیمات حیدرآباد دکن ۱۶۔ قاسم علی نور محمد چٹھا گوگل بھائی صاحب ۱۷۔ جناب ملا عبدالحسین ذکی الدین صاحب ۱۸۔ عبدالواحد صاحب صدر ناظم محکمہ جنگلات۔ طے پایا کہ صدر کالج اور پرنسپل کالج بحیثیت عہدہ مجلس انتظامی کے صدر و معتمد ہوں گے۔

کالج میں تدریس زور شور سے جاری تھی اور وائس چانسلر حلیم صاحب کا ہمت افزا رویہ اس یقین دہانی کے لیے کافی سمجھا جا رہا تھا کہ یونیورسٹی کالج کا الحاق ضرور منظور کر لے گی۔ یونیورسٹی کی جملہ شرائط پر عمل ہو رہا تھا۔ لیکچروں کی حاضرینوں اور فی کلاس طلبہ کی تعداد وغیرہ کا باقاعدہ حساب رکھا جا رہا تھا کہ یونیورسٹی کے افسران معائنہ اگر بے اطلاع تشریف لائیں تو ہر کام قاعدے کے مطابق ہوتا نظر آئے لیکن مئی ۱۹۴۹ء میں جامعہ سندھ کی سنڈیکیٹ میں انجمن کی درخواست پیش ہوئی تو اس جلسے میں طے پایا کہ چونکہ ذریعہ تعلیم کے متعلق ایک قرارداد حال ہی میں سینٹ میں پیش ہو کر منظور ہو چکی ہے لہذا جب تک اس کو تین ماہ کا عرصہ نہ گزر جائے کسی درخواست پر جو اس موضوع سے متعلق ہو، غور نہیں کیا جاسکتا البتہ اگر سنڈیکیٹ کے پانچ ارکان اس کی تحریک کریں تو غور ممکن ہے۔ چنانچہ سنڈیکیٹ کے پانچ معزز ارکان کے دستخط سے اردو کالج کے الحاق سے متعلق تحریک پیش کر دی گئی جو سنڈیکیٹ کے جلسہ منعقدہ ۱۱ جولائی میں زیر بحث آئی اس جلسے میں جو قرارداد منظور ہوئی وہ درج ذیل ہے:-

”قرار پایا کہ وائس چانسلران کے نمائندوں سے ملاقات کریں اور ان کو یہ اطلاع دیں کہ ان کی درخواست سینٹ کی قرارداد کے متناقص ہے اس لیے اس پر غور نہیں کیا جاسکتا تاوقتیکہ اس کو منظورہ قرارداد کے مطابق نہ بنادیا جائے۔“

اس قرارداد میں گھما پھرا کر یہ واضح کیا گیا تھا کہ اردو کالج کو اس لیے الحاق نہیں دیا جاسکتا کہ اس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اگر اردو کو ترک کر کے ذریعہ تعلیم انگریزی مقرر کر دیا جائے تو سنڈیکیٹ کو الحاق پر کوئی اعتراض نہ رہتا۔ ظاہر ہے کہ ایک یونیورسٹی کی مجلس انتظامی جیسی ذمہ دار جماعت کا یہ فیصلہ از حد حیرت انگیز اور افسوس ناک تھا۔ علاوہ ازیں یہ کہنا کہ اردو کالج کی درخواست سینٹ کی قرارداد سے متناقض ہے صریحاً خلاف حقیقت تھا۔ سینٹ کی قرارداد کا منشا یہ تھا کہ فی الحال پانچ سال تک انگریزی کو ذریعہ تعلیم رکھا جائے اس کے بعد اردو ذریعہ تعلیم بنائی جائے اور انجمن اپنے کالج میں ابھی سے اردو کو رائج کر رہی تھی۔ فرق صرف تعیین مدت کا تھا غایت دراصل دونوں کی ایک تھی۔ سینٹ منزل مقصود کی طرف پانچ سال بعد جانا چاہتی تھی جبکہ انجمن ابھی سے اس طرف گامزن تھی۔ اردو کالج تو اصل میں عملی مثال قائم کر کے آئندہ کے لیے سہولت پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس کا یہ عمل سینٹ کے منشا کے خلاف ہونے کے بجائے اس کے عین مطابق تھا چنانچہ سنڈیکیٹ کا اعتراض مولوی صاحب کو ہرگز قابل قبول نہ تھا۔ سندھ یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ اور اس کے امتحانات کو پہلے ہی تسلیم کر چکی تھی اور یہ کالج جو جامعہ عثمانیہ کے اصول پر قائم ہوا تھا، کس دلیل کی رو سے ناقابل قبول ٹھہر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں حکومت پاکستان نے اردو کو قومی زبان تسلیم کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں کا ذریعہ تعلیم اردو زبان ہی ہوگی۔ مولوی صاحب یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ جامعہ سندھ کے اسباب اختیار ان حقائق سے لاعلم تھے۔ پھر یہ امر تعجب کا باعث تھا کہ انجمن کے قابل تحسین اقدام کی تائید اور حوصلہ افزائی کے بجائے اس میں رکاوٹ پیدا کرنے کا آخر کیا مقصد تھا۔ مولوی صاحب نے اسے سراسر علم دشمنی کا مکروہ مظاہرہ قرار دیا۔

پاکستان کے اخبارات و جرائد نے جامعہ سندھ کے اس فیصلے کی پر زور مذمت کی اور اسے حد درجہ نامناسب اور رجعت پسندانہ قرار دیا۔ حتیٰ کہ ملک کے مقتدر اخبار ڈان کراچی جو حکومت پاکستان سمجھا جاتا تھا جامعہ سندھ کے فیصلے کو مہتمم نہ کر سکا۔ اس کے نامور مدیر جناب الطاف حسین نے مولوی صاحب کے موقف کو درست قرار دیا انھوں نے اپنے ادارے میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ اسباب یونیورسٹی کا یہ فیصلہ ہرگز فہم و بصیرت پر مبنی نہ تھا۔ انھوں نے لکھا کہ ”ہر یونیورسٹی کا ایک بنیادی مقصد اور اہم ترین فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بلند خیالی اور وسعت نظر پیدا کرے۔ یونیورسٹی کو مقامی تعصبات کی پیدا کردہ خرابیوں کو دور کرنے کا ایک موثر ترین ذریعہ ثابت ہونا چاہیے۔“ مولوی صاحب اور کارکنان کالج مرکزی حکومت کے اسباب اختیار سے ملے۔ جناب یاقوت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے انہیں افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ”مولوی صاحب آپ نے پہلے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہ کیا۔ اگر مجھے



معلوم ہوتا کہ آپ کے کالج کے الحاق کا مسئلہ سندھ یونیورسٹی کے سامنے ہے تو میں پہلے سے کچھ نہ کچھ ضرور کرتا رہا آپ اپنے کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کرالیں اور اس میں آپ کی پوری مدد کی جائے گی۔" مولوی صاحب وزارت تعلیمات کے افسروں سے ملے اور اس باب میں صلاح مشورہ کیا۔ وزیر تعلیم فضل الرحمن صاحب نے کہا کہ کراچی کو وفاقی علاقہ قرار دیا جا چکا ہے اور حکومت سندھ کے دفاتر حیدرآباد (سندھ) منتقل ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنی وزارت کو ہدایت کی ہے کہ وہ کراچی کے لیے فیڈرل یونیورسٹی کے قیام کا مسودہ قانون پارلیمنٹ میں منظوری کے لیے تیار کرے۔ میری مجوزہ فیڈرل یونیورسٹی آپ کے کالج کا فوراً الحاق منظور کرے گی، مولوی صاحب اس وضاحت کے بعد قدرے مطمئن ہوئے مگر انھوں نے تجویز پیش کی کہ یہ بل بجلیت محکمہ پارلیمنٹ میں لایا جائے، اس کے قیام کی تاریخ کا ابھی سے اعلان کر دیا جائے۔ بل میں یہ وضاحت بھی کر دی جائے کہ اس جامعہ کا ذریعہ تعلیم اردو ہوگی اور اس کے لیے درسی کتب کی فراہمی کے لیے ایک محکمہ تالیف و ترجمہ کی گنجائش بھی رکھی جائے اور یہ محکمہ قائم کرنے کے لیے یونیورسٹی کے بل کی منظوری کے انتظار میں وقت ضائع نہ کیا جائے بلکہ فی الفور اس کے لیے علاحدہ رقم منظور کرائی جائے۔ ان امور کے علاوہ انھوں نے تجویز پیش کی کہ مجوزہ جامعہ کا خاکہ مرتب کرتے وقت جس چیز کو ملحوظ رکھنا از حد ضروری ہے وہ مقصد تعلیم کا تعین اور طرز تعلیم کی اصلاح ہے۔ ہم کو اب ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو پاکستان کی ضروریات کے مطابق ہو چنانچہ نئے نظام میں مقصد تعلیم کا تعین انھی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہونا چاہیے جن کے حصول کی خاطر پاکستان قائم ہوا ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۴۹ء تک کالج میں داخلہ لینے والے طلبہ کی مجموعی تعداد دو سو سے متجاوز ہو چکی تھی۔ سال اول میں ڈیڑھ سو طالب علم تھے۔ کالج میں مخلوط تعلیم رائج کی گئی تھی چنانچہ اس تعداد میں آٹھ طالبات بھی تھیں۔ ابتداً کالج میں انگریزی اردو دینیات کے لازمی مضامین کے علاوہ تاریخ عام، تاریخ اسلام، سیاسیات و شہریت، معاشیات، منطق و فلسفہ، نفسیات، فارسی عربی کے مضامین کی تدریس شروع کی گئی اور نصاب جامعہ سندھ کے دیگر کالجوں کے مطابق تھا۔ اخبارات میں اردو تدریس کا حال شائع ہوا تو مختلف سیاست داں، ماہرین تعلیم اور اہل علم اسے دیکھنے کے لیے کالج کے اوقات میں آنے لگے۔ چنانچہ سب سے پہلے ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نائب وزیر دفاع حکومت پاکستان جناب ہاشم صاحب رکن سندھ وغیرہ کالج تشریف لائے اور مختلف جماعتوں کی تعلیم اور کتب خانے کا معائنہ کیا۔ کالج کے معیار تعلیم کی نسبت اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ۲۷ اگست ۱۹۴۹ء کو وزیر اعلیٰ سندھ جناب یوسف ہارون صاحب، جناب عباس غلیبی معتمد محکمہ صنعت، جناب نذیر احمد کمشنر آباد کاری اور جناب شعیب قریشی



مرکزی اور صوبائی حکومت کے دیگر عمال کے ہمراہ کالج میں تشریف لائے۔ کالج کا معائنہ کیا اور طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے جناب یوسف ہارون صاحب نے کہا کہ جہاں تک مرکزی حکومت اور اس کے تحت صوبائی حکومتوں کا تعلق ہے سب کا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ ۳۱ اگست کو صوبہ سرحد کے وزیراعلا خان عبدالقیوم خان نے بھی کالج کا دورہ کیا۔ ۱۹ ستمبر ۴۹ء کو وزیراعظم پاکستان جناب یاقوت علی خاں معہ بیگم یاقوت علی خاں و سردار عبدالرب نشتر گورنر مغربی پنجاب و خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ پاکستان کالج میں تشریف لائے اور کالج کے کتب خانے کا افتتاح کیا۔ اور مولوی صاحب کے کام کی بہت تعریف کی۔ فیڈرل یونیورسٹی کابل ابھی پارلیمنٹ میں پیش ہونے سے دیر ہو رہی تھی طلبہ میں یہ اضطراب بڑھ رہا تھا کہ الحاق نہ ہوا تو طالب علم امتحان میں کیونکر شریک ہوں گے۔ مولوی صاحب ۲ نومبر ۴۹ء کو وزیر تعلیم جناب فضل الرحمان سے پھر ملے اور کالج کے بڑھتے ہوئے مسائل کا ذکر کیا اور اطمینان دلایا۔

۲۸ مئی ۴۹ء کو مولوی صاحب نے سید ہاشمی فرید آبادی کو خط میں لکھا تھا کہ "کالج کا معائنہ ابھی تک معلق ہے وائس چانسلر بہت نکمّا ہے۔" (مطبوعہ اردوئے مصفی) ۲۲ جولائی ۴۹ء کو پھر انھی کو لکھتے ہیں ہمارے کالج میں ڈیڑھ سو طالب علم شریک ہو گئے۔ سندھ یونیورسٹی نے الحاق منظور نہیں کیا۔ ہم نے فیڈرل یونیورسٹی کو مقابل میں کھڑا کر دیا ہے اس کابل کانٹری ٹیوٹ اسمبلی میں پیش ہو گا۔ اس سے ہمارے کالج کا الحاق ہو کر رہے گا۔" (اردوئے مصفی ص ۱۷۲)

۱۳ نومبر کو ہاشمی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں "میں چند روز ہوئے مرکز کے وزیر تعلیم مسٹر فضل الرحمن سے ملا تھا انھوں نے کہا کہ ہم ہرگز آپ کے کالج کو ٹوٹنے نہ دیں گے اور کہا کہ میں اگر چاہتا تو سندھ یونیورسٹی پر دباؤ ڈال کر الحاق منظور کرادیتا لیکن چونکہ ہم خود فیڈرل یونیورسٹی کابل پیش کر رہے ہیں اس لیے ضرورت نہ سمجھی۔ ہم آپ کے کالج کو تسلیم کریں گے اور مدد بھی دیں گے اس کے بعد میں نے مناسب خیال نہ کیا کہ جھگڑے کو طول دوں۔" (ص ۱۷۶)

غرض امید و بیم کی کیفیت یوں ہی جاری رہی۔ مولوی صاحب اور طلبہ پر اضطرابی کیفیت طاری رہی۔ کالج کے مستقبل سے مایوس ہو کر طالب علموں کی حاضری گھٹنی شروع ہو گئی۔ اساتذہ بھی سوچتے تھے کہ یہی کیفیت رہی تو کالج کا مستقبل کیا ہو گا۔ آخر کار وزیر تعلیم حکومت پاکستان جناب فضل الرحمان نے وہ اقدام کیا جس سے وہ اب تک گریز کر رہے تھے یعنی ان کے ایما پر جامعہ سندھ کی سنڈیکیٹ نے ۲۹ جون ۵۰ء کو کالج کے از سر نو معلّٰی اور تنقیح کے لیے ایک سہ رکنی کمیٹی بھیجی جس کے ارکان میں جناب غلام محمد وزیر خزانہ پاکستان پیرزادہ عبدالستار

وزیر خوراک پاکستان اور ڈی جے کالج کے پرنسپل مسٹر شیخ شامل تھے۔ اس کمیٹی نے کالج کا تفصیلی معائنہ کیا جماعتوں کی تعلیمی کیفیت کا مشاہدہ کیا جسٹروں کے اندر راجات کالج فنڈ اور کتب خانہ وغیرہ کو اچھی طرح دیکھا اور کوئی نقلی نہ پایا تو منڈیکریٹ سے الحاق کی سفارشیں کر دی۔

۲۵ جون ۱۹۵۰ء میں اردو کالج کا قیام بڑی بے سروسامانی کے عالم میں ہوا تھا۔ ایک سال تک کالج کے الحاق کا مسئلہ معلق رہا۔ کالج کے طلبہ اور ہمدرد مولوی صاحب سے زیادہ پریشانی میں مبتلا تھے۔ سندھ کی صوبائی حکومت کے افسران، جامعہ سندھ کے ارباب نسبت و کثرت اور مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم کے عمال کو بار بار یاد دہانیاں کی جاتی رہیں۔ ساری کوششیں اس امر پر مرکوز ہو گئی تھیں کہ داخل ہو جانے والے طلبہ کا قیمتی سال ضائع نہ ہو۔ مولوی صاحب ایک لمحے کے لیے بھی اس شک و شبہ میں مبتلا نہ ہوئے کہ کالج کا الحاق نہ ہو گا۔ وزیر تعلیم فضل الرحمان صاحب اور وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب مسلسل یقین دہانیاں کراتے رہے کہ کالج کو ناکام نہ ہونے دیا جائے گا مگر اصل مسئلہ وقت کا تھا۔ مرکزی حکومت فیڈرل یونیورسٹی کے قیام کا ارادہ ظاہر کر چکی تھی اور یہ امر بالکل واضح ہو چکا تھا کہ فیڈرل یونیورسٹی قائم ہوگی تو کالج کے الحاق میں ہرگز کوئی لا بنمل مسئلہ نہ رہے گا مگر اس بل کا تیار ہونا، مختلف وزارتوں کے آراء کی چھان بین، ان کی تطبیق پر وزارت قانون کی قطعی تجاویز اور بالائے برائے حکومت کی اسمبلی پارٹی اور وزارتی کمیٹیوں کا غور و فکر اس کے بعد مسودہ قانون کا پارلیمنٹ میں پیش ہونا، ہفتوں اس پر بحث و تمحیص، ترمیم کے بارے میں فیصلے اور سب سے آخر میں بل کا قطعی شکل اختیار کر کے منظور کیا جانا پھر صدر اسمبلی کے دستخط اور بالآخر گورنر جنرل کی توثیق کے بعد اس کا نفاذ اور پھر عملی طور پر یونیورسٹی کا قیام اور انصرام یہ سب ایک دو دن کی بات نہ تھی۔ یہ سب امور معمولاً اپنا وقت لیتے ہیں یہاں بچوں کے امتحان کا مسئلہ سر پر کھڑا تھا۔ چنانچہ وزیر تعلیم پاکستان کو بادل نا خواستہ جامعہ سندھ کے ارباب حل و عقد کو مجبور کرنا پڑا کہ وہ نئی کمیٹی بنائیں اور الحاق کی کارروائی پر از سر نو غور کر کے مناسب فیصلہ کریں جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کمیٹی کے ایک اہم رکن خود وزیر خزانہ غلام محمد صاحب تھے جو انجمن ترقی اردو کے بھی خواہ اور ہمدرد تھے اردو کالج کے قیام کا فیصلہ انہی کے زیر صدارت اجلاس نظامی انجمن منعقدہ ۱۳ فروری ۱۹۴۹ء (جو پاکستانی انجمن کا تاسیسی اجلاس تھا) میں کیا گیا تھا۔ دوسرے اہم رکن پیر زادہ عبدالستار صاحب تھے جو سندھ کے قدیم باشندے اور قائد اعظم کی پہلی کابینہ کے اہم رکن تھے اردو سے متعلق ان کا موقف بھی اردو کے مخالفین سے بمرآل مختلف تھا۔ تیسرے رکن ڈی جے کالج کے پرنسپل شیخ صاحب تھے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کمیٹی میں ان کی شمولیت تکنیکی امور کے طے کرنے کے لیے تھی۔ وہ سندھ کے پرنسپل ماہر تعلیم اور بہت قابل شخص تھے۔ عام مسموم فضا سے قطعاً غیر متاثر اور معاملات کا فیصلہ مولوں کی بنیاد پر



کرنے کے عادی تھے۔ اس کیشی نے حسب توقع اردو کالج کے الحاق کی منظوری کی سفارش کر دی چنانچہ ایک سال کی مدت اس قضیے کا فیصلہ ہونے میں لگ گئی اور جو توانائیاں ادارے کی تقویت اور استحکام میں صرف ہونی چاہیے تھیں وہ اس بے کار مد میں صرف ہوئیں۔ مولوی صاحب کو اس تفریق کا صدمہ مزید تھا مگر وہ ہار ماننے والے انسان نہ تھے انھوں نے بار بار کہا تھا کہ اردو کے لیے میں نے زندگی بھر غیروں سے لڑتے گذاری یہاں مجھے اپنوں سے جنگ کرنی پڑ رہی ہے مگر میں نے نہ جب ناکامی قبول کی نہ اب ہار مانوں گا۔ مولوی صاحب کا کہا پورا ہوا اور انھوں نے کالج کا الحاق چل کر کے دم لیا۔

۱۹۴۹ء میں جب کالج کا آغاز ہوا تو آرٹس (فنون) کے چند مضامین کی کلاسیں شروع ہوئی تھیں لیکن الحاق کی منظوری کا اعلان ہوتے ہی کالج میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اب تک جو اساتذہ کالج میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے وہ یا تو وہ لوگ تھے جنھوں نے از خود اپنی خدمات پیش کی تھیں اور بعض وہ تھے جنھیں مولوی صاحب اور ان کے رفقاء نے اس کام پر مامور کیا تھا۔ الحاق کے بعد اب ہر کام یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے مطابق کرنا شروع ہوا۔ سب سے پہلے اساتذہ کی بھرتی کے لیے اخبارات میں اشتہار شایع کیا گیا اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ماہرین تعلیم کے مشورے سے ایک انتخابی بورڈ تشکیل دیا گیا جس نے دفتر انجمن میں پورے دن انتخابی مجلس کا جلسہ جاری رہا۔ انتخابی مجلس کے صدر مولوی عبدالحق صاحب تھے جامعہ سندھ کی کائنسنگی اس کے شیخ الجامعہ جناب پروفیسر ابو بکر احمد عبد الحلیم صاحب نے کی دیگر علما اور ماہرین تعلیم میں حسب ذیل اصحاب شامل تھے۔

جناب مولانا سید سلیمان ندوی صاحب، جناب ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نائب وزیر دفاع پاکستان، جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نائب وزیر داخلہ پاکستان، جناب سید عبد الواحد صاحب ناظم جنگلات، جناب مولوی سید تقی الدین صاحب سابق معتمد ریاست حیدرآباد دکن اور کالج کے پرنسپل جناب ملا محی الدین صاحب سابق معتمد تعلیمات حیدرآباد دکن۔ انتخابی بورڈ کے سامنے ایک صدمہ زیادہ امیدواران ملازمت پیش ہوئے۔ پچھلے سال جو اساتذہ کالج میں تدریس خدمات انجام دے رہے تھے ان میں سے بعض نے انتخابی بورڈ کے رویہ و پیش ہونا مناسب نہ سمجھا مثلاً جناب نجم الہدی صاحب پروفیسر تاریخ و اردو کالج کے وائس پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے بقیہ سابق اساتذہ میں جو لوگ انتخابی بورڈ کے سامنے پیش ہوئے بورڈ نے ایک اضافی ترقی کے ساتھ ان کا تسلسل جاری رکھنا منظور کیا کیوں کہ یہ حضرات مطلوبہ قابلیت پر پورے اترتے تھے دوسرے کٹھن حالات میں کالج کی رفاقت کرتے رہے تھے نئی اسامیوں پر غیر معمولی قابلیت کے اصحاب علم کا تقرر کیا گیا مثلاً ڈاکٹر سید معین الحق صاحب شعبہ تاریخ،

جناب قادری صاحب شعبہ سیاسیات، ڈاکٹر محمود الحسن صاحب تاریخ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب اردو، پروفیسر حبیب اللہ صاحب غصنفر اردو، ڈاکٹر غلام سردار صاحب فارسی، مولوی عبدالرشید صاحب فاضل فارسی، جناب عبدالعزیز صاحب فارسی، جناب آیت اللہ بیگ صاحب عارف معاشیات، جناب پروفیسر حسن عادل صاحب معاشیات، جناب فہم الزماں صاحب معاشیات، جناب محمد عارف صاحب سیاسیات، جناب ڈاکٹر عبدالسلام صاحب اردو، جناب عبدالقیوم صاحب اردو، جناب شرافت علی صاحب ہاشمی تجارت، جناب شمیم احمد صاحب تجارت اور راقم الحروف، محترم محمد حسن عسکری صاحب جو حال ہی میں سرکاری جرمیدے ماہ نو کی ادارت سے مستعفی ہوئے تھے۔ شعبہ انگریزی میں ملازمت کے امیدوار تھے۔ چونکہ انتخابی بورڈ میں ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی وزیر داخلہ موجود تھے انہوں نے عسکری صاحب سے سوال کیا کہ انہوں نے ماہ نو کی ادارت سے کن اسباب کی بنا پر استعفا دیا عسکری صاحب کی طبع نازک پر یہ سوال سخت گراں گزرا اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے اردو کالج کی ملازمت کے لیے درخواست دی ہے گورنمنٹ کی ملازمت میں رہنے نہ رہنے کا اس سے کیا تعلق لہذا یہ سوال غیر ضروری ہے۔ ڈاکٹر قریشی نے یہ سوچ کر کہ امیدواران ملازمت سے ان کی سابقہ کارکردگی کے زمرے میں پچھلی ملازمتوں پر کام کرنے کی مدت اور علاحدگی کی وجوہ کا جاننا انتخابی کمیٹی کے لیے ایک معمول کی کارروائی ہے۔ اپنے سوال پر اصرار کیا تو عسکری صاحب اپنی کتابیں یا کاغذات سمیٹ کر انٹرویو سے باہر نکل آئے اور اردو کالج میں ملازمت کے خیال کو یکسر ترک کر دیا۔ اس جگہ مولوی عبدالعظیم صاحب اور مولانا جلیل الدین صاحب کا تقرر ہو گیا ان حضرات کے علاوہ جناب عبدالرحمن صاحب حنفی کو شعبہ ریاضی، حسین الدین کو شعبہ فلسفہ اور جناب صاحب کو شعبہ تاریخ اسلام میں لے لیا گیا۔ ان میں سید منتخب الحق صاحب اور جناب قادری شعبہ اسلامیات و عربی اور ان کے ساتھ مولوی مظہر علی کامل اور مولانا قمر الدین صاحب کو عربی و اسلامیات میں لے لیا گیا۔ اردو کالج کے معتمد جناب مولوی تقی الدین صاحب اور کالج کے پرنسپل جناب سید محی الدین صاحب کٹر قسم کی مذہبیت کے حامل حضرات تھے اس لیے کسی ایسے استاد کو قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا جو اپنی علمی صلاحیتوں کے باوجود آزاد خیالی کے لیے شہرت رکھتے تھے اس لیے حسن عسکری صاحب کی انتخابی کمیٹی سے چلا جانا انہوں نے اپنے حق میں مفید سمجھا۔ اسی طرح اس انتخابی بورڈ نے علی گڑھ کے پروفیسر ڈاکٹر غور شید الاسلام صاحب کو جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر ملازمت اور گونا گوں ادبی صلاحیتوں کے ابھرتے ہوئے نوجوان تھے، منتخب کر لیا تھا لیکن سکرٹری کالج سید تقی الدین صاحب نے ان کو قلیل مشاہرے کی پیش کش کی جو ان کی موجودہ تنخواہ سے بہت کم تھی۔ انہوں نے بجا طور پر اسے ایک توہین آمیز



پیش کش قرار دیا اور حکم نامہ تقرری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ یوں بھی پاکستان میں ملازمت کے خواہش مند نہ تھے اور ایک دوست نے کراچی آنے پر مجبور کرنے کے لیے اردو کالج کے لیے ان کی درخواست داخل کر دی تھی۔ وہ سخت برہم ہوئے اور مولوی عبدالحق صاحب سے ملاقات کرنے اور اس حقیر پیش کش کا سبب دریافت کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی اور ہندوستان واپس چلے گئے۔ سید تقی الدین کالج میں ان کی شمولیت پر ہرگز ٹوٹ نہ تھے۔ ان کو بے حد خوشی ہوئی کہ خورشید صاحب نے اردو کالج میں آنے سے صاف انکار کر دیا۔ خود میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا کہ انتخابی بورڈ کے اجلاس کے بعد شام کو مولوی صاحب نے خود مجھے مطلع فرمایا کہ تم کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ میں مطمئن ہو کر گھر چلا آیا۔ کئی دن تک تقرر کے پروانے کا منتظر رہا۔ اس درمیان میں یہ دیکھتا رہا کہ جن لوگوں کو لیا جانا تھا ان کو پروانہ ہائے تقرر مولوی صاحب کے دستخطوں سے جاری ہو رہے ہیں۔ سید علی شیر جاتمی صاحب نے ایک دن مجھ سے پوچھا کہ آپ کو تقرر نامہ ملایا نہیں میں نے جو صورت حال تھی بتادی اور یہ بھی کہہ دیا کہ تقی الدین صاحب نے غالباً میرے پروانہ تقرر کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ کی ہے وہ مجھے رکھنا نہیں چاہتے۔ شاید علی شیر جاتمی صاحب نے مولوی صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں زینبا کے تقرر کے کاغذات کئی دن ہوئے دفتر کو بھیج چکا ہوں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بورڈ نے اس کا انتخاب منظور کر لیا تھا۔ شیر جاتمی صاحب نے دفتر میں جا کر اس کاغذات کھنگال ڈالے مگر میرے پروانہ تقرر کا پتہ نہ چلا۔ انھوں نے تقی الدین صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے یہ حالات دیکھے تو سوچا کہ اب اگر مراد تقرر ہو بھی گیا تو تقی الدین صاحب جو کالج کے سکریٹری ہیں مجھے قبول نہیں کریں گے اور میں ناحق مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ اُس زمانے میں مجھے روزنامہ امروز کے عملہ ادارت میں جگہ مل گئی تھی اور ایک سال سے مجھے اخباری کار کی مشق و مزدورت حاصل ہو چکی تھی۔ میں شیر جاتمی صاحب کو اپنے مذہب سے مطلع کر کے صاف کہہ دیا کہ میں اب کالج میں آنا نہیں چاہتا۔ شیر صاحب نے غالباً مولوی صاحب کو میرے خیال سے آگاہ کر دیا۔ انھوں نے اگلی صبح مجھے گھر سے طلب فرمایا۔ میں حاضر ہوا تو ان کے سامنے تقرر ناموں کے خالی کاغذات کا پلندہ رکھا تھا۔ مجھ پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تم کو بتا چکا ہوں کہ تمہارا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ اگر تمہیں پروانہ تقرر نہیں ملا تھا تو میرے پاس کیوں نہ آئے۔ میں نے یہ عرض کرنے کی جسارت کی کہ کالج کے حالات بظاہر میرے لیے ناسازگار ہیں مجھے ان حالات میں اپنی موجودہ ملازمت کو چھوڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ انھوں نے سخت نظروں سے میری طرف دیکھا اور ڈانٹا (ہائے اس شفقت آمیز ڈانٹ میں جو لطف تھا وہ آج تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہے) فرمایا یہ کاغذ تھا مواد کل کالج جا کر حاضری کی رپورٹ

کر دیکھ کر کہہ کر ہر واہ تقرر کے فارم پر جو ان کے سامنے رکھا تھا اپنے دستخط کر کے مجھے تھما دیا اور کہا اب جاؤ۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے اخبار کے دفتر میں گیا اور کراچی امر روز کے ایڈیٹر جناب ایوب احمد کرمائی کو یہ حال سنایا اور اپنے عزیز دوست اور کرم فرما ابراہیم صدیقی کو جو اس وقت نیوز ایڈیٹر تھے ان سے مشورہ طلب کیا۔ دونوں نے مولوی صاحب کے حکم کو بے چون و چرا ماننے کی تلقین کی اور وعدہ کیا کہ جس تاریخ سے مناسب سمجھو گے اخبار سے فارغ کر دیا جائے گا۔ ان احباب کی محبت اور دل سوزی کو یاد کرتا ہوں اور پھر آج کے زمانے کا حال دیکھتا ہوں تو دل غلوں کے آنسو روتا ہے اور سوچتا ہوں کہ وہ لوگ اور وہ زمانے اب کہاں لے گئے

غالب بہ تصرف ع دل ڈھونڈھتا ہے پھر وہی الفت کے رات دن

اسی سلسلے میں ایک واقعہ اور یاد آتا ہے اس کا بھی ذکر کرتا ہوں۔ مولوی صاحب کی خدمت میں بلاناغہ حاتمہ ہوتا رہتا تھا کیوں کہ چند ماہ سے قومی زبان کی ادارت میرے سپرد تھی۔ ایک صبح کو میں پہنچا تو مولوی صاحب ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے میں ان کے ساتھ چائے میں شریک ہو گیا۔ فرمانے لگے تم حسن عسکری سے واقف ہو۔ میں نے عرض کیا چند بار ملاقات ہوئی ہے تھوڑی بہت جان پہچان ہے۔ کہنے لگے تمہیں معلوم ہے کہ ہم عسکری کو لینا چاہتے تھے مگر انتخابی کمیٹی میں ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ وہ انٹرویو کی تکمیل سے پہلے اٹھ کر چلے گئے تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ وہ مرے ہم وطن ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ان کے کالج میں نہ آنے کا مجھے بھی قلق ہے۔ فرمایا کہ اس وقت کوئی اور کام نہ ہو تو عسکری کے پاس چلے جاؤ اور میری طرف سے ان سے کہو کہ وہ کالج میں آجائیں تنخواہ ان کی لیاقت کے مطابق دی جائے گی۔ میں چائے پی کر اٹھا بیچے دفتر میں آیا اور سوچا رہا کہ عسکری صاحب کا مکان مجھے معلوم نہیں اب کیا کروں۔ پھر یاد آیا کہ میرے دوست سلیم احمد صاحب ان سے ملتے رہتے ہیں وہ ان کے مکان سے واقف ہیں۔ وہ تہذیب روڈ پر ریڈیو پاکستان کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ انہیں کے دفتر سے نکل کر میں پیدل چلتا ہوا ریڈیو پاکستان گیا اور سلیم احمد صاحب سے ملا۔ انھیں سب ماجرا سنایا اور پوچھا کہ اب کیا ہونا چاہیے وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے میں ابھی تمہیں لے کر عسکری صاحب کے پاس چلتا ہوں۔ چلو ان سے بات کرتے ہیں میں رکش میں بیٹھ کر سلیم احمد صاحب کے ساتھ عسکری صاحب کے مکان واقع پیر الٹی بخش کالونی میں پہنچا اس وقت دن کے کوئی تین گھنٹے تھے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ عسکری صاحب پروفیسر کرار حسین صاحب کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے کے لیے نشاط سنیما گئے ہوئے ہیں۔ میں نے سلیم احمد صاحب سے کہا کہ چلو نشاط سنیما چلتے ہیں۔ وہاں گئے تو شو شروع ہو چکا تھا۔ ہم دونوں انٹرول کے انتظار میں سنیما کے برآمدے میں ٹہلتے رہے گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں انٹرول



کی گھنٹی بجی اور کرازمین صاحب عسکری صاحب کے ساتھ ہال سے باہر نکلے ان کے باہر آتے ہی سلیم احمد نے کہا کہ ذریعہ صاحب مجھے ساتھ لے کر آپ کے مکان پر حاضر ہوئے تھے وہاں سے پتہ چلا کہ آپ کو ٹی انگریزی فلم دیکھنے نشاط سینما آئے ہوئے ہیں۔ ہم آپ کی تلاش میں یہاں آگئے۔ اب جو کام ہے وہ ذریعہ صاحب آپ کو بتائیں گے میں نے وہاں کھڑے کھڑے مختصر الفاظ میں مولوی صاحب کا پیغام دیا اور عرض کیا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مولوی صاحب سے کسی وقت ملاقات کر لیں اور کالج میں ملازمت قبول فرمائیں۔ عسکری صاحب نے پوری بات سننے کے بعد دوسری طرف کو رخ بدلا اور فرمایا کہ مجھے کیا کام ہے کہ میں مولوی عبدالحق کے پاس جاؤں۔ میں نے کہا کہ حضرت آپ کو کام نہ ہوگا۔ لیکن مولوی صاحب کالج کے لیے آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے، چاہتے ہوں گے مگر میں تو نہیں چاہتا۔ اب سلیم احمد نے ملازمت کی اور عسکری صاحب سے کہا کہ جناب آپ ماہ نو چھوڑ چکے ہیں کراچی میں بہت زیادہ کالج نہیں ہیں۔ یہ ملازمت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آپ وہاں میں سینٹ اسٹیفن کالج میں کافی عرصے اس کام کا تجربہ کر چکے ہیں اس لیے اس پیش کش پر غور کیے بغیر کوئی بات کہنی مناسب نہ ہوگی فرمایا کیوں مناسب نہ ہوگی کہہ جو دیا کہ میں مولوی عبدالحق کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جہاں تک ماہ نو کی ملازمت ترک کرنے کا تعلق ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے اسلامیہ کالج میں ملازمت مل چکی ہے بلکہ چند طالب علموں نے میری وجہ سے ایم اے کلاس میں داخلہ لے لیا ہے اب میں انہیں کسی حال میں چھوڑ کر مایوس نہیں کر سکتا۔ کرازمین صاحب جواب تک خاموش کھڑے تھے عسکری صاحب کی تائید میں بولے کہ بھئی یہ اسلامیہ کالج نہیں چھوڑ سکتے ہیں انہیں اسلامیہ کالج میں لایا ہوں اور اب یہ وہاں جم چکے ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے ترک ملازمت نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم لوگ مایوس و نامراد ہو کر واپس آئے۔ سلیم احمد کو ان کے دفتر میں پھوڑتا ہوا اچھن گیا اور مولوی صاحب کو نرم لفظوں میں یہ گفتگو سنا دی۔ مولوی صاحب نے سخت افسوس کیا مگر یہ حال تھا تو وہ کیا کر سکتے تھے۔ ہاں میں نے ازراہ احتیاط مولوی صاحب کو یہ نہیں بتایا کہ انٹرویو والے دن ڈاکٹر قریشی کے سوالات کا رد عمل عسکری صاحب نے کچھ اس حد تک قبول کر رکھا ہے کہ وہ آپ کے پاس آئے اور ملاقات کرنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ عسکری صاحب کے لیے کی تلخی اور بے لفاظی کا ذکر مولوی صاحب کی عمر اور بزرگی کو دیکھتے ہوئے، کرنا مجھے مناسب نہ ہوگا۔ البتہ عسکری صاحب کے اخلاق اور معقولیت کے بارے میں جو رائے میں نے قائم کی اس کا نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔

بہر حال کالج شروع ہو گیا اس سال یعنی ۱۹۵۰ء میں آرٹس (فنون) کے صفائین کے علاوہ شام کے

وقت تجارت کے مضامین کی شفٹ بھی شروع ہو گئی۔ شام کی تدریس کا تجربہ کراچی میں سب سے پہلے اردو کالج میں شروع ہوا اور بہت کامیاب رہا اس کے بعد آنے والے زمانے میں کراچی کے بیشتر غیر سرکاری کالجوں میں شام کی تدریس کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اس وقت سید معین الحق صاحب جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تاریخ میں پی ایچ کی تھی اور پندرہ بیس سال وہاں کے شعبہ تاریخ میں استاد رہے تھے (اور مجھے بھی چار سال وہاں پڑھایا تھا) کالج میں وائس پرنسپل بلکہ عملاً پرنسپل کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مولوی صاحب علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ایک اور صاحب آفتاب حسن صاحب کو کالج کا پرنسپل بنانے کا وعدہ کر چکے تھے مگر اس میں وقت یہ بھی کہ موصوفی قیام پاکستان کے بعد حیدرآباد سے ہجرت کر کے آئے اور ملٹری اکادمی کاکل میں بحیثیت میجر خدمات انجام دے رہے تھے فوج والے ان کی درخواست کے باوجود انھیں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے بعض حالات کی وجہ سے وہ خود بھی فوجی ملازمت ترک کرنا چاہتے تھے اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ علی گڑھ کے مشہور پروفیسر اسحاق صاحب جو وہاں طبیعیات کے شعبے کے چیرمین تھے اور نیوکلائی طبیعیات کے سلسلے میں انگلستان کے عطائے سائنس کے ساتھ کام کر چکے تھے پاکستان آکر ملٹری اکادمی کاکل میں آفتاب صاحب سے بلند تر منصب پر فائز ہو چکے تھے ان کے آنے سے ملٹری اکادمی میں آفتاب صاحب کی حیثیت متاثر ہونے لگی تھی اور وہ بار بار مولوی صاحب کو لکھتے تھے کہ اپنے اثرات کو کام میں لا کر انھیں کاکل سے نجات دلائیں۔ مولوی صاحب ان کے سلسلے میں فوجی حکام کو خطوط لکھتے رہے مگر جب اس سے بھی کام نہ چلا تو خود راولپنڈی تشریف لا کر خاص طور پر جنرل محمد ایوب خاں صاحب کمانڈر انچیف افواج پاکستان سے ملاقات کی اور انھیں میجر آفتاب حسن صاحب کی گھلو خلاصی پر رہنا مند کیا گو اس کام کی تکمیل میں کچھ دیر لگی لیکن جنرل صاحب نے مولوی صاحب کو رد کرنے کی جرات نہ کی۔ اور ۱۹۵۱ء کے اواخر میں آفتاب حسن صاحب کاکل سے فارغ ہو کر کراچی آ گئے۔ یکم جنوری کو ۱۹۵۲ء کو اپنے فسر مولوی سید محی الدین صاحب سے کالج کا جائزہ لے کر پرنسپل پر فائز ہو گئے۔ اس درمیان میں سید تقی الدین صاحب سکریٹری کالج نے طلبہ کی ہڑتال کے نتیجے میں اپنے عہدے سے استعفادے دیا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی استغنے کی دھمکیاں دے چکے تھے اور ایک مرتبہ تحریراً استعفادے چکے تھے لیکن مولوی سید ہاشمی فرید آبادی صاحب نے باوجود اس کے کہ سید تقی الدین صاحب ان کو سخت ناپسند فرماتے تھے مولوی صاحب کو سمجھا بھاکر اس پر راضی کر لیا کہ استعفا گورننگ باڈی میں پیش نہ کیا جائے بلکہ اسے فسوخ سمجھا جائے لیکن سید تقی الدین صاحب جو انجمن اور کالج میں من مانی کارروائیوں کے قادی ہو چکے تھے مولوی صاحب سے کسی کام میں صلاح مشورے کو ضروری



نہ سمجھتے تھے اور اگر ان کو کوئی نیک صلاح دی جاتی تھی تو ان کی خود سری اور خود پسندی اس پر عمل کرنے کو غیر ضروری سمجھتی تھی۔ وہ مولوی صاحب کو جو صدہ و بانی کالج تھے اپنے اختیارات کے مقابلے میں ایک گوشے میں بٹھا دینا چاہتے تھے۔ ان کی خود پسندی اور آمریت نے مولوی صاحب کے صبر و ضبط کے باوجود یہ دن دکھایا کہ کالج کے طلبہ ان کے سخت مخالف ہو گئے اور ان کے خلاف ہڑتال کر دی اور زبردست مظاہرہ کیا جس میں ان سے استغفے اور کالج سے بے تعلقی کا مطالبہ کیا۔ سید تقی الدین صاحب جذباتی قسم کے محرور المزاج انسان تھے طالب علموں کی نعرہ بازی ان کو اس درجہ ناگوار ہوئی کہ طیش میں آکر لوٹا رکھ کر (مغرب کے وقت نماز کے لیے وضو کے واسطے غسل خانے جارہے تھے) ایک طالب علم کے ہاتھ سے قلم اور کاپی پھین لی اور کھڑے کھڑے مولوی صاحب کے نام چند سطرے استغفا لکھ کر طلبہ کے حوالے کر دیا۔ طلبہ نے وہ کاغذ اسی وقت اوپر کی منزل پر جہاں مولوی صاحب مقیم تھے جا کر مولوی صاحب کو پیش کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی صاحب نے جبراً استغفا لکھوا کر لانے والے طلبہ کو سخت تنبیہ کی اور یہ کہا کہ اس کالج کے طلبہ کو اس قسم کی ناشائستہ حرکتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں۔ بزرگوں کی بے ادبی اور بے حرمتی ہمارے اخلاقی اور روایات کے خلاف ہے یہ سن کر جو طلبہ انھیں استغفا دینے گئے تھے سخت شرمندہ ہوئے اور یہ کہہ کر کہ آپ اس پر غور فرمالیں اور ہم آپ کے بچے ہیں اگر ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو آپ درگزر فرمائیں اور آپ جو فیصلہ کریں گے ہم میں اس کی سربا بی کی جرأت نہ ہوگی۔ مولوی صاحب اس گفتگو کے بعد مطمئن ہو گئے۔ اگرچہ وہ سید تقی الدین صاحب کے طریق کار کو پسند نہ کرتے تھے لیکن ان کا اس طرح علاحدہ کیا جانا ان کو ہرگز پسند نہ تھا۔ انھوں نے طالب علموں کو جو تعداد میں چار پانچ سے زیادہ نہ تھے زبرد تو بیج کر کے اپنے پاس سے بھگا دیا۔ ادھر کالج کے اساتذہ یہ ہلڑ اور طوفانی بدتمیزی دیکھ کر نیچے اتر آئے تھے اور انھوں نے طلبہ کو ڈانٹنا اور سمجھانا شروع کر دیا تھا اس طرح جوش و خروش میں مقتدرہ کمی آگئی اور طالب علم خاموشی کے ساتھ اپنے جماعتوں میں واپس چلے گئے۔ اب اسے استادوں کا اثر رسوخ تصور کر دیا یہ سمجھ کر سید تقی الدین صاحب نے طیش میں آکر استغفا طلبہ کے حوالے کر دیا تھا یہ وجہ طلبہ کے سکون و اطمینان کی ہو گئی تھی اور وہ اپنا مقصد پورا ہوتا دیکھ کر پُر سکون ہو گئے تھے مگر تقی الدین صاحب پر اس واقعہ کا رد عمل شدید تھا اور وہ اگلی صبح اپنا بستر اور اسباب رکشہ پر رکھ کر انجن کی عمارت کی نچلی منزل سے جو کالج کے سامنے اسی احاطے میں واقع تھی، کچھ کہے سنے بغیر اپنے مکان (بہار کالونی) چلے گئے اور انجن یا کالج سے بے تعلقی اختیار کر لی۔ انھوں نے تشریف لے جانے سے پہلے مولوی صاحب اور سید ہاشمی فرید آبادی صاحب سے رخصتی ملاقات بھی نہ کی اور

نہ اپنا موقف بتانا ضروری سمجھا۔ وہ چلتے ہوئے چوکیداروں سے یہ کہہ گئے کہ ان کا استعفا قطعی ہے اور اب وہ کبھی انجمن یا کالج میں قدم نہ رکھیں گے کیوں کہ ان کی بڑی بے عزتی ہوئی ہے جب وہ بالکل ہی چلے گئے اور واپسی کا کوئی امکان نہ نظر آیا تو مولوی صاحب نے کالج گورننگ باڈی اور نظائے انجمن کے اجلاس طلب کیے اور تقی الدین صاحب کی تحریر اور پیش آورہ واقعات سے اراکین کو مطلع کیا۔ یہ ۱۵ نومبر ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے۔ اسی شام کو چار بجے اردو کالج کی گورننگ باڈی نے مجبوراً تقی الدین صاحب کا استعفا منظور کیا اور مولوی صاحب کی تجویز پر جناب عبدالرحمن صاحب صدیقی (سندھی) سے یہ عہدہ قبول کرنے کی درخواست کی جو انھوں نے منظور کر کے معتدلی کے فرائض انجام دینا شروع کر دیے۔ ان حالات میں بعض صاحبوں نے مولوی صاحب کو مشورہ دیا کہ آفتاب حسن صاحب کو جو تقی الدین صاحب کے برادر بزرگ مولوی سید محی الدین صاحب پرنسپل کے داماد ہیں کالج میں نہ بلایا جائے مگر مولوی صاحب اس سلسلے میں اتنی پیش رفت کر چکے تھے اور عمال حکومت سے لے کر کانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں تک رسائی حاصل کر چکے تھے کہ انھوں نے ممکنہ خطرات سے صوف نظر کیا اور اپنے فیصلے میں کسی تبدیلی کے روادار نہ ہوئے۔ ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے اپنی پرنسپل کے لیے بہت کوششیں کیں اور عبدالرحمن صدیقی معتد کالج اس پر رضامند بھی ہو گئے تھے مگر مولوی صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے اور یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو آفتاب حسن صاحب نے کالج سنبھال لیا۔ آفتاب حسن صاحب جب کالج تشریف لائے تو مولوی صاحب کے ساتھ بر خور دانہ اور مودبانہ طرز عمل رکھا مگر کالج کے ان اساتذہ اور طلبہ کو جو سید تقی الدین صاحب کے آورہ سے اور خیر خواہ تھے بطور خاص توازا اور اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مولوی صاحب کے احکام کی تعمیل کی بجائے اور وہ خندہ پیشانی سے کرتے رہے مگر کالج میں وہ کسی اور پالیسی پر چلتے رہے اور کراچی یونیورسٹی کے (جواب قائم ہو چکی تھی) نئے وائس چانسلر پروفیسر ابو بکر احمد عبدالحمیم صاحب سے پڑھایا اور کالج کو ان کی پالیسیوں کا گڑھ بنا دیا۔ میں نے چند مرتبہ مولوی صاحب سے اجالا یہ کہنا چاہا کہ آفتاب صاحب انجمن کے بجائے یونیورسٹی کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں مگر مولوی صاحب نے سنی ان سنی کر دی اور کوئی توجہ نہ فرمائی۔

آفتاب حسن صاحب نے اگر دیکھا کہ کالج فنون و تجارت (آرٹس کامرس) کے مضامین کی تعلیم دے رہا ہے انھیں اس نظام میں اپنی افادیت نظر نہ آئی لہذا مولوی صاحب سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جب تک سائنس کی تدبیریں کا اجرا نہ کیا جائے گا یہ تحریک نامکمل رہے گی۔ اس کی تکمیل کے لیے سائنس کی تدبیریں کا انصرام ضروری ہے۔



یہ بات مولوی صاحب کی خواہش اور آرزو کے عین مطابق تھی مگر مولوی صاحب اب تک اس سے اس لیے ہچکچا رہے تھے کہ سائنس کی تعلیم کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی جو اس وقت نہ انجمن کو میسر تھا نہ کالج اس کا متحمل ہو سکتا تھا۔ الحاق کے بعد کالج کی مقبولیت میں ایک بیک بہت اضافہ ہو گیا تھا اور طلبہ کی تعداد اتنی ہو گئی تھی کہ کالج کی عمارت ان کے لیے نا کافی اور تنگ معلوم ہوتی تھی بلکہ بعض چھوٹے کلاس مثلاً ریاضی وغیرہ کی تدریس باہر صحن میں بنچوں پر بیٹھ کر درختوں کے سایہ میں ہوتی تھی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی سالانہ رولڈ ادبابت یکم اپریل ۱۹۵۳ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۵۴ء میں صفحہ ۱۷ پر مولوی صاحب نے یہ لکھا ہے :

”انجمن نے محسوس کیا کہ نئی نسل میں صحیح قومی جذبے کی نشوونما اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قومی زبان کے ذریعے اپنے تہذیبی ورثے کی اہمیت کو اچھی طرح طلبہ کے ذہن نشین نہ کرایا جائے اور جو اصحاب اب تک مذہب میں ان پر اردو کی اعلیٰ علمی صلاحیتیں آشکار کی جائیں اس مقصد کے پیش نظر جون ۱۹۴۴ء میں (سنہ غلط طبع ہو گیا ہے اصل سال ۱۹۴۹ء ہونا چاہیے) اردو کالج قائم کیا گیا جو انتہائی نامساعد حالات کے باوجود روز بروز ترقی کی منازل طے کر رہا ہے سال گذشتہ اس کالج کے طلبہ کی تعداد ۱۴۲۹ تھی اور اساتذہ کی تعداد ۴۷ تھی۔ سال زیر نظر میں طلبہ کی تعداد بڑھ کر ۱۵۰۲ اور اساتذہ کی تعداد ۴۹ ہو گئی ہے۔“

چنانچہ ۱۹۵۳ء میں کالج میں شعبہ سائنس کا اجرا عمل میں آیا اور اسی میں صرف طبیعیات، ریاضی، کیمیا اور جغرافیہ کے مضامین شروع کیے گئے۔ کالج میں تجربہ قانون اور نئے کلاسوں کی گنجائش نہ تھی مگر پہلے سال جوں توں کر کے کام چلایا گیا۔ آفتاب حسن صاحب نے مولوی صاحب کو آمادہ کیا کہ وہ اس کے لیے صرف دس ہزار روپے کی منظوری دیں تو وہ کام شروع کر دیں گے۔ چنانچہ یہ رقم ان کو دے دی گئی اور چند ایسے طلبہ جو ایم ایس سی میں زیر تعلیم تھے کالج میں جزوقتی طور پر مقرر کر کے کام چلایا گیا۔ ان استادوں نے جن میں بھی شامل تھے جوں توں کر کے ایک سال کام کیا۔ اگلے سال چند نئے کمرے تعمیر کیے گئے اور قانون کی کلاسوں کا بھی اجرا کر دیا گیا۔ سائنس میں ایک نیا شعبہ حیاتیات کا اضافہ کیا گیا۔ شعبہ قانون کے اجرا کا ذکر مندرجہ بالا رولڈ ادبابت متعلقہ یکم اپریل ۱۹۵۳ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۵۴ء میں صفحہ ۱۷ پر اس طرح ملتا ہے۔

”اردو کی قومی حیثیت کے مد نظر ضروری تھا کہ ملک کے عدالتی نظام میں اسے اس

کے جائز منصب پر فائز کرایا جائے۔ مگر اس کے لیے شرط اولیں یہ ہے کہ ملک میں ایسے وکلا اور قانون دان اصحاب موجود ہوں جو جلد عدالتی کام باسانی اردو کے ذریعے کر سکیں چنانچہ اردو کالج کی انتظامی کمیٹی نے نئے تعلیمی سال سے کلیہ قانون کھولنے کا فیصلہ کیا ہے تو قیاس ہے کہ قانون کے شعبے کے لیے ہمیں اعلیٰ درجے کے ماہرین قانون اور وکلا کی خدمات بحیثیت اساتذہ حاصل ہو جائیں گی اور یہ شعبہ ایک مثالی شعبہ بن جائے گا۔

چنانچہ ۱۹۵۴ء میں قانون کی جماعتیں شروع کر دی گئیں اس شعبے کی صدارت ملک کے مشہور ماہر قانون اور وکیل جناب محمود رضا صاحب کی خدمات حاصل کر لی گئیں جو برہمن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ قانون کے استاد کی حیثیت سے وابستہ رہے تھے اور کراچی میں ان کا شمار کامیاب وکلا میں ہوتا تھا۔ وہاں کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے اور ان کے علی گڑھ کے زمانے کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد کراچی میں وکالت کے پیشے سے وابستہ تھی۔ حسن اتفاق سے مجھے بھی مسلم یونیورسٹی میں جہاں سے میں نے اول درجہ میں قانون کی ڈگری حاصل کی تھی ان کی شاگردی کا فخر حاصل تھا اور میرے چچا زاد بھائی و حاج احمد خاں صاحب جواب تک مراد آباد میں وکالت کر رہے تھے ان کے چہیتے شاگردوں میں شامل تھے۔ ایک مرتبہ ایک مقدمے کے سلسلے میں امر وہ میرے مکان پر بھی تشریف لائے تھے۔ میں ان تعلقات درمیان کے پیش نظر ان کے تقرر سے بہت خوش تھا ان کے علاوہ جناب عبداللہ صاحب جو حیدر آباد کے ممتاز وکیل اور انجمن اتحاد المسلمین کے نظریاتی رہنماؤں میں رہ چکے تھے، منتخب کیے گئے تھے۔ ایک اور معروف وکیل جناب سہروردی صاحب بھی تھے جو ریلوے بورڈ کے مشہور چیرمین جناب سہروردی کے چھوٹے بھائی تھے اور قانون کے اساتذہ میں انھیں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ غرض ۱۹۵۴ء میں اردو کالج کے شعبہ قانون کا اجرا ہو گیا اور ان کلاسوں کو طلبہ میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی یعنی تعداد کے لحاظ سے شہر کے دوسرے کالج ایس ایم لاکالج کی قدامت اور طویل درسی تسلسل کے لحاظ سے اس نوزائیدہ کالج کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ ایک غیر معمولی بات نظر آتی تھی۔ اب اردو کالج میں چار فیکلٹیاں زور شور کے ساتھ کام کر رہی تھیں یعنی فنون (آرٹس) تجارت (کامرس) علوم (سائنس) لا (قانون) کالج ایک اسکول کی پرانی عمارت میں قائم کیا گیا تھا جس کے دو بلاک کالج کے قبضے میں تھے اور ایک بلاک جو قدرے فاصلے پر تھا اس میں انجمن کے دفاتر اور کتب خانے وغیرہ قائم تھے۔ درمیان میں ایک وسیع صحن تھا جس میں حسب ضرورت انجمن یا کالج کے جلسوں کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی سالانہ



روئداد بابت یکم اپریل ۱۹۵۳ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۵۴ء میں حسب ذیل تحریر ملتی ہے :

کسی درس گاہ کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت اس کے فرزندوں کے ان امتیازات سے ملتا ہے جو دوسرے اداروں کے مقابلے میں حاصل کرتے ہیں اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اردو کالج نے پانچ سال کے مختصر عرصے میں ایسی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے جو ہمدردان اردو کے لیے قابل فخر ہے ہمارے طلبہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اعزازات حاصل کر کے جو ریکارڈ قائم کیا ہے اسے کوئی دوسرا کالج مشکل ہی سے توڑ سکتا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ شیر محمد قیصر ایم اے سال دوم اردو، اول ڈویژن، یونیورسٹی میں اول آئے۔ ۲۔ نصرت اشرف ایم اے سال دوم فارسی، دوم ڈویژن، یونیورسٹی میں اول آئے۔ ۳۔ نصیر امام ایم اے سال دوم، اردو، دوم ڈویژن یونیورسٹی میں دوم۔ ۴۔ محمد احمد سعید بی اے پاس، اول ڈویژن یونیورسٹی میں اول۔ ۵۔ اقبال احمد خان بی اے پاس دوم ڈویژن یونیورسٹی میں دوم۔ ۶۔ محمد بدیع الزماں بی اے آنرز اردو، دوم ڈویژن یونیورسٹی میں اول۔ ۷۔ حافظ محمد یوسف علی صدیقی بی اے آنرز اردو دوم ڈویژن، یونیورسٹی میں دوم۔ ۸۔ مفتی محمد معظم بی اے آنرز فارسی دوم ڈویژن یونیورسٹی میں دوم۔ ۹۔ تقی حسن بی اے آنرز تاریخ اسلام، دوم ڈویژن یونیورسٹی میں دوم۔ ۱۰۔ رحیم بخش خاں بی اے آنرز تاریخ اسلام دوم ڈویژن، یونیورسٹی میں دوم ۱۱۔ سید افتخار بھی بی اے آنرز معاشیات دوم ڈویژن یونیورسٹی میں اول ۱۲۔ محمد ریاض اللہ خان سال اول فنون، اول ڈویژن یونیورسٹی میں اول ۱۳۔ محمد جلیل احمد سال اول سائنس، یونیورسٹی میں اول ۱۴۔ سید اعجاز علی سال اول تجارت اول ڈویژن یونیورسٹی میں اول۔ اس طرح یونیورسٹی کے تقریباً اٹھارہ امتیازات میں سے ہمارے طلبہ نے چودہ (۱۵ سال زیر رپورٹ میں) حاصل کیے۔ یہ اردو کالج کے اسٹاف کی فرسٹ شناسی اور تن دہی نیز اردو کی صلاحیت کا واضح ثبوت ہے۔ ”انجمن ترقی اردو پاکستان کی سالانہ روئداد یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء تک۔

(صفحات : ۱۷، ۱۸، ۱۹)

”یہ گنگل“ بھی انجمن اتحاد طلبہ کا سالانہ مجلہ ۱۹۵۶ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر کالج کے طالب علم شیر محمد قیصر (ابن انشا) اور نائب ایڈیٹر افضل الرحمن ممتازہ مقرر ہوئے اس کی پہلی مجلس ادارت کے نگرانوں میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب، جناب (ڈاکٹر) عبدالقیوم صاحب اور شجاع احمد ریا وغیرہ مقرر کیے گئے تھے۔

۳۱ اگست ۱۹۵۴ء میں بعض اختلافات کے باعث راقم الحروف انجمن کے پندرہ روزہ رسالے قومی زبان کی ادارت سے علاحدہ ہو گیا اور ایک سال بعد (اگست ۱۹۵۵ء) میں اردو کالج کی ملازمت سے بھی مستعفی ہو کر جناح کالج کراچی میں جو ایک سال پہلے ناظم آباد کے علاقے میں تعمیر ہوا تھا، چلا گیا اور ۱۳ جولائی ۱۹۵۶ء میں اسلامیہ کالج سے وابستہ ہو گیا۔ ۳۱ اگست ۱۹۵۴ء سے اگست ۱۹۵۵ء سے قریب ایک سال تک انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں سے علاحدہ رہا۔ لیکن جب اگست ۱۹۵۵ء میں مولوی صاحب نے بطور صدر اردو کالج میرا استعفا قبول کیا اور میرے واجبات کی قطعی ادائیگی کے چیک پر دستخط کر دیے تو شاید انھیں میری مکمل علاحدگی پر کچھ خیال پیدا ہوا۔ اور میں اپنے واجبات کا چیک وصول کر کے جب اردو کالج کے دفتر سے نیچے اتر رہا تھا تو مولوی صاحب کے نمائندے کو پھاٹک کے قریب منتظر پایا۔ انھوں نے میری علاحدگی اور استعفیٰ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مولوی صاحب کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور اپنی رہائش گاہ میرے منتظر ہیں۔ میں اس وقت انجمن اور کالج کی دیرینہ رفاقت سے انقطاع تعلق پر افسردہ اور رنجیدہ تھا میں نے مولوی صاحب کے فرستادے سے اس وقت ان کی خدمت میں حاضری سے معذوری ظاہر کی اور پھر کسی وقت حاضر ہونے کا خیال ظاہر کیا اور اپنے گھر واپس چلا آیا۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ مولوی صاحب اور آفتاب حسن صاحب پر نپل کالج میں انتظامی معاملات میں کچھ اختلافات شروع ہو چکے ہیں۔ مولوی صاحب غالباً اس مرحلے پر کالج سے میری علاحدگی نہ چاہتے تھے۔ اسی لیے شاید مجھے طلب کر کے کچھ سمجھانا چاہتے تھے۔ انجمن اور کالج میں ۱۹۴۹ء سے میں سرگرم کارکن کی حیثیت سے جو خدمات انجام دے چکا تھا وہ ان کے علم میں تھیں بہر حال میں چند روز ان کے پاس نہ جاسکا اور نئے کالج میں اپنا کام سمجھنے اور سنبھالنے میں مصروف رہا۔ فرصت ہی نہ مل سکی کہ ایک دن جبکہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی مولوی صاحب کی گاڑی میرے گھر کے سامنے آکر رکی اور مولوی صاحب مینہ میں بھیگتے ہوئے میرے گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کے مقصد خصوصی عین الدین رضوی ان کی گاڑی چلاتے ہوئے انھیں ساتھ لے کر آئے تھے۔ مولوی صاحب کچھ دیر میرے مکان پر ٹھہرے اور میری علاحدگی پر اظہار افسوس کیا۔ اردو کالج کا ذکر ہوا تو آفتاب حسن صاحب سے ان کے اختلافات اور خفیہ سی بے اطمینانی کا ذکر ہوا۔ تب مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ کالج کی موجودہ صورت حال ان کے لیے باعث تشویش بن چکی ہے۔ بہر نوع انھوں نے مجھ سے اپنے پاس آتے اور ملتے رہنے کا وعدہ لیا اور میں اس کے بعد سے ہر دوسرے تیسرے دن ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ مولوی صاحب کو سب سے زیادہ فکر کالج کی

مالی حالت کی تھی اور اس کی اصلاح اور درستی میں آفتاب صاحب ان سے تعاون نہیں کر رہے تھے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں :

”کالج کے حسابات کی حالت سید تقی الدین صاحب کے زمانے سے ناقابل اطمینان چلی آرہی تھی۔ لیکن ۱۹۵۵ء میں جو اطلاعات مجھے ملیں اور ان کے متعلق میں نے اپنے طور پر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حسابات کی حالت ابتر ہے اور بہت سی رقم کا بیجا صرف کیا گیا ہے اور جن کے ہاتھ میں رقم کا لین دین ہے ان کی دیانت بہت مشتبہ ہے اس بنا پر میں نے کالج کے حالات و حسابات کی تفتیش کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی کی تجویز کی اور اس مضمون کی قرارداد مجلس نظامیہ ۴ نومبر ۱۹۵۵ء کو عبد الخالق صاحب نے پیش کی اور بالاتفاق منظور ہوئی اس کمیٹی کے تین ارکان تجویز کیے گئے۔ حاتم علوی صاحب داعی (کنویر) عبد الخالق عبد الرزاق صاحب، حسام الدین راشدی۔۔۔ اس سے میرا منشا علاوہ دیگر امور کے خاص طور پر حسابات کالج کی اصلاح تھا میری قطعی رائے تھی کہ اگر اس وقت خبر نہ لی گئی تو آئندہ یہ خرابی بڑھتی چلی جائے گی۔ جن کی اصلاح اور بھلائی کے لیے یہ تجویز کی گئی تھی وہی اس کے زبردست مخالف نکلے اور اس وقت سے آفتاب حسن صاحب پر نسل اور ان کے رفقاء نے میرے اور انجمن کے خلاف پورے ہنگامہ شروع کر دیا۔“ (اردو کا المیہ، صفحات ۱۶، ۱۷)

گفتگو کے تسلسل میں یہ بتانا بھول گیا کہ تقی الدین صاحب کے استعفائے بعد جو عبد الرحمن صدیقی صاحب کالج کے معتمد مقرر ہوئے تھے وہ چند ماہ بعد ہی مشرقی پاکستان کے گورنر مقرر ہو کر کراچی سے باہر چلے گئے تھے اور ان کی جگہ حکیم محمد حسن صاحب نے خود اپنی درخواست پر کالج کی معتمدی کی تجویز مولوی صاحب سے منظور کرائی تھی انجمن اور کالج کی کمیٹیوں میں وہ پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے اور مولوی صاحب کے کاموں میں ہمہ تن مصروف و معاون رہتے تھے مولوی صاحب ان کی بہت قدر کرتے تھے اور ہمیشہ انھیں اپنا مددگار اور رفیق سمجھتے تھے جب میں نے کالج سے استعفا دیا تو انھوں نے صدر کی خدمت میں استعفا قبول کرنے کی سفارش بھیجنے سے پہلے مجھے بہ نفس نفیس طلب کیا تھا اور مجھے کالج میں روکنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تفصیلات کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں بہر حال کالج میں رفتہ رفتہ سکریٹری حکیم محمد حسن صاحب اور پر نسل آفتاب حسن صاحب کے درمیان خوب گاڑھی



چھٹنے لگی تھی۔ اب معلو ہوا کہ دونوں مولوی صاحب کی مخالفت میں متحد المقصد ہو گئے ہیں اور کالج کے ضوابط اور قوانین کی پروا نہیں کرتے۔ مولوی صاحب کی ہدایات کو بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ آفتاب حسن صاحب اردو کالج سے میرے جانے کے بعد مطمئن ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ کالج سے معلومات کا واحد ذریعہ جو مولوی صاحب کو حالات سے آگاہ کر سکتا تھا، چلا گیا۔ اول تو میرے اور مولوی صاحب کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرائیں اور اب مجھ سے چھٹکارا پانے کے بعد بالکل مطمئن ہو گئے اور خوب کھیل کھیلے۔ انھیں معتمد کالج کی بھرپور حمایت اور سرپرستی حاصل تھی اس لیے مولوی صاحب کے پاس آنا جانا، ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ ادھر خود انجمن میں بھی نئے سکریٹری ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کے آنے کے بعد کشمکش شروع ہو گئی اور چوں کہ بعض ارکان کالج اور انجمن کے نظما میں مشترک تھے اس لیے ایک کے حالات کا دوسرے سے ادارے پر بھی اثر پڑنے لگا۔ ڈاکٹر معین الحق صاحب ۳ جولائی ۱۹۵۶ء کو انجمن کے معتمد مقرر ہوئے اور کوئی ایک ماہ کے اندر ہی انھیں مولوی صاحب سے شکایات پیدا ہوئیں۔ جنوری ۱۹۵۷ء تک یہ سب مدت لڑائی جھگڑے میں گزری۔ کالج اور انجمن کے نظما میں پارٹیاں بن گئیں اور دونوں اداروں کو سخت نقصان پہنچا۔ نظما کے اکثر لوگ عبدالرحمن رضوی صاحب سے جو معین الحق صاحب کے ساتھ انجمن کے شریک معتمد ہو گئے تھے، نالاں تھے اور ان کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور انجمن اور کالج میں مداخلت کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر معین الحق کے استعفی کے ساتھ ہی عین الدین کی شرکت معتمدی بھی ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر معین الحق کے استعفی کے بعد ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب جو اس وقت کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ و سیاسیات میں پروفیسر ہو گئے تھے بعض اجاب کے مشورے سے مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کا معتمد اعزازی اور ان کے ایما پر حکیم محمد احسن صاحب کو شریک معتمد مقرر کیا گیا دونوں حضرات کے انجمن کے اہم عہدوں پر فائز ہونے کے ساتھ انجمن میں عین الدین رضوی کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا اور مولوی صاحب تنہا رہ گئے اس زمانے میں مولوی صاحب پوری طرح مخالفین کے نرغے میں گھر کر رہ گئے تھے انجمن کی بالائی منزل میں ان کی رہائش گاہ تھی۔ انجمن کے دفتر پر حکیم محمد احسن صاحب ڈاکٹر محمود حسین خاں کے نائب کی حیثیت سے قابض ہو گئے۔ ۲۵ مئی ۱۹۵۶ء کو کالج کی گورننگ باڈی میں مولوی صاحب کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کا رپورٹ پیش ہونا تھی۔ اس کی کوئی نقل مولوی صاحب کو نہیں دی گئی۔ اور حکیم محمد احسن صاحب نے مولوی صاحب کی مخالفت کے باوجود اس اجلاس میں پرٹھہ کر سنائی مولوی صاحب کو اعتراض تھا کہ اس کی نقول اراکین مجلس کو مہیا نہیں کی گئیں لہذا اس وقت اس پر بحث ملتوی کر دی جائے مگر ان کی ایک نہ سنی گئی۔



وہ اجلاس برخواست کر کے جلسے سے باہر آ گئے مگر ان کی موجودگی میں ایک رکن عبدالخالق صاحب کی صدارت میں کارروائی جاری رکھی گئی اس طرح اس رپورٹ اور اس کے ساتھ حسام الدین راشدی کی ذیلی رپورٹ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا کیٹی کے کنوینر حاتم علوی نے مولوی صاحب کے طلب کرنے کے باوجود انھیں یہ کہہ کر اس کی نقل نہ دی کہ ایک ہی کاپی تھی جو حکیم محمد احسن صاحب نے گئے ان کے پاس کوئی نقل اب موجود نہیں۔ حکیم احسن صاحب نے رپورٹ و بانی اور کبھی منظر عام پر نہ آئی۔ میر حسام الدین راشدی صاحب نے اپنا تحریر کردہ نوٹ مولوی صاحب کو دے دیا تھا۔ وہ جولائی ۱۹۵۸ء کے ”نیارا ہی“ کراچی میں شائع ہو گیا مگر اس پر بھی کسی نے توجہ نہ کی۔ پیر صاحب نے اپنی رپورٹ کے آخر میں لکھا تھا کہ :

”دوسری ضروری چیز جس پر مجلس نظماً انجمن ترقی اردو اور گورننگ باڈی اردو کالج کے ارکان کو فوری توجہ دینی چاہیے یہ ہے کہ پچھلے آٹھ دس ماہ سے انجمن اور کالج کے اراکین میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے انتہائی شرم ناک ہیں اور دونوں اداروں کی عزت و ناموس کو ناقابل تلافی حد تک نقصان پہنچ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دونوں اداروں کے اراکین انتظامی نے اگر یہ حرکات بند نہ کیں تو یہ اداسے تباہ ہو جائیں گے اس لیے دونوں اداروں کی مجالس کی خدمت میں میری مخلصانہ گزارش ہے کہ اس طرف فوری توجہ دیا اور کوئی ایسی صورت نکالیں جس سے پیدا شدہ اختلافات ختم ہو جائیں اور جو دماغ اس وقت منصوبہ سازی اور سازشی کارروائیوں میں مصروف ہیں وہ آئندہ اداروں کی فلاح و ترقی میں مصروف ہو جائیں نیز اگر یہ معلوم ہو کہ بعض افراد کے وجود سے یہ اختلافات پیدا ہوئے ہیں تو ان افراد کو اداروں کی فلاح و بہبود کے پیش نظر فوراً اعلیٰ درجہ کے اس فضا اور مکمل شدہ ماحول کو صحیح اور صحت مند بنایا جائے۔“

میر صاحب کی اس مخلصانہ گزارش ”اور دردمند تجویز بھی پارٹی بازی کا شکار ہو گئی اس پر کسی نے ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی زحمت نہ فرمائی۔ میر آفتاب حسن صاحب کی طرف سے ذیلی رپورٹ میں مندرج الزامات کی تردید کی کبھی نہ زحمت نہ فرمائی چنانچہ انجمن اور اردو کالج کی بدنامی میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ ا

”ڈسپلن تو پہلے ہی ناقص تھی تعلیمی حالت بھی خراب ہو گئی امتحانات کے نتائج بھی اچھے نہ رہے یہی وجہ ہے کہ اس سال طالب علم بہت کم داخل ہوئے ہیں اب یہ تعلیمی ادارہ نہیں رہا بلکہ سازشوں اور فسادات کا گھر ہو گیا ہے بہت سے طالب علموں اور بعض اساتذہ کے پروفیسرینڈے کا کام لیا جاتا ہے تعلیمی مقاصد پس پشت ڈال دیے گئے ہیں۔“ (اردو کا المیہ ص ۲۶ از مولوی عبدالحق)

انجمن کے معتمد اعزازی ڈاکٹر معین الحق صاحب کے دور میں اردو خواتین کالج جو دو سال پہلے انجمن نے اردو کالج کے اصول پر قائم کیا تھا انجمن میں خنڈ نہ ہونے کے عذر پر بند کر دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کو اس کا بھی بہت صدمہ تھا۔ ادھر تو یہ حالات تھے ادھر انجمن کی بالائی منزل میں جہاں مولوی صاحب کی رہائش تھی حالات ناگفتہ بہ تھے مولوی صاحب کو بے دست و پا بنا کر رکھ دیا گیا اور وہ ایک طرح قید شہابی کی زندگی گزار رہے تھے ان کے پاس آنے جانے والوں کو روکا جاتا تھا ان کے ملازمین کو خدمت کرنے سے منع کر دیا گیا تھا خود حکیم صاحب اور میر آفتاب حسن صاحب نے مولوی صاحب کے ہمدردوں اور ملنے والوں کو دھمکیاں دے کر ان کا آنا جانا بند کر دیا جس میں ابن انشا صاحب، شمس حسین صاحب نجی اردو کالج کے بعض اساتذہ اور خود راقم الحروف کو بھی انجمن میں داخل ہونے اور مولوی صاحب کا حال احوال پوچھنے کی ممانعت کر دی تھی اور کچھ دن کے لیے باہر کی دنیا سے مولوی صاحب کا رابطہ کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود چند لوگ جان پر کھیل کر مولوی صاحب کے پاس جاتے رہے جن میں ابن انشا صاحب اور میں خود بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب کو یہ شکایات پہنچائی گئیں لیکن انھوں نے اس طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ :

”میرے ساتھ کام کرنے والے یا میرے خاص ہمدرد میرے پاس نہیں آنے پاتے انھیں زرد کو بکرنے کی دھمکی دی جاتی ہے اور وہ ڈر کر انجمن میں قدم نہیں رکھتے ظاہر ہے کہ ایک شریف آدمی غنڈوں سے مقابلہ نہیں کر سکتا انجمن کے کارکنوں کو مجھ سے ملنے کی ممانعت ہے وہ حکیم صاحب کے عتاب سے ڈرتے ہیں۔“

(اردو کا المیہ ص ۲۲)

۲۰ نومبر ۱۹۵۷ء کو کتب خانہ خاص جو مولوی صاحب کی ملک تھا اور جسے بعض احباب نے مولوی

صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور جہاں بیٹھ کر مولوی صاحب کام کرتے تھے مقفل کر کے مہربند کر دیا گیا۔ مولوی صاحب کا کام ان کے مسودات، کتابیں اور منظومات وغیرہ اندر بند ہو گئے اور مولوی صاحب کو اس طرح بے بس کر دیا گیا کہ وہ اپنی تحقیقی کام بھی نہ کر سکیں اور اوپر بیٹھے مکھیاں مارتے رہیں۔ اس زمانے میں انجمن کے رسالے بند ہو چکے تھے اور کتابوں کی پھپھائی اور اشاعت پر بھی ناخوشگوار اثر پڑا تھا۔ اس کے ساتھ یہ سازش تیار کی گئی کہ مولوی صاحب کو اردو کالج کی صدارت کے منصب سے خابج کر دیا تھا ان کی جگہ سندھ ہائی کورٹ کے سابق جج جناب ظہیر الحسنین لارلی صاحب کو صدارت پر فائز کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ تجویز کیا گیا کہ مولوی صاحب کو انجمن کی صدارت سے بھی علاحدہ کر دیا جائے اس کے لیے یہ تجویز سوچی گئی کہ مجلس نظامین ایک سرپرست کا اضافہ کر کے مولوی صاحب کو محض ایک سرپرست کا درجہ دے دیا جائے اس طرح انجمن سے ان کو عللاً ہے دخل کر کے ان کی رہائشی منزل بھی خالی کرائی جائے۔ ایک دن صبح کے گیارہ بجے مولوی صاحب میرے پاس اسلامیہ کالج تشریف لائے میں کالج سے پھٹی بے کراں سے بات چیت کرنے کے لیے ایک قریبی ہوٹل (گرین ہوٹل) میں چلا گیا۔ وہاں بالائی ہال میں مولوی صاحب کو بٹھا کر گفتگو کرنے لگا انھوں نے ہوٹل کا پرسکون ماحول دیکھ کر یکایک مجھ سے کہا کہ مجھے اسی ہوٹل میں ایک رہائشی کمرہ دلوا دو تاکہ سکون اور دل جمعی کے ساتھ زندگی کے باقی دن گزار سکوں۔ یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے مجھے سخت صدمہ ہوا اور میں نے عرض کیا کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں قطعی کوئی دقت نہیں لیکن ان حالات میں آپ کا انجمن کا قیام چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہونا حریفوں کی عین مسرت کا موجب ہو گا اور آپ کا کانٹا نکل جانے کے بعد وہ بے خوف و خطر جو چاہیں گے کریں گے اور کالج تو تمام و کمال ان کے ہاتھوں میں آچکا ہے اب وہ انجمن پر بھی تصرف بے جا کریں گے اور آپ کا سب کیا کرایا غارت ہو جائے گا۔ مولوی صاحب کی سمجھ میں میری بات آگئی اور انھوں نے تسلیم کیا کہ اپنے مقام سے ہٹنا ضرر کا خلاف مصلحت ہے میں نے مولوی صاحب کو یقین دلایا کہ میں ہر دوسرے تیسرے دن باوجود مزاحمتوں کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا اور ان کی تکالیف کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کروں گا مولوی صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور کچھ دیر بعد انجمن واپس چلے گئے۔

کالج کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ انجمن میں مولوی صاحب عضو معطل بن چکے تھے کہ یکایک ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خاں صاحب نے ملک میں مارشل نافذ کر کے سول حکومت کو برطرف کر دیا۔ ایوب خاں کی فوجی



حکومت پاکستان کے لیے ایک نیا تجربہ تھی اور ملک میں غنڈوں اور قانون شکن عناصر کی سرگرمیاں یکایک بند ہو گئیں۔ احتساب اور سزا کے خوف سے ہر شعبہ زندگی میں اعتدال سا آگیا۔ اردو کالج کے ارباب اقتدار کو معلوم تھا کہ مولوی صاحب کے جنرل ایوب خاں سے خاص مراسم ہیں اور مولوی صاحب نے انجمن کے مسائل اور پریشانیوں کے سلسلہ میں ان سے خط و کتابت شروع کر رکھی ہے۔ ۲۸ جون ۱۹۵۸ء کو ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نے معتمدی سے استعفادے دیا تھا اور شریک معتمد حکیم محمد احسن صاحب کو چارج دے کر رخصت ہو گئے تھے اب حکیم صاحب عملاً انجمن اور کالج دونوں کے مالک و مختار بن گئے تھے۔ ۹ جولائی ۵۸ء کو مولوی صاحب نے محمود حسین خاں صاحب کے استعفے کا تفصیلی جواب تحریر کیا مگر ملک میں مارشل لا لگ جانے کے باعث یہ بحث آگے نہ بڑھی۔ مرکزی وزارت تعلیم نے ایوب خاں صاحب کی ہدایت پر کالج اور انجمن کے حالات کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا اس کی خبر مولوی صاحب کے مخالفین کو بھی ہو گئی اور انھوں نے بھی حکومت کے با اثر افراد تک رسائی حاصل کرنا شروع کر دی۔ اسی کش مکش میں ایک سال گزر گیا۔ مولوی صاحب کے خط کے جواب میں جنرل ایوب خاں نے کہا کہ موجودہ ملکی قوانین کے لحاظ سے میں انجمن اور کالج میں مداخلت کا اختیار نہیں رکھتا اس پر مولوی صاحب نے ساری حالت زار بیان کر کے انجمن اور کالج کو ایوب خاں صاحب کی تحویل میں دے دیدیا۔ اس پر ستمبر ۱۹۵۹ء کو ایوب خاں صاحب نے ایک مارشل لا ضابطہ جاری کیا اور انجمن اور کالج کو دوبارہ مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے دیا اور ان کی مدد کے لیے کچھ سرکاری افسروں کی ایک با اختیار کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کام میں صدر ایوب خاں کے سکریٹری جناب قدرت اللہ شہاب صاحب نے مولوی صاحب کی خاص مدد کی اور صدر صاحب کو مولوی صاحب کے موقف کی تائید پر آمادہ کیا اس کام میں متوسط اور رابطہ کا کام ابن اثا صاحب نے انجام دیا جو شہاب صاحب کے مخلص اور بے ریا دوست تھے۔ آخری وقت تک مخالفین نے ان اقدامات کو کوآنہ کی سخت کوشش کی۔ مولوی صاحب کا اس زمانے میں جو حال تھا اسے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”یہ حالت بہت نازک اور خطرناک ہے اسے دیکھ کر مجھے سخت رنج اور صدمہ ہے اس تھوڑے عرصے میں انجمن کا انحطاط اس درجے کو پہنچ گیا ہے کہ اگر چند ہی عرصے میں یہی حالت رہی تو شاید وہ روز پھر دیکھنا پڑے جس کا اندیشہ ہے میں نے تقریباً پچاس سال تک اس انجمن کے بنائے ترقی دینے انجمن کے مقاصد پورا کرنے اور اردو کے وقار کو بڑھانے کے لیے ہر قسم کی محنت و مشقت اور جدوجہد کی اور اپنا دل و دماغ اور سرمایہ اس



کی نذر کر دیا میں اپنی زندگی میں اسے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا اگر میں خاموشی سے  
ایک تماشائی کی طرح یہ سب کچھ دیکھتا رہا تو مجھ سے زیادہ قابل ملامت کوئی شخص نہیں  
ہو سکتا اسے ہلاکت سے بچا نادر و مندان اردو کا فرض ہے میں اس زندگی پر  
موت کو ترجیح دوں گا۔

معرفت نیست دریں قوم خدا یاد دے کہ برم گو بر خور دار نہ خسریار گر  
(اردو کا المیہ صفحات ۳۸، ۳۹)

مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ ہی حکیم احسن اور آفتاب حسن صاحب اپنے گھر بیٹھ رہے نئی انتظامی کمیٹی نے  
جس کے سکریٹری جناب صوفی تھے پہلے ہی اجلاس میں آفتاب حسن صاحب کے اخراج کا فیصلہ کیا اور اگلے اجلاس  
کرنل عطاء الرحیم صاحب کو ان کی جگہ پر نیشنل مقرر کر دیا کہ وہ ناپسندیدہ عناصر کی تطہیر کر کے ضروری اصلاحات  
عمل میں لائیں۔

۱۹۵۹ء میں جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مارشل لا آرڈر کے نفاذ کے بعد انجمن اور کالج دوبارہ مولوی صاحب  
کے زیر انتظام آگئے۔ آفتاب حسن صاحب پر نیشنل اور حکیم محمد احسن صاحب مقتدر کالج سے علاحدہ ہو گئے۔ اور حکیم اسرار  
احمد صاحب کمرہ پوری کے مشورے سے کرنل عطاء الرحیم صاحب کو اردو کالج کا نیا پر نیشنل مقرر کر دیا گیا۔ کرنل صاحب  
نے جب کالج کا چارج سنبھالا تو خیال کیا جاتا تھا کہ وہ آفتاب حسن اور ان کی ذریعات کو کالج سے نکال دیں گے مگر  
اس قسم کی کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی اور کالج کا کام خوش اسلوبی سے چلتا شروع ہو گیا۔ یہاں یہ کہنا ضروری  
ہے کہ کالج کے مناقشات کے زمانے میں مولوی صاحب نے اپنی تحریک کو ایک نیارنگ دینا شروع کر دیا  
تھا اور اب وہ پوری توانائی کے ساتھ "اردو یونیورسٹی" کی مہم چلا رہے تھے۔ کالج چونکہ کراچی یونیورسٹی کے  
قوانین کا پابند تھا اور اس یونیورسٹی کے مقاصد میں اردو کی ترویج اور اس کے فروغ کی کوئی صراحت نہیں کی  
گئی تھی اور یہ اپنے دستور العمل سے ہٹ کر کوئی ایسا کرنے کی مکلف نہ تھی جو جامعہ عثمانیہ کے آغاز قیام ہی سے  
اس کا حصہ تھے۔ مولوی صاحب کو گزشتہ آٹھ دس سال کے تجربے سے یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ جو مقاصد ان کے  
پیش نظر ہیں وہ صرف اردو کالج کے ذریعے پورے نہیں کیے جاسکتے وہ سمجھ چکے تھے کہ جامعہ کراچی صرف تدریس کا  
کام کرنے اور امتحان لے کر اسناد تقسیم کرنے کے علاوہ کوئی بنیادی فریضہ ادا نہیں کر سکتی۔ ان کے نزدیک  
ایک تو انگریزی ذریعہ تعلیم بجائے خود طالب علم کی تخلیقی صلاحیت کو نقصان پہنچاتا ہے دوسرے اس کے ذریعے

جن کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان سے پڑھنے والوں کے فکر و خیال پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ ان میں نقالی اور تقلید کی عادت راسخ ہو جاتی ہے۔ وہ بے لاگ غور و فکر سے قاصر رہتے ہیں۔ اپنے ماحول سے منافرت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ باتیں قومی ترقی اور نشوونما کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اس باطنی کیفیت کا اثر ظاہر پر بھی پڑتا ہے زبان کے ہر لفظ اور جملے اور ہر پیرایہ بیان میں قومی روایات تہذیب و تمدن کے شعار اور ذہنی اور روحانی تجربے بیوست ہوتے ہیں۔ انگریزی کے ذریعہ ایک صدی میں جو تعلیم ہم نے حاصل کی ہے اس علم و فن کو ہم ڈھنگ سے اپنی زبان میں منتقل نہیں کر سکتے۔ یونیورسٹیوں سے علم کی روشنی ملک میں نہیں پھیل سکی اور اہل وطن ان کے علم سے نہال نہ ہو سکے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ہماری قوم کے عالی دماغ مصلح سر سید احمد خاں کو سب سے پہلے اردو یونیورسٹی کا خیال پیدا ہوا انھوں نے ۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے حکومت ہند کو ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں اس تجویز کی ضرورت اور اہمیت کو صاف اور سادہ زبان میں مدلل طور پر بیان کیا۔ انھوں نے خاص طور پر زور دیا کہ جب تک جدید علوم ہمیں ہماری زبان میں نہ پڑھائے جائیں گے ہماری تعلیم ناکافی اور غیر موثر رہے گی۔ لیکن اس وقت کے حالات کے باعث یہ تجویز عمل میں نہ آ سکی۔ پر یہ تجربہ دہلی کالج میں کیا گیا۔ اس کالج کے مشرقی شعبے میں جدید علوم و فنون کی تعلیم اردو کے ذریعہ دی جاتی۔ اس کامیاب تجربے کی توصیف میں پرنسپل کارگل اور بنگال تعلیم عامہ کے سرکاری تبصرہ سے شاندار الفاظ میں تحسین کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں مسٹر فریڈرک موٹ مٹ فزیشن میڈیکل کالج کلکتہ نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں یہ کالج توڑ دیا گیا۔ اس کے کوئی اسی سال بعد عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی اس کے شعبہ تالیف و ترجمہ نے علوم و فنون کی صد ہا کتابیں تالیف یا ترجمہ کیں ہزاروں علمی اصطلاحات وضع کیں۔ انجینیئری، ڈاکٹری، جغرافیہ، نظری اور طبی علوم کے سارے شعبے قائم کیے۔ سر آرڈیشہ دلال، سر ہشونم داس، سر رادھا کرشنن ہی راج گوپال آپھاریہ اور ہندوستان ٹائمز نے عثمانیہ یونیورسٹی کے تجربے کی توصیف و تعریف کی ہے۔ انگلستان کے سب سے بڑے طبی ادارے نے جامعہ عثمانیہ کی ڈاکٹری کی ڈگری کو تسلیم کیا۔ ۱۹۳۸ء کی دہلی اردو کانفرنس میں اور ۲۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو ناگپور کانفرنس میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی قراردادیں منظور کی گئیں۔ یہ یونیورسٹی کہاں قائم ہو اس پر اخبارات میں بہت سی تجاویز پیش کی گئیں۔ ۱۹۳۹ء کو ایک سماجی کارکن اور ماہر تعلیم مسٹر واسوانی نے اسے کراچی میں قائم کرنے کا مشورہ دیا اس سلسلے میں مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ "میں نے اللہ کا نام لے کر اسی کراچی میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام اردو کالج قائم کیا جو خدا کے فضل و کرم سے اب بھی



کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور جس میں بی اے، بی ایس سی، بی کام اور ایل ایل بی تک اردو کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے اب سے چند سال پہلے ایم اے کی تعلیم بھی اس میں اردو کے ذریعہ سے دی جاتی تھی۔  
(اردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضہ ص ۲۱۔ از مولوی عبدالحق)

مولوی صاحب نے فرمایا کہ حکومت پاکستان کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے اردو کالج کی افادیت کا اعتراف کیا ہے کمیشن نے اردو کی ترویج کے لیے پندرہ سال کی مدت تجویز کی تھی جس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ ”لیکن میں انتظار نہیں کر سکتا اور ایک مسلمہ حقیقت کو عمل میں لانے کے لیے پندرہ سال اور غیر یقینی اور تذبذب کے عالم میں نہیں رہنا چاہتا۔ اور اللہ کے نام سے از سر نو اردو یونیورسٹی کی زندگی بخش اور روح پرور مہم کو نئے جوش اور ولولوں سے شروع کرتا ہوں۔“

(ص ۲۱، مضمون: اردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضہ، از مولوی عبدالحق)

مولوی صاحب نے یہ مہم ۱۱ مارچ ۱۹۶۰ء کو شروع کی۔ ۶ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو شام پانچ بجے بیچ ہوٹل کراچی میں انجمن کی طرف سے ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت کریم آغا نے کی مولوی صاحب نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا اور ان کے دست مبارک سے اردو یونیورسٹی کی مہم کا افتتاح کرایا۔ مولوی صاحب نے یاد دلایا کہ سر کرم آغا خان کے دادا نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے سارے ہندوستان سے چندہ کیا اور اس کے مساوی رقم خود بھی عطا کر کے مسلم یونیورسٹی کے خواب کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔ اب ان کے پوتے کے ہاتھوں اردو یونیورسٹی کے قیام کا عظیم کام شروع ہو رہا۔ مولوی صاحب نے اردو یونیورسٹی کی تشکیل کے لیے ایک تاسیسی کمیٹی قائم کی جس کے سکریٹری گجراتی کے مشہور ادیب شاعر اور اخبار نویس جناب صاحب ایڈیٹر ملت گجراتی کو مقرر کیا اُس زمانے میں مولوی صاحب آنکھوں کے عارضے میں مبتلا تھے اور ان کی آنکھوں میں موتیا بند اترنے کی وجہ سے آپریشن ہوا تھا وہ اپنے خطوط بھی دوسروں سے پڑھوا کر سنتے تھے اور جوابات بھی لکھوا کر بھیجتے تھے۔ اس کے بعد سے مولوی صاحب کی علالت کا سلسلہ دراز ہو گیا وہ ۱۹۶۱ء دوبارہ جناح اسپتال کراچی میں داخل کر دیے گئے تھے جہاں سے مشترکہ فوجی اسپتال میں اور پھر اوپنڈی میں صدر پاکستان کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے زیر علاج رہے۔ عالم سکرات میں کراچی واپس لائے گئے اور کراچی میں بحرہ کے اسپتال میں ۱۴ اگست ۱۹۶۱ء کو جان جاں آفریں کے سپرد کی اور اپنی وصیت کے مطابق اردو کالج میں دفن ہوئے۔

مولوی صاحب کے انتقال کے بعد انجمن اور اردو کالج نئی انتظامیہ کے تحت ترقی کی نئی منزلوں کی طرف رواں ہوئے۔ جناب اختر حسین صدر انجمن دکن کالج کی سربراہی میں اردو سائنس کالج کی نئی عمارت کے لیے زمین حاصل کی گئی اور تعمیر کے لیے عطیات فراہم کیے گئے اور تعمیر عمارت کے بعد سائنس کالج شعبہ نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا جہاں اب وہ ایک علاحدہ اور مکمل کالج کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس کالج کے پہلے پرنسپل جناب اکرام الرحمن صاحب ہوئے اور اب ایم ایس سی کے مضامین کی تدریس بذریعہ اردو انجام دے رہا ہے۔ یکم ستمبر ۱۹۷۲ء کو دونوں کالج ملک کے دوسرے کالجوں کے ساتھ قومی تحویل میں لے لیے گئے اور یکم مئی ۱۹۷۵ء کو ان اردو کالج کے دونوں حصوں کا انتظامی و فاقی حکومت نے سنبھال لیا۔ اب آرٹس کالج یعنی پرانی عمارت میں فنون تجارت اور قانون کی تعلیم جاری ہے۔ آرٹس کالج کے پرنسپل خلیل اللہ صدیقی کے دور میں کالج نے بڑی ترقی کی۔ پرانے کالج کی عمارت میں توسیع ہوئی اور کالج و انجمن کے درمیان جو صمن افتادہ تھا اس پر بھی عمارتوں کا ایک سلسلہ تعمیر ہو گیا ہے۔ کالج کے قریب علمی کراچی کا میدان موجود تھا اس کا ایک حصہ جو کالج سے ملحق تھا کالج کو مل گیا اس حصے میں بابائے اردو ہال اور پرنسپل کے دفاتر واقع ہیں۔ کالج میں ایم اے کی تدریس دوبارہ شروع ہو گئی ہے ایک نئے مضمون ایم اے ایجوکیشن کا اضافہ کیا گیا ہے قانون میں ایل ایل ایم کی جماعتوں کے لیے نیا نصاب مرتب کیا گیا ہے اور یہ کلاسیں پورے ملک میں اپنے ذریعہ تعلیم کی بنا پر مقبول عوام ہیں۔

کالج کے اساتذہ کی علمی کارگزاری ایک الگ موضوع ہے جس پر علاحدہ مضمون درکار ہے۔ مجملہً کہا جاسکتا ہے کہ پرنسپل آفتاب حسن نے دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ شائع کیا، مولانا منظر علی کامل صاحب نے ”حکومت کا اسلامی نظام“ کے نام سے ایک عربی کتاب ”نظام الحکم فی الاسلام“ کا ترجمہ کیا، عبدالرشید نے ”اقبال اور عشق رسالت مآب“ لکھی، محمد علی علوی صاحب نے جغرافیہ پر تین کتابیں مرتب کیں۔ سید حسین الحق صاحب نے قدیم مشرق کے نام سے پرانی تہذیبوں کا مطالعہ پیش کیا۔ عظمت اللہ خاں نے نظری معاشیات پر ایک کتاب لکھی۔ اردو کالج کے وابستگان اساتذہ اور طلبہ نے جو علمی و ادبی کام کیا ہے اس کی مکمل فہرست آج تک شائع نہیں ہوئی لیکن مولوی عبدالحق نے اردو کالج کی صورت میں جو چراغ علم و ادب روشن کیا تھا اس کی لو سے بہت سے چراغ منوفاں ہوئے اور آج تک ان کی روایت پر اس طرح کام ہو رہا ہے جیسا کہ ان کی زندگی میں ہوتا تھا۔ جن اساتذہ اور طلبہ نے علمی کاموں میں زندگی گزاری ان میں ڈاکٹر معین الحق



ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، پروفیسر حبیب اللہ خان، غصنف، ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر عبدالقیوم، عبداللہ المدوسی، مولانا مظہر علی کامل، مولوی عبدالرشید فاضل، مولوی قمر الدین خان، پروفیسر خلیل اللہ، ڈاکٹر نعیم نقوی، اکرام الرحمن، محمد علی علوی، ڈاکٹر غلام سرور، ڈاکٹر محمد ایوب قادری اور دیگر متعدد اصحاب کا نام گنایا جاسکتا ہے۔ مولوی صاحب کی ومنع اصطلاحات کی مجالس میں دیگر ماہرین کے علاوہ کالج کے آفتاب حسن، مولانا منتخب الحق قادری، سید عبدالعلیم، فصیح الزماں صاحب، خواجہ آشکار حسین اور دیگر حضرات شریک ہوتے رہے اور اس کام کو بڑھانے میں ان کی مدد کردار و کالج اب ایک سرکاری ادارہ ہے اس کی مالی مشکلات کا بڑی حد تک ازالہ ہو چکا ہے۔ افسوس کہ مولوی صاحب اس کی تعمیر و ترقی کا یہ دور دیکھنے کو زندہ نہ رہے لیکن اس کالج کے احاطے میں ان کا مزار اب بھی کالج آنے والے ہزاروں افراد کو اپنے بانی کے عزم و ہمت کی یاد دلانا رہتا ہے۔

عتیق احمد جیلانی

استاد شعبہ اردو، جامہ سندھ،

جام شورو، پاکستان۔

## دبستانِ شبلی اور مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق کو عام طور پر دبستانِ شبلی کے مخالفین میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اخیر عمر کے ایک خط میں انھوں نے اس خیال کی تردید کی ہے جس کا حوالہ آئندہ سطور میں آئے گا۔ تمہید کے طور پر یہاں قومی زبان، کراچی بابائے اردو نمبر ۱۹۶۶ء سے دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں: ”میں تربیت کے لحاظ سے شبلی کے گروہ کا آدمی تھا۔ یہاں تک کہ ۳۹ء یا ۴۰ء تک میں مولوی عبدالحق صاحب سے صرف اسی وجہ سے بے تعلق رہا کہ وہ میرے ہیرو کے متعلق اچھے خیالات نہ رکھتے تھے۔“

اس کے ساتھ ہی ابوسلمان شاہجہان پوری کے مقالے سے یہ اقتباس بھی توجہ طلب ہے: ”مولانا غلام رسول مہر نے اسی سلسلے میں میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا: یہ ٹھیک ہے کہ مولوی عبدالحق کے گرد ایسے لوگوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا جو لیگی ذہن رکھتے تھے اور مولانا آزاد کے مخالف تھے۔ مولوی صاحب ان لوگوں سے متاثر تھے۔ لیکن ان کے اختلاف کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شبلی کو سخت ناپسند کرتے تھے اور شبلی اسکول کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مولانا آزاد کو اگر کسی اسکول سے وابستہ کیا جاسکتا ہے تو وہ شبلی اسکول ہے۔ اس لیے وہ مولانا آزاد کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ شبلی کے مقابلے میں

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مضمون ”کچھ یادیں“ مشمولہ قومی زبان، کراچی، بابائے اردو نمبر جلد ۲۹، شمارہ ۲، ۱۹۶۶ء ص ۱۔

۲۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری: مضمون ”عبدالحق اور ابوالکلام آزاد“ مشمولہ قومی زبان، محولہ بالا، ص ۲۵۱۔

وہ حالتی کے بہت مداح تھے بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ وہ شبلی کے دشمن اور حساسی کے عقیدت مند تھے، مولانا مہر نے مزید فرمایا تھا: "واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی مخالفت ان کی ایک کمزوری تھی اور اکثر لوگ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے تھے۔"

اب آئیے مولوی عبدالحق کے مذکورہ مکتوب کی طرف "ادیب" علی گڑھ، شبلی نمبر کے لیے عبد اللطیف اعظمی نے بذریعہ خط ان کے تاثرات طلب کیے۔ جوابی خط میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

"رہی یہ بات کہ میں مولانا شبلی کا مخالف ہوں تو یہ بالکل غلط ہے۔ میں مولانا کے علم و فضل کا تہہ دل سے قائل ہوں اور انھیں اردو زبان کے بڑے ادیبوں اور محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔۔۔۔۔"

لوگوں کا یہ کہنا کہ میں مولانا شبلی کا مخالف ہوں، اس کا سبب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنی بعض تحریروں میں مولانا شبلی کے بعض بیانات پر جو تنقید کی ہے اس سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہو۔"

اسی خط میں ماہ نامہ انشا کراچی، اکتوبر ۱۹۵۹ء میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون کا اقتباس بھی نقل کیا ہے۔ زمانہ طالب علمی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے فارسی لی، اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے استاد ملے۔"

حالی و شبلی کی چٹمک کے ضمن میں اظہار خیال کرتے ہوئے مولوی صاحب اس کی تردید کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ مولانا شبلی کی طبیعت میں مضبوط نہ تھا جب کہ حالی انتہا درجے کے مضبوط واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے

۱۔ مولوی عبدالحق، مکتوب بنام عبد اللطیف اعظمی مرقومہ ۹ جولائی ۱۹۶۰ء، مضمون ماہ نامہ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر جلد ۱، شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۵، ۱۴۔ (یہ خط "شبلی نقادوں کی نظر میں" از دواصل عثمانی، کراچی، صفحہ اکیڑمی، مطبوعہ ۱۹۶۴ء میں بھی شامل ہے۔)

۲۔ ایضاً ص ۱۵۔ (مولوی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مورخ تھے، ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہوتا تھا۔ وہ موقعے موقعے سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف پاتا رہتی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔" بحوالہ بابائے تحریک ادب و افکار، از ڈاکٹر سید معین الرحمن لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، طبع اول ۱۹۶۶ء، ص ۱۴۳)

شبلی کا ذکر ہمیشہ اچھے نظروں میں کیا۔ مولانا شبلی نے "حیات جاوید" دیکھتے ہی اسے کذب و افترا کا آئینہ قرار دیا تھا۔ مگر انھیں حالی سے کوئی بغض نہ تھا وہ بھی ان کی علمیت کے قائل تھے۔ جب مولانا (حالی) کو شمس العلماء کا خطاب ملا تو مولانا شبلی نے مجھ سے فرمایا اب اس خطاب کی عزت بڑھ گئی ہے۔" ۱۷

مولوی صاحب کی اس وضاحت کے باوصف یہ حقیقت ہے کہ ان کے اور شاگردان و حامیان شبلی کے درمیان تعلقات میں کبھی گرم جوشی کی کیفیت نہیں رہی۔ دونوں طرف کی متعلقہ تحریروں میں اختلافات کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور ایک دوسرے کی ادبی و علمی خدمات کا اعتراف بھی ملتا ہے۔ ان تحریروں کے جائزے سے مفہوم صرف اسی قدر ہے کہ بکھرے ہوئے حقائق یکجا کر دیے جائیں۔ دونوں طرف کے بزرگوں میں سے کسی کو برحق ثابت کرنا ہمارا منشا ہرگز نہیں۔ ہماری نگاہ میں سر سید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مہدی الافلوی اور دیگر اہل علم اپنی اپنی جگہ لائق تکریم ہیں۔

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں فریقوں کے تعلقات میں خرابی کا آغاز کہاں سے ہوا۔ اس ضمن میں "حالی و شبلی کی چشمک" کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ مگر ایک خیال یہ بھی ہے کہ شبلی کی مخالفت حالی سے نہیں سر سید سے تھی۔ سر سید سے اختلافات کے آغاز اور ان کی نوعیت پر "حیات شبلی" میں سید سلیمان ندوی نے تفصیلاً لکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی حالی و شبلی کے مخلصانہ تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ۱۸ آل احمد سرور، عبداللطیف اعظمی کی تصنیف "شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں" کے مقدمے میں لکھتے ہیں: "در اصل یہ چشمک ان دونوں بزرگوں میں اتنی نہ تھی، جتنی ان کے جانشینوں میں ہے۔"

۱۹ ایضاً، ص ۱۳۰۔

۲۰ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: "شبلی نامہ" اور یادگار شبلی "از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، "سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء اردو شکرانی اور فکری جائزہ" از ڈاکٹر سید عبداللہ، "شبلی ایک دبستان" از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ردوئی "ذکر شبلی" از محمد امین زبیری، اور "شبلی ادیبوں کی نظر میں" از محمد واصل عثمانی۔

۲۱ آل احمد سرور، مقدمہ مشہور "شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں"، طبع دوم، کراچی، صفحہ اکیڑمی،

اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۳۔



اس موضوع پر جب مہدی الافادی نے قلم اٹھانے کا ارادہ کیا تو اس کی اطلاع مولانا عبد الماجد دریابادی کے توسط سے سید سلیمان ندوی تک پہنچی، مگر صاحبِ مضمون کا نام صیغہ راز میں رہا۔ سید صاحب کا ذہن قاضی تلمذ حسین اور سید ہاشمی فرید آبادی کی طرف منتقل ہوا اور یہ گمان گزرا کہ شاید یہ سب کچھ مولوی عبدالحق کے اشارے پر ہوا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام لکھتے ہیں:

”متاخرین کی معاصرانہ چشمک آخر کس کی آنکھ کا اشارہ ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ قاضی صاحب ہوں گے یا ہاشمی صاحب! نو واردوں میں کوئی تیسرا نہیں ہو سکتا۔“  
(ص ۹۱، مکتوب مرقوم ۱۵ جون ۱۹۱۸ء)

”ہاں! مولوی عبدالحق یا سلیم تو چشمک باز نہیں؟ ابھی یونہی شبہ سا ہوا۔“  
(ص ۹۲، مکتوب مرقوم ۱۵ جون ۱۹۱۸ء۔)

”آپ کے چشمک باز صاحب پر ایک شعر یاد آیا، داد دیجیے گا! اللہ ری تابِ حسن کہ تیرا ڈیرِ بلاق چشمک زل کرے ہے عقیقِ یمن کے ساتھ“  
(ص ۹۳، مکتوب مرقوم ۲۴ رمضان ۱۳۳۶ھ۔)

”حالِ شبلی کی معاصرانہ چشمک“ کے اصل خالق مہدی الافادی، مولانا شبلی کے مذاہن میں سے تھے۔ اسی حوالے سے سید سلیمان ندوی اور ندوہ و دارالمصنفین سے بھی تعلق خاطر رکھتے تھے۔ سید صاحب نے ان کے انتقال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بھی اس مضمون کا حوالہ دینا ضروری خیال کیا۔ لکھتے ہیں:

”ناظرین کے دلوں میں شبلی سوسائٹی اور معاصرانہ چشمک کے لکھنے والے کی یاد ابھی بالکل تازہ ہوگی۔ مرحوم کو مولانا شبلی کی ذات، ان کی تصانیف، ان کے تلامذہ اور ان کی یادگار کی چیزوں، سب سے گہرا تعلق تھا۔“

انہ اقتباسات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شبلی وصال کے تعلقات کو اس انداز میں موضوعِ بحث بنانا سید صاحب کو منظور نہ تھا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سر سید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی کے بارے میں

دارالمصنفین اور سید سلیمان ندوی کے تاثرات کی ایک جھلک پیش کر دی جائے۔ شداتِ معارف کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے<sup>۱</sup>۔

”جو لوگ اب تک ہر چیز کے جواب میں آیاتِ ممکنات کی طرح سرسید کی پابسی سرسید کی پابسی چلاتے رہتے ہیں وہ یا تو سرسید کو غلط سمجھتے ہیں یا خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں یا قوم و ملک کو۔“

مولانا حالی سے متعلق دو اقتباسات دیکھیے۔۱۔

”مولانا حالی مغفور کی قدر دانی خود ان کی قوم میں تو یہ ہوئی تھی کہ خالی اخیالی، ڈفال جیسے سنجیدہ حریف ان کے زیر کرنے کو اکھاڑے میں اتارے گئے اور علی گڑھ، لکھنؤ و گورکھپور سے مہینوں بلکہ برسوں ان کے نام پر آوازے کسے جاتے رہے۔ لیکن دوسری قومیں اس قدر تنگ نظر نہ تھیں۔ ان کی رباعیات کا ترجمہ مدت ہوئی انگریزی میں ہو چکا ہے۔ ان کی تصانیف نظر ہر انگریز محققوں نے تبصرے لکھے ہیں۔۔۔۔۔“<sup>۲</sup>

”ہمارے پچھلے نامور مصنفین میں مولانا حالی کا جو درجہ ہے وہ مخفی نہیں۔ وہ ”حیاتِ جاوید“ کے مصنف ہو کر خود حیاتِ جاوید پا چکے ہیں۔ ان کی سخن دہری، سخن فہمی، نکستہ رسی اور متانتِ تحریر اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ایسی ہستی اگر کسی دوسری قوم کو حاصل ہوتی تو اس کی مستقل سوانح عمریوں اور اس کے کاموں کے تبصروں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہوتا مگر ہماری غفلت کی انتہا ہے کہ چند مہینوں کے سوا ان کے سوانح حیات کا کوئی ورق بھی نہیں ملتا۔“<sup>۳</sup>

۱۹۱۵ء کے دوران شبلی اکبر ٹی اور دارالمصنفین کی تہذیبی و زیر غور تھیں۔ سید سلیمان ندوی مقاصد کے اشتراک کی بنیاد پر انجمن ترقی اردو سے رابطے اور تعاون کی صورت چاہتے تھے۔ اس ضمن میں مولانا

<sup>۱</sup> معارف، جلد ۹، شمارہ ۵، مئی ۱۹۲۲ء، ص ۳۲۴۔

<sup>۲</sup> معارف، جلد ۱۰، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۲۲ء، ص ۳۲۸۔

<sup>۳</sup> ”مولانا حالی کی خود نوشت سوانح عمری“، ادارتی نوٹ، مشمولہ معارف، جلد ۹، شمارہ ۵، مئی ۱۹۲۲ء، ص ۳۲۴۔

عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں :

● — "رات اکاڈمی کے قواعد و مقاصد ترتیب دے رہا تھا، دیکھتا ہوں تو انجمن ترقی اردو سے کہیں کہیں ٹکرا جاتی ہے۔ کاش اہل انجمن، ترقی اردو کو اکاڈمی میں ضم کر دیں۔ مولوی عبدالحق مشغول آدمی ہیں اور پھر مرکز سے ۷۰۰ کوس دور۔ مولوی عبدالحق کا پتا معلوم نہیں، مطلع فرمائیے۔" (ص ۳۸، مکتوب مرقومہ ۲، فروری ۱۹۱۵ء)

● — "دارالمصنفین کی نسبت ڈاکٹر اقبال، سید اکبر حسین، عماد الملک اور مولوی حبیب الرحمن خاں اور مولوی ابوالکلام سے گفتگو کر رہا ہوں، مولوی عبدالحق کو بھی خط لکھتا ہوں۔" (ص ۳۸، مکتوب مرقومہ ۹، فروری ۱۹۱۵ء)

● — "حسن نیت سے معاملہ خود بخود فیصلہ ہو گیا۔ اتفاق سے چند روز کے لیے مجھے خود حیدر آباد جانا پڑا، مولوی عبدالحق وہاں آگئے تھے، مولوی حمید الدین صاحب اور میرے مقابلے میں ان سے باتیں ہو گئیں۔"

(ص ۳۹، مکتوب مرقومہ ۴، مارچ ۱۹۱۵ء)

"دارالمصنفین" کے قیام اور "معارف" اعظم گڑھ کی اشاعت کے اولین سالوں میں بھی سید صاحب اور مولوی عبدالحق کے درمیان تعلقات میں سرد مہری قائم رہی۔ اس کا اظہار مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام سید صاحب کے خطوط میں ہوتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے :

● — "سنا ہے کہ آپ نے ترقی اردو کی شاخ مکھنویں قائم کی ہے۔ میں تو اس دربار کے لائق ہی نہیں ہوں، ورنہ میں بھی شہداء میں داخل ہوتا۔"

(ص ۴۷، مکتوب مرقومہ ۳، دسمبر ۱۹۱۵ء)

● — "نقاد میں اپنی تنقید تو آپ نے پڑھی ہوگی، ترقی اردو کو تو کہیں کانہ رکھا۔"

(ص ۶۹، مکتوب مرقومہ ۱۸، مئی ۱۹۱۷ء)

● — ”مولوی عبدالحق صاحب کی مجلس شوریٰ میں مجھے بار کیوں ملنے لگا! آپ کو یہ منطقی طرز استدلال معلوم ہے، دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے۔“

(ص ۷۴، مکتوب مرقومہ ۲۲، اگست ۱۹۱۷ء)

مولانا عبدالحق صاحب دریا بادی، انجمن ترقی اردو اور دارالمصنفین، دونوں سے قریبی روابط رکھتے تھے۔ وہ مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی، دونوں کے مخلص احباب میں شامل تھے۔ اس لیے دونوں بزرگوں کے باہمی تعلقات کے بہت سے نشیب و فراز ان کی نگاہ میں تھے۔ چنانچہ اسی واقفیت کی بنیاد پر مذکورہ بالا خط (مرقومہ ۲۲، اگست ۱۹۱۷ء) کے حاشیے میں لکھتے ہیں: ”مولوی عبدالحق صاحب کی مخالفت مولانا شبلی اور ان کے جانشین سے اب بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔“ (ص ۷۴)

ان خطوط میں انجمن ترقی اردو کی مطبوعات پر تنقیدی آراء بھی موجود ہیں:

● — ”معاف کیجیے، آپ کے سوا انجمن ترقی اردو کے دوسرے دور کی کوئی کتاب

زبان کی لفظی و معنوی غلطیوں سے پاک نہیں۔“ (ص ۸۴، مکتوب مرقومہ ۸، جنوری ۱۹۱۸ء)

● — ”مولوی عبدالحق صاحب نے اصطلاحات کی کاپی بھیجی تھی۔ میں کیا بتاتا ہوں ہی

کچھ سٹپٹ جا جا رہا ہے لکھ کر بھیج دی۔ جامع نے انہیں کتابوں کے اخیر سے اصطلاحات

بعینہ نقل کر لی ہیں۔“ (ص ۸۷، مکتوب مرقومہ ۱۴، فروری ۱۹۱۸ء)

۱۹۲۱ء کے آغاز میں سہ ماہی اردو، انجمن کے علمی مجلے کی حیثیت میں سامنے آیا تو معارف نے اس کا خیر مقدم

کیا۔ باب التقریظ والانتقاد کے تحت پہلے شمارے پر تبصرہ شامل اشاعت کیا گیا۔ اس تبصرے میں شکوہ و شکایت

کا ایک پہلو بھی موجود تھا۔ چنانچہ اردو کی تیسری اشاعت میں مولوی عبدالحق نے ”معارف کی تنقید“ کے عنوان سے

اس کا جواب تحریر کیا۔ اس طرح غیر ضروری طور پر فضا ناخوش گوار ہو گئی اور پھر جلد ہی شعر العجم کی تنقید سے متعلق سلسلہ

مضامین نے اسے محاذ آرائی کی شکل دے دی۔ سہ ماہی اردو، شمارہ ۱، پر معارف کے تبصرے سے اقتباس درج ذیل

۱۔ ایضاً۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ مولوی صاحب کی یہ تحریر قومی زبان کراچی، جلد ۵۳، شمارہ ۸، اگست ۱۹۸۳ء میں بھی شائع ہو چکی ہے۔



”اردو کا آغاز ہی پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ اس کے دربار میں نہ حالی و آزاد  
(مولوی محمد حسین) کی صفت میں شبلی کی جگہ ہے اور نہ ’حسن‘ و ’دکن ریویو‘ کے ساتھ  
’الندوہ‘ کے نام سے یہ اپنی زبانِ قلم کو آلودہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے یقیناً معارف  
کی تعریف و تنقیص دونوں سے اس کا مرتبہ ارفع ہو گا۔۔۔۔۔ اردو میں اس سے پہلے غالباً  
کوئی رسالہ ہی رسالہ کبھی نہیں نکلا۔ اس بدعتِ حسنہ کا ہم دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔“  
مولوی صاحب نے اس شکایت کا جواب ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

”معارف نے اردو کا خیر مقدم کیا ہے جس کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ  
معارف کی طرح اردو کا شیوہ نوک جھونک نہیں ہے لیکن فاضل مرتب معارف  
نے ابتدائے تنقید ہی میں چند جملے ایسے لکھ دیے ہیں جن سے مغالطہ پیدا ہوتا ہے  
اور اس کا رفع کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ بہر حال ہمیں ان کی طبیعت کا رنگ معلوم  
ہو گیا اور جوان کے دل میں تمنا وہ ان کے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑا۔“

علامہ شبلی نعمانی کی مشہور تصنیف شعر العجم پر حافظ محمود خاں شیروانی کے تحقیقی مقالات کی اشاعت رسالہ اردو  
میں شروع ہوئی تو اسے بھی دارالمصنفین میں ٹپک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ معارف کے شذرات اور مقالات میں  
مذکورہ ”تنقید شعر العجم“ متعدد بار موضوعِ تحریر بنی۔ یوں دونوں اداروں کے درمیان شکوک و شبہات کی خلیج  
کچھ اور وسیع ہو گئی۔ سید سلیمان ندوی اس سلسلہ مضامین کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر سید عبداللہ  
کی اس تحریر سے کیا جاسکتا ہے:

”جس زمانے میں استاد مرحوم پروفیسر شیرانی، شعر العجم کے بعض حصوں پر  
تنقیدی مضامین لکھ رہے تھے سید صاحب مرحوم نے مجھے لکھا کہ اپنے استاد سے کہہ دو

۱۔ معارف، جلد ۷، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۲۱ء، ص ۳۱۵۔

۲۔ رسالہ اردو، جلد اول، حصہ سوم، جونائی ۱۹۲۱ء، ص ۴۸۱۔

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مضمون ”کچھ یادیں“، مشہور قومی زبان، محولہ بالا، ص ۹

کہ تنقید ضرور کریں مگر مولوی عبدالحق کی پارٹی بازی میں شرکت نہ کریں پیغام میں نے پہنچا دیا اور مدتوں تک استاد مرحوم کی نظروں میں مشکوک بلکہ معتبوب آدمی رہا۔

رسالہ اردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء، جلد ۳، حصہ ۱۲ میں تنقید شعرا لعمم کے سلسلے میں مشہور محقق ڈاکٹر محمد اقبال کو غلطی سے ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال لکھ دیا گیا۔ شذرات معارف میں سید سلیمان ندوی نے اس کی تصحیح میں ذرا سخت لہجہ اختیار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”مرحوم مصنف نے تو سینکڑوں برس کے مردہ اشخاص کے ناموں میں غلطیاں کی ہیں مگر ہمارے زندہ تنقید نگار کی صحیح البیانی یہ ہے کہ وہ زندہ اور معاصر اشخاص کے ناموں میں بھی الشباس اور تشابہ سے محفوظ نہیں، پھر مردوں کی داد فریاد کون سنتا ہے۔۔۔ حضرت مسیح نے سچ کہا ہے: تم کو دوسروں کی آنکھوں کا تنکا نظر آتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا،

ایک زندہ دل نہ رفت سلامت ز عیب جو کایں با جراتہ حضرت علیہ السلام رفت“

رسالہ اردو کے اگلے شمارے میں اس سے زیادہ سخت لہجہ اختیار کیا گیا اور فہرست مضامین سے قبل تین صفحات میں دو عنوانات کے تحت نمایاں طور پر جواب شائع کیا گیا۔ پہلی تحریر منیر مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (مولوی محمد مقتدی خاں) کی طرف سے ”مطبع کی معذرت“ کے عنوان سے ہے۔ صاحب تحریر قادریں سے معذرت کے بعد لکھتے ہیں:

”شعرا لعمم کی جو تنقید رسالہ اردو میں مسلسل شائع ہو رہی ہے وہ بلاشبہ ایک اہم ادبی و تاریخی خدمت ہے اور اس سے کسی طرح مرحوم مؤلف کی خدا خواستہ منقصدت یا ان کے حقیقی کمال کا استخفاف مد نظر نہیں ہے۔ مگر شبلی منزل کے عرش نشین جو خود کو جائز سے جائز اعتراض سے ماورا سمجھتے ہیں اس سے سخت نعل درآتش ہیں اور بجائے اس کے کہ اعتراضوں پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور متانت کے ساتھ ان کا جواب دیں (اگر کچھ

ہو سکتا ہو) اب معارف کے دسمبر نمبر میں انھوں نے اس ناموں کی الٹ پھیر کی آڑ پر ذکر رسالہ اور اس کے فاضل تنقید نگار پر بوجھاڑ کی ہے۔“

اس کے بعد دوسرے صفحے پر نیا عنوان ہے ”کھپائی بتی کھپا نوچے“۔ یہ تحریر ایڈیٹر کی طرف سے ہے۔ اس کا عنوان اور نفسِ مضمون غیر ضروری حد تک جارحانہ ہے، اقتباس درج ذیل ہے؛

”معلوم ہوتا ہے کہ اہل معارف ایسی ایسی بھول چوک کی تاک ہی میں تھے رسالے

کے فاضل ایڈیٹر نے اپنے شذرات میں رسالہ اردو اور صاحبِ تنقید شعرا انجم پر رکیک اور

عامیانه زبان میں حملہ کیا ہے جو ایک علمی پرچے کی شان سے بعید ہے اور بڑے فخر و نمود

سے اس غلطی کا اظہار فرمایا ہے گویا تنقید شعرا انجم کا جواب ہو گیا۔۔۔ مگر اس کا کیا

علاج کہ یہ حضرات شیش محل میں رہ کر دوسروں پر پتھر پھینکتے ہیں۔ معارف کے پرچے

(ہابت ماہ دسمبر) میں تلخیص و تبصرہ کے تحت میں بوسٹن کے عجائب خانے کا حال درج

ہے اور ہر جگہ بوسٹن کو انگلستان کا شہر بتایا ہے۔ حالاں کہ مدرسے کا بچہ بچہ جانتا ہے

کہ یہ شہر صوبہ جات متحدہ امریکہ میں واقع ہے۔۔۔ کیا ہم حضرت مسیح کے اس قول کی

نقل کر سکتے ہیں جو معارف کے فاضل ایڈیٹر نے اردو پر تعریفیں کرتے ہوئے نقل فرمایا ہے۔“

اس کے فوراً بعد شذراتِ معارف میں سید سلیمان ندوی جوابِ الجواب کے طور پر لکھتے ہیں؛

”دسمبر کے معارف میں تنقید شعرا انجم کے سلسلے میں ڈاکٹر اقبال اور پروفیسر

اقبال کے تشابہ پر رسالہ اردو کو جو ہم نے ٹوکا تھا اس نے اورنگ آباد سے لے کر

علی گڑھ تک ایک آگ سی لگادی، ایڈیٹر صاحب کی خفگی تو سب جانتھی مگر مہتمم صاحب مطبع

مسلم یونیورسٹی کی بوالغضولی سمجھ میں نہیں آئی، بہر حال معارف اور اردو کے شذرات

ملک کے اربابِ علم و فہم کے سامنے ہیں اور وہ ان کو دیکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں

میں کس کا معیارِ اخلاق بلند ہے؟۔۔۔ معارف کے ایک معمولی لیکن ذرا سے شذریہ پر



جس سے ملک کے متحد و اہل قلم کو باہمی الجھاؤ سے نجات مل گئی اردو کی اس برافروختگی کو دیکھ کر ہم کو بے اختیار ہنسی آتی ہے کہ وہ ایک معمولی گرفت سے اس قدر برہم ہے اور ان لوگوں کو صبر و رضا و تسلیم کی دعوت کرتا ہے جن کے ایک بزرگ کو طعن و طنز، لہجے کی درشتی اور تجہیل کے ساتھ وہ مہینوں سے یاد کر رہا ہے۔

معارف کے اسی شمارے میں ”شعرا لعم اور عمر خیام“ کے عنوان سے سید سلیمان ندوی کا ایک مقالہ بھی موجود ہے جس میں پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کے ساتھ اس بحث میں پروفیسر محمد اقبال کی شرکت پر تنقید کی گئی ہے اور پھر یہ نکتہ بہ نکتہ پروفیسر اقبال کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ تمہیدی عبارت کے چند فقرے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

”کچھ دنوں سے رسالہ اردو (اورنگ آباد، کن) میں شعرا لعم پر ایک مسلسل تنقید نکل رہی ہے جس کی طرف پہلے اس لیے ہم نے توجہ نہ کی کہ یہ نقاد کی شعرا لعم پر تنقید نہیں بلکہ مغربی مستشرقین کی مشرقی تذکرہ نویسوں پر تنقید ہے اور شعرا لعم کا پردہ مضمون نگار نے صرف اس لیے رکھا ہے تاکہ ’طعنہ نیکاں‘ کے وسیلے سے وہ اپنے ’اخلاق حسنة‘ کی پردہ دری کر سکیں۔“

اس بحث کے بعد بھی رسالہ اردو اور معارف میں شعرا لعم کا تذکرہ ہوتا رہا۔ مسٹر پیٹن جی بھاجی والا کی کتاب ”مولانا شبلی اینڈ عمر خیام“ (انگریزی) شائع ہوئی تو رسالہ اردو میں غالباً پاشمی فرید آبادی نے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا: ۳

۱۔ اس سے اگلے شمارے کے شذرات میں سید صاحب لکھتے ہیں: ”پروفیسر اقبال میرے نیاز نامے کے جواب میں ارقام فرماتے ہیں کہ میں نے رسالہ اردو والا مضمون اشاعت کے ارادے سے نہیں لکھا تھا اور نہ اس کی عبارت اور ترتیب مختلف ہوئی۔ آپ نے اپنے مضمون سے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور بدین وجہ اہل زبان کو میری نکتہ چینی کا مشکور ہونا چاہیے۔“ (مکالمہ معارف جلد ۱۳، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۲۔)

۲۔ سید سلیمان ندوی: ”شعرا لعم اور عمر خیام“ مشمولہ معارف، جلد ۱۳، شمارہ ۲، ص ۸۲۔

۳۔ رسالہ اردو، اپریل ۱۹۳۳ء، ص ۲۳۰۔



”انھوں نے مرحوم کے حالات لکھنے میں کافی محبت اور دردِ دوسری اٹھائی ہے اور انگریزی دانوں کو اسلامی ہند کے اس مشہور اہل قلم سے روشناس کیا ہے جس کی اردو میں بھی ابھی تک کوئی معقول سیرت نہیں لکھی گئی۔ بشرِ بھاجی والا کی یہ کوشش قابلِ شکر گزاری ہے لیکن ذوقِ تحقیق کا تقاضا تھا کہ وہ مصنفِ مرحوم کے مضمون کو جس کا ترجمہ کیا ہے اچھی طرح جانچ لیتے کیوں کہ مرحوم کی یہ کتاب تحقیق کے معیار پر قابلِ اصلاح پائی گئی ہے۔“

اس کے برخلاف معارف کے صفحات میں شعرِ العجم کا ذکر اس انداز میں ملتا ہے:

”مولانا شبلی مرحوم کو اپنی زندگی میں شاید اپنی کتاب شعرِ العجم کی اس مقبولیت کا خیال بھی نہ آیا ہو گا کہ ایک طرف وہ پروفیسر براؤن کی تاریخِ ادبیات ایران کا آخری ماخذ بنے گی اور دوسری طرف خود وہ ملک جس کی ادبی تاریخ اس میں لکھی گئی ہے اس کی اتنی قدر کرے گا کہ اس کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا اہتمام کرے گا۔“

”مولانا شبلی مرحوم جب شعرِ العجم نکھر رہے تھے تو ان کو خیال بھی نہ تھا کہ وہ اتنی مقبول ہوگی کہ ایک طرف انگلستان کا سب سے بڑا مشرقی اس سے فائدہ اٹھائے گا اور دوسری طرف ایران و عجم کے مشاق اس سے بہرہ مند ہوں گے۔“

اس سلسلے میں قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ معارف اور دارالمصنفین کو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ تنقیدِ شعرِ العجم کسی فرمائش یا سازش کا نتیجہ نہیں بلکہ حافظ محمود خاں شیرانی کی سنجیدہ علمی کاوش ہے۔ ”پنجاب میں اردو“ منظرِ عام پر آئی تو معارف میں سید نجیب اشرف ندوی نے اس پر مقالہ تحریر کیا۔ اس مقالے میں شیرانی صاحب کے بعض نتائجِ تحقیق سے اظہارِ اختلاف کے پہلو بہ پہلو ان کے علم و فضل کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ تنقیدِ شعرِ العجم کے پس منظر میں دبستانِ شبلی کے ایک رکن کی طرف سے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں:

”جناب پروفیسر محمود شیرانی صاحب آج سے چند سال قبل تک ادبی دنیا میں

۱۔ معارف، جلد ۴، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۴۱ء، ص ۱۶۴۔

۲۔ معارف، جلد ۳، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۳۸ء، ص ۲۔

۳۔ سید نجیب اشرف ندوی: مقالہ ”پنجاب میں اردو“ مشمولہ معارف، جلد ۲۲، شمارہ ۲، اگست ۱۹۲۸ء، ص ۹۱۔

بہت کم معروف تھے اور ان کی تنقید شعراِ اعجم سے پہلے شاید پنجاب سے باہر ہندوستان کے بہت ہی کم لوگ ان کی وسعتِ تحقیق، فراوانیِ معلومات اور خداداد علمیت و ذہانت سے واقف تھے۔۔۔۔۔ ان کا ایک ایک حرف نہایت افادی شوق اور طالبِ علمانہ ذوق سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ جس چیز پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس میں تحقیق و معلومات اور فلسفیانہ تنقید و نتائج کے دریا بہا دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تحریر خاص توجہ کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔“

اسی طرح حافظ محمود خاں شیرانی کے انتقال پر معارف میں ”وفیات“ کے زیرِ عنوان سید سلیمان ندوی کی ایک تحریر بھی توجہ طلب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس بائیس سال پہلے کی تنقید شعراِ اعجم کو سید صاحب زیادہ بہتر نظر میں دیکھ رہے ہیں اور انھیں شیرانی مرحوم کی غیر جانب دارانہ علمی تنقید و تحقیق کا اعتراف ہے۔ سید صاحب کے الفاظ ہیں:

”ہم کو ابھی تک اپنے ملک کے علما اور محققین کی پوری قدر نہیں ہوئی۔ کیسے افسوس

کی بات ہے کہ ہماری قوم اور ملک کے ایک نامور محقق پر وفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کا انتقال ۱۶ فروری ۱۹۴۶ء کو ٹونک میں ہو گیا اور ہم میں سے بہتوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ اس زمانے میں یورپ کے علمائے مشرقیات نے بعض شعرا پر جو مستقل مضامین لکھے ہیں یا کتب خانوں کی فہرستوں میں ان شعرا کے دواوین کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے یا پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب میں ان منتشر معلومات کو جو یکجا کر دیا ہے پروفیسر شیرانی نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنی ذاتی تحقیقات کے بہت سے اضافوں کے ساتھ اس سلسلے کو لکھ کر فارسی ادب کی تاریخ کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔“

”ادیب“ علی گڑھ، شبلی نمبر ۱۹۶۰ء میں شامل خط میں مولوی عبدالحق نے تنقیدِ شبلی سے متعلق اپنی جن تحریروں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں چند مقدمے بھی شامل ہیں۔ مقدمہ ”شعری خواب و خیال“ میں مولوی صاحب نے حالی کے اس قیاس کی تصدیق کی ہے کہ مذکورہ شعری خواب مرزا شوق کا ماخذ تھی۔ اس سے قبل شبلی نعمانی تذکرہ گلشنِ ہند کے دیباچے میں اس خیال کی تردید کر چکے تھے۔

ان مقدمات میں سے مقدمہ "حیات النذیر" بھی قابلِ توجہ ہے کیوں کہ اس میں مولوی صاحب نے شبلی نعمانی، ندوہ اور اس سے متعلق علما کے بارے میں نہایت تند و تیز زبان استعمال کی ہے۔ دو طرفہ اختلافی تحریروں میں یہ مقدمہ اسی سبب سے نمایاں ہے۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کی کتاب "امہات الائمہ" کی اشاعت پر علما اور عام مسلمانوں کی طرف سے جو ردِ عمل ہوا تھا اور جس طرح ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس منعقدہ دہلی میں اس کتاب کی کاپیاں نذر آتش کی گئیں، اس کا ذکر اس مقدمے میں نہایت جذباتی اور فسانوی انداز میں کیا گیا ہے۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی نے مقدمہ "مقدمات عبدالحق" میں اس کی پُر زور تردید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ندوۃ العلماء کے ارکان و شرکاء اس کے جلانے پر آخر تک آمادہ نہ تھے خود مولوی (نذیر احمد) صاحب مرحوم کی تحریک تھی۔۔۔۔۔ چنانچہ رسالے جلانے گئے، مفتی کاتیل لاکر رو بجے رات کو جس نے رسالوں پر ڈالا تھا، وہ میں ہی تھا۔"

مولوی عبدالحق کے اس مقدمے اور مولانا شروانی کی وضاحت کو سید سلیمان ندوی نے "معارف" جلد ۳۶، شمارہ ۴ اور حیاتِ شبلی میں مضمون بحث بنایا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور تحریر "مقدمہ بر خطوط عطیہ بیگم صاحبہ" ہے۔ ظاہر ہے کہ ان خطوط کی اشاعت و البتگانِ ندوہ و دارالمصنفین کے لیے رنج کا باعث ہوئی ہوگی۔ مولوی صاحب اس مقدمے میں سید سلیمان ندوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا کے ایک ارشد تلمیذ نے حال میں شعر العجم کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے کہ 'وہ واقعات کی کھتونی نہیں، حسن و عشق کی داستان ہے، گویا واقعات (شاعر کی زندگی اور اس

۱۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مقدمہ "مقدمات عبدالحق"، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، پہلا پاکستانی ادیشن، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۲ء۔

۲۔ محمد واصل عثمانی لکھتے ہیں: "حالی کی شاگردی اور علی گڑھ سے وابستگی نے عبدالحق کو شبلی کے خلاف ضرور اکسایا اور اس طرح وہ اپنی دلی آرزو کی تکمیل کے لیے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتے رہے کہ شبلی کی حیاتِ معاشقہ اور رنگین زندگی کو اجاگر کیا جائے۔ (بحوالہ "شبلی ادیبوں کی نظر میں"، طبع اول، کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ص ۸۱)۔

۳۔ مولوی عبدالحق، مقدمات عبدالحق، (حصہ دوم، مرتبہ مولوی مرزا محمد بیگ، حیدر آباد، مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۳۱ء، ص ۱۰۰)۔

۴۔ یہاں سید سلیمان ندوی کی تحریر "شعر العجم اور عمر خیام" مشمولہ معارف غروری ۱۹۲۲ء کی طرف اشارہ ہے۔



کی شاعری پر کچھ اثر ہی نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعرا بعم و اقعات کی کھوتی بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی، لیکن وہ اگر ان خطوط کو دیکھتے (اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا) کہ جس داستان کا تصور ان کے ذہن میں تھا وہ شعرا بعم میں نہیں ان خطوط میں ہے۔

مقدمے کے اختتام پر لکھتے ہیں :

”آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے نوئی لگنی شروع ہو گئی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا، وہ بہت سخت مزاج ہے۔ مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی لیکن بعض تصانیف ان کی ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور انھیں میں یہ خطوط بھی ہیں۔“

مولوی صاحب، مقدمات کے مرتب مرزا محمد بیگ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

”آپ عطیہ بیگم کے خطوط سے متروکہ ہوں اس سے مولانا شبلی کی منقصدت نہیں ہوتی۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ نرے خشک ملا یا مولوی نہ تھے بلکہ لطیف انسانی جذبات بھی رکھتے تھے۔“

یہاں ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی کے مشہور مضمون ”حالی و شبلی کی معاشرانہ چشمک“ سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس میں مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کے ایک خاص پہلو پر تبصرہ ہے۔ لکھتے ہیں :

”مولوی عہد الحق کے ذمہ دار قلم سے ٹپکی ہوئی سیاہی جس طرح پھیلی ہے ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے۔ جس طرح ناممکن ہے کہ کسی ٹکسالی (اسٹینڈرڈ) کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو، یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی پاس داری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں۔ یعنی چشمک کے جراثیم ان کے مقدمات میں اس کثرت سے ملیں گے کہ یہ امر ان کے

۱۔ مولوی عہد الحق، ”مقدمات عبد الحق“، مرتبہ مولوی مرزا محمد بیگ، محولہ بالا، ص ۱۳۲۔

۲۔ ایضاً، مکتوب بنام مولوی مرزا محمد بیگ، پیش لفظ از مرتبہ، مشمولہ مقدمات عبد الحق، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، محولہ بالا۔

۳۔ ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی، افادات مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۴۹ء، ص ۳۱۱۔



ٹریجر کے خصائص کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور اظہار خیال سے کبھی نہیں چوکتے۔ لیکن میں اگر غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ سنجانہ لکھتے ہیں یعنی شبلی کی تنقیدیں مقصود بالذات نہیں ہوتی۔

رسالہ "الناظر" کی طرف سے، اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز کا تعین کرنے کے لیے انعامی مقابلہ منعقد کیا گیا۔ بعد ازاں انعامی مضمون تبصرے کے لیے مولوی صاحب کو بھیجا گیا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

"مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ آزاد کی اردو شاعرانہ، نذیر احمد کی عاصیانہ اور سوقیانہ اور حالی کی روکھی پھینکی ہے۔ اردو میں اگر کوئی اعلا ادیب اور انشا پرداز ہوا ہے تو وہ شبلی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ بالغ نظر ادیبوں کی نظر میں کیا وقعت رکھ سکتا ہے۔"

مولوی صاحب کی اخیر عمر کا ایک خط بنام مولوی حاجی محمد مقتدی خاں شروانی پیش نظر ہے۔ مکتوب الیہ کو ان کے ایک مضمون کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کا مضمون 'علی گڑھ میں شبلی کا قیام' پڑھا۔ سبحان اللہ کیا خوب لکھا ہے۔ جزاک اللہ! کیا چھپی چوریاں پکڑی ہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ 'حیاتِ شبلی' کے اخیر میں بطور ضمیمہ شائع کیا جائے۔ اگر مولوی سلیمان زندہ ہوتے اور اس مضمون کو پڑھتے تو ان کے قلوب کی حرکت بند ہو جاتی۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ کوئی بات خلاف واقعہ نہیں ہے۔ آپ نے حق گوئی کا حق ادا کر دیا اور ان باتوں کو صاف صاف بیان کر دیا جن پر عمداً ہمدرد پڑا ہوا تھا۔"

مولانا شبلی نے سرسید کو بدنام کرنے کے جو طریقے اختیار کیے تھے وہ بہت گھٹیا تھے اور افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسے عامیانہ طریقے کیوں اختیار کیے ہیں۔ اصل بات طرف کی ہے۔"

۱۔ مولوی عبدالحق: "ادبی تبصرے"، طبع اول، لکھنؤ، دانش محل، ۱۹۴۷ء، ص ۶۸۔

۲۔ خط مولوی عبدالحق بنام مولوی محمد مقتدی خاں شروانی، مرقوم ۷ فروری ۱۹۵۸ء، مشمولہ اردو بابائے اردو نمبر ۱،

۱۹۶۲ء، ص ۳۶۵۔ (مولوی مقتدی خاں کا مذکورہ مضمون "ابصر" کے شبلی نمبر میں شائع ہوا ہے۔)

”قومی زبان“ کراچی کے ابتدائی شماروں میں ادارے کی طرف سے ”مشاہیر اردو“ کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔ مولانا شبلی نعمانی پر تحریر کیے گئے مضمون میں ایک ذیلی عنوان ملتا ہے۔ ”معاصرانہ چشمک“ اس کے تحت یہ عبارت آتی ہے:

”سرسید اور آزاد جس بزم ادب کے رکن تھے اسی کے شبلی بھی ہیں۔ گو یہ سب کے بعد پہنچے لیکن پیچھے نہیں بیٹھے۔ اور اگرچہ ابتدائیں اپنے معاصرین کے، دہنی کارناموں کو سرتپتے رہے لیکن بتدریج معاصرانہ چشمک کا جذبہ بڑھتا رہا۔ اور آخر میں تو قلم میں زیادہ گرمی پیدا ہو گئی۔“

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ترجمان ”معارف“ اور انجمن ترقی اردو کے ترجمان ”اردو“ اور ”قومی زبان“ میں چھپنے والے کتابوں اور رسالوں کے تبصرے بھی ہمارے مطالعے کا حصہ ہیں۔ رسالہ اردو میں سید سلیمان ندوی کی کتابوں پر تبصرے ملتے ہیں۔ ”عربوں کی جہاز رانی“ پر تبصرہ رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۸ء میں موجود ہے۔ اس میں مذکور کتاب کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ عرب میں جہاز رانی کا آغاز عہد جاہلیت میں ہوا۔ مبشر نے ایک آیت کی تشریح میں سہو کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ”قومی زبان“ کراچی کے ایک شمارے میں ”معارف“ کی نزدیکی اشاعت میں شائع شدہ ایک ”شکوے“ کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

”نئی مطبوعات کے ضمن میں قومی زبان کا بھی ذکر آگیا ہے۔ لائق مدیر تحریر فرماتے ہیں کہ: ”اردو زبان کو یہ شکایت کرنے کا حق ہے کہ اسے ہندوستان میں بے یار و مددگار چھوڑ کر (انجمن ترقی اردو کا) پاکستان کی راہ لینا آئین و فاسد ہے، بے چارے غالب کو تو یہ شکایت تھی کہ جن کی خاطر گھر بار ٹپا تھا وہی بے خانماں ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہندی دوست شاعر کے خیالی معشوق سے آگے بڑھ گئے کہ گھر لوٹ کر دیس نکالا دیا اور اب خود ہی بے وفائی کا الزام دے رہے ہیں کیا یہ بھی ستم کا کوئی نیا پیرا ہے۔“

”معارف“ میں بابائے اردو اور انجمن ترقی اردو کی بیشتر تصانیف پر تبصرے موجود ہیں۔ ان تحریروں میں تعریفی و توصیفی انداز بھی ہے اور اختلافی و تنقیدی نکات بھی۔ مثنوی ”خواب و خیال“ مرتبہ مولوی عبدالحق پر تبصرے میں یہ انداز اختیار کیا گیا ہے: ”شروع میں جناب مرتب کا ایک مقدمہ ہے جو ہر حیثیت سے تشنہ بیان ہے۔۔۔ قدر شناسان اردو کو انجمن ترقی اردو کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُس نے اس گراں قیمت متاع کو وقف عام کر دیا۔“ قواعد اردو از مولوی عبدالحق (طبع دوم) پر تبصرے کے الفاظ ہیں: ”شاید جناب مؤلف نے ان تنقیدوں پر زیادہ توجہ نہیں کی جو طبع اول پر شائع ہوئی تھیں۔ بہر حال وہ اس وقت اردو کی معیاری کتابوں میں ہے۔“ پندرہ روزہ ”ہماری زبان“ پر تبصرہ کرتے ہوئے مبصر اردو زبان کے خلاف ہوئے والی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مسلمانوں کے پاس اس کے مقابلے کے لیے زبانی شور و غل کے سوا کچھ نہیں ہے۔  
 لے وے کے ایک انجمن ترقی اردو اپنی بساط کے مطابق عملاً مقابلہ کر رہی ہے۔ اسی غرض سے اس نے یہ پندرہ روزہ اخبار نکالا ہے۔۔۔۔۔ اس سے مخالفین اردو کی تخریبی سرگرمیاں اور انجمن ترقی اردو کی مدافعت اور تعمیری کارگزاریوں کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔“  
 رسالہ ”جوہر“ دہلی کے عبدالحق نمبر پر تبصرے سے اقتباس ہے:  
 ”انجمن اتحاد جامعہ کے رسالے ”جوہر“ نے مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو کی سترویں سالگرہ کی تقریب میں یہ خاص نمبر نکالا ہے۔ جس کی مدد و تح کی ذات بجا طور پر مستحق ہے۔“ جوہر نے یہ نمبر نکال کر اردو کے خدمت گزاروں کی جانب سے محسن شناسی کا ثبوت دیا ہے۔“  
 ”سر سید احمد خاں“ از مولوی عبدالحق پر معارف کا تبصرہ بھی قابل توجہ ہے:

- 
- ۱۔ ”معارف“، جلد ۱۹، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۳۱۸۔  
 ۲۔ ”معارف“، جلد ۱۹، شمارہ ۶، جون ۱۹۲۷ء، ص ۲۸۰۔  
 ۳۔ ”معارف“، جلد ۲۲، شمارہ ۲، اگست ۱۹۳۹ء، ص ۱۵۳۔  
 ۴۔ ”معارف“، جلد ۲۶، شمارہ ۳، اگست ۱۹۴۰ء، ص ۱۲۷۔  
 ۵۔ ”معارف“، جلد ۸۶، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۳۶۔



”سر سید مرحوم کے بعض مذہبی افکار و عقائد سے اختلاف کے باوجود ان کے قومی، علمی، تعلیمی اور اصلاحی کارناموں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔۔ مصنف سر سید کی مجلسوں اور صحبتوں میں شریک رہ چکے ہیں، اس لیے بڑی خوبی سے ان کے سیرت و کردار کی مصوری کی ہے مگر چونکہ تمام تر عقیدت و محبت کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس لیے ان کا ایک ہی پہلو دکھایا ہے۔“

تبصروں کے علاوہ معارف کے شذرات میں بھی بابائے اردو اور انجمن ترقی اردو کا تذکرہ ملتا ہے۔ چند شذرات کا حوالہ پہلے آچکا ہے۔ یہاں موضوع کی ضرورت کے لحاظ سے چند اقتباسات مزید پیش کیے جاتے ہیں۔ ”معارف“ کے ایک شمارے میں اردو انسائیکلو پیڈیا کی تجویز کے ضمن میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں<sup>۱</sup>

”امید ہے کہ اہل نظر اور اس کام سے دل چسپی رکھنے والے ہندو مسلمان اسی اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔ اس ذیل میں مولوی عبدالحق صاحب بی اے (اورنگ آباد) ڈاکٹر سر محمد اقبال ایچ بی اے (لاہور)۔۔۔۔۔ سے خصوصیت کے ساتھ التفات و توجہ کی درخواست ہے۔“

ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ کی چوتھی ادبی کانفرنس کا اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا۔ مولوی عبدالحق نے اجلاس کے شعبہ اردو کی صدارت کی اور خطبہ دیا۔ اس خطبے کے ضمن میں ”معارف“ نے مولوی صاحب سے اس طرح اپنی شکایت کا اظہار کیا<sup>۲</sup>؛ ”اگر اردو کی پھلی اور موجودہ ترقیوں کے ضمن میں ذکر نہیں آیا تو اس شخصیت کا جس نے اس قابل مثال انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی۔“ مگر اس کے ساتھ ہی ایک شذرے میں یہ انداز بھی موجود ہے<sup>۳</sup>؛ ”ہمارے مخدوم مولوی عبدالحق صاحب اردو کی جو جواں مردانہ خدمت کر رہے ہیں وہ اردو کے ہر حامی کے شکریہ کی مستحق ہے۔“

اس دو طرفہ مطالعے کے اختتام سے قبل تین اہم تحریروں کا تذکرہ ضروری ہے۔ ۱۔ رسالہ ”جوہر“ عبدالحق نمبر کے بے سید سلیمان ندوی کا پیغام۔ ۲۔ سید صاحب کے انتقال پر قومی زبان، کا تعزیتی نوٹ۔ ۳۔ مولوی صاحب کی وفات

۱۔ ”معارف“، جلد ۱۹، شمارہ ۲، فروری ۱۹۲۷ء، ص ۸۷۔

۲۔ ”معارف“، جلد ۳۷، شمارہ ۲، فروری ۱۹۳۶ء، ص ۸۳۔

۳۔ ”معارف“، جلد ۴۲، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۳۹ء، ص ۴۰۴۔



پر ”معارف“ کا تعزیتی شذرہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رسالے ”جوہر“ میں سید سلیمان ندوی کی یہ تحریر موجود ہے۔  
 ”ملک کے پورے طول و عرض میں، جس میں اردو زبان کے بولنے والوں کی  
 تعداد کروڑوں سے بڑھی ہوئی ہے، اس کی خدمت کرنے والوں کی تعداد اگر مولوی  
 عبدالحق نہ ہوتے تو صفر ہوتی۔ وہ پیری میں بھی ہمت سے کام کر رہے ہیں اور اپنے قلم  
 قدم اور درم سے اس کی ترقی کی یادگار کوششیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے سادہ نگاری  
 کو ترقی دی، نقد و تبصرے کی نئی راہ دکالی، اردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھادی،  
 ادب اور تاریخ ادب پر تحقیقی مضمون لکھے، اردو کے قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا،  
 اردو لغت، اردو تذکرے، اردو کے پرانے دیوان اور اردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں  
 چھپوائیں اور لکھوائیں اور انجن ترقی اردو کو ہر حیثیت سے وہ ترقی دی کہ آج وہ ملک  
 کا زندہ ادارہ ہے۔“

سید سلیمان ندوی کے انتقال (۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء) پر ”قومی زبان“ نے ”آہ اہولانا سید سلیمان ندوی“ کے  
 عنوان سے ایک تعزیتی تحریر شائع کی۔ اس میں سید صاحب کی دینی و علمی خدمات کا اعتراف بھی ہے اور  
 ان کے زہد و تقویٰ کا تذکرہ بھی۔ اقتباس درج ذیل ہے:

”موصوف کا انتقال علمی و ادبی دنیا کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے اور حقیقت  
 یہ ہے کہ اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے سید صاحب کی ذات پاکستان  
 و ہند ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے لیے شمع ہدایت کی حیثیت رکھتی تھی۔ سید صاحب  
 کے علمی کارنامے اور ان کی ادبی خدمات اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار  
 رہیں گی۔۔۔۔۔ علمی دنیا ان کے احسانات سے کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔  
 آں را کہ جاہ و سندش ہی نہ داشتہ      این فضل بس کہ نقش سلیمان گذاشتہ“

۱۔ سید سلیمان ندوی: ”جوہر“ عبدالحق نمبر، دہلی مکتبہ جامعہ، مارچ ۱۹۳۰ء، ص ۱۴۔ (یہی پیغام بعد ازاں ماہنامہ ”الشجاع“  
 کراچی، عبدالحق نمبر، ۱۹۵۹ء اور ”بابائے اردو، احوال و افکار“ از ڈاکٹر سید عین الرحمن، میں بھی شائع ہوا۔)  
 ۲۔ قومی زبان، کراچی، جلد ۴، نمبر ۲۳، یکم دسمبر ۱۹۵۳ء، ص ۳۔

اسی طرح بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وفات پر "معارف" نے شذرات میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ کیا، ورنہ ان کے انتقال کو دنیا نے اردو کا سب سے بڑا حادثہ قرار دیا۔ مذکورہ تحریر سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے؛

"بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی وفات دنیا کے اردو کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ علمی اور ادبی حیثیت سے اردو کے خدمت گزاروں کی کمی نہیں ہے لیکن جس نے ہر پہلو سے اس کی خدمت کی اور اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور اس کی راہ میں اپنا تن من دھن سب نثار کر دیا وہ تنہا مولوی عبدالحق کی ذات تھی مولوی صاحب مرحوم سے پہلے اردو کی خدمت کا دائرہ محض اردو کی انفرادی علمی و ادبی تصانیف تک محدود تھا، اجتماعی کوشش اور تاریخی، لسانی اور سیاسی حیثیت سے اس کی خدمت کی صرف بنیاد پڑی تھی، مولوی صاحب نے اس کا عظیم قعر تعمیر کر دیا اور اردو کی خدمت کی ایک عام لگن پیدا کر دی، ان کی خدمات اردو کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہیں اور جب تک اردو زبان باقی ہے ان کا نام بھی زندہ و پایندہ رہے گا۔۔۔ اگر انجن ترقی اردو نہ ہوتی تو اردو کو علمی زبان بننے میں بڑی دیر لگتی۔۔۔ مولوی صاحب کو اردو سے والہانہ عشق تھا۔ انھوں نے اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا، ان کو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اسی کی دھن رہتی تھی۔۔۔ پاکستان میں بھی ان کو اردو کے لیے جنگ کرنا پڑی اور آخر تک لڑتے رہے۔ اردو کے مسئلے میں پاکستان میں جو کامیابی بھی ہوئی اس میں دوسرے حامیان اردو کی تائید و حمایت کے ساتھ مولوی صاحب کی کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے۔۔۔ خالص علمی اور ادبی حیثیت سے بھی ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔۔۔ وہ صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی تحریر سادگی و سلاست میں سہل مستغ کی حیثیت رکھتی ہے اور سادگی کے باوجود خوش گوار ادبی چاشنی سے خالی نہیں ہوتی۔۔۔ اب اردو کے ایسے باعمل فدائی نہ پیدا ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔"

دستانِ شبلی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مابین تعلقات و مراسم کی یہ روداد ہماری ادبی تاریخ کا

ایک حصہ ہے۔ اس سلسلے کی دو طرفہ تحریروں میں طنز بھی ہے اور تنقید بھی، شکوہ و شکایت بھی ہے اور باہمی رنجش کا اظہار بھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ تحریریں بھی موجود ہیں جن میں ایک دوسرے کے علمی، ادبی اور شخصی کمالات کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ اس جائزے میں دونوں رخ پیش کیے گئے ہیں، جنہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اکثر اوقات اختلافات کی خلیج محض معمولی غلط فہمیوں کے سبب وسیع ہوئی۔ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں سے صرف نظر کیا جاتا یا ردِ عمل کے اظہار میں احتیاط و توازن کا رامن تھا، جاتا تو یقیناً یہ صورت پیش نہ آتی۔ اس جائزے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ تمام تر ذاتی و شخصی اختلافات کے باوجود ملت کی خیر خواہی اور اردو کی ترقی کے لیے سب کے دل ایک ساتھ ڈھکے تھے۔ علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اردو ہو یا ندوۃ العلماء، شبلی اکیڈمی اور دارالمصنفین، اردو زبان کی ترقی و ترویج کے معاملے میں سب کا خلوص ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

## کتابیات :

۱۔ آفتاب احمد صدیقی ردو لوی، ڈاکٹر: شبلی ایک دبستان، ڈھاکہ، مکتبہ عارفین، مئی ۱۹۷۰ء۔

۲۔ سلیمان ندوی، سید: حیاتِ شبلی، طبع سوم، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۷۹ء۔

۳۔ سلیمان ندوی، سید: مکتوباتِ سلیمانی حصہ اول، مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا بادی، لکھنؤ، صدق جسد پبلشرز، ۱۹۶۳ء۔

بک ایجنسی، ۱۹۶۳ء۔

۴۔ سلیمان ندوی، سید: یادِ روزگار، کراچی، مکتبہ الشرق، جنوری ۱۹۵۵ء۔

۵۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر: ادبی تبصرے، طبع اول، لکھنؤ، دانش محل، ۱۹۴۷ء۔

۶۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر: مقدماتِ عبدالحق حصہ دوم، مرتبہ مولوی مرزا محمد بیگ، حیدرآباد، مکتبہ البرہمیت، ۱۹۳۱ء۔

۷۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر: مقدماتِ عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بی بی، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۲ء۔

۸۔ عبد اللطیف اعظمی: شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، کراچی، صفیہ اکیڈمی، اکتوبر ۱۹۶۷ء۔

۹۔ محمد اکرام شیخ، ڈاکٹر: یادِ گارِ شبلی، طبع اول، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء۔

۱۰۔ معین الرحمن، سید، ڈاکٹر: بابائے اردو احوال و افکار، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء۔

- ۱۱۔ مہدی الافادی (مہد حسن افادی الاقصادی) : افادیت مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۴۹ء۔
- ۱۲۔ واصل عثمانی، محمد شبلی ادیبوں کی نظریں، طبع اول، کراچی، صفیہ اکیڈمی، نومبر ۱۹۶۸ء۔
- ۱۳۔ واصل عثمانی، محمد شبلی نقادوں کی نظریں، طبع اول، کراچی، صفیہ اکیڈمی، اکتوبر ۱۹۶۷ء۔

## رسالہ:

- ۱۔ اردو اورنگ آباد/دہلی/کراچی، متفرق شمارے۔
- ۲۔ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء۔
- ۳۔ الشجاع، کراچی، عبدالحق نمبر، ۱۹۵۹ء۔
- ۴۔ جوہر، دہلی، عبدالحق نمبر، مارچ ۱۹۳۰ء۔
- ۵۔ قومی زبان، کراچی، متفرق شمارے۔
- ۶۔ معارف، اعظم گڑھ، متفرق شمارے۔



## مولوی عبدالحق کی قواعد نویسی

اردو قواعد نویسی کی دو واضح روایتیں ملتی ہیں۔ ایک یورپی اور دوسری عربی، یورپ میں بارہویں  
تیرہویں صدی میں برصغیر کی زبانوں کے علمی مطالعہ کا آغاز ہوا اور دو بھی زیر مطالعہ زبانوں میں شامل تھی جرمن،  
فرانسیسی، ولندیزی اور انگریز علمائے لسانیات نے اردو قواعد کی کتابیں تحریر کیں۔ ان کتابوں کا بڑا مقصد  
تبلیغ یا تجارت کے لیے ہندوستان جانے والوں کو قواعد کے ذریعہ اردو سکھانا تھا۔ یہ تمام کوششیں اپنی  
جگہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن ہر یورپی قواعد نویس نے اپنی زبان کے حوالے سے قواعد لکھے اور اس طرح  
اپنی زبان کے بہت سے غیر متعلق مباحث کو قواعد میں داخل کر لیا جس کی وجہ سے یہ کتب اردو قواعد کا اچھا نمونہ  
نہیں بن سکیں۔ عربی قواعد نویسی کے ارتقار میں ایرانیوں کا حصہ بڑا واقع ہے۔ عربی قواعد کا جو سا نچا بناس  
کا اطلاق فارسی پر بھی کیا گیا اور اردو بھی ایک مدت تک عربی قواعد کے شکلوں میں کئی جاتی رہی اور عربی  
فارسی علماء اس پر ستم ڈھاتے رہے۔ اس طرح ان کے ہاتھوں اردو قواعد متعلق و غیر متعلق بحثوں کا مجموعہ بن  
کر رہ گئی۔ اردو قواعد کے سرمایے میں انشا کی دریائے لطافت غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ انشا نے اردو کو  
ایک مستقل زبان قرار دے کر اس کے اپنے قواعد پر زور دیا ہے اور اسے فارسی اور عربی کا تتمہ نہیں  
سمجھا۔ انشا کے اس موقف کی بدولت دریائے لطافت بہت سی غیر ضروری بحثوں سے محفوظ رہی لیکن اس  
کتاب سے بطور قواعد اردو زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ اس میں کتب قواعد کی  
جامعیت اور متانت نہیں ملتی۔ پھر یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی۔ اس میں کچھ ایسے موضوعات بھی زیر بحث آئے  
ہیں جو اس سے پہلے یا بعد قواعد کی کتابوں کا موضوع نہیں بن سکے۔ ان سب کتابوں میں مولوی عبدالحق  
کی قواعد اردو ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے انھوں نے اس کتاب میں عربی کا تتبع کیا نہ سنسکرت کا  
اور انگریزی قواعد کی پیروی میں بھی حد سے آگے نہیں بڑھے۔ انھوں نے ان تینوں سرچشموں سے استفادہ  
مزدور کیا ہے۔

قواعد کا تعلق بنیادی طور پر زبان ہی سے ہوتا ہے لیکن سزاں یہ ہے کہ قواعد کا موضوع کون سی زبان ہے بول چال کی یا تحریری، قواعد نویسوں کی ایک غالب اکثریت نے تحریری زبان ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے اور انہوں نے مثالیں نظم وثر ہی سے پیش کی ہیں۔ مولوی صاحب اس سلسلہ میں بول چال کی زبان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔ اس لیے زندہ زبان کے قواعد نویس کو سب سے اول بول چال کا خیال رکھنا چاہیے اور اسکی سے قاعدے بنائے جائیں۔ قواعد میں اول درجہ آواز کا ہے اس کے بعد حروف کا پہلے بول چال ہے اور بعد میں تحریر۔

اردو کے جدید ترین قواعد نویس بھی اسی موقف پر قائم ہیں وہ بھی بول چال کی زبان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے مولوی صاحب جدید ترین قواعد نویسوں میں جگہ پاتے ہیں۔

کلاسیکی قواعد نویس کی غرض و غایت یہ رہی ہے کہ زبان کے معیاری نمونوں کے حوالے سے زبان کے قواعد مرتب کیے جائیں اور ان قواعد کے ذریعہ معیاری زبان کو محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے اس طرح قواعد کا شمار (NORMATIVE SCIENCES) معیاری علوم میں ہوتا رہا ہے۔ بعض قواعد یہ بتاتے رہے کہ زبان کیسی ہونی چاہیے۔ لیکن اب قواعد کا یہ تصور بدل چکا ہے اور اس کے ذریعہ زبان کے اصولوں کی سائنسی تشریح کی جاتی ہے اس تصور کے مطابق زبان کیسی ہونی چاہیے کے بجائے زبان کی تشریح جیسی کہ وہ ہے کے مطابق کی جاتی ہے اور بولی جانے والی زبان کے اختلافات زیر بحث لائے جاتے ہیں جدید قواعد نویس معیاری زبان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک زبان کی تبدیلیاں زیادہ اہم ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولوی صاحب کی قواعد اردو بھی کتب قواعد کے کلاسیکل زمرہ ہی میں آتی ہے کیوں کہ اس کتاب کے لکھنے سے ان کا مقصد لوگوں میں معیاری اردو زبان کے قواعد کا شعور پیدا کرنا تھا چنانچہ فرماتے ہیں ”اردو زبان اب ملک کی عام اور مقبول زبان ہو گئی ہے اور ملک میں اکثر جگہ بولی جاتی ہے اور ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ ملک کی دوسری زبانیں خاص خاص خطوں میں محدود اور مخصوص ہیں نیز اس زبان کو کچھ ایسے مقامات کے لوگ بھی پڑھتے اور لکھتے ہیں جن کی یہ مادری زبان نہیں۔ اس لیے ضرورت واقع ہوئی کہ اس زبان کے قواعد منضبط کیے جائیں اور مستند کتاب میں لغت پر لکھی جائیں تاکہ زبان بگڑنے سے محفوظ رہے۔ قواعد اردو کا آغاز ہجائے ہوتا ہے اس فصل میں اردو حروف کی تعداد، ان کی اصل وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ مولوی صاحب نے اردو کی ہائے آوازوں کے بارے میں بہت اہم بات

کہی ہے وہ انھیں دو سادہ آوازیں قرار دیتے ہیں جو مل کر ایک ہو گئی ہیں جدید قواعد نویس بھی اردو کی ہائے آوازوں کو مفرد آوازیں سمجھتے ہیں حالانکہ ایک مدت تک انھیں مرکب آوازیں سمجھا جاتا رہا ہے مولوی صاحب نے اردو حروف کی کل تعداد پچاس لکھی ہے ان میں ہائے آواز میں بھی شامل ہیں۔ مولوی صاحب عربی حروف بھی کو اردو میں رکھنے کے حق میں تو ہیں لیکن بول چال کی زبان میں ان حروف کے صحیح تلفظ پر انھیں اصرار نہیں ہے۔ اعراب و حرکات و سکنات کے بارے میں بھی انھوں نے بہت کام کیا ہے لیکن ہماری قواعد نویس اس موضوع پر عربی فارسی اصطلاحوں کی توضیح کو کافی سمجھتے آئے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے اردو کے خاص مسائل کے حوالے سے ان پر بحث کی ہے۔ ہمزہ کی بحث عربی فارسی میں بڑی پیچیدہ بحث ہے اس کے حرف یا حرکت ہونے پر اختلاف پایا جاتا ہے اور مولوی صاحب بھی اسے حروف میں شامل کرنے میں متامل ہیں۔ ان کے خیال میں ہمزہ ی اور واو کے ساتھ ہی کام دیتا ہے جو مد الف کے ساتھ بعض جگہ یہ کی کا قائم ہوتا ہے اور کبھی عربی الفاظ میں خفیف الف کی آواز دیتا ہے۔ یائے معدولہ کی دریافت مولوی صاحب کا لسانی اجتہاد ہے اس بحث میں بابائے اردو ہوشیار کی اصطلاحات برتے بغیر بہت سے سوالوں کا جواب دے دیا ہے اگرچہ یہ موضوع دریا کے لطافت یا بعض جدید قواعد کی کتابوں کی طرح مفصل نہیں ہے پھر بھی مولوی صاحب اردو قواعد کے سلسلہ میں اپنے معاصرین کے مقابلہ میں زیادہ جدید ہیں۔

قواعد اردو میں صرف کا آغاز مستقل اور غیر مستقل الفاظ سے کیا گیا ہے اسم، صفت، ضمیر، فعل، تمیز کو مستقل الفاظ کے تحت اور حروف کو غیر مستقل کے تحت رکھا گیا ہے۔ اردو قواعد نویس عربی کی پیروی میں کلمہ کو اسم، فعل اور حرف میں تقسیم کرتے چلے آئے ہیں۔ اور کلمہ کی تمام اقسام کو ان تینوں کے تحت زیر بحث لاتے رہے ہیں مولوی صاحب نے اردو کے مزاج کا خیال کرتے ہوئے اس تقسیم کو رد وراج دینے کی کوشش کی۔ ان کے بعد لکھی جانے والی قواعد کی بیشتر علمی کتابوں میں تقسیم کے اسی اصول کو اپنایا گیا ہے قواعد کی درسی کتاب میں البتہ اب تک اسم، فعل اور حرف کی تقسیم پر کار بند ہیں جدید فارسی قواعد نویسوں نے کلمہ کی تقسیم کو زیادہ سہل بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک کلمہ کی اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔

اسم، فعل، صفت، عدد، کنایہ، قید، حرف، اہم صوت، کنایہ میں ضمیر، اشارہ اور استہنام وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے۔ قید میں ADVERB یا متعلق فعل کی مختلف صیغہ میں زیر بحث آتی ہیں مولوی



صاحب نے اسم کی بحث میں جنس، تعداد اور حالت کو لوازم اسم قرار دے کر روایتی طریقہ سے انحراف کیا ہے۔ جنس میں تذکیر و تانیث، تعداد میں واحد جمع اور حالت میں فاعلی، مفعولی، ندائی، خبری، اضافی اور طوری حالتوں کا ذکر کیا ہے۔ اسم کی حالت دراصل نحو کا موضوع ہے، اس لیے یہاں اسے اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے فعل پر جو لکھا ہے۔ وہ قدیم قواعد سے کافی مختلف ہے اور ان کی قواعد اردو کا یہ حصہ بہت جاندار ہے وہ اسم کی طرح فعل کے بعض لوازم کے بھی قائل ہیں ان کے خیال میں لوازم فعل مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۱، جنس (۲)، تعداد (۳)، طور (۴)، صورت (۵)، زمانہ

جنس میں فعل کی تذکیر و تانیث، تعداد میں واحد جمع، طور میں معروف و مجہول آجاتے ہیں۔ خبری، شرطی، احتمالی، امری اور مصدری فعل کی پانچ صورتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے قواعد نو لیس شرطی اور احتمالی کا ذکر صرف ماضی کے حوالے سے کرتے تھے۔ امر ان کے نزدیک ایک باقاعدہ فعل تھا خبر اور مصدر کا ذکر وہ فعل کے حوالے سے نہیں کرتے تھے۔ فعل کی مصدری صورت مولوی صاحب کے ہاں بھی قدرے مبہم ہے زمانے کے حوالے سے فعل کو ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے فعل کی بحث میں حالیہ پر بھی روشنی ڈالی ہے اور حالیہ نام تمام، حالیہ تمام اور حالیہ معطوف اس کی تین اقسام بتائی ہیں۔ حالیہ غالباً PARTICIPLE کا ترجمہ ہے اردو میں حالیہ کی وہ حیثیت نہیں جو انگریزی میں ہے حالیہ تمام ماضی مطلق، واحد غائب کے سوا کچھ نہیں۔ حالیہ نام تمام کو پرانے قواعد کی رو سے ماضی تثنائی کہہ سکتے ہیں۔ اور یہی کیفیت حالیہ معطوف کی ہے جسے فعل معطوف بھی کہا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے بعض افعال کے نام بھی نئے رکھے ہیں۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ماضی تمام (ماضی بعید) ماضی نام تمام (ماضی استمراری) حال قدیم (مضارع) حال مطلق (حال) حال نام تمام (جاری) حال تمام (ماضی قریب) حال احتمالی۔ علی اعتبار سے یہ سارے نام بالکل درست ہیں لیکن درسی کتابوں میں ابھی تک پرانے نام ہی چل رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے اردو افعال کے صیغوں پر بڑی محنت اور تفصیل سے روشنی ڈالی ہے لیکن چونکہ وہ اپنے کتاب اردو کے صیغے میں ان کی جو تفصیل دی ہے۔ وہ مولوی صاحب کے ہاں نہیں ملتی قواعد کی قدیم کتابوں میں افعال مصدر سے بنتے تھے لیکن مولوی صاحب نے اس سلسلے میں مادہ فعل پر زیادہ زور دیا ہے جدید قواعد نو لیس بھی مصدر کے مقابلہ میں مادہ فعل کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔



متعلق فعل کہیے مولوی صاحب نے تمیز کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح اپنے اندر متعلق فعل جیسی وسعت نہیں رکھتی اور متعلق فعل انگریزی ADVERB کا ترجمہ ہے۔ تمیز چوں کہ فعل کے ساتھ ساتھ صفت کی کیفیت بھی بیان کرتی ہے۔ اس لیے متعلق فعل کہنا زیادہ درست ہے۔ جدید فارسی قواعد نویس اسے قید کہتے ہیں۔ تمیز یا متعلق فعل کی جگہ اس آسان اصطلاح کو رواج دیا جاسکتا ہے۔ غیر مستقل الفاظ میں حروف کو رکھا گیا ہے۔ اور حروف ربط، عطف، حروف تخیس اور حروف فجائیہ ان کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ اور انہی قسموں کے تحت حرف کی بحث کو سمیٹ لیا گیا ہے۔

قواعد اردو کی تیسری فصل کا تعلق مشتق اور مرکب الفاظ سے ہے مولوی صاحب نے مشتق کی تعریف میں وسعت پیدا کی ہے اسے مصدر سے بننے والے الفاظ تک محدود نہیں رکھا ان کے نزدیک جو لفظ کسی دوسرے لفظ سے کسی قدر تغیر سے نکلا یا بنا ہو وہ مشتق ہے انھوں نے اردو میں مستعمل اشتقاق کی مختلف صورتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اسی طرح مرکب الفاظ اور ان کی ساخت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ لفظ سازی کے یہ طریقے اردو زبان کے مزاج کا خاص حصہ ہیں لیکن قواعد کی قدیم کتابیں ان کے ذکر سے عام طور پر غالی نظر آتی ہیں لفظ سازی میں سابقے اور لاحقے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے ان کی مثالیں تو دی ہیں مگر سابقے اور لاحقے کی اصطلاح نہیں برتی۔ مرکب الفاظ کی بحث میں عبدالحق صاحب نے مندرجہ ذیل مرکبات کا بھی ذکر کیا ہے۔

مرکبات تابع، مرکبات ربطی، مرکبات اعدادی، مرکبات تمیزی، یہ سب مرکبات اور ان کی مختلف اقسام مرکب الفاظ ہی ہیں۔ ان کی یہ تقسیم اس معنوی تعلق کی بنیاد پر کی گئی ہے جو اس مرکب کے دونوں اجزاء میں موجود ہوں اس سے ان مرکبات کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور نئے لفظ بنانے میں اردو کی وسعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے عام قواعد نویس مرکب اضافی، توصیفی وغیرہ کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے جن مرکب لفظوں پر یہاں روشنی ڈالی ہے ان کا تعلق صرف ہی سے بنتا ہے۔

فصل چہارم کا موضوع نخو ہے اور کتاب کا یہ حصہ روایتی کتب سے کافی مختلف ہے نخو میں پہلے مرکبات اور ان کی اقسام کا ذکر کیا جاتا تھا۔ پھر جملے کی قسمیں آتی تھیں اور آخر میں جملے کی مختلف اقسام کی ترکیب نخوی ہوتی تھی۔ مولوی صاحب نے اس فصل میں ایک تو اجزائے کلام اور ان کے مختلف تغیرات کے عمل سے جو ان میں بلحاظ تعداد و حالت و زمانہ وغیرہ پیدا ہوئے ہیں بحث کی ہے۔ اگرچہ ان اجزائے کلام کا ذکر حصہ

صرف میں بھی آیا ہے لیکن حصہ نحو میں یہ بحث معنی اور مفہوم کے لحاظ سے کی گئی ہے اس فصل کا دوسرا بڑا موضوع جملوں کی ساخت اور ان کی اقسام سے تعلق رکھتا ہے۔ مولوی صاحب نے مرکب جملے کی ترکیب نحو میں ہم رتبہ، تابع، اسعی، وصفی اور تمیزی جملوں کے ذکر سے اردو ترکیب نحو کو انگریزی ANALYSIS کی حدود میں داخلہ کر دیا ہے۔ بیشتر آریائی زبانوں میں ANALYSIS ترکیب نحو کے مقابلہ میں زیادہ عام ہے بہر چند کہ مولوی صاحب نے حصہ نحو میں اجزائے کلام پر نحوی تبدیلیوں کے حوالے سے نظر ڈالی ہے لیکن اگر حتمی طور پر صرف و نحو گئے ملتی نظر آتی ہیں اور نحو کا امتیاز واضح نہیں ہو پاتا۔ جدید فارسی قواعد نویس تجزیہ اور ترکیب پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ تجزیہ میں جملہ میں آنے والے تمام الفاظ کے بارے میں صرفی بحث کی جاتی ہے اور اجزائے جملہ کے باہمی روابط پر ترکیب جملہ میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو کے بعض ہندی الاصل کلمات کے ماخذ پر بھی روشنی ڈالی ہے عربی اور فارسی الفاظ کی اصل پر زیادہ توجہ نہیں دی اس کے مقابلہ میں ان کلمات پر زیادہ توجہ دی ہے جن کا تعلق سنسکرت سے ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ عام اردو جاننے والے سنسکرت کی نسبت فارسی، عربی سے زیادہ قربت رکھتے ہیں اور اردو کے اس عنصر کو جاننے کی ضرورت ہے جو سنسکرت سے اردو میں آیا ہے مولوی صاحب نے اردو اعداد و ضمائے کے ماخذوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس طرح انھوں نے بعض افعال اور حروف کی اصل کی نشاندہی کی ہے۔ اردو میں موجود بعض ہندی الاصل کلمات کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ مولوی صاحب نے قواعد اردو میں اردو زبان کی بعض خصوصیات کا خیال رکھا ہے۔ مثلاً الفاظ کی تکرار اردو کی ایک خصوصیت ہے اور اس تکرار سے جملے میں خاص معنی پیدا ہوتے ہیں اور ان سے اختلاف زور، تاکید یا مبالغہ کا اظہار ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسی طرح افعال مرکب، مرکب و مشتق الفاظ بھی اردو کی بعض خصوصیتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور انہیں بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

ہمارے ہاں قواعد کو زیادہ تر فطری حیثیت سے پڑھا، پڑھایا گیا ہے، اور کتب قواعد میں نظری مباحث زیادہ ملتے ہیں لیکن مولوی صاحب کی کتاب میں قواعد کے عملی استعمال پر زور دیا گیا ہے ہر فطری مسئلہ کی وضاحت لا تعداد مثالوں سے کی گئی ہے اس سے ایک تو کتاب اتنی خشک نہیں رہی دوسری یہ نظری سے زیادہ عملی قواعد کی کتاب بن گئی ہے اس کے تذکیر و تانیث و حدت و جمع، صفات و ضمائے کا

استعمال، فعل سازی، افعال کا تعدیہ، مرکب افعال و الفاظ اور تمیز وغیرہ پر اتنی تفصیلات اس کتاب سے  
کر دی گئی ہیں کہ اس سے پہلے ان موضوعات پر اتنی معلومات کہیں اور نظر نہیں آتیں۔

مولوی صاحب کی قواعد اردو کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک  
اردو قواعد کے موضوع پر کوئی بلند پایہ علمی کتاب نہیں ملتی۔ چوں کہ قواعد اردو کے نصاب میں بھی شامل رہے  
ہیں اس لیے درسی ضرورتوں کے تحت قواعد کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں ان میں کوئی واضح نقطہ نظر نہیں سنا۔  
بیشتر کتب میں عربی قواعد کی تقلید کی گئی ہے کہیں کہیں مولوی صاحب کے اثرات بھی نظر آ جاتے ہیں، کی  
دھائی سے اردو قواعد نویسی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور بعض ماہرین لسانیات نے قواعد اردو کی طرف  
توجہ کی۔ ۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر ابوالیث صدیقی کی جامع القواعد کا حصہ شائع ہوا۔ اس کتاب کا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ  
خاں صاحب کا لکھا ہوا حصہ نحو... منظر عام پر آیا۔ ۱۹۸۱ء میں دلی سے عصمت جاوید صاحب کی نئی اردو  
قواعد ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کی اردو قواعد اور ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر اقتدار حسین خاں کی "اردو میں صرف و نحو"  
جی سی کتاب میں شائع ہوئیں۔ مغربی زبانوں میں لسانیات اور ساختیات کے زیر اثر قواعد کے ایک نئے تصور  
نے جنم لیا ہے نئی اردو قواعد اور اردو صرف و نحو اسی تصور کے مطابق ہیں ان کتابوں کی بدولت جیہ سن باؤم فیلڈ  
نوم چامسکی اور دوسرے اکابرین فن کے افکار کی جھلک اردو قواعد میں نظر آتی ہے۔ ان کتابوں کا انداز سائنسی ہے  
اور علمی پایہ بلند ہے موجودہ دور کو اردو قواعد کی تاریخ میں نئی سوچ کا دور قرار دیا جاسکتا ہے نئے قواعد  
نویس بابائے اردو کی قواعد سے بہت آگے دیکھنے کے دعویدار ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ درست بھی ہو سکتا ہے  
لیکن مولوی صاحب کے قواعد اردو کا اعتبار اب بھی قائم ہے اور جس مقصد کے تحت انھوں نے یہ کتاب لکھی تو عد  
کی کوئی دوسری کتاب اس مقصد کو اس خوبی سے پورا نہیں کرتی۔

۱۔ عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، قواعد اردو، لاہور، کیپیٹی لاہور ۱۹۵۸ء ص ۳۵  
۲۔ عصمت جاوید، اردو قواعد، ترقی اردو بیورو، لاہور، ۱۹۸۵ء ص ۱۴ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد،  
مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۲ء ص ۱۰، اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، اردو صرف و نحو ترقی اردو بیورو، لاہور، ۱۹۸۵ء ص ۹۸  
۳۔ عبدالحق ص ۲۸ ۴۔ ایضاً ص ۳۳ ۵۔ ایضاً ص ۴۴ ۶۔ بٹاری، دکنر طلعت، دستور مختصر  
زبان فارسی، کتاب خانہ مطہری، تہران، ۱۳۴۶ء ص ۱۱ ۷۔ چرنیکووا، سونیا، اردو کے صیغے، دارال شاعری ترقی ماسکو  
ت۔ ن، ص ۱۴-۱۶ ۸۔ بٹاری، ص ۲۲۳



# بابائے اردو مولوی عبدالحق (مرحوم) کا خادم خاص

## مشاہدہ و حقیقت

میں نے آنکھ کھولنے کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب (مرحوم) کے گھر ہی میں پرورش پائی۔ اس قریب نے مجھے مولوی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع دیا۔ مولوی صاحب کا وضع، قطع، علم و فضل، جہاں دنیائے ادب پر مسلم ہے وہاں ان کی نجی زندگی بھی ایک کھلی کتاب کی طرح تابندہ و درخشندہ تھی۔ رحمت، جنوس، شفقت اور دل بولی مولوی صاحب کے شعار لازمہ کے عناصر جلید تھے۔ وہ جہاں اہل علم کی پذیرائی اور طالبان علم کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے وہاں ناخواندوں سے بھی اسی پروقاہ عظمت کے ساتھ محبت کا مظاہرہ کرتے تھے۔

یوں تو مولوی صاحب کے ان گنت واقعات میری نظر سے گزرے، مگر میں اپنی چند یادداشتوں سے دو واقعہ نذر قارئین کرنا چاہتا ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ بابائے اردو کی ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ نجی زندگی کس محور پر تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک غریب مفلوک الحال خاتون جو کہ ذہنی مریضہ تھی جس کا نام کنوڑی باؤلی تھا یہ سقن تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت ایک ایسے حادثے سے دوچار ہوئی۔ جس نے اس کی خوش و خرم زندگی کو بادلا کر دیا، ہوائیوں کہ ایس کے جواں سال بیٹے کی بارات، دریائے گنگا کی نذر ہو گئی یہی صدمہ وہ تھا جس نے اسے پاگل بنا دیا۔ اس طرح یہ بے چاری گلیوں میں ماری ماری پھرنے لگی۔

اس کا مولوی صاحب کے خاندان سے ربط تھا۔ اس غریب خاتون کو مولوی صاحب وہی عورت دیتے تھے جو کسی صاحب حیثیت کے لیے ہوتا ہے مولوی صاحب کو جب کہیں سبے چاری نظر آتی اس کے لیے دعائے موت فرماتے اور جو کچھ اس وقت جیب میں ہوتا، اس کو دے دیا کرتے تھے اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ادبا کے بھرپور رہنے والی شخصیت غریب کو کسی بھی وقت اپنے سے



جدا نہیں کرتی تھی۔ مولوی صاحب درومند تھے کسی کی تکلیف کو گوارا نہیں کرتے تھے۔

دوسرا واقع بھی ملاحظہ فرمائیے، ہاپوٹر میں ایک شخص کرم الہی نامی تھا جو تانگہ چلایا کرتا تھا یہ تانگہ اس کا اپنا تھا مگر مولوی صاحب کے خاندان کا بندہ بے دام ہوئے پر غر کیا کرتا تھا۔ اپنی تمام خدمت مولوی صاحب کے گھر کے لیے وقف کر دی تھیں، مولوی صاحب کے والد صاحب کی سواری کے لیے ہمہ وقت خاطر رکھتا، ان کے بعد مولوی صاحب کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق صاحب کی خدمت بجا لاتا۔ اور مولوی صاحب کی موجودگی میں اس بات کا منتظر رہتا تھا کہ مولوی صاحب کا کب اشارہ ہو اور وہ ان کی خدمت بجا لائے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہ مولوی صاحب کے ارشاد پر مزدوری کے لیے نکلتا تو کوشش یہی کرتا تھا کہ پھر جلد مکمل کر کے پھر تانگے کو مولوی صاحب کے گھر کی ڈیوڑھی پر لے آئے، اکثر یہ ہوتا کہ ہاپوٹر کے اسٹیشن پر جب کوئی سواری اس کو ملتی اور اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ آنے والی شخصیت بابائے اردو کی ہماں ہے تو وہ بڑے تپاک سے تانگے میں سوار کرتا اور بلا معاوضہ کے ان کو بابائے اردو کے گھر تک پہنچا کر ایک روحانی مسرت حاصل کرتا۔

یہ واقعات اور ان سے ملتے جلتے نہ جانے کتنے واقعات بابائے اردو کے خاندان سے منسوب ہیں جو اس بات کے متقاضی ہیں کہ ادیبوں میں سے کوئی ادیب ایسا بھی ہو کہ وہ بابائے اردو کی خالصتاً نجی زندگی کے انہوں روزمرہ کو زینت قرطاس بنائے دیوں تو بابائے اردو پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ابھی مجھ جیسے لوگ باقی ہیں جو بابائے اردو کی سحر و شام سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں میں اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرنے کو سعادت سمجھوں گا۔

ایک اہم چیز یہ ہے کہ میں نہ صرف مولوی صاحب کے گھر کا ریزہ خوار تھا بلکہ بابائے اردو کے خادم ہونے کے باعث انہیں ترقی اردو سے بھی منسلک رہتے ہوئے اپنی خدمت بجا لاتا رہا۔ میں انہیں ترقی اردو کی ابتدائی منزل سے تاحال خدمت انجام دے رہا ہوں۔ میں نے انہیں ترقی اردو کے شب و روز دیکھے ہیں بابائے اردو کے ساتھ نواب سید ہاشمی فرید آبادی اور قاضی احمد میاں اختر جو ناگزیر ہی ان شخصیات سے پہلے بابائے اردو کی موجودگی میں پنڈت برج موہن دتا تر یہ کہنی۔ جنہوں نے انہیں کی بہت خدمت کی ان کا واقعہ یاد آیا، جو قارئین کی نظر ہے میں نے ایک فائل اٹے ہاتھ سے دی تو انہوں نے مجھے ڈانٹا اور کہا یہ عمل درست نہیں، فائل یا اور کوئی چیز ہو تو سیدھے ہاتھ سے

دیا کریں۔ ایک اور چھوٹا سا واقعہ کہ لطیفی پریس سے ایک صاحب آئے جو انجمن کے کاغذات کے بل لائے تھے اس پر دستخط انگریزی میں کیے ہوئے تھے تو پینڈت برج موہن دتاریہ کیفی صاحب نے ان سے کہا کہ یہ بل واپس لے جائیں اور اس پر اردو میں دستخط کروانے کے پھر لائیں یہ سب کام اردو اور انجمن کی محبت میں کرتے تھے۔

ان کے بعد جناب اختر حسین صاحب، جناب قدرت اللہ شہاب صاحب اور اب انجمن کے موجودہ صدر جناب نور الحسن جعفری صاحب کی سرپرستی میں میں اپنی خدمات وقف کیے ہوئے ہوں۔ یہ امر انتہائی حوصلہ افزا ہے کہ موجودہ صدر نور الحسن جعفری صاحب جب سے صدر انجمن ترقی اردو ہوئے ہیں۔ انجمن حقیقتاً بابائے اردو کے خواب کی تعبیر بنتی جا رہی ہے میں دعا کرتا ہوں کہ صدر انجمن جناب نور الحسن جعفری صاحب اور مولانا انجمن جناب جمیل الدین عالی صاحب، ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب، جناب مشفق خواجہ صاحب اور دیگر کرم فرماؤں کو اللہ تعالیٰ شاد و آباد رکھے! جناب مشفق خواجہ صاحب اب تک انجمن کے ملازمین کا، اور جو کام انجمن کی بہتری کے لیے ہو اس کام کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے قیمتی وقت نکال کر شب و روز خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ ان کو زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی سعادت مرحمت فرمائے۔ جس درخت کو بابائے اردو نے لگایا تھا وہ سدا بہار رہتے ہوئے ٹھہرائے ادب سے بار آور ہو۔ آئین۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی جہاں گراں مایہ بیشتر تصانیف ہیں ان میں کی یادگار ماہنامہ ”قومی زبان“ اور ”سما ہی اردو“ اپنی روایات کو دنیا کے ادب میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اخیر میں میں ڈاکٹر محمد اسلم فرخی صاحب میٹر علی دادنی کا ذکر بھی کروں گا کہ جب سے ڈاکٹر اسلم صاحب انجمن کے مشیر علی دادنی مقرر ہوئے ہیں۔ انجمن کی کارکردگی نمایاں طور پر پیش قدمی سے ہمکنار ہے اور یہ سفر انشاء اللہ جاری و ساری رہے گا۔

مولوی صاحب کی تمام توجہات کا مرکز انجمن ترقی اردو تھی۔ وہ کسی قیمت پر یہ برداشت ہی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص انجمن کو نقصان پہنچائے۔ خواہ وہ شخص ان کا عزیز ترین دوست ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے وہ اپنی ذاتی عزت اور ذلت کا کبھی کوئی خیال نہیں کرتے تھے۔ انجمن کی عزت ہی ان کی اپنی عزت تھی۔ ان کی اسی کمزوری سے کچھ لوگوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ہر ایسا شخص مولوی صاحب کو یہ یاد دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ دوسرا انجمن ترقی اردو کو نقصان پہنچا رہا ہے اور کسی کے بارے میں

اس قدر کہ دینا مولوی صاحب کو اس کے خلاف کر دینے کے لیے کافی تھا۔

مولوی صاحب ہمیشہ ہم لوگوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ اگر تم لوگ مجھ سے محبت کرتے ہو تو تم کو انجن سے محبت کرنا چاہیے اور اگر تم انجن کی خدمت کرو گے تو گویا میری خدمت کرو گے۔ انھوں نے انتقال سے ذرا پہلے کہا تھا۔ جب تک زندہ ہوں انجن باقی ہے اور تم اس وقت تک یہیں رہو گے۔ لیکن اب وہ نہیں ہیں۔ مگر میں جب تک زندہ ہوں انجن کی خدمت کرتا رہوں گا۔ کیوں کہ انجن کی خدمت میرے محسن اور آقا مولوی عبدالحق کی خدمت ہے۔ اس میں بہت زیادہ مسرت محسوس کرتا ہوں۔

میرا خاندان مولوی صاحب کے خاندان کے احسانات کے بوجھ سے ہمیشہ دبا رہا ہے۔ میں تو ساری عمر ان کے احسانات سے سرنہ اٹھا سکوں گا۔ جیسا زندگی بھر ان کا غلام رہا آج بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ میرا اور مولوی صاحب کا تعلق میرے دادا کے وقت کا تھا۔ میرے دادا ان کے پرنسپل ملازم تھے اور اس طرح میری تین پشتیں مولوی صاحب کے خاندان کی خدمت میں گزر گئیں ہیں۔ میری پیدائش بھی مولوی صاحب کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق صاحب کے گھر میں ہوئی تھی۔ اور میرے والد صاحب بھی اسی طرح اس خاندان کے دعا گو اور احسان مند رہے ہیں۔ مولوی صاحب کا خاندان بڑا غریب پرورد خاندان تھا۔ اور اچھا خاں صاحب کا بھائی تھا۔ اس خاندان میں ایک خصوصیت ہمیشہ رہی تھی کہ وہ خدا ترسی اور حق گوئی کے معاملہ میں بہت مشہور تھا۔ ضیاء الحق صاحب سیاسی آدمی تھے۔ مولوی صاحب سمیت تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ بھائیوں میں بڑے بھائی ضیاء الحق صاحب ہاپوڑ میں رہتے تھے۔ منجھلے بھائی مولوی عبدالحق صاحب تھے اور چھوٹے بھائی احمد حسن صاحب جو بھوپال میں انجینئر تھے مولوی صاحب کی بڑی بہن منشی اخلاق حسین حرّ اور زمیندار کو بیاہی گئی تھیں جو ہاپوڑ میں ہی رہتے تھے۔ اور باقی دو بہنیں بھی ہاپوڑ کے ہی زمیندار گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کی پیدائش ہاپوڑ میں نہیں بلکہ سراد میں ہوئی تھی جو ہاپوڑ سے چار میل دور ایک جگہ تھی۔ بچپن سے ہی مولوی عبدالحق صاحب کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور اکثر چراغوں کی روشنی میں رات گئے تک پڑھا کرتے تھے۔ یہ بات مشہور تھی کہ مولوی صاحب کی فطرت میں عام بچوں کی طرح کمیل کو دار شرارت کا غفر نہیں تھا۔ بلکہ وہ شروع ہی سے سنجیدہ تھے اور پڑھائی کی طرف مائل تھے۔ اسی وجہ سے ان کا تعلیمی شوق روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ علی گڑھ چلے



گئے جہاں انھوں نے سرسید کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور اسی فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا کہ وہ سرسید احمد خاں اور مولانا حاتمی کے رنگ میں ہمیشہ کے لیے رنگ گئے یہ وہی رنگ تھا جو ساری عمر ان پر سے نہ اترتا۔ علمی، تعلیمی اور قومی کاموں میں ہر وقت مصروف رہنا اور زندگی کی کسی بھی بڑی سے بڑی رنگینی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا، ان کا خاص جوہر تھا۔ اسی لیے وہ اپنے خاندان اور گھرانے کے افراد سے بہت بیگانہ رہتے تھے اور کبھی ان کو خاندان کے معاملہ میں دلچسپی لینے نہیں دیکھا گیا حتیٰ کہ مولوی صاحب نے اپنی شادی بھی اسی خیمے بیگانگی کی نذر کر دی۔ جب ان کی چھوٹی بہن کی شادی ”چھوٹے محل“ میں ہونے لگی جو ہاپوٹڑ کا ایک زمیندار گھرانہ تھا تو مولوی صاحب کی شادی بھی اسی گھر کی ایک لڑکی سے طے کر دی گئی مولوی صاحب کی بیوی کا نام زکریا بیگم تھا۔ یہ شادی مولوی صاحب نے زبردستی بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق صاحب کے اصرار پر کی تھی۔ اور ان کے حکم کی عدم ادولی نہیں کرتے تھے۔ مگر ان سے یہ زبردستی زیادہ برداشت نہیں ہوتی اور بیوی سے باسکل تعلق ہی نہیں رکھا اور علی گڑھ چلے گئے۔ تھوڑے عرصہ بعد مولوی صاحب نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور زکریا بیگم کی دوسری شادی مولوی ممتاز صاحب سے ہوئی۔ مولوی ممتاز صاحب کے دو بیٹے جو زکریا بیگم سے ہوئے، ایک ہارون اور دوسرے ریحان جو بقیدِ حیات ہیں اور ہاپوٹڑ میں رہائش پذیر ہیں۔ مگر مولوی صاحب نے پھر ساری عمر شادی نہیں کی۔

شیخ ضیاء الحق صاحب کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد میں ہاپوٹڑ میں ان کے مکان پر رہا۔ جب انھیں ترقی اردو اور رنگ آباد سے دہلی منتقل ہوئی تو میں پابندی کے ساتھ دہلی میں انھیں کی خدمت پر مامور رہا۔

میرے ساتھ مولوی صاحب کا رویہ ایسا ہی رہا ہے جیسے ان کے بڑے بھائی مرحوم شیخ ضیاء الحق صاحب کا تھا۔ وہ مجھے اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ اور مولوی صاحب نے بھی اولاد کی طرح میرے ساتھ سلوک کیا اور ہر وقت اپنے ساتھ رکھا۔ کبھی کبھی خفا ہو جاتے تو اس کی تلافی فوراً کر دیتے تھے۔ خفا اس بات پر ہوتے تھے کہ خالتو چیز نہ آئے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ چینی (شکر) ختم ہو گئی جو اس دور میں راشن ڈپو سے ملا کرتی تھی بہانہ زیادہ آگئے تو چینی زیادہ خرچ ہو گئی۔ میں چینی بازار سے لے کر آگیا اس چینی کی قیمت میں کچھ اضافہ ہوا تو مجھ سے پوچھا کہ چار روپے زیادہ کیوں خرچ ہوئے۔ گرمی کی قیمت کا بھانڈا پوچھا چینی کی قیمت میں اور گرمی کی قیمت میں تقریباً چار روپے کا فرق نکلا تھا۔ چینی واپس کر دانی گئی اور گرمی کی شکر منگوائی



گنتی اور یہ شکرا متنی مقدار میں آئی کر گیارہ روپے کی بچت ہوئی جو ان کی اپنی ذاتی جیب خرچ میں سے تھی گیارہ روپے مولوی صاحب کے کہنے پر انجن کے دفتر میں جمع کروا دیے گئے۔ اس دن سے مولوی صاحب کے حکم کے مطابق جو بھی چیز آئی وہ ہنگی ہوتی تو اسی قیمت کے حساب سے جو پیسے پختے وہ انجن کے دفتر میں جمع کروا دیئے جو ان کی اپنی جیب خرچ کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ اور یہ رقم انجن کے دفتر میں بطور امداد جمع کروائی جاتی وہ چیزیں جو اپنے مصرف میں آئیں وہ کم قیمت کی ہوتی اور اس سے جو پختا وہ انجن کے دفتر میں جمع کرادیا جاتا اس طرح کے سیکڑوں واقعات تھے۔

میں ان کی ذاتی خدمت پر مامور تھا ہر چیزوں کا لانا اے جانا ان کے احکامات کی پابندی کرنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ گویا میرا وہ کام تھا جو اوپر کے ملازمین کرتے ہیں۔ مولوی صاحب کو شروع میں میری تعلیم سے بہت دلچسپی تھی مگر میں بیمار اس قدر رہتا تھا کہ مولوی صاحب کی یہ خواہش کبھی نہ پوری ہو سکی۔ اور میں علم کی روشنی سے محروم رہا۔ میں دراصل اپنی ذہنی کمزوری کی بناء پر نہیں پڑھ سکا۔ مولوی صاحب کے بڑے بھائی ضیاء الحق صاحب کا انتقال ۱۳۹۳ء میں ہوا تھا۔ اور یہ وہ واحد واقعہ تھا جس پر میں نے مولوی صاحب کو بہت متاثر دیکھا۔ ان کو اپنے بڑے بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی لیے ان کے بعد ان کی اورداد کو خوب پڑھایا اور گھر کے تمام اخراجات اور تعلیم کا خرچ بھی خود دیتے تھے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی بھی مولوی صاحب نے خود کی۔ ضیاء الحق صاحب کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد سے مولوی صاحب کو کبھی زیادہ شغف نہیں رہا۔ جب تک ضیاء الحق صاحب زندہ رہے مولوی صاحب ہاپوڑ پابندی سے آئے رہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد صرف بھتیجے کی شادی پر ہاپوڑ آئے تھے اور اس کے بعد پھر کبھی نہیں آئے۔

۱۹۳۸ء میں جب مولوی صاحب دہلی آئے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ دہلی میں مولوی صاحب دریا گنج میں رہتے تھے۔ یہاں مولوی صاحب کی ذاتی خدمت کے علاوہ میرے سپرد دفتری کام بھی تھے۔ ۱۹۴۱ء میں جب حالات بخیر و خوش ہو گئے اور فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تو مولوی صاحب نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم بھوپال چلے جاؤ چناں چہ مولوی صاحب خود حیدرآباد چلے گئے اور مجھے احمد حسن صاحب کے پاس روانہ کر دیا۔ دہلی سے بھوپال جاتے ہوئے فریدآباد کے مقام پر ٹرین پر حملہ ہوا۔ جس میں میں بھی شدید زخمی ہوا۔ وہ زمانہ جس سنگین صورت حال سے دوچار تھا اس کا اندازہ آج اچھی طرح نہیں کیا جاسکتا۔ بھوپال پہنچتے پہنچتے دوپہار روز لگ گئے۔ احمد حسن صاحب کو ٹرین پر حملہ کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ اسٹیشن پر منتظر تھے۔ مجھے لگے اور میرا علاج کر دیا۔ جب مولوی

صاحب حیدر آباد سے بھوپال آئے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم فوراً کراچی چلے جاؤ۔ میں کراچی ہی آ رہا ہوں۔ مولوی صاحب بھوپال سے دہلی آگئے اور وہاں ابوالکلام آزاد سے مل کر انجمن کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کی اور آگئے۔ میں بمبئی کے رائے بھری جہاز سے کراچی پہنچا۔ مولوی صاحب نے میری والدہ کو اپنے بھتیجے کے ساتھ ہوائی جہاز سے یہاں پہنچے ہی بلوایا تھا۔ اور وہ انھیں کے پاس رہ رہی تھیں۔ میں جب یہاں پر آیا تو کلیشن روڈ پر ان کے بھتیجے ممتاز حسین صاحب کے پاس رہا۔ اور مولوی صاحب کی خدمت بدستور شروع کر دی۔ مولوی صاحب کی رحلت سے تقریباً چھ سات سال قبل انجمن میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مجھے مولوی صاحب کی خدمت سے الگ کر کے دفتری کام میں لگا دیا گیا تھا۔ مگر میری تنخواہ مولوی صاحب ہی دیتے رہے اور اکثر میرے مانگنے پر الگ سے روپیہ بھی مجھے دیتے تھے۔ میری شادی بھی انھوں نے ۱۹۵۳ء میں کرائی اور سارے اخراجات خود برداشت کیے۔

مولوی صاحب میں اتنی خوبیوں تھیں جن کے گنوں گے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ لیکن خاندانی روایت کے تحت جو شخص جو کچھ بھی کہتا اس پر عمل کرتے۔ کوئی شخص کسی کے خلاف کچھ کہہ دیتا اس کو صفائی کا موقع دیئے بغیر الگ کر دیتے اور بدگمان ہو جاتے۔ اس بات کی وجہ سے بعض بڑے مخلص افراد کو بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن میرا پھر بھی یہ امر ہے کہ اس میں محض انجمن ترقی اردو کی محبت کام کر رہی تھی۔

”میں ۱۹۳۶ء سے تاحال انجمن کا ملازم ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ میں مولوی صاحب کا ہی ملازم ہوں۔ مروجہ ساری زندگی انجمن کی نذر کر دی اور اسی غلوں کی روشنی آج تک ہم سب کے لیے

مشعل راہ ہے۔“

بڑے آدمی

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم اولیاء العزم اور عالیٰ حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور بالکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کی حیرت، نگیز جدوجہد قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکی مٹایا۔ محبت ہم ان سے کرتے ہیں جن کی سیرت، خوش اطواری اور

خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ ان کے پاس سے جو اٹھا کچھ لے کر اٹھا، اور ان کے پاس ہو گیا کچھ بن کر آیا۔

### بڑے آدمیوں کے وعدے

بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔  
(چند ہم عصر۔ ص ۴۱۲)

### بڑے لوگوں کی صحبت

بڑے لوگوں کی صحبت بھی اکیر کی خاصیت رکھتی ہے جو ان سے چھو اکند بن گیا۔  
(چند ہم عصر۔ ص ۲۰۷)

# URDU ADAB QUARTERLY

*EDITOR*

**Khaliq Anjum**

**ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)  
NEW DELHI**



سہ ماہی

اُردو ادب



# اردو ادب (سہ ماہی)

۱۹۹۲ء

شمارہ (۲)

# اردو ادب

(خاص نمبر)

ادیٹر  
خلیق انجم

انجمن ترقی اردو دہندہ نئی دہلی

۲۵ روپے	_____	سالانہ قیمت
پندرہ روپے	_____	فی شمارہ
۲۵ روپے	_____	موجودہ شمارہ

پرنٹر پبلشر ایم۔ حبیب خاں اسسٹنٹ سکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے ٹمرا فیسٹ پرنٹرس دہلی میں  
چھپوا کر اردو گھڑاؤ ذرا یونیورسٹی دہلی سے شائع کیا۔



# فہرست

۷	ڈاکٹر خلیق انجم	حرف آغاز
۹	پروفیسر مختار الدین احمد	تعارف
۱۶	ڈاکٹر ظفر اقبال	مقدمہ
۲۷	نین سکھ	دیوان نین سکھ
۷۳	پروفیسر مسعود حسین	غالب کی حیات معاشقہ

## حرفِ آغاز

اردو میں قدیم متون کی طباعت اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب ہندوستان میں پریس کا رواج ہوا اگرچہ سرسید نے ابوالفضل کی آئینہ اکبری مرتب کر کے متنی تنقید کی روایت کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا لیکن فن کو مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ آئینہ اکبری کی طباعت کے ۱۶۰ سال بعد مولوی عبدالحق نے اردو میں متنی تنقید کا آغاز کیا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام بڑی تعداد میں اردو تذکروں، دکن اور شمالی ہند کے شاعروں کے دواوین اور دکن کی بعض نثری تصنیفات کے تنقیدی ادیش شائع کیے۔ ہمارے متنی نقادوں میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، حافظ محمود شیرانی، مالک رام صاحب، پردیسر نذیر احمد اور رشید حسن خاں صاحب وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ یہ فن ہمیشہ ہی سے ہماری دانش گاہوں کی حدود سے باہر رہا۔ اردو میں جتنے بھی اعلام جے کے متنی نقاد پیدا ہوئے ہیں ان کا درس و تدریس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ کچھ دن سے یونیورسٹی کے اساتذہ اب اس طرف توجہ کر رہے ہیں اور یہ متنی تنقید کے حق میں بہت اچھا ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر ظفر اقبال نے ایک غیر معروف کلاسیکی شاعر نین سکھ کا دیوان مرتب کیا ہے۔ اس شاعر کے نام سے شاید ہی کوئی اسکا لرواقف ہو۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری نور نے تذکرہ مخطوطات اردو میں نین سکھ نامی ایک شاعر کا ذکر کیا ہے لیکن غالباً وہ کوئی اور شاعر ہے وہ نہیں جس دیوان کا ظفر اقبال صاحب نے تنقیدی ادیشن تیار کیا ہے۔ نین سکھ کے دیوان کا ابھی صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے۔ متنی تنقیدوں کے اصولوں کے پیش نظر متنی نقاد کے پاس اگر صرف ایک ہی متن ہو تو کام مشکل بھی ہو جاتا ہے اور آسان بھی۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ اگر ہمارے پیش نظر دو یا دو سے زیادہ متن ہوتے ہیں تو عبارت پڑھنا آسان ہو جاتا ہے۔

کیوں کہ اگر ایک متن میں عبارت غیر واضح ہو تو دوسرے متن سے مدد لی جاسکتی ہے اور اگر صرف ایک ہی متن ہو تو متنی نقاد کو قیاسی تصحیح کا بہت زیادہ سہارا لینا پڑتا ہے۔  
 اقبال صاحب نے نین سکھ کے دیوان کا زیر نظر تنقیدی اڈیشن بڑی محنت اور دیریدہ  
 ریزی سے تیار کیا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے متن اور شاعر سے متعلق تمام اہم مباحث کا احاطہ  
 کر لیا ہے۔ یہ دیوان قدیم اردو کی ادبی اور لسانی خصوصیات کے سلسلے میں بہت اہمیت  
 رکھتا ہے۔

ظفر اقبال صاحب اٹھارہویں صدی کے بعض اہم شاعروں کے دیوانوں کا تنقیدی اڈیشن  
 تیار کر رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ اردو میں یہ کام بہت کم ہوا ہے۔ ہم نے غالب، اقبال اور  
 انیس کا کافی حد تک حق ادا کر دیا لیکن میر، سودا، خواجہ میر درد اور مومن وغیرہ ابھی تک ہمارے  
 متنی نقادوں کی توجہ کے طالب ہیں۔ خدا کرے ظفر اقبال صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔

خلیق انجم

۳۰ جون ۱۹۹۲ء

## تعارف

طاہر ظفر اقبال، کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرار ہیں، آج کل وہاں استاد کی حیثیت سے ٹوکیو یونیورسٹی، جاپان کے شعبہ اردو میں طلباء کو درس دے رہے ہیں۔ اپنی کم عمری کے باوجود درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ وہ آج کل بعض قدیم متون، دیوان احسن الشریان، دیوان آبرو، دیوان قدرت الشریقت اور مبتدا کا تذکرہ طبقات سخن مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ طبقات سخن کے نسخہ، شاہجہاں پور کی نقل اور نسخہ برلین کا عکس انھوں نے فراہم کر دیا ہے۔ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان اہم اور قدیم مخطوطات پر پوری توجہ دیں گے اور تصحیح و تخریج کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔

دیوان نین سکھ کی ترتیب ان کی تازہ کوشش ہے یہ کام انھوں نے اردو کے عدائے بہت دور جاپان میں بیٹھ کر کیا ہے۔ جہاں اردو کے مہادر بہت کم ہوں گے، اگر یہ کام وہ کراچی، لاہور میں کرتے تو ان متعدد مراجع سے انھیں مستفید ہونے کے مواقع ملتے بھڑکی الحال، میرا خیال ہے، ان کی دسترس میں نہیں۔

نین سکھ کی شخصیت فی الحال مجھوں سے، اس کا اصل نام یہی تھا یا کچھ اور کہا نہیں جاسکتا، اس کے سنہین ولادت و وفات بھی معلوم نہیں، کہاں کا رہنے والا تھا، شاعری میں کس سے شرف تلمذ حاصل تھا، کچھ پتا نہیں۔ اس کی زندگی کے حالات پردہ تاریکی میں ہیں۔ اردو شعراء کے تذکرے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد الدین قادری زور مروم کے تذکرہ مخطوطات اردو میں جس نین سکھ کا ذکر ہے، جس نے صف شاہ خاں بجاہد جنگ ارمان حیدر آبادی کے صوبہ دار مقرر ہونے پر ایک قطعہ تاریخ فارسی



زبان میں لکھا تھا، مرتب کے خیال میں وہ، نین سکھ صاحب دیوان سے مختلف ہے۔ میں فی الحال اس سلسلے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں، لیکن انھوں نے اس کے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ قطعی نہیں اور ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے:

۱۔ وہ لکھتے ہیں کہ صف شکن خاں کے سلسلے کا قطعہ تاریخ، دیوان نین سکھ میں موجود نہیں، اس لیے وہ قطعہ، صاحب دیوان کا نہیں کسی اور کا لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہو ایسا ہی ہو، لیکن یہ بالکل ضروری نہیں کہ کسی شاعر کی ہر غزل، ہر قصیدہ، ہر قطعہ دیوان میں شامل ہو۔ خاص طور پر ایسی شکل میں کہ ان کے بقول دیوان کا موجودہ نسخہ غالباً نین سکھ کی بیاض ہے جس میں اس نے اپنا کلام بغیر کسی ترتیب کے نقل کرایا ہے۔ پھر دتی سے غائب تک کے دو ادین دیکھ جائیے۔ بعض شعراء کا کچھ اور بعض کا خاصا کلام دیوان مروجہ میں سے غیر حاضر لیکن دوسرے مہادر میں موجود ملتا ہے۔ پھر یہ نین سکھ کا اردو دیوان ہے فارسی کلام کا شمول اس میں ضروری نہیں۔ دیوان شیخ غلام یحییٰ حضور عظیم آبادی (متوفی ۱۲۳۷ھ) میں اس کے اردو اشعار ہیں فارسی کا ایک مصرع بھی نہیں ملتا، جب کہ ان کا لکھا ہوا فارسی کا ایک قطعہ جو حضرت شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی کی وفات پر انھوں نے ۱۲۳۷ھ میں نظم کیا، حضرت عشق کے لوح مزار پر کندہ ملتا ہے۔ قدمی عظیم آبادی کا فارسی قطعہ تاریخ وفات عشق بھی ان کے دیوان اردو سے غیر حاضر ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ نین سکھ کے دیوان کا موجودہ نسخہ مکمل نہیں، جیسا کہ مرتب نے اپنے مقدمے میں ملاحظہ کی ہے۔ اس کے کچھ اوراق غائب ہیں۔

۲۔ مرتب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ نین سکھ نے کیا ساری زندگی میں ایک ہی فارسی قطعہ لکھا؟ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی زندگی کا سارا سرمایہ ہمارے پیش نظر ہے کہاں! حضور اور قدمی کا ذکر اور ہرگز! جن کا لکھا ہوا صرف ایک ہی فارسی قطعہ اب تک دستیاب ہوا ہے۔ ایسے اور شعراء بھی ہوں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نین سکھ نے فارسی میں شعر کہے ہوں لیکن وہ ہم تک نہ پہنچ سکے ہوں یا ضائع ہو گئے ہوں۔

میرا یہ ادعا ہرگز نہیں کہ محی الدین قادری زور نے جس نین سکھ کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہی نین سکھ صاحب دیوان اردو ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ فاضل مرتب نے جو دلائل دیے ہیں وہ مستحکم اور قطعی نہیں۔

نہیں سکھ نام کے ایک صاحب اور گزرے ہیں۔

سید مقبول احمد صدیقی، علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی (متوفی ۱۱۳۸ھ) کی سوانح زندگی حیات جلیل میں میر صاحب کے بارہ معتمدان خدمت و ملازمین خاص کا ذکر کرنے کے بعد نین سکھ کا مختصر حال لکھتے ہیں۔

نین سکھ، ان کا منشی اور مقرب خاص تھا۔ جس زمانے میں دربار کی حاضری دونوں وقت دینی پڑتی تھی اور میر صاحب عظیم الفرصت تھے تو افسوس کرتے تھے:

نین سکھ بیمار ست ہذا جواب خطوط مردم آں جا کہ میر سندی شود کہ بنویم بہر کدام عذر خواہند گفت  
دوسرے خط میں لکھتے ہیں د

نین سکھ بتایم ششم جمادی الآخر ۱۱۳۸ھ بقضائے الہی فوت شد۔ ماسف بسیار نمودیم بحضر

چارہ نیست (حیات جلیل) : (طبع الہ آباد ۱۹۴۱ء)

مولف مرحوم نے میر عبد الجلیل کے دو خطوں کی جو مختصر عبارتیں نقل کی ہیں اس سے نین سکھ کے بارے میں کچھ وضاحت نہیں ہوتی۔ اس کی فارسی انشا پر داندی کا ذکر تو ہے لیکن اس کی اردو شاعری کے متعلق کسی قسم کا اشارہ نہیں ملتا۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی (۱۲۰۲ھ) مآثر الکرام میں میر عبد الجلیل کے حال میں لکھتے ہیں۔ میر سید محمد سلہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق ایشاں پادہ از منشآت والا جمع کردند۔ یہ مجموعہ بائیس خطوط پر مشتمل تھا جو میر صاحب نے اپنے صاحبزادے میر سید محمد بلگرامی کو سفر سے بھیجے تھے۔ (حیات جلیل ۱۴: ۲) افسوس ہے کہ اس مجموعہ خطوط کا کوئی قلمی نسخہ بلگرام یا کسی جگہ دستیاب نہیں ہاں فرہین (ORIENTAL MISCELLANY) میں ہے جسے ایک انگریز مستشرق نے مرتب کیا ہے اور جس میں فرہین اور دوسری تحریرات کے ساتھ میر عبد الجلیل کے فارسی مکتوبات کا متن انگریزی ترجمے کے ساتھ کلکٹہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔ قابل قدر تحریرات کا مجموعہ ہے۔ انگریز مولف نے اس کا نام مختلف معاملات پر باب کے اصلی خطوط بیٹے کے نام رکھا ہے اس کی اشاعت کو اب کوئی دو سو سال ہونے کو آئے یہ کیا ب نہیں گویا نایاب ہے۔ میں نے کلکٹہ لاہور خطوط لکھ کر اس کے حصول کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی میں نے لندن خط لکھا ہے اگر برٹش لائبریری میں یہ مجموعہ حاصل ہو گیا تو اس کا امکان ہے کہ نین سکھ کے بارے میں کچھ مزید اطلاع ملے۔

لیکن یہ نین سکھ، صاحب دیوان سے متقدم معلوم ہوتے ہیں اور اس کا بہت کم امکان ہے کہ ہم جس

نہیں سکھ کی تلاش میں ہیں وہ یہی نہیں سکھ ہوں جن کا ذکر حیات جلیل میں آیا ہے۔  
نہیں سکھ نے ایک شعر میں بارہویں صدی کا ذکر کیا ہے:

بارہ صدی کا دور جو سنتے تھے (ہم) نیتن

بے شک شہرہ تحقیق وہ ہنگام یہی ہے

منشی نین سکھ جن کا سال وفات ۷۱۱ھ میر صاحب نے بتایا ہے، یہ صاحب دیوان نین سکھ اسی وقت قرار دیے جاسکتے ہیں جب یہ معلوم ہو جائے کہ نین سکھ نے یہ غزل یا کم از کم یہ شعر اپنی زندگی کے بالکل آخری دور میں ۷۱۱ھ سے کچھ پہلے لکھا ہے، لیکن اس شکل میں بھی یہ اشکال رہ جاتا ہے کہ نین سکھ کی زبان اتنی قدیم نہیں معلوم ہوتی۔ خلاصہ کلام یہ کہ بصورت موجودہ قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ شاعر نین سکھ جس کا دیوان اردو محفوظ ہے۔ اور جس نین سکھ کا فارسی قطعہ حیدرآباد میں ملتا ہے اور نین سکھ جو میر عبد الجلیل بلگرامی کے متوسلین میں تھا۔ ایک ہیں یا یہ تینوں علیحدہ علیحدہ شخصیتیں ہیں۔

نین سکھ کے ایک شعر میں تیرہویں صدی کا ذکر بھی آیا ہے:

وہ تیرہ صدی جو نے تھے بھی

یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے

اس سے تو یہ خیال بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ نین سکھ (متوفی ۷۱۱ھ) کا کسی قسم کا تعلق نین سکھ صاحب دیوان سے ہے۔

مرتب نین سکھ صاحب دیوان کو پیشے کے لحاظ سے زرگم بتاتے ہیں اور ثبوت میں ان کی نین ابیات پیش کرتے ہیں۔ جن میں تور، ماشہ، رکی، چھٹکی، صراف اور کھوٹا کے الفاظ آئے ہیں۔ شعر لے فارسی واردوں کتنوں کے یہاں نجوم، طب اور دوسرے علوم اور مختلف پیشہوروں کی اصطلاحیں آئی ہیں۔ ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ شعرا نجومی یا طبیب تھے یا زرگم، خیاط، معمار۔

نین سکھ کو مرتب یقین دہلوی کا شاگرد بتاتے ہیں۔ اور سند میں حسب ذیل شعر درج کرتے ہیں جس میں اس نے یقین کے ایک مصرع کی تفسیر کی ہے۔ اس میں استناد کی بنیاد اس بات پر ہے کہ نین سکھ نے انھیں "حضرت یقین" لکھا ہے۔ تعظیمی لفظ "حضرت" استعمال کرنے سے یقین کا ان کا استاد ہونا کس طرح ثابت ہو سکتا ہے، ناظر مولف تذکرہ خوش معرکہ زریا کا دستور ہے کہ وہ کسی اہم شاعر کے ذکر کے بعد ان کے

ملا مذہ کا ذکر کرتا ہے۔ یقین کی ہر سمت تلامذہ میں نین سکھ کا ذکر نہیں۔ اگر وہ یقین دہلوی جیسے شاعر کا واقعی شاگرد ہوتا تو کسی نہ کسی تذکرے میں اس کا ذکر ضرور ملتا۔ شاگردی یقین کے لیے کسی مضبوط دلیل کی ضرورت ہے۔ نین سکھ کے مذہب کے بارے میں مرتب کا خیال ہے کہ وہ ہندو مذہب کے پیروکار ہیں۔ ثبوت میں تین شعرا انھوں نے پیش کیے ہیں۔ ان اشعار سے استناد درست نہیں۔ کتنے ہی مسلم شعرا کے دواوین میں اس مضمون کے شعر مل جائیں گے۔ انھوں نے اپنے خیال کے استحکام کے لیے نین سکھ کے حسب ذیل شعر نقل کیے ہیں، ان سے تو معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔

تبیح نماز روزے سے مجھ کو نہیں ہے کام      میں بت پرست ہوں مرا پہچان یہ سخن  
کیا ازل سے ہے صانع نے بت پرست مجھے      کبھو بتوں سے پھروں میں یہ تو خدا نہ کرے  
یہ مانگتا ہوں دعا روز حق تعالیٰ سے      بتوں سولے کہیں دل کو مبتلا نہ کرے

وہ لکھتے ہیں نین سکھ نے اہل دل، اہل حق، مردم آگاہ، حق آگاہ، جیسی ترکیب بکثرت استعمال کی ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی صوفی کے صحبت یافتہ یا اسی طرح کے ماحول کے پرورش یافتہ تھے۔ وہ عقیدہ جبر کے قائل تھے، ان کے خیال میں انسان مجبور محض ہے۔

اپنی نظر تو نین خدا پر ہے، ہو سو ہو  
جو آن باز کھائے وہ لاچار دیکھنا

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں: نین سکھ پختہ ندہی عقائد رکھتے تھے اور خدا کی رزاقیت پر مکمل بھروسہ کرنے کے قائل تھے، انھوں نے دو شعر بھی نقل کیے ہیں جو قابلِ توجہ ہیں:

توئی راز حق حقیقی ہے جو دیوے ساسے عالم کو      تے ثانی کوئی یارب کہاں دانا رہ پیدا  
جز نام خدا صرف نہ کرنا کبھو انفا س      از بسکہ عبارت کا سرا انجام یہی ہے

نین سکھ، اگر شاعر کا نام ہے تو ان کے مذہب کا معاملہ واضح ہے، اور اگر نین سکھ اصلی نام نہیں بلکہ بعض مسلم شعرا کی طرح کہ جب وہ ہندی میں شعر کہتے ہیں تو اسی مناسبت سے نام بدل دیتے ہیں اور کچھ اور رکھ لیتے ہیں، یہ ان کا قلمی نام ہے۔ تو صورت حال مختلف ہو جاتی ہے۔

ہندی شاعری کی تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ میر غلام نبی بنگرامی اٹھارویں صدی عیسوی کے شاعر ہیں۔ فارسی میں نبی تخلص کرتے تھے، یہ ہندی میں 'رس لین' راجت میں 'جو' کے نام سے معروف ہیں۔



ان کی متکون تصانیف میں انگ در پن اور رس بودہ مشہور ہیں۔ سید ابراہیم، جو ”رس کھان“ کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، ہندی کے ممتاز شاعر گزرے ہیں۔ طالب علی بلگرامی (رس نانک)، بھی ہندی کے شاعر ہیں۔ ”بتیم“ اور ”پریمی“ بھی مسلمان شاعر ہیں، نام کچھ اور ہیں لیکن ہندی دنیا میں یہ دونوں ”بتیم“ اور ”پریمی“ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ نین سکھ کے مذہب کے بارے میں قطعیت کے ساتھ اسی وقت کچھ کہا جاسکتا ہے جب اس عہد کی تاریخ یا شعر کے تذکرے سے کوئی معتبر شہادت مل جائے۔

دیوان نین سکھ کا نسخہ منحصر بفرد ہے۔ قیاس ہے کہ یہ مکمل ہو کر کبھی مرتب نہیں ہوا، کلام بھی عام اور مقبول نہ ہوا اس لیے اس کی نقلیں تیار نہ ہو سکیں، اگر نقل نویسوں نے اس کی نقلیں تیار کیں تو وہ ضائع ہو گئیں، اور صرف وہی نسخہ محفوظ رہ گیا جو مصنف کا ذاتی نسخہ تھا۔ یہ نین سکھ کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور اسے مرتب نے بیاض کہا ہے۔ حسن اتفاق سے مولوی عبدالحق مرحوم کو یہ نسخہ ہاتھ لگ گیا اگر انہیں حیدر آباد یا اس کے مضافات میں ملا تو اس سے کچھ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، اگرچہ قطعی نہیں، اور ان کے ذاتی کتاب خانے میں رہا یہ نسخہ گلا سے دہلی منتقل ہوا، تقسیم ہند کے فسادات میں ضائع ہونے سے بچ گیا اور کراچی پہنچ کر مولوی صاحب کے کتاب خانہ خاص میں محفوظ رہا۔ مولوی صاحب کی زندگی میں کراچی میں ان کے ذاتی کتاب خانے پر بھی افتاد چڑی، بہر حال ان کی وفات کے بعد ان کی ملوکہ ساری کتابیں کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں محفوظ کر دی گئیں۔ آج کل اردو۔ سندھی جھگڑوں اور لسانی فسادات کی وجہ سے انجمن کے سارے مخطوطات و نوادر حکومت کی نگرانی میں نیشنل میوزیم کراچی میں بھیج دیئے گئے ہیں۔ اور دیوان نین سکھ کا یہ وحید نسخہ اب وہیں محفوظ ہے۔

کسی قدیم شاعر کا دیوان صرف ایک نسخے سے مرتب کرنا، اور الفاظ کی صحیح قرأت متعین کرنا ایک مشکل کام ہے۔ شاید اس لیے کہ شاعر غیر معروف بلکہ بھول ہے جس کا صحیح زمانہ حیات بھی معلوم نہیں، اور جس کے اکثر اشعار بھی بے مزہ ہیں، مولوی عبدالحق مرحوم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ دیوان کی اشاعت تو دور کی بات ہے، اس پر ایک مختصر سائنس دان مضمون بھی لکھ کر یا کسی سے لکھوا کر شائع نہیں کیا۔ دیوان کی قدامت کی وجہ سے اس کی لسانی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر ظفر اقبال کا ہمیں مومن ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس کی ترتیب و اشاعت کی طرف توجہ کی، ان کی یہ کوشش۔

لائق تحسین ہے۔

جناب ڈاکٹر خلیق انجم، سکریٹری انجمن ترقی اردو دہندہ سے اس دیوان کا ذکر آیا، اس کی قدامت و لسانی اہمیت کی وجہ سے وہ اس کی اشاعت پر بخوشی آمادہ ہو گئے، اگر وہ اسے صحیح چھپوا سکے تو ہمارے دہرے شکریے کے مستحق ہوں گے۔ کیا عجب مستقبل قریب میں اس کا کوئی دوسرا نسخہ مل جائے، اس وقت اس کا زیادہ مکمل اور صحیح و مستند متن پیش کیا جاسکتا ہے۔

فیض الدین احمد

۲۰ مئی ۱۹۹۱ء

ناظم منزل

۲۸۶/۴ امیر نشان روڈ

علی گڑھ

## مقدمہ

نہیں سکھ کے حالات و اشخاص، کسے اتنا ذکر ہے یا ذیلی مآخذ میں نہیں ملتے ہیں۔ اور نہ انھوں نے دیوان میں ایسے اشارے دیے ہیں کہ جن کی مدد سے ان کی زندگی کا خاکہ مرتب کیا جاسکتا۔ وہ کہاں اور کب پیدا ہوئے؟ زندگی کہاں اور کیسے گزاری؟ وفات کہاں اور کب پائی؟ ان سب کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے دیوان میں دو شعر ایسے مل سکے کہ جن سے نہین سکھ کے عہد کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

بارہ صدی کا دور جو سنتے تھے نہین      بے شک شبہ، تحقیق وہ ہنگام یہی ہے

وہ تیرہ صدی جو نے تھے بھی      یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے

پہلے شعر میں بارہویں صدی اور دوسرے میں تیرہویں صدی کے ذکر سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ نہین سکھ کا زمانہ بارہویں صدی کے وسط سے تیرہویں صدی کی ابتدائی چند ہائوں تک کے عہد پر محیط ہے۔ اس سلسلے میں ”مدرس شہر آشوب“ کے دو بند ہماری مزید رہنمائی کرتے ہیں:

ہے عجب کچھ یہ جاٹ کی سرکار      خلق ناخوش، سپاہ سب بیزار

دیر طلبی سے سخت ہو لاچار      اکثر اس بیت کو پڑھیں ہیں پکار

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پر برطرفی و بھالی ہے

پاجی عالم ہے بادشاہی میں      مرد آدم پھر میں تباہی میں

کیا کہوں میں جناب الہی میں      اب کے پھر ٹھہلی ہے چھاہی میں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پر برطرفی و بھالی ہے

جاٹ گردی، شاہ عالم کے عہد کے اہم واقعات میں سے ہے۔ شاہ عالم کی تاریخ مندرجہ نشینی ۳، ۴، ۵ اور

تاریخ وقات ۱۲۲۱ھ سے نصف مذکورہ شہر آشوب کے کسن کی توقیت ہوتی ہے بلکہ نین سکھ کے عرصہ حیات کو بھی ایک دائرے میں محدود کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے قرائن سے نین سکھ کی حیات کو بارہویں صدی کے نصف آخر اور تیرہویں صدی کی ابتدائی چند دہائیوں کے مابین متعین کر چکے ہیں، مذکورہ شہر آشوب میں بیان کردہ حالات سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ”تذکرہ مخطوطات“ میں درج ذیل قطعہ تاریخ کو نین سکھ نام کے ایک شاعر سے منسوب کیا ہے:

نگہدار مولا علی در امن      مبارک کناں نظم جان و دکھن  
ز ہاتف ندا آمد آیین بگو      کہ ملک علی صوبہ شد صف شکن

ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ نین سکھ نے یہ قطعہ صف شکن خاں، مجاہد جنگ، ارمان حیدر آبادی کے حیدر آباد کا صوبہ دار مقرر ہونے کے موقع پر پیش کیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۱۶۷ھ کا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ”تذکرہ مخطوطات“ جلد چہارم، ص ۲۶۲۱- طبع ثانی: ترقی اردو بیورو، دہلی ۱۹۸۲ء) یہی اطلاع افسر صدیقی نے بھی دی ہے۔ افسر صدیقی، ”فہرست مخطوطات“، انجمن ترقی اردو، جلد چہارم، ص ۲۰۲) مذکورہ بالا قطعہ کا اس نین سکھ سے جس کا دیوان ہم پیش کر رہے ہیں انتساب ہماری رائے میں درست نہ ہوگا۔ اس کے متعدد دلائل موجود ہیں۔

۱۔ اگر یہ قطعہ ہمارے نین سکھ کا ہے تو اسے ان کے دیوان میں بھی شامل ہونا چاہیے تھا لیکن دیوان میں مذکورہ قطعہ تاریخ درج نہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور: کیا نین سکھ نے ساری زندگی میں صرف ایک ہی قطعہ تاریخ لکھا؟ اگر زیادہ لکھے تو انہیں کلا یا جزو دیوان میں شامل ہونا چاہیے تھا۔

۲۔ نین سکھ کا حیدر آباد جانا ثابت نہیں۔ اگر وہ حیدر آباد جاتے تو وہاں کی ”سرکاروں“ یاد بار میں باریابی اور حصول مقصد کے لیے قصائد ضرور لکھتے؛ موجودہ صورت میں ان کے دیوان میں قصیدہ تو کجا کسی کی شان چند مدحیہ اشعار تک نہیں ہیں۔

۳۔ مذکورہ بالا قطعہ تاریخ فارسی میں ہے۔ نین سکھ کے پورے دیوان میں فارسی کا ایک بھی شعر نہیں۔ اگر وہ فارسی میں کچھ بھی لکھتے تو زیر نظر دیوان میں کچھ نہ کچھ تو درج ہوتا۔

دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ قطعہ تاریخ کا زیر بحث نین سکھ سے انتساب درست نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اس نام کی کوئی اور شخصیت حیدر آباد میں گزری ہو۔

نین سکھ کے دیوان میں ۱۴ اشعار کی ایک مشنوی ہے۔ اس مشنوی میں بھوپال کے حالات بیان کیے



گئے ہیں اور ایک واقعے کی تفصیلات رقم کی گئی ہیں۔ اس مثنوی میں بیان کردہ تفصیلات سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بیان ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے۔ نیز اس مثنوی سے نین سکھ کی بھوپال سے کچھ نہ کچھ نسبت بھی واضح ہوتی ہے۔ نین سکھ کی علمی صلاحیت اوسط درجہ کی تھی۔ انھوں نے متعدد مقامات پر 'عند اللہ' 'حق تعالیٰ' 'جزاک اللہ' جیسے عربی الفاظ بر محل استعمال کیے ہیں۔ علاوہ ازیں 'مخمس شہر آشوب' میں ایک قرآنی آیت 'وقعا عذاب النار' بھی بطور مصرع استعمال کی ہے۔ جہاں تک فن شاعری کا تعلق ہے، اس سے نین سکھ بے بس معمولی واقفیت رکھتا تھا۔ بالخصوص عروض سے ان کی ناواقفیت کا ثبوت دیوان میں متعدد مقامات پر فراہم ہوتا ہے۔

نین سکھ پیٹے کے لحاظ سے زنگر تھے۔ انھوں نے متعدد اشعار میں اپنے پیٹے کی اصطلاحات نظم کر کے اس کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

وہ جو اک تور کئی ماٹہ تھی تم سے یاری  
رٹی بھر بھی نہ رہا اس میں کچھ آثار کہیں  
کھوٹا ہو اگر دام ہی اپنا یارو  
صراف کو پھر عیب بحث لیتے کیوں  
ذرا سے دیکھتے ہی یہ بدلی نظر تری  
من میں چھٹکی سیر چھپے گھٹ گیا ہے دل  
نین سکھ کو غالباً انعام اللہ خان یقین سے تلمذ حاصل تھا، کیوں کہ انھوں نے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے:

قول ہے حضرت یقین کا تب تو یوں کہتا ہے نین  
"بھر کے دل رو لیجیے یہ چشم گریاں پھر کہاں"  
اس شعر میں یقین کے لئے "حضرت یقین" کے تعظیمی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو یقین سے ان کے تلمذ کے گمان کو یقین کی سرحدوں تک پہنچاتے ہیں۔ انھوں نے یقین کے علاوہ سودا اور میر تقی میر کے مصرعوں کی بھی تعظیم کی ہے لیکن ان کے لیے ایسے تعظیمی الفاظ نہیں استعمال کیے ہیں:

راست ہے دنیا کا احوال، بقول سودا  
"ایک زنداں ہے کہ جہاں ہیں گرفتار کئی"  
اب کیا کہوں نصیبوں کو پہنچے، بقول میر  
"آید ہر تو ہم سے تم پھرے ادھر خدا پھرے"  
اس غیر محتمی داخلی شہادت کے علاوہ یقین سے ان کے تلمذ کا ثبوت کہیں سے نہ مل سکا۔ نین سکھ نے اپنے استاد کی مہربانیوں کا بھی برملا اعتراف کیا ہے:

ہر استاد کی سے دیکھو تو اس یقین کے تئیں  
شعر کہنے کا کبھی دھب نہ ہوا تھا سو ہوا

اس دیوان کی ترتیب کے وقت تک میں سکھ معمر ہو چکے تھے جس کا اشارہ متعدد اشعار میں ملتا ہے:

غنیمت ہے مجھ کو بزرگی یہ اتنی  
میں طالب ہوں تیرا اور تو جان من ہے  
ہو سکے سب ہو س دے لیکن  
بوڑھے کو کس طرح جوان کیجیے

نہیں سکھ نے اپنی شاعری کی وجہ جوازیوں بیان کی ہے:

دنیا میں یادگاری کو کمر تلے فکری نین  
اس کا بھی کوئی دلوں میں دیوان دیکھنا

ان کے نزدیک فکر سخن، نام کی بقا کا بہترین طریقہ ہے۔ اس شعر کی تخلیق کے وقت تک ان کا دیوان مکمل نہیں ہوا تھا۔ ”کوئی دلوں“ سے مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت تک وہ خاصی تعداد میں شعر کہ چکے تھے اور دیوان کی تکمیل کچھ ہی عرصہ کی بات تھی۔ نہیں سکھ شاعری کو فن شریف، قابلیت کی نشانی اور باعث افتخار جانتے تھے۔ انھوں نے صاحب سخن کو افلاطون کے ہم مرتبہ قرار دیا ہے:

جسے شعر کا شوق ہے رات دن  
وہ تو قابل ہے اس کی کیا بات ہے  
جو کوئی عصر میں ہے صاحب سخن  
اسے کیسے بے شک فلاطون زمن

نہیں سکھ ہندو مذہب کے پیروکار تھے۔ انھوں نے متعدد مقامات پر فخر یہ لکھا ہے اس کا اظہار کیلئے:

تبیخ، نماز اور روزے مجھ کو نہیں ہے کام  
میں بت پرست ہوں! مرا پہچان یہ سخن  
کیا ازل سے ہے مانع نے بت پرست مجھے  
کبھو بتوں سے پھروں میں، یہ تو خدا نہ کرے  
یہ مانگتا ہوں دعا روز حق تعالیٰ سے  
بتوں سوائے کہیں دل کو مبتلا نہ کرے

نہیں سکھ نے اہل دل، اہل حق، مردم آگاہ، حق آگاہ، دل آگاہ جیسی اصطلاحات بکثرت نظم کی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی صوفی کے صحبت یافتہ یا اس طرح کے ماحول کے پرورش یافتہ تھے۔ وہ عقیدہ ہمد کے پیروکار تھے۔ ان کے خیال میں انسان مجبور محض ہے:

جو حق کی رضا ہے، سو ہی سچ ہے  
جھوٹا ہے سب اختیار اپنا  
اپنی نظر تو نہیں خدا پر ہے، ہو سو ہو  
جو آن باز کھائے سولا چار دیکھنا

نہیں سکھ پختہ مذہبی عقائد رکھتے تھے اور خدا کی رزاقیت پر مکمل بھروسہ کرنے کے قائل تھے:

توئی رازِ حقیقی ہے جو دیوے سارے عالم کو  
ترے ثنائی کوئی یا سب کہاں داتا ہو پیدا  
مہانے مراد ہے کہ ہو کسی رہی چوب خشک  
سو سو دفعہ وہ چاہے تو اس کو ہری کمرے  
وہ خدا سے لو لگانے اور دنیاوی ہوا دہوس سے دور رہنے کو پسند کرتے تھے :

یہ تین سکھ تری یاد میں مسرور ہے دائم  
یا بار خدا اس کا یہ اطوار نہ چھوٹے  
جز نام خدا صرف نہ کرنا کبھی انفا س  
از بسکہ عبادت کا سرا ختام یہی ہے

نہیں سکھ نے زمانے کی بدلتی ہوئی قدریں، مفاد پرستی، ناپرسی، بے توقیری، ملیع سازی، سپاہیوں، علماء اور ہنرمندوں کی بے قدری، جاہلوں کی لاف و گزاف، پست لوگوں کا بلند ہو جانا، ہوس مال رکھنے والوں کا صاحبِ عزت در تہ ہونا اور عوام کو پریشان کرنے والے منصب داروں اور اہلکاروں کی جا بجا مذمت کی ہے :

یاروں میں جو یاری ہے سو سب بائیں میں ملو  
دنیا میں کہاں ہے کہیں کوئی یار کسی کا  
بخیلوں سے کیوں کر خوشی ہو تمہاری  
کمیوں کا ہے دور حضرت سلامت  
پلو چھے کوئی کسی کو یہ امکان ہی نہیں  
نا پرستی کا یہ دور انڈھا کھلا پھرا  
بے ہنسر ہو گئے ہیں اب ممتاز  
قا بلوں کا شمار کوئی نہیں ہے

نہیں سکھ کے کلام میں مکمل طور پر ہندوستانی فضا جھلکتی ہے۔ وہ دور از کار تشبیہات اور بعید از فہم استعارات سے کام نہیں لیتے، وہ سامنے کی چیزوں کو بطور تشبیہ استعمال کرتے ہیں۔ انسانی عزم و ہمت کو برا لگیختہ کرنے کے لیے اردو شاعری میں دیرپائے گنگا کو بطور مثال پیش کرنے کی اولین طرح غالبان ہی نے ڈالی ہے :

بڑھی جس کی ہمت بڑھا اس کا ٹھاٹ  
نہ مانو تو جا دیکھو گنگا کا پاٹ

ان کی شاعری میں محاوروں کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ انھوں نے جہاں محاورہ باندھا ہے تو پست و بلند کے تصور کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ شاعری میں سو قیام محاورہ یا پست و فحش لفظ استعمال کرنے سے قطعاً نہیں بچکپاتے :

گو کہ ہے آہ اپنی بے تاثیر  
پر رقیبوں کو ہینگ ہگاتی ہے

اپنی کرتے ہیں آپ ہی تعریف ان کے تئیں کو تو چوتیا کہیے  
انہوں نے اپنے کلام میں بہت سے غیر مانوس اور متروک الفاظ استعمال کیے ہیں جن کی فہرست درج  
ذیل ہے۔

آب اوزاں، آسیا، اچرچ، ادھوتر، اگری، اپاد۔  
بھونچیا، بھوتیا، بھاگن، بھنڈی، باٹ، بچنا، بھٹیک، بھائیں، باپھڑی، بے بند، بھیترا، بھید، بھاؤ۔  
پل، پاسیدھیا، پھلیل، پرات، پتچ ہار، پسیری۔  
جٹا، جھمکڑا، پھیرہ، پھیرا بند، پھیا، پھٹہ، چٹ لگن، چٹھی، چبنا، چھیکا، چھینا، چھٹ،  
چکرت، چچا۔

خجری، خندوں، خوگیر۔  
دہاڑہ، دھیا، دھندھوکاں، دھورا۔  
ڈنڈیل، ڈاہ۔

تری باب۔

روب، رپ، رنجک۔  
سرس، سرمور، سارنگ، سمر شہتوت، سہج، سیتی، سوگند، سربری۔  
شباشب، شینے، شفقی۔

غربال۔

فروئی۔

قلبتاں، قابو چیں۔

کھور، کٹی، بھیر بھاڑ، کھاج، کھنڈی، کانا، کپوت، کھان پان، کنگ، کئے، کھل، کپور، کام دارہ۔  
گنگور، گیھان، گھور، گھڑیاں، گوہد، گیپائی، گونیدے۔

مد جھڑا، ماٹ، مشرا، من ہرن، مشبک، مردنگ، مواشی، مستر، موگیا، مرنڈا۔

نت، نپٹ، نانکار۔

وار پار۔



ہاٹ۔

یرات۔

## مخطوطہ کی کیفیت

دیوان نین سکھ کا مخطوطہ  $91/2 \times 41/2$  سائز کے ۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ اوسط درجہ کے خط نستعلیق میں بظاہر مصنف کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے۔ نسخہ معمولی طور پر کرم خوردہ ہے۔ کاغذ، مثیالا دیز ہے اور کتابت سیاہ روشنائی سے کی گئی ہے۔ قومی عجائب گھر کراچی میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ اس کا نمبر ۱۵۴/۱ ہے۔ نسخہ کا آغاز غزلیات سے ہے۔ صفحہ ۳۵ تک الف، ا، ت، ن، ی، ر، ع، ف، و، ا، ل، ط، اور ک کی ردیفوں میں غزلیں ہیں۔ اس ضمن میں کسی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ صفحہ ۳۱ سے ۳۹ تک ۱۲۷ اشعار کی ایک مشوی ہے۔ اس کے بعد ی، ا، الف، ظ، اور ز کی ردیفوں میں غزلیں ہیں جن کا سلسلہ صفحہ ۴۳ تک ہے۔ صفحہ ۴۴ سے ۴۹ تک ۱۱ بند کا ایک مجلس شہر آشوب ہے۔ اسی صفحہ سے ایک سلسلہ شہر آشوب صفحہ ۵۵ تک ہے۔ اسی صفحہ پر ۱۳ اشعار پر مشتمل ایک غزل شہر آشوب ہے۔ صفحہ ۵۶ سے ۵۹ تک دس ی، ا، الف، ن کی ردیفوں میں ۶ غزلیں ہیں۔ اسی صفحے پر دو رباعیاں اور دو متفرق شعر ہیں۔ صفحہ ۶۰ اور ۶۱ پر ۱۲ فردیات اور چند مطلعے درج ہیں۔ صفحہ ۶۱ کے آخر میں بطور تہ قیہ صرف یہ عبارت درج ہے: ”خاتمہ بقلم نین“

دیوان نین سکھ کا یہ نسخہ ناقص الادب ہے۔ صفحہ ۱۵ کا آخری شعر ہے:

سائے کو میرے لیے جہاں میں

دامان اگرچہ ہو، تیرا ہی ہو

مذکورہ صفحہ کے آخر میں بطور ترک ”نکلا خورشید“ کے الفاظ درج ہیں جس کے مطابق اگلی غزل کا آغاز ”نکلا خورشید“ سے ہونا چاہیے، لیکن صفحہ ۱۶ پر نہ صرف مذکورہ ترک کے مطابق شعر نہیں ہے بلکہ اس صفحہ کا آغاز کسی دوسری نامکمل غزل کے اس شعر سے ہوتا ہے:

آیا کبھو نہ بر میں مرے پیار کر کے تو

اس آرزو میں عمر ہی ساری بسر کر دی

اس غزل کا مطلع اور بقیہ اشعار جس صفحہ پر درج تھے وہ ضائع ہو چکے ہیں۔

یہ دیوان مصنف کے قلم کا تحریر کردہ معلوم ہوتا ہے اور غالباً یہ اس کی بیاض ہے جس میں اس نے بغیر کسی ترتیب کے اپنا کلام تحریر کیا ہے۔ اس نے متعدد مقامات پر نظر ثانی، ترمیمات اور اضافوں کا عمل کیا ہے ترمیم و تنسیخ کا عمل مصنف کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ ترمیمات، تنسیخات اور اضافوں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

- ۱۔ پہلے اس طرح لکھا گیا تھا:
 

نجیبوں سے ہر گز خوشی نہیں تمہاری  
نجیبوں سے کیونکر خوشی ہو تمہاری

ترمیم شدہ :
- ۲۔ پہلی روایت :
 

ہر روز بھ کو عشق سے کیوں مانع ہوئے ہیں  
..... روکتے تو

ترمیم شدہ :
- ۳۔ پہلی روایت :
 

آسمان پھٹ کے گر پڑا سارا  
آسمان سارا ہو گیا غرباں

ترمیم شدہ :
- ۴۔ پہلی روایت :
 

بہتر ہے سب سے دوستی اللہ میاں کی نین  
بہتر ہے سب سے دوستی اپنی خدا کی نین

ترمیم شدہ :
- ۵۔ پہلی روایت :
 

باغ میں کیا مزا ہے جلنے کا  
جب تلک ساتھ گلےزار نہ ہو

ترمیم شدہ :
- ۶۔ دیکھتے ہی اس بات خوش خراماں کی طرف  
پھر کبھو ہرگز نہ آیا میں گلستاں کی طرف

شاعر نے اس مطلع کے پہلے مصرعے پر نظر ثانی کر کے لکھا ”دیکھ کر ایسا جھکا“ لیکن بعد میں اس ترمیم شدہ ٹکڑے کے آغاز و اختتام پر ”لا“ لکھ کر سابقہ قرأت ہی کو بحال رکھا ہے۔
- ۷۔ صفحہ ۲۱ پر ایک غزل درج ہے :
 

کس سیتی دل کا مدعا کیے ..... الخ

یہ غزل دس اشعار پر مشتمل تھی۔ شاعر نے بغلی حاشیوں میں چار اشعار کا اضافہ کیا اور بقیہ دس اشعار میں بھی جزوی تبدیلیاں کیں لیکن بعد کو اسی غزل کے سات اشعار منتخب کر کے انہیں صفحہ ۲۲ پر درج کیا گیا ہے اور صفحہ ۲۱ پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا ہے۔

اطلاقی خصوصیات : نین سکھ بے حد غلط نویس تھا۔ وہ اکثر الفاظ کو بے موقع توڑ کیا جوڑ کر لکھتا ہے۔ اس عہد کے بلکہ بعد کے عہد کے بعض شاعروں اور نقل نویسوں کے یہاں بھی اطلاقی خصوصیات ملتی رہیں۔ اور بیجان اور دلہیں ”تو تو ہمارے عہد کے بعض لوگ اب بھی لکھتے ہیں۔ خلیق انجم۔

## جوڑنے کی مثالیں :

ایدل (اے دل) ، مشکہ (مت کر) ، بیجان (بے جان) ، دلیں (دل میں) ،  
ساریعاً لکو (سارے عالم کو) ، بیشعوریکا (بے شعوری کا) ، بیطرح (بے طرح) ، جگمگھری (جس گمگھری)  
لوڈیونس (لوڈیوں سے) ، امصرعیر (اس مصرعہ پر) ، سچکہ (سچ کہ) ،  
توڑنے کی مثالیں :

چوبھا (چھپا) ، اٹھکھیل (اٹھکھیلی) ، لیجیے (لیجیے) ، خوش آمد (خوش آمد) ، کبھی وہ الفاظ کا املا  
یکسر تبدیل کر دیتا ہے مثلاً : عالم (عالم) ،  
ڈ، ژ اور ٹ پر چار نقطے لگاتا ہے : بڑھا (بڑھا) ، اڑاڑ (پھوڑا پھوڑا) ، پھوڑتے (پھوڑتے)  
طرّاق (طرّاق)

یاں کو یہاں اور واں کو وہاں لکھتا ہے۔

وہ کو دو بھی لکھتا ہے۔

پیش کی حرکت ظاہر کرنے کے لیے اکثر واؤ کا استعمال کرتا ہے، مثلاً : اوس (اُس) ، اون (اُن) ، ہائے  
مخلوط کو بعض جگہ حذف کر دیتا ہے، مثلاً سات (ساتھ) ، بات (ہاتھ) ،  
بعض الفاظ میں 'ہ' کا اضافہ کر دیتا ہے، مثلاً : بھوٹھ (بھوٹ) ، ترپھ (ترپ) ،  
ہائے مخلوط کو ہائے ہوز سے لکھتا ہے : پھر (پھر) ، پہل (پہل) ،  
غیر منقوٹ نون کی جگہ بھی منقوٹ لکھتا ہے، مثلاً : مین (میں) ، نہیں (نہیں) ، یون (یوں) ،  
گاف پر ایک مرکز لگاتا ہے، مثلاً : کر (کر) ، کریاں (کریاں) ، کریاں (کریاں) ،  
یائے مہول کی جگہ بھی یائے معروف استعمال کرتا ہے، مثلاً : کی (کے) ، بری (برے) ،  
کبھی یائے معروف کی جگہ یائے مہول استعمال کرتا ہے، مثلاً : دلدارے (دلدارے) ، نیلے (نیلے) ،  
دل آزارے (دل آزاری)

## زبان :

تذکیر و تانیث : دیوان کی زبان میں آج کل کے قاعدے سے اختلاف ملتا ہے لیکن کچھ اہم فعاں

اور جہاں کو مذکر باندھا ہے :

شمع کی آشنائی میں دیا آخر کو جاں اپنا  
 سناؤں کس طرح اس کو میں فریاد و فغاں اپنا  
 کہیں کہیں واد عطف کا استعمال عجیب نامانوس طور پر ملتا ہے  
 چاہو سو ہوو پر مجھے ایک بار دیکھنا

## افعال

دیوان میں افعال روا کی متعدد مثالیں ملتی ہیں :

قالبو میں آوتا تو نہیں ہے مرے رقیب  
 ہر نفس کو حیران کئے سوتے جگتے  
 ترے آنے کی خبر سن کے پیارے  
 آقا ہو کے بجاوتے مردنگ

ہندی کے مخصوص افعال یا مصادر سے بنے ہوئے افعال بھی ملتے ہیں : چبنا ، پھینکنا ، بھاگنا ،  
 چھینکنا ، نون غنہ کے حذف یا اضافے و احاد و جمع کے صیغے بعض مقامات پر خلط ملط کر دیے ہیں ، مثلاً :

اتنا ہیں سخن مان تو اک بار کسی کا

وہ تیرہ صدی جو سنے تھے بھی

دیوان میں جدید عہد کی زبان کے برعکس متعدد مقامات پر نون کا استعمال ملتا ہے۔ یہ عمل اسم ، فعل ،  
 حرف ہر جگہ پایا جاتا ہے :

میں نہیں تو اس کو خوب ہی زیر و زبر کیا

جھننے جبر کو چاہا دل اپناں ادھر کیا

متعدد مقامات پر ہائے ہونہ کے اضافے سے بعض الفاظ تلفظ کیے گئے ہیں :

اس قدر دل یہ نہ بے قرار نہ ہو

بولے ہو نہ کہیں مردم آگاہ غلط

ہائے غلوٹ کے اضافے سے بھی بعض الفاظ تلفظ کیے گئے ہیں : جھوٹ ، تڑپ ، ہونٹ

متعدد ساکن حروف کو متحرک استعمال کرتا ہے ، مثلاً :



مت مل بتوں سے مجھ سے یہ اکہ ذکر کیا

خک ہو گئے چوں برف کی ٹلی

عدل کے لیے وہ پھرے کو بہ کو

یہ کہہ کر کے جلدی بیٹھا یا امن

متعدد مقامات پر مخفف الفاظ کو مشدد تلفظ کرتا ہے :

تجھے ہتھوڑم میں ہم دیکھ کر یوں تاڑ جاتے ہیں

رحم ذرا بھی نہ لانا وہ دل آزار کہیں

ہر فن میں عیار ہو بس تم کو بھی دیکھا

حروف علت (وا، الف، ی) کے استعمال میں فراخ دلانہ آزادی کا ثبوت دیوان میں جگہ جگہ ملتا ہے مین سکھ

اکثر مقامات پر ان حروف کو دبا کر تلفظ کرتا ہے، لہذا دیوان کی قرارت کے دوران اس امر کو بطور خاص ملحوظ رکھا

جلے ورنہ متعدد اشعار خارج از بحر معلوم ہوں گے۔

ظفر اقبال

شعبہ اردو

لوکیو یونیورسٹی، جاپان

## غزلیات

کب دخل تری بزم میں ہو یار کسی کا  
 شکوہ نہ کراے دل کبھو زہار کسی کا  
 جو بات پتے کی ہو اسے سنتے ہی پی جا  
 یاروں میں جو یاری ہے سب باتیں سن لو  
 کھر کے ہے جگر نیچھ مرے، تیر کی مانند  
 مختار ہے اب نیکی بدی اچلے ہو کرے  
 اس بھانت ملے غیر سے پی پی کے قدح بھنگ  
 گیوں میں پھرے سیف نکالے ہے شب روز  
 دلداری تو ڈوبی ہے، دلازاری بھی مت کر  
 خوش کیجے کسو کو تو بھی آفریں بولیں  
 کہیے جو بھلے کی تو بری لگتی ہے بھ کو  
 تب جن دو فتح عشق کا ہووے تجھے معلوم

پھر نین تجھے دیکھے کوئی ایک نظر بھی  
 پھر کچھ نہ رہے اس کو سروکار کسی کا

تما شاہے اگر خلقت سبھی زردار ہو پیدا  
 نہیں ہو تو بلا سے مت کوئی دلدار ہو پیدا  
 نہ پوچھے کوئی کسی کو پھر عجب آزار ہو پیدا  
 پرا تانا تو کہیں ہو، موجب درکار ہو پیدا

ترے ثانی کوئی یارب کہاں داتا رہو پیدا  
تو ہر اک ذرہ سے تجھ کو ترا دیدار ہو پیدا  
یہ ممکن ہے کوئی تجھ سا پری رخسار ہو پیدا  
غنیمت ہے اسے تیری اگر بیگار ہو پیدا  
تو پھر بے شک قیامت کا وہاں آثار ہو پیدا  
زیں کو پھوڑ کر قصداً اگر صدمہ بار ہو پیدا  
بجائے خس اُدھر فوراً گل و گلزار ہو پیدا  
تو ہر اک حرف سے اس کے عجب تمکرات ہو پیدا  
ازل سے جو کوئی تجھ عشق کا بیمار ہو پیدا  
تو آنکھوں میں رقیبوں کے بڑا ہی غار ہو پیدا

اگر کوئی نین پاوے تجھ سخن کے طرز رنگین کو  
تو ہر مصرعے سے تیرے مطلع انوار ہو پیدا

توئی رازق حقیقی ہے جو دیوے سارے عالم کو  
یہی ہے آرزو دل میں کہ کر دے دیدہ روشن  
ہیں خوبصورت بہت اب بھی اور آئندہ بہت ہونگے  
نہ فرما غیر کو کچھ اب سو اتو اپنے طالب کے  
تمہے خوش قدم کی رفتار کی کو دیکھے سروگلشن میں  
یہ جتنا سبز ہے جگ میں نہ پاوے خطے کے بننے کو  
جدھر تو نانہ سے دیکھے، اٹھا کر چشمِ مخمور میں  
پڑھے کوئی شعر ناموزوں اگر قابل کی مغل میں  
بغیر از وصل کے، اس کی دو اینٹیں ہے طبابت میں  
اگر تو گاہ باشد پیار سے ہم سے ہنسے بولے

ہم نے تو اسے جیتے جی اس جان میں دیکھا  
یارو یہ تماشا میں بیا بان میں دیکھا  
چکر میں کہاں پر یہ مزاتان میں دیکھا  
یہ دور میں نے حضرت رمضان میں دیکھا  
بھونچتا میں نے چھوٹے شعبان میں دیکھا  
پر سب سے سر میں ہم نے مزاناں میں دیکھا  
ایسا تو میں نے سودا کے دیوان میں دیکھا  
اس فن کو میں حضرت شیطان میں دیکھا  
لطف یہ ترے اس لب خندان میں دیکھا  
یہ طور تما طفدکب نادان میں دیکھا

بہتوں نے جسے عرش پر بے جان میں دیکھا  
جنوں تھا ہم آغوشش یے لیلیٰ کو اپنی  
جاوے بھی پھر آوے بھی کئی شکل سے ہر بار  
خاقہ ہی رہے روزانہ کچھ کھانا نہ پینا  
سب رات لڑیں ٹوٹے پھچھو ندر کی لڑائی  
گو میوے ہزاروں ہیں اور ہیں نعمتیں لاکھوں  
ہر شعر تڑلے گا، ہر اک بات تماشا  
ہر نفس کو حیران کرے سووٹے جگتے  
کچھ بات کہے ہنس کے تو جھڑتے میں نرمے پھول  
ہنستے ہی کرے دیر نہ لڑتے ہی کرے دیر

گو سر و ترے قدم کا ساموزوں تو نہیں ہے  
پر کہنے کو لاچار میں بستان میں دیکھا  
جو چاہ زرخ نیچ گرا، پھیر نہ نکلا  
ایسا تو کئی بار میں ہر آن میں دیکھا  
کوچے کا گیا ترے کوئی پھرنا نہیں ہے  
میں خوب ہی کر غور گریبان میں دیکھا  
تھ چٹم کی تشبیہ کو درگس کا ذکر کیا  
سو بار اسے میں نے گلستان میں دیکھا

جس دم چن میں ہی سچ ہی تو نے گزر کیا  
بہل کی گل کی وصل میں کیا خوب بن گئی  
جب دور دور ظلم کا دیکھا ترا بیاں  
کیا تاب ہے رقیب کی ہوسا منے ترے  
واعظ کی بے شعوری کا میں کیا بیاں کروں  
سنے ہی سوخت ہو کے کہ میں نے سولے  
ملا ہوں گل رخوں سے تو میں اب آپ کو  
عاشق تو سب نڈر ہیں کو کے ہی بس کہتے ہیں  
بارے وہاں چشم ۱۹ سے پچکے ہی اٹھ گیا  
ہر چند ہم نے غم میں ترے چشم تر کیا  
جی دے چکا ہوں ہجر میں فریاد کی کروں  
نے خطا نے پیام نہ کچھ بھیجنا سلام  
آنے کی کہہ گئے تھے سو آئے بھے شتاب  
میر کیا تو سارا وہ برباد ہی گیا  
فرہاد سے غریب کو شیریں کے عشق نے

گل نے نثار تجھ پہ تمام اپنا زر کیا  
گویا بہم کسی نے یہ شیر و حکم کیا  
تب ہار کر کے یار میں آہن جگر کیا  
میں نے تو اس کو خوب ہی زیر و زبر کیا  
مت مل بتوں سے مجھ سے یہ اگر ذکر کیا  
جاخیریت سے دیکھ خدا کا میں ڈر کیا  
اس میں تری گرہ کا بتا کیا صبر کیا  
جن نے جدھر کو چاہا دل اپنا ادھر کیا  
میں بھی کلام طوں کو پھر مختصر کیا  
تجھ سنگ دل میں لیک نہ کچھ اشر کیا  
آہ و فغاں و نالہ ترے سب نذر کیا  
نے آپ ہی اب تلک کہہو ایدھر گزر کیا  
تارے ہی گنتے شام سے یاں تو سحر کیا  
تو نے جو کچھ کیا سو میاں خوب تر کیا  
رسوا کیا، شراب کیا، در بدر کیا

منزل کو اپنی ازود وہی پہنچتا ہے نہیں

جن نے کہ اس جہان سے عزم سفر کیا



کیا بے طرح سے جاتی ہے اک جان دیکھنا  
کیا حسن کیا غرور سے آتا ہے بے نظیر  
انداز اس کی خوبی کا کہتے نہ بن سکے  
غنجہ دہن کا سیر کرد شوق سے لیکن  
منظور اپنی طبع کو ہرگز نہیں ہے یہ  
کمر کے خضاب ڈاڑھی کو نکلا ہے آج شیخ  
یا ر و خدا کے واسطے یہ آن دیکھنا  
اس شوخ دلربا کی ٹٹک اک شان دیکھنا  
ٹمکھڑے پہ اس کے زلف پریشان دیکھنا  
چاہ زنج ہے آ کے ہر بان دیکھنا  
مجنوں کو دشتِ نیلچ میں حیران دیکھنا  
اس بے چا کی صورتِ شیطان دیکھنا  
دنیا میں یادگاری کو کرتا ہے فکرِ نیتن  
اس کا بھی کوئی دنوں میں یہ دیوان دیکھنا

کیا اس کو لکھوں پیام اپنا  
اس دل نے کیا ہے کام اپنا  
چاہوں نہ ترے سوا کسی کو  
دیتا ہے گلوں کے تئیں طراوت  
افسوس تری گلی میں ہم نے  
دل ریلی کو دے کے دشت میں جا  
پھندے میں یا مجھے بُھا کر  
بے مفت میں مجھ سے نقد دل کا  
لینا ہی نہیں سلام اپنا  
اس بت کو کیا ہے نام اپنا  
شیوا ہے یہی مدام اپنا  
یاں تک ہے یہ تر، مٹام اپنا  
قصہ ہی کیا مٹام اپنا  
مجنوں نے کیا ہے نام اپنا  
یہ زلف کیسے ہے دام اپنا  
مفسد لے کیا طعام اپنا  
تس پر غضب کہ نین وہ شوخ  
سنتا ہی نہیں کلام اپنا

یار کا وصل شبِ شب نہ ہوا تھا، سو ہوا  
لے چکا دل کو وہ مجھ ہاتھ سے تہی زکے ہا  
جور اور ظلم سے دنیا میں یہ خواباں کا اسم  
ساعز عشق لبالب نہ ہوا تھا، سو ہوا  
اس قدر تیرا مطالب نہ ہوا تھا، سو ہوا  
بے وفائی کا مقلب نہ ہوا تھا، سو ہوا

کرنا تسخیر ہر اک دل کو دواک باتوں میں  
 روز لگتا ہے ترے کان سے جا جا کے قریب  
 غیروں کی، بر میں ترے اب تو یہ کچھ کثرت ہے  
 اس طرح کا بھی عجائب نہ ہوا تھا، سو ہوا  
 کسو کا اتنا مراتب نہ ہوا تھا، سو ہوا  
 یعنی ہر کوئی مہادب نہ ہوا تھا، سو ہوا  
 ہر استاد کی سے دیکھو تو اس نین کے تئیں  
 شعر کہنے کا بھی ڈھب نہ ہوا تھا، سو ہوا

مل جائے کہیں وہ یار اپنا  
 جب بات کہے ادا سے ہنس کر  
 یار ب ہو کہیں شتاب ایسا  
 مدت سے پڑا ہوں بس میں اس کے  
 آتی ہی نہیں زباں سے اب بات  
 جو حق کی رضا ہے، سو ہی سچ ہے  
 کیا جا کے کروں گلی میں تیری  
 تس پر یہ رقیب کی شرارت  
 کر رکھوں گلے کا ہار اپنا  
 کر ڈالوں یہ دل نثار اپنا  
 دیکھوں میں وہ نو بہار اپنا  
 جادو ہے وہ گلزار اپنا  
 یاں تک ہوں میں شرمسار اپنا  
 جھوٹا ہے سب اختیار اپنا  
 کچھ بھی تو نہیں شمار اپنا  
 دکھلاتا ہے مجھ کو پیار اپنا  
 اس دوستی پہ نہ بھولیو نین  
 دشمن ہے یہ درکنار اپنا

ناگن ہے زلف یار نہ نہا رہ دیکھنا  
 کہتے ہیں لوگ مجھ سے یہ کھا کھل کے اب قسم  
 شیریں دہن نہ بوجھو، ہیں شہد کی چھری  
 کہتا ہوں در جواب انھوں کے میں رو برو  
 قابو میں آتا تو نہیں ہے مرے رقیب  
 اڑاڑ کے کاٹتی ہے خبردار دیکھنا  
 خو خوار ہے یہ شوخ ستمگار دیکھنا  
 ہنس ہنس کے جان لیں ہیں یہ اٹوار دیکھنا  
 چاہو سو ہو پیر مجھے اک بار دیکھنا دے  
 کہیں داد بن گیا تو میرے یار دیکھنا

شانہ سمجھ کے کیجیو زلفوں کو اپنی یار  
دل خوش ہوا کہیں تو پھر اپنا یہ ہے شعار  
ابھاسے اس میں دل یہ گرفتار دیکھنا  
جا کر کے باغ میں گل و گلزار دیکھنا  
اپنی نظر تو نین خدا پر ہے، ہو سو ہو

جو آن باز کھائے سو لاچار دیکھنا

نہیں ہے تجھ کو کوئی دوسرا ب دستاں اپنا  
جہاں میں جستجو کی سب عمر پر اب تلک ہم نے  
بجھ پر واز پر یار و بڑا افسوس آتا ہے  
خبر لے کے جلدی اپنے عاشق دیدہ گریاں کو  
گئی آخر وفا ہو کر کے ایسی گل کے ہاتھوں سے  
مجھے اس فصل گل میں ہر گھڑی حسرت یہ آتی ہے  
ترا اندوہ درد اور فکر حسرت اس میں رہتے ہیں  
تجھے بھوم میں ہم دیکھ کر یوں تاڑ جاتے ہیں  
کہ جس کو درد دل جا کر سناویں اے میاں اپنا  
نہ دیکھا قدرت داں اپنا نہ کوئی ہیراں اپنا  
شمع کی آشنائی میں دیا آخر کو جہاں اپنا  
وگر نہ سوخت ہوتا ہے ابھی دل شمع ساں اپنا  
چمن میں پھیر بیل نے نہ دیکھا آشیاں اپنا  
کسو کو بھی کیا مٹوں نہ تو نے باغباں اپنا  
عجب ترکیب سے آباد ہے یہ خانماں اپنا  
کہ جیوں لشکر میں بولیں دور سے وہ ہے نشان اپنا

وہ دل دیتا نہیں ہے نین ہرگز اپنی باتوں پر

سناؤں کس طرح اس کو میں فریاد و فغاں اپنا

وہ یار ہم سے خفا ہے تو ہو، ہو اسو ہو  
اگر رقیب شرارت سے باز نہیں آتا  
ہر اک بات میں تم کیوں اچھتے ہو یارو  
یہ سارا قہنیہ تو ہم سے ہے اس سے تم کو کیا  
ہم اپنا آپ ہی کر لیں گے انفعال اس سے  
یہ سب لڑانے کی باتیں ہیں تم جو کرتے ہو  
ہیں تو یار سو اپنے تمہیں کسو سے کام  
رنگا ہے اب تو زمانے نے خوب کالا رنگ  
پھر اس کا قہہ ہی کیا، جلنے دو ہو اسو ہو  
بلا سے اپنی کنوئیں میں پڑو، ہو اسو ہو  
دیکھو یہ مفت گدھے مت چڑھو، ہو اسو ہو  
تم اپنے ایک طرف ہو رہو، ہو اسو ہو  
ہمارے نیچ کوئی مت پڑو، ہو اسو ہو  
ذرا تو خیر کا کلمہ کہو، ہو اسو ہو  
برا کسی کو لگے تو لگو، ہو اسو ہو  
یہ لال، زرد دکھائی کرو، ہو اسو ہو

گر ان باتوں سے تری نین پیش نہیں جاتی

تو پھر بے ہودہ کیوں کہتے ہو، ہو اسو ہو

خدا کے واسطے چکے رہا، ہوا، ہوا، ہوا  
 کسی کے کان میں کچھ مت کہو، ہوا، ہوا، ہوا  
 کسی سے فعل جنت مت لڑو، ہوا، ہوا، ہوا  
 کہیں خدا کے غضب سے ڈرو، ہوا، ہوا، ہوا  
 کسی سے قضیہ نہ ہو دیکھو، ہوا، ہوا، ہوا  
 طبیب مفت میں رسوا نہ ہو، ہوا، ہوا، ہوا  
 سزا ہے، غوطہ ذرا کھانے دو، ہوا، ہوا، ہوا  
 کہا بلا سے مری، کوئی مرو، ہوا، ہوا، ہوا

اگر نفیب میں ایسا ہی کچھ لکھا ہے نین

تو پھر بس ہمیں لاچار، تو، ہوا، ہوا، ہوا

بے واسطہ کو زخم وہ سینے پہ کھا پھرا  
 جو کوئی پھرا، سو واں سے نہایت خفا پھرا  
 اپنا سا میں کروڑ جگہ آذما پھرا  
 ناپڑسی کا یہ دور انوکھا بھلا پھرا  
 ایدھر تو ہم سے تم پھرے اور خدا پھرا  
 ہر بت کو دیکھت ہوں تو وہ بھی بھلا پھرا

بیغا مبر کے آنے کا مستند نہ کر خیال

دیوار قہقہہ کا نہ کوئی گیا پھرا

گویا بنگالہ کا گھر اس کے خزانہ آیا  
 قبضہ میں اس کے تمام حاصل کا مار، آیا  
 بھوکے کو جیسے کہیں سے گویا کھانا آیا  
 کچھ نہ کچھ یاد تھے وہ نہیں بہا نہ آیا  
 لازم ہر ایک کے تئیں شمع جلانا آیا

جفا کا اس کی گدہ مت کرو ہوا، ہوا، ہوا  
 نئے گا وہ تو خفا ہوگا پھر نئے سرے  
 یہ گفتگو جو کرو ہو سو کچھ بھلی نہیں ہے  
 مجھے تو پاک محبت ہے، امت کرو بدنام  
 پھرے ہے وہ تو پیر سیف نے ارے یاد  
 یہ مرض عشق ہے اس کی دوا کرو موقوف  
 گرا جو چاہ زنج میں کوئی، تو یوں بولا  
 سنا جب ان نے فلانا تو رنج، مر ہی گیا

تیری گلی میں جو کوئی دھوکے سے جا پھرا  
 کیا جانے کیا بلا ہے ترے کوچے میں صنم  
 ہے نام آشنا کا لیکن آشنا کہاں  
 پوچھے کوئی کسی کو سو امکان ہی نہیں  
 اب کیا کہوں نصیبوں کو پسچ ہے بقوں میر  
 میرا تو دل پھرا تھا برہمن کی شکل سے

جس کے گھر ناز سیتی چل کے وہ جانا آیا  
 لطف سے جس کو شہ حسن کا نامہ آیا  
 چٹٹی دل کی بھی یار کے دیکھے سے یوں  
 چاہا جب میں نے، کہوں تجھ سیتی مطلب پنا  
 فوں بہائے گا یہ پروانے کے جی کا جب تو



لاکھ سربارو اگر تو بھی نہ پوچھے کوئی  
آنکھوں کے دیکھتے یہ زور ہی زمانہ آیا  
گھر بہ گھر بھرنے کی عادت ہے تری جیوں خوشید  
مہر سے بین کے گھر لیک نہ آنا آیا

ذرا کیجیے غور حضرت سلامت  
مناسب نہیں ہم غریبوں کے اوپر  
تمہیں پھوڑ کر اب کہیں درد کس سے  
نہیں جانے تم ہوا ہم کسی کو  
ہر اک دانے میں دل پڑے دیکھتا ہوں  
اسی آستانے بغیر ہم کو جگ میں  
لگائی ہے صندل کی تم نے جہیں پر  
نہیں بولتے ہم سے، سو کیا سبب ہے  
نجیبوں سے کیوں کر خوشی ہو تمہاری

بس اب کیجیے معاف دیکھیں تماشا  
نکلتی ہے گنگور، حضرت سلامت

کسو کی عقل میں آیا نہیں یہ راز ہنوز  
اور سب ماتی نے تیری تو بنائی تصویر  
شمع رو دیکھ ترا، ہوئے شمع شرمندہ  
ہو گیا آہ سے میری تو متک سب عرش  
حشر تک دید میسر ہو ترا، سو معلوم  
چرخ ظالم کی خوشامد تو بہت کی لیکن  
کہ دیے آن میں سو نعت، جگر کے میرے  
غیر کے بریں میں دیکھوں ہوں پٹ خوش چھو کو

مرغ دل کس لیے کرتا ہے یہ پرواز ہنوز  
پر درست ہونہ سکی پہرے کی پرواز ہنوز  
کہیں دیکھا نہ سنا کوئی ترے دم ساز ہنوز  
لیک پہنچی نہ ترے کان تک آواز ہنوز  
پر کیے جاتا ہوں، اپنی سی نگہ تازہ ہنوز  
ظلم اپنے سے نہ آیا کبھو وہ باز ہنوز  
تیغ ابرو کا عجب کاٹ ہے طنائہ ہنوز  
ہم سے ہر بات میں قیصے کا ہے آغاز ہنوز

جفا و جور ہی سمجھیں ہیں دلتاں افسوس  
 شمع کو جلتے، نہیں دیکھ سکتا پروانہ  
 سنی نہ تم نے کبھو دل کی داستاں میری  
 کرم رقیبوں کے اوپر، ستم غریبوں پر  
 ترا یہ بوس و کنار ہم کو کیوں کہ ہو حاصل  
 جو مدعا ہے مرے دل کا مستر یار و  
 و فلکے نام سے بھاگیں ہیں یہ بتاں افسوس  
 تصدق ہو کے وہ دیتا ہے اپنی جاں افسوس  
 یہ کہتے کہتے گئی ساری گھس زباں افسوس  
 یہ دیکھتے ہی گیا مجھ کو جاوداں افسوس  
 زمین سخت ہے اور دور آسماں افسوس  
 کمرے ہے آہ اسے فاش ہر زباں افسوس

سب اپنی غرض کے ہیں نین یار دنیا میں  
 نہیں کسو کا کوئی دوست، مہرباں افسوس

ہیں تو تحقیق بھی یہ بت گمراہ غلط  
 راز اس عقدہ لاصل کا کوئی پاتا نہیں  
 نہ سنا آج تلک ہم نے کسو کے منہ سے  
 جو کہیں بات زباں سے سو ہے پتھر کی ٹکیر  
 آنا تیرا تو مرے یار بعلم عند اللہ  
 لمبی پوششیں انھوں کی ہے مع وجاہ غلط  
 کیوں کمرے ہے میرے حق میں مری آہ غلط  
 بولتے ہوں کہیں مردم آگاہ غلط  
 کب کہیں حق میں کسو کے جو دل آگاہ غلط  
 لوگوں کے منہ کی ہے سب طرح یافواہ غلط

دیکھنے سے تو کبھو بھی نہ ہٹے دل ہر گز  
 نین ہر گز تو دل اپنے میں گمراہی مت را  
 گزرنیچ نہ ہو دے ترے یہ چاہ غلط  
 حرف بے جا کہے کوئی تجھ کو گمراہ غلط

دلدار ہونا خوش، اب دل کا خدا حافظ  
 خنجر سے مڑہ کے یہ سب سینہ کیا زخمی  
 کس طرح کوئی جیتے، ناداں سے پڑا پالا  
 غیروں سے چلتا ہے، یاروں سے چلتا ہے  
 اپنی ہی وہ کہتا ہے پراور کی نہیں سنتا  
 نظروں میں لگا لڑنے بس کا خدا حافظ  
 کچھ بس ہی نہیں چلتا گھائل کا خدا حافظ  
 بے طرح کی خواری ہے، عاقل کا خدا حافظ  
 چھوٹے ہی چلتا ہے، چنچل کا خدا حافظ  
 ہر اک سے الجھتا ہے، جاہل کا خدا حافظ

شکل کی خبر آئی، آتا ہے لیے لشکر  
گلشن میں پڑی کھل بل ابل کا خدا حافظ  
میں تجھ کو نہ کہتا تھا، امت تین بتوں سے مل  
دل دے کے ہوا سوا بے دل کا خدا حافظ

اتنا سکے ہے آپ کو گرچہ جلائے شمع  
مردا قدم ہے یار جسے سوز اور گداز  
لگ جائے ماہ رو کا اگر ہاتھ ناز سے  
شعلے کو تیرے نور کے کہیں دیکھ لے اگر  
پردے میں مارے شرم کے لاچار ہے وہ  
کہہ کیا خیال تھا کہ یہ پروانے کی طرح  
کیا تاب اک قدم بھی تجھ آگے وہ چل سکے  
جی لیتے ہی ڈرے ہے نہ جی دیتے ہی ڈرے  
پروانے کے فداق کو تو بھی نہ پائے شمع  
پہلے ہی سب سے نرم میں کیوں نہ لے شمع  
کب پیرہن میں اپنے خوشی سے سمائے شمع  
خاطر میں پھر کسی کو ذرا بھی نہ لائے شمع  
پروانہ پاس پہنچے ابھی پر لگائے شمع  
یوں مفت جی جلائے دیا تو نے ہائے شمع  
خدمت میں تیری رہوے کھڑی ایک پائے شمع  
کیا جانے کچھ یہ کیسی ہے یار و بلائے شمع

مت پوچھ راز شوخ کا تو نہیں اور مے

کس واسطے کہ کون ہے محرم، سوائے شمع

دیکھتے ہی اس بت خوش قد خراماں کی طرف  
جو کہ غفلت میں پڑے ہیں سو تو ہیں سب بے نصیب  
زندگی جن کے تئیں گو تھی نہ ٹک کر کے عزیز  
بعضوں نے چاہا کہ ہم بھی دیکھ لیں تو کچھ بنے  
جب نظر آئی ترے کوچے میں کٹی بھیڑ بھاڑ  
رپ گئے عاشق ترے دل کے جو کوئی مرد تھے  
عاشقی کچھ خانہ خالہ نہیں سو پیش جائے  
یاد میں اس کی فنا ہو اور خودی کو چھوڑ دے  
پھر کبھو ہرگز نہ آیا میں گلتوں کی طرف  
اب تلک ڈالے پڑے ہیں سر گریلوں کی طرف  
ہے تو دوڑے پیونے کو آب حیاں کی طرف  
اٹھ چلے ہے دیکھنے کو تیرے بتاں کی طرف  
بزدلے جی لے کے بھاگے تب بیاہاں کی طرف  
پل گئے چالاکی سے زلف پریشاں کی طرف  
سر کے بدلے دیکھنا ہے ماہ رویاں کی طرف  
تب میسر ہوئے تھے کہیں وہ تاباں کی طرف

اس حقیقت کو تو جانیں نہیں جو ہیں اہل دل

خیر خواروں کی ہے حرکت آب اوزاں کی طرف

طاقت نہیں سخن کی جو پہنچے زباں تلک  
 ہر چند جی میں غور کیا میں جہاں تلک  
 میری تو دوڑ رہے گی ترے آستان تلک  
 پر ہو ویں تو بھی اٹکے نہ پہنچوں وہاں تلک  
 دشوار ہے پہنچنا ترے خانماں تلک  
 آہ و فغاں گئی ہے مری آسماں تلک  
 ایسی گئی کہ پھر نہ پھری آشیاں تلک  
 کس کس خوشی سے جلیے پھر بوستان تلک

کہنا کسی کا یار ترے بھاد میں ہی نہیں  
 اس داستاں کو نہیں کہے اب کہاں تلک

دوری سے تیری یار بڑھا ضعف یہاں تک  
 تجھ ہجر کا تو ہے ہی نہیں انتہا کہیں  
 اس ماجرا کو جگہ کے کہوں کس کے روبرو  
 میں ہوں نہیں پرہ اور فلک، شمتیں پہ تو  
 کیا منہ ہے تیرے کوچے میں جاوے کوئی صنم  
 اب تو پہنچ رہے گی ترے کان میں کبھو  
 گل کے ستم کی ماری چمن سیلتی عندلیب  
 آوے بہار جلدی سے ایسا خدا کمرے

بھیتر سینے کے ٹکڑے ہو کر بھٹ گیا ہے دل  
 تب سے سبھی طرف سے مرا ہٹ گیا ہے دل  
 پر خال و خط میں جا کے ترے بٹ گیا ہے دل  
 یاں تک ترے خیال میں اب ڈٹ گیا ہے دل  
 من میں چھٹکی سیر چھپے گھٹ گیا ہے دل  
 یہ بات سن کے یار نہٹ چھٹ گیا ہے دل

جیسا ہے سبز خط تیرا اور شوخ چشم  
 ان دونوں نے بیچ آ کے میرا لٹ گیا ہے دل

تھریخ کی نگہ سے مرا کٹ گیا ہے دل  
 جب سے جمال تیرا میں دیکھا ہے اے صنم  
 انداز ناز قہر ہے اس کے نہ میں کہوں  
 آگے کو بڑھ سکے ہے نہ پیچھے کو ہٹ سکے  
 ذرا سے دیکھتے ہی یہ بدلی نظر تری  
 ہوتا ہے شرب کو جاکے ہم آغوش غیر سے

کیا کہوں ہے ہی نہیں جگ میں وہ زہار کہیں  
 بچے رہتے ہی نہیں ابرو سے خم دار کہیں  
 کب ہٹیں دیکھ کے یوسف کو خریدار کہیں

چاہتا ہوں کہ ملے یار و فسادار کہیں  
 ہر گھڑی زخم کریں سینے پر تیغ کی مثال  
 سیم و زر سے لے کے دوڑیں ہیں خبر سن کر



بعد مرنے کے کہیں ہیں ملے دیدار کہیں  
یعنی دیکھے ہی نہیں ایسے طرح دار کہیں  
ورنہ بے مہری کریں کیوں مرے دلدار کہیں  
گل سے خالی نہ رہے جگ کا گنزار کہیں  
چنگا ہوتا نہیں تجھ چشم کا بیمار کہیں  
رحم ذرا بھی نہ لایا وہ دلازار کہیں  
رتی بھر بھی نہ رہا اس میں کچھ آثار کہیں  
بار دیگر نہ کسے پھر کوئی تکرار کہیں

یہ جو کچھ جو دجفا تم نے کیا نیناد ہر  
ایسا کوئی کرتا ہے بتلاتو بھدایا کہیں

جیتے جی منزل مقصود کو پہنچو سو بخیر  
جو ملے سو ہی جفا پیشہ، ستم گرد، بیدرد  
کم نصیبی سے کو طرح نہیں ہے چارہ  
آمد اور رفت ہے دنیا کی کبوتر خانہ  
واحم المصن شفا پاوے یہ تو ممکن ہے  
کم لنگا ہی سے یہ ظالم نے کیا غارت دل  
وہ جو اک تو لہ کئی ماشہ تھی یاری تم سے  
وہ واہ چاہے ایسا ہی تمہیں رحمت ہے

بھستتی چھوٹے عشق ہے امکان یہ سخن  
میں بت پرست ہوں مر بہچان یہ سخن  
آخر کو کھو رہا ہے تری جان یہ سخن  
میں ان کا دکڑا، ہوں مری جان یہ سخن  
کہنے لگا کہ کیا ہے ہمدان یہ سخن  
یہ بے وقوف ہے جو کہے آن یہ سخن  
اکثر کے کہ گئے ہیں قدر دان یہ سخن  
جب منہ سے یار کے پڑا مجھ کان یہ سخن

بہتر ہے سب سے دوستی اپنی خدا کی نین  
فعل بحث ہے یاری، گیکہاں یہ سخن

ناصح نہ بک زیادہ مرا مان یہ سخن  
تبلیغ، نماز، روزہ سے مجھ کو نہیں ہے کام  
ہر روز مجھ کو عشق سے کیوں روکتا ہے تو  
دلدار دلربا ہیں مرے دل کے مشتری  
اتنے میں میرا یار مرے پاس آگیا  
اس بے حیا سے کا ہے کو خالی کرد ہو مغز  
طالب کو معرفت کے سبھی چیز ہیں معاف  
القصد ہو خوش، کیا میں نے یہ یقین

دیکھ لو خوش ہو کے یاراں یہ بہاراں پھر کہاں

فضل گل میں ہر گھڑی یہ ابرو باراں پھر کہاں

ہے سعادت قمریو اس کے تصدیق ہو چلو  
ورنہ کوئی دن کو یہ سر و خراماں پھر کہاں  
آج آتی ہے نظر مجھ دل کے شیشے میں پری  
دیکھ لو لحظہ میں یہ صورت نمایاں پھر کہاں  
میں چمن میں پنی کے مے کو اس لیکے تا ہولیر  
کون جانے سا قیا یہ گلغداراں پھر کہاں  
قول ہے حضرت یقین کا تب تو یوں کہتا ہے نین  
بھر کے دل رو لیجیے یہ چشم گریاں پھر کہاں

جن نے مجھ دل کو لیا کل تھا چڑا آنکھوں میں  
آج پھر بھی وہی آتا ہے چلا آنکھوں میں  
یارو اس شوخ کی حرفت کا بیاں کیا کیجیے  
نہر کو ممنون کیا رہ کے ذرا آنکھوں میں  
رحمت ہے آفریں شاہ تری دانش کو (۴)  
غرض ملنے کی مرے ہاڑ گیا آنکھوں میں  
رفت اور روبر میں مرگاں سے کیا ہے گھر کو (۴)  
کیا بنائی ہے ترے واسطے جا آنکھوں میں  
تجھ سو اکون ہے ایسا کہ جسے میں چاہوں  
تو ہی بستا ہے میرے یار سا آنکھوں میں  
کیوں نہ ہر ایک کے ملنے میں کرے یار حجاب  
وہ تو دکھتا ہے پیٹ شرم و حیا آنکھوں میں

روئے وہ مرد یک دیدہ اگر تجھ کئے نین  
ہو کے بیتاب۔ ہی کہیو کہ آ آنکھوں میں

دیکھ کر حسن یار آنکھوں میں  
ہو گیا بے قرار آنکھوں میں  
چشم تیری کو دیکھ کہتا ہوں  
خوب پھولی بہار آنکھوں میں  
اک نظر تجھ کو دیکھتے ہی میاں  
بڑھ گیا انتظار آنکھوں میں  
نغمہ چہ تقصیر دل کی ثابت نہیں  
پھر یہ کیوں ہے غبار آنکھوں میں  
کب زباں سے کہوں مرے اس کے  
ہو گیا جو شمار آنکھوں میں  
بعدت مدت کے میں ملا اس سے  
وہی پایا ہے پیار آنکھوں میں

نین اپنے کو کیوں ستاتے ہو  
آکے بے اختیار آنکھوں میں

جواب منع کی ہے اسے کہیے کیوں  
 کھوٹا ہو اگر دام ہی اپنا ایا رو  
 خطرہ ہے مرتججی کا سمجھ دیکھ تو جی میں  
 جس بستی میں انصاف کا کہیں نام نہ ہووے

جوشے کہ حرام ہے گی اسے کہیے کیوں  
 صراف کو پھر عیب بحث لیے کیوں  
 جو راہ کہ مرتے ہوں ادھر جیے کیوں  
 اس بستی میں پھر فعل بحث رہیے کیوں

بات اپنی پیش نہ جاتی ہووے  
 بے فائدہ پھر بولنا وہاں چہیے کیوں

دیکھے نہیں کو کو تو پھر لیجیے بھی نہیں  
 تو قیر حسن شرط ہے دل دینے کے لیے  
 ہووے اگرچہ اپنی شرافت اوپر نگاہ  
 ایدھر سے سیتے جاؤ ادھر سے پھٹ جائے

نیکی نہ بن سکے تو ہدی کیجیے بھی نہیں  
 گر حسن ہی نہ ہو تو کھو رہیجیے بھی نہیں  
 ہرگز بدی کے کام پر دل دیجیے بھی نہیں  
 ایسے طرح کے کپڑے کو پھر لیجیے بھی نہیں

گر نام بھی نہ ہو تو بحث چھیے بھی نہیں  
 یکبارگی بھڑک کے کھو کیجیے بھی نہیں

مے کا مزا بھی ہے کہ جب ماہ رو ہو پاس  
 گر ماہ رو نہ ہووے تو مے پیجیے بھی نہیں

یار کے دل میں گر پیار نہ ہو  
 اس صنم سیتی پھر ملیں کیا خوب  
 پرچ کہہ بلبیل تو کیا کرے گل کو  
 جو کہ دل کینہ دار ہے اس کا

اس قدر دل یہ بے قرار نہ ہو  
 دل میں اپنے اگر غبار نہ ہو  
 باغیاں گر خود اختیار نہ ہو  
 عاشقوں میں کبھی غمسا نہ ہو

کیا مزا ہے شراب پینے کا  
 دیکھے آٹھ کھیلی سے تجھے چلتے

جب تلک پاس گلندار نہ ہو  
 کیوں نہ پھر سرو شرمار نہ ہو

فعل بحث بول جھڑندگی کو نہیں  
 بس میں اپنے اگر چہ یار نہ ہو

کہی نہیں جائے آہ، مت پوچھو  
 اس شکر لب کے کچھ نہیں بھائیں  
 مفت مرنا ہے اس کے کوپے میں  
 ہنس کے بولیں نہیں ہیں غنچہ دہن  
 کسی نے بھر عشق کی اب تک  
 شوق میں تیرے پھرتے ہیں گھر گھر  
 لگی ہے چوٹ، چاہ مت پوچھو  
 ہنسے ہے قاہ قاہ مت پوچھو  
 کوئی ادھر کو راہ مت پوچھو  
 یا پھڑے واہ واہ مت پوچھو  
 نہیں پائی ہے نقاہ مت پوچھو  
 روز و شب ہر وہاں مت پوچھو  
 نین کو آرزو ہے ملنے کی  
 خواہ کوئی پوچھو، خواہ مت پوچھو

بڑی ہی یار ہے گی خند تم کو  
 ملنا اس قدر کس سے سیکھا  
 کیا تم نے اگر قتل عاشقوں کو  
 نہیں رکھتے ہو تم خاطر کسو کی  
 یہ باندھا جب سے تم نے سرخ چیرا  
 یہ باعث ہے تمہارے سبز رنگ کا  
 کہے کیوں کر نہ خلقت رند تم کو  
 کہو سچ، حق کی ہے سو گند تم کو  
 کہے گا کون پھر دلبند تم کو  
 کہا میں سودفعہ ہر چند تم کو  
 کہیں ہیں لوگ چیرا بند تم کو  
 کرے ہے پیار سارا ہند تم کو  
 کہا اب نین کا کاہے کو مانو  
 چڑھی ہے بھنگ یہ بے بند تم کو

دل کو سمجھاتا ہوں میں ہر بار ہونا ہو سو ہو  
 بات کہنے سیتی پرانی ہوئے یہ تو جان لے  
 خود پسندی چھوڑ دے اور تبلیغ کوئی ترک کر  
 بھ کو تیرے دیکھنے کی غرض ہے اور کچھ نہیں  
 شوق اور نہ خیر کو خاطر میں یاں راتا ہے کیوں  
 خبر دیوں سے نہ مل نہ ہار ہونا ہو سو ہو  
 راز دل کا مت کرے اظہار ہونا ہو سو ہو  
 اس میں ہرگز مت کرے سکھار ہونا ہو سو ہو  
 کوئی اگر رسوا کرے بیکار ہونا ہو سو ہو  
 میں تو دیوانہ ہوں تیرا یار ہونا ہو سو ہو



دلف کے زنداں میں یار دیکھا پڑا اندھیر ہے  
 چھوٹنے سے کچھ نہیں سرکار ہونا ہو سو ہو  
 واسطے میرے نہ کیجو کوئی معالج کا تلاش  
 نرگسی چشموں کا ہوں بیمار، ہونا ہو سو ہو

یہ جان اگرچہ ہو تو تیسرا ہی ہو  
 تازیت کسی کا بار احسان نہ لوں  
 دلوں ناچیز، کیا گدا اور کیا شاہ  
 بیمار عشق کا نہیں کوئی طبیب  
 قسربان اگرچہ ہو تو تیسرا ہی ہو  
 احسان اگرچہ ہو تو تیسرا ہی ہو  
 فرمان اگرچہ ہو تو تیسرا ہی ہو  
 درمان اگرچہ ہو تو تیسرا ہی ہو

سائے کو میرے لیے جہاں میں

دامان اگرچہ ہو، تیسرا ہی ہو

عاشقوں کا تو یہ احوال ہے دلدار کے ساتھ  
 سلطنت ہند کی سب بخش دوں اس دم یارو  
 میرے اور اس کے کوئی بیچ میں ہرگز نہ پڑو  
 خویاں گو کہ ہزاروں ہیں جہاں میں لیکن  
 کبھی پوشیش چلے جس طرح سردار کے ساتھ  
 باتیں جس وقت کرے مہن کے صنم پایا کے ساتھ  
 سرنگا یا ہے میں نے طرہ خمدار کے ساتھ  
 زندگانی کا مزا سارا ہے روزگار کے ساتھ

چشم خونخوار، بھنویں تیغ کی یوں ہے تعریف

ہانکے ہوتے ہیں سپاہی سب ہی ہتھیار کے ساتھ

اب تو اس دل کو تازہ جاں کیجیے  
 یہ بھی اک میرے گلوں کے لیے  
 زندگانی تو ہے مشاں جاب  
 راز دل کا کبھو بھی فاش نہ ہو  
 یہ زمانہ ہے اک طرح کا یار  
 آسماں پھٹ کے گر پڑے سارا  
 جب تلک زندگی خدا دیوے  
 دولت وصل گر میسر ہو  
 یعنی گلشن میں آشیاں کیجیے  
 عندلیبوں کو باغباں کیجیے  
 کب تلک چاہ گل رخاں کیجیے  
 زردی رخ کو گر نہاں کیجیے  
 دل کا احوال کیا بیاں کیجیے  
 حب حال اپنے گر فغاں کیجیے  
 تب تلک فکر آب و ناں کیجیے  
 عیش ہی عیش جاوداں کیجیے

ہو سکے سب ہوس و لے لیکن  
ہونا جو کچھ تھا سو تو ہو گزرا  
بوڑھے کو کس طرح جواں کیجیے  
معاف نقصیر خوردگاں کیجیے

کمترین ہے ہمارا عاجز نیتن

اتنا غصہ نہ ہر ہاں کیجیے

کبھو کسی کا گلہ اپنی تو بلا نہ کرے  
کیا ازل سے ہے صالح نے بت پرست مجھے  
پہ مانگتا ہوں دعا روز حق تعالیٰ سے  
اگرچہ یار ہے ظالم تو کیا ہوا یارو  
دفا کی تجھ سے توقع تو کچھ نہیں مجھ کو  
اگر مریض بغیر از علاج چنگا ہو  
پہ بے وفا سے کہیں دل لگے خدا نہ کرے  
کبھو تبوں سے پھروں میں یہ تو خدا نہ کرے  
تبوں سوائے کہیں دل کو مبتلا نہ کرے  
مگر ہے خوف یہ، کوئی بد دعا نہ کرے  
یہ ممکن ہے کہ ستم گار کہیں حفا نہ کرے  
طیب جگ میں کسو کے تو پھر دوا نہ کرے

شمار عاشقوں میں اس کا کچھ نہیں ہے نیتن

شمع نمط جو کوئی عشق میں بگد نہ کرے

جی میں آتا ہے کہ اس مشکل کو آساں کیجیے  
مگر یہی ٹھہری کہ اب مجنوں کو ہماں کیجیے  
نوح کا طوفاں بھی چہیے آن کر مانگے پناہ  
مگر سب آخر ہوئی اور ہجر جیوں کا تیوں رہا  
چشم میرے آج ٹمک بھی گردِ افشانی کریں  
سرو بھی حیران ہو اور نافہ بے تاب ہو  
اپنے فیضِ اشک سے صحرا گلستاں کیجیے  
اس خیاباں کی جگے یاروں بیاباں کیجیے  
حب حال اپنے اگر یہ دیدہ گریاں کیجیے  
کب ملک اس سوختگی میں جان بریاں کیجیے  
یاسے ملنے کا پھر کیا فوب ساماں کیجیے  
تجھ سے خوش قد کو جو گلشن میں خراماں کیجیے

عشق کی سختی تبھی معلوم ہووے دل کو نیتن

قیس کے ہمراہ جب سیر بیاباں کیجیے

مجھ سے شکوہ سنا کبھی نہ کبھی  
دست کوتاہ کر، تعدی سے  
ہر طرح شوخ کو ملوں گا میں  
یعنی بوسہ دیا کبھی نہ کبھی  
مان کہتا ذرا کبھی نہ کبھی  
اس بلا سے بچا کبھی نہ کبھی

قصہ کیجو تمام، دل اپنا  
سندلی یا شفق یا اگری  
آسمان سارا ہو گیا غریب  
گم سے دسبر آ، کبھی نہ کبھی  
شیخ ڈاڑھی رنگا کبھی نہ کبھی  
ہم نے نعرہ کیا کبھی نہ کبھی

نین تھو کو دکھاؤں گا وہ دن  
گر میں جیتا رہا کبھی نہ کبھی

مجھ سے تو ترا عشق یہ زہار نہ چھوٹے  
تھ چاہ زنج کا تو گرفتار نہ چھوٹے  
یہ شیخ و برہن ہیں ترے قصہ دلال  
فریاد کروں کس سے ترے ظلم کی اے شریف  
تھ قدر کی صفت کیا کہوں سبحان اللہ  
ملک چلتے تھے دیکھے تو ایسا ہی نجل ہو  
ہر روز اگر لاکھ دوا دیو میں طبیاں  
جب تک کہ نہ ہو بھر کی آفت سے خلاصی  
ہر چند ہووے باغباں مانع و مزاحم  
بھوں کو ملا دشت اور فرہاد کو تیشہ

اپنا تو یہ غامض ہے اسے یار نہ چھوٹے  
جیوں یوسف مصر سے فریدار نہ چھوٹے  
ان سے تو کبھو تسبیح و زنار نہ چھوٹے  
تھ سے تو جفا کاری کا اظہار نہ چھوٹے  
ہر لحظہ کی انکھیلی کی رفتار نہ چھوٹے  
تا حشر کبھو کبک سے کہار نہ چھوٹے  
تھ عشق کے بیمار سے آزار نہ چھوٹے  
چشموں سے مری اشک تو یکبار نہ چھوٹے  
بیل سے تعشق گل و گلزار نہ چھوٹے  
قسمت کا لکھایوں ہی تھا اپنا چار نہ چھوٹے

یہ نین تری یاد میں سرور ہے دائم  
یا بارِ خدا اس کا یہ اظہار نہ چھوٹے

غصہ کو ترے کیا کہوں ایسا ہی غضب ہے  
کہاں تک میں کروں آپ کے اوصاف کا شکوہ  
ہم سے تو گئی چشم بدل طوطے کی مانند  
از روز ازل خواہش، ملنے کی ہے والٹر  
رفتار زمانے کی اگر بگڑی تو بگڑے  
ہر چند کہو، کوئی نہ سنے بات کسی کی

قاصر ہے زباں، ہوش فرشتے کا سلب ہے  
جھڑکی تو ہر اک بات ہے دشنام لقب ہے  
غیروں سے ملی جا کے یہ تو زہری ڈھب ہے  
کیا جانیں ترے ملنے کا وہ روز بھی کب ہے  
ہم کو تو نفع اس سے نہ آگے تھا نہ اب ہے  
اس گردشیں افلاک کا یہ طور عجیب ہے

وحدت تھی میسر تو وہ دن گئے افوس  
ہفتاد و دو ملت ہے یہ سب منظر اسی کا  
تھے عاشق و معشوق اگر وامق و عذرا  
وانا تو بھی کم سخن ہوتے ہی ہیں از بس

نکاح اپنی بھلک نور تجلی کی دکھا دے

مدت سے ترائین یہ دیدار طلب ہے

لے ٹوخ دل آزار ترا کام یہی ہے  
دامن کو پکڑ تیرے بیہ محشر میں کہوں گا  
جز یاد خدا صرف، نہ کرن کبھو انفاکس  
رکھتی ہے سدا دل کو مرے دام میں اپنے  
ہر روز تری جستجو میں پھرتے ہی رہنا  
صہبا کا تو ساقی ہو تو پھر اللہ ہی اللہ  
آلودہ کو کچھ دیکھے تو اس کی نہیں تعریف

بارہ صدی کا دور جو سنتے تھے (ہم) نہیں

بے شک شبہ، تحقیق وہ ہنگام یہی ہے

مر گئے کھینچتے ہی ہجر کے آزار کئی  
جنس یوسف کی تھے دیکھ کے لے مایہ حسن  
کیا بلا دام ہے تجھ زلف کا دل کے حقایق  
ایسے بے قدر ہیں دل، یار ترے کچھ ہیں  
راست ہے دنیا کا احوال بقول سودا  
کچھ نہ فریاد کی گنتی ہے نہ کچھ مجنوں کی

کس سے جا کر کے کہوں حال زمانے کا نہیں

جان اپنی سے تو بیزار ہیں اب یار کئی

کثرت میں پڑی آکے قیمت کا سبب ہے  
بت خانے میں کہے میں وہی ایک ہی سبب ہے  
ان پر تو صریح مجنوں کا احوال چرب ہے  
اس کو نہ سمجھ ٹیب، یہ تو پاس ادب ہے

عاشق کو کرے خسرو بدنام یہی ہے  
دیتا ہے مجھے مفت میں دشنام یہی ہے  
از بسکہ عبادت کا سر انجام یہی ہے  
مکھڑے یہ تری زلف سیہ فام یہی ہے  
لے صبح سے تا شام اچھے کام یہی ہے  
دل خواہ شکل عشرت و آرام یہی ہے  
مفلس کو اگر دیجیے تو نام یہی ہے



رقیاں اس طرح پھرتے ہیں انت اٹھ پایکے پیچھے  
 دو کوئی کیا کرے اب مفسدوں کی ایسی بن آئی  
 نہ سو بھادقت پر کچھ، پھیر کچھ کا کچھ لگے جکنے  
 پڑا ہے کام یوں فریاد سے تجھ عشق میں ظالم  
 رحوم آہ، بن یلیا کے یوں ہے قیس کے ہمرہ  
 نظر کی ہر سے تم نے تو یہ رتبہ ہوا مجھ کو  
 لکھا تقدیر کا مٹتا نہیں، کہتے ہیں سب لیکن  
 ہوا جو کچھ سو دیکھا اور جو ہوگا سو دیکھیں گے

کہ جیسے ٹھگ پھر میں زور آوری 'نر دار کے پیچھے  
 طیبیوں کی بنے جس طرح سے ہمار کے پیچھے  
 کہ جیوں دشنام یاد آدے کسی کو مار کے پیچھے  
 کہ جیسے داد خواہ ہووے کوئی فونخوار کے پیچھے  
 کہ جیوں لڑکے تماشے کو پھر رساے خوار کے پیچھے  
 کہ جیوں ادنیٰ سے اعلیٰ ہو کوئی سردار کے پیچھے  
 جو کچھ بے قدری ہے جگ میں سو ہے روزگار کے پیچھے  
 لیکن معلوم نہیں کیا ہوئے دن دو چار کے پیچھے

نہیں ہے نیک و بد پہ منحصر اب بین دنیا میں

جو کچھ جس کی معیشت ہے سو ہے سردار کے پیچھے

دہر سے یہ سودا ہے مرا، یا کہ یہ دم ہے  
 منا ترا اغیار سے تشریح کردوں کیا  
 آئینے سے بھد دل کے تجیر کو ملا دیکھ  
 گو عرش پہ خورشید ہے روشن تو بلا سے  
 کوئی ہاتھ لگاتا ہی نہیں خوف کے مائے  
 جتنا کہ ہے افراط تری کم، نگہی کا  
 چونکے ہے مجھے دیکھ کے وحشی سی سرس تو  
 کیا کیا کہوں تجھ عاشقی میں گزرا سو گزرا

ایک دم کی جدائی تیری مجھ پر تو ستم ہے  
 یہ قہر ہے آفت ہے غضب رنج و دام ہے  
 یہ دونوں برابر ہیں کوئی بیش و کم ہے  
 مکھڑے کی جھمک تیری یکب، سے کم ہے  
 ناگن کی لہر ہے کہ تری زلف کا خم ہے  
 اتنا ہی ادھر دیکھو تو یہ دیدہ نم ہے  
 آہو سے بھی ملد چند تجھے مجھ سیتی رم ہے  
 مت بڑ چھو یہ مجھ سے تجھے تیری ہی قسم ہے

یا آتے تھے ہر روز یا اب ملتے ہی نہیں ہو

اس نیتن پہ کچھ کیسا تھارا یہ کرم ہے

کیا منہ ہے کسی کا جو ترے کوچے میں جاوے  
 کیا غرض ہے اس کو جو ملے پھیر کسو سے  
 مارے بھی جلاوے بھی اور آمر نہ بھی کر دے

جاوے بھی تو پھر کا ہے کو دنیا میں وہ آوے  
 جب پہنچا ترے پاس جو کچھ چاہے سو پلاوے  
 عہدے ملے تیرے کون ہے ایسا سو براوے

دیکھا ہے کہیں گل نے تجھے جس کی خوشی سے  
ہر چند غم عشق میں سرچیر کے مرجائے  
جھ پٹم کے غمزہ کو اگر دیکھ لے نرگس  
پھول ہے وہ اتنا کہ قبا میں نہ سماوے  
فرہاد سے خرو کبھو شرمیں نہ ملاوے  
ہرگز نہ مشابہ میں کبھی آپ کو لاوے  
میں مرد گنوں تین جہاں میں تو اسی کو

تینے کا تیرے ابرو کے جو دار بچا وے

واجبی بات کہیں ذرا کیے  
بھ کو اک یہ بڑی سی حیرت ہے  
نیکی کا پھل بدی لگا ہونے  
چرخ ظالم نے سب کو ڈالا پیس  
اور ہی احوال دیکھتا ہوں میں  
جا بجا پھوٹیں بھوٹ کے شپے  
آتی کہتے ہیں ہم تو ہیں فاضل  
اپنی کرتے ہیں آپ ہی تعریف  
بے شعوری پہ بسکہ ہیں نازاں  
شیخ جی نے کیا ہے آج خطاب  
لوگوں کے پھوڑتا پھرے شیشے  
پلوچ ، پادروا ، بکے سخی  
اپنا سر پھوڑتا ہے آپ رقیب  
مارے خندوں کے مرد آدم کو  
ڈاڑھی ملا کی گو کہ ہے خو گیسر  
جن کی حرمت پہ کچھ نہیں ہے نگاہ  
چھپتے پھرتے ہیں وقت جنگ و جدل

بری لگتی ہے سب کو کیا کہیے  
برے کو کس طرح بھلا کہیے  
اس زمانے کا کیا گلہ کہیے  
اس کو تحقیق آسیا کہیے  
کس کے آگے یہ ماجرا کہیے  
یہ بھی یاروں کا اشفلا کہیے  
بے وقوفوں کا درگملا کہیے  
ان کے تئیں کو تو چوتیا کہیے  
کیوں نہ اب ان کو ناسزا کہیے  
اس کو بوٹھے کا چوچلا کہیے  
مختب کو تو مسخرا کہیے  
ناصح کو خواہ مخواہ سٹرا کہیے  
شوق سے اس کو مد جھڑا کہیے  
کوئی پلوچے نہیں ہے کیا کہیے  
پر مہا دیو کی جٹا کہیے  
ان کو پاپوشش کا تلا کہیے  
بزدلا ان کو برملا کہیے

خود پسندی میں غرق ہے عالم

نہیں کس کس کو اب برا کہیے

کس سیتی دل کا مدعا کیے  
یار ہم سے کمال ناخوش ہے  
فلوہ کیا تاب، کوئی کہے اس کا  
سیف ہے یہ تاب سمری چشم  
بے طرح ہے یہ مرن عشق طیب  
وقت پر جو کہ اپنے کام آوے  
کوئی سنتا نہیں ہے کیا کیے  
کس کے آگے یہ دکھ سنا کیے  
جو کہے وہ سوسب بجا کیے  
قتل عاشق کو تو نیا کیے  
کوئی مجرب سی اب دوا کیے  
اسی کو اپنا آشنا کیے

جس گھڑی یار ہنس کے بولے نین  
اکس گھڑی کو تو مرجھا کیے

ہر چند گرم ہو کے اگر برتری کرے  
جلوہ ترا وہ ہے کہ پری کو پری کرے  
وہ جادو تری چشم ہیں اے رنگی نین  
میرے تو دل کی ہووے بھی آرزو تمام  
خوش قد ترے کی جگ میں تو تمثیل ہی نہیں  
صانع مرادہ ہے کہ ہو کسی ہی چوب خشک  
کب آفتاب مہر کی ترے ہمہری کرے  
کس کی مجال ہے جو تری ہمہری کرے  
دیکھے جو سامری تو تری چاکری کرے  
جب تو سخن کی اپنے، سخن پروری کرے  
کہنے کو سرو ہے یہ کہاں سر بری کرے  
سو سودنہ وہ چاہے تو اس کو ہری کرے

ہو بارغ بارغ نین، وہ غنچہ دہن اگر  
دو لیک بات ہنس کے کھجور سری کرے

جی کو جب تیری یاد آتی ہے  
بیٹھے کل پڑے نہ اٹھتے کل  
گو کہ ہے آہ اہنی ہے تا نیر  
قد ترا جب سے دیکھا قمری نے  
تیرے دانتوں کی یار بڑا تی  
اس قدر خوش ہے گل سیتی بلبل  
جب کہ فریاد کرتی ہے گھڑیاں  
اگر رنجک کے تئیں لگاتی ہے  
مثل بھونچال ہلہلائی ہے  
پر رقبہوں کو ہینگ ہنگائی ہے  
سرو کو چشکی میں اڑاتی ہے  
مثل بجلی کے پھماتی ہے  
تن میں پھولی نہیں سماتی ہے  
کھڑے پانی میں ڈوب جاتی ہے

پر یہ اچر پچ ہے غیر کی محبت  
روز جلتی ہی رہے ساری رات  
کس طرح تیرے میں خوش آتی ہے  
شمع کی نور ہی یہ چھاتی ہے  
یہاں کے دیکھنے کو آج ملک  
روح مجنوں کی تڑپھرتی ہے

نین کے دل میں ہر ملنے کی

ایک آتی ہے ایک جاتی ہے

چہرہ دنیا میں یار کوئی نہیں ہے  
اپنی اپنی غرض کے ہیں سب یار  
کس کو کارینہار کوئی نہیں ہے  
اس میں اب پھر بھار کوئی نہیں ہے  
باپ بیٹوں میں پیار کوئی نہیں ہے  
کہیں ذرا بھی بہار کوئی نہیں ہے  
ایسا تو روزگار کوئی نہیں ہے  
ہر سچ کا سروکار کوئی نہیں ہے  
اب تو ایماندار کوئی نہیں ہے  
ان کے ایک تار کوئی نہیں ہے  
قابلوں کا شمار کوئی نہیں ہے  
اس خرابی کا پکار کوئی نہیں ہے  
ہنگامی ہے تو ازار کوئی نہیں ہے  
مونس و غمگسار کوئی نہیں ہے  
دانشی اور بچار کوئی نہیں ہے  
اس برابر و قار کوئی نہیں ہے

چاہے سو ہو وہ نین دنیا میں

اپنا کچھ اختیار کوئی نہیں ہے

سے ہی نہیں ہیں کس طرح دستاں اپنی  
منع ہی کہتے ہیں تو جھک گیا ایسے بارو  
ابھی کس سے کہوں جا کے داستاں اپنی  
خوش رہتی نہیں ہے کہیں نہ ہاں اپنی



سے نہ تجھ سے کبھو ہم تو، ہم کے ہم آغوش  
 ذرا سی بات میں ہوتے ہو تم تو روگرداں  
 ہم عاشقی میں تری یار، بہت تیج ہائے  
 قماش دیکھ ترے دل کا، جو فرد شول نے  
 پورا ج عالم یکلخت ہو گئے بہلول  
 نہ ہے یہ شکل، زلمے کے ہاتھ تھی نجیب

یہ آرزو ہی رہی جی میں جاوداں اپنی  
 اسی میں ہو چکی لبس خراب نشاں اپنی  
 کسو ہی طرح نہیں گلتی دال یاں اپنی  
 کمری ہے گرم بٹے ٹھاٹھ سے دوکاں اپنی  
 انھوں کے آگے کہو اب چلے کہاں اپنی  
 سنبھلے پھرتے ہیں دستار ہرماں اپنی

خدا ہی شرم رکھے نین لب تو دنیا میں  
 پڑی ہے آگے ہر اک کو جہاں تہاں اپنی

بے شبہ ہے کہ عرش اُپر تو ہے  
 کون ہے ایسا کہ جس کی دوں تشبیہ  
 کو پہ تیرا بھید نہیں کھلتا  
 ناز کی کے سبب چل ہی نہ سکے  
 تیسری الفت کو کس طرح چھوڑوں  
 بعضے طاب ترے یہ کہتے ہیں

پیر جدھر دیکھوں ہوں تدھر تو ہے  
 تیرے ثانی ہے تو اگر تو ہے  
 تیسری حکمت سے باخبر تو ہے  
 زور ہی یار موکسر تو ہے  
 میری تو جان اور جگر تو ہے  
 شمس بھی تو ہے اور قمر تو ہے

نین کہتا ہے کل وہم، شے میں (۹)

جان من، قصہ مختصر تو ہے

جہاں میں جو کوئی گلبدن، خوش نین ہے  
 یہ سب خوبیاں تجھ میں ہیں گی پری رو  
 دیوانہ ہوں اس دم کہ جس دم کہیں ہیں  
 (ذرا) پیار سے جس سے تو منہا کے بولے  
 تجھ کو ترا جن نے ٹمک دیکھ پایا

بہت جی کو پیارا ہے اور من ہرن ہے  
 تو ہی من ہرن ہے، تو ہی چٹ لگن ہے  
 شکہ لب بھی کیا خوب شیریں پن ہے  
 تو بے شک اسے بادشاہی ختن ہے  
 ولی ہے وہ پھر اور فلاطون زمن ہے

ترے آونے کی خبر سن کے پیارے  
بھلا تجھ کو دنیا میں کوئی کیوں کر پائے  
ہے سب میں ملا اور سب سے نرالا  
تو اب خواہ نزدیک یا دور ہی رہ  
نہ گھر کہیں تیسرا، کہیں نہ وطن ہے  
عجب تیری قدرت عجب تیرا فن ہے  
تیری یاد جی میں مرے رات دن ہے  
میں طالب ہوں تیرا اور تو جان من ہے

کرم کی نظر سے ذرا دیکھ ایدھر

ترا نین عاجز ہے رنگین سخن ہے

جو کوئی آبرو دے کہ جگ میں جیا ہے  
جو کوئی جیا آبرو دکھو کے جگ میں  
ارے یار دوستے ہو کوئی تو بولو  
مجھے ان نے سب طرح سے پس ڈالا  
میں حرمت کو چاہوں یہ چاہے بتوں کو  
یہ ڈھونڈے سیر زلف اور چشم مے گوں  
یہ نت اٹھ کے چاہ زرخ ہی کو دوڑے  
پری زو کے پیچھے قلعہ کوٹ کھودے  
دکرم خوردہ، کسو پر الہسی  
الجتا ہے ہر دم، نہ روکار کے ہے  
کہوں ہوں میں کچھ یہ کرے اور ہی کچھ  
کبھو گادے، رووے، کبھو مسکراوے

ہر ایک شخص نے وصف اس کا کیا ہے  
سراسر وہ احمق ہے اور بے حیا ہے  
یہ دل ہے کہ دشمن ہے قاتل ہے کیا ہے  
یہ دل نہیں ہے پہلو میں سنگ آسا ہے  
انوکھا خدائی سے شیوا لیا ہے  
بھلا اب یہ سودا نہیں ہے تو کیا ہے  
نہ سمجھے ادھر جو گیا، سو گیا ہے  
یہ گوہر کے حق میں گو پا سپدھیا ہے  
کہاں کا یہ منہ زور گھوڑا دیا ہے  
مجھے دل نے اب سخت عاجز کیا ہے  
زجانا پٹے کن نے جادو کیا ہے  
دیوانہ ہے یارو یہ کچھ اولیا ہے

.. بلے پہنچے تہاں اڑ کے پہنچے

گلا داب نے کو یہ تو مویا ہے

نصیحت سے میری یہ سو کو کس بھاگے  
 ہیں تپتوں زمیں پر، یہ بیٹھے سماں پر  
 کہیں جا بجا لوگ پر کا کبوتر  
 زمانے کا یہ حال اور دل کا یہ حال  
 بھنور بیچ غم کے میں ڈوبوں اور اچھلوں  
 میں سو سو دفعہ تیرا پھاڑا گریباں  
 تو ہے موت کا ڈھیر، مت بول مجھ سے  
 میرے ثانی نہیں ہے کوئی اب جہاں میں  
 خدا ہوں سدا عاشقی پر میں اس کی  
 خدا کی طرف جن نے دل کو لگایا  
 مرے جی میں آدے گی سو ہی کروں گا  
 نہیں دل کے منے، میں جیسے سی باتیں  
 پھر آخر ہو ماچار میں بار بیٹھا  
 کہوں کیا کیا پارو، میں دل کے تماشے

تلنگوں کے حق میں جیسے بھوتیا ہے  
 کجا تخت شاہی، کجا بوریا ہے  
 ہر اک بات کا مچ رہا تو تیا ہے  
 کہو کس طرح رہتی شرم اور حیا ہے  
 یہ کہتا ہے مجھ سے کہ تو مرجیا ہے  
 بتا تو نے کس واسطے پھر سیا ہے  
 امر ہوں، میں نے آبِ حواں پہا ہے  
 فلک کے کنگوروں کو میں نے چھیلے  
 وہ جو قیس صحرائیں ایک ہو گیا ہے  
 ہوا فضل اس کے سے وہ انبیا ہے  
 میں مختار ہوں میرا دکر مفرودہ، ہے  
 خدا شاہد ہے میں نے رو رو دیا ہے  
 یہ لڑنے کے تئیں میرا خاں ٹھوکیا ہے  
 یہ تو سوانگ لانے کو بہر و بیا ہے

نہ یک آگے اب نین خاموش ہو رہ

یہ دل ہے ترا، پار لنگوٹیا ہے

آیا کبھو نہ ہر میں مرے پیار کر کے تو  
 "ماریں ہیں پہلو عرش پر اب تو بھی رقیب  
 اس آرزو میں عمر ہی ساری بسر کریں  
 اب تک کبھو نہ تو نے کرم کی نظر کری  
 ایسی ہی تو نے ہر انھوں کے اوپر کری  
 بے رحم میرے حق میں مقرر ہے تو صنم

تک دیکھ چٹم خلق سے نین اپنے کی طرف

تیرے ہی اعتماد پہ میں تو گزر کری

## رباعیاں

واجبی بات میں کچھ پھیر نہیں ہوتا ہے  
چھ پیری کا جھلا سیر کہیں ہوتا ہے  
کہتے ہیں شیخ جی کے خانے میں سر سے بھاری  
اتنا گاڑی بھرا اندھیرا کہیں ہوتا ہے

یزدین تیش میں کھڑے پر بلا ہے جو تجھے سوچھے  
بھنویں ترہی بڑی قابلِ اداس ہے جو تجھے سوچھے  
جو کچھ فرہاد پر گزرا سو سب عالم پر روشن ہے  
مقامِ عشق میں بے شک و غلبہ جو تجھے سوچھے

## فردیات

کیا کارگر ہو گئی ہے دیکھو ڈاھ کسی کی  
ظالم کو تو لگتی ہی نہیں آہ کسی کی  
کہو جا کے زلیخا سے نہ کر چاہ کسی کی  
بس چھوڑ دے یوسف کو نہ آہ کسی کی

دیکھے ہیں تیری چشم میں جادو بھرے ہوئے  
دشمنی پھر میں ہیں دشت میں آہو دے ہوئے

تجھ سامنے ہو شمع تو حسرت سے نگہل جائے  
اور گل کا تو کیا منہ کر چمن سے نہ شکل جائے

متصل چشم کے یوں فکر اڑی رہتی ہے  
جس طرح مینہ کی ساون میں بھڑی رہتی ہے  
چشم سے اشک کی وہ ندی چڑھی رہتی ہے  
جیوں لب آب سدا فوج پڑی رہتی ہے

نیزینی تجھ بیاں کی نہ کہہ انتہا سکوں  
مصری، مشاں ہے گی پر لیس نہ لاسکوں

نہ دینا بسکہ سیکھا شوخ نے کوئی کہاں تاک مانگے  
میں اپنا مانگتا ہوں دل، وہ کہتا ہے کہ پھر مانگو



منے سے جتنی گزرے زندگی اتنی نزاکت ہے کہ ورت اس میں کچھ بھی ہو تو پھر پوری ملامت ہے

دل اور جان سے جو کوئی دیوانہ تیرا ہے کہیں ہیں لوگ کہ اس پر پری کا پیرا ہے

جہاں میں جہاں تک کہ خوبصورتے ہیں مجر د انہیں خواہ خواہ گھورتے ہیں

مرے کا دیکھنا ہم کو تو یار تیرا ہے ہوا تو آنکھوں کے ادھیل تو پھر اندھیرا ہے

## محسوس

از بسکہ ستم گار ہو، بس تم کو بھی دیکھا عاشق کے دلا زار ہو، بس تم کو بھی دیکھا

ہر فن میں عیار ہو، بس تم کو بھی دیکھا ایذا کے روادار ہو، بس تم کو بھی دیکھا

کیا خوب وفادار ہو، بس تم کو بھی دیکھا

کھب گئی ہے ز بس دل میں مرے تیری نزاکت اس واسطے کہنے ہے یہ دل اتنی ملامت

یا ویسی محبت تھی اور یا ایسی قیامت اب زیادہ کہوں کیا، تمہیں حق رکھے سلامت

کوئی تم بھی عجب یار ہو بس تم کو بھی دیکھا

کہ تیرے موافق میں استاد کہاں ہے تجھ حسن کی زیبائی کا تعداد کہاں ہے

گلشن میں ترے قد سا وہ شمشاد کہاں ہے دنیا میں کوئی تجھ سا پریزا کہاں ہے

ایسے ہی طرح دار ہو بس تم کو بھی دیکھا

رہتی ہے شب در در مرے دل میں تیرت غیروں سے یہ الفت رکھو اور ہم سے یہ نفرت

کیا جانیں مجھے کیوں کہ غرض آئی ہے وہ صحبت افسوس ترے دل سے کہاں گئی وہ مروت

کوئی سخت دغا دار ہو بس تم کو بھی دیکھا

کہاں تک میں کروں آپ کے اوصاف کا شکوہ ہر بار اکڑ جاتے ہو غفہ سیتی بل کہا

نے آپ ہی سمجھو، نہ کہو مجھ سیتی، سمجھا اس طور تمہارے کی حقیقت کو کہوں کیا

ذرا ہی میں بیزار ہو بس تم کو بھی دیکھا  
 کیا کہیے میاں تم سے عبت، دل ہے دیوانہ  
 کہنے کو مرے تم نے کبھو بھی تو نہ مانا  
 ایک دم جو ملے ہم سے، کیا تم نے بہانہ  
 اس وضع تہدی کو میں اب خوب پہچانا  
 خندوں کے فریدار ہو بس تم کو بھی دیکھا  
 بہتیک تجھے دیکھ کے ہوتے ہیں گے قربان  
 ہے گرم پنٹ اب تو ترے حسن کی دوکان  
 دانا نہ کہیں اس کو، کہے تم کو جو نادان  
 شاباش میاں خوب نکالی ہے یہی شان  
 ہر بات میں ہوشیار ہو بس تم کو بھی دیکھا  
 تب تم کو کہے تھے کہ میں ہوں صادق دلدار  
 اور مجھ سا نہ کوئی دوسرا دنیا میں وفادار  
 اک دم جو جدا ہوا، نہ تو جوان میں گنہگار  
 اس بات کو یک بارگی اب بھول گئے یار  
 عیار، ہو مسکار، ہو بس تم کو بھی دیکھا

## مثنوی

الہی میرے تئیں ہدایت تو دے  
 تری یاد مجھ کو تو ہر آن ہے  
 اگر تیرا ثانی میں ڈھونڈوں کہیں  
 زباں پر کیا درد میں نے یہی  
 ہر اک منٹے یہی بولتی ہے صدا  
 پہچانے بہت اپنا سا کہ اپا دور ہے  
 تیرے بھید سے ہے تجھی کو خبر  
 ترا کن کا کہنا کہ امسا تھا  
 تیرے کن کے کہتے ہوا یہ وہ سب  
 عجائب ہیں یہ چار صفتیں تری  
 یعنی ہے تو بے چون اور بے چگون  
 ذرا اپنی مجھ کو حمایت تو دے  
 تیرے نام پر جان قربان ہے  
 نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے نہیں  
 توئی ہے، توئی ہے، توئی ہے توئی  
 خدا ہے، خدا ہے، خدا ہے، خدا  
 کسی نے نہ پایا تیرا بھید بھاو  
 جہاں میں نہیں ہے کسی کو خبر  
 لیکن بے طرح کا طلسمات تھا  
 پڑے تھے عدم میں نہ تھا کچھ بھی تب  
 کہ جس سے ہے خرم طبیعت مری  
 کہیں ہیں دگر بے شبہ بے نموں

نہ دیکھا کسی نے نہ پایا کہیں  
 ہے سب سے جدا اور سب میں بلا  
 ہزاروں گدا کر دیے بادشاہ  
 نظر آگیا جس کو ٹمک تیرا نور  
 لیکن ایک تیری عجب شکل ہے  
 جو چاہوں کہ تیرا کروں کچھ بیاں  
 تو نے دل کے تئیں جس کے روشن کیا  
 تصدیق کیا تجھ پہ سب جان و تن  
 ترسرا عشقِ نغوت سے جن نے کیا  
 لگا باتیں کرنے وہ آسمان سے  
 پھرے بھونکتا لگ نہن اور ٹھٹھاٹ  
 پھر آخر کے تئیں اس کو سودا ہوا  
 اسی طرح سب عمر بھٹکا کیا  
 تری آشنائی میں یہ حال ہے  
 تری اب عبادت ہی کرتا ہے خوب  
 نکمے ہوں میں آگے زمانے کا حال  
 نیٹ کر کے اب وقت باریک ہے  
 وہ تیسرہ صدی جو نہیں تھے بھی  
 مچائیں زمانے کے نیرنگیاں  
 لگے جا بجا چوٹ پر اور چوٹ  
 اک عالم کے تئیں کر دیا خاک سیاہ  
 ٹھکانہ کسو بھی نہ سرکار میں  
 چچی ہے نہایت ہی اب بھوک بھوک

پڑی عقل چکرت میں آکر بہر ہیں  
 اسی بات سے غنچہ دل کھلا  
 تمہارے حکم سے روشن ہیں ہر وہ ماہ  
 اسی دم ہوا اس کا سب درود دور  
 کسی کا نہ تیسرے کئے دخل ہے  
 تو منہ میں ہوئی جلے ساکت زباں  
 اے انبیاء اولیاء گم دیا  
 قدم بوس ہوئے لگے مرد و زن  
 گویا اُن نے سچ سچ دھتورا پیا  
 ہوا بے خبر جسم اور جان سے  
 جیسے بے دہانہ بکس ڈوم بھاٹ  
 گلی در گلی خوب زسوا ہوا  
 ہر ایک سنگ پر سر کو پٹکا کیا  
 کہوں کیا بڑا جی کو جنجال ہے  
 غضب سے ترے سخت ڈرنا ہے خوب  
 سنوا ہل فرہنگ اور اہل قتال  
 زمین آسمان سارا تاریک ہے  
 یہی ہے یہی ہے یہی ہے یہی ہے  
 کر میں رنگ میں سب کی بے رنگیاں  
 مقدم ہے ہر ایک کا لوٹ پوٹ  
 ہزاروں سپاہی پھر میں ہیں متباہ  
 نہ دربار میں کچھ نہ گھر بار میں  
 چھو ہارا ہوئی خلق سب سوکھ سوکھ

کوئی چھٹے بیٹے کی باتیں کرے  
 گریں ایک پر چھ چھوٹا اس طرح  
 کہیں ہیں اسے رجعت القہری  
 تھمتے زمانے میں بانکے بی  
 اسافل خوشی ہے تو کم بیش ہے  
 گیا بھول یک لخت جو عش اور خروش  
 کہوں اس حکایت میں ایک ادھر  
 عجب وقت ہے اور عجب ڈول ہے  
 کسو کے تئیں کوئی پوچھے نہیں  
 حق پر ہوئی ساری ترکِ تمام  
 تنوک دیکھ ناخواندوں کا اس زمان  
 کریں بے شعوری کے سب کام ہے  
 تکمیں پگڑی ایک ایک کی لے کے نادوں  
 ڈرے خلق یوں ان کی مدد بیرے  
 غرض سب طرح ان کی نیت بری  
 لبھانویں پہلے کر کے دلداریاں،  
 پھکے ہے کوئی دن میں جلدی سے مور  
 اور آقا ہمارے تو اب واہ واہ  
 قبول ہے یہ قسمت کا اپنی قصور  
 جہاں فاقہ ہے اور برا حال ہے  
 نہ دھماں مال، نہ چرخا، نہ خاک دھول

تو انہو پھر اس طرف پل پڑے  
 شہد پر مگس گرتے ہیں جس طرح  
 گیا موج زن آب اور پھرا پھرا  
 خاک ہو گئے جیوں برف کی ڈلی  
 نجیب ہے سو وہ سخت دلریش ہے  
 کیا اس طرف سے میں نے دل خوش  
 سنو اہل علم و عمل، اہل رمز  
 کہیں چھکڑ ہے اور کہیں دھول ہے  
 برا اور بھلا کچھ بھی سوچے نہیں  
 ندارد ہوئی عین، قاف اور لام  
 ہوا ورد ہم کو، اہلسی اماں  
 دھریں ہیں خدائی کے تئیں نام وے  
 جنھوں کی طبیعت کا سر ہے نہ پاؤں  
 کر جس طرح کھوا ڈرے تیرے  
 ہر ایک بات جن کی شہد کی پھری  
 کریں پیچھے سے خوں خواریاں  
 ہوا ایک ہی بھاؤ پر کھل، کپور  
 منے ہے جنھیں خلق سب تاقاہ  
 پہ گویندوں سے یہاں کے حق رکھے دور  
 تھاں کہتے ہیں خواہ مخواہ مال ہے  
 یہ کپا بنے پھرتے ہیں پھول پھول



جو کچھ چاہتے ہیں سو بکتے پھر ہیں  
 کٹیں اجلے کپڑوں کو دیکھ اس طرح  
 مرو یا جیو کوئی پسینہ سے  
 پھر ہیں پیچھے ہر ایک کی گھات میں  
 تھے آگے ہی سے ایک تو لا علاج  
 کہیں کو چلو راہ چلتی نہیں  
 فسروئی کا اب کیا کہوں میں رواج  
 (کرم خوردہ) تو بستی میں کوئی نہیں بجا  
 فروغی جو پوچھو تو ہے یہ کہاں  
 نکل گھر سے جو کوئی کہیں کو چلا  
 اسے پوڑے میں پھر کھڑا کر دیا  
 روہیلہ ہے ایک مستی خاں اس کا نام  
 اگر کامداری سے ظاہر ہے وہ  
 بڑا دھاک اس کا بڑا اس کا ٹھوک  
 نہ پھوٹے بھلا اور نہ پھوڑے بُرا  
 یہاں تک کشش کی کہ پھر ٹھک گیا  
 پڑا صبر رعیت کا اس پر شتاب  
 دیکھا اس نے اٹھنے ہی میں ہے مزا  
 نہ مانا پھر ان نے کسی کا کہا  
 سنو کار پر دانوں کا اب بیاں  
 چایا ہے کھنڈی کا دور اس قدر  
 لگے ہے یہ تو سال میں ایک بار  
 یہ کھنڈی نہیں ہے گی بھنڈی ہے یہ

گلی کوچے میں سب کو بکتے پھر ہیں  
 پھری سے کٹے خربزہ جس طرح  
 انہیں کام ہے مردم آزار سے  
 کریں خالی وہ، گھر ذرا بات میں  
 ہوئے تس پہ اب کوڑھ میں اور کھاج  
 کو کی یہاں دال گلتی نہیں  
 کوئی کل غارت ہوا، کوئی آج  
 چچا کر کے پھوڑا ہر ایک کو پنا  
 چچا چیل کا سا پھٹا یہاں  
 وہ نہیں لوگوں نے اس کا پکڑا گلا  
 جو کچھ پایا سو سب ہڑپ کر لیا  
 اسے کرتی ہے خلق اٹھ اٹھ سلام  
 لیکن مال کھانے کو ماہر ہے وہ  
 سب آمد شہر کی وہ لے تم کو ٹھوک  
 مرنڈا کرے وہ پکڑ کر چھڑا  
 رعیت کے تئیں لوٹ کر چھک گیا  
 ہوا آپ ہی اس کا سب نہرہ آب  
 والا کہ یہاں پہنچتی ہے سزا  
 جمعیت کو اپنی لے جاتا رہا  
 جنہیں تھوکتا ہے گا سارا جہاں  
 کہ بھاگن پڑی شہر میں گھر بگھر  
 نہ کہ ہر مہینے میں پھر چھ بار  
 ستم کاروں کی گرم منڈی ہے یہ

مگر میں بنیوں پر رات دن ٹوٹ ٹوٹ  
 کسو کی نہ مائیں کوئی داب، ڈاٹ  
 کسو کے تئیں کوئی کھینچے پھرے  
 کسو کے تئیں کوئی ڈالے پچھاڑ  
 کسو کو کوئی روٹی کھلے دے  
 کسو کا گویا کوئی والی نہیں  
 کسو کی ذرا کوئی سنے نہیں پکار  
 محنت محنت میں ہلا محیا  
 کہوں کیا پڑی ہلڑی مہربان  
 گئے بھاگ لے لے کے سب اپنی جان  
 ہوا آخر شش سارا بازار بند  
 لگے کہنے سب مل کے واہ واہ دے میں  
 کئی ماہ تک یہ بکھیڑا رہا  
 ہزاروں روپوں کا پڑا آکے بیچ  
 گئے بیچنا بھول دے مونگا ماش  
 اب ان باتوں کا کوئی کیا دے جواب  
 (کنا، تھا ملک آگوسیدر عمل  
 یہاں تک ہے وہ اپنے باطن کا صاف  
 ہے سب طرح سے اس کی نیت بھر  
 رکھے سب کو خوش اور خوش رہوے آپ  
 ملک ہے جہاں ظلم معدوم ہے  
 کسی کا برا کر کے جانے نہیں  
 چکوروں کو وہ کان لگنے نہ دے

مچائی ہے بے طرح کی لوٹ لوٹ  
 اہلی یہ کچھ کیسا بگڑا ہے ماٹ  
 کسو کے تئیں کوئی ایسے پھرے  
 کسو کے کوئی توڑتا ہے کواڑ  
 کسو کو کوئی ہاٹ جانے نہ دے  
 ہودم ہے سو آفت سے خالی نہیں  
 کریں ہیں رعیت کے تئیں مار مار  
 یہ ہلا نہیں بل دھڑلا محیا  
 ہوئے کان سن سن کے اب پکیدان  
 لگے پھوڑ کر قفل، گھر اور دوکان  
 کیا یہ تردد تو لایق پسند  
 لیا پیسہ بنیوں سے کیا خوب، ایس!  
 رعیت نے یارو بڑا دکھ سہا  
 ہوئے مفت میں بنیے سب بیچ بیچ  
 ہوئے گھر کے گھر صاف اور پاش پاش  
 مجھے آگے کہنے کی طاقت نہ تاب  
 وہ مرزا، وہ منصف، عصہ کا دلی  
 ہزاروں خطا لوگوں کی کر دے معاف  
 ہمیشہ خدا کی اس اوپر ہے ہر  
 بھلائی کی اس کے تو پھیلی ہے چھاپ  
 کرے زیادتی کوئی، معلوم ہے  
 چپڑ خندوں کی بات مانے نہیں  
 وہ تاحتر فتنے کو جگنے نہ دے

عمر اس کے میں، چوری کا نام کیا  
 خدا کے خوش ایسے کوتوال کو  
 غزن کے لیے وہ پھرے کو بکو  
 خفا ہو گیا تھا وہ بھوپال سے  
 ستان نے جس وقت یہ ماجرا  
 بارے ان پہنچا وہ چل کر شتاب  
 بہت اہلکاروں کو دی لعن لعن  
 وہ پہلے سبھوں کے تو گھر گھر پھرا  
 بلا پھر تو سب کو دیئے ان نے ہان  
 اگر تم کو دیکھے کوئی بد نظر  
 ذرا چھیڑے تم کو کوئی باٹ میں  
 یہ کہہ کر کے جلدی بٹھایا امن  
 لگیں جا بجا کویلیں بولنے  
 ہوئی گل فروشوں کی وہ ہی بہار  
 بھمکدا وہی پھر چمکنے لگا  
 پر ہی زاد گھر سے نکلتے لگے  
 عجائب کیے نازیں خوش خرام  
 کیا بیوں کے سینے سے دور داغ  
 ملک کے تئیں کو کہے آفریں  
 کرے اس کی تعریف خلقت کیوں  
 کیا مختصر میں نے یہ رنگ رس  
 سنو پارو اب تم بزرگوں کے قول  
 جو کوئی کہ ہیں گے پٹ دل حزیں

دغا باز، نٹ کھٹ کا جھاں کام کیا  
 پر کھتا رہے سب کے احوال کو  
 تردد کا ہے لیک دادا، گرد  
 کئی طرح کے پاں کے احوال سے  
 نہایت وہ دل نہیچ اپنے کڑھا  
 ہوا شہر کو دیکھ جل بہن کیا ب  
 کیے صاف گویندوں کے ناک کان  
 ہر ایک سے بغل گیر ہو کر ملا  
 کہا کھولو دوکان تم میری جان  
 کیا بوجھو اس کو شہر کے بدر  
 تو دے دوں اسی دم اسے کاٹھ میں  
 کیا شہر کو پھر گلوں کا چمن  
 پھلیں اور عطر پھر لگیں تولنے  
 لگے بکنے انگور، میب اور انار  
 وہی مشرو میٹھا پھٹکنے لگا  
 بہت سنگ دل پھر چمکنے لگے  
 کریں کوئی نظروں میں قصہ تمام  
 ہوا دل ہر ایک کا پیٹ باغ باغ  
 جزاک اللہ صد آفریں، آفریں  
 کیا ان نے بانار کو بیوں کا میوں  
 کہ مغز حقیقت ہمیں است و بس  
 کہے ہیں سخن میسزاں میں تول تول  
 وہ، اَللّٰہِ یٰنِیٰہِ اَللّٰہِ یٰنِیٰہِ

جو کوئی مفت لیتے پھریں ٹکڑیوں  
 جو کوئی زباں کا گندہ ہے وہ  
 جو کوئی کسو کا کرے ہے بڑا  
 جو کوئی فضیلت سے بھاگیں ہیں دور  
 جسے شعر کا شوق دن رات ہے  
 جو کوئی عصر میں ہے صاحب سخن  
 جو کوئی کر مفلس پتیں ہیں شراب  
 جتنوں کی کر نیت میں ہے کچھ خلل  
 جو کوئی سخاوت کے ہیں پائے مرد  
 لیکن یارو ہمت خدا داد ہے  
 نہ ہمت برابر کوئی چیز ہے  
 بڑھی جس کی ہمت بڑھا اس کا ٹھاٹھ  
 جو کوئی کہ سب طرح ہیں بے تمیز  
 کیا ان کی دولت نے جس دم فرار  
 خوشامد کریں جا بجا جوڑ ہاتھ  
 جو کوئی کہ عاشق ہیں تیسرے آپر  
 بڑی دولت ہے گی ترے نام کی  
 فدا ہوں میں نون ترے نام پر  
 ہزار آفتوں سے بچا یا مجھے  
 ترا شکر ہر دم کیا چاہیے  
 اہل ترا فضل درکار ہے  
 شراب ٹھہرا پلا دے مجھے  
 یہی نیتن کو آرزو ہے مدام

پڑیں غیب سے ان کے سر چھکڑیں  
 بھلا آدمی نہیں ہے خندہ ہے وہ  
 نہ ہووے کبھو ہرگز اس کا بھلا  
 مقرر انہیں جانے دل کے کور  
 وہ تو قابل ہے اس کی کیا بات ہے  
 اسے کہیے یہ شک فلاطوں زمن  
 انہوں کی تو مٹی ہے گھٹ گھٹ خراب  
 ہے آفت انہوں پر محل بے محل  
 انہوں نے کیا ہمت حاتم کو گرد  
 سدا اہل ہمت کا دل شاد ہے  
 نہیں جس میں ہمت وہ تو حیر ہے  
 نہ مانو تو حبا دیکھو گنگا کا پاٹ  
 انہوں کے تئیں کو ہے دولت عزیز  
 لگے خوار پھر نے شتر بے ہزار  
 تو بھی ان کی کوئی نہیں پوچھے بات  
 وے ماریں ہیں دولت کو پا پوخل پر  
 بڑے نام کی اور بڑے کام کی  
 کمر باندھی ہے کس کے اس کام پر  
 نئے سرے کئی دم چھلایا مجھے  
 یہی چاہیے اور کیا چاہیے  
 یہ بندہ تو سب طرح لاچار ہے  
 جمال اپنا جلدی دکھا دے مجھے  
 تری یاد میں خوش رہے صبح و شام



## مسدس شہر آشوب

جس کسی کا گھرانہ عالی ہے      اس کا منہ چکنا پیٹ خالی ہے  
زور ہی تحفہ طرح نکالی ہے      دیں بنا اس کہیں کہ حالی ہے (۹)

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

روز داروغہ پاس جاتے ہیں      شور و ہوا بہت مچاتے ہیں

صبح سے شام تک بکاتے ہیں      وے مواشی انہیں بتاتے ہیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

بعضے جب آکے دھوم ڈالیں ہیں      آند دو آند دے کے ٹالیں ہیں

بعضوں سے جھٹیں نکالیں ہیں      بعضوں کو صاف ٹالیں بالیں ہیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

لکھ کے دیتے ہیں دور پہ کی برات      نس کے دو آنے پھر لگیں ہیں ہاتھ

اس کو بھی کئی نگاہ ہے ہیں نگاہات      اس خرابے کی کیا کہوں میں بات

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا ہوا بگڑی ہے زمانے کی      کچھ بھی صورت نہیں ہے پانے کی

آشنا کی نہ کچھ یگانے کی      دوائے برجان ہے بیگانے کی

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کوئی روپوں کی تلاش میں ہیں گے      کوئی فکر معاش میں ہیں گے  
کوئی سینہ فراکش میں ہیں گے      اس طرح کے قماش میں ہیں گے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

مارے بھوکوں کے اس قدر ہیں چور      کسو کے منہ پہ نہیں ذرا بھی نور  
بے نصیبی میں کچھ نہیں ہے قصور      یہ حقیقت کہوں میں کس کے حضور

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

بے طرح کے یہ لوگ ہیں بے بیر      دینے کی کچھ بھی نہیں کریں تدبیر  
بھوک از بس ہوئی ہے عالمگیر      ساری دنیا کے تئیں کیا ہے فقیر

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ہے عجب کچھ یہ جاٹ کی سرکار      خلق ناخوش، سپاہ سب بیزار  
دیر طلبی سے سخت ہوا چار      اکثر اس بیت کو پڑھیں ہیں پکار

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

پاجی عالم ہے بادشاہی میں      مرد آدم پھر میں متباہی میں  
کیا کہوں میں جناب الہی میں      اب کے پھر گھٹلی ہیں چھماہی میں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

حال اپنا سنا کے جیتا کہا      سال گزرے پہ تو بھی کچھ نہ ملا  
اٹھ گئے آخر کش کو ہو کے خفا      بے جا نہیں ہے، کہا ہے بہت بجا

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے  
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا کہوں میں انھوں کی نادانی  
نوکری کہیں ذرا نہ پہچانی  
بے وقوفوں پہ ہے مہربانی  
بہت سا پیار اور قدر دانی  
کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے  
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

اس سوا اور یہ تمسا شاہ ہے  
کیا کھلا آؤں کا ڈر ہے  
حق شناسی کا حرف عنقا ہے  
بسکہ عالم خراب در سوا ہے  
کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے  
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

یہاں تک ہے جہاں کی بات ابتر  
پیسے دینے پہ تئیں کس کی نظر  
بھوٹ ہی جھوٹ پہ بندھا ہے کمر  
شاہ کے گنے کی ہے تس پہ خبر  
کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے  
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

دیکھ کر جھوٹ اور دغا بازی  
اٹھ گئے جو کہ مرد تھے غازی  
چاپلوسی سے کمر سخن سازی  
اب تو نامرد دے گئے بازی  
کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے  
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

نہ کوئی منصف ہے نہ کوئی عادل  
حظ نفسی میں ہیں سبھی کا مل  
بسکہ حیرت میں ہیں گے سب عاقل  
کہتے ہیں روز ہاتھوں کو مل مل  
کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے  
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

جا بجا بھوک اور پریشاں ہیں  
کردہ خویش سے پشیمان ہیں

دیدہ گریاں و سینہ بریاں ہیں دیکھ یہ حال ہم بھی حیراں ہیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا یہ امرار و بخشی و عظام روز و شب کرتے ہیں گے اپنا کام

دیکھ کر کے یہ ان کی شکل مدام اک ہنسی آتی ہے گی جن پہ تمام

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

اس طرح کا چچا ہے دھندھو کال سب کے چہرے پہ ہے خود ملال

خواجہ حافظ میں دیکھتے ہیں فال تیسرے فاتے، ہے حرام، حلال!

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ہو گئے نادہند اہل ہمم اب کسی کا کسی کو درد نہ غم

غور کیجے تو ہے صریح ستم بات اس مصرع پہ ہوئی ہے ختم

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا کروں یار و جاٹ کا میں بیان اوپنچی دوکان اور سڑاپہ کو ان

وے کہاوت ہے آخرش کو ندان اڑ گئی چٹیا رہ گئے دوکان

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

دیکھو یارو یہ کیا عجیب ہے طرح آقا کے کیا غراب ہے

جو کہ بھر دوا ہے سو مصاحب ہے مسخرا ہے سو پیارا نائب ہے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے



کوئی کچھ لینے کو جو یہاں آوے      پیسے دے، مارکھا، چلا آوے  
لاکھ کوئی اگرچہ چلا آوے      آقا سُن کر کہیں نہ شرم آوے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ہے مزاج تو بات جھوٹی میں      کچھ نزاکت نہیں ہے موٹی میں  
دیکھتا ہوں یہ طرز کھوٹی میں      جی رہے ہیں ہمیشہ روٹی میں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

اب تو رتبہ ہے زندگی کے تئیں      اور مراتب ہے خندگی کے تئیں  
کوئی نہیں پوچھے بندگی کے تئیں      پھٹے منہ ایسی زندگی کے تئیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

دھول ہے اب کے اس زمانے میں      خاک اڑتی ہے کارخانے میں  
کچھ برکت نہیں کمانے میں      گویا، بگھی چھی ہے خانے میں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کہیں ذرا شرم دل پہ نہیں لاتے      روز پھر تے ہیں غایہ سہلاتے  
تس پہ بھی حق اپنا نہیں پاتے      اس حماقت سے باز نہیں آتے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

بہتوں کی اب یہ آہ ہی گزر      ٹھیکرے کے پھرتے ہیں گھر گھر  
بعض کہتے ہیں دیکھ انھیں اکثر      لعنت ہے ایسی لوکری اوپر

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا کہوں بعضوں کی بھی شامت کو کچھ میسر نہیں حجامت کو

دیکھتے ہیں صریح قیامت کو جس پہ بھی مرتے ہیں قدامت کو

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

بعضوں کی گانٹھیں، نہ کچھ گھر میں وے اکڑتے پھریں نہ کنیں شر میں

دیکھ عالم انھیں بہت بھر میں جھ کو کچھ غرض نہیں، کہوں پر میں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

جو کہ صاحب طبع ہیں اہل دکا وے تو مرنے کی مانگتے ہیں دعا

ہاتھ میں تسبیح کے دل کو لگا یہ وظیفہ پڑھیں ہیں سب کو سنا

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ہو رہے ہیں فیضیے گھن گھور اور خرابی بجی ہے چاروں اُور

جس کو دیکھو سو زندہ ہے درگور رات کو جس پہ آوے ہیں چور

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

غرض ہے اب جہاں میں آیا آپ کوئی نہ بیٹا کو کا، کوئی نہ باپ

اپنا مطلب کریں ہیں سب پیپ چاپ پھر اسی مصرع پہ لگی ہے تھاپ

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ساری خلقت کو دیکھ کر غناک بسکہ حیرت کا ہوئے سینہ چاک

آنکھیں سب کی ہیں پر نہیں ہے ناک اس سوا اور کیا کہوں میں خاک  
 کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے  
 جس پہ برطرفی اور بحالی ہے  
 شہر آشوب بس کیا چہیے آگ و خاموشی ہی رہا چہیے  
 گزرے جو کچھ، سو سب پہلچہیے کوئی پوچھے تو یہ کہا چہیے  
 کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے  
 جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

## محسوس شہر آشوب

جگ میں کوئی کو کا یار نہیں یار بھی ہیں تو ان میں پیار نہیں  
 پیار وہ جس کا اعتبار نہیں اعتبار ہے سو برقرار نہیں  
 کو لٹا دل ہے جو کہ زائد نہیں  
 سوچ ہی میں کٹے ساری رات جی نہ چاہے وہ کہیے منہ سے بات  
 ماریے ایسی زلیست ادب پر لات اس زمانے کے ہاتھ سے یہ بات  
 عیش کا کچھ بھی سرور کا نہیں  
 کیا کہوں میں تبہ ہی دنیا کی بھوک کی، دکھ کی، اوسے ویلا کی  
 اور مصیبت کے صور پر پاکی بھاں تلک مفلسی نے اب جا کی  
 پگڑی سر پر ہے تو انا نہیں  
 اس سوا اور بھی یہ ندرت ہے دانا شخصوں سے سب کو نفرت ہے  
 زور ہی یہ خدا کی قدرت ہے نہ کہیں عیش ہے نہ عشرت ہے  
 جز حسناں کے کہیں بہار نہیں

فاضل آگے ہی کہہ گئے ہیں پکار      بعد اقبال کے ہے پھر ادبار  
زندگی کا مزا ہے دن دو چار      اس کو کس واسطے کروں اظہار  
یہ سخن کس پہ آشکار نہیں

کوئی نہ پوچھے اگر مرے کوئی      درد میں غم سب بھرے کوئی  
سر کو کاٹ ہاتھ پر دھرے کوئی      لاکھ حکمت اگر کرے کوئی  
تو بھی مطلب کا رو بکار نہیں

یاں تو جو کچھ کہ طرح ہے سو یہ ہے      مقصد ہونے کو میں کہا سودہ ہے  
جی میں آدے ہر سو جی میں رہے      چاہے کہنے کو بھی تو کس سے کہے  
ایسا کوئی یار غمگسار نہیں

تیل بن، گھر دیا جلے کیوں کر      آنچ بن چیز کوئی گلے کیوں کر  
پیسے بن کام بھی چلے کیوں کر      مفت چاہو سو کچھ ملے کیوں کر  
بادا جی کی تو ناکار نہیں

ایک نے جا بخومی سے پوچھا      کچھ ترقی کب ہوگی یہ مبتلا  
تب وہ بولا کہ ہے نرادر ہو کا      کون جانے کہ کل کیا ہوگا  
آج ہے اس میں پھیر بچار نہیں

جو کہ بالفعل ہیں گے اب سردار      وہ تو غفلت کی مدھ میں ہیں مرشار  
ساری بستی انھوں سے ہے بیزار      وقت بنا عذاب النار  
دینے کا کچھ بھی کاروبار نہیں

اُمّی ہیں سو مشیر صاحب ہیں      فیلیاں ہیں سو عمدہ نائب ہیں  
مسخرے ہیں سو وہ صاحب ہیں      اہل دانش انھوں سے نائب ہیں  
اس حماقت کا دار پار نہیں

سیر کو جب کہیں وہ جاتے ہیں      لال پیلے کی سیج دکھاتے ہیں  
طرزہ رکھ کر کے سر ہلاتے ہیں      چلتے ہیں بھاؤ سا بتاتے ہیں  
اس سوا ان کو اور کار نہیں



دیکھ کر یہ طرح، ہوا جی دنگ آقا ہو کے بجا دتے مردنگ  
 خنجر یارے کے گاوتے سارنگ اور غضب یہ کہ ایسے ہیں دل تنگ  
 جن کے انکل سپنے کا پار نہیں

صحبت ان کی عجب دھتیا ہے کوئی پتنگا کوئی تنٹیا ہے  
 ہے گویا کوئی، پنچیا ہے تانا رے رے ہے، تانا تھتیا ہے  
 "مرد آدم کو ان میں یار نہیں

شکل ایسی کہ جیوں سحر شہوت بولے لیے کہ جیسے بولے بھوت  
 کیوں نہ خلقت کہے انھوں کو کپوت لوٹ لڑیوں سے کتا کے نیچیں بوت  
 کہیں ذرا دل میں جن کے عار نہیں

مرد ایسے کر چو ہے سیتی ڈریں جنگ کا نام سن کے موت پھریں  
 چلو بھر پانی میں نہ ڈوب مریں یار سب مل کے ان کا ٹھٹھا کریں  
 تو بھی ذرا دہ شرمسار نہیں

ہیجڑوں کی سی جن کی چولی ہے جوتے اس سے پھر ٹھٹھولی ہے  
 بارہ مانسے جنھوں کی ہولی ہے روز شب جن کا درس گولی ہے  
 قابلیت کا کچھ شمار نہیں

نوکر حق مانگنے کو جب آویں ایک رو پیہ انھیں نہ دلاویں  
 وقت پر دے بھی خایہ بتلاویں ایسے برتے پہ آقا کہلاویں  
 بے شعوری کا کچھ شمار نہیں

دوسرے اور یہ بڑا جنجال ایک عالم پھر سے ہے بیت المال  
 جھوٹ، چغلی، دغا کا مالا مال کارکن ہے سو وہ بھی خرا، دجال  
 رحم کا دل میں جس کے بار نہیں

پھوری اوپر ہے عالموں کی نگاہ رکنا، رشوتی سے مار سیاہ  
 بخشش کہ جن پہ ہے سپاہ کی آہ دیوان سیتی پناہ دے اللہ  
 معتبر کوئی اہلکار نہیں

شخصیت ہی نہیں کہوں کس میں      ہے عناد اور نفاق آپس میں  
جلئے جنت کے کچھ نہیں اس میں      کون سا گھر ہے یہ کہو جس میں  
خانہ جنگی و کارزار نہیں

خوب ہی میں نے غور کر دیکھا      یہاں بزرگی کو سب نے مل چھیکا  
چاہیں جس کو کریں میں چومینا      نہ حساب ہے نہ جس کا کچھ لیکھا  
ان کے گرنے کو کوئی غار نہیں

ایسا اندھیر بھی سنا ہے کہیں      جس کو دیکھو سو ہے وہ قابو چہیں  
غیر کے کام میں نہٹ، بد میں      کیوں نہ رسوا کروں میں ان کے تہیں  
ان کو کچھ اور روزگار نہیں

یا اپنی زیادہ اب نہ جلاؤ      ہو نا ہو کل سو آج ہی ہو جاؤ  
چار سو کا ہے بے طرح کچھ بھاؤ      خندوں کو راگ، ناچ، قلیہ، پلاؤ  
مستحقوں کو موزہ ہار نہیں

کام کے لوگوں کو تو موت آئی      اب نکمہوں نے دھوم پھیلائی  
راست گفتہ کہے زدانائی      گنگ نشیند بجائے گپائی  
اس پر ابر تباہ کار نہیں

ناک، کان، آنکھیں، خوردن و آشام      اہیہاں مہ ہے اے ذوی الاکرام  
پرندار ہے عین، قاف اور لام      ڈوبے دیکھو صبح یا شام  
اس میں کچھ دیر نہ ہار نہیں

جو کہ آگو بڑے تھے دولت مند      نبھا، اشراف کو رکھے تھے پسند  
ان کی حالت کہوں میں اب تاچند      اس قدر ہوئی انھوں کی آمد بند  
پالکی کو جنھیں کہار نہیں

جو خوشی پہنچ دن کو بھرتے تھے      نیک نیت پہ دل کو دھرتے تھے  
اور بدی سے بہت سا ڈرتے تھے      سب طرح کا وہ حفظ کرتے تھے  
ان میں اب کوئی مالدار نہیں

جن کا خوبی میں نام تھا مشہور اور زری، باب سے تھا گھر معمر  
 جانتے ہی نہ تھے وہ حرف غرور کام آگے تھے سب کے وقت ضرور  
 ان کے اب تو ایک تار نہیں

لٹکری سارے، ہاتھ دھو ہی چکے جو طلب تھی اسے ڈبو ہی چکے  
 برے کے جی کو خوب رو ہی چکے یہاں برائی کا بیج بو ہی چکے  
 کچھ سمجھ کا جنہیں بچار نہیں

دل ہوا ہے کیا ب، اب جل کر جی میں ہے اس طرف سیتی ٹل کر  
 کسو کے ساتھ ہر طرح مل کر اپنا دن کاٹیے کہیں چل کر  
 ایسے کوئی دوست تین چار نہیں

چاہیے یوں کہ دور ہو آلام مے ہو، مطرب ہو، ساتی ہو اور جام  
 وہ میسر ہو تازہ نہیں گلغام جس کے دیکھے سے جی کو ہو آرام  
 لیکن اپنا کچھ اختیار نہیں

ایزد اپنی آسمان میں رکھے جب ملک اس جہان میں رکھے  
 شادی و کھان پان میں رکھے جاہ و حشمت کی شان میں رکھے  
 اس سے بہتر کوئی وقار نہیں

# غالب کی حیاتِ معاشرۃ

مگر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھالیتا اسد

میری دلی میں ہی ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے ! (قبل ۱۸۳۱ء)

عزل ایک داخلی صنفِ سخن ہے جو بلبوس ہوتی ہے کنایات و ملامت کی تہ داری میں۔ اسی لیے اس کی داخلیت سے کسی قسم کی خارجیت کا استخراج ایک نازک مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے میں خواجہ منظور حسین جیسے ادبیات کے دیدہ ورس نے ایک ٹکڑی صرف کر دی ہے اور چند عزل گو شعراء مثلاً امیر، ظفر، ذوق، حالی اور داروغہ کے کلام سے بعض تاریخی حالات و معاملات کا استخراج بھی کیا، لیکن غالب کے سلسلے میں انہیں بھی زیادہ کامیابی نہ ہو سکی۔ وہ غالب کے تعلق سے اس ”دورانِ انحطاط“ کے صرف چند نقوش عمومی بیانات کے طور پر فراہم کر سکے ہیں۔ ان کے ان بیانات میں بہر حال ایک تاریخی استحکام اور استدلال کی صورت ملتی ہے، یہ دیگر شارحین و ناقدین کے اس رویے کے بالکل مختلف ہے، جو غالب کے کلام کے تاریخی ارتقا اور اداسے ناواقفیت کی بنا پر ایک دور کا شعر دوسرے دور کے تاریخی حالات پر چسپاں کر دیتے ہیں؛ خاص طور پر جب ڈاکٹر سید محمود کی طرح غالب کو ایک وطن پرست شاعر ثابت کرنا

۱۔ اردو عزل کا خارجی روپ، ہر روپ ۱، لاہور، ۱۹۸۱ء

۲۔ اس تصنیف کے تلمنے ہانے خواجہ منظور حسین نے تقسیم ملک سے قبل اپنے علی گڑھ کے قیام میں کیا کر یے تھے

۳۔ ۴۰ صفحات کی اس تصنیف میں وہ مشکل چار صفحوں کا مواد فراہم کر سکے جو مشکل ہے غالب کے چند اشعار اور، ۱۸۸۵ء

۴۔ کے ہنگامے۔ یہ متعلق ایک قطعے پر۔ یہ تمام چیزیں بھی شعری نقطہ نظر سے دوم درجے کی ہیں۔

۵۔ مقدمہ دیوانِ غالب



مولانا ابیاد علی عرشی اور کالی داس گیتارنا کی کاوشوں سے اب غالب کا اردو کلام بڑی حد تک تاریخی ترتیب پا چکا ہے۔ خاص طور پر غالب صدی کے موقع پر (۱۹۶۹ء) گنج باد آورد کے طور پر ان کے ابتدائی کلام کے مجموعے ”دیوان بخط غالب“ کے انکشاف کے بعد ان کے کلام کی تاریخی ترتیب میں بہت سہولت ہو گئی ہے جس سے اس ”گنجینہ معنی کے طلسم“ شاعر کی شخصیت کے بہت سے پرت کھلنے لگے ہیں۔

چوبیس پچیس برس کی عمر تک غالب نے ایک ”بند شاہد باز“ کی حیثیت سے زندگی گزار لی۔ مذکورہ سرور کے مصنف نے جو غالب کے دوست تھے۔ انہیں ایک ”درومند“ (عاشق) اور پروردہ عشق مجاز“ شخصیت کا مالک بتایا ہے۔ خود غالب اس دور میں اپنے ”فنی و فخر اور عیش و عشرت میں اہماک“ اور شور و سوائے پری چہرگاں کا ذکر کرتے ہیں۔ دیوان بخط غالب (۱۸۱۶ء) کے ایک شعر میں ایک ”جفا مشرب“ شیوہ محبوبہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد

مال سنی کو مباح اور خون صوفی کو حلال

نثر بھوپال (حمیدریہ) جس کی تکمیل کے وقت (۱۸۲۱ء) غالب کی عمر ۲۴ سال کے قریب تھی،

وہ بری طرح ”عشرت صحبت خواں“ میں ”اپنی عمر طبعی“ کی پروا نہ کرتے ہوئے مہمک تھے۔

عشرت صحبت خواں ہی غنیمت سمجھو

نہ ہوئی غالب اگر عمر طبعی نہ سہی

(قبل ۱۸۲۱ء)

۱۔ دیوان غالب، (نہج شرقی اردو دہند)، طبع دوم

۲۔ دیوان غالب (کامل)، بمبئی، ۱۹۸۸ء

۳۔ مذکورہ بالا ’بیشہ شعر‘ کی سیاحت دشوار ثابت ہو تو دیکھئے، انتخاب کلام غالب، مکمل، مرتبہ مسعود حسین

سر سید بک ڈپو، جامو اردو، علی گڑھ، ۱۹۵۱ء

۴۔ یہ تذکرہ ”عمرہ منتخبہ“ ۱۸۰۰ء کا ہے۔ (مرتبہ ہوتا رہا جس میں مسلسل اضافے ہوتے رہے ہیں۔

۵۔ ذکر غالب، مالک رام ص ۲۹ (طبع چہارم)

شاہد یازی' میں یہ غالب کا عروج کا زمانہ تھا کہ وہ واقعہ ہائے پیش آیا جس کی یاد انھیں عمر بھر ستاتی رہی۔ ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں اپنے عزیز دوست مرزا حاتم علی بیگ تھرکڑ آبادی کو ان کی محبوبہ کے انتقال پر تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”جناب مرزا صاحب، آپ کا غم افزا نامہ پہنچا، میں نے پڑھا، یہ یوسف علی خاں کو پڑھوایا۔ انھوں نے جو میرے سامنے، اگس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا، یہ یعنی اس کی اطاعت اور تہاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بھری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی، تین فن میں سرد فزا اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بھری سے ٹکڑے کھا دے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہوئے۔ لیکن اس کے سامنے مری تھی، تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیں اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی! مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ بالآخر یہ کوہ چھٹ گیا۔ اس فن میں بیگانہ محض ہو گیا، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامہ سازی عشق مجازی چھوڑو۔۔۔“

مرزا حاتم علی بیگ تھرکڑ کو یہ خط غالب نے ۱۸۶۰ء میں لکھا تھا، اس وقت غالب کی عمر ۶۳ برس کے قریب تھی۔ واقعہ کو غالب کی یادداشت کے مطابق چالیس بیالیس سال گزر

چکے تھے۔ میرے خیال میں ”چالیس یا لیس“ سال سنہ ہجری کے ہوں گے، اس لیے کہ غالب سنہ عیسوی سے واقف ہونے کے باوجود اپنی عمر کا شمار ہمیشہ سنہ ہجری میں کرتے تھے۔ سنہ ہجری اور عیسوی میں ۳۶ سال کے اندر سال بھر کا تفاوت پڑ جاتا ہے۔ یعنی سنہ ہجری، سنہ عیسوی سے سال بھر چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اس حباب سے یہ واقعہ سنہ عیسوی میں ۱۸۱۸ء متا ۱۸۲۱ء کے درمیان کا ہو گا۔ یہی زمانہ نسخہ ”بھوپال (حمیدیہ) کی تصنیف کا ہے جس کی تکمیل ۱۸۲۱ء میں ہوئی تھی اور جس کے متن میں غالب کی ہائے ہائے ردیف والی غزل کا اندراج ملتا ہے اس طرح یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ اسی ”بڑی ستم پیشہ ڈومنی“ کی المناک موت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، جسے غالب ۱۸۶۰ء تک نہیں بھولے تھے۔ اور قہر کی مجاہدہ کے انتقال پر ان کی اپنی مجاہدہ کی یاد کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے تھے!

اب اس غزل کا متن ملاحظہ کیجیے جیسی کہ نسخہ ”بھوپال (حمیدیہ) میں درج ہے۔

۱۔ درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے!

کیا ہوئی، ظالم، مری غفلت شعاری ہائے ہائے!

۲۔ تیرے دل میں گم نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ

تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے!

۳۔ اس میں شبہ نہیں کہ مرثیہ نما اس غزل کا اندراج دیوان بختِ غالب (۱۸۱۶ء) میں بھی ملتا ہے، لیکن وہاں یہ حالتِ شبہ پر ہے اور کسی دوسرے کے قلم سے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل ۱۸۱۶ء کے بعد کہی گئی ہے اور اس نسخے میں جہاں اور چودہ غزلوں کا اندراج حواشی پر ملتا ہے، ان میں یہ بھی شامل ہے۔ (دیکھیے نسخہ ”عرشی زادہ“)

۴۔ کمال داس گپتا رضائے دیوانِ غالب (کامل) میں اس غزل کو بعد از ۱۸۲۱ء کا بتایا ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جب کہ یہ نسخہ ”بھوپال (حمیدیہ) کے متن میں درج ہے اور بحر شعر نمبر ۱۳ (دوسرا مقطع) جس پر ”مطبوعہ“ لکھا ہوا ہے غزل کے باقی اشعار پر قلمی کا اندراج ہے، جس سے نسخہ ”بھوپال کا متن مقصود ہے۔

- ۳- کیوں مری غم خواری کا تجھ کو آیا تھا خیال ؟
- ۴- دشمنی اپنی تھی ، میری دوستداری ہائے ہائے !  
عمر بھر کا تو نے بیمانِ وفا باندھا تو کیا ؟
- ۵- عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری ، ہائے ہائے !  
زہر لگتی ہے ، مجھے آب و ہوائے زندگی
- ۶- یعنی ، تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے !  
گل نشانی ہائے بازِ جلوہ کو کیا ہو گیا ؟
- ۷- خاک پر ہوئی ہے تیری لالہ کاری ، ہائے ہائے !  
شریم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
- ۸- ختم ہے الفت کی ، تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے !  
خاک میں ناموسِ بیمانِ محبت مل گئی
- ۹- اٹھ گئی دنیا سے راہِ درسمِ یاری ہائے ہائے !  
ہاتھ ہی تیغِ آزما کا کام سے جا سنا رہا
- ۱۰- دل پہ اک ، لگنے نہ پایا ، زخمِ کاری ہائے ہائے !  
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال ؟
- ۱۱- ہے ، نظر ، فو ، کردہ اختر شماری ، ہائے ہائے !  
گوشِ مہجورِ پیام و چنمِ محسوسِ جمال
- ۱۲- ایک دل ، بس پر یہ نا امید داری ، ہائے ہائے !  
مگر مصیبت تھی ، تو غربت میں اٹھالیتا اسد
- ۱۳- میری دلی ہی میں ہوئی تھی یہ خواری ہائے ہائے !  
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ، ہائے ہائے !

یہ غزل متبادل دیوان میں بغیر کسی حک و اصلاح کے جوں کی توں برقرار رکھی گئی ہے البتہ



نمبر ۱۳ (مقطع اول) حذف کر کے نمبر ۱۳ (مقطع دوم) کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ عمل غالباً ۱۸۳۳ء میں متداول دیوان کا مبیضہ تیار کرنے سے پہلے کر دیا گیا ہوگا۔ دوسرا مقطع (نمبر ۱۳) پہلے مقطع سے (نمبر ۱۳) کہیں زیادہ پختہ اور عمومی صداقت کا حامل ہے۔ اس میں جذبے یا اظہار کی وہ ناہنجشکی نہیں ملتی جو مقطع اول (شعر ۱۳) سے ظاہر ہے۔ مختص بھی اسد کے بجائے غالب کر دیا گیا ہے۔ دوسرے مقطع (نمبر ۱۳) میں اس 'سوائی' اور خواری کی واردات پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ جس کی جائے وقوع دہلی کے کوچہ و بازار تھے۔ دوسرا مقطع پہلی بار نسخہ رام پور قدیم میں درج ملتا ہے، جو بقول عمرتی متداول دیوان کا پہلا نقش ہے۔

قبل اس کے کہ ہم غالب کی عشقیہ واردات کا تجزیہ کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فلسفہ عشق کے بارے میں چند نکتے بیان کر دیں۔ اپنے دوست مرزا حاتم علی بیگ تھر کو ایک دوسرے خط میں ران کا محبوبہ کی موت پر مسلسل جزع و فزع کرنے پر، یوں رقم طراز ہیں:

”مرزا صاحب! اہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پیشہ برکس کی عمر ہے،

پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی۔ کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر، بجالاؤ، غم نہ کھاؤ، اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چٹا جان نہ سہی مٹا جان سہی۔۔۔“

حسن و عشق میں انفرادیت پسند غالب کے اس آزادانہ مسدک کے باوجود جس "بڑی ستم پیشہ ڈومنی" کو انہوں نے "مادر کھا" تھا اس کی یاد ساری عمر ان کی دامن گیر رہی، لہٰذا مذکورہ بال غزل باریک بینی کے ساتھ تجزیہ چاہتی ہے۔ یہ ہی نہیں نسخہ بھوپال (حمید یہ) کے دور کی ان تمام غزلوں پر بھی نظر رکھنی ہوگی جن میں غالب نے "دل کے داغ نمایاں" کیے ہیں۔



کی حیثیت رکھتی تھی، کبھی نہیں ہوتی تھی۔ میرے قصبے، قائم گنج (ضلع فرخ آباد) میں، میرے بچپن تک ڈومنیوں کا گھریلو تقریبات میں آکر گانا بجانا عام تھا۔ یہ لوگ 'ڈوم' کے بجائے خود کو 'سرودی' کہلاتے جانے پر اصرار کرتے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ بھی پٹھان ہیں۔ جن کے آباد اجداد قائم گنج کے دیگر آفریدی پٹھانوں کی طرح صوبہ سرحد سے ہجرت کر کے قائم گنج آئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں ان کی ذات میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، البتہ پیشے کے اعتبار سے وہ گائے بجاتے تھے۔ اور یہی ان کی معاش کا وسیلہ تھا۔ بیگمات اور دھکی مصاحبت میں جو ڈومیاں رہتی تھیں وہ عام ڈومنیوں سے خود کو اعلیٰ و برتر سمجھتی تھیں۔ بہر حال ان کا کبھی نہ ہونا مسلم ہے۔ اس کا امکان ضرور تھا کہ بڑے گھرانوں میں جہاں وہ گانے بجانے جاتی تھیں وہاں کا کوئی من چلا رئیس زادہ کسی طرح دار ڈومنی سے تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ امکان اس وقت بڑھ جاتا تھا جب رئیس زادہ (غالب کی طرح) شاعر ہو اور ڈومنی خواندہ و سخن فرم ہو۔ دونوں کے درمیان یہ کاروبار عشق نہایت خفیہ اور بڑوں کی نظر سے بچا کر ہوتا تھا۔ اس لیے کہ رسوائی کا خوف دونوں طرف ہوتا۔ لیکن عشق اور مشک دونوں کب چھپتے ہیں، بھاپنے والے بھانپ جاتے۔ بالکل یہی صورت غالب کے اس معاملے کی ہوئی۔

یہاں ہمیں یہ نہیں بھونا چاہیے کہ غالب، امراؤ بیگم کے رشتے سے خاندان لوہارو کے داماد بن چکے تھے۔ ان کے خسر اپنی بخش معروف و نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے، ایک عرصے تک عیش و نشاط کی زندگی گزارنے کے بعد تائب ہو کر صوفیہ کے حلقے میں داخل ہو چکے تھے۔ غالب کی شادی کو تقریباً ۶، ۷ سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں وہ کئی بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے، ایسے میں اچانک اس تازہ واردات کا پیش آنا ان کے اور ان کی محبوبہ دونوں کے لیے باعث خواری و رسوائی تھا۔ اس لیے ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ واقعہ غربت میں دلی سے پرے کہیں ہوا ہوتا ہے

گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھا لیتا اسہ

میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے!

غالب ہزار بادہ خوار سہی لیکن ثقبات لوہارو کی لاج رکھنا ان کے لیے بنی ہوئی



تھے۔ جمیل الدین عالی نے اپنے خاندان کے کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ غالب اپنی مذہب و حرکات کی وجہ سے لوہارو خاندان میں ابھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ خود غالب بھی ”ستم ہائے عزیزاں“ کے شکی تھے۔ دہلی سے بے زاری کا ذکر انہوں نے اس دور کے ایک اور شعر میں بھی کیا ہے :

دہلی کے رہنے والو اسد کو کستاؤ مت

بے چارہ چند روز کا۔ بھال جہان ہے (قبل ۱۸۳۱ء)

غالب اپنی تعقل پسندی کے سبب جان کو عزیز جانتے ہوئے اس واقعہ سخت کی تاب لے آئے۔ لیکن وہ ”ستم پیشہ“ خود اپنا شکار ہو گئی۔ غزل کا آغاز اس کی جاں کنی کے عالم سے ہوتا ہے، اس عالم میں بھی وہ شکوہ کناں ہے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری، ہائے ہائے!

کیا ہوئی ظالم، تری غفلت شعاری، ہائے ہائے!

شکوے کی یہ نئے بند ہوتی جاتی ہے جب وہ تیسرے اور چوتھے شعر میں اپنے محبوب سے کہتی ہے کہ اگر تیرے دل میں ”آغوشِ غم“ کا حوصلہ تھا تو پھر تو نے میری ”غم گساری“ کا دم کیوں بھرا تھا۔ تیرے عمر بھر کے ”پیہنِ وفا“ باندھنے سے کیا فائدہ؟ تو میری حالتِ زار کو دیکھ کہ عمر کو بھی پائنداری نہیں ہے۔

جو تھے شعر تک عالم نزع میں محبوبہ کی زبان سے شکوہ کیا گیا ہے۔ بعد کے شعروں میں اس کی الم ناک موت پر شاعر نے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ پوری غزل ایک ڈرامائی انداز میں لکھی گئی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ محبوبہ کی آواز کون سی اور شاعر نے اپنی آواز کہاں سے شامل کر دی ہے۔ جیسا کہ ’۶‘، ’۷‘ اور ’۸‘ میں شعر سے ظاہر ہے۔ محبوبہ نے ”شرمِ رسوائی“ کے خوف سے ”نقابِ خاک“ میں جا چھپنا پسند کیا۔ یعنی خود کشی کر لی۔ شاعر کو اب زندگی زہر لگنے لگی۔ اس لیے کہ وہ وفا کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترا۔ وہ گل اندام جو اپنے نازِ جلوہ سے گل افشانی کرتی تھی، آج خاک پر اپنی لالہ کاری دکھا رہی ہے اور یہ سب اس نے ”شرمِ رسوائی“ اور بدنامی کے خوف کی بنا پر کیا ہے۔ محبوبہ کی موت شاعر کے لیے سارے جہاں



کی موت ہے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا سے 'راہِ وِرم یاری' جیسے اٹھ گئی ہو۔

غالب کی عشقیہ واردات کا یہ دور زیادہ طویل نہیں تھا۔ میرے خیال میں بس دو برس، اسی لیے انھوں نے ۱۸۹۰ء میں اسے چالیس یا پچاس برس کا واقعہ بتایا ہے، یوں ہے کہ غالب کہتے ہیں کہ ابھی عشق کا زخم کاری 'دل پر لگنے بھی نہیں پایا تھا کہ یہ ڈراما محبوبہ کی خودکشی پر اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ اب روتی برسات کی تاریک رات ہے اور وہ ہیں۔ ہجر میں جو وقت وہ "آخر شماری" کے سہارے کاٹتے تھے، اس کا بھی موقع نہیں۔ نہ تو گوشت تک محبوبہ کی "گلا تگِ تسلی" پہنچتی ہے اور نہ چشمِ اس کے "جلوہِ ناز" کی گل افشانی دیکھ پاتی ہیں۔ شہرِ دہلی اب انھیں کاٹتے لگا ہے۔ اور وہ 'غربت' کے متلاشی ہیں۔ نئے مقطع میں بھی انھیں احساس ہے کہ عشق نے ابھی جنون کی کیفیت اختیار نہیں کی تھی کہ بساطِ محبت اُلٹ گئی ہے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ

دل میں جو کچھ رہ گیا تھا ذوقِ خواری ہائے ہائے!

ہر چند غالب نے اپنے عشق کی نوعیت "مصری کی مکھی" کی بتائی ہے اور غالباً اُن کے دیگر معرکہ ہائے عشق اسی نوعیت کے ہوں گے، لیکن "ستم پیشہ ڈومنی" سے جسے انھوں نے "مارکھا" تھا دل کی لگی کو ہم صرف دل لگی کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔ اس لیے اس دور کی ان تمام عزتوں پر بھی نظر ڈالنی ہوگی جہاں جہاں اس کا عکس ملتا ہے۔ محولہ بالا غزل میں واردات کے اثبات کے بعد باقی کام قیاس کے لیے رہ جاتا ہے۔

اس دور کی ایک اور غزل جس میں یادِ ماضی کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے، المیہ کے ایک سال بعد کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ یہ غزل نسخہ بھوپال (حمیدیہ) کے حاشیہ پر درج ملتی ہے۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟

فرست کار و بار شوق کے ؟  
 ذوقِ نظارۂ جمال کہاں ؟  
 دل تو ذل، وہ دماغ بھی نہ رہا  
 شورِ سودائے خط و خال کہاں ؟  
 تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں ؟ (بعد ۱۸۲۱ء)

”اک شخص“ اب غالب کی شاعری کا استعارہ سا بن گیا ہے۔ واردات سے زمانی قرب  
 کے پیش نظر یہ ”اک شخص“ وہی ”ستم پیشہ“ تو نہیں جس کو چالیس پالیس سال بعد بھی  
 یاد کر کے چیخ اٹھتے ہیں، ”اُس کا مزہ زندگی بھر نہ بھولوں گا۔“  
 غالب دو سال کے معاملاتِ عشق و محبت میں سبھی نشیب و فراز سے گزر گئے، شوق و میل  
 غم، ہجراں، پھیڑ چھاڑ، حتیٰ کہ دھول دھپا تک۔

دل دیا جان کے، کیوں اس کو وفادار اسد

غفلتی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا (قبل ۱۸۲۱ء)

فلک کو دیکھ کے، کرتا ہوں اُس کو یاد اسد

جفا میں اس کی ہے، انداز کا رفسر ماکا (قبل ۱۸۲۱ء)

معاملاتِ حسن و عشق میں غالب عام طور پر مغلوب نظر آتے ہیں۔ ان کا محبوب ہر زمانے  
 میں ”ستم پیشہ“ اور ”جفا مشرب“ رہا اس لیے اللہ کا یہ شیر (اسد اللہ) کو چہ عشق میں جا کر گبیلی  
 بن جاتا ہے۔

دہن شیر میں جا بیٹھے لیکن اے دل !

نہ کھڑے ہوئے خوبانِ دل آزار کے پاس (قبل ۱۸۲۱ء)

اپنی بے بسی پر کبھی کبھی ہنچلا ہٹ آتی ہے تو یہ ردِ عمل ہوتا ہے۔

ہے ہے، خدا نخواستہ ! وہ اور دشمنی

اے شوقِ منفعل ! یہ تجھے کیا خیال ہے ؟ (قبل ۱۸۲۱ء)

لیکن غالب کے لیے ترکِ محبت ناممکن ہے۔ یہ ان کی زندگی ہے۔ بالآخر پھر مجھو بہ کے قدموں پر آجاتے ہیں۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی ہے  
میری وحشت، تری شہرت ہی ہے  
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے  
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی ہے  
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟  
اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی ہے  
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں  
نہ سہی عشق، مصیبت ہی ہے  
ہم بھی تسلیم کی ٹھو، ڈالیں گے  
بے نیازی تری عادت ہی ہے  
یار سے پھیڑ چلی جاتے، اسد  
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی ہے

(بعد ۱۸۶۱ء)

معاملاتِ حسن و عشق میں کامرانی اور ناکامی کے نشیب و فراز آتے ہیں خاص طور پر جب  
محبوبہ 'ستم پیشہ' اور 'جفا مشرب' ہو۔ کار و بارِ محبت کی یہ دھوپ چھاؤں ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔  
چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے  
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے  
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟  
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے  
اپنی، رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی  
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے  
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے  
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد  
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے  
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے  
لیکن غالب کی صورت ایسی تو نہ تھی کہ 'خوب رویوں' کو ناخوب معلوم ہو۔ مرزا حاتم علی  
بیگ ہتر کو اپنے جوانی کے حیلے کے بارے میں لکھتے ہیں:-

۱۔ نسخہ بھوپال (حمید) کے حاشیہ پر نوٹ: نسخہ بھوپال کے ناپید ہو جانے کی صورت میں یہ بتانا کہ  
واشی میں درج غزلوں کی نوعیت کیا تھی، ذرا مشکل ہے۔ اس لیے ایسی تمام غزلوں کو بعد از ۱۸۶۱ء تصور کرنے  
کا تحقیقی جواز نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ کچھ غزلیں حاشیہ پر نہیں بلکہ آخر میں چپاں زائد اوراق میں درج تھیں،  
۲۔ یہ غزل نسخہ بھوپال (حمید) کے آخر میں اضافہ شدہ اوراق میں درج تھی۔

”بہر حال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپی تھا۔ اور دیدہ و رنگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔۔۔“

غالب کی عشقہ واردات میں رشک و رقابت ایک خاص جذبہ ہے، جو مجو بہ سے منسوب ہر دور میں پایا جاتا ہے۔ اس ”ستم پیشہ“ کو وہ کیوں کر بخش سکتے تھے؟

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف عقل کہتی ہے کہ وہ بے ہر کس کا آشنا؟ (قبل ۱۸۲۱ء)

گو تم کو رخصا جوئی اغیار ہے لیکن جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے (قبل ۱۸۲۱ء)

”ستم گر و ستم پیشہ“ مجو بہ سے غالب کی عشقہ واردات اور معاملات کا مجموعی تاثر حزیں مرتب ہوتا ہے۔ یہ تاثر حسب ذیل دو مشہور غزلوں کے منتخب اشعار سے کیا جاسکتا ہے جو اسی دور (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۱ء) سے یادگار ہیں:

آہ کو چاہے اک عمر اثر ہوتے تک  
کون جیتا ہے، تری زلف کے سر ہوتے تک  
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب  
دل کا کیا رنگ کروں، خون جگر ہوتے تک  
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن  
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک



نہ گلِ نغمہ ہوں ، نہ پردہ ساز  
تو اور آرایشِ سخم کا کل  
لافِ تمکین ، فریبِ سادہ دلی  
ہوں گرفتارِ آفتِ صبا و  
وہ بھی دن ہو ! کہ اس ستم گرے  
نہیں دل میں مرے وہ قطرہِ خوں  
اے ترا غمزہ ! یک قلم انگیزا  
جھ کو پلوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا  
اللہ خاں تمام ہوا  
میں ہوں اپنی شکست کی آواز  
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز  
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز  
دور نہ باقی ہے طاقتِ پرواز  
ناز کھینچوں ، بجائے حسرتِ ناز  
جس سے مرزاں ہوئی نہ ہو گلاب  
اے ترا ظلم ! سر بسر انداز  
میں غریب اور تو غریب نواز  
اے دریغا ! وہ رند شاہد باز

غالب نے یہ اشعار ۲۴ سال کی عمر سے قبل سپردِ قلم کیے تھے۔ اس وقت تک ان کی 'رندی' اور شاہد بازی' کے چرچے دلی کے گلی کوچوں میں عام ہو چکے تھے۔ لوہارو خاندان کے اکابرین و بہنوں ان کے خیر الہی بخش معروف ، ان کی نوجوانی کی رنگ رلیوں سے بخوبی واقف تھے۔ الہی بخش معروف نے تو غالب کی اس دور کی ایک عاشقانہ غزل کی تفسیر تک لکھی تھی۔ کاش وہ اس غزل کے بین السطور معنی سے آشنا ہوتے ، اور اس 'آفت' کو جان سکتے جس میں غالب اپنے دل کے ہاتھوں سے گرفتار تھے۔

اپنا احوالِ دل زار کہوں یا نہ کہوں ؟

ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں ؟

نہیں کہنے کا میں تقریرِ ادب سے باہر

میں بھی ہوں محرمِ اسرار ، کہوں یا نہ کہوں ؟

اپنے ہی دل سے ، میں احوالِ گرفتاریِ دل

جب نہ پاؤں کوئی غم خوار ، کہوں یا نہ کہوں ؟

دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا

ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں ؟

میں تو دیوانہ ہوں، اور ایک جہاں ہے غماز

گوشش ہیں در پس دیوار، کہوں یا نہ کہوں؟

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد

حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں؟

ان کی اس دور کی ایک اور مشہور غزل کے بعض اشعار میں غالب کی اس عشقیہ واردات کا دردناک

عکس ملتا ہے۔ غالب کا یہ شہکار بھی اسی ستم پیشہ، کامرہوں منت معلوم ہوتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے نزلیت کا مزا پایا یا

درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا یا

غنیچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل

خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا یا

حال دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی

ہم نے بار بار ڈھونڈھا، تم نے بار بار پایا (قبل ۱۸۲۱ء)

اس دور کے چند اور اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں جن سے بھی "اک شخص کے تصور" کی کر نیں

پہنچی ہیں۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترارہ گزر یاد آیا (قبل ۱۸۲۱ء)

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و فاسے چھوٹوں

وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا (قبل ۱۸۲۱ء)

یہ غزل دیوانِ انجمنِ محض معروف (متوفی ۱۸۲۶ء) کے ایک گیس میں مٹی ہے۔ اس لیے متداول دیوانِ غالب میں شامل

ہونے سے رہ گئی۔ کالی داس گپتا نے اس لیے اس پر بھی "بعد از ۱۸۲۶ء" لکھا ہے (دیوانِ غالب دکن) ص ۲۰۳

حالات کہ یہ ۱۸۲۱ء سے قبل کی بھی ہو سکتی ہے۔

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجیے

ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا (قبل ۱۸۲۱ء)

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا (قبل ۱۸۲۱ء)

مرے دل میں ہے غالب، شوقِ وصل و شکوہ، بھراں

خدا وہ دن کرے، جو اس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی (قبل ۱۸۲۱ء)

غالب کی عشقہ واردات میں صرف فراقی پہلو نہیں تھے معاملہ بندی کی وہ تمام سلطنت بھی موجود ہیں جو اس قسم کی آئادِ محبت میں پیش آتی ہیں اسی لیے تو کہا ہے

جب کرمِ رخصتِ بے باکی و گستاخی ہے

کوئی تقصیر، بجز خجلتِ تقصیر نہیں (قبل ۱۸۲۱ء)

اور جب کرمِ رخصتِ بے باکی و گستاخی نہیں دیتا ہے تو یہ ”عذرِ مستی“ درمیان میں لا کر دھکی دیتے ہیں :

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن

ورنہ ہم پھڑکیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن (قبل ۱۸۲۱ء)

اور اپنی ”پیش دستی“ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں :

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن (قبل ۱۸۲۱ء)

اور کبھی کبھی معاملاتِ عشق میں یوں بھی ہوتا ہے :

اسدِ خوشی میں مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کہا جب اس نے، ذرا میرے پاؤں داب توڑے (بعد ۱۸۲۱ء)

ابھی غالب دھول دھپا اور پاؤں دابنے کی رخصتِ بے باکی و گستاخی کی داد دینے بھی نہ

پائے تھے کہ محبوبہ کی موت نے بساطِ عشق الٹ دی۔ غالب کی ناکام اور مختصر محبت کی کلید اس شعر میں ملتی ہے۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد

تھا لکھا بات کے بتتے ہی جدا ہو جاتا (بعد ۱۸۲۱ء)

غالب کی رنگ رلیوں کا یہ دور ۲۴، ۲۵ برس کی عمر کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ 'رندِ بادہ خوار' رہے لیکن 'شاہد بازی' اور 'غمِ عشق' سے مزہ موڑتے گئے۔ ۱۸۲۶ء میں اپنے خسر الہی بخش معروف کے انتقال کے بعد وہ 'غمِ روزگار' میں مبتلا ہو گئے اور اسی سال اپنی پنشن کی بازیافت کے لیے کلکتے کے سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ غالب اپنی متاہرانہ زندگی سے مطمئن نہیں تھے۔ اپنے خطوط میں انھوں نے بار بار لکھا ہے کہ وہ تاہل کے آدمی نہیں تھے اور نہ ایک عورت کے ساتھ ساری زندگی گزارنا (چاہے وہ حور کیوں نہ ہو) ان کا مشرب تھا۔ جو حالات و واقعات پہنچے ہیں ان سے علم ہوتا ہے کہ امرا و بیگم سے انھوں نے ساری عمر نبھایا ہے۔ ان کے اور غالب کے درمیان کوئی شے قدرے مشترک نہیں تھی؛ مسکن الگ، کھانے کے برتن الگ، وہ بیچ وقتہ مصلوٰۃ کی پابند، ان کی طبیعت ادھر نہیں جاتی، وہ روزہ دار، غالب روزہ خوار، غالب کی شراب نوشی ان کے لیے باعثِ آزار ہی۔ ان کی صوم و مصلوٰۃ کی پابندی کا ٹھٹھول وہ یہ کہہ کر اڑاتے، تم نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا رکھا ہے۔

ایسے حالات میں غالب کا کسی طرح سے 'جو غالباً مذاقِ سخن بھی رکھتی تھی، ربط و ضبط بڑھالینا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ غالب نے اسے اپنی شاعری میں کبھی شوخ، کبھی جفا مشرب، کبھی کافر صنف، کبھی ستم گر اور ستم پیشہ اور کبھی 'ایک شخص' کے نام سے یاد کیا ہے۔ رسوائی کا خوف دونوں طرف تھا۔ غالب کو منہ چھپانے کے لیے 'غزبت' کی تلاش تھی لیکن وہ ستم پیشہ، اپنی ہی آگ میں جل کر مر گئی۔ یہ اس کی دردناک موت تھی جس نے غالب سے "ہائے ہائے" والی غزل لکھوائی اور مرنے کے بعد بھی وہ ایک 'دارِ گہنہ' کی شکل میں غالب کے دروں میں جاگزین رہی۔



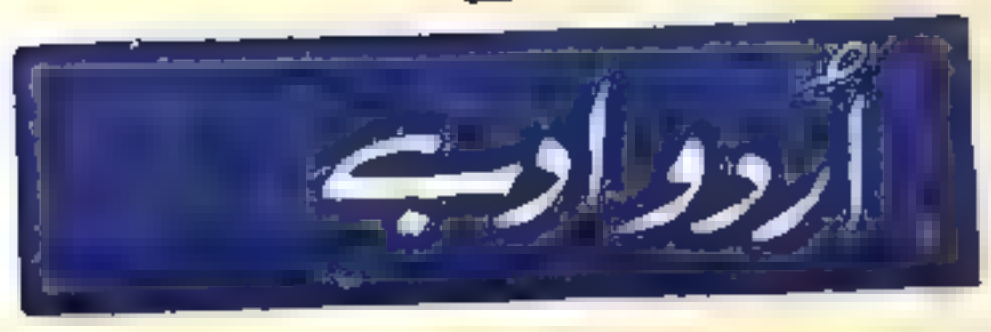
# URDU ADAB QUARTERLY

*EDITOR*

**Khaliq Anjum**

**ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)  
NEW DELHI**

سہ ماہی



# اردو ادب (سہ ماہی)

# اردو ادب

(بابائے اردو مولوی عبدالحق نمبر)

ادیٹر  
خلیق انجم

انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی



۱۹۹۳ء شماره (۱)

۱۹۹۲ء شماره (۴،۳)

سالانہ قیمت \_\_\_\_\_ ۴۵ روپے  
فی شماره \_\_\_\_\_ ۲۰ روپے  
موجودہ شماره \_\_\_\_\_ ۵۰ روپے

پرنٹر پبلشر ایم حبیب خاں اسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے ٹرافیٹ  
پرنٹرس دہلی میں چھپوا کر اردو گھر راؤ زالیونیو نی دہلی سے شائع کیا۔

# فہرست

۷	خلیق انجم	حرف آغاز
۹	حیات اللہ انصاری	مولوی عبدالحق اور ہندوستانی
۱۹	بیگم سلطانہ حیات	مولانا عبدالحق صاحب، اردو اور مہاتما گاندھی جی
۵۱	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	مہاتما گاندھی۔ اردو۔ مولوی عبدالحق
۱۰۰	سید شہاب الدین دسنوی	مولوی عبدالحق اور اردو تحریک
۱۱۹	رشید حسن خاں	مولوی عبدالحق مرحوم کی بعض تحریریں
۱۲۳	ڈاکٹر منظر اعظمی	مولوی عبدالحق اردو کا استعارہ
۱۳۳	ڈاکٹر فریدان فتحپوری	مقدمات عبدالحق اور ان کی تنقیدی اہمیت
۱۴۲	سید جاوید اقبال	مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری
۱۵۶	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	مولانا عبدالحق اور تحقیقی تدوین
۱۶۱	ڈاکٹر کاظم علی خاں	علی گڑھ بابائے اردو کے سفر حیات کی ایک اہم منزل
۱۸۰	ڈاکٹر سید حامد حسین	مولوی عبدالحق اور دیوان غالب
۱۹۵	ڈاکٹر شانتی رجن بھٹا چاریہ	مولوی عبدالحق اور بنگال میں اردو تحریک
۲۰۱	کشمیری لال ڈاکٹر	بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خاک نگاری
۲۱۰	ڈاکٹر بارون ایوب	مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری
۲۱۶	یوسف ناظم	مولوی عبدالحق خطوط کے آئینے میں
۲۲۶	طاہر مستود	مولوی عبدالحق کے ادبی اور علمی رسائل
۲۵۲	ڈاکٹر رحیم بخش	مکاتیب عبدالحق
۲۶۵	ڈاکٹر مظہر احمد	مولوی عبدالحق کی تحقیق
۲۷۸	محبوب احمد نقوی	مولوی عبدالحق بحیثیت شاعر

## حرف آغاز

دسمبر ۱۹۹۱ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے اردو کے محسن اعظم مولوی عبدالحق پر (۲۸ دسمبر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء تک) چار روزہ بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا تھا۔ اس کے افتتاحی جلسے کی صدارت جناب سید حامد نے کی اور افتتاح اس وقت کی نائب وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر گرجاویاس نے کیا تھا۔ اس وقت کے سفیر پاکستان عزت مآب عبدالستار صاحب نے یہاں خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی سیمینار میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، ناروے، انگلینڈ اور کینیڈا وغیرہ سے تقریباً بہتر مقالہ نگار حضرات نے شرکت کی۔ انجمن کے دعوت نامے پر ہزاروں روپے خرچ کر کے دہلی پہنچنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اہل اردو مولوی عبدالحق کی لسانی اور ادبی خدمات کے دل سے معترف ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد باقی تمام زندگی کو اردو ادب کی ترقی و فروغ اور اردو زبان کی بقا کے لیے وقف کر دیا۔ مولوی صاحب نے پہلی بار دکنی ادب کے شہ پارے تلاش کر کے اردو والوں کو ان سے روشناس کرایا اور ان کی ادبی و لسانی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اردو کے ادبی مورخین ہماری ادبی تاریخ کا آغاز شمالی ہند کے میر تقی میر مرزا خدر فیع سودا، اور خواجہ میر درد وغیرہ سے کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے ہماری ادبی تاریخ میں تقریباً تین صدیوں کا اضافہ کیا۔ انھوں نے خواجہ بندہ نواز گیسو داس سے لے کر وئی تک بڑی تعداد میں دکنی شاعروں اور نثر نگاروں کو دریافت کر کے اردو والوں سے متعارف کرایا۔

اٹھارویں صدی میں بڑی تعداد میں اردو شاعروں کے تذکرے لکھے گئے۔ یہ تذکرے ذاتی اور سرکاری لا سبریریوں اور اہل پاروں میں بند تھے۔ مولوی صاحب نے انہیں تلاش کر کے مرتب کیا یا دوسروں سے کروایا اور پھر انجمن سے انہیں شائع کیا۔ ہمارے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے نصف اول تک کی تاریخ ادب اردو انہیں تذکروں کی مرہون منت ہے۔ اگر مولوی

صاحب ان تذکروں کو دریافت کر کے شایع نہیں کرتے تو آج ہم بے شمار شاعروں کے ناموں سے بھی واقف نہ ہوتے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) پر مولوی عبدالحق کے ناقابل فراموش احسانات ہیں۔ وہ ۱۹۱۲ء میں جب انجمن کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے تو انھیں ٹین کے ایک صندوق میں چند بوسیدہ جہت اور کچھ مسودات کی شکل میں انجمن کا پورا ریکارڈ ملا تھا۔ مولوی صاحب کے زمانے میں اردو زبان کے معاملات خاصے ہنگامہ خیز تھے۔ اردو مخالفین نے اردو کو تباہ کرنے بلکہ اس کا نام و نشان مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے مولوی صاحب کے دوروں ہو گئے۔ ایک تو وہ انجمن کے ایک پلیٹ فارم سے اردو ادب کی خدمت کرتے رہے اور دوسرے پلیٹ فارم سے اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے جدوجہد میں مصروف رہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) نے کوشش کی تھی کہ ایک اعلیٰ درجے کا بین الاقوامی سیمینار منعقد کر کے مولوی صاحب کی خدمات کا خاطر خواہ اعتراف کیا جائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ انجمن اپنے اس ارادے میں کامیاب ہوئی۔ جن حضرات کو مولوی صاحب کی شخصیت یا فن پر مقالہ لکھنے کی دعوت دی گئی تھی، ان سب حضرات نے بھرپور تعاون کیا۔ بلکہ مولوی عبدالحق کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ بعض ایسے حضرات بھی تھے، جنھیں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن مولوی صاحب کی محبت اور عقیدت میں ہزاروں روپیے خرچ کر کے وہ بھی سیمینار میں شریک ہوئے۔ ہم ان تمام مقالہ نگار حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ سیمینار کے مقالوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے لیے ان تمام مقالوں کو شایع کرنا ممکن نہیں ہے۔ ۱۹۹۲ء میں ہم نے اردو ادب کا "مولوی عبدالحق نمبر" شایع کیا تھا۔ جس میں پندرہ مضامین شامل تھے۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ نمبر چند مہینوں میں ختم ہو گیا۔ ہمیں پھر اسے کتابی صورت میں شایع کرنا پڑا۔ اب ہم "اردو ادب" کے تحت باقی مضامین کا "مولوی عبدالحق نمبر" شایع کر رہے ہیں۔ اس میں انیس مضامین شامل ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم اس نمبر کو بھی کتابی صورت میں شایع کریں گے۔

میں آخر میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے اس وقت کے صدر جناب سید حامد کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہماری نہ صرف رہنمائی کی بلکہ قدم قدم پر ہمیں مالی تعاون بھی دیا۔ اگر انجمن کے تمام اراکین اور انجمن کے کارکنان بھرپور تعاون نہیں دیتے تو یہ سیمینار اتنا کامیاب نہیں ہوتا۔ ان سب کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سب حضرات آئندہ بھی اسی طرح تعاون کرتے رہیں گے۔ خلیق انجم



## مولوی عبدالحق اور ہندوستانی

ہندوستان کی ریاستوں میں قومی حکومتوں کے بننے سے پہلے لگ بھگ ۱۹۳۷ء کے شروع میں صدر کانگریس ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق کا ہندوستان کی مشترکہ زبان کے بارے میں ایک بیان نکلا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو کہ شمالی ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہ دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی یہ بیان پڑھ کر میرے ایسے نوجوان جو شش بھینچے لگے کہ ہم لوگ ابھی سے ایسی زبان لکھا کیوں نہ شروع کر دیں۔

انٹرپرائس میں قومی حکومت بنتے ہی کئی قوم پروردار دو اور ہندی ہفتہ وار نکل آئے تھے اردو میں تھا ”ہندوستان“ جس کا میں اڈیٹر تھا اور ایک ہندی ”سنگھش“ تھا۔ ان دونوں کے اسٹاف والوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ہندوستانی لکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس فیصلے کے بعد جو پرچہ نکلے اُن کا جب موازنہ کیا گیا تو زبان میں بڑی دوریاں نکلیں۔ مثلاً ہندوستان میں تھا بین الاقوامی اور سنگھش میں انٹرا سٹریٹ اور پھر عبارت میں اُن کے مشتقات تھے مثلاً بین اقوام اور اقوامی ایک طرف اور انٹرا سٹریٹ اور سٹریٹ دوسری طرف۔ اب بحث اٹھی کہ یہ دوریاں کیوں کر کم کی جائیں۔ تاکہ ہندوستانی پیدا ہو سکے۔ اردو والے کہتے تھے کہ بین الاقوامی کو سب ہی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہندی والے اس کو اور اسی قبیلے کے الفاظ کیوں نہیں لکھتے ہیں۔ ہندی والے کہتے تھے کہ انٹرا سٹریٹ کو سب ہی لوگ سمجھتے ہیں۔ اس لیے اسی قبیلے کے الفاظ کو قبول کر لینا چاہیے۔ میں نے غور کیا کہ وہ سب ہی لوگ کون ہیں۔ جن کا حوالہ ہندی والے اور اردو والے دونوں ہی دیتے ہیں۔ پتا چلا کہ یہ تھے کہنے والوں کے اپنے حلقے کے لوگ۔ تقریروں میں لوگ انٹرنیشنل کہتے تھے اور قوم اور انٹر۔ ایسے میں اس سوال کا اٹھنا ضروری تھا کہ ہندوستانی زبان کیوں کر بنے گی؟

رامائن اور میلاد شریف کی محفلوں میں میں دیکھتا تھا کہ مسلمان اپنے بزرگوں کے لیے عربی اور

فارسی کے القاب استعمال کرتے ہیں۔ اور ہندو اپنے بزرگوں کے لیے سنسکرت کے القاب یہ بھی دیکھتا تھا شادی اور غمی کے موقعوں پر جس شخص کو مبارک باد دی جائے یا اظہار غم کیا جائے وہ چاہتا ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو اُس کے مذہب یا دھرم کی رو سے متبرک ہیں۔

میری نظر اس طرف بھی گئی کہ سنسکرت کے القاب و آداب اور شادی و غمی میں استعمال ہونے والے سنسکرت کے جملے اگر اردو میں آئیں گے تو اُن کے مشتقات بھی آئیں گے اور محاورے بھی۔ اُن چیزوں کی آمد سے زبان میں تو ایسا الٹ پلٹ ہو جائے گا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اردو کی شکل و صورت پہچانی ہی نہیں جاسکے گی۔ دوسری طرف اگر ہندی پر عربی اور فارسی الفاظ کی بلیغ ہوئی تو اس کی بھی حالت یہی ہو جائے گی۔ پھر ایک سوال یہ بھی تھا کہ اگر اسی طرح الفاظ کی آمیزش نہ ہوئی تو ایسی ہندوستانی بن سکے گی جو سب کے کام آسکے؟ وہ ہندوستانی کس مصرف کی ہو گی کہ جب میں اپنے دوستوں کے رخ و غم میں شریک ہونے جاؤں تو وہ گونگی ثابت ہو۔

یہ مسئلہ ابھی تک میرے خیالات کا دنیا میں گھوم ہی رہا تھا کہ ایک واقعہ ایسا ہوا۔ کہ مسکند مزید شہنشاہ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ مولوی عبدالحق صاحب کا خط ملا دیکھیے آپ کے وزیر تعلیم کیا کہتے ہیں؟ سمجھو نہ ناندی نے کسی مضمون میں لکھا تھا کہ ہندوستانی میں ہندی کے روزمرہ کے کام چلاؤ الفاظ شامل ہوں گے۔ میں اُن سے ملا تو انھوں نے کہا کہ میرے اسی مضمون پر بحث اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس لیے میں نے اس کے بارے میں گاندھی جی سے اُن کی رائے پوچھی ہے۔ گاندھی جی نے جو جواب دیا اُس سے مسئلہ کی نوعیت بالکل بدل گئی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی میں اردو اور ہندی کے سب ضروری الفاظ ہوں گے۔ اس کا فارمولا یہ ہو گا۔

ہندی مثبت اردو = ہندوستانی

ہندوستانی منفی اردو = ہندی

ہندوستانی منفی ہندی = اردو

اس پر مولوی صاحب نے مجھے لکھا کہ گاندھی جی ہٹ گئے اپنے موقف سے اس طرح میرے سامنے آیا ہندی اردو اور ہندوستانی کا مسئلہ پوری طرح کھل کر اس واقعہ سے کافی پہلے کی بات ہے کہ ایک قصہ گو صاحب زندہ تھے۔ جو ضعیفی کی وجہ سے کہیں جاتے نہیں تھے۔ قصہ سننے لوگ اُن کے گھر

پہنچ جاتے تھے۔ ایک بار میں بھی ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ قصہ کہتے کہتے انھوں نے ایک جگہ سوال کیا جوتشی جی نے کیا کہا بادشاہ سے؟ یہ کہہ کر وہ جوتشی کے الفاظ دہرانے لگے جو کہ سنسکرت آمیز ہندی میں تھے۔ اور ان کا وہ ترجمہ بھی کرتے جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اکبر کے دربار کا نمونہ پیش کر دیا۔ جہاں ہندو مسلمان، راجپوت اور مغل سب ہی ہوتے تھے۔ یہ تصویر کشی میرے دماغ کو جو افسانہ نگار بننے والا تھا بہت اچھی لگی تھی۔ اب میں سوچنے لگا تھا کہ اس تصویر کشی کے لیے سنسکرت آمیز ہندی بھی ضروری ہے۔ اور اس کا ترجمہ بھی۔

اس دور میں ہندو ازم اور اسلام دونوں کے ایک بڑے واقف کار تھے۔ ڈاکٹر بھگوان داسر میں نے اُن سے سوال کیا کہ مہاتما گوتم بدھ خدا کے وجود کے بارے میں مذہب تھے یا منکر لیکن انھوں نے ہندو فلسفہ کے مطابق روح کی حیثیت ابدی تسلیم کر لی تھی۔ اس طرح لا تعداد چھوٹے چھوٹے خداؤں کو مان لیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اردو تو خوب جانتے تھے۔ لیکن فارسی اور کچھ عربی بھی جانتے تھے لیکن اس سوال کے جواب میں اُن کو بڑے بڑے سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنا پڑے جن کو وہ یا تو طویل اردو جملوں میں سمجھاتے تھے یا انگریزی میں۔

مسلم بزرگوں کے ملفوظات اور مخطوطات میں بڑے فلسفیانہ مباحث آئے ہیں۔ اُن بحثوں میں بزرگوں کو ایسے فارسی اور عربی الفاظ کا سہارا لینا پڑا ہے جو ہندی لغت میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر مجھے گاندھی جی کا ہندوستانی کا فارمولا قابل قبول نظر آیا کہ ہندی اور اردو دونوں کے ضروری الفاظ اس میں شامل ہوں گے۔

اور مجھے موقع مل گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب سے گفتگو کرنے کا اُن کا خیال یہ تھا کہ جس کو میں ہندی کہہ رہا ہوں وہ ایک مصنوعی زبان ہے جس کو فورٹ ولیم کالج کے جادو گروں نے بنا دیا ہے۔ بول چال سے وہ بہت دور ہے زبانے الفاظ کا ہندوستانی کے لیے سو اردو ہمیشہ نئے الفاظ قبول کرتی چلی آئی ہے۔ ضرورت ہوگی تو سنسکرت کے اور الفاظ بھی قبول کر لیے جائیں گے۔ میں نے مولوی عبدالحق صاحب کی توجہ اُن مسائل کی طرف دلائی جو میرے ذہن میں تھے۔ مگر مولوی صاحب نے اس طرف دھیان نہیں دیا اور گفتگو ختم کر دی۔



لیکن اس گفتگو سے میں نے ایک نتیجہ نکالا وہ یہ کہ مولوی صاحب ہندوستانی کی اصطلاح سے کچھ اور سمجھتے ہیں اور گاندھی جی کچھ اور اس کا تعلق ان دونوں کے ماضی سے ہے۔

جس زمانہ میں مولوی عبدالحق صاحب حیدرآباد گئے ہیں، اُس زمانے میں وہ ریاست تعلیم اور کلچر میں ابھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں کے دانشوروں کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ علم اور کلچر تک صرف دو راستوں سے جایا جاسکتا ہے۔ انگریزی کے ذریعہ یا اردو کے ذریعہ۔ جن میں انگریزی تک رسائی کم لوگوں کو ہو سکتی ہے۔ اور اس لیے اس حالت میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس تک حیدرآباد والوں کی رسائی ہے اور جو ان کو علم اور کلچر تک لے جاسکتی ہے۔ ایسے میں مولوی صاحب کا وجود ریاست کے لیے ایک نعمت تھا۔ اس سے پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ پھر مولوی صاحب نے بھی ریاست کو بہت کچھ دیا۔ انھوں نے دکنی مخطوطات کو مرتب کر کے اردو کی جڑ بنادی۔ اردو کی علمی اصطلاحات مرتب کرنے میں بڑا کام کیا۔ رفتہ رفتہ مولوی صاحب حیدرآباد کے علمی اور ادبی طبقے کے لیڈر بن گئے۔ اس طبقے میں ہندوؤں کی تعداد بہت کافی تھی۔ لیکن جس طرح انگریزی دور کی ابتدا میں بڑے لوگ تقریبوں اور شادی اور غم کے موقعوں پر انگریزی ہی استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح حیدرآباد میں ہندو بھی جن کی زبان تامل تلگو اور کنڑ تھی اہم موقعوں پر اردو شادی اور غم میں اردو ہی کا استعمال کرتے تھے۔

نچلی سطح پر ریاست کی خاص زبانیں یعنی تلگو، کنڑ اور تامل زور پکڑ رہی تھیں اور ان کا اثر پکڑا بھر کر کچھ دور تک آگیا تھا۔ اوسط سطح میں بھی اور اس کے نیچے بھی یہ زبانیں تقریبوں اور شادی بیاہ میں آنے لگی تھیں۔ لیکن مولوی صاحب کی زندگی جن حلقوں میں گزری تھی وہ ان نچلے حلقوں سے بہت دور تھے ان اسباب کی وجہ سے مولوی صاحب اس لسانی کشمکش سے بالکل ناواقف رہے جو ہندوستان میں مختلف شکلوں میں اندر اندر چل رہی تھیں۔ شمالی ہند میں اسی کی ایک شکل تھی ہندی کا فروغ۔ گاندھی جی کا لسانی تصور ایک بالکل ہی دوسری فضا سے آیا تھا۔ وہ گجراتی اور انگریزی لے کر جنوبی افریقہ گئے تھے لیکن وہاں طرح طرح کے ہندوستانیوں سے باتیں اور بحثیں کر کے وہ ہندوستان آئے تو ایک ایسی کھوٹی زبان لے کر آئے۔ جو شمالی ہند اور بمبئی اور گجرات میں سمجھی جانے لگی۔ گاندھی جی نے اپنی وہی زبان لے کر ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ چھپارن بہار میں تحریک چلائی۔ پھر اسی زبان میں نان کو آپریشن اور نمک کی تحریکیں چلائی۔ کانگریس کے بڑے بڑے اجلاسوں کو خطاب کیا۔ اخباروں میں ان کی تقریروں کی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ اور کسی کو ایسا نہیں لگا کہ گاندھی



جی کی کچھڑی زبان سمجھی نہیں جاتی ہے۔

کانگریس کے اجلاسوں میں ہندوستان بھر کے نمائندے آتے تھے۔ لیکن چوں کہ شمالی ہند کے نمائندے بہت بڑی تعداد میں ہوتے تھے اس لیے سب کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایسی زبان میں تقریر کریں جس کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھیں۔ اس لیے لوگ طرح طرح کی اردو مانل یا ہندی مانل کچھڑی زبان میں تقریریں کرتے تھے۔ ان میں پرشوتم داس ٹنڈن جی کے ایسے ہندی بولنے والے بھی ہوتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایسے بلخ اردو بولنے والے بھی۔ ایسی ہی بھانت بھانت کی زبانوں کے اے۔سی۔م اور جی۔سی۔ام سے گاندھی جی نے اپنا ہندوستانی زبان کا فارمولا حاصل کیا تھا۔

ہندوستانی زبان کی ایک تیسری سمت بھی تھی۔ عیسائی مشنریوں کو اپنے کاموں کے لیے اردو بہت مفید نظر آئی کیوں کہ وہ شمالی ہند میں اور کسی حد تک جنوبی ہند میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ وہ اس کو استعمال کرنے لگے۔ لیکن جلد ہی ایک دشواری اس راہ میں اُن پڑی وہ یہ کہ انگریز حکومت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو رٹ کرنے کی جو راہیں نکالی تھیں اُن میں ایک تھی اردو اور ہندی کا ٹکراؤ۔ اس حالت میں مشنری نہ اردو کی طرف جاسکتے تھے اور نہ ہندی کی طرف۔ یہ دیکھ کر مشنریوں نے اردو میں اپنی چند اصطلاحیں ملا کر اُس کا نام ہندوستانی رکھ دیا۔ اور پھر یہ نام بھی چل نکل۔

جب گاندھی جی نے کہا کہ اگر ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی تو مولوی صاحب نے ہندوستانی کو، سی معنی میں لیا۔ جس میں مشنری لیتے تھے۔ حالانکہ گاندھی جی نے یہ نام دیا تھا اس زبان کو جو بیک پودے کی طرح گاندھی جی کے ذہن میں تھی۔ اس پودے نے، بھی زمین سے سر نکالا تو تھا۔ لیکن کوئی کشتاخت نہیں ہو سکی تھی۔

یہ اختلاف ان دونوں بیڈروں کی خط و کتابت اور تحریروں میں کافی نمایاں ہے مولوی صاحب نے ۲۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی کو لکھا:

”اگر آپ میری اس درخواست کو منظور فرماتے جو میں نے اکھل بھارتیہ سہائتہ پریشد کے سالانہ اجلاس ناگپور ۱۹۴۷ء میں کی تھی کہ اس ملک اور پریشد کی زبان ہندوستانی ہونی چاہیے۔ تو بہت سے جھگڑوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ پریشد کے اس اجلاس میں جب آپ سے پوچھا گیا کہ ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ وہ زبان جو کتابوں

میں ہے بول چال میں نہیں!

ایک ایسی زبان کو جو بول چال میں نہیں راشتہ بھاشا قرار دینا اور اس زبان کو جو صدیوں سے بول چال میں ہے نظر انداز کر دینا کتنی بڑی نا انصافی تھی اور یہی بات فساد کی جڑ بن گئی۔  
 ”یہ سچ ہے کہ کبھی آپ نے اردو دشمنی کا اظہار نہیں کیا لیکن دانستہ یا نادانستہ ایسی تدبیریں اختیار کیں جن کی وجہ سے زبان کا مسئلہ دن بدن پیچیدہ اور خراب ہوتا چلا گیا۔ اور دلوں میں بدگمانی اور سیر بڑھتا گیا۔“

اس خط میں مولوی صاحب کا اصرار ہے کہ گاندھی جی خالص ہندی کو راشتہ بھاشا بنانا چاہتے ہیں۔ اور وہ اردو کے خلاف ہیں۔ جواب میں گاندھی جی لکھتے ہیں کہ وہ اردو کے خلاف نہیں ہیں۔ اور وہ اردو ہندی کو ملا کر ایک بھاشا بنانا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی کے خط کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔  
 ”خیال میں بھی میں نے اردو زبان کی دشمنی نہیں کی۔ میں نے جنوبی افریقہ میں اور یہاں بھی ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ اور کر رہا ہوں یہ میری غلطی مانی جائے سوالگ بات ہے لیکن میں دشمن کسی کا نہیں۔“

”ہندی ساہتیہ سبلیں ہیں اردو کی بات نکالنے والا پہلے میں تھا۔“

گاندھی جی کا اصرار یہ رہا کہ ہندوستانی کو راشتہ بھاشا بننا ہے اور اس کے بنانے کے لیے اردو اور ہندی کو ملانا ضروری ہے۔ لیکن مولوی صاحب نے اس پر کھل کر کبھی بحث نہیں کی۔ دونوں کی خط و کتابت میں مسئلہ کا یہ رخ بار بار سامنے آتا رہا ہے۔ مولوی صاحب کے اعتراضات کا خلاصہ یہ رہا ہے۔

(۱) ”گاندھی جی نئی ہندی کو راشتہ بھاشا بنانا چاہتے ہیں۔“

(۲) ہندی کے فروغ کی ساری ذمہ داری گاندھی جی پر آتی ہے۔

(۳) ہندو مسلم اختلافات میں زبان کا بڑا دخل رہا ہے۔ اور اس کی ذمہ داری بھی گاندھی جی پر آتی ہے۔

اب بیچے نئی ہندی کا مسئلہ ہندی نظم کی شکل میں تو صدیوں سے موجود تھی لیکن نثر کی شکل میں وہ موجود نہیں تھی۔ نثر کی شکل اس کو دی فورٹ ولیم کالج والوں نے اسی کو مولوی صاحب

نئی ہندی کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی کوئی عوامی جڑ نہیں ہے۔ اس لیے وہ مصنوعی زبان ہے۔ اور اس کو فورٹ ولیم کالج کے جادوگر عدم سے وجود دہماے آئے۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے لیکن بس ایک حد تک۔ ہوا یہ کہ جب انگریزوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی قومیت ان کی حکومت سے ٹکڑے رہی ہے۔ تو انھوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کی۔ اس مسئلہ پر ایک بار وزیر ہند اور گورنر جنرل میں خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔ جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ لڑاؤ کے لیے ہندو مسلم مسئلہ بہت اچھا رہے گا۔ اور اس کو مختلف رجحانوں سے اٹھانا چاہیے۔ جو چل جائے وہ لے لیا جائے۔ ہوشیار انگریزوں نے دیکھ لیا کہ اردو وسیع ہونے کے باوجود ہندوؤں کے بعض بے حد گہرے جذباتی مواقع کے ادا کرنے میں ناکام رہی ہے مثلاً پیدائش اور شادی کے مواقع پر اظہار مسرت میں غمی کے مواقع پر اظہار غم ہیں اور مذہبی تقریبات کے مواقع پر ہندو بنبرگوں کو اچھے القاب سے یاد کرنے میں۔ ان موقعوں پر سنسکرت امیز ہندی کام دیتی ہے ایسے میں اگر نہی کو ابھار دیا جائے تو مذہب کا بھرپور سہارا پا کر وہ کچھ کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا کام دے سکتی ہے۔ ہندی نظم کافی جاندار اور عوامی ہے اس صورت میں ہندی کو صرف شرکی ضرورت ہے فورٹ ولیم کالج کے ہوشیار لوگوں نے ہندی والوں کو مشورہ دیا کہ تم اردو نشر لے لو اور اس میں جہاں جہاں عربی اور فارسی کے الفاظ ہوں وہاں سنسکرت کے الفاظ رکھ دو۔ اس طرح ہندی نشر تیار کر لو۔ یہ جادو چل گیا اور نشر کی تیاری کا کام جو زبانوں میں صدیاں لیتا رہا ہے وہ ہندی میں برسوں میں انجام پا گیا۔ اس طرح اردو کے ٹکڑے پر ایک طریقہ اظہار ایسا مل گیا جو دونوں فرقوں کے درمیانی خلیج کو مسلسل چوڑا کرتا رہا۔

ہندی نشر بن تو گئی لیکن وہ بوں چال میں آ نہیں سکی اور اس میدان میں اردو ہی کا قبضہ رہا۔ لیکن ہندی کو بالکل مصنوعی زبان نہیں کہا جاسکتا ہے۔ بالکل ہی مصنوعی زبان ہوتی تو نہ تو اس طرح تیزی سے پھیلی جس طرح پھیلی ہے اور نہ اس میں اس طرح کے شاہکار تصنیف ہو سکتے۔ جیسے ہندی میں موجود ہیں۔

میں نے اپنا یہ نظریہ واضح کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے کے لیے ایک مضمون ٹھیکہ اردو کے عنوان سے لکھا جس میں ذرا گھما پھرا کر یہ بات کہی کہ اردو ہے تو بے حد مکمل زبان جو شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند کے بہت سے مقاموں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور تحریر اور تقریر دونوں کاموں میں آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوؤں کے ایک بہت بڑے طبقے کی بے حد



اہم ضروریات کو پورا نہیں کر پاتی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس میں ایسے الفاظ شامل کیے جائیں کہ وہ اپنے جغرافیائی حلقے کے سب لوگوں کی اہم ضرورتوں کو پورا کر سکیں یہ مضمون دو حصوں میں تھا۔ پہلے میں دکھایا گیا تھا کہ اردو کا عوام کے ہر طبقے سے اب تک پکارا شہر ہے اور دوسرے میں یہ کہ اس رشتے کو موجودہ ضروریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے کیا کیا کرنا چاہئے۔ اس دوسرے حصے میں میں نے اُن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں اردو ابھی کو نگی ثابت ہو جاتی ہے۔ مولوی صاحب نے پہلا حصہ تو شائع کر دیا اور دوسرے کے مسودے پر لکھ دیا "یہ شائع نہیں کیا جائے گا" جب ہندوستان تقسیم ہو گیا اور ہندوستان کی الگ انجمن ترقی اردو بن گئی۔ تب میرے مضمون کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔ لیکن وہ اب شیتے بعد از جنگ تھا۔

آج عملی طور پر انگریزی و ہندی سرکاری زبانیں ہیں۔ لیکن کیا ان دونوں میں سے کوئی بھی ایسی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی ضروریات کو براہ راست ادا کر سکے؟ کیا ان میں سے کسی میں میلاد شریف اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو ویسی ہی تشفی ہو جیسی اردو میں بیان کیے ہوئے میلاد شریف سے ہوتی ہے۔ ہندی کی کسی لغت میں کیا صلی اللہ علیہ وسلم اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے گا؟ ہندی کی ایک بات سے مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اس میں بڑے پائے کے افسانے اور ناولیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن ان میں آپ کو مسلم کردار اکا دکا کہیں تو ملیں۔ اور اگر مسلمان کبھی آجاتا ہے تو ٹائپ کی شکل میں آتا ہے۔ آپ اس بات کو ہندو مسلم غینک سے نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ اردو میں ہندو مضمفوں کے یہاں ایک سے ایک اعلیٰ نقاشی کے مسلم کردار ملتے ہیں۔ میرے خیال میں ہندی ادب میں مسلم کرداروں کے فقدان کی وجہ یہ ہے کہ ہندی میں ایسے الفاظ ہی نہیں ہیں جو ختمیل کو مسلم زندگی کی طرف سے جاسکیں۔ سرسری قسم کے جو الفاظ ہیں وہ ٹائپ ہی تک لیے جاسکتے ہیں۔ الفاظ بھی قطب نما کا کام کرتے ہیں۔

گاندھی جی نے برسوں زیر دست کوشش کی لیکن وہ اپنی ہندوستانی کے قریب نہیں پہنچ سکے۔ اس وقت ہندی والوں نے ان سے کہا کہ ساہتیہ سمیلن اردو اور ہندی کو ملانے کے کام میں آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ آپ اس کی مہر قبول کر کے سرپرستی کیجئے۔ گاندھی جی نے جیسا کہ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے ساہتیہ سمیلن والوں سے کہا کہ وہ اردو کی بھی سرپرستی کریں گے۔ ہندوستانی بنانے کا پروگرام یہ پیش کیا گیا کہ اس کا پہلا مرحلہ ہوگا۔ ہندی اٹھوا ہندوستانی۔ گاندھی جی کی بات معقول نظر آتی ہے۔



شفیق الرحمن صاحب نے مجھے بتایا کہ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان سے کہا تھا کہ اگر اردو والے ہندوستانی یا اردو کی تحریک چلائیں تو آپ اس میں شریک ہوں گے؟ گاندھی جی نے جواب دیا یقیناً پنڈت سندھ لال نے گاندھی جی سے اس وقت کہا تھا کہ سائیتھیمین والے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں وہ ہندوستان کے لیے کچھ بھی نہیں کریں گے۔ آپ کے نام سے ہندی کو فروغ دیں گے لیکن افسوس گاندھی جی سائیتھیمین والوں کے کہنے میں آگئے اور اس کی مہر قبول کر لی۔

کئی برسوں کے بعد گاندھی جی نے اپنی غلطی مانی اور سٹیمین سے استعفا دے دیا۔ لیکن اتنے عرصے میں ہندی آندھی کی طرح بڑھنے لگی تھی اور ہندوستانی کا جو کچھ بھی کام ہو رہا تھا وہ بھی ٹھیکڑ ہندی بن چکی تھی۔ اس جگہ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اگر مولوی صاحب نے گاندھی جی کی بات سمجھ لی ہوتی کہ اردو کو ہندوستان بھر کے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھاری تعداد میں ہندی الفاظ کی ضرورت ہے تو گاندھی جی سٹیمین کی طرف ہرگز نہ جاتے۔

گاندھی جی نے جو سواں اٹھایا تھا وہ آج بھی موجود ہے۔ آج انگریزی اور ہندی کل ہند قومی سرکاری زبانیں ہیں۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی مسلمانوں کی شادی و غم میں اور ان کے میل و شریف میں کیا کام دے سکتی ہیں؟ کیا کسی کی سنت میں صلی اللہ علیہ وسلم اور رضی اللہ عنہ پایا جاتا ہے۔ یعنی جو کمزوریاں مجھے اس وقت اردو میں نظر آتی تھیں اس وقت ہندی میں نظر آرہی ہیں گاندھی کل سچائی پر تھے اور آج بھی ہیں۔

میں نے مولوی صاحب سے دو بار ہندوستانی کے بارے میں بحث کی تھی اور دونوں بار یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ گاندھی جی کے ذہن میں ہندوستانی کا تصور کیا ہے۔ آخری بار گفتگو اس وقت ہوئی جب گاندھی جی سٹیمین کو چھوڑ چکے تھے۔ گفتگو ذرا تفصیل سے ہوئی۔ اس کے پس منظر میں میرا مضمون ٹھیکڑ اردو تھا جو نصف شائع ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب میری بات سنتے رہے۔ لیکن جواب سرسری سے دیتے۔ اور گفتگو اس طرح ختم کی کہ انھوں نے آرام کر مئی سے ٹیک کالی اور حقہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس گفتگو کے بعد میں لوگوں سے کہتا رہا کہ مولوی صاحب مجھے اپنے مخالفوں میں تو نہیں گنتے ہیں۔ لیکن دوستوں میں بھی نہیں گنتے ہیں۔ مجھے صرف برداشت کر لیتے ہیں۔

لیکن حال میں ایک زبردست انکشاف ہوا جس سے مولوی صاحب کی شخصیت میری نظروں میں

کچھ اور ہو گئی۔ قومی آواز دہلی ایڈیشن کے میگزین ۲۲ دسمبر ۱۹۹۱ء میں ”مولوی عبدالحق مرحوم“ کے عنوان سے مصنفہ چودھری شرف الدین شائع ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کی میرے بارے میں کیا رائے تھی۔ پس منظر یہ ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے اردو طلباء کی دعوت پر مولوی صاحب لکھنؤ تشریف لائے تھے، ورنٹرل ہوٹل میں مقیم تھے۔ مضمون میں لکھا گیا ہے:

”جو بات بہت ہی اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ کا زبردست زور تھا۔ پڑھے لکھے نوجوان پر لیگ کا جادو چل گیا تھا اور کوئی ایکشن ہونے والا تھا۔“

جب مولوی صاحب سنٹرل ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ تو ان کے کمرے میں زیادہ تر ٹیکے مسلم لیگ کے جوشیلے کارکن تھے۔ انہوں نے حیات اللہ انصاری کا ذکر نکال دیا تاکہ کچھ صلواتیں ہی سننے کو مل جائیں۔ مگر مولوی صاحب نے آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے فرمایا:

”حیات اللہ بڑا ہی پر خلوص کارکن ہے۔ مجھے ایسے ہی پر خلوص اور محنتی آدمی کی ضرورت ہے۔ اس کی لگن دیکھئے۔ ایسی لگن، ور محنت سے کام عبادت بن جاتا ہے۔“

یہ بات ہے ۱۹۴۵ء کی اس وقت تک میں نے سوائے عام قسم کی جدوجہد کے اردو کا کوئی کام ایسا نہیں کیا تھا جس کی مولوی صاحب کی نظروں میں خاص وقعت ہوتی۔ زندگی بھر چلائی تھی ”دس دن میں اردو“ مکمل کر سکا تھا۔ نہ قومی آواز کے ذریعہ صحافت کی خدمت کر سکا تھا اور نہ اپیک ناول ”لہو کے پھول“ لکھ سکا تھا۔ بلکہ میں تو ایک حد تک ہندوستان کے طالب علموں میں مولوی صاحب کے اپوزیشن کیپ میں تھا۔ اس حانت میں میری ایسی تعریف کرنے کا کتنا بڑا دل تھا مولوی صاحب کا، اور کتنی قدر دان!

رہے گا نام ان کا، نام مسٹ جائیں گے شاہوں کے

# مولانا عبدالحق صاحب اردو اور مہاتما گاندھی جی

ہندوستان مہاتما گاندھی کی قیادت میں آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھا اس کے ساتھ ساتھ اردو اور ہندی بھی الگ الگ اپنی اپنی بقا، تحفظ اور ترقی و ترویج میں لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت سوال یہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی زبان کیا ہوگی۔ یا یہ کہ کیا ہونی چاہیئے۔ سی جذبہ کے تحت (ہندی) ساہتیہ سمیٹن اور ہندک ساہتیہ پریشد کی طرف سے ایک مشاورتی جلسہ ناگپور میں طلب کیا گیا تھا جس میں ملک کے سربراہ اور لیڈروں مثلاً مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ کاکا کالیکر صاحب اور منشور والا صاحب وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ اردو کی نمائندگی مولانا عبدالحق صاحب مرحوم مع اپنے ساتھیوں کے کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں مہاتما گاندھی کے جو مضامین ادبیات نکلے اس میں انھوں نے آزاد ہندوستان کی زبان کو ”ہندی“ اٹھوا ہندوستانی کا نام دیا تھا۔ یہ مٹینگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئی یعنی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا کہ آزاد ہندوستان کی زبان کیا ہونی چاہیئے۔ اس مٹینگ کی رپورٹ مولانا عبدالحق صاحب کے قلم سے اردو اخبارات میں شائع ہوئی تھی جس میں جملہ اور باتوں کے ایک جملہ مولانا صاحب نے مہاتما گاندھی کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ تمانے اس مٹینگ کے دوران کہا کہ:-

”اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ قرآن شریف کے الفاظ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے مسلمان چاہیں تو اس کو رکھیں چاہیں نکالیں“

اس جملہ نے پوری اردو دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ شاید ہی کوئی اردو کا اخبار ہو جس نے اس جملے کو بار بار کسی نہ کسی عنوان سے نہ لکھا ہو یا جس جملہ نے اردو والوں کے دلوں میں تعصب اور نفرت کی وہ آگ لگائی جس

نے اردو ہندی زبانوں کو دو پہلو انوں کی طرح سیاست کے اکھاڑے میں اتار دیا تھا۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے یہ جملہ تقریریں باہر تقریر اور تحریر میں دہرایا جانے لگا۔ یوں تو سینکڑوں جملے اور باتیں کہی اور لکھی جاتی ہیں اور بھلا دی جاتی ہیں مگر یہ جملہ برائے تقریروں اور مضامین کا موضوع بنا رہا۔ اور مسلم لیگ نے اس جملہ سے تقویت پائی۔ ورنہ اس سے پہلے عموماً پڑھا لکھا طبقہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کہلوانے سے ذرا کتراتا تھا۔ غرضیکہ دن، ہینوں اور برسوں کے پردے بھی اس جملہ کو بھلا نہ سکے۔

مجھے بھی یہ جملہ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہا تم نے یہ جملہ کیسے کہہ دیا۔ مجھے اگست ۱۹۴۱ء میں باپو سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ پیر کا دن تھا۔ یعنی باپو اس روز چپ کا روزہ یا مون رکھتے تھے میں نے باپو سے کہا:

”آپ پوری ہندوستانی قوم کے لیڈر ہیں۔ پھر آپ نے یہ کیسے کہا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جو قرآن شریف کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان اس کو چاہے رکھیں چاہے ختم کر دیں۔“

باپو کا چہرہ حیرت اور جذبات کی شدت سے سرخ پڑ چکا تھا۔ وہ بول نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے لکھ کر دیا:

”تم نے میری بحث دیکھی تھی۔ سچ بات یہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ میں نے جو کہا تھا وہ چھپا ہے۔ میں نکال کر بھیج سکتا ہوں۔“

میں نے بہت ادب سے عرض کیا کہ مولانا صاحب کہتے ہیں کہ وہ جملہ آپ نے دوران گفتگو کہا تھا، لکھا نہیں تھا۔ یہ جملہ تو مولانا عبدالحق صاحب برابر دہرا رہے ہیں۔ اردو دنیا میں تو آپ کے اس جملہ نے آگ لگا دی ہے۔ مسلم لیگ اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اور دنوں، ہینوں اور برسوں کی دوری بھی اس جملہ کو نہیں بھلا سکی تھی۔ اردو اخبارات برابر اس جملہ کو چھاپتے ہیں۔ اور اس کا حوالہ دیتے ہیں۔

باپو نے پھر لکھ کر دیا:

”کیا کیا جائے؟ اخباروں میں میرے بارے میں بہت ہی غلط باتیں لکھی جاتی ہیں۔ اگر کل تک رہنا ہے تو اجاؤ۔ کچھ بات کریں گے اور کچھ بتاؤں گا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے یہ کہا نہ ہو اور مولانا عبدالحق صاحب آپ کا نام لے لے کر اس کو آج



بھی دہرا رہے ہیں ؟

میرا یہ اصرار اس پاس کے کھڑے لوگوں کو ناگوار ہوا۔ مگر میرے دل میں اس جملہ نے آگ لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے اصرار کیا کیوں کہ اردو میری مادری زبان ہے۔

ہمارا صوبہ ہی کو ناگپور جانے کا پروگرام تھا۔ میں نے پھوپھی جان بیگم حمیدہ سید عزیز الدین احمد صاحب سے دریافت کیا کہ کل ہم آسکیں گے ؟ پھوپھی جان نے خوشی سے پروگرام میں تبدیلی کی اور یہ طے پایا کہ ہم کل بہا تاجی سے ملنے آئیں گے۔

باپو نے ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ کیا کہ شام کے ۴ بجے آنا۔ اگلے روز ہم سب وقت پر پہنچے۔ باپو بیٹ رہے تھے، دوران کے پیٹ پر مٹی کی پٹی رکھی جا رہی تھی۔ کمرے میں آچاریہ کرپلائی بیٹھے تھے۔ ہندی سہتیہ سمیلن اور پریشد کی مشترک مٹنگ کی کچھ کاروائی نیز زبان کے متعلق کچھ باپو کے مضامین جو خبرت میں شائع ہوئے تھے وہ رکھے تھے۔ وہ سب باپو نے مجھے پڑھنے کے لیے دئے۔

گفتگو کا آغاز تو اس سے ہوا کہ آزاد ہندوستان کی رابطہ کی زبان کیا ہونی چاہیے۔ درپہر جلد ہی اس شعلہ بار جملہ کا ذکر کیا جس کا تذکرہ کر چکی ہوں۔ اور جس کا تقسیم ہند میں بڑا حصہ تھا۔ بہا تاجا کا مدھی جی پوش میں نہیں آتے تھے مگر میری اس تکرار سے ان کو تکلیف ہوئی اور پھر انھوں نے ہندی سہتیہ پریشد اور ہندی سہتیہ سمیلن کی ناگپور میں منعقد شدہ کانفرنس کا ذکر کیا۔ اپنے رجحان طبیعت کا تذکرہ کیا کہ وہ اس قسم کی فصول بات نہ سوچ سکتے ہیں نہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اردو کی بن و بٹ پر روشنی ڈالی کہ یہ کس طرح ترکی۔ پشتو۔ فارسی۔ عربی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ وغیرہ۔ اس گفتگو میں ایک گھنٹہ پورا گزر گیا ہے۔ جب ہم امتہ اسلام نے ان کے پیٹ پر سے مٹی اٹھاتے ہوئے بنایا تو وہ چونک پڑے۔ بولے کہ اتنا وقت تو میں آج کل کسی کو نہیں دیتا ہوں۔

بہا تاجی جیسی ذہین ہستی! انھوں نے میرے ذہن میں جو کشمکش جاری تھی اس کو بڑھادیا۔ بولے کہ جب ضرورت ہو تو راجیند بابو (ڈاکٹر اجیندر پرشاد جی سابق صدر جمہوریہ ہند) اور سکا کا صاحب اکا کا کا لیکر صاحب بھی مل لینا۔ وہ دونوں بھی اس مٹنگ میں تھے۔ اس طرح سے یہ گفتگو ختم ہوئی میری کشمکش سے، میں نے محسوس کیا کہ باپو بھی بے چین ہیں۔

لے بیگم حمیدہ احمد صاحبہ اور پھوپھی سید عزیز الدین احمد صاحب مرحوم کے ساتھ میں وارد ہو گئی تھی اور ڈاکٹر سید منہاج الحسن صاحب مرحوم جو صبح وارد ہوئے تھے ان کی وساطت سے بہا تاجی سے ملنا ہوا تھا۔

کچھ دن بعد میں پھر اکیلی سیواگرام آشرم پہنچ گئی۔ باپو سے جب موقع ہوتا تھا، آزاد ہندوستان کے رابطہ کی زبان کیا ہونی چاہیے، پر گفتگو ہوتی تھی۔ اکثر ہاتھ تاجی خود اس کا آغاز کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی یہ جہالت کرتی تھی۔ اس وقت باپو کا خیال تھا کہ رابطہ کی زبان وہ ہونی چاہیے جو کہ شمالی ہند کے بازاروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ کہ یہ زبان ہندی۔ اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے مگر باپو اس کو ہندی اٹھوا ہندوستانی کا نام دیتے تھے۔ میں کہتی تھی کہ لفظ ہندی اٹھوا لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھی بات صرف ہندوستانی کہیے۔

اسی دوران اور لوگوں کے علاوہ بابو راجندر پرشاد جی سے تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے بھی مجھے ناگیور کی مٹنگ کی تفصیل بتائی۔ پھر وقت مقرر کر کے وہ مجھے کا کا صاحب کے پاس لے گئے جو سیواگرام آشرم اور وار دھاک کے درمیان رہتے تھے۔ وہاں پر ریحانہ طیب جی اور بہن سرجنی مہتا سے بھی پہلی بار ملاقات ہوئی۔ ان ہی کی بیٹھک میں بیٹھ کر ہم سب نے اس مٹنگ کی رپورٹیں پڑھیں۔ اس طرح کی مٹنگیں کئی بار ہوئیں۔ آخری بار کی مٹنگ آج بھی دماغ پر نقش ہے۔ کا کا لیکر صاحب راجندر باپو۔ منشور والا جی سب بیٹھے تھے

اور بڑی دردمندی سے مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ باپو ایسا جملہ بھی کہ نہیں سکتے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ وہ تو ہر اقلیت کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں۔

ان سب اور خصوصاً ہاتھ تاجی کا ندھی کی باتوں میں کتنی سچائی اور خصوص تھا۔ میں کافی پریشان ہو گئی ایک طرف ہاتھ تاجی جیسی شخصیت دوسرے مجھے ان کے ساتھ ان کی کٹیا میں رہتے ہوئے کافی دن گزر چکے تھے۔ جس قدر مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا اتنی ہی میری عقیدت بڑھ رہی تھی۔ جی میں آتا تھا سب کی طرح میں بھی اُن کو پیارا اور احترام کے ساتھ باپو کہنے لگوں مگر پھر وہ نہ ہر بلا جملہ یاد آجاتا تھا۔ اور یہ کہ مولانا عبدالحق صاحب نے اردو کا بہت کام کیا ہے۔ بچپن سے اُن کا نام سن رہی ہوں۔ پھر مولانا ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اردو کا ہر اخبار ہاتھ تاجی کا یہ جملہ دہرا رہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن پاک کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ وغیرہ۔ اردو کے سب اخبارات اور مولانا عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو ہند کے پلیٹ فارم سے یہ جملہ بار بار دہرا رہے ہیں۔ یہ سب غلط ہوں اور یہ کہ سچ کس طرف ہے؟ کس کی طرف ہے؟ میں فیصلہ نہیں کر پائی۔ میری اس غلطی کو باپو محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ:

”توجا ہرعل۔ ذاکر حسین صاحب۔ عابد حسین صاحب اور جو جو اس روز ناگپور والی مٹنگ میں شریک تھے اُن سے ملے اور ہر ایک سے پوچھ لے کر کیا میں نے ایسی بات کہی تھی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے؟“

میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی ایک ایک سے مل کر اس کی تصدیق کروں گی کہ سچ کس طرف ہے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی زبان کیا ہونی چاہیے۔ اس مسئلہ پر مفتوں گفتگو ہوئی۔ جس میں مختلف موقعوں پر مختلف لیڈر بھی شامل ہو جاتے تھے۔ مثلاً سردار اپٹیل۔ بی۔ جی۔ کھیر صاحب جو بعد میں ہمارا شٹر کے وزیر اعلیٰ بنے تھے۔ مرارجی ڈیسا فدیہ کے دفعہ پنجاب کے میاں افتخار الدین صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ نے بھی شرکت کی تھی۔ اچار یہ کر پلانی جی سنتے سب کچھ تھے مگر بولتے کوئی خاص نہیں تھے۔

آخر یہی طے پایا کہ وہی فارمولا تسلیم کر لیا جائے جس کو باپو اور مولانا عبدالحق صاحب منظور کر لیں۔ چنانچہ باپو کے مشورہ سے میں نے ایک خط مولانا صاحب کو لکھا جس کو نقل کر رہی ہوں

اسلام علیکم

قبلہ مولوی صاحب

مجھے اردو ہندی کے بڑھتے ہوئے جھگڑے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے ہانما گاندھی جی سے کچھ سوالات کئے۔ انھوں نے بڑی ہر بانی سے مجھے بتایا اور میرے شکوک رفع کرنے کی کوشش کی۔

اب بجائے اس کے کہ اخبارات میں زبان کا جھگڑا طے ہو۔ زبانی اس کا فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ کیوں کہ میں اب تک اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ فساد کی، اصلی جڑ ایک بڑی حد تک غلط فہمی ہے۔

کیا آپ مجھے وقت دیں گے کہ میں آپ سے مل کر اس ابھی ہوئی بحث کو سلجھانے کی کوشش کروں؟

آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔

راقمہ

(سلطانہ قاضیہ)

مہاتما جی کا بھی یہی خیال ہے کہ اب یہ جھگڑا زبانی طے ہو جائے اور یہ خط میں آپ کو اُن کے مشورہ سے لکھ رہی ہوں۔ یہ بعد کا جملہ مہاتما جی نے لکھوایا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۱ء کے تیسرے ہفتے میں مولانا صاحب کا جواب آیا جو یہ ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند)

نواب منظور جنگ بہادر، جشی گوڑہ حیدر آباد دکن

مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۱ء

مکرہ سلطانہ قاضیہ سلمہ

آپ کا خط مجھے یہاں پہنچا جس پر بہت شکر گزار ہوں۔  
میں دہلی واپس جانے والا ہوں۔ آپ کو الوداع کہوں گا۔ آپ  
وہاں شریف ہیں۔ میں نہایت خوشی کا ساتھ اردو ہندی  
تنازعہ و مسئلہ آپ سے گفتگو کروں گا۔

میں خود اس مسئلہ میں کہ یہ سادہ معقول طور پر طے ہو جائے  
غریب

مجھے ناگپور میں مولانا صاحب کا ۲۴ ستمبر ۱۹۴۱ء کا تحریر کردہ خط ملا۔ یہ خط لے کر میں پھر  
واردھا گئی اور یہ خط مہاتما جی کو سنا دیا۔ وہ یہ خط سن کر خوش ہوئے۔ اور پھر ایک تاکید کی خط لکھنے  
کی ہدایت دی کہ میں اُن سے ملنے حیدر آباد بھی جاسکتی ہوں یا پھر وہ دہلی واپس جاتے ہوئے غریب  
خانہ پر قیام کریں۔ میرے اس خط کا انھوں نے فوراً جواب دیا جو یہ ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند)

بوساطت نواب منظور جنگ جشی گوڑہ، مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۱ء

مکرہ سلطانہ قاضیہ سلمہ

آپ کا خط پہنچا۔ شکریہ

میں یہاں سے جلد جانے والا ہوں۔ اگر میرا قیام یہاں کچھ دنوں اور رہتا تو میں آپ کو  
یہیں بلالیتا۔ یہاں سے میں سیدھا بھوپال جاؤں گا وہاں دو تین روز قیام ہوگا۔ انجمن کے



متعلق بعض معاملات طے کرنے ہیں اور وہاں سے دہلی چلا جاؤں گا۔ ناگپور میں نہیں ٹھہر سکتا۔ دہلی جا کر آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ کو اب دہلی آنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔ اگر بعض ضروری کام نہ ہوتے تو میں ناگپور ایک دو روز کے لیے ٹھہر جاتا لیکن فوری ضرورت کی وجہ سے یہ ممکن نہیں۔

خیر طلب  
عبداللہ الحق

مولانا صاحب سے تو خط و کتابت جاری تھی۔ دوسری طرف باپو سے آزاد ہندوستان کی رابطہ کی زبان پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ باپو ہندی، تھو ہندوستانی نام دینا چاہتے تھے۔ باپو کو اگر کوئی چیز سن کی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور کر سکتی تھی تو وہ تھی صرف دلیل کی طاقت۔ وہ میں چاہتی تھی کہ رابطہ کی زبان کا نام صرف ہندوستانی رہے۔

ایک رات کھانے کے بعد رابطہ کی زبان کا ذکر آیا۔ یہ بحث تقریباً ایک ہفتہ سے زیادہ چلی تھی جہاں تک یاد ہے۔ اس وقت راجندر پرشاد جی جو وہاں راجندر بابو کہلاتے تھے۔ کبھو صاحب، سردار پٹیل وغیرہ موجود تھے۔ میں نے کہا کہ مہاتما جی، جب شہان ہند کے بازاروں میں جو بونی بون جاتی ہے۔ اس کو آپ ہندی تھو ہندوستانی کہتے ہیں۔ مولانا صاحب، اس کو اردو کہتے ہیں۔ راجندر بابو اس کو ہندی کہیں گے۔ تو پھر اس کا نام صرف ہندوستانی ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اس پر سب ہنس پڑے اس کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔ باپو کی سونے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

گلے دن جب ہم سب شام کو ٹہلنے کے لیے نکلے۔ سردار پٹیل تو ساتھ ہوتے ہی تھے۔ اس کے علاوہ راجندر بابو اور بمبئی کے کچھ مہمان بھی تھے۔ راستے میں باپو بولے۔ ”تو ٹھیک کہتی ہے۔ ہندی تھو ہندوستانی کے بجائے صرف ہندوستانی ہی نام رہے تو چھا ہے۔ باپو کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں زحمت خوش ہوئی۔ باپو کا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔ یہ بھی بھول گئی۔ اور خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ فوراً ہی ہوش آیا تو درتو سب حیرت میں تھے۔ مگر سردار پٹیل مسکرا رہے تھے۔ وہ شرمندگی بے تک یاد ہے۔ باپو کا چہرہ دیکھنے کی بہت نہیں پڑی میرے چہرے سے مسکرائی نکلتی گئی۔ اور آتے ہی مولانا صاحب کو خط لکھا۔ خوشی کے مارے میرا براہان تھا۔

کیوں کہ میں سمجھ رہی تھی کہ ایک بہت اہم منزل طے ہو گئی ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۱ء

جناب مولوی صاحب تسلیم !

گرامی نامہ موصول ہوا۔ مشکور فرمایا۔ کچھ ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ میں اب آپ سے جلد نیاز حاصل کرنے کی متمنی ہوں۔

(سلطانہ قاضیہ)

اس خط کا جواب مجھے فوراً ہی ملا جو یہ ہے:-

انجمن ترقی اردو (ہند)

۱۔ دریا گنج، دہلی

مورخہ ۳ اکتوبر ۱۹۴۱ء

مکرمہ سلطانہ قاضیہ صاحبہ السلام علیکم

میں پرسوں اپنے دورے سے یہاں واپس آ گیا ہوں۔ آپ نے دہلی تشریف لانے اور اردو ہندی کے متعلق گفتگو کرنے کے متعلق لکھا تھا۔ اگر آپ ۱۲ اکتوبر کو یہاں تشریف لے آئیں تو اطمینان سے گفتگو ہو سکے گی۔ براہ کرم اطلاع دیجیے کہ آپ اس تاریخ کو یہاں آ سکیں گی یا نہیں۔ اگر قیام کا کہیں اور انتظام نہ کیا ہو تو انجمن کا مکان حاضر ہے۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔

دوسری عرض یہ ہے کہ انجمن کی اردو ریڈریں بغرض منظوری محکمہ تعلیمات میں داخل کی گئی ہیں۔ کمیٹی کی روح رواں بیگم عزیز الدین صاحبہ ہیں۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ بیگم صاحبہ کو صفحہ سے اس بارے میں تائید کی سفارش کر دیں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کی بڑی حامی ہیں اور ذوق علم و ادب رکھتی ہیں۔ انھوں نے تائید کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آپ براہ کرم انھیں یاد لادیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی تائید منظوری کے لیے کافی ہوگی بلکہ وہ صاحب علم بھی ہیں اور ذمی اثر بھی۔

خیر طلب  
عبدالحق

4, نومبر 1951ء

جناب مولوی صاحب

بصدا د ب تسلیم !

گرامی نامہ بارے سے ۵ نومبر کو موصول ہو کر باعث عزت ہوا۔۔۔ خط پر ۳ اکتوبر درج ہے۔ اکتوبر کب کا رخصت ہوا۔ ماہ رواں نومبر ہے ممکن ہے کہ یہ خط اکتوبر ہی میں لکھا گیا ہو اور کسی وجہ سے پڑا رہ گیا۔ اب معلوم نہیں آپ اس ماہ کی ۱۲ تاریخ کو بھی تحریر کے مطابق وقت دے سکیں گے یا نہیں۔ جواب کی منتظر ہوں۔

اگر آپ کا مطلب نومبر سے ہے تو کیا میں ماہ حال کی ۱۵ یا ۱۶ تاریخ کو حاضر ہو سکتی ہوں؟

انجمن کے مکان پر آپ نے جو مجھے قیام کی دعوت دی ہے۔ اس کا بہت شکریہ!

آپ کا خط آنے پر مطلع کروں گی کہ میں دہلی میں کہاں کھڑی رہی ہوں۔

باقی صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ دہلی سے کتابیں ناگپور میں کسی صاحب کو بھیجی جا چکی ہیں۔ غالباً

وہ انھوں نے اب تک بورڈ کو نہیں بھیجی ہیں۔

کل ہی کچھ کتابیں برائے تنقید بچھو پی جان کے پاس آئیں تھیں۔ مگر اس میں انجمن کی کوئی کتاب

نہیں تھی۔ کتا بیس دراصل مندرجہ ذیل پتے پر پہنچنی چاہیں۔

Mr. U. A. Apté,

Secretary High School Education Board,

Central Provinces, Berar Nagpur

کھوپڑی جان کو خود بہت خیال ہے۔ اب دیر کی مطلق گنجائش نہیں۔ جلد از جلد کتابیں بھیج دیجیے۔

غالباً جنوری میں میٹنگ ہوگی۔ اور اس سے ایک مہینہ قبل سب ممبروں کی رائے ویاں پہنچنی چاہئے۔

اور خود مہران بھی تنقید لکھنے میں ایک پھینہ تو لگا ہی دیں گے۔

شیرپا و دسمیلام

## سلطانہ قاضیہ

اس خط کے جواب میں مجھے اطلاع ملی کہ ۱۲ نومبر ۱۹۴۱ء کو مولانا صاحب دن کے اربنچ میرا انتظار کریں گے۔ اور پھر میں ۱۲ نومبر کو ان سے ملنے دہلی پہنچ گئی۔

## مولانا عبدالحق صاحب کے ملاقات

انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر ۱۔ دریا گنج میں تھا۔ میں جب وہاں پہنچی تو ایک بڑے سے کمرہ میں بیٹھا پایا گیا۔ تھوڑی دیر میں مولانا عبدالحق صاحب مع ایک اور صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ برتناؤ عجیب تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی بات شروع ہو، مولانا صاحب کو کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑا۔ اس دوران میں جو صاحب آئے تھے۔ انھوں نے میرے والد صاحب کا نام دریافت کیا۔ جب میں نے بتایا کہ میرے والد صاحب کا نام قاضی بشیر الدین احمد صاحب ہے۔ تو ان کا رویہ ایک دم سے بدل گیا۔ اور بہت محبت سے انھوں نے گھر کا سب حال دریافت کیا۔ وہ بھوپالی کے شعیب صاحب تھے جنک بلقان کے سلسلہ میں ۱۹۱۲ء میں ایک وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کی قیادت میں قسطنطنیہ گیا تھا۔ میرے والد صاحب اس میں شریک تھے۔ شعیب صاحب سے اس وقت سے یا علی گڑھ سے ان کی دوستی تھی۔

اب مولانا صاحب واپس آئے۔ میں ان کی آمد پر حسب عادت کھڑی ہوئی اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ جو کہ ان کو پہلے سے تو معلوم تھا ہی (مولانا صاحب بہت برا فروخت ہو گئے تھے) کی وجہ یہ تھی کہ میرے سوا کوئی اور معقول آدمی اردو ہندی کے مسئلہ کو طے کرنے کے لیے نہیں ملا، میں نے وضاحت کی کہ میں نے خود ہی بالپو سے جا کر آپ کے تحریر کردہ قیامت خیز جملے کا تذکرہ کیا تھا۔ اور اب یہ کہ آزاد ہندوستان کی رابطہ کی زبان کیا ہو۔ اس پر اگر آپ دونوں میں سمجھوتہ ہو جائے تو اچھا ہے بس اب مولانا صاحب کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ میرے بجائے کسی اور معقول آدمی سے گفتگو کر سکتے ہیں۔

”تو پھر آپ نے مجھے یہ کیوں لکھا کہ آپ یہ مسئلہ مجھ سے مل کر طے کرنا چاہتے ہیں؟“

اب نہ پوچھیے مولانا کے غصہ کا عالم! وہ تو شعیب صاحب موجود تھے۔ وہ براہ مولانا صاحب کو



تھام رہے تھے۔

مولانا صاحب بگڑ کر بولے۔ ”نہیں میں نے نہیں لکھا“

آپ نے لکھا تھا۔ میرے پاس آپ کی تحریر موجود ہے۔ ورنہ میں آپ کے پاس آتی کیوں؟  
مجھے اُس وقت ۱۔ دریا گنج میں بیٹھ کر سیواگرام آشرم کا ہر تاؤ یاد آ رہا تھا۔  
”جھوٹ بالکل غلط! میں نے نہیں لکھا۔“

شعیب صاحب نے معاملہ کو سامان کر دیا۔ مولانا صاحب کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے  
بولے۔

مولانا صاحب کہتے ہیں کہ انھوں نے نہیں لکھا اور تم کہتی ہو کہ تمہارے پاس تحریر موجود ہے۔  
تو وہ تحریر موجود ہے تو بس دکھا دو۔ مولانا صاحب نے اگر لکھا ہے تو وہ ضرور اردو، ہندی کے مسئلہ  
پر گفتگو کریں گے۔ (یہ سب ایک جملہ میں طے نہیں ہوا تھا۔ تقریباً ۱۰ منٹ میں ہم تینوں بولے  
تھے تب یہ نتیجہ نکلا تھا۔ میں نے بتایا کہ وہ خطوط گھر پر ہیں جہاں میں مقیم ہوں۔ طے پایا کہ میں جا کر وہ  
خطوط لے آؤں۔

میں کمرے سے برآمدے میں آگئی۔ شعیب صاحب بھی آگئے۔ دریافت کیا کہ کہاں ٹھہری ہوئی ہو۔  
دریا گنج میں پرانے تھانہ کی پشت پر اپنے نانا، باڈی ٹی قاضی محترم الدین احمد صاحب مرحوم کے  
مکان پر۔ وہ تو قریب ہے۔ انھوں نے اپنے ڈرائیور کو بلایا۔ میرے منہ سے تو بات بھی نہیں  
نکل رہی تھی۔ میں ان کی کار میں بیٹھ کر قیام گاہ روانہ ہو گئی۔

واپسی پر دیکھا کہ برآمدے میں شعیب صاحب ٹھہر رہے تھے۔ وہ سب خطوط جو، وپر تحریر کر چکی  
ہوں، اُن کے ہاتھ میں دیدئے۔ انھوں نے ہماری خط و کتابت کو پورا پڑھا۔

”لو لکھا تو ہے“ شعیب صاحب کے جملہ میں جو اطمینان تھا وہ آج بھی محسوس کر رہی ہوں۔ مولانا  
صاحب نے اپنے خطوط پر نظر ڈالی مگر کچھ بولے نہیں۔ اور گفتگو کا آغاز ہوا۔ مولانا صاحب، باپو  
کے اس خیال سے تو متفق تھے کہ وہ زبان جو شمالی ہند کے بازاروں میں بولی جاتی ہے وہ اردو اور ہندی  
رسم الخط میں لکھی جائے۔ مگر ان کے خیال سے بازاروں میں وہ زبان بولی جاتی تھی جو وہ لکھتے تھے  
جس میں ہندی الفاظ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نیز یہ کہ مستند الفاظ کو چُن لیا جائے۔ اس پر وہ راضی تھے۔

پھر یہ طے پایا کہ اب کی بار جو ہاتما جی دہلی آئیں گے تو مولانا صاحب اُن سے مل کر یہ مسائل طے کریں گے۔ نیز یہ بھی طے پایا کہ پنڈت سند رلال جی کو بھی اس گفتگو میں شامل کیا جائے اور ہاتما جی سے رابطہ کی زبان کے متعلق گفتگو کی جائے۔ وغیرہ۔

یہ تو حاصل تھا اس گفتگو کا جو نہ معلوم بعد میں کتنے دن چلی تھی۔ مولانا صاحب کو اس سمجھوتے پر لانے میں مجھے اتنی ہی وقت پڑی تھی جس قدر آج اتر پردیش سرکار سے اردو کے سلسلہ میں کوئی مراعات حاصل کرنے میں ہوتی ہے۔

یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ پہلی مٹینگ میں ہی میں نے بڑی ہمت کر کے مولانا صاحب سے دریافت کر لیا تھا۔ کہ آپ نے جو اخبارات میں تحریر فرمایا ہے کہ ”ہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ قرآن پاک کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان چاہے اس کو رکھیں چاہے نکالیں۔“ میں نے ہاتما جی سے دریافت کیا تھا کہ وہ پوری قوم کے لیڈر ہیں۔ انھوں نے ایسا جملہ کیسے کہہ دیا؟ تو انھوں نے انکار کیا کہ انھوں نے کبھی ایسا جملہ نہیں کہا۔

”کیسے نہیں کہا تھا؟“ مولانا صاحب پھر طیش میں آ گئے۔

میں نے روانہ ہوتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ ہاتما جی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ان حضرات سے جو جو اس مٹینگ میں شامل تھے، ان سے بھی تصدیق کروں کہ انھوں نے یہ جملہ کہا تھا یا نہیں۔

مولانا صاحب غصہ میں نہ معلوم کیا کیا کہہ رہے تھے۔ صرف محترم شعیب صاحب کی وجہ سے گفتگو آگے بڑھی تھی۔ وہی مجھے رخصت کرنے پر آمدمے تک آئے۔ پیچھے مولانا صاحب بھی آ گئے تھے۔

مجھے مولانا صاحب کے برتاؤ سے تکلیف تو بہت ہوئی تھی اور جی چاہا کہ اب دوبارہ ان سے نہ ملوں مگر پھر خیال آیا کہ اردو میری مادری زبان ہے۔ صرف مولانا صاحب کی تو نہیں ہے۔ اور اگر اب سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو ہندوستان میں اردو کے لیے جگہ رہے گی۔ دوسری طرف اردو کو بچانے کے لیے پاکستان بنایا جا رہا تھا۔ تاکہ اردو کو ایک وطن مل جائے۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سندھ میں سندھی، بنگال میں بنگالی۔ اسی طرح پنجابی اور پشتو وغیرہ ہیں۔ وہ لوگ اپنی زبان چھوڑ کر اردو کو کیوں قبول کریں گے؟ اردو کو اس کے وطن میں ہی جگہ ملنی چاہیے۔ یہی وقت ہے جب کہ اردو کے لیے جگہ بنائی جاسکتی ہے۔ اسی جذبہ کے تحت میں نے پھر سلسلہ جنبانی کی۔ جس کے نتیجے میں باپو نے مولانا

صاحب کو خطوط لکھے پنڈت سند رلال جی تو بالکل گھر کے بزرگوں کی طرح ساتھ دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ میں مولانا صاحب کی شکایت بھی انھیں سے کرتی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر مجھے تسلی دیتے تھے۔ صرف اُن سے ہی اردو کے معاملہ میں ہر بات کھل کر کہی اور سوچی جاسکتی تھی۔

مولانا صاحب کا برتاؤ برسوں میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک دفعہ ایک صاحب جو مولانا عبدالحق صاحب کو کافی قریب سے جانتے تھے۔ اُن سے ذکر اُگید انھوں نے مولانا صاحب اور میرے خطوط پڑھے۔ پھر سوال کیا۔ ”انجن کی ریڈروں کا کیا ہوا؟“

میں نے جواب دیا کہ ریڈر میں محکمہ تعلیم میں داخل ہی نہیں ہو سکیں۔ اس کی اطلاع میں نے مولانا صاحب کو اپنے خط میں دیدی تھی۔ اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ باقی صاحب نے بتایا تھا کہ آپ نے کسی کے ہاتھ ریڈر میں ناگزیر بھیج دی ہیں۔ مگر وہ اب تک محکمہ میں داخل نہیں ہوئی ہیں۔ جلدی ریڈر میں محکمہ کو بھیج دیں۔ مگر وہ آخری وقت تک محکمہ میں داخل نہیں ہو سکیں۔

اُن صاحب نے پھر دریافت کیا۔ ”مولانا صاحب نے کس کے ہاتھ کتابیں بھیجی تھیں؟“ میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ اُن صاحب کا نام نہ باقی صاحب نے بتایا اور نہ مولانا صاحب سے میں نے دریافت کیا۔

وہ ہنسنے لگے۔ بولے بس یہاں سے ہی غلط فہمی کا آغاز ہوا ہوگا۔ اللہ جانے؟ غالباً مہاتما جی کی فرمائش پر میں سیواگرام آشرم سے پنڈت سند رلال جی کو الہ آباد خط لکھ چکی تھی۔ یاد دہلی سے لکھا۔ بہر حال وہ دہلی آئے۔ میں میرے گھر سے آئی اور مولانا عبدالحق صاحب کی موجودگی میں جو کچھ طے ہوا تھا وہ میں نے باپ کو ۲۱ نومبر ۱۹۴۱ء کو لکھ دیا تھا۔ مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ کبھی یہ خطوط شائع بھی کیے جائیں گے۔ یہ نقش اول ہے۔ جو خط باپ کو بھیجا تھا وہ ظاہر ہے کہ اس سے بہتر ہوگا۔

Gunder Kot

Amrit.

21. 11. 1941.

My dear Mahatamaji,

I reached safely Nagpur,

Delhi and now Meerut.

At Delhi I met Molana Abdul Haq Sahib. I am glad to say that he agreed to all those points, about the national language of India, which I have discussed with you beforehand.

I think there should not be any controversy about the first four points, which are as follows.

1. India's national language will be called only Hindustani.
2. And it is that language, which is commonly spoken by northern <sup>Hindis</sup> Hindus and Muslims; and it is written in Hindi and urdu script.
3. All those Persian and Arabic words which are used by good <sup>educated</sup> Hindi writers and all those Hindi words which are used by good urdu writers, must be taken in the national language. (Babu, Rajendra Prasad is of the same opinion).



4. A committee will be formed of Hindi and urdu knowing scholars of admitted ability. This committee will decide about each word, expression and idiom of the national language and this committee will be entrusted with the task of compiling a dictionary of the national language.

The fifth point, which Molana Sahib has added is as follows  
I put it in the exact words.

کون کا گرسنہ میری ایسی اکھیاں یا صاحب میری پیر کے گناہ جو  
قوی رہاں کے بارے میں ادیر گئی ہوئی یا ایسی کو پوری طرح میر  
سرمایہ ہو۔ یا اصل اصل یا اصل اسکے طلب ہو۔

I shall be deeply grateful to you, Mahatamaji, if you honour me with your view-point on the above.

Slaves to all.

With respect,  
Yours affectionately  
Sultana Kazia.

۲۵ نومبر کو باپو کا خط سیواگرام سے آگیا جو درجے ذیل ہے۔

اس ورق کے علاوہ ایک ورق اور بھی تھا جس پر دونوں طرف لکھا ہوا تھا اور باپو کے دستخط بھی تھے۔ مجھے سخت رنج ہے کہ وہ ورق کھو گیا۔ لیکن مولانا صاحب اپنڈت سندرالال جی اور میرے خطوط سے معلوم ہو سکتا ہے کہ باپو نے کیا لکھا تھا۔

سیواگرام	سیواگرام	سیواگرام
وردہا۔ سی۔ پی	وردہا۔ سی۔ پی	وردہا۔ سی۔ پی
10859	10859	10859

my dear Jiltana,

I was delighted to  
have your letter.

The first proposition  
you have laid  
down with the  
approval of the  
committee is well  
received. But how  
to secure uniform  
transcript and  
return is the question.

10859

They form the basis  
for further action.  
If you have any



جناب پنڈت جی آداب عرض ہے ۔

پتا نہیں آج کل آپ کا قیام کہاں پر ہے بہر حال انجمن ترقی اردو کی

معرفت آپ کو خط لکھ رہی ہوں ۔ خدا کرے کہ آپ تک پہنچ جائے ۔

میں نے اردو اور ہندی کے جھگڑے کے سلسلہ میں جو پانچ بنیادی شرائط مولانا صاحب اور آپ

کی موجودگی میں آپ سب کے مشورے سے لکھی تھیں ۔ مہاتما جی کو میرٹھ پہنچنے کے بعد بیج دی تھیں ۔ مہاتما جی

کا خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا خط آیا ہے ۔ جس میں کہ انھوں نے پہلی چار باتوں کو تسلیم کر لیا ہے ۔ آپ کی یاد

دھانی کے لیے ان کو لکھتی ہوں ۔

(۱) ہندوستان کی قومی زبان صرف ہندوستانی کہلائے گی ۔

(۲) اور یہ وہ زبان ہے جسے شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمان مشترک طور پر بولتے ہیں ۔ اور

یہ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ۔

(۳) ہندی اور اردو کے چند مستند عالموں کو ملا کر ایک کمیٹی بنائی جائے گی ۔ یہ کمیٹی ہندوستانی

زبان کے ہر لفظ اور جملہ کے متعلق تحقیق کر کے طے کرے گی ۔ اور قومی زبان کی ڈکشنری بنانا اس ہی

کمیٹی کے سپرد ہوگا ۔

(۴) فارسی اور عربی کے تمام وہ الفاظ جن کو اچھے اور مسلم الثبوت ہندو مصنفوں نے استعمال کیا ہے اور

تمام وہ ہندی الفاظ جو کہ بڑے مسلمان مصنفوں نے اپنی کتابوں میں لکھے ہیں ۔ قومی زبان میں

شامل کیے جائیں گے ۔

مہاتما جی کا خیال ہے کہ جب وہ اور مولانا صاحب ان اصولوں کو قومی زبان کی بنیاد سمجھتے ہیں ۔ تو اب

یہ دونوں مل کر باہمی سمجھوتے سے ایسی باتیں سوچیں ۔ جن سے کہ ان بنیادی اصولوں کو عوام کے اندر

بھی مقبولیت حاصل ہو جائے ۔ اس لیے مہاتما جی چاہتے ہیں کہ مولانا صاحب سیواگرام تشریف

لائیں وہاں ہمہ پانچویں شرط بھی طے ہو جائے گی ۔ کیوں کہ اس میں کئی باتیں تشریح طلب

ہیں ۔ وہ یہ ہے :-



(۵) کوئی کانگریس کا میکر کسی ایسی انجمن یا جماعت کا ممبر نہیں ہو سکے گا۔ جو قومی زبان کے بارے میں اوپر لکھی ہوئی پالیسی کو پوری طرح پر نہیں مانتی ہو۔ یا جس (ممبر) کا اصول یا عمل اس کے خلاف ہو۔

غالباً آپ کو یاد ہوگا۔ یہ پانچویں شرط آپ نے بولی اور میں نے لکھی تھی۔ میں نے تقریباً اس ہی مضمون کا خط مولانا صاحب کو دہلی لکھا ہے۔ کیوں کہ مہاتما جی نے مجھے تحریر فرمایا ہے کہ میں مولانا صاحب سے سیواگرام جانے کے متعلق دریافت کر کے ان کو مولانا صاحب کے جواب سے مطلع کروں۔

میں آپ کو یہ خط اس امید کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ آپ ایسا موقع ہرگز نہیں آنے دیں گے۔ جس سے کسی کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ اردو والے ہی صلح کرنا نہیں چاہتے۔ دوسرے میری آپ سے ایک درخواست ہے۔ وہ یہ کہ مولانا صاحب کے ساتھ آپ کا جانا بہت ضروری ہے۔ آپ ضرور جائیں میں آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی کہ آپ نے اس سلسلہ میں کیا فیصلہ کیا۔

سلطان قاضیہ

یکم دسمبر کو میں نے مولانا صاحب کو بھی خط تحریر کیا تھا۔ بہر حال نقشِ اول ہی تھی۔ مگر اس ہم خط و کتابت کی کڑی سے کڑی ملتا ہے۔

اندر کوٹ میرٹھ

یکم دسمبر ۱۹۴۱ء

جناب مولوی صادق تسلیم

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

میں نے آپ کے دولت خانہ پر اردو اور ہندی تنازعہ کے سلسلے میں صلح کے لیے جو پانچ شرائط پنڈت سند لال جی اور آپ کے مشورے سے لکھی تھیں۔ یہ لکھ کر میں نے ان کو مہاتما جی کے پاس بھیج دیا تھا۔ پرسوں مہاتما جی کا خط آیا۔ جس میں کہ انھوں نے پہلی چار شرائط کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

چوں کہ آپ اور مہاتما جی قومی زبان کے ان چار بنیادی اصولوں پر متفق ہیں۔ اس لیے مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں دوسری عملی باتیں بھی طے ہو جائیں۔ اس کے لیے ہاتھ تاجی چاہتے ہیں کہ آپ سیوانگرم جانے کی تکلیف فرمائیں تاکہ ان بنیادی اصولوں کو عوام میں بھی مقبولیت حاصل ہو جائے۔ ہاتھ تاجی نے تحریر فرمایا ہے کہ میں آپ سے اس تجویز کے متعلق دریافت کر کے ان کو آپ کے جواب سے مطلع کروں مجھے امید ہے کہ آپ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیں گے کہ صلح کرنے میں اردو والوں نے کوتاہی کی۔ اب رہی پانچویں شرط تو ہاتھ تاجی کا خیال ہے کہ اس کو مل کر طے کر لیا جائے۔ کیوں کہ اس میں کئی چیزیں تشریح طلب ہیں۔

جواب کی منتظر ہوں گی۔ سلطانہ قاضیہ

مجھے مولانا صاحب کا تحریر کردہ خط بتاریخ ۸ دسمبر ۱۹۴۱ء ملا۔ جس میں انھوں نے صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ مجھے دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔  
انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۔ دریا گنج، دہلی

مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۴۱ء

مکرمہ قاضیہ سلطانہ صاحبہ

آپ کا خط مورخہ یکم دسمبر وصول ہوا۔ میں اس قدر مصروف تھا کہ اس کا جواب نہ لکھ سکا۔ اس تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔

وہ چار اصول جن کے متعلق گاندھی جی نے اتفاق ظاہر کیا ہے کوئی نئے نہیں ہیں۔ میں نے سب سے اول یہ تجویز آل انڈیا اور ٹمیل کانفرنس منعقدہ بڑودہ (دسمبر ۱۹۳۳ء) میں اپنے خطبہ صدارت میں پیش کی تھی۔ نیز اس بیان میں جو بالوراجیندر پرشاد صاحب اور میں نے مشترکہ طور پر شائع کیا تھا تقریباً یہی اصول درج تھے۔ لیکن اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ کچھ بھی نہیں بالوراجیندر پرشاد صاحب نے جو حال میں تقریر میں فرمائی ہیں ان سے ظاہر ہے کہ وہ ہندی ہی کو ملک کی عام زبان سمجھتے یا بنانا چاہتے ہیں۔ پانچویں شرط ہم نے اس لیے لگائی تھی کہ جب تک وہ منظور نہ کی جائے گی کوئی عملی نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ پنڈت سندھ لال صاحب مختلف اوقات میں ہفتوں اور مہینوں سبگاؤں میں رہ کر آئے اور برابر گوش

کرتے رہے۔ ڈاکٹر تارا چند گاندھی جی کے فرمانے پر ایک ہفتہ وہاں رہے اور اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ دونوں ناکام واپس آئے۔ اب میں جاؤں گا تو کیا کروں گا۔ گاندھی جی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اردو ہندی تنازعہ کا رفع کرنا ملک کے حق میں مفید ہوگا اور وہ سچے دل سے اس کے لیے آمادہ ہیں تو انہیں براہ راست اس کے متعلق کارروائی اور مجھ سے مراسلت کرنی چاہئے۔ بیچ میں کسی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اس سے بہت کچھ غلط فہمی کا اندیشہ ہے اور تاویل اور توجیہ کی بہت بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔ اور تاویل کرنے میں گاندھی جی بڑے ماہر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ فساد گاندھی جی کا بڑھایا اور پھیلایا ہوا ہے۔ اس سے پہلے یہ صرف ایک دو علاقوں میں محدود تھا۔ لیکن جب گاندھی جی نے ہندی کو ملک کی عام اور مشترکہ زبان بنانے کا اعلان کیا تو سارے ملک میں آگ سی لگ گئی۔ اب یہ نہر اس قدر پھیل چکا ہے کہ گاندھی جی کے مٹائے بھی نہیں مٹ سکتا۔ اور یہ ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ ایک وقت تھا کہ وہ اس جھگڑے کو آسانی سے مٹا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس کی قدر نہ کی اور وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ غلط راستے پر چلے اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج اگر وہ چاہیں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے۔ بہر حال کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔

جب گاندھی جی کی کوئی تحریر آئے گی تو اس پر میں اور میرے رفیق بڑی خوشی سے غور کریں گے۔

عبدالحق

مولانا صاحب کا خط پڑھ کر مجھے تکلیف تو ہوئی لیکن میں نے اردو کے کام کو مقدم سمجھتے ہوئے باپ کو ایک خط لکھا جس کا عکس درج ذیل ہے۔

~~I acknowledge~~  
~~II Bafur~~

~~My dear Bafur~~

~~I was so glad to receive your~~  
~~very kind letter, which I have already~~  
~~acknowledged through Bafur. And I am~~  
~~acknowledge~~  
~~I hope, Bafur, that you and others~~

in the sharam are well and happy.  
 I pray for your long life, health and  
happiness (Success) M.

I am ~~myself~~ ~~feeling~~ well and my stay  
 with you at Savagran which you  
 so kindly permitted has done me a lot  
 of good.

I received today a letter from Molana  
 Abdul Haq Sahib from Delhi. He  
 desires that the correspondence  
 on the subject of the National language  
 should be direct between you  
 and him. He says in his letter that

correspondence through others  
 (~~in this case myself~~) leads to  
 misapprehensions. He therefore  
 desires that you should very kindly  
 correspond on this subject direct  
 with him.

He seems quite agreed on  
 the main points of the matter.

Do kindly be good enough to let  
 him know about the future develop-  
 ments in this matter, if any.





چوں کہ ہاتما جی بزرگ ہیں ان کی اپنی تحریر کا اثر بالکل دوسرا ہو گا۔ اور اس طریقہ سے آئندہ کی راہ نکل آویگی۔ رہا میرا سیوا گاؤں جانا وہ بھی اگر ہاتما جی مجھے طلب کریں گے تو فوراً پہنچ جاؤں گا۔ انھیں یہ معلوم بھی ہے اور اگر مولانا مجھے اپنے ہمراہ لے جانا ضروری خیال کریں گے تو ان کی خدمت کے لیے بھی حاضر ہوں گا۔ مجھے جواب سے اطلاع دیں گی مولانا نے آپ کو کیا جواب دیا اور آپ نے آئندہ کیا قدم اٹھایا۔

فقیر سندral ۱۶ دسمبر ۱۹۴۱ء

اسی اشارہ میں مجھے باپو کا کارڈ ملا۔ جس کا عکس درج ہے۔ ہاتما جی چاہتے تھے کہ میں پھر سیوا گرام جاؤں

10860

Baroda

17 12 41

My dear Sultana,

I thank you  
letter I will

write to you

soon. You have

to come again

Love

Baroda

۱۶ دسمبر ۱۹۴۱ء کو میں نے ایک خط پنڈت سندral جی کو لکھا جو ذیل میں درج ہے۔ اس

عرصہ میں پنڈت جی دہلی آئے تھے اور مجھے مطلع بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر داور صاحب جن کے گھر پر پنڈت جی دہلی میں قیام کرتے تھے۔ انھوں نے یاد پڑتا ہے کہ مجھے پنڈت جی کے دہلی آنے کی اطلاع بھی دی تھی۔ کیوں کہ اس خط میں میں نے معذرت کی ہے۔

اندر کوٹ۔ میرٹھ۔

۲۱ دسمبر ۱۹۴۱ء

محترم مکرم۔۔۔۔۔ تسنیم

آپ کا خط الہ آباد سے آیا۔ بہت شکریہ آپ نے دریافت فرمایا

ہے کہ اردو ہندی کے تنازعہ کے سلسلہ میں کیا ہو رہا ہے۔ جو انا عرض کرتی ہوں کہ میں نے مولانا

صاحب کو مطلع کر دیا تھا کہ ہاتھ جی ان چار بنیاد والوں کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا صاحب نے جواب دیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ خود ان کو لکھیں۔ میں نے مولانا صاحب کا یہ پیغام ان تک پہنچا دیا تھا۔ پرسوں ہاتھ جی نے مجھے لکھا کہ وہ اس سلسلہ میں ایک خط مولانا صاحب کو دہلایا بھیج رہے ہیں۔

دیکھئے مولانا صاحب کیا جواب دیتے ہیں۔

اگر آپ مجھے اپنے تبدیل مقام سے مطلع کرتے رہیں تو بہت عنایت ہوگی۔ کیوں کہ پھر میں آپ کو بوقت ضرورت خط لکھ سکوں گی۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

زیادہ آداب

خاکسار سلطانہ قاضیہ

مورخہ یکم جنوری ۱۹۴۱ء

محترم پنڈت جی۔۔۔۔۔ تسلیم !

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

مجھے آپ کا خط ملا تھا۔ بہت شکریہ۔ اس عرصہ میں کوئی خاص بات سوائے اس کے نہیں ہوئی کہ مولانا عبدالحق صاحب نے باپو سے سیوا گرام جانے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور تاریخ کا ابھی لے نہیں ہوا۔

البتہ میں آپ سے ایک خاص بات کہنا چاہتی تھی۔ وہ یہ کہ میرا خیال ہے۔ ممکن ہے کہ غلط ہو بہر حال میں یہ سمجھتی ہوں کہ اردو ہندی کے جھکڑے کو ختم کرنے کی یہ بہت دنوں کے لیے آخری کوشش ہے۔ مولانا صاحب خصوصاً اور دوسری طرف ہاتھ جی وغیرہ سب اس سے گھبرا گئے ہیں۔ مگر خدا را خواستہ یہ ابھی طے نہ ہو تو اس قصہ کا سلجھنا مشکل ہو جائے گا۔ دوسری طرف میں سمجھتی ہوں کہ مولانا صاحب سے اس معاملہ میں گفتگو کرنے میں آپ کی موجودگی انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے آپ مجھے مطلع کیجیے کہ اب تک سیوا گرام سے یا مولانا صاحب کے پاس سے آپ کے پاس کوئی خط آیا ہے یا نہیں۔

مجھے مطلع کریں کہ کیا آپ بھی سیوا گرام جا رہے ہیں؟ میرے خیال میں تو آپ کی شرکت اردو ہندی کے متعلق سمجھوتا کرانے میں انتہائی ضروری ہے۔ میں آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔ عنایت

مابعد :- یاد فرمائی کا شکریہ !

میں ضرور حاضر ہوتی۔ مگر اس دوران میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ جس کے لیے میں آپ کا وقت لیتی۔

سلطانہ قاضیہ

مجھے میرٹھ میں مولانا صاحب کا ۱۰ جنوری ۱۹۴۲ء کا تحریر کردہ خط موصول ہوا۔ اس کا عکس درج ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۔ دریائے گنجدہلی۔

مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۲ء

مکرر سلطانہ قاضیہ صاحبہ۔

گاندھی جی کا خط بر دہلی سے میرے پاس آیا۔ انہوں نے بات چیت کرنے کے لیے سیواگرام بلا یا ہے۔ میں جاؤں گا لیکن ابھی کسی تاریخ کا تعین نہیں کیا۔  
عبداللہ الحق

جناب مولوی صاحب آداب عرض ہے۔

آپ کا خط ملا۔ بہت شکریہ !

مجھے یہ معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ سیواگرام جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خدا کرے کہ اب ہمارا جی اور آپ کے درمیان کوئی سمجھوتا ہو جائے۔ کیا آپ کے ساتھ پنڈت سند رلال جی بھی وردھان شریف لے جائیں گے۔

سلطانہ قاضیہ

اس کے بعد پنڈت جی کا خط آیا جس کا عکس درج ہے۔ میں پنڈت جی سے ملنے دہلی گئی تھی۔ پنڈت جی مسلسل میری بہت، فزانی کرتے رہتے تھے۔

معرفت ڈاکٹر ایم سی داوڑ

کوناٹ پلیس، نئی دہلی۔

مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۲ء

جی۔ تسلیم . سلطانہ قاضیہ



میں چند روز سے دہلی ہوں۔ مولانا عبدالحق صاحب سے ملاقات کی امید نہیں۔ یہاں، مگر معلوم ہوا وہ حیدرآباد گئے ہیں۔ ایک خط اسی سلسلے میں گاندھی جی کا بھی ملا تھا۔ میں ابھی کم از کم دو تین دفعہ یہاں اور ضرور ہوں۔ اگر آسانی سے ممکن ہو تو چند گھنٹہ کو تشریف لے آئیے۔ حالات معلوم ہو جائیں گے۔ ورنہ معاملات نے اس وقت تک جو کچھ ترقی کی ہے اُس سے اوپر کے بتا پر مطلع کریں۔ زیادہ دعا۔

خیر اندیش  
فقیر سندرلال

۲۰ جنوری ۱۹۴۲ء کا مولانا عبدالحق صاحب کا تحریر کردہ خط ملا۔ جس کا عکس درج ذیل ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس کے بعد اردو ہندی کے سلسلہ میں کوئی سلسلہ جنبانی نہیں ہوئی۔

مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۲ء

مکرمہ۔۔۔ تسلیم

پنڈت سندرلال صاحب سے اس بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکا کہ وہ میرے ساتھ جائیں گے یا نہیں۔

خیر طلب  
عبدالحق

ادھر تو ہاتھ تاجی، مولانا صاحب اور پنڈت سندرلال جی وغیرہ سے خط و کتابت چل رہی تھی۔ دوسری طرف میں نے ان لوگوں سے ملنا شروع کر دیا جو کہ ناگپور میں ہندی ساہتیہ کے سمیلن کے جلسہ منعقدہ ۳۵-۳۶ء میں موجود تھے۔ جن سے ملنے کے لیے ہاتھ تاجی نے کہا تھا۔ مجھے اس قیامت خیز جملہ کے متعلق سخت فکر تھی کہ سچ کس طرف ہے۔ اس خیال نے مجھے کافی پریشان کر دیا تھا۔

ایک طرف ہاتھ تاجی جیسی شخصیت، دوسرے مجھے اُن کے ساتھ رہتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ اور جس قدر میں اُن کو فریب سے دیکھ رہی تھی۔ میری عقیدت بڑھ رہی تھی۔ جی میں آیا کہ میں بھی اُن کو سب کی طرح باپو کہنے لگوں۔ مگر پھر دل نے کہا کہ عبدالحق صاحب نے اردو کے لیے بہت کام کیا ہے۔ بچپن سے اُن کا نام سن رہی ہوں یہ جملہ دہرایا جا رہا ہے کہ اردو مسلمانوں

کی زبان ہے اور قرآن پاک کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اردو کے سب اخبارات، مولانا صاحب، انجمن ترقی اردو ہند جس کے پلیٹ فارم سے یہ جملہ ہر گھڑی دہرایا جا رہا ہے۔ سب غلط ہوں۔ سچ کس کی طرف ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر پارہی تھی جب میں سیواگرام میں تھی تو مجھے باپو کے آزاد ہندوستان کی زبان کے متعلق لکھے ہوئے کئی مضامین ملے تھے۔ جو ان کے موقف کو واضح کرتے تھے۔ پھر میں جب میرٹھ میں تھی تو جواہر لال جی میرٹھ آئے۔ اس وقت مجھے ان سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اس وقت کانگریس کے ورکر کی لگائی ہوئی ایک نمائش کا غالباً افتتاح کرنے یاد یکھنے جا رہے تھے۔ کارکن اعلیٰ مسز کیلاش وتی سود صاحبہ اور دیگر بہنوں نے بڑی محنت سے یہ نمائش لگائی تھی۔ میں نے یہ بات جیسے کہی۔ وہ رُک گئے۔ مجھے لے کر جمع سے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ میرے دادا ابا قلیہ قاضی نجم الدین صاحب مرحوم میرٹھ شہر کانگریس کمیٹی کے صدر بہت لمبے عرصہ تک رہے۔ جب جواہر لال جی میرٹھ آتے تھے تو ابا جی ہم سب بہنوں کو ان سے ملانے کے لیے لے جاتے تھے۔ اس لیے مجھے ان سے باتیں کرنے میں آسانی ہوئی۔

میں نے جواہر لال جی کو پورا قصہ سنایا کہ کس طرح باپو کے متعلق یہ جملہ مشہور کیا جا رہا ہے کہ انھوں نے ناگپور کی ٹینگ میں کہا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ”جواہر لال جی نے بے چین ہو کر جواب دیا:-

نہیں نہیں باپو ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کبھی نہیں۔ انھوں نے ایسا نہیں کہا میں تو موجود تھا۔۔۔ باپو ایسی نکمی بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟ انھوں نے بہت ہی شفقت سے میرا شک دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد میں وہلی جا کر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور عابد حسین صاحب سے الگ الگ ملی۔ اور ناگپور کی ٹینگ کے متعلق دریافت کیا۔ سب نے بڑی وضاحت سے بتایا کہ اس ٹینگ میں باپو نے کبھی ایسا جملہ نہیں کہا۔ دوسرے یہ کہ اگر ایسا جملہ کہا ہوتا تو ان لوگوں کی طرف سے فوراً اعتراض ہوتا۔ وغیرہ

میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اور عابد حسین صاحب مرحوم سے فردا فردا شکایت کی تھی۔ کہ جب آپ کو یہ یقین ہے کہ باپو نے یہ جملہ نہیں کہا تو پھر اخباروں میں آپ نے اس کی تردید کیوں

نہیں کی ۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب میرے ایسا کہنے پر تڑپ اٹھے اور بولے کیا کوئی لکھے ؟ پھر انھوں نے مجھے واردھا اسکیم کا واقعہ سنایا کہ جب انھوں نے باپو کی ہدایت پر واردھا تعلیمی اسکیم مرتب کر کے ملک کے سامنے پیش کی تو مسلم لیگ اور خصوصاً مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے جس میں لیاقت علی خاں صاحب بھی شامل تھے، اس اسکیم کی شدید مخالفت کی۔ ذاکر صاحب نے ان حضرات کو خطوط بھیجے کہ واردھا اسکیم میں جو قابل اعتراض حصے ہوں وہ بتائے جائیں تاکہ اسلام کی تعلیم کے خلاف جو بات ہو وہ اسکیم سے نکال دی جائے۔ نیز یہ کہ ڈاکٹر صاحب ان کو ہر طرح سے مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ان خطوط کا کوئی جواب نہیں آیا۔ ذاکر صاحب نے ہنس کر بتایا کہ کسی پارٹی میں ان کی ملاقات مسٹر جناح سے ہو گئی۔ انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مسٹر جناح سے کہا کہ بتائیے آپ کو واردھا تعلیمی اسکیم میں کیا کیا خرابیاں نظر آئیں جو اسلام کے خلاف ہیں تاکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسٹر جناح نے جواب دیا کہ ڈاکٹر صاحب میں نے واردھا اسکیم پڑھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے کسی ممبر نے بھی انھوں نے اس کی شدید مخالفت کی تھی، واردھا اسکیم کو پڑھا تک نہیں تھا۔

یہ تھے مسلم لیگ کے سیڈ۔ ایہ قصہ سن کر ذاکر صاحب نے پھر صفائی پیش کی کہ باپو نے یہ جملہ اردو کے متعلق کبھی نہیں کہا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اب مجھے یقین آگیا کہ ذاکر صاحب، عابد حسین صاحب، کا صاحب، منشور والا جی، خواہر لال جی اور میرے باپو سچے ہیں اور انھوں نے یہ جملہ نہیں کہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ہاتھ جی کو باپو کہنا شروع کر دیا تھا۔

بٹلر کی مبین کاٹ اور مشہور کتاب Hitler puts the clock back پڑھنے کے بعد

مجھے ٹیبلر کے نسخہ پر یقین آگیا کہ جھوٹ اتنی بار دہراؤ کہو اور لکھو یہاں تک وہ سچ بن کر جی اٹھے۔

## برلا ہاؤس میں ملاقات

ملک کے سیاسی حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ سراسٹوفر کرپس حکومت برطانیہ کی طرف

سے ہندوستانی لیڈروں سے سمجھوتہ کرنے کے لیے دہلی آئے۔ تو صدر کانگریس نے اپنی ورکنگ کمیٹی کے ممبران کو دہلی طلب کر لیا۔ باپو برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں میرٹھ سے اُن سے ملنے کے لیے دہلی آئی۔ باپو بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مجھے برلا ہاؤس میں دادا بھائی نوروجی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی خورشید بہن کے ساتھ قیام کے لیے کہا۔ اُن کے ساتھ چند دنوں رہ کر میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ بڑی حسین خاتون تھیں۔

برلا ہاؤس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی برابر ٹینگیں ہو رہی تھیں۔ اور بھی کچھ اہم لوگ آئے ہوئے تھے۔ باپو سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس کے باوجود جب بھی موقع ملتا تھا، باپو مجھ سے رابطہ کی زبان کے متعلق بات کر لیتے تھے۔ اور اُن کے مشورہ سے میں نے مولانا عبدالحق صاحب کو مدعو کر لیا۔ اور اس کی اطلاع ڈاکٹر عابد حسین صاحب کو بھی دی کہ وہ وقت مقررہ پر تشریف لائیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور پنڈت سند رلال جی دہلی میں نہیں تھے۔

حسب وعدہ مولانا عبدالحق صاحب مع ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور شاید ایک دو حضرات اور تھے، ان سب کے ساتھ برلا ہاؤس پہنچ گئے۔ جب میں باپو کے کمرہ میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ایک گاؤ تکیہ کا سہارا لگائے باپو بیٹھے ہیں۔ ان کے داہنی طرف مولانا عبدالحق صاحب غصے میں زور زور سے باتیں کر رہے ہیں۔ سر کی زوردار گردش کے ساتھ ترکی ٹوپی کا کالا پھندا ہوا میں ہمارا ہاٹے۔ ادب سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب بیٹھے کبھی مولانا صاحب کو کبھی باپو کے پریشان چہرے کو دیکھ رہے ہیں۔ اور میں؟ میں سہم گئی۔ اپنے باپو کو اُن کے سو کھتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی۔ ادھر مولانا کا چہرہ شہابی رنگت اختیار کر رہا تھا۔ ادھر شاید ہم لوگوں کے پیروں کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔

مولانا صاحب کا غصہ دو ہاتھوں پر تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ باپو نے اردو کے ایک اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ایک مجھ جیسی معمولی اور گم نام لڑکی کو کیوں چنا۔ کیا اور کوئی پورے ہندوستان میں نہیں رہ گیا تھا؟ اس کا جواب باپو نے یہ دیا کہ اُس نے ہی یہ مسئلہ اٹھایا اور پھر اس کی مسلسل کوشش دیکھ کر میں نے اُس کو ہی آپ کے پاس بھیج دیا تاکہ اردو اور ہندی کے مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے۔

دوسری بات یہ تھی کہ مولانا صاحب باپو پر الزام لگا رہے تھے کہ اردو ہندی کا سارا جھگڑا انھیں کاڑا لا ہوا ہے۔ اس پر بڑی سختی سے پھٹکار رہے تھے۔ عابد حسین صاحب کہنا چاہتے تھے کہ جو ہوا



سوچا۔ اب نئے سرے سے اس پر گفتگو کر لی جائے۔ مگر مولانا صاحب بار بار اسی کی تکرار کر رہے تھے۔ غالباً ۱۰۔۱۵ منٹ یا اس سے زیادہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر بڑی کوشش کے بعد اصل مسئلہ کہ ہندوستان کی آئندہ قومی زبان کیا ہوگی، زیر بحث آیا۔ مولانا صاحب اسی پر اصرار کرتے رہے کہ ہندوستانی زبان کی وہی شکل ہوگی جو کہ وہ بولتے اور لکھتے ہیں۔ اور سمجھوتہ کی کوئی بات نہیں کی۔

جب میں نے محسوس کیا کہ اب گفتگو ختم ہو رہی ہے اور مولانا صاحب اٹھنے والے ہیں تو میں نے مولانا صاحب کی خفگی برداشت کرنے کو تیار ہو کر کہا کہ آپ نے جو جملہ اردو کے متعلق باپو سے منسوب کر کے کہا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔۔۔۔۔ مولانا صاحب میرا مطلب سمجھ گئے۔ اس کے بعد مولانا صاحب نہ معلوم کتنی دیر اپنے غصہ کا اظہار کرتے رہے۔ جب ذرا دھیمے پڑے تو باپو بولے کہ میں نے یہ جملہ کبھی نہیں کہا۔ مولانا صاحب نے جواب دیا "کہا کیسے نہیں تھا؟ مولانا صاحب کو پھر غصہ آگیا۔

مولانا صاحب جب ذرا خاموش ہوئے تو میں نے پھر کہا کہ میں نے اس جملہ کے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، جو اہل لال جی، ڈاکٹر راجندر پرشاد جی، کا کا صاحب اور منشور والا جی سے فرداً فرداً دریافت کیا تھا اور سب نے وثوق کے ساتھ مجھے یقین دلایا کہ ہاتھ جی نے ایسا کوئی جملہ نہیں کہا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے عابد حسین صاحب موجود ہیں ان سے بھی دریافت۔۔۔۔۔

"سب جھوٹے ہیں" مولانا صاحب نے بے دھڑک کہہ دیا۔

محفل پر سناٹا چھا گیا۔

مولانا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ چوں کہ میں نے ہی مولانا صاحب کو مدعو کیا تھا اس لیے میں ان سب کو کار تک چھوڑنے کے لیے گئی۔ راستہ جو کافی لمبا تھا اس کو طے کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے دو ایک جملے میری ہمت افزائی کے لیے بھی کہے اور یہ قافلہ قومی زبان کا مسئلہ طے کیے بغیر چلا گیا۔ اس کے بعد کسی نے بھی اردو ہندی کے درمیان باعزت سمجھوتہ کی کوشش نہیں کی۔

اتنا اور یاد دلادوں کہ آزادی وطن کے بعد جب قومی زبان کا مسئلہ ایوان حکومت میں آیا

کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان کیا ہونی چاہیے۔ تو خود کانگریس کے ممبران جن کی اس وقت ایوان میں بھاری اکثریت تھی، دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک کی وکالت جواہر لال جی کر رہے تھے دوسرے کی وکالت ڈاکٹر اجیندر پرشاد جی کر رہے تھے۔ جواہر لال جی چاہتے تھے کہ ملک کی قومی زبان ہندوستانی تسلیم کی جائے جو کہ ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ اور ڈاکٹر اجیندر پرشاد جی ہندی کی وکالت کر رہے تھے جو کہ صرف ہندی رسم الخط میں لکھی جائے گی۔

اگر مولانا صاحب سمجھوتہ کر لیتے اور ”ہندوستانی“ پر فیصلہ ہو جاتا کہ آزاد ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی تو پھر جواہر لال جی ایوان حکومت سے ہندی کے بجائے ہندوستانی کو ملک کی قومی زبان منوانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ یاد رہے کہ پارلیمنٹ میں جب قومی زبان کے مسئلہ پر ووٹ پڑے تھے تو جواہر لال جی صرف ایک ووٹ سے ہار گئے تھے۔ اگر باپو اور مولانا صاحب کا سمجھوتہ ہو چکا ہوتا تو اس وقت ایسا ماحول تھا کہ کانگریس کے ممبران کی ایک بڑی اکثریت باپو کے سمجھوتہ کا احترام کرتی جس کے معنی یہ ہوتے کہ ہندوستانی، ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی۔ اور اردو و تعصب کا ایسا نشانہ نہیں بن سکتی تھی جیسا کہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک اس کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

۱۹۴۷ء اور اس کے بعد ماحول میں پاکستان بننے کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اردو بیلٹ پاکستان میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے اردو کی محبت کا تقاضہ تھا کہ مولانا صاحب کسی اپنی پسند کے بااثر فرد کو باپو سے اردو ہندی مسئلہ پر سمجھوتہ کرنے کے لیے بھیج دیتے مگر ایسا نہیں کیا گیا اور باپو نے سچ کہتے کہتے سینہ پر گولی کھائی اور مولانا عبدالحق صاحب اردو کی محبت میں اردو کی سر زمین چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں کی زمین پر اردو کا تناور درخت اب تک جڑ نہیں پکڑ سکا ہے۔

## مہاتما گاندھی — اردو — مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق اس صدی کے بابائے اردو ہیں۔ یہ عقب انھوں نے خود اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ اردو زبان بولنے والوں نے، اردو کے تین عبدالحق کی خدمات کے اعتراف میں ان کو یہ خطاب دیا تھا۔ میرا موضوع ہے: ”مہاتما گاندھی، عبدالحق اور اردو“۔ شروع ہی میں یہ عرض کر دوں کہ مولوی عبدالحق نے جس اردو کے جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد کی، وہ زب اب ہمارے ادیب اپنی تخلیقات کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور نہ اس زبان میں اخبارات نکلتے ہیں، ورنہ یہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ادبی پروگراموں کی زبان ہے، اردو رسالوں اور اخباروں میں یہ رسم خط دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن یہ زندہ اردو زبان اخباروں اور رسالوں کے مضامین میں نہیں ہوتی۔ اردو اگر زندہ ہے تو صرف اس وجہ سے کہ کروڑوں لوگ جن میں سے زیادہ ان پڑھ ہیں، یا اردو رسم خط سے واقف نہیں، یہ زبان گھروں اور بازاروں میں بولتے ہیں، اور اسی زبان میں ہندی کی اکثر فلمیں بنتی ہیں۔ اور ان فلموں کی زبان ہی ٹیلی ویژن کے اکثر اشتہاروں اور ان ٹانکوں کی زبان ہے جو SOAP OPERAS کہلاتے ہیں، اور جو ہندی لپی ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو کا ادبی محاورہ، روزمرے سے دور جا پڑا ہے۔ مولوی عبدالحق ادبی زبان اور بول چال کی زبان کے درمیان دوئی کی دیواریں گرا دینے کے حق میں تھے۔ منشی پریم چند اور مولوی عبدالحق کی تحریروں کی زبان اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

سانیات کے مسلمات میں سے یہ بات ہے کہ زبان کا تعلق نہ تونس سے ہوتا ہے، اور نہ مذہب سے۔ دینی تخلیقات کا تو طبقاتی کردار ہو سکتا ہے جس کی وجہ ادیب کا طبقہ نہیں، بلکہ اس کا نظریہ ہوتا ہے۔ زبان کا کوئی طبقاتی کردار نہیں ہوتا۔ ایسا ہوتا تو زبان ترسیل اور بلاغ کا ذریعہ نہیں بن سکتی تھی۔ اور یہی اس کا مقصد بھی ہے اور اس کے وجود کی وجہ بھی۔

گاندھی جی سانیات کے ماہر نہ تھے۔ لسانی قصبے یا سیکے کے سلسلہ میں ان کے خیالات سرسری اور

نامعتبر معلومات پر اور بڑی حد تک لسانی عصبیت کے شکار مشیروں کے غلط مشوروں کا نتیجہ تھے۔ گاندھی جی نے زبان کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنا چاہا، لیکن وہ خود اپنے مشیروں کا آلہ کار بن گئے۔ اُن کے مشیروں میں پرشوتم داس ٹنڈن اور کنھیالال منشی شامل تھے۔

ہند سورا ج ۱۹۰۹ء، ص ۱۲۴، قومی زبان کے تصور کے بارے میں گاندھی جی کا یہ بیان ہے:

”ہر ایک پٹھے لکھے ہندستانی کو اپنی زبان کا، ہندو کو سنسکرت، مسلمان کو عربی، پارسی کو فارسی کا، اور سب کو ہندی کا گیان ہونا چاہیئے۔ کچھ ہندوؤں کو عربی، اور کچھ مسلمانوں اور پارسیوں کو سنسکرت سیکھنی چاہیئے۔ اُتر اور پچھم میں رہنے والے ہندستانیوں کو تامل سیکھنی چاہیئے۔ سارے ہندستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیئے اردو یا انگریز لکھاؤٹ میں لکھنے کی چھوٹ دینی چاہیئے۔ ہندو مسلمانوں کے وچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لیے بہتر ہے ہندستانیوں کو انگریزی لکھاؤٹیں جاننا ضروری ہے۔ ایسا ہونے پر ہم اپنے آپس کے بیوہار میں سے انگریزی کو باہر نکال سکیں گے۔“

۱۹۱۸ء میں ہندی سہیتہ سمیلن کا اکٹھاں اجلاس ہوا۔ خطبہ صدارت گاندھی جی نے پڑھا، انھوں نے جن نکتوں پر زور دیا، ان میں یہ بھی ہے:

”سہیتہ کا دائرہ، بھاشا کی بھومی جاننے پر ہی طے ہو سکتا ہے۔ اگر ہندی بھاشا کی بھومی صرف اُتری صوبہ ہوگی، تو سہیتہ کا دائرہ تنگ رہے گا۔ اگر ہندی بھاشا راشٹر بھاشا ہوگی، تو سہیتہ کی پھیلاؤٹ بھی راشٹری ہوگی۔۔۔ ہندی بھاشا، وہ بھاشا ہے، جس کو اُتر میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں، اور جو انگریز یا فارسی لکھاؤٹ میں لکھی جاتی ہے، یہ ہندی ایک دم سنسکرت لدی نہیں ہے، نہ وہ ایک دم فارسی شبیدوں سے لدی ہوئی ہے۔۔۔ ہندوؤں کی بولی سے فارسی شبیدوں کو بالکل الگ کرنا، اور مسلمانوں کی بولی سے سنسکرت کو بالکل الگ

۱۔ بحوالہ گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ، مترجمہ عشرت علی صدیقی (اتر پردیش اردو اکاڈمی، ۱۹۸۰ء)

ص ۱۳۱

۲۔ مشترکہ زبان (ہاتما جی نے کیا سوچا تھا)، قاضی عبدالغفار: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۹۔



کر دینا غیر ضروری ہے۔۔۔ مسلمان بھائی عربی لکھاوٹ میں ہی لکھیں گے۔ ہندو دیوناگری میں لکھیں گے۔۔۔ ہندوؤں کو فارسی شبد کھوڑے بہت جانتے پڑیں گے۔ مسلمان بھائیوں کو سنسکرت شبدوں کا گیان حاصل کرنا پڑے گا۔۔۔ ہم جانتے ہیں کہ مسلمان بھائیوں کی توار دو ہی راشتہ بھاشا ہے۔ اس بات سے یہ بھی آسانی کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ ہندی یا اردو مخلوں کے زمانے سے راشتہ بھاشا بنتی جاتی تھی۔

اس خطبے میں گاندھی جی نے نہ صرف یہ کہا کہ ”ہم جانتے ہیں کہ مسلمان بھائیوں کی توار دو ہی راشتہ بھاشا ہے۔ بلکہ یہ مشورہ دینے کے بعد کہ مسلمان سنسکرت کا گیان حاصل کریں، یہ بھی کہا کہ ”ایسے لین دین سے اسلامی بھاشا کا بل بڑھ جائے گا۔“

دوسری گجرات تعلیمی کانفرنس ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بھڑوچ میں ہوئی تھی۔ ہندی اور اردو کے تعلق سے بھی گاندھی جی نے کچھ باتیں اپنے خطبہ صدارت میں کہیں:

”۔۔۔ میں ہندی اس زبان کو کہتا ہوں، جو اتر کے ہندو اور مسلمان بولتے ہیں، اور جہے یا تو دیوناگری میں، اور یا اردو لکھاوٹ میں لکھا جاتا ہے۔ اس تشریح بہ کچھ اعتراض بھی کیے گئے ہیں۔ ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہندی اور اردو، دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اتری ہندستان میں ہندو اور مسلمان، دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ان زبانوں میں فرق پڑھے لکھے لوگوں نے پیدا کیا ہے۔ پڑھے لکھے ہندو، اپنی ہندی یا سنسکرت ملا دیتے ہیں، جس کی وجہ سے مسلمان اسے سمجھ نہیں پاتے۔ اسی طرح لکھنؤ کے مسلمان اپنی اردو میں فارسی ملا دیتے ہیں، اور اسے ہندوؤں کے سمجھنے کے لائق نہیں رکھتے۔ عام لوگوں کے لیے یہ دونوں زبانیں اجنبی ہیں، اور ان کے کسی کام کی نہیں ہیں۔۔۔ اتری ہندستان کے لوگ جو زبان بولتے ہیں، وہ ایک ہے آپ اسے چاہے ہندی کہہ لیں چاہے اردو۔ اسے اردو لکھاوٹ میں لکھ کر آپ اردو کہہ سکتے ہیں، اور اسی کو ناگری لکھاوٹ میں لکھیں تو یہ ہندی ہی جاتی ہے۔ اب رہا لکھاوٹ کا سوال۔ فی الحال مسلمان یقینی طور سے اردو لکھاوٹ

استعمال کریں گے، اور ہندو زیادہ تردید باغری میں لکھیں گے۔ میں زیادہ تر کی بات اس لیے کہتا ہوں کہ آج بھی ہزاروں ہندو وارد و نکھاوٹ میں لکھتے ہیں، اور ان میں سے کچھ تو ناگری نکھاوٹ جانتے بھی نہیں ہیں۔ آخر ہمیں جب ہندوؤں، و مسلمانوں کے بیچ کوئی شک و شبہ نہیں رہ جائے گا، اور جب ان کے درمیان بے اعتباری کی تمام وجہیں دور ہو جائیں گی، تو جس نکھاوٹ میں زیادہ طاقت ہے، وہ زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال ہوگی۔ اور اس طرح قومی نکھاوٹ بن جائے گی۔

بیچ کے زمانے میں جو ہندو اور مسلمان اپنی درخواستیں وغیرہ اردو میں لکھنا چاہتے ہیں، انہیں ایسا کرنے کی آزادی ملنی چاہیے۔۔۔ ہندی نے اپنے آپ کو قومی زبان کی حیثیت سے پہلے ہی جھالیایا ہے۔ ہم سے اس حیثیت میں بہت مدت سے استعمال کر رہے ہیں جو داردو کا جنم بھی اسی صورت میں کا نتیجہ ہے۔ مسلمان بادشاہ فارسی اور عربی کو قومی زبان نہیں بنا سکے۔ انہوں نے ہندی کو اردو (گرام دیا کرن) کو اپنا لیا، اور صرف بول چال میں فارسی کے زیادہ لفظ استعمال کیے، اور لکھنے میں اردو نکھاوٹ سے کام لیا۔ لیکن وہ عام لوگوں سے بات چیت ایک بدیسی زبان میں نہیں کر سکتے تھے۔ یہی معاملہ انگریزی حاکموں کا ہے۔ جن لوگوں کو معلوم ہے کہ فوج میں سپاہیوں سے کیسے کام لیتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس کے یہ انہوں نے ہندی یا اردو کے لفظ گھڑ لیے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ہندی قومی زبان بن سکتی ہے۔۔۔

۳ جنوری ۱۹۲۵ء کے نو بیرون میں گاندھی جی نے کانپور کانگریس کے ہندوستانی کے بارے میں رزلوشن کے حق میں نکھاوٹ

”اس رزلوشن کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ کانگریس کی کارروائی، جہاں تک ہوسکے ہندوستان میں چلائی جائے گی۔ اگر کانگریس کے ممبر اس کو قبول کر لیں، اور اس پر عمل کریں، تو کانگریس کے کام میں غریب جنتا کی دل چسپی بڑھ جائے گی۔“

کانپور کانگریس کارزولوشن نمبر ۱ (انڈین نیشنل کانگریس، کانپور ۱۹۲۵ء) یہ تھا

” کانگریس کی کارروائی، جہاں تک ممکن ہوگا، ہندوستانی میں چلائی جائے گی۔ انگریزی زبان، یا کوئی صوبائی زبان بھی، استعمال کی جاسکتی ہے، اگر تقریر کرنے والا ہندوستانی نہیں بول سکتا، یا جب کبھی ضروری ہو جائے، صوبہ کانگریس کمیٹی کی کارروائی، متعلقہ صوبے کی زبان میں ہوگی۔“

ہندوستانی بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔“

۱۳ جولائی ۱۹۲۷ء کے یگ انڈیا میں رسم خط کے سلسلہ میں گاندھی جی نے ان خیالات کا اظہار کیا: ”... سارے ہندوستان کے لیے ایک ایسی عام لکھاؤٹ ہونی چاہیے، جسے آسانی سے اپنایا جاسکے۔ اور کسی لکھاؤٹ کو اپنانے میں اتنی آسانی نہیں ہے، جتنی دیوناگری لکھاؤٹ کو اپنانے میں۔ اور نہ کوئی لکھاؤٹ اتنی مکمل ہے، جتنی کہ دیوناگری لکھاؤٹ۔ اس کام کے لیے ایک کل ہندو ادارہ قائم ہے، یا کسی نطرنے میں قائم نظامہ میں نہیں جانتا کہ اس وقت یہ سنسکرت کا کام کر رہی ہے۔ لیکن اگر اس کام کو انجام دینا ہے، تو یا تو اصل انجمن کو جاندار بنانا ہوگا، یا اس کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کرنا ہوگا۔ اس تحریک کو ہندی یا ہندوستانی کا ایک مشترکہ زبان کی حیثیت سے، پہچان کرنے کی تحریک کے ساتھ کسی طرح خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ یہ دوسرا کام بہت آہستہ، لیکن مستقل طور سے جاری ہے۔ ایک ہی لکھاؤٹ کے استعمال سے، ایک ہی زبان کو چلانے میں مدد ملے گی۔ لیکن یہ دونوں تحریکیں اپنے مقصد کے اعتبار سے، صرف ایک نقطہ تک ساتھ ساتھ جاتی ہیں۔ ہندی یا ہندوستانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے صوبائی زبانوں کے بجائے رائج کیا جائے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان زبانوں کی مدد کی جائے، اور مشترکہ زبان کو صوبوں کے آپسی کام کا ج میں استعمال کیا جائے۔ جب تک ہندو مسلم تناؤ باقی ہے، اُس وقت تک اس کی شکل یا تو اس اردو کی ہوگی جو فارسی لکھاؤٹ میں لکھی جائے گی، اور جس میں فارسی اور عربی نفظوں کی کثرت ہوگی، اور یا اس ہندی کی ہوگی، جو دیوناگری لکھاؤٹ میں لکھی جائے گی، اور جس میں سنسکرت نفظوں کی

بھرا ہوگی۔ جب دونوں فرقوں کے دل مل جائیں گے، تو ایک ہی زبان کی دونوں شکلیں ایک دوسرے میں سما جائیں گی، اور ہمیں ایک ایسی زبان مل جائے گی، جو دونوں کے میل سے پیدا ہوگی، اور جس میں سنسکرت، فارسی، عربی، یا دوسری زبانوں کے وہ لفظ شامل ہوں گے، جو زبان کی پوری ترقی اور دو چاروں کو پوری طرح سے ظاہر کرنے کے لیے ضروری ہوں گے۔

رائٹر پبلکیشن پریشد (قومی تعلیمی کونسل) گروکل کانگری میں گاندھی جی نے ایک تقریر کی تھی، جو ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء کے ہندی نو جیون میں چھپی تھی۔ ایک اقتباس:

”سنسکرت سیکھنا ہر ایک ہندوستانی طالب علم کا فرض ہے۔ ہندوؤں کا تو ہے ہی۔ مسلمانوں کا بھی ہے، کیوں کہ انھیں اُن کے باپ دادا بھی تو رام اور کرشن ہی تھے جنہیں پہچاننے کے لیے انھیں سنسکرت سیکھنی چاہیے۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ سمندر رکھنے کے لیے اُن کی زبان سیکھنا ہندوؤں کا بھی فرض ہے۔ آج ہم ایک دوسرے کی بھاشا سے بھاگے پھرتے ہیں، کیوں کہ ہم پاگل بن گئے ہیں۔۔۔“

ہندی، اردو، ہندوستانی کے سلسلہ میں ایک بڑا عجیب اور بھیانک تضاد گاندھی جی کے ان خیالات میں ہے، جو پیش کیے گئے اقتباسات میں اتنا نمایاں ہے، کہ صرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔ وہ ہندی، اردو، ہندوستانی کو ایک ہی زبان مانتے ہیں۔ اُن کی یہ رائے کسی گہری فکر یا مطالعے کی وجہ سے نہیں، بلکہ سیاسی وجدان کا کرشمہ ہے۔ خلافت کی تحریک کو انھوں نے کانگریس کی حمایت اس لیے پیش کی کہ مسلمان جذباتی طور سے کانگریس کی طرف رغب ہوں۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان بار بار کہہ کر، اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان قرار دے کر، دونوں کو قریب لانا چاہا۔ ساخت اور قواعد کے اعتبار سے بول چال کی ہندی اور اردو ایک ہیں۔ سر جارج گریسن نے بھی یہ بات کہی ہے، لیکن مذہب یا فرقے کا عنصر اُس نے بھی داخل کیا۔ اور یہی تضاد اُس کے یہاں بھی ہے۔

As a dialect of Western Hindi, Hindustani presents itself

۱۔ گاندھی جی اور قومی زبان، ص ۴۷۔

LINGUISTIC SURVEY OF INDIA; VOL. IX Indo-Aryan Family:

Central Group : Part I.

(First Edition : 1916, Reprint (Motilal Banarsî Das, Delhi:1968)



under several forms. These may first of all be considered under two heads, viz. vernacular Hindustani, and the Literary Hindostani founded there on. Vernacular Hindostani is the language of the Upper Gangetic Doab and of Western Rohilkhand. Literary Hindostani is the polite speech of India generally, and may be taken as the Vernacular of educated Musalmans through out northern India, and of all Musalmans south of Narbada...Literary Hindostani is so widely known and of such importance, that it must necessarily be taken as the standard dialect of Western Hindi (p.42)

”مغربی ہندی کی ایک بولی کی حیثیت سے ہندوستانی کے کئی روپ ہیں۔ سب سے پہلے ان کے بارے میں دو خانوں میں بات کر، غور کیا سکتا ہے۔ ایک اور اکیوٹر، یعنی ویسی بول چال کی ہندوستانی دو بول چال کی ہندوستانی پر مبنی ادبی ہندوستانی۔ بول چال کی ہندوستانی۔ ورنہ اکیوٹر ہندوستانی بالائی دو آبے (گنگا) اور مغربی روہیل کھنڈ کی زبان ہے۔ ادبی ہندوستانی عام طور سے ہندوستان کی شائستہ زبان ہے، اور اسے شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں اور نرپدا کے جنوب کے سارے مسلمانوں کی زبان سمجھنا چاہیے۔ ادبی ہندوستانی اتنی عام ہے، اور اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ لازمی طور پر اسے مغربی ہندوستانی کی معیاری بولی ماننا چاہیے“ (ص ۴۲)

گریسن کے اس بیان میں ایک واضح تضاد ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ادبی ہندوستانی عام طور سے ہندوستان کی شائستہ زبان ہے۔ دوسری طرف وہ سے شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زبان بتاتا ہے۔ اور دوسرے تضاد یہ ہے کہ نرپدا کے جنوب میں رہنے والے مسلمانوں کی زبان بھی یہی ہے، چاہے وہ تعلیم یافتہ ہوں یا ناخواند۔

کیوں کہ سرحد کے جنوب کے یہ اُس نے تعلیم یافتہ ہونے کی بھی قید نہیں رکھی۔ کیا یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ ایک گھر میں دو بھائی صرف اس وجہ سے زبان کے دو مختلف روپ بولیں گے کہ ایک تعلیم یافتہ ہے، اور ایک ناخواندہ۔ اردو کے سلسلہ میں تو دلی میں بھی، اور لکھنؤ میں بھی، بعض گھرانوں کی خواتین کی زبان کو سندھ مانا جاتا تھا۔ حالاں کہ اس زمانے میں تعلیم نسواں کا رواج نہیں تھا۔ اگلے صفحے پر ہی گریسن نے یہ لکھا ہے کہ

Literary Hindostani, as distinct from vernacular Hindostani, is current, in various forms, as the language of polite society, and as a lingua franca over the whole of, India proper. It is also a language of Literature, both poetical and prose (p.44)

اور تانیکور ہندستانی سے نمایاں طور پر مختلف، ادبی ہندستانی، مختلف ہیئتوں میں شائستہ سوسائٹی کی زبان کی حیثیت سے اور سارے ہندستان کی لنگو افراڈکا کی حیثیت سے رائج ہے یہ نثر اور نظم کی ادبی تخلیقات کی بھی زبان ہے (ص ۴۴)

گریسن کے بیان کے پچھلے اقتباس کے تضادات، اس اقتباس کے بعد اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ وہ زبان جو ملک کی لنگو افراڈکا ہو کسی طبقے یا فرقے تک محدود نہیں ہو سکتی۔ ہاں کسی علاقے میں رہنے والوں کی مادری زبان ہو سکتی ہے۔ دوسرے علاقوں کے باشندوں کی اکتسابی زبان ہو سکتی ہے۔ یہ باقاعدہ زبان ہوتی ہے، جو بولی کی سطح سے ترقی کر کے زبان کی سطح پر پہنچتی ہے۔ اور یہ زبان اکتسابی زبان کی حیثیت سے جہاں پڑھی اور استعمال کی جاتی ہے، وہاں کی زبانوں کو متاثر کرتی ہے۔ اور اگر کسی دوسرے علاقے میں رائج ہونے لگے، تو جیسے اپنے علاقے میں اس کی بولیاں ہوتی ہیں، دوسرے علاقوں میں بھی اس کی بولیوں کے اکھوٹے پھوٹتے ہیں، اور اس کی نشوونما اپنے ماحول میں ایک مختلف پنج سے ہوتی ہے۔ گریسن جسے مغربی ہندی، ادبی ہندستانی کو جس کی بولی بتاتا ہے، دراصل اس کی عمر ادبی ہندستانی سے کم ہے۔ اور اس لیے مغربی ہندی، ادبی ہندستانی بولی تو ہو سکتی ہے، ادبی ہندستانی، مغربی ہندی کی بولی نہیں ہو سکتی۔

یہ ذکر ضمنی طور پر آگیا ہے، کیوں کہ موضوع حاضر سے متعلق تھا۔ موضوع ایک تحقیقی مقالے کا تقاضا کرتا ہے۔ - حوصلہ کانٹے کی طرح ذہن میں چبھ رہا ہے۔ کیوں کہ وقت متنازع کیا جا رہا ہے۔  
وہ گریسن، جس نے ادبی ہندوستانی کو شمالی ہند کے تعلیم یافتہ اور نریداس سے نیچے کے سارے مسلمانوں کی زبان بتایا تھا، صفحات ۴۴ و ۴۵ پر لکھتا ہے:

Urdu is that form of Hindostani, which is written in the Persian character, and which makes a free use of Persian (including Arabic) words in its vocabulary. The name is said to be derived from the Urdu-e-Mu'alla or royal military bazar outside the Delhi palace. It is spoken chiefly in the towns of Western Hindostani, by Musalmans and by Hindus who have fallen under the influence of Persian culture. Persian vocabless are, it is true, employed in every form of Hindostani. Such have been admitted to full citizenship even in the rustic dialects, or in the elegant Hindi of modern writers like Harish-chandra of Benaras. To object to their use would be affected purism, just as would be the avoidance of the use of all words of Latin derivation in English. But in what is known as High Urdu, the use of Persian words is carried to almost incredible extremes. In writing of this class we find whole sentences in which the only Indian thing is the grammar, and with nothing but Persian words from beginning to end. It is curious, however, that the extreme Persianisation of Hindostani is not, as Sir Charles Lyall rightly points out, the work of conquerors ignorant of the language of the people. On the contrary, the Urdu language took its rise in the efforts of the ever pliable Hindu to assimilate the language of his rulers. Its authors were Kayasthas and Khatrias employed in the administration and acquainted with Persian, not Persians or Persianised Turks, who for many centuries used only their

own language for literary purposes. To these is due the idea of employing the Persian character for their vernacular speech and the consequent preference for words to which that character is native. "Persian is now no foreign idiom in India, and through its excessive use is repugnant to good taste, it would be foolish purism and a political mistake to attempt (as some have attempted, to eliminate it from the Hindu (HINDI) literature of the day' .... Once a word has become domesticated in Hindostani no one has any right to object to its use, whatever its origin may be, and opinions will only differ as to what words have received the right of citizenship and what have not. This, after all, is a question of style, and in Hindostani, as in English, there are styles and styles. For myself, I far prefer the Hindostani from which words whose citizenship in any way is doubtful are excluded, but that I freely admit, is a matter of taste.

"اردو ہندستانی کا وہ روپ ہے، جو فارسی حروف میں لکھا جاتا ہے، اور جو اپنی فرہنگ میں (عربی سمیت) فارسی الفاظ کا آزادانہ استعمال کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نام اردو معنی دہلی کے شاہی محل کے باہر کے فوجی بازار سے مستخرج ہے۔ یہ (یعنی اردو) خاص طور سے مغربی ہندستان میں، مسلمان، اور وہ ہندو، جو ایرانی کلچر کے اثر میں آگئے ہیں۔ بولتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ فارسی الفاظ ہندستانی کے ہر روپ میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ دیہاتی بولیوں میں بھی انہیں پوری طرح قبول کر لیا گیا ہے۔ بنارس کے ہرش چندر جیسے جدید دانشور ہندی ادیبوں کی تحریروں کی تعلیم میں بھی انہیں پوری شہریت کا حق مل گیا ہے۔ ان کے

1.: Quotation from Sir Charles Lyall.



استعمال پر اعتراض کرنا محض دکھاوے کی تطہیر پسندی ہوگی، بالکل اسی طرح جیسے انگریزی میں لاطینی سے مستخرج الفاظ کے استعمال سے احتراز کریں۔ لیکن وہ جسے اردوئے معلیٰ کہتے ہیں، فارسی الفاظ کا استعمال ناقابل یقین انتہائی حدود تک پہنچ گیا ہے۔ اس قسم کی تحریروں میں ہمیں پورے پورے جملے ایسے ملتے ہیں، جن میں ہندوستانی جزو صرف تو، عدد (صرف و نحو) ہوتا ہے۔ شروع سے آخر تک فارسی الفاظ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستانی کی انتہائی فارسی زدگی، جیسی کہ سرچارلس ریال نے درست نشاندہی کی ہے، عوام کی زبان سے ناواقف فاقوں کا نہیں تھا۔ برخلاف اس کے، اردو زبان ابھری ہی ہمیشہ اطاعت پذیری پر مائل ہندو کی، اپنے حکمرانوں کی زبان کو جذب کر لینے کی سعی، و سرگرمی کی وجہ سے لے کا تسخیر اور کھڑی، جو انتظامیہ میں ملازم تھے، اور فارسی سے واقفیت رکھتے تھے، اس کے موجد تھے، نہ کہ ایرانی یا ایرانی کلچر میں رنگ جانے والے ترک، جنہوں نے ادبی مفاسد کے لیے صرف اپنی زبان استعمال کی تھی اپنی ورنہ نابور بولی کے لیے فارسی حروف کا تحریروں میں استعمال کرنے کا منصوبہ بھی انہی کا رہنما بنتا ہے، اور اس کی وجہ سے اس زبان کے الفاظ کو ترجیح دینے کا خیال بھی جس کا رسم خط انہوں نے اپنی زبان کی تحریر کے لیے اپنایا۔

۱۷: یہ نظر پر صرف کالمستقوں اور کھڑیوں نے فارسی زبان اور حروف کو اپنایا، مزید چھان بین چاہتا ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں کے ایک سنسکرت مخطوطے میں بعض الفاظ کے صحیح تلفظ کے لیے بین السطور میں الفاظ فارسی رسم خط میں لکھے ہیں۔ اور یہ مذہبی کتاب ہے۔ کشمیر میں ماسٹر زندہ کول، وراسٹر شکر پنڈت کو مشنوی مولانا کے روم نہ صرف ازہر تھی، بلکہ عبادت کے طور پر اس کا جاپ کرتے تھے۔ دلی میں فارسی زبان پوجا کی تقریبات کا حصہ بن گئی تھی۔ ہیشوردیال نے اپنے بچپن میں، جیسٹھ کے مہینے میں ہونے والی نرجلا اکاڈشی کی پوجا میں یہ شلوک سنا: "ایک فلوس، و بادکش و یک صراحی بہ شری کشن اپنی دم" فارسی پوجا کے شلوکوں کے روپ میں رائج ہو گئی تھی، اور گھروں اور مندروں میں پہنچ گئی تھی (کمال) ۱۸: اس بیان کی صداقت اس حقیقت سے واضح ہے کہ بابر نے اپنی توڑک توڑک فارسی میں لکھی یہ جانگیر کی توڑک فارسی میں ہے۔ اورنگزیب کے رقعہ نگار لکیر بھی فارسی میں ہیں۔ محمد شاہ آخری بادشاہ تھا، جو ترک جانتا تھا۔ اردو، ہندی، فارسی رسم خط میں (شاہ عالم اور آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نے ادبی اظہار کی زبان کے طور پر استعمال کی اکبر نے نورتنوں میں سے ایک راجہ ٹوڈرل نے محکمہ مال کے ریکارڈ فارسی میں رکھنے کے احکامات صادر کیے۔ (کمال)

اب فارسی کے الفاظ ہندوستان میں غیر ملکی روزمرہ یا محاورہ نہیں، اور اگرچہ اس کا کثرت سے استعمال ذوق پر گراں گزرتا ہے، پھر بھی آج کے ہندی ادب سے فارسی کے الفاظ ایک قلم نکال پھینکنے کی کوشش کرنا جیسا کہ کچھ تے کرنا چاہا، احتفانہ تطہیر پسندی اور سیاسی حماقت ہوگی۔ یہ ایک بار کوئی لفظ ہندوستانی میں سدھ جلے (اور رائج ہو جائے) تو کسی کو اُس کے استعمال پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، چاہے اس کا ماتخذ کوئی بھی (زبان) ہو۔ اقتدار سے صرف اس بات پر ہوسکتا ہے کہ کون سے الفاظ کو (اقلیم زبان میں) شہریت کا حق مل گیا ہے، اور کون کو نہیں۔ یہ بہر حال، اسلوب کا سوال ہے، اور ہندوستانی میں، جیسا کہ انگریزی میں ہے، اسالیب کی رنگارنگی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اس ہندوستانی کو کہیں زیادہ ترجیح دیتا ہوں، جو ایسے الفاظ سے پاک ہو، جن کا مروج ہونا کسی بھی طرح مشکوک ہو، لیکن یہ بات میں کھلے دل سے مانتا ہوں کہ یہ اپنی پسند اور ذوق کا معاملہ ہے۔

ص ۷۷ پر گریڈیشن نے لکھا ہے :

We may now define the three main varieties of Hindostani as a follows: Hindostani is primarily the language of the Upper Gangetic Doab, and is also the Linga franca of India, capable of being written in both Persian and Devnagri characters, and without purism, avoiding alike the exercise use of either Persian or Sanskrit words when employed for literature. The name 'Urdu' can then be confined to that special variety of Hindostani in which Persian words are of frequent concurrence, and which hence can only be written in the Persian character and similarity, 'Hindi' can be confined to the form of Hindostani, in which Sanskrit words abound, and which hence can only be written in the Devanagari character -

”اب ہم ہندوستانی کی تین سب سے اہم قسموں کا تعین کریں گے۔ ہندوستانی بنیادی طور سے گنگا کے اوپری دو آبے کی زبان ہے، اور ہندوستان کی لنگوا فرانکا بھی ہے، اور جس میں صلاحیت ہے فارسی اور دیوناگری، دونوں لپیوں میں لکھے جانے کی، اور تطہیر کی شعوری کوشش کے بغیر فارسی اور سنسکرت کے (ثقیل) الفاظ کے بے تحاشا استعمال سے بچنے کی، جب ادبی تخلیق کے لیے کام میں لائی جائے۔ اردو کا نام ہندوستانی کے اس روپ کے لیے مخصوص کیا جاسکتا ہے جس میں فارسی (دخیل) الفاظ زیادہ ہوں، اور اس لیے صرف فارسی رسم خط میں لکھی جاسکے۔ ہندوستانی کے اس روپ کے لیے مخصوص کی جاسکتی ہے جس پر سنسکرت رت سم (شبدا چھائے ہوئے ہوں) اور اس لیے صرف دیوناگری ہی میں لکھی جاسکتی ہے۔“

رسم خط، زبان کا ناقابل تسمیخ جزو نہیں ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے زبان کی تحریری شکل بعد کا مرحلہ ہے، اور اس کا بھی ایک ارتقا ہے۔ تصویر کی رسم خط سے حروف کی موجودہ شکل تک۔ اس کے باوجود ہندی اور اردو قصبے نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ فارسی حروف پر ہندی رسم خط اردو کی بقاء کے لیے ضروری ہو گیا ہے یہ تفصیل کا موقع نہیں ہے، لیکن یہ گزارش کرنا ضروری ہے کہ بہت سے (اور یہ تعداد کم و بڑی ہیں) ان لوگوں کی مادری زبان اردو ہے، جو لکھنا نہیں جانتے، یا صرف ناگری رسم خط سے واقف ہیں۔ ان کی زبان بنیادی ہندوستانی ہے (بنیادی پر چونکنے کی ضرورت نہیں، اسی میں غیر ضروری آمیزش سے نام نہاد پنج کوٹی کی شدھ ہندی اور اعلا معیار کی اردو ایجاد ہوئی، جو فطری زبانیں نہیں بلکہ (خشکہ بگندہ بیروزہ کی طرح) ایجاد بندہ ہیں۔

ولی، ابرو، میر، اور بڑی حد تک سودا کی زبان بھی فارسی زدہ نہیں ہے (حالاں کہ سودا فارسی کے بھی شاعر تھے۔ ولی کو گلشن کے مشورے کی روایت، اردو شاعری کی زبان میں ایرانی پیکر تراشی، اور فارسی الفاظ کی روز افزوں فراوانی کا نقطہ عروج غالب کی وہ شاعری، جسے بید کی رنگ کہا جاتا ہے (حالاں کہ اس حقیقہ کے نزدیک یہ رنگ بیدل نہیں ہے) ایسی ہی افراط و تفریط کی نشیں ایک مثال رجب علی بیگ سرور کا ”فسانہ عجائب“ ہے۔ یہ بھی اردو ادب کا ایک طیفہ ہے کہ رنگ بیدل میں ریختہ کہنے والے مرزا اسد اللہ خان غالب نے رجب علی بیگ سرور کی فارسی زدہ ترکی عبارت کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ سچ ہے دوسرے کی آنکھ کا نہکا نظر آ جاتا ہے، اپنی آنکھ کا ہتیر دکھائی نہیں دیتا۔

سرور کے نزدیک میرامن کی بارغ و بہار کے زبان سو قیاد تھی، اسی لیے انھوں نے فسانہ عجائب۔ شرفا

کی پُر تکلف اور شستہ زبان لکھی۔ لیکن غالب نے میرامن کی زبان کو ترجیح دی، کیوں کہ یہ دلی کی بول چال اور روز مرے کے مطابق تھی۔ فسانہ عجائب چوں کہ باغ و بہار کے بعد لکھا گیا، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نثر، جو تسبیل کی طرف جا رہی تھی، اُس سفر میں یہ ایک قدم مراجعت کا تھا۔

اردو نثر کا ارتقاء ایک ضخیم تحقیقی مقالے کا مطالبہ کرتا ہے، اور یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔ لیکن مختصر طور سے اس کا ذکر ضروری ہے، چاہے وہ ادھورا ہی ہو، ناقص الاولوں اور ناقص الآخر ہونے کے علاوہ درمیان کی بھی بہت سی کڑیاں چھوٹی ہوتی ہوں۔

عجائب القصص، شاہ عالم کی تصنیف ہے، اور اُس عہد کی، جب غلام قادر و سید انھیں نابینا کر چکا تھا۔ ڈاکٹر تصنی کریم نے اس پر تحقیق کی ہے، اور اُن کا خیال ہے کہ شاہ عالم نے یہ قصہ (بہت ممکن ہے) میرامن ہی کو املا کرایا تھا۔ عجائب القصص کی زبان کا اندازہ اس اقتباس سے ہو سکتا ہے:

”ساتھان کھنچے ہوئے ہیں، اور ٹٹیاں ابرک کی لگ رہی ہیں اور جوہری پچہ اور صراف، حلوائی وغیرہ اقام اقام کی پوشاکیں پہنے ہوئے، دوکانوں میں بیٹھے ہیں، اور ایک طرف دوکانوں میں نان و حلوہ فروش، طرح طرح کے طعام تیار کیے ہوئے، چوڑیاں، سونے، روپے کی ہاتھ میں لیے ہوئے، مگس رانی کر رہے ہیں، اور ایک طرف دوکانوں میں فالودے والے چاندی کی قابو (ر) میں، آبی غریلوں میں، چینی کی تشریوں میں فالودہ دمشق و رومی و ہندی و چینی جمائے ہوئے بیٹھے ہیں، چچی اور قاشق نقرہ و چوہی منقش چین کے اور روم کے خطائی پیالوں پر دھری ہوئی ہیں۔“

باغ و بہار میں میرامن، سیر پہلے درویش کی اس طرح شروع کرتے ہیں:

”خاتمہ کتاب کی عبارت ہے جبکہ کتاب فضل الہی سے اختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اسی میں تاریخ نکلے جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری میں کہنا رکھنا شروع کیا تھا۔ باعث عدم فرصت کے بارہ سو سترو سن کی ابتدا میں انجام ہوئی۔ اس فکر میں تھا کہ دل نے کہا باغ و بہار اچھا نام ہے کہ ہم نام وہم تاریخ اس میں نکلتی ہے۔“

انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں بھی مسلم قریشی کی عنایت سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نایاب مخطوطات، قدیمی نسخے اور مخطوطات اور نسخوں کی فہرستیں دیکھنے کا موقع ملا۔ جو یادداشتیں تیار کی گئیں اُن میں سے ایک میرامن کی اس کتاب کے بارے میں بھی ہے، مخطوطات کی فہرست کے مطابق ۱۸۰۱ء میں چار درویش کی تالیف ہو چکی تھی۔ اندراج کے مطابق۔

۱۷۵۰ ہجری مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی، اور اصل کتاب کے نام پر اس کا نام بھی چار درویش رکھا گیا۔ لیکن باغ و بہار کے نام سے مشہور ہوئی جو اس کا تاریخی نام ہے پہلے ۱۸۰۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی، لیکن اس سے پہلے ایک سال قبل اس کا کچھ حصہ کلکتہ کے ہندی مینوں میں شائع ہو چکا تھا۔ اس اسکان کو نظر انداز نہیں کیا سکتا جنوری ۱۸۰۲ء میں جب کتابوں کی اشاعت ملتوی ہو گئی، اور اس میں میرامن کی کتاب بھی شامل تھی، تو میرامن نے مسودے پر نظر ثانی کر کے، نام باغ و بہار رکھا، اور اس کا ستر تالیف تصنیف ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء قرار دیا۔ اور ۱۸۰۱ء ۱۲ جان ۱۲۱۶ھ میں ختم ہوا تھا۔



مہیلا درویش دوزانو جو بیٹھا، اور اپنی سیر کا قصہ اس طرح سے کہنے لگا۔ یا معبود! اللہ!  
ذرا ادھر متوجہ ہو، اور ماجرا اس بے سرو پا کا سنو:

یہ سرگذشت میری ذرا کان دھر سنو      مجھ کو فلک نے کر دیا زیر و بر، سنو  
جو کچھ کے پیش آئی ہے شدت مرتے نہیں      اس کا بیان کرتا ہوں، تم سر بسنو  
مے یاراں! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد ماجد اس عاجز کا ملک  
التجار، خواجہ احمد نام، بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی باجن یا پیلہ اُن کے برابر نہ تھا۔  
اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے، خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے، اور لاکھوں روپے  
نقد اور جس ملک ملک کی، گھر میں موجود تھی۔ اُن کے بیاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی  
فقیر، جو کفنی سیلی پہنے ہوئے، مرشدوں کی حضوری میں حاضر، اور بولتا ہے۔۔۔۔۔

بارغ و بہار سے پہلے دریائے لطافت سے عبارت کا نقل کیا جانا چاہیے تھا، لیکن ایسا بعد میں، یہ وجود کیا  
جار ہا ہے۔ میرزا مظہر جان جاس سے اپنی ملاقات کا ذکر اُنشانے ان الفاظ میں کیا ہے:

"۔۔۔ میں نے دیکھا کہ میرزا موصوف پیرا بن، اور کلاہ سفید پہنے، اور تاشپاتی رنگ کے دوٹے  
کا سموں کندھے پر ڈالے بیٹھے تھے۔ میں نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ نہایت عنایت اور اخلاق  
سے، جو بزرگوں کا شیوہ ہے، سلام کا جواب دیا، اور اپنی جگہ سے اٹھ کر، مجھ بے بوقت کے سر کو  
اپنے کن رہیں بھیج لیا، اور پہلو میں جگہ دی۔ میں نے عرض کیا:

ابتداءے سخن صبا سے، تا اوایل رسیا و اوایل رسیا سے اُٹی، ان اشقیاء  
ملا ابطاق تقبل عقبہ کالیہ نہ جدے تھا کہ سلکِ تحریر و تقریر میں منظم  
ہو سکے۔ لہذا، بے واسطہ و وسیعہ حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے ارشاد کیا:  
اپنے تلوں بھی بد و طفلی سے تمہیں اپنے اشخاص کے ساتھ موانست و مجالست  
رہا کی ہے۔"

گفتگو، اس جن قزبان میں (جو میرزا غائب کے ہیدوارنگ کا شری جواب ہے) لکھنے والے انہی اُشانیے رانی کی کہانی  
اس مثالی زبانِ اردو میں لکھی، جس میں ایک لفظ بھی عربی، فارسی، ترکی کا نہیں۔ پہلے اس نشر کا نمونہ دراج گمارا دے

”ایک دن ہرالی دیکھنے کو اپنے گھوڑے پر چڑھ کے، اٹھکیل پئے، اور رطکپن کے ساتھ دیکھتا بھاتا چلا جاتا تھا۔ اتنے میں جو ایک ہرنی اس کے سامنے آئی، تو اس کا جی لوٹ پوٹ ہوا۔ اس نے ہرنی کے پیچھے سب کو چھوڑ چھاڑ کر گھوڑا پھینکا۔ بھلا کوئی گھوڑا اس کو پاسکتا تھا جب سورج چھپ گیا، اور ہرنی آنکھوں سے اوجھل ہوئی، تب تو یہ کنورا دے بھان بھوکا پیاسا، ابنیلا، جمہانا، انگڑائیاں لیتا، ہٹکا ہٹکا ہو کے، لگا آسرا ڈھونڈتے تھے۔ اتنے میں کچھ ایک امریاں دھیان چڑھیں۔ اُدھر چل نکلا، تو کیا دیکھتا ہے کہ چالیس سو رٹیاں، ایک سے ایک جو بن میں اگلی، جھول ڈالے ہوئے، پٹری جھول رہی ہیں، اور ساون ٹکٹیاں ہیں۔ جوں ہی انھوں نے اس کو دیکھا، تو کون ہو تو کون ہو کہ چنگاڑسی پڑ گئی۔ اُن سمجھوں میں ایک کے ساتھ، اُس کی آنکھ بڑ گئی۔ دو ہا اپنی بولی کا کہہ

کوئی کہتی تھی، یہ اُچکا ہے کوئی کہتی تھی۔ ایک پکا ہے۔

یہ چند صفحوں کی کہانی نہیں، کتاب ہے۔ لمبائی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہے، اور وہ یہ کہ صفحہ دس صفحے نہیں پوری کتاب اردو میں لکھی گئی۔ اور اُس میں کوئی لفظ فارسی، عربی اور ترکی کا نہیں۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ۔ اور اس سے بڑا اور ثبوت کیا ہوگا کہ اردو کا اس ملک میں مسلمانوں کی آمد سے کوئی تعلق نہیں۔ فارسی، عربی اور ترکی الفاظ مسلمانوں کے ساتھ ہی تو آئے تھے۔ اگر اردو کی ایک کتاب میں صرف ویسی لفظ ہیں، تو یقیناً اُس زبان کا ارتقار، دوسری جدید ہندوستانی زبانوں کی طرح اسی ملک میں ہوا۔ اب اگر فارسی، عربی، ترکی، وغیرہ کے لفظوں کو حق شہریت مل گیا ہے، تو ایسا کس زبان میں نہیں ہے؟ بنگالی، مراٹھی، گجراتی، کشمیری، پنجابی، ہریانوی، ڈوگری، کوتھکی کے علاوہ ہر بیدار کے جنوب میں بولی جانے والی دراوڑی زبانوں تک میں یہ بیرونی الفاظ ہیں۔ اور تو اور ہندی میں ان زبانوں کے ذخیل الفاظ ہیں۔ خود ہندی نام انت سم بات نہ بھونہیں، فارسی ہے۔ انشا کی کتاب ”رانی کیشکی کی کہانی“ کی زبان اگرچہ وہ نہیں ہے، جو بے تکلف لکھی یا بولی جاتی تھی / ہے۔ ایک طرح سے اس میں بڑی آہور ہے، اس کے باوجود اس سے اردو کا خالص ہندوستانی زبان ہونا تو ثابت ہوا ہی۔ انشا چوں کہ اردو، عربی

سلہ اُس زمانے میں عورت کو رنڈی کہتے تھے۔ باغ وہاں میں بھی رنڈی انہی معنوں میں ہے۔ (کمال)

سلہ یہ لفظ شاید زائد ہے اور سہو کہتا ہے۔

فارسی، ترکی، پنجابی اور کشمیری زبانوں پر دسترس رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی آمیزش نہیں ہونے دی۔ انھوں نے یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں لکھی تھی۔

چند معروضات: اعلا اور ارفع اردو کے مقابلے میں اونچ کوئی کی ہندی کے بارے میں۔ یہ ہائی ہندی، کوئی قطری یا ارتقاء پذیر زبان نہیں، بلکہ ایجاد کی ہوئی زبان ہے، اور اس کے موجد ہیں لٹوالاں کب (کوی) یہ بھی میرامن کی طرح فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے عملے میں تھے۔ ان کی کتاب پریم ساگر ۱۸۱۰ء میں چھپی۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد تھا کہ اردو اور دیوناگری لپیوں میں ایسی کتابیں لکھوائی ورجھانی جائیں جن سے کمپنی بہادر کے افسر جو ولایت سے آئیں، وہ ہندوستانی نہ صرف سمجھ سکیں، بلکہ لکھ بھی سکیں۔ دفتروں اور عدالتوں میں دستاویزیں پڑھ سکیں، درگواہیاں سن سکیں، اور ہندوستانی عملے کو ہدایات دے سکیں اور ان کے جواب سمجھ سکیں۔ ہندوستانی شعبے کے صدر گلکرسٹ تھے، آخر فروری ۱۸۰۴ء میں گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ۹ اگست ۱۸۰۳ء کو انھوں نے ہندوستانی مصنفین (عملے) کی جن کتابوں پر انعام دینے کی سفارش کی تھی، اس میں ۲۵۰ صفحات کی کتاب پریم ساگر بھی شامل تھی۔ گویا کتاب ۱۸۰۳ء میں لکھی جا چکی تھی لیکن چھپی گلکرسٹ کے جانے کے چھ برس بعد گلکرسٹ کے زمانے میں۔ جتنی کتابیں لکھی گئیں، ان میں اس بات پر زور تھا کہ بول چال کی زبان استعمال ہو لیکن پریم ساگر کی زبان سنگھاسن، تپسی، بیتال پچسی اور باغ دہار سے بالکل مختلف ہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے لیے جو تحقیقی مقالہ (ترسیلی اردو کو الہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن) میں نے لکھا تھا، اس میں شاید پہلی بار یہ سواں اٹھایا گیا کہ پریم ساگر کی زبان، کالج کی دوسری مطبوعات کی زبان سے مختلف کیوں ہے؟ میری حقیر رائے یہ ہے کہ گلکرسٹ نے جس مسودے کو انعام کا مستحق ۱۸۰۳ء میں سمجھا تھا، وہ ارتقاء، ۱۸۰۸ء میں جو کتاب چھپی وہ کچھ اور تھی۔ اور ان معنوں میں لٹوالاں جس نے اس چھ برس کے عرصے میں یہ کام کیا کہ جن

۱۔ شکستہ اور بیتال پچسی کا ترجمہ لٹوالاں اور کاظم علی جوان نے مل کر کیا تھا۔ کاظم علی سنسکرت نہیں جانتے تھے، اور شکستہ کا ترجمہ شاید سنسکرت متن کا کیا گیا تھا۔ اسی طرح سنگھاسن، تپسی اور قصہ بادھونل و کام کندلا کا ترجمہ لٹوالاں اور مظہر علی و لاف نے مل کر کیا تھا۔ سنگھاسن، تپسی اور بیتال پچسی اردو اور ہندی رسم خط، دونوں میں چھپی تھیں۔ واضح ہے کہ یہ ترجمے ہندوستان کے لوگوں کے پڑھنے کے لیے نہیں، ولایت سے تازہ وارد صاحبوں کی تعلیم کے لیے ہوتا تھا۔ اس لیے زور دو باتوں پر تھا۔ کمپنی بہادر کے یہ نئے انگریز افسرانگریزی اور اردو پسند سیکھیں، اور وہ زبان بگیا جس میں انھیں مقدمے سنا ہوں گے، اور درخواستیں پڑھنا ہوں گی۔ تسم لکھنڈ کیا فارسی زندہ اردو کو ایجا دکر نایا فروغ دینا فورٹ ولیم کالج کا مقصد نہیں تھا (مکمل)

لفظوں کو انھوں نے عربی اور فارسی اور ترکی کا سمجھا، ان کی جگہ سنسکرت کے شبید رکھ دیئے۔ اور جہاں جہاں ممکن ہوا تو بھوا الفاظ کاٹ کر، ان کی جگہ تہتم لکھ دیئے۔ اب لٹولاں کب جی ہفت زبان تو تھے نہیں، انشا کی طرح۔ اگرے کے معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ فورٹ ولیم کالج کو ضرورت بھی ایسے لوگوں کی تھی، جو بول چال کی زبان لکھ سکیں۔

چنانچہ پشت فاری ریشموں عربی و ترکی الفاظ پریم ساگر میں موجود ہیں، ایک بات موصوف نے اور بھی کی۔ وہ یہ کہ مرکب افعال کا جو اسلوب ساز طریقہ چونکھ تھا، لٹولاں جی نے اسے بھی ترک کیا۔

پریم ساگر میں ایک جملہ ہے:

”جس کال او شبارہ ورشش کی ہوئی، تو اس کے مکھ چندر کی جیوتی دیکھ پورن ماسی کا چندرما

چھب، مین ہوا۔“

اس زمانے میں نہ یزبان بولی جاتی تھی، ورنہ اس سے پہلے بولی جاتی تھی۔ چنانچہ شرو نظم سے ایسی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے وہ اس شیلی کے بانی قرار پائے۔ کال، وقت اور زمانے کے معنوں میں جھکا ہے، لیکن یہاں جیسے استعمال ہوا ہے، شاید ہی پہلے یا بعد میں ہو، ہو۔ دور درشن اور کاش وانی نے شبید کوشش کی مدد سے نہایت مضحکہ خیز زبان ایجاد کی ہے، لیکن کال کا ایسا استعمال کرنے کی جسرات ان اداروں کو بھی نہیں ہوئی۔ زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ گلرست نے پریم ساگر کے مسودے کو دیکھ کر انعام کی سفارش کی ہوگی، تو اس میں عبارت یہ رہی ہوگی:

”جس سے، و شبارہ برس کی ہوئی، تو اس کے چاند سے مکھڑے کی دھک دیکھ کر چودھو میں رپون

ماشنی کا چاند ماندر پڑ گیا۔“

---

اے لٹولاں اور سدا مسر کی کتابوں کے علاوہ یہ زبان اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ اولین نمونے ہیں۔ ہندی سائیتھ کا آہاس میں رام چندر شکل صرف پریم ساگر کی زبان کو ہندی مانتے ہیں نیکستلا، ورمادھونل و کام کنڈلا کے ساتھ دیوناگری میں چھپے بیتال چھپی اور سنگھاسن سیتی کی زبان کو اردو قرار دیتے ہیں۔ ہندی نہیں تسلیم کرتے۔ گویا لٹولاں ہندی کے پہلے مصنف ہیں اس طرح تہتم لکھی ہندی انیسویں صدی کی دوسری نہیں تو پہلی دہائی میں وجود میں آئی، اردو میں قطع و برید کے بعد۔ اس طرح اعلیٰ ہندی، اردو کی شیلی بن جاتی ہے (کمال)



گریسن نے ہندوستانی کے جو تین روپ بیان کیے ہیں، اُن تینوں کی مثالیں بھی پیش کی گئیں، اور کچھ اُن کے رتقار کے بارے میں بھی گزارش کی گئی۔

اب ہم ماضی بعید سے نسبتاً ماضی قریب کی طرف آتے ہیں، حالاں کہ اُس پر بھی ۵۵ برس گزر چکے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رے پوری اس وقت مولوی عبدالحق کے ساتھ انجمن ترقی اردو میں کام کر رہے تھے۔ اپنی خود نوشت سو، رخ حیات گم دراد میں، انھوں نے ساہتیہ پرشدر، ناگپور کے جلسے کے بارے میں ص ۲۰۰ پر جو کچھ لکھا ہے، اُس کے کچھ اقتباسات :-

”اپریل ۱۹۲۶ء کے آخری ہفتے کی مقررہ تاریخ کو میں ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری کی کوٹھی پر پہنچا تو مولوی صاحب کو موجود پایا۔ رہوڑ کے دورے کا حال سناتے ہوئے انھوں نے یک بیک کہا۔۔۔ ہماری ٹرین شام کو حیدر آباد جاتی تھی، لہذا وقت کاٹنے کے لیے مولوی صاحب نے جامعہ ملیہ کا قصد کیا۔۔۔ ہم پر وفیسر مجیب کے گھر اتر گئے اور انھوں نے ڈاکٹر اختر حسین وغیرہ کو خبر کر دی۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کل ناگپور میں گاندھی جی کا جلسہ ہے۔ آپ لوگ سربراہ کیوں وہاں ٹھہر نہیں جاتے۔۔۔ تاہم مولوی صاحب گاندھی جی کے مذاح تھے۔۔۔ گاڑی دوسرے دن صبح اٹار سی جنکشن پہنچی، جہاں الہ آباد کی ٹرین سے سکنگ ہوتا تھا۔ اس میں سے پنڈت نہرو کے ہمراہ منشی پریم چند اور چارپہ نریندر دیو کو برآمد ہوتے ہوئے دیکھا۔۔۔ ساہتیہ پرشدر کے جلسے میں گاندھی جی نے جو گل کھلایا، وہ سب کو معلوم ہے، اور اس کی جو روداد مولوی صاحب نے قلم بند کی تھی، وہ تاریخی دستاویز ہے۔۔۔ جو بحث یہاں شروع ہوئی، اُس نے آگے چل کر لسانی سیاست کی شکل اختیار کر لی۔۔۔ پہلے تو سمجھے میں نہ آیا کہ گاندھی جی نے خواہ مخواہ ہندی، ردو کا قضیہ کیوں شروع کیا، اور ادبی مسائل کے بجائے لسانی عداوت کیوں پیدا کی۔ بعد میں جا کر اصل بھید کھلا۔ گاندھی جی باخبر سیاست دان تھے، لیکن، دہلی اور ثقافتی معاملات میں اُن کے مشیر کے، ایم منشی اور کا کا بیکر جیسے متعصب فرقہ پرست تھے، جن میں سے ایک گجراتی، اور دوسرا مراٹھی کا نامی گرامی مصنف تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کو سمجھایا کہ ادب میں جدید خیالات عام ہو رہے ہیں

اگر فوری طور پر آدمیوں کو کانگریس کے جھنڈے تلے جمع نہ کیا گیا، تو وہ کسی اور طرف ہٹک جائیں گے۔ بنارس میں گاندھی جی جلسے کی تشکیل کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس کی تاریخ ہندی ساہتیہ مہین کے سالانہ جلسے کے ساتھ رکھی گئی، جو ناگپور میں منعقد ہوا تھا۔ اس طرح ساہتیہ پرشد کے جلسے میں ہندی کے طرفدار بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اور پس پردہ یہ طے پایا کہ اسی وقت طے کر لیا جائے کہ قومی زبان ہندی (یعنی ہندوستانی) ہوگی، جس سے مراد شمالی ہند کی وہ بول چال کی زبان ہے، جو ہندی یا اردو لکھی جاتی ہے۔۔۔ ساہتیہ پرشد کے جلسے نے مولوی صاحب کی زندگی، اور انجمن کے لائحہ عمل کو بدل کر رکھ دیا۔ حیدر آباد ہوتے ہوئے چند روز بعد ہم اورنگ آباد پہنچے تو سب سے پہلے مولوی صاحب نے اپنے کمرے سے چرخہ اٹھا کر پھینک دیا۔ اور کھاری کے کپڑے تہہ کر دیئے۔ طاق سے وہ لٹیا بھی ہٹا دی، جو نوک مانیہ تک کبھی سیاہی روپوشی کے زمانے میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر نرمی کے بجائے سختی نمایاں ہو گئی تھی اور آنکھوں میں فکر کی بدلی کے بجائے غم کی دھوپ چمکنے لگی تھی۔۔۔

ناگپور میں ساہتیہ پرشد کے اجلاس سے چند مہینے پہلے، سجاد ظہیر لندن سے ہندوستان واپس آئے۔ بہت سی کچھ دنوں کے قیام کے دوران میں انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے سلسلہ میں گجراتی اور مراٹھی ادیبوں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کنھیا لال منشی اور ان کی بیوی بیلا دتی منشی سے ملاقات کے کچھ تاثرات سجاد ظہیر کی کتاب روشنائی (ص ۳۱ - ۳۲) سے:

”۔۔۔ منشی صاحب بڑے آدمی تھے، اور میں ایک طالب علم۔ میں نے جب ترقی پسند مصنفین کا مینی فیسٹو انھیں دیا تو اس پر اچھٹی سی نظر ڈال کر، انھوں نے اسے الگ رکھا۔ اور جیسا کہ ہمارے لیڈروں کا عام دستور ہے، انھوں نے اپنی ادبی اور سانی اسکیموں پر مجھے لکھ دینا شروع کیا۔۔۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میں خود ایک ایسا ادارہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب کو ایک جگہ جمع کر کے، ایک واحد قومی زبان (ہندی) کے ذریعے سارے ملک میں پھیلانے۔ انھوں نے مجھے متنبہ کیا کہ ہمارے ملک میں مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب بہت ہے، چنانچہ لوگ، خاص طور پر اردو والے، ہندی کی ترویج کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور ہر ایسے پلان کی مخالفت کرتے ہیں، جس

میں قومی اتحاد کی کوشش کی گئی ہو۔۔۔ یہ ظاہر ہو گیا کہ کنھیالال منشی کا، اور ہمارا نقطہ نظر بنیادی طور پر مختلف تھا۔۔۔ کنھیالال منشی سومنا تھ کے کھنڈروں کو دوبارہ کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری نظر میں موجودہ انسانی جدوجہد کی فیصلہ کن عظمت پر گڑی تھیں۔۔۔

گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ میں عشرت علی صدیقی نے ص ۵۹-۶۱ پر اکھل بھارتیہ ساقیہ پر شد کے عنوان سے ۱۹۳۷ء کے ناگپور کے اجلاس میں گاندھی جی کا خطبہ صدارت درج کیا ہے، لیکن اس کے ماخذ کا کوئی اندراج نہیں ہے۔ صرف یہ اطلاع نوٹ میں ہے کہ یہ لکھی ہوئی تقریر تھی۔ خطبہ یہ ہے: ”عالم فاضل لوگ ایک دوسرے کے ادب کا کچھ علم حاصل کریں، صرف اتنے ہی سے ہمیں کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو دیہاتی ادب کی بھی ضرورت ہے۔ اور جہاں تو میں موجودہ زمانے کے ادب کے پرچار کی بھی شرم کی بات ہے کہ جتنے کے تبرک کا فائدہ ہندوستان کی سبھی زبانیں بولنے والوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ ترو ویلور کا نام شاید ہم سب نہیں جانتے ہوں گے اتر بھارت کی جنتا تو اس سنت کا نام جانتی ہی نہیں۔ اُس نے کھوٹے لفظوں میں جیسا گیان دیا ہے، ویسا بہت کم سنت لوگ دے سکتے ہیں۔ اس بارے میں تو اس وقت تو نکارام ہی کا دوسرا نام میرے خیال میں آتا ہے۔“

اگر ہم سارے ہندوستان کے ادب کے لمبے چوڑے میدان میں داخل ہوں، تو کیا اس کی کچھ قدریں اور حدیں بھی مقرر ہونی چاہئیں؟ میری رائے میں ضرور ہونی چاہئیں۔ مجھے کتابوں کی گنتی بڑھانے کا موہ کبھی نہیں رہا۔ میں اسے ضروری نہیں مانتا کہ ہر ایک صوبے کی زبان میں لکھی اور چھپی ہر ایک کتاب کی جانکاری دوسری سب زبانوں میں دی جائے۔ جو ادب ایٹا کو، اخلاق کو، ہمت و بہادری کو، اور دوسری اچھی باتوں اور سائنٹفک رویے کو بڑھانے والا ہو، اس کا ہر چار ہر ایک صوبے میں ہونا ضروری اور مفید ہے۔

آج کل عشقیہ رنگ والے گندے ادب کی بارش سب صوبوں میں آرہی ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایک عشقیہ رنگ کو چھوڑ کر، اور کوئی رنگ ہے ہی نہیں۔ عشقیہ

رنگ کو بڑھانے کے کارن، ایسے لوگ دوسروں کو تیاگی کہہ کر، اُن کی مخالفت کرتے، اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں جو سب چیزوں کا تیاگ کر بیٹھے ہیں، وہ بھی رُس کا تیاگ تو نہیں کر پاتے۔ کسی نہ کسی طرح کے رُس سے ہم سب بھرے ہیں۔ داد اچائی نے دیس کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی وہ رُس سے بھرے تھے۔ دیس سیوا ہی کو انھوں نے اپنا رُس بنا رکھا تھا۔ اس میں اُن کو خوشی ملتی تھی۔ چتینہ کو رُس سے خاں کہنا رُس نہ جاننے کے برابر ہے۔ نرسنگ مہتا نے اپنے کو بھوگی (لطف و مسرت کا رسیا) بتایا ہے۔ لیکن وہ گجرات کے سب سے اونچے بھگت تھے۔ اگر آپ کو میری بات بُری نہ معلوم ہو، تو میں یہاں تک کہوں گا کہ میں عشقیہ ادب کو سب سے گھٹیا قسم کا ادب سمجھتا ہوں۔ اور جب اس میں فحش پن اُچھاتا ہے، تب اسے بالکل ہی فضوں اور چھوڑنے کے لائق مانتا ہوں۔ اگر میرا بس چلے تو میں اس نسقا میں ایسے ادب کی ممانعت کرا دوں۔ اسی طرح جو ادب فرقہ داری نفرت کو، دھرم کے نام پر اندھے ہو کر، بُرے سے بُرا کام کرنے کو، اور جنتا میں، یا الگ الگ آدمیوں میں دشمنی کو بڑھاتا ہے، اس کو بھی چھوڑ دینا ضروری ہے۔

یہ کام کیسے کیا جائے؟ منشی جی اور کا کا صاحب نے ہمارا راستہ ایک حد تک صاف کر رکھا ہے۔ جو ادب کے ایک بڑے علاقے کی سیوا کرنا چاہتا ہو، اُس کا پرچار بڑے پیمانے پر یولی جانے والی زبان ہی سے ہو سکتا ہے۔ ایسے کام کے لیے جو (؟) ہندی ہندستانی دوسری کسی بھی زبان سے زیادہ موزوں ہے۔ ہندی کو ہندستانی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس زبان میں فارسی محاوروں (؟) سے پرہیز نہ کیا جائے۔

انگریزی بھاشا کبھی صوبوں کے لیے آپسی تبادلہ خیال کا ذریعہ نہیں ہو سکتی، اگر ہم سچ مچ ہندستانی ادب کی ترقی چاہتے ہیں، اور الگ الگ زبانوں میں جو جو اہرات چھپے پڑے ہیں، اُن کا پرچار ہندوستان کے کمر وڑوں انسانوں میں کرنا چاہتے ہیں، تو یہ سب ہم ہندستانی کی معرفت ہی کر سکتے ہیں۔

اس خطبہ صدارت کے علاوہ صرف ہندوستان کی بارے میں دو نوٹ / شذرے / مضامین ترمین

میں چھپے، جو بعد میں نقل کئے جائیں گے۔ قاضی عبدالغفار اور عشرت علی صدیقی کو



کچھ اور اس موضوع پر نہیں ملا، جس کا تعلق ساہتیہ پرشد کے ناگپور اجلاس سے ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۲۵ء کے کانپور اجلاس میں ہندوستانی کے بارے میں جو رزلوشن (نمبر ۸) منظور کیا تھا، اس کی حمایت میں ۷ جون ۱۹۲۶ء کے سینگ انڈیا اور ۳ جنوری ۱۹۲۶ء کے نو جیون میں گاندھی لکھ چکے تھے۔ ”کانگریس کی کارروائی، جہاں تک ہو سکے، ہندوستانی میں چلائی جائے گی“ (اکتوبر ۱۹۱۷ء میں بھڑوچ میں گاندھی جی کہہ چکے تھے) یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ہندی اور اردو دو الگ الگ زبانیں ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اتر میں ہندوستان میں ہندو اور مسلمان، دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ذرا زیادہ تفصیل سے اقتباس نقل کیا جا چکا ہے۔ گاندھی جی ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاسوں کی صدارتیں کرتے کرتے، اس تنظیم کے روح رواں اور ترجمان بھی بن گئے۔ اور اس کا تباہ کن نتیجہ ناگپور کا، کھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا اجلاس تھا۔ یہاں جو سوال کانٹے کی طرح ذہن میں چبھتا اور کھٹکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کی معروف ترین ادبی شخصیتیں تھیں رابندر ناتھ ٹیگور، اقبال، منشی پریم چند، اور قاضی نذیر اسلام گاندھی جی اور جواہر لال نہرو، دونوں ٹیگور اور اقبال کا بڑا احترام کرتے تھے۔ لیکن اس کھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے لیے انہیں نہیں بلایا گیا۔ اقبال کی صحت اچھی نہیں تھی، اور علاج کے لیے رتھیری بار (بھوپال) مارچ ۱۹۳۶ء کو گئے تھے۔ بھوپال سے ناگپور بہت دور نہیں۔ اس زمانے میں ایک دن یا ایک رات کا سفر تھا۔ اگر کوشش کی گئی ہوتی تو بہت ممکن تھا اقبال ۲۲ اپریل کے ناگپور اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے یا تو بھوپال میں زیادہ ٹھہر جاتے، یا پھر لاہور سے آتے، اور واپسی پر بھوپال رُک جاتے۔ نہ گاندھی جی نے، اور نہ کسی اور نے اجلاس میں ٹیگور یا اقبال کا ذکر کیا۔ منشی پریم چند بھی اس لیے بلائے گئے کہ انھوں نے سنس (سارکس) کو ہندی ساہتیہ سمیلن کا آفیشل آرگن بنادیا تھا۔ کھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کنھیالال منشی اور کالیکر کا اسٹیج مینیج شو (Stage Managed Show) تھا، اور ان لوگوں نے گاندھی جی، جواہر لال نہرو، اور اجاریہ تریندر دیو کو استعمال کیا۔

انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد میں تھا، اور وہیں سے اردو متحدہ نکلتا تھا۔ ۱۹۱۷ء تا ۱۹۳۸ء جلد پرل ۱۹۳۸ء میں شایع ہوئی۔ ص ۲۱۵ سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت (از ایڈیٹر) مولوی عبدالحق کا تاریخی مضمون ہے۔ یوں تو اس مضمون کے ایک ایک لفظ کی ہمیت ہے لیکن طوالت کے پیش نظر ہم اس کے کچھ حصے چھوڑ دیں گے۔ مولوی صاحب نے لکھا:

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

بہت سے اصحاب اس جملے کے معنی نہیں سمجھیں گے، اور عنوان کو پڑھ کر انہیں الجھن ہوگی۔ اس

یہ سب سے اول یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنی ہیں: ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۷ اور ۲۸ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انھیں تاریخوں میں ہندی سائیتھ سیمین کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے، اس سے قبل کہ میں پرشد کے اجلاس کے حالات بیان کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی شان نزول سے مختصر بحث کروں یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجہ سے وجود میں آئی۔ اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا۔ اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔

مسٹر کاکا لیکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنے ایڈریس میں بھارتیہ سائیتھ پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میں اس کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں، کیوں کہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹرا دھشتا (سائیتھ) سیمین منعقدہ، بڑودہ میں سب سے (پہلے) یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کو لھا پور کے اجلاس میں مہاراجہ بڑودہ نے بھارت سائیتھ پرشد کا خاکہ بہت پُر زور طریقے سے پیش کیا۔ کراچی میں کانگریس (کے اجلاس) کے موقع پر، مسٹر کنھیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی، تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سو سائٹھ کی ضرورت کو محسوس کیا۔ کچھ سال جب اندور میں ہندی سائیتھ سیمین کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا، اور ہم ایک جا جمع ہوئے، تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی، جسے عمل میں لانے کے لیے مسٹر کنھیا لال منشی، ہری ہر شرما، اور گر دھر شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی سائیتھ سیمین کے چند مہینے بعد، مہاراشٹرا سائیتھ سیمین کا اجلاس اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کو لھا پور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لیے ہندی سائیتھ سیمین سے تبادلاً خیالات کیا۔ ہندی سائیتھ سیمین نے اپنی سائیتھ پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ سائیتھ سیمین قائم کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹرا سائیتھ سیمین نے اسی طرح گونا گوں اور گجرات کی سائیتھ سیمینوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔ یہ تو ہے، اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد، سو وہ اس قرارداد کے الفاظ ہیں۔

”اس پرشد کا ادیش (مقصد) ہوگا کہ (ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے سائیتھوں (ادبوں) اور سائیتھکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا، اور اس

سے بھارتیہ سائیتوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا۔ (ب) اس سبھا کا کام 'ہندی یعنی ہندستانی، میں ہوگا۔۔۔

اس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مقرر کی گئی تھی، پہلا کام یہ کیا کہ ماہنامہ ہنس کو، جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی ایڈیٹری میں جاری تھا، اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا، اور اب اسے پرشد کار سالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنھیالال منشی بھی اس کی ایڈیٹری میں شریک ہو گئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد، جو بھارتیہ سائیت پرشد کی پیدائش کے مقاصد کے متعلق تھی۔ میں آپ کو اس کے پہلے اجلاس کی روداد سناتا چاہتا ہوں: جو ہم سب کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴ اپریل سنہ (۱۹۳۱ء) کو تقریباً دس بجے دن کے اس کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ سب سے اول، مسٹر کا کا لینکر نے اپنے ایڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ ایڈریس، جو صرف ایک صفحے کا تھا، تقسیم کر دیا گیا۔ اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ ایڈریس پڑھ کر سناتا فضول ہے، وہ آپ خود پڑھ لیں گے، زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے۔

پرشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ریزولوشن تھا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اسی پر رہی۔ اس کے پہلے جز سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جز پر بہت کچھ گفتگو ہوئی۔ اصل مسودے میں یہ الفاظ تھے کہ اس پرشد انجمن کی ساری کارروائی 'ہندی ہندستانی' میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تحریر شایع کی، اس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی انھوں (یا) ہندستانی ہوگی۔ اس کے کیا معنی؟ فرمانے لگے کہ کانگریس کارپوریشن بھی میں نے ہی بنایا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ صحیح ہے، لیکن اس وقت ہندستانی کے معنی ہم برگز نہیں سمجھتے تھے۔ کہنے لگے۔ اب میں نے اس کے معنی بتا دیئے ہیں، جو ہنس کی تحریر میں آپ



نے دیکھے۔ یہ گاندھی جی کی محض زبردستی ہے۔ یہ انھوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے۔ ”ہندی ہندوستانی“ جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پرشد کی مجلس، استقبالیہ کے صدر کا کا سیلر صاحب نے اپنے ایڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اس کی گنجائش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص، اس کا مفہوم اردو نے سکے جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ ہندی ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے، تو فرمایا کہ وہ ہندی، جو آگے چل کر ہندوستانی ہونے والی ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا کہ یہ تو کوئی زبان نہ ہوتی۔ یہ تو آپ کی خواہش یا متہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ہندی کون سی زبان ہے، اور ہندوستانی کون سی، مہاتما جی نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے، اور عام لوگ کم سمجھتے ہیں، اور ہندوستانی زبان وہ ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں، لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا۔ اپنے مطلوبہ ایڈریس میں انھوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بحث میں ان فارسی الفاظ کو، جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں، ترک نہ کیا جائے۔ غرض صبح کا جلسہ اس پر ختم ہو گیا، اور کوئی بات لے نہیں ہوئی۔

سب پر کے جلسے میں پھر بھی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ ریزولوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھیے، یا ہندوستانی کا، ہندی۔ ہندوستانی کے کوئی معنی نہیں، تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں، اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سہیل کے ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے، جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ میں نے دانتہ دوبارہ یہ بات اس لیے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لعل نہرو موجود نہ تھے۔ اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے، اور خیال تھا کہ وہ ہمیشہ صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے، لیکن مجھے افسوس، اور کسی قدر مایوسی ہوئی، انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا، اور خاموش بیٹھ رہے۔ اور ایک نہیں، وہاں اکٹھے تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اس کے بعد جب یہ گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے ”ہندی ہندوستانی“ کو بدل کر ”ہندی یعنی ہندوستانی“ کے الفاظ رکھ دیئے۔ اس پر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ ریزولوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی، کیوں کہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں، اس بنا پر ہندی اور ہندی ہندوستانی



ایک زبان نہیں ہو سکتی، اس لیے ہندی یعنی ہندوستانی بے معنی ہو گا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہو گا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی کر دیجئے، اور میں اس کی تائید کروں گا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا آخر ہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر کنھیالال منشی نے کہا کہ یہ حاملہ ادبی اور لسانی ہے، ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہئے۔ ہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں، فیصلے کی ہی ایک تدبیر ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیار کی یہ کہ ہندی سٹیمین کے ان نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا، جو اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سٹیمین کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دیا جاتی جس کا انھیں حق حاصل نہ تھا، تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ مگر ہاتما گاندھی ساہتیہ پرشد کو ہندی سٹیمین کا بچہ سمجھتے ہیں، اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہونے پائیں (پائیں) حالاں کہ بقول منشی پریم چند کے یہ خیال صحیح ہے پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہو گئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا تھا۔ دوسرے دن ۲۵ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن سہ پہر کو ایک گفتگو یہ بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رخ بدلا چاہیے پر نے فرسودہ خیالی مضامین کو دہرانا موجودہ حالات کے بالکل منافی ہے ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہئے۔ اس بحث میں پنڈت جو ابرہال نہرو نے بھی حصہ لیا۔ اور یہ ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک ریزولوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنھیالال منشی اور دو ایک اور صاحب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پرشد کے مہار پرشوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی ریزولوشن پیش نہ کر دیں رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا ریزولوشن تیار کیا، اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کر لیا گیا۔ لیکن یہ ریزولوشن کچھ تصریح کا محتاج تھا، اس لیے ان صاحبوں نے، جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مصرتھے، ایک الگ بیان شائع کیا۔ اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا ان میں سے چند تو ہندی ساہتیہ سٹیمین نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمائندے انتخاب کیے، اور کچھ مہاراشٹ ساہتیہ سٹیمین نے، اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی میں اور ہندی کے معنی ہندوستانی بنانے میں، پھر ہندی ہندوستانی کے جدید لفظ کے اختراع میں اور

آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں۔ پہلے اردو کا لفظ ترک کر کے، ہندوستانی اختیار کیا گیا۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا۔ اور اس بہرہم بھی رضامند تھے۔ اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ہو گیا، اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لیے ان کے پاس جواب موجود ہے، وہی جو گاندھی جی نے فرمایا ”ہندی یعنی ہندوستانی“ گاندھی جی نے رسالہ ہنس کی زبان کو بھی ہندی اتھواہستہ لکھا ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے، وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ ویشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے، تو انھیں حیرت ہوئی۔ ہنس کے ایڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے، خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہدہ کر چکے ہیں۔ اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبہ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ہندی سائٹیہ سیمین میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے بھارتیہ سائٹیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ”خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ سائٹیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے“ اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگیور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا ہے۔ اس کے ذریعے سے ایک فائدہ یہ ہو گا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی۔ کا کا صاحب کا لیکر نے بھی اپنے ایڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ”جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ سائٹیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے، انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار اسٹر بھاشا (قومی زبان) ہندی ہندوستانی میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی بجائے ایک ہی ہو، اور اب سب میں ناگری ہیرسم خط جاری ہو جائے تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں۔“

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لیے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیہ سائٹیہ پرشد کا یہ مقصد بے شک قابل تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہے۔ لیکن اس کا دوسرا مقصد بلاشبہ ہندی زبان کا پرچار ہے، جس میں وہ اور ہندی سیمین دونوں متفق ہیں۔ اور غالباً

یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر انھیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا، جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سیمین کا اجلاس تجویز ہوا تھا۔ تاکہ ہندی سیمین کے اثر اور انداز سے مستفید ہو سکے۔ غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے مسئلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آگئی، اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحاد عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آئنگ ہمارے ساتھ رہے، اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بد دل ہی نہیں تھے، بلکہ برہم بھی ہوئے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے، جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔ لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی، اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے، جیسے ہم میں سے بعض لوگ

-----

میں ایک بات کہنی بھول گیا۔ وہ یہ ہے کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما جی کے نام وصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے، اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں، جس نے ملک کی زبان ہندوستانی قرار دی ہے۔ انھوں نے مہاتما جی کی اندرونی تقریر، نیز "ہنس" والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جن میں "ہندی یا ہندوستانی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہندی کے معنی ہندوستانی قرار دیئے ہیں جو درست نہیں، اردو یا ہندوستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیہ سائیہ پرشد کے قائم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے۔ لیکن ہنس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے، اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں سے مشکل ہے، مجیب صاحب ساہتیہ پرشد کے ساتھ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے، کیوں کہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندوستان ہوتا ہے، اور اس لیے اس سے صرف مسلمان اور ان کی تمام کوششیں جو ہندی زبان کی (کذا) بنانے میں صرف ہوئیں، بلکہ صد ہا سال کے تعبیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کیے ہیں، وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ ان کی رائے میں بھارت کے بجائے ہندوستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے، جو صحیح معلوم ہوتی ہے، کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے، لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر







موضوع کا رخ کسی اور طرف مڑ جاتا۔ اردو کا یہ شمدہ کم یاب ہے، لیکن نایاب نہیں، اس لیے بھی کچھ حصے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے پروفیسر محمد مجیب کے خط کا حوالہ دیا ہے۔ اصل انگریزی میں خط فراہم نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے دو اردو ترجمے موجود ہیں ایک: گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ میں، اور دو، جامعہ کے مجیب نمبر میں یہ جلد ۸۳، شمارہ ۴-۱۰ ہے (ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۶ء)۔ عنوان ہے مجیب صاحب کا ایک تاریخی خط (ص ۱۵۴ سے ص ۱۶۲) ایک اقتباسات میں خط کے آخر میں چھ تجویزیں ہیں:

۔۔۔ جس چیز کا میں جواب دیکھ رہا ہوں، وہ تو یہ ہے کہ آپ انہیں کی بنا پر ایک اعلان اپنی طرف سے شائع کریں۔ وہ باتیں یہ ہیں:

- (۱) ہماری زبان ہندی نہیں کہلائے گی، بلکہ ہندوستانی۔
- (۲) ہندوستانی کا کسی ایک مذہبی سماج کے ورثہ سے تعلق نہ ہوگا۔
- (۳) اس زبان کے لفظوں میں یہ نہ دیکھا جائے گا کہ کون دہیسی ہیں، اور کون ہدیسی بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ کس کا رواج ہے، کس کا نہیں۔
- (۴) اردو کے ہندو لکھنے والوں اور ہندی کے مسلمان لکھنے والوں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ سب رائج مانے جائیں گے۔ لیکن اردو اور ہندی کی جو مذہبی حیثیت ہے، اُس پر اس قاعدہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

(۵) اصطلاحیں اور خاص طور پر سیاسی اصطلاحیں تجویز کرتے وقت سنسکرت کے لفظ اس لیے نہ پسند کیے جائیں گے کہ وہ سنسکرت ہیں، بلکہ اردو، ہندی اور سنسکرت کے لفظوں میں سے لوگوں کو چننے، اور پسند کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔

(۶) دیوناگری اور عربی خط، دونوں رائج اور سرکاری سمجھے جائیں گے، اور ان تمام اداروں میں، جن کا رویہ پہلے چاروں کے اثر میں ہے، دونوں خط سیکھنے کا انتظام ہوگا۔

۱۔ اردو کا رسم خط نستعلیق ہے، اور فارسی سے ماخوذ ہے یہ دوسری بات ہے کہ فارسی کا رسم خط عربی سے ماخوذ ہے اردو نے رسم خط عربی سے نہیں، فارسی سے، کچھ آؤزوں کے لیے نقطوں اور چھوٹی ط کا اضافہ فارسی حروف میں کیا۔ عربی سے رسم خط سندھی نے مستعار کیا، اصوات کے لیے کچھ اضافوں کے ساتھ۔ حیرت کی بات ہے کہ پروفیسر محمد مجیب نے عالم اور خاص طور سے تاریخ وال کے قلم سے یہ بات لکھی گئی۔ (کمال)

(جامعہ، مجیب نمبر سے اقتباس)

تھوڑی دیر کے لیے ہم محمد مجیب کے خط، اور اس کے مضمرات کو چھوڑتے ہیں۔ اس پر پھر واپس آئیں گے کیونکہ اس سے کچھ اور تحریریں جڑی ہوئی ہیں۔ منشی پریم چند بھی پرشہد کے اجلاس میں شریک تھے، اور یہ خط ہمارے تھے۔ ان کا رسالہ سنس اردو کے خلاف تحریک کا آلہ کار بن گیا تھا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے ادارے میں اس کا ذکر کیا۔ اردو کا یہ شمارہ، منشی پریم چند کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ اپریل ۱۹۳۶ء، جون ۱۹۳۶ء کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد شاید منشی پریم چند کو احساس ہوا کہ ناگپور میں اردو کے ساتھ اور مولوی عبدالحق کے ساتھ جو زیادتی ہو گئی ہے، اس پر خاموش رہنا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے ۴ جون کو ایک خط مولوی عبدالحق کو لکھا۔ اس خط کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے نقل کیا جاتا ہے:

دھنپت رائے پریم چند۔  
دختر رسالہ سنس، بنارس کنٹونمنٹ

۴ جون ۱۹۳۶ء

بھائی صاحب قبلہ۔ تسلیم

اس ماہ کے اردو میں میں نے "بھارتیہ سائتھ پرشہد" پر آپ کا مقالہ دیکھا تو مجھے افسوس ہوا۔ جس کام کو اتنے نیک ارادوں سے اٹھایا گیا، اس کی بسم اللہ ہی غلط ہوتی نظر آتی ہے۔ آپ نے پرشہد میں حاضرین جلسہ کا رخ دیکھ کر شبہ یہ اندازہ نہیں لگایا کہ مذہبی پسند کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔ تناہی نہیں، بالعموم لوگ اسے اشتباہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہر ایک زبان کی جانب سے مخالفت ہو رہی ہے۔ غلامیہ نہیں تو درپردہ سبھی۔ کسی زبان نے بھی اس کا خیر مقدم نہیں کیا۔ کچھ مٹھی بھر لیڈ ضرور شامل ہو گئے ہیں، شاید اس خیال سے کہ یہاں بھی کچھ شہرت کمائی جاسکتی ہے۔ ورنہ اس تحریک سے بہت کم کسی کو دل چسپی ہے۔ اردو میں جس طرح اس کا عدم وجود برابر ہے، اُسی طرح ہندی میں بھی۔ چوں کہ ہاتما جی کا اس بڑے کام سے تعلق بتایا گیا ہے، اس لیے تھوڑے سے خریدار ہو گئے ہیں۔ یہ تو ہے اصلی حالت۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اداروں کے پاس خوب پیسہ ہے، خوب جوش ہے۔ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ یہ تحریک اس خیال سے جاری کی گئی تھی کہ ہندوستان کے ادیبوں میں، ورنہ دو ادبیات میں برادرانہ اور ہمدردانہ احساس پیدا ہو۔ زبان اس کی حتی الامکان سلیس رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مگر چوں کہ مضامین لکھنے والے مختلف صوبوں کے لوگ ہوتے تھے، اور سنس کا ایڈیٹوریل اسٹاف ایکٹایر ادم ہے اس لیے ہر ایک مضمون کی صلاح مشکل تھی۔ یہ خیال بھی تحت الشعور میں تھا ہی کہ سنس سے دل چسپی رکھنے والے ۹۹ فیصدی غیر اردو وال ہیں، اس لیے

فارسی اور عربی کا استعمال بے محل ہوگا، کیوں کہ جیسا کہ کاکا لیکر صاحب نے فرمایا تھا، ہماری سلیس اردو ہی غیر اردو ہے۔ اصحاب کے لیے بعید از فہم ہے۔ زبان کی اصلاح تو رفتہ رفتہ ہی ہو سکتی ہے۔ جس طرح سنسکرت سے بھری ہوئی ہندی اردو خط میں لکھی جائے، تو اُسے کوئی نہیں سمجھے گا یہ، اسی طرح مغرب (اور مفرس) اردو سمجھنے والے ہندی میں۔ یاد رکھو، بحاث میں خال خال ہیں۔ اس اعتبار سے نہ سہی، ادبی لین دین کے خیال سے ہی، یہ ضروری ہے کہ ہمارے ادیبوں میں اشتراکِ عمل ہو۔ ان میں ادبی اور علمی، اور ذوقی مسائل پر تبادُل خیال ہو۔ اس پر شد میں تو کچھ ہوا تھا نہیں۔ مگر آپ نے یہ تو محسوس ہی کیا کہ تین چار اردو داں اصحاب کی موجودگی نے لوگوں پر اتنا اثر کیا کہ قرار دادوں کی زبان وہ ہو گئی، جواب ہے۔ ورنہ اس کے قبل وہ خالص ہندی زبان میں تھیں۔ اگر یہ ارباب روز افزوں بڑھتا جاتا، تو کیا آپ کے خیال میں زبان اور ادب پر اس کا اثر نہ پڑتا۔ اور سلسلے قطع تعلق کر لینے پر، یا مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو جانے پر کہ یہ ایک پولٹیکل تحریک ہے، جو ہندی زبان کے پرچار کے لیے جاری کی گئی ہے، کیا صورت حال بہتر ہوگی؟ جو بعد فی الحال ہے، اُس کے زیادہ ہونے کا امکان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگلے سال آپ حالات میں تغیر پاتے۔ اور دو چار سال میں جب اردو داں طبقہ نو اس تحریک سے اُسن ہو جاتا، آپ دیکھتے کہ آپ ہی اس پر قابض ہیں۔ میرے لیے تحریک سے صرف اتنی دل چسپی تھی کہ غیر ہندی و اردو کو ہندوستانی کے گھر میں لا کر ملا دوں۔ مجھے اس سال کامیابی نہ ہوئی۔ ایک دوسرا اور نہ ہوئی۔ لیکن اگر اردو داں طبقہ میری امداد کرنا، تو یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ مگر جب آپ نے اعلان جنگ کر دیا۔ تو مجھے بھی زیادہ دل چسپی نہیں ہے۔ یہ افتراق والی پالیسی معوم نہیں کیوں، اس قدر جلد میں بھیج لیتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں تمنا گاندھی ہندی کے خدا نہیں، اور نہ اُن کی تاویل ماننے کے لیے ہم مجبور ہیں۔ ہمارا دعو ہے کہ پرشد کی زبان ہندوستانی ہونا چاہیے۔ ہم ہیں جنہیں زبان کے مسئلے سے کچھ شغف ہے۔ انہیں اپنے اثر اور علم، اور مشورے سے اُس منزل کی طرف لے جانا چاہیے۔ اگر اردو داں طبقہ ساتھ دیتا ہے، تو وہ ہندوستانی بنے گی، سچے معنوں میں۔ وہ الگ ہو جاتا ہے، تو پھر وہ ہندی ہندوستانی

---

اے منشی پریم چند کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اُن کے زمانے میں گیتا پرسیس گورکھ پور سے شریہ بھگو دگیتا، رمان اور مہا بھارت اردو رسم خط میں بھی چھپتی تھیں۔ آج بھی یہ صحیفے اور پریم ساگر (ملوال جی کی) اردو رسم خط میں اتنی چھپتی ہیں کہ پورے صفحے کے اشتہار ہر مہینے ایک رسالے میں چھپتے ہیں (کمال)



ہو کر رہ جائے گی۔ آپ کا آخری جلد، ہم بھی بیٹھے ہیں، ہیران مانسیے گا، آپ کے شایان شان نہ تھا۔ بھائی اختر (رائے پوری) اگر اس جملے کا استعمال کرتے، تو میں ان کی پیٹھ ٹھونکتا۔ مگر آپ کو ان تنگ خیالیوں سے بالآخر بچتا ہوں۔ اور وہ بھی جب کہ آپ پریشد کی انتظامی سمیٹی میں ہیں، اور آپ نے ابھی اس سے استعفیٰ نہیں دیا ہے۔ یہ نعرہ جنگ تو بغلی گھونسا جیسا لگتا ہے۔

زبان کا مسئلہ یونہی حل ہو سکتا ہے کہ دو چار اصحاب مل کر ایک سوڑ صفحے کا رسالہ ہندوستانی میں نکالیں۔۔۔ دو آدمیوں کو اس کا بار سونپا جائے۔ اور جو لوگ اس اسکول کے حامی ہیں، وہ اس میں ہندوستانی زبان میں لکھیں۔ اگر دنی و سے اردو میں کر لیں، تو میں یہاں اسی رسالے کا ہندی ایڈیشن ہو ہوں بنا رس سے نکالنے پر تیار ہوں۔ اپنے بل پر۔ حالاں کہ میری حالت فاقہ کشی سے ایک ہجرت قدم پیچھے ہے۔ اس طرح یہ بھوت زیر کیا جاسکتا ہے۔ نگ ہو جانے سے تو وہ اور بھی شریر ہو جائے گا۔

زبان کا مسئلہ پریشد سے بالکل الگ کر دیا جائے۔ وہ خالص ادبی تحریک ہو۔ ہندوستانی کی۔۔۔ کے لیے ایک ماہواں سوڑ صفحے کا رسالہ نکالا جائے، جس میں چار مضامین، ذمہ دار اصحاب کے قلم سے لکھے ہوئے ہوں۔ اس طرح ہماری دونوں غرضیں پوری ہو جائیں گی۔ زبان کی بھی، اور ادب کی بھی۔ مجھے امید ہے آپ میری تجویز سے متفق ہوں گے۔ میں تو آپ کی رہنمائی میں دوزخ میں جا جانے کو بھی تیار ہوں۔ حالاں کہ وہ کام بغیر آپ کی رہنمائی (کے) میں زیادہ صفائی سے کر سکتا ہوں۔ اس کا رستہ مجھے خوب معلوم ہے۔

امید ہے آپ خوش ہیں۔

نیاز مند

پریم چند

اردو کے سلسلے میں منشی پریم چند نہایت مخلص انسان تھے۔ ان کا ایک مضمون ہندی اور اردو کا مستقبل جو ۱۹۳۷ء کے اردو نہیں چھپا تھا۔ ص ۷۳۸، ۷۳۷ پر انہوں نے واضح الفاظ میں لکھا:

”مسلمانوں کے عہد میں ہندی کی تین شکلیں ہوں گی۔ ایک ناگری خط میں ٹھیکہ ہندی، جسے بھاکھیا ناگری کہتے ہیں۔ دوسری اردو، یعنی فارسی خط میں لکھی ہوئی فارسی آمیز ہندی اور تیسری برج بھاکھا۔ ہندی زبان کو موجودہ صورت میں آتے آتے صدیاں لگ گئیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء سے پہلے کوئی تصنیف دریافت نہیں ہوتی اس کتاب کا نام چندراوتی



ہے، اور اسے سدول مسرانے لکھا تھا۔ اس کے بعد ہی تلوال جی، انشا اور خاں وغیرہ کا نام آتا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ سو سو سا پہلے، جس زبان کے لکے (نشر کا پتا نہیں چلتا، وہ آج ہندوستان کی قومی زبان بن رہی ہے)۔

یہ اقتباس اس لیے پیش نہیں کیا گیا کہ انداز سے جو بات منشی پریم چند نے کہی وہ امر واقعہ ہے یا نہیں۔ اس سے صرف ان کے بے رہ، دراز دو کے تئیں نخلص ہونے کا پتا چلتا ہے۔

ہندی اتھوا ہندوستانی پرنا گپور کے اجلاس میں نزع پیدا ہوا۔ گاندھی جی نے اس موضوع پر دو مضمون لکھے۔ ایک ۹ مئی، اور دوسرا ۱۴ مئی ۱۹۳۷ء کے مہرجن میں چھپا تھا۔

(۱)

”اس پرچے میں کسی جگہ پڑھنے والوں کو ایک معزز دوست کا ایک انتہائی دل چسپ خط ملے گا، جو پچھلے دنوں ناگپور میں کل ہند بھارتیہ سائیٹی پریشد کے افتتاح میں ڈیلی گیٹوں کے سامنے پڑھا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک مسلمان دوست نے بھیجا ہے، جس کے ساتھ، اسی مسئلے پر اخبار با میس کر نیکل مورخہ ۲۷ اپریل کا ایک ایڈیٹوریل بھی نکلی ہے۔ مشترکہ میں صوبائی بول چال (۱۶ کذا) کے متعلق میری رائے عام طور سے وہی ہے، جو ان دونوں مراسلوں، اور کرانیکل کے مضمون (کذا) میں ظاہر کی گئی ہے۔ تاہم مجھے اندیشہ ہے کہ شاید ان باتوں سے میرا اتفاق رے بعض باتوں ہی تک محدود ہے، اور ان حد بندیوں کو کھول کر بین کر دین ضروری ہے۔ ان حدوں سے۔ اگر ان کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے، اس مقصد کا احاطہ ہوتا ہے کہ جو میرے ان دوستوں کے ذہن میں ہے۔

پہلے میں اس شبہ (۱) کو الگ رکھے دیتا ہوں، جو کچھ مسلمانوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔ شبہ

۱۔ گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ۔

۲۔ یہی محمد مجیب کا خط ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے (رکمال)

۳۔ شاید مراد را بطلے کی زبان سے ہے (رکمال)

۴۔ شاید مراد اداریہ یا شذرے سے ہے (رکمال)

۵۔ شاید یہ کتابت کی غلطی ہے۔ لفظ شبہ ہے ہوگا۔ (رکمال)

کے گہرے بادل ساری فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔ کسی شخص کی باتیں اور کام شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہیں۔ جو لوگ دل سے فرقہ وارانہ اتحاد چاہتے ہیں، اور جن کے دلوں میں کوئی کشیدہ نہیں ہے، ان کے لیے میری رائے میں سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ وہ وقتی جذبات کسی ایک طرف یا دوسری سمت (کذا) جھکے بغیر دیانت داری کے راستے پر چلیں۔ خاص کر پریشد جیسے معاملہ میں، جسے جذبات سے کوئی سروکار نہیں۔ پریشد کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کی بہترین چیزوں کو یکجا کرے (کذا) اور اس طرح جو زبان بنے اس کو ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے سامنے پیش کر دے۔ یہ اور اسی مقصد کو سامنے رکھ کر، اس کام میں ایسی بول چال کی زبان استعمال کرے، جو زیادہ سے زیادہ آدمی سمجھ سکیں۔ اردو بلاشبہ دوسری زبانوں میں سے ایک زبان ہے، اور اس میں ایسے خزانے موجود ہیں جن کو سارے ہندوستان کی مشترکہ ملکیت ہونا چاہیے۔ کوئی ہندوستانی اردو ادب کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اگر وہ مسلمانوں کے خیال سے واقف ہوتا چاہتا ہے، یا اسلام کے متعلق وہ سب کچھ جاننا چاہتا ہے، جو ہندوستانی وسیلوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پریشد جو ابھی حال ہی میں قائم ہوئی ہے، اگر موجودہ اردو ادب کے خزانے کا دروازہ سارے ہندوستان کے لیے نہیں کھول سکے گی، تو وہ اپنے مقصد اور فرض میں ناکام رہے گی۔

میرے مراسلہ نگار نے ایک غلطی کی ہے، جسے صاف کر دینے کی ضرورت ہے۔ اُن کے سامنے ٹنڈن جی (یا یو پرشوتم داس ٹنڈن) کی اس تقریر کا، جو انھوں نے لاہور میں کی تھی، نہ کہ بنارس میں جیسا کہ مراسلہ نگار کا بیان ہے، پورا متن نہیں تھا، ورنہ یہ رائے قائم کر لینے کی غلطی نہ کرتے کہ جب ٹنڈن جی نے یہ کہا کہ ۲۲ کروڑ آدمی ہند کی بولتے ہیں، تو اُن کے ذہن میں صرف وہ لوگ تھے، جو آج کی بناوٹی ہندی تکھتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کو صاف کر دیا تھا کہ اُن کی مراد وہ بھیاچل کے اثر میں بسنے والے ان بہت سے لوگوں سے تھی جن میں سے ۲ کروڑ مسلمان بھی شامل تھے، جو قریب قریب وہی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، جو برج بھاشا سے نکلی ہے، اور جس کی قواعد (گر امر) کا ڈھانچہ وہی ہے، جو برج بھاشا کا ہے۔ اس زبان کو ہندی کا جو نام

۱۔ سانی نقطہ نظر سے یہ ایسا ممکن نہیں۔ ہندو آریائی زبانوں کا آمیزہ بنانا ہی ممکن نہیں، نہ کہ دراوڑی، ایسٹرنک، ہندو چینی وغیرہ کی جدید زبانوں اور یوپیوں کو بھی، اس سانی کاک ٹیل میں شامل کیا جائے۔ شاید گاندھی جی کے مشیر بھی اس کے مختلف خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانوں اور یوپیوں کا کوئی تصور اپنے ذہنوں میں نہیں رکھتے تھے۔ (کمال)

دیا گیا ہے، وہ اصل نام نہیں ہے۔ مسلمان لیکھکوں نے یہ نام ان تحریروں کو دیا تھا، جو انھوں نے اتر کے لوگوں کے لیے لکھی تھیں، اور جو بلاشبہ ان تحریروں کے مانند تھیں جو کہ ہندو بھائی لکھتے تھے۔ اس کے بعد دو الگ الگ راہیں نکل آئیں، دیوناگری میں لکھی ہوئی ہندی اتر کے ہندوؤں کی یوں چاں بن گئی، اور عربی یا فارسی لکھاؤ میں لکھی ہوئی اتر کے مسلمانوں کی بول چال کی زبان بن گئی۔ ابھی تک یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اردو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا مشترکہ زبان ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ علی برادران کو اور مجھے ملا ہار کے مولویوں کو اردو کے ذریعے اپنی باتیں سمجھانے میں دقت ہوتی تھی، اور ہمیں ایک ملیالی ترجمان رکھنا پڑتا تھا۔ ایسی ہی دشواریوں کا ہم کو پوری (پورے) بنگال میں بھی، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے سنڈن جی، اور راجندر بابو نے جب ہندی کا لفظ استعمال کیا، تو اس سے ن کی مراد بالکل وہی تھی جو سرے ان دونوں نے کی ہے۔ ہندوستانی کا لفظ استعمال کرنے سے ان کا مطلب کوئی اس سے زیادہ واضح نہیں ہو جاتا۔

لیکن مراسلہ لکھنے والے کی یہ شکایت بالکل ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے کہ اتری ہند کے کچھ لکھنے والے ایک ایسی زبان لکھتے ہیں جس کو وہ خود ہندی کہتے ہیں لیکن جسے اتری ہند میں بھی بہت ہی کم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جانسن کے طرز کی زبان کی طرح، اس کوشش کی ناکامیابی بھی یقینی ہے۔

ممکن ہے مراسلہ بھیجنے والے صاحب یہ کہیں کہ پھر ہندی یا ہندوستانی پر زور کیوں دیا جائے، اور صرف ہندوستانی کا لفظ کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ اس کا کارن صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ میرے جیسے خود نوادر کے لیے یہ بک گستاخی ہوگی کہ میں ۲۵ برس پرانی ایک انجمن سے کہوں کہ وہ اپنا نام بدل دے، جب کہ

اے گاندھی جی کی ساری زندگی حق کی لڑائی کی جدوجہد ہے۔ چناں چہ انگریزی میں ان کی سوانح حیات (ترجمہ) ہے۔

(صد اقت کے ساتھ میرے

The Story of my Experiments With Truth

تجربوں کا کتاب) گاندھی جی خود بھی اپنی ہر بات کو صداقت کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ چناں چہ چوری چور میں سیت گرہ کا تجربہ تشدد کے واقعات کی وجہ سے ناکام ہوا، تو انھوں نے تحریک واپس لے لی، اور اسے اپنی ہمالیائی غلطی بتایا۔ اور غلامیہ گاندھی نے سیرٹری، امتحان ولایت میں صرف ڈنر کھا کر پاس نہیں کیا تھا۔ اپنے حقے کی شراب وہ دوسروں کو دے دیتے تھے اس لیے ان ڈنروں میں ان کے ساتھ رہنے والے ہم جماعتوں میں بوڑگی رہتی تھی (کہ ان کی میز پر ساتھ رہیں) جنوبی فریق میں وہ سیرٹری۔ یک موکل نے اپنے مقدمے کے سلسلہ میں غلط اطلاعات دی تھیں۔ جب گاندھی جی کو حقیقت معلوم ہوئی تو انھوں نے اس سے حکومت کے واجبات ادا کرادیے۔ پرتھوتم داس سنڈن کے مقدمے کی بھی یہاں، انھوں نے پیروی کی ہے۔ لیکن موکل نے انھیں صحیح بات نہیں بتائی۔ زبان پہلے ہے، رسم خط بعد میں۔ اس وقت ۲۲ کروڑ لوگ ہندوستان میں تھے، جن میں جو خود مندہ ہوں۔ کل چالیس کروڑ آبادی تھی۔ اگر کوئی رسم خط تھا تو یہ مقدمہ خود بخود خارج ہو جاتا ہے (کمال)



میں تبدیلی کی ضرورت پوری طرح ثابت نہیں ہوئی ہے۔ نئی پریشندہ، پرانی، انجمن ہی کی اولاد ہے، اور اتری ہند میں مشترکہ مادری زبان بولنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ اسے ہندی کہا جائے یا ہندوستانی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے نزدیک ان دونوں لفظوں سے ایک ہی چیز مراد ہے۔ لیکن ان لوگوں سے میرا کوئی جھگڑا نہیں، جو ہندی کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یہ شرط ہے کہ ان کی مراد اُس زبان سے ہو، جو میرے ذہن میں ہے۔

اکھل بھارتیہ کے فقرے پر مراد لکھنے والے صاحب نے جو اعتراض کیا ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ یقینی بات ہے کہ سارے ہندوستان کے ہندو اس فقرے سے واقف ہیں، اور میں یہاں تک کہنے کی جرأت کروں گا کہ اتری ہند کے مسلمانوں کی اکثریت بھی اسے سمجھ لے گی۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس کوشش میں ہیں کہ ان تمام تمدنوں کا ایک مجموعہ مرتب کریں، جو آج ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی تمدن جو الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرے گا، زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان میں آج کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے خالص آریہ تمدن کہا جاسکے۔ اس بات سے مجھے کوئی خاص دل چسپی نہیں کہ آریہ لوگ ہندوستان کے پرانے باسی تھے یا باہر کے ناپسندیدہ جد اور بیٹے مجھے تو دل چسپی اس بات سے ہے کہ میرے آباؤ اجداد،

۱۔ محمد مجیب نے اپنے خط میں لکھا تھا: "ساتویں پریشندہ کو بھارتیہ کہا گیا ہے، ہندوستانی نہیں کہا گیا۔" آخر ایسا کیوں ہے؟ اگر لفظ بھارت کوئی مفہوم رکھتا ہے، تو اس سے آریوں والا ہندوستان مراد ہے، جس میں نہ صرف مسلمانوں کی، اور ہندوستانی زندگی میں ان کے حصے کی بلکہ سیکڑوں برسوں کی ترقی اور تبدیلی کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیا اس سے الگ تھلگ رہنے، اور پرانے زمانے کی طرف واپس جانے کی خواہش کا پتا نہیں چلتا؟

۲۔ یہ نہایت اور قابل لحاظ نکتہ ہے، اور زبان کی سیاست سے وابستہ ہر شخص کو اس سے واقف ہونا ضروری ہے۔ گاندھی جی جیسے مرتبے کے سیاسی رہنما کے قلم سے ناپسندیدہ جملہ اور کے فقرے کے مضمرات افسوسناک بھی ہیں، اور خطرناک بھی۔ ایک اہم سوال گاندھی جی کے شعور کی کس سطح پر تھا، جس کا جواب انھوں نے شائستہ طریقے سے ٹال دیا۔ (کمال)



ایک دوسرے سے انتہائی آزادی کے ساتھ ملتے جلتے رہے، اور ہماری موجودہ نسل اسی میل جول کا نتیجہ ہے۔ اس بات کا فیصلہ صرف آنے والا زمانہ ہی کر سکتا ہے کہ آیا ہم اس ملک میں، جس نے ہم کو پیدا کیا، اور جس چھوٹے سے کمرہ کی، جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، کوئی سیوا کر رہے، یا اُس کے لیے ایک بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، نئی پریشند اور ہندی سائیمین، ہندوستان کی تمام زبانوں کی بہترین چیزوں کے میل جول سے، سب کی مشترکہ بھلائی چاہتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو جراثیم فنا ہو جائیں گی۔ لیکن میل جول ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ آریائی بو باس رکھنے والی ہر چیز کو نکال دیا جائے، یا یہ کہ عربی یا انگریزی کسی اور طرح کی بو باس رکھنے والی چیزوں کو الگ کر دیا جائے۔

## (۲)

اس سے پہلے والے مضمون میں، میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں ہندی، اور ہندوستانی کو کس طرح اور کیوں ہم معنی سمجھتا ہوں، اور لفظ ہندی کا استعمال جاری رکھنا کیوں ضروری ہے۔ پچھلے ہفتے جو مراسلہ نقل کیا گیا تھا، اُس لفظ ہندی پر اس طرح اعتراض کیا گیا ہے:

”اس زبان کو مسلمان پچھلے زمانے میں پڑھتے رہے ہیں، اور اسے ترقی دے کر ایک ادبی زبان بنانے میں انھوں نے اپنے ہندو بھائیوں سے زیادہ نہیں، تو ان کے برخلاف ضرور کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس زبان سے، ایسی مذہبی اور تہذیبی باتیں وابستہ ہیں،

لفظ تاریخ کے صفحات میں کہانی اس کے بالعکس ہے۔ جب دونوں کی تقسیم ہوئی، تو شعوروں اور چنداں میں رکھے گئے لوگوں کے لیے (جو پہلے بھی کثرت میں تھے، اور آج بھی ہیں)۔ دراوڑی لوگوں کو چھوڑ کر، آریہ قبائل کے ہندوستان آنے سے پہلے اس ملک میں بسنے والے آدی ہاسی کہلائے، اور آج بھی کہلاتے ہیں۔ اور انسانی حقوق سے محروم ہیں جیسے گاندھی جی کے زمانے میں، اور اُس سے پہلے تھے۔ ان کی محنت کے استحصاں پر برہمن، کھتری اور ویشی زندگی بھوگتے تھے، اور یہ اچھوت تھے: (کمال)

۱۵۔ یہ مراسلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے محمد مجیب کا تھا، اور اُن کے، سی سے اقتباس پر روش ہے (کمال)

۱۶۔ پہلا دوہا، گوری سووے پیچ پر۔ اٹل امیر خسرو کا ہے۔ رحیم اعبد الرحیم خان خاناں، ایسے صاحب طرز ہندی شاعر تھے، کہ بعض ہندی کے عالموں کے نزدیک تلسی داس نے رمانس اہنگ میں لکھی جو ہندی میں سب سے پہلے رحیم نے استعمال کیا۔ ملک محمد جانیسی اور کتیراُن چند ناموں میں سے ہیں، جن کے بغیر اردو ادب کی طرح، ہندی ادب کی تاریخ بھی نہیں لکھی جاسکتی۔ (کمال)

جن کو مسلمان مجموعی طور پر اپنا نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ یہ زبان اب اپنے اندر بہت سے ایسے لفظ شامل کرتی جا رہی ہے جو اکیلے اُسی کے ہیں، اور جن کو اردو جاننے والے عام طور سے نہیں سمجھ سکتے ۛ

اگر پچھلے زمانے کے مسلمانوں نے ہندی پڑھی اور اُسے مارا مال بنایا، تو موجودہ نسل کے مسلمان اس سے دامن کیوں بچاتے ہیں؟ یقیناً پچھلے زمانے کی ہندی میں، آج کی ہندی سے زیادہ مذہبی اور تہذیبی باتیں موجود تھیں۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا کسی شخص کو کسی زبان سے اس کی مذہبی اور تہذیبی باتوں کی بنا پر دامن بچانا چاہیے۔ اگر میں ان باتوں کا اثر نہیں لینا چاہتا، اگر مجھے ناگوار ہیں، تو مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمیں، ایسے بھائیوں کی طرح جن کی رگوں میں درحقیقت ایک ہی خون دوڑ رہا ہے، ایک ساتھ زندگی بسر کرنی ہے تو ہم کو ایک دوسرے کی تہذیب سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ اس کے علاوہ ہندی میں سنسکرت کے لفظوں کے استعماں پر تنا جھگڑا کیوں کیا جائے، کہ اصل زبان کے خلاف بغاوت کی صورت پیدا ہو جائے جو آسان لفظ پہلے سے رائج ہیں، ان کی جگہ سنسکرت لفظ استعمال کرنے یا سنسکرت سے بنائے ہوئے لفظوں میں ان کی صنی سنسکرت شکل دے دینے کا طریقہ یقیناً ناپسندیدہ ہے۔ اس طرح زبان اپنے سریلے پندے محروم ہو جاتی ہے، لیکن قوم جیسے جیسے ترقی کرے گی، ویسے ہی ویسے ہندو، جو صرف سنسکرت جانتے ہیں۔ سنسکرت لفظ ایک حد تک لازمی طور پر استعمال کریں گے۔ اسی طرح جس طرح کہ مسلمان جو صرف عربی جانتے ہیں اُسے عربی لفظ لازمی طور پر استعمال ہوں گے۔ چاہے لکھتے ہیں دونوں ایک ہی زبان استعمال کریں، اور کسی چیز کو خاص طور سے پسند یا ناپسند کرتے ہوں۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو زبان کی دونوں صورتوں سے جانکاری حاصل کرنی ہوگی۔ کیا یہی بات تمام ترقی کرنے والی زبانوں میں نہیں پائی جاتی؟ ایک

ۛ شاید گاندھی جی کے تحت، مشور میں محمد بن قاسم تھا۔ سندھ پر اس حملے سے پہلے، عرب تاجروں کی حیثیت سے جنوبی ہند میں اُریس چکے تھے، موبلا، انھیں کی اولادیں ہیں۔ وہ اردو نہیں بولتے، اس لیے ہندوستان میں ایسے ہندوستانی بولنے والے مسلمان نہیں تھے، جو صرف عربی جانتے ہوں۔ محمد غوری اور اس کے بعد سے جتنے بھی حملہ آور مسلمان آئے، ان کی زبانیں فارسی تھیں یا ترکی۔ فارسی میں عربی الفاظ کی آمیزش ضرورتی، لیکن وہ فارسی کے اپنے لے ہوئے الفاظ تھے۔ گاندھی جی مسلمان اور عربی کو ایک دوسرے سے جڑا ہوا کیوں سمجھتے تھے، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کمال

پڑھا لکھا انگریز، ہمدردی کے لیے

Fellow Feeling, Sympathy

پیدا نہ بنناؤ

کے لیے

Fatherly

Paternal

یا سالانہ کے لیے yearly اور

Annual

، دونوں لفظوں سے واقف رہتا ہے۔ یہاں دشواری یہ ہے کہ ہمارے دل ایک نہیں ہوئے ہیں، اور ہم میں سے اچھے سے اچھے لوگ بھی باہمی بدگمانی کے زہر سے متاثر ہیں۔

ہندی، ہندوستانی اور اردو ایک ہی زبان کے الگ الگ نام ہیں۔ سچ جو مقصد سامنے ہے، وہ ایک نئی زبان کو پیدا کرنا نہیں، بلکہ اُس زبان کو، جو ان تینوں ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ بین صوبائی زبان مان لینا ہے۔ میرے خیال میں مشرقی منشی نے ہنس کی زبان کو کچ بجا طور پر کہی ہے۔ اس لیے کہ نامل یا نلگو کی کسی عبارت کا ہندو یا ہندوستانی میں ترجمہ کرتے وقت سنسکرت کے لفظوں کے استعمال سے بچنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اُسی طرح، جس طرح کہ کسی عربی عبارت کا ہندی یا ہندوستانی میں ترجمہ کرتے وقت عربی لفظوں کے استعمال سے بچنا نہیں جاسکتا۔ اگر رویندر ناتھ (ٹیکور) کی گیتا انجلی کے ہندی یا ہندوستانی ترجمے سے سنسکرت لفظ، جن سے ہنگامی زبان بھری پڑی ہے، چُن چُن کر نکال دیے جائیں، تو اُسے پڑھنے میں جتنا ترجم ابھی محسوس ہوتا ہے، اُس سے کہیں کم محسوس ہوگا۔ مشرقی زبان کو خراب ہو کر، محض ہندوؤں کی بول چال کی زبان بن جانے سے رد کرنے کے لیے ضرورت بس اس بات کی ہے کہ مولوی عبدالحق جیسے مسلمان ادیب اس میں اپنی طرف سے، اضافہ کریں۔ میرا بس چاہتا ہوں کہ اس نظر سے ہٹا دوں کہ زبان کی جس شکل کو اردو کہا جاتا ہے، وہ صرف مسلمانوں کی بول چال کی زبان ہے اُسی طرح جس طرح کہ ہندوؤں کو ہندی کو صرف ہندوؤں کی زبان سمجھنے کے نظریے سے ہٹا دوں گا۔

لے ہنگامی زبان، سنسکرت تنہا سمجھی نہیں، بلکہ سنسکرت نسل کے ہنگامی زبان ہے تنہا سمجھی نہیں، ان کا تلفظ بدلتا ہے۔ عربی اور ترکی سمیت، اس لفظ بھی ہنگامی ہیں۔ (رکھیں)

۲۔ بنیادیں انھیں انھیں اور کالیں جیسے، انھیں کارہا ہوگا، جنھوں نے، سے پھیلا یا۔ رد و والوں نے کبھی، رد و کو، جس کے ادب کی آبیاد رتن ناتھ سرشار، دیاندر شکر، برتن نرین، جلیست، درگا سہاسے سرور، منشی پریم چند، دیاندر این سنگم، رنجیت سہاسے فراق، انند نرائن، مالاویہ نے کی ہو، بھی مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھا۔ وہ ایسا سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن انھیں انھیں منشی کے قصے کے لوگوں نے ہندی، ہندو، ہندوستان کو جوڑ دیا، اور ہندی کو سنسکرت کی طرف لے جانے کو رگ وید کے زمانے میں واپس جانے کا ذریعہ بنانا چاہا۔ رگ وید پڑھنا اور سمجھنا ماضی کے سرچشمے کو سمجھنا ہے، لیکن اُس عہد کو دوبارہ ماننے کی کوشش کرنا رجعت پرستی ہے (رکھیں)

اگر دونوں میں سے کوئی اپنے اس نظریے سے نہ ہٹتا، تو اتری ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان، اس کا نام چاہے جو ہو، نہیں بن سکے گی۔ اس لیے فی الحال ہمیں نام پر جھگڑانے کی ضرورت نہیں۔ آپ نام جو چاہے رکھ لیجئے بشرطہ کہ آپ پورے خلوص کے ساتھ، اس سے ایک ہی بات مراد لیتے ہوں۔

اب لکھاؤٹ کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ اس وقت اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کے دیوناگری میں لکھنے پر اصرار کیا جائے، اور یہ بات تو خیال کی حد سے اور بھی پرے ہے کہ ہندوؤں کی بہت بڑی آبادی کو عربی لکھاؤٹ اپنانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے میں نے ہندی یا ہندستانی کے لیے یہ تشریح تجویز کی ہے کہ اس سے وہ زبان مراد ہے، جو اتر کے ہندو اور مسلمان عام طور سے بولتے ہیں۔ چاہے وہ دیوناگری میں لکھی جائے، چاہے اردو لکھاؤٹ میں۔ اس کے خلاف جو احتجاج کیا گیا، اس کے باوجود میں اس تشریح پر قائم ہوں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دیوناگری کی ایک تحریک سے میں نے اپنے آپ کو پورے طور پر وابستہ کر دیا ہے، اور وہ تحریک یہ ہے کہ اسے مختلف صوبوں میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی، خاص کر ان زبانوں کی، جن کی لغت میں سنسکرت لفظ زیادہ ہیں، مشترکہ لکھاؤٹ بنادیا جائے۔ بہر حال اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ ہندستان کی تمام زبانوں کے پیشوا ذخیروں کو دیوناگری لکھاؤٹ میں منتقل کر لیا جائے ۛ

ہرزجن میں بہا تما گاندھی کی ان دو تحریروں کے بعد بھی مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ جولائی ۱۹۳۷ء کے اردو میں مولوی عبدالحق نے افکار و واقعات کے عنوان سے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔ خدائے بخش اور ٹیبل پبلک لائبریری میں یہ شمارہ موجود ہے۔

## انجمن ترقی اردو (ہند)

دریا گنج، دہلی

مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۳۷ء

مکرم گاندھی جی سلامت

آپ کا خط پہنچا۔ میری تقریر کی رپورٹ جو اخبار میں چھپی ہے اس میں ایک آدھ جگہ غلطی ہوئی

ہے۔ البتہ یہ میں نے ضرور کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں اور یہ موقع ہے کہ



”ابتدا میں ہندی اردو کا جھگڑا صرف بہار اور یوپی تک تھا، کبھی کم کبھی زیادہ۔ لیکن جب آپ نے اس میدان میں قدم رکھا اور یہ اعلان کیا کہ اس ملک کی عام زبان ”راشٹر بھاشا“ ہندی ہے اور سارے ملک اور خاص کر اُن علاقوں میں اس کے پھیلائے پر کمر باندھی جہاں کی زبان کو ہندی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا (جیسے صوبہ مدراس) تو یہ جھگڑا آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گیا۔

آپ کو شاید یہ معلوم ہے یا نہیں کہ ہندو مسلمانوں کے جھگڑے کی ابتدا زبان کے مسئلے پر ہے۔ پولیشکل اختلاف بہت بعد کی بات ہے۔ زبان کے جھگڑے صرف بہار اور یوپی تک محدود تھے۔ لیکن جب آپ نے نئی ہندی کو ”راشٹر بھاشا“ بنانے کا بیڑا اٹھایا اور بڑی سرگرمی، غیر معمولی مستعدی اور لاکھوں روپیے کا صرفے سے اس مہم کو چلایا تو پورا فانی ہوئی آگ پھر سلگ اٹھی۔ اور آپ کی کوششوں نے اس لگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ اور اس میں ان جھگڑوں کو کون جانتا تھا، پنجاب میں ہندی رد کی کوئی بحث نہ تھی، بمبئی میں اس کا کبھی ذکر نہ آتا تھا۔ آپ کی بدولت یہ فساد شہر شہر گاؤں گاؤں اور گھر گھر پہنچ گیا۔ اور اس پر چار سے متاثر ہو کر ہندو دہلی ریاستوں نے بھی رد زبان کو اپنی ریاستوں سے خارج کر دیا حالانکہ یہ زبان وہاں بہت زمانے سے رائج تھی۔

پچیس برس کا مسلسل پرچار سیکڑوں اور ہزاروں کارکنوں کی دن رات کی محنت مشقت اور لاکھوں روپیے کے صرفے سے آپ نے وہ کام کیا جو اس جنس کے بڑے بڑے پریکشی و رجائی گزشتہ اسی سال میں نہ کر سکے۔ جب اس کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور آپ اس طرف سے نچنت ہو گئے تو اس وقت آپ جیسے کہ ہندوستان کی ”راشٹر بھاشا“ ہندوستانی ہونی چاہیے۔ لیکن آپ جلتے ہیں وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اگر آپ میری اس درخواست کو منظور فرمائیے جو میں نے اکھل بھارتیہ سہ ماہی پر شد کے سالانہ اجلاس ناگپور (۱۹۳۶) میں کی تھی کہ اس ملک اور ہندو کی زبان ہندوستانی ہونی چاہیے تو بہت سے جھگڑوں کا خاتمہ ہو جاتا۔

پر شد کے اسی اجلاس میں جب آپ سے پوچھا گیا کہ ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا ”وہ زبان جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں“ ایک ایسی زبان کو جو بول چال میں نہیں ”راشٹر بھاشا“ قرار دینا در اس زبان کو جو صدیوں سے بول چال میں ہے نظر انداز کر دینا بڑی نا انصافی تھی۔ اور یہی بات فساد کی جڑ بن گئی۔

یہ سچ ہے کہ آپ نے کبھی اردو دشمنی کا اظہار نہیں کیا، لیکن دانستہ یا نادانستہ ایسی تدبیریں اختیار کیں جن کی وجہ سے زبان کا مسئلہ دن بدن پیچیدہ اور خراب ہوتا گیا اور دوسروں میں بدگمانی اور سیر بڑھتا گیا۔

میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے وہ بحث کی غرض سے نہیں لکھا بلکہ اس زمانے میں جو واقعات گزرے اور ان کا جو اثر ملک پر ہوا وہ میں نے صاف صاف آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے تاکہ آپ کو ہر مسئلے کا دوسرا رخ معلوم ہو جائے۔

خدا آپ کو ۱۲۵ برس تک زندہ و سلامت رکھے۔ ورنہ آپ کی ذات سے ملک کو جو نقصان پہنچا ہے باقی عمر میں اس کی تلافی کی تو فین عطا فرمائے۔

آپ کا خیر اندیش  
عبدالحق

"ملاش کے باوجود گاندھی جی کے اس خط کی نقل نہ مل سکی، جس کے جواب میں مولوی عبدالحق نے یہ خط لکھا تھا۔ اور نہ وہ بیان ہی مل سکا، جو مولوی عبدالحق نے دیا تھا، اور جس کی پریس رپورٹ نظر سے گزرنے کے بعد گاندھی جی نے خط لکھا۔ مجھے یقین ہے کہ مولوی عبدالحق ہر کام کرنے والے، کم سے کم ن کی تقریر کا متن اور تاریخ ضرور دریافت کر لیں گے۔ اس خط میں سدی اکائی اور دہائی نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ستمبر ۱۹۰۶ء میں یہ خط لکھا گیا ہوگا۔ ہندوستانی کے بارے میں مولوی عبدالحق اور بابا بھائی راجندر پرشاد کے درمیان معاہدہ پر دستخط ہونے کے بعد۔ یہ اندازہ شاید نادرست نہ ہو، لیکن اس کی تصدیق ضروری ہے۔

"پنجاب سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو" مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی (انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۳ء) سے یہ عبارت (ص ۷۴-۷۸) نقل ہے:

"... ۱۹۳۲ء میں، جب کہ دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کی ضرورت اسب جگہ تسلیم کی جا رہی تھی، پٹنہ یونیورسٹی کی سینیٹ میں یہ تحریک منظور ہوئی کہ میٹرک تک ذریعہ تعلیم ہندوستانی کر دی جائے۔ اہل اردو اصولاً اسے قبول کرنے پر تیار تھے، مگر چاہتے تھے کہ ہندوستانی اچھی طرح واضح کر دی جائے۔ مقامی شاخ کی تحریک پر انجمن ترقی اردو نے ایک خاص جلسہ پٹنہ میں منعقد کیا۔ علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ کے چند اساتذہ مصنفین، وناشرین شریک تھے۔ مولانا سیدمان صاحب نے صدارت کی (۲۸ اگست ۱۹۳۲ء) اہل جلسہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں ہندوستانی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے متفق تھے۔ مگر جب تک اس زبان

کی صحیح تعریف نہ معین ہو جاتے، درسی کتابوں کا اردو اور ہندی میں الگ الگ رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ ایک قرارداد (۱۹۵۰ء) میں، انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہندوستانی زبان کے قواعد، اصطلاحات لغات کے لیے (حکومت بہار کی طرف سے) ایک کمیٹی مقرر کی جائے، جس میں انجمن ترقی اردو، اور ہندی کی نمائندہ جماعت کے قائم مقام مساوی تعداد میں شریک ہوں۔ ایسی کمیٹی کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اتفاق سے کام لیا جائے، لیکن اختلاف کی صورت میں۔۔۔ اردو کتابوں کے متعلق ہندی انجمن کے قائم مقاموں کی رائے فیصلہ کن سمجھی جائے۔۔۔۔۔

اسی دن سہ پہر کو بابو راجندر پرشاد اور صوبائی کانگریس کے سکریٹری جلسے میں آئے، اور متعلقہ مسائل پر دوستانہ بحث و اتفاق رائے کے بعد یہ طے ہوا کہ ایک متفقہ اعلان، سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) اور بابو راجندر پرشاد کی طرف سے شائع کی (کیا) جائے۔ چنانچہ دونوں صاحبوں کے دستخط سے، حسب ذیل بیان مرتب و شائع کیا گیا:

”بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقد ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء میں ہمیں ہندوستانی زبان کے مسئلے پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا۔

ہمیں فکر تھی کہ اردو - ہندی - ہندوستانی کے مناقشے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، انھیں دور کیا جائے، اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس بات میں جن مباحث پر گفتگو ہوئی، تو معلوم ہوا کہ، میں بڑی حد تک ہم متفق اسے ہیں۔ چنانچہ ہم کو اس پر اتفاق ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہونی چاہیے، اور یہ اردو رسم الخط، و دیوناگری، دونوں میں تحریر، اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لیے سرکاری زبان تسلیم کی جانی چاہیے۔ ہندوستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں، جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑے مشترکہ عنصر ہے، اور ہماری دانست میں، اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول اور انتخاب کا معیار ہی عام استعمال یا رواج ہونا چاہیے۔ مزید برآں، ہماری رائے ہے کہ ہندی اور اردو، دونوں کو بحیثیت ادبی زبانوں کے، ترقی کرنے کے

پورے مواقع دیئے جانے چاہئیں۔ ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی اہل علم کے اشتراک عمل سے ہندوستانی الفاظ کا ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لغت کی تدوین، اور اس قسم کے حل طلب مسائل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے، ایک مختصر نمائندہ کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہونا چاہیے، جس میں اردو اور ہندی کے ایسے ذی شراعی شامل ہوں، جو ان دونوں زبانوں کو ترقی دینے کے قابل ہیں، تاکہ اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسن ظن پیدا کیا جائے۔

شرح دستخط (مولوی) عبدالحق

(راہو) راجندر پرشاد

۱۱ ستمبر ۱۹۶۲ء کے ہر تہجن میں ایک مبارک قدم کے عنوان سے، اس معاہدے کا متن شائع ہوا ہے۔ اس تمہید کے ساتھ:

”مولوی عبدالحق صاحب اور شری راجندر پرشاد نے ہندی اردو بحث پر جو مشترکہ بیان جاری کیا ہے، اس سے اُمید ہو سکتی ہے کہ یہ بحث اب ختم ہو جائے گی، اور جن لوگوں کو ایک بین صوبائی زبان کے بننے سے دل چسپی ہے، وہ اس معاملے کے اچھے برے پہلوؤں پر بحث مباحثہ کر سکیں گے، اور مشترکہ کارروائی کے لیے کوئی راہ نکال سکیں گے۔“

گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ میں یہ نوٹ معاہدے کا متن، اور آخر میں گاندھی جی کے خیالات ص ۹۸-۱۰۰ ہیں۔ معاہدے کا متن، اس سے کچھ مختلف ہے جو نقل کیا جا چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عشرت علی صدیقی نے ترجمہ کی عبارت کا ترجمہ کیا ہے (جو زیادہ، سان زبان میں، اور اس لیے زیادہ رواں ہے) جو متن اور درج کیا گیا ہے وہ شاید اصل معاہدے کے الفاظ کے ساتھ ہے۔

گاندھی جی کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ ہندی، ہندوؤں کی زبان ہے، اور اردو، مسلمانوں کی۔ ان کے دل و دماغ میں کسی فرقے کے لیے مخصوص طور سے مسلمانوں کے لیے نہ کوئی نفرت تھی اور نہ کوئی تعصب وہ خصوصاً دل سے ہندو مسلم ایکتا چاہتے تھے، اور چوں کہ ان کا خیال تھا کہ ان دونوں کی زبانیں الگ ہیں، اس لیے وہ ان دونوں زبانوں کو بھی ایک دوسری کے گلے ملوانا چاہتے تھے۔ یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نظریہ خود انھوں نے قائم کیا تھا، لیکن قرابین اس بات کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں کہ یہ بات کہ اردو مسلمانوں کی



زبان ہے، اور عرق سے جڑی ہوئی ہے، اُن کے ذہن میں مدن موہن، مالویہ، کنھیالال منشی اور کاکا بایلکر جیسے لوگوں نے ڈالی ہوگی۔ ہندی ساجتہ سیمپلین اور ناگری پر چارنی سبھا سے گاندھی جی کی وابستگی نے ہندی اور ملک کی ساری زبانوں کے لیے ناگری رسم خط اپنا لیے جانے کی تحریک نے زور پکڑا۔ گاندھی جی اگر ان تحریکوں سے وابستہ نہ ہوتے تو یہ تناور درخت نہ بنتیں، اور ان کے اکھوے مرجھا جاتے۔ گاندھی جی، مہاتما کی حیثیت سے کروڑوں لوگوں کے لیے روحانی پیشوا بھی تھے۔ جو لوگ اچھوت کہلاتے تھے، اُن کے نام سے یہ کلنک ہٹانے کے لیے بھی گاندھی جی نے تحریک چلائی تھی۔ امبیڈکر اُن کو ہندو سماج سے نکالنا چاہتے تھے، جو صدیوں سے اُن کو پسماندہ رکھے ہوئے تھا، اور اُن کے سارے کو بھی بعض علاقوں میں نجس مانا جاتا تھا۔ گاندھی جی ہندو سماج ہی میں انہیں بنیادی انسانی حقوق دلانا چاہتے تھے۔ اگر یہ طبقہ ہندو سماج سے نکل جاتا تو ہندو اس ملک میں اکثریت میں نہیں رہتے۔ اس لیے ہر تہمت سدھار کی تحریک سے برہمنوں، کتھریوں اور ویشیوں کا مفاد بھی وابستہ ہو گیا تھا۔ ان میں کانگریسی بھی تھے، اور کٹر فرقہ پرست بھی۔ اور زیادہ تر یہی آخر الذکر، جو نام نہاد اونچی ذات کے بھی تھے، مصلحتاً گاندھی جی کو سیاسی ضرورت سمجھتے تھے۔ اور ہر تہمت تو گاندھی جی کو اپنا میسج مانتے ہی تھے۔ دیسی رجواڑے، خاص طور سے مراٹھا، گجراتی اور راجستھانی بھی ہندی اور ناگری کی تحریکوں میں شامل ہو گئے۔ اس طرح یہ دونوں تحریکیں بہت دن چڑھیں۔ جنوبی ہند میں ان تحریکوں کو کامیابی حاصل ہوئی، کیوں کہ ہندی کسی بھی صورت میں دروڑی زبانوں کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔ دوسری زبانوں کے علاقوں میں بھی کوئی مزاحمت نہیں ہوئی، لیکن اردو کو خطرہ محسوس ہوا، کہ اس کی شناخت نابود ہو جائے گی۔ بولی جانے والی زبان، یعنی ہندستانی ایک تھی، اور آج بھی ہندستانی کی سطح پر ہندی اور اردو ایک ہیں۔ لیکن، فورٹ ولیم کالج رکلکتہ میں انیسویں صدی کے شروع کے برسوں میں، شریش امگ، الگ ہوئے۔ سدل مسرا (چندراوتی) اور خاص طور سے تلوالال کب (کوی) [پریم ساگر]، سے کھڑی بولی سے رائج فارسی (پہ شمول عربی و ترکی) ہی نہیں بلکہ سنسکرت سے ماخوذ تہذیب و ثقافت سم و لی ہندی کی شبیلی الگ کی گئی۔ حقیقت یہ نہیں ہے کہ اردو، ایک شبیلی ہے ہندی کی، کیوں کہ اب ہندی سے مراد بولی جانے والی ہندی نہیں بلکہ تہذیب و ثقافت ہندی ہے۔ تہذیب و ثقافت ہندی تو خود ایک مصنوعی شبیلی ہے، اس زبان کی، جو دہلوی کے ہندوی، ہندی اور اردو کے ناموں سے مختلف زمانوں میں موسوم رہی۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع نے گاندھی جی کے زمانے میں، اور نہ آج رمانس اور بھارت جیسے دور درشن مقبول سیریلوں کے باوجود، یہ تہذیب و ثقافت ہندی

مشیلی، عوام کی بول چال کی زبان بنا سکے۔ لیکن مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ اگر ہندی اور اردو ایک دوسری سے مخالف سمت میں چلتی رہیں، تو یہ دو زبانیں بھی ہو جائیں گی، بول چال کی سطح پر۔ اس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ تامل سے ملیالم الگ ہوئی۔ بنگلہ سے اسمیہ (آسامی) الگ ہوئی۔ پراکرت اور اپ بھرنش کے دور میں ایک زبان ابولی ماگدھی تھی۔ آج بہار کی بولی الگ ہے، بنگلہ، اسمیہ، اڑیہ الگ زبانیں ہیں۔

تت سم دی ہندی اور ناگری رسم خط کے پرچار میں جب گاندھی بہت آگے نکل گئے تو انھیں حسا ہوا کہ ایسا کا جو مقصد انھیں عزیز تھا، اُس پر نہ صرف آپنچ آئی، بلکہ وہ جل کر رکھ بھی ہو سکتا ہے۔ خیال ہے کہ شاید ڈاکٹر تارا چند سے گاندھی جی نے مشورہ کیا، اور ڈاکٹر تارا چند نے لسانی منظر نامہ اُن کے سامنے پیش کیا کہ کس طرح جدید ہندوستانی زبانوں کا ارتقا ہوا۔ ویدی یا ویدک۔ پراکرت۔ اب بھرت اور جدید ہندوستانی زبانیں۔ اردو ہند آریائی زبان ہے، دوسری زبانوں کی طرح۔ عربی/فارسی/ترکی اس کی قواعد کی جڑوں میں نہیں ہے، کیوں کہ ہندی اور اردو کی قواعد، صرف و نحو ایک ہے۔ دخیل الفاظ سے زبان کی ساخت پر اثر نہیں پڑتا۔ جو دخیل الفاظ اردو میں ہیں، کم و بیش وہ ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی ہیں۔ سنسکرت کے دخیل، الفاظ دروڑی زبانوں میں بھی ہیں۔ عربی/فارسی/ترکی کے دخیل الفاظ بھی ان میں ہیں۔

گاندھی جی کے نظریے میں تبدیلی آئی۔ انھوں نے ہندوستانی کا وہ تصور مان لیا، جو مولوی عبدالحق کا تھا۔ اور اکھل بھارتیہ ہندوستانی پرچار ستمیلن کی صدارت بھی کی۔ ہندوستانی کی حمایت میں مضامین بھی لکھے۔ ۲۷ فروری ۱۹۴۵ء کو وردھا میں ہندوستانی پرچار ستمیلن میں اپنی تیسری صدارتی تقریر میں گاندھی جی نے یہ بھی کہا:

”میں نہیں چاہتا کہ ہندی مٹ جائے یا اردو فنا ہو جائے۔ میں صرف چاہتا ہوں کہ دونوں ہمارے کام کی ہو جائیں۔ سستیہ گرہ کا قانون ہے کہ ایک ہاتھ کی تالی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ بجتی نہیں، پر اس سے کیا۔ آپ ایک ہاتھ بڑھائیں گے تو دوسرا اپنے آپ بڑھ جائے گا۔ حق صاحب (مولوی عبدالحق) نے ناگپور میں جو بات کہی تھی، اُسے اُس وقت میں نہ سمجھ سکا۔ ہندی یعنی اردو، اسے میں نے نہیں مانا تھا۔ اس وقت اُن کی بات مان لیتا، تو اچھا ہوتا۔

دوست بننے آئے تھے، مگر مخالفت ہوئی، اور دشمن جیسے بن گئے۔ مگر میرا دشمن تو کوئی  
 ہے ہی نہیں۔ پھر حق صاحب ہی کیسے میرے دشمن بن سکتے ہیں۔ اس لیے آج پھر ہم ایک  
 منع پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ناگپور میں بھارتیہ سہایتہ سیمین کیا تھا۔ لیکن وہ وہیں شروع اور  
 وہیں ختم ہوا۔ ہم لوگ ملنے آئے تھے، اور ہو گئے الگ، الگ۔ اس سیمین سے کیا فائدہ ہو سکتا  
 تھا؟ وہ ہندوستانی نہیں بلکہ بھارتیہ سہایتہ سیمین تھا۔۔۔“

---

## مولوی عبدالحق اور اردو تحریک

اثر پردیش کے شہر پٹنہ یا بعض لوگوں کے مطابق، سروہ میں عبدالحق پیدا ہوئے، ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ سے بی۔ اے۔ کر کے حیدرآباد گئے تو وہاں کے سرکاری ضابطے کے مطابق ”مولوی“ اور آبادی نوٹ کی تفویض کردہ آئری ڈگری کے مطابق ”ڈاکٹر“ اور اردو دنیا کے دئے ہوئے لقب ”بابائے اردو“ کہلائے۔ ۱۹۰۳ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس میں ایک شعبہ علمیہ کا قیام بھی عمل میں آیا جس کا مقصد اردو میں علوم و فنون کی اشاعت تھا۔ مزید ضراحت کے لیے اس شعبہ کا نام انجمن ترقی اردو رکھا گیا۔ پروفیسر آرنلڈ اس کے صدر اور مولانا شبلی نعمانی سکریٹری مقرر ہوئے۔ شبلی کے بعد مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سکریٹری بنے۔ ان کے استعفیٰ ہونے پر یہ کام عزیز مرزا کے سپرد ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ کے بعد سید اس مسعود صدر ہوئے۔ ۱۹۳۷ میں ان کا انتقال ہو گیا تو سر اکبر حیدری کی تحریک پر سرچ بہادر سپرو صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۱۲ میں دہلی دربار کے موقع پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بھی دہلی میں اجلاس ہوا۔ عزیز مرزا کی وفات سے انجمن ترقی اردو میں جگہ خالی رہ گئی تھی، مولوی عبدالحق، عزیز مرزا کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ اب وہی انجمن کے سکریٹری نامزد ہوئے۔ ان دنوں مولوی صاحب اورنگ آباد (دکن) میں مقبرہ رابعہ دورانی والی عمارت میں مقیم تھے اور ریاست حیدرآباد کے اورنگ آباد کے علاقے کے اسپیکٹر آف اسکول۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کا دفتر حیدرآباد سے اورنگ آباد منتقل کر دیا۔ سکریٹری کی ذمہ داری قبول کرتے وقت مولوی صاحب نے کہا تھا:

”میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس بارگراں کو اپنے ذمے لیا کیوں کہ جس قدر یہ کام ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اردو زبان میں علوم و فنون کے لیے ایسے اصحاب کی ضرورت ہے جو علوم مشرقی و مغربی دونوں میں ماہر ہوں، اور ایسے لوگ ہماری قوم میں شاذ و نادر



ہیں، (منہاج ص ۲)

اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس وقت مولوی عبدالحق کے پیش نظر انجمن کا ایک محدود دائرہ عمل تھا جس میں مرزا علی وادبی کاموں کی گنجائش تھی۔ حیدرآباد کی ریاست، اردو کی ریاست تھی۔ اس لیے وہاں مسئلہ کسی تحریک چلانے کا نہیں بلکہ صرف اردو کے علی اور ادبی سرمائے میں اضافے کا تھا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں انجمن ترقی اردو نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ پہلے دس سال میں سات کتابیں شائع کی گئیں۔ اس دور تک اردو کا ذخیرہ مذہبی، تاریخی کتابوں، ناو، شعر و شاعری تک محدود تھا۔ علوم و فنون کی طرح تحقیقی کاموں پر توجہ کم تھی ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۵ء تک جو کتابیں انجمن نے شائع کیں ان میں زیادہ تر شعرا کے تذکروں اور بعض متون پر کام ہو ۱۹۲۱ء سے ایک دینی اور تحقیقی رسالہ ”اردو“ کا بھی اجراء کیا گیا۔

حیدرآباد ہی کی طرح ہندوستان کی بعض دوسری دیسی ریاستوں مثلاً اور، بھرت پور، بیکانیر، میٹالہ، دھول پور، گوالیار، کشمیر، جے پور وغیرہ میں بھی ایک مدت سے سرکاری سطح پر اردو کا رواج عام تھا۔ شمالی ہندوستان کے علاقوں میں تعلیمی اور سرکاری دفتروں کی ضرورت کے لیے اردو کا استعمال ہوتا رہا۔ وثیقہ نویسی، درخواستیں اور عدالتوں میں بحث کی کاروائیاں اردو میں ہوتی رہیں۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں جہاں جہاں ضرورت ہوتی، مادر کی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھائی جاتی تھی۔ یونیورسٹی سطح پر پوسٹ گریجویٹ ڈگری اردو میں حاصل کرنا ممکن تھا۔ جوجی ٹوٹ ولیم کالج میں ہندی اور اردو کے نام سے پوائے گئے تھے، ان کی کونپلوں نے ۱۹۴۷ء میں سر نکالاجب کہ بنارس کے بعض سربراہ اور وہ لوگوں نے یہ کوشش کی کہ تمام سرکاری عدالتوں سے اردو زبان اور فارسی رسم خط کو موقوف کر کے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم خط جاری کر دیا جائے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی ”سر سید اس وقت سے لے کر مرنے سے نووں پہلے تک اس کے خد ف قلمی جہاد میں مصروف رہے اور ان ہی کی جفا کا اثر تھا کہ ان کی زندگی تک یہ تجویز سرکاری طور سے منظور نہ ہو سکی، (نقوش ص ۱۱) اس کے چند سال بعد سرانیشونی میکڈالڈ، یو۔ پی کے لفٹنٹ گورنر نے اس صوبہ میں قانونی طور سے ہندی کو ممتاز مقام بخش دیا۔

۱۹۱۸ء میں ہاتما گاندھی نے آل انڈیا سابتہ سیمین ناگری پر چار سبھا کے اندر وائے اجلاس کے صدر کی حیثیت سے زبان کا مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا: ”مغلوں کے زمانے سے ہی

ہندی ورار دوہندوستان کی قومی زبان بننے لگی تھیں۔ لیکن دو سال بعد جب انھیں ہوم رول لیگ کی صدارت پیش کی گئی تو ۱۸ مارچ ۱۹۲۰ کو سر نو اس شاستری کے نام انھوں نے خط لکھا:

”ہندی اور اردو کے امتزاج سے بنی ہوئی زبان ”ہندوستانی“ کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لینا چاہئے۔۔۔ اس کو لوں میں ”ہندوستانی“ کی تعلیم کو یک لازمی مضمون اور دیوناگری یا اردو رسم خط کو اختیاری حیثیت سے رائج کریں“ (محمد علی جناح ص ۲۹)

۱۹۲۵ء میں پھر اندور ہی میں سیشن کے ۲۶ ویں اجلاس میں گاندھی جی نے فرمایا:

”صرف ہندی ہی قومی زبان بن سکتی تھی کیوں کہ ہندی کے سوا اور کسی دوسری زبان میں وہ فائدے نہیں جو ہندی سے حاصل ہوتے ہیں۔“

پھر گاندھی جی نے فرمایا:

”آپ نے غور کیا کہ میں نے ہندی۔ ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا۔ میں نے ۱۹۱۸ء میں بھی کہا تھا کہ ہندی وہ زبان ہے جو ہندو اور مسلمان فطری طور پر بلا کسی تکلف کے بولتے ہیں۔ ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہیں ہے۔“

لگے سال ۱۹۳۴ء میں ۲۶ اپریل کو ناگ پور میں ہندوستان کی جملہ زبانوں کا ادبی اجتماع ہوا جس میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کی حیثیت سے مولوی عبدالحق بھی شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں ایک تجویز منظور ہوئی کہ اس سبجا کا کام ”ہندی اٹھوا ہندوستانی“ میں کیا جائے گا اس پر ”موجودہ سیاست اور اردو زبان“ کے عنوان سے مولوی عبدالحق رسالہ ”اردو“ کے جون ۱۹۳۴ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

”لیکن بڑا معرکہ بھارتیہ سائٹیہ پریشید کے اجلاس میں ہوا بحث یہ تھی کہ پریشید کی کاروباری زبان کیا ہو۔ گاندھی جی فرماتے تھے ہندی اور میں کہتا تھا ہندوستانی۔ میری دلیل یہ تھی کہ جب انڈین نیشنل کانگریس نے ”ہندوستانی“ کے متعلق فیصلہ کر دیا ہے تو اسے ملنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ وہ ریزولیشن بھی تو میرا ہی بنایا ہوا تھا۔ میں نے کہا اس وقت تو اس کا یہ مطلب نہ تھا۔ فرمایا کہ میں اب بتاتا ہوں۔ میں حیرت سے ان کا منہ نہ کھٹے رگا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندی ہندوستانی کا نیا لفظ گڑھا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ جب گاندھی جی ہندی چھوڑ نہیں سکتے ہیں تو ہم اردو کیسے چھوڑ دیں۔“

اس کے بعد ہماری آنکھیں کھلیں ۛ (خطبات ص ۱۵۷)

اسی اجلاس میں گاندھی جی کی زبان سے وہ فقرہ نکلا کہ ”اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے جو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں۔“

گاندھی جی کے اس بیان اور ملکی زبان کے ایک نئے نام ”ہندی۔ ہندوستانی“ کی تجویز سے شدید رد عمل ہوا۔ مولوی عبدالحق کے احتجاج اور اردو اہل طبقے کی طرف سے جو شور و شعل پیدا ہوئی اس سے خود کانگریس کے حلقوں میں بھی حرکت ہوئی۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۸ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں ڈاکٹر محمد شفیع نے تجویز پیش کی کہ ہندوستانی (دونوں رسم خط میں) ملک کی قومی زبان مانی جائے اور اس کی ترقی اور فروغ کے لیے ایک ”ہندوستانی بورڈ“ بنایا جائے جو اپنے لائحہ عمل کے لیے ایک جامع منصوبہ مرتب کر کے آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پیش کرے۔ مگر ڈاکٹر اشرف کی تجویز مسترد ہو گئی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں جلسہ کو آگاہ کیا کہ کانگریس ”ہندوستانی کے بجائے“ ہندی کا لفظ استعمال کر رہی ہے جس سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ مگر ”فغان درویش“ کسی کو سنائی نہ دی۔

مولوی عبدالحق بلاشبہ اردو کے علمبردار تھے۔ ان کا مقولہ تھا ”میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے، یعنی زبان اردو کی اشاعت اور ترقی“ (ہمازی زبان یکم جون ۱۹۳۹ء) اس کے باوجود انھوں نے اردو کا دوسرا نام ”ہندوستانی“ قبول کر لیا تھا۔

”۱۹ جون ۱۹۳۷ء میں مسلم یوتھ کانفرنس (مدرس) میں مولوی عبدالحق نے فرمایا ”اردو

یعنی ہندوستانی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا عظیم الشان نتیجہ ہے“

مولوی عبدالحق کے الفاظ میں ادیبوں اور اصحابِ اہل علم نے ”ہندوستانی کا جس خلوص اور

دلہے سے استقبال کیا۔ اس کی مثال مولانا سید سلیمان ندوی کے خطبات میں ملتی ہے۔

”ہماری سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ ہم اس زبان کا نام ”اردو“ جو سو ڈیڑھ سو برس سے

رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا، ایک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں“

(نقوش ص ۷۷)

ایک دوسرے جلسے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ بھی صاف صاف بتا دیا کہ

”مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے ہے یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ ان



کو دھوکا دینے کے لیے سازش کی جارہی ہے، بدگمانی کی انتہا ہے۔ (نقوش ص ۱۰۴) مولانا کا یہ فرمانا بھی صحیح تھا کہ ”یہ تحریک خالص لسانی اصول و مہادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے جس کے بہت سے سبب ہیں“ اور اس کے بعد انھوں نے وہ اسباب ایک ایک کر کے گنائے (نقوش ص ۱۰۴ تا ص ۱۰۹)

۱۹۳۲ء میں ہندی سہیتہ پریشد کا اجلاس ہوا تو اس کی کاروائی کے بعد یہ محسوس ہونے لگا کہ اردو والوں کو اب اپنے حق کی خاطر کمر بستہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں مولوی عبدالحق نے علی گڑھ میں اردو کانفرنس بلائی جس کے اجلاس تین دن تک ہوتے رہے۔ ان میں ان تمام محرمات کا جائزہ لیا گیا جو زبان کے بارے میں ملک میں پیش آرہے تھے۔ بھارتیہ سہیتہ پریشد کی تجویز بھی اسی میں زیر بحث آئی۔ مولوی عبدالحق نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اب وہ انجمن ترقی اردو کو صرف علمی اور تحقیقی ادارہ کی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے اس کے ذریعے اردو کو اس کا حق دلانے کی تحریک چلائیں گے۔ تحریک چلانے کا کام پورا وقت اور پوری توجہ چاہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس سلسلے میں دو اہم فیصلے کیے: انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے راجدھانی دلی منتقل کیا اور خود جامعہ عثمانیہ کی ملازمت ترک کر کے پنشن لے لی۔ اپنا ذاتی کتب خانہ، جو نادر کتابوں اور مخطوطات پر مشتمل تھا، انجمن کو بے دیا۔

مولوی عبدالحق چاہتے تو مسلم لیگ کی مقبولیت کے پیش نظر، اس کی حمایت حاصل کر کے اپنی تحریک کو تقویت پہنچا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اردو اور صرف اردو کے سپاہی کی حیثیت سے زبان کی مدافعت اور اس کا حق دلانا اپنا مقصد حیات بنایا۔ اور اپنی تحریک کو فرقہ وارانہ مسئلہ بننے کی انتہائی مزاحمت کی۔ ان کے خاص رفیق کار ہاشمی فرید آبادی کے الفاظ میں:

”وہ تعصبات سے بالکل بری تھے اور تقسیم ہند یا اس کے قریب کے زمانے تک ہندوستان کی متحدہ قومیت کے آرزو مند رہے، بلکہ یہی آرزو انھیں اور طیش دلاتی رہی کہ اردو، جو اس متحدہ قومیت کی علامت تھی اور نہایت آسانی اور خوبی سے قومی زبان کا کام دے سکتی تھی، اسے فرقہ وارانہ یا تنگ نظری سے نقصان پہنچا یا جا رہا تھا“ (نہجہ ص ۱۳)

خود مولوی صاحب نے یکم جون ۱۹۳۵ء میں لکھا:

”مجھے یا انجمن ترقی اردو کو کسی سیاسی جماعت سے دور کا بھی تعلق نہیں اس کے باوجود میں



ہر جماعت سے تعاون کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ بہ شریکہ اسے ہمارے مقاصد سے  
ہمدردی ہو“ (ہماری زبان)

۱۹۳۷ء کے بعد سے ہندوستانی سیاست دو محور کے گرد پھر رہی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ۔  
ان میں مسلم لیگ نے پہلے تو اپنی ساری توجہ کانگریس کی پالیسی کی طرف اور بعد میں مطالبہ پاکستان پر مرکوز  
کر رکھی۔ ان دونوں معاملوں میں جو لوگ ہندوستان کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنے کا  
فیصلہ کر چکے تھے یا کرنے والے تھے، ان کی رہنمائی کے لیے کسی تعمیری پروگرام سیاسی، معاشی یا ثقافتی  
کی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ اس کے برعکس چوں کہ کانگریس کے رہنماؤں کو یقین ہو چلا تھا کہ ملک  
برطانوی دسترس سے نکل کر خود مختاری کی طرف بڑھ رہا تھا اس لیے وہ اس کے مستقبل کے بارے میں  
ہر پہلو سے غور و فکر کرنے لگے تھے۔ ہندوستان میں ایک نہیں، بیسیوں زبانیں بولی جاتی تھیں اور ان میں  
سے کئی ایسی تھیں جو بہت کافی ترقی یافتہ تھیں۔ ان میں سے کون سی زبان ملکی زبان ہو، یہ غور طلب مسئلہ  
تھا۔ کانگریس کے سب لیڈر ہم خیال نہ تھے لیکن انہوں نے بہتر یہی جانا کہ سیاسی انتشار کو روکنے کی خاطر  
قیادت کی باگ ڈور ہاتھ آگاندھی کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ گاندھی جی کے ایما  
پر کئی تحریکیں شروع کی گئیں لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ ان سب تحریکوں پر  
لیک بچنے والوں میں کتنے لوگ ایمانداری سے عمل پیرا ہوئے اور کتنے انہیں وقتی مصلحت سمجھ کر پامی  
کے تحت۔ وجہ جو بھی رہی ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ مہاتما گاندھی کانگریس میں بے تاج کے بادشاہ رہے۔  
یہی وجہ تھی کہ مولوی عبدالحق نے اردو کی تحریک کا مطالبہ گاندھی جی کو بنایا اور انہیں کے ذریعہ اسے اس کا  
حق دلانے کی کوشش کی۔ انہیں امید تھی کہ آئندہ جو حکومت اس ملک کی ہوگی اس میں کانگریس برسر  
اقتدار ہوگی اور گاندھی جی اس کے رہبر ہوں گے۔ مولوی عبدالحق نے زبان کا معاملہ گاندھی جی ہی سے طے کرنا چاہا۔  
اردو کے سلسلے میں سب سے زیادہ غلط فہمی گاندھی جی کی اس تقریر سے ہوئی جو انہوں نے کھل بھلا  
ساتیہ پریشد کے ناگ پور والے اجلاس میں کی جس میں انہوں نے مسلمانوں کی زبان ”اور“ قرآنی حروف  
میں لکھی جانے والی زبان کی بات کی۔ دوسری طرف بدقسمتی سے کانگریس کے اکثر ارکان کانپور کی قرارداد  
جو پر شوتم داس ٹنڈن نے تیار کی تھی اور جس کا اعادہ فیض پور کے اجلاس میں ہوا تھا، یعنی ہندوستانی  
کو نظر انداز کر کے، ہندی اور صرف ہندی اور دیوناگری لپی کی طرف جھک گئے۔

زبان کے نام کے بارے میں گاندھی جی نے بار بار اپنا خیال نئے نئے انداز سے پیش کیا۔ کبھی ”ہندی“ کبھی ”ہندی۔ اردو“ کبھی ”ہندوستانی“ کبھی ”ہندی اتھوا ہندوستانی“ کہا لیکن ”قرآنی حروف“ اور مسلمانوں کی مذہبی زبان“ والی بات سے انحراف کبھی نہیں کیا۔ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے بتارس ہندو یونیورسٹی میں کنووکیشن خطبہ دیا۔ ان کے ایک مراسلہ نگار نے اس خطبہ کی طرف ان کی توجہ مبذول کرتے ہوئے انہیں لکھا:

”مہاتما جی آپ فرماتے ہیں کہ اردو کے خلاف آپ کو تعصب نہیں رکھتے ہیں، پھر بھی آپ اسے مسلمانوں کی قرآنی حروف میں لکھی جانے والی زبان کہتے ہیں جسے چاہیں تو مسلمان رکھیں۔“

اس کے بعد مراسلے میں جن دوسری باتوں کا ذکر ہے ان کے جواب تو گاندھی جی نے دئے مگر قرآنی حروف والی بات پر وہ مطلق خاموش رہے۔ لطف یہ کہ اسی جواب میں انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ”ہزاروں ہندو ایسے ہیں جو آج بھی صرف اردو رسم خط میں لکھتے ہیں اور دیوناگری سے قطعی ناواقف ہیں۔“

انہوں نے ہندوستانی کے نام سے ایک رسالہ نکالا جس میں اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ ناگ پور میں اکھل بھارتیہ پریشد کے جلسے کے بارے میں مولوی عبدالحق کا ایک طویل خط شائع ہوا۔ یہ جلسہ ۲۵/۲۴ اپریل کو ہوا، صدر ڈاکٹر اجندر پرشاد اور صدر استقبالیہ کا صاحب کالیکر، دونوں بچے گاندھی وادی تھے۔ جلسے کا مقصد ہندوستان کے سب علاقائی زبانوں کے ادب اور ادیبوں میں آپس میں میل ملاپ پیدا کرنا اور اس کام سے ویسی زبانوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا تھا۔ اسی جلسے میں کہا گیا کہ سبھا کا کام ہندی اتھوا ہندوستانی میں ہوگا، جس پر مولوی عبدالحق نے شدت کے ساتھ مخالفت کی۔

مولوی عبدالحق کا خط چھپا تو گاندھی جی نے ہیرجن سبک کے یکم اگست کے شمارے میں ایک مضمون ”غلط فہمی کی گتھی“ لکھا۔ جس میں اردو اور اردو والوں پر الزامات عاید کیے گئے تھے۔ اس مضمون سے پنڈت سندر لال کافی دلگیر ہوئے۔ انہوں نے ایک طویل خط گاندھی جی کو لکھا جو ”ہماری زبان“ اور رسالہ ”اردو“ (جنوری ۱۹۳۷ء) میں شائع کیا گیا۔ پنڈت سندر لال کی اہمیت کے مد نظر یہ خط اس قابل ہے کہ اس کے بعض حصوں پر غور کیا جائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مولوی عبدالحق کو اردو کا حق دلانے میں

کیسے کیسے پا پڑ بیٹے پڑے۔

۱۔ گاندھی جی نے لکھا: ”اردو نام خاص طور سے اور خاص مطلب سے رکھا گیا۔ پنڈت سندھ لال نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا: ہندی اور اردو ان دونوں شہدوں کا جنم کبھی بھی اور کسی طرح ہوا ہو اور ان کے مصدری معنی کچھ بھی رہے ہوں، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آج یہ دونوں نام ہندوستانی زبان کی دو الگ الگ شکلوں کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ اور ان کے دو صاف صاف الگ الگ مروجہ معنی ہیں۔ ایسی صورت میں جو لوگ ان دونوں شکلوں کو پھر سے ملا کر ایک زبان بنا چاہتے ہیں انہیں کسی تیسرے نام کا سہارا لینا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی سچائی کو محسوس کر کے آپ نے خود کچھ ساں پہلے ”ہندوستانی“ (لفظ) کو استعمال کیا تھا اور ملک کو سکھایا تھا۔ پھر اب وہ حالت بدل گئی۔

۲۔ ”آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر: ”اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وے (یعنی اردو والے) بھاشا کا ویاکرن (قواعد) بھی بدل دیتے ہیں“ مجھے اور بھی رکھ اور جبرانی ہوئی۔۔۔۔۔ ہندوستانی زبان کی مختلف شکلوں پر جتنی اچھی کھوج (تحقیق) گذشتہ تیس سال میں مولانا عبدالحق نے کی ہے، شاید کسی دوسرے نے نہیں کی۔۔۔۔۔ اگر آپ منشی پریم چند سے دریافت کر لیتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اصلیت اس سے ٹھیک برعکس ہے۔“

۳۔ ”شاید آپ کے دھیان میں یہ بات نہیں ہے کہ اس وقت کی کتابی ہندی، ہندوستان کے کسی بھی ضلع یا نگر یا گاؤں کی بول چال کی زبان نہیں ہے۔

۴۔ ”ہاں کچھ مصنف ہر زبان کے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ویاکرن کے قواعدوں سے بندھنا نہیں چاہتے ان میں کچھ اعلیٰ مرتبہ کے مصنف ہیں جنہیں ایسا کرنے کا اختیار بھی دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہندی میں مرحوم بال کرشن بھٹ۔۔۔۔۔ ہندی یا اردو کا کوئی قدیم یا حال کا ادیب اس معاملے میں شاید اتنا قصور وار نہیں ہے جتنا مرحوم بھٹ۔“

۵۔ ”آپ نے لکھا ہے: ”مولوی عبدالحق صاحب نے ہندی۔ ہندوستانی کے بجائے صرف ہندوستانی یا ہندی اردو کے پر لوگ (استعمال) کا پرستانہ رکھا تھا مجھے تو ان دونوں میں کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن بجا رتیر سا ہتیر پریشدا اپنے جنم کو نہیں بھول سکتا۔۔۔۔۔ اسی لیے شبدر (الفاظ) کا لکھنا

ضروری ہو گیا۔

۴۔ ”مولانا عبدالحق کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ۔۔۔ جو اردو ادیب وہاں آئے تھے وہ غلط امیدیں باندھ کر آئے تھے۔۔۔ شاید انہیں دعوت دینے میں بھی بے احتیاطی ضرور ہوئی۔ ملک کی بڑی خوش قسمتی ہوئی اگر آپ کی رہنمائی میں کوئی ایسی ہندوستانی ساہتیہ پریشد قائم ہو سکتی جو اپنے رسالوں اور کتابوں میں ہندوستانی زبان لکھنے کی کوشش کرتی اور جس کی چیزیں ناگرمی اور فارسی دونوں حریفوں میں نکل کر ہندی اور اردو دونوں کے پڑھنے والوں کو آہستہ آہستہ ہندوستانی زبان کی طرف لائیں۔“

۵۔ ”باپو جی! میں نے عبدالحق صاحب کے خط اور آپ کے لیکچر دونوں کو ملا کر پڑھا۔ جو شکوک اس خط سے پیدا ہوتے ہیں، آپ کے لیکچر سے وہ رفع نہیں ہوتے۔“

۸۔ ”مولانا سلیمان ندوی جیسے ودوان (ذی علم)۔۔۔ برسوں سے زوروں کے ساتھ کھیلے طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ ہمیں نہ صرف اردو کو سہل ہندوستانی بنانا چاہیے بلکہ اردو کی جگہ سے ہندوستانی کہنا چاہئے۔“

۹۔ رسم الخط کا سوال علاحدہ ہے۔ ان قابل تعریف کوششوں کی کچھ جھلک آپ کو عبدالحق صاحب کے خط میں بھی مل سکتی ہے۔ یہ سب کافی حد تک آپ ہی کے پریم اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔ مگر ناگپور سے اب تک نہ جانے کیا ہوا، بہت سے اس طرح سچے اور سنجیدہ مسلمان کام کرنے والوں کے دل بھی شکوک اور مایوسی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جو اپنے دکھ کو زبان تک بھی لانا نہیں چاہتے ہیں۔

یہ خط الہ آباد سے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو لکھا گیا۔

۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۸ء تک ہندوستان کی قومی زبان کے نام کی تاویل کچھ اس انداز سے ہوتی رہی کہ اس کی وجہ سے کوئی معین صورت سامنے آنے کے بجائے الجھنوں میں اضافہ ہونا گیا اور یہی حال رسم خط کا بھی ہوا۔ گاندھی جی کی تحریروں اور بیانات کا جائزہ لیا جائے تو ان کا خلاصہ اس طرح نکلتا ہے:

۱۔ ہندی ہی واحد قومی زبان بن سکتی ہے (۲۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء)

۲۔ ہندی اور اردو کے امتزاج سے قومی زبان بن سکتی ہے (۱۹۱۸ء)



- ۳۔ دیوناگری کو ہندوستان کی کل زبانوں کے لیے واحد رسم خط بنایا جائے تاکہ اس طرح "ہندو" بنایا۔  
میں مکمل یک جہتی پیدا ہو سکے (ینگ انڈیا ۲۷ جولائی ۱۹۲۷ء)
- ۴۔ ہندی اور اردو دونوں میں (ہیرجین ۱۷ جون ۱۹۳۷ء)
- ۵۔ راشٹر بھاشا ہندوستانی ہے نہ کہ ہندی (پریس رپورٹ ۲۸ جنوری ۱۹۳۷ء)
- ۶۔ ہندی سابقہ سہیلن میں اسے ہندی اتھوا ہندوستانی بتایا (فروری ۱۹۳۵ء)
- ۷۔ ہندی، اردو اور ہندوستانی، ایک ہی زبان کے جدا جدا نام ہیں (ہیرجین ۱۷ مئی ۱۹۳۷ء)
- ۸۔ راشٹر بھاشا کا نام صرف ایک ہے۔ ہندوستانی (۲۷ دسمبر ۱۹۳۷ء)
- ۹۔ ہندی + اردو = ہندوستانی (ہیرجین ۸ فروری ۱۹۳۷ء)
- ۱۰۔ ہندی اور اردو دونوں کو پھوٹا پھٹا دیکھنا چاہتا ہوں (پریس رپورٹ)
- ۱۱۔ یہ (ہندی اور اردو) دونوں ہیں جن کے سنگم سے "ہندی" نکلتی ہے۔ ہندوستانی کی ہندی (پریس رپورٹ یکم مارچ ۱۹۳۷ء)
- ۱۲۔ ہندی اور اردو، گنگا اور جمنی کی طرح ہیں، ہندوستانی سرسوتی ہے جو اب تک ٹہوڑی نہیں آئی ہے (پریس رپورٹ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۷ء)
- ۱۳۔ راشٹر بھاشا کی آئیڈولوجی ہندی اور اردو کو بچا کر ہے (پریس رپورٹ ۱۱ جنوری ۱۹۳۷ء)
- ۱۴۔ راشٹر بھاشا ہندوستانی ہے، ہندی نہیں ہے (پریس رپورٹ ۲۸ جنوری ۱۹۳۷ء)
- ۱۵۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی یعنی۔ ہندی اور اردو کا صحیح استخراج ہی قومی زبان ہے (ہیرجین ۷ اپریل ۱۹۳۷ء)
- رسم خط کے متعلق ۲۷ اپریل ۱۹۳۷ء کے "ہیرجین" میں گاندھی جی نے لکھا "اگر ہم قومی زبان کو پوری طرح تسلیم کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں رسم خط (دیوناگری اور اردو) کو مساوی درجہ دیا جائے" پھر اسی شمارے میں آگے چل کر تحریر فرمایا "۱۹۲۵ء میں جب کانگریس نے قومی زبان کا نام "ہندوستانی" رکھا اور دونوں رسم خط کے استعمال کیے جانے کی اجازت دی تو گویا ہندی + اردو قومی زبان قرار پائی۔ ان فیصلوں میں بلاشبہ ہندو مسلم اتحاد پریش نظر تھا۔ اس بیان سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ فیصلہ سانی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی مصلحت کی بنا پر کیا گیا۔ ایک پریس رپورٹ کے مطابق گاندھی جی نے یہ بھی کہہ دیا "اگر

تم اردو رسم خط پسند نہیں کرتے ہو تو میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کروں گا کہ تم ہندوستانی پسند نہیں کرتے ہو۔۔۔ اس لیے خواہ تم چاہو یا نہ چاہو تمہیں اردو سیکھنی ہوگی اور اس سے پرہیز کرنا پڑے گا (۲۸ نومبر ۱۹۴۵ء)

ن مختلف فیہہ بیانات اور تاویلوں کی روشنی میں مولوی عبدالحق کے لیے اردو کی آسان شکل کو جسے وہ ہندوستانی کہنے پر راضی ہو گئے تھے لگے بڑھانے کا کام دشوار گزار ہو گیا۔ یکم اپریل ۱۹۴۱ء کو ”افکار و واقعات“ کے تحت انھوں نے لکھا:

”دو سال کے عرصے میں۔۔۔ اردو کے خلاف جو زبردست طوفان اٹھا اٹھا اسے انگریزوں نے فرو نہیں کر سکے تو اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ اردو والوں کو اتنے ولے خطروں سے ہم نے ہوشیار کر دیا اور اس طرح اس طوفان کے اثرات زیادہ نہ ہونے پائے۔۔۔ ۱۹۳۹ء میں اردو کا نفرنس دہلی کے نام اپنے پیغام میں (گاندھی جی) اردو ہندی کا تذکرہ اس پیرائے میں کیا کہ گویا اردو صرف مسلمانوں کی اور ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہے۔ ہم نے انھیں پھر اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا اور بالآخر وہ اس حد تک آگئے کہ ”بے شک اردو ان حصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مادری زبان ہے جہاں اس کو یہ حیثیت حاصل ہے“ ہمیں امید ہے کہ اگر ایسی رفتار رہی تو تھوڑے دنوں بعد گاندھی جی بالکل ہمارے ہم خیال ہو جائیں گے (ہماری زبان)۔“

اس دوران مولوی عبدالحق ریڈیو، ڈاک خانہ، اسکولوں اور کالجوں میں جہاں جہاں اردو کے خلاف کچھ دیکھا تو اس کے تدارک کے لیے کوشاں رہے۔

زبان کے مسئلے کے حل کرنے میں امید کی ایک کرن انھیں اس وقت دکھائی دی تھی جب ۱۹۴۲ء میں دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کی ضرورت ہر جگہ تسلیم کی جانے لگی۔

انجمن ترقی اردو کی پٹنہ شاخ کی تحریک پر ۲۸ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک خاص جلسہ مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں علی گڑھ، دلی، لکھنؤ کے بعض اساتذہ کے علاوہ مصنفین اور ناشرین بھی شریک ہوئے۔ اس جلسے نے ”ہندوستانی کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت بہار سے مطالبہ کیا کہ ”ہندوستانی زبان کے قواعد و اصطلاحات علمی اور لغات کے لیے ایک کمیٹی بنائی

جائے جس میں انجمن ترقی اردو و ہندی کی جماعت کے نمائندے مساوی تعداد میں شریک ہوں  
 کمیٹی کی کوشش یہ ہو کہ ممکن حد تک اتفاق سے کام لیا جائے لیکن اختلاف کی صورت میں اردو رسم خط  
 کی کتابوں کے متعلق انجمن ترقی اردو اور ہندی رسم خط کی ہندوستانی کی کتابوں میں ہندی انجمن کے  
 نمائندوں کی رائے فیصلہ کن سمجھی جائے۔

یہ محض اتفاق کی بات نہیں تھی کہ اس جلسے کی سہ پہر کی نشست میں بابو راجندر پرشاد اور صوبائی  
 کانگریس کے سکریٹری بھی چلے آئے۔ درحقیقت وہ گاندھی جی کے ایما پر شریک ہونے آئے تھے۔ متعلقہ  
 مسائل پر باہمی گفتگو کے بعد ایک متفقہ اعلان شایع کیا گیا جس پر بابو راجندر پرشاد اور مولوی  
 عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو نے دستخط کیے، یہی راجندر۔ عبدالحق پیکٹ کہلایا۔ اس اعلان  
 میں کہا گیا تھا:

”بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی زبان کے  
 مسئلہ پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہمیں فکر تھی کہ اردو، ہندی، ہندوستانی  
 کے مباحثے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، انہیں دور کیا جائے اور خوشی کی بات ہے کہ  
 مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں گفتگو  
 ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان میں بڑی حد تک ہم متفق رائے ہیں۔ چنانچہ ہم کو اس پر اتفاق  
 ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہونی چاہئے اور یہ دونوں رسم الخط اردو  
 اور دیوناگری میں تحریر ہو اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لیے سرکاری زبان تسلیم  
 کی جانی چاہئے۔ ہندوستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں  
 سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول اور  
 انتخاب کا معیار بھی عام استعمال میں رواج ہونا چاہئے۔ مزید براں ہماری رائے ہے  
 کہ ہندی، اور اردو دونوں کو بحیثیت ادبی زبانوں کے ترقی کرنے کے پورے مواقع  
 دیے جانے چاہئیں۔“

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے بابو راجندر پرشاد کی  
 صدارت میں ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی بنائی جس میں مولوی عبدالحق مجاز کیے گئے کہ ہندوستانی زبان

کالغت تیار کریں جس میں وہ تمام عربی و فارسی الفاظ آجائیں جو مستند ہندی کے مصنفوں نے استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام ہندی اور سنسکرت الفاظ بھی شریک کیے جائیں جو مستند اردو مصنفوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے یہ لغت تیار کر لیا اور پٹنہ بھیج دیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ قومی زبان کا مسئلہ طے پا گیا۔ مگر نہ تو لغت کی اشاعت کی نوبت آئی اور نہ تجویز پر عمل درآمد کرنے کا۔ جب گاندھی جی کی طرف سے مایوسی ہوئی تو مولوی عبدالحق نے ۱۹۴۰ء سے ملک بھر کا دورہ کر کے اردو کی تحریک کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ اپنے کمرسن کے باوجود بنگال، بہار، گجرات، یوپی، راجستھان، مہاراشٹر، میسور، کیرل، سی۔ پی، مدراس صوبوں کے مختلف مقامات میں جا کر انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کیں، ایک جگہ بڑے درد کے ساتھ انھوں نے کہا:

”ہندوستان جو آج ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے اور ہر جماعت دوسری جماعت کو اور ہر فرقہ دوسرے فرقے کو بھنبھوڑنے اور ہضم کرنے پر آمادہ ہے، ان کے مزاج کو ٹھنڈا کرنے اور ان کو اعتدال پر لانے کے لیے یہی (زبان کا) نسخہ دے سکتا ہے۔ یہ ٹکڑے گوند یا لسی سے نہیں جڑ سکتے، کچے بنا گے سے نہیں بندھ سکتے۔ ان کو یکجا کرنے اور باندھنے کے لیے شیرازے کی ضرورت ہے اور یہ شیرازہ ہماری اردو زبان ہے جس کے خمیر میں اتحاد ہے۔ یہ اتحاد سے بنی تھی اور آئندہ بھی اگر اتحاد پیدا کرے گی تو یہی کرے گی۔ وہ بقول سرتیج بہادر سپرو، ہندو، مسلمان کے آبار و اجداد کا مشترکہ اور مقدس ترکہ ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے“ (ص ۱۴)

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے اردو کے اس بوڑھے سپاہی کی گویا کمر ٹوٹی لیکن اس کی ہمت نہیں ٹوٹی۔ دلی میں فسادات ہو رہے تھے تو مولوی عبدالحق حیدرآباد تھے۔ مولوی صاحب دلی پہنچے تو دریا گنج میں انجمن کے دفتر کو خاک کا ڈھیر دیکھ کر ان کے دل کی کیا کیفیت ہوئی اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جو ایسے حادثے سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ اس کے باوجود ان کے عزم اور



اردو کی خدمت کے ارادے میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ اپنا کام جاری رکھنا چاہتے تھے۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ اس ملک میں اب ان کی زیادہ ضرورت ہے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد و غیر تعلیمات کو خط لکھا۔ اور ۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ان سے ملے اور اپنے ارادے سے آگاہ کیا مگر مولانا آزاد نے انھیں اس ارادے سے باز رکھنے کی تلقین کی۔ فرمایا:

”بہت بدگمانیاں ہیں۔ آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیے۔ یہ ٹھیک نہیں کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں اور ایک ٹانگ وہاں ہو۔۔۔۔۔ موجودہ حالات ایسے نہیں کہ آپ یہاں کام کریں“ (پنجاب ۲۰۳)

مولوی صاحب نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مولانا آزاد کو خط لکھا:

”اس میں مطلق شبہ نہیں کہ میں بدستور یہاں کام کرنا چاہتا تھا اور اب بھی یہاں کام کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔۔۔ میں نے انڈین یونین کی سکونت (شہریت) ترک نہیں کی ہے۔“

اس یقین دہانی کے باوجود مولوی عبدالحق کو ترک وطن کرنا پڑا۔ اس کے بعد ان پر کیا گزری یہ الگ داستان ہے۔

۲۷ جنوری ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی نے ہندوستان کی ہندی دیوناگری رسم خط میں ملک کی قومی زبان قرار دیا اور اس طرح ”ہندوستانی“ کے معاملے پر آخری ہر شہرت کر دی۔ نہ جاتے اس فیصلے کا گاندھی جی کے دل پر کیا اثر ہوا۔ انھوں نے بمبئی کی ہندوستانی پرچائی سبھا کی سکریٹری مسز پیرین کپشن کو اپنی پرارتھنا سبھا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:

”تم نے دیکھا میں نے کل ”ہندوستانی“ پر کیا کہا۔ ہم کو اور تم کو اس کام کے لیے کڑی محنت کرنی ہوگی، مرجانے کی حد تک، بد دل نہ ہو۔“

ہندوستان کی ملکی زبان بنانے میں مولوی عبدالحق کی کوششوں کے جائزے کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ قطع نظر اس سے کہ بقول اندولال یاگنک کہ ”گاندھی جی جب کوئی تجویز پیش کرتے تو اپنے فرار کی صورت پہلے سے سوچ لیتے“ (ہمارے زبان یکم فروری ۱۹۴۷ء) وہ کون سے اسباب تھے کہ جن کی وجہ سے گاندھی جی ملک کی مشترکہ زبان کے بارے میں اپنا موقف بدلتے رہے جس

نے معاملے کو الجھن میں ڈال دیا ؟

پہلی وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ گاندھی جی اردو زبان سے، اس سانی اوزناری کی پس منظر سے واقف نہ تھے انھوں نے خود تسلیم کیا:۔

”اردو کا میرا علم ہندی سے بہت کم ہے اور اس کمی کی وجہ سے (اردو) پڑھنا میرے لیے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میری جانکار کی بہت محدود ہے۔ ہندی میں نے بچپن میں سیکھی اردو مجھے سیکھنی پڑی۔ میں آسانی سے اس میں کچھ لکھ بھی نہیں سکتا“ (ہریجن ۲۶ جولائی ۱۹۴۶) اس کے ایک ہفتہ بعد انھوں نے لکھا:

مجھے دونوں زبانوں سے پریم ہے لیکن ان دونوں میں سے کسی کا ماہر نہیں ہوں۔ کتابوں کے ذریعے مجھے ان کے مطالعے کا موقع نہیں ملا۔ میرا اردو کا علم تو ہندی سے بھی بہت کم ہے۔ (ہریجن ۱۳ جولائی ۱۹۴۶)

ان کو یہ غلط فہمی رہی کہ اردو زبان فارسی اور عربی سے اس قدر بوجھل ہے کہ ہندوستان میں اسے صرف عربی اور فارسی داں مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ اردو کو صرف مسلمانوں کی دلداری کی خاطر قائم رکھنے کے حامی تھے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے ۹ نومبر ۱۹۴۷ء کے ”ہریجن“ میں لکھا: دلداری (appease - ment) کی پالیسی کو ناپسندیدہ مانی جاتی ہے لیکن یہ ہمیشہ برہمی نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے بھی وہ لکھ چکے تھے کہ ۱۹۲۵ء میں جب کانگریس نے ”ہندوستانی کی تجویز منظور کی تھی تو یقیناً اس معاملے میں ہندو مسلم اتحاد ہی تہ نظر رکھا گیا (ہریجن ۲۶ اپریل ۱۹۴۲)

دوسرے لفظوں میں گاندھی جی نے اردو، ہندی، ہندوستانی کے مسئلے کو خالص سانی ضرورت اور تقاضے کے تحت نہیں بلکہ صرف سیاسی زاویہ نگاہ سے دیکھا۔ اس لیے اس کی وضاحت میں الٹ پھیر کرتے رہے جو سیاست کا مسئلہ طریقہ ہے۔

الجھن کا دوسرا سبب یہ بھی ہوا کہ گاندھی جی کے وہ رفقاء کار جو انھیں زبان کے معاملے میں مشورے دیتے رہے۔ اپنی بات دیانت داری سے کہنے کے بجائے، گاندھی جی کی اردو سے عدم واقفیت کا فائدہ اٹھاتے رہے۔ ان میں بابور جندر پر شاد، پر شوٹم داس ٹنڈن، کنھیالال منشی، کاکا کالیکر، شری من نارائن اگر وال، رتن لال پارکھ وغیرہ کے نام نمایاں طور پر آتے ہیں۔ یہ سب بہ ظاہر ”ہندوستانی“ کے حق میں تھے،

انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس عام فہم زبان کی حمایت کی تھی۔ ۱۹۲۵ء کے کانپور اجلاس میں کانگریس کے سامنے ہندوستانی زبان کی جو تعریف کی گئی تھی وہ ٹنڈن جی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ بابو راجندر پرشاد، فارسی کے فرسٹ کلاس گزٹجوئیٹ تھے، کنہیا لال منشی گجراتی کے مشہور لیکچرر تھے۔ کانکا بلیکر کو گاندھی جی نے خصوصی پرچارک بنا رکھا تھا۔ لیکن ان کی تحریروں اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی کے بارے میں ذہنی تحفظ سے کام لیتے رہے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں بہار کی صوبائی ہندی سائنس سیمین کا افتتاح کرتے ہوئے ۵ فروری کو بابو راجندر پرشاد نے فرمایا:

”آج میں یہ کہتا ہوں کہ ہندی ایک زندہ زبان ہے جو سارے ہندوستان میں بولی اور لکھی جاتی ہے، ہزاروں لے سیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک قومی خدمت ہے کیوں کہ وہ ایک زبان کو ترقی دے رہے ہیں جو ان کے نزدیک قومی زبان ہو سکتی ہے (ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۴۰ء)

اگلے برس ”پوربا بھارت راشٹر بھاشا پرچار کانفرنس“ منعقدہ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو کلکتہ میں انھوں نے فرمایا:

”چوں کہ ہندی سب سے بڑی زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں بولی جاتی ہے اور قریب قریب ملک کے ہر حصے میں سمجھی جاتی ہے لہذا اس امر پر اتفاق ہے کہ صرف یہی ایک زبان ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے“ (ہماری زبان یکم جولائی ۱۹۴۱ء)

ملک آزاد ہوا تو اس کی دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی ملکی زبان کا فیصلہ کرنے بیٹھی، آدھے ارکان ”ہندوستانی“ کے حق میں تھے اور باقی ہندی کے حق میں۔ ووٹ لیے گئے تو برابر برابر ووٹ آئے۔ اس وقت راجندر بابو نے اپنے صدارتی حق (کاسٹنگ) ووٹ دیوناگری میں ہندی کے حق میں دے کر یہ باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ ایک اور صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے ہندی ہندوستان کی ملکی زبان قرار پائی۔ جمہوری طرز کا یہ فیصلہ دنیا کی تاریخ میں آپ اپنی مثال ہے!

اس واقعہ کے دو سال بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد (صدر جمہوریہ ہند) نے بمبئی میں ہندوستانی

پرچار بھا کے نام ایک پیغام میں فرمایا:

”ہندوستانی کا مسئلہ بابو (گاندھی جی) کو دل سے عزیز تھا۔ ان کی آرزو تھی کہ ہر شخص

دونوں رسم خط میں ہندوستانی لکھیے۔ یہ باپو کے تعمیری پروگرام کا اہم اور لازمی جز ہے۔

جو لوگ اس کام میں تین من سے لگے ہوئے ہیں قابل مبارک باد ہیں۔۔۔۔۔

درحقیقت دستور میں جس طرح ہندی کی وضاحت کی گئی ہے اس سے وہی ہندوستانی زبان

مرا ہے جس کی تعریف ہانڈا گاندھی نے کی تھی "ہندوستانی پرچار سبھا کا کنا پچہ"

اس پیغام کی تاریخ ۲۶ مئی ۱۹۵۱ء ہے سرکاری سطح پر جو ہندی، ریڈیو، ٹی وی اور ابلاغ عامہ کی خاطر

استعمال کی جا رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ناطقہ سرپرہ گریباں ہے کہ اسے کیا کہیے۔

کا کا کابیکر نے "ہنزجن" کے شمارہ ۷۷، ۱۴ نومبر ۱۹۴۷ء میں لکھا:

"کچھ عرصہ تک ہم نے ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے مقبول کرانے کی کوشش کی ہم نے

کہا کہ اردو، ہندی میں شامل ہے اور ہم نے وہ عربی اور فارسی الفاظ کو باقی رکھنے کی کوشش

کی جو ہندی میں مستعمل تھے۔ پھر وہ وقت آیا جب کہ عام فہم اردو، اردوئے معلیٰ بن گئی۔

ہم نے اسے آسان بنانے کی کوشش کی مگر ہم نے محسوس کیا کہ یہ کافی نہیں تھا۔"

اردو کے ساتھ بابو پرشوتم داس ٹنڈن کا جو رویہ رہا اس کا کھل کر مظاہرہ پارلیمنٹ میں ہوا جب کہ

وزارت تعلیم کی دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کو ۵۴ ہزار روپے کی غیر اجرائی گرانٹ دینے پر بابو صاحب سخت

نکتہ چیں ہوئے۔ جس کے جواب میں مولانا آزاد نے ٹنڈن جی جیسے لوگوں کو یہ کہہ کر متنبہ کیا تھا:

"ہندی والوں کو ان کا سانی تعصب بے ڈوبے گا۔ افسوس! جو اردو زبان ہی ملک

کی پیداوار ہے۔ آج اس کے لیے ہمارا دماغ تنگ ہو گیا ہے۔"

کنہیا لال منشی گجراتی کے مانے ہوئے ادیب تھے، ان کی ہندوستانی میں دل چسپی صرف سطحی رہی البتہ

ہندی کے وہ پریکری رہے۔ ان کے قایم کردہ بھارتی وڈیا بھون میں ہندوستانی کا نام و نشان نہیں۔

بہتی میں دادا بھائی نوروجی کی پوتی پیرین کپٹین ہندوستانی پرچار سبھا کی سکریٹری تھیں۔ وہ شروع

سے ہی پکی نیشنلسٹ رہیں اور گاندھی جی کے تعمیری پروگرام میں زبان کی پرچارک۔ انھوں نے دونوں

رسم خط میں ہندوستانی کی تعلیم پیسوں گجراتی اور مراٹھی اسکولوں میں رائج کی رہا انھوں کے لیے ہندوستانی

کی کلاسیں کھولیں اور ان کے ذریعہ امتحانات لے کر سندیں دینے کا انتظام کیا۔ جب ہوا کا رخ بدلتے دیکھا

تو انتہائی کرب کے ساتھ انھوں نے گاندھی جی کو خط میں لکھا:



”نتہائی شرم، فسوس اور رنج کے ساتھ میں نے آں تڈیا ریڈیو پر سنا کہ ہماری جماعت کے لوگ اس قومی زبان کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے لیے ہم بٹاک کوشاں رہے۔ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ معروف کانگریسی لیڈر بھی حالیہ واقعات سے متاثر ہو کر تعصب میں اندھے ہوتے جا رہے ہیں، اتنے اندھے کہ وہ اسی چیز کی ریختگی پر تل گئے ہیں جسے کانگریس نے بنایا اور استوار کیا۔

”برائے کرم مجھے بتائیے کہ آپ کے وہ ہم وطن ہندو مسلمان، عیسائی اور یہودی، جو ہندوستانی کو (قومی زبان) تسلیم کر چکے ہیں، کانگریس کے اس ریزولیشن سے کیا نتیجہ اخذ کریں؟“

گاندھی جی نے ۲ اگست ۱۹۴۷ء کے سیزجن میں شائع کر دیا خط کا جواب دیا اس میں اصل مسئلے سے گریز کیا۔

ریڈیو کی خبر کا عمل گاندھی جی کے ایک دوسرے رفیق رتن رام پارکھ پر اس طرح ہوا:

”ہماروں کی اطلاع کے مطابق کانگریس پارٹی نے (یعنی دستور ساز اسمبلی کی پارٹی) ہندی و دیوناگری رسم خط میں ہندوستان کی قومی زبان مان لیا ہے۔ اس خبر کا عام پبلک پر بردست اثر پڑا۔ وہ اردو رسم خط کے مخالف ہیں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ اردو رسم خط کی ترویج و اشاعت کا مسئلہ کوئی جاندار مسئلہ نہیں ہے (سیزجن ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء) آنا دی کے اعلان سے صرف پانچ دن پہلے!

بہت تھوڑے عرصے میں مولوی عبدالحق اپنی تحریک چلا رہے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ زبان کا مسئلہ صرف گاندھی جی کے ساتھ مل کر ہی حل ہو سکتا ہے کیونکہ گاندھی جی کانگریس کے بے تاج کے بادشاہ تھے، اپنی جماعت اور اس سے باہر بھی احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ جو کچھ کہیں گے ان کی جماعت اس پر عمل پیرا ہوگی۔ مگر فسوس یہ نہ ہو سکا۔ مولوی صاحب دل برداشتہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ وہ سب لوگ جو اردو اور ہندی کی ”سانشکل“ ہندوستانی کو دونوں رسم خط میں ملکی زبان دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے بسا آرزو کہ خاک شدہ

حوالے

”پنجاب“۔ پنجاب ساہتہ تاریخ اردو مرتبہ ہاشمی فرید آبادی (کراچی)

- ۲۔ نقوش - نقوش سلیمانی، از مولانا سید سلیمان ندوی (دار المصنفین، اعظم گڑھ)
- ۳۔ "اردو" - رسالہ "اردو" (اورنگ آباد)
- ۴۔ "ہمارے زبان"، انجمن ترقی اردو (ہند) دلی
- ۵۔ ہریجن -
- ۶۔ On Language Problem: Edited by Anand T. Hingorani
- ۷۔ ہندوستانی پرچار سبھا، بمبئی - کتابچہ
- ۸۔ محمد علی جناح - سید شہاب الدین دستوی (علمی مجلس، دلی)
- ۹۔ خطبات - خطبات عبدالحق (انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۳۹)
-

## مولوی عبدالحق مرحوم کی بعض تحریریں

کئی موضوعات ایسے ہیں جن سے متعلق مولوی عبدالحق مرحوم کی تحریروں کو "اولیات" کے عنوان کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔ یہاں لفظ "اولیات" کو ذرا وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ مرحوم کی سبھی تحریروں نے پہلی بار ان خاص موضوعات کو روشناس کرایا۔ مقصود یہ ہے کہ ان کی تحریروں نے بعض موضوعات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ بیسویں صدی کے نصفِ اول میں وہ صحیح معنی میں انہی کی تحریروں کے واسطے سے متعارف ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے ایسے کام بھی ہیں جو حقیقی اور قطعی مفہوم میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر میرٹھناسی کی روایت کو بھیجیے۔ میر کا خدائے سخن ہونا مسلم رہا ہے اور ہر زمانے میں خراج عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے؛ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مرحوم کے مرتب کیے ہوئے انتخاب میر کے مقدمے نے میر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں کو اس طرح پیش کیا کہ اُس کی طرف نئے انداز سے ذہن متوجہ ہوئے۔ یہ کہنا کسی لحاظ سے بے جا نہ ہوگا کہ جس چیز کو میرٹھناسی کی روایت کہا جاتا ہے، اُس روایت کا نقش اسی مقدمے سے بنا تھا۔ اثر لکھنوی مرحوم کا کام بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اُن کا مرتب کیا ہوا "انتخاب مزامیر" مولوی عبدالحق کے انتخاب کے بعد اور دراصل جوابی کتاب کے طور پر سامنے آیا تھا۔ اثر صاحب کو شکایت یہ تھی کہ میر کے بیت سے قابلِ انتخاب اشعار کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ "مزامیر" کا مقدمہ بھی میر کی شاعری کے محاسن کو عمدہ طور پر سامنے لایا، لیکن مولوی صاحب کی تحریر میں جو تنقیدی انداز ہے، وہ اُس سے خاصا مختلف ہے اور مولوی صاحب کی یہ تحریر بنیادی تحریر کے طور پر آج بھی اپنی حیثیت اور اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے ہے۔

دوسری اس سے بھی زیادہ اہم مثال مقدمہ "باغ و بہار" کی ہے۔ باغ و بہار کوئی نئی کتاب

نہیں تھی، لیکن پیش تر لوگ اس کتاب سے، دو نسبتوں کے واسطے سے واقف تھے۔ ایک تو فائدہ عجائب کے واسطے سے، کہ رجب علی بیگ سرور نے میرامن کو اور ان کی نشر کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور دوسرے فورٹ ولیم کالج کے وسیلے سے، کہ گل کرسٹ کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب جو اردو نشر کا شاہ کار ہے اور جس کو جدید اردو نشر کا پہلا صحیفہ کہا جاسکتا ہے؛ اس کی تشریح کیا خوبیاں ہیں، اس بات سے کم لوگ واقف تھے۔ اس کتاب پر مولوی صاحب کا مقدمہ بہت طویل نہیں، کل ۲۶ صفحات کا ہے، اور ان ۲۶ صفحوں کا بھی زیادہ حصہ دوسرے مباحث سے متعلق ہے، مگر یہ کمال نقد و نظر ہے کہ چند صفحوں میں اس کتاب کی نشری خصوصیات کو اس طرح بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی تحریر کا چھٹہ آج بھی سر مشق کے طور پر پیش نظر رکھنے کی چیز ہے۔ مولوی صاحب کی اس مختصر سی تحریر نے پہلی بار میرامن کی نشر کی ان خصوصیات کو روشنی بخشی جنہوں نے اس کتاب کو بے مثالی کی سند عطا کی ہے اور اس کتاب کی حقیقی قدر و قیمت کو روشناس کرایا۔

اس کتاب کے سلسلے میں مولوی صاحب کو ایک اور بحث میں بھی اولیت کا شرف حاصل ہے۔ مولوی صاحب نے تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کی ہے کہ ”باغ و بہار کا ماخذ دراصل ”نوطر زمر“ ہے، لیکن میرامن نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ شیرانی صاحب نے اور بعض اور لوگوں نے اس سلسلے میں مولوی صاحب کے اس اعتراض کو غلط بتایا اور کہا کہ اشاعت اول کے سرورق پر یہ صراحت موجود ہے یہ صحیح ہے کہ اشاعت اول کے سرورق پر یہ صراحت موجود ہے، لیکن مولوی صاحب کا اعتراض اب بھی اپنی جگہ برقرار ہے کہ میرامن نے اس کا اعتراف نہیں کیا کہ ان کا ماخذ ”نوطر زمر“ ہے۔ میرامن نے اپنے دیباچے میں واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ میں نے فارسی کے قسطے کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ فورٹ ولیم کی کتابوں کے سرورق مصنفین کے تیار کیے ہوئے ہوتے تھے؛ ہاں اس کے متعدد قرائن موجود ہیں کہ یہ گل کرسٹ کی نگرانی میں تیار کیے گئے تھے۔ میرامن نے وہی بات لکھی ہے جس پر مولوی صاحب نے اعتراض کیا تھا۔ گل کرسٹ نے اپنے پیش لفظ میں اور سرورق پر ضرور اس کی صراحت کی ہے کہ یہ کتاب ”نوطر زمر“ پر مبنی ہے، مگر میرامن نے اپنے دیباچے میں واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب فارسی کے قسطے چہار و رویش کا ترجمہ ہے۔ مولوی صاحب نے دراصل میرامن کے اسی قول پر اعتراض کیا تھا اور شیرانی صاحب کی مفصل جواب دہی کے باوجود، مولوی صاحب کا اعتراض



آج بھی اپنی جگہ پر برقرار ہے۔

نہیں اس سے بھی اہم ایک اور بات ہے جو پہلی بار مولوی صاحب نے لکھی ہے۔ خود میر تقی نے باغ و بہار کو ترجمہ بنایا ہے اور بعض دوسرے حضرات نے یہ لکھا ہے کہ ترجمہ تو دراصل نو طرز مرصع ہے؛ مولوی صاحب نے اپنے مقدمے میں پہلے تو اس کی وضاحت کی کہ باغ و بہار ترجمہ نہیں۔ فارسی کے قصہ بہار درویش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میر تقی کی باغ و بہار اسی کتاب کا ترجمہ بھی جاتی ہے اور وہ خود بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کا ترجمہ نہیں۔ قصہ وہی ہے، مگر اس کا لہجہ بجائے فارسی کے، اردو کی کتاب نو طرز مرصع ہے۔" اس کے بعد نو طرز مرصع اور باغ و بہار دونوں کے متعلق لکھا ہے کہ: "اصل میں ترجمہ ان دونوں میں سے کوئی نہیں۔ فارسی قصے کو اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے۔" صحیح بات یہی ہے جو مولوی صاحب نے لکھی ہے کہ نو طرز مرصع کو بھی ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔

حقیقتاً تحسین فارسی کے قصہ بہار درویش کو، کہانی کی حد تک فارسی کے مطابق اپنی زبان میں لکھتے چلے گئے ہیں۔ یعنی انھوں نے فارسی عبارت کی پابندی نہیں کی ہے، صرف قصے کو سامنے رکھا ہے اور میر تقی نے بنیادی طور پر نو طرز مرصع کو سامنے رکھ کر، اُسی قصے کو اپنی زبان میں اپنے انداز سے لکھا ہے۔ جس طرح نو طرز مرصع زبان اور بیان کی حد تک فارسی قصے سے بالکل مختلف ہے؛ اُسی طرح باغ و بہار بھی نو طرز مرصع سے مختلف ہے؛ یوں اصولاً ان دونوں کتابوں میں سے کسی ایک کو بھی ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔

اس کو یوں بھی دیکھیے کہ میر تقی کی دوسری کتاب گنج خوبی کو ترجمہ کہا گیا ہے اور حقیقتاً بھی ترجمہ زبان میر تقی کی ہے اور بیان بھی اُن کا اپنا ہے؛ لیکن وہ اصل فارسی عبارت سے سب سے تجاوز نہیں کرتے اصل سے اس قدر وفاداری نے، زبان اور بیان کی خوبیوں کے باوجود، اُسے ترجمے کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھنے دیا ہے؛ جب کہ باغ و بہار میں وہ یک داستان کو اپنے طور پر لکھتے ہیں اور اس طرح لکھتے ہیں کہ اُس کا قالب ہی بدل جاتا ہے۔ اس عمل نے باغ و بہار کو تصنیف کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ غرض کہ مولوی صاحب سے پہلے کسی کی نظر اس پہلو پر نہیں پڑی تھی۔ یہاں مولوی صاحب کو حقیقی معنی میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور بات بھی ہے۔ مولوی صاحب نے جہاں اس کی وضاحت کی ہے کہ میر تقی میر کا  
 ماخذ نو طرزِ مرصع ہے، وہاں نو طرزِ مرصع سے تقابل کے ساتھ ساتھ، فارسی کے قصیدہ چار و رویش کی بھی بہت  
 سی عبارتیں نقل کی ہیں؛ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جن مقامات پر فارسی قصیدے اور نو طرزِ مرصع میں اختلاف  
 ہے، بارغ و بہار میں ایسے مقامات بہ طورِ معمول نو طرزِ مرصع سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس سے بڑا فائدہ یہ  
 ہوا ہے کہ پہلی بار فارسی کے ایک نسخے کی عبارتیں اردو والوں کے سامنے آئیں اور یہ معلوم ہوا کہ نو طرزِ مرصع  
 متعارف مفہوم میں ترجمہ نہیں۔ جو معلومات اس وقت تک سامنے آئی ہیں، اُن کی بنیاد پر ہم اعتماد کے  
 ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو والوں میں مولوی صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے فارسی نسخے کو پڑھا تھا  
 اور نو طرزِ مرصع سے اُس کا تقابل کیا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولوی صاحب نے اس تقابلی مطالعہ  
 سے جو نتائج پہلی بار نکالے تھے، اُن سے اب تک اختلاف نہیں کیا جاسکا ہے۔

بچے چند سکندر آبادی نے ہمایوں کے زمانے میں ایک منظوم رسالہ لکھا تھا، جسے اردو کا قدیم ترین  
 نصاب کہا جاسکتا ہے۔ قدامت کی بنا پر اس مختصر رسالے کی بہت اہمیت ہے۔ آج ہم میں سے بہتوں کو  
 یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ اب سے بہت پہلے مولوی صاحب نے اس بیش قیمت خطوط کو دریافت  
 کیا تھا اور اس پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا اور اس طرح اسے روشناس کرایا تھا۔

مولوی صاحب سے جن چیزوں کو بہ طورِ اولیات منسوب کیا جاسکتا ہے، ان کی اچھی خاصی  
 فہرست بن سکتی ہے یہاں محض چند باتوں کی طرف صرف اشارے کیے گئے ہیں۔ مولوی صاحب  
 قد آور شخصیت کے مالک تھے، ہنسی اس پر آتی ہے جب آج بعض وہ لوگ جو ان کے مقابلے میں صاف طور پر  
 کوتاہ قامت نظر آتے ہیں، وہ اُن کی عظمت سے انکار کو بھی اپنی بڑائی کا ایک ذریعہ فرض کر لیتے ہیں۔  
 چاند پر خاک ڈالنا اسی کو کہتے ہیں۔

## مولوی عبدالحق — اردو کا استعارہ

اردو زبان و ادب کے فروغ اور اس کے علمی اور فنی ارتقاء کے سلسلے میں اگر اس کے محبین کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں کئی طرح کے لوگ نظر آئیں گے۔ کچھ وہ جنہوں نے اسکول، کالج، یونیورسٹی اور ادارے کھولے اور اس کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کچھ نے نصابی کتابیں اور ریڈیو لکھیں کچھ نے شعروادب میں اپنے گراں قدر اضافوں سے اس کو سرفراز کیا۔ کسی نے محض زبان کی اصلاح کو اپنا مقصد بنایا۔ کسی نے لغات اور قواعد مرتب کیے۔ کسی نے اردو کے تناور درخت کی ایک ہی شاخ کو سنوارنے میں عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا کسی نے دو چار شاخوں کو ہاتھ میں لیا اور عمر گزار دی اور اس طرح کسی نے عملی میدان میں نام کمایا اور کسی نے علمی سلسلے کو بلند کیا۔ اردو میں ایسی صرف دو ہی شخصیں ہیں جنہوں نے اس کے تحفظ و بقا کے لیے بھی کام کیا اور اس کے علمی اور ادبی فروغ میں بھی نام کمایا۔ ایک سرسید احمد خاں اور دوسرے مولوی عبدالحق۔ سرسید احمد خاں کی بھی پوری زندگی اردو کے علاوہ اور مختلف محاذوں پر تاریخ و مذہب اور اصلاح و ترقی کی جنگ لڑنے گزری مگر مولوی عبدالحق وہ اکیلی شخصیت ہے جو محض اردو کے لیے جیسا اور اردو کے لیے مرا۔ جس نے ایک ہی انداز کے جوش و خروش کے ساتھ اس کے بقا کی بھی جنگ لڑی اور اس کے علمی اور ادبی خزانے میں بھی اضافہ کیا۔ اس کے معیار کا پیمانہ ہر جگہ بلند تھا۔ اس نے جو کام بھی کیا اعلیٰ درجے کا کیا اور اردو کی محبت میں کیا۔ اردو سے اس کے تعلق کا یہ حال تھا کہ اس نے اسے مقصد زندگی بنالیا تھا۔ ڈاکٹر منظر احمد انصاری کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ ”میرے زندگی کا مقصد دنیا میں صرف ایک ہی ہے وہ یہ کہ اردو کو ترقی ہو اور علمی زبان بن جائے“ لہٰذا شفی فرید آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

”یہ تمہنے کیا کہا کہ میں اپنا ذاتی روپیہ کیوں بے دردی سے انجمن پر خرچ کر رہا ہوں۔ تمہارے

بھائی یا بیٹے پر خدا نخواستہ کوئی وقت آپڑے تو کیا تم اس کی مدد نہ کرو گے اور کیا ایسے وقت میں تم روپیہ کا منہ دیکھو گے۔ میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہو گیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتا اور انشاء اللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے ایسا ہی قائم رہے گا خواہ میں اس کا سیکرٹری رہوں یا نہ رہوں واللہ

جو ایک زمانے میں انجمن کے خلاف سازشوں اور اس کی تباہ حالی پر اس قدر متاسف تھا کہ اس کی اپنی ذات کی منفعت اور تعظیم بھی اس کے غم کو کم نہ کر سکی اور خطاب و اعزاز سے بھی اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی یہ میرا خیال ہے کہ اردو میں ایسی کوئی شخصیت نہیں جس کا اوڑھنا بچھونا اردو ہو۔ جس کا اٹھنا بیٹھنا سوٹا جاگنا اور چلنا پھرنا محض اس کے لیے ہو۔ انھوں نے اردو کی جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا۔ اس کے تنے کو خوشنما بنایا۔ اس کی شاخوں کی راستگی کی اور اس کے پھولوں میں طرح طرح کے پھول کھلا کر صرف ایک درخت سے چین زار بنا کے دکھا دیا۔

مولوی صاحب نے ۱۸۹۸ء میں حیدرآباد میں رسالہ افسر کی ادارت سنبھالی اور بقوں رشید احمد صدیقی اسی وقت سے اردو اور مولوی صاحب نے ایک دوسرے کی تقدیر پر پچانی اور اپنائی رکھ چوں کہ ایک عرصے تک وہ درس و تدریس سے بھی متعلق رہے۔ اس لیے انھیں اردو میں بنیادی کتابوں کی کمی محسوس ہوئی۔ اس کی تکمیل کے لیے بچوں کے لیے ریڈرین لکھیں۔ میٹرککوش اور انٹرمیڈیٹ کے درجات کے تصابات ترتیب دیے۔ قواعد اردو اور اردو صرف و نحو، جیسی کتابیں لکھیں۔ جیسے جیسے اردو میں جس چیز کی بھی کمی محسوس کی اس کو خود دور کرنے کی کوشش کی اور دوسرے اہل علم کا تعاون بھی حاصل کیا۔ اس ضمن میں دکنی اردو کی ایک لغت مرتب کی، نگرینری اردو ڈکشنری ترتیب دی اور ایک جدید اردو لغت کا ڈول بھی ڈالا۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ اردو اتنی سر بلند ہو کہ جدید تر علوم و فنون کی اعلا تعلیم بھی اس میں ہو سکے۔ اس کے لیے انھوں نے دارالترجمہ قائم کر دیا۔ پھر اس کے ذریعے سائنسی اور علمی اصطلاحوں کو اردو میں منتقل کروانے کی جدوجہد

۱۔ مکتوبات عبدالحق، مرتبہ جلیل قدوائی، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۸، ۱۹۶۲ء ص ۴۷۷

۲۔ ص ۵۶۵

۳۔ گنجائے گرانمایہ، از رشید احمد صدیقی، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لٹریٹری دہلی، فروری ۱۹۷۶ء ص ۲۷



میں اوروں کے ساتھ خود بھی پیش پیش رہے، ان کا مضمون اردو زبان میں علمی اصطلاحوں کا مسئلہ اسی کا اشاریہ ہے۔ انہی کی کوششوں نے نتیجے میں علمی اصطلاحات، اور اصطلاحات پیشہ وراں، جیسی کتابیں سامنے آئیں۔ مختلف علوم و فنون کی ممتاز کتابوں کے ترجموں کے علاوہ کئی نایافت بھی سامنے آئیں اور ان ساری کوششوں کا مرکز و محور وہ خود تھے۔

ان کا ایک اہم خواب 'اردو یونیورسٹی' کا قیام تھا۔ اس کے لیے انھوں نے دوران قیام حیدرآباد ہی میں کوششیں شروع کر دی تھیں اور اس کے نتیجے میں اردو میڈیم کی ایک یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں سامنے آئی جو بقول رشید احمد صدیقی "ایک مختصر مدت میں ہندوستان کی معیاری انگریزی یونیورسٹیوں کے ہم پلہ ہو گئی بلکہ اس میں اگرچہ کئی لوگوں کی کوششوں کا دخل تھا لیکن مولوی صاحب کا نام سب سے روشن اور سب سے پیش پیش تھا۔ پاکستان جانے کے بعد وہاں بھی انھوں نے اس کے لیے کوششیں کیں۔ اردو یونیورسٹی کی وہ شکل جو وہ چاہتے تھے اگرچہ عمل میں نہ آ سکی لیکن انھوں نے اردو کالج، جو قائم کیا اس نے بڑی حد تک ان کے خواب کی لاج رکھ لی۔ اس لیے کہ اس میں اردو میڈیم کے ذریعے سماجی علوم کے علاوہ دوسرے علوم کی تدریس بھی ایم۔ اے کے درجات تک ہونے لگی۔ پھر عورتوں کے لیے ایک الگ خواتین کالج، کا قیام بھی انہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

انجمن ترقی اردو، جو محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک جز تھی اور نام ہی کو زندہ تھی ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب اسے علی گڑھ سے حیدرآباد لائے اور آنریری سکریٹری کی حیثیت سے اکیلے ہی اس کو ایسا سجایا بنایا اور توانا کیا اور اتنی ترقی دی کہ بقول رشید احمد صدیقی وہ اردو کی بے شمار صلاحیتوں کا آئینہ، ان کو بروئے کار لانے کا وسیلہ اور اردو کی حفاظت و حمایت کا معتبر کل ہند محاذ بن گئی۔ جب تک زندہ رہے اس کو اپنے سینے سے لگائے

رکھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کی وجہ سے زندہ تھے یا اس کے بغیر ان کا اپنا کوئی مقام یا شناخت نہ تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اس کو ختم یا تباہ ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ انجمن سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہ تھا بلکہ انجمن کے لیے وہ اپنا ذاتی روپیہ پیسہ وقت و صحت اور اپنی ساری توانائیاں داؤ پر لگائے ہوئے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے انجمن یعنی اردو ہی ان کے ذہن میں ہوتی۔ اس کے لیے دور دراز کا سفر کرتے۔ مسلسل چلتے۔ درد و رماندگی مجبور بھی کرتی تو بھی اس کو نے کے پیٹھ جلاتے۔ وہ اس کے بغیر اپنے آپ کو نہ پہچان پاتے۔

اردو زبان و ادب کو درست و چست اور بلند پایہ اور توانا کرنے کی خاطر انھوں نے اخبارات و رسائل کا سہارا لیا۔ رسالہ افسر کو ادبی رنگ دیا۔ پھر اردو نکالا۔ ہماری زبان اور قومی زبان، کے ذریعے اس کے فروغ کی کوششیں کیں۔ اس کو ایک علمی زبان کا بلند سے بلند درجہ دینے کی خاطر رسالہ سائنس، اور رسالہ معاشیات، جاری کیا۔ خود بھی مضامین لکھے۔ دوسروں سے بھی لکھوائے۔ اور ایسا کیا کہ اردو کا تعلق سماج و سیاست سے اور گہرا کر دیا۔ ان کے متعدد مضامین ان رسالوں میں چھپے۔ جن میں سے کچھ کتابی شکل میں سامنے آئے۔ اور بہت سے مقالات عبدالحق کی صورت میں منظرِ سوسے۔ ان میں جو تبصرے چھپے وہ تنقید اور تبصرے کی خوب صورت علمی کاوشیں ہیں۔ متوازن رائے، علم و ذہانت کا امتزاج، غلطیوں کی نشان دہی اور نئی چیزوں کی ہمت افزائی۔ اس نے اردو کو بڑھاوا دیا۔ انھوں نے اردو کے لیے اور اس کے متعدد کاموں کے سلسلے میں متعدد لوگوں کو بے شمار خطوط لکھے کام کا حوصلہ دلایا۔ نئے لوگوں کی ہمت افزائی کی۔ پرائوں کو جھنجھوڑا اور بہت سے لوگوں کی علمی اور ادبی تربیت کی۔ مکتوبات عبدالحق اور ان کے خطوط کے دوسرے مجموعے مکتوب نگاری کا بھی ایک اہم حصہ ہیں۔ اور اردو سے ان کی محبت کا منہ بولتا آئینہ بھی۔

ان کی تقاریر اور خطبات کیا ہیں اردو سے ان کے عشق۔ ان کے تعلق اور ان کے علم کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ان کے خطبات ہیں نہ صرف زبان کی تاریخ ملتی ہے، نہ صرف اس کے سائنس اور عہد بہ عہد تبدیلیوں کا سراغ ملتا ہے بلکہ اردو زبان کی ترقی اور ترقی کے لیے قابل عمل تجویزیں بھی ہیں۔ اردو کے حوالے سے شاید ہی کوئی پہلو ہو جس پر روشنی نہ پڑتی ہو۔ ان میں سائنس مسائل بھی ہیں۔ اور قومی زبان کی تعریف و تفسیر بھی۔ لفظ و معنی کے باہمی ربط پر بھی باتیں ہیں اور اردو کے خیر کے عناصر ترکیبی پر بھی۔ زبان کی صحت سے کیا مراد ہے اور معیاری زبان کیسے کہتے ہیں۔ ملک کے تعلیمی مسائل پر بھی بحث ملتی ہے۔ اور اردو ذریعہ تعلیم پر بھی اور

ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک ایک لفظ، ایک ایک بات اور ایک ایک تقریر میں اردو سے ان کی والہانہ شینگی کی کرنیں جگمگ کر رہی ہیں۔

یہ اردو سے ان کی والہانہ شینگی اور جوش ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اردو کی تیز تر ترویج کے لیے نستعلیق ٹائپ کے لیے کوششیں کیں۔ بہتوں سے باتیں کہیں۔ بہتوں سے خط و کتابت کی۔ یہ انہی کی کوششوں ترغیب اور ہمت افزائی کا نتیجہ تھا کہ آج نستعلیق ٹائپ حقیقت بن چکا ہے۔ اپنے آخری زمانے میں انھوں نے اردو کے ایک عظیم ترسانی، ادبی، علمی اور تہذیبی مرکز کا خاکہ تیار کیا تھا اس غرض کہ جس طرح سے بن پڑا اردو کے کام اور کام کو روشن تر کرنے میں لگے رہے۔

ان کی بعض کتابیں ایسی ہیں جو اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ اہم اس لیے بھی ہیں کہ ایک عالم کی علمیت اور اس کے ذہن کی نکتہ ریزی ان میں قابل دید ہے اور اس لیے بھی ہیں کہ انھوں نے اردو شعروادب کی تاریخ کے ایک دور کو روشن تر اور تابندہ تر کر دیا۔ قدیم اردو، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ، نصرانی۔ ملک الشعراء پیر، پور، ایسی کتابیں ہیں جنہوں نے وکئی ادب کو اردو تاریخ کا روشن باب بنا دیا۔ ان میں تحقیق و تنقید، تلاش و جستجو اور چھان پھٹک کر عمدہ ڈھنگ سے پیش کرنے کی خوب صورت مثالیں ملتی ہیں۔ یہی حال ان کی بعض دوسری کتابوں کا بھی ہے جیسا کہ "مرحوم دہلی کالج" اور "سرسید خان حالات و افکار" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جن میں اردو کی اثر انگیزی اور کچھ ایسی بھی جن میں اردو کی طرف لوگوں کی بے توجہی اور اس کی کس مہر کی کو بڑے درد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثلاً "اردو زبان کی فضیلت چند بنگالی اکابر کی نظر میں" اور "پاکستان میں اردو کا المیہ" وغیرہ۔

ان میں تخلیقی ایج اور صلاحیت غضب کی تھی۔ اس صلاحیت کا نمود کچھ تو اردو کی ترویج و ترقی کا خاطر ان کے مختلف منصوبوں، اور رہنما خطوط ہیں، ہوا اور کچھ چند ہم عصر، جیسے سوانحی خاکوں اور طرز نگارش کی انفرادیت ہیں۔ ان خاکوں میں مختلف اصحاب کی سیرتوں کی ایسی اصلی اور پاک و صاف تصویر سامنے آتی ہے کہ وہ جیتے جاگتے ہمارے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ صرف بڑے لوگ ہی نہیں چھوٹے بھی شاید اس لیے کہ بہت سے بڑے لوگ کہیں کہیں چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ اور بہت سے چھوٹے بھی کبھی کبھی بڑے نظر آنے لگتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کم سے کم لفظوں ایسی تصویریں اتاری ہیں کہ وہ جامع بھی ہیں اور متاثر کن بھی۔ مولانا محمد علی جوہر کو ایک آتش فشاں پہاڑ، یا گلیشیر سے تشبیہ دینا انہی کا حصہ تھا۔ نور خاں،

اور نادر دلو جیسے انسانوں کے خاکے لکھ کر انھوں نے اپنے ادبی مسلک کا بھرم رکھ لیا۔

انھوں نے اپنے اسلوب کو کئی رنگوں سے سجایا تھا۔ سرسید کی سادہ بیانی اور چیتا نثر کو مزید نکھار کر ایک رنگ بنایا، اعلیٰ کی نثر کی سادگی، صفائی اور انکسار، انداز کو مزید چوکھا کیا اور شبلی کی علمی رنگین نثر سے اس کا حسن لے کر اپنے اسلوب کی تشکیل کی۔ لفظوں کی پرکھ کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ وہ لفظوں کے ایسے پارکھتے تھے کہ یہاں مقصد کے مکمل اظہار کے لیے وہ اردو میں مستعمل کسی بھی زبان کے لفظ کو استعمال کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کبھی کبھی غریب اور متروک لفظ بھی مستعمل مل جاتا ہے مگر ان کی تحریروں میں خوب کھپتا ہے۔ چھوٹے جملے متوازن انداز، خوب صورت تشابہ اور طنز و مزاح کی ہلکی سی چاشنی ان کے اسلوب کو جاندار بنا دیتی ہے۔ یہاں رشید احمد صدیقی مرحوم کا ایک اقتباس بے موقع نہ ہوگا کہ

”سرسید نے سب سے پہلے اردو نثر کو ایسے اسلوب سے متعارف کرایا جس میں ہر طرح کے خیالات و جذبات کا اظہار و بلاغ کیا جاسکتا تھا۔ مولوی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سرسید کے اسلوب کی ابتدائی ناگزیر تاہم اور یوں کو دور کر کے اس میں ادبی خوبیاں پیدا کر دیں۔ سبب یہ ہے کہ مولوی صاحب انگریزی، فارسی اور ہندی انداز خیال، انداز فکر و انداز بیان کے رموز سے واقف تھے۔ ان اسباب کو انھوں نے اردو نثر میں اسی سلیقے سے سمو یا کہ وہ سلیقہ اردو کا سلیقہ بن گیا۔ چنانچہ مولوی صاحب کی نثر میں مشکل سے کوئی ٹکڑا ایسا ملے گا جس کو علیحدہ کر کے آپ بتا سکیں کہ یہ انگریزی، فارسی یا ہندی کا چرہ ہے ان امور کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغ نہ ہوگا کہ اردو نثر کا جس کو خالصتاً اردو کا کہا جاسکے غائب، سرسید اور حالہ کے بعد مولوی صاحب کی تحریروں میں ملتا ہے۔“

انھوں نے مختلف موضوعات پر مختلف جگہوں پر اظہار خیال کیا ہے اور جس موضوع پر لکھا ہے لگتا ہے یہ انہی کا میدان ہے۔ تنقید، تحقیق، ڈراما نگاری، سوانح نگاری، مکتوب نگاری، لغت نگاری، ترجمے کی اہمیت، زبان کیا ہے، معیاری زبان، الفاظ کیا ہیں۔ ان کی اہمیت، رسم الخط، حیات و کائنات، انسانیت کیا ہے، اخلاق اور تعلیم، جدید تعلیم، بچوں کا ادب، تہذیب و سائنس وغیرہ موضوعات ان کے خیالات ان کے وسعت علم کی گواہی دیتے ہیں۔



یہ نہیں کہ ان کے معیار کا پیمانہ کہیں پست ہوا ہو۔ وجہ یہ کہ وہ محض اردو کے مجاہد اور غاری نہیں تھے وہ اردو کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ یہی نہیں کہ عالمی ادب بھی ان کی نظر میں تھا۔ متعدد زبانوں کی ادبیات پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ ادبیات ہی نہیں دیگر سماجی علوم سے ان کی واقفیت بھی قابل رشک تھی۔ وہ ملک میں سمیٹے پھلتے مختلف ادبی، علمی، سماجی اور سیاسی رویوں اور تحریکوں سے خوب آشنا تھے۔ وہ نقد کا ذہن اور تبصرے کا شعور رکھتے تھے۔ تنقیدات عبدالحق، اوراد بنی تبصرے، اس کے شاہد عدل ہیں۔ ان کا قول تھا کہ

”تنقید صحیح ذوق کے لیے لازم ہے۔ لیکن ایک نقاد کے لیے جو اس کٹھن اور صبر آزمائے کام

میں ہاتھ ڈالتا ہے وسیع معلومات، گہری نظر اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔ صحیح تنقید

مصنف اور پڑھنے والے دونوں کے لیے مفید ہے۔“ (خطبات، ص ۱۴)

ان کی تنقید صحیح معنوں میں سائنٹفک تنقید ہوتی ہے۔ وہ بلا کسی درعایت اور جھجک کے اظہار

خیال کرتے ہیں۔ اور اس طرح کہ خود ان کی نظر کی گہرائی اور وسعت مطالعہ نظروں میں آجاتے ہیں۔ آیات و

نقات، پر ان کے تبصرے ایک اقتباس دیکھے جو نقد و تبصرہ دونوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ کیا یہ وہی باتیں

نہیں ہیں جو دوسرے متعدد نقادوں نے جو کتنی کی شاعری کے حوالے سے دہرائی ہیں۔

”جوش صاحب کوئی نئے شاعر نہیں، اچھے خاصے پختہ اور پرانے شاعر ہیں۔ ان کے کلام

میں جوش، روانی، حسن بیان بدرجہ کمال موجود ہے۔ اس میں زور بھی ہے اور شور بھی۔

وہ قدیم روایات و اخلاق مذہب و معاشرے اوہام و عقائد کے سخت پیروار ہیں اور مستانہ

وار انہیں ٹھکراتے چلے جاتے ہیں لیکن جب وہ سلام اور نوحے یا اس قسم کی نظمیں لکھتے

ہیں (جیسا کہ اس مجموعے میں پائی جاتی ہیں) تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل پرانے اوہام اور

عقائد سے اس قدر اٹا ہوا ہے کہ روشنی کی ایک کرن کا بھی وہاں گزیر نہیں۔ انقلاب، نظام

جدید اور جدید رنگ پر فریفتہ ہیں۔ جوش و خروش اور انقلاب کے نغموں سے

ان کا کلام گونج رہا ہے۔ لیکن انقلاب کیا ہے؟ نظام جدید سے کیا مطلب ہے؟ اس سے

انہیں بحث نہیں۔ انہیں تو غارت گری سے مطلب ہے۔ اس میں تغیر تو ہے۔ ان کی حالت

ایک تماشائی کی سی ہے۔ جس پر تپتی ہے اور جو اپنے اصولوں کی خاطر سب کچھ کھیتا ہے

اور خوشی خوشی ہر طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہے اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہے۔ جو کس کے کلام کو پڑھ کر لطف و سرور تو ہوتا ہے لیکن اس میں بلندی فکر اور تاثیر نہیں (ادبی تبصرہ)

(ص ۸۸)

مواد کو گھنگالنے کے بعد وہ زبان و بیان کو بھی پرکھتے ہیں۔ نئی بات کو سراہتے ہیں اور روایتی اور رسمی باتوں سے سرسری گزر جاتے ہیں۔ نئے مصنفین کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں اور معیاری تفضیلات کا احترام بھی۔ ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا سب سے روشن باب ان کے مقدمات اور ردون کتابیں ہیں۔ ان مقدمات سے ان کے وسعت علم، تحقیقی نظر، تنقیدی بصیرت اور علمی انداز بیان کی روشنی پھوٹی اور انھیں میں سے بعض میں تحقیقی غلطی کی نشاندہی بھی کی گئی۔ کچھ لوگوں نے بحیثیت محقق ان کے قد کو گھٹا کر اپنا قد بڑھانے کی بھی کوشش کی۔ غلطیاں بے شک ہیں مگر یہ بھی تو غور کرنے کی چیز ہے کہ کتنے مخطوطات، گم نامی کے تہ خانوں میں دفن اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے کہ مولوی صاحب کا دست علم پر ورگے بڑھا۔ انھیں تلاش کیا۔ ان کے گرد و غبار کو صاف کیا اور پھر مرتب کر کے اہل علم کے سامنے ان کو پیش کیا دوسری بات یہ کہ متعدد مقدمے ایسے ہیں جن میں بیان کیے ہوئے ان کے نکات ہی کو آج تک لوگ دہراتے آ رہے ہیں۔ مثلاً انتخاب کلام میر، باغ و بہار، قطب مشتری وغیرہ کے مقدمے۔ ہاں کچھ ایسے ضرور ہیں جن میں کچھ نئی باتوں کا علم ہوا ہے۔ مثلاً معراج العاشقین اور سب رس کے سلسلے میں۔ تیسرے یہ کہ اپنے دور کی معلومات کے مطابق اور تحقیق کے جتنے وسائل ان کو مہیا تھے ان کے پیش نظر ان کے مقدمے بے شک تحقیق کے اچھے نمونے ہیں۔ چوتھی چیز یہ کہ تحقیق و تدوین کے جو اصول آج سامنے آئے ہیں وہ مولوی صاحب کے سامنے اس وقت نہ تھے اور اس لیے بھی کہ تحقیق میں کوئی چیز حتمی نہیں ہوتی کسی وقت اگر اور چیز کا علم ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پہلے کے کیے ہوئے کام کی اہمیت ہی زری۔ او بڑا کھا بڑا میدانوں اور گھنے جنگوں میں جو لوگ پہلے راستہ نکالتے ہیں ان کا کام زیادہ اہم اور وقت طلب ہوتا ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جو انھیں راستوں کو مزید ہموار اور صاف کر کے آسان سفر کے قابل بنا دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ شعر العجم کی اپنی اہمیت ہے وہ تنقید شعرا العجم سے کم نہیں ہوتی۔ یہ نہیں کہ مولوی صاحب تحقیق کو محض بیان آخر سمجھتے تھے اور اس کی حقیقت سے واقف نہیں تھے انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ”ادبی اور عالمی معاملات میں ایسی تحقیق جو خطا و سہو سے بھی بری ہے نادر و نادر ہی ہوتی ہے“ ان کا کہنا تھا کہ ”غلطی، تحقیق و جستجو کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ ادب کا کامل ذوق سلیم ہر

ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے نقاد اور مبصر فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کے کام پر حرج نہیں آتا۔ غلطی ترقی کے مانع نہیں ہے بلکہ وہ صحت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو راستہ بھٹکنے سے بچا دیتی ہے، (مقدمات دوم ص ۲۰۹)

اب اس کے دوسرے پہلو پر غور کیجیے کہ اردو میں اتنے مختلف اور تنوع موضوعات پر اتنی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ ایسے علمی مقدمے اور اتنی تعداد میں یعنی ۵۵ مقدمے جو کم و بیش ایک ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں کسی ایک شخص نے نہیں لکھے۔ شاید ہی دوسری زبانوں میں اس کی کوئی مثال ہو۔ دوسرے یہ کہ مقدمہ نگاری، کے فن میں اولیت انہی کو حاصل ہے اگر حالی کے اپنے مجموعہ کلام کے مشہور مقدمے کو جو مقدمے سے زیادہ کتاب بن گیا ہے شمار نہ کیا جائے تو۔ اس سے پہلے تقریظوں کا رواج ضرور تھا جو ایک طرح کی مداحی ہی ہوتی تھیں۔ عالمانہ تنقیدی بصیرت شاذ ہی ملتی تھی تیسرے یہ کہ بیشتر مقدموں میں خصوصاً کلاسیکی ادبی کتابوں پر جو مقدمے لکھے گئے ان میں تحقیق و تدقیق کا رنگ غالب تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب مولانا شبلی نے لطف کا تذکرہ لکھنا ہند، مرتب کیا تو مولوی صاحب نے اس پر مقدمہ لکھا اور بقول ڈاکٹر گیان چند جین یہ ”اردو کا پہلا جدید تحقیقی مضمون تھا۔ تیسرے یہ کہ مولوی چراغ علی کی تصانیف اعظم الکلام فی ارتقار الاسلام اور تحقیق الجہاد اور ڈاکٹر ڈیرپہر کی مولانا ظفر علی خاں کی ترجمہ کی ہوئی کتاب ”معرکہ مذہب و سامنس“ پر جتنے بھرپور طریقے سے اور ایک عالمانہ شان سے جس طرح مولوی صاحب نے مقدمے لکھے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علم کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جاتا ہے۔ جس جس طرح کے نکات پیدا ہوتے ہیں اس سے ان کی علمیت اور ذہانت کے امتزاج کا ایک خوب صورت نمونہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے چوتھے یہ کہ مولوی صاحب اکثر و بیشتر کتاب کے مصنف یا مولف کا تعارف، اس کے حالات کا بیان اور اس کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ قاری اس سے اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے اور پھر اس کے کارنامے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ اگر کوئی خاص موضوع ہے تو اس موضوع کے مآلہ و ماعلیہ کی ایسی دلچسپ وضاحت کرتے ہیں کہ وہ تصنیف سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ کلاسیکی ادبی کتاب کے سانی پہلو پر بحث بھی ضرور ہوتی ہے اور بڑی معلومات افزا ہوتی ہے۔

اس مضمون ہندوستان میں اردو تحقیق، مشورہ کھوج، اردو ڈاکٹر گیان چند جین ایجوکیشنل پبلیک ہاؤس دہلی، طبع اول

وہ مختلف مقدموں میں ضرورت کے تحت تاریخی اور جغرافیائی حالات بھی بیان کر دیتے ہیں مثلاً مخزن شعرا کے مقدمے میں نوٹہ گجرات کا، گلشن ہند کے مقدمے میں گلکرسٹ اور فورٹ ولیم کالج کے اردو عالموں کا اور اپنے وقت کی تحقیقات کی روشنی میں ایسا تحقیقی نکتہ بیان کر جاتے ہیں جو تحقیق ہی کے نہیں ذہن کے بھی دریچے کھول دیتا ہے۔ مثلاً تذکرہ ہندی کے مقدمے میں کہتے ہیں کہ دو ایک بات اور قابل لحاظ ان تذکروں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں تک تحقیق ہو رہی ہے اردو شعرا میں مصحفی پہلے شخص میں جنہوں نے اردو کا لفظ زبان کے مضمون میں استعمال کیا ہے۔ لیکن زبان اردو کے معنی کا لفظ سب سے پہلے میر صاحب نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں لکھا ہے "اے اور پھر یہ صورت بھی ہے کہ وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہیں کہ تذکرہ و تحقیق کا حق ادا ہو جائے۔ گل عجائب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "کتب خانہ آصفیہ کا نسخہ جس سے یہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے۔ اکثر جگہ سے بوسیدہ اور مسخ و مجروح ہے۔ اس لیے اس کی ترتیب میں بہت دقت اٹھانی پڑی۔ اس کے بعض حصوں کا کاتب بہت غلط نویس ہے۔ اکثر املا کی غلطیاں موجود ہیں اور اشعار غلط نویسی کی وجہ سے وزن و بحر سے خارج ہو گئے ہیں۔ ان کو دوسرے تذکروں اور دیوانوں کے سیاق و سباق سے درست کرنا پڑا۔ بعض اشعار بالکل مہمل ہو گئے تھے مجبوراً خارج کرنے پڑے ۲۷

اس طرح ان کے مقدمے اور تذکرہ میں بھی جہاں موضوعات کے تنوع، اگرائی، تحقیق و تنقید، علم و فن اور ان کی ذہانت کے اعلاں ہو رہے ہیں وہیں اردو سے ان کے وابہانہ جذب و شوق کے بھی قہماز ہیں۔ انہوں نے جو بھی لکھا اور جتنا بھی لکھا اس کی محبت، اس کو بلند سے بلند تر کرنے کے جذبے سے لکھا۔ ایک ایسے شخص کو جس نے جہاں بھی قدم رکھا نقوش پاکر روشن تر کر دیا کس طرح اور کجاں کہاں خراج عقیدت پیش کیا جائے۔ اس کی زندگی کی داستان اردو کی داستان ہے اس میں اردو اتنی رچ بس گئی تھی کہ عبدالحق کے معنی اردو کے ہو گئے۔ وہ اردو کے مرادف ٹھہر گیا۔ وہ اردو کا استعارہ بن گیا۔ وہ سرسید احمد خاں کا شاگرد تھا۔ شاید فرید شاگرد نے ذہین استاد کے اردو سے متعلق خواب کو پڑھ لیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی تعبیر بن کر ابھرا۔ رشید احمد صدیقی نے غلط نہیں کہا ہے کہ "اردو کے بارے میں سرسید نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر مولوی صادق کی خدمات میں ملتی ہے ۲۸

۲۷ مقدمہ عبدالحق، مرتبہ فی اکثر عبادت برہنوی، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۴ء ص ۱۰۵

۲۸ ص ۱۱۳

۲۹ گنج ہائے گزائے، ص ۶۷۷



## مقدمات عبدالحق اور ان کی تنقیدی اہمیت

مولوی عبدالحق کے مقدمات سے پہلے، ہم نے زبان و دب کے توسط سے صرف دو مقدموں کے نام سنے تھے، ایک مقدمہ ابن خلدون، دوسرے مقدمہ شعر و شاعری۔ یہ دونوں مقدمے عرف عام میں مقدمے نہیں، مستقل تصنیف سمجھے گئے ہیں۔ بلکہ ان کی اہمیت اصل تصانیف سے بھی بڑھ کر ہو گئی ہے۔ ایسا ہونا زیادہ حیرت انگیزیوں نہیں ہے کہ ان مقدمات کا تعلق صاحب تصنیف ہی سے ہے یعنی یہ ایسے مقدمے ہیں جو مصنفین نے اپنی ذاتی تصانیف کے لیے قلم بند کیے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مقدمہ نگار کے ذہن میں ہر بات پوری طرح واضح رہتی ہے۔ موضوع کی اہمیت و وسعت اس کے نکات و رموز اور تصنیف و ترتیب کے دوسرے مسائل و مباحث غرض کہ کتاب کا ہر پہلو اس کے سامنے روشن ہوتا ہے؛ اس روشنی میں وہ اپنے مقدمے کی تنقیحات قائم کرتا ہے۔ ایک ایک کر کے انھیں علم و فکر کی میزان پر تولتا ہے۔ ان پر جرح و بحث کا سلسلہ پھیلتا ہے اور اپنی تصنیف کے مقصد و غایت اور اصول و ضوابط کا ایک کارآمد دستاویز یادگار چھوڑ جاتا ہے لیکن اگر کسی شخص کو اپنی تصنیف کے بجائے کسی دوسرے کی تصنیف پر کوئی مقدمہ لکھنا ہو تو یہ کام اتنا آسان نہیں رہ جاتا۔ خصوصاً ہمارے معاشرے میں جہاں ”خطائے بزرگانِ گرفتار خطا است“ کو اخلاق کا معیار سمجھا جاتا ہے اور دروغ مصلحت آمیز کو راست گوئی پر ترجیح دی جاتی ہے وہاں دیانت کے ساتھ مقدمہ نگاری بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ اردو میں ان مقدمات کا نام آپ تعارف رکھ لیں یا پیش لفظ اور تقریظ کا نام دیں۔ اپنی ہیج اور فرض و غایت کے لحاظ سے سب ایک سے ہوتے ہیں۔ ان پر آمد سے زیادہ آورد کا غلبہ ہوتا ہے اور عام طور پر مقدمہ کہہ اٹھتا ہے کہ

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

یوں سمجھ لیجیے کہ یہ مقدمات، باعموم نثر میں مصنف کا قصیدہ ہوتے ہیں جہاں معاملہ اس کے برعکس ہو گا وہاں اول تو مقدمہ کو کتاب میں جگہ ہی نہیں دی جائے گی اور اگر بادل ناخواستہ اسے کتاب میں شامل ہی کرنا پڑا تو کتاب کا مصنف ایمان کے تیسرے درجے پر اترا آئے گا یعنی کچھ اور نہ کر سکا تو دل ہی دل میں مقدمہ نگار کو عمر بھر برا سمجھتا رہے گا۔ یہ باتیں کچھ آن کل کے لیے مخصوص نہیں ہیں، اخلاقی قدروں کے احترام کے پر دے میں مقدمہ نگاری کی یہ رسم ہمارے یہاں ایک مدت سے چلی آرہی ہے یہ بھی نہیں کہ اس قسم کی باتوں کا تعلق محض ہاشما سے رہا ہو۔ دیکھئے میں یہ آیا ہے کہ بڑے بڑے آزاد خیال بزرگ تک مقدمہ نگار کے دیانت دارانہ اظہار خیال کو برداشت نہیں کر سکے۔ اس کی اس جگہ صرف ایک مثال کافی ہے۔

آپ کے علم میں ہے کہ گزشتہ صدی کے سب سے بڑے آزاد خیال ادیب سرسید احمد خاں نے ابو الفضل کی تصنیف ”آئین اکبری“ کو نئے ڈھب سے مرتب کیا تھا۔ دہلی کے کئی بزرگ اہل قلم نے اس کی تقریظیں لکھی تھیں۔ چنانچہ مرزا غالب نے بھی اس کی ایک منظوم تقریظ لکھی اور سرسید کی خواہش پر لکھی۔ لیکن غضب یہ ہوا کہ غالب نے تعریف کرتے کرتے اس میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی اس طور پر کر دیا کہ۔

مردہ پروردن مہلک کار نیست

خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

اس کا جو نتیجہ نکلا وہ سب کہ معلوم ہے۔ یہی نہیں کہ سرسید احمد نے اس تقریظ کو کتاب میں شامل نہیں کیا۔ بلکہ وہی سرسید جن کے بارے میں مرزا غالب نے اتنا اوصاف و ثناء کی تقریظ میں یہ دعا کیا تھا کہ ان میں اور مجھ میں رسمی دوستی نہیں تعلق خاطر ہے اور وہی سرسید جنہوں نے خود غالب کے بارے میں لکھا تھا کہ

”راقم آشکم کو اعتقاد ان کی خدیت میں ہے اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے نہ احاطہ

تقریر میں آسکتا ہے۔“

مرزا سے عمر بھر بدظن رہے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر آخر دونوں کے دل صاف ہو گئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ لیکن اس سے اتنی بات تو ثابت ہے کہ ہمارے یہاں مدح سرائی کے سوا غالباً مقدمہ نگاری کا کوئی اور معیار پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ اس لیے محتاط اور دیانت دار لکھنے والے اول تو کچھ لکھنے ہی سے دور بھاگتے تھے اور اگر کچھ لکھنا ہی پڑ جائے تو اصل موضوع کو ہاتھ لگانے کے بجائے ادھر ادھر کی

باتوں سے چند صفحے کالے کر دیا کرتے تھے۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں مرزا کے بارے میں لکھا ہے کہ ”تقریظ نگاری کا انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہ ہو صاحب کتاب خوش بھی ہو جائے بہت سا حصہ تمہید یا مصنف کی ذات، وراثت کے اخلاق یا اس کی محبت اور دوستی کے بیان میں یا اور لطیف یا پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو بے محل ہوں ختم ہو جاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہ ہوتے تھے اور مصنف کو خوش کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے لکھ دیتے تھے۔“

ان حالات میں اگر مقدمہ نگاری کی کوئی معیاری صورت یا روایت اردو میں نظر آئے تو ہیں چنداں تعجب نہ کرنا چاہئے۔ دنیا کا ہر کلام اپنے تکملے کے لیے کسی مناسب اور اہل شخص کے انتظار میں رہتا ہے۔ اردو مقدمہ نگاری بھی ایک مدت تک اس انتظار میں رہی ہے آخر کار مولوی عبدالحق کے روپ میں۔ ”مردے از غیب برون آمد و کارے بکرد۔“

مولوی عبدالحق پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو مقدمہ نگاری کو ایک بلند معیار ایک دلکش اسلوب اور ایک آبرو مند مقام عطا کیا۔ ان سے پہلے اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت بڑی بے جان رسمی اور پست تھی۔ مولوی صاحب نے اس کے مردہ جسم میں تازہ روح و طرائق اس کی رسمی حیثیت کو ختم کر کے اسے مستقل فن کی حیثیت دی اور اسے پتی سے نکال کر بلندی پر فائز کیا۔ حتیٰ کہ مقدمہ نگاری کا فن تقریظ و پیش لفظ سے بہت آگے بڑھ کر گراں قدر تحقیق و تنقید کا مظہر بن گیا۔

یہ ماننا کہ اردو کے حق میں مولوی صاحب کی دین یک گونا نہیں گونا گوں ہے انھوں نے اردو قواعد و لغت اور خاکہ نویسی سب کو نئی راہیں دکھائی ہیں سب کی منزلوں کا تعین کیا ہے۔ تبصرہ نگاری کا فن بھی ان کی رہنمائی میں آگے بڑھا ہے اور اردو کے خطباتی ادب کی سطح کو بھی انھوں نے بلند کیا ہے۔ بایں ہمہ میری ناقص رائے میں مولوی صاحب کے حقیقی ادبی منصب و قد و قامت کا تشخص ان کے مقدمات کرتے ہیں۔ مقدمات ہی کی بدولت مولوی صاحب اردو کے ایک بلند پایہ نقاد اور محقق سمجھے جاتے ہیں اور مقدمات کی روشنی میں ان کی ادبی شخصیت قد آور اور عظیم نظر آتی ہے ان کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں

کے نقوش و آثار ان کی دوسری تحریروں میں بھی ملتے ہیں لیکن ان صلاحیتوں کا جیسا خوب صورت اور بھرپور اظہار مقدمات میں ہوا ہے کسی اور جگہ نہیں ہوا۔

مولوی صاحب کے مقدمات پہلے پہل دو جلدوں میں مرزا محمد ریگ نے حیدرآباد دکن سے شایع کیے تھے۔ پھر انھیں ایک ہی جلد میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے یکجا مرتب کیا اور اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شایع کیا۔ اس جلد میں ایک کم ساٹھ مقدمے شامل ہیں۔ ان پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا دائرہ بلحاظ موضوعات کس قدر وسیع اور متنوع ہے۔ تذکرے منتخبات۔ مسدس۔ شعری مجموعے۔ مذہبی رسائل۔ داستانیں۔ مکتوبات۔ سوانحی خاکے۔ تاریخی کتب و تراجم۔ اصطلاحات علمیہ۔ لغات و قولہ۔ مجموعہ مقالات، آپ بیتیاں۔ خطبات اور تحقیقی و تنقیدی مضامین غرض یہ کہ ہر صنف سخن اور موضوع کی کتابوں پر مولوی صاحب نے مقدمے لکھے ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مولوی صاحب سرسری گزر گئے ہیں یا کتب کو پوری طرح پڑھے بغیر خانہ پری کے لیے مقدمے لکھے ہیں۔ ہر کتاب اور کتاب کے موضوع سے ان کی ذاتی واقفیت اور رگڑ کا پتہ چلتا ہے۔ مقدمے کیا ہیں مولوی صاحب کے تبحر علمی۔ وسعت نظر۔ ذہنی رسائی، تصنیفی شغف، تحقیقی دسترس اور تنقیدی صلاحیتوں کا آئینہ ہیں۔ پڑھنے والے کو ہر طرح یقین ہو جاتا ہے کہ مقدمہ نگار جو کچھ لکھ رہا ہے پوری قلمی دیانت اور کامل احساس ذمہ داری کے ساتھ لکھ رہا ہے۔

مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا ایک خاص ڈھب ہے۔ یہی ڈھب اب اردو میں مقدمہ نگاری کا معیار کہلاتا ہے۔ مولوی صاحب کے ادبی مقدمات، عام طور پر تین خاص منزلوں سے گزرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ کتاب کے مصنف کا بھرپور تعارف کراتے ہیں اس کی علمی قابلیت، سیرت، تعلیم و تربیت، انداز فکر، تصنیفی شغف اور تحقیقی و تنقیدی صلاحیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہمیں کتاب کے موضوع سے روشناس کراتے ہیں یہ روشناسی کچھ اتنی مفصل اور جامع ہوتی ہے کہ قاری اگر کتاب کے اصل موضوع سے چنداں واقف نہ ہو تو بھی مقدمے کے مطالعہ کے بعد وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ کتاب سے استفادہ کر سکے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اصل کتاب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ یہ مقدمے کی تیسری



اور آخری منزل ہوتی ہے۔ اس میں وہ کتاب کے سارے پہلوؤں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔ اور اردو زبان و ادب میں اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ یہ سارا کام مولوی صاحب عجیب سادگی و پرکاری اور مدلل دل نشینی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ جگر نے کہا تھا۔

مجھے تو کر دیا سیراب ساقی نے مرے لیکن

مری سیرابیوں کی تشنہ سامانی نہیں جاتی

ذہن میں کچھ اسی طرح کی کیفیت مقدمات عبدالحق کے مطالعے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ نے کسی کتاب کے سلسلے میں مولوی صاحب کا مقدمہ پڑھ لیا ہے تو پھر مطالعے کا یہ نشہ آسانی سے نہ اترے گا۔ خمار سا طاری رہے گا۔ آپ اپنے آپ کو اصل کتاب پڑھنے پر مجبور پائیں گے۔ بات یہ ہے کہ ان کا مقدمہ موضوع کی حد تک آپ کو سیراب کرے گا۔ لیکن اس درجہ نہیں کہ آپ کتاب کے مطالعہ سے غافل ہو جائیں۔ مولوی صاحب خوب جانتے ہیں کہ مقدمہ کتاب کا اصل مقصود نہیں ہے بلکہ قاری کو کتاب اور اس کے نفس مضمون تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔ اس وسیلے کو مولوی صاحب وسیلہ ہی رہنے دیتے ہیں نتیجتاً ان کے مقدمات کے مطالعہ کے بعد ہم میں اصل کتاب کے مطالعہ کا ذوق و شوق کم نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو فنی و معنوی اعتبار سے مقدمہ نگاری کا حقیقی منصب و مقصد بھی یہی ہے۔ اس منصب و مقصد کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ مولوی صاحب نے پورا کیا ہے ابھی تک اردو میں اس کا جواب نہیں بن سکا۔

جیسا کہ ابھی میں نے کہا ہے کہ مولوی عبدالحق کے ادبی سرمائے کا سب سے اہم اور قابل قدر حصہ ان کے مقدمات ہیں۔ ہر چند کہ یہ مقدمات کسی خاص کتاب اور اس کے مصنف کی علمی و ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان مقدمات کا اس سے بھی اہم تر پہلو یہ ہے کہ خود مولوی صاحب کے ادبی کاموں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں جو مدد ان مقدمات سے ملتی ہے وہ ان کی کسی اور تحریر سے نہیں ملتی۔ اردو میں ایک بلند پایہ محقق اور نقاد کا منصب مولوی صاحب کو ان کے مقدمات ہی کی بدولت ملا ہے اور مقدمات ہی نے انھیں اردو تحقیق و تنقید کی تاریخ میں زندہ جاوید بنایا ہے۔ اردو میں ادبی تحقیق کا اعلیٰ معیار بھی اول اول مولوی صاحب کے مقدمات سے نمودار ہوا ہے ان کے مقدمات سے ملنے والی بار بار اس بات کا اظہار ہوا کہ بے مصرف کوہ کئی یا خواہ مخواہ بال کی

کھال نکالنے کا نام تحقیق نہیں ہے۔ تحقیق کا اصل کام اہم حقائق کی نشان دہی اور ادب و ادیب کی رہنمائی ہے۔ اس رہنمائی کا ادبی ذوق و شعور اور تنقیدی شعور سے گہرا رشتہ ہے۔ اگر اس رشتے سے محقق بے نیاز ہو جائے تو پھر اس کی تحریریں ادب نہیں رہتیں۔ میونسپلٹی کے شعبہ وفات و پیدائش کا رجسٹر بن جاتی ہیں۔ ان سے وفات و پیدائش کی صحیح تاریخیں تو معلوم ہو جاتی ہیں لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ موت و پیدائش کے درمیان کا فاصلہ کس نوعیت کا تھا اور مرنے والے نے اسے کس طرح طے کیا تھا۔ ادبی ذوق اور تنقیدی شعور سے بیگانہ تحقیق کی نوعیت عام طور پر یہی ہوتی ہے۔ اس قسم کی بے جان اور بے مصرف تحقیق سے مولوی صاحب کی طبیعت ہمیشہ پاکرتی رہی ہے۔ وہ ادبی تحقیق میں انتخابی نظر کے قائل رہے ہیں۔ انھوں نے اہم اور غیر اہم میں ہمیشہ فرق کیا ہے اور کسی شخص یا موضوع کی ادبی اہمیت ہی کے پیش نظر اس پر قلم اٹھایا ہے۔ اس لیے مولوی صاحب کی تحقیقی تحریریں، واقعات کی بے روح کھنڈی نہیں ہیں بلکہ ادبی ذوق کو نکھارنے اور تنقیدی صلاحیتوں کو آگہی کے ساتھ بروئے کار لانے کا ذریعہ بن گئی ہیں۔

مولوی صاحب کے یہاں اعلیٰ درجے کا تحقیقی مواد و معیار زیادہ تر ان مقدمات میں نظر آتا ہے جو اردو شعر کے قدیم تذکروں اور بعض قدیم ترین تصانیف کے لیے لکھے گئے ہیں۔ میری مراد نکات اشعار تذکرہ ریختہ گویان، مخزن نکات، مخزن شعراء، قطب مشرق، گلشن عشق، دیوان اثر، انتخاب میر، معراج العاشقین، سب رس، باغ و بہار اور اس طرح کی بعض دوسری تصنیفات کے مقدمات سے ہے، یہ مقدمات مولوی صاحب کی وسعت مطالعہ و ذوق نظر اور تحقیقی باغ نظری ہی کا مظہر نہیں ہیں بلکہ وہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ادب کے ایک محقق کو اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو کس قسم کے موضوع اور کس نوع کی تصانیف پر صرف کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی وہ اپنے انداز تحریر سے تحقیقی صلاحیتوں کے صرف کا وہ طریقہ کار بھی سمجھاتے ہیں جو حقائق تک پہنچنے کے لیے واقعات و حالات کے سارے پہلوؤں کی چھان بین تو کرتا ہے لیکن اس چھان بین میں ادب اور ادیب کا خون نہیں ہونے دیتا۔

مقدمات عبدالحق کے تنقیدی اجزاء کی نوعیت بھی دوسروں سے بہت مختلف ہے۔ مولوی صاحب کے مقدمات میں تحقیق و تنقید دو الگ چیزیں نہیں رہیں بلکہ ادب کے رشتے سے دونوں ایک ہو گئی ہیں وہ اس قسم کے نقاد یا مقدمہ نگار نہیں جو واقعات و حالات سے بے خبر رہ کر صرف نظری مسائل کے سہارے کسی تصنیف یا مصنف کے بارے میں اچھے برے ہونے کا حکم لگاتے رہتے ہیں۔ اور

بزرگم خود بھی سمجھتے ہیں کہ تنقید کا حق ادا ہو گیا۔ مولوی صاحب کا تنقیدی مسلک اس سے بہت مختلف ہے ان کے یہاں تنقید نام ہے شعور آگہی کو ادب کے سلسلے میں بروئے کار لانے کا اور اس کے ذریعہ زندگی کی کوکھ سے پیدا شدہ ادب کو سنوارنے بنانے اور آگے بڑھانے کا۔ چنانچہ ان کے مقدمات میں تحقیق و تنقید کے عناصر ایک دوسرے میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ آپ انھیں ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ تحقیق و تنقید دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں اور حسب ضرورت کہیں تحقیقی مواد سے اپنی تنقید کو اور کہیں تنقیدی شعور کی مدد سے اپنی تحقیق کو جاندار بناتے ہیں۔

کسی تصنیف پر قلم اٹھاتے وقت تصنیف کے موضوع و مواد کے علاوہ صاحب تصنیف کا خارجی ماحول اس کی سیرت، ذہنی محرکات، سماجی عوامل، ماحول کی تبدیلیوں کے اثرات داخلی کیفیات اور نفسیاتی پیچیدگیاں سبھی چیزیں مولوی صاحب کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ لیکن وہ انھیں الگ الگ کر کے نہیں ایک دوسرے سے منسلک کر کے دیکھتے ہیں ان کی تنقید میں ادب کے سارے حیات اور نظریات اور مذاکبات فکر کا احترام نظر آتا ہے۔ زندگی کی ساری مثبت قدروں کی ترجمانی ملتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ ان کی تنقید کو کسی خاص قسم کے خانے میں رکھ دیں تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ وہ خود کو نقاد کہلوانے کے لیے کسی خاص نظریے کے محتاج نہیں ہیں۔ اردو میں کوئی تاثراتی نقاد ہے۔ کوئی جمالیاتی، کوئی وجدانی نقاد ہے، کوئی تاریخی، کوئی سائنٹفک نقاد ہے کوئی مارکسی، مولوی صاحب ان میں سے کسی خاص قسم کے نقاد نہیں ہیں۔ ان کی تنقید نگاری کا مقام ان سب سے الگ ہے وہ ادب کے نقاد ہیں اور سارے نظریات و افکار کو ادب کا خام مواد سمجھ کر ادب ہی کے توسط سے اسے جانچتے پرکھتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مولوی صاحب تنقیدی مسلکوں اور ان کے نظریات افکار سے واقف نہیں۔ وہ خوب واقف ہیں اور ایک ایک بات ان کے ذہن میں واضح ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ادبی مباحث میں نظریات کی لمبی چوڑی خشک بحثیں چھیڑ کر ادب کو گور کھدھنڈا بنانا پسند نہیں کیا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ادب و تنقید کے نظری مسائل پر انھوں نے مضامین کی شکل میں الگ سے کچھ نہیں لکھا پھر بھی اگر آپ ان کے مقدمات کو غور سے دیکھیں تو ادب اور ادبی نظریات کی جملہ اقسام و اصناف کے بارے میں نہایت واضح اور چچی علمی رائیں مل جائیں گی۔ مثلاً تنقید کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے الگ سے کوئی مقالہ قلم بند نہیں کیا۔ لیکن ان کی تحریروں میں درجنوں ٹکڑے ایسے



مل جاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب کا ذہن تنقید کے باب میں بالکل واضح ہے اس سلسلے میں صرف ایک مقدمے کی چند سطریں دیکھئے۔ لکھتے ہیں کہ

”افلاطون کے وقت سے لے کر اب تک تنقید کے بیسویں مسلک وجود میں آچکے ہیں مثلاً جمالیاتی، وجدانی، تاریخی، حولی، تاثراتی نفسیاتی وغیرہ اور اس زمانے میں قرائد اور مارکس کے نظریوں نے بھی تنقید کو متاثر کیا ہے اور جیسے جیسے حالات بدلتے رہیں گے ادب اور تنقید پر نئے نظریوں اور سائنس کے اکتشافات کا بھی اثر پڑتا رہے گا۔ اقتاد جمع ماحول تعلیم و تربیت و صحبت کی بنا پر انسان کا رجحان ایک خاص جانب ہو جاتا ہے اور جب اس میں غلو ہوتا ہے تو وہی مسلک یا مذہب بن جاتا ہے۔ اس لیے تنقید کا کوئی مسلک جامع نہیں۔ ایسے نقاد اپنے رجحان یا ذوق کے زیر اثر ایک طرف جھک جاتے ہیں اور دوسرے رخ پر یا تو سرسری نظر ڈالتے ہیں یا بالکل نظر انداز کر دیتے ہوں۔ صحیح تنقید اسی وقت ہونی چاہیے جب ادب کے ہر رخ کو دیکھا اور جانچا جائے گا۔ اگر ایک گروہ دوسرے کو الہامی، ماورائی، روحانی جذباتی کہتا ہے اور اسے ماضی پرستی یا روایت پرستی کا ملزم قرار دیتا ہے اور اس کی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتا تو دوسرا گروہ جو قرائد اور مارکس پرستی میں مادیت پرستانہ اور دیتا ہے کہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی تنقید بھی ادبی تنقید نہیں رہتی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ بے شک ادب کا کام صرف ذوق اور وجدان کی تسکین کا سامان پیش کرنا نہیں لیکن اس کا کام محض مادیت کا پرچار بھی نہیں۔ یہ دونوں کا خادم ہے۔“

مولوی صاحب کے یہاں اس قسم کی واضح رائیں تنقید ہی کے سلسلے میں نہیں ہر صنف ادب اور ہر مکتبہ فکر کے بارے میں مل جاتی ہیں۔ مکتوب نگاری کے فن اور اس کی خصوصیات کے بارے میں ہمارے یہاں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آپ نے بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ مولوی صاحب نے الگ سے اس موضوع پر بھی کچھ نہیں لکھا لیکن مکتوبات حالی اور خطوط عطیہ بیگم کے مقدمات میں انہوں نے جو کچھ ضمت لکھ دیا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے اور بہت سے مقامات پر بھاری ہے اسی طرح آپ بیٹی یا خود نوشت کی دل کشی اور قادیت کے بارے میں بھی آپ نے بہت کچھ سنا اور پڑھا ہوگا۔ لیکن ذرا مولوی صاحب کے چند فقرے دیکھئے لکھتے



آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ ہلکے بیتی (تاریخ) میں کہاں۔ مورخ ہزار بے لاگ ہو، اور تحقیق و تلاش میں سر مارے۔ آپ بیتی لکھنے والے کو نہیں پہنچ سکتا۔ بعض اوقات اس کے بے ساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں جو مدتوں تاریخوں کی ورق گردانی کے بغیر میسر نہیں ہوتے۔ اگر ہر شخص جس نے دنیا دیکھی بھالی ہے، اور کچھ کہا بھی ہے اپنی آپ بیتی لکھے یا کرے تو ادب کے خزانے میں یہ جواہرات انمول ہیں۔

یہ سطر میں مقدمہ ذکر میر سے ماخوذ ہیں اور آپ بیتی کی اہمیت کے ذکر میں مختصر ترین سہی لیکن جامع رائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس طرح کئی اور نہ جانے کتنی رائیں جن کا تعلق ادب کے نظری مسائل سے ہے مقدمات میں بکھری پڑی ہیں۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ مولوی صاحب تنقید کے دستاویز اور ان کے نظری مباحث سے واقف نہیں درست نہ ہوگا۔ صرف یہ کہ وہ تنقید کو مختلف خانوں میں بانٹنے اور کسی خاص خانے سے انتہا پسندانہ رنگاویج کو تنقید نہیں سمجھتے۔ وہ تنقید کے سارے نظریوں اور دستاویزوں کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ادبی تنقید ہر حال میں ادب اور ادبیت ہی کے دائرے میں رہے۔ نظریوں کی آڑ میں بے جان اور بے ریس غیر ادبی تحریر کا نمونہ نہ بن جائے۔ شاید اس لیے انھوں نے نظری اور عملی تنقید کی بحثیں بھی الگ الگ اپنی تحریروں میں کہیں نہیں چھیڑیں۔ ہاں عملی تنقید کے ایسے نمونے ضرور یادگار چھوڑے ہیں جن کی مدد سے تنقید کے بہت سے اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں اور جس کی مدد سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ادب اور ادبی تنقید میں نظریات کا دخل کس انداز سے اور کس سطح پر ہونا چاہیے، البتہ آپ کو یہ سب کچھ جاننے اور مولوی عبدالحق کی تحقیق پر روش تنقید سے واقفیت کے لیے ان کے مقدمات کا غائر مطالعہ کرنا ہوگا۔

## مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری

مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری کا آغاز زمانہ طالب علمی میں ہوا۔ ان کا پہلا تبصرہ ”ریویو بریڈیہ ناظر“ کے عنوان سے یکم اگست ۱۸۹۳ء کے علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوا۔ ۱۸۹۳ء کے بعد بھی مولوی عبدالحق نے کئی معرکتہ الآراء تحریریں لکھیں لیکن وہ تبصرہ نگاری کی طرف بھرپور توجہ نہیں دے سکے۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں جب رسالہ ”اردو“ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا تو مولوی عبدالحق اس کے مدیر ہوئے۔ انھوں نے رسالہ ”اردو“ میں تبصرہ نگاری کا خاص اہتمام کیا، یہی وہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کا سنہرے دور شروع ہوتا ہے۔ رسالہ ”اردو“ میں ابتداء ہی سے تبصرے شامل کیے گئے۔ ابتدائی دو شماروں میں صرف انجمن کی مطبوعات پر تبصرے لکھے گئے لیکن جولائی ۱۹۲۱ء میں تیسرا شمارہ منظر عام پر آیا تو تبصرے کے لیے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا اور یہ پابندی بھی نہیں تھی کہ تبصرے صرف انجمن کی کتابوں پر ہوں۔

ابتداء میں رسالہ ”اردو“ میں سارے تبصرے مولوی عبدالحق ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن اکتوبر ۱۹۲۲ء سے مولوی صاحب کے اس کام میں دیگر حضرات کی معاونت بھی شامل نظر آتی ہے۔ البتہ چند ایک نام کے علاوہ مبصر کے نام کا مخفف نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ ”اردو“ میں سیکڑوں مختصر اور طویل تبصرے تحریر کیے۔ یہ تبصرے مختلف موضوعات کی کتب و رسائل پر ہیں مثلاً فلسفہ، نفسیات، طب، قواعد تاریخ ادب، مزاح، ناول اور شاعری وغیرہ۔

ان تبصروں سے مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی بصیرت اور تبصرہ نگاری سے دل چسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی یہ دل چسپی فطری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تبصروں کا ایک اپنا فلیور ہے۔ اسی فلیور نے علماء و فضلا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ اس توجہ کے باعث انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) نے ۱۹۳۹ء میں "چند تنقیدات عبدالحق" کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں مولوی عبدالحق کے دس (۱۰) تبصرے شامل کیے گئے اور یوں اردو ادب میں پہلی مرتبہ کسی کے تبصرے یکجا کر کے شائع کیے گئے۔ یہاں پر ان کتابوں کے نام دیے جاتے ہیں جن پر کیے گئے تبصرے اس کتاب میں شامل ہیں:

۱۔ سرگزشت الفاظ از مولوی احمد دینی۔

۲۔ مکاتیب امیر مینا کی مرتبہ احسن اللہ شاقب۔

۳۔ اردو زبان پر سرسری نظر از رشید احمد صدیقی۔

۴۔ اصلاح سخن مرتبہ محمد عبدالعلی شوق سندیلوی۔

۵۔ اردو شہ پائے از ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور۔

۶۔ آبر الہ آبادی از طالب الہ آبادی۔

۷۔ فیضان شوق، دیوان احمد علی شوق قدوائی مرتبہ شیخ رضی الدین احمد

۸۔ اردو لٹریچر از ڈاکٹر گرام بیلی۔

۹۔ نور اللغات، از نور الحسن نیر۔

۱۰۔ مجموعہ لغز از میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی۔

اس کتاب میں شامل تمام تبصرے رسالہ "اردو" میں شائع ہوئے۔ یہ کتاب ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۳ء

تک کیے گئے تبصروں کا انتخاب ہے۔

ان تبصروں کی افادیت کو مد نظر رکھتے ہوئے محمد ثراب علی خاں باز نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۲ء تک

کے تبصروں کا انتخاب "تنقیدات عبدالحق" کے نام سے طبع کر دیا۔ اس مجموعے میں تیس (۲۳) تبصرے

شامل کیے گئے جو کہ دس (۱۰) تبصرے وہی ہیں جو گزشتہ مجموعے میں تھے۔

ذیل میں ان کتب کی نشان دہی کی جاتی ہے جن پر کیے گئے تبصرے "تنقیدات عبدالحق" میں

شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شامل کتب کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے:

- ۱۔ رُوح تنقید از غلام محی الدین قادری زور۔
- ۲۔ جامع اللغات مرتبہ خواجہ عبدالحمید۔
- ۳۔ گنجینہ تحقیق از پروفیسر سید محمد احمد بے خود موہانی۔
- ۴۔ اربابِ شہادہ از سید محمد۔
- ۵۔ پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی۔
- ۶۔ دیوان ولی، از ولی مرتبہ حیدر ابراہیم سالیانی۔
- ۷۔ مکاتیب نواب محسن الملک مرتبہ محمد امین زبیری۔
- ۸۔ شرح دیوان غائب از مولوی عبدالباری آسی۔
- ۹۔ تذکرہ اعجازِ سخن مرتبہ شیر علی خاں سرخوش۔
- ۱۰۔ تلخیص عروض و قافیہ مرتبہ سید حیدر علی ملہاٹائی۔
- ۱۱۔ خطوط سر سید احمد خاں مرتبہ راس مسعود۔
- ۱۲۔ شعر الہند از مولوی عبدالسلام۔
- ۱۳۔ بانگِ درا از علامہ اقبال۔

مولوی عبدالحق کے تبصروں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۷ء میں دانش محل لکھنؤ سے بھی "ادبی تبصرے" کے نام سے ایک اور مجموعہ شائع ہوا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تینوں مجموعے مولوی صاحب کی زندگی میں شائع ہوئے اور مقبول ہوئے۔

اس مجموعے میں جو تبصرے شامل ہیں وہ گزشتہ دونوں مجموعوں میں نہیں ہیں۔ ذیل میں ادبی تبصرے کے مندرجات پیش کیے جاتے ہیں:

- ۱۔ رُوحِ ادب از شبیر حسن خاں جوش۔
- ۲۔ مرہٹی دناں کوش (مرہٹی انسائیکلو پیڈیا)۔
- ۳۔ رساکی عماد الملک مرتبہ مولوی سید حسن بگرامی۔
- ۴۔ رُوحِ سیاست مترجم محمد عمر نورانی۔



- ۵۔ حزن اختر از واجد علی شاہ -
- ۶۔ جواہراتِ عالی مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی -
- ۷۔ افاداتِ مہدی از محمد مہدی حسن افادی -
- ۸۔ انجامِ زندگی از ضیاء بانو -
- ۹۔ دیوانِ جان صاحب از جان صاحب -
- ۱۰۔ نائک ساگر مترجم محمد عمر و نور الہی -
- ۱۱۔ ہند، عہد اورنگ زیب میں از مرزا سمیع اللہ -
- ۱۲۔ مکتوباتِ عالی مرتبہ خواجہ سجاد حسین -
- ۱۳۔ الناظر کا انعامی مضمون -
- ۱۴۔ ماورا از ن۔ م۔ راشد -
- ۱۵۔ آیات و نغات از شبیر حسن خاں جوش -

گزشتہ مجموعوں کی طرح اس کے تبصرے بھی رسالہ ”اردو“ سے لیے گئے ہیں۔ اور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۲ء تک کے تبصروں سے ان کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان تینوں کتابوں کی قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان میں زیادہ تر تبصرے رسالہ ”اردو“ کی ابتدائی دہائی سے لیے گئے ہیں اور چند تبصرے ۴۲۔ ۱۹۴۱ء سے اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ جو تبصرے اس زمانے میں زیادہ پسند کیے گئے اور مشہور ہوئے انہیں شامل کر لیا گیا۔

## (۲)

مولوی عبدالحق کے تبصرے بہت سی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان میں لسانی مسائل، عملی تنقید، تحقیقی بحث، ملی و قومی مسائل، معاشرانہ چشمک اور مقدمہ نگاری کی خصوصیات وغیرہ ملتی ہیں۔ لیکن بہت سارے تبصرے ایسے ہیں جن میں خالص تبصرے کا مزاج ہے۔ یہی تبصرے ہر لحاظ سے اعلیٰ پائے کا نمونہ ہیں۔ ہماری ناچیز رائے میں جن کتابوں پر اعلیٰ پائے کے تبصرے کیے ان میں سے چند یہ ہیں مثلاً حافظ سید حب الحق عظیم آبادی کی کتاب ”شرعہ الحق“ (بابت اکتوبر دسمبر ۱۹۲۱ء) و دیوانِ حسرت ”از حسرت موہانی (بابت اکتوبر دسمبر ۱۹۲۴ء)، ماہ نامہ ”المعلم“ حیدرآباد دکن (بابت اکتوبر دسمبر ۱۹۲۴ء)۔

”جواہر منظم“ یعنی رباعیاب سرمد مترجم سید نواب علی صولت لکھنوی (جولائی - ستمبر ۱۹۲۲ء) رسالہ  
 ”نگار“ مدیر نیاز فتح پوری (بابت جولائی - ستمبر ۱۹۲۲ء) کلام عاصی از منشی گشتنام لال عاصی  
 (بابت جنوری - مارچ) اردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد (بابت جولائی - ستمبر ۱۹۲۲ء)  
 زبان اور علم زبان از عبدالقادر سروری (بابت جنوری - مارچ ۱۹۵۷ء) طرہ امیر از امیر احمد علوی  
 (بابت جنوری - مارچ ۱۹۲۹ء) وغیرہ۔

مولوی عبد الحق کے بہت سے تبصرے ایسے ہیں جن کو پیش لفظ قرار دینا چاہیے مثلاً سوانح  
 عمری از نواب مولوی تفضل حسین (بابت جولائی - ستمبر ۱۹۲۲ء) قزاق (ڈراما) از محمد عمر  
 (بابت اپریل ۱۹۲۳ء) کلیات اسماعیل مرتبہ محمد اسلم شیفی (بابت اپریل - جون ۱۹۲۳ء)  
 تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام از قاری محمد طیب (بابت اپریل - جون ۱۹۲۰ء) کلام رونق  
 از منشی پیارے لال (بابت اپریل - جون ۱۹۲۳ء) یادگار شعرا مترجم محمد طفیل (جولائی -  
 ستمبر ۱۹۲۳ء) مضامین رشید از رشید احمد صدیقی (بابت اپریل - جون ۱۹۳۸ء)  
 اعمال نامہ (سوانح) سید رضا علی (بابت جنوری - مارچ ۱۹۲۷ء) بہادر شاہ ظفر سوانح  
 از امیر احمد علوی (بابت اکتوبر - دسمبر ۱۹۲۵ء) داستان غدر از سید طہیر الدین ٹھیسر دہلوی  
 (اکتوبر - دسمبر ۱۹۵۷ء)

مولوی عبد الحق زبان اردو کے سب سے بڑے وکیل اور نمائندے تھے (اس  
 کی جھلک ان کے تبصروں میں بھی پائی جاتی ہے) انھوں نے ساری زندگی اردو کا مقدمہ  
 لڑا، اردو کی تبلیغ کی، اردو کی نشوونما کی، اردو کی ہی اشاعت کی، غرض وہ کون سا اردو  
 کا میدان ہے جہاں وہ نظر نہیں آتے۔ ان کی ساری زندگی کی تگ و دو، ان کے ادبی سیاسی  
 قومی اور ملی نظریات کی جھلک ان کے تبصروں میں بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً ”مرقع ہند“  
 جو ترجمہ ہے اس رپورٹ کا جسے حکومت ہند کے لیے پرنسپل سر دشن بروک  
 ولیم نے پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی غرض سے مرتب کیا تھا۔ مولوی صاحب اس  
 پر (جولائی - ستمبر ۱۹۲۱ء کے سہ ماہی ”اردو“ کے شمارے میں) تبصرہ کرتے ہوئے  
 کہتے ہیں:-

”تعلیم کے باب میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن اور اس کی رپورٹ کا مفصل ذکر کیا ہے اور ان اصلاحات پر بحث کی ہے جو کمیشن نے تجویز کی ہیں لیکن تعجب ہے کہ اس رپورٹ میں کمیشن کی اس خاص تجویز کا مطلق ذکر نہیں کیا جس کا قومی نقطہ نظر سے ملک کی تعلیم سے خاص تعلق ہے۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس پر زور دیا ہے کہ مدارس میں میٹریکولیشن تک جہاں تک ممکن ہو مضامین کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے دی جائے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر کیا جائے اور ان کی تعلیم تاریخی اور تنقیدی نظر سے ہو۔ ملک میں اس وقت جا بجا قومی مدارس کھل رہے ہیں، انہیں یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے اور جہاں تک جلد ممکن ہو اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ملک کی ایک زبان ہو جائے کیوں کہ ہم خیالی کا دار و مدار بہت کچھ ہم زبان پر ہے۔“

ہم زبان کے نعرے پر وہ شروع سے آخر وقت تک ڈٹے رہے اور اردو کی خدمت کے ہر انداز کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ”اردو کے ہندی ادیب“ از سید قاسم علی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”یہ کتاب مؤلف نے ہندی زبان اور ناگرمی رسم خط میں لکھی ہے یہ بھی اردو کی خدمت ہے۔“

اس کے علاوہ الفاظ کے استعمال سے متعلق ایک فارمولہ بھی دیتے ہیں جو اصلً انشا کی دریاے لطافت کا ہے۔ ”روح ادب“ از سید حیدر عباس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”جو الفاظ استعمال میں آگئے ہیں اور عام و خاص کی زبان پر جاری ہیں! انہیں اردو میں صحیح اور فصیح خیال کرنا چاہیے گو اصل کے اعتبار سے غلط ہی کیوں نہ ہوں۔“

۱۔ سرمایہ ”اردو“ حیدرآباد دکن، جولائی۔ ستمبر، ۱۹۲۱ء، ص ۵۷۔

۲۔ سرمایہ ”اردو“ حیدرآباد دکن، اپریل، جون، ۱۹۲۲ء، ص ۲۹۳۔

۳۔ سرمایہ ”اردو“ حیدرآباد دکن، جنوری۔ مارچ، ۱۹۲۳ء، ص ۲۰۱۔

مولوی عبدالحق کے تبصروں میں تنقیدی عناصر بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تبصرے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی خالص تنقیدی مضمون پڑھ رہے ہیں۔ لیکن تبصروں میں تنقید کی آمیزش قطعاً عیب معلوم نہیں ہوتی۔ کیوں کہ اس عمل سے قاری کے مزاج میں ادب کی تنقید کا ذوق بیدار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب کی یہ تنقید غور و فکر کا نتیجہ اور علمی بصیرت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف کی کتاب "غالب" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اس تمام کتاب میں کہیں اردو شاعری اور اردو شعرا سے بحث نہیں کی گئی ہے اور اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی کوئی رائے یا خیال معلوم نہیں ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری اور شعر کی تعریف میں سب انگریزی اقوال نقل کیے ہیں، نمونے بھی انگریزی کلام کے دیے ہیں۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو شعرا کے کلام کو مطالعہ کرنے کی کبھی زحمت نہیں فرمائی اور شاعری سے غالب کو الگ کر کے بحث کرنا اور پھر اردو شاعری میں اس کا درجہ قائم کرنا ایک مجنونانہ خیال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ غالب کے نقادوں کی تحریر زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کی پسند خاطر ہوتی ہیں جن کی تعلیم ویسی طریقہ پر ہوئی ہے۔ اور جن کی حس جمالیات پر مغربی ادب کی چھینٹ تک نہیں پڑی۔ بے ادبی معاف ہمارا بھی خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر اگر ہوئی تو ایسے ہی لوگوں کی دل چسپی کا موجب ہوگی جو آپ کی طرح مغربی ادب کے تورسیا ہیں مگر اردو شاعری۔ اور اس کے مختلف رنگوں اور اسلوبوں اور اس کی اندرونی حقیقت اور زبان کی نزاکتوں سے بالکل کورے ہیں"۔

مولوی عبدالحق تبصرہ کرتے ہوئے شخص کے بجائے فن کو سامنے رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کی ہرگز پروا نہیں کرتے کہ کون بہت مشہور ہے اور کون کم مشہور اور نہایت غیر جانب داری سے تنقید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کی کتاب "ادب کا مقصد" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔



”اس مجموعے میں واجد علی شاہ کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط ان کی ایک چستی بگم شنیدہ نام اور شنیدہ بگم کے بادشاہ کے نام ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان خطوط کو بہت اہم خیال کرتے ہیں۔ اس نظر سے کہ وہ غیر مطبوعہ ہیں، اہم خیال کیے جاسکتے ہیں ورنہ اس مجموعے میں یہ سب سے غیر اہم ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس بادشاہ کے عامیانہ خیالات میں جو ملک کے ایک نہایت زرخیز اور مرکز تہذیب پر فرمانروا تھا اور بازیافتِ شاہی کا متعلق ہے یہ تبصرے کے اس اقتباس میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور واجد علی شاہ دونوں پر بہ یک وقت تنقید اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن تحقیق کے حوالے سے ایک نکتہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ہر پرانی چیز کارآمد نہیں ہوتی یا ہر بڑے شخص کے تمام پہلو قابل تقلید نہیں ہوتے۔ قدیم یا جدید میں اسی فن پارے کی اہمیت ہوتی ہے جو حقیقی معنوں میں علمی حیثیت رکھتا ہو۔

مولوی عبدالحق کے تبصروں میں جہاں کڑی تنقید ملتی ہے وہیں منصفانہ اور تعریفی انداز بھی ملتا ہے۔ جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مولوی عبدالحق اچھے ادب کی ترقی کے خواہش مند تھے۔ اس حوالے سے ان کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ایک فنی کتاب ”فوٹو گرافی“ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”علاوہ بیسوں اشکال کے تقریباً پچیس ایسی عکسی تصاویر بھی دی ہیں جو فن کے لحاظ سے ضروری ہیں۔ مگر ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے پریسوں میں کیسا کام ہوتا ہے اس لیے مصنف پر اس کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اُسی طرح کتابت میں بھی غلطیاں ہیں جو ہمارے لیتھو پریس کی خصوصیت ہے۔ اردو کی وہ کتاب ہی نہیں جو غلطیوں سے پاک ہو البتہ اکثر جگہ ’نے‘ کا بے جا استعمال بری طرح کھٹکتا ہے مگر کیا کیا جائے یہ فقط پنجاب والوں کی اردو کا ایک جزو لاینفک ہو گیا ہے“۔

تبصرے کے حوالے سے مولوی عبدالحق کے ہاں یہ رجحان بھی پایا جاتا ہے کہ ہر وہ کتاب جو اردو کو فائدہ پہنچا سکتی ہے اس کی تشہیر ہو اور جو کتاب غلط فہمیوں میں اضافہ کرے اس کی اور اس جیسی کتابوں کی

روک تھام ہو یہی وجہ ہے کہ رسائل اردو کی ابتدائی تین دہائیوں میں مولوی صاحب نے بکثرت تبصرے کیے اُس کے بعد کی آگئی پھر ۱۹۵۰ء کے بعد اور کی جاتی ہے اور زیادہ تر زور مختصر تبصرے پر نظر آتا ہے لیکن کتاب کی تشہیر سے متعلق نظریے میں فرق نہیں آتا جو تبصرہ نگاری میں مولوی عبدالحق کی مستقل مزاجی کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تبصروں میں ایک نمایاں عنصر بے لاگ رائے ہے جو تبصرے کا اہم جزو ہے۔ مولوی صاحب کی اس تبصرہ نگاری کو بے لاگ تبصرہ نگاری کہا گیا ہے۔ مثلاً "افکارِ سلیم" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ایک بات سلیم مرحوم کی نثر اور نظم دونوں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ اور یہی ان کی خاص انفرادیت ہے یعنی خودداری اور معقول پسندی جس کا تعلق اسلوب اور طرزِ بیان سے نہیں بلکہ تخیل اور طرزِ عمل سے ہے۔ متروکات کا طوفان ان کی رحلت سے بہت پہلے سر بہ فلک تھا لیکن انھوں نے اس کی ذرا پروانہ کی اور یاس۔ واس۔ سدا۔ تلک۔ پر (مگر) برابر لکھتے رہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے، "مضامینِ فلک پیما" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسلوبِ بیان میں بھی ایک طرح کی جدت ہے مگر دل کشی نہیں بعض جگہ طول، اجیرن

ہو جاتا ہے یہ مضامین مسلسل پڑھنے کے لیے نہیں ورنہ صیغت گھبرانے لگے گی" ۲۷

مولوی عبدالحق نے ادبی کتب و رسائل کے علاوہ فنی کتابوں پر بھی بے لاگ تبصرے کیے ہیں تجارت

کی پہلی کتاب "پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے آدمی تاجر بن سکتا ہے۔ لیکن تناظر و

ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل میں تجارت کا ولولہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اور ابتدائی معلومات

کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کی ترغیبی کتاب ہے اور کار آمد و مفید ہے" ۲۸

عبدالحق کے تبصروں میں ایسے تبصروں کی ہرگز کمی نہیں جن میں تحقیق کا عنصر پایا جاتا ہے اور قابل

قدر بات یہ ہے کہ تحقیق و تنقید ان کے ہاں شانہ بشانہ چلتی ہے۔ اور آخر میں وہ بڑے بھرپور انداز میں

نتیجہ اخذ کرتے ہیں، پھر اس نتیجے کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت اپنے منفرد انداز میں کرتے ہیں اس کی

۲۷ سہ ماہی "اردو" دہلی، جنوری۔ مارچ، ۱۹۴۰ء، ص ۱۴۹۔

۲۸ سہ ماہی "اردو"، اورنگ آباد دکن، جولائی۔ ستمبر، ۱۹۳۴ء، ص ۳۴۵۔

۲۹ سہ ماہی "اردو"، اورنگ آباد دکن، اکتوبر۔ دسمبر، ۱۹۳۱ء، ص ۶۴۰۔

مثال ہیں پروفیسیس رائے برانی کوف کے مقالے ”اردو زبان میں فارسی عنصر“ پر کیے جانے والے تبصرے سے اقتباس پیش کیا جاسکتا ہے :

”ان سب کو یہ کہہ دینا کہ اردو میں یہ عناصر فارسی سے مستعار سہ لیے ہیں حقیقت کے خلاف ہے۔ جب ہم انیسویں صدی کے نصف اول کی اردو پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اتنی ہندی نہیں جتنی فارسی ہے۔ فاضل پروفیسیس نے اردو شعراء کے کلام سے کئی مثالیں دی ہیں اس کے بعد اس نے نکات الشعراء سے میر تقی میر کا قول ریختی کے متعلق نقل کیا ہے۔ ریختی کا لفظ اردو کے لیے ہندی یعنی غیر مخلوط زبان کے مقابلے میں استعمال کیا گیا تھا۔ درحقیقت وہ فارسی زبان تھی اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ریختی کے شاعر فارسی کے شاعر بھی تھے فارسی نے اردو کے بنانے میں اسی قدر کام کیا ہے جتنا ہندی نے اور یہ امر تاریخی واقعات سے پورے طور پر ثابت ہے۔ ایرانی بولیوں کے بولنے والے ہندوستان میں چھٹی صدی سے آباد ہیں۔ مغلوں کی حکومت میں فارسی دفتری اور درباری زبان تھی۔ اردو شاعری کے سارے ڈھنگ اور اس کا عروض اور اس کے اصطلاحات وغیرہ سب فارسی میں لہذا یہ امر قابل غور ہے کہ اردو ہندی کی ایک صورت ہے یا فارسی کی اولہ

مندرجہ بالا اقتباس میں مولوی عبدالحق نے نہایت احتیاط سے فاضل مقالہ نگار سے اختلاف کیا ہے اور ایک اور رائے پیش کی ہے۔ اسی طرح حسرت موہانی کی کتاب ”مترکات سخن“ کے ایک باب پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ جس میں زبان سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے، ”مترکات سخن“ کتاب نکات سخن کا پہلا باب ہے اس میں اگرچہ مولانا حسرت نے صرف ان مترکات کے ذکر کرنے کا دعویٰ کیا ہے، جو دور اول کے زمانے میں عام طور سے رائج تھے مگر ان میں سے بعض الفاظ دور دوم، سوم اور چہارم تک ہیں نظر آتے ہیں خیر یہاں تک درست تھا۔ لیکن غصب یہ کیا ہے کہ جو الفاظ اب تک لوگوں کی

زبانوں پر ہیں اور برابر استعمال میں ہیں ان کو بھی زبان سے متروک فرمادیا ہے یہ  
 غالباً اساتذہ مکھنؤ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعض جگہ مولانا حسرت نے بڑی رواداری  
 سے کام لیا ہے۔ مثلاً وہ "مرت" کو متروکات میں داخل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں  
 کہ "\_\_\_\_\_ صرف نہ ہیں ہ کی آواز خفیف بلکہ معدوم ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف  
 مرت کا تلفظ کامل ہوتا ہے۔ اور ضروریات شعر کے لحاظ سے اس کا استعمال حروف نہ  
 کے ناقص تلفظ کے مقابلے میں ناگزیر ہو جاتا ہے۔" چنانچہ اس بنا پر راقم  
 حروف کے نزدیک مرت کو فہرست متروکات میں داخل کرنا اس طرح سے مناسب  
 نہیں معلوم ہوتا۔ یہ کوئی معقول وجہ نہیں اس کا جواب زمانہ ہوا ایک صاحب ذوق یہ  
 دے چکا ہے کہ شعر گفتن چہ ضرور، اصل یہ ہے کہ ان دو لفظوں کے معنوں میں بھی  
 فرق ہے اور نہ، مرت کا کام نہیں دے سکتا ۱۱

مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی، پرانے لکھنے والوں کو  
 اچھا لکھنے کی مسلسل ترغیب، اردو کی بہتر نشوونما، قدیم کو جدید سے ملانے کی کوشش بیت واضح نظر  
 آتی ہے۔ اس موقع پر کبھی ان کے قلم میں گہری کاٹ، کبھی منصفانہ انداز، کبھی تعریفی طریقہ اور کبھی  
 درگزر اور ناتفت ملتا ہے۔ ان مواقع پر اکثر جگہ ان کے قلم میں بڑے خوب صورت پُر مزاج جملے بھی  
 پڑھنے کو ملتے ہیں جو ان کے تبصروں میں تنگنگی پیدا کرتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی کتاب یا ان کے  
 کسی رسالے یا ان کی ترغیب پر کسی نے رسالہ یا کتاب لکھی تو مولوی صاحب اس پر ضرور تبصرہ تحریر  
 کرتے تھے۔ گو یا جب بھی خواجہ حسن نظامی کا ذکر آتا تحریر میں ایک سکراہٹ کھینچنے لگتی تھی :

”رسالے کا پہلا مضمون خواجہ صاحب ہی کا ہے جس کا عنوان استثنائی کا دوسرا  
 گھر ہے، یہ گویا اس رسالے کی تاریخ ہے اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ  
 رسالہ خواجہ صاحب کا تھا اور وہ اور ان کی بیگم خواجہ بانو اس کے ایڈیٹر تھے۔ مالی نقصان  
 کی وجہ سے بند ہو گیا تھا (تعجب ہے) اب انھوں نے احمد وجودی صاحب کے حوالے



کہہ دیا ہے یہ ایسے نیک دل ہیں کہ انھوں نے استانی کا قرضہ بھی اپنے ذمے لے لیا ہے۔<sup>۱۷</sup>  
اسی طرح شوکت تھانوی کی کتاب "شیش محل" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ان کی ایمان داری میں شک نہیں مگر ان کی نظر خطرناک ہے وہ بعض اوقات وہاں  
جا پہنچتی ہے جہاں ہر ایک کا۔۔۔ رسائی نہیں اور چھپی چوریوں کو شارع عام پرے  
آتی ہے۔ اب اس پر بے چارہ ادیب یا شاعر خفا نہ ہو تو کیا کرے۔ کہنے والا سامنے ہو  
تو خیر وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دے یا اس کا منہ نوچ لے۔ کتاب میں لکھا ہے تو کتاب  
ہی پر غصہ اتار سکتا ہے۔ فرصت کے وقت پڑھنے کی اچھی چیز ہے۔"<sup>۱۸</sup>

مولوی عبدالحق کی طویل زندگی میں معاصرین کے ساتھ چشمبکیں بھی رہیں۔ یہ خود انگ سے ایک دل  
چسپ موضوع ہے۔ لیکن طوالت سے بچنے کی وجہ سے صرف ایک مثال کے بعد ہم آگے بڑھتے ہیں۔  
ممتاز علی آہ کی تخریر کردہ سوانح "امیر مینائی" کے مقدمے پر رائے دیتے ہیں:

"مولوی عمادی کا مقدمہ پڑھ کر وہ مشہور فقرہ یاد آتا ہے کہ دشمن مرا بہ مددِ سر کے بردا۔  
خوب بال کی کھال نکالی ہے اور عبث محنت کی ہے۔"<sup>۱۹</sup>

جس طرح مولوی عبدالحق نے حاتمی اور سرسید احمد خاں سے ادبی اور نظریاتی اثر قبول کیا اسی طرح عبدالحق  
سے بھی بہت سے لوگوں نے اثر قبول کیا۔ ہم اگر صرف تبصرہ نگاری کے حوالے سے جائزہ لیں تو یہ بات بہت کھل  
کر سامنے آتی ہے۔

مولوی صاحب نے رسالہ اردو میں ہی تبصرے کیے جس میں ابتدائی دوسالوں کے بعد اور لوگوں کے  
بھی تبصرے شایع ہوتے تھے۔ اگر رسالہ اردو کے تبصروں کو ایک تسلسل سے پڑھا جائے اور اگر درمیان میں  
کسی دوسرے شخص کا تبصرہ آجائے تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کسی اور کا تبصرہ ہے۔ وہی زبان، وہی اسلوب،  
وہی مزاج، وہی طنز، وہی تنقیدی اور تحقیقی بحث کا انداز ملتا ہے۔

<sup>۱۷</sup> سہ ماہی "اردو" اورنگ آباد دکن، جنوری۔ مارچ، ۱۹۲۲ء، ص ۱۷۷۔

<sup>۱۸</sup> سہ ماہی "اردو" دہلی، اکتوبر۔ دسمبر، ۱۹۲۳ء، ص ۵۷۲۔

<sup>۱۹</sup> سہ ماہی "اردو" دہلی، اپریل۔ جون، ۱۹۲۲ء، ص ۳۶۳۔

رسالہ اردو میں تبصرے کے لیے مخصوص حصے کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو تبصرے کے لیے کتاب خود مولوی صاحب منتخب کر کے دیتے تھے۔ ”اردو کی شری داستانیں“ از گیان چند جین پر تبصرے کی ابتداء میں محمد سخاوت مرزا کہتے ہیں:

”ڈاکٹر عبدالحق صاحب مدظلہ بابائے اردو نے ہم کو بھی ایک نسخہ تحفہ عطا فرمایا ہے اور اس پر لفظ برائے تبصرہ لکھا ہے۔“

جس طرح مولوی عبدالحق تبصرے کے لیے کتابیں خود منتخب کر کے دیتے تھے اسی طرح تحریر کردہ تبصروں کی بھی نظرداری کرتے تھے مولوی سعید انصاری کی ترجمہ کی ہوئی کتاب ”آزادی“ پر کسی صاحب نے فرمائی نام ”ہی“ سے تبصرہ کیا ہے۔ تبصرے کے آخر میں مولوی صاحب نے بھی نوٹ لگایا ہے:

”اس کتاب کا ترجمہ مدت ہوئی راجہ نرندر و ناتھ صاحب نے کیا تھا، کیا اچھا ہوتا کہ مترجم صاحب اُسے دیکھ لیتے اگر اُس سے مقصد پورا ہو جاتا تو مناسب تغیر و تبدل کے ساتھ راجہ صاحب سے اجازت لے کر شایع کر دیتے اور اس زحمت سے بچ جاتے۔“

مولوی صاحب نے طویل تبصرے بھی کیے اور مختصر بھی۔ دونوں طرح کے تبصروں میں وہ کتاب پارساے کی مکمل تشخیص پیش کرتے ہیں۔ جس سے کتاب لکھنے کا مقصد، اس کے مندرجات اور اس کی اہمیت کا اندازہ قاری کر لیتا ہے۔ تبصرے کے دوران وہ کتاب کی ضخامت، کتابت، املا اور کتاب کی نظم و ترتیب پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اگر ان کے تبصروں میں سے لسانی مباحث، تحقیقی و تنقیدی جائزے وغیرہ نکال بھی دیئے جائیں تو خالص تبصرہ پھر بھی مل جائے گا۔ ان کے تبصرے معاصرین کے تبصروں کے مقابلے میں نمایاں فرق و امتیاز رکھتے ہیں۔

اس مختصر جائزے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مولوی صاحب کے تبصروں میں کتاب پر کتاب لکھنے کا رجحان نہیں پایا جاتا، وہ تبصرے کے قلمور کا ہر جگہ خیال رکھتے ہیں، تبصرے میں اختصار اور سادگی پائی جاتی ہے۔ ان کے تبصروں میں تبصرے کی ترقی یافتہ صورت ملتی ہے۔ یہ تبصرے ان

علمی اور ادبی بصیرت کے آئینہ دار ہیں اور ان میں تعلق نہیں پائی جاتی۔  
یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر بابا اے اردو مولوی عبدالحق بے لاگ تبصرہ نگار کہلائے اور  
بلاشبہ وہ ایک عہد ساز تبصرہ نگار ہیں۔ انھوں نے اردو تبصرہ نگاری پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

## کتابیات

کتاب:

- ۱۔ مولوی عبدالحق: "چند تنقیدات عبدالحق"۔ دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۴ء۔
- ۲۔ مولوی عبدالحق: "تنقیدات عبدالحق"، طبع چہارم، لاہور، ایسٹرن بک اسٹال، ۱۹۴۵ء۔
- ۳۔ مولوی عبدالحق: "ادبی تبصرے" لکھنؤ، دانش محل، ۱۹۴۷ء۔

رسائل:

- ۱۔ رسالہ "اردو" سہ ماہی، ۱۹۳۱ء تا ۱۹۴۵ء۔
- ۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: مضمون بعنوان "بابا اے اردو بحیثیت تبصرہ نگار" مشمولہ ماہ نامہ "قومی زبان"،  
کراچی، اگست ۱۹۸۳ء۔

## مولانا عبدالحق اور تحقیقی تدوین

مولانا عبدالحق کے قلم نے جن محض ادبی خطوط پر جادہ پیمائی کی ہے اور جہاں کے تحریری آثار و نقوش رہنا روشنیوں کی طرح آگے بڑھتے نظر آتے ہیں اُن میں بعض نہایت اہم تذکروں کی بازیافت اور ادبی دنیائے متعارف کرانے کی سعی مشکور کا خصوصیت سے ذکر کیا جاسکتا ہے۔

یہ تذکرے شمالی ہند میں شعرائے اردو کے ابتدائی تذکروں میں ہیں اور اردو شعر و سخن کے اُس دور ارتقا کے بارے میں معلومات کے لیے مستند آخذ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُن میں ”عقد ثریا“ فارسی گو شعرا سے متعلق ہے لیکن اس عہد کے سلسلے میں دید و دریافت کے نقطہ نظر سے اس کی افادیت بھی ایک عصری دستاویز کی سمجھا ہے۔

یہ تذکرے اُس اہم ادبی و تاریخی ماحول کی باز دید میں معاون ہوتے ہیں شعر و سخن کے ادواری حرکات کی لسانی و ادبیاتی تفہیم اور شعری و شعوری رویوں کی شناخت میں بھی مددگار ہوتے ہیں۔ مولانا نے نہ صرف یہ کہ ان اوراقِ پارینہ کو نئی زندگی اور پائیدگی بخشنے کی کوشش کی بلکہ اُن کی اور ان کے مصنفین کے لیے تعارفی نگارشیں بھی بصورت مقدمہ یا دیباچہ تحریر فرمائے۔ تحقیق و تنقید کا ایک مرحلہ کسی متن یا تصنیف کا تنقیدی و تحقیقی زاویہ نگاہ سے تعارف بھی ہے۔

تحقیق کا منظر نامہ قوسِ قزح کے نیم دائرے کی طرح ہفت رنگ ہے۔ اس میں تعارفِ متنی، تنقید، تصحیحِ متن، تاریخِ متن، تفسیر اور تحقیق نامہ غرض بہت سے علمی اور ادبی نوعیت کے کام آئے۔ جن کی معیار گیری اور جن پر نظرداری کے بغیر تحقیقی نوعیت کے کام ادھو سے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان میں سے معروف و منقہ نقطہ نظر کے ساتھ ہو جائے وہ بعد میں آنے والوں کے لیے نشانِ راہ اور چراغِ نقشِ پا کی طرح منزلِ نمائی کرتے ہیں۔ مولانا کے کام کو بھی اسی معیار سے پرکھنا شاید زیادہ مناسب ہوگا۔

مولانا نے جو مقدمہ لکھے ہیں۔ وہ اُن کی طرف سے انجام دیے جانے کا تدوین کے ذیل میں جسے



متنی تنقید کہنا چاہیے کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مقدموں سے مولانا کے تحقیقی مطالعہ، تنقیدی زاویہ نگاہ اور تندی و نین طریق کار کی معیار شناسی میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مولانا کے مرتب کردہ تذکروں میں اگر ہم تذکرہ ریختہ گویاں کا ذکر کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۱۶۶ھ میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے مصنف فتح علی حسینی گردیزی کا اس تذکرہ کا تالیف کے ماسوا ادبیات اردو سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا اور ایک مرتبہ اس کی تسوید و تحریر سے فراغت پانے کے بعد مصنف نے اُس کے ترجموں میں ترمیم و اضافے کے عمل کو جاری نہیں رکھا۔ جس کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظر ثانی، و رہا ز فکر کی After Thought کے اثرات سے بھی آزاد رہا جب کہ اردو کے متعدد تذکروں کے بارے میں یہ بات نہیں بھی جاسکتی۔

اس کے مقدمے میں مولانا نے مصنف کے بارے میں معلومات کی فراہمی اور مصادر کی نشان دہی سے متعلق تفکر و تجسس کی ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ میر قدرت قاسم کے اشعار اور ان کے تذکرے مجموعہ نغز کے بعض حوالوں سے جس طرح اس سلسلے کی کڑیوں کو جوڑا ہے وہ بہت ہی مستحسن کوشش ہے۔ اور اس نوع کی استفادہ کاری کے لیے ایک عمدہ نمونہ قرار دی جاسکتی ہے۔

لیکن جہاں تک مولانا کی بعض مواقع پر تنقید یا تبصرہ کا تعلق ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مولانا جیسے کسی محقق اور ادبی نقاد سے جس سلامت روی کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے، اس کا جھکاؤ جغیہ داری اور سوگیری کی طرف ہے۔

مولانا کے تبصرے علی کی اس رویہ سے بھی نفی نہیں ہوتی لیکن تقریر کی طرح تحریر کا بھی اپنا ایک بھرم ہوتا ہے وہ قائم نہیں رہتا۔ چنانچہ مولانا نے گردیزی پر جو تنقید کی ہے۔ وہ اسی عدم توازن کا شکار نظر آتا ہے۔

”اُس نے اپنے سارے تذکرے میں کہیں کسی تذکرہ کا حوالہ نہیں دیا یہاں تک کہ خان آرزو پر خاکسار اور سودا کے حالات میں اُن کے تذکروں کا مطلق ذکر نہیں کیا البتہ قرآن سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر کا تذکرہ اس کی نظر سے ضرور گزرا ہے، اور دیا چہ میں جو اُس نے تذکرہ نویسوں کے خلاف زہرا گلا ہے۔ اس کا ہدف کتاب اشعار ہی ہے۔ مولانا اپنے اس فاضلانہ مقدمہ میں خود ہی جب یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ خاکسار، سودا اور امام الدین کے تذکرے

ہنوز دستیاب نہیں تو پھر قیاس یا قرائن کو اتنا درجہ اعتبار دینا کس حد تک قرین انصاف ہے گردیزی نے جو زہرا گلا ہے وہ دراصل میر کے خلاف ہے۔

خاکسار کے تذکرہ "بنام معشوق چل سالہ خود" کہہ کر میر نے جو پھبتی کہی ہے وہ اپنی جگہ پر لیکن اس کے ماسوا بھی کیا یہ واقع ہے کہ میر نے خاکسار کے رویہ کا اپنے تذکرہ میں مذاق اڑایا ہے، جس کے معنی کہ خاکسار کی معاصرینہ روش خود میر کے نزدیک پسندیدہ نہ تھی۔ اور اس وقت نکات شعراء کی جو روایت سامنے ہے اس سے پیشتر یہ روایت قاسم کے بیان کی روشنی میں اپنے لب و لہجہ کے اعتبار سے کچھ اور رہی تھی۔ "وکی شاعریت از شیطان مشہور تر" ایسی ناگوار گزشتہ والی باتیں میر صاحب کی زبان قلم پر بھی۔ ایسی صورت میں کہ اس وقت معاصرانہ چشمیں تذکروں کی عبارت و اشارت پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ یہ کیسے مان لیا جائے کہ یہ زہرا میر ہی کے خلاف اگلا گیا ہے۔

غلا وہ برس میں مولانا کا یہ بھی خیال ہے کہ میر نے اپنے معاصرین کے بارے میں جو رائیں دی ہیں وہ آزادانہ ہیں، اور ان کی بنیاد حق گوئی پر ہے۔ جس کا اندازہ مولانا کی اس عبارت سے ہوتا ہے۔ میر صاحب پہلے تذکرہ نویس ہیں جنہوں نے صحیح تنقید سے کام لیا ہے اور جیسا کہ کوئی سقم نظر آیا ہے وہاں بے رورعایت اس کا اظہار کر دیا ہے اور ہر شاعر کے متعلق جو ان کے لئے ہے۔ اس کے ظاہر کرنے میں انہوں نے مطلق تامل نہیں کیا۔

شعرا کے درمیان گروہ بندیوں اور تذکرہ نگاری کے محرکات میں ان کے اثر و نفوذ کے تاریخی عمل سے مولانا بخوبی آگاہ ہیں۔ اس پر بھی میر کے دفاع میں وہ بے تحلف یہ کہہ جاتے ہیں، "میر کی شان اس سے بہت ارفع تھی۔ وہ کسی جتھے سے تعلق نہیں رکھتے۔ غلا وہ اس کے میر صاحب سے حالات کے بیان کرنے میں بھی تاہم مقدور صحت سے کام لیا ہے۔

[ آگے چل کر مولانا نے دینی زبان سے اس کا بھی اقرار کر لیا ہے کہ ]

بعض اور اصحاب کی طرح گردیزی کو بھی یہ بات ناگوار گزری کہ اس کے بعض دوستوں پر میر صاحب نے بے باکی سے نکتہ چینی کی تھی یا ان کی طرف سے بے التفاتی کی؟

یہ اور اس طرح کے بعض دوسرے بیانات سچے یہ ہے غیر جانب دارانہ تنقید سے (گاہ گاہ) بہت دور جا پڑتے ہیں۔

مولانا طرَح معروضیت سے وقتی طور پر ہی سہی گذرہ گیری کسی بھی تنقیدی نقاد کے لیے خوش آئند بات میں ہے۔ مگر شخصیت تعصب و منافرت بلند تھی یا نہیں۔ مولانا کو تو اس سے بہر حال بلند ہونا چاہئے تھا۔ ممکن ہے کہ اسی نوع کے سچے بیباک میں کچھ دیر یا کچھ دور تک الجھنے کے باعث ہی شاید مولانا ایک تنقیدی حیثیت سے فرائض انجام نہ دے سکے کہ وہ اس تذکرہ کے قلمی نسخوں کا تعارف کراتے اور یہ بتلاتے ہوئے گزرتے کہ ترتیب اور تدریس کی روایت کے لیے ان قلمی نسخوں کی اہمیت کیا ہے۔ حواشی کا اہتمام بھی مولانا کے یہاں برائے نام ہے اشاریہ بھی نہیں جو حواشی یا اضافات کے ذیل میں ضرور آنا چاہئے۔

محزن نکات کی روداد میں تو یہ بات بھی شاہد ہے کہ اُس کی روایت کو مولانا نے نہیں ایڈٹ کیا چنانچہ اس کی شاعت اولیٰ آخری صفحہ پر جو اندراجات تھے انہیں دوسرے کاغذ چپکا کر قارئین کی نگاہوں سے چھپا دیا گیا تھا۔ اور اس اشاعت کے نسخوں میں یہ صورت حال ملتی ہے۔ تذکرہ نکات الشعر کے مقدمہ کے صفحات بلکہ سطور میں بھی تقریباً وہی مبادث بزبانِ قلم پیش کیے گئے ہیں۔ جو ریختہ گویان پر دیباچہ نگاری کے وقت مولانا کے پیشِ نظر رہے ہیں، جس کی وجہ سے ان تحریروں پر دہرانے کے عمل کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ

اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں عموماً اور اکثر شعرا کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔ یہ بات دوسرے تذکروں میں نظر نہ آئے گا۔

یہ قیاس یا پھر یہ کہ بالکل بجا ہے کہ نکات الشعراء کا سنہ تالیف ۱۴۵ھ ہے۔ اور چوں کہ گردیزی نے اپنا تذکرہ میر صاحب ہی کے جواب میں لکھا ہے۔ قیاس کو یقین کا درجہ دینا ایک محقق یا مرتب کے لیے جائز حد و کو توڑنے کے مترادف ہے۔ یہی صورت اُن نکات کے بارے میں مولانا کے ذہن پر مرتسم ہے۔ جو میر نے اپنے تذکرہ کے آخر میں ”انداز“ کے عنوان سے سپرد قلم کیے ہیں۔ جب کہ میر کے قلم سے ان کا ذکر کچھ اس انداز کے ساتھ آیا ہے جیسے چلتے چلتے ایک بات کہی گئی ہو اور گردیزی کے یہاں ان کی حیثیت علمی بیان اور ادبی افکار کی سی ہے۔

معاصرین کے یہاں علمی اندازِ نظر اور عصری میلانات کا پرتو آ جانا۔ ایک قرین امکان بات ہے اس میں تقدیم و تاخیر کا فیصلہ مبہم صورت حال کی موجودگی میں آسان نہیں۔ جب کہ بنیادی روایت میں بسا اوقات ترمیم و اضافہ کا عمل جاری رہتا ہے اور میر کے یہاں ایسا ہوا بھی ہے کہ تذکرہ کی موجودہ روایت باز فکری

اور بازنگاری کے مراحل سے گزر رہی ہے۔

بائیں ہمہ میر نے جزئی جزئی باتوں اور داخلی شہادتوں پر نظرداری سے مولانا نے اخذ نتائج کا جو کام لیا ہے وہ مولانا کی علمی بصیرت کا طرف اشارہ سیخ ہے۔

تذکروں میں مصحفی کا تذکرہ "ہندی گویا" اور "عقد ثریا" مولانا کی نگاہوں سے مزین ہیں۔ ان میں مصحفی کے سوانح و سیرت پر مولانا نے جو نظر ڈالی ہے اُس میں بھی رنگ و یکسانیت کے پہلو موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ایک مقدمہ دوسرے مقدمہ کی تحریر کے وقت سامنے رہا اور استفادہ کی صورت نمایاں ہوتی گئی۔

سوانحی کوائف کی بات تو الگ ہے کہ ان میں اشتراک فطری امر تھا۔ لیکن فارسی شاعری اور اس کے تہذیبی محرکات و عوامل پر گفتگو اور دور زندگی میں ہندوستانی فارسی گو شعرا کے جو تذکرے لکھے گئے تھے ان سے استفادہ اور تقابلی اندازِ نظر کے ساتھ مصحفی کے کام کی طرف بھی ذہن منتقل ہونا چاہئے تھا کہ یہ موضوع گفتگو پر علمی تقاضے کا حصہ تھا لیکن مولانا کے یہاں نظر انداز ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فکر و نظر کے دوسرے الگ ہونے کے باوصف مقدمہ کے صفحات وہی رہے۔



## علی گڑھ۔ باباے اردو کے سفر حیات کی ایک اہم منزل

باباے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کی داستان میں علی گڑھ ایک اہم عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولوی صاحب "نام ورن علی گڑھ" کی اس سنہری زنجیر کی ایک اہم کڑی تھے جس کو ڈھالنے اور بنانے میں سرسید کی علی گڑھ تحریک کی ٹکسال کا کھرسونا استعمال ہوا تھا۔ جن "نام ورن علی گڑھ" نے اپنے یادگار کارنامے سے علم و فن اور شعر و سخن کی وادیوں میں قدم قدم پر چراغ روشن کیے ہیں ان میں باباے اردو مولوی عبدالحق کا نام ممتاز مقام رکھتا ہے۔

مہر سے لحد تک باباے اردو کے عہد کی زمانی تحدید ۱۰ مارچ ۱۸۷۰ء سے ۱۷ اگست ۱۹۱۹ء تک کی ۹۱ سالہ درمیانی مدت ہوتی ہے۔ اور مولوی صاحب کی اس ۹۱ سالہ داستان حیات میں مکانی اعتبار سے جو دیار و امصار اہم عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں قصبہ ہاپڑ (ضلع میرٹھ)، فیروزپور (پنجاب)، علی گڑھ، حیدرآباد، اورنگ آباد دہلی اور کراچی (پاکستان) کے نام شامل ہیں۔ زمان و مکان کے لحاظ سے مولوی عبدالحق کی ۹۱ سالہ زندگی کی اس داستان کے بیان میں سرین علی گڑھ پر ان کے قیام کا عنوان زمانی اعداد و شمار کے اعتبار سے ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۵ء تک اگرچہ سات برس کی مدت سے زیادہ نہیں جو ان کی ۹۱ سالہ طویل زندگی کا محض تیسروں حصہ ہوتا ہے لیکن قیام علی گڑھ کا یہ عنوان مولوی صاحب کی داستان زندگی کے تقریباً تمام یادگار کارناموں کے لیے اہم ترین بنیادی محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے اس مقالے میں اپنے اسی اجمالی بیان کی تفصیل و تفسیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

باباے اردو مولوی عبدالحق کی ادبی، علمی اور عملی زندگی کی نشو و نما میں سرسید کی علی گڑھ تحریک نے جو یادگار کردار ادا کیا ہے اس کے تجزیاتی جائزے کے نقطہ آغاز کی تلاش میں جب ہم نے مولوی صاحب کے صحیفہ حیات کی ورق گردانی کی تو یہ انکشاف ہوا کہ مولوی عبدالحق اپنے قیام علی گڑھ سے قبل ہی سرسید

اور ان کی علی گڑھ تحریک سے ذہنی اور قلبی طور پر وابستہ ہو چکے تھے۔ مولوی عبدالحق کا درج ذیل تحریری بیان ہماری اس بات کا اثبات کرنے کے لیے ایک مضبوط ثبوت ثابت ہوتا ہے:

”میں نے جب ہوش سنبھالا تو مسلمانوں۔۔۔ (کے) دیوان خانوں میں۔۔۔ کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کالج یا سید احمد خاں کا ذکر نکل آتا۔ سید احمد خاں اس زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقے میں موضوع بحث تھے۔ اُن کی نسبت کفر و الحاد کا فتویٰ تو عام تھا۔۔۔ کوئی کہتا گردن مروڑی مرنے لکھتا ہے اور حلال حرام میں کچھ فرق نہیں کرتا کوئی کہتا اُس نے اپنا سر بیچ دیا ہے، مرنے کے بعد انگریز اُس کا سر لے جائیں گے۔۔۔ یہ سب کچھ تھا لیکن اتنی بات ضرورتی کہ اُن کی دانش مندی کے سب قائل تھے۔۔۔ میں یہ دیکھتا ہی نہ تھا رہتا تھا، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، اتفاق سے ایک روز میرے ایک ہم جماعت مجھے اپنے گھر لے گئے وہاں میں نے (سید احمد خاں کے رسالے) تہذیب الاخلاق کے پرچے دیکھے اور پڑھنے شروع کیے۔ اس میں ایسا دل رگاکہ اس کے بعد میں اُن سے پرچے مانگ لایا اور پڑھنا رہتا۔ اب میری آنکھیں کھلیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق کا مطالعہ مجھے کھینچ کر علی گڑھ لے گیا اور میں (علی گڑھ) کالج کے اسکول میں داخل ہو گیا۔۔۔“

مولوی عبدالحق کا یہ بیان خود بتاتا ہے کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک سے مولوی صاحب کی وابستگی ہی دراصل ان کے قیام علی گڑھ کا سبب بنی تھی۔ ہمارے نزدیک علی گڑھ تحریک سے بابائے اُردو کی ابتدائی ذہنی قربت اُن کے قیام علی گڑھ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اُن کا قیام علی گڑھ خود علی گڑھ تحریک سے اُن کی ذہنی وابستگی کا نتیجہ تھا۔ گویا مولوی عبدالحق اپنے قیام علی گڑھ سے قبل ہی سرسید کی علی گڑھ تحریک سے ذہنی طور پر وابستہ ہو چکے تھے۔

علی گڑھ میں مولوی عبدالحق ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۵ء تک محض سات سال رہے تھے یہ بعض اہل قلم کا یہ اندراج نظر ثانی کا محتاج ہے کہ عبدالحق دسواں درجہ (یعنی انٹرنس) پاس کر کے علی گڑھ آئے تھے یہ خود عبدالحق نے بتکرا لکھا ہے کہ وہ علی گڑھ کالج کے اسکول میں داخل ہوئے تھے اور علی گڑھ کالج کے اسکول سے انٹرنس پاس کر کے کالج کی جماعتوں میں پڑھے تھے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے قیام علی گڑھ کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ: ”انٹرنس (یعنی دسویں درجے) میں سیٹھ یعقوب حسن

میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ اے مولوی صاحب کے یہ تمام بیانات ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے دسواں درجہ علی گڑھ کالج کے اسکول ہی سے پاس کیا تھا۔ علی گڑھ میں مولوی عبدالحق کے سلسلہ تعلیم کی سنہ وار تخمینہ تو قیّت کا درجہ ذیل گوشوارہ بھی ہمارے دعوے کے لیے ایک دل چسپ و مفید شمار یاتی شہادت ہے۔

Statistical Evidence

درجہ	تعلیمی سال
۱۔ نهم	۱۸۸۸-۸۹
۲۔ دہم	۱۸۸۹-۹۰
۳۔ یازدہم	۱۸۹۰-۹۱
۴۔ دوازدہم	۱۸۹۱-۹۲
۵۔ بی۔ اے (پہلا سال)	۱۸۹۲-۹۳
۶۔ بی۔ اے (آخری سال)	۱۸۹۳-۹۴

دانش گاہ علی گڑھ کے معتبر و مستند راوی پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ بیان کہ مولوی عبدالحق نے علی گڑھ کالج سے ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کیا تھا ہمارے پیش کردہ گوشوارے کے اندراجات کی تائید کرتا ہے۔

عبدالحق ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے پاس کر کے ۱۸۹۵ء تک جس علی گڑھ میں مقیم رہے تھے وہ اپنی رفقائے تاریخ کی کس منزل میں تھا۔ اس امر کا جائزہ لینا ہمارے مقالے کے موضوع کے لیے وہ ناگزیر پہلو ہے جس سے پہلو نہی کرنا نہ صرف مقالے بلکہ سامعین کے ساتھ بھی نا انصافی کرنے کے مترادف ہوگا۔ علی گڑھ میں ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۵ء تک عبدالحق کے سات سالہ قیام کا زمانہ سرسید کی علی گڑھ تحریک کی تاریخ کا وہ یادگار دور تھا جب یہ تحریک تصورات و نظریات کی سرحدوں سے گزر کر تعبیر و تشکیل کے ایک سنہرے عملی دور میں داخل ہو چکی تھی۔ سرسید کا انقلاب آفریں مجلہ تہذیب الاخلاق اپنے دو ابتدائی ادوار پورے کر کے "جریدہ عالم" پر اپنے نام کے دوام کی ہر شے کر چکا تھا۔ سرسید کے خوبوں کی تعبیر مدرسۃ العلوم علی گڑھ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اپنے افتتاح کے بعد یکم جون ۱۸۷۵ء سے درس و تدریس کے کام کا آغاز کر کے ۸ جنوری ۱۸۷۷ء تک مدرسے سے ترقی کر کے محمدن اینگلو اورینٹل کالج (



( M.A.O. College ) علی گڑھ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اواخر جولائی ۱۸۷۶ء میں سرسید اپنی سرکاری ملازمت سے عہدہ دوش ہو کر بنارس سے مستقل قیام کے لیے سرزمین علی گڑھ پر آئے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں سرسید کی بنا کردہ محمدن ایجوکیشنل کانسفرنس بھی وجود میں آچکی تھی۔ مئی ۱۸۸۸ء میں جب سرسید اپنی گراں قدر اصلاحی اور تعلیمی خدمات کی بدولت حکومت وقت سے K.C.S.I کا خطاب پا چکے تو عبدالحق اسی سال ۱۸۸۹ء میں دیار علی گڑھ میں وارد ہوئے تھے۔

عبدالحق نے دیار علی گڑھ میں ۱۸ سال کے سن سے ۲۵ برس کی عمر تک کا جو یادگار زمانہ گزارا وہ سرسید کی علی گڑھ تحریک کے نقطہ عروج (CLIMAX) کا دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہ تحریک فکر و نظر کی تخم ریزی کی منبروں سے گزر کر برگ و بار لانے کے دور سے ہم کنار ہو رہی تھی۔ سرزمین علی گڑھ پر سرسید اور ان کے ہم نوا جدید ہندوستان کی تشکیل اور ایک نئی ذہنی تلخ کی تحریروں تکمیل کے تاریخی کام میں سرگرم عمل تھے۔ دیار علی گڑھ میں نوجوان عبدالحق کی نظروں کے سامنے سرسید کی انقلاب آفریں اور عہد ساز تحریک کے زیر سایہ بطن تاریخ سے ایک نیا ہندوستان ابھر رہا تھا۔ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں سرزمین علی گڑھ پر ذہنی بیداری اور روشن خیالی کا جو ایک نیلاب لکھا جا رہا تھا وہ اپنے دامن میں کن عہد آفریں انقلابات کو لیے ہوئے تھا اور اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کو بروئے کار لانے کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو سائنسی ایجادات کی برکتوں، روشن خیالی اور ذہنی بیداری کی نعمتوں سے مالا مال مغرب کی کروٹیں کھینچی ہوئی نئی زندگی سے (جو تاریخی قوتوں کی بدولت ہندوستان کا بھی مستقبل بننے والی تھی) روشناس کرا کے قدامت پسند اور ماضی پرست ہندوستانی مسلمانوں کو مستقبل کا استقبال کرنے کا حوصلہ دے کر جو تاریخ ساز و عہد آفریں نقیبانہ بلکہ پیہرانہ کردار ادا کیا وہ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے اسباب و محرکات کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ناک باب ثابت ہوتا ہے۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء کے بحران کے بعد ہندوستان میں اپنے امتحانی اور بحرانی دور کے نازک تقاضوں کو سمجھا اور ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی مایوسی، بے عملی، ماضی پسندی، قدامت پرستی، فرسودگی، ذہنی خوابیدگی، دینی بے اعتدالی، توہم پرستی، اخلاقی زبوں حالی، سماجی بے راہروی، اقتصادی بد حالی، تعلیمی پس ماندگی اور تقلید پروری



کے مریضانہ تاریک نہاں خانوں سے نکال کر ان کے ان تمام ہلکے امراض کے موثر علاج کے لیے علی گڑھ تحریک کا کارگر ٹکڑی "تیار کیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اُس فوری اور ضروری طبی امداد (First Aid) کی حیثیت رکھتا تھا جس سے مریض کی جان بچائی جاتی ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو زوال کی پستی کے کس مقام سے کمال کی بلندی کی کس منزل تک پہنچا دیا اور ان کا رخ کس جانب سے کس طرف موڑ دیا !

• فکر و نظر کی مایوسی و پشیمانی سے قلب و ذہن کی تازگی و بالیدگی کی سمت۔ !

• بے مقصد سستی اور بے عملی سے بامقصد جستجو اور کامیاب کارکردگی کی طرف۔ !

• ماضی پسندی، قدامت پرستی و فرسودگی کے جوہر سے مغرب کی اُس رواں دواں، متحرک اور

فعال نئی زندگی کی جانب جو مستقبل میں ہندوستان کا مقدر بننے والی تھی۔ !

• ذہنی خوابیدگی سے بیدار مغز کی طرف۔ !

• مذہبی بے اعتدالی اور توہم پرستی سے مذہبی روا داری اور عقلی و منطقی حقیقت پسندی کی جانب۔ !

• اخلاقی زبوں حالی اور سماجی بے راہ روی سے صحت مند اخلاقی اور سماجی قدروں کی سمت۔ !

• اقتصادی بد حالی، معاشی تنگ دستی اور تعلیمی پس ماندگی کے زوال سے معاشی خوش حالی

اور علمی ترقی کے کمال و اقبال کی طرف۔ !

• تقلید پروری سے تجدید پسندی کی جانب۔ !

سرسید کی اسی علی گڑھ تحریک کے سایے اور سرسید کی سرپرستی میں نوجوان عبدالحق نے

علی گڑھ کالج میں ۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۴ء کے دوران ۸ سال کے سن سے ۲۵ برس کی عمر تک اپنا جو یادگار

تعلیمی اور تربیتی دور گزار اس کے دیرپا اور دور رس اثرات کے گہرے نقوش کی تابندگی یا بے اردو

مولوی عبدالحق کی شاہ راہ زندگی کی ہر اہم منزل میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ علم و دانش کی روشنی اور ریاضت

و عمل کی سرگرمی اور گہما گہمی سے معمور دیار علی گڑھ کی سرزمین نوجوان عبدالحق کی حیات و شخصیت کی تشکیل

و تکمیل کے لیے ایک ایسی تربیت گاہ ثابت ہوئی جس میں پروان پاکر ضلع میرٹھ کے ہاپڑ جیسے غیر اہم

قصبے کا عبدالحق جیسا ۱۸ سالہ غیر معروف قصبائی نوجوان "بابا بے اردو مولوی عبدالحق" بن کر علم و ادب

کے میدان میں اپنی زبردست خدمت کی بدولت عالم گیر شہرت کا مالک بنا تھا۔

مولوی عبدالحق سرسید کے زیر نگرانی علی گڑھ میں نہ صرف پڑھے بلکہ کڑھے بھی تھے۔ انھوں نے دورانِ تعلیم علی گڑھ کالج کی تاریخ میں وہ دور پایا تھا جب علی گڑھ کی سر زمین علم و دانش اور شعر و ادب کے میدانوں کی سربر آوردہ و قد آور علی وادنی ہستیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب سرسید، حالی، شبلی، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکار اللہ، وقار الملک، محسن الملک، عماد الملک، نواب سید حسین بلگرامی، شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی، مولوی چرخ علی، مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی اور جسٹس کرامت حسین کی ایسی منتخب روزگار ہستیاں علی گڑھ تحریک کی ہم نوائی اور علی گڑھ کالج کی آبیاری کے لیے مستعد و موجود تھیں۔ خود مولوی عبدالحق کے الفاظ میں یہ ہستیاں تھیں جن سے۔۔۔ میں پاس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو، ان سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں۔۔۔۔۔

مولوی عبدالحق کی طبیعت میں محنت اور لگن سے ہر کام سرانجام دینے اور ہر کار آمد کام کو سیکھنے کی صلاحیت موجود تھی، علی گڑھ میں ان "پاس صفت" بزرگوں کی صحبت ان کے لیے سونے پر سہاگنا ثابت ہوئی۔ مولوی صاحب میں اچھی باتوں اور عمدہ عادتوں کو سمجھنے اور سیکھنے کے لیے جو زبردست قوتِ مشاہدہ تھی اس کا اظہار ان کے لکھے ہوئے ان خاکوں میں ہوتا ہے جو بہترین انسانی عادت اور اخلاقی افتاد کے قابلِ تقلید عملی نمونوں کا حسین و دل نشین نگار خانہ معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے علی گڑھ میں سات سالہ قیام کے دوران اپنے سفر حیات کے لیے زاوڑاہ کا جو ساز و سامان حاصل کیا وہ ان کی آنے والی زندگی کی ہر اہم منزل میں قدم قدم پر ان کا رفیقِ سفر بنا رہا۔ مولوی صاحب نے علی گڑھ میں جو کچھ دیکھا، جو کچھ سیکھا اور جو کچھ پایا اس کی تفصیل کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ اگر ایجاز کے اعجاز کی اجازت ہو تو بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ بابائے اردو علی گڑھ کالج کی چلتی پھرتی، بولتی چالتی اور جیتی جاگتی تاریخ تھے۔ انھوں نے علی گڑھ جیسے معمولی شہر کو علم و فن اور شعر و سخن کا زبردست مرکز بننے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ علی گڑھ کالج کے متعدد عالی شان علمی ایوان کی تعمیر و تکمیل کے عینی شاہد اور معتبر راوی تھے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں علی گڑھ کالج، سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک کے نامور ہم نواؤں کے آنکھوں دیکھے، پاؤں سننے "حالات" واقعات و حکایات کو جس لطف و تفصیل سے بیان کیا ہے

اس پر یہ مثل صادق آتی ہے :

”لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتیم“

مولوی عبدالحق برسوں تک سرسید کی صحبت سے فیض یاب رہے۔ سرسید سے اپنی قربت کے ضمن میں مولوی صاحب نے جو متعدد و قابل ذکر واقعات بیان کیے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر یہاں دس چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولوی عبدالحق تقریباً ڈیڑھ سال تک سرسید کی میسنر ہسٹام کوئٹہ کے طعام ہونے کا شرف رکھتے تھے۔ مولوی صاحب کو علی گڑھ میں سرسید کے گراں قدر و نادار الوجود کتب خانے میں رسائی کے بھی موقع ملتے رہتے تھے جو بابا اے اردو کے علمی اور ادبی ذوق کی آبیاری میں معاون ثابت ہوئے۔ بابا اے اردو نے بعد میں اپنے ذاتی اور انجمن ترقی اردو کے کتب خانوں کے لیے مطبوعات و مخطوطات کا جو زبردست علمی و ادبی ذخیرہ جمع کرنے کا کام کیا تھا اس کام میں شاید سرسید کے اسی کتب خانے کی تقلید کا کرم شامل ہو۔ سرسید کو جب علی گڑھ کالج کے لیے یونی فارم (Uniform) کا خیال آیا تو انھوں نے خود کپڑا خرید لیا اور یونی فارم سلوا کر عبدالحق کو اس غرض سے پہنوائی کہ کالج کے دوسرے طلبہ بھی اس یونی فارم کو دیکھ کر پسند کریں اور اسے سلوا کر استعمال کریں۔ گویا عبدالحق نے سرسید کے علی گڑھ کالج کی یونی فارم کے لیے موجود اصطلاح میں ماڈلنگ (Modelling) کا کام بھی سرانجام دیا تھا۔ سرسید نے نوجوان طالب علم عبدالحق کو علی گڑھ کالج کی یونی فارم کے سلسلے میں ماڈل (Model) یا مثالی نمونہ بنانے کے لیے جو منتخب کیا اسے ہم سرسید کی نظر انتخاب کا ایک ایسا یادگار کرم و کارنامہ قرار دیتے ہیں جو علامتی اعتبار سے عبدالحق کے حالات و کمالات کے لیے بہترین عنوان بنا اور بابا اے اردو مولوی عبدالحق اپنی آنے والی زندگی میں واقعی علی گڑھ کالج کی ”پیداوار“ (Product) کا بہترین مثالی نمونہ (Model) ثابت ہوئے۔ بابا اے اردو کی زندگی کی عظیم الشان داستان کے ہر اہم عنوان میں سرسید اور دوسرے ناموران علی گڑھ کے اثرات کی جو کارفرمائی شام مستی ہے اس پر قدرے تصرف کے ساتھ فیض کا یہ مشہور و مقبول شعر گوش گزار کیا جا تلے ہے :

شمع (خیر و) خیال کے انجم، جگر کے درغ — جتنے چراغ ہیں، (راسی) محفل سے

آئے ہیں لہ

علی گڑھ سے بی۔ اے کر کے نوجوان عبدالحق نے ۱۸۹۵ء کے دوران جب عملی زندگی کے میدان



میں قدم رکھا تو وہ تلاش روزگار کے امتحان سے دوچار ہوئے۔ ہندوستان میں ہر نوجوان اپنی عملی زندگی کے اس امتحان سے دوچار ہونے پر چار چھ تلخ تجربات کے ہفت خواں عام طور پر ضرور طے کرتا ہے مگر نوجوان عبدالحق کو تلاش معاش کے اس امتحان میں ناموران علی گڑھ کی بدولت بھیٹی اور حیدرآباد دکن میں پے درپے اپنی زندگی کی جوابدہائی تین ملازمتیں ملیں وہ ان کی زندگی کی بازی میں ایسی ملازمتی پیٹرن کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں تینوں بار ارباب علی گڑھ نے نوجوان عبدالحق بی۔ اے (علیگ) کی کاربراری کی تھی۔ اس طرح مولوی عبدالحق کی عملی زندگی کی داستان میں ”ملازمت“ کا جو پہلا عنوان نظر آتا ہے اُس میں سرتاسر نواب محسن الملک، مولوی محمد عزیز مرزا اور نواب وقار الملک کے ایسے ناموران علی گڑھ کی عنایتوں کا بیان ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی ابتدائی تینوں ملازمتوں کا احوال اجمال سے یوں بیان کیا جاسکتا ہے :

۱۔ عبدالحق کو اپنی زندگی کی پہلی نوکری ۱۸۹۵ء کے دوران دیار بھیٹی میں سرسید کے نام ور ہم نوا نواب محسن الملک کی بدولت ملی۔ محسن الملک اُس زمانے میں ریاست حیدرآباد دکن کے فائی ٹنس سکریٹری تھے اور وہ اُس زمانے میں اپنے علاج و بحالی صحت کے علاوہ علی گڑھ تحریک کو بھیٹی کے متحول طبقے میں مقبول بنانے کی غرض سے بھیٹی میں مقیم تھے۔ محسن الملک نے عبدالحق کا تقریر اپنے پرائیویٹ سکریٹری کے اہم عہدے پر کر لیا (عبدالحق ص ۲۲-۲۱)

۲۔ عبدالحق کو ۱۸۹۵ء ہی کے اُس پاس محسن الملک کے ایک سفارشی خط کی بدولت حیدرآباد دکن میں مترجم کی دوسری ملازمت ریاست حیدرآباد دکن کے فرسٹ اسٹنٹ ہوم سکریٹری مولوی محمد عزیز مرزا سے ملی جو علی گڑھ کالج ہی کے تربیت یافتہ ناموروں میں تھے۔

۳۔ مدرسہ اصفیہ حیدرآباد دکن کی ہیڈ ماسٹری جو عبدالحق کی زندگی کی تیسری نوکری تھی وہ بھی انھیں سرسید کے دست راست اور علی گڑھ تحریک کے زبردست ہم نوا ریاست حیدرآباد کے معتمد مال نواب وقار الملک کی بدولت افسر الملک نواب افسر جنگ سے ملی تھی۔

مدرسہ اصفیہ حیدرآباد کی ہیڈ ماسٹری عبدالحق کی زندگی میں اُس تعلیم و تربیت کا امتحان تھی جو انھوں نے سرسید اور ان کے رفیقوں کے زیر سایہ علی گڑھ کالج میں حاصل کی تھی۔ مدرسہ اصفیہ حیدرآباد دکن کی کامیاب سربراہی کی بدولت مولوی عبدالحق ۱۹۱۱ء میں دیار اورنگ آباد میں مہتمم تعلیمات کے



اعلاہدے پر فائز ہوئے۔ یہاں انھیں سرسید کی تعلیمی تحریک کے فکری اور نظریاتی کارآمد رہبر اصولوں کی عملی تعبیر و تفسیر پیش کرنے کا موقع ملا۔ مثلاً تعلیم کے میدان میں مولوی عبدالحق کے یادگار کارناموں کی طویل فہرست میں سے چند اہم کاموں کی نشان دہی کی جاتی ہے: محکمہ تعلیم کے اسکولوں کی نگرانی، اسکولوں میں درس و تدریس کے کارآمد نئے تجربات، نصابی کتابوں کی تیاری، اردو یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ، عثمانیہ کالج اور ننگ آباد کی پرنسپل، ناظم دارالمرجہ حیدرآباد کی حیثیت سے مختلف علوم و فنون کی نصابی کتابوں کے اردو میں ترجموں کا اہم کام، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبہ اردو کی سربراہی اور کراچی (پاکستان) میں اردو کالج کا قیام۔  
تعلیم و تدریس کے محاذ پر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یہ تمام یادگار سرگرمیاں ہمارے نزدیک دراصل سرسید کی اسی علی گڑھ تحریک کی توسیعی شکل کی حیثیت رکھتی ہیں جو بابائے اردو کی زندگی کا مشن بن چکی تھی۔

مولوی عبدالحق کی زندگی کی داستان میں تعلیم و تدریس کے میدان کی سرگرمیوں کے دوش بدوش ”صحافت“ کا بھی ایک اہم عنوان ملتا ہے۔ صحافت مولوی عبدالحق کے استاد معنوی سرسید کے سفر حیات میں شروع ہی سے رفیق رہی تھی۔ سرسید کی ادبی زندگی کا آغاز ہی اپنے بڑے بھائی سید محمود علی کے سید الاخبار دہلی میں مضمون نگاری سے ہوا۔ سرسید نے اپنی زندگی کی مختلف منزلوں میں متعدد رسالے جاری کیے تھے۔ صحافتی کارنامے سرسید کی علی گڑھ تحریک کا اہم پہلو رہے ہیں۔ صحافت اگر سرسید کی اصلاحی تحریک کی اشاعت کا ایک اہم وسیلہ بنی تو سرسید کے معنوی شاگرد مولوی عبدالحق کی زندگی میں بھی صحافت ایک ادبی مشغلہ رہی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی صحافتی زندگی کے لیے ابتدائی تربیت علی گڑھ ہی میں پائی تھی۔ سرسید کے رسالے ”تہذیب اخلاق“ اور ”علی گڑھ میگزین“ میں مولوی عبدالحق کے شائع ہونے والے مضامین مولوی صاحب کی صحافتی زندگی کے لیے بنیاد بنے۔ مولوی عبدالحق کے صحافتی کارناموں کی فہرست میں جو رسالے شامل ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: رسالہ افسر حیدرآباد (۱۸۹۷-۹۸)، رسالہ اردو (آغاز اشاعت جنوری ۱۹۲۱ء) رسالہ نورس اورنگ آباد (۱۹۲۵ء) اور رسالہ قومی زبان کراچی پاکستان (۱۹۷۸ء)۔

صحافت کے ساتھ ساتھ خطابت بھی مولوی عبدالحق کی داستان زندگی کا وہ قابل ذکر عنوان ہے جس میں سرسید، حالی اور مولوی ندیر احمد کے ایسے نامور ان علی گڑھ کے خطبات کے اثرات کی

کارفرمائی شامل ہے۔ مولوی عبدالحق کے خطبات کے دامن میں سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک یا دوسرے نامورانِ علی گڑھ کے کارناموں کے ذکر کی جو فراوانی ملتی ہے وہ مولوی عبدالحق کی خطابت پر نامورانِ علی گڑھ کی گہری چھاپ کی غماز ہے۔ مولوی صاحب کے خطبوں کی آسان زبان بھی سرسید اور حالی کی تقریروں کی آسان زبان کی آئینہ دار ترجمان معلوم ہوتی ہے۔ بابائے اردو عام طور پر جس مقام پر تقریر کرتے اس سرزمین کی تاریخی اور ادبی روایات کے بیان سے سامعین کو محفوظ و مسرور کرنے کے ہنر سے کام لیتے تھے۔ بابائے اردو نے کامیاب خطابت کا یہ ہنر سرسید ہی سے سیکھا تھا۔ مولوی صاحب اپنی تقریروں میں سرسید کے اس ہنر کی بڑی کامیاب پیوند کاری کرنے کے گہرے پوری طرح قادر تھے۔

بابائے اردو کی ادبی زندگی کا آغاز علی گڑھ کالج میں دورانِ تعلیم ان ادبی مضامین سے ہوا جو ہندوستان پر الاخلاق علی گڑھ اور علی گڑھ میگزین میں چھپے تھے۔ مولوی صاحب کو اپنے ایک ابتدائی مضمون پر علی گڑھ کالج میں لارڈ لیتیس ڈاؤن میڈل ملا تھا۔ مولوی صاحب نے دورانِ تعلیم علی گڑھ میں ایک مضمون سینٹ پال پراور ایک مضمون بایوں کے مذہب پر بھی لکھا تھا۔ یہ شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ بابائے اردو کی ادبی زندگی کی بنیادیں علی گڑھ کالج ہی میں اُستوار ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انبارِ دربارِ ادبی اور علمی کارناموں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد ایسی ہے جس میں سرسید یا ان کی علی گڑھ تحریک کے اثرات کی کارفرمائی جلوہ گر ملتی ہے۔ یہاں تفصیل میں نہ جا کر ہم ایجاز سے کام لیتے ہوئے بابائے اردو کے علمی اور ادبی کارناموں میں سرسید یا ان کی علی گڑھ تحریک کے اثرات کا تجزیاتی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے متعدد ایسی قدیم و نایاب علمی اور ادبی کتابوں کی ترتیب، تدوین، تقدیم و تقدیر یا اشاعت کا کام سرانجام دیا ہے جو گوشتہ گم نامی کے تاریک نہاں خانوں میں پڑی وقت کی گرد میں روپوش تھیں۔ ان کتابوں میں فارسی و اردو شاعروں کے قدیم تذکرے جنوبی و شمالی ہند کے پرانے شاعروں اور شہنشاہوں کے منظوم و منثور ادبی آثار جیسی انبارِ دربارِ چیسز ہیں۔ ترتیب و تدوین کے علمی اور ادبی کاموں میں بابائے اردو کی یہ لگن ہمیں ان کے معنوی استاد سرسید کی یاد دلاتی ہے جو اسی قسم کے تدوینی کاموں سے غیر معمولی دل چسپی رکھتے تھے۔ سرسید کی آثارِ اصنافِ ادب اور آئینِ اکبری جیسی کتابیں ان کی اسی دل چسپی کا ثمرہ ہیں۔

بابا بے اردو کی متعدد کتابیں ٹائپ میں بھی شایع ہو چکی ہیں۔ ٹائپ کی چھپائی مولوی عبدالحق کی پسند تھی مولوی صاحب کے معنوی استاد سرسید بھی ٹائپ کی چھپائی کو پسند کرتے تھے۔ ٹائپ کی طباعت کو پسند کرنے میں بابا بے اردو پر سرسید کے اثرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

مولوی عبدالحق کے ادبی کاموں میں کامیاب خاکہ نگاری ایک اہم عنوان ہے۔ مولوی صاحب نے اس میدان میں جو کامیاب مرقعے پیش کیے ہیں ان میں ناموران علی گڑھ کے بھی متعدد ایسے یادگار قلمی خاکے شامل ہیں جو بابا بے اردو کی خاکہ نگاری پر سرسید کی علی گڑھ تحریک کے مثبت ہونے والے اثرات کے اچھے ثبوت ثابت ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی کتاب "چند ہم عصر کا مطالعہ ہمارے ان معروضات کی تصدیق کرتا ہے۔"

بابا بے اردو کی ادبی زندگی میں ان کا نشری اسلوب بھی اہم ادبی کارنامہ ہے جو سراسر حالی اور سرسید کے نشری اسلوب سے متاثر نظر آتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے اردو کے دامن کو دوسری زبانوں کی بہت سی علمی کتابوں کے ترجموں سے مالا مال کرنے کا جو زبردست کام دکن میں ناظم دارالترجمہ کی حیثیت سے سرانجام دیا وہ سرسید کی سائنسی فک سوسائٹی کے ماتحت ہونے والے ترجموں کے کاموں کی یاد دلاتا ہے۔

سرسید نے اردو یونیورسٹی کا جو خواب دیکھا تھا وہ بابا بے اردو مولوی عبدالحق نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی شکل میں پورا کر دیا۔ کھایا جس میں تمام مضامین کی تعلیم کا کام اردو زبان میں ہونے لگا تھا مگر ملک کے سیاسی حالات نے مولوی صاحب کے اس کام اور سرسید کے خواب کو چکنا چور کر ڈالا۔ مولوی عبدالحق نے سرسید کے خواب اردو یونیورسٹی کو قائم کرنے کی کوششیں پاکستان میں بھی اپنی آخری سانس تک جاری رکھی تھیں مگر پاکستان میں ان کی یہ تمام کوششیں ان کی زندگی میں ناکام رہی تھیں۔

بابا بے اردو مولوی عبدالحق ہمارے ان ادیبوں میں تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی اردو زبان کی خدمت گزاری میں گزاری تھی۔ اردو زبان کی خدمت بابا بے اردو کی زندگی کی داستان وہ اہم و بہتم بالشان عنوان ہے جس کے ذکر کے بغیر اردو زبان کی نشوونما کی تاریخ کی تکمیل ممکن نہیں۔ مولوی عبدالحق ۱۹۱۲ء سے اگست ۱۹۷۱ء میں اپنی آخری سانس تک ہندوستان اور پاکستان میں

جس انجمن ترقی اردو سے سکریٹری یا صدر کی حیثیت سے وابستہ رہے وہ جنوری ۱۹۰۳ء میں اپنے قیام سے دسمبر ۱۹۹۱ء تک اب اپنی زندگی کے ۸۸ سال پورے کر چکی ہے۔ انجمن ترقی اردو کی اس ۸۸ سالہ زندگی میں باباے اردو مولوی عبدالحق کی معتمدی یا صدارت کے دور کی مدت (۱۹۱۲ء تا ۱۹۶۱ء) تقریباً پچیس سال متعین ہوتی ہے اور باقی تقریباً ۳۸ سال کا زمانہ دوسرے اصحاب کا حصہ رہا ہے بشمول اعداد و شمار اس بات کا اثبات کرتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو کی معتمدی یا صدارت میں تنہا باباے اردو کا جو پچاس سالہ زمانی حصہ رہا ہے وہ اس انجمن کی تاریخ میں ایک ایسا یادگار ریکارڈ ہے جسے باباے اردو سے قبل یا بعد کے تمام معتمدین انجمن مل کر بھی آج تک توڑنے سے قاصر رہے ہیں۔ باباے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کے اس یادگار کارنامے پر بے اختیار یہ اشعار یاد آتے ہیں:۔

۱۔ سب یہ جس بار نے گرانی کی۔ اس کو یہ ناتواں اٹھالایا ۲۹

۲۔ آسمان بار امانت نہ توانست کشید۔ قرعہ قال بنا مین دیوانہ زندہ ۳۰

مولوی عبدالحق نے جب ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کی معتمدی کا بار سنبھالا تو ان سے قبل ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء تک مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور مولوی محمد عزیز مرزا (متوفی ۲۶ فروری ۱۹۱۲ء) کے ایسے تین اہم ناموران علی گڑھ انجمن کے سکریٹری رہ چکے تھے ۳۱ مگر اس تلخ حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء تک انجمن ترقی اردو کی تاریخ کا ابتدائی نو سالہ زمانہ ایک تاریک و ناکام دور یا تھا اور باباے اردو جب ۱۹۱۲ء میں انجمن کے چوتھے سکریٹری ہوئے تو انجمن کی کشتی نامساعد حالات کے سیلاب اور ناسازگار طغیانی کے گرداب سے دوچار رہ کر غرقاب ہونے والی تھی۔ باباے اردو منجد چار میں پھنسی انجمن کی اس ڈولتی اور ڈوبتی ہوئی ناؤ کو پار لگانے میں پتو اور ثابت ہوئے۔

انجمن ترقی اردو کے سفینے کی کامیاب ناخدائی جو باباے اردو کی زندگی کا سب سے اہم و یادگار کارنامہ مانا جاتا ہے اس کے سرے بھی سرسید کی علی گڑھ تحریک سے ملتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ انجمن علی گڑھ تحریک کے ماتحت سرسید کے ہاتھوں ۱۸۸۶ء میں قائم ہونے والی محمدن ایجوکیشنس کانفرنس علی گڑھ کا ایک ایسا ذیلی ادارہ رہی ہے جس کا قیام ۱۹۰۳ء میں عمل میں آیا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان دونوں ہی ملکوں میں انجمن ترقی اردو کے معتمدوں



سربراہوں اور سرپرستوں کی طویل فہرست میں ایسے نامورانِ علی گڑھ کا ہجوم نظر آتا ہے جو خود بھی علی گڑھ تحریک یا علی گڑھ کالج سے وابستہ رہے ہیں اور جنہوں نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر قیام ہونے والی محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جزئی یعنی انجمن ترقی اردو کو پال پوس کر پروان چڑھایا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے عہدے داروں کی یہ مرعوب کن فہرست اپنے دامن میں جن نامورانِ علی گڑھ کے نام رکھتی تھی ان میں سے چند قابل ذکر ہستیاں یہ ہیں: مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولوی عزیز مرزا، باباے اردو مولوی عبدالحق، عماد الملک نواب سید حسین بلگرامی، سر اس مسعود (سر سید کے حقیقی پوتے) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، آل احمد سرور، ڈاکٹر خلیق انجم اور اختر حسین وغیرہم۔

انجمن ترقی اردو ۱۹۱۲ء میں باباے اردو کی معتمدی سے قبل تک ایک قالب بے جان تھی۔ مولوی عبدالحق نے انجمن کے اس قالب بے جان میں اپنی معتمدی کے دوران ایک نئی روح پھونکنے کا تاریخی کام سرانجام دے کر سر سید کی محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے یادگار پودے انجمن ترقی اردو کو نہ صرف مرجھانے سے بچا لیا بلکہ اس کو پال پوس کر پروان بھی چڑھایا۔ آج سر سید کی علی گڑھ تحریک کے باغ کی محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی کیاری سے اگنے والا انجمن ترقی اردو کا یہ شجر سایہ دار ہندوستان اور پاکستان میں جس طرح برگ و بار لایا ہے اسے اس شجر سایہ دار کے مالی باباے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کا ایک یادگار اور سدا بہار کارنامہ قرار دیا جانا چاہئے۔

اس مقالے کے اختتام میں پروفیسر خواجہ تنویر حسین کا یہ بیان پیش کرتا ہوں

نہ ہوگا

”سر سید کو اردو زبان سے دلی رگاو تھا۔ وہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے آرزو مند تھے اور ٹیکر یونیورسٹی ان کا تعلیمی نصب العین تھا۔ عبدالحق نے بھی ”خدمتِ اردو“ اپنا مسلک اپنا مقصد حیات بنایا۔ جس دل جوئی اور دوسوڑی سے انہوں نے ترقی اردو کے لیے جدوجہد کی اس کا اندازہ ۱۹۱۲ء کی انجمن ترقی اردو اور آج کی انجمن ترقی اردو سے ہو سکتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جب مولوی صاحب کو انجمن کا سکریٹری نام زد کیا گیا تو انجمن کی کل کائنات ایک پیرانا صندوق، ایک رجسٹر، چند پرلے اور غیر مرتب مسودات (اور) ایک قلم دوات تھی یہی انجمن جب ۱۹۳۸ء میں اورنگ آباد سے دہلی منتقل کی گئی تو صرف انجمن کی

مطبوعات مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لادی گئیں۔ جن کی قیمت کا اندازہ (۱۹۳۸ء میں) کم و بیش ایک لاکھ روپیہ لگایا گیا تھا۔ آج بھی بھارت میں اور پاکستان کے ہر بڑے شہر میں اس کی شاخیں قائم ہیں ۲۴

اس مقالے میں بابا اے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کی داستان کے ہر اہم عنوان میں جگہ جگہ سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک کے جو نشان پیش کیے گئے ہیں وہ اس بات کا اثبات کرتے ہیں کہ علی گڑھ بابا اے اردو کے سفرِ حیات میں ایک نہایت اہم منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

## حواشی

۱۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے مولوی عبدالحق کی تاریخ ولادت ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء لکھی ہے مگر مولوی صاحب کے ہم وطن چودھری شرف الدین نے مولوی عبدالحق کے ایک قریبی دوست وصی احمد بنگرامی کے حوالے سے مولوی صاحب کی تاریخ ولادت ۱۰ مارچ ۱۸۷۰ء قرار دی ہے جس کی تصدیق بعد کو خود مولوی صاحب نے بھی کر دی تھی۔ دیکھیے:

۱۔ عبدالحق: مختار الدین احمد۔ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی طبع ۱۹۸۲ء ص ۱۱ نیز ص ۴۴

۲۔ مضمون ”مولوی عبدالحق مرحوم“؛ چودھری شرف الدین مطبوعہ قومی آواز لکھنؤ ہفتہ وار ضمیمہ مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۲

۳۔ عبدالحق: مختار الدین احمد ص ۱۱ تا ۴۴

۴۔ بابا اے اردو۔ احوال و افکار: ڈاکٹر سید معین الرحمن۔ نئی دہلی طبع مئی ۱۹۷۹ء ص ۲۰۳ تا ۲۰۴

۵۔ دیکھیے: ۱۔ مقالہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی بہ عنوان ”بابا اے اردو“ مشمولہ کتاب بابا اے اردو

مولوی عبدالحق: مرتبہ عبداللطیف اعظمی۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ طبع ۱۹۷۱ء

ص ۸۴

۲۔ عبدالحق ص ۱۴

۵۔ دیکھیے: ۱۔ عبدالحق: مختار الدین احمد ص ۱۳

۲۔ رسالہ اردو کراچی (بابا اے اردو نمبر ۱۹۷۲ء)؛ مرتبہ سید وقار عظیم۔ مقالہ

شیخ احمد حسن (برادر مولوی عبدالحق مرحوم) بہ عنوان "اہدی بھائی" ص ۱۲

۳۔ نصائی جاکسے: (کاظم علی خاں) نظامی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۹۱ء ص ۱۷

۴۔ بابائے اردو۔ احوال و افکار ص ۲۰۴ تا ۲۰۵ نیز ص ۲۱۷

۵۔ مقالہ پروفیسر رشید احمد صدیقی بہ عنوان "بابائے اردو" مشمولہ کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق ص ۸۴

۶۔ سرسید احمد خاں کا مشہور و مقبول رسالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۷ء سے ۲ فروری ۱۸۹۷ء تک بہ تفصیل ذیل تین ادوار میں جاری رہا تھا:

۱۔ پہلا دور ۲۴ دسمبر ۱۸۷۷ء تا ۲۰ ستمبر ۱۸۷۹ء

۲۔ دوسرا دور ۲۳ اپریل ۱۸۷۹ء تا ۲۸ جولائی ۱۸۸۱ء

۳۔ تیسرا دور ۷ اپریل ۱۸۹۴ء تا ۲ فروری ۱۸۹۷ء

سرسید (متوفی ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) کے رسالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے تیسرے

اور آخری دور کے ایک سال کی جلد میرے کتب خانے میں موجود ہے جس میں یکم

شوال ۱۳۱۲ھ سے یکم رمضان ۱۳۱۳ھ (مطابق ۲۸ مارچ ۱۸۹۵ء سے ۱۵ فروری ۱۸۹۶ء)

تک کے شمارے شامل ہیں۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے ادوار مقالات سرسید

مرتبہ محمد عبداللہ خاں خویشتگی علی گڑھ (سند اشاعت ندارد) ص ۱۳ تا ۱۴ کے

حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ سرسید کی تاریخ وفات حیات جاوید: الطاف حسین

حالی۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی طبع ۱۹۷۵ء ص ۲۸۲ سے نقل کی گئی ہے۔ کاظم

علی خاں۔

۷۔ علی گڑھ کالج اور سرسید کی حیات و خدمات کے لیے دیکھیے:

۱۔ انگریزی کتاب "سرسید اینڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" کاظم علی خاں۔ پرنکاش

کیندر لکھنؤ طبع ۱۹۶۷ء

۲۔ انگریزی کتاب "سرسید احمد خاں" کے اے۔ نظامی۔ دہلی طبع نومبر ۱۹۶۶ء

۳۔ حیات جاوید: حالی

۴۔ انتخاب مضامین سرسید: مرتبہ عتیق احمد صدیقی۔ لکھنؤ طبع ۱۹۸۳ء ص ۱۹

۲۲ تا

۱۔ یہاں سے اگلی سطور میں ہم نے خود اپنے ایک مقالے "بندوستانی نشاۃ ثانیہ کے خدوخال" مطبوعہ رسالہ غالب نامہ نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۹۱ء (س ۱۷۰ تا ۱۷۳) کے بعض حصوں سے مدد لی ہے۔ کاظم علی خاں۔

۲۔ رجوع کیجیے: ۱۔ انگریزی کتاب "دی اسپرٹ، اینڈ سبزسٹنس آف اردو پروزانڈر دی انفلوئنس آف سرسید احمد خاں: ایس۔ ایم۔ عبداللہ۔ لہور طبع ۱۹۴۰ء

۲۔ رسالہ فکر و نظر علی گڑھ کے "ناموران علی گڑھ" کے عنوان سے شایع ہونے والے پہلے اور دوسرے کارواں سے متعلق ابتدائی دو شمارے

۳۔ رسالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مورخہ یکم شوال ۱۳۱۲ھ (مطابق ۲۸ مارچ ۱۸۹۵ء ص ۱۳ تا ۱۴) نیز تہذیب الاخلاق علی گڑھ مورخہ یکم ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ (مطابق ۲۴ مئی ۱۸۹۵ء) ص ۲۳ تا ۲۴ جن میں مولوی سید کرامت حسین کے دو عدد مضامین شامل ہیں۔

۴۔ ادبی تبصرے: عبدالحق۔ دانش محل لکھنؤ طبع ۱۹۴۷ء ص ۱۸ تا ۲۴ برائے عماد الملک سید حسین بلگرامی

۵۔ تنقیدات عبدالحق: مرتبہ محمد تراب علی خاں باز کتب خانہ عزیز بیہیدر آباد دکن طبع دوم ص ۷ تا ۱۰ برائے محسن الملک وقار الملک

۱۲۔ چند ہم عصر: ڈاکٹر عبدالحق۔ حیدر آباد دکن طبع ۱۹۷۲ء ص ۱۳۷

۱۳۔ بابا بے اردو۔ احوال و افکار ص ۲۱۱ تا ۲۱۲

۱۴۔ ایضاً ص ۲۱۵

۱۵۔ سرسید احمد خاں۔ حالات و افکار: بابا بے اردو ڈاکٹر عبدالحق۔ اردو مرکز دہلی طبع ستمبر ۱۹۹۲ء ص ۲۵ تا ۲۶

۱۶۔ فیض کا یہ شعر یہاں قدرے تصرف کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ فیض احمد فیض کے اس شعر کی



اصل شکل یہ ہے :-

شمع نظر خیال کے انجم، جگر کے داغ۔ جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں  
دیکھیے :- ۱۔ رہ نماے بیت بازی : مرتبہ کاظم علی خاں۔ نامی پریس لکھنؤ طبع جولائی ۱۹۸۲ء

ص ۱۳۷

۲۔ کلام فیض (عکسی) علی گڑھ طبع ۱۹۸۲ء ص ۲۱۵

۳۔ محسن الملک مولوی مہدی علی (وفات ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء) کے حالات درج ذیل مصادر میں موجود ہیں :

۱۔ چند ہم عصر ص ۱۳۷ تا ۱۴۷

۲۔ تنقیدات عبدالحق ص ۷ تا ۱۰

۳۔ رسالہ فکر و نظر علی گڑھ : خصوصی شمارہ "ناموران علی گڑھ" (پہلا کارواں) :

مدیر نور الحسن نقوی طبع اگست ۱۹۹۵ء ص ۶۱ تا ۷۲

۴۔ عبدالحق ص ۲۲

۵۔ رجوع کیجیے : چند ہم عصر ص ۷۱ تا ۷۷

۶۔ عبدالحق ص ۲۲

۷۔ رسالہ فکر و نظر علی گڑھ : خصوصی نمبر "ناموران علی گڑھ" (دوسرا کارواں) ص ۱۲۹

تا ۱۴۵ میں مولوی محمد عزیز مرزا (زمانہ حیات مئی ۱۸۶۱ء تا ۲۶ فروری ۱۹۱۲ء)

کے حالات موجود ہیں۔

۸۔ وقار الملک مولوی مشتاق حسین (۱۸۴۱ء تا جنوری ۱۹۱۷ء) کے حالات کے لیے دیکھیے :

۱۔ وقار حیات (یہ ضخیم کتاب میری نظر سے برسوں قبل گزری تھی مگر اب پیش نظر نہیں)

۲۔ رسالہ فکر و نظر علی گڑھ "ناموران علی گڑھ" (پہلا کارواں) ص ۷۲ تا ۸۶

۳۔ خطوط وقار الملک : مرتبہ مشتاق احمد۔ علی گڑھ طبع ۱۹۷۷ء

۴۔ تنقیدات عبدالحق ص ۷ تا ۱۰

۵۔ عبدالحق ص ۲۲ تا ۲۳

۲۱۔ عبدالحق ص ۲۳، ص ۲۵ نیز ص ۳۱ تا ۳۹

۲۲۔ دیکھیے : ۱۔ عبدالحق ص ۳۲ تا ۴۰

۲۔ کل پاکستان انجمن ترقی اردو کا المیہ : عبدالحق - کراچی (سنہ اشاعت ندارد) میں مولانا

عبدالحق کے قائم کردہ کالج (کراچی) کے تفصیلی حالات موجود ہیں۔

۲۳۔ انگریزی کتاب ”سید احمد خاں“ کے۔ اے۔ نظامی ص ۳۷ تا ۱۷۵

۲۴۔ بہ حوالہ کتاب بابا اے اردو مولوی عبدالحق : مرتبہ عبداللطیف اعظمی ص ۱۲ تا ۴۵، ص ۵۶ ص ۸۸

ص ۲۸۷ نیز ص ۳۱۲

۲۵۔ دیکھیے : ۱۔ عبدالحق ص ۷۲ تا ۸۳

۲۶۔ رسالہ سہ ماہی اردو کراچی بابا اے اردو نمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۳

۲۷۔ خطوط مشاہیر بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب : مرتبہ نیر مسعود۔ شایع کردہ یو۔ پی۔

اردو اکادمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۵ء (ص ۲۴۳) میں مسعود حسن رضوی ادیب کے نام اپنے ایک

خط میں بابا اے اردو مولوی عبدالحق نے اردو ٹائپ کی طباعت کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار

یوں کیا ہے : ”۔۔۔ اس کا البتہ مجھے افسوس ہے کہ آپ ٹائپ کو پسند نہیں فرماتے۔ آپ ہی

صاحبوں سے یہ توقع ہے کہ اس کے رواج کی کوشش کریں گے اور جب آپ کی طرف سے

یہ خیال ظاہر ہوتا ہے تو کسی قدر مایوسی ہوتی ہے۔ اب لوگ رفتہ رفتہ ٹائپ پسند کرنے لگے ہیں۔

حال ہی میں ایک صاحب نے ایک کتاب ہمارے مطبع میں ٹائپ میں چھپوائی

ہے۔ آپ اسے ملاحظہ فرمائیے۔۔۔۔“

۲۸۔ رجوع کیجیے کتاب دار الترمیم عثمانیہ کی علمی اور ادبی خدمات : ڈاکٹر مجیب الاسلام۔ دہلی طبع مارچ

۱۹۸۷ء ص ۲۶ تا ۲۸، ص ۵۳ تا ۵۵ نیز ص ۱۵۱ تا ۱۵۲

۲۹۔ ریک : ۱۔ بابا اے اردو مولوی عبدالحق ص ۲۴۵ تا ۳۱۸

۲۔ کل پاکستان انجمن ترقی اردو کا المیہ : عبدالحق - کراچی (سنہ طباعت غالباً ۱۹۵۸ء)

۳۔ سہ ماہی رسالہ اردو کراچی بابا اے اردو نمبر ۱۹۶۲ء ص ۳۰۴ تا ۳۱۱

۳۰۔ کلیات میر (جلد اول) : مرتبہ نعل عباس عباسی۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی طبع ۱۹۸۳ء ص ۱۳۸

۳۱۔ فرہنگِ امثال: مرتبہ مسعود حسن رضوی، ادیبِ کتاب نگر لکھنؤ، طبع ۱۹۵۸ء، ص ۱۵  
 ۳۲۔ رسالہ فکر و نظر علی گڑھ خصوصی شمارہ "نامواریت علی گڑھ" (دوسرا کارواں) ص ۱۴۰ تا ۱۴۱  
 ۳۳۔ ریک : ۱۔ عبدالحق ص ۳۲

۲۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ص ۲۴۵ تا ۲۷۲

۳۳۔ رجوعِ کبھی : ۱۔ حیاتِ جاوید ص ۲۴۲

۲۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ص ۲۴۵

۳۴۔ رسالہ سہ ماہی اردو کراچی۔ بابائے اردو نمبر ۱۹۴۲ء ص ۲۴۵ (مقالہ پر وفیسر خواجہ تھوڑ حسین)

## مولوی عبدالحق اور دیوان غالب

اردو پر مولوی عبدالحق کے جو احسانات ہیں ان میں اردو ادب کے شہ پاروں کی تدوین و اشاعت سرفہرست ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کسی منصوبے میں دیوان غالب کی شمولیت کو نظر انداز کیا جانا ناممکن ہے۔ حالانکہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام مولوی صاحب دیوان غالب شائع کروانے میں کامیاب نہیں ہوئے تاہم اس سلسلے میں انھوں نے جو کوششیں کیں وہ قابل ذکر ہیں۔

یوں تو کلام غالب کی اشاعت کا خیال مولوی عبدالحق کے ذہن میں کافی عرصے تھا اُسے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں ایک منصوبے کی شکل دی۔ رسالہ ”الناظر“ (لکھنؤ) کے مدیر ظفر الملک علوی کو خیر بھراپنے ایک خط میں مولوی صاحب نے (جو کہ ”الناظر“ کے شمارہ بابت مئی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا) اپنے ان خیالات کا اظہار کیا۔

”جناب مخدومی، تسلیم!

انجمن ترقی اردو نے ارادہ کیا ہے کہ اس مرتبہ اپنی نگرانی میں دیوان غالب اردو کا ایک صحیح اور عمدہ نسخہ چھپوا کر شائع کرے۔ جناب کو معلوم ہے کہ غالب کی قبولیت اور فلسفیانہ شاعری کی قدر روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مرحوم کا کلام پسند کرنے والے پڑھنے کی نسبت کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ پس بالکل بر محل ہے ایک جماعت کثیر کی خواہش پوری کرنے کا سامان کیا جائے اور پڑھنے والے نسخوں کے بجائے جن میں ناقص کاغذ اور غلط کتابت سے زیادہ کوئی شے نمایاں نہیں، ایک پاکیزہ اور خوب صورت مجلد بازار میں آجائے جب کہ طوطا کہانی اور دلفروزش نالک تک سفید کاغذوں پر چھپ رہے ہیں، باعث حجاب ہونا چاہئے کہ اردو علم و ادب کے مایہ ناز اور انقلاب افکن شاعر کا ہر تاثیر ترانہ ٹپا لے اور بے نور کاغذوں پر شکوہ گزار کس پیرسی ہوا ڈالے



مولوی صاحب نے دیوان غالب کے مطبوعہ ایڈیشنوں کی جس کس پیروی کی طرف توجہ دلائی تھی، اُس سے مشہور انگریزی ناول نگار ای ایم فارسٹر کا وہ تبصرہ یاد آتا ہے جو اس نے ۱۹۱۲ء میں دورہ ہندوستان کے دوران کیا تھا۔ پروفیسر ہارون خاں شیرانی نے راقم الحروف کو یہ بتایا تھا کہ ایک دن دہلی کے چاندنی چوک میں اپنے دوست سر اس مسعود کے ساتھ گھومتے ہوئے فارسٹر نے اردو کے سب سے اہم شاعر کے بارے میں استفسار کیا اور جب اس مسعود نے غالب کا تذکرہ کیا اور غالب کے اشعار ترجمہ کر کے سنائے تو فارسٹر نے دیوان غالب کا ایک نسخہ حاصل کرنے کی خوش غماہی کی۔ لیکن اس وقت جو مطبوعہ نسخے دستیاب تھے اُن کا غنڈ بہت معمول تھا، ورطاعت نہایت ناقص۔ اس پر فارسٹر نے اپنے تعجب کا اظہار کیا اور مسعود سے کہا کہ تم جس شاعر کو عظیم سمجھتے ہو، اس کا دیوان ایسے کاغذ پر چھاپا ہے جس سے ہم اپنا بدن بھی صاف کرنا پسند نہ کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس مسعود میں تبصرے پر تمل لگتے اور انھوں نے اپنے کئی دوستوں اور اردو کے ہمدردوں سے ذکر کیا جن میں پروفیسر ہارون خاں شیرانی، نامی پریس کانپور کے مالک رحمت اللہ رحیم، نظامی بدایونی شامل تھے۔ مولوی عبدالحق کے مذکورہ بالا تاثرات میں بھی ای ایم فارسٹر کے تبصرے کی ہی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

دیوان غالب کے ایک صحیح اور نفیس ایڈیشن کی اشاعت کے علاوہ مولوی صاحب نے یہ تجویز بھی کی کہ ساتھ ہی ساتھ اس وقت کے مقتدر دیہوں سے غالب حیات، شخصیت اور فن پر مضامین لکھوا کر انھیں بھی شائع کرائے۔ چنانچہ وہ ظفر الملک صاحب کو اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں:

”یہ ایسا مجلس علمی کی تقلید میں ہے کہ، انجمن اساتذہ ماضیہ پر موجودہ ارباب ذوق سے اُن کی رائے لکھوانے کا خواہاں ہے تاکہ اُس کے شائع کردہ نسخے میں خصوصیت بھی پیدا ہو جائے اور مستند دہائے وقت کا مجموعہ آرا اردو علم و ادب میں ایک دلکش اضافہ ہو اور اردو کی شاعری کے طلباء کو مفید اعانت بھی اس سے مل سکے۔“

اسی غرض سے میں نے ذیل میں چند عنوانات قائم کیے ہیں اور ہر بحث کے

مقابل میں حضرت کے نام درج ہیں جنہیں اس بارے میں زحمت دی گئی ہے۔۔۔

- ۱۔ مرزا صاحب کے خاندانی حارات، تعلقات، حباب واقعات کے ساتھ، عوام و خواص کے ساتھ ان کا بڑاؤ اور عام گفتار، کردار، نسبت بر خاست، معاشرت کا طریقہ و نواب سعید الدین احمد خاں صاحب

غالب دہلوی۔

۲۔ مرزا صاحب کی شاعری کی خصوصیات، ان کی زبان اور طرز بیان کی جدت، مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی و مولوی رضا علی صاحب وحشت کلکتہ۔

۳۔ مرزا صاحب کی اردو شاعری میں فارسی کا امتزاج اور سائنڈ فارسی سے اس کا تاثر، مولانا شبلی نعمانی۔

۴۔ مرزا صاحب کا فلسفہ شاعری اور اس کا مقابلہ یورپ کے بعض نامور شعراء سے، ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اقبال لاہور۔

۵۔ مرزا صاحب کی شاعری کا اثر اردو زبان پر، مولانا عبد الحلیم صاحب شکر لکھنوی و مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی۔

۶۔ مرزا صاحب کی اردو نثر اور اس کی خصوصیات، مولانا فضل الحسن حسرت موہانی و راقم الحروف عبد الحق۔

(جناب مولانا حالی کی خدمت میں بھی عرض کیا گیا ہے اگر وہ کچھ تکلیف لکھنے کی فرما سکیں تو انجمن کے لیے اس سے بڑھ کر قابل رشک کوئی اعزاز نہیں)۔

دیوان غالب کے اس ایڈیشن پر آنے والے خرچ کے لیے بھی مولوی عبد الحق نے ایک تجویز پیش کی تھی جو "الناظر" کے جون ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

"گزشتہ رپورٹ میں دیوان غالب کے ایک نفیس اور صحیح ایڈیشن کے طبع کے متعلق

مسٹر محمد علی بی. اے (آکسن) اڈیٹر کامریڈ و ہمدرد کی خدمت میں یہ استدعا پیش کی گئی

ہے کہ جو فنڈ انھوں نے مرزا صاحب کے مقبرے کی تعمیر و تعمیر کے لیے جمع کیا تھا اور

اب وہ کسی وجہ سے اس کام میں صرف نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ رقم اس ایڈیشن کے طبع

کے لیے بہ اجازت معطیان عنایت فرمائی جائے تو مرحوم کی ایک عمدہ یادگار ہوگی۔ ابھی

اس کے متعلق موصوف کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا ہے"۔

مولانا محمد علی نے ۱۹۱۱ء میں غالب کے مزار کی تعمیر کے لیے پر جوش کوشش شروع کی تھی اور ساتھ ہی

ساتھ اس جانب توجہ دلائی تھی کہ "غالب" کی کوئی عمدہ سوانح حیات بھی مرتب نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ

مولانا حالی کی یادگار اپنی جگہ بہت خوب ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وہ غالب کے شایان شان ہے اور نہ

خود خاندان کے۔ غالب کی نظم و نثر کا بھی کوئی اچھا ایڈیشن موجود نہیں۔ برہمہ غالب کے نئے اور سستے ایڈیشن تو انھیں ہم مجموعہ غلام کا ایک کرشمہ کہہ سکتے ہیں۔ مولانا محمد علی نے غالب کے مزار کی تعمیر کے لیے جو فنڈ شروع کیا تھا اس میں سگلے چھ ماہ میں ۵۷ روپے جمع ہو گئے تھے۔ مگر لیکن جب ۱۹۱۴ء کے آخر میں آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی میں منعقد ہوئی تو ۲۷ دسمبر کو ہندو مسیحی مولوی عبدالحق نے بتایا کہ مولانا محمد علی نے کہا کہ

”غالب کا مقبرہ بنانے کے لیے جو روپیہ کامریڈ کے ذریعے انھوں نے جمع کیا ہے وہ کلام غالب کا عمدہ ایڈیشن چھاپنے کے لیے نہیں دینا چاہیے بلکہ غالب کا مقبرہ بنانے میں ہی اس کو صرف کریں گے۔ البتہ اپنی طرف سے مبلغ ایک صد روپیہ عنایت فرمائیں گے۔“  
راولپنڈی کے اسی اجلاس میں انجمن ترقی اردو کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے دیوانی غالب کے بارے میں بتایا کہ

”انجمن نے ایک صحیح اور عمدہ ایڈیشن چھاپنے کا ارادہ کیا ہے اور اس خیال کو اکثر اصحاب نے پسند فرمایا ہے اور اس کے ساتھ یہ جدت بھی کرنی چاہی کہ اردو زبان کے نامور اہل قلم سے مرزا صاحب کی خصوصیات شاعری پر مضامین لکھوا کر ان کے کلام کے ساتھ شائع کیے جائیں۔ چنانچہ ملک کے مشہور اور نامور دانشا پردازوں سے یہ استدعا کی گئی لیکن سوائے مولوی عبدالحلیم صاحب شرر اور مولوی رضا علی صاحب وحشت کے کسی نے حامی نہ بھری۔ لیکن اب تک ان صاحبوں سے بھی مضامین حاصل نہیں ہوئے۔ خوش قسمتی سے مرزا صاحب کے دیوان کا ایک صحیح قلمی نسخہ دستیاب ہو گیا ہے۔ یہ نسخہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب تیر نے لکھوایا تھا اور مرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا ہے جناب نواب احمد سعید خاں صاحب نے بہمال عنایت و لطف وہ نسخہ انجمن کو مستعار عنایت فرمایا اور انجمن نے اس پر سے ایک نسخہ تیار کر لیا ہے۔ لیکن چوں کہ مرزا صاحب کا کلام مشکل و دقیق ہے اس لیے یہ خیال کیا گیا کہ بعض بعض مقامات پر ضروری حواشی اور شرح بھی لکھ دی جائے۔ یہ ایڈیشن تیار ہو رہا ہے اور آئندہ سال طبع کیا جائے گا۔ جناب نواب عماد الملک بہادر نے جو خود بڑے ادیب اور صاحب ذوق ہیں، انراہ قدردانی

پانسو روپیہ اس کے اخراجات کے لیے مرحمت فرمائے ہیں، لکھ

اسی رپورٹ میں مولوی عبدالحق نے یہ بھی بتایا کہ انجمن کے لیے اس دیوان کو سید ہاشمی مرتب کر رہے

تھے۔ خود سید ہاشمی نے اس سلسلے میں یہ تجویز کیا ہے :

”تجویز یہ تھی کہ دیوان غالب کو عمدہ کاغذ پر خوش خط اور صحیح طبع کرایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو مرزا صاحب کے غیر مطبوعہ یا گم شدہ کلام بھی تلاش کیا جائے۔ اس کے ساتھ چند مشہور ادیبوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کلام غالب کے مختلف پہلوؤں پر مضامین تحریر فرمائیں تاکہ انجمن کے نسخے میں ایک علمی شان پیدا ہو جائے۔ تجویز کے اسی آخری حصے کی بدولت کتاب کی تیاری میں بہت دیر ہوئی۔ صرف جناب رضا علی وحشت (کلکتہ) نے انجمن کی درخواست پر ایک دل چسپ مضمون ارسال فرمایا۔ لیکن دیگر حضرات نے یا تو یہ درخواست قبول ہی نہ کی اور یا قبول کی تو ایفائے وعدہ نہ کر سکے۔ دیوان کو صحیح اور جدید اصول تحریر کے مطابق لکھوانے اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی خدمت راقم الحروف کے سپرد ہوئی تھی اور ۱۹۱۵ء تک کتاب کا مہیضہ تیار ہو گیا۔ نیز مختلف ذرائع سے جو کچھ غیر مطبوعہ کلام مل سکا اُسے شامل کر لیا گیا۔“

انجمن ترقی اردو کے لیے سید ہاشمی نے جو دیوان مرتب کیا تھا وہ جناب خیر بھوروی کے پاس تھا۔ انھوں نے اس کی مختصر کیفیت اپنے مضمون ”کچھ رنگین تصویر کے بارے میں“ ”شاعر“ (بہشتی) غالب نمبر ۱۹۴۹ء (ص ۱۸۴، ۱۸۵) میں درج کی ہے۔ بعد میں یہ ڈاکٹر احمد لاری (گوکھپور) کے پاس آیا۔ انھوں نے اس کی تفصیلی کیفیت اپنے مضمون ”دیوان غالب مرتبہ سید ہاشمی“ ”تحریر“ (دہلی) شمارہ نمبر ۲۰، ۱۹۷۱ء (صفحات ۴۸ تا ۱۱۹) میں درج کی ہے۔ ڈاکٹر احمد لاری کی اطلاع کے مطابق سید ہاشمی نے حسرت موہانی کے ”دیوان غالب“ (دومع شرح) کے متن کو بنیاد بنایا تھا جو کہ دراصل غالب کی زندگی میں شائع ہونے والے آخری دیوان پر مبنی تھا۔ اس طرح سید ہاشمی کی بنیاد باواسطہ مطبع احمدی دہلی میں جولائی۔ اگست ۱۸۸۱ء میں چھپا دیوان تھا۔ اس متن میں نواب احمد سعید خاں کے نسخے کو سامنے رکھتے ہوئے ترمیم کی گئی اور حاشیے میں اختلاف کی صراحت کر دی گئی تھی۔ اس صرح متداول کلام کے علاوہ جو زائد کلام اس دیوان میں شامل کیا گیا تھا یا جس کی نشاندہی کی گئی تھی اس کے خاص مآخذ (۱) نواب احمد سعید خاں کا نسخہ (۲) ”گل رعنا“



کے حوالے کے ساتھ حسرت موہانی کے مرتبہ دیوان میں شامل اضافے اور (۳) حالی کی یادگار غالب میں شامل اشعار تھے۔ لیکن "یادگار غالب" کے اشعار کے سلسلے میں سید ہاشمی یکساں اصول نہیں اپنا سکے۔ دیوان کے شروع میں انھوں نے "یادگار غالب" کے چند زائد اشعار کو دیوان میں شامل کرنے کی رائے اس وجہ سے دی ہے کہ وہ نہ تو "گل رعنا" میں شامل تھے اور نہ متداول کلام میں۔ لیکن دیوان کے آخر میں انھوں نے چند اشعار صرف "یادگار غالب" کے حوالے سے شامل کر لیے تھے۔ اسی طرح نواب احمد سعید خاں کے نسخے کے حوالے سے کچھ ایسا کلام شامل کر لیا تھا جس کے استناد پر بعد میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کو شبہ ہوا۔ (اس سلسلے میں تفصیل آگے پیش کی جائے گی)۔ الغرض یہ کوشش کی گئی تھی کہ انجمن کے ذریعے چھاپے جانے والے دیوان جہاں تک ہو سکے مکمل اور مستند ہو۔

انجمن ترقی اردو کی مختصر رپورٹ بابت ماہ جون ۱۹۱۵ء میں مولوی عبدالحق نے تحریر کیا کہ "مرزا غالب کے دیوان کا صحیح ایڈیشن مرتب ہو چکا ہے اور صاف کیا جا رہا ہے۔ غنقریب مطبع میں بھیج دیا جائے گا" ۲۹ دسمبر میں جب ایجوکیشنل کانفرنس پونا میں منعقد ہوئی تو مولوی صاحب نے مطلع کیا کہ

"مرزا غالب کے اردو کلام کا صحیح نسخہ مرتب ہو گیا ہے۔ اس میں مرزا صاحب کا وہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے جو مطبوعہ دیوان میں نہیں پایا جاتا۔ اس کی ترتیب اور جمع کرنے میں بہت وقت لگا۔ سید ہاشمی صاحب نے اس کام کے انجام دینے میں بڑی محنت اور سرگرمی سے کام کیا اور اس لیے ہر طرح ہمارے شکریے کے مستحق ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ وہ اب پہنچ چکے مکمل ہو گیا ہے اور طبع کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ نیز یہ انتظام کرنا ہے کہ دیوان غالب کا یہ ایڈیشن نہایت صحت اور نقاست کے ساتھ طبع کیا جائے اس انجام کے لیے انجمن ظفر الملک علوی صاحب ایڈیٹر انظار کی ممنون ہے"۔

لیکن اسی زمانے میں جیسا کہ سید ہاشمی نے ذکر کیا ہے :

"نظامی پریس بدایوں سے دیوان غالب کا نیا نسخہ چھپ کر شایع ہوا۔ صحت یا حسن طبع کے اعتبار سے یہ ایسا نہ تھا جیسا کہ انجمن چاہنا چاہتی تھی۔ لیکن مروجہ نسخوں سے کہیں بہتر تھا۔ لہذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولہ طبع کو سرد کر دیا اور اگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیا ہو جاتی مگر ان

مرحوم کو کلام غالب سے اس قدر عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی عملی تکمیل پر آمادہ ہو گئے اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ اللہ

اکتوبر ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری بھوپال بحیثیت مشیر تعلیم آگئے اور مولوی عبدالغنی نے ان سے ملنے کے لیے سیدنا بھمی کو بھوپال بھیجا۔ جیسا کہ راقم الحروف نے اپنے مضمون ”دیوان غالب اور ڈاکٹر بجنوری“ ”شاعر“ (بہشتی)۔ اپریل ۱۹۷۱ء۔ صفحات ۲ تا ۶ میں تفصیلات درج کی ہیں، ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو بجنوری نے مولوی عبدالغنی کو اپنے خط میں لکھا:

”مولانا ہاشمی صاحب سے یہاں ملاقات ہوئی۔۔۔ (ان) کی گفتگو سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ شاید آپ کا ارادہ ہے کہ دیوان غالب کو لکھنؤ ”الناظر“ پریس میں ہی طبع کرا دیا جائے۔ گو کہ مجھے اس بات کا باور نہیں ہوتا لیکن اس چیز نے مجھ کو نہایت مشغوش کر دیا ہے اور میں نہایت مضطربانہ التجا کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ فرمائیے گا ورنہ تمام محنت برباد ہو جائے گی۔ جو دیوان لکھنؤ میں کتابت ہوا ہے نہایت عمدہ ہے لیکن اگر اس کی چھپائی کے لیے کسی نہایت اعلیٰ درجے کی کلوں کے پریس کا انتظام نہ کیا گیا تو کتنا ہی عمدہ کاغذ لگا یا جائے حروف پھیل جائیں گے۔ سطریں غیر متوازی ہو جائیں گی اور تمام صورت نقشہ بگڑ جائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ اول تو لکھنؤ کے خوش نویس کے لکھے ہوئے مسودہ (کاغذ) کو فوٹو کرنے کی کوشش کی جائے۔ پھر اسے کلکتہ کا کارخانہ دنیا کے عمدہ کارخانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں صرف ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ لاگت بہت بڑھ جائے گی۔ بہر حال ایک اندازہ طلب کرنے میں مضائقہ نہیں

اس کے بعد ایک پریس بہشتی میں ایک شخص ہائے نامی نے کہولا ہے جو لیتھو میں بہترین تیار کیا جاتا ہے۔ ہائے نے لیتھو کا فن یورپ میں تحصیل کیا ہے۔ اس سے پتہ لگا کر اس سے طبع کرایا جائے۔ جو دیوان غالب آپ طبع کرا رہے ہیں وہ ایک کتاب کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں علی گڑھ میں منعقدہ ایجوکیشنل کانفرنس میں انجمن کی سالانہ رپورٹ پیش

کرتے ہوئے مولانا نے مطلع کیا:

”مرزا غالب کے اردو دیوان کے جدید ایڈیشن کے متعلق گزشتہ رپورٹ میں ذکر ہو چکا ہے۔ یہ ایڈیشن بہرہ و جود مکمل و مرتب ہو چکا ہے۔ جناب ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بجنوری بی اے۔ میں ایل ڈی۔ بیرسٹریٹ لائبریری تعلیم ریاست بھوپال، اس کے لیے عالمانہ مقدمہ لکھ رہے ہیں۔ جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے بھی اس ایڈیشن کے لیے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اب تک بوجہ جنگ اعلا درجے کا کاغذ دستیاب ہونے میں دشواری ہے دوسرے پتہ تک بستیو کا کوئی ایسا مطبع نہیں ملا جو اس اعلا درجے کی نقاست کے ساتھ چھاپ کے جو انجن کا منشا ہے۔ بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ فوٹو گراف کے ذریعے طبع کرایا جائے اس کے متعلق بھی خط و کتابت جاری ہے کوشش کی جائے گی کہ آئندہ سال یہ طبع ہو جائے۔“

مولوی عبدالحق کے ایما سے ڈاکٹر بجنوری نے کلام غالب پر ایک مقدمہ لکھنے کا کام بھی سنبھال لیا۔ حالانکہ مولانا عبدالحلیم شرر نے مضمون تحریر کرنے کا وعدہ کر لیا لیکن شاید وہ اسے پورا نہ کر سکے۔ رفاہی وحشت کلکتہ میں نے ضرور اپنا مضمون مولوی صاحب کو روانہ کیا، لیکن وہ بھی مطمئن نہیں کر سکا۔ بعد میں رسمی انداز میں تحریر کیا جو یہ مضمون ”غالب کا انداز بیان“ کے عنوان سے ”نقاد راگرہ“ کے جنوری ۱۹۲۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ چنانچہ مولوی صاحب ان مضامین کے ذریعے جن پہلوؤں کا احاطہ کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے پیش تر کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر بجنوری نے اپنا مقدمہ تحریر کیا۔ اور جیسا کہ بعد میں حالات نے موڑ دیا، مولوی صاحب کو دیوان غالب اپنے منصوبے کے مطابق شائع کرنے کا تو موقع نہیں ملا لیکن ڈاکٹر بجنوری کے اس مقدمے کو نمایاں طور پر شائع کرنے کی مولوی صاحب نے پوری ندرت رکھ کر نبائی جو ان کے ایما اور اصرار پر تحریر کیا گیا تھا۔

دیوان کی تدوین، تصحیح اور ترتیب کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر بجنوری نے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ ۲۷ جولائی ۱۹۱۷ء کو انھوں نے مولوی عبدالحق کو تحریر کیا:

”دیوان غالب کی کاپیاں پہنچ گئیں۔ ایک نمونہ تیار ہو رہا ہے۔ جب تیار ہو جائے گا۔ روانہ ہوگا۔ علاوہ اس کے رنگ پلیٹ فوٹو ٹائپ کرنے کے متعلق خط و کتابت کر رہا ہوں۔ کلکتہ کی ایک کمپنی تیار ہے۔ اوروں کے جواب بھی تک نہیں آئے۔ ٹیمپوں سے اطلاع دوں گا۔ اگر آپ پانچ ہزار تک صرف کرنے کو تیار ہوں تو ضرور بہترین فوٹو رنگ پلیٹ ٹائپ

بہترین جلد کے ساتھ، بہترین کاغذ سمیت، ممکن ہے۔ کاپی ممکن ہے کہ اور لکھوانی پڑے۔  
 نوٹوائپ کے لیے یہ موزوں نہیں۔ چند تصاویر متعلق مضامین دیوان وغیرہ کے بھی بندوبست  
 کر رہا ہوں۔ دہلی سے قبر کی تصویر بھی منگوائی ہے۔ ۱۳۱۵ھ

ساتھ ہی ساتھ بجنوری نے سید ہاشمی کے دیوان میں شامل کیے گئے غیر متداول کلام کی تصدیق کے بارے  
 میں اپنی چھان بین شروع کر دی تھی۔ شعیب قریشی اس وقت دہلی میں تھے۔ انھیں بجنوری نے اپنے ایک  
 خط میں لکھا:

”نواب احمد سعید خاں صاحب کے دیوان کے احاسنیہ پر جو غزلیں غالب کی  
 دوسروں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں وہ کون کون سی ہے ذکر ان نوٹ کر لیجئے گا اور  
 اگر متداولہ نسخہ سے کہیں اختلاف ہو تو وہ اختلاف نوٹ کر لیجئے گا۔ چند اشعار اور  
 ایک آدھ قطعہ غیر مطبوعہ جس کا خط میں ذکر کیا ہے وہ کیا ہیں۔ ضرور لکھ کر لائیے اور  
 نسخہ کا حوالہ دینے کے لیے نسخہ کے لکھنے کا سنہ، کاتب کا نام وغیرہ، اگر کوئی نہ کہیں  
 ہے، اُس کا پتہ نشان کس شخص کے خط میں اضافی غزلیں اور چند اشعار، ایک آدھ قطعہ  
 غیر مطبوعہ تحریر میں (شاید نواب صاحب کو معلوم ہو) وغیرہ وغیرہ بھی یادداشت کے طور پر  
 درج کر لیجئے گا۔“

واسوخت کے متعلق میں آپ کی رائے سے متفق ہوں اور ہاشمی کے اڈٹ  
 کیے ہوئے دیوان سے (جو انھوں نے مجھ کو دے دیا ہے) اُس کو کاٹ دوں گا۔

لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ”تکیہ“ والی غزل پوری طرح لکھ کر  
 بھیجتا ہوں۔ سید ہاشمی نے جو دیوان کا اپنا اڈٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے، اس میں یہ غزل  
 نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے جہاں  
 تک میں مرزا صاحب کے کلام اردو سے واقفیت رکھتا ہوں، زمین آسمان مل جائیں۔ لیکن  
 یہ اُن کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے۔ دوسرے نواب صاحب کو اس  
 بارہ میں ذاتی علم کیا ہے۔ تیسرے نواب صاحب کی اس بارہ میں رائے کیا ہے۔

ظاہر دل جو قطعہ ہے وہ بھی مرزا کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بارہ میں نواب



صاحب سے جو کچھ مطابق یا منافع معلوم ہو سکے نوٹ کر لیجئے گا۔ ۱۵

مولوی عبدالحق ڈاکٹر بجنوری کی اس رائے سے منفق تھے کہ اس دیوان کی حیثیت یادگاری اور ستادین کی ہو۔ چنانچہ مولوی صاحب اور ان کے اصحاب ڈاکٹر بجنوری کی ان کوششوں میں ہر ہمدرد و معاون تھے چنانچہ دیوان کو راستہ کرنے کے لیے غالب کی قبر کی تصویر، غالب کی تصویر کا عکس اور دوسرے نوادرات کی فرہی کی کوشش ہو رہی تھی۔ مولوی عبدالحق تحریر فرماتے ہیں:

”اس کے یہ بہت سی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں۔ من جلد ان کے ایک عجیب چیز خود مرزا کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انھوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا اور انھوں نے اپنی عنایت سے مرحوم بجنوری کو بھیج دیا تھا۔ اگرچہ یہ حالات انھوں نے اس طرح لکھے ہیں جیسے غیر شخص لکھا ہے۔ لیکن عبارت کا رنگ صاف بتا رہا ہے کہ پر دے میں خود مرزا نوشتہ باتیں کر رہے ہیں۔ سید افتخار عالم نے ان حالات کے ساتھ (پیر) راجہ خٹان جلد ۳ نمبر ۵ کا بھی ایک مطبوعہ ورق بھیجا تھا جس میں ”تذکرہ مظہر العباب کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ حالات مرزا نے اسی تذکرے کے لیے تحریر کیے ہوں۔ اس تذکرے کے مؤلف مولوی محمد انور الحق صاحب مرحوم، مولوی احتشام الدین ایم۔ اے کے والد ہیں۔ معلوم نہیں اس تذکرے کا کیا حشر ہوا؟ ۱۶

اسی تنگ دو میں تقریباً ایک سال گزر گیا۔ اگست ۱۹۱۸ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے دیوان غالب کی اشاعت کے پروگرام کو نیا موڑ دیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی اپنی تصنیف ”شعر الہند“ کی خاطر حیاں بین کرنے بھوپال آئے ہوئے تھے کہ انھیں بھوپال کی حمید یہ لائبریری میں دیوان غالب کا ایسا قلمی نسخہ نظر پڑا جس میں غالب کا محذوف کلام بڑی مقدار میں موجود تھا۔ اس کا علم ہوتے ہی ۳۰ اگست ۱۹۱۸ء کو ڈاکٹر بجنوری نے یہ نسخہ اپنے پاس منگوایا اور ۲۰ اگست ۱۹۱۸ء کو انھوں نے مولوی عبدالحق کو لکھا:

”جس دن سے وہ نسخہ دیوان غالب کا میرے پاس آیا ہے، شہر کے علمی طبقے میں ایک ہلچل مچا ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔۔۔ میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلتا پڑے خواہ

جان جائے، نسخہ نہیں جاتا انتشار اللہ۔۔۔۔

جب ہاشمی صاحب آویں گے، اپنی مفصل تجویز پیش کروں گا۔ آپ ان کے ہمراہ جو تصاویر، آرٹسٹس کی چیزیں وغیرہ آپ نے جمع کی ہیں اور جو مصالحہ یا خط و کتابت وغیرہ ہے سب بھیج دیجئے گا۔ شعیب میری ہدایات کے مطابق چند چیزوں کی فراہمی میں مشغول ہیں اور سراسر پاسی ہو رہے ہیں۔

کاغذ کا مسئلہ سب سے پیڑھا ہے۔ آپ علی گڑھ لکھیے۔ اگر کلیات خسرو میں سے کاغذ چننا ہو تو سب کو انجمن کے لیے فوراً خرید لیجیے۔ کسی طرح بے کار نہیں ہو سکتا۔ اگر پیچ رہا یا خدا نخواستہ کام میں نہ آیا تو بک سکتا ہے۔ اگر اخبارات میں اعلان ابھی نہ دیا ہو تو اس میں بھی ایسی توقف کیجیے۔ ہاشمی صاحب سے گفتگو کر لوں۔

دیوان کے اڈٹ کرنے کا کام شروع کر دیا ہے جب ہاشمی صاحب تشریف لائیں گے تو کافی نوڈ پیش کر سکوں گا۔ فرمائیے کتنے روپے تک انجمن خرچ کر سکتی ہے۔ کاش اس وقت کہیں سے کچھ ہاتھ لگتا۔ سیرۃ النبی کی پہلی جلد پر آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہے، پانچ ہزار تو اس کام کے لیے ہونا چاہیے۔

اس خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھوپال میں نو دریافت نسخے کے پیش نظر دو قسم کی تجاویز نکلیں۔ بعض لوگ یہ چاہتے تھے کہ اس دیوان کی اشاعت کا اقتدار ریاست کو ہی ملے کیوں کہ یہ ریاست کی لائبریری سے دریافت ہوا ہے۔ لیکن دوسرے ڈاکٹر بجنوری کے ہم نوا تھے اور وہ اس دیوان کے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شایع کیے جانے کے حق میں تھے۔ یہ حال دیوان کے ملتے ہی ڈاکٹر بجنوری نے اس کی اشاعت کی تیاریاں برقی رقماری سے شروع کر دیں اور مولوی عبدالحق اور دوسرے رفقا بھی ان کوششوں میں سرگرم ہو گئے۔ مولوی صاحب نے فوراً سید ہاشمی کو بھوپال بھیجا اور ڈاکٹر بجنوری نے ان کو اپنی تجاویز سے آگاہ کیا۔ نئے دیوان کی کتابت شروع کر دی گئی اور دوسرے وسائل کی فراہمی پر بھی پوری توجہ دی جانے لگی۔ ”یادگار بجنوری“ کے مقدمے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

”جب مرزا غالب کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا، مرحوم کی نظر پڑا تو مارے خوشی کے بیتاب ہو گئے اور اس اصلی نسخے کی لمبائی

کے لیے بڑے بڑے سامان کیے۔ اعلا درجے کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب، طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کی تشریح کے لیے چابکدست مصوروں سے تصویروں کی فرمائش۔ ان کا یہ انہماک دیکھ کر ان کے بعض دوست بھی (ظاہر ہے ان میں پیش پیش مولوی صاحب خود بھی تھے) اس شاہکار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ لیکن افسوس موت نے اتنی مہلت نہ دی اور یہ سب ٹھاٹھ یوسا ہی پڑے کا پڑا رہ گیا۔

قلمی دیوان کے ملنے کے تین ماہ بعد ہی، نومبر ۱۹۱۸ء کو انفونزہ کی وبا میں ڈاکٹر بجنوری کا انتقال ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدالحق نے انجمن کی سالانہ رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس میں پیش کرتے ہوئے بتایا: ”انجمن دو تین سال سے مرزا غالب کے اردو دیوان کا صحیح اور عمدہ نسخہ شایع کرنے کا اعلان کر رہی ہے۔ اس کا مسودہ بڑی تلاش اور محنت کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا اور صرف طبع کی دیر تھی۔ غالب اس سال طبع بھی ہو جاتا لیکن ایک خاص واقعہ کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ تاخیر ناگوار ہوئی لیکن حکمت سے خالی نہ تھی۔ اس لیے کہ اب انجمن کو مرزا صاحب مرحوم کے تمام (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) کلام کے جمع کرنے کا فخر نصیب ہو گا۔۔۔“

انجمن ترقی اردو کو تلاش سے بعض غیر مطبوعہ غزلیں اور خارج شدہ اشعار ضرور مل گئے تھے لیکن اس بات کی کسی کو امید نہ تھی کہ پورا خارج شدہ کلام کبھی میسر آجائے گا۔ یہ محض حسن اتفاق اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کی سعی کا نتیجہ ہے کہ بھوپال کے ایک کتب خانے سے یہ گنج گم شدہ برآمد ہو گیا۔ (میں اس امر کا اظہار کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ سب سے پہلے کتب خانہ حمید یہاں اس نسخے پر مولوی عبدالسلام صاحب کی نظر پڑی) انجمن کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب اس کی تصحیح و طبع کا انتظام فرما رہے تھے کہ ان کی بے وقت اور پُرالم موت نے اس کے ساتھ بہت سی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔۔۔

جناب صاحب زاوہ نواب حمید اللہ خاں بہادر بی۔ اے نے اپنی خاص عنایت اور

علمی قدر وانی کی وجہ سے اس نسخے کے استعمال کی اجازت انجمن کو عطا فرمائی۔ انجمن جناب  
ممدوح کی بے حد ممنون ہے۔ ۱۹۱۹ء۔

لیکن مولوی صاحب کا یہ اظہار خیال محض ایک خوش فہمی ثابت ہوا کیوں کہ ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے بعد  
ریاست بھوپال کے بااثر حلقوں میں اس رے نے تقویت حاصل کر لی کہ دیوان غالب کی اشاعت کا کام  
انجمن ترقی اردو کو سونپنے کی بجائے ریاست کی جانب سے کیا جائے۔ چنانچہ مفتی محمد انوار الحق جنہیں  
ڈاکٹر بجنوری کے بعد ایجوکیشنل ایڈوائزر (مشیر تعلیم) کا عہدہ سونپا گیا انہیں ہی دیوان غالب کو  
ایڈٹ کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ اس طرح انجمن ترقی اردو، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر بجنوری کے اصحاب  
و معاونین کو دیوان غالب کی ترتیب و اشاعت سے بے تعلق کر دیا گیا۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی نے  
اکتوبر ۱۹۱۹ء کے ”معارف“ میں ڈاکٹر بجنوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

”امید تھی کہ ان کے احباب اور انجمن ترقی اردو مرحوم کی یادگار میں اس نسخے کو چھاپ کر شایع  
کرے گی۔ لیکن مولوی عبدالحق سکر پٹری انجمن کی زبانی یہ سن کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی  
محنت و کاوش ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکشوں میں ضائع ہونا چاہتی ہے۔“ ۱۹۱۹ء

اس کے نتیجے میں مولوی عبدالحق اس نسخے کی اشاعت سے دست کش ہو گئے۔ لیکن انجمن کے واسطے ڈاکٹر بجنوری  
نے جو مقدمہ کلام غالب تیار کیا تھا اس کی اشاعت انہوں نے اپنا فرض جانا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۲۱ء میں انہوں  
نے انجمن کا سہ ماہی رسالہ ”اردو ہجاری“ اور اُس کے پہلے شمارے میں انہوں نے بجنوری کے مقدمے کو فرست  
جنگ دی اور اسی سال اسے ”محاسن کلام غالب“ کے نام سے علیحدہ کتابی شکل میں بھی شایع کر دیا۔

اس طرح انجمن دیوان غالب تو شایع نہ کر سکی لیکن ”محاسن کلام غالب“ کی اشاعت سے غالب  
شناسی کو ایک نئی جہت ملی اور کلام غالب کے شائقین میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا ہوا۔ دیوان  
غالب ”جدید رنسمہ مجید“ ۱۹۲۱ء میں شایع ہوا۔ وہ ڈاکٹر بجنوری اور مولوی عبدالحق کے خواب کی تعبیر  
تو نہ تھا لیکن اس نے غالب کی عظمت کو مستحکم تر بنیادوں پر استوار کرنے کے اس مقصد کو کچھ حد تک  
ضرور پورا کیا جو انجمن کا مطمح نظر تھا اور جو مولوی صاحب کی تمنا تھی۔



## ۱۹۲ حواشی

- ۱۔ ضمیمہ "الناظر"۔ مئی ۱۹۱۳ء۔ ص ۷۔ ۸۔ راقم الحروف کا مضمون "امی۔ ایم فارستر اور ان کی تصانیف"
- ۲۔ "ہماری زبان"۔ یکم جنوری ۱۹۱۹ء۔ ص ۷۔
- ۳۔ مختصر رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ اپریل ۱۹۱۷ء ضمیمہ "الناظر"۔ یکم جون ۱۹۱۷ء۔
- ۴۔ "غالب کا مزار" ہفتہ وار کامریڈ کلکتہ ۱۷ جون ۱۹۱۱ء بحوالہ سعادت علی صدیقی "غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین کوشش"۔ "اردوئے معلیٰ" (دہلی یونیورسٹی) غالب نمبر حصہ سوم۔ ص ۳۵۳۔
- ۵۔ ایضاً۔ ص ۳۶۶۔ ۶۔ "الناظر"۔ یکم جنوری ۱۹۱۵ء۔
- ۷۔ رپورٹ متعلق اجلاس بست و ہشتم۔ آل انڈیا محمدن اینگلو اور ٹیل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام پونا۔ منعقدہ ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۱۳ء ص ۱۳۸، ۱۳۹۔
- ۸۔ سید ہاشمی تبصرہ "دیوان غالب جدید" (نسخہ حمید)۔ "اردو" (اورنگ آباد) اکتوبر ۱۹۲۳ء ص ۷۰۳۔ ۹۔ "الناظر"۔ یکم اگست ۱۹۱۵ء۔ ص ۵۷۔
- ۱۰۔ "رپورٹ انجمن ترقی اردو" رپورٹ متعلق اجلاس بست دہم۔ آل انڈیا محمدن اینگلو اور ٹیل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام پونا۔ منعقدہ دسمبر ۱۹۱۵ء۔ ص ۱۵۴۔
- ۱۱۔ تبصرہ "دیوان غالب جدید" (نسخہ حمید) از سید ہاشمی۔ "اردو" (اورنگ آباد) اکتوبر ۱۹۲۳ء ص ۷۰۳۔
- ۱۲۔ نقوش (لاہور)۔ مکتبہ نمبر۔ جلد دوم۔ ص ۵۷۹، ۵۸۰۔
- ۱۳۔ رپورٹ متعلق اجلاس سی ام۔ آل انڈیا محمدن اینگلو اور ٹیل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام علی گڑھ۔ منعقدہ دسمبر ۱۹۱۴ء ص ۸۳۔
- ۱۴۔ "نقوش" (لاہور)۔ مکتبہ نمبر۔ جلد دوم۔ ص ۵۸۰۔
- ۱۵۔ ڈاکٹر احمد لاری، ڈاکٹر بجنوری اور تندرین دیوان غالب۔ "ہماری زبان" (علی گڑھ) ۸ دسمبر ۱۹۷۲ء۔ ص ۳، ۴۔
- ۱۶۔ "مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری کا ایک ورق" از عبدالحق۔ "الشجاع" (کراچی)۔
- ۱۷۔ غالب نمبر۔ حاشیہ بلاک۔ (بلا نمبر ص ۶۰۵) مابین صفحات ۲۵۱، ۲۵۲۔

۱۷۱۔ احمد لاری "ڈاکٹر بجنوری اور تدوین دیوان غالب" "ہمارے زبان" (علی گڑھ) - ۱ دسمبر ۱۹۷۲ء  
ص ۵، ۶ -

۱۷۲۔ مولوی عبدالحق "چند ہم عصر" ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن - اردو اکیڈمی سندھ (کراچی)  
۱۹۶۶ء - ص ۱، ۳، ۴، ۵ -

۱۷۳۔ رپورٹ اجلاس منعقدہ بمقام سورت ماہ دسمبر ۱۹۱۸ء ص ۱۰۳، ۱۰۵ -

۱۷۴۔ "معارف" اکتوبر ۱۹۱۹ء -

## مولوی عبدالحق اور بنگال میں اردو تحریک

مولوی عبدالحق بابائے اردو کہلائے۔ کم از کم زندگی کے پچاس ساٹھ سالوں تک ان کا اور ٹھکانا بھونٹنا اردو اور صرف اردو ہی رہا ہے۔ اردو سے متعلقہ مولوی عبدالحق کی خدمات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ان کی ادبی خدمات کا ہے۔ وہ اردو کے صاحبِ قلم ادیب اور محقق تھے۔ انہوں نے قواعد زبان اور لغات کے سلسلے میں بھی ٹھوس کام کیے۔ ان کی یہ خدمات ایسی ہیں جو ان کا نام دنیا بھر میں اردو میں ہمیشہ بلند مقام پر رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

دوسرے حصے کا تعلق اردو زبان کی تحریک سے ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جہاں ان کی کئی باتیں مجموعی طور پر ہندوستان اور خاص کر بنگال میں اردو تحریک کے راستے میں اکثر و بیشتر ہماری راہ ہیں آج بھی رکاوٹیں کھڑی کر دیتی ہیں۔ خود پاکستان کو بھی ان کی اندھی اردو محبت سے سخت نقصان ہوا ہے اور متحدہ پاکستان جو ٹوٹ کر اب دو ملکوں میں (بنگلہ دیش اور پاکستان) بٹ گیا ہے اس میں مولوی عبدالحق کی اردو سے اندھی محبت اور بنگلہ زبان سے سخت نفرت کے جذبات شامل ہیں۔

مولوی عبدالحق کا عشق اردو ان کے سرچڑھ کر بولتا رہا ہے۔ اس عشق نے انہیں نگاہیں بنایا بلکہ جس طرح ایک نادان عاشق کو اپنی محبوبہ ہی میں تمام تر حسن، تمام تر خوبیاں نظر آتی ہیں اور وہ دیوانہ عاشق اپنی محبوبہ کے سامنے دیگر تمام باتوں کے حسن کو، ان کی خوبیوں کو نہ صرف نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ کم تر بھی سمجھتا ہے۔ ان سب کی مخالفت کرتا ہے۔ ان کی ہر خوبی سے انکار کرتا ہے اور پھر آگے بڑھ کر ان سے سخت نفرت کا کھلے عام اظہار کرنے لگتا ہے اور اس طرح اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہی کرتا جاتا ہے بالکل یہی حالت عشقِ اردو میں آخری منزل پر پہنچ کر مولوی عبدالحق کی ہوتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اردو کے عشق میں وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے اور انہوں نے بار بار کئی ایسی باتیں کہی ہیں جو نہ صرف غلط اور بے بنیاد ہیں بلکہ ہمارے لیے خطرناک بھی ہیں اور آج

اردو کی بقا و ترقی کی تحریک میں وہ باتیں ہماری راہ ہیں سخت رکاوٹیں بن گئی ہیں۔ ہمارے مخالفین، ہمارے دشمن، ہم سے کہتے ہیں کہ آپ کے بابائے اردو نے ہی تو یہ سب باتیں کہی ہیں۔

اردو ایک کل ہند زبان ہے۔ یہ اسی دھرتی پر پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ یہ کسی خاصی مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ سماجی تاریخی حالات کے تحت جس مشترکہ تہذیب نے ہندوستان میں جنم لیا، اردو اس مشترکہ تہذیب کی انمول نشانی ہے۔ ہندوستان ہی اس کا وطن ہے۔ یوں تو یہ پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن اثر پرورش اس کا سب سے بڑا گھر ہے۔ ان باتوں کو مولوی عبدالحق بھی خوب جانتے تھے اور تقسیم ہند سے قبل بار بار انھوں نے ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن تقسیم ہند کے فوری اثرات کا مولوی عبدالحق درست تجربہ نہیں کر سکے اور انھوں نے ترک وطن کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ یہ سمجھ کر کہ اب اردو کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں رہی۔ اس کی ترقی کے لئے کچھ کرنا تو دور کی بات ہے بلکہ اسے بچا لے رکھنا اور اس کا نام لینا بھی اس سرزمین میں ممکن نہیں ہے یعنی وہ ہندوستان میں اردو کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ یوں تو کہنے کے لیے ہندوستان سے اردو کے کئی ادبا و شعرا بھی پاکستان چلے گئے لیکن وہ لوگ صرف ادیب یا شاعر تھے اور عملی میدان میں اردو تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ لیکن مولوی عبدالحق اردو تحریک کے سب سے اہم رہنما تھے لہذا ان کے ترک وطن کا گہرا اثر اردو تحریک پر پڑا۔ ان کے جانے سے اردو کے دشمنوں کو سب سے بڑا فائدہ پہنچا۔ وہ یہ ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کے قابل ہو گئے۔ کہ اردو پاکستان کی زبان ہے جب کہ خود بابائے اردو ہی پاکستان چلے گئے اور یہ اعلان بھی کیا کہ اردو نے قیام پاکستان کی جنگ لڑی ہے، اردو نے پاکستان بنایا ہے۔

یہی مولوی عبدالحق کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ انھوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ صرف مذہب کی بنیاد پر ایک ملک کا اتحاد پایدار نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ایک مذہب والوں کی کوئی ایک زبان ہو سکتی ہے۔ انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ نیا ملک جس کا نام پاکستان ہوا ہے، اس ملک کا سب سے بڑا حصہ مشرقی پاکستان ہے اور عالم وجود میں آنے والے اس نئے ملک میں بنگلہ زبان بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ صرف مذہب کی بنیاد پر ایک قدم کا جوش ٹھنڈا بھی پڑ جا سکتا ہے۔ دنیا میں کئی چھوٹے بڑے ممالک ہیں جن کا مذہب، یا جہاں کی اکثریت کا مذہب تو اسلام ہے لیکن ان کی قومیت



انگ انگ ہے۔ اسی طرح اگر ایک مذہب ایک قوم کا جوش، نئے معاشی، سیاسی، لسانی اور تہذیبی اختلافات کی بنا پر کوئی نیا موڑ لے تو نہ پاکستان ایک ملک رہ سکتا ہے اور نہ ہی اردو اس پورے ملک کی زبان رہ سکتی ہے جب کہ اس نئے ملک میں مختلف صوبائی زبانیں اور صوبائی تہذیبوں کی جڑیں بھی مضبوط ہیں۔ اُن صوبائی زبانوں سے اردو کا رشتہ یا لگاؤ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، اُن لوگوں کے لیے دل کی گہرائیوں سے اردو کو قبول کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جن حصوں کو لے کر یہ نیا ملک پاکستان بنا، ان میں صرف پنجاب کا علاقہ ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں اردو کے لیے فضا سازگار ہے اور لاہور اردو زبان و ادب کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان میں جب اردو کو قومی زبان قرار دینے کی تحریک چلی تو پنجاب ہی نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی نے صاف لکھا ہے۔۔۔۔۔ "اُس نازک وقت میں اگر اہل پنجاب یہ کہہ کر سامنے نہ آتے کہ ہمارا زبان اردو ہے تو آج اردو صرف بہاجرؤں کی زبان بن کر رہ جاتی۔" (بزم خوش نفسان۔ شاہد احمد دہلوی۔ مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مکتبہ اسلوب کراچی۔ ۱۹۸۵ء۔ صفحہ ۱۳۳)۔

مولوی عبدالحق نے اس پر بھی غور نہیں کیا کہ حقیقی معنوں میں نئے ملک پاکستان میں اردو صرف اُن بہاجرین مسلمانوں کی زبان ہے جو اتر پردیش، بہار، دہلی اور حیدرآباد (دکن) وغیرہ سے یعنی ہندوستان کے مختلف حصوں سے پاکستان گئے ہیں یعنی پاکستان میں اردو اپنی زمین سے اکھڑے ہوئے لوگوں کی زبان ہے۔ لہذا پہلا اور اہم ترین مسئلہ ان اکھڑے ہوئے لوگوں کے آباد ہونے، بسنے اور روٹی روزگار سے جڑ جانے کا ہے۔ نئی آب و ہوا، اور نئے ماحول میں اپنا قدم جانے کے لیے ایک عرصہ چاہئے۔ اس کے بعد ہی یہ آبادی کسی اور بات پر غور و فکر کرنے کے لائق ہوگی۔ یہی فطری ہے۔ مولوی عبدالحق نے یہ نہیں سوچا کہ اُن اجڑے ہوئے لوگوں کو کُل آبادی، جن کی مادری زبان اردو ہے، وہ مجموعی طور پر ہندوستان کی صرف دو بڑی ریاستوں یعنی اتر پردیش اور بہار کی اردو آبادی سے بھی کم ہے۔ اور اگر وہ خود پاکستان نہ جا کر ہندوستان میں رہتے اور ہندوستان سے جانے والوں کو روکنے کی کوشش کرتے، ان سے کہتے کہ یہی اردو کا وطن ہے اور ہندوستان سے اس طرح پاکستان چلے جانے پر خود اردو کے گھر میں اردو کو سخت نقصان پہنچے گا، تو یقیناً ان کی آواز ہزاروں اور لاکھوں اردو بولنے والے سنتے، ان کی بہت بندھتی۔ اور آج کے ہندوستان میں اردو کے لیے فضا کافی ہوا رہتی اور اردو کے دشمنوں

کی زبانیں بند رہیں۔ لیکن افسوس مولوی عبدالحق نے ایسی دوراندیشی سے کام نہیں لیا۔

پاکستان جانے کے بعد ان کو وہاں جو ٹھوکریں کھانی پڑی ہیں، اُس پر روشنی ڈالتا یہاں ضروری نہیں ہے لیکن اتنا سچ ہے کہ انھوں نے پاکستان کی سرزمین پر اردو کے لیے جو تاج محل تعمیر کرنے کا خواب دیکھا تھا اور جس طرح سوچا تھا کہ محض مسلمان ہونے کے ناتے سب پاکستانی اردو کو بخوشی اپنے سر کا تاج بنالیں گے، وہ خواب چور چور ہو گیا، جس سے نہ صرف وہ پریشان ہوئے بلکہ اُن کو دلی صدمہ پہنچا۔ اُن کے اس ٹوٹے ہوئے دل کی پکار ہم ”پاکستان میں اردو کا المیہ میں پاتے ہیں۔“ پاکستان میں جب انھوں نے دیکھا کہ سب بخوشی اردو کو قومی اور سرکاری زبان تسلیم کر لینے کے حق میں نہیں ہیں، تب وہ اگ بگور ہو گئے اور دیگر زبانوں کی مخالفت پر بلا سوچے سمجھے اثر آئے یعنی اپنے ہی دیرینہ موقف سے وہ بالکل ہٹ گئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مولوی عبدالحق نے ایسی غلط باتیں کہی ہیں جس سے نہ صرف سابق پاکستان میں اردو سے نفرت اور دشمنی بڑھ گئی بلکہ جس کا برا اثر ہندوستان پر بھی پڑا، خاص کر مغربی بنگال میں بھی اردو کو نقصان پہنچا۔ مثلاً مولوی عبدالحق نے اردو کی حمایت میں ایک دو بار کہا ہے :-

”جہاں جہاں جس حد اور درجہ تک اردو مروج ہے، وہاں مسلمانوں میں اُسی حد اور درجہ تک شائستگی، روشن خیالی اور قومی شعور پایا جاتا ہے، اور جہاں جہاں اردو کا رواج کم ہے یا نہیں ہے، وہاں اُسی حد اور درجہ تک شائستگی، روشن خیالی اور قومی جذبہ مفقود ہے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردیک بلند تہذیب کی نشانی ہے لیکن یہ کہنا کہ جہاں اس کا رواج کم ہے وہاں شائستگی، روشن خیالی اور قومی جذبہ وغیرہ بھی کم ہے یا مفقود ہے، کیا معنی رکھتا ہے۔ ہاں چاہے مولوی عبدالحق نے یہ بات صرف مسلمانوں کو مد نظر رکھ کر ہی کیوں نہ کہی ہو، لیکن بنیادی طور پر یہ دیگر لوگوں اور قوموں کی تہذیب و تمدن، شائستگی اور روشن خیالی کے خلاف ہے اور ان سب کو کمتر قرار دینا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس خیال کو درست قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ دوسروں کو کمتر قرار دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اچھی طرح ان کی تہذیب و تمدن، خیالات اور جذبات کو جانیں، اُن کا گہرا مطالعہ کریں کیوں کہ اس کے بغیر کوئی تقابلی مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ دوسروں کو کمتر جاننا



ایک اور پاکستان چاہتے ہیں۔ اس طرح مخالفین اردو نے فرقہ پرستی کو ہوادی تھی نتیجہ وہی ہوا، جو ہونا تھا۔ !  
 لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایسے تمام نعروں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ صاف بتادیں کہ اردو نے پاکستان  
 بنانے کے لیے جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ ابتداء ہی سے تحریک آزادی میں اردو نے بھرپور حصہ لیا ہے۔ تحریک آزادی ایک  
 ملی تحریک ہے۔ اس نے کفار خ بدے، حالات بدے اور ملک تقسیم ہو گیا۔ اس کی ذمہ داری اردو والوں پر  
 ہرگز نہیں ڈالی جاسکتی۔ اگر بنگالی مسلمان نہ چاہتے تو پاکستان بننا بھی دشوار تھا۔ بنگالی مسلمان اس وقت  
 تقسیم کے حق میں تھے۔ وہ مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ بنگلہ زبان بولنے والوں میں بنگالی مسلمان اکثریت میں  
 ہیں اور بنگالی مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ اگر ملک تقسیم ہوا، پاکستان بنا، تو اس نئے ملک میں ان کی اکثریت  
 ہوگی، ان کا راج ہوگا، وہاں کی سرکاری زبان بنگلہ ہوگی۔ پھر نئے ملک پاکستان میں اردو اور بنگلہ کا جھگڑا  
 ہوا، اور وہ ملک ٹوٹ گیا۔ اس کا کوئی تعلق نہ ہندوستان سے ہے، نہ ہندوستان میں اردو سے ہے اور  
 نہ ہی مغربی بنگال سے ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہمیں ایسی باتوں کو بار بار کہنا ہے کہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ اردو  
 ایک ہندوستانی زبان ہے، امن اور بھائی چارگی کی زبان ہے۔ آپسی محبت اور بندھن کی نشانی ہے۔ اس کا ادب  
 محض اسلامی ادب نہیں ہے۔ ہر زبان میں مذہبی لیٹرچر موجود ہے اور اردو میں بھی مختلف مذاہب پر کافی  
 لیٹرچر ہے۔ ہندوؤں نے اردو کی تعمیر اور ترقی میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ لہذا ہندوستان میں  
 اردو کو نہ صرف زندہ رہنے بلکہ پھلنے پھولنے کا پورا پورا حق ہے اور ہماری اردو تحریک اسی حق کو حاصل  
 کرنے کے لیے ہے۔ چاہے مولوی عبدالحق بابا سے اردو ہی کیوں نہ ہوں، اُن کی ہر بات پیغمبر  
 کی لکیر نہیں ہو سکتی۔ اور ہر بات سچ نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہی ہم ان کی ہر بات کو درست تسلیم کرتے ہیں  
 ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے نہ صرف اردو کے ادبا و شعراء اور دانشوروں کے دروازوں  
 پر دستک دینی پڑے گی بلکہ دیگر زبانوں کے ادبا، شعراء اور دانشوروں کو ساتھ لینا اور انہیں ہم خیال  
 بنانا ہوگا۔ اس سے کئی زیادہ ضروری ہے اردو بولنے والوں کے در پر جانا، اُن کو ساتھ لینا، اور  
 ساتھ لے کر آگے بڑھنا کیوں کہ زبان کے اصل مالک عوام ہی ہوتے ہیں اور عوامی تعاون کے بغیر کامیابی  
 ہرگز ممکن نہیں ہے۔



## بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

میں نے اپنے بہت سے دوستوں کے خاکے لکھے ہیں لیکن وہ سب ایسے دوست تھے جنہیں میں ذاتی طور سے جانتا تھا اور ان سے ملاقاتیں بھی رہی تھیں یہی ہیں۔ اس لیے ان سب خاکوں میں بہت ذاتی قسم کی باتیں بھی تھیں۔ ورنہ ذاتی قسم کے واقعات بھی تھے۔ دراصل خاکوں میں اگر ذاتی حوالے نہ ہوں تو وہ خاکے صرف مضمون بن کر رہ جاتے ہیں اور ان میں دل چسپی کے بہت سے پہلو، بھر نہیں پاتے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جس خاکے میں اس کا لکھنے والا خود موجود نہیں ہوتا وہ خاکہ پر اثر اور دل چسپ نہیں بن پاتا۔

لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خاکہ لکھنا میرے لیے بڑا دشوار مرحلہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے بہت بڑے بزرگوں کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ بزرگ ہوگ تو قابل تعظیم ہوتے ہیں۔ وہ تحریروں کا موضوع بنانے کے لیے تھوڑی ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ میں نے مولوی عبدالحق کو کبھی دیکھ نہیں صرف تصویروں سے ہی، انہیں پہچانتا ہوں۔ میں نے البتہ ان کی وہ کرسی ضرور دیکھی ہے جو ان کے استعمال میں آتی تھی اور جو اب انجمن ترقی اردو کے دفتر کی زینت ہے اور ایک تخت پر رکھی رہتی ہے جس پر گرمیوں کے دنوں میں کبھی کبھی خلیق انجم کا سیلٹ بھی پڑا نظر آتا ہے۔ میں تقسیم کے بعد جب ہندوستان آیا تو ساں دوساں تو اپنے آپ کو سنبھالنے ہی میں لگ گئے۔ اس عرصہ میں لکھنا پڑھنا بھی بہت کم ہوا۔ اور جب میں اس قلم کو ہلکا کر کے فلم حضرت سے رابطہ قائم کر سکوں تو اس وقت تک کئی ادیب، شاعر، نقاد پاکستان چلے گئے تھے یا جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مولوی عبدالحق کا نام بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ وہ جنوری ۱۹۴۹ء میں مستقل طور پر پاکستان چلے گئے لہذا ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ مولوی صاحب کی نگارشات البتہ نظر سے گزرتی رہیں جن میں بڑا تنوع ہے۔ یہی تنوع اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی اردو زبان کی خدمت کا دائرہ بے حد وسیع ہے اور یہ کہ انھوں نے اردو ادب کو اپنی نگارشات کا گراں قدر سرمایہ دے کر اسے

مالا مال کیا ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت اور ان کی خدمات کے لاتعداد سپو ہیں۔ میں نے صرف اپنی بات ان کی 'خاکہ نگاری' ہی تک محدود رکھی ہے میرا یہ خاکہ نہ مضمون صرف ان کی ایک کتاب "چند ہم عصر" کا ہی احاطہ کرتا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے چودہ ہم عصر ادیبوں اور دوستوں اور فلم کاروں کے کچھ مختصر اور کچھ طویل خاکے تحریر کیے ہیں۔ لیکن جس بات نے ان خاکوں کو اردو ادب میں ایک بلند مقام دیا ہے وہ ہے ان کا اپنا مخصوص اسٹائل اور پرسنل سٹچ اور یہی پرسنل سٹچ دراصل ان خاکوں کی جان ہے۔

پہلا خاکہ منشی امیر احمد کا ہے جس کے نیچے ساں ۱۹۰۰ درج ہے۔ شاید یہ اس خاکے کی تصنیف کا سال ہے۔ خاکہ بہت طویل نہیں۔ لیکن اس خاکے میں سلطان واجد علی شاہ کی ایک بڑی دس چپ عادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"واجد علی شاہ کی یہ عادت عجیب تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے اور دھرا دھرا سے چند کتابیں اٹھالیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کر لیے، اسی طرح جو کتاب سامنے آئی اس میں سے کچھ حصہ نقل کر لیا۔ وہ اس بات کا مطلق لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا ہیں نے مختلف مضامین، در علوم کی کتابوں کے اقتباس سے بے ٹھکانے جمع کر لیے ہیں۔ غرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود نیز ان کے درباری ان کتابوں کو اعلیٰ تصانیف میں سے خیال کرتے تھے، ایسی ان بل بے جوڑ کتابوں کی شرح لکھنا اور ان میں ربط و سلسلہ قائم کرنا منشی صاحب مرحوم ہی کا کام تھا۔"

دوسرا خاکہ پروفیسر مزاحیرت کا ہے۔ اس کے نیچے بھی ساں ۱۹۰۰ ہی درج ہے۔ مولوی صاحب ان کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مرزا حیرت صحیح النسب سید تھے مگر وہ ہمیشہ اسے چھپاتے رہے۔ وہ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے یعنی جس سال کہ ملکہ وکٹوریہ تخت نشین ہوئیں۔ پروفیسر حیرت مئی ۱۸۷۲ء میں الفٹن کالج بمبئی کے پروفیسر فارسی مقرر ہوئے اور پچیس سال تک اپنا فرض نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا۔ مولوی صاحب کے خاکوں کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ انھوں نے جس بھی شخص کا خاکہ تحریر کیا اس کی شخصیت کے کسی بہت ہی روشنی بنیادی پہلو پر اپنی نظر رکھی اور اسے بڑے پرائر

نداز میں قاری کے سامنے پیش کیا۔ پروفیسر مزاحیرت کی جس بنیادی خوبیوں سے مولوی صاحب متاثر ہوئے وہ تھیں، ان کا قوی حفظ اور ان کے علم کی وسعت۔ کس خوب صورتی سے مولوی صاحب نے پروفیسر حیرت کی ان دونوں خوبیوں کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

”ان کا علم اس قدر وسیع اور ان کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ اگر حافظہ و سعادی کی تصانیف

دنیا سے مٹ جائیں تو وہ صرف اپنے حافظہ کے زور سے بلا کم و کاست پھر پیدا کر سکتے

تھے ان کو اساتذہ کے ہزار۔ با عربی اور فارسی، شعاریاد تھے اور موقع

پر بلاتال سیکڑوں اشعار پڑھتے چلے جاتے تھے۔ عربی و فارسی انش

پر دہری میں وہ عدیم النظیر تھے۔ کالج میں پڑھتے وقت وہ کبھی کتاب ہاتھ میں نہیں لیتے

تھے۔ ان کا حافظہ اس قدر صحیح تھا کہ اپنی یاد سے پڑھتے چلے جاتے، اور اس خوبی سے تمام

مطالب کی تشریح اور تنقید کرتے تھے کہ طلباء کو حیرت ہوتی تھی۔ ہندوستان میں وہ

عربی اور فارسی کے استاد یگانہ سمجھے جاتے تھے، ویران میں بھی ان کا شمار مشہور اشراف و زوا

میں تھا۔ مگر فسوس کہ ان کی طبیعت میں کچھ ایسا حجاب تھا کہ کبھی میدان شہرت میں قدم نہ

رکھا، ورنہ کوئی ایسا کام کیا کہ جس سے عام طور پر لوگ ان کی علاقائیت کا بھی اندازہ کر سکتے

اور یہی وجہ ہے کہ پبلک میں نہ اس کے نہ بیٹھا، ورنہ بت سے بیک بہتی سے باہر ان سے نہ وقف ہے۔

خو جنہ غلام شقیں کا خاکہ مولوی صاحب نے ۹۱۵ میں لکھا۔ خاکے کے پہلے پیر میں مولوی صاحب نے

ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہمارے معاشرے کی ایک تلخ سچائی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

”بہت سے ایسے ہیں جو یک چک پر دستخط کر دینے سے دنیا میں یکا یک نامور ہو جاتے ہیں۔

بہت سے ایسے ہیں جنہیں اتفاقات زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو

محض نام و نمود کے لیے زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے

لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ لیکن کم ہیں جو محض اپنی بیاد

محنت و خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت و بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی

ہے۔ خو، جنہ غلام شقیں مرحوم اسی مظلوم و چھوٹے گروہ میں سے تھے۔ وہ غالب علی کے زمانے

میں بھی اپنے مطالعہ اور وسیع معلومات کی وجہ سے ممتاز تھے اور تمام غالب علم (سوائے

بعض کھنڈروں کے اور پروفیسر انھیں وقت کی نگاہ سے دیکھتے۔ یونین کلب میں ان کی تقریروں کی تش فٹانی اور خوان الصفا میں ان کے مضامین کی فصاحت بیانی مشہور تھی !

خواجہ صاحب کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

”وہ اس قدر درست باز اور بے راگ تھے کہ سچ بات کہنے میں کبھی کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور اسی لیے بعض لوگ ان سے خوش نہیں رہتے تھے مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب لوگ قائل تھے۔ خود سید مرحوم انھیں محض ان کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے مگر اختلافات کرنے میں وہ ان سے بھی نہ چوکتے تھے۔ حالاں کہ ان کے سامنے بڑے بڑوں کے پر جلتے تھے۔ علی گڑھ کالج میں ان سے پہلے اور غالباً ان کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا معلومات ایسی وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا ان تھک ہو۔ وہ پورے درجہ کے ذہین اور ذکی تھے۔ وہ ہمیشہ علمی معاملات میں گفتگو کرتے اور پوسٹکس اور خصوصاً انگلستان کے سیاسیات سے انھیں اتنے دلچسپی اور جس قدر انھیں اس سے واقفیت تھی ہماری قوم میں شاید ہی کوئی اس قدر واقف ہو۔ وہ حقیقت علی گڑھ کالج کے پوت تھے، لیکن مادر کالج کا برتاؤ ان کے ساتھ ہمیشہ ظالم نہ رہا۔ کئی بار ان کا نام پیش ہوا مگر وہ کبھی کالج کے ٹرسٹی منتخب نہ ہوئے، وجہ حیرت و افسوس یہ ہے کہ ان کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کو ترجیح دی گئی جن کا نام لکھنا بھی ہم اس صفحہ کا غر پر گوارا نہیں کر سکتے۔ کالج کے کارنامے پر یہ بڑا دھبہ ہے گا۔“

مولوی صاحب اس طرح کی دیانتدارانہ اور بے راگ رائے کا اظہار جس جرأت اور بے باکی سے کرتے تھے بہت ہی کم اہل قلم ایسا کر سکتے ہیں، انھیں اپنے آپ پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ کھل کر بات کرنے سے کبھی گھبراتے نہیں تھے۔

مولوی عبدالحق دوسروں کی خوبیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے اور ان خوبیوں کی قدر بھی کرتے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم کے مختصر خاکے میں جو بھرپور تعریف کی گئی انھوں نے مولانا سلیم کی اس کا اندازہ آپ ان مسطور سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔



”حقیقت یہ ہے کہ مولانا جیسی طبیعت اور ذہانت اور جہت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں، ان کی تحریریں اُسی قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ بات کی تہہ کو خوب پہنچتے تھے اور زبان کے توازن اور سادگی۔ جدید تعلیم نہیں پائی تھی، مگر مغربی تعلیم کا جو منشا ہے، اس سے ایسے واقف تھے کہ بہت کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہوں گے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے، مگر جب انگریزی سے اردو میں اصطلاحات یا ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو انگریزی دلی بھی ان کی واقفیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے، وہ الفاظ کے کینڈوں اور ان کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے۔ اور لفظوں کی تلاش پانے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے اور لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں۔ جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔“

گدڑی کا لال — نور خاں

۱۹۳۰ میں لکھا ہوا ایک بڑا ہی پراثر خاکہ ہے جو کہ ایک معمولی سپاہی کی، علا شخصیت کی عکاسی

کرتا ہے۔ خاکے کا آغاز ہی بڑا شاندار ہے۔ مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

”لوگ، دشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں ہیں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں، اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں کے ہی حالات لکھتے اور اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے، انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔“

لیکن خاکے کا آخری پیرا تو مولوی صاحب کی طرف سے دفعہ دار نور خاں کو ایک بہت بڑا خرچ محبت ہے۔ اقتباس پیش خدمت ہے۔

”وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے، اور دل کے کھرے تھے۔ وہ ہر دو فاکے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مریخ و مرنجان اور وضع دار لوگ کبہاں ہوتے ہیں۔ اُن کے بڑھاپے پر لوگوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی دیکھ کر دل

میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ تو میں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نورغاں ہوتے!

زیر بحث مجموعے کا سب سے مختصر خاکہ شیخ غلام قادر گرامی کا ہے۔ لیکن اس ایک صفحے کے خاکے میں گرامی کے بارے میں مولوی صاحب نے وہ بات کہہ دی ہے جو اس ٹھیک پنجاہی لہجے والے شاعر کے بارے میں کسی اور ادیب، شاعر یا نقاد نے نہیں کہی فرماتے ہیں۔

”گرامی سچا شاعر تھا۔ ہمارے یہاں شاعر کے لیے جو جو لازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے۔ بے نیاز و بے پروا۔ دنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر لاابالی۔ اگرچہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا۔ پہروں عالم خیال میں غرق آپ ہی آپ گنگنا رہتا تھا۔ اس وقت جو دیکھتا سچ عجیب دیوانہ سمجھتا۔ گھر کا حال گھر والے جانیں اور باہر والے جانیں۔ وہ اپنے شعر میں مگن رہتا تھا۔ شعر اس جوش سے پڑھتا تھا کہ گویا شعر کے جگر میں گھسا جاتا ہے اور پڑھتے پڑھتے بے خود ہو جاتا تھا۔ ذوق سخن ایسا اچھا تھا کہ اچھا شعر سن کر وجد میں آجاتا تھا۔ صورت شکل، وضع قطع سے کبھی یہ خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایسا اچھا شاعر اور ایسا صاحب ذوق ہوگا اگرچہ بظاہر اکھڑا مگر دل میں خلوص تھا۔ تو اضع اس طرح کرتا تھا کہ جیسے کوئی کسی سے بڑھا ہے اور یہ اس کے عین خلوص کی علامت تھی دوستی کا سچا اور دوستوں کا قدردان تھا۔“

سب سے آخری خاکہ حالی پانی پتی کا ہے جس کے نیچے ۱۹۳۷ء درج ہے۔ یہ آخری خاکہ سب خاکوں پر سبقت لے گیا ہے۔ کیا بھرپور خاکہ ہے۔ لگتا ہے مولوی عبدالحق حالی کی شخصیت، اس کی خوبیوں اور اس کی علمی قابلیت سے بے حد متاثر تھے۔ مجھے یہ خاکہ سب خاکوں سے اچھا لگا ہے۔ اس میں شاید میرے ذاتی تعصب کا بھی دخل ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حالی پہلا ادیب اور شاعر تھا جس نے ہندوستان میں ترقی پسندی کی تحریک کا آغاز کیا۔ کیوں کہ میرا اپنا تعلق بھی اسی تحریک سے ہے اس لیے مجھے حالی پسند ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حالی کا تعلق ہریانہ سے ہے اور پانی پت برصغیر میں اس لیے مشہور ہے کہ یہ قصہ الطاف حسین حالی کا وطن تھا اور یہیں بوعلی قلندر کے مزار

کے قریب اس کا مقبرہ ہے۔ اس حوالے سے میری حالی سے اس لیے بھی وابستگی ہے کہ میرے دو بہت ہی قریبی دوست حالی کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ میری مراد خواجہ احمد عباس و بیگم صاحبہ عابد حسین سے ہے۔

لیکن اگر حالی سے میری ذاتی وابستگی نہ بھی ہوتی میں جب بھی مولوی صاحب کے اس خلع کو، خاکہ نگاری کی ایک لاجواب مثال سمجھتا۔ خلع کا آغاز دیکھئے ذرا۔، قنبا کس طویل ہے لیکن اسی سطور میں مولوی صاحب نے حالی کی سادگی، دردِ دل کو کس خوب صورت پیرائے میں پیش کیا ہے، اس کا اندازہ آپ کو بخوبی ہو جائے گا۔

”غائباً ۱۸۹۲ یا ۹۳ کا ذکر ہے جب میں مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالب علم تھا۔

مولانا حالی اس زمانے میں یونین کی پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں اس سال تعطیلات کے زمانے میں وطن نہیں گیا تھا بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ”حیات جاوید“ کی تالیف میں مصروف تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ”یادگار غائب“ کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ انھیں دنوں میں میرے ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے، میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو گئے۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی بوٹے وقت راستے میں عزیز مہمان فرمانے لگے کہ ملنے سے اور باتوں سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنہوں نے ”سیدس“ لکھا ہے۔ یہ مولانا کی فطری سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ کا ذکر ہے جب غفران مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی جو بلی بلدہ حیدر آباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جا رہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جو بلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصے میں ٹھہرائے گئے۔ زمانہ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے مولانا سے ملنے آئے، ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپ سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی پندرہ غریب کے رسید کر دیئے۔ مولانا یہ

نظارہ اوپر برآمدہ میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ کر کے سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے۔ مزاج پر سی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا۔ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا، وہ برآمدے میں ٹھہرتے چلتے تھے اور کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا!" اس روز کھانا بھی، چھی طرح نہ کھا سکے، کھانے کے بعد قبیلے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے "یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں، اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس پر نصیب سائیں کو بھی نہ ہوا ہوگا۔"

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری درد دلی۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھیے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

مولوی صادق کو حالی کا جو وصف بہت پسند تھا وہ ان کی بے تعصبی تھی۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: "تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے انھیں بہت رنج و افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا رنج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو۔ بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔"

میں یہ سمجھتا ہوں کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مولانا حالی کا جو اتنا طویل خاکہ تحریر کیا ہے اس کا ایک سبب مولوی صاحب کی حادثے ذاتی قربت اور ذاتی پسند بھی تھی جسے محبت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ خاکے کا آخری پیرا ان کے اس ذاتی تعلق کا مضمر ہے۔

"آخر میں ان کی دو بڑی تمنائیں تھیں۔ ایک تو اردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اور رنگ آباد ہوا تھا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی ہوا بہت متعطل اور خوش گوار ہے۔ پانی بہت لطیف ہے، اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی



پر فضا ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آئیے صحت کو بھی فائدہ ہوگا۔ درجہ کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی نخل و قنات بھی نہ ہوگا اور قین ہے کہ آپ یہاں اگر بہت خوش ہوں گے۔ وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگر ن کے فرزند خواجہ سیاح حسین صاحب اور دوسرے عزیز واقارب رضامند نہ تھے۔ عذریہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے۔ ضعیفی کا عام ہے۔ طبیعت یوں بھی ناساز مہتی ہے، ایسی حالت میں اتنی دور کا سفر خلاف مصلحت ہے۔ مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم ادھر آؤ تو دو ایک روز کے لیے پانی پت بھی چلے آنا، اس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔ پھر کوئی چوں و چرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا تو وہ بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچی کہ جان لے کر گئی۔

میرا یہ خیال ہے کہ خاکہ نگاری کا فن بہت مشکل فن ہے، اور اس میں نام پیدا کرنا آسان نہیں اس کے لیے ایک خاص قسم کے ذہنی رجحان، اور ڈسپلن کی ضرورت ہے۔ یہ فن سلو سائیکلنگ ریس (SLOW CYCLING RACE) کی طرح ہے۔ اپنی حدود کا خیال بہت ضروری ہے۔ خلوص، تفصیلات کا ذخیرہ، اور ریسرچ کا انداز، مثبت اور منفی پہلوؤں کا توازن۔ بے لاگ اور دیانتدارانہ اظہار کا حوصلہ، اور ان سب کے ساتھ زبان اور اسٹائل پر عبور اور پھر دل چسپ انداز سے بات کہنے کا ایسا ڈھنگ کہ پڑھنے والا مسحور ہو کر پڑھتا جائے، کہیں رکے نہیں۔ یہ ہیں کچھ بنیادی تقاضے ایک کامیاب خاکہ نگار کے۔

میں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کو صرف ان کے خاکوں سے جانا ہے ورنہ ذاتی طور پر میں انہیں بالکل نہیں جانتا۔ اس کے باوجود میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولوی صاحب فن خاکہ نگاری پر کمال کی دسترس رکھتے ہیں اور لگتا ہے کہ ہم جس شخص کا خاکہ پڑھ رہے ہیں وہ شخص بذات خود ہمارے سامنے کھڑا ہے اور ہم سے گفتگو کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ کہاں اور کیا ہوگا۔

لیکن بطور خاکہ نگار میں ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ ان سب خاکوں میں بالائے سادو نے کسی خاتون کا کوئی خاکہ تحریر نہیں کیا۔ وہ تو ہمارے درمیان میں نہیں جو میرے اس سوال کا جواب دے سکیں۔ اگر آپ میں سے کوئی صاحب یا صاحبہ میرے اس سوال کا جواب دے سکیں تو میں ہمہ تن گوش ہوں۔ نہیں تو میرے شبہات بنے رہیں گے اور شبہات کا بنے رہنا کسی بھی صورت میں مناسب نہیں ہوتا۔

## مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری

تبصرہ نگاری کا فن اس وقت وجود میں آیا، جب تصانیف عالم وجود میں آنا شروع ہوئیں اور ان کی تبصیر کی ضرورت محسوس کی گئی، بقول ڈاکٹر ظ. انصاری:

”کالرج نے تبصرہ نگاری کو مستقل فن کی صورت دی اور پھر بعد کے تبصرہ نگاروں نے کالرج کے تبصروں سے کچھ اصول مرتب کرنے کی کوشش کی، لیکن ان سب کے باوجود، آج تک کوئی مستقل کتاب تبصرہ نگاری کے اصولوں پر مرتب نہیں کی جاسکتی۔“

یہ حقیقت ہے کہ تبصرہ کا کوئی اصول نہیں ہے لیکن پھر بھی اس فن نے بہت ترقی کی ہے۔

مولوی عبدالحق ایک عظیم محقق، بلند پایہ نقاد، مقبول نویس اور قابل احترام زبان شناس کی حیثیت سے اردو میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں انھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں اور مضامین تحریر کیے ہیں، ان میں تبصرے بھی شامل ہیں۔ تبصروں کی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل میں بکھری پڑی ہے۔ البتہ کچھ تبصرے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہوئے ہیں اس کا نام ہے ”ادبی تبصرے“۔ اس کتابچہ میں ۱۵ اہم کتابوں پر مولوی عبدالحق کے لکھے ہوئے تبصرے شامل ہیں۔

ان تبصروں کے مطالعے سے ایک طرف فن تبصرہ نگاری کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں تو دوسرا بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کے مزاج اور ان کے ادبی منصب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان تبصروں کی نوعیت آج کے تبصروں سے بہت مختلف ہے، کیوں کہ ان میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سرسری نہیں ہے اور نہ ہی غیر ضروری اعتراض کا پہلو نکالا گیا ہے بلکہ مولوی عبدالحق صاحب نے جو بھی بات کہی ہے، بہت غور و فکر کے ساتھ ساتھ گہرے مطالعے کے بعد کہی ہے۔ ”مکتوبات حالی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ادب میں سیکڑوں دلکشاں ہیں، اُس کی بے شمار راہیں اور اُن گنت گھاٹی ہیں لیکن خطوط  
 میں جو جادو ہے (بشرطے کہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی دایں نہیں، نظم ہو، ناول ہو،  
 ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو، غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی  
 ہے اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، بناوٹ کی باتیں جلد پرانی، ور بوسیدہ  
 ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔ ہماری ہر علمی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے،  
 غیروں کے لیے ہے اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں  
 کی نظر میں اس پر پڑیں گی، اس لیے مصلحت وقت کا بھی خیال ہوتا ہے، عبارت اُرائی  
 بھی کرنی پڑتی ہے۔ تکلفات بھی برتنے پڑتے ہیں، خیال کو صاف صاف لکھنے کے بجائے  
 طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست  
 کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ  
 جاتا ہے اور ہر مسئلے اور ہر شے کے متعلق جیسا کہ اس کا خیال ہوتا ہے، صاف صاف  
 اور سچ سچ لکھ دیتا ہے، وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے، وہ نہ دوسروں سے چوکت  
 ہے اور نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے، اُس وقت نہ اسے خوف لگتا ہے اور نہ نکتہ  
 چینی کا کھٹکا، خطوط کی یہی سادگی ادب بے ریا فی جودلوں کو بھاتی ہے اور یہی وجہ  
 ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعہ  
 سے نہیں ہو سکتا، ان خطوط میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے  
 باتیں کرنے لگتا ہے، جو خیال اس کے دل میں ہوتا ہے، اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا  
 ہے۔“ (ادبی تبصرے - صفحہ ۷۶-۷۷)

اس اقتباس سے ایک ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے یعنی مولوی عبدالحق نے جو بات بھی کہی ہے وہ بہت  
 وثوق اور ذمہ داری سے کہی ہے، خواہ مخواہ اُنے غیر ضروری اعتراضات بھی نہیں کیے ہیں نہ بلاوجہ خامیاں  
 تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، یہی وہ خوبی ہے، جو آپ کے تبصروں کو دوسروں سے منفرد کر دیتی  
 ہے ملاحظہ فرمائیے ایک اقتباس ”روح ادب“ کے تبصرے سے، جو جو شایع آبادی کا مجموعہ کلام۔  
 ”بلاشبہ حضرت جو شایک جو اں طبیعت، جدت پسند اور ہونہار شاعر و ناشر

ہیں لیکن جدت کے جوش میں انہیں ذوق سلیم کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے، ان کی نثر میں تصنع اور تکلف کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ حصوں کمال کے لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔

لیکن سب سے زیادہ مایوسی اور رنج ہمیں ان تصویروں کو دیکھ کر ہوتا ہے، جو اس کتاب میں بعض مضامین فطرت و جذبات کے ساتھ چسپاں کی گئیں ہیں۔ اس سے مصنف کے ذوق کا ایک حد تک اندازہ ہوتا ہے، بجائے اس کے یہ تصویریں ان جذبات کی گرمی اور حسن کو بڑھائیں۔ دیکھنے والوں پر الٹا اثر کرتی ہیں تعجب ہے کہ قابل مصنف نے اس قسم کی ادنیٰ، عامیانہ اور بازاری تصویریں کو اس مجموعہ میں داخل کرنا کیوں گوارا کیا۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سگریٹ کے پکسوں پر جو تصویریں اکتی ہیں، ان کی ہو بہو نقل کر دی ہے یا انگریزی اخباروں اور رسائل کے اشتہاروں سے لی گئی ہیں اس سے تو بہتر تھا کہ تصویریں شریک ہی نہ کی جاتیں، ورنہ اس کا خاص، پتہ نام کیا جانا اور نازک خیال مصوروں سے بنوائی جاتیں۔ (ادبی تبصرے صفحہ ۶۰)

تبصرے کے لغوی معنی روشن کرنے، تعارف کرانے، کسی چیز سے پردہ اٹھانے اصل صورت دکھانے وغیرہ کے ہیں۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ تقد ہے نقد کے معنی پرکھنے کے ہیں، اسی لیے تنقید اور تبصرہ ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں اور زیادہ تر لوگ تبصرے کو تنقید کے دائرے میں لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں، جب کہ تنقید اور تبصرے میں بہت فرق ہے، اس فرق کو مولوی عبدالحق صاحب نے سب سے پہلے محسوس کیا اور اپنے تبصروں میں اس کا پورا خیال رکھا اور ہماری آپ کی سب کی رہنمائی کی کہ تبصرہ کیسے کرنا چاہیے؟

گو تبصرہ اور تنقید کی سرحدیں مل جاتی ہیں لیکن بھر بھی ان میں فرق اور امتیاز کو مولوی عبدالحق صاحب نے ملحوظ رکھا اور تبصرے کے جو معنی ہیں یعنی دکھانا، بینا کرنا، جائزہ لینا، اس کا پورا خیال رکھا۔ دکھانے کے ساتھ ساتھ متعارف کرانے کا کام بھی بہت سلیقے سے کیا، کیوں کہ تعارف کرانے میں بھی ایک خاص رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق اپنے قلمین سے الطاف حسین حالی کا تعارف یوں کراتے ہیں۔



”دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں، دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم ان اولوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کے حیرت انگیز جدوجہد، قربانیوں، اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکی کو مٹایا۔ محبت ہم ان سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت، خوش اطوری اور خوش اخلاقی دس کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے، جو چودھویں رات کی چاندنی، ان کے پاس سے جو اٹھا کچھ لے کر اٹھا اور ان کے پاس جو گیا، کچھ بن کر آیا۔ مولانا حالی ان پاک نفوس میں سے ہیں، جن کا ہم ادب بھی کرتے ہیں اور ان سے محبت بھی؟ (ادبی تبصرے صفحہ ۶۲)

ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیے جو نائک ساگر کے تبصرے سے لیا گیا ہے، جس میں مولوی عبدالحق صاحب نے لغوی معنوں کا خاص خیال رکھا ہے۔

”ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت ڈرامے سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو رفع کرے گا اور بہت سے ایسے نکتہ معلوم ہوں گے جن سے ہم بے خبر تھے اور ملک کے انشا پردازوں کے لیے ہدایت کا کام دے گی، جو صاحب ڈرامے سے شوق رکھتے ہیں یا جن کا رجحان اس طرف ہے، ان کے لیے یہ کتاب ایک نعمت ہے نور محمد صاحبان قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اردو ادب میں بہت اچھا اضافہ کیا ہے اور ایسے مضمون پر کتاب لکھی ہے، جس سے ہماری زبان خالی تھی (ادبی تبصرے، صفحہ ۵۳)

در اصل تبصرہ نگار کا کام ابتدائی ہوتا ہے اور تنقید نگار کا کام انتہائی، مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے ہر تبصرے میں اس بات کا خیال رکھا ہے اور قارئین کے سامنے کتاب اور مصنف کا تعارف اس انداز سے کرایا ہے کہ خوبیاں اور خامیاں دونوں ہی اجاگر ہو کر سامنے آگئیں ہیں اور کتاب کے ساتھ ساتھ مصنف کی بھی صحیح تصویر قارئین کی نظروں میں ابھرتی ہے، جو تبصرہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے اور بے اختیار اس کا جی چاہا اٹھتا ہے کہ وہ کتاب خریدے اور اس کا مطالعہ کرے۔ م راشد کے مجموعہ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اب میں نیا اور پرانا کوئی چیز نہیں، جس ادب میں تازگی، جدت اور گہرائی ہے۔ خواہ دو ہزار برس پہلے کا کیوں نہ ہو، نیا ہے اور جس ادب میں یہ خوبی نہیں، خواہ وہ آج ہی

کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو، پرانا ہے۔“ (ادبی تبصرے صفحہ ۸۵)

حالانکہ تبصرہ نگاری کے کوئی اصول ابھی تک مرتب نہیں کیے جاسکے ہیں۔ مگر فطری طور پر چند باتیں سامنے آگئی ہیں اور جس پر مولوی عبدالحق شمس سے کاربند نظر آتے ہیں، اسی لیے ان کے تبصرے عام تبصروں سے بہت مختلف ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک تبصرہ نگار کو یہ بھول جانا چاہیے کہ کتاب کا مصنف کون ہے؟ اور صرف اس بات پر توجہ دینا چاہیے کہ کتاب میں کیا لکھا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے، اس کی قدر و قیمت کیا ہے یعنی تبصرہ نگار اور مصنف کے ذاتی تعلقات درمیان میں نہیں آنا چاہئے اور اس بات کا پورا پورا خیال مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے تبصروں میں رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر بے لاگ تبصرے کیے ہیں، جو کشمکش بادی کا مجموعہ کلام ”آیات و نجات“ کے بارے میں فرماتے ہیں :-

”لیکن جب سلام اور نوحے یا اسی قسم کی نظمیں لکھتے ہیں جیسا کہ اس مجموعہ میں پائی جاتی ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دل پرانے اوہام اور عقائد سے اس قدر اٹا ہوا ہے کہ روشنی کی ایک کرن کا بھی وہاں گزر نہیں۔ انقلاب، نظام جدید اور ہر جدید رنگ پر فریفتہ ہیں، جو کشمکش و خروش اور انقلاب کے نعروں سے اُن کا کلام گونج رہا ہے لیکن انقلاب کیا ہے؟ نظام جدید سے کیا مطلب ہے؟ اس سے انھیں بحث نہیں، انھیں تو غارت گری سے مطلب ہے۔“ (صفحہ ۸۷)

یہ ہے مولوی عبدالحق کی دیانت داری اور بے باکی، جو ان کے تبصروں میں پائی جاتی ہے اور ان کے تبصروں کو مثالی تبصرے بنا دیتی ہے۔ مولوی عبدالحق کے یہ تبصرے اردو تبصرہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب نے بہت بڑی تعداد میں تبصرے لکھے ہیں، اُن کے یہ تبصرے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، کُل ۵۰ کتابوں پر تبصرے ”ادبی تبصرے“ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں، اس کتاب پر کوئی دیباچہ نہیں ہے۔ کل ۸۷ صفحات کی یہ چھوٹی سی کتاب ہے،

جس کا پہلا ایڈیشن، دانش محل، لکھنؤ نے ۱۹۴۷ء میں شایع کیا تھا اور یہ دوسری بار بھی دانش محل لکھنؤ سے ۱۹۶۴ء میں شایع ہوئی تھی۔ اب یہ کتاب نایاب ہے، پرانی لائبریریوں میں تو مل جاتی ہے لیکن ہزار میں دستیاب نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ تلاش و جستجو کر کے مولوی عبدالحق کے لکھے ہوئے تمام تبصرے یکجا کیے جائیں اور انہیں پھر کتابی صورت میں شایع کیا جائے۔ یہ کام اس لیے بہت ضروری ہے کیوں کہ مولوی عبدالحق کے تبصرے آج کی مروجہ طرز تبصرہ نگاری سے بہت مختلف ہیں اور ہمیں تبصرہ کرنے کے لیے نئی راہیں دکھاتے ہیں۔

جو حضرات فن تبصرہ نگاری کے اصولوں سے آشنا ہونا چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ مولوی عبدالحق کے تبصروں کا ضرور مطالعہ کریں اور جس طرح کا لرحج کے تبصروں سے ان کے بعد کے تبصرہ نگاروں نے تبصرہ نگاری کے اصول مرتب کرنے کی کوشش کی تھی، ٹھیک اسی طرح کوئی صاحب اگر تبصرہ نگاری کے اصولوں پر کتاب مرتب کرنا چاہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مولوی عبدالحق کے تبصروں کو بنیاد بنائیں تو یقیناً ایک بہتر اور مفید کتاب تیار ہو جائے گی۔

## مولوی عبدالحق خطوط کے آئینے میں

ہندوستان کے محکمہ ڈاک کو اردو کے جن ادیبوں اور شاعروں سے بکثرت رقی فائیدہ پہنچا ہے ان زعمائے مکتوب نگاری میں، میں سمجھتا ہوں بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنے پیشرو اسد اللہ خاں غالب، اپنے ہم عصر رشید احمد صدیقی اور نیاز فتحپوری سے بھی آگے ہیں وجہ ان کی سبقت کی یہ ہوگی کہ مولوی صاحب اردو کے خدمت گار ہونے کے علاوہ سرکاری ملازم بھی تھے اور وہ بھی محکمہ تعلیمات میں۔ مرحوم ریاست حیدر آباد میں مولوی صاحب کے تعلقات ہمارے سرشن پرشاد سے لے کر محکمہ تعلیمات کے ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن اور کالج کے تمام مانتھن سے تھے۔ انہیں ترقی اردو جسے میں بنت عبدالحق کہنا پسند کروں گا کے فتر کے تمام ساتھی مولوی عبدالحق کے اراکین خاندان تھے۔ ان تمام افراد سے مولوی صاحب کو والہانہ محبت تھی اور وہ ان سب کے گھربلو معاملات میں بھی ذہیل تھے یعنی ان کے تقررات، تبادلوں، تنخواہوں وغیرہ سے متعلق سارے مسائل مولوی صاحب ہی حل کرتے تھے۔ اسی لیے مولوی صاحب کی خطوط نگاری کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مولوی صاحب کے ایک شاگرد رشید محمد اکبر الدین صدیقی نے مولوی صاحب کے وہ خطوط کتابی صورت میں شایع کیے ہیں جو مرحوم نے اپنے نیاز مندوں کے نام لکھے ہیں۔ اکبر الدین صدیقی نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے "مولوی صاحب کے خطوط کے تین مجموعے اردو سے مصفا مکتوبات عبدالحق اور مکتب بابائے اردو (امامی صاحب) منظر عام پر آئے۔ ان کے علاوہ رسائل میں بھی مولوی صاحب کے اکثر و بیشتر خطوط شایع ہوئے ہیں لیکن ان خطوط کو اگر بغور پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھیں باسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ خطوط ہیں جو مولوی صاحب نے اپنے کرم فرماؤں اور سادی مرتبہ رکھنے والوں کے نام لکھے ہیں دوسرے وہ خطوط ہیں جو ان کے نیاز مندوں کے نام ہیں۔"

میں انہی خطوں میں سے چند خط آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ مولوی عبدالحق



بحیثیت شخص کیا اور کیسے تھا انہی خطوں کے ذریعے انہیں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ اردو زبان جیسے اس دیس کی گوری کہتا چاہیے کیسے آبرو باختہ ہوئی اس کی تفصیل بھی انہی نئی خطوں میں ملے گی اور آپ کے ذہن میں میر کا یہ شعر در آئے گا۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ      تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

وہی مولوی عبدالحق جنہوں نے کراچی میں طفرار حمان مرحوم کے نام ۱۹۴۸ء میں یہ لکھا تھا کہ اردو انجمن زندہ ہے اور انشا اللہ زندہ رہے گی اور فروغ پائے گی۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں دکھا دوں گا کہ ہم ان ناسازگار حالات میں بھی کام کر سکتے ہیں۔ اردو ترقی کرے گی اور جتنا دبا یا جائے گا اتنی ہی پھیلے گی۔ انہی مولوی عبدالحق نے کراچی سے یکم نومبر ۱۹۵۰ء کو سید ساجد علی مرحوم کو اپنے خط میں لکھا ”میں خیریت سے ہوں لیکن اردو کی خیریت کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ آپ نے لکھا ہے وہاں اب اس میں کچھ جان پڑ رہی ہے۔ دن کی تسلی کے لیے تو یہ بات کافی ہے لیکن حقیقت سے دور ہے۔۔۔۔۔ یہ نہ پوچھیے پاکستان میں اس کا کیا حال ہے ورنہ یہ خط میرا تیس کا مریض ہو جائے گا اور میرے قلم سے روشنائی کی بجائے خون ٹپکنے لگے گا۔ میں اپنا ایک کتابچہ ”پاکستان میں اردو کا المیہ“ بھیجتا ہوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا بچی کو عرش پر بھی بیگار جو مثل ہے بعینہ میرا وہی حال ہے۔“

یہ دو اقتباسات تو میں نے صرف اس لیے نقل کیے کہ مولوی عبدالحق یا پائے اردو تھے اور اپنی چھٹی بیٹی کو کسی حال میں فراموش نہیں کر سکتے تھے ورنہ میں تو اصل میں ان خطوں کا عاشق ہوں جن میں مولوی عبدالحق کی محبت ٹھاٹھیں مارتی ہے اور ان کے خلوص کی روشنی جنہیں بقول نورنا دیتی ہے گویا وہ خط نہ ہوں کوئی شادی خانہ ہوں۔ مثال کے طور پر اپنے ایک خط میں اپنے اور نگ آباد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ”آپ کا اشفاق نامہ پہنچا۔ اسے پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے دوسرے عالم میں چاہنچا۔ اور نگ آباد کی محنتوں رفیقوں اور احباب کی محبت، عنایت، کالج اور انجمن کی سرگرمیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اس عظیم پاک دہند کا شاید ہی کوئی بڑا چھوٹا شہر، قصبہ و قریہ

۱۔ خطوط مولوی عبدالحق مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی

۲۔ ایضاً ص ۱۷۵، ص ۱۷۴

ایسا ہو جس کی خاک میں نے نہ چھانی ہو۔ شہر اور قصبے تو میری جولان گاہ تھے۔ پہاڑوں، جنگلوں، دریاؤں اور سمندروں کی بھی جی بھر کے سیر کی۔ جن دنوں مجھ بہار دوزبان کا جن سوار تھا اور ہندی والوں اور کانگریس حکومتوں سے معرکہ آرائی تھی تو میں سچ پچ زمین کا گز بنا ہوا تھا۔ زندگی کا وہ دور عجیب و غریب تھا۔ اگر تحریر میں لاؤں تو اسٹ لیلہ کی داستان معلوم ہوگی۔ اس سرگردانی اور آوارہ گردی میں کبھی کبھی میرا قیام ایسے پر فضا صحت افزا اور خوش منظر مقامات میں بھی رہا جنہیں دیکھ کر خدا کی قدرت نظر آتی تھی لیکن یقین جانے اورنگ آباد کی یادوں بھی مجھے گدائی تھی۔ اورنگ آباد کا وہ مقام جہاں میرا قیام تھا یعنی مقبرہ رابعہ دورانی اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا اس کی صاف ستھری ہوا، بنی نہر کے لطیف پانی، اس کے دریا ماحول اور قدرت و صنعت کی یکجائی میں ایسی کشش تھی کہ حیدر آباد چھوڑنے کے بعد بھی میں ہر سال وہاں جا کر کچھ دن بسر کرتا اور اسے اپنی صحت و توانائی اور مسرت کا ضامن سمجھتا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ اورنگ آباد جاؤں اور چند روز ”مقبرہ“ میں جا کر رہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے یہ حسرت میرے ساتھ قبر تک جائے گی۔

مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ میں تو اسے وطن ثانی بھی نہیں کہوں گا وطن اول ہی کہوں گا۔ سارا ہندوستان ہی سمجھتا تھا کہ ایک غیر معروف قصبہ ہاڑیس ولادت پانے والے مولوی عبدالحق اورنگ آباد کن ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ غلط فہمی، تسامح ہونے کے باوجود کتنی صحت مندانہ تھی۔ مولوی عبدالحق کہنے کو اہل و عیال سے بے نیاز تھے لیکن انجمن ترقی اردو اورنگ آباد انٹر میڈیٹ کالج اورنگ آباد کالج کار سائے نورس، انجمن کار سائے اردو یہ سب ان کی اولادیں تھیں جن پر بابائے اردو کی شفقت، مودت و محبت، محنت اور مشقت، خلوص اور لگن کی موسلا دھار بارش ہو آ کر تھی۔ انجمن کے کاموں کے سلسلے میں مولوی صاحب کو جگہ جگہ جانا پڑتا تھا۔ اس لیے یوں سمجھئے کہ مولوی عبدالحق نے صرف محکمہ ڈاک ہی کی کفالت نہیں کی محکمہ ریلوے اور دیگر ذرائع آمد و رفت کو بھی مالا مال کیا۔ ایک خط میں انھوں نے طفر الرحمن صاحب کو لکھا تھا کل صبح رام پور جا رہا ہوں بھی کو ہر ایک کے پاس جانا پڑتا ہے پہلے تو وہ اورنگ آباد کے قریب کے تمام ضلعوں، تعلقوں اور قصبوں

میں گھومے پھر ہندوستان کی سرزمین کے گز بلکہ مربع گز بنے رہے، تقسیم ہند سے پہلے بھی لاہور اور کراچی آتے جاتے رہے اور بعد میں مستقل طور پر کراچی منتقل ہونے تو وہاں بھی سفر سفر سفر۔ بس یوسف کھیل پوش کی طرح جگہ جگہ گھومتے رہے۔ جو خط انھوں نے ظفر الرحمان، سید ساجد علی اور محمد علی صاحبان کو لکھے ہیں اگر ان خطوں کو ایک ہی نشست میں پڑھا جائے تو پھر جغرافیہ کی کتاب پڑھنے کو باقی نہیں رہتی۔ ہندوستان کے سارے شہروں اور قصبوں کے نام ان خطوں میں مل جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کو صرف انجمن سازی آئی زمانہ سازی نہیں آئی۔ مولوی صاحب روزانہ ۶ خط تو لکھتے ہی ہوں گے۔ جب پاکستان منتقل ہوئے تب بھی ان کا یہی مشغلہ تھا۔ مثلاً ۲۶/۲۷ مارچ کو لاہور میں اردو کانفرنس ہونے والی ہے۔ اصرار ہے میں اس کی صدارت کروں اس کے بعد ہماری احمد آباد کی شاخ کل گجرات اردو کانفرنس ۳/۴ اپریل کو کر رہی ہے۔ اس کی صدارت میں نے قبول کر لی ہے کیوں کہ وہ ہندوستان میں ہوگی اور مجھے اس نا انصافی کے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملے گا جو ہند کی حکومتوں نے اردو کے حق میں کی ہے۔ اردو کے حق کے الفاظ پر ذرا غور فرمائیے۔ یہ خط فروری ۱۹۴۸ء کا ہے۔

ایک ورخط میں لکھتے ہیں "میں اکیلا نگر مارا ملا پھرتا ہوں کسی اور کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اگر ملے"۔ ۳ جنوری ۱۹۴۹ء کے ایک خط میں اپنے سفر تک وڈو کے بارے میں لکھتے ہیں ساقوں کو آمد و رفت میں جو تکلیفیں دی جاتی ہیں اس کا حال میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ اس کا مقصد سولے تکلیف پہنچانے اور کچھ نہیں سہہ لیکن یہ شکوے شکایتیں صرف دوستوں سے تھیں سفر وسیلہ ظفر ہو یا نہ ہو اس سے انھیں مفر نہیں تھا۔ ملاحظہ ہو "دلی سے لوٹنے کے کچھ دن بعد مشرقی پاکستان کے دورے پر چلا گیا تھا۔ وہاں اردو کا کام شروع کیا ہے تیس چالیس سال جو محنت کی تھی اس پر پانی پھر گیا۔ اب اس عمر میں از سر نو کام کرنا ہے۔ "قوی زبان" (جائے ہماری زبان یہاں سے جاری کیا ہے) "اردو" جولائی سے اور معاشیات، اگست سے جاری ہو گیا۔ یہ خط ۸ جون ۱۹۴۹ء کا ہے۔

مولوی عبدالحق کی زندگی میں کئی موڑ آئے۔ وہ حوادثِ زمانہ کو جزو حیات سمجھتے تھے اور



ان کے پیشانی پر جو میرے انداز پریمائش کے مطابق فراخ تھی شکستیں نہیں پڑتی تھیں لیکن ان کے تجربے تلخ بھی تھے اور وہ اپنے نجی خطوں میں اس تلخی کا اظہار کرنے سے احتراز نہیں کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ”دلی جا ناممکن نہیں ہے۔ وہاں گیا تو شاید واپس نہ آسکوں۔ ایک خط سے ابھی معلوم ہوا کہ وہاں کی انجمن کے سکریٹری قاضی عبدالغفار مقرر کیے گئے ہیں۔ خدا کی قدرت ہے۔ اب کسی بات پر تعجب معلوم ہوتا ہے اور نہ کوئی نقصان۔ نقصان — ہندی سائتھ سمیلن کا کوئی دعوت نامہ مجھے نہیں پہنچا۔ اگر ہوا بھی تو میں نہ جانتا۔ اب ہندوستان ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ خدا کی مرضی یہ خط بھی کاپی سے ۲۴ جولائی ۱۹۴۹ء کا لکھا ہوا ہے (صفحہ ۸۹) (۳)“

کراچی کی ثقافتی صورت حال ۴ فروری ۱۹۵۰ء کے خط میں ان الفاظ میں ظاہر کی ہے: ”یہاں زندگی کی سب آسانیاں میسر ہیں اور غذا تو یہاں اس قدر سستی اور افراط سے ہے کہ شاید دنیا کے کسی ملک میں نہ ہو۔ روزانہ بیسیوں دعوتیں ہوتی رہتی ہیں اور ان دعوتوں میں بیس پچیس یا پچاس ساٹھ آدمی نہیں ہوتے بلکہ سو سو، دو سو، پان پان سو۔ کھانے اعلیٰ درجے کے نفیس مختلف قسم کے دس دس بارہ بارہ مگر جو چیز نہیں ملتی وہ کتاب ہے۔ اس لیے جہاں جہاں سے مجھے کتابیں ملتی ہیں جمع کرتا رہتا ہوں۔ بہت سے ہاجرین اپنی کتابیں ویسے ہی نذر کر گئے ورنہ تلف ہو جاتیں (۴)“

اچھا ہوا کہ دعوتوں سے متعلق مولوی صاحب کا یہ خط زیادہ مشہور نہیں ورنہ ویرا آفس پر درخواست گزاروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔

انجمن مولانا کی جان تھی۔ ہر خط میں ان کی اپنی صحت اور خیریت کا ذکر ہوا یا نہ ہوا انجمن کے ذکر کا ہونا ضروری تھا۔ ایک مرتبہ اس کا ذکر یوں کیا کہ ”انجمن کی شاخ کسی نام سے ہو اور کہیں ہو۔ اردو کا حقیقی کام کرنے تو ہمارے سر آنکھوں پر۔ اب تو حیدر آباد میں سب سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔“ (۵) شکر ہے کہ مولوی صاحب کی یہ آرزو کم سے کم ضرور پوری ہوئی حبیب الرحمان مرحوم جیسے اردو کے عاشق نے حیدر آباد میں ”اردو گھر“ تعمیر کروادیا۔ میں اسے سالار جنگ میوزیم پر بھی ترجیح دینے میں تکلف نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ حبیب الرحمان مرحوم کسی پایگاہ کے مالک نہیں تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ حیدر آباد کے علاوہ کسی اور مقام پر ”اردو گھر“ موجود ہے۔ دلی کی بات اور ہے۔

اورنگ آباد کا مقبرہ اور انجمن کے علاوہ مولوی صاحب اورنگ آباد کالج کے بھی قیس و فریاد تھے۔



اورنگ آباد کالج سے متصل بھراکل دروازے پر مولوی صاحب نے جو کتبہ کندہ کروایا تھا اب بھی محفوظ ہے۔ اورنگ آباد کالج کے رسالہ "نورس" کی ابتدا ابھی ہوئی بھی نہیں تھی کہ مولوی صاحب کا اس رسالے سے عشق الم نشرح ہو گیا۔ اورنگ آباد سے ۲۶ جنوری ۱۹۲۵ء کے خط میں سید ساجد علی صاحب کو اپنے رسالے کے بارے میں لکھا کہ "یہ کالج سے بھی ایک میگزین شایع کرنے والا ہوں بنطوری اچکی ہے۔ امید ہے کہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں پہلا پرچہ شایع ہو جائے گا۔ یہ دو ماہی ہو گا یعنی سال میں چھ پرچے نکلا کریں گے۔ (یہ دو ماہی ہو گا لکھنا کافی تھا۔ لیکن مولوی صاحب تقسیم اور تفصیل کے ماہرین میں سے تھے۔ ی۔ ن۔ ا) اس کا نام میں نے بہت ہی اچھا رکھا ہے۔ آپ سن کر خوش ہوں گے۔ "نورس" پر لحاظ سے مناسب ہے۔" مولوی صاحب اپنی انجمن کے رسالے "اردو" پر جان چھڑکتے وقت محفوظی سی جان بچا لیتے تھے اور یہ "نورس" پر چھڑکتے تھے۔ "نورس" کے ایڈیٹروں میں دہاج الدین شمیم تو تھے ہی طلباء میں شیخ چاند مرحوم، اشفاق حسین اور سکندر علی وجد بھی شامل رہے۔ یہ "نورس" حیدرآباد کے محلہ عثمانیہ کا برادر خورد تھا اور بہت سچملا۔ یہ خاکسار بھی اسی رسالے کے صفحات سے طلوع ہوا ہے۔

مولوی عبدالحق میں حسن مزاج اتنی تھی کہ وہ جانتے تو دوسروں میں بھی تقسیم کر سکتے تھے۔ مجھے ان کا طالب علم ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی لیکن شرف ملاقات سے محروم نہیں رہا۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں میں جب زیر تعلیم تھا اور وہاں کی بزم ادب کا معتقد تو ایک مشاعرے کی صدارت کی درخواست کے ساتھ میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مشاعرے کی صدارت ایک شاعر کو کرنی چاہئے تو میں نے جواب میں عرض کیا کہ مشاعرے کی صدارت ایک شاعر کو کرنی چاہئے تو میں نے جواب میں عرض کیا کہ مشاعرے کی صدارت کا حق تو ایک ادیب اور شاعر ہی کو پہنچتا ہے جو داد دینے میں شاعروں کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔ مولوی صاحب نے یہ صدارت قبول فرمائی اور شاعروں کو اتنی داد دی کہ اس داد پر داد و ہش کا گمان ہونے لگا۔ مولوی صاحب پھلوں کے علاوہ تمباکو کے بھی عاشق تھے۔ پھلوں کا معاملہ تو یہ تھا کہ ہندوستان کے ہر علاقے کا مشہور پھل ان کی قیام گاہ یعنی ممبرہ دورانی میں وقت مقرر

پر پہنچ جاتا تھا۔ تمباکو وہ فرمائش ہی نہیں فہمائش کر کے منگواتے تھے۔ اجار کے بھی شوقین تھے۔ مولوی صاحب کے حقے کی گڑ گڑا ہٹ کلیر ویم اور سرگم مقبرہ کی سنگی دلیواروں میں اب بھی محفوظ ہے۔ اجار سے اپنی رغبت کا اظہار ایک خط میں اس طرح کیا ہے۔

”اچار پہنچا، میری بڑی مرغوب چیز ہے۔ بہت شکریہ، یہ خط ظفر الرحمن کا موصول ہے تاریخ درج نہیں ہے

تمباکو کا ذکر خیر کی خطوں میں ہے مثلاً تمباکو پہنچ گیا تھا۔ اگر یہ ۔۔۔ کا ہے تو بڑی نعمت ہے۔ میں نے ابھی بنوایا نہیں ہے۔ بنوانے کے بعد اطلاع دوں گا اور آئندہ کے لیے فرمائش کروں گا۔ اس خط کے فوراً بعد دوسرے خط میں یہ اطلاع درج ہے ”اس وقت میں حقہ پی رہا ہوں، ہر کش میں پپ کی یاد کی خوشبو آرہی ہے۔ اچھے تمباکو کے نہ ملنے پر شکایت بھی کرتے مثلاً، ”آپ وطن گئے مگر آپ نے اب کے پھر میرے لیے تمباکو کا کوئی انتظام نہ کیا۔ اتنے دنوں کے بعد آدمی وطن جاتا ہے تو وہاں کی خوشبو میں ایسا مگن ہو جاتا ہے کہ ایسی ویسی باتیں اسے یاد نہیں رہتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کے خاندان میں کوئی حقہ نہیں پیتا ورنہ پیتے دیکھ کر آپ مجھے ضرور یاد کرتے۔ یہ موسم بھی تھا۔۔۔ چلئے مولوی صاحب کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھیلوں اور شادیوں کے موسم کی طرح، تمباکو نوشی کا بھی کوئی موسم ہوا کرتا ہے۔

مولوی صاحب کے خطوں میں اورنگ آباد ہی اورنگ آباد بھرا پڑا ہے۔ ان کے متعلق ہاشمی فرید آبادی نے تو یہ تک مشہور کر رکھا تھا کہ اورنگ آباد کے قرداں اورنگ زیب عالمگیر تھے یا عبدالحق۔ اور یہ اس لیے صحیح ہے کہ جب عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ منظور ہوا اور یونیورسٹی کے قیام سے پہلے دارالترجمہ قائم ہوا تو اس کی نظامت مولوی صاحب نے صرف اس شرط پر قبول کی کہ مہینے میں شروع کے دس دن وہ اورنگ آباد میں گزاریں گے اور نظامت کے فرائض بھی صرف دو سال تک انجام دیں گے۔ ان کی یہ شرط قبول کی گئی اور مولوی صاحب پابندی سے ہر مہینے اورنگ آباد آتے جاتے رہے۔ جامع عثمانیہ میں جب ان کا تقرر ہوا تب بھی ان کی محبت اورنگ آباد سے برقرار رہی۔ حیدر آباد سے جب بھی اورنگ آباد پہنچتے اپنے دوستوں کو لکھ بھیجتے کہ آموں کا انتظام کر رکھنا۔ تریبوز اور خبربوز کی فرمائش ہوتی لیکن جہاں تک آموں کا تعلق ہے وہ بہار کے آموں کو سونے کے تمنغے کا مستحق سمجھتے تھے۔ محمد علی کو جو بعد میں اورنگ آباد کالج کے منتظم ہو گئے تھے ایک خط میں انھوں نے یہ لکھا کہ ”انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔ آم نہیں تو نہ سی۔ تم اور

فستی تو ہو۔ آم کھانے تو میں بہار جاؤں گا۔ وہاں سے بہتر آم کہیں نہیں ہوتا۔ اس قسم کے چٹکے ان کے خطوں میں بہت ہیں۔ ایک خط میں یہ قوفی کی صفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ قوفی کسی خاص عمر سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ہر عمر میں ہوتی ہے البتہ اس کی نوعیت بدلتی رہتی ہے" ۱۔ قسمت اور سفارش کے بارے میں خیالات اس طرح ظاہر کیے "دو لفظوں کا مفہوم حیدر آباد میں آکر سمجھ میں آیا۔ ایک قسمت اور دوسرا سفارش یوں تو یہ لفظ بچپن سے پڑھتے اور سنتے آتے تھے مگر اصل معنی یہاں آکر معلوم ہوئے" ۲۔ لیکن مولوی صاحب خود بھی سفارشیں کرنے میں بہت مستعد تھے مثلاً "حائل نیاز نامہ منڈل کامیاب ہے اور منشی گری کا کام خوب جانتا ہے۔ مدرسی اور محری دونوں کام کر چکا ہے۔ یہ لڑکا اس وقت بہت مشکل میں ہے۔ سارے خاندان کا بار اس پر آ پڑا ہے اور کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ آپ سید ہیں اور یہ برہمن ہے اسید ہے کہ آپ اپنے ہم پیشہ کی دستگیری میں دریغ نہ فرمائیں گے" ۳۔ لیکن مولوی صاحب کی سفارشیں جائز سے بھی زیادہ جائز ہو کر رہ گئیں ایک خط میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے "پھر آپ سنیوں کوں کر ہوئے۔ جب آدمی لڑنے کو تیار ہو تو اس کا دعویٰ قوی ہونا چاہئے" ۴۔

مولوی صاحب کا ایک خط تو بڑے ہنگامے کا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے منڈل کمیشن کے

سربراہ کا لکھا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہوا

"میں نے گزشتہ سال بار بار تاکید کی تھی اور گشتی بھی جاری کی تھی کہ نیچے اقوام کے مدارس اور ان کی تعداد وغیرہ کا خاص طور پر رپورٹ میں ذکر کیا جائے لیکن افسوس ہے کہ آپ کی رپورٹ میں ان کا نام تک نہیں۔ کیا آپ بھی انھیں ناقابل ذکر خیال کرتے ہیں۔ کیا سید بھی اب برہمن ہو گئے ہیں براہ کرم جو نیچے اقوام کے مدارس اور طلباء کی تعداد اور اس کے متعلق جو قابل ذکر امور ہوں مطلع فرمائیے" ۱۔ دلی سے اورنگ آباد جاتے وقت لکھا "اب میں شروع برسات میں وہاں آ جاؤں گا۔ صرف ایک مشکل ہے۔ وہ آموں کا موسم ہوتا ہے ایسے آم وہاں نہیں ملتے۔ برسات میں اورنگ آباد جنت ہوتا ہے اور دلی دوزخ لیکن ایسی جنت کس کام کی جس میں آم نہ ہوں۔ اس سے تو وہ دوزخ اچھی ہے جس میں کھانے کو آم تو ملیں۔ مولوی عبدالحق شاعر نہیں تھے لیکن آموں کی نسبت سے وہ سدا اللہ خاں غالب کے رشتہ

دارمزرور تھے اور جو بات مولوی صاحب نے نشر میں کہی ہے وہی غالب نے ایک مصرع میں یوں کہی دو نسخہ میں ڈال دو کوئی نے کربشت کو گو کہ مصرعہ اول میں ذکر آموں کا نہیں ہے وانگیں کا ہے۔

یہ بات مولوی صاحب کے ایک خط ہی سے معلوم ہوئی کہ انجن کا چندہ یعنی رکنیت کی فیس ایک روپے سالانہ مولوی صاحب نے ۱۹۴۲ء میں مقرر کی تھی۔ یعنی آج سے ٹھیک ۵۰ سال پہلے۔ یہ خط فروری ۱۹۴۲ء کا ہے اسی خط میں مولوی صاحب نے انجن کے کاموں کے لیے ایک تنخواہ دار شخص کے تقرر کی منظوری دیتے ہوئے لکھا کہ اس کی تنخواہ ۳۰ روپے ماہانہ مقرر کی جائے اور اس کے علاوہ صوبہ اورنگ آباد کے ۴ ضلعوں میں کام کرنے کے لیے ۳۰ روپے سفر خرچہ ادا کرنے کی ہدایت جاری کی۔ یاد رہے یہ رقم سکہ خالی میں تھی جو ہندوستانی سکہ جسے کلدار کہا جاتا تھا کے مقابلے میں کمتر تھا یعنی اس کی قیمت ۱۰ فی صد کم تھی لیکن یہ ۳۰ روپے خالی اس صدی کے تیسری اور چوتھی دہائی میں آسودہ مالی کا سبب تھے۔ اپنی اپنے اہل خاندان کفالت کے علاوہ شرافت نبھانے کے لیے بھی کافی تھے مولوی صاحب نے یہ رقم اس شرط کے ساتھ منظور کی تھی کہ یہ تنخواہ دار شخص سال بھر میں ایک ہزار رکن بنائے۔ اس نسلے میں یہ مشقت کمائی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ ایئر لائنز جیٹ ایئر لائنز میں سب بعد کی چیزیں ہیں مولوی صاحب نے یہ بھی لکھا کہ اگر شخص مذکور ایک ہزار سے زیادہ رکن بنائے تو مزید رقم پر اسے ۱۰ فی صد کمیشن دیا جائے۔ یہ جنرل سی تھی یا جنرل سیات شتی بہر حال اسی نکتہ سخی اور باریک بینی کا نتیجہ ہے کہ آج انجن ترقی اردو ایک مملکت میں نہیں دو مملکتوں میں سرسبز و شاداب ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب دوستاں و در دل کے قابل نہیں تھے۔ ان کی فرمائش کی ہوئی چیز کی اگر کوئی شخص قیمت ان سے نہیں لیتا تھا تو وہ اس شخص سے تو نہیں لیکن فرمائش کے تعلقات منقطع کر لیتے تھے۔ ان کے بہت ہی عزیز دوست پنڈت ونشی دھرو دیا سنگر جو اورنگ آباد کا لچ میں ہمارے ہندی کے استاد تھے مولوی صاحب کے اتہا سے زیادہ عقیدت مند تھے۔ یہ عقیدت مولوی عبدالحق کی محبت کا جواب تھی مولوی عبدالحق پنڈت ونشی دھرو کو اتنا چاہتے تھے کہ جب وہ خود اورنگ آباد سے حیدر آباد گئے تو پنڈت ونشی دھرو کا تبادلہ بھی انہوں نے حیدر آباد میں کر والیا۔ مولوی عبدالحق چوں کہ حق گو تھے اس لیے ان کی ہر بات تسلیم کر لی جاتی تھی۔ پنڈت جی کی ساٹھویں سال گزرے پر مولوی صاحب نے خود مقصود لکھا ان کے ساتھ اورنگ آباد سے بمبئی آکر پانی کے جہاز سے کوئٹے کا سفر کیا۔ یہ سب کچھ



تھا لیکن جب بھی ان سے تنہا کو منگوایا اس کی قیمت بہر حال ادا کی ۔

مولوی عبدالحق دراصل عبدالرودو تھے۔ انھوں نے اردو کی جتنی خدمت کی ہے ناپائا اور تولنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی پیمائش ایک آزمائش ہوگی۔ مکتوب نگاری کا انھیں پتہ نہیں وقت کیسے مل جاتا تھا اور یہ خط کوئی تفریحی خط نہیں ہیں انھیں مضوعات ادب میں شمار نہیں کیا جاسکتا ان خطوں میں نقوشِ بیع کا کوئی عنصر نہیں ہے کیوں کہ یہ مفروضات نہیں بلقیات ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی بات پر ان کی نظر تھی اور گہری نظر ان خطوں میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک شفیق بزرگ، ہربان افسر بالا دست، ضرورت مند لوگوں کے ہمدرد، سخت گیر منتظم، آرام بیزار، شب بیدار اور ہمہ وقتی کارگر، شخص کی تصویر ہے۔ اُموں کے عاشق، خربوزوں کے شایق، تریبوز کے مشتاق، مچھلی اور جھنگلوں کے رسیا، تنہا کو کے پار کھڑا چار کے پرستار اور باد نوشی سے باد چیمائی کا لطف و سرور حاصل کرتے والے مولوی عبدالحق دوستوں کی محفل میں شاداں و فرحاں اور مخالفین کے ترغے میں مسرور و مطمئن رہنے کے عادی تھے۔ ماضی سے ان کا رشتہ نہ تھا۔ حال پر ان کی گرفت تھی اور مستقبل پر ان کی نظر۔

میں ادب کا تاریخ داں نہیں ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکاتیب عبدالحق ذرا دیر سے شایع ہوئے ورنہ رشید احمد صدیقی، اپنے مضمون ”مکاتیب نیاز“ میں، مکتوب نگاروں کی فہرست میں مولوی عبدالحق کا نام ضرور شامل رکھتے۔

میں اپنی حد تک تو مولوی عبدالحق کی خطوط نگاری کو ثبوت نگاری مانتا ہوں کیوں کہ ان کا ہر خط

مدلل ہے اور شاید خط تقدیر کی طرح مسکت بھی :

## مولوی عبدالحق کے ادبی اور علمی رسائل

مولوی عبدالحق (۱۸۷۱-۱۹۶۱) نے اپنی گونا گوں علمی، تحقیقی اور تنظیمی مصروفیات کے ساتھ چھ رسائل کی اجراء و ادارت کا بھی فریضہ انجام دیا۔ اس لحاظ سے وہ اپنے معاصر رسائل کے مدیروں میں ممتاز حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں کہ انھوں نے کسی ایک ہی رسالے کو اپنی پہچان نہیں بنایا بلکہ اردو کے علمی و ادبی سرے کو وسیع اور پرمایہ بنانے کے لیے مختلف موضوعات پر رسالے جاری کیے۔ اور اُس زمانے میں جب تحقیقی صحافت کے خدوخال ابھی پوری طرح واضح بھی نہیں ہوئے تھے، انھوں نے مخصوص موضوعات پر رسالوں کا اجرا کر کے صحافت کی اس نئی صنف کی صورت گیری کی اور صوری و معنوی اعتبار سے اسے اعلیٰ معیار بخشا۔ سائنس، تاریخ اور اقتصادیات جیسے سنجیدہ اور خشک موضوعات پر اردو میں لکھنے کا رجحان عام کیا۔ باذوق، باصلاحیت اور اہل علم اصحاب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا، انھیں اپنے رسائل کے پلیٹ فارم پر یکجا کیا اور ایک ٹیم کی صورت دی۔ پھر ان ہی میں سے بعض کو ان رسائل کی ادارت تفویض کی۔ ان رسائل نے اردو زبان کی ترقی و توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی بقا کی جنگ بھی لڑی۔ مولوی عبدالحق نے اردو کو ایک تحریک بنادیا تھا چنانچہ ان کے یہ رسائل بھی تحریکی جذبے کے تحت نکلے جاتے تھے اور ان کے پس پشت مالی یافت اور منافع کی کوئی ترغیب و تحریص نہیں تھی اس لیے خسارے میں ہونے کے باوجود ان رسالوں نے کبھی ”معیار“ کے معاملہ میں سمجھوتہ نہیں کیا اور انتہائی کمٹمن حالات میں بھی ٹھکن اور جود کا شکار نہیں ہوئے۔ دو مرتبہ نقل مکانی اور ہجرت (اورنگ سے دہلی اور دہلی سے کراچی) کے جانگل تجربے سے گزرنے کے باوجود ان رسائل کے معیار میں اضافہ ہی ہوا۔

مولوی عبدالحق کے ان چھ رسائل میں رسالہ افسر (۱۸۹۷ء) کے سوا باقی پانچوں رسالے ان ہی کا خواب نئے جن کی تعبیر بھی ان ہی کے ذریعے ممکن ہوئی۔ سہ ماہی اردو (۱۹۲۱ء) سہ ماہی سائنس (۱۹۲۸ء) پندرہ روزہ ”ہماری زبان“ (۱۹۳۹ء) ماہنامہ ”معاشیات“ (۱۹۴۶ء) اور سہ ماہی ”تاریخ و سیاسیات“ (۱۹۵۱ء) یہ وہ رسائل تھے جو موضوعات کی اہمیت، مضامین کے تنوع اور معیار کی بلندی کے لحاظ سے اردو کی مجلاتی

صافیت میں خیال افروز ہی نہیں انقلاب آفریں بھی تھے۔

مولوی عبدالحق کے رسائل کا جائزہ لیتے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی صحافتی زندگی کا جائزہ لے لیا جائے۔ اسے مولوی صاحب کی خوش نختی کہیے کہ انھوں نے اپنا تعلیمی دور علی گڑھ کالج میں گزرا جہاں انھیں سرسید کی سرپرستی اور خصوصی شفقت و عنایت حاصل رہی۔ مولوی صاحب نے سرسید کو تہذیب الاخلاق کی ترتیب و تدوین کرتے ہوئے دیکھا اور تعجب نہیں کہ صحافتی آداب و معیار کے اولین نقوش یہیں سے ان کے ذہن پر مرتب ہوئے ہوں۔ مولوی عبدالحق کے برادر خرد شیخ احمد حسن کا بیان ہے کہ سرسید مولوی صاحب کی ادبی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ان سے ”تہذیب الاخلاق“ کے لیے کام بھی لیتے رہے۔ یہ زمانہ طاسب علمی جی میں عبدالحق نے علمی و ادبی رسائل کے لیے مضامین بھی لکھنا شروع کر دیے۔ ان کے مضامین ”علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ“، ”سر مورگنزٹ“، ”مڈل ٹینشل میگزین“، اور حیدر آباد دکن کار سائنس کی زینت بنے۔ یہ ان میں چند مضامین تو شگفتہ اور ہلکے پھلکے اسلوب میں لکھے گئے تھے جو ان کے دور طاسب علمی کی نوشتگی کی یاد دلاتے ہیں لیکن دو ایک مضامین ایسے بھی ہیں جو ان کی وسعت معلومات، تنقیدی بصیرت، اور دینی حمیت کا پتا دیتے ہیں۔ عبدالحق گریجویشن کے بعد نواب محسن الملک کا تعارفی خط لے کر حیدر آباد دکن گئے اور ریاست کے ہوم سیکریٹری مولوی عزیز مرزا کے دفتر میں مترجم مقرر ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فوج اصفیہ کے سپہ سالار نواب افسر الملک نے اپنے ہی نام سے موسوم رسالہ ”افسر“ جاری کر رکھا تھا اور اس کی ادارت کی ذمہ داریاں مولوی محب حسین کے سپرد کر رکھی تھیں۔ ماہنامہ ”افسر“ ۱۵ اپریل ۲۲ سنٹی میٹر کے سائز پر ۳۲ صفحات کا مکمل فوجی رسالہ تھا جس میں فن حربے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ مولوی محب حسین افسر الملک کے دفتر میں ترجمے کے کام پر مامور تھے اور ساتھ ہی ”معلم نسواں“ اور ”شفیق“ کے نام کے دو رسالے بھی نکالتے تھے۔ ان مصروفیات کے ساتھ ”افسر“ پر یکسوئی سے توجہ دینا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ افسر الملک کو اس صورت حال کا اندازہ تھا اور وہ ”افسر“ کے لیے کسی دوسرے مدیر کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ نواب وقار الملک کے ذریعے افسر الملک کی ملاقات مولوی عبدالحق سے ہوئی تو افسر الملک نے انھیں مدرسہ اصفیہ کے ہیڈ ماسٹر کے عہدے کی پیش کش کی۔ یہ عبدالحق مدرسے کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے تو ”افسر“ کی ادارت بھی ان کے حصے میں گئی۔

ماہنامہ ”افسر“ اپریل ۱۸۹۷ء میں جاری ہوا اور مولوی عبدالحق اکتوبر ۱۸۹۹ء میں اس سے

والبتہ ہوتے۔ اس وقت تک حیدر آباد کن کا مشہور رسالہ ”حسن“ بند ہو چکا تھا، لہذا مولوی عبدالحق نے محسوس کیا کہ ”افسر“ کی پالیسی تبدیل کر کے اسے ایک اعلا درجے کا علمی اور ادبی پرچہ بنانا چاہیے۔ افسر الملک کی جانب سے انہیں اس کی اجازت بھی مل گئی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۹۹ء کے پرچے میں عبدالحق نے اسے ایڈیٹر رسالہ ”کی طرف سے“ اطلاع ضروری“ شایع ہوئی جس میں اعلان کیا گیا:

”یہ رسالہ تین سال سے نواب افسر الملک کی سرپرستی میں نکل رہا ہے۔ اب تک یہ صرف فوجی مضامین کے لیے مخصوص تھا لیکن اب جناب ممدوح نے ہاکلیتہ ہمارے حوالے کر دیا ہے اور ہمیں اجازت دی ہے کہ چند صفحے فوجی مضامین کے علاوہ باقی حصے کو جیسے چاہیں استعمال کریں۔ چوں کہ حیدر آباد کن میں اس وقت ایک علمی میگزین کی بہت ضرورت ہے اس لیے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اسے جہاں تک ممکن ہو ایک اعلا درجہ کا علمی میگزین بنانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۰۰ء سے اس کی ہئیت بالکل بدل دی جائے گی اور اس کے قالب میں ایک علمی روح نظر آئے گی اس میں ہر قسم کے عمدہ عمدہ علمی تاریخی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین لکھے جائیں گے۔۔۔ اس غرض سے اس کا حجم بڑھا دیا جائے گا یعنی بجائے ۳۲ صفحات کے ۴۸ صفحہ کر دے جائیں گے جن میں سے صرف ۸ صفحے میں فوجی مضامین درج ہوا کریں گے۔ ساتھ ہی ہم نے یہ بھی انتظام کیا ہے کہ ہر ماہ اعلا درجہ کے مضمون کے لیے ایک اشرفی نذر کا جائے۔“

اعلان کے مطابق نومبر ۱۹۰۰ء سے مولوی عبدالحق نے رسالے کا مزاج یکسر بدل دیا۔ جہاں پہلے رسالے کی لوح کے نیچے یہ جملہ درج ہوتا تھا: ”فوجی مضامین اور فوجی نامور اشخاص کے تذکرے وہاں اب اسی رسالے کے صفحات پر شعرو سخن، سیروسیاحت، انشائے لطیف کے نمونے اور علمی تاریخی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین اشاعت پذیر ہونے لگے۔ کتبوں پر ریویو بھی کیا جانے لگا۔ ایڈیٹر کی جانب سے نئے لکھنے والوں کو ترغیب دی جانے لگی۔ چنانچہ اس شمارے میں یہ اعلان بھی نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی تمدن اصلاح پر سب سے اچھا مضمون اور اردو میں چھوٹا سا ڈرامہ لکھنے والے کو ایک ایک اشرفی انعام میں دی جائے گی۔ انعام دینے کی یہ روایت رسالہ ”حسن“ نے شروع کی تھی اور اس کے بند ہونے کے بعد ”افسر“ نے اس روایت ہی کا احیاء یعنی کیا، اس معیاری رسالے کی کمی بھی دور کرنے کی کوشش



کی اور بلاشبہ اس میں کامیاب رہا۔

”افسر“ تقریباً پانچ سال تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں اس نے اردو زبان و ادب کی بہت خدمت کی۔ اس کے مضمون نگاروں میں چوٹی کے اہل قلم حضرات شامل تھے۔ ان میں مولانا، لطافت حسین علی، شمس اعجاز مولوی، ذکار اللہ، مولوی عزیز مرزا، مولوی غلام، نقی، مولوی چراغ علی، پروفیسر شہباز انوار، عہد الملک، مولانا ظفر علی خاں، مولانا گرامی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ”افسر“ میں خود مولوی عبدالحق کے بچیدہ معلوماتی اور تاریخی مضامین کے علاوہ ہلکے ہلکے لطیف مضامین بھی ملتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے مولانا غلام قادر گرامی کی مثنوی کو مع اپنے تعارفی نوٹ اور ”بیگم چیں“ کے عنوان سے ایک مغربی رسالے ”ریویو آف ریویو“ سے ماخوذ مضمون شایع کیا تو دہلیسی ”اوپر کی آمدنی“ ”سبز چھتری“ اب مردوں کی ضرورت نہیں“ اور ”اردو اخبار کے ایڈیٹروں کو نیک صلاح“ جیسے لطیف مضامین بھی لکھے مولوی عبدالحق کے آخری ذکر مضمون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے کے اردو اخبارات کے معیار کی بابت کیا رائے رکھتے تھے:

”عام طور پر شکایت ہے کہ اردو اخبارات کی پوری وقعت نہیں ہوتی اور اہل ملک بجائے اس کے کہ اپنے ہم وطنوں سے ہمدردی کریں، زیادہ تر انگریزی اخبارات کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ یہ شکایت ایک لحاظ سے بجا ہے اور ایک لحاظ سے بیجا۔ بجا اس لیے کہ درحقیقت ملک کے قابل لوگ اردو اخباروں کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں اور اس قابل نہیں سمجھتے کہ ان پر اپنا قیمتی وقت صرف کریں۔ بیجا اس لیے کہ اکثر اخبار خود اس قدر بے وقعت، کم مایہ اور پلچڑ ہوتے ہیں کہ جو شخص اخباروں کے فرائض اور خوبی کو سمجھتا ہے ہرگز اپنا وقت اور روپیہ ان پر صرف نہ کرے گا۔“

اس مضمون میں انھوں نے خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں اردو اخبارات کے غیر ذمہ دارانہ رویے، ریسوں کو بغیر طلب کیے اخبارات جاری کرنے اور پھر چند دن ملنے پر دوبلا پچاتے کے طرز عمل، اخبار خریدنے والوں کو نیک، در اخبار نہ خریدنے والوں کی نیکی اور راستبازی کو مشکوک نظروں سے دیکھنے کی قبیح حرکت پر نہایت لطیف ہر ایسے میں طنز کیا ہے۔

”افسر“ سے وابستگی کے دوران اس کے بعد بھی مولوی عبدالحق کے مضامین درمعارف

”دکن ریویو“ اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ بلکہ مولانا ظفر علی خاں نے تو ”دکن ریویو“ ان ہی کے مشورے پر جاری کیا جس میں ان کا تین سو صفحات کا قسط وار مضمون ”العالم الاسلام“ شائع ہوا۔ مولوی عبدالحق نے جب حیدرآباد دکن چھوڑنے اور ملازمت ترک کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے ذہن میں جس متبادل ملازمت کا خیال آیا، وہ کسی اخبار یا رسالے سے وابستہ ہونے کا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے ”پسیا اخبار“ اور دوسری مرتبہ مولانا محمد علی جوہر کے ”ہمدرد“ میں کام کرنے کی ہامی بھری تھی۔ لیکن قدرت کو شاید ان سے اردو زبان کی خدمت لینا مقصود تھا اس لیے ایسے مواقع پیش آئے کہ انھیں اپنا بندھا ہوا بستر کھول دینا پڑا۔ رسالہ ”افسر“ کے بند ہونے کے بعد مولوی عبدالحق کی صحافتی زندگی کا یہ مختصر دور اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

مولوی عبدالحق کی صحافتی زندگی کا دوسرا دور کامیابیوں کا دور ہے جس میں انھوں نے پے درپے پانچ رسائل جاری کیے، وراورد کی مجلاتی صحافت کو ایک نئی راہ دکھلائی۔ مولوی عبدالحق نے یہ رسائل انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام جاری کیے اور ان میں سے رسالہ ”اردو“ کو چھوڑ کر باقی چاروں رسائل مختلف وقتوں میں مختلف اصحاب مرتب کرتے رہے لیکن فی الحقیقت ان کی سرپرستی اور نگرانی مولوی عبدالحق ہی کے ذمہ رہی اور وہ ان رسائل کے مزاج کی تشکیل میں اثر انداز ہوتے رہے دوسرے نقطوں میں مولوی عبدالحق کے حوالے کے بغیر ان رسائل کا تعارف اور تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

اب ہم ان رسائل کا باری باری جائزہ لیں گے۔

### سرمایہ ”اردو“

اس صدی کی ابتدا میں جب بدیسی راج کے خلاف سیاسی شعور بیدار ہوا تو چند ایسے رسائل منظر عام پر آئے جو ادب اور سیاست کا امتزاج پیش کرتے تھے۔ وہ ادب کی کلاسیکی روایات کے عکاس بھی تھے اور سیاست کے جدید رجحانات کے علمبردار بھی۔ ان میں حسرت موہانی کا ”اردوئے معلیٰ“ شیخ عبد القادر کا ”مخزن“ دیانرائن نگم کا ”زمانہ“ ظفر الملک علوی کا ”الفاظ“ سید سیدمان ندوی کا ”معارف“ جامعہ اسلامیہ کا ”جامعہ“ وغیرہ شامل تھے۔ لیکن مولوی عبدالحق کا سرمایہ ”اردو“ مذکورہ رسائل سے س کاظ سے مختلف تھا کہ یہ سیاست سے خالی تھا اور خالص ادبی اور تحقیقی پرچہ تھا۔ دوسرے رسائل میں سے بعض میں سیاست اور بعض میں علم سیاست، تاریخ اور عمرانیات کے موضوعات نمایاں تھے۔ چنانچہ جب مولوی عبدالحق نے

رسالہ "اردو" کا ڈوس ڈالنا تو مختلف حلقوں کی جانب سے اس اندیشے کا اظہار کیا گیا کہ اس رسالے کی عمر بھی اکثر رسالوں کی طرح سال دو سال سے زیادہ نہ ہوگی کیوں کہ اردو زبان و ادب پر چچا پنے کے لیے اتنا مواد کہاں سے میسر آئے گا بلکہ اس کا جواب مولوی عبدالحق نے یہ دیا:

"یہ میدان باد جو ذنگی کے بہت کچھ وسعت رکھتا ہے اور بجائے خود ایک عام ہے۔۔۔۔۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ بہت سے ارفاظ اور محاورے ابھی تحقیق طلب ہیں، بہت سے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک بساط قدر وانی تک نہیں پہنچا۔ بہت سی کتابیں ہیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشہ گمنامی میں رہ گئیں یا شایع ہوتے ہی ناپید ہو گئیں۔ زبان کے رسم الخط، اعلیٰ اور انشا میں بہت سی باتیں اصلاح طلب اور مشورہ اور بحث کی محتاج ہیں۔ اردو کی تاریخ اور اس کی نشوونما میں بہت سی چیزیں ابھی طے کرنا باقی ہیں۔۔۔۔۔ زبان کی ترقی و اشاعت کی بہت سی ایسی تجویزیں ہیں جو ابھی تک علم خیال سے صفحہ قرطاس پر نہیں آئیں۔ ان پر بحث کرنا، ان کا جو پختہ اور ان کو عمل میں مانا بھی بڑا کام ہے۔ تنقید جو ادب کی جان اور ذوق سلیم کا روح رواں ہے ابھی ہمارے یہاں ابتدائی مرحلہ میں ہے اسے صحیح رنگ میں دکھانا بہت بڑا فرض ہے۔۔۔۔۔ اردو کے بہت سے ایسے محسن ہیں جن کے حالات اور کارنامے ملک کے سامنے پیش ہونے چاہیں۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ غیر زبانوں کے ادب میں ایسے انمول جوہر ہیں جو صاحب نظر ادیب اور شائقین ادب کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں اردو کے لباس میں پیش کیا جائے تاکہ ہمارے ہلے ملک اسلوب بیان طرز تکمیل اور ادائے مطلب سے حظ حاصل کریں اور متمتع ہوں۔"

مولوی عبدالحق "اردو" کو ان عام رسائل کی روش سے پرٹ کر نکالنا چاہتے تھے جو اپنی پیشانی پر "ادبی اخلاقی، تاریخی، معاشی، سیاسی رسالہ" کا لیبل چسپاں کر کے اس میں ہر قسم کا رطب و یابس اور انمل بے جوڑ مضامین بھر دیتے ہیں۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۲۰ء میں رسالہ اردو کی پالیسی کے بارے میں درج ذیل بیان ملتا ہے: "یہ رسالہ مثل دوسرے رسالوں کے کشکول نہ ہو جس میں ہر قسم کے مضامین بلا لحاظ مناسبت و ربط درج کر دیے جاتے ہیں بلکہ اس میں زیادہ تر زبان و ادب کی بحث ہو اور اردو زبان اس کی تاریخ، اصطلاحات، لغت الفاظ و محاورات اور تنقید کے متعلق مضامین ہوں۔ وہ نہ



صرف انجمن کے مقاصد کی اشاعت اور توسیع کا آگہ ہے بلکہ اہل ملک میں صحیح ذوقِ ادب پیدا کرنے میں بھی مدد دے گا۔  
 انجمن ترقی اردو کے جس اجلاس میں اردو کے اجلاس کا فیصلہ کیا گیا اس کا روداد کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ "اردو" کو اکتوبر ۱۹۲۰ء سے جاری کرنا طے پایا تھا اور رسالہ اشاعت کے لیے تیار بھی کر لیا گیا تھا لیکن سیاسی ہنگامہ آرائی کی وجہ سے اس کا اجرا التوا میں پڑ گیا اور یوں یہ رسالہ جنوری ۱۹۲۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ ۲۳۰ ۱/۲ سینٹی میٹر سائز کے ۱۹۹ صفحات پر مشتمل تھا۔ سالانہ چندہ چھ روپیہ کھدار محصول ڈاک ملا کر آٹھ روپیہ کھدار (سنگہ عثمانیہ میں سات روپیہ اور مع محصول ڈاک نو روپیہ سنگہ عثمانیہ) تھا۔ پہلے شمارے کے خریداروں کی تعداد ۳۰ تک پہنچ گئی تھی۔ محمد مقتدی خاں شروانی کے زیرِ اہتمام انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپتا تھا کیوں کہ اورنگ آباد میں کوئی چھاپہ خانہ نہیں تھا۔ رسالے کی اشاعت کے لیے جنوری۔اپریل، جولائی اور اکتوبر کے مہینوں کا پہلا ہفتہ مقرر کیا گیا تھا۔ سرورق پر لوح کے نیچے اورنگ آباد کے مقبرہ رابعہ دورانی کی تصویر اور اس کے نیچے "انجمن ترقی اردو کا سرمایہ رسالہ" درج ہوتا تھا۔

مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو، کے اولین ادارے میں جن عزائم اور ارادوں کا اظہار کیا تھا رسالہ ان پر پورا اُترا۔ اس کے بلند پایہ علمی تحقیقی اور ادبی مضامین نے اسے بہت جلد اردو کے علمی اور ادبی رسائل کے صفِ اَوّل میں جگہ دے دی۔ یہاں تک کہ منشی پریم چند نے کہا: "رسالہ اردو، اردو رسالوں کا سالانہ کارواں ہے۔" "اردو" اورنگ آباد سے ۸ سال تک نکلتا رہا۔ اس دوران رسالے میں اہم ادبی تنقیدی مضامین کے علاوہ سیم الخط ۱۰ اصطلاحات کے ترجمے اردو کی بقا و ترقی کے اہم مسائل پر بھی علمی مضامین شایع ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے پہلے ہی شمارے سے "اصطلاحات علمیہ" کے عنوان سے علمی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا جو قسط وار چھپتا رہا رسالے کے آخر میں انجمن ترقی اردو کی کارگزاریوں کی مختصر روداد بھی شایع کی جاتی تھی جس میں پچھلی کارکردگی کا جائزہ لینے کے علاوہ آئندہ منصوبوں کا بھی تذکرہ ہوتا تھا۔ جولائی ۱۹۲۱ء سے رسائل و کتب پر تبصروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ تبصرے مولوی عبدالحق کیا کرتے تھے۔ ان تبصروں کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ کتابوں کا بے لاگ تنقیدی جائزہ لیا جاتا تھا۔ جنوری ۱۹۲۳ء سے خطبات کا رساں دتاسی کا ترجمہ ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ شایع ہوا جس میں گارساں دتاسی کا تعارف کرانے کے بعد سراسر مسعود کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انھوں نے ان نادر نیکمروں اور تبصروں کا مجموعہ عطا کیا۔

انجمن ترقی اردو کا دفتر ۱۹۲۸ء میں دہلی منتقل ہو گیا جہاں سے "اردو" کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۹ء میں



نکلا۔ اس شمارے کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بین الاقوامی ادب اور ادیبوں کی بابت مضامین کی تعداد پہلے کے مقابلے میں بڑھ گئی۔ ٹائمز لٹریچر سلیمنٹ کے تبصرے بھی ترجمہ ہو کر چھپنے لگے۔ اس کے علاوہ عالمی ادب کی خبریں، نئی کتابوں اور نئے ادیبوں کے بارے میں معلومات افزا اطلاعات بھی شائع ہونے لگیں۔ قیام پاکستان کے بعد سالہ اردو کا پہلا شمارہ کراچی سے جولائی ۱۹۴۹ء میں نکلا۔ رسالے کے لیے ایک مجلس ادارت بنائی گئی جس میں شیخ محمد اکرام، ممتاز حسین، ڈاکٹر فضل احمد، کریم فضل، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، عندلیب شادانی اور قاضی احمد میاں، اختر جو ناگر بھی شامل تھے۔ مولوی عبدالحق کی زندگی تک 'اردو' کراچی سے پابندی سے نکلتا رہا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تقسیم کے ہنگاموں میں انجمن جن مصائب و آفات سے گزری تھی اور خود مولوی عبدالحق پر جو حملے ٹوٹے تھے 'اردو' کے معیار پر ان حالات کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ حالاں کہ پاکستان آنے کے بعد 'اردو' کے پرانے خریداروں کی ایک بڑی تعداد کم ہو گئی، اس کے مستقل مقالہ نگاروں میں سے بھی بہت سے بھارت اور حیدرآباد دکن میں رہ گئے۔ لیکن 'اردو' روز اول کی طرح تازہ دم رہا اور محنت سے فکر انگیز اور خیال آفریں مضامین کو اپنے جلو میں لیے طلوع ہوتا رہا۔ ان خدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید ہاشمی فرید آبادی نے جنوری ۱۹۵۱ء کے شمارے میں لکھا:

"انجمن کا سب سے پہلا اور پر د عزیز رسالہ اردو ہے جس نے پچیس برس زبان و ادب کی خدمت انجام دی اور نہ صرف انجمن بلکہ اردو زبان کا نام روشن کیا۔ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہو گا کہ اس رسالے کے تحقیقی مقالات نے اردو کی عمر گزشتہ بڑھادی اور آئندہ زندگی کے لیے اس میں نئی جان ڈال دی۔ اس کے بلند پایہ مضامین سے زبان کی وقعت بڑھ گئی۔ اس کی تنقید دقیق سے ادب کا معیار اونچا ہو گیا۔ ان ہی خصوصیات کے اعتبار سے وہ ممالک ہند ایک طرف، دنیا کے لسانی رسائل کی صف اول میں شمار ہونے کا مستحق ہے۔"

پاکستان آنے کے بعد "اردو" نے دو نکاتی پالیسی کا اعلان کیا:

۱۔ "اُزلو اور ترقی یافتہ ممالک کے علمی و ادبی کارناموں سے 'اردو' کے قارئین کو واقف کرانے قوم کی تعلیمی اور دماغی پس ماندگی دور کی جائے۔"

۲۔ "اعلا معیار کی درسی کتابوں پر تفصیلی اور محققانہ تبصرے لکھوائے جائیں تاکہ اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم میں ذریعہ اظہار کے طور پر اپنایا جاسکے۔ ان تبصروں کے ذریعے دوسری کتابوں کے تراجم و تصانیف کی کمزوریاں

عیاں کی جائیں تاکہ طبع ثنائی کے وقت ان کتابوں کی اصلاح میں سہولت ہو سکے۔

”اردو“ مولوی عبدالحق کی زندگی تک جاری رہا اور ان کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔ اس کی وجہ انجمن

ترقی اردو کے معتمد اعزازی جمیل الدین عالی کے الفاظ میں:

”پاکستان میں چاروں طرف اردو کی علمی اہمیت بڑھ رہی تھی، نئے نئے اور وسیع پیمانے پر

نکل رہے تھے۔ علمی مضامین لکھنے والے اور اہل تحقیق سے کچھ حاصل کرنا آسان نہیں رہا تھا

کیوں کہ مولوی صاحب کی فرمائش اور پھر تاکید اور فمائش جیسے لٹاٹے ہم کہاں سے لاتے؟

لیکن ”اردو“ کی کمی برابر محسوس کی جاتی رہی اور بالآخر ۱۹۶۶ء سے دوبارہ جاری کر دیا گیا اور آج تک

نکل رہا ہے۔

رسالہ ”اردو“ نے مولوی عبدالحق کی زیر ادارت چالیس سال تک اردو زبان و ادب کی کیا خدمت

کی یہ جاننے کے لیے ”اشاریہ اردو“ کی سرسری ورق گردانی بھی بہت کافی ہوگی۔ تاہم ڈاکٹر انور سدید نے

اپنے مقالے میں ایسے چند اہم ترین مضامین کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول ان مضامین نے اردو

دنیا میں غفلت برپا کر دیا تھا: (۱) محاسن کلام غالب، عبدالرحمن بجنوری (۲) شعراجم کی تنقید حافظ محمود

شیرانی (۳) دلی کا یادگار شاعر، فروغ الدیگ (۴) سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم، شیخ احمد اسماعیل

پانی پتی (۵) معرکہ قتل و غالب، خواجہ احمد فاروقی (۶) دلی کی علمی استعداد اور فارسی شعرا سید ظہیر الدین

مدنی (۷) مثنوی حجاب زناں محمد عمر نورانی (۸) اردو کی ابتدا سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کے لسانی نظریے

پر تنقید، ڈاکٹر مسعود حسین خاں (۹) فارسی اور اردو میں پیروڈی کا تصور، ڈاکٹر محمد داؤد جبر (۱۰) دیوان

مراد، غلام دستگیر نامی (۱۱) مرثیہ خوانی کا اثر مرثیہ گوئی پر، ڈاکٹر محمد حسن اس فہرست میں ڈاکٹر انور سدید

نے بعض نہایت اہم مضامین کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مقالہ ”ادب

اور زندگی“ (مطبوعہ جولائی ۱۹۳۵ء) جو ترقی پسند تحریک کی فکری اساس بنا۔ رسالہ اردو کے مضامین

کے موضوعات کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ نادر مخطوطات اور قدیم دواوین کے نادر نسخوں سے متعلق مضامین ۲۔ اردو شعراء کے نئے حالات غیر

مطبوعہ کلام (۳) غیر ملکی ادب، بدسی زبان کے شعراء (۴) اردو کی کمیاب کتابوں کی بابت تحقیقی مضامین

(۵) شعروادب کی تنقید (۶) عظیم ناولوں اور فن پاروں کا تعارف (۷) مختلف زبانوں کے ایک

دوسرے پر اثرات (۸) رسم الخط کی اصلاح ۹۱ اردو کے جدید میڈانات (۱۰) ترقی پسند ادب (۱۱) شہر کی خطوط نگاری (۱۲) کلاسیکی شعرا کی شاعری کی جدید علوم کی روشنی میں تفہیم (۱۳) انیسویں صدی کے اخبارات و رسائل (۱۴) اردو کی نئی انجمنیں (۱۵) سانی بھٹیں (۱۶) اردو زبان کی ترقی اور اشاعت (۱۷) دوسری زبانوں کے تنقیدی مضامین کے ترجمے (۱۸) گارساں دتاسی کے مقالات (۱۹) شخصیات (۲۰) تذکرے۔

رسالہ اردو کا نمایاں امتیاز اس کا معیار ہائے لغت و ادب ہے جس کے بارے میں نہایت اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کبھی عامیانہ اور غیر معیاری تحریر شائع نہیں ہوئی۔ اور یوں مولوی عبدالحق کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو انھوں نے پہلے شمارے کے اداسیے میں یہ کہنے کی تھی:

”میں چاہتا ہوں کہ رسالہ اردو اردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے

مالا مال ہو کہ شائقین ادب اسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں اور اہل ملک

کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو اور وہ دن آئے کہ لوگ اس کے پرچے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں۔“

### سہ ماہی ”سائنس“

مولوی عبدالحق نے جنوری ۱۹۲۸ء میں سائنس جاری کیا۔ اس کے اجرا کا اصل مقصد تو یہی تھا کہ زبان اردو کے علمی سرمائے کو وسعت دی جائے لیکن ساتھ میں مولوی صاحب کو یہ بھی احساس تھا کہ سائنس میں پیچھے رہ جانا ہی ہماری پسماندگی کا اصلی سبب ہے۔ ان کے خیال میں سائنس سے عدم دل چسپی اور ناواقفیت کی ذمہ داری گزشتہ تعلیم پر عاید ہوتی تھی کیوں کہ اس تعلیم کا بڑا حصہ منطق، فلسفہ، ادب اور شاعری وغیرہ کی نذر ہو جاتا تھا نتیجے میں تخیل نے عمل کی جگہ بھی گھیری تھی۔ مولوی صاحب کو یقین تھا کہ ایشیائی اور خاص کر ہندی دماغوں کا علاج سائنس ہے۔ انھوں نے رسالہ سائنس کے اولین شمارے کے ادارے میں لکھا:

”چشم بدور، اردو میں رسالوں کی تعداد کافی ہے اور ہر مہینے کوئی نہ کوئی نیا رسالہ جاری ہوتا

رہتا ہے۔ مگر وہ زیادہ تر ادب اور تاریخ وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ سائنس کے لیے کوئی رسالہ

مخصوص نہیں ہے۔ مشکل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اور صحیح کلمہ ہے کہ سائنس کے مضامین کو اپنی زبان میں

کیوں کر ادا کریں۔ اس مشکل کو عثمانیہ یونیورسٹی نے رفع کر دیا ہے لیکن اس کا دائرہ

بھی کالج کے احاطے تک محدود ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فیض کو عام کر دیں۔

انھوں نے رسالے کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا:

”ایک مقصد تو یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو سائنس کے معلومات سے نیران خیالات اور عبادات



واختراعات سے آگاہ کرتے رہیں جو دنیا میں سائنس کے متعلق روز بروز ہوتی رہتی ہے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ خود ہمارے لوگ اپنی تحقیقات کو ملک کے سامنے پیش کریں یا سائنس کے مختلف شعبوں پر تحقیقات مضامین لکھیں۔

[رسالہ "سائنس" ۲۲x۱۷ سنٹی میٹر کے سائز کے تقریباً سو صفحات پر مشتمل تھا۔ قیمت سالانہ آٹھ روپے (نور و پے چار آنے سکے عثمانیہ) تھی۔ انجمن اردو پریس اورنگ آباد میں طبع ہوتا تھا۔ سرورق پر چھپا ہوا تھا۔ سب سے خوش نصیب انسان وہ ہے جو حقائق کا انکشاف کرتا ہے اور دوسرے درجے پر وہ ہے جو پیرائے تعصبات کو ترک کرتا ہے "سائنس" جنوری اپریل، جولائی اور اکتوبر کے مہینوں میں منظر عام پر آتا تھا۔ مولوی عبدالحق نے اس کی تدوین و ادارت کی ذمہ داری جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کو سونپ دی تھی۔ اور بلاشبہ اردو میں سائنس کا پرچہ نکالنے کے کڑے امتحان سے وہ سرخرو نکلے۔

سائنس اردو کا پہلا رسالہ تھا جس کے لیے برطانیہ کے نامور سائنس دانوں سے قلمی تعاون کی درخواست کی گئی تھی اور اہم بات یہ ہے کہ جن سائنس دانوں سے رابطے کیے گئے ان میں سے اکثر نے رسالہ سائنس کے مقاصد سے دلچسپی ظاہر کی اور چند ممتاز سائنس دانوں نے مضامین ارسال بھی کیے۔ مثلاً پروفیسر این ڈی اینڈریڈ نے ٹیلی وژن پر اپنا مقالہ بھیجا جو ترجمہ ہو کر "دور نمائی" کے عنوان سے چھپا۔ (اس زمانے میں ٹیلی وژن خود اہل مغرب کے لیے نسبتاً نئی چیز تھی، چہ جائیکہ ہندوستان میں تو ایسی کسی ایجاد کا تصور محال تھا ٹیلی وژن پر اردو میں یہ پہلا مضمون تھا۔) اسی طرح ڈاکٹر ایچ فراینڈش پروفیسر ہرن یونیورسٹی اور معروف ماہر نباتات پروفیسر ولیم بریگ (رائل انسٹی ٹیوشن لندن) نے بھی اپنے تازہ مضامین ارسال کیے۔ برطانیہ کے ممتاز کیمیا دان پروفیسر ایڈم اسٹرونگ نے اگلے شمارے میں لکھنے کا وعدہ کیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر بلا تک (یرن یونیورسٹی) پروفیسر اسٹین (کیمبرج یونیورسٹی) نے رسالے سے گہری دلچسپی ظاہر کی۔ غرض کہ "سائنس" کانگلستان کے سائنس دانوں اور ہندوستان کے علمی حلقوں نے شاندار طریقے سے خیر مقدم کیا۔ "شذات" کے عنوان کثوت ڈاکٹر مظفر الدین قریشی نے لکھا:

"علمی مضامین میں اصطلاحات کا استعمال ناگزیر ہے اور اس تحریک کا ایک بہت بڑا مقصد اصطلاحات کو مقبول بنانا ہے جس کے بغیر علوم کا نشر ممکن نہیں ہے۔"

رسالہ سائنس، میں سائنسی موضوعات پر مضامین کے علاوہ "اخبار علمیہ" کے عنوان سے سائنسی دنیا کی



تازہ ترین خبریں، ایجادات اور تحقیقات سے پڑھنے والوں کو مطلع رکھا جاتا تھا۔ سائنس اور نفسیات کی کتابوں پر عام ذہن بصرے بھی کیے جاتے تھے، ان میں انگریزی کتابیں اور رسائل بھی شامل تھے۔ رسالے کے آخر میں انگریزی اصطلاحات و ان کے اردو ترجمے کی فہرست بھی دے دی جاتی تھی۔ چوں کہ یہ اصطلاحات ان ہی مضامین کے لیے نئی نئی وضع کی جاتی تھیں لہذا ان کے بارے میں ایڈیٹر نے لکھا:

”شروع شروع میں ان کا (اصطلاحات کا) استعمال نفس مضمون سمجھنے میں دشواری پیدا کرے گا

لیکن امید ہے کہ رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے یہ دشواری خود بخود دور ہو جائے گی۔ مثلاً

واقعہ یہ ہے کہ سائنس نہایت مفید معلوماتی اور بلند پایہ رسالہ تھا۔ اس میں موضوع کے تقاضوں کے تحت چارٹ، نقشے اور تصویریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ کاغذ اور طباعت وغیرہ بہت عمدہ تھا۔ ایک عمدہ بات یہ تھی کہ سائنسی علوم کی اشاعت کے ساتھ مشرق کی روحانیت پر بھی یکساں زور دیا جاتا تھا۔ مثلاً دیکھئے اپریل ۱۹۲۸ء کی اشاعت میں ایڈیٹر نے سائنس کی اہمیت و افادیت پر کس توازن کے ساتھ روشنی ڈالی:

”انسانی زندگی کے دونوں پہلو بیرونی اور اندرونی یا مادی اور روحانی ضروری ہیں اور بہترین تمدن وہ ہے جو ان دونوں پہلوؤں کے ارتقار کے مواقع بہم پہنچاتا ہے اور ان دونوں میں صحیح توازن قائم رکھتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک پہلو کی کمزوری حیاتِ انسانی کی تدریجی تکمیل کے لیے مضر ہے اس اعتبار سے موجودہ مغربی تمدن نامکمل ہے کیوں کہ اس تمدن میں بیرونی زندگی کے مقابلے میں اندرونی زندگی کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے اور مغرب کے مفکرین کو خود اس کی احساس اور اعتراف ہے۔ لیکن دوسری طرف محض اندرونی زندگی بھی مکمل زندگی ہونے کا دعوا نہیں کر سکتی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اندرونی یا روحانی زندگی اس صورت میں حیاتِ انسانی کے لیے عام طور پر مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جب کہ اس کے اظہار کے لیے جسمانی صحت، دماغی قوت، اور ماحول پر تصرف حاصل ہو اور یہ لوازمات مادی ترقی اور عملی سائنس کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔“

”سائنس“ جدید ترین سائنسی نظریات، انکشافات، معلومات اور تحقیقات کو اردو زبان میں مستقل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس کے پرانے شماروں کو پڑھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ آج سے نصف صدی سے بھی پہلے جس معیار کا سائنسی جہریدہ اردو میں شائع ہوتا تھا، آج اس معیار کے رسالے کی مثال

مشکل سے پیش کی جاسکتی ہے۔ رسالے میں مغرب کے اعلیٰ سائنسی محلوں مثلاً "سائنس پروگریس" وغیرہ سے بھی مضامین ترجمہ کیے جاتے تھے۔ کتابوں پر تبصرے کے حصے میں مولوی عبدالحق کی تحریر سہما بھی ملتی ہیں مثلاً جولائی ۱۹۲۸ء کی اشاعت میں جارج سارٹن (GEORGE SARTON) کی فاضلانہ کتاب

INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE, FROM HOMER TO

OMAR KHAYYAM پر مولوی صاحب نے بارہ صفحات کا نہایت سبوتاہ

پُر مغز تبصرہ کیا اور آخر میں لکھا کہ رسالے کے اُنکدہ نمبروں میں ہم اس کتاب کے ان حصوں کا ترجمہ پیش کرتے رہیں گے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ان کوششوں کا ذکر ہے جو انھوں نے سائنس کی تحقیقات اور ترقیوں میں کیں۔ پس معلوم ہوا کہ رسالہ کا مدبر مقرر کرنے کے باوجود عبدالحق رسالے کی نگرانی و سرپرستی کرتے تھے اور اپنی تباہ و تباہ و مشوروں سے بھی نوازتے تھے اور خود بھی رسالے کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ سائنس کے لکھنے والوں میں محمد عثمان خان، محمود احمد خاں، سر آر تھر کیتھ، ڈاکٹر میجر فرحت علی، محمد عزیز الرحمن، صلاح الدین احمد، حبیب خاں، ساندوزی، محشر عابدی، خلیل الرحمن، ڈاکٹر برج موہن لال، آفتاب حسن، سراج الدین حسین نقوی، سید محمد حسن، محمد صدیق، محمد زکریا مائل، ٹی پی جاسکرن، ڈاکٹر سلیم انبیا، صدیقی، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، سید مصطفیٰ حسین، ڈاکٹر محمد باہر مرزا، محمد رحیم اللہ، محمد یحییٰ خان، میر اسد علی، ڈاکٹر محمد عثمان، مصطفیٰ کریم ندوی، ریاض الحسن قریشی، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر غلام دسگیر، محمد عبدالہادی، سید مقصود علی، سید ظہیر الدین حسن، سید محمد حیدر، رضوانہ یدی، پی این پنڈت، املا چند باہل اور دوسرے شامل تھے۔ دوسرے لفظوں میں سائنس، کا شاندار کارنامہ اردو زبان میں سائنسی موضوعات پر لکھنے والوں کی ایک ٹیم تیار کر دینا تھا۔

سائنس کی کامیابی کے پیش نظر ستمبر ۱۹۴۱ء سے ماہانہ کر دیا گیا۔ ایڈیٹر نے سفر گزشتہ کا

جائزہ لیتے ہوئے لکھا:

"ان تیرہ برسوں میں اسی رسالہ کے ذریعے بہت سے لوگ جو انگریزی نہیں جانتے تھے،

سائنس سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کر چکے ہیں۔ جو لوگ انگریزی تعلیم یافتہ تھے، وہ

شروع میں اردو میں سائنس کے کچھ زیادہ قائل نہیں تھے۔ اب یہ طبقہ بھی آہستہ آہستہ

اس کی طرف توجہ کر رہا ہے اس رسالہ کے پڑھنے والوں کی تعداد خیریداروں سے بہت

زیادہ ہے۔ کیوں کہ بہت سے طلبہ مدرسوں اور کالجوں کے کتب خانوں میں اسے پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے مضامین بعض مرتبہ اردو اخباروں اور دوسرے رسالوں میں نقل کیے جاتے ہیں جس سے اس رسالہ سے فائدہ اٹھانے والوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ علمی اصطلاحوں کی اشاعت میں اس رسالہ کا کام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بہت سے نئے علمی اور فنی الفاظ جو سب سے پہلے اسی رسالہ کے مضمون نگاروں نے لکھے اب مقبول عام ہو کر اردو زبان کا جز بن گئے ہیں۔ اس رسالہ کے جاری ہونے سے پہلے سائنس پر لکھنے والے تعداد میں اتنے کم تھے کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے، اب لکھنے والوں کی کونہیں بلکہ پڑھنے والوں کی کمی ہے۔

ماہانہ ہونے کے بعد رسالے میں چند نئے سلسلے شروع کیے گئے جن میں ایک تو ”سوال و جواب“ کا کام تھا۔ اس میں سائنس سے متعلق پڑھنے والوں کے استفساروں کے جوابات دیے جاتے تھے۔ دوسرا مستقل سلسلے ”سائنس کی دنیا“ تھا۔ اس کے تحت سائنس اور سائنس دانوں کے بارے میں تازہ خبریں شائع ہوتے لگیں۔ ان دونوں سلسلوں کا مقصد پڑھنے والوں کی اس شکایت کو دور کرنا تھا کہ رسالے میں عام فہم مضامین بہت کم ہوتے ہیں۔

”سائنس“ اورنگ آباد سے بیس سال سے زائد مدت تک جاری رہا۔ اور بقول ڈاکٹر انور سدید ”اردو میں تکنیکی نوعیت کا یہ سب سے طویل العمر جریدہ نظر آتا ہے“۔ یہاں سے اس کا آخری پرچہ اگست ۱۹۴۸ء کو نکلا۔ قیام پاکستان کے بعد انجمن کے دوسرے رسائل تو جاری ہو گئے لیکن ”سائنس“ کے اجراء کی بلدی سب سے آخر میں آئی۔ وجہ یہ تھی کہ اورنگ آباد میں رسالے کو جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر صاحبان کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ خاص طور پر اس کی کامیابی میں ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کی اہلیت اور کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ گو بعد میں اس کی ادارت کے فرائض محمود احمد خان ریڈر کیمیا جامعہ عثمانیہ، نصیر احمد عثمانی ریڈر طبیعیات جامعہ عثمانیہ اور بعد میں آفتاب حسن انجام دیتے رہے لیکن مولوی عبدالحق کے الفاظ میں ”حقیقت یہ ہے کہ رسالے کے اجراء میں ان کا (ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کا) بڑا دخل تھا۔ انہوں نے اس کی ترتیب، مضامین کی تنقید، اصطلاحات کی تصحیح وغیرہ کے متعلق جو اسلوب قائم کر دیا تھا، رسالہ سائنس، انٹرک اس پر کامیابی سے چلتا رہا۔“



پاکستان میں سائنس کا اجرا ماہور سے جنوری ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر مظفر الدین قریشی ہجرت کر کے لاہور آگئے تھے۔ ہذا مولوی صاحب نے ان کی قیام گاہ مقامی پرائس دانوں کا ایک اجلاس بلایا۔ ایک کمیٹی بنائی۔ رسالے کی مجلس ادارت قائم کی تمام امور طے کیے۔ ڈیرہ دو ہزار روپے چندہ جمع ہوا۔ ڈاکٹر مظفر الدین قریشی مدیر اعلیٰ تجویز ہوئے۔ مجلس ادارت میں ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی، محمد افضل حسین، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر حامد خاں بھٹی، ڈاکٹر بشیر احمد، میجر آفتاب حسین، ڈاکٹر افضال حسین قادری اور سید سبط نقوی شامل تھے۔ ”سائنس“ ماہانہ سے پھر سہ ماہی ہو گیا۔ پہلے شمارے میں مولوی عبدالحق نے اپنے وقیع علمی منصوبے کا خاکہ بیان کیا۔ مولوی صاحب کا منصوبہ یہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ میں جتنی علمی کتابیں لکھی گئی ہیں اور رسالہ سائنس یا دوسرے رسالوں کے مضامین ہیں جو علمی، لفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان سب کو جمع کیا جائے اور ان پر غور و تحقیق سے نظر ثانی کی جائے۔ اسی کام کے لیے جو مجلس قائم کی جائے اس میں صرف سائنس داں ہی نہ ہوں بلکہ اردو زبان کے ادیب بھی ہوں۔ اور جب ان اصطلاحات پر اتفاق رائے ہو جائے تو اسے کتاب کی صورت میں شایع کر دیا جائے تاکہ علمی و سائنسی اصطلاحات پر اختلاف رائے ختم ہو سکے۔

”سائنس“ ایک سال تک لاہور سے نکلنے کے بعد فروری ۱۹۵۱ء میں کراچی منتقل ہو گیا۔ رسالے کے معتمد میجر آفتاب حسن مقرر ہوئے۔ اور جن اہل قلم کے مضامین شایع ہوتے رہے ان شیخ عبدالحمید، چودھری عبدالغفور، سید سبط نقوی، ڈاکٹر حامد خاں بھٹی، مرزا منظور احمد، معین الدین صدیقی، ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی، ڈاکٹر نذیر احمد، محمد اسلم فاروق فریدی، محمد انور، ڈاکٹر علی مومن نقوی، ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری، غلام احمد، سید اسد علی انوری، شیر احمد چودھری سرفراز احمد، افتخار احمد اور سید قادری محمد الدین وغیرہ شامل تھے۔ ”سائنس“ نے ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی جس کے بعد اردو میں سائنس پر رسائل نکلنے لگے۔ گو یہ رسائل گونا گوں مسائل کا شکار ہیں اور ان کا معیار بھی اتنا بلند نہیں ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ رسائل کو مولوی عبدالحق جیسی لگن، محنت، اہلیت اور اردو زبان سے عشق رکھنے والے کوئی شخصیت میسر نہیں۔

پندرہ روزہ ”ہماری زبان“

پندرہ روزہ ”ہماری زبان“ جس نے بعد ازاں پاکستان میں ”قومی زبان“ کا روپ دھارا مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو کا بازوئے شمشیر بن تھا۔ مولوی عبدالحق نے اس اخبار کو دہلی سے یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو جاری



کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب متحدہ ہندوستان میں اردو ہندی تنازعہ اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اردو سیاسی محاذ پر اپنی بھاگ کی جنگ لڑ رہی تھی اور اس جنگ میں اردو فوج کے سپہ سالار اعظم مولوی عبدالحق تھے۔ ”ہماری زبان“ نے اردو اور انجمن ترقی اردو کے ترجمان کی حیثیت میں اس تنازعے میں نہایت موثر کردار ادا کیا۔ اس زمانے کے فائلوں کا مطالعہ کیجئے تو دو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ ”ہماری زبان“ نے اردو زبان کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ تہذیبی سرمایے کی حیثیت سے پیش کیا اور اس ناشر کی شد و مد سے تردید کی کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ ”ہماری زبان“ کے سرورق پر لوج کے دو پر تقسیم سے قبل تک پابندی سے سر تیج بہادر سپرو کا یہ جملہ بطور ٹوچپتا رہا۔

”اردو زبان ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے“

ہماری زبان کے دوسرے شمارے کے ادارے میں اس نقطہ نظر کی تفصیل سے وضاحت کی گئی :

”آج اردو زبان بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے جو مختلف قومیں ہندوستان میں صدوں

سے رہتی چلی آئی ہیں ان میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے رہتے زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک حد تک یک رنگی اور یکسانی پیدا ہو گئی تھی۔ اس یک رنگی اور یکسانیت کا سب سے بڑا مظہر اردو زبان ہے جس کو ان مختلف قوموں نے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا تھا۔ یہ اردو زبان کا بڑا کرشمہ تھا اور اب بھی ہے کہ وہ ہندوستان کے بیشتر لوگوں کو باوجود نسلی اور مذہبی اختلاف کے ایک وطنی رشتہ میں گوندھے ہوئے ہے۔

ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی اپنے مذہبی رسوم، اپنی مذہبی زبانوں میں ادا کرتے ہیں لیکن جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بلا تکلف اردو میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔

یہ ایک ایسا رشتہ ہے جو مذہب کے رشتہ سے کہیں اونچا ہے اور درحقیقت ہندوستان کے اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بلا خوفِ تردید کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس ملک میں کبھی متحدہ قومیت کے خواب کی تعبیر ہوگی تو وہ اردو زبان سے ہوگی۔۔۔ بڑے افسوس

کا مقام ہے کہ آج اردو زبان کی جڑ پھلکا رہی ہے پڑ رہی ہے اور ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کلہاڑے ان ہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جو ہندوستان

میں متحدہ قومیت کے دعوے دار ہیں اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان میں ایک ایسی ہندوستانی قوم کا خواب دیکھ رہے ہیں جو مختلف عناصر سے بنی ہو۔ جو لوگ اردو زبان کو ہندوستان کی عام زبان ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے مٹانے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت ہندوستان کی موجودہ جغرافیائی وحدت کو مٹا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ ”ہماری زبان“ نے اردو کے دفاع و حمایت کی جو جنگ لڑی اس میں کبھی صحافتی آداب و اخلاق کو پامال نہیں ہونے دیا اور نہ سنجیدگی، متانت، معقولیت اور دیانت داری کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ ایک ادارے میں اسی جانب اشارہ بھی کیا گیا:

”انجمن ترقی اردو نے ایک ثقہ ادارے کی طرح اعتدال و معقولیت کو کبھی ہاتھ سے جلنے نہ دیا اور یہی شعار ”ہماری زبان“ کا رہا ہے۔ ہم نے نہ کٹ جھتیوں میں پڑنا گوار کیا۔ اور نہ دریدہ دہنوں کے منہ لگنا پسند کیا۔ ہماری زبان کے ”افکار و واقعات“ اور اجتماعی مضامین کے ساتھ ساتھ خبروں اور دوسرے مضمونوں کے انتخاب میں اس کا لحاظ رکھا گیا، ہماری مکمل صحافت نے اس شور و شغب کے زبانے میں جو ڈھنگ اختیار کر رکھا ہے، انجمن ترقی اردو کی یہ آواز اس سے الگ رہی۔ ”ہماری زبان“ نے صحافتی تبادلہ خیال میں صرف اس وقت حصہ لیا جب تک ذاتیات اور بدزبانی کی نوبت نہ آنے پائے۔ اس کی سادہ اور متوسط روش نے ہی صحافتی نمیز کو کھٹکھٹایا اور پھر تیز و تند مخالفتیں بھی اس کی سچی تردید کیے جانے پر نہیں اڑ سکے۔“

”ہماری زبان“ ۲۰۲۰ء سنٹی میٹر کے ابتدا میں سولہ اور پھر بارہ صفحات پر نکلتا تھا۔ قیمت فی پرچہ ایک آنہ اور سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔ ہر مہینے کی پہلی اور سولہویں تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ جب تک اردو ہندی تنازعہ گرم رہا، ہماری زبان کے صفحات کی پر جوش مگر بادل و کالت کے لیے مخصوص رہے۔ ”افکار و واقعات“ کے عنوان سے ایسے ادارتی نوٹ لکھے جاتے تھے جن میں اردو زبان سے تعلق رکھنے والی خبروں پر اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ یہ ادارتی تبصرے نہایت پُر مغز ہوتے تھے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ان میں ادبیت پائی جاتی تھی۔ پھر مختلف علمی و ادبی مضامین، اخبارات و رسائل اور کتابوں پر تبصرے، ”ذرا سفیہ تو“ کے عنوان سے مختصر اور دل چسپ خبریں اور انجمنی صفحے میں اشتہارات ہوتے تھے۔ ”ہماری زبان“ نے اس دور میں اردو زبان کی کیا خدمت انجام دی اس کا جائزہ ان ادارتی شذرات میں موجود ہے جو اخبار کا ایک

سال مکمل ہونے پر پابندی سے لکھے جاتے تھے۔ ان شندوں سے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

۱۔ "اپریل ۱۹۳۹ء سے انجمن کی سرپرستی میں "ہماری زبان" جاری ہوا اور دو کے علاوہ پوٹو شید

دونوں قسم کے مخالفوں کی قلعی کھلنا شروع ہوئی۔ انجمن کی اس کوشش میں بڑی کامیابی ہوئی

اور ہونا بھی چاہیے تھی اس لیے کہ ایک بڑا طبقہ "بین ثبوت" کا ہی منظر تھا۔ اور "ہماری زبان"

کے کالموں میں ایسی ہیاشتہائیں پیش ہوتی رہیں جو اہل ثابت ہوتی تھیں۔ اس نے ملک

میں بڑی بیداری پیدا کی۔ شمالی ہند میں اردو کی مخالفت بیکار کم ہونا شروع ہوئی جسے

۲۔ "آج" ہماری زبان کی زندگی کا تیسرا سال شروع ہوا ہے۔ اگرچہ ہمیں احساس ہے کہ ہم

اس دو سال کے عرصے میں وہ سب کچھ نہ کر سکے جو کرنا چاہتے تھے لیکن ساتھ ہی اطمینان

بھی ہے کہ ہم نے جو کچھ کر لیا ہے وہ کچھ کم نہیں۔ اردو کے خلاف جو زبردست طوفان اٹھا تھا

اسے اگر ہم فرو نہیں کر سکے تو اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ اردو والوں کو آنے والے خطروں

سے ہم نے ہوشیار کر دیا اور اس طرح اس طوفان کے اثرات زیادہ نہیں ہونے پائے

اور اردو والوں کے بروقت بیدار ہونے سے اس کا زور بہت کچھ کم ہو گیا۔"

واقعہ یہ ہے کہ "ہماری زبان" نے بڑے اُسے وقتوں میں اردو کی حمایت میں آواز بلند کی جب سیاہی

دباؤ کے تحت سرکاری اداروں اور محکموں نے اردو کو نظر انداز کرنا شروع کیا اور خاص طور پر ریڈیو نے

اردو کے عام الفاظ کو چھوڑ کر گڑے ہوئے کمریہ لفظوں کو استعمال کرنا شروع کیا تو "ہماری زبان" نے

اس ردیے پر احتجاج کیا اور اردو داں طبقے کو اس کے خلاف ہموار کیا اور اکسایا کہ وہ اپنی شکایت تحریری

طور پر ریڈیو کی انتظامیہ تک پہنچائیں۔ میاں بشیر احمد ایڈیٹر جمالیوں نے "ہماری زبان" کی اس خدمت پر خراج

تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

"مولوی صاحب نے (مولوی عبدالحق) انجمن کی طرف سے ایک پندرہ روزہ اخبار ہماری زبان"

جاری کیا جو بلاشبہ قومی زبان کی سب سے زیادہ خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہماری زبان" نے

گزشتہ نو ماہ میں مختلف شعبوں اور محکموں اور اداروں میں اردو کے تحفظ کی طرف توجہ دلائی

ہے۔ مثلاً ریڈیو، ریوے، ڈاک خانہ، ڈسٹرکٹ بورڈ، یونیورسٹیاں، صوبوں کی حکومتیں،

ریاستیں، کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ۔"



”ہماری زبان“ کے اجراء کا فیصلہ مولوی عبدالحق نے نہایت بروقت کیا تھا۔ لہذا اس کے نکلنے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یکم اپریل ۱۹۴۲ء کو اس کی اشاعت چار ہزار چار سو تک پہنچ چکی تھی۔ اس مقبوضہ کی مدت میں اس کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کس قدر وقت پر جاری کیا گیا جیسے لوگوں کو اس کا انتظار تھا۔ اردو کو ایک مردہ زبان اور اردو والوں کو بے یار و مددگار سمجھ کر اردو کے ساتھ جو سلوک کانگریس کی طرف سے ہو رہا تھا اسب نے دیکھ لیا کہ کانگریس حکومتوں کے استعفیے دینے سے پہلے ہی اس روش میں نرمی پیدا ہو گئی تھی۔

”ہماری زبان“ نے مخالفین اردو کو دندان شکن جواب دینے کے علاوہ فروغ اردو اور دفاع اردو کے سلسلے میں مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو کی کارگزاریوں سے بھی اپنے پڑھنے والوں کو باخبر رکھا۔ اس پورے دور میں اردو زبان کو جن مسائل اور تنازعات کا سامنا رہا، اس کی پوری تاریخ ”ہماری زبان“ کی فائلوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی جاسکتی ہے۔ لیکن ”ہماری زبان“ کے اس ہنگامہ پروردور میں بھی تخلیقی ادب اور ادیبوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اردو کے لسانی اور تہذیبی مزاج پر جہاں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، مولانا عبد القدوس ہاشمی اور میاں بشیر احمد کے مضامین اور مولوی عبدالحق کی تقریریں ہماری زبان کے صفحات پر نظر آتی ہیں وہیں ادب اور ادیبوں کے حقیقی مسائل پر سید سبط حسن اور سجاد ظہیر کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ بد قسمتی سے یہ اخبار اپنی اشاعت کے بہترین زمانے میں بھی مالی خسارے سے دوچار رہا جس کی وجہ سے اس کے صفحات سولہ سے کم کر کے بارہ کر دیے گئے۔

۱۹۴۷ء تک ”ہماری زبان“ کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ اردو ہندی تنازعے کی گرد بیٹھ گئی۔ اب اس کے صفحات پر افسانے، نظمیں، غزلیں، مضامین، غورتوں اور بچوں کے لیے علیحدہ کالم چھپنے لگے۔ سرورق پر زبان کی اہمیت و افادیت کے حوالے سے مشاہیر کے اقوال اور اقتباسات دیے جانے لگے جب کہ صفحہ تین کو باقاعدہ ادارتی صفحے کی شکل دے دی گئی۔ ادارت کے فرائض اس پورے دور میں ڈاکٹر ریاض الحسن پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور رفیق الدین احمد انجام دیتے رہے۔

”ہماری زبان“ کا دوسرا دور یکم جون ۱۹۴۸ء سے شروع ہوا جب یہ کراچی سے ماہانہ ”قومی زبان“ کے نام سے نکلا۔ (بعد ازاں یہ پندرہ روزہ اور پھر ماہانہ ہو گیا) اس کے سائز میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ البتہ جہاں سرچ بہادر سپرو کا قوں درج ہوتا تھا وہاں اب یہ لکھا جانے لگا: ”قومی زبان ہی قوم کی آواز ہے“ سرورق پر



تصویریں چھپنے لگیں، مندرجات و مشلات میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ "خیابان ادب" کے عنوان سے دل چسپ محاضرات، قصص و حکایات شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مولوی عبدالحق "زعفران" کی سرخی کے تحت اپنے دل چسپ مشاہدات قلمبند کرنے لگے۔ اخبار میں ایک سندھی صفحہ بھی شروع کیا گیا جس کا ایک کام سندھی میں اور دوسرا اردو ترجمے کا ہوتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اردو اور سندھی بولنے والے لسانی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ اس صفحے کو پیرجام الدین راشدی ترتیب دیا کرتے تھے۔ "نقد و نظر" کے عنوان سے کتابوں اور رسالوں پر تبصرے اور "چیدہ خبریں" کے عنوان سے دو صفحات پر علمی و ادبی خبریں درج کی جاتی تھیں۔

پاکستان میں "قومی زبان" کے ابتدائی چند سال نہایت معرکہ خیز گزرے۔ نو آزاد مملکت میں اس اخبار نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ بجائے سفود ایک تاریخ ہے، جسے اختصار سے ان نکات میں سمیٹا جاسکتا ہے :

۱۔ "قومی زبان" نے پاکستان میں اردو کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کی بھرپور جدوجہد کی جب بھی اردو کے مقابلے میں کسی علاقائی زبان یا مذہبی آرٹھیں عربی زبان کو لانے کی کوشش کی گئی، یہ اخبار اردو کے حق میں سینہ سپر ہو گیا۔ اس نے اپنے اداروں اور مضامین کے ذریعے اس سے کہیں جارحانہ انداز اختیار کیا جیسا اردو ہندی تنازعہ کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔

۲۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے اور اردو کالج، اردو میڈیکل کالج، اور بعد ازاں اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے اسی اخبار نے حکومت پر دباؤ ڈالنے اور رائے عامہ ہموار کرنے کی پیہم کوششیں جاری رکھیں۔

۳۔ اردو اخبارات و رسائل کا وقار بلند کرنے، ان کے معیار کو بہتر کرنے اور حکومت کی نظروں میں انہیں با وقعت بنانے کے لیے قیمتی تجاویز و مشورے دیے۔ "قومی زبان" نے اردو اخبارات کو ٹائپ اختیار کرنے پر بھی زور دیا اور انہیں غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنی بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی کے قیام کی ضرورت و اہمیت بتائی۔

۴۔ "قومی زبان" نے اردو کو دوسری علاقائی زبانوں سے قریب لانے اور ان کے مابین غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے ازالے کی بھی سنجیدہ کوششیں کیں۔

۵۔ اس نے صحافیوں اور ادیبوں کے لیے آزادی اظہار رائے کی بھی جنگ لڑی۔ اور جب بھی اظہار پر پابندی عاید کرنے کی کوشش کی گئی، قومی زبان نے ببانگ دہل احتجاج کیا لیکن ساتھ ہی اس نے لغزات کو بھی ذمہ دارانہ روش اختیار کرتے اور آزادی رائے کے غلط استعمال سے روکنے کی کوشش کی۔

”قومی زبان“ کی ادارت کے فرائض مختلف وقتوں میں شاہد حسین رزاقی، قاضی احمد علی اختر خواجہ ناظمی، عبدالرشید قاضی، محمد مظہر الدین صدیقی، حکیم اسرار احمد کیریوی، شجاع احمد زبیا اور مشفق خواجہ نے انجام دیا۔ مشفق خواجہ کی ادارت میں رسالے کا مزاج علمی اور ادبی ہو گیا۔ اور اس میں ڈاکٹر محمد اجمل، محمد حسن عسکری اور دیگر ممتاز ادیبوں اور نقادوں کے مضامین شائع ہونے لگے۔ بعد میں اس کا سائز بھی عام ادبی رسالوں جیسا ہو گیا۔ ”قومی زبان“ مالی طور پر کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود اس نے ہر دور میں بڑی بے جگری سے اردو کی لڑائی لڑی اور قومی زبان اس کا یہ احسان کبھی نہ بھولے گی۔

### ماہانہ معاشیات

مولوی عبدالحق نے ماہانہ ”معاشیات“ دہلی سے جنوری ۱۹۴۶ء میں نکالا تھا اور یہ ڈیرہ برہنہ تک پابندی سے نکلتا رہا تھا اور اسے پڑھنے والوں میں کافی پذیرائی بھی حاصل ہو گئی تھی لیکن بقول مولوی عبدالحق، ”۱۹۴۷ء کے وسط میں ملک کی تقسیم کے بعد حالات کا نقشہ ہی بدل گیا۔ انجمن کو بھی اس سلسلے میں بہت کچھ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔۔۔ سب سے بڑھ کر نقصان یہ ہوا کہ انجمن کی ساری علمی اور عملی جدوجہد ختم ہو گئی۔“ ”معاشیات“ بھی بند ہو گیا۔

### پاکستان سے معاشیات اگست ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا

”معاشیات“ کیوں نکالا گیا تھا۔ مولوی عبدالحق کی زبانی سنیے :

”اردو کی اشاعت اور ترقی کے ساتھ ہی ساتھ انجمن ترقی اردو کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے

کہ وہ اردو ادب کی کمی پوری کرے، کوئی زبان شائستہ اور ادبی ہونے کا دعویٰ نہیں

کر سکتی جو علمی خیالات ادا کرنے سے قاصر ہو اور جس میں علوم و فنون کا کافی ذخیرہ نہیں ہے“

چنانچہ ”معاشیات“ کی از سر نو اشاعت کا ڈول ڈالا گیا، ایک مجلس ادارت ترتیب دی گئی جس میں

ملک کے ممتاز ماہرین معاشیات کو شامل کیا گیا۔ رسالے کا معتمد محمد احمد سبزواری، ریسرچ آفیسر ٹی

آف انکمیس افیسرس) کو مقرر کیا گیا۔ دیگر اراکین ادارت میں ڈاکٹر انور اقبال، سید منیر اہدی، ڈاکٹر سردار محمد اختر، محمد حسن، سید عبدالصمد، عاتم علی علوی، الطاف گوہر، سید احمد، غلام محمد بدرالدین شامل تھے۔ یہ سارے اصحاب یا تو حکومت کے مالیاتی اداروں میں کسی اونچے عہدے پر فائز تھے یا پھر علاقائی تعلیمی اداروں میں معاشیات و تجارت کی تعلیم و تدریس یا صحافت سے وابستہ تھے۔ معاشیات کا پہلا شمارہ ۱۴ صحت پر مشتمل تھا، فی پرچے کی قیمت ۸ آنے، شش ماہی تین روپے اور سالانہ چندہ چھ روپے تھا۔ مضامین کے سلسلے میں اعلان کیا گیا تھا: ”زسانے میں نظری معاشیات اور پاکستان، ہندوستان، اسلامی ممالک، غیر ممالک کے معاشی مسائل، زراعت پر صحیح معلومات کے مقالے اور مضامین شامل ہوں گے۔ اسلامی معاشیات اور علمائے اسلام کے معاشی افکار کی اشاعت کے علاوہ زسانے میں معاشی خبریں اور ضروری اعداد و شمار اور علم معاشیات کی اردو اصطلاحوں کی تشریح بھی شائع ہوا کرے گی۔“

معاشیات کا پہلا پرچہ منظر عام پر آیا تو سرکاری، غیر سرکاری اور علی حلقوں میں شاندار خیر مقدم ہوا۔ ہر جگہ اسے مضامین کے معیار، کتابت اور طباعت کے لحاظ سے پسند کیا گیا۔ چنانچہ عوام میں اس کو مزید مقبول بنانے کے لیے چندہ اٹھ روپے کے بجائے چھ روپے سالانہ کر دیا گیا۔ معاشیات پر انگریزی دار و اخبارات نے حوصلہ افزا تبصرے کیے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ نے تبصرہ کیا:

”یہ رسالہ ان لوگوں کے واسطے بے حد مفید ہے جو معاشیات اور مالیات کے دشوار مسائل سمجھنا چاہتے ہیں مگر انگریزی سے ناانوس ہونے کی وجہ سے مجبور ہیں۔ انگریزی کی تعلیم بین الاقوامی روابط کے لیے ضروری ہے لیکن اس کو نقصان پہنچائے بغیر اردو کے سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ چنانچہ انجمن اس ذیل میں ٹھوس کام کر رہی ہے اور اس کا زیر تبصرہ رسالہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے۔“

”ماہ نو“ نے لکھا:

”دہلی سے بھی انجمن اسی نام کا ایک رسالہ نکالتی تھی، موجودہ پرچہ معیار میں اس سے بہت بہتر ہے اور اس میں پاکستان کے کئی ماہرین معاشیات کے ایسے مضامین شامل ہیں جو پاکستان کی معاشی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔“

اگست ۱۹۴۹ء سے دسمبر ۱۹۵۰ء تک معاشیات کے سولہ شمارے شائع ہوئے اس رسالے نے ایک







لکھنا پڑے۔

معاشیات "جنوری ۱۹۵۵ء تک جاری رہا۔ بند میں یہ ٹائپ میں چھپتا تھا لیکن بعد میں کم صفحات میں زیادہ مواد دینے کے خیال سے کتابت پر منتقل کر دیا گیا۔ رسالے کے چند صفحات طلبہ علموں کے لیے بھی مخصوص کر دیے گئے تھے۔ لیکن فوسس کے رد و کاپی معیار کی علمی رسالہ چند برسوں تک بہار جہانپور دیکھ کر سر جھکا گیا۔

### سہ ماہی "تاریخ و سیاسیات"

مولوی عبید اللہ نے پاکستان آنے کے بعد دو علمی مجلوں کی بنیاد رکھی۔ ایک، انجمن سائنس، وردہ سرکاری تاریخ و سیاسیات۔ اس انجمن کے قیام کے سلسلے میں انھوں نے مئی ۱۹۵۰ء میں کرچی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں، جس میں تاریخ و تاریخ کے سائنسہ گرام کا ایک اجلاس بلایا جس میں انجمن کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالہ "تاریخ و سیاسیات" کے موضوع پر جاری کرنا طے پایا۔

"تاریخ و سیاسیات" کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ ۶۲۶۱۷۱ سٹی میٹر کے سائز کا یہ رسالہ طائپ کے ۵۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ قیمت ڈھائی روپے فی رسالہ تھا۔ مجلس درت نے صدر مولوی عبدالحق تھے اور راکین ادارت میں ڈاکٹر محمود حسین خان، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مسٹر ایم بی احمد، ڈاکٹر معین الحق، ڈاکٹر ریاض الحسن، سید حسام الدین راشدی، قاضی احمد میاں اختر، سید ہاشمی فرید بادی شامل تھے۔ بعد میں مولوی سید تقی الدین کے نام کا اضافہ ہو گیا۔ "تاریخ و سیاسیات" بلند پایہ علمی مجلہ تھا۔ اس میں معروف اہل قلم، درموزین کے مضامین چھپتے تھے اس کا اندازہ پیسے شمارے کے فہرست مضامین سے لگایا جاسکتا ہے:

(۱) فتنہ جہ سر ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ پاکستان

(یہ وہ تقریر تھی جو "مجلس تاریخ" کے افتتاح کے موقع پر کی گئی تھی)

(۲) ہندی الاصل و رہندوی مسلمان سلاطین: سید سلیمان ندوی

(۳) قانون بین الممالک کا آغاز و ارتقاء: ڈاکٹر حمید اللہ

(اس موضوع پر اردو میں لکھا جانے والا پہلا مقالہ ہے)

(۴) مشاہدات کابل: مولوی محمد علی (یہ مشاہدات مدیر رسالہ کی خصوصی فرمائش پر تحریر کیے گئے۔)

## (۵۱) تبصرے:

(i) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت: مبصر ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(ii) خوارزم قدیم ف م اشرف

(iii) تذکرۃ اہل دہلی قاضی احمد میاں اختر منقول از: تنار الصنادید۔ مسلسل (دیگر شماروں

کے لکھنے والوں میں عبد الرحمن صدیقی، ڈاکٹر محمد اشرف، ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی، مولوی اصحاح الحین، مسٹر ڈاکٹر اشرف، نصیر الدین ہاشمی، سید تمکین کاظمی، مالک رام، مفتی انتظام اللہ شہبانی، ڈاکٹر سید معین الحق، عبدالرافع خان، مرزا علی اظہر برلاس، عبدالماجد فاروقی، ڈاکٹر وحید قریشی، وحید الدین قادری، پروفیسر ضیاء الدین احمد، محمود احمد عباسی اور دیگر اہل قلم شامل تھے۔

”تاریخ و سیاسیات“ کو کامیاب بنانے کی ڈاکٹر حمید اللہ نے حتی المقدور کوشش کی انھوں نے سارے کے لیے خود بھی مضامین لکھے اور دوسروں کے مضامین بھی رسالے کو اشاعت کے لیے فراہم کیے۔ نومبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں ابوالجلال ندوی کا ایک چونکا دینے والا مقالہ ”موتن جوڈو کی زبانیں“ شایع ہوا۔ فاضل مقالہ نگار کا دعویٰ تھا کہ اس نے موتن جوڈو کی ہروں پر قدیم عربی کے حروف پڑھ لیے ہیں۔ اس مقالے پر ایڈیٹر نے نوٹ لکھا: ”یہ انکشاف بڑی جرأت سے کیا گیا ہے۔ ہم اس کی صحت کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں پیش کر سکتے۔ مگر ان کا نظریہ غور و حجت پر ضرور مبنی ہے۔“

جولائی ۱۹۵۱ء میں مالک رام کا تحقیقی مقالہ ”حمورابی اور قانون حمورابی“ اگست ۱۹۵۲ء میں عبدالماجد فاروقی کا مقالہ ”ادارۃ پائیت و خلافت کا تقابلی مطالعہ“ قسط وار شایع ہوا۔ ڈاکٹر معین الحق کی مرتبہ کتاب ”تذکرۃ الواقعات“ از جوہر آفتابچی مئی ۱۹۵۲ء سے سلسلہ وار چھپی۔

”تاریخ و سیاسیات“ اگست ۱۹۵۳ء کے بعد پھر نہ نکل سکا اور یوں پڑھنے والوں کی کورزوقی اور لکھنے والوں کی قلت کے سبب ایک بہت اچھا علمی رسالہ بند ہو گیا۔

## حوالہ جات:

۱۔ ماہنامہ ”ہم قلم“ کراچی اگست ۱۹۶۲ء

۲۔ شہاب الدین ثاقب ”مولوی عبدالحق حیات اور علمی خدمات“ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

- ۳۴۔ ممتاز الدین احمد عید حق "سلسلہ ہندوستانی دب کے معمار" سہ ماہی کا مئی دہی ۱۹۴۷ء ص ۲۳-۲۴
- ۳۵۔ سدا دھامبر کی تاریخ صحافت اردو جلد پنجم، جدید پرنٹنگ پریس، ۳۲ گلی کبیریاں جامع مسجد دہلی ۱۹۱۳ء ص ۳۸
- ۳۶۔ ماہنامہ ہم فلم اگست ۱۹۴۲ء ص ۵۴ شہاب الدین نقیب، محولہ بالا ص ۱۱۰ ص ۱۱۱ ایضاً ص ۳۲
- ۳۷۔ رئیس احمد جعفری "اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو" مشہور "قومی زبان" کراچی ماہنامہ اردو نمبر ۱۹۴۴ء
- ۳۸۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "مجلاتی صحافت میں نقوش کا مقام" مشہور نقوش محمد طفیل نمبر جولائی ۱۹۵۸ء
- ۳۹۔ سہ ماہی اردو اورنگ آباد جنوری ۱۹۴۱ء ص ۱۱۱ ایضاً ص ۱۱۲ ایضاً ص ۱۱۳
- ۴۰۔ جمیل اردین عانی "حرفے چند" مشہور اشاریہ اردو مترجم سید سرفراز علی رضوی "انجمن ترقی اردو" کراچی ص ۴
- ۴۱۔ سہ ماہی اردو کراچی جنوری ۱۹۵۰ء
- ۴۲۔ ڈاکٹر انور سدید "موسوی عید حق کی ادبی صحافت" مشہور سہ ماہی ادبیات شملہ ۳، ۱۵، ۱۴ جلد ۱ اسلام آباد
- ۴۳۔ سہ ماہی اردو جنوری ۱۹۴۱ء ص ۱۱۱ سائنس جنوری ۱۹۴۸ء ص ۱۱۱ ایضاً ص ۱۱۲ ایضاً سائنس جنوری ۱۹۴۱ء
- ۴۴۔ سہ ماہی ادبیات "محولہ بالا" پندرہ روزہ ہماری زبان ۱۴ اپریل ۱۹۳۹ء ص ۲۴ ہماری زبان "اپریل ۱۹۴۰ء
- ۴۵۔ ہماری زبان یکم جنوری ۱۹۴۰ء ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۴۱ء ص ۱۱۱ ہماری زبان یکم جنوری ۱۹۴۰ء
- ۴۶۔ ہماری زبان اپریل ۱۹۴۰ء ص ۱۱۱ معاشیات اگست ۱۹۴۹ء ص ۱۱۱ ایضاً
- ۴۷۔ معاشیات ستمبر ۱۹۴۹ء ص ۱۱۱ سول اینڈ ملٹری گزٹ ۲۷ اگست ۱۹۴۹ء
- ۴۸۔ ماہ ذی لاہور اکتوبر ۱۹۴۹ء ص ۱۱۱ معاشیات جولائی ۱۹۵۰ء

## مکاتیب عبدالحق

اردو نثر کی اصناف میں مکتوب نگاری کی ہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کسی بڑی شخصیت کا خط محض ایک تحریر نہیں ہوتا بلکہ ایک صاف اور شفاف آئینہ تصور کیا جاتا ہے جس میں لکھنے والے کا بھرپور عکس دکھائی دیتا ہے۔ شاعر اور دیب، اپنی شخصیت کو اپنی تخلیق کے پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں شاید وہ کہتے ہیں کہ اگر ان کی شخصیت کے سمجھی پہلوؤں کو اس کے سامنے آگئے تو ان کی شہرت اور مقبولیت کا سورج گہنا جائے گا۔ اس لیے کسی فن کار کے حقیقی خیالات کا مطالعہ محض اس کے فن پاروں کے ذریعے ممکن نہیں اس کے لیے ہمیں کسی دوسرے ذریعے کی جستجو کرنا چاہئے، ورنہ ذریعہ شاعریا ادب کے خطوط ہی ہو سکتے ہیں۔

خطوط، لکھنے والے کے اصل اوصاف کو بے نقاب کر دیتے ہیں اور اس کی تہ در تہ شخصیت کو قارئین پر کھول کر رکھ دیتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ خطوط کسی اخبار یا رسالے میں اشاعت کی غرض سے نہ لکھے گئے ہوں ایسے خطوط دلچسپ بھی ہو سکتے ہیں اور معلومات افزا بھی لیکن اکثر و بیشتر یہ کاغذ پر دسے ثابت ہوتے ہیں جن کے پیچھے اصل شخصیت چھپ جاتی ہے، لہذا تحقیقی اعتبار سے وہی خطوط مفید ثابت ہوتے ہیں جو سادگی اور بے تکلفی سے لکھے گئے ہوں۔ مولوی عبدالحق خطوط کی افادیت کے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”خطوں کی یہ سادگی اور بے ریاکی ہے جو دلوں کو بٹھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا انداز ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بعض اوقات اپنے آپ سے بات کرنے لگتا ہے جو خیال جس طرح دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے، نہیں بلکہ وہ اپنا دل کا غم کے ٹکڑے پر نکال



کر رکھ دیتا ہے" (۱)

ہی بات بالفاظ دیگر یوں کہتے ہیں :

"خانگی خطوط ہیں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دل چسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے، تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت و راندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے جہاں اندیشہ لازم نہیں ہے یہ وہ خیالات و رجحانات کا روزنامہ ہے اور سر حیات کا صحیفہ ہے پھر کون ہے جو اس خالص آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا؟ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزناموں، آلبم، پتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہاں انسان بچپن کی سنی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں۔ جنہیں نہ لٹا کی صنعت نسخہ سکتی ہے، اور نہ تشبیہات و استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت ہر خیال اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے"

مولوی عبدالحق نے خطوط کی اہمیت و افادیت کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ ان کے اپنے خطوط پر بھی صادق آتی ہے۔ ان خطوں سے ان کے کردار کے مختلف گوشے اس طرح روشن ہوتے ہیں۔ مٹائشوں کی بڑائی ہوئی دھوئیں قاری، اور مولوی عبدالحق کی شخصیت کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اصل مولوی عبدالحق سے متعارف ہونے کے خواہش مند ہیں ان کے لیے خطوط عبدالحق سے بے نیاز نہ رہنا ممکن نہیں، اس کے باوجود یہ بات یقیناً دل چسپ ہے کہ مولوی صاحب سے جب بھی کسی نے ان کے خطوط کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کو بالکل پسند نہیں کیا، اور خواہش مند حضرات کی ہمیشہ خواہش کی لیکن لوگ مایوس نہیں ہوئے حتیٰ کہ مولوی عبدالحق کو رضامند ہونا پڑا جیسا کہ ان کے خطوط بنام حکیم محمد امام امای اور شبیر علی کاظمی سے ظاہر ہے جو بالترتیب ۳ نومبر ۱۹۵۸ء اور ۱۲ نومبر ۱۹۵۸ء کو لکھے گئے۔ ان خطوں میں انھوں نے جمع و تدوین کو ایک

بدعت، فیشن اور زواج وغیرہ کا نام دیا ہے اور لکھا ہے کہ ایسے کاموں میں وقت اور روپیہ صرف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ قصہ کو تاہ مشفق خواجہ بابائے اردو کو قائل کرنے میں کامیاب رہے اور انھوں نے ان کے خطوط جمع کرنے اور شایع کرنے کی اجازت حاصل کر کے چند سال کی مسلسل کوشش سے ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا جسے بعد ازاں جلیل قدوائی نے مکاتیب عبدالحق کے نام سے مرتب کر کے اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے ۱۹۶۳ء میں شایع کیا۔ اس سے قبل ایک مجموعہ مکتوبات بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام حکیم محمد امام امامی سکریٹری انجمن ترقی اردو میسور بنگلور اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے نومبر ۱۹۶۰ء میں شایع ہو چکا تھا، اس کے بعد اب تک مندرجہ ذیل مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں:

اردوئے مصطفیٰ مرتبہ ہاشمی فرید آبادی مطبوعہ ۱۹۶۱ء

مکتوبات بابائے اردو بنام پیر حسام الدین راشدی مطبوعہ ۱۹۶۴ء

خطوط عبدالحق مرتبہ اکبر الدین صدیقی مطبوعہ ۱۹۶۷ء

عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام مرتبہ افضل العماڈ ڈاکٹر عبدالحق مطبوعہ ۱۹۶۸ء

مؤخر الذکر دونوں مجموعے ماہنامہ قومی زبان کراچی نے بابائے اردو کی نوپیں برسی کے موقع پر

گست ۱۹۷۰ء میں شایع شدہ خصوصی شمارہ میں بھی شامل کئے، انگریزی خطوط کا ایک مجموعہ بہ

عنوان *Letters by Maulvi Abdul Haq* ۱۹۶۶ء میں شایع ہو چکا ہے۔ خطوط

عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی دسمبر ۱۹۷۶ء میں شایع ہوئی۔

ان مجموعوں کے علاوہ مولوی عبدالحق نے ”بچوں کے خطوط“ کے عنوان سے دو حصوں میں ایک

کتاب تیار کی جس کا پہلا حصہ مدارس تحتانیہ (پرائمری) اور دوسرا مدارس فوقانیہ کے طالب علموں

کے لیے لکھا گیا تھا، دونوں حصے نومبر ۱۹۶۴ء میں عبدالحق اکیڈمی اشاعت منزل اردو گنج حیدر آباد

دکن سے شایع ہوئے۔

ان تمام مطبوعہ مجموعوں میں شامل خطوط کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں حالانکہ اندازہ یہ ہے

کہ بابائے اردو کے خطوط کی تعداد ہزاروں میں ہے جن میں سے خاصی تعداد ان خطوط کی ہے جو رساں اخبارات

اور متفرق کتابوں یا مجموعوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان میں وہ دو خط بھی شامل ہیں جو انھوں نے ۱۹۲۳ء

میں مولانا عثمان جعفری ایم اے پروفیسر سٹی کالج حیدر آباد دکن کو لکھے تھے اور غالباً ابھی تک ان کے

کسی مجموعہ خطوط میں شامل نہیں ہو سکے۔ اکثر و بیشتر خطوط تاحات لوگوں کے ذاتی ذخیرہ یا برصغیر کے مختلف اداروں کی فائسوں میں کسی محقق یا محققین کی جماعت کی منظم اور مربوط مساعی کے منتظر ہیں۔

موجودی عہد الحق کے نام اقبال کے آٹھ خطوط دستباب ہوئے ہیں یہ خطوط ڈاکٹر ممتاز حسن نے اپنی کتاب ”قبال اور عہد حق“ میں شامل کئے ہیں جن سے دونوں شخصیتوں کے رسم کا پتہ بھی چھٹا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں عرصے تک خط و کتابت جاری رہی لیکن فسوس ہے کہ موجودی عہد حق کا ایک خط بھی دستیاب نہیں ہو سکا۔

خطوط کا یہ بیش قیمت ذخیرہ بابائے اردو کے افکار و نظریات، احساسات، رجحانات و میلانات عادات و اطوار اور اشتغال وغیرہ کے علاوہ ان کی معاشرتا ریح کا بھی آئینہ ہے۔ اردو زبان سے ان کا گناؤ سب پر واضح ہے لیکن اس گناؤ کے فکری پس منظر کا علم ہمیں خطوط سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو انھوں نے حکیم مامی کو خط لکھا ہے اس میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بتایا ہے کہ وہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں اس لیے کوشاں ہیں کہ یہ زبان بڑھنے والی ہو، اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ یہ چیز اس کی سرشت میں داخل ہے۔ آپس کے میل جول سے پیدا ہوتی ہے اور گزشتہ زمانے کی طرح اب بھی ایک ان کی اور خوش گواری پیدا کر سکتی ہے (۵) حکیم مامی ہی کے نام یکم دسمبر ۱۹۴۸ء کو لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اس زبان کا پایہ بہت بلند ہے اور ملک کے ہر حصے اور ہر گوشے میں اس کے جاننے اور بولنے والے موجود ہیں اس کی شیرینی اور حسن و خوبی کو غیروں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس کا ادب بہت وسیع اس کی صلاحیت بے پایاں ہے۔ ملک کے مختلف طبقوں میں اتحاد و یک جہتی کا بہت بڑا ذریعہ ہے اس کی خدمت درحقیقت ملک کی خدمت ہے (۶)

اردو کی اہمیت و افادیت کے اس احساس نے انھیں ۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی اردو کی معتمدی قبول کرنے پر آمادہ کیا اور وہ موزوں مرکز کی تلاش میں علی گڑھ سے اورنگ آباد، واس سے دہلی، دیکھ کر اچانک سرگرداں رہے۔

اسی پر بس نہیں بلکہ انھوں نے اپنا سب کچھ اس کے لیے وقف کر دیا، اپنے اوقات عزیز، اپنی آمدنی و جسم و جان کی ساری صلاحیتیں انجمن کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کر دیں، ان کی خوشی اور غم، صحت اور بیماری اس ایک ادارے کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے تابع ہو کر رہ گئی ان کے خطوط



میں بھی اردو زبان اور انجمن کا ذکر تمام امور پر حاوی ہے، کہیں کتابوں کے پروف پڑھنے کا ذکر ہے اور کہیں کتابوں کی اشاعت کی اطلاع ہے، کہیں مسودوں کے ملنے کی خبر ہے تو کہیں ان پر نظر ثانی کا تذکرہ۔ اس کے علاوہ انجمن کی شاخیں کھولنے، چندہ امداد حاصل کرنے، اردو کانفرنس منعقد کرنے کا ذکر بھی کثرت سے ملتا ہے، یہ اور اس قسم کے دیگر موضوعات یقیناً خشک ہیں لیکن اپنی موضوعات کی بدولت خطوط عبدالحق کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے کیوں کہ ان کے مطالعہ سے مولوی عبدالحق کی وہ شاندار خدمات نمایاں ہوتی ہیں جو انھوں نے اردو زبان کی ترویج کی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے انجام دیں۔

۲۳ اگست ۱۹۵۰ء کے خط میں حکیم امامی کو لکھتے ہیں ”تمہیں معلوم ہے کہ جو کچھ پاس تھا وہ انجمن کی نذر کر چکا تھا گزرا وقت کا سہارا پنشن تھا سو وہ حکومت حیدرآباد نے بند کر دی ہے“ انھیں یہ کہہ کر مولوی عبدالحق نے اپنی عمر کی کمانی ۴۴ ہزار روپے کی خطیر رقم انجمن کو بطور عطیہ دے دی تھی تاہم کہ پنشن کی بندش نے کیا کیا ستم دکھائے ہوں گے لیکن اس پر بھی صبر و ضبط اور غیرت و خودداری کا یہ عالم ہے ”جہاں مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹے ہوں جہاں ہماری تہذیب و روایات اور ہماری زبان کو یکسر مٹا دیا گیا ہو وہاں میں رہتی پنشن بند ہونے کی کس منہ سے شکایت کروں۔ بہت گزر گئی تھوڑی باقی ہے یہ بھی بڑی بھلی گزر رہی جائے گی۔ لگدس باقی ہوس“ یہ اور دوسری بہت سی مصیبتیں اور صدمے بابائے اردو نے محض حب اردو اور خدمت انجمن کے جذبے کی وجہ سے برداشت کیے لیکن ملتھے پر شکن تک لانا گوارا نہیں کی۔ انجمن کی خدمت کے سلسلے میں انھوں نے جس وفاداری بشرط استواری کا مظاہر کیا اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں اس معاملے میں وہ صاحب عزیمت تھے جب کسی کام کا پیڑا اٹھاتے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حتی الامکان کوشش کرتے اور ناموافق حالات سے بدل نہ ہونے۔ ۷ اگست ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر شوکت بزداری کے خط میں اردو زبان کو درپیش حوادث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اردو بہت بد نصیب ہے گھر میں در ماندہ اور باہر ماندہ۔ کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اب تو دوست بھی منہ چھپانے لگے یہ مخالفت آج کی نہیں ساہا سال سے چلی آرہی ہے لیکن یہ کچھ ایسی سخت جان ہے کہ ہر معرکے میں سے سرخ رو ہو کر نکلی۔ مگر اب کے چال بے ڈھب



پڑی ہے۔ پہلے غیروں سے لڑتے رہے اب، ہنوس سے لڑنا پڑا ہے یہ سخت آزمائش ہے  
بعض اوقات مجھے بھی مایوسی ہونے لگتی ہے لیکن میں اس پر کاربند ہوں،

دست از طلب ندالم تا کام من برآید  
(۹ الف) یا جان رسد بہ جاناں یا جان ز تن برآید

۴ مئی ۱۹۳۳ء کے خط میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو لکھتے ہیں کہ ”اردو زبان کا جملہ ضرور  
کردار و خرچ کچھ زیادہ ہوگا۔۔۔ اس قدر ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ کوئی نہیں  
دے گا تو میں دون گا۔ میں اس کام کو کر کے چھوڑوں گا، خواہ کوئی مدد دے یا نہ دے  
میں کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانا، جب تک اس کی تکمیل کا تہیہ نہیں کر لیتا۔ مجھے اپنی  
ذات پر کامل اعتماد ہے اور میں کر کے دکھا دوں گا۔ اس طرح دیر تو لگے گی مگر کام نہیں  
رکے گا“ (۹-ب)

بچن ترقی اردو گریبا بنے اردو کی جان تھی تو اردوان کا ایمان بھی، نہ وہ انجمن کی مخالفت برداشت  
کر سکتے تھے اور نہ اردو کی۔ وہ اردو سے محبت ضرور کرتے تھے لیکن کسی دوسری زبان کو حقارت کی نظر سے نہیں  
دیکھتے تھے البتہ جو شخص یا گروہ اردو کو اس کے جائز حق اور منصب سے محروم کرنے کی کوشش کرتا یا اردو دشمنی  
کا مظاہرہ کرتا وہ اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور اس سلسلے میں وہ کسی بڑی سے بڑی  
شخصیت کی پروا نہیں کرتے تھے وہ اگر گاندھی جی کو ہدف تنقید بناتے ہیں یا سر مرزا اسماعیل کی مذمت  
کرتے ہیں تو صرف اس بنا پر کہ وہ انھیں اردو کا مخالف تصور کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے  
۳۰ جولائی ۱۹۲۶ء کے مکتوب بنام حکیم محمد امام امامی میں اپنے اس اصول زندگی کی وضاحت یوں کی ہے:  
”تم نے کہا کیا جو اس ظالم سے مذاقات کی۔ تعجب ہے اس نے تمہیں دھتکار کر نکال  
کیوں نہیں دیا مجھے اس کی ذات سے کوئی مخالفت یا عداوت نہیں لیکن اردو کو جو کوئی بھی  
نقصان پہنچائے گا میں اس کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی میرا ہڑے سے بڑا بزرگ بھی  
یہ حرکت کرتا تو میں اس سے بھی بڑا بڑا کرتا“

بابائے اردو میدان سیاست کے مرد بھی نہ تھے لیکن چوں کہ اردو زبان کی تحریک قومی تحریک ہے  
اور اس نے ہر صغیر کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے اس لئے ان کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ سیاسی ہتھیار

کو پہنوا بنانے اور ان کے اثر و رسوخ کو اردو کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کریں لیکن مجموعی طور پر ان کی توقعات پوری نہ ہو سکیں اس بنا پر وہ نہ سیاست دانوں سے مایوس تھے بلکہ امیر کبیر وگوں کے رویے سے بھی نالاں تھے۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے ہمدردان اردو کی جو اسکیم جاری کی اس میں انھوں نے لکھ پتی میٹھوں کی بجائے غریبوں مگر مخلص مہبان اردو سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے حکیم امامی کے نام ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کے مکتوب میں اس اسکیم کو غریبوں کا نام دیا اور لکھا ”اُمرا اور لکھ پتی ہمارے کام سے مطلق ہمدردی نہیں رکھتے۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ تعلیم و تہذیب زبان و ادب کن پڑیوں کا نام ہے۔ اس لئے ہم نے غریبوں متوسطہ احوال شریفوں کے آگے دست سول پھیلا دیا ہے“

مولوی عبدالحق کے بعض معاصرین خیال کرتے تھے کہ وہ کسی کے ساتھ مل کر کام کرنے کا میلان نہیں رکھتے لیکن جب غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کا مزاج رکھنے والا شخص ایسی زبردست تحریک جاری نہیں رکھ سکتا جیسی بابائے اردو نے جاری رکھی اور پھر انھوں نے انجمن ترقی اردو کی تنظیم کا ڈھانچہ کھڑا کرنے اور اس کی متنوع سرگرمیوں کو منظم کرنے میں جو کامیابی حاصل کی وہ بھی مذکورہ غلط فہمی کی تردید کے لیے کافی ہے۔ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جہاں اردو زبان کے وار اور شیدا اور انجمن سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے وہاں فروغ اردو کی تحریک کے سلسلے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ان کا شعار تھا اور اپنے ساتھیوں کے انتخاب کے معاملے میں بھی وہ خاصی احتیاط سے کام لیتے تھے انھیں ہمیشہ قابل اور اہل لوگوں کی جستجو رہتی تھی وہ ان سے مشورہ کرتے اور انجمن کے معاملات میں ان سے تعارف اور امداد حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی نصیر الدین ہاشمی، حکیم محمد امام امامی، مولوی سخاوت مرزا اور افضل العلماء عبدالحق کے نام خطوط سے بابائے اردو کے مزاج کی اس خصوصیت کا بخوبی پتا چلتا ہے، یہی نہیں بلکہ ان خطوط سے جو انھوں نے نوجوانوں کے نام لکھے ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہونہار ادیبوں کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔

بابائے اردو نے اردو زبان اور علم و ادب کی جو خدمت کی ہے اس کی مثال ناممکن ہے اور وہ اس پہلو سے اپنی ذات پر جس قدر فخر کریں کم ہے اس کے باوجود ان کی طبیعت میں خاص قسم کی وضع داری تھی جو انھیں احساں عظمت کے باوجود انھیں آپے سے باہر نہیں ہونے دیتی۔ ان کے خطوط سے ان کے طبعی عجز و انکسار کا دلکش اظہار ہوتا ہے جس سے ان کی عظمت شان کا نقش دل پر اور گہرا ہو جاتا ہے، انھوں نے اپنی مساعی سے اردو

کی شان بڑھائی اور اس کی ترقی و شاعت میں جدوجہد کا حق ادا کر دیا اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو کسی اعزاز و کرام کا مستحق نہیں سمجھتے۔ حکیم امامی کو لکھتے ہیں:

”آپ نے جن الفاظ میں میرا ذکر فرمایا ہے اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن جن محسنین اردو کے ساتھ آپ نے میرا نام لیا ہے میں ان کی خاکِ پاکی برابر بھی نہیں ہوں۔ میرا کیا منہ ہے کہ ان کی برابری کا دعویٰ کروں۔ میں تو اردو کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور بس یہ محض آپ کی قدر دانی ہے کہ مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔“ (۱۳۱ الف)

مولوی عبدالحق نام کی بجائے کام پر یقین رکھتے تھے۔ چند ہم عصر ہیں جنہوں نے جن لوگوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے وہی ہیں جو نمود و نمائش کی بجائے اپنے فرض کی دائمیگی کو ترجیح دیتے تھے۔ مولوی عبدالحق نمود و نمائش سے ہمیشہ گریزاں رہے اس لیے جب کہیں سے کسی جلسہ کی صدارت وغیرہ کی دعوت آتی تو انکار کر دیتے اس کی ایک وجہ تو منصب کی سنگینی کا احساس تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اس کو بھی ایک قسم کی نمائش خیال کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی تو علمی مجالس میں شرکت سے احتراز کرتے تھے اور جمعی و عجز و انکسار کی بنا پر اپنی علمی بے باکی کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام ۲۳ مارچ ۱۹۲۵ء کے خط میں، ادارہ معارف اسلامیہ کے اجلاس میں شرکت سے معذرت کے طور پر رقم طراز ہیں۔

”پروفیسر اقبال صاحب کا مطبوعہ خط اپنے ادارے (نام بھول گیا) معارف، معارف اسلامیہ کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ میں حیران ہوں کیا جواب دوں۔ وہ علماء کی مجلس ہے۔ میں کس حیثیت سے اس میں شریک ہو سکتا ہوں۔ باہر والوں کو میری نسبت بہت بڑا مغالطہ ہے وہ سمجھتے ہیں کہ میں صاحب علم و فضل ہوں۔ اب اگر میں معذرت کرتا ہوں تو وہ انکسار کی خیال کریں گے اور شرکت کا وعدہ کروں تو یہ بے عمل ہو گا وہاں جاؤں تو کیا لے کر جاؤں۔ عوام کا جلسہ ہوتا تو میں بھی خوشی خوشی جا پہنچتا۔ لیکن علماء کی مجلس میں جاتے ہوئے مجھے شرم معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے جواب نہیں دیا۔“ (۱۳۱ ب)

بابائے اردو کے خطوط کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے انداز تحریر کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ چوں کہ ان کا تعلق سید احمد خاں اور مولانا الطاف حسین حالی کے دبستان سے ہے اس لیے وہ سادگی اور سلاست کے شیدائی ہیں اور کہتے ہیں:

”بناوٹ کا باتیں بہت جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں صرف سادگی ایسا حسن ہے جسے کسی حال



میں اور کسی زمانے میں زوال نہیں بشرطے کہ اس میں صداقت ہو اور ہم میں سے کون ہے جس

کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟ (۱۴)

ہاشمی فرید آبادی نے ان کی تحریر کی سادگی اور صفائی کے پیش نظر ان کے خطوط کے مجموعے کو ردوئے مصطفیٰ کا نام دیا ہے لیکن خیال رہے کہ ان کے ہاں ان خوبیوں کے علاوہ شگفتگی اور دل چسپی کا عنصر بھی موجود ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ بابائے اردو نے سادگی اور بے تکلفی کا سبق تو سید احمد خان اور جانی سے لیا شگفتگی اور دل چسپی کی خصوصیت مرزا غالب کے خطوط سے اخذ کی لیکن بابائے اردو کے اسلوب میں روزمرہ دفتری اور انتظامی مسائل کو عام فہم اور مختصر عبارت میں بیان کر دینے کی جو صلاحیت ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اس میں وہ قاری کی ذہنی سطح کے مطابق سب و لہجہ اختیار کرتے ہیں کمال مہارت رکھتے ہیں۔ انتظامی مسائل کے حوالے سے سینکڑوں خطوط بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن مکتوب الیہ کی ذہنی سطح کے مطابق تحریر کی ایک عمدہ مثال ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے بیٹے مسلم کے نام ان کا خط ہے۔ میرے علم کی حد تک کسی بزرگ عالم و فاضل شخص کی طرف سے کسی بچے کو اتنا سادہ اور خوب صورت خط شاید ہی لکھا گیا ہو۔

پیارے مسلم تمہارا انتہا منا خط پہنچا جسے پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ماشار اللہ اب تو تم خوب پڑھتے لکھتے لگے ہو۔ ہاں تو بتاؤ کہ تم مسلم جنگ کب سے ہو گئے؟ اگر تم شوق سے پڑھو گے تو بڑے ہو کر سچ سچ کے مسلم جنگ ہو جاؤ گے۔

میں نے تمہارا یہ خط رکھ لیا ہے۔ جب تم بڑے ہو کر اپنے ابا جان کی طرح لائق اور ڈاکٹر ہو جاؤ گے تو اس وقت تمہیں یہ خط دکھاؤں گا اور پوچھوں گا کہ بھی مسلم دیکھنا یہ خط کس کا ہے۔ پہچانتے ہو یا نہیں یہ نوب مسلم جنگ بہادر کون ہیں؟

اب یہ لکھو کہ تم کو نئی کتاب پڑھ رہے ہو۔ جواب آنے پر تمہیں کہانیوں کی کتاب بھیجوں گا۔

اچھا ایک بات تو بتاؤ، ڈھاکہ اچھا یا حیدر آباد دیکھو کسی سے پوچھ کر نہ لکھا جو تمہارے دل کی بات ہو وہ

لکھنا۔ (۱۵)

تمہارا چاہنے والا

عبداللہ حق

مرزا غالب کو نہ صرف اس اعتبار سے اویسیت حاصل ہے کہ انہوں نے خطوط میں سادہ اور سلیس



زبان استعمال کی بلکہ خطوط میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے شوخی و طرافت سے کام لینے میں کبھی انھیں سبقت حاصل ہے۔ شوخی و طرافت ان کے مزاج کی نمایاں خصوصیت تھی۔ بات صحبات پیدا کرنے، اور معمولی واقعات کو دل چسپ بنانے میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا بعض اوقات اپنی پریشانیوں کا نقشہ اس انداز سے کھینچتے ہیں کہ پڑھنے ہی ہنسی آجاتی ہے۔ موبوئی عبدالحق کے خطوط پر عام طور پر سنجیدگی غالب رہتی ہے یوں بھی لگی اور اور تنظیمی معاملات میں ہنسی مذاق کی گنجائش محلِ نظر ہے لیکن جن لوگوں سے ان کی بے تکلفی ہے ان کے نام خطوط میں ان کی طبعی طرافت نے خوب دل چسپی پیدا کی ہے۔ افضل العلما موبوئی محمد عبدالحق، مولانا غلام رسول ہبر، نصر اللہ خان اور ڈاکٹر د. وڈر ہمبر کے نام خطوط میں و فرتی جس، در نقباض کی بجائے کسی باشا کی کشادگی، و فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں متعدد خطوط خوب صورت ادب پاروں کی صورت اختیار کر گئے ہیں مثلاً کے طور پر افضل العلما عبدالحق کے نام ان کا خط مرقوم ۲۷ مارچ ۱۹۴۵ء درج کیا جاتا ہے:

”حیدر آباد میں فقیروں کی ایک چھوٹی سی ٹولی ہے۔ دن بھر وہ مانگنے کھانے کا کام کرتے ہیں۔ و رات کو ایک ٹکیے میں جمع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے منصوبے پیش کرتے ہیں اور ان پر گرم کھٹیں ہوتی ہیں پھر رات گئے سو جاتے ہیں۔ صبح، کھ کر وہی کاسہ گدائی اور شہر کا گشت۔ غرض یہ سلسلہ براہِ جاری رہتا ہے۔

آپ جب دہلی تشریف لائے تھے تو شب کو ہمارا بھی یہی حال ہوتا تھا۔ آپ نے کیسے کیسے منصوبے پیش کیے اور کیسے کیسے سبزاغ دکھائے۔ اردو مرکز۔ جائزہ زبان اردو۔ اردو کانفرنس۔ اردو یونیورسٹی اور نہ معلوم کیا کیا۔ مدراس پہنچتے ہی یہ خیالات نیا نسیا ہو گئے اور حسبِ معمول چپ سا دھلی۔ اب تک انتظار کرتا ہوں کہ شاید کوئی کرم نامہ آئے اور خوشخبری سنائے مگر ادھر سے سوا خاموشی کے کوئی آواز نہ آئی۔ آخر خود ہی ہار کر یہ عریضہ لکھنا پڑا۔ یہ بھی جانتا ہوں جو اس کا جواب ملے گا۔ خاموشی۔ خاموشی۔ خاموشی۔ جب بار بار خط پہنچیں گے تو برس چھ ماہی میں ایک عنایت نامہ محبت شمامہ آئے گا جس میں مصروفیت، علالت، غیر متوقع واقعات وغیرہ کے غذر اس حسن و خوبی سے سپردِ قلم فرمائیں گے کہ سب شکایتیں بھول جاؤں گا اور الٹا غدر خواہ ہونا پڑے گا۔

لیکن ایک بات یاد رکھیے اور یہ میں اپنے تجربے کی اور آپ کی بھلائی کی بات کہتا ہوں۔ میرے ایک بڑے عزیز دوست تھے جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں جب مجھے یاد آتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یاد آتا

بچہ کاش میں ان کی فلاں فرمائش ان کی زندگی میں پوری کریتا رہی جو میں آسانی سے کر سکتا تھا، تو وہ کتنے خوش ہوتے اگر یہ کام ان کے ہوتے میرے ہاتھوں ہو جاتا تو انہیں کتنی مسرت ہوتی۔ اس وقت میرے دل کو جو رنج اور کوفت ہوتی ہے۔ وہ میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میرے بعد اس قسم کے خیالات آپ کو نہ ستائیں۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ آدمی پانی کا بلبلہ ہے۔ آج موئے کل دوسرا دن۔ اس لیے میرے تجربے سے فائدہ اٹھائیے اور آئندہ کی روحانی تکلیف سے بچئیے۔ یہ میرا ہی تجربہ نہیں سب کو ہوا ہے اور آپ کو بھی ہوا ہوگا۔ لیکن انسان فطرًا کابل واقع ہوا ہے۔ وقت پر غفلت کرتا ہے اور بعد میں پچھتا تا ہے۔ اس کے بعد بھی آپ اپنے پرانے عزم کی پھر ایک بار تجدید نہ کریں۔ اور بسم اللہ کر کے ان منصوبوں کو جو اب تک شیخ چلی کے خیالات رہے ہیں، عمل میں نہ لائیں تو میرا قصور نہیں، میں نے نگاہ کر دیا ہے اب آپ جانے اور آپ کا کام۔ زندہ رہا تو دیکھ لوں گا۔ خوش ہوں گا آپ کو دعائیں دوں گا۔ ورنہ جہاں اور حسرتیں ساتھ جائیں گی یہ بھی ساتھ بیٹھا جاؤں گا۔

بہن کی اردو کانفرنس دیکھنے کے قابل تھی۔ بہنوں نے اردو سے جو شغف ظاہر کیا اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اب یہاں انجمن کی عمارت ضرور بنالوں گا۔

حضرت عبدالوہاب بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت فیض و رحمت میں دست بستہ آداب۔ جب ان کا خیال آتا ہے تو ان کا ہنس مکھ چہرہ سامنے آجاتا ہے جب ملتے ہیں تو کس محبت اور خلوص اور گرم جوشی سے اور اس کے بعد وہی فراموشی اور خاموشی۔ یہ جب تک و انمباری میں تھے تو بخاری تھے۔ اب گورنمنٹ ٹیڈن کالج میں آگئے تو ان کا درجہ بڑھ گیا اور بخاری سے بخارا ہو گئے ہیں۔ پہلے میں رتود کی کامصرع بہ تصرف ان کے حق میں پڑھا کرتا تھا۔ اب صحیح طور سے پڑھتا ہوں۔

اے بخارا شاد باش و شاد زی

احمد سیٹھ دلی آئے ہوئے ہیں اس وقت میرے پاس بیٹھے ہیں۔ آپ کی خیر و عافیت معلوم ہوئی آپ کی سنت انہوں نے بھی ادا کی یعنی پرسوں شب ہمارے ہو گئے۔ اسی ڈاکٹر نے ان کا علاج کیا جس نے آپ کا کیا تھا۔ اب اچھے ہیں مجھ سے سلسلہ کو دعا۔

بھولا ہوانیا زمند عبدالحق (۱۶)

عبدالحق کے نام عبدالحق کے اس خط اور دیگر کئی خطوں کا سب وہیہ مکتوب نگار و مکتوب لیب کے انتہائی دوستانہ مراسم کا غماز ہے۔ ان خطوں میں اگر انجمن کے کسی انتظامی معاملے، دور سے یا کانفرنس وغیرہ کا ذکر ہے تو وہ بھی بڑے پُر ہفت انداز میں ہے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام خطوں میں بھی کہیں کہیں مزاحیہ جملے ملتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے اس طرح کے خطوں کے مطالعہ سے ذہن علامہ اقبال کے ان خطوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو انھوں نے مولانا شیخ غلام قادر گری کو لکھے تھے اور جو مکاتیب اقبال بنام گرامی کے نام سے اقبال انسٹیٹیوٹ کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۹۹ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال کی علمی تحریروں کی طرح ان کے خطوں میں بھی سنجیدگی غالب رہتی ہے لیکن گرامی کے خطوں میں یہ سنجیدگی فکر کی جو رانی اور خیال کی برہنگی کے ہمراہ ملتی ہے۔ بعض اوقات تو اقبال نشر میں شاعری شروع کر دیتے ہیں اور ایسے مقامات بھی کم نہیں جہاں اقبال گرامی کے ادب و احترام کا لحاظ رکھنے کے باوجود ان کے ساتھ لطیف ٹوک جھونک کرتے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان خطوں میں اقبال کا ذوق شعری بھی قاری کی توجہ جذب کرتا ہے وہ کبھی تو گرامی کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہیں اور کبھی اپنے اشعار پر ان سے مشورہ طلب کرتے ہیں جب کہ بابائے اردو کے خطوں میں نقل اشعار کی کوشش کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک ایسے دور میں جب ابوالکلام آزاد کی پر تکلف نشر کی دھوم مچی ہو مولوی عبدالحق کی نشر کی یہ سادگی شاید بعض لوگوں کو بے ہفت نظر آتے لیکن یہی وہ نشر ہے جس کی بدولت اردو زبان عوامی ضرورتوں کی کیفیات ثابت ہوئی، اس کی صلاحیتوں پر لوگوں کے اعتماد میں اضافہ ہوا اور اس کی عمل ترویج کی راہ ہموار ہوئی۔

(۱) مکتوبات بابائے اردو بنام حکیم محمد امام امامی، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، نومبر ۱۹۹۲ء

ص ۱۲۱۔

(۲) کتاب مذکور، ص ۱۴۱-۱۵۰

(۳) کتاب مذکور، ص ۱۷۷-۱۷۸

(۴) خط کے عکس کے لیے دیکھئے مکاتیب عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی، کراچی، اردو اکیڈمی

سندھ ۱۹۹۳ء

(۵) مکتوبات بابائے اردو، ص ۵۰

(۶) کتاب مذکور، ص ۱۳۱

(۷) مکتوبات بابائے اردو، ص ۱۲۵-۱۲۶

(۸) کتاب مذکور، ص ۱۲۶

(۹الف) مکاتیب عبدالحق، ص: ۳۴۵ (۹ب) خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرتبہ ڈاکٹر

عبادت بریلوی، مدپور یونیورسٹی آرٹس کالج دسمبر ۱۹۷۶ء ص ۱۲۱

(۱۰) کتاب مذکور، ص: ۴۰۹-۴۲۲ یہ مفصل خط بابائے اردو نے ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد دکن سے لکھا تھا۔

(۱۱) مکتوبات بابائے اردو، ص: ۸۳

(۱۲) کتاب مذکور، ص: ۱۲۴

(۱۳الف) کتاب مذکور، ص: ۳۳ (۱۳ب) خطوط عبدالحق، ص: ۵۳

(۱۴) کتاب مذکور، ص: ۱۴

(۱۵) مکاتیب عبدالحق، حاشیہ ص: ۴۶

(۱۶) ماہنامہ قومی زبان کراچی، اگست ۱۹۷۰ء، ص: ۵۴-۵۵



# مولوی عبدالحق کی تحقیق

”مرحوم دہلی کالج“

بابائے اردو مولوی عبدالحق نہ صرف شہدائے اردو تھے بلکہ ایک بڑے محقق بھی تھے۔ جہاں انھوں نے ایک طرف اردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی وہیں دوسری طرف نایاب کتابوں کی بازیافت کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ ان کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں سے کسے انکار ہو سکتا ہے اردو کے کلاسیکی ادب کی کئی اہم کتابوں کا تعارف پہلی بار بابائے اردو کے قلم سے ہوا۔ انھوں نے ان کتابوں پر محققانہ مقدمے لکھ کر اردو تحقیق کا معیار بلند کر دیا۔ خاص طور پر دکنی ادب کے کئی گراں قدر مخطوطات کو عوام کے سامنے لائے۔ انھیں احساس تھا کہ اگر زمانے کی گردان خزانوں پر حاوی ہو گئی تو اردو کی عظمت کا اعتراف مشکل ہو جائے گا، نوجوان نسل اردو کو قابل اعتناء نہ سمجھے گی۔ اور زبان کی ترقی کا کام رک جائے گا۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان ادبی ذخیروں کو ماضی کا حصہ بنانے کی سازشیں جاری ہیں۔ لہذا انھوں نے ان کی بازیافت کے لیے کمر کس لیا۔ اس سلسلے میں ایک اہم تعلیمی ادارے کی بازیافت کا کام بھی مولوی صاحب کے دست مبارک سے ہوا۔ جسے عوام الناس آہستہ آہستہ بھولتے جا رہے تھے۔ یہ تھا دہلی کا قدیم دہلی کالج جسے مولوی صاحب نے بجا طور پر ”مرحوم دہلی کالج“ لکھا ہے۔ مولوی صاحب دیکھ رہے تھے کہ اس کالج کی ادبی و تعلیمی خدمات سے چشم پوشی کی جا رہی ہے اور دہلی زبان میں سائنس کی تعلیم دینے والا یہ ادارہ جس کے زیر انتظام بڑی تعداد میں مختلف علوم کی کتابیں ترجمہ و تالیف ہوئیں آہستہ آہستہ گمنامی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ لہذا انھوں نے انجمن کے سربراہی رسالے ”اردو“ میں ۱۹۳۳ء میں مضامین کا ایک سلسلہ جاری کیا اور اس ادارے کی اہمیت پر پہلی بار قلم اٹھایا۔ یہ سلسلہ پورے سال چلتا رہا۔ مگر کتابی شکل میں۔

”مرحوم دہلی کالج“ ۱۹۴۵ء میں سامنے آ سکا اور اس طرح اس ادارے کی ادبی و تاریخی اہمیت سامنے آئی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ”مرحوم دہلی کالج“ کتابی شکل میں آنے سے پہلے ہی قسط وار رسالہ ”اردو“ کے صفحات کی زینت بن چکا تھا۔ اس لیے ”مرحوم دہلی کالج“ نام کی کتاب کو مستقل کتاب نہیں کہا جاسکتا بلکہ

یہ چار مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان چاروں مضامین کا موضوع ایک ہے اور یہ مضامین کالج کی ادبی و تعلیمی خدمات کے ساتھ اس کے اساتذہ و طلباء کا مکمل خاکہ پیش کرتے ہیں۔ ان چاروں مضامین کو اسی ترتیب کے ساتھ جوں کا توں کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے جیسے یہ رسالہ "اردو" میں چھپے تھے پہلا مضمون بعنوان "مرحوم دہلی کالج از ایڈیٹر" جنوری ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شائع ہوا جس میں دہلی کالج کی ابتدا اس کا پس منظر۔ تاریخ و ترقی کا سلسلہ اور تعلیمی حالات کی سلسلہ وار نشاندہی کی گئی ہے۔ دوسرا مضمون ایڈیٹر کے شمارے میں ذی عنوان نصاب تعلیم کے ساتھ شائع ہوا جس میں بابائے اردو نے مختلف نصابات کا بھڑور حوالہ پیش کیا۔ اس میں مشرقی علوم کے نصاب کے ساتھ ساتھ انگریزی نصاب کی تفصیل بھی پیش کی گئی۔ مضمون کی تیسری قسط جولائی ۱۹۳۳ء کے شمارے میں "تالیف و ترجمہ۔ دہلی وزیکلر سوسائٹی" کے عنوان سے شائع ہوئی اور اپنے موضوع کی افادیت و اہمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ معتبر ثابت ہوئی۔ اس میں سوسائٹی کے قیام۔ اس کے اغراض و مقاصد، اصول ترجمہ و تالیف کے ساتھ دہلی کالج کے زیر اہتمام لکھی گئی کتابوں کی ایک فہرست بھی شامل کی گئی۔ چوتھی اور آخری قسط اکتوبر کے شمارے میں بعنوان کالج کے اساتذہ، شائع ہوئی۔ جس میں کالج کے پرنسپلوں کے علاوہ نامور طالب علموں کے مختصر حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اور آخر میں خاتمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

بھی چار مضامین یکجا کر کے پہلی بار ۱۹۴۵ء میں انجمن نے "مرحوم دہلی کالج" کے عنوان سے شائع کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ ان مضامین کو لکھتے وقت مولوی صاحب کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ مستقبل میں اسے کتابی شکل دی جائے گی اور چوں کہ ہر مضمون اپنے عنوان کے مطابق مکمل ہے لہذا جب یہ مضامین کتاب میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے، شائع کر دیئے گئے تو کتاب کے تسلسل اور روانی پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ خاص طور پر اشخاص کے ذکر کا ایک بے ترتیب سلسلہ پوری کتاب میں پھیلا ہوا ہے جو پہلی نظر میں گراں گزرتا ہے۔ مثلاً ماسٹر راجندر کا ذکر کتاب میں بار بار آیا ہے۔ ہمارے پیش نظر کتاب کے صفحہ ۵۸ پر جو انجمن سے شائع کیا گیا تیسرا ایڈیشن ہے ماسٹر راجندر اور چمن لال کے عیانی ہو جانے کا واقعہ درج ہے جب کہ صفحہ ۷۲۔ ۷۱ پر ۱۸۵۷ء میں آئی ان مصیبتوں کا ذکر ہے جن میں ماسٹر صاحب گھر گئے تھے۔ ص ۱۶۳ پر راجندر بحیثیت مدرس اور صفحہ ۱۶۹ تا ۱۷۴ پر ان کے تفصیلی حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک ہی شخص کے حالات

زندگی اور ادبی کارنامے کتاب کے صفحات پر کس بے ترتیبی سے بکھر گئے ہیں۔ پرنسپل ٹیلر، ڈاکٹر اسپرنگ، بٹر ولس اور دیگر اشخاص کے سلسلے میں بھی یہی بے ربطی دکھائی دیتی ہے مگر یہ کوئی نمایاں نہیں ہے۔ ہوا یوں ہے کہ پہلی قسط میں کالج کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور جہاں جہاں تاریخی اعتبار سے جن اشخاص کا ذکر ضروری تھا، وہاں ان کا ذکر معمولی تعارف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں کالج کے پرنسپلوں کے حوالے بکثرت میں تیسری قسط میں ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سلسلے میں جن اشخاص کا تذکرہ ضروری ہے، ان کا بیان کیا گیا ہے اور چوتھے و پندرہویں مضمون میں تو سائنہ و طلباء کو ہی موضوع بنایا گیا ہے اور یہاں بالکل نئے سرے سے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ تمام اشخاص کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مضامین اس نیت سے نہیں لکھے گئے تھے کہ انھیں کتابی شکل دی جائے۔ لہذا جہاں جس کا تذکرہ ضروری ہوا وہاں کر دیا گیا، اور اسی لیے ہمارا اصرار ہے کہ اسے بنیادی طور پر چار مضامین کا ایک مجموعہ سمجھا جائے، جن کا موضوع ایک ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے موضوع کا تعلق ہے، اس کی اہمیت سے بے انکار ہو سکتا ہے۔ دہلی کالج کی تاریخ اور اس کے ادبی کارناموں پر تحریر کی گئی پہلی باضابطہ کتاب خود ایک کارنامہ کہی جاسکتی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے اس دورے کی اہمیت کو نہ صرف محسوس کر لیا تھا بلکہ عوام کے سامنے اس کے کارنامے پیش کرنے کی ہمت بھی کرنی تھی یہ کام اس لیے بھی مشکل تھا کہ اس سے پہلے اس ادارے پر کوئی مضمون یا کتاب شائع نہ ہوئی تھی۔ البتہ چند حوالے ضرور ملتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صدیق رحمن قدوائی کا یہ بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

”ایک عرصے بعد سی۔ ایف۔ اینڈریوز (C.F. Andrews) نے اپنی مشہور کتاب (Zakaulah of Delhi) کے ذریعے دہلی کالج۔ اس سے وابستہ شخصیات اور اس تہذیبی رجحان کو جو کہ حکومت برطانیہ کی حکمت عملی کی بدولت بھڑایا جا چکا تھا پھر ملک کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس طرف تھوڑی بہت توجہ دی جانے لگی۔ ہرسی ول اسپر (Percival Spear) نے اپنی کتاب (Twilight of Mughals) میں مغلوں



کے دورِ زوال میں جنم لینے والے اس امید افزا پہلو پر روشنی ڈالی: (ماسٹر رام چندر

از صدیق الرحمن قدوالی۔ ص ۵۵)

مگر یہ مضامین انگریزی میں تھے اور اردو کے عام قارئین کے سامنے نہیں آتے تھے لہذا ”مرحوم دہلی کالج“ کی اولیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحقیقی دروس بنی اور ذہنی استدلال کو بروئے کار لا کر کھوئے ہوئے ذخیروں سے اس گہرناپاب کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی۔ دہلی کالج سے متعلق تمام معلومات، کالج کی رپورٹوں، اس دور کے اخبارات، سرکاری دستاویزات اور دوسری یادداشتوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ انھوں نے ان کرم خوردہ حوالوں سے طویل محنت و کاوش کے بعد دہلی کالج سے متعلق تمام تر معلومات الفاضلین کے ذریعے عوام الناس تک پہنچانے کا ایک بڑا ہی صبر طلب اور قدرے دشوار کارنامہ انجام دیا اور اس طرح اپنی تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف اہل زبان سے کروا لیا۔ اس کتاب کے ذریعے مولوی صاحب کی حیثیت ایک صحیح اور فاضل محقق کے روپ میں ابھری، پوری کتاب میں انھوں نے تحقیقی تقاضوں کو مد نظر رکھا اور اس طرح ایک مثال پیش کی۔ گیان چند جین نے محقق اور نقاد کے فرق کو بیان کرتے ہوئے محقق کی خوبیوں کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

”عوام فرسودہ ساز و برگ کو پھینک کر اس کی جگہ نئی چمک حاصل کرنا چاہتے ہیں محقق کرم خوردہ اگلے سڑے سرمایے سے اپنا دامن بھرتا ہے اور اپنی پرانی گدڑی سے نعل نکال کر پیش کرتا ہے۔ نقاد نئے نئے رجحانات نو بہ نو تجربوں کو پرکھ کر ان کے قابل قبول حصوں کو ادب میں سکھرا کر اچھے وقت قرار دیتا ہے۔ محقق طاق نیاں سے اتار کر چند مرقعے چند حسین بت ہماری نظروں کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ نقاد ہمیں تاج محل اور منگل گارڈن کی دل فریبیوں پر لوٹنا سکھاتا ہے تو محقق اندھیرے غاروں کی بھول بھلیاں میں جا کر ہمارے واسطے اجنتا کے شاہکار دریافت کرتا ہے“

(تحریریں۔ گیان چند جین)

مولوی صاحب کا نامہ دراصل گدڑیوں سے نعل ڈھونڈ نکالنے کے مترادف ہے۔ طاق نیاں سے چند حسین مرقعے، چند حسین بت ہمارے سامنے لانے میں انھوں نے جو کاوشیں کی ہوں گی، ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ تحقیقی کارنامہ دراصل آج کل کے سہل انگار، نام نہاد نقادوں و محققوں کے لیے جائے عبرت بھی ہے۔



اس کتاب کے تمام حوالوں کو معتبر کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ حوالے براہ راست کالج کی رپورٹوں، کالج کے اساتذہ کی یادداشتوں اور سرکاری دستاویزات پر مشتمل ہیں۔ اس موضوع پر کام کرنے والے، بعد کے اشخاص نے مولوی صاحب کے حوالوں سے ہی کام لیا اور اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم و اصل مآخذ کی حیثیت اختیار کر گئی۔

۳۔ مذکورہ کتاب کا پہلا مضمون ”مرحوم دہلی کالج“ کے عنوان سے ہی شروع ہوتا ہے۔ اس میں مولوی صاحب نے کالج کی ابتدا اور تاریخ مع حوالوں کے سلسلہ وار درج کیا ہے۔ لفظ ”مرحوم“ کی توجیہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ۱۔

”مرحوم میں اس لیے کہتا ہوں کہ وہ ایک عزیز چیز تھی جسے زمانے کے اتفاقات اور حالات نے عین ایسے وقت میں زندہ دفن کر دیا جب کہ اس کے عروج کا وقت آیا تھا اور جب کہ وہ گزشتہ تجربوں سے سبق حاصل کر کے ملک کے لیے تبلیغ علوم و فن کا بہت بڑا مرکز بن سکتا تھا“ (مرحوم دہلی کالج ص ۱۱)

بزرگ نقاد مانگ رام صاحب نے اپنی کتاب ”قدیم دہلی کالج“ کا سلسلہ موجودہ ”ذاکر حسین کالج“ سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور یہ صحیح ہے کہ دہلی کالج کی موجودہ شکل ذاکر حسین کالج ہی ہے مگر مولوی صاحب کا اشارہ جس کالج کی طرف تھا وہ ۱۸۷۷ء میں ختم کر دیا گیا تھا۔ دراصل دہلی کالج کے زیرِ اہتمام دیسی زبان میں دی جانے والی تعلیم اور خاص طور پر ترجمہ و تالیف کا سلسلہ ہی دہلی کالج کی ادبی حیثیت کو واضح کرتا ہے بعد میں کالج ضرور قائم رہا۔ مگر اس کی وہ ادبی اہمیت ختم ہو گئی۔ لہذا مولوی صاحب کا دہلی کالج کو۔ ”مرحوم دہلی کالج“ کہنا مناسب ہے۔

دہلی کالج کی ابتدا جیسا کہ مولوی صاحب نے لکھا ۱۸۲۵ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی جس کا مقصد ہندوستان میں نوکری کی فرض سے آئے نگرہ یروں کو دیسی زبان کی تعلیم دینا تھا۔ اس کے برعکس دہلی کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد مختلف تھے۔ انگریزوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستانیوں کو مغربی علوم و سائنس کی تعلیم دی جائے تاکہ ان کے علمی استعداد میں اضافہ ہو، ان کے گند ذہن کشادہ ہو جائیں اور وہ مغربی علم و ادب سے متاثر ہوں تاکہ

حکومت کا استحکام برقرار رہے۔ اس غرض سے انھوں نے دہلی میں جو ہندوستان کا دارالخلافہ تھی۔ ایک کالج کی بنیاد رکھی جو دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا اور جس میں دیسی زبان (جو بلاشبہ اردو تھی) میں سائنس و دیگر علوم کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ مولوی عبدالحق اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

”اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز تھا کہ ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم تو اردو میں ہوتی ہی تھی لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے۔ ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو ہی تھا۔“ (مرحوم دہلی کالج ص ۲۵-۲۴)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کالج کی ادبی و علمی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون میں اس کی اہمیت پر اظہار خیال کیلئے لکھتے ہیں:

”دہلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اردو کے ذریعے مغربی سائنس، ہیئت، ریاضی، نیچرل سائنس، فلاسفی وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کیا اور شمالی ہند میں سب سے پہلے مشرق و مغرب کے صحت مند عناصر کو سمونے کی کوشش کی۔ اس طرح اس کالج نے نہ صرف اردو میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں بلکہ ایک نیا فضا اور ایک نئی کشش جہت پیدا کی۔“ (ماسٹر رام چندر از قدوائی۔ مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی ص ۲۴)

مگر ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا گیا۔ کلاسوں کو مشرقی و انگریزی شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ کالج کی سالانہ رپورٹوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی شعبہ کسی بھی طرح انگریزی شعبہ سے کم تر نہیں تھا۔ طلباء کی حوصلہ افزائی کے لیے وظائف کا کام کیا گیا تھا۔ ”مرحوم دہلی کالج“ کے مطالعہ سے نتائج اوروں میں کالج کی پروگریس اور اس کی تعلیمی رفتار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کالج کے خلاف چلنے والی بہوں کا ذکر بھی ان صفحات میں آگیا ہے۔ خاص طور پر انگریزی تعلیم کے خلاف عوام کے غم و غصہ کا تذکرہ بھی مولوی صادق نے کیا ہے۔ ماسٹر رام چندر اور چین لال کے عیسائی ہو جانے سے پھیلنے والے عوامی انتشار کا بیان بھی اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہیں:

”س سال ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے کالج کو کسی قدر دھچکا لگا۔ وہ یہ تھا کہ ماسٹر رام چندر جو اردو میں سائنس پڑھاتے تھے اور لالہ چین لال فرسٹ اسٹنڈنٹ سرجن دونوں کے دونوں عیسائی ہو گئے اس سے دہلی کی مخلوق بہت

بگڑی اور شہر میں غلغلہ پیدا ہوا۔ (مرحوم دہلی کالج ص ۵۸)

۱۸۵۷ء کے غدر میں باغیوں کے ذریعے کالج اس کے انگریز پرنسپل اور ماسٹر رام چند پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں اور جس طرح پرنسپل ٹیلر کی موت واقع ہوئی اس کا بیان بھی تاریخی تسلسل کے ساتھ صحیح جگہ پر کیا گیا ہے۔ ٹیلر کا میگزین سے صحیح سلامت نکل آنا۔ بڈھے خانہ ماں کی کوٹھری میں پناہ لینا پھر مولوی محمد باقر کے مکان پر پہنچنا۔ اگلے دن ہندوستانی لباس پہنا کر محمد باقر کا انہیں گھر سے روانہ کرنا اور پھر ان کا قتل، اس کی یادداشت میں مولوی محمد باقر کا سولی پر لٹکا دیا جانا، ماسٹر۔ م چندر کا بلوایوں کے چنگل سے بچ نکلنا، تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ غدر کے بعد کالج کا دوبارہ جاری ہونا اور ۱۸۷۷ء تک اس کا چلتے رہنا۔ ان سب کا بیان کتاب کے پہلے مضمون (قسط) میں تفصیل سے سلسلہ وار کر دیا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ "نصاب تعلیم" کے عنوان سے مختلف ادوار میں پڑھائے جانے والے نصاب کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ جس کے مطابق کے بعد کالج کے تعلیمی معیار کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مشرقی و انگریزی شعبوں کے نصابات کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور سنسکرت کے نصابات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی طلباء کو ملنے والے وظائف، مختلف کورسوں میں طلباء کی تعداد اور سنین کے مطابق اس تعداد میں کمی و اضافے کی تفصیل نقشوں کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ تحقیقی نقطہ نگاہ سے یہ حصہ زیادہ محنت طلب و دشوار کن ہے۔ خود مولوی صاحب نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

تعدادِ متعلمین کی ایک فہرست دینے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

"ان اعداد کے ہم پہنچانے میں بڑی دقت پیش آئی۔ سرکاری مطبوعہ رپورٹوں میں اعداد کے متعلق بہت بے احتیاطی کی گئی ہے اور اس لیے مختلف کاغذات کو دیکھ کر ان کی تصحیح کی گئی ہے۔ (مرحوم دہلی کالج ص ۱۲۰)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مواد حاصل کرنے کے لیے مولوی صاحب نے کس جانفشانی سے کام لیا ہے۔ مضمون کے آخری حصے میں کالج کے انتظامیہ کی تفصیل اور عمارت کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے کالج کی ابتدا مدرسہ غازی الدین کی تاریخی عمارت میں ہوئی بعد میں یہ کالج کتب خانہ دارانکوہ (نزد کشمیری گیٹ) منتقل ہو گیا۔ مگر چند سال بعد ہی اپنی پرانی عمارت

میں لوٹ آیا ۔

”مرحوم دہلی کالج“ کا تیسرا حصہ اپنے موضوع کی اہمیت کے سبب خاص درجہ رکھتا ہے۔ یہ حصہ کالج کے زیر اہتمام شایع ہوئی والی کتابوں کی فہرست کے ساتھ ساتھ دہلی ورنیکلر سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی تفصیل بھی پیش کرتا ہے۔ کالج کی ادبی خدمات کا صحیح اعتراف یہی حصہ کرتا ہے اور ادبی تاریخ کے تسلسل میں فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی کالج کا درجہ متعین کرتا ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام جن کتب کے ترجمے کیے گئے ان کا تعلق فقہ، کہانیوں سے تنہا جب کہ کالج کی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام سائنس، ریاضی، جغرافیہ و تاریخ کی اہم کتابوں کے ترجمے عمل میں آئے اور اس طرح اردو میں سائنسی ادب کی روایت قائم ہوئی، مولوی صاحب نے ایجوکیشن کمیٹی، اسکول بک سوسائٹی اور ورنیکلر سوسائٹی کے قیام، ان کے طرز عمل اور ان کے بتدریج ارتقاء سے مفصل بحث کی ہے۔ کالج کے دو انگریز سرپرستوں مشر بتروس اور ڈاکٹر اسپرنگر کی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اساتذہ و طلباء کے ذوق و شوق کی ایک تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے:

”جب کالج کی جدید تنظیم ہوئی اور مغربی علوم کی تعلیم بھی لازم قرار پائی تو پھر وہی پرانی شکل پیش آئی کہ کتابیں کہاں سے آئیں اور بغیر کتابوں کے تعلیم کا ہونا معلوم۔ قدیم السنہ یعنی عربی سنسکرت یا فارسی میں جدید علوم اور تاریخ پر کوئی کتاب نہ تھی اور مولوی اور پینڈت ان مضامین کی تعلیم دے نہیں سکتے تھے۔ لہذا ایک صورت یہ نکالی گئی کہ تین طالب علم جن میں رام چندر پیش پیش تھے۔ کالج کے کام کے بعد فلسفہ و ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اردو میں ترجمہ کرتے اور پرنسپل بتروس ترجمہ پڑھ کر اصلاح دیتے۔ اس طرح جب کتاب ختم ہو جاتی تو چھاپنے کو دے دی جاتی اور نیچے کا جماعتوں کے نصاب تعلیم میں شریک کر دی جاتی“ (مرحوم دہلی کالج ص ۱۸۲)

ورنیکلر سوسائٹی نے ترجمے کے چند قواعد بھی وضع کیے جن کا تفصیلی ذکر کتاب میں سلسلہ وار پیش کیا ہے۔ ان قواعد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے پونے دو سو سال پہلے بھی ان مشاہیر و ادباء نے ترجمے کے فن کی باریکیوں کو کتنی نزدیکی سے دیکھا تھا اور کتنے جامع اصول مرتب کیے تھے۔ خاص کر انگریزی الفاظ کے ترجمے کا جو طریقہ بیان کیا گیا آج تک مستعمل ہے۔ اس کے ساتھ اصطلاح سازی کے عمل



میں جس سائنسی نقطہ نگاہ سے کام لیا گیا ہے اس سے اس سوسائٹی کی اہمیت اور سنجیدگی کا اندازہ ہوتا ہے اس حصہ کے آخر میں سوسائٹی کے زیر اہتمام ترجمہ و تالیف ہوئی کتابوں کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے ایک سو اٹھائیس کتابوں کے صرف نام ہی گنوائے گئے ہیں ان ناموں کے مطالعے سے ہی دہلی کالج کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جاسکتا ہے۔ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی کتابوں کے ترجمے بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ صرف نام گنوائے پر ہی اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ ہر کتاب پر ایک تفصیلی نوٹ بھی شامل کر دیا جاتا۔ اس طرح اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو جاتی۔ بعد کے کام کرنے والوں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا اور بہتر طور پر انہیں پیش کیا۔ دہلی کالج میگزین کے "قدیم دہلی کالج نمبر" صدیق الرحمن قدوائی اور سیدہ جعفر کی "م چند سر پر تخلیقات کے ساتھ ساتھ چند پتی۔ ایچ ڈی کے مقالوں میں ان کتب پر کافی تفصیل سے بحث کی گئی ہے (ڈاکٹر شکیل خاں کی کتاب "اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب" اور ڈاکٹر انتظار مرزا کی غیر مطبوعہ تھیسس "دہلی کالج کی ادبی خدمات") بزرگ نقاد مالک رام کی تصنیف "قدیم دہلی کالج" میں چند کتابوں پر مختصر اضافوں کے ساتھ بابائے اردو کی فہرست دہرا دی گئی ہے اور بس۔

کتاب کا آخری حصہ یعنی رسالہ "اردو" میں چھپی آخری قسط بعنوان "کالج کے اساتذہ" اپنے آپ میں نہایت اہم اور ناگزیر حصہ کتاب ہے۔ کتاب کے ان آخری صفحات میں جگہ جگہ موبوی صاحب کے اسلوب بیان کے دلکش نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ دہلی کالج میں پڑھانے والے مدرسوں، پرنسپلوں کے مفصل بیان میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ سوانحی خاکے پیش کر دیے ہیں بلکہ ان اشخاص کی ادبی خدمات کا صحیح جائزہ بھی پیش کیا ہے جنہیں زبان و ادب سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا اور جو ہندوستانیوں کی تعلیمی کم فہمی کو دور کرنے کی بے لوث خدمت میں لگے ہوئے تھے پرنسپل ٹیلر۔ ڈاکٹر سپرنگر اور مسٹر بتروس کے دیوں میں دہلی کالج کی محبت موجزن تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ کالج کے لیے وقف کر دیا۔ موبوی صاحب نے ان پرنسپلوں کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے :

"مسٹر بتروس، ڈاکٹر سپرنگر اور مسٹر ٹیلر، یہ کالج کے تین پرنسپل ایسے گزرے ہیں کہ انہوں نے کالج کی سچی خدمت کی اور اس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی طلباء اور اساتذہ پر ان کا بڑا اثر تھا اور شہر والے بھی ان کا ادب کرتے تھے۔ خاص کر

مشرقی شعبے کی اصلاح اور اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر بتروس اور ڈاکٹر اسپرنگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت قابل قدر ہے" (مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۰)

مندرجہ بالا اقتباس ان تینوں پرنسپلوں کی خدمات کا صحیح اعتراف کرتا ہے۔ پرنسپل ٹیلر نے ابتدا سے ہی دہلی کالج کی تحریک کو اپنی قیادت سے نوازا اور اسی کی خاطر ۱۸۵۷ء میں قربانی دی۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اردو تراجم کے سلسلے میں جو محنت و کوشش کی وہ روز روشن کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ ان کا شہر یوں پر بھی بہت اثر رہا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید نے "آثار الصنادید" ڈاکٹر صاحب کی تحریک پر ہی لکھی تھی۔ مسٹر بتروس نے ورنیکلر سوسائٹی کو جو نئی آب و تاب دی وہ بھی سامنے آچکی ہے۔ مولوی صادق جانتے تھے کہ اس ادارے اور اس کی قیادت کرنے والوں کو لوگ بھولتے جاتے رہے ہیں۔ انھوں نے بروقت اس مٹتی ہوئی روایت کو زندہ کیا اور اپنے زور قلم سے ان اشخاص کی ادبی خدمات ہمارے سامنے پیش کیں۔ کالج کے ہندوستانی اساتذہ میں مولوی ملوک علی، مولوی امام بخش صہبائی، مولوی سبحان بخش، ماسٹر رام چندر، مولوی ذکار اللہ کے علاوہ کئی دیگر اساتذہ کا مختصر تذکرہ بھی کیا ہے یہاں پر ان کی ایک اور ادبی صلاحیت نے ان کے اسلوب کو شکستگی بخشی ہے اور وہ ہے ان کی فن خاکہ نگاری پر مکمل دسترس۔ مولوی امام بخش صہبائی کے حالات لکھتے ہوئے۔ یہ ضمنی واقعہ بھی تحریر کر جاتے ہیں جس کا تعلق امام بخش صہبائی کی کالج میں تقرری سے ہے:

"ان کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے ۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامس لفٹنٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لیے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کیا کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم موسیٰ خاں تیسرے امام بخش صہبائی، لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بجلایہ روگ کیوں پالنے لگے تھے۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ موسیٰ خاں نے یہ شرط کی کہ تین سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد میں پچاس ہو گئے۔ (مرحوم دہلی

کالج کے نامور طلباء کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں کالج نے شخصیت سازی کی بڑی اہم خدمت انجام دی اور اردو زبان و ادب کو ایسے میرے تراش کر دیئے جن کی آب و تاب آج بھی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ یہ اتنی بڑی خدمت ہے کہ دوسری تمام تفصیلات اس کے سامنے بیچ ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، ڈاکٹر ضیاء الدین، ماسٹر رام چندر۔ موتی لال دہلوی، میر ناصر علی، مولوی کریم الدین کے نام لے بیٹا ہی کافی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے کالج کی خدمات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”یہ ادارہ نامعلوم طور پر ایک اہم فکری تحریک کا مرکز بن گیا اور اس نے قدامت کے اندھیروں کو دور کرنے اور جدیدیت کا اجالا پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لحاظ سے دلی کالج محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں تھا بلکہ اسے یہ حیثیت بھی حاصل تھی کہ اس نے متوسط طبقے کے بعض چیدہ افراد کی شخصیت سازی کی اور ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ کو قریب تر لانے میں مدد دی۔ (اردو ادب کی تحریکیں، نور سدید ص ۳۰۶)

دہلی کالج اردو ادب کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر استادہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی داستانوی نشر اور سرسید تحریک کی عقلیت پسندی و سائنسی نقطہ نگاہ کے بیچ دہلی کالج ایک منطقی کڑی ثابت ہوتا ہے۔ اگر دہلی کالج کے زیر اثر دہلی میں ایک بڑے گروپ کی تربیت نہ ہوتی تو غالباً سرسید تحریک اتنی فعال اور جامع ثابت نہ ہوتی جتنی وہ ہوئی۔ بلاشبہ دہلی کالج نے کردار و شخصیت سازی کا، ایک اہم فریقہ ادا کیا اور سرسید تحریک کے لیے راہ ہموار کی۔ مولوی عبدالحق نے کالج کے ہونہار طلباء کی جو فہرست پیش کی ہے ان میں سے ایک (ڈپٹی نذیر احمد) کا یہ مشہور قول کالج کی تربیت پر دلالت کرتا ہے۔ مولوی صاحب نے بھی اسے نقل کیا ہے، اور پھر بار بار نقل کیا جاتا رہا ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

”اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو کیا بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا، تنگ نظر ہوتا، متعصب اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متحسب، بر خود غلط“

بابائے اردو نے کتاب کے خاتمے میں دہلی کالج کی تاریخی اہمیت پر زور دیا اور اردو کے بارے میں پھیلی ہوئی اس غلط فہمی کا اثر اٹھایا کہ اردو زبان میں اتنی سکت نہیں کہ وہ مغربی علوم اور جدید سائنس کے بار کی متحمل ہو سکے۔ انھوں نے اراکین کالج اور طلباء کی ان تلک محنت اور روشن خیالی و بالغ نظری کی طرف توجہ مبذول



کرائی اور مکھا کہ:

”کالج نہیں رہا مگر اس کا کام زندہ ہے، اردو زبان و ادب کے سنوارنے اور بنانے میں جو خدمت اس نے کی ہے وہ کبھی قرا محوش نہیں ہو سکتی ہم اپنی زبان کو اس وقت جو ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں اس پر بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کا بہت کچھ اثر ہے۔ یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے دی جاتی ایک صدی پہلے اس کا خیال آنا اور اس پر عمل کرنا غیر معمولی ہمت کا کام تھا۔ (مرحوم دہلی کالج ص ۱۸۱)

غرض مولوی عبدالحق نے ”مرحوم دہلی کالج“ تصنیف کر کے۔ اس ادارے کو زندہ جاوید بنادیا انھوں نے پہلی بار اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور قلم اٹھایا۔

جہاں تک مولوی صاحب کے اسلوب بیان کا تعلق ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ وہ دبستان سرسید کے اسلوب نگارش سے متاثر ہیں اور ان پر سب سے زیادہ اثر مولانا حالی اور سرسید کی تحریروں کا ہے ان کا صاف ستھرا اور نکھرا ہوا انداز بیان ان کی تمام تحریروں میں نمایاں ہے۔ وہ فصیح طرزِ ادا پر زور دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں حقیقی سادگی و دھجھاپن پایا جاتا ہے۔ سید عبداللہ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ”مولوی عبدالحق کا اسلوب اردو نشر کا سہل متنع ہے“ جہاں تک تحقیقی زبان کا تعلق ہے۔ رشید حسن خان نے تحقیق کی زبان کے متعلق لکھا ہے کہ:

”تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرائش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہیے اور صفائی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے“ (رشید حسن خاں۔ ادبی تحقیق روایت اور تجزیہ)

مولوی عبدالحق کی محققانہ زبان میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اس کے لیے ضروری ہیں۔ بات کو منطقی روپ میں کہنے کا سلیقہ، مدلل انداز بیان، سادہ و سلیس الفاظ و محاورات کا استعمال، نپا تلا اندازِ تحریر، بے جا تفصیلات سے احتراز اور مختصر اندازِ گفتگو ”مرحوم دہلی کالج“ کی اسلوبیاتی خوبیاں ہیں۔ سید عبداللہ نے مولوی صاحب کی تحقیقی زبان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”خطبوں اور تقریروں کے علاوہ عبدالحق کی تحریر کا ایک رنگ وہ بھی ہے جو ان کے تحقیقی مقدمات میں ہے۔ یہ مسلم ہے کہ تحقیقی طرزِ تحریر زیادہ چٹا تلا، زیادہ معین اور قطعی اور زیادہ متین



ہوتا ہے۔ اس میں حوالے کی پابندی لازمی ہے۔ اس میں انشا پر داری کے مواقع نسبتاً کم ہوتے ہیں اور سائنسی قسم کا رکھ رکھاؤ ناگزیر ہے۔ اس لیے عام محققانہ مضامین شگفتہ نہیں ہوتے مگر عبدالحق کی تحقیقی تحریریں وہ ہیں بھی دل چسپی کی کمی نہیں۔ عام مضامین کی طرح ان میں بھی عام فہم روزمرہ، سلیس زبان، واقعات کی منطقی ترتیب ہر جگہ عبارت کو قوی اور دل چسپ بناتی ہے۔ محققانہ مضامین بھی حشو و زوائد سے بالکل پاک ہوتے ہیں مگر با آں ہمہ اختصار ان سے تشفی ہوتی ہے۔ ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور طبیعت کو بھی انبساط حاصل ہوتا ہے عبدالحق کی تحریر نمود و نمائش کی ہر کوشش سے آزاد ہے اور تحقیق میں تو وہ صرف ضروری بات کہنے کے قائل ہیں اور بیان کو غیر ضروری تفصیل سے بوجھل نہیں ہونے دیتے چنانچہ واقعاتی تفصیلات بھی کہانی کا مزہ دیتی ہیں: ”مولوی عبدالحق کا اسلوب تحریر۔۔۔ سید عبداللہ۔ مشہور اردو سہ ماہی کراچی۔ بابائے اردو نمبر ۱۹۷۲ء“

مختصر کہا جاسکتا ہے کہ بابائے اردو کا یہ تحقیقی کارنامہ، اپنے موضوع کی انفرادیت اور اولیت کے ساتھ ساتھ ان کی محققانہ صلاحیتوں کا نماز ہے۔

## مولوی عبدالحق بحیثیت شاعر

اس عنوان سے ممکن ہے کہ بعض لوگ چونکے ہوں اس لیے کہ مولوی عبدالحق، شاعر کی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ بھی شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک باشعور اور برجستہ گو شاعر تھے۔ ان کا باشعور ہونا ہی، آگے چل کر ان کے دوسرے ادبی کارناموں یعنی، علمی درجے کی تحقیق و تنقید کا وسیلہ بنا اور وہ ایک بلند پایہ محقق و نقاد بن کر سامنے آئے۔ ان کی برجستہ گوئی بھی ضائع نہیں گئی بلکہ گاہے کسی خاص علمی و ادبی واقعے کی منظوم تاریخی گواہ بن گئی ہے اور گاہے موقع محل کے اعتبار سے محفل میں شریک، صاحبانِ ذوق کے لیے سامانِ نشاط فراہم کر گئی ہے۔

مانا کہ مولوی عبدالحق اردو کے نامور شہ نگار ہیں اور شہ نگاری ہی ان کی شناخت ہے، پھر بھی ان کا شاعر ہونا چند عجیب کی بات نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہاں ادبی روایات کا سلسلہ شریعت سے نہیں شاعری سے شروع ہوا ہے، عربی، فارسی، اردو اور ہندی، سب کا تقریباً ایک ہی حال ہے۔ شاعری کی روایت کے مستحکم ہونے کے بہت بعد، تحقیق و تنقید کا آغاز ہوا ہے۔ چنانچہ ہمارے سارے بزرگ ادیبوں کی ذہنی تربیت شاعرانہ ماحول میں ہوئی ہے۔ مولوی عبدالحق سے قبل کے ممتاز شہ نگار، ڈپٹی منیر احمد، محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور مولانا شبلی چاروں شاعر تھے۔ خود سرسید احمد خاں، جنہیں جدید شہ نگار کا بانی کہا جاتا ہے اور شہر میں جن کی خدمات غیر معمولی ہیں، وہ بھی شاعر تھے اور آہی تخلص کرتے تھے۔

سرسید اور حالی کے بعد کے شہ نگار یعنی مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، محمد دین تاشیر، آل احمد سرور، مولانا حامد حسن قادری، احتشام حسین وغیرہ سب کے سب طبعاً شاعر تھے یا ہیں۔ فراق نے تو خیر تنقید اور شاعری دونوں میں بڑا نام پایا لیکن دوسروں نے بھی

شاعری کا قاب ذکر ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے اور ان میں سے بعض کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ دور کیوں جائیے مولوی عبدالحق سیمنا میں آج جو لوگ بطور نقاد و محقق شریک ہیں ان میں بھی کئی بہت اچھے شاعر ہیں۔ ایسے میں مولوی عبدالحق کا شمار ہونا چند دل جبرت کی بات نہیں بلکہ ان کے تحقیقی و تنقیدی کارناموں سے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان کا شعری ذوق ہی انہیں ادب کی طرف لایا ہے، اور اسی کی بدولت ان کی نثر میں وہ دل کشی پیدا ہوتی ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے، یوں بھی ان کے مقدمات، تبصروں اور تنقید کی مضامین پر نگاہ دوڑائیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی طبیعت کو شاعری سے خاص مناسبت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی اردو شعر کے تذکروں کو نہ ہتھ لگاتے اور نہ اردو شعرا کے انتخاب کلام کی طرف توجہ کرتے۔ دوسرے مضامین کو چھوڑیے، صرف انتخاب کلام میر ہی کے مقدمے کو لے لیجیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ شاعری کی تفہیم و تنقید کا کیسا اچھا شعور و سلیقہ رکھتے تھے۔

مولوی عبدالحق کو میں نے اوپر باشعور شاعر کہا ہے اور وہ اس وجہ سے کہا ہے کہ وہ دوستوں کی طرح بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکے نہیں بلکہ اپنی خوش ذوقی اور شاعرانہ صلاحیت کے باوجود بہت جلد محسوس کر لیا کہ وہ شاعر سے اچھے نثر نگار ہو سکتے ہیں اور شاید یہ بھی محسوس کر لیا کہ کسی زبان یا قوم کو صرف شاعری کی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی تنقیدی اور علمی و ادبی نثر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی نظر سے غالباً مولانا روم کا یہ قول بھی گزر چکا تھا کہ

شعر گفتن گرچہ در سفتن بود

شعر فہیدن بہ از گفتن بود

یعنی شعر کہنا یقیناً، موتی پرونے کا کام ہے اور بہت مشکل کام ہے لیکن شعر کی تفہیم و تنقید کا کام کچھ اس سے بھی زیادہ بہتر کام ہے۔ اسی لیے انھوں نے دانستہ شاعری کو،وروں کے لیے چھوڑ دیا اور اپنے معنوی استاد سرسید احمد کی طرح خود کو نثر کے لیے وقف کر دیا۔

مولوی عبدالحق کا شعری سرمایہ کسی ایک جگہ مجتمع نہیں بلکہ ان کی تحریروں خصوصاً خطابات اور مکتوبات میں جا بجا بکھرا ہوا ہے اور ہماری نگاہوں سے عموماً و جہل ہے۔ ان سب کا کھوج لگانا، انہیں یکجا کرنا اور جانچنا پر کھنا کسی بسندہ پایہ محقق کا کام ہے، میں تو، دب کا ایک ادنیٰ قاری ہوں، اور مجھے چوراکہ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کی ذات و صفات سے خاص دلچسپی ہے، اس لیے اس

محفل میں اُن کی شاعری کے ذکر کو ضروری جانا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے تلاش بسیار یا تحقیق واقعی کا بھی کوئی موقع نہیں ملا اور نہ شاید میں اس کا اہل ہوں نتیجہ جو چیزیں آسانی سے ہاتھ لگ سکیں، بطور تبرک پیش کیا جا رہا ہے۔

اب سے کم و بیش پچیس ساں پہلے کی بات ہے۔ میں کراچی میں تھا۔ اور انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ عام میں "عظمتِ رفتہ" نامی کتاب دیکھ رہا تھا۔ ضیاء الدین احمد برنی کی کتاب تھی اور اس میں ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں چھوٹے چھوٹے خاکے تھے۔ مجھے کتاب اچھی لگی، اپنی پسند کے سارے ادیبوں کے خاکے پڑھ ڈالے اور لطف اندوز ہوا کتاب کے آخر میں مولوی عبدالحق کا خاکہ تھا۔ اس میں ان کے چند شعر نظر آئے۔ میں نے کچھ شعر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیے۔ اشعار یہ تھے۔

نہ فکرِ معیشت نہ عشقِ بتاں ہے مگر جاگتے رات کُشتی ہے ساری

تو نے حقی کو خوب گانٹھا ہے اپنے مطلب کو خوب چھانٹا ہے  
دیکھنے میں وہ پھول ہے لیکن درحقیقت وہ سید کا کانٹا ہے

عبدالحق سیمنار کے لیے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے کو قلم اٹھایا تو یہی اشعار میرے لیے موضوع بن گئے۔ کراچی میں دو تین دن قیام کس کے میں نے مولوی صاحب کی شاعری کے بارے میں مزید مواد فراہم کرنا چاہا۔ پہلے تو مایوسی ہوئی پھر کسی نے بتایا کہ اردو کے ممتاز محقق و ناقد ڈاکٹر سید معین الرحمن کی ایک نئی کتاب "تحقیق اور تلاش" کے نام سے بازار میں آئی ہے اس میں ایک مضمون مولوی عبدالحق کی شاعری کے بارے میں بھی ہے۔ اردو بازار گیا کتاب آسانی سے مل گئی اور میرے لیے لطفِ مسرت کا باعث ہوئی۔ لندن میں رہ کر بھی ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب کے نام اور کام سے متعارف تو تھا لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ مولوی عبدالحق کی زندگی، شخصیت اور شہر نگاری کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اور اُن پر درجنوں مقالے ہی نہیں تین چار کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی شاعری کے سلسلے کا مضمون بھی میرا حاصل اور محققانہ تھا۔ نتیجہ اس سے آگے کھوج کرنے کی ہمت نہ ہوئی میں نے اسی کو اپنے مضمون کا اصل ماخذ بنالیا اور اس جگہ اسی کی مدد سے مولوی عبدالحق کے جستہ جستہ اشعار، آپ کی صفت اندوزی کے لیے پیش

۱۔ یہ قطعہ شانِ الحق کے بارے میں ہے۔ اس کے سلسلے میں برنی صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ محض مذاقاً

لکھا گیا ہے۔ اس سے کسی کی تنقیص مراد نہ تھی۔ مولوی صاحب حقی کو بہت چاہتے تھے۔ ص ۵۰۸



کر رہا ہوں۔

ادب و ضیاء میں برنی کی کتاب کے حوالے سے یہ شعر نقل کیا گیا ہے  
 نہ عشق بتاں ہے، نہ فکر معیشت مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری  
 یہ شعر، ابیلا نہیں ہے بلکہ مولوی صاحب کی مکمل غزل سے تعلق رکھتا ہے اس غزل میں  
 گیارہ اشعار ہیں، صرف چند شعر دیکھیے۔

ہوں آلودہ عصیاں سے گو سر بسر ہیں      مٹا دے گی، دھبے مری خاکساری  
 نشیب و فراز اس جہاں کی ہیں ریتیں      نہ کراے مری جان، دں پنا بھاری  
 سزا چاہتا ہوں کہ پنہاں ہے جس میں      تری بردباری، مری بے قراری  
 کہاں تک یہ مخلوق پرستی رہے گی      کہاں تک یہ آہ و بیکاناہ زاری  
 تم سے زہر میں پاپ ہے اور زہن ہے      ہے اس سے بہتر مری مے گساری  
 خزاں کا محل اٹھ چکا ہے چمن سے      خبر لائی اڑتی سی باد بہاری

ایک اور شعر میری توجہ کا مرکز بنا۔ یہ فرد کی صورت میں ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ مولوی عبدالحق  
 میں غزل گوئی کا بہت اچھا ملکہ موجود تھا۔ اگر وہ چاہتے تو بہت اچھی غزلیں کہہ سکتے تھے لیکن، بخون  
 نے دانستہ شعر گوئی سے گریز کیا اور افادیت کے نقطہ نظر سے نثر نگاری ہی کو مستقلاً اپنائے رکھا  
 شعریہ ہے۔

دلوں پہ قبضہ، خیالات پر حکومت ہے      اب اس سے بڑھ کے تمہیں اختیار کیا ہوگا  
 مولوی صاحب برجستہ گوئی اور تاریخ گوئی میں بھی طاق تھے۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے، اس کی بھی کئی  
 مثالیں اپنے مضمون میں درج کی ہیں لیکن میں انہیں اس جگہ نقل کر کے مضمون کو بے جا طویل نہیں دینا  
 چاہتا۔ بتانا صرف یہ تھا کہ مولوی عبدالحق شاعر بھی تھے اور شعر گوئی کی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے لیکن  
 ان کی خود شناسی نے انہیں شاعر بننے سے روکا اور سرسید احمد خاں کی راہ پر چلنے پر ہمیںز کیا۔ واقعہ  
 یہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے جس جلدید اور علمی نثر کی بنیاد ڈالی تھی مولوی عبدالحق نے اُس پر یک تاج  
 محل تعمیر کر دیا اور آج ہم مولوی عبدالحق سینما کے حوالے سے اس تاج محل کو حیرت سے دیکھ  
 رہے ہیں۔

# **URDU ADAB**

## **QUARTERLY**

**EDITOR**

**Khaliq Anjum**

**ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)**  
**NEW DELHI**

سہ ماہی

# آرڈو اب



# اردو ادب (سہ ماہی)



# اردو ادب

(راج بہادر گوڑ نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

۱۹۹۳ء شماره (۲) تا (۴)

سالانہ قیمت \_\_\_\_\_ ۴۵ روپے  
فی شماره \_\_\_\_\_ ۲۰ روپے  
موجودہ شماره \_\_\_\_\_ ۵۰ روپے

پرنٹرز پبلشر ایم حبیب خاں، اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، نے ٹمرا فیسٹ پرنٹرس  
نئی دہلی میں پھپھو اکرا اردو گھراؤ زایو نیوئی دہلی سے شائع کیا۔

# فہرست

۷	خلیق انجم	حرف آغاز
۱۲	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	بات میں سادہ و آئادہ معانی میں دقیق
۱۸	سید حامد	راج بہادر گوڑ ایک منفرد شخصیت
۲۳	پروفیسر آل احمد سرور	تاثرات
۲۵	کمال الدین احمد	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پیکر جہد مسلسل
۲۹	امولک رام	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۵۰ ویں سالگرہ
۳۱	ڈاکٹر عبد المعنی	ادبی تناظر پر ایک نظر
۳۷	مجتبیٰ حسین	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۵۰ ویں سالگرہ
۴۶	پروفیسر قمر میں	ڈاکٹر گوڑ کی تنقیدی نگارشات
۵۴	رفعت سرور	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ادبی تناظر کے آئینے میں
۶۶	جوادر نقوی	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ مجاہد آزادی — محب اردو
۷۵	ایم. حبیب خاں	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اردو کی ایک فعال شخصیت
۸۲	منوہر راج سکینہ	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۵۰ ویں سالگرہ
۹۳	شمیم جہاں	ہمارے گوڑ صاحب
۹۹	ڈاکٹر صادق ذکی	فوائین ادب اور راج بہادر گوڑ
۱۰۸	قمر جمالی	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ — ایک شخصیت منشور مثلثی
۱۲۲	—	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی تحریریں
۱۳۳	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	خطبہ ہمدات بہادر ریاستی اردو کانفرنس مظفر پور
۱۳۴	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	خطوط گوڑ

## حرفِ آغاز

ہندوستان میں تہذیب نے دلی میں جنم لیا اور صدیوں تک اسی سرزمین پر پروان چڑھی۔ جب دلی اجڑ گئی تو اودھ، حیدرآباد، رام پور اور دوسری ریاستیں اس تہذیب کی اہم مرکز بن گئیں، جہاں یہ تہذیب اپنے عروج کو پہنچی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ حیدرآباد کے رہنے والے اور ہندوستانی تہذیب کے بہترین نمائندے ہیں۔ ان کی ذات ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کا حسین مرقع ہے۔

گوڑ صاحب ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۶ء تک راجیہ سبھا کے رکن رہے تھے۔ اس زمانے میں وہ اکثر راجیہ سبھا میں اردو کے بارے میں بیان دیتے تھے، جسے اردو اخبار بہت نمایاں کر کے شائع کرتے تھے۔ ان ہی بیانات کے توسط سے گوڑ صاحب سے میرا غائبانہ تعارف ہوا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں جب انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا تو معلوم ہوا کہ گوڑ صاحب بھی انجمن کے رکن ہیں۔ اردو کے اس مجاہد سے میری پہلی ملاقات انجمن کی مجلس عاملہ کے اس جلسے میں ہوئی جو میرے تقرر کے کچھ دن بعد منعقد ہوا تھا۔ ملاقات کے ابتدائی چند لمحوں ہی میں گوڑ صاحب نے مجھے متاثر کر لیا۔ سانوں رنگ، کھڑی ناک، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں مخصوص چمک اور ذہانت، گھنے بکھڑی بال، سفید کم کاسے زیادہ، صحت مند جسم، مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ، بات بات میں مذاق اور دوسروں سے جھپٹ چھاڑ۔ اس وقت گوڑ صاحب سفید شیر والی اور سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اس واقعے کو بیس سال ہو چکے ہیں۔ اب بھی گوڑ صاحب کی شخصیت ویسی ہی ہے۔ صرف بال زیادہ سفید ہو گئے ہیں اور جسم کچھ ڈبلا ہو گیا ہے۔



گوڑ صاحب نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم حیدر آباد میں حاصل کی۔ اُن کا شمار ہمیشہ بہت اچھے طلبہ میں ہوتا تھا۔ انھوں نے ہر امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ لیکن ڈاکٹری کا پیشہ اختیار نہیں کر سکے۔ کیوں کہ ہوش سنبھالتے ہی وہ مختلف سماجی اور سیاسی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ اعلیٰ تعلیم کے ابتدائی دنوں ہی میں وہ آریا سماجی تحریک کے سرگرم کارکن ہو گئے۔ اُس کے کچھ دن بعد یعنی ۱۹۴۰ء میں کھادی تحریک سے اتنے متاثر ہوئے کہ گھر گھر جا کر کھدر تحریک کا پرچار کرتے اور لوگوں کو کھدر کے فوائد سے آگاہ کرتے۔ خود بھی کھدر پہنتے۔ آج بھی اُن کا پسندیدہ لباس کھدر کے کپڑے ہی ہیں۔ ۱۹۴۰ء ہی کا زمانہ ہے جب عالم خونہ میری، جواد رضوی، مرزا حیدر حسن، مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر گوڑ نے کامریڈ ز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور کچھ ہی دن بعد گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر بن گئے، حیدر آباد میں اس پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی، لیکن ڈاکٹر گوڑ اور اُن کے ساتھیوں کی سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۴۶ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ جیل میں گوڑ صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی تو انھیں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں گوڑ صاحب ہسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ روپوش تھے۔ لیکن ۲۴ اپریل ۱۹۵۰ء میں ضلع منگنڈہ کی ریور کنڈہ پہاڑیوں سے گرفتار کر لیے گئے۔ حکومت نے انھیں نظر بند کر دیا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہو گئے۔ حکومت کو مجبوراً انھیں رہا کرنا پڑا۔ ۱۹۵۷ء میں اُن کی راجیہ سبھا کی رکنیت کی مدت ختم ہو گئی۔ لیکن دوبارہ منتخب ہو گئے۔ اور ۱۹۶۲ء تک راجیہ سبھا کے رکن رہے۔ گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین کے اہم لیڈر ہیں۔ اگرچہ اب اُن کی عمر پچھتر سال سے زائد ہے۔ لیکن اُن کی سیاسی سرگرمیاں بدستور قائم ہیں، اور اب بھی وہ ٹریڈ یونین کے سلسلے میں پورے ہندوستان میں گھومتے ہیں۔

گوڑ صاحب اردو تحریک کے ایک اہم رہنما ہیں۔ اردو سے متعلق دستور ہند

کی دفعت سے جتنی واقفیت گور صاحب کو ہے، میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں کسی اور کو نہیں ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ مختلف ریاستوں نے گجراٹ کمیٹی کی سفارشات کو کہاں تک عملی روپ دیا ہے۔ مرکزی حکومت نے ۱۵ فروری ۱۹۹۰ء کو سردار جعفری کمیٹی کی صدارت میں پندرہ سولہ اداہوں، دانشوروں اور پروفیسروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ جیسا کہ ہوتا ہے کہ کمیٹی میں صرف دو تین لوگ تھے جو مسائل سے واقف تھے۔ ان دو تین لوگوں میں گور صاحب بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ لکھنے اور سفارشات مرتب کرنے میں گور صاحب کا بہت اہم رول رہا ہے۔

گور صاحب گزشتہ چوالیس سال سے انجمن ترقی اردو (ہند) کے حیاتی رکن ہیں۔ اور دو دفعہ انجمن کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ آج کل انجمن کی مجلس عاملہ کے اہم رکن اور جنوبی ہند کی شاخوں کے چیرمین ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو (آندھرا پردیش) کے بھی نائب صدر ہیں۔ ان دونوں انجمنوں کے ذریعے وہ ہمیشہ اردو کی بقا، ترقی اور فروغ کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ گور صاحب سیاست داں ہیں۔ لیکن انھوں نے زبان کے مسائل کو ہمیشہ سیاست سے دور رکھا۔ بس ایک واقعہ سن لیجیے۔ مالک رام مرحوم، انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر تھے۔ جب اُن کی مدت صدارت ختم ہوئی تو انجمن کے کچھ اراکین نے گور صاحب کو صدارت کا امیدوار بنانا چاہا۔ لیکن گور صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں سیاسی آدمی ہوں۔ میرے صدر ہونے سے انجمن کو نقصان پہنچے گا۔

گور صاحب کی شخصیت کے جس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اُن کی وسیع قلبی، کشادہ دلی اور سیکولر رویہ ہے۔ اُن کا سیکولر ازم مصالحتوں کا پیدا کردہ نہیں ہے، بلکہ یہ اُن کا عقیدہ ہے۔ وہ بنیادی طور پر انسان دوست ہیں۔ وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن اُن کا مذہب انسانیت ہے۔ مجھے پچھلے پندرہ برسوں سے اُن سے قربت حاصل ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کمزور سے کمزور لمحے یا مذاق میں بھی کسی مذہبی فرقے کے خلاف ایک لفظ بھی کہا ہو۔

گوڑ صاحب اردو کے ممتاز ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ ان سیاسی سرگرمیوں میں گزرا ہے، جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس کے باوجود ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ تحفے میں ملنے والی کتابوں پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ کتابیں خرید کر پڑھنے کے عادی ہیں۔ جب بھی دہلی آتے ہیں تو اردو گھر ضرور آتے ہیں۔ اردو گھر آتے ہیں تو بک ڈپو جاتے ہیں اور کتابیں ضرور خریدتے ہیں۔ وہ ہمیشہ انجمن کی بک ڈپو کے مقروض رہتے ہیں۔ جب بھی اردو گھر آتے ہیں پچھلا حساب چکاتے ہیں۔ اور قرض پر نئی کتابیں لیتے ہیں۔ حیدر آباد میں ان کی ذاتی لائبریری میں انگریزی اور اردو کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ٹریڈ یونین کے لیڈر کی حیثیت سے گوڑ صاحب کو بہت سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ سفر ان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ کیوں کہ سفر کے دوران انھیں مطالعے کا شوق پورا کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

گوڑ صاحب کی پہلی تحریر ۱۹۳۴ء میں روزنامہ ”پیام“ حیدر آباد میں شائع ہوئی تھی، وہ عرصے سے تنقیدی مقالے اور تبصرے لکھ رہے ہیں۔ جو ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تنقیدی مضامین کے تین مجموعے ”ادبی مطالعے“ ”ادبی جائزے“ و ”ادبی تناظر“ شائع ہو چکے ہیں، گوڑ صاحب کو اپنے مرحوم دوست مخدوم محی الدین سے بہت محبت ہے۔ انھوں نے مخدوم پر انگریزی میں کتاب لکھی ہے۔ ریاست حیدر آباد کی تحریک پر بھی ان کی دو کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ بڑی تعداد میں ان کے تنقیدی اور سیاسی مضامین اور تبصرے ہیں، جو مختلف ادبی رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی کے آرگن ”کمیونسٹ جائزہ“ کے چار سال اڈیٹر ہیں۔ ان کی تنقیدی کتاب ”ادبی تناظر“ انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوئی تھی۔ میں نے اس کا پیش لفظ لکھا تھا۔ اس پیش لفظ میں گوڑ صاحب کے تنقیدی رویے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، اُسے ہی دہرا دیتا ہوں۔ میں نے لکھا تھا۔

نظریاتی اعتبار سے گوڑ صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ وہ ادب اور زندگی کے باہمی روابط اور ادب کی مقصدیت کے قائل ہیں۔ ادب کو زندگی کے معاشی

اور طبقاتی رشتوں کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ادب میں صرف مقصدیت ہی کو نہیں، اُس کی ہیئت، اسلوب کی خوبصورتی اور جمالیاتی حُسن کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ گوڑ صاحب قدیم ادب اور جدید ادب دونوں کا احترام کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں، ہم عصروں اور نوجوانوں کے ادب کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اُن کا رویہ ایک سخت گیر اور اپنی علمیت کا وہاں منولنے والے نقاد کا نہیں۔ ایک ہمدرد ہم سفر کا ہوتا ہے۔ وہ غالب کے کلام میں جاگیر داری اقدار کو بنیاد بنا کر غالب کو ہدفِ ملامت بنانے کے بجائے پورے سیاسی سماجی اور تہذیبی پس منظر میں غالب کے کلام کا عالمانہ انداز میں تجزیہ کرتے ہیں۔ اپنے بزرگ مصنفین میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قائل ہیں اور خاص طور سے اُن کے سیکولر رویے کے زبردست مداح ہیں۔

گوڑ صاحب کی تحریروں کو پڑھ کر اُن کی بصیرت، دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور سلامتِ روی کا اندازہ ہوتا ہے۔

خلیق انجم



## باتیں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

ڈاکٹر راج بہادر گٹر کا جب خیال آتا ہے یا ان کے ساتھ ملاقات ہوتی ہے تو علامہ اقبال کا یہ شعر حافظے میں چمک اٹھتا ہے۔

مصارفِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

بستانِ محبت میں حریر و یرنیاں ہو جا

جنگِ آزادی کا یہ سپاہی اور اردو شعر و ادب کا یہ نقاد اسی شعر کی تفسیر ہے۔

آج تو اس مجاہدِ آزادی اور اردو کے اس باعثِ فخر نقاد اور نثر نگار سے اس خاکسار کا تعلق جان اور دل کا سہ ہے لیکن میں بات اس وقت سے شروع کرنا چاہتا ہوں جب راقم التحریر اس جوہرِ قابل کے نام اور کام سے آشنا نہیں تھا۔

۱۹۴۸ء کی بات ہے حکومت ہند نے یونائیٹڈ پیپل کیشنز کا دفتر بند کر کے اس کی جگہ پیپل کیشنز ڈویژن کی بنیاد رکھی اور اردو کے ماہنامہ ”آج کل“ کو از سر نو جاری کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دو اور ماہناموں کا بھی اجراء کیا تھا۔ ایک بین الاقوامی سیاست کے موضوع پر اور ایک بچوں کے لیے۔

یوش ملیح آبادی پیپل کیشنز ڈویژن میں شعبہ اردو کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان کے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر عرشِ ملیاتی، بلونت سنگھ اور راقم التحریر کا تقرر ہوا۔ کام کی تقسیم پوری ہوئی کہ ”آج کل“ کی ادارت عرش کے سپرد ہوئی۔ بین الاقوامی سیاست والا جریدہ ”بساطِ عالم“ راقم التحریر کے حصے میں آیا اور بچوں کے ماہنامہ ”نونہال“ کا کام بلونت سنگھ کے سپرد ہوا۔

ابھی ان جرائد کو منظرِ عام پر آئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ ایک دن ہمیں پتا چلا کہ ایک ممبر پارلیمنٹ نے پارلیمنٹ میں ماہنامہ ”آج کل“ کا مسئلہ اٹھایا ہے اور اس کی کسی

کسی ایسے مضمون کی نشاندہی کی ہے جس میں جا بجا ساقط المعیار زبان کا استعمال ہوا ہے۔ اب پیشانیس برس بعد یہ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ وہ کس کا مضمون تھا۔ اور اس کا موضوع کیا تھا۔ دوسرے دن ہمیں معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اٹھانے والے ممبر پارلیمنٹ کا اسم گرامی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہے۔

اس وقت تک میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے نام اور کام سے واقف نہیں تھا۔ بلونت سنگھ بھی اس نام سے آشنا نہیں تھے۔ عرش ملیانی بھی حیرت ہے کہ جوش صاحب نے بھی اس معاملے میں ہماری کوئی رہنمائی نہ کی کیوں کہ میرا اندازہ ہے کہ جوش چوں کہ اس زمانے میں ادب کی ترقی پسند تحریک کے امیر کارواں سمجھے جاتے تھے اس لیے ممکن ہے وہ راج بہادر گوڑ کے نام اور کام سے آشنا ہوں لیکن اس گتھی کو سمجھانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکے۔

دو ایک روز بعد عرش ملیانی دور کی کوڑی لائے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ راجستھان کے رہنے والے ایک صاحب ہیں۔ وہ ہیں تو کانگریس کے رکن لیکن اردو کے مخالف ہیں اور وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماہنامہ "آج کل" کو بند کرادیا جائے۔

میں نے عرش سے کہا "یار ذرا آج کل" کا وہ شمارہ تو دکھاؤ یا وہ مضمون جس پر اعتراض کیا گیا ہے کیونکہ انجام کار تو منسٹری ہمارے ڈائریکٹر سے پوچھے گی، ڈپٹی ڈائریکٹر سے، ڈپٹی ڈائریکٹر جوش صاحب سے اور جوش صاحب ہم لوگوں سے۔ اس لیے ہمیں کچھ معلوم تو ہوتا کہ ہم جوش صاحب کو مشورہ دے سکیں۔

اب جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں اس وقت تک اس مضمون یا اس کے موضوع سے خالی ذہن ہو چکا ہوں لیکن اتنا یاد ہے کہ مضمون پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس میں واقعی زبان و بیان کی اغلاط موجود ہیں۔ حیرت ہے کہ عرش صاحب کی ادارت میں یہ سب کیسے ہو گیا۔ ہو سکتا ہے وہ مضمون غلطی سے کاتب کے پاس چلا گیا ہو لیکن اس کے پروف تو عرش صاحب کو پڑھنا تھے۔ اور عرش ایسے محتاط اور ذمہ دار شخص سے یہ بعید تھا کہ وہ اتنی بڑی کوتاہی کے مرتکب ہوئے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہم لوگوں کی پریشانی اور بڑھی لیکن اس بات سے اطمینان ہوا کہ اردو کے جریدے میں زبان و بیان کی اغلاط پر اعتراض کرنے والا کوئی بھی شخص خواہ وہ ممبر پارلیمنٹ ہو یا نہ ہو اردو کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ وہ اردو کا حامی اور اردو کا دوست ہی ہو سکتا ہے اس لیے یہ اندیشہ بے بنیاد ہے کہ معترض ماہنامہ "آج کل" کو بند کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

بہر طور ہم لوگوں نے کسی قدر پریشانی کے عالم میں جوش صاحب سے جب ساری صورت حال کا ذکر کیا تو انھوں نے اس بات کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ ہم نے کہا کہ جوش صاحب معاملہ بہت سنجیدہ ہے، پارلیمنٹ میں اچکا ہے تو وہ کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں میں پنڈت جی سے کہہ دوں گا۔ میں نے عرض کیا جناب پنڈت جی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سردار پٹیل کی منسٹری ہے اور سردار پٹیل تک بات پہنچے گی ہی نہیں اور ہم لوگوں پر کوئی نہ کوئی عذاب ٹوٹ پڑے گا جوش صاحب پر ہماری اس فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا کہنے لگے تو ہم سردار پٹیل سے کہہ دیں گے۔

اب اس مضمون میں یہ بتانے کی تو گنجائش نہیں ہے کہ سردار پٹیل بھی پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح جوش صاحب پر کس قدر مہربان تھے اور کس طرح ان کی تاز برداری کیا کرتے تھے لیکن اتنا یاد ہے کہ جوش صاحب کی جب دو ایک روز میں سردار پٹیل سے ملاقات ہوئی تو معلوم نہیں انھوں نے سردار پٹیل سے کیا کہا کہ وہ اعتراض ایک پھوٹے سے نوٹ کی صورت میں یا شاید ٹیلی فون کی صورت میں ہمارے ڈائریکٹر تک پہنچا اور وہاں سے جوش صاحب تک کہ اپنے اسٹاف سے کہہ دیجئے کہ آج کل بساط عالم اور نو نہال کے کام میں محتاط رہا کریں۔ گویا صحر سیدہ بود بلائے فلے بجز گذشت۔

اس زمانے میں میرا قیام اپنے والدین اور بچوں کے ساتھ پل بنگلش کے محلے میں تھا۔ ساحر لدھیانوی بھی لاہور چھوڑنے کے بعد اسی پل بنگلش نامی محلے میں آکر آباد ہوئے تھے پر کاشش پنڈت کے پڑوس میں۔ ایک دن میں نے ان سے بر سیل تذکرہ پوچھا کہ یار یہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ممبر پارلیمنٹ کون صاحب ہیں تو ساحر لدھیانوی نے مجھے بتایا کہ ان کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ براہیہ سجا کے ممبر ہیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہی نہیں ہیں عوام کے رہنما بھی ہیں، اردو کے عاشق ہیں اور ٹریڈ یونینوں میں بہت کام کر رہے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ عرض نے ہمیں کیا بتایا تھا۔ اور حقیقتاً معذرت کہ ہے۔ گویا عرض صاحب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے بارے میں جو اطلاعات فراہم کر کے لائے تھے وہ سرتاپا غلط تھیں۔ نہ یہ راجتھان کے رہنے والے تھے، نہ کانگریس کے ممبر، نہ اردو کے مخالف اور نہ آج کل کو بند کرانے کی کوشش کرنے والے۔

اگلے دن جب میں دفتر گیا اور جوش صاحب کے کمرے میں ہم سب لوگ جمع ہوئے تو میں نے

ساحر لدھیانوی سے اپنی بات چیت کا ذکر کیا اور بتایا کہ بقول ساحر لدھیانوی راج بہادر گوڑ اردو کے عاشق ہیں۔ کمیونٹ رہتا ہیں اور پھر میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ جوش صاحب آپ کی تو ان سے واقفیت ہوگی۔ کہنے لگے ہاں ملاقات ہو چکی ہے۔ لیکن نہ جانے کیسے حافظے سے یہ بات اتر گئی۔

بہر طور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے راقم کا یہ پہلا تعارف تھا۔ ایک طرف تعارف یعنی میں ان کے اسم گرامی سے اور کسی حد تک کام سے آشنا ہوا۔ اب اخبارات میں جب کبھی ان کا نام دیکھت تو ساری خبریں اول سے آخر تک پڑھتا۔ گویا ان کا سیاسی کام کسی حد تک سامنے آنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور ملاقات کی بات یہ ہے کہ میں پہلی کیشنز ڈورن یعنی گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا اور راج بہادر گوڑ ہوں یا سردار جعفری، مجروح ہوں یا کیفی یا مخدوم ہوں ان کا کام تھا اگر فکر ہونا جیل جانا۔ رہا ہو کے آنا پھر گرفتار ہو جانا۔ ادھر صورت یہ تھی کہ کمیونٹ پارٹی تو دور کی بات ہے۔ PWA اور IPTA تک سے قربت ہم لوگوں کے یہ ممنوع تھی۔

اس کے کافی مدت بعد جب میں ۱۹۶۶ء میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت سے سبکدوش ہوا اور انجمن ترقی اردو کے ایک رکن کے طور پر منتخب ہوا تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے ملاقاتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو اس وقت تک جاری ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند کی رکنیت کے دوران میں یہ بات بڑی وضاحت سے میرے سامنے آئی کہ گوڑ صاحب کے دل میں اردو کے لیے محبت اور درد کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہ بات میرے لیے ایک طرح سے قابل رشک تھی اور ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب تک ہندوستان میں گوڑ صاحب ایسے درد مند ان اردو موجود ہیں ہم اردو والوں کی جدوجہد میں کوئی کمزوری نہیں آسکتی اور انشاء اللہ ایک روز اس جدوجہد کا خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔

ڈاکٹر گوڑ کی زندگی قید و بند کی صعوبتوں میں کٹی ہے۔ لیکن اردو اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے قلبیتوں کے جان و مال کے تحفظ کے لیے جو آواز بلند کی ہے اور عملی طور پر جو کام کیا ہے اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی اور اس سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ہماری سیاسی و سماجی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔



مجھے ڈاکٹر گوڑ کے ساتھ مجوزہ اردو یونیورسٹی کیٹی میں بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور اگرچہ یونیورسٹی کسی مذہبی اکثریت یا اقلیت کے مفادات کے پیش نظر قائم نہیں کی جا رہی ہے لیکن گوڑ صاحب نے جب بھی اس یونیورسٹی کی افادیت کے پیش نظر مجاویز پیش کی ہیں ان میں ملک کی اقلیتوں کے مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ اردو یونیورسٹی کیٹی نے بھی ان مجاویز کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں قدم کی نگاہ سے دیکھا ہے اور انھیں اپنی رپورٹ میں جگہ دی ہے۔

اسی دوران میں ڈاکٹر گوڑ کی زندگی کا ادبی پہلو بھی ہمارے سامنے آیا اور یکے بعد دیگرے ان کی تین کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ”ادبی مطالعے“، ”ادبی جائزے“ اور ”ادبی تناظر“ اور ایک کتاب انگریزی میں مخدوم محی الدین کی شاعری پر۔ یوں تو ان کی دو کتابیں ریاست حیدرآباد کی تحریک سے متعلق بھی ان کے قلم سے نکلیں لیکن اول الذکر چاروں کتابیں ڈاکٹر گوڑ کی علمی ادبی اور تنقیدی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔

جہاں تک ادبی تخلیقات کا تعلق ہے ڈاکٹر گوڑ نے ہمیشہ اس نظریے کی حمایت کی ہے کہ ادبی تخلیق میں یا کسی فن پارے میں کیا کیا ہے، اور کیوں کر کیا ہے۔ برابر کی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس موضوع پر خوب صورتی کے ساتھ بحث کرتے ہوئے آپ اپنے مضمون ”روشنائی، ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی“ میں لکھتے ہیں۔

یورپی گنڈہ بھی زندگی کا لازمی عنصر ہے اور پراپیگنڈے کا روپ بھی معیاری ادب ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ادب کے سماجی مقاصد کے ساتھ اس کے جایا تی پہلو سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ چناں چہ یہی تبلیغی عنصر کرشن چندر کے افسانوں کی جان ہے۔ ان کے شاہکار افسانے وہی ہیں جن میں انھوں نے اپنی سماجی بصیرت کو اپنے مقصد کے موزوں فنی ہیئت میں پیش کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھیں تو حالی سے اقبال تک اور نذیر احمد سے پریم چند تک نظم و نثر کی بے شمار تخلیقات میں یورپی گنڈا نظر آئے گا۔ بے پروپیگنڈہ جسے فنی ہیئت حاصل ہو گئی ہے۔

”روشنائی، ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی“ آپ کی تصنیف ”ادبی تناظر“ کا پہلا مضمون ہے اس تصنیف کے تمام مقالات مثلاً غالب اور ذہن جدید سماجی تقاضے اور ادیب کے فرائض،

آج کا ہندوستان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت، مولانا محمد علی، خواجہ احمد عباس، مخدوم ایک پہلو دار شخصیت، راجندر سنگھ بیدی۔ ایک عظیم فن کار اور جلیل مانک پوری۔ عہد اور کلام جادہ نقد و نظر پر روشنی چراغوں کی مانند چمک دمک رہے ہیں۔ اور ڈاکٹر گوڑ کے ترقی پسند خیالات سے شعروادب کی محفل میں چاروں طرف روشنی برسا رہے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی سنجیدہ تحریروں میں جہاں کہیں طنز و مزاح کی لہر اُجھاتی ہے۔ وہ ان تحریروں کے متن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ ماقم التحریروں کی کتاب "محمد اقبال۔ ایک ادبی سوانح حیات" جب شائع ہوئی تو اس سے دو چار ماہ قبل میری چند اور تصانیف بھی جو ایک مدت سے پریس میں تھیں یکے بعد دیگرے چھپ کر منظر عام پر آ گئیں۔ تو محمد اقبال۔ ایک ادبی سوانح حیات "پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنی تحریر دل پذیر کچھ اس طرح شروع کی کہ جگن ناتھ آزاد کتابیں تصنیف کرنے کے معاملے میں فیملی پلاننگ کے قائل نہیں ہیں۔۔۔ اور اس طرح اپنی نقادانہ تحریر کو آخر تک دلچسپ اور دلکش بناتے چلے گئے۔

آج ہم یہاں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی پچتر دس سال گزرے جسے ڈاکٹر گوڑ نے کہا جاتا ہے۔ مبارکباد دینے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے یہ پچتر برس انتہائی مصروف انداز سے اور بھرپور طریقے سے بسر کیے ہیں۔ مصروف زندگی کے بارے میں مجھے اس وقت اپنا ایک پرانا ناشر یاد آ رہا ہے۔

اے تو کہ تجھ کو ناز عبادت پر ہے بہت  
مصروف زندگی بھی عبادت سے کم نہیں

میں اس مصروف زندگی بسر کرنے پر اپنے محترم دوست 'اپنے برادر معظم ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو دلی مبارکباد دیتے ہوئے اپنے اس ہدیہ محبت و عقیدت کو غالب کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں کہ

تم سلامت رہو ہزار برس  
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

## راج بہادر گوڑ ایک منفرد شخصیت

راج بہادر گوڑ کی شخصیت نہ دار بھی ہے، پہلو دار بھی۔ ورنہ ادب کو سیاست سے بیرہا ہے پھر بھی راج بہادر گوڑ چابک دستی کے انداز سے دونوں کو ساتھ لے کر چلے۔ پہلی نظر میں ان پر منسوڑ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن ان کے ذہن کے نہاں خانہ میں جھانکے تو وہ مقطع نظر آئیں گے۔ تاہم تھوڑی دیر بھی ان کے ساتھ بیٹھے تو خندہ زیر لب سے آگے بڑھنا پڑے گا۔ نام ان کا رکھا گیا راج بہادر، لیکن انھوں نے عمر بھر راج کو بزدل ثابت کرنے، اس کے خلاف بغاوت کرنے اور اسے پاپا کرنے میں صرف کی۔ اور جس گھڑی بدلیسی راج کے پاؤں اکھڑے اور دیسی راج بنام جہودیت کے پاؤں جھے، اس گھڑی انھوں نے تجدید بغاوت کا پیمانہ باندھ لیا۔ حالات زیادہ سازگار اور خطرات بے شمار ہو گئے اور ہتھکڑیاں ہوائیں ہراتی ہوئی نظر آئیں تو زیریں چلے گئے، قارون کے اس خزانے کی تلاش میں جو وہ راستے میں ٹاٹا چلا گیا تھا، دریادلی کے تحت نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اب وہ خود اس کو صرف کرنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ لیکن ہم یہاں قارون کی پپائی کے محرکات پر غور کرنے نہیں بیٹھے ہیں۔ ہمیں تو راج بہادر کی شاہانہ پیش قدمی کو خراج ادا کرنا ہے۔

ہندوستان کو جہد بیار کے بعد آزادی تو مل گئی، لیکن اسے بھرپور بنانا اسے منصفانہ رخ دینا، اس کے تحت ذرائع و اثاثہ پیداوار کو عادلانہ ڈھنگ سے تقسیم کرنا، سب کچھ باقی بچا اور اس میں سے بہت کچھ اب بھی باقی ہے۔ راج بہادر ان بے تاب ارواح میں سے ہیں جو سفر سے جی لگاتی ہیں اور منزل سے نہیں گھبراتیں انھیں ایک لمحہ بھی اس میں شک نہیں ہو کہ آزادی مقصد نہیں ذریعہ ہے، ذریعہ سماجی اور معاشی نا انصافیوں سماجی نابرابریوں کو دور کرنے کا۔ چناں چہ انھوں نے ٹھکان لی کہ سرمایہ کے ہاتھوں کے ساتھ جو زیادتیاں، غور ہی میں ان پر روک لگائیں گے۔ جدید صنعت نے دست دولت آفریں کو جس طرح کچلا اور کچل رہی ہے، راج بہادر نے اس کے

خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اب اس ضمن میں کیا کر رہے ہیں، کیا انھیں حال کی گرفت میں قوار کے ساتھ ساتھ جذبہ بھی آگیا۔ عقیدت کہتی ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ لوگ جو مظلوموں کی دست گیری کے لیے سر پر کفن باندھ کر نکلتے ہیں، وقت کا احترام ان اوقات بن کر کبھی نہیں کرتے۔ اس سے بہتر ان لوگوں کی ترجمانی نہیں ہو سکتی جیسی لسان الغیب کہ گئے ہیں۔

اذاں بدیر مغاظم عزیر می دارند

کہ آتشی کہ نہ میسرد ہمیشہ در دل ماست

میں باوجود پرانی لکیروں پر چلنے کے عقیدت مندانہ کنکھیوں سے ان سرفرد شوں کو دیکھتا رہا ہوں ایک طرف ان معدودے چند سرفرد شوں کو، کیسے دوسری طرف ان ایمان فرد شوں کو جو ماضی قریب میں انجمنہ در انجمنہ ایوان سیاست میں درائے ہیں۔ تب جا کر بغاوتِ رہ کا اندازہ ہوگا۔

راج بہادر گوڑ کے سوانح حیات کی سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ علاج معالجہ سے ان کا جو تعلق رہا ہے۔

اس کی روداد پر آکر رک گیا۔ حکایت لذیذ تھی، نظریں اسے دربر تک دہرائی رہیں۔ گوڑ صاحب نے ایم بی بی ایس کیا یعنی مجاہد سے کے بعد ڈاکٹر بنے۔ معلوم نہیں ڈاکٹری سے طبیعت کیوں اچاٹ ہو گئی۔ ان کے سوانح نگار نے شاید مصلحتاً یہ صراحت نہیں کی کہ مطلب ان کی اماج گاہ سرے سے بنا ہی کہ نہیں، شاید انھیں یقین نہ تھا کہ اگر وہ اس شریفانہ پیشہ کو جس کی نیادی میں انھوں نے پانچ چھ سال کھپائے تھے۔ اختیار کریں گے تو اس کے نتیجہ میں ہندوستان کی آبادی برقرار رہے گی یا گھٹ جائے گی ان لوگوں پر جو ایم بی بی ایس یا بی ایس سی (انجینئرنگ) کر کے دوسرے دھندوں میں لگ جاتے ہیں اعتراض کی انگلی اٹھ کرتی ہے کہ انھوں نے میڈیکل یا انجینئرنگ کالج کی قیمتی نشستیں ضائع کر دیں لیکن میں ہوسول سرو میز کے انٹرویو میں ان بے شمار ڈاکٹروں اور انجینیروں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ جو شوق بیلانے سول سروس میں مبتلا ہو گئے تھے، راج بہادر گوڑ بد حرف گیری کیسے کروں۔ وہ سول سروس کے دام میں گرفتار ہونے سے رہے۔

بروایں دام بر جائے دگر نہ

کہ غنقارا بلند است آشیانہ

انھوں نے تو مظلوموں اور ستم رسیدوں کی دادرسی اور یادری کو مقصد حیات بنا لیا۔



کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ گوڑ صاحب کے علاج معالجہ سے دوسروں نے فائدہ اٹھایا ہو یا نہ ہو، خود انھوں نے نظام چارہ گری سے انوکھے طور پر فائدہ اٹھایا۔ خدا نخواستہ دائم المریض ہو کر نہیں بلکہ بیماری کو ماہ نجات بنا کر گوڑ صاحب ٹھہرے فعال اور متحرک آدمی۔ زنداں میں ان کا دل کیوں کر لگتا۔ چناں چہ خود کو علاج کا مستحق بنایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قدرت نے ہی ان کی رہائی بیماری کے راستے لکھی ہو۔ بیماری واقعی تھی یا مصنوعی، ہمیں پردے کے پیچھے جھانکنے کی ضرورت نہیں۔ جنگی قیدیوں کی طرح سیاسی قیدیوں کے لیے فرار کی ہر راہ روا ہے۔ راج بہادر گوڑ کی تازہ تصنیف ”ادبی تناظر“ میں حسن بیاں اور سلف زبان کی تلاش بے سود ہوگی۔ فاضل مصنف کو عبارت آرائی سے زیادہ سروکار نہیں، لیکن ان کے مفہم با وزن اور قابل قدر ہیں۔ ترقی پسند ادب اور اس کے برتنے والوں کے بارے میں انھوں نے بہت سی ایسی باتیں بتائی ہیں جنھیں وہ نہ بتاتے تو یہ داستان تشنہ رہ جاتی۔ سلسلہ مذہب کی کئی کڑیاں خالی رہ جاتیں۔ چوں کہ وہ خود اسی دبستان ادب سے تعلق رکھتے ہیں، اور اس دبستان کے اکابر اہل قلم کی رفاقت اور ان کی طرف سے انیت اور احترام انھیں میسر ہوا ہے۔ اس لیے ان کی تحریر میں ”شنیدہ“ کی دوری اور پھیکا بن نہیں ہے۔ ”دیدہ“ کا قرب اور انتہا ہے۔ وہ ترجمانی اس تحریک کی کر رہے ہیں جس میں وہ گلے گلے شریک تھے۔ مصنف کے ساتھ قارئین تیسری اور چوتھی دہائی کے اس دور میں پہنچ جاتے ہیں جب ترقی پسند مصنفین ادب اور زندگی دونوں کو اپنے شدت سے محسوس کیے ہوئے نظریات کے مطابق ڈھال رہے تھے۔

راج بہادر گوڑ کی تحریر کے برعکس ان کی گفتگو رواں، شگفتہ، صاف اور دلکش ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی تحریر کو خرا داتا کرتے تو بات ہی دوسری ہوتی۔ ان کی گفتگو کا ذکر آگیا ہے تو دو ایک باتیں کہہ دی جائیں۔ اول تو ان کی صحبت میں انسان ناک چڑھا کر اور تیوری پر بل ڈال کر بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ ان میں ہر جملہ کو پھیدنے کی صدا حیت ہے۔ ان کی گفتگو دل کش اور بڑاق ہوتی ہے۔ اسے دارالترجمہ وائے حیدر آب کا فیض کہیے کہ ان کا ذہن موزوں غظیا موزوں ترین متبادل تک ایک پہل میں پہنچ جاتا ہے اور یاران محفل تمدن میں سرگرداں رہ جاتے ہیں۔

گوڑ صاحب قانون کی بہت اچھی فراست رکھتے ہیں۔ اور انجمن ترقی اردو کو اردو زبان کے آئینی حقوق کے سلسلہ میں جتنے مرجوعات کرنے پڑتے ہیں ان میں بالعموم گوڑ صاحب انجمن کی

انگلی پکڑ کر اسے چلاتے ہیں۔

راج بہادر گوڑ کی شخصیت دل پذیر ہے۔ عام خیال یہ ہے اور صحیح ہے کہ وہ مذہبی تعصب سے بے نیاز اور بالا تر ہیں، اس زمانہ میں بھی جب یہ سکڑاؤ کا وقت ہو چلا ہے۔ یوں تو ہمارا ترقی پسند طبقہ ہی ذہنی طور پر انصاف پسند اور اقلیت دوست ہے۔ راج بہادر گوڑ کی اقدار طبع عروس البلاد حیدرآباد سے ان کے تعلق اور شریف النفس اہل سیاست و اہل قلم اور انصاف پسندوں کی صحبت نے اس پر درجہ کر دی ہے۔ اگر آپ کو تلاش ہو کہ بے لوث اور ٹھیکہ ہندوستانی کے کہتے ہیں، تو جو ہرمت آپ بنائیں گے اس میں راج بہادر گوڑ کا نام ضرور شامل ہو گا کہ اس کے رگ و ریشہ پر بے آمیز ہندوستانی ہونے کی ہر ثبوت ہے اور اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ ہر لمحہ اس کے دل کو ہندوستانیّت کی صہبائے ناب میں بہلا رہا ہے۔ گوڑ اپنی بے غرضی

سادگی اور بے دریائی میں حسرت موہانی کی یاد دلاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس درجہ حرارت کو نہ گوڑ پہنچتا ہے، نہ ہمارے بڑے بڑے قلم کار اس سے کوئی۔ تاہم حسرت موہانی کے کردار سے قریبی مماثلت کا افتخار کیا کم ہے۔

"ادبی مناظر" ۱۹ مضامین پر مشتمل ہے۔ "روشنائی" سے اس فاصلہ پر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی بنا اس کے جہانوں نے کن ارادوں، اضطرابوں اور امالوں کے ساتھ ڈالی اس میں شک نہیں کہ ترقی پسندوں نے اردو ادب کی دیوار میں جو فرسودگی اور کجی آگئی تھی اسے پیٹھ کا سہارا دے کر سیدھا کر دیا۔ مضامین اکثر ان معاصرین کا ذکر تھیں کرتے ہیں جو مصنف کے ہم مشرب تھے، ان میں سر فہرست مخدوم امین اور خواجہ احمد عباس، اور نیاز حیدر اور باقر زیدی بھی ہیں۔ مضامین بصیرت اور ہمدردی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ لیکن مصنف کی وسعت نظر اور فراخی ترجیحات کا اندازہ بھی ان سے ہوتا ہے۔

ترقی پسند ادب عالمی مناظر اپنے ساتھ لایا، اس کی تخلیقات میں زندگی کی ندی پورے فوش و خروش کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔ ان اوصاف کا انعکاس "ادبی مناظر" میں ہوتا ہے، جہاں انہیں شاعرانہ، متعصبانہ نہیں عادلانہ انداز سے یہ کتاب قارئین کے افق کو

وسیع کرتی ہوتی چلتی ہے۔ اور جو بصیرتیں اور روشنیاں وقتاً فوقتاً حاصل ہوتی ہیں، وہ اس پر مستزاد دیکھیے۔

”بغادوت اور انقلاب میں فرق ہی یہ ہے کہ بغادوت کے سامنے مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں ہوتا اور انقلاب کے آگے سماج کی تشکیل نو کا ایک پورا منصوبہ ہوتا ہے۔“

”کسی ادب کو یا کسی ادبی دور کو اس کے اچھے اور اعلیٰ ادب کی بنا پر جاننا جاتا ہے۔“  
 ”کرشن چندر نے اپنی سماجی بصیرت کو اپنے مقصد کو موزوں فنی ہیئت میں پیش کیا ہے۔“  
 ”جاگیر داری سماج میں عورت محض ایک کھلونا تھی۔ سرمایہ داری نے اپنے عروج کے زمانے میں اسے آزاد تو کیا مگر وسعتِ زیرِ نگیں تک ہی۔“

”جمہوری طریقہ کار، کھلی بحث اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنا پر کھنا اور مفاہمت اور مطابقت کی راہیں تلاش کرنا، انجمن کا طریقہ کار تھا۔“

”اول تو درمیانی طبقہ کا المیہ یہ ہے کہ وہ نہ تو سرمایہ دار طبقہ کی طرح سماج پر قابض ہے اور نہ مزدور طبقہ کی طرح اس پر قبضہ و اقتدار حاصل کرنے کے خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے متذبذب اور تشکیک کی اس کیفیت میں منزل اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے دیر نہیں لگتی۔“

”غالب کے دور میں، پرانی قدیمیں ٹوٹ رہی ہیں اور نئی قدیمیں اپنی پرچھائیاں تو ڈال رہی ہیں لیکن کسی واضح اور خوش آئند مستقبل کا نقشہ نہیں پیش کر رہی ہیں۔“

”ان غالب کے پاس ’غمِ موجود‘ کے ساتھ نشاطِ آرزو بھی ہے اور یہی غالب کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرتا ہے۔“

ترقی پسند ادب اور اس کے اہل قلم پر راج بہادر گوڑ کو بہت کچھ لکھنا ہے۔ اس منصفانہ روش اور عالم گیر نظر اور انسان دوستی کے ساتھ جس کا اظہار ”ادبی مناظر“ میں کیا گیا ہے۔ ہم ان کی اس سلسلہ کی کتابوں کا انتظار کریں گے۔

## تاثرات

راج کی یاد آتی ہے تو اقبال کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے۔

یقین محکم عمل پیہم محبت فنا رح عالم  
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

یہ ۵۰ سال کے ہوں یا ۸۰ سال کے یا اس سے زیادہ کے ہمیشہ جوان رہیں گے  
ان کی فکر جوان ہے ان کے قدم زندگی کی راہوں میں اسی جوش سے پڑتے ہیں جو جوانی کا خاصہ  
ہے۔ ان کی زندگی کی، علی قدروں سے تہذیب سے ادب سے عشق جوان ہے۔ میں تصور بھی نہیں  
کر سکتا کہ راج بڑھے بھی ہو سکتے ہیں۔

ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ممبئی میں دہلی سے حیدرآباد سفر کے دوران ہوئی میں جگر صاحب  
خواجہ احمد فاروقی، حمیدہ سلطان کے ساتھ حیدرآباد کی ایک اردو کالفرنس میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔  
یہ ناگپور پر مل گئے پھر مخدوم کے اشعار اور لطائف کی بھرمار ہی وقت اچھا گذر گیا۔ اس زمانہ میں یہ  
حضرت رائے گنجپور کے ممبر تھے۔ چنانچہ انجمن نے جب ۱۹۵۸ء میں اردو کے حقوق کے لیے پارلیمنٹ  
کے ممبران سے ملاقات کا سلسلہ شروع کیا تو راج بہادر گوڑ ہمارے ساتھ تھے۔ دن بھر ہم ممبروں سے  
سلطے شام کو راج بہادر گوڑ چڑ پادھیا سے ملاقات سے کر کے سانی اقلیتوں کے مسئلے پر بار بار پانی کیٹی کی  
دن بھر کی کارروائی کی ٹوہ لگاتے۔ راج بہت اچھے وکیل ثابت ہوئے۔ پارلیمنٹ کے کئی ممبروں  
کو ہم خیال بنانے میں وہ بہت معاون بن سکے۔

پھر انجمن ترقی اردو کی مجلس عام اور مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے انھیں دیکھنے و سہ پر کھنے  
کا موقع ملا۔ یہ کبھی جھنجھلا تے ہیں نہ برہم ہوتے ہیں نہ بیزار۔ یہ وہ دریا ہیں جو بہتی دھن میں بہے  
جاتا ہے۔ مخدوم کے بارہی نہیں عاشق بھی تھے۔ ان کے بعد کسی سے محبت نہیں کی ان کی ایک



نظم سے اخذ کر کے مکان کا نام بھی رکھ لیا ہے۔

شخصیت بارغ و بہار ہے۔ شعر ہزاروں یاد ہیں۔ اکثر جلسوں میں فریق مخالف کو انھوں نے کسی بر محل شعر سے چت کیا۔ مظفر پور میں انجمن کی ایک کانفرنس تھی مجھے ایک دن شرکت کر کے علی گڑھ واپس آنا تھا۔ چناں پہ صدارت ان کے سپرد کر کے روانہ ہونے لگا۔ ایک بقراط کاروائی آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے تھے۔ راج نے سمجھا یا کہ آپ کو بھی بولنے کا موقع دیا جائے گا۔ گاڑی کو آگے چلنے دیجئے مگر یہ حضرت کہاں مانتے تھے۔ آخر راج نے یہ شعر پڑھا۔

اتنی ہی تو بس کی ہے تم میں

کہنا نہیں مانتے کسی کا

جمع نے قہقہہ لگایا وہ حضرت خاموش ہو گئے گاڑی پھر آگے چلنے لگی۔

راج بہادر گوڑ ایک سیاسی کارکن بھی ہیں عام طور پر آدمی سیاست میں ڈوب جائے تو شے لطیف اور حس مزاج سے ماری ہو جاتا ہے مگر اس کلیہ میں کچھ استثنیٰ بھی ہے۔ ان میں ایک راج بہادر گوڑ بھی ہے۔ سماجی انصاف کے علم بردار، مشترک تہذیب کے عاشق، شعر و ادب کے دمز شناس، اردو کے ایک مجاہد گویا ایک جام جہاں نما۔ دنیا انھیں دکن کے ایک جلیل القدر فرزند کی حیثیت سے ہی نہیں برصغیر کے ایک دانشور کی حیثیت سے بھی جانتی ہے۔

خدا ان خضر طریقت کو عمر خضر دے۔

## ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ پیکرِ جہدِ مسلسل

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پچھتر برس کے ہو گئے۔ ہزاروں برس پرانی دنیا میں پچھتر برس کا عرصہ کوئی لمبا عرصہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سوال یہاں صرف پچھتر برس کا نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ یہ پچھتر برس کس کے حصر میں آئے ہیں اور اس نے ان پچھتر برسوں کو کیسے جیا ہے۔ دیکھا جائے تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ یوں ہی پچھتر برس کے نہیں ہو گئے ان پچھتر برسوں کے ایک ایک لمحہ کو انھوں نے کارآمد، مفید، بامقصد اور حیات آفریں بنایا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی زندگی کے پچھتر برس ان کی نجی زندگی کے پچھتر برس نہیں ہیں بلکہ یہ پچھتر برس پر پچھتر برس ہیں۔ رواداری اور اخوت کے پچھتر برس انسان دوستی اور بھائی چارے کے پچھتر برس، گنگا جمنی تہذیب اور روشن خیالی کے پچھتر برس، مظلوموں اور بے کسوں کے حق میں گزارے ہوئے یہ پچھتر برس، ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے پچھتر برس، انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی حفاظت کرنے والے پچھتر برس۔ یہ اعزاز کسے ملتا ہے کہ ایک انسان کی زندگی بالآخر اس کے اطراف پھیلے ہوئے معاشرہ کی زندگی بن جائے۔ ایسی زندگی جینے کے لیے پتھر کا کلیجہ اور فولاد کا جگر چاہیے۔ ایسے لوگ سمٹتے ہیں تو دل عاشق بن جاتے ہیں۔ اور پھیلتے ہیں تو زمانہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی شان محبوبی اس میں ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ایک بے لوث بامقصد زندگی گزاری ہے۔ اپنا ایک ایک پل اپنے اطراف پھیلے ہوئے سماج کو دیا ہے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو اپنا بزرگ مانتا ہوں صرف اس لیے نہیں کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایک مثالی رہنما ہیں۔ ایسے رہنما کسی بھی سیاسی پارٹی میں ہوں وہ صرف کسی مخصوص پارٹی کے نہیں ہوتے بلکہ سارے ملک کے لیے ایک اثاثہ ہوتے ہیں۔ میں اب تدار ہی سے کانگریس

پارٹی سے وابستہ رہا اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ شروع ہی سے کیونست پارٹی سے وابستہ رہے۔ لیکن میں اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی ان کی سیاسی سرگرمیوں، ملک کے لیے ان کی بے لوث خدمات اور ان کی راست بازی اور بے باکی کا قائل رہا، ہوں حیدر آباد میں پولیس ایکشن سے پہلے نظام کی شخصی حکومت کے خلاف، کانوں، منظر و مومن اور بے کسوں کی حمایت میں آواز اٹھانا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس لیے وقت میں رومی نارائن ریڈی، مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں نے نہ صرف اس شخصی نظام کے خلاف آواز بلند کی بلکہ تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کا آغاز بھی کیا۔ اس وقت سابق ریاست حیدر آباد کے جو حالات تھے ان میں اس کام کا بیڑہ اٹھانے کے لیے بڑی دلیری جرات اور حوصلہ کی ضرورت تھی۔ اس جدوجہد کے دوران انھوں نے برسوں روپوشی اختیار کی۔ جنگلوں کی خاک چھائی، صعوبتیں اٹھائیں۔ مشکلات سے گزرے لیکن کبھی اپنے نظریہ اور عقیدہ کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے نہیں دیا۔ مشکل حالت میں بھی انھوں نے حیدر آباد کے روشن خیال نوجوانوں کا ہونے اور مزدوروں کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ طب کے پیشہ کی اہمیت اس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔ ڈاکٹر گوڑ کے ساتھیوں میں کئی ڈاکٹروں نے صرف اپنے پیشہ میں خوب نام کمایا بلکہ بے پناہ دولت بھی کمائی۔ چاہتے تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بھی ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر ایک خوش حال، آرام دہ اور پرسکون زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن ملک اور سماج کے لیے خوشی خوشی اپنی شخصی خوشحالی کی قربانی دے دی، عام آدمی کی طرح زندگی گزاری۔ عوام کے مصائب میں شریک ہے اور ان کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ ریوں تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ فرد کی بیماریوں کا علاج کرنے کے بجائے معاشرہ کی بیماریوں کا علاج کرنے کی غرض سے میدان سیاست میں کود پڑے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا ابتداء ہی سے عقیدت مند اور مداح رہا ہوں لیکن آج سے بیس برس پہلے جب میں آندھرا پردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کا چیرمین بنا تو انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن ملازمین کی ٹریڈ یونین کے صدر کی حیثیت سے بیسوں بار ان سے ملاقاتیں رہیں۔ ملازمین کے مسائل کو جس طرح وہ پیش

کرتے تھے اور جس ڈھنگ سے وہ ملازمین کی نمایندگی کرتے تھے اس سے ان کی گہری موبہ بوجھ کا پتہ چتا تھا وہ نری لغو بازی کے ذریعہ مزدوروں کے مسائل کو الجھاتے نہیں تھے بلکہ انھیں پوری دانشمندی اور دیانتداری کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کرتے تھے انتظامیہ کے تعلق سے سخت اور تنقیدی رویہ رکھنے کے باوجود وہ انتظامیہ کی دشواریوں کا بھی ہمدردانہ ادراک رکھتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ اندھی محاسمت کو نہیں بلکہ دانشمندانہ مفاہمت کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں انتظامیہ ان کی اکثر باتوں کو مان لیتا تھا وہیں ملازمین ان پر بھرپور اعتماد کرتے تھے۔ ایک ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جو مقام ملک میں حاصل کیا ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہے۔ ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کی کوئی بھی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی۔ ڈاکٹر گوڑ نہایت اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی ہیں۔ جہاں وہ مزدوروں اور کالوں کے جلسوں میں گھنٹوں بول سکتے ہیں وہیں دانشوروں اور اہل علم کے سمیناروں میں بھی اسی دسترس اور اعتماد کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام اور خواص دونوں میں بے حد مقبول ہیں اور ان کی بات نہایت توجہ سے سنی جاتی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بہترین پارلیمنٹریں بھی رہے ہیں جن دنوں وہ پارلیمنٹ کے ممبر تھے میں پارلیمنٹ کا رکن نہیں بناتھا لیکن مختلف اہم ملکی مسائل پر پارلیمنٹ میں ان کی تقریروں اہم ملکی مسائل پر پارلیمنٹ میں ان کی تقریروں کو گہری توجہ اور دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ انھوں نے نہایت موثر انداز میں عوام کی آواز کو پارلیمنٹ کے ایوان تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس میں وہ بے حد کامیاب بھی رہے۔ ان کی تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ جمہوریت میں اپوزیشن لیڈر کتنی اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں بشرطیکہ ان کا رویہ تعمیری ہو۔ اگرچہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے نظام کی شخصی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا لیکن حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے وہ سچے علمبردار رہے ہیں سیکورزم رواداری اور انسان دوستی جیسے جذبات ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں۔ حیدرآباد ہی کے حوالہ سے وہ اردو زبان کے نہ صرف ایک سچے عاشق ہیں بلکہ ان کے ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ انھوں نے سینکڑوں ادبی موضوعات پر تنقیدی اور تعارفی مضامین لکھے ہیں۔ سیاست دانوں میں ادب سے ایسی گہری دلچسپی کی مثالیں ذرا کم ملتی ہیں۔ آندھرا پردیش میں بالخصوص اور ہندوستان میں بالعموم جب



بھی اردو کا کوئی مسئلہ اٹھا ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بڑی شدت کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج جب کہ ملک کی سیاست ایک بحران سے گزر رہی ہے۔ لوگ سیاسی پارٹیاں یوں بدل رہے ہیں جیسے لباس بدل رہے ہیں، ملک اور عہدیدے کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ شخصی الزامات لگا کر سیاسی فائدہ اٹھانے کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ جمہوریت، سیکولرزم، سمجھتی جیسے نظریات پر ضرب کاری لگ رہی ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جیسے وسیع النظر وسیع المشرب روشن خیال اوسپے رہنما کی موجودگی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ڈاکٹر گوڑ نے نصف صدی پہلے جس عہدہ اور نظریہ کو اپنایا تھا آج تک اس پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم ہیں۔ اس کٹھن سفر اور آزمائش میں ان کے پائے استقامت کبھی نہیں ٹڑکرائے۔ دنیا میں بہت کچھ بدل گیا لیکن ڈاکٹر گوڑ نہیں بدے۔ ہم سے تو زمانہ ہے زمانہ سے ہم نہیں۔ ایسے دیانت دار اور کھرے بزرگ رہنما کا ہمارے زریعہ موجود رہنا ہم سب کی خوش بختی ہے۔ پچھتر برس کے ہو جانے کے باوجود ان میں لڑکھائوں کا سا جو ش اور ولولہ موجود ہے۔ ہندوستانی سماج کی بہتری کے لیے آج بھی وہ ایک بھرپور اور فعال زندگی جی رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ان کی صحت اور توانائی جی رہے اور وہ اسی طرح ملک اور قوم کی خدمات انجام دیتے رہیں۔

## ڈاکٹر راج بہادر گوڑہ پتھروں ساگر پر

بھی حساس دلوں کے لیے آج ایک سہرا دن ہے کہ ہم میں سے ایک نامور شخصیت کی زندگی کے ۵۰ سال بیتنے پر جس کا پیشہ بہادری و اجتماعی خدمت میں گذرا ہو، ان خدمات کو سراہا جا رہا ہے۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خدمات کو بھول جانے اور یادوں کو بھلا دینے کی روایت بڑھ چکی ہے۔ ویسے ڈاکٹر راج بہادر گوڑہ کی خدمات کو نہ بھلا جا سکتا ہے اور ان یادوں کو کبھی بھلا یا جاسکے گا۔ کیوں کہ ڈاکٹر راج درمخدوم نے حیدرآباد کو ایک مخصوص شخصیت بخشی تھی۔ ریایوں سمجھے کہ سرزمین حیدرآباد کے لیے اسے پست میں تو سیاست کو، دب اور سنگیت کو، یہاں کی ہر تحریک کو حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے بہترین قرار دیے۔ اسی لیے تو بیرون حیدرآباد سے شاعر اور ادیب اب بھی حیدرآباد کو کھینچے چلے آتے ہیں، اور پرانی یادوں اور قدروں کو زندہ کرتے ہیں۔ میرے اس مقالہ کا مقصد ان کی خدمات کا کوئی جائزہ دینا نہیں بلکہ اپنا خراج تحسین پیش کرنا ہے۔ کیوں کہ میں ان سے درمخدوم سے ابتدائی و بھائی جانشین کی تھی اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ جو میرا خمیر بن چکا ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑہ حیدرآباد میں ٹریڈ یونین تحریک کے مخدوم، جو ادا اور ہندو کے ساتھ باہمی مبنی تھے۔ اس لیے ٹریڈ یونین کا مدین اور ہر پارٹی نے انہیں ٹریڈ یونین تحریک کے ہیڈ من بنانا کہتے ہیں۔ نئی نسل کے ٹریڈ یونین کارکنوں کو اصل میں یہ جتنا بہت ضروری ہے کہ اس وقت یہ کتنا مشکل کام تھا۔ نظم و ضبط ہی درانگریز سامراج کا دور دورہ تھا۔ جب کہ عام جلے کرنا ایک خطرناک جرم سمجھا جاتا تھا۔ راتوں کے اندھیرے میں محفوظ مقامات اور جگہوں اور قبرستانوں میں مزدوروں کے جلسہ عام رکھتے۔ رہیں ٹریڈ یونین کے رجسٹریشن فرم پر کرتے۔ مطالبات اور ممبرانڈم مرتب کرتے اور ضرورت پڑنے پر ہڑتالوں کے فیصلے بھی نہیں ہوتے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں مزدور تحریک کی شروعات ہوئی۔ راج اور ان کے ساتھیوں کی لگن بے مثال تھی۔ ان دنوں یونین کا تصور مزدوروں کے لیے نیا بات تھی۔ ہر چیز بڑے دھیرے سے سمجھانا پڑتا اور مزدوروں کی باتوں سے مسائل کو سمجھ کر ان کی رہنمائی کرنا پڑتا۔ راج کو میں نے کچھ مزدوروں کو بڑے پیار اور دھیرے سے بات کہتے دیکھا

اس پیار کا تاثر تھا کہ مزدور اپنے گھر میں پریشانیوں بھی ان کے سامنے رکھتے اور کنبہ کا کنبہ ان کے گرد گھومنے لگتا۔ مزدوروں سے پیار کا رشتہ جو راج اور مخدوم نے جوڑا تھا اور جو پیار کیا تھا شاید ہی کوئی اور نیتانے کیا ہو مزدور ہی کیا جن سے بھی ان کا واسطہ پڑتا ہی پیار کا رشتہ بن جاتا۔ اس لیے لوگ بھی ان پر پیار اور عقیدت کے پھول پتھار کرتے۔ ٹریڈ یونین کے کام میں راج

کو اولین اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے تیار کردہ ممبرانڈم، سلیس زبان میں، عام فہم اور دلیلوں کے ساتھ ہوتے۔ ان مزدوروں کو اپنے مطالبات کی واجبیت پر بھروسہ ہوتا جدوجہد کے لیے مکمل تیار ہونے اور خود سرمایہ داروں کو بھی واجبیت کو تسلیم ہی کرنا پڑتا۔ راج کی ایک اور خصوصیت ہے وہ روزمرہ کے مسائل اور مطالبات کو بھی اصولوں اور نظریات کی اونچی سطح پر لے جاتے اور اس طرح جدوجہد کی بھی اونچی ہو کر سماجی مسئلہ بن جاتی۔ ویسے بھی وہ اعلیٰ اصولوں کو مزدور کے سمجھ بوجھ کے لیے آسان زبان میں پیش کرتے اس پہلو میں دونوں راج اور مخدوم پر کامریڈ ڈانگے کا بڑا اثر تھا راج اور مخدوم کا اپنے ساتھیوں اور ان کے ارکان خاندان کے ساتھ برتاؤ، خصوصی ذکر کا محتاج ہے شاید یہ پرانے کمیونسٹوں کے اقدار کا ایک حصہ تھا۔ تو اب دھیرے دھیرے غنچا ہو چلا ہے۔ نصرت یا وسیع کاراب بھی راج کو اپنے مرحوم والدین کے نمائندے تصور کرتے ہیں۔ راج، ریڈی اور راجو اپنے والد سے بھی بڑا درجہ دیتے ہیں۔ خود میراڈ کا ڈاکٹر راہول اور رڈ کی ڈاکٹر یادھیکا ان کو "اپنا" سمجھتے ہیں۔ میری بیوی ڈاکٹر پدم اہمیتہ سناں ہیں کہ یکے مخدوم ایک دفعہ یکا یک ہماری شادی کی سالگرہ پر آدھکے اور ہم کو "مدعو" کیا جب انھوں نے دیکھا کہ میں اپنے روزمرہ کے کام میں اس دن کی خصوصیت کو بھول بیٹھا تھا۔ مزدور کو منظم کرنے راج کے ہزار جتن رہتے۔ ان کے تعلیمی معیار کو اونچا کرنے میں مدد کرتے۔ کلچرل صلاحیتوں کو ابھارنے کی مقدور بھر کوشش کرتے چناں چہ مخدوم کی سالگرہ کے موقع پر انھوں نے مزدور شعراء کا بھی ایک الگ پروگرام رکھا تھا۔ دو ایک مزدور شریک ہوئے لیکن ایک بڑا پروگرام بن سکا۔ پارٹی اور کمیونزم کے لیے راج کی خدمات انہماک اور وابستگی بے پناہ رہی۔ مخدوم اور راج کمیونسٹوں اور انقلابیوں کے لیے ایک عظیم ورثہ چھوڑے ہیں کیا ہم منبھال سکیں گے؟ یہ میرے چند پیار اور عقیدت کے پھول ہیں جو میں اپنے گرو اور ساتھی اور رہنما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے بھینٹ کر رہا ہوں۔

## ادبی مناظر پر ایک نظر

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب اردو ہندی کی، ملی قدروں کا ایک نونہ میں اور رد و تحریک تنظیم کے ساتھ ایک طویل مدت سے ذمہ دارانہ طور پر وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے متعدد موضوعات پر واقع مضامین بھی لکھتے رہے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہو کر دل بہتی کے ساتھ پڑھے گئے ہیں۔ ادبی مطالعے "اور ادبی جائزے" کے بعد "ادبی مناظر" ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا تیسرا مجموعہ مضامین ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفحات پر مشتمل، مضامین میں ڈاکٹر صاحب نے نظم و نثر کے متنوع موضوعات اور مختلف علمی و ادبی نیز قومی و سیاسی شناسیات کے متعلق نگاہ نیاں کیا ہیں۔ مشقے نونہ کے طور پر بروقت تین مضامین پر تنقیدی تبصرہ کافی ہو گا۔

مجموعہ کا تیسرا مضمون ہے "غالب اور جدید ذہن" اس میں مختلف جہتوں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اول تو اپنے زمانے کے لحاظ سے خود غالب کا ذہن کتنا جدید تھا، دوسرے یہ کہ غالب نے موجودہ دور کے جدید ذہن پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گوڑ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ

"غالب کا دور انتہائی پیچیدہ اور پُر آشوب ہے۔ پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور نئی

قدریں اپنی پرچھائیاں تو ڈال رہی ہیں لیکن کسی واضح اور خوش آئند مستقبل کا

نقشہ نہیں پیش کر رہی ہیں" (ص ۱۲۳)

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ غالب اپنی ہندی کی پسندیدہ قدروں کی شکست و ریخت



سے بہت ملول تھے اور وہ اپنے اشعار سے مستقبل کے لیے لوگوں کے حوصلے بڑھانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے خیالات میں آزادگی و خود بینی اور نشاط و رجائیت کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ غالب نے تصوف میں پناہ لی“ (ص ۳۵) یہ ایک متضاد سی بات معلوم ہوتی ہے اور اس کا تضاد ڈاکٹر صاحب کے حسب ذیل بیان سے کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔

”وہ غالب، مسائل حیات کو سمجھنے اور مذہب کی ظاہر داریوں سے بچ نکلنے کے لیے

فلسفہ وحدت الوجود کا سہارا لیتے ہیں“ (ص ۳۵)

بلاشبہ غالب کے بعض اشعار میں رسم زمانہ اور روایت شاعری کے مطابق وحدت الوجود کے کچھ اشارات موجود ہیں، مگر غالب کی توانا رجائیت وحدت الوجود کی اس تحلیل پرستی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ تو قوائے عمل کو مضحمل کر دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کا حقیقی میدان وحدت الشہود کی طرف تھا جیسا ان کی ایک مشہور غزل کے حسب ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود	پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ ہری چہرہ لوگ کیسے ہیں	غمزہ و عشوہ دادا کیا ہے
شکن زلف غیر میں کیوں ہے	نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں	ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

اس موضوع پر خود گوڑ صاحب کا یہ اقرار:

”پتہ چلتا ہے کہ غالب موجودات کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ اور ان کی کثافت کے بغیر لطافت تک پہنچ ممکن نہیں۔“

وحدت الوجود کے بجائے وحدت الشہود کا پتہ دیتا ہے۔

بہر حال، گوڑ صاحب نے غالب کے یہاں تاتاری بیگن ازم“ اور لذت طلبی“ کا جو سراغ کسی جملے سے لگایا ہے وہ صحیح نہیں۔ محض چند شعروں اور مصرعوں سے وہ مطلب نہیں نکل سکتا جو غالب کے اشعار اور خطوط کے مجموعی اور عمومی مفہوم کے برعکس ہے۔ غالب بلاشبہ وسیع ترین معنوں میں ترقی پسند تھے اور گوڑ صاحب نے ان کی تشلیک“ کو ”صحت مند“ کے ساتھ مشروط کر کے ایک معقول بات کہی ہے۔ یہ تشلیک یقیناً قنوطیت اور کلیت کے برخلاف رجائیت اور نشاط آلود“ کی طرف مائل ہے۔ اس میں

مذت طلبی اور پیگن ازم کی گنجائش بہت ہی کم ہے، اس لیے کہ اس میں آزادی و خود بینی کا عنصر ایک پروقار اور بہت ہی بھیدہ جرات مندی کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اعتراف کر کے کہ "غالب کا اسلام پر عقیدہ راسخ تھا" (ص. ۴۰)، ڈاکٹر گوٹ نے غالب کے یہاں اس پیگن ازم کی جسے ڈاکٹر صاحب "کفر" (ص. ۳۷) سے تعبیر کرتے ہیں خود ہی نفی کر دی ہے، اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بجا اور درست ہے کہ غالب رسوم و قیود کی تقلید سے آزاد تھے۔ جب کہ اس قسم کی تقلیدی باپ پرستی خود اسلام میں روا نہیں اور اقبال بھی اجداد پرستی کے اس حد تک مخالف تھے کہ انھوں نے اعلان کر دیا،

اگر تقلید بودے شیوہ خوب

ہم سب ہم رہ اجداد رفتے

اگر تقلید کوئی اچھا طریقہ ہو، تو پیغمبر اسلام بھی اپنے اجداد کی کافراں و جاہلانہ روش اختیار کرتے، مضمون کے آخر میں غالب کے بارے میں ڈاکٹر گوٹ نے سب سے سچی بات ان کی غزل گوئی کے عظیم الشان کارنامے کے متعلق ان لفظوں میں کہی ہے:

"غزل اونچے میچ سے گزر کر نہ صرف زندہ رہی بلکہ زمانے کے نئے تقاضوں کی ترجمان بھی رہی اور ارتقا کی نئی سمتوں کی بشارت بھی دیتی رہی۔ غزل کو یہ راہ غالب ہی نے دکھائی تھی۔ اردو غزل کو اس حیات نو کے بخشنے میں غالب کی روایات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں غالب جدید ذہن کے معمار ادلیں بن جاتے ہیں۔" (ص ۴۳)

اردو شاعری اور ہندوستانی ہندیب کی تاریخ میں غالب کے فکر و فن کی اسی اہمیت یہی ہے۔ غزل یا شاعری میں میر کی فتوحات جو بھی ہوں وہ یقیناً ہماری ہندیبی روایات کا ایک بڑا حصہ اور ورثہ ہیں لیکن عصر حاضر میں اردو شاعری اور اس کے سر پایہ افتخار "غزل" کو جس نادر تجربے نے زندہ و تابندہ رکھا ہے وہ ایک بلند تخیل اور اس کے محکم الظہار کا وہ انداز و سلوب ہی ہے جس کی تشکیل سوداے کی اور اسے ترقی غالب نے دی جب کہ اس کی تکمیل اقبال کے ہاتھوں ہوئی۔

"آج کا ہندوستان اور مولانا، ابوالکلام آزاد کی معنویت" میں ڈاکٹر راج بہادر گوٹ نے مولانا کی

عظمت کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس میں دو نکات بہت نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے لفظوں میں :

”صحافت کا ناظر ادب۔ بے جوڑ نے والے غالباً وہ پہلے اردو صحافی ہیں۔“ (ص ۶۳)

حقیقت یہ ہے کہ ”اہل دل“ اور ”ابلاغ“ کی شاندار، معنی آفریں اور سحر انگیز زبان آج کے اردو جاننے اور پڑھنے والوں کے لیے کتنی ہی اجنبی اور مشکل ہو۔ مگر بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں اس کی فتوحات پر جو مشہور تبصرہ حسرت موہانی نے کیا ہے اور جس کے مطابق ابوالکلام آزاد کی نثر کو دیکھ کر نظم حسرت میں کچھ مزاح نہ رہا وہ بالکل صحیح ہے۔ مگر چہ مولانا آزاد کی بہترین نثر کے کمالات بعد میں ”ترجمان القرآن“ اور ”غبارِ خاطر“ کے زیادہ محکم اسلوب نگارش میں ظاہر ہوئے۔ دوسرا نکتہ بقول ڈاکٹر گوڑ یہ ہے کہ مولانا آزاد نے موجودہ ہندوستان کے سلسلے میں اسلامی نقطہ نظر سے دیگر علمائے دین کے برخلاف ”دارالسلام“ اور ”دارالحرب“ کے مقابلے پر اور دونوں کے بیچ میں ”دارالمن“ کے تصور کا تاریخی اجتہاد کیا۔ لیکن ڈاکٹر گوڑ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے ”وحدتِ ادیان“ کی بات کی ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ شاہ ولی اللہ نے وحدتِ ادیان کا تصور پیش کیا تھا۔ دراصل مولانا آزاد اور شاہ ولی اللہ دونوں نے دیگر مستند و مشہور علمائے اسلام کی طرح ”وحدتِ دین“ کے نظریے کی تشریح و توضیح کی۔ وحدتِ ادیان کا مطلب ہے کہ تمام مذاہب ایک دوران کی موجودہ سب شکلیں برحق ہیں، جب کہ وحدتِ دین کا مفہوم یہ ہے کہ دین اصلاً ایک ہے اور وہ دینِ فطرت ہے جس پر حیات و کائنات کا پورا نظام مبنی ہے۔ اس ہمہ گیر دین کی تعریف قرآن کی ایک مشہور آیت میں اس طرح کی گئی ہے :

اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے

پھر اسلام کی جو وضاحت قرآن کی متعدد آیتوں سے صریحاً ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام محض کسی ایک نسل فرقی کا مذہب نہیں ہے بلکہ خدا کا مقرر کیا ہوا وہ قانونِ فطرت ہے جس کی تابع داری تمام مخلوقات کو کرنی ہے۔ چنانچہ عربی میں اسلام کا لفظی معنی بھی خدا کی بندگی اور فرماں برداری ہے۔ یہ ایک نظریہٴ حیات ہے جو بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے ہے، جو اس کو تسلیم کرے وہ مومن

ہے، جو اس سے انکار کرے وہ کافر ہے۔ وحدتِ دین کا یہی تصور اپنے اپنے وقت میں، در اپنے اپنے طور پر شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد نیز دیگر مشاہیر علمائے اسلام بھی نے پیش کیا ہے۔ مولانا غلام رسول ہر کے ایک سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے اس پر ورے مسئلے کی وضاحت خود ہی "میرا عقیدہ" کے عنوان سے کتابی شکل میں کر دی ہے۔

"مولانا محمد علی جوہر — ایک خراج عقیدت اور ایک تجزیہ" میں ڈاکٹر راج بہادر گوٹ نے جو حقائق پیش کیے ہیں ان میں چند کا صرف بیان کر دینا یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کتنی وسعت نظر اور بصیرت کے ساتھ مولانا محمد علی کی شخصیت اور کارناموں کا مطالعہ کیلئے وہ کہتے ہیں:

۱۔ "علیؒ رحمہ تحریر اور آکسفورڈ کی تعلیم نے انہیں یہ سکھایا کہ سچائی کی تلاش اور روایت کے اضرام کے درمیان "ویرزش نہیں بلکہ رابطہ ہونا چاہیے" (ص ۱۶۹)

۲۔ "مولانا محمد علی کی اسلام پرستی اور وطن دوستی ایک دوسرے سے سترہ کار نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون کار ہیں۔" (ص ۱۷۰)

۳۔ "مولانا محمد علی تعلیمی نظام کی صحت پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں جدید تعلیم نے "مذہب پرستی سے زیادہ فرقہ پرستی" کو فروغ دیا ہے۔ ان کی رائے میں جمہوریت کے لیے ایک صحت مند تعلیمی نظام کی سخت ضرورت ہے جو لوگوں کے ذوق اور مزاج سے ہم آہنگ ہو۔" (ص ۱۷۵)

میرے خیال میں یہ سچائیاں ہیں جو کسی تبصرے اور تنقید کی محتاج نہیں۔ آج کے حالات میں انہیں مولانا محمد علی کے حوالے سے اجاگر کر کے ڈاکٹر گوٹ نے ایک علمی نیز عملی خدمت انجام دی ہے۔ یہ سچائیاں عصر حاضر کے ہندوستانی دانشوروں کو بلا امتیاز فرقہ و طبقہ دعوت فکر دیتی ہیں۔ "ادبی تناظر" کے تین اہم مضامین کے تجزیے سے آشکار ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر راج بہادر گوٹ صاحب نے چند دقیق موضوعات پر فکر انگیز سوالات اٹھائے ہیں اور بصیرت افروز بحثیں کی ہیں، مگر یہ ان کے بعض خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا، پھر وہ اپنے افکار کی وضاحت کے لیے بہر حال دلیلیں دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا



اندازِ نظرِ علمی ہے اور وہ ادبی مسائل پر بھی عالمانہ اسلوب سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ زیرِ نظر کتاب کے مضامین کی فہرست کے مدِ نظر ڈاکٹر خلیق انجم نے "حرفِ آغاز" میں بالکل بجا ارشاد کیا ہے :

"گوڑ صاحب کی تحریروں کا کینوس وسیع ہے۔ انھوں نے بہت متنوع موضوعات پر مقالے لکھے ہیں۔"

ڈاکٹر انجم کا یہ خیال بھی صحیح ہے :

"ادبی تناظر . . . ایک ایسے نقاد کی تحریروں کا مجموعہ ہے جو ادب اور سیاست دونوں میدانوں کا مرد ہے، جس کا اندازِ فکر ہمیشہ متوازن اور ہمدردانہ رہا ہے اور جس نے اپنے نظریاتی مخالفوں کو برا بھلا کہنے کے بجائے بہت نرم اور مدِ تل انداز میں اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔"

## ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی پچھترویں سالگرہ

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پچھتر برس کے ہو گئے۔ یہ بات آپ اور ہم تو اس لیے مان لیں گے کہ وہ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے تھے لیکن شاید خود ڈاکٹر گوڑ اس بات کو نہ مانیں کیوں کہ راج بہادر گوڑ کسی بھی بات کو اتنی آسانی سے نہیں مانتے۔ مجھے اس وقت اپنے خاندان کے ایک بزرگ یاد آ گئے جنہوں نے ساری زندگی ہنستے کھیلتے، دھو میں مچاتے ہوئے گزاری، نوے سال کی عمر میں بھی ان کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جو عموماً نو سال کے بچے کے ہونٹوں پر دکھائی دیتی ہے۔ بچی اور خالص مسکراہٹ، مگر جب وہ کیا نوے برس کے ہو گئے اور میں ان کی سالگرہ پر مبارکباد دینے گیا تو اُداس سے نظر آئے۔ اُداس کا سبب پوچھا تو کہنے لگے میں زندگی کے کیا نوے برس تو چٹکی بجائے میں گزار دیے لیکن اب اس سونے لگے کہ مجھ میں مزید بوڑھا ہونے کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس جملہ کو ادا کرنے کے بعد بھی وہ پندرہ برس تک زندہ رہنے کی گنجائش نکالتے رہے۔ اصل میں ان کی عمر کیلنڈروں سے طے نہیں ہوتی بلکہ اس کے اپنے احساس اور رویہ سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنے جذبہ و احساس کی سطح پر عمر کے س منہل سے گزر رہے ہیں جہاں ان میں مزید جوان بننے سے کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ میرا اپنا حال بدھت یہ ہو گئی ہے کہ میں کبھی کبھی اپنے آپ کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا بزرگ سمجھ بیٹھتا ہوں۔ حالاں کہ ڈاکٹر گوڑ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں میں نے غالباً اس وقت دیکھا تھا جب میں خود نو برس کا تھا۔ یہاں غالباً کا استعمال میں نے اس لیے کیا ہے کہ میں ان دنوں سابق ریاست حیدرآباد کے شہر گلبرگہ میں رہتا تھا۔ اور اپنے بڑے بھائیوں سے ملنے کے لیے کبھی کبھار حیدرآباد آ جاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی حیدر گوڑہ کے ایک مکان میں

رہتے تھے۔ ایک رات مجھے بلا کر تاکید کی گئی کہ میں مکان کے اس کمرہ میں بالکل نہ جاؤں۔ جو مکان کے پچھلے حصہ میں واقع تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ وہاں ایک جہان آیا ہوا ہے اور اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی کہا گیا کہ اگر کوئی یہ پوچھے کہ گھر میں کوئی جہان آیا ہوا ہے تو جواب میں یہ کہہ دوں کہ کوئی بھی نہیں آیا ہے۔ ایسے جہان کو دیکھنے کی تمنا بھلا کس بچے کے دل میں پیدا نہیں ہوگی۔ لہذا سخت تاکید کے باوجود میں نے چوری چھپے درازوں میں سے جھانک کر اس جہان کو دیکھا جو آرام تو خیر کچھ کھٹے پڑھنے میں ضرور مصروف تھا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ مونچھیں بھی شاید تھیں جو پتہ نہیں اہسلی تھیں یا نقلی۔ یہ غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ جب محمد مٹھی الدین، راج بہادر گوڑ اور ان کے دیگر کمیونسٹ ساتھی تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے سلسلہ میں روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور اپنے ٹھکانے بدل بدل کر اپنے آپ کو گرفتار ہونے سے بچا رہے تھے۔ میں نے ادھر جس جہان کا ذکر کیا ہے وہ ہمارے گھر میں رہا تو صرف ایک ہی دن لیکن اس کے گھر سے چلے جانے کے پانچ چھ برس بعد کسی نے بتایا کہ اس دن جو جہان ہمارے گھر میں رکھا تھا اس کا نام ڈاکٹر راج بہادر گوڑ تھا۔ جب مجھے اس کا پتہ چلا تو میں چودہ پندرہ برس کا بوجھکا تھا۔ اس وقت تک ڈاکٹر گوڑ جیل سے رہا ہو چکے تھے۔ میں اپنے دوستوں کو بڑے خزانے کے ساتھ اس وقت بھی بتایا کرتا تھا۔ اور آج بھی بتایا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر گوڑ نے کبھی ہمارے گھر میں بھی پناہ لی تھی۔ اگرچہ میں آج بھی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آج سے پچاس برس پہلے جس جہان نے ہمارے گھر میں پناہ لی تھی کیا وہ سچے سچے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ تھے۔ میں چاہتا تو پچھلے پچاس برسوں میں اپنے بڑے بھائیوں سے اس بارے میں پوچھ سکتا تھا۔ بلکہ خود ڈاکٹر گوڑ سے اس کی توثیق حاصل کر سکتا تھا۔ مگر میں نے کبھی نہیں پوچھا۔ اور آج بھی پوچھنا نہیں چاہوں گا۔ اس لیے کہ اگر خدا نخواستہ جواب نفی میں ملے تو میری زندگی میں سے ان سے رابطہ کے عرصہ میں اچانک پانچ چھ برسوں کی کمی ہو جائے گی۔ اور میں عمر کی اس منزل میں ہوں جہاں سینت سینت کر جمع کیے ہوئے لمحوں کو تفریق کے عمل سے گزارنا میرے لیے گھائے کا سودا ہوگا۔ فراق نے کچھ ایسی ہی ذہنی کیفیت کے بارے میں کہا تھا۔

سہ خود اپنے خیالوں کو ہمد م میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں

قصہ دراصل یہ ہے کہ راج بہادر گوڑ میرے لیے افسانہ بھی ہیں اور حقیقت بھی۔ یہ معاملہ صرف

میرا ہی نہیں یہ اس شخص کا ہے جس نے ملک کی آزادی سے پندرہ سولہ برس پہلے سابق ریاست  
حیدرآباد کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ شخصی حکمرانی کے اس دور میں جب اچھے ایجنوں کے مزہ بند  
رہتے تھے۔ مخدوم محی الدین، رومی نارائن ریڈی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں نے  
تلنگانہ کے کسانوں اور مزدوروں کو ساتھ لے کر مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ اس تحریک نے اس  
وقت کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ مخدوم محی الدین کا ترانہ

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا

گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا

اس وقت کے نوجوانوں میں بے پناہ مقبول ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جیل سے رہائی کے بعد  
مخدوم محی الدین کا جو جلوس نکلا تھا۔ اس سے بڑا جلوس میں نے آج تک نہیں دیکھا بلکہ جوں  
جوں میری عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے میرے حافظہ میں اس جلوس کی لمبائی بڑھتی ہی پہلی جا رہی  
ہے۔

مخدوم اور ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں اور یہ دونوں کسی اور افسانہ کے  
کردار لگتے تھے۔ ان لوگوں کی ردپوشی کے بارے میں بھی طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ جنہیں سن کر  
حساس ہوتا تھا کہ یہ اس دھرتی کے باسی ہیں۔ مثلاً مخدوم نے ایک بار اپنے ایک برہمن دوست کے  
گھر میں پنہاں لی۔ ان کا برہمن دوست تھا تو کیونٹ پارٹی کا ہمدرد لیکن اس کے والدین برہمن سہن  
اور کھانے پینے کے معاملہ میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ مخدوم کے دوست نے مخدوم کو کچھا رکھا  
تھا کہ اس کے والدین کو ہرگز یہ پتہ نہ چلنے پائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ مخدوم اس پر سختی سے عمل بھی  
کرتے رہے۔ ایک دن کھانے کی میز پر ان کے دوست کے والد نے باتوں باتوں میں مخدوم سے  
کہا: تم لوگ کیونٹ پارٹی میں کام کرتے ہو۔ تم لوگوں کے دین و ایمان کا کیا بھروسہ۔ کہیں تم لوگ  
گوشت وغیرہ تو نہیں کھاتے؟

اتنا سننے ہی مخدوم نے منہ میں جاتے ہوئے نوار کو روکا اور کہا "نعوذ باللہ لا حول ولا قوۃ"  
چھی چھی۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم گوشت کھاتے ہیں؟

ڈاکٹر گوڑ بھی کئی نام اور کئی بھیس بدل کر ردپوش رہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ یہ بھی غالب ۱۹۴۵ء



کی بات ہے کہ راج بہادر گوڑ ایسی ہی کسی "نعوذ باللہ" والی بات پر دھریے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ جیل میں پہنچ کر انھوں نے کسی بیماری کا بہانہ کیا۔ میڈیسن کے ڈاکٹر ہونے کا اتنا فائدہ تو وہ اٹھانا جاتے ہی تھے۔ پھر یہ اکیلے بیمار نہیں پڑے بلکہ اپنے ایک ساتھی کا مرہٹہ بوا اور منوی کو بھی ساتھ لے کر بیمار پڑے (حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو اسی کو کہتے ہیں) نتیجہ میں دونوں قیدی علاج کے لیے عثمانیہ اسپتال لائے گئے۔ اپنا علاج کرنا وہ خود تو جانتے ہی تھے۔ لہذا دونوں کچھ ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ اسپتال سے فرار ہو گئے کہ ان کے فرار ہونے کے ڈرامہ کا ذکر کئی دنوں تک حیدرآباد کے گلی کوچوں میں ہوتا رہا۔ ہماری فلموں میں بھی قیدی اس طرح فرار نہیں ہوتے جیسے یہ دونوں ہوئے تھے۔ میری نسل کے لوگوں کے ذہنوں میں مخدوم اور راج بہادر گوڑ ایک عرصہ تک افانوی کردار کی طرح ہی رہے۔ ۱۹۵۲ء میں جب یہ رہا ہوئے اور جب پہلی بار انھیں اصلی روپ میں دیکھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ یہی وہ راج بہادر گوڑ ہیں جن کے قصے الف بیل کی داستانوں کی طرح مشہور ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اصل راج بہادر گوڑ تو وہی تھے اور ۱۹۵۲ء کے بعد سے ہم جب ڈاکٹر گوڑ کو دیکھ رہے ہیں وہ اصل میں ایک جیس بدل ہوئی شخصیت ہے۔

معزز حضرات! آج کی محفل میں ہم جن بزرگ کی پھرتیوں سالگرہ منا رہے ہیں ذرا آپ ان کے ہاتھوں کی طرف غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ کیا کبھی ان ہاتھوں نے ہتھیار اٹھائے ہوں گے ان کے قریبی جاننے والے کہتے ہیں کہ ان ہاتھوں نے ضرور ہتھیار اٹھائے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اٹھائے تھے۔ میرے پاس ایک نہایت بوسیدہ اور پرانی گھڑی تھی۔ ایک بار وہ ہاتھ سے پھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ میں اسے ٹھیک کرانے کے لیے گھڑی ساز کے پاس گیا۔ گھڑی ساز نے پہلے تو اسے حقارت سے دیکھا اور پوچھا: کیا ہوا ہے اسے؟ میں نے کہا: یہ ہاتھ سے پھوٹ کر زمین پر گر گئی تھی۔ گھڑی ساز نے کہا: جب یہ زمین پر گر گئی تھی تو آپ نے اسے اٹھایا ہی کیوں؟ وہیں بڑی رہنے دیتے۔ ایسی ہی بات ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں ذہن میں آتی ہے کہ جب آپ کو ہتھیار ڈالنے ہی تھے تو انھیں اٹھانے کی زحمت ہی کیوں کی تھی۔ پھر ذرا سوچئے کہ کیا ان ہاتھوں نے کبھی کسی پر گولی چدائی ہوگی۔ اور اگر چلائی بھی ہوگی تو کیا گولی نشانہ پر لگی ہوگی۔ آج ان

ہاتھوں کو دیکھ کر ان کہانیوں پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ہوں ہاتھوں سے منسوب رہی ہیں۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ بارہ برس پہلے جب مجھے جاپان جانے کا موقع ملا تو ڈاکٹر گوڈ کے تعلق سے میری غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا۔ جاپانیوں کے ہاتھ بہت خوب صورت ہوتے ہیں میں ان کے ہاتھوں کو دیکھتا جانتا تھا اور گھنٹوں حیرت میں مبتلا رہتا تھا کہ کیا سچ مچ ان ہاتھوں نے دوسری جنگ عظیم میں گولیاں چلائی تھیں اور بم پھینکے تھے۔ اصل میں تاریخ مختلف ادوار میں ہاتھوں سے مختلف کام لیتی ہے اور ان کے کاموں کی نوعیت کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ تاریخ نے ڈاکٹر گوڈ کے ہاتھوں سے اب ہتھیار پھین لینے ہیں اور ان میں ایک قلم تھما دیا ہے کہ وہ اسے چلاتے رہیں۔ اس سے پہلے قدرت ان کے ہاتھوں میں اسٹیمسکوپ تھما نا چاہتی تھی جسے پھینک کر انھوں نے ہتھیار اٹھالے تھے۔

مجھے اس وقت اپنے ایک دوست کی یاد آرہی ہے جو نہایت کم عمری میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کے ذمہ کام یہ تھا کہ راج بہادر گوڈ اور ان کے ساتھیوں کو ہتھیار فراہم کرتے رہیں۔ ایک بار یہ اسلحہ لے جاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ بعد میں پولیس نے ایسی کڑی تفتیش کی کہ بی پی رے کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس واقعہ کے کئی برس بعد انھیں علاج کے لیے سوویت یونین روانہ کیا گیا جہاں ان کی ریڑھ کی ہڈی کی مرمت کی گئی۔ وہ علاج سے مطمئن ہو کر خوش خوش واپس تو ہو گئے لیکن چند ہی برسوں میں خود سوویت یونین کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان پچھتر برسوں میں نہ جانے کتنوں کی ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹیں لیکن ہمارے ڈاکٹر راج بہادر گوڈ کی ریڑھ کی ہڈی اب بھی صحیح و سالم ہے۔ ورنہ ہمارے کتنے ہیرو اور کتنے محبوب تھے جن کا سفر نہ جانے کیا ہو گیا۔ ایک شعر یاد آ گیا۔

زمانہ کس قدر پامال کر دیتا ہے انسان کو

ہمارے دور کے محبوب پہچانے نہیں جاتے

اصل میں ڈاکٹر راج بہادر گوڈ نے لمحہ موجود میں پوری شدت کے ساتھ جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ ہم جیسے تو ابھی سے ساحل پر بیٹھ کر زندگی کے منجھدار کا تماشا دیکھنے لگے ہیں۔ لیکن راج بہادر گوڈ ہیں کہ اب بھی اس منجھدار میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے پورے پچاس برس

بیت گئے۔ پچاس برس پہلے ان میں جو حیرت دیکھی تھی وہ آج بھی ان کی ذات میں موجود و محفوظ ہے اور اس شے کو سیلاب صفتی کہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے ایک لمحہ کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے نتیجہ میں ان کے مزاج میں بلا کی تیزی پستی اور پھرتی نظر آتی ہے۔ جلد بازی اور عجلت ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مجھے یاد ہے پچھلے سال کے اواخر میں ایک دن صبح صبح پھر بچے میرے گھر کے آس پاس اچانک کسی کے پکاسنے کی آوازیں آنے لگیں، میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو محسوس ہوا کہ کوئی بڑی تیزی کے ساتھ میرے فلیٹ تک آنے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ میرا مکان چوتھی منزل پر تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کی زقار اور میرا نام پکارنے کی تکرار سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی بھونچا سا آنے والا ہو۔ میں نے گھر کے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنی کمزن سسٹر اودیش رانی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ بونے اپنے مسخرے اتنی دیر تک سوتا ہے۔ میں نے کہا ایک زمانہ تک سرخ سویرے کے آنے کی امید میں بہت جلدی بیدار ہو جایا کرتا تھا۔ یہ تو نہیں آیا۔ اب جلدی جاگ کر کیا کروں گا۔

یہ سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی پیشانی پر ایک ہلکی سی چوٹ تھی جسے وہ بار بار سہارا رہے تھے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہو گیا؟" بونے "تمہارے گھر کے زینے کو تیزی سے طے کرنے کی کوشش میں میری پیشانی ریلنگ سے ٹکرا گئی اور کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "آپ کو اتنی عجلت سے سیڑھیاں چڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟" بونے "ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ اودیش رانی نے بالآخر شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ آج سے پانچ دن بعد ان کے دوہامیاں آنے والے ہیں۔ اور پچھلے دن ہر حالت میں ان کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے شادی میں شرکت نہ کر سکوں گا۔ لہذا "کورٹ میریج" کے سارے امور تمہیں طے کرنے ہوں گے۔ کیا دان بھی تمہیں کرنا ہوگا۔

میں نے کہا "گوڑ بھائی! یہ تو سب ہو جائے گا۔ مگر آپ کو سیڑھیاں چڑھنے میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں بھی اودیش رانی کی عمر اب پچاس برس کی ہو گئی ہے۔ جہاں اتنی تاخیر ہوئی ہے وہاں پانچ دس منٹ کی اور تاخیر ہو جانی تو کیا فرق پڑتا۔"

ہنس کر بولے "پیارے! پچاس برس کی عمر ہو گئی ہے اسی لیے تو عجلت نہایت ضروری تھی ورنہ تیس تیس برس کی عمر ہوتی تو مزید سال دو سال انتظار کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں تھی" یہ کہہ کر وہ فوراً واپس جانے لگے۔ میں نے انھیں بہت روکا کہ ناشتہ کر کے جائیں لیکن وہ بالکل نہیں رُکے۔ جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے چلے بھی گئے۔

ڈاکٹر مزاج بہادر گوڑ کی ایک اور خرابی ناخوبی یہ ہے کہ یہ اپنے سے پھوٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں بلکہ اتنا خیال رکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد پھوٹے اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھنے کی غلطی کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ پھوٹے آدمی کا بڑا پن کتنا کھوکھلا ہوتا ہے۔ یہ جب کسی کی ہمت افزائی کرتے ہیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء میں جب میرے مزاجیہ مضامین کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو ڈاکٹر گوڑ نے میری مزاج نگاری کے بارے میں ایک طویل اور جامع مقالہ لکھا۔ میری مزاج نگاری کے بارے میں اس وقت تک کسی نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ مگر ان کا مضمون سن کر میں ہکا بکا سارہ گیا کیوں کہ انھوں نے میری مزاج نگاری میں جو خوبیاں تلاش کی تھیں وہ خود مجھے نظر نہیں آرہی تھیں۔ چنانچہ جلسہ کے بعد میں نے ان سے شکایت کی کہ حضور آپ نے میری بہت زیادہ تعریف کر دی جس کا میں مستحق نہیں تھا۔

بولے "میاں! اس کو تعریف نہیں کہتے۔ ہمت افزائی کہتے ہیں ہمت افزائی"۔

میں نے کہا "مگر مجھ میں اتنی ہمت افزائی کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

ہنس کر بولے "اپنی ذات میں تھوڑی سی خوش فہمی پیدا کر لو تو یہ ہمت بھی آجائے گی۔"

چنانچہ ڈاکٹر گوڑ کا مضمون اب بھی میرے پاس محفوظ ہے جسے میں اکثر اوقات اپنے آپ میں خوش فہمی پیدا کرنے کے خیال سے پڑھ لیتا ہوں۔ اور میری نا اہلی دیکھیے کہ یہ خوش فہمی آج تک مجھ میں پیدا نہیں ہوئی۔ یہ نہ سمجھے کہ ڈاکٹر گوڑ نے میرے ساتھ یہ خصوصی سلوک کیا تھا۔ پچھلے تین چار دہوں میں ڈاکٹر گوڑ نے سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی ہے اور حتی المقدور انھیں خوش فہمی میں مبتلا کیا ہے۔ ہر کوئی میری طرح نا اہل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں کہنے کو میرے پاس بہت سی باتیں ہیں۔ لیکن اس وقت مجھے چند سال پہلے دسمبر کی ایک شام یاد آ رہی ہے۔ حیدرآباد میں ایک دوست کی بیٹی کی شادی میں



ڈاکٹر گوڑ سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ بابری مسجد کو گرے ہوئے سات اٹھ دن ہی بیتے تھے۔  
 ڈاکٹر گوڑ نے آتے ہی میزبان سے کہا، ”بھئی کھانا جلدی لگوادو۔ میں زیادہ دیر نہیں رُک سکتا۔“  
 میں نے کہا، ”گوڑ بھائی! یہ آپ نے کب سے کھانے میں دلچسپی یعنی شروع کر دی۔“  
 بولے، ”نہیں! مجھے پرانے شہر میں ایک میٹنگ میں جانا ہے۔“  
 میں نے پوچھا، ”کوئی ادبی محفل ہے؟“

بولے، ”دیکھ نہیں رہے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اور تمہیں ادبی محفل کی سوچ رہی ہے  
 پرانے شہر میں ایک میٹنگ ہے بابری مسجد کے انہدام کے خلاف۔“  
 میں نے کہا، ”گوڑ بھائی! بابری مسجد کے انہدام کے خلاف آپ کیا کہیں گے۔ یہ میں اچھی طرح  
 جانتا ہوں۔ لیکن یہ بتائیے کہ آج کے حالات میں کون آپ کی عقلمندی اور ہوشمندی کی  
 باتیں سنے گا۔“

غصہ سے بولے، ”کسی کو نہ سنا ہو تو نہ سنئے۔ مگر مجھے جو کہنا ہے وہ تو میں کہتا ہوں گا۔  
 اگر کوئی مجھے نہیں سنا چاہتا تو میں ہی اپنے آپ کو اپنی باتیں سناتا رہوں گا۔“  
 ایسے موڈ میں ان سے بحث کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے عافیت اس میں جاتی کہ اپنے  
 حلوے مانڈے سے مطلب رکھوں۔

ڈاکٹر گوڑ نے آج سے پچاس پچپن برس پہلے جس عقیدہ اور مسلک کو اپنایا تھا اس پر  
 آج تک اسی طرح قائم ہیں۔ انسان دوستی، محبت، پیار اور رواداری کا مسلک — دنیا میں  
 کیا نہیں ہوا۔ لیکن یہ بدستور اپنے مسلک کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ دامن بھلے ہی چاک  
 ہو گیا ہو لیکن انھوں نے اپنے مسلک کو چاک نہیں ہونے دیا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر گوڑ مجھے ایک  
 ایسے عوامی رہنما نظر آتے ہیں جو انسانوں کی بھیڑ میں تنہا رہ گئے ہیں۔ ہجوم کی تنہائی کو  
 جو لوگ محسوس کر سکتے ہیں وہ اس نکتہ کو بخوبی سمجھ پائیں گے۔ میں انھیں سچے، مخلص بے لوث  
 اور بے غرض رہنماؤں کی نسل کی آخری نشانی سمجھتا ہوں۔

اگر میں صاحب اقتدار ہوتا تو ایسے بچے کھچے رہنماؤں کی ایک سینکڑی Sanctuary  
 بناتا تاکہ یہ یہاں محفوظ رہیں اور ہمارے موجودہ رہنما انھیں دیکھ سکیں۔ کوئی سبق تو وہ خیر کیا

حاصل کر پائیں گے۔ مگر انہیں دیکھ لینے میں کیا قیامت ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ ایک سوال میں ڈاکٹر گوڑ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ آج کے حالات میں پھر پارلیمنٹ کے ممبر بننا پسند کریں گے؟ مجھے ڈر ہے کہ اگر کوئی انہیں پھر سے پارلیمنٹ میں بھیجنے کی کوشش کرے تو کہیں وہ پھر سے ہتھیار نہ اٹھالیں۔

میری دعا ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ برسوں ہمارے درمیان رہیں اور ہماری ہمت افزائی کرتے رہیں۔ اور ہم میں وہ خوش فہمی پیدا کرتے رہیں جس کے بغیر آج کے دور میں زندہ رہنا دشوار نظر آنے لگا ہے۔

---

## ڈاکٹر گوڑ کی تنقیدی نگارشات

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی شخصیت کے بنیادی اوصاف کی تلاش کی جائے تو ان کی نظریاتی وفاداری، کثیر الجہت بصیرت، بذلہ بخشی اور ذکاوت، سد بہار استعداد اور بے کراں توانائی کو نمایاں جگہ دی جائے گی۔ وہ ہمیشہ اپنی ذات سے اور اپنے ماحول سے آمادہ صلح رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ جدوجہد میں گزرا۔ لیکن بچوں کو یہ جدوجہد اپنی ذات کی فیض رسانی کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد انسانی حقوق کی بحالی اور ظلم و استعمار کی طاقتوں سے انسان کی نجات تھی۔ اس لیے اس طویل جدوجہد اور ڈھلتی ہوئی عمر کے باوجود ان کے مزاج میں کوئی تلخی، بیزاری اور بیگانگی پیدا نہیں ہوئی۔ باطنی ہم آہنگی اور آشتی کا یہی وہ احساس تھا جس نے انھیں شعر و ادب کی طرف متوجہ کیا۔ ٹریڈ یونین تحریک اور پارٹی کی ہمدستی سرگرمیوں کے باوجود وہ بڑی محویت اور دلچسپی سے اردو ادب کا مطالعہ کرتے رہے۔

اردو زبان اور اس کے تہذیبی سرچشموں سے محبت ڈاکٹر گوڑ کی خاندانی وراثت کا ایک متحرک حصہ تھی۔ ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی یہی زبان تھی۔ جو آزادی سے قبل ارض دکن کے اس خطہ میں ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر رہی تھی۔ اس پر مستزاد مخدوم محی الدین، عابد علی خاں، ڈاکٹر حسینی شاہد اور زینت ساجدہ جیسے احباب کی رفاقت۔ جو انھیں انجمن ترقی اردو اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی تقریہوں، جلسوں اور سرگرمیوں میں کھینچ لاتی تھی۔ اس طرح تو اتر کے ساتھ ان کے ادبی ذوق کی تربیت ہوتی رہی اور کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ ہم عصر ادب کے رجحانات اور مسائل سے ان کی واقفیت گہری ہوتی گئی۔

ڈاکٹر گوڑ کی ذہنی اور ادبی تربیت کا دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ دوسری قومی زبانوں کی طرح اردو میں بھی یہ تحریک شعر و ادب کی ہر صنف اور ہر حلقہ میں اپنا سکہ جھار رہی تھی۔ برطانوی سامراج اور جاگیرداری کے شکنجے سے آزادی کی جدوجہد میں یہ تحریک عوام کو ایک نیا حوصلہ بخشنے لگی تھی۔ اس زمانہ میں سوویت نظریہ ساز Zhadanov کے سوشلسٹ ریٹزم کے تصور نے بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل کی جس کے تحت شعر و ادب کی تخلیق کو طبقاتی پیکار اور اشتراک کی نظام کو تعمیر کی جدوجہد سے مربوط کر دیا گیا تھا۔ اردو میں بھی کچھ ادیب اور نقاد اس نظریہ کے حامی تھے۔ اس کے نتیجہ میں ادب میں مارکسی نظریات کو مستند اور میکائلی ڈھنگ سے نافذ کرنے کی روش بھی پیدا ہو چلی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر گوڑ کی تحریروں میں مارکسی نظریات کا اطلاق میکائلی تفہیم اور انتہا پسندانہ تعبیر کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس متوازن رویے کا ایک سبب شاید یہ ہو کہ انھوں نے کلاسیکی اردو شاعری کا مطالعہ بھی بڑے انہماک اور شوق سے کیا ہے اور کلاسیکی شعری روایت سے وہ کما حقہ مانوس تھے۔ اس سلسلہ میں مرزا غالب، میر انیس اور جلیل مانک پوری جیسے کلاسیکی مزاج کے شعرا پر ان کے مضامین کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مارکسی فکر نے انھیں معروضی تجربہ اور علمی استدلال کی جو روشنی دی تھی اور ادبی فن پاروں کو سماجی تہذیبی اور تاریخی حقائق کے ہم گیر پس منظر میں سمجھنے کا جو شعور بخشا تھا اس سے وہ دست بردار ہو گئے۔ اس کے برعکس اس شعور و آگہی نے ان کے مضامین کو تاثراتی رائے زنی کی سطح سے بلند کر کے علمی وزن و وقار عطا کیا۔

ڈاکٹر گوڑ کے مضامین اور تنقیدی تبصروں پر مشتمل اب تک تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ یعنی ”ادبی مطالعے“ ”ادبی جائزے“ اور ”ادبی تناظر“ ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اولاً وہ مضامین جو کلاسیکی شعرا کے بارے میں ہیں۔ دوم وہ مضامین جن کا موضوع ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ہیں اور سوم ایسے مضامین جن میں انھوں نے زبان اور ادب کے نظریاتی مسائل سے بحث کی ہے۔

ایک مضمون میں ڈاکٹر گوڑ نے میر انیس کی شاعری کا ایک نئے زاویہ سے مطالعہ کرتے ہوئے اس کی سماجی غایت پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس سے اہم مقالہ وہ ہے جس میں انھوں نے اردو اور



تیلگو شعر و ادب پر واقعات کر بلا کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے روایات سے ہٹ کر تاریخی شواہد کے حوالے سے بتایا ہے کہ دکن کی ابتدائی شاعری سے لے کر عہد حاضر تک کس طرح حضرت امام حسینؑ اور ان کے اعزاء اور رفقا کی شہادت نے تخلیق کاروں کے فکر و تخیل کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے تاریخی عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اورنگ زیب کے ہاتھوں اپنے محبوب بادشاہ ابو الحسن کی شکست کے بعد دکن کے شاعروں نے اپنے غم و اندوہ کے اظہار کے لیے مرثیہ کا سہارا لیا۔ اور بہت سے سنی مسلک شعرا بھی مرثیہ گوئی میں منہمک ہو گئے اسی طرح انھوں نے شواہد سے بتایا ہے کہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت اور ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں اودھ کی حکومت کے زوال نے وہاں عزاداری اور مرثیہ گوئی کو فروغ دیا۔ وہ مرثیوں کو تہذیبی اور عوامی معنویت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”انیس کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے مضامین کو اتنی وسعت دی اور اس میں ایسی آفاقیت پیدا کی کہ وہ ایک مخصوص مذہبی دائرے سے نکل کر ہر مذہب اور ہر ملک کے لوگوں کے دلوں کو گرم کرنے اور ان کو دعوت فکر و نظر دینے لگا اور یہی حق و باطل کے درمیان کر بلا کے عظیم معرکے کا تقاضہ تھا۔“

ادبی مطالعہ ص ۱۲۵

”مذہبی ملاؤں کے داؤں پیچ چا ہے جو ہوں عوام تو اس میں اپنی روحانی تسکین اور تہذیبی آسودگی کی راہیں نکال لیتے ہیں۔ اس طرح واقعات کر بلا میں ہندوستان کے عوام نے حق کے لیے قربانی کی عظیم مثال دیکھی اور اس سے اپنی تہذیبی تخلیقیت کو نئی آب و تاب دی۔“ ص ۱۳۵

اپنے مضمون ”غالب اور جدید“ میں ڈاکٹر گوڑا ن عوام اور ان عناصر کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ ہومزنا غالب کو جدید احساس و آگہی اور دانش و فکر کا پیش رو بناتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

”غالب ناموافق اور نامساعد حالات دہر سے مفاہمت کے لیے تیار نہیں۔ ان کا غم غم ضرور ہے لیکن غم انھیں ترک دنیا کی طرف نہیں لے جاتا۔ زندگی سے مایوس نہیں کرتا بلکہ ”اچھے حالات“ کے تصورات ان کے لیے نشاط کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

ان کے پاس 'غم موجود' کے علاوہ نشاط آزد بھی ہے اور یہی غالب کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرتا ہے۔  
ادبی مناظر ص ۳۶

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گوڑ کے تنقیدی رویے کی کچھ اصولی بنیادیں ہیں۔ جن کا اطلاق وہ قديم کلاسیکی اور معاصر دونوں زمانوں کے تخلیق کاروں پر یکساں قدرت سے کرتے ہیں۔ وہ فن کار کے ذہنی جذباتی اور تخلیقی رویوں میں ایسے اوصاف و عناصر تلاش کرتے ہیں جو انسانیت کی نجات کے اعلیٰ آدرشوں سے ہم آہنگ ہوں۔

معاصرین میں یوں تو انھوں نے ان گنت شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، سجاد ظہیر، نیاز حیدر اور ظفر گورکھ پوری شامل ہیں۔ لیکن اس سلسلہ کے سب سے اہم مضامین شاید وہ ہیں جو انھوں نے مختلف موقعوں پر مخدوم محی الدین کے بارے میں لکھے ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ انھوں نے مخدوم کو زندگی کے ہر دور میں بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اپنے ان مضامین میں ڈاکٹر گوڑ نے مخدوم کا عہد، ان کی زندگی ان کی جدوجہد اور ان کی شاعری میں ایک سلسلہ ارتباط و عمل تلاش کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دس بارہ سال پہلے کے لکھے ہوئے ان مضامین میں انھوں نے کیونٹ پارٹی اور جمن افراد کی افسوسناک کمزوریوں کو بے نقاب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس طرح بڑی جرأت اور دیانت سے انھوں نے مخدوم کے اس کردار کو ابھارا جس کی شفاف پرچھائیاں ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

”نہ ۱۹۵۷ء کے اواخر اور ۱۹۵۸ء کے اوائل میں پارٹی کے اندر پالیسی کے تعلق سے سخت بحث چھڑ گئی تھی۔ مخدوم نے پہلے فروری ۱۹۵۸ء کی پارٹی کانگریس کی لائین اور بی۔ ٹی۔ رندیوے کی تاویلات سے بالکل اتفاق کرتے تھے نہ ۱۹۵۷ء کے وسط سے یہ سوچنے لگے کہ پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور پھر تلنگانہ میں ہتھیار بند جدوجہد جاری رکھنے پر بھی شبہ کا اظہار کرنے لگے۔ چنانچہ اس بنا پر اس زمانہ کی پارٹی قیادت نے مخدوم کو نظر انداز کرنا شروع کیا اور یہ پارٹی کا دطیرہ سا بن گیا تھا کہ جو بھی پالیسی کے صحیح ہونے پر شبہ کا اظہار کرتا خود اس پر شبہ کیا جانے لگا۔ اور اسے الگ

کمر دیا جاتا۔ اس زد میں مخدوم بھی آگئے۔ اور یہ مخدوم کے لیے محنت کرب اور آنائش کا دور تھا۔ اسی زمانہ میں ۲۴ اپریل ۱۹۵۱ء کو میں راج کوئٹہ کی پہاڑیوں میں گرفتار ہوا۔ اور کچھ ہی دنوں بعد مخدوم حیدر آباد میں گرفتار کر لئے گئے۔ یہ بھی یوں ہوا کہ ایک صاحب نے جو پولس ایکشن کے بعد رضا کار دور کے اپنے کرتوتوں کی بنا پر پولس کے ہمدے سے معطل کر دئے گئے تھے۔ اپنی باز ماموری کے لیے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہی مخدوم کو گرفتار کر دیا۔ لیکن ان کی اس غداری کا ان کی بیوی پر اتنا اثر ہوا کہ وہ بیمار ہو گئیں اور پھر جانبر نہ ہو سکیں۔

مخدوم کا نام لیتے ہوئے مر گئیں؟  
ادبی مطالعہ صفحہ

ان مضامین کی اہمیت کے کئی پہلو ہیں۔ گزشتہ پچاس سال میں آندھرا پردیش کے محنت کش عوام نے جو سیاسی اور انقلابی لڑائیاں لڑی ہیں مخدوم اور ڈاکٹر گوڈرہ صرف ان میں برابر کے شریک رہے ہیں بلکہ اکثر موقعوں پر رہنمائی بھی کی ہے۔ روپوشی اور قید و بند میں بھی دونوں اکثر ساتھ رہے۔ ان مضامین میں اس جدوجہد کی دلچسپ اور مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ پھر یہ کہ اس عہد میں مخدوم کا تخلیقی سفر بھی جاری رہا۔ ان مضامین میں مخدوم کی بے شمار نظموں کے حرکات اور ماخذوں کا پتہ بھی چلتا ہے مثلاً، ویلی، قید، آخر شب اور چارہ گر جیسی نظمیں۔ صرف یہی نہیں ڈاکٹر گوڈرہ ان نظموں کے ایسے علامتی مفہام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی طرف عام قاری کا ذہن مشکل سے جاتا ہے۔ مثلاً چارہ گر کے درج ذیل مصرعے نقل کر کے وہ لکھتے ہیں۔

یہ بتا چارہ گر

تیری زنبیل میں

لنحوہ یکمیا ئے محبت بھی ہے

کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے۔

”یہاں وہ کمیونٹ رہنماؤں کے اس قبیلے پر چوٹ کرتے ہیں جن کو اپنی ہمدانی پر ناز ہے۔ اور جو سمجھتے ہیں کہ ہر مسئلے کا حل ان کے پاس موجود ہے۔“

ادبی مناظر صفحہ ۹۲

رہی اذراؤں کے بجائے ایک سلجھے ہوئے قاری کی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ مثال کے طور پر اپنے مضمون "جہا یاتی حسن" میں وہ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ جہا یاتی "مست کا سرچشمہ" وہ ترتیب و آہنگ ہے جو زندگی میں قدرت کے نظام میں یا فن و ادب میں ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ حسن و جمال کی سماجی افادیت کو بیان کرنے کے لیے بوجھل مارکی اصطلاحات کا سہارا نہیں لیتے۔ اسے ایک دوسرے سادہ اور عام فہم انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محنت اور اس کے مقصود سے انسان کا جذباتی لگاؤ اس کے وجود میں ایک خاص دل بستگی پیدا کر دیتا ہے۔ محنت کرنے والا ایک چیز تیار کرتا ہے۔ اس کی افادیت اور اس کی متناسب بناوٹ دونوں ہی اسے حسین بناتی ہیں۔ لوگ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوتے اور بنانے والے کی محنت کی داد دیتے ہیں۔ بس یہی وہ وصف ہے جو محنت کرنے والے اور محنت کے موضوع کے درمیان جذباتی لگاؤ پیدا کرتا ہے۔ یہی لگن اور لگاؤ جہا یاتی انبساط کا داخلی سرچشمہ ہے۔

اپنے مضمون "ادب اور تصوف" میں وہ متصوفانہ شعر و ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ملک کی عوامی اور مزاحمتی تحریکوں سے اس کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ مثالوں کے ساتھ وہ بتاتے ہیں کہ اس تحریک نے ایک طرف ایک رابطہ کی عوامی زبان کو فروغ دیا تو دوسری طرف مختلف مذہبی اور نسلی گروہوں کے درمیان اتحاد و یک جہتی کے تصور کی آبیاری کی۔ ڈاکٹر گوڑ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"اسلامی وحدانیت کی تعلیمات پر ہندو ویدانت کا پانی چڑھا کر صوفیوں اور بھگتوں نے ایک زبردست فکری لہر دوڑادی جس نے تصوراتی اور عملی دونوں سطحوں پر عوامی اتحاد اور قومی یک جہتی کو بڑھا دیا۔ صوفیوں اور صوفیانہ ادب کے اس کارنامے کو ہندوستانی قومی یک جہتی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔"

ادبی مطالعہ ص ۱۹۷

ایک دوسرے مضمون میں ڈاکٹر گوڑ نے جدیدیت کی تعریف متعین کرتے ہوئے حقیقت پسندی کی روایت سے اس کی آویزش پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ جدیدیت کے بعض حامیوں کی طرح وہ یہ مان کر چلتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ تہذیب بحران کا شکار ہے۔ اس کے عہد عروج کی قدریں



اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر گوڑ نے بجا طور پر مخدوم کو محنت اور محنت کے نامندہ شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور دلائل سے بتایا ہے کہ مخدوم کی سیاسی اور شاعرانہ شخصیت کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ عوام کی انقلابی جدوجہد میں شرکت اسے مرد آہن بناتی ہے۔ لیکن خلوت میں انسان کی غریبی، غلامی اور عظم و اندوہ کے بارے میں سوچ کر اس کا دل موم ہو جاتا ہے۔ یہی جذبہ انسان دوستی کے غنائی نغموں میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”مخدوم نے محنت اور محنت دونوں ہی کو محروم اور مجبور دیکھا ہے۔ دونوں ہی کو مصروف جہاد دیکھا ہے۔ اس لیے وہ دونوں ہی کی جیت اور کامرانی کی دعا کرتے ہیں۔ یہی مخدوم کی شاعری کا مرکزی خیال ہے۔ مخدوم کے ہاں پرچم عشق اور عظم بغاوت ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ وہ قلم کو تلوار اور تلوار کو قلم میں تبدیل کر دینے کے ہنر سے واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں انقلابی مزدور تحریک کی مصروفیتیں اور شعری تخلیق کی خلوتیں ایک دوسرے سے ستیزہ کار نہیں بلکہ ایک دوسرے کی شریک کار ہیں۔“

ادبی مطالعہ ص ۹

مخدوم کے علاوہ دوسرے معاصرین پر لکھے ہوئے مضامین بھی سرسری نہیں ہیں۔ یہاں بھی ڈاکٹر گوڑ کے تنقیدی رویے میں علمی تلاش و جستجو کا رجحان حاوی نظر آتا ہے۔ وہ تخلیق کی اندرونی صداقتوں کو معروفی سچائیوں کے تناظر میں دریافت کرتے ہیں۔ اس طرح کہ قاری ان کے حکماء لیکن شگفتہ استدلال کے ساتھ بہہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا آزاد، اکبر الہ آبادی، سروجنی نائیڈو کے بارے میں ان کے مضامین۔

ڈاکٹر گوڑ نے اگرچہ نظریاتی مضامین کم لکھے ہیں لیکن جو چند مضامین ان کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ وہ فنِ داد کے والے سے ان کے پاکیزہ اور متوازن ادبی ذوق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے بعض دوسرے مارکسی نقادوں کی طرح کوئی میکانیکی رویہ نہیں اپنایا اور نہ ہی ایسی فلسفیانہ موٹوگافیاں کی ہیں جو عام قاری کی فہم سے ماورا ہوں۔ حالاں کہ مارکسزم کا مطالعہ انھوں نے جس دقت نظر سے کیا ہے وہ بجا طور پر اس کی صلاحیت رکھتے تھے کہ جدیدیاتی یا تاریخی مادیت کے والے سے فنِ داد کے سرچشموں کا سراغ لگائیں لیکن انھوں نے نقاد کے

شکست و ریخت کے ٹل سے گزر رہی ہیں۔ نتیجہ میں حساس فنکار بے یقینی پر آگندگی، خوف، سرایمگی، تنہائی اور بیگانگی کے روحانی کرب سے گزر رہا ہے۔ لیکن یہ کل حقیقت تو نہیں ہے۔ اگر ایک تہذیب مردہ ہی ہے تو ایک نئی تہذیب ابھر بھی رہی ہے۔ شکست آرزو اور محرومیوں کے ساتھ ساتھ خواہشوں کی تکمیل کے نئے امکانات بھی جنم لے رہے ہیں۔ وہ وجودی فلسفہ پر بھی کڑی تنقید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ماضی پرستی اور موت کا ہمہ گیر احساس، زندگی کے حسن اور حرکت کے شعور سے محروم کر دیتا ہے۔ لکھتے ہیں:

اگر ہمارے ذہن پر ماضی مسلط رہے اور حال پر اس کے حبیب سائے پڑتے رہیں تو مستقبل نظروں سے اوجھل رہے گا۔ نا اُسودگی چھائی رہے گی اور ممکن الحصول کی کشمکش بے سود معلوم ہوگی۔ یہیں سے بیزاری، یاس اور ناامیدی کا شدید غلبہ شروع ہوتا ہے اور وہ ماضی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو فنکار کو تخلیقی فن کی امید افزا دادیوں سے دور کر دیتی ہے۔

#### ادبی مطالعے ص ۲۰۸

یہ مضمون سو سال قبل لکھا گیا تھا۔ اس دوران جدیدیت کی تحریک مسلسل رو بہ زوال رہی۔ نئی پیرہنی کے ادیبوں نے جدیدیت کے توانا اور صالح عناصر سے استفادہ کرتے ہوئے معاصر زندگی کی پچائیوں سے آنکھیں چار کیں اور اس طرح ادب میں ایک نئی حقیقت پسندی اور ایک نئے بھالیاتی شعور نے فروغ پایا۔ جو توازن، ہم آہنگی اور دردمندی کے اس جذبہ سے معمور ہے جس کی طرف ڈاکٹر گوڈرنے اپنے مضامین میں اشارہ کیا ہے اور جو ان کی عملی تنقید کی بنیاد ہے۔

مارکسی ادیبوں کے تنقیدی مضامین کی نثر اکثر بڑی بے کیف اور خشک ہوتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر گوڈرن کی تحریروں میں وضاحت اور روانی کے ساتھ تازگی اور شگفتگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان کے مطالعو کی وسعت اور تجرباتی قوت ان کے مضامین کو استناد عطا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اپنے ذاتی تجربہ اور ذاتی مشاہدہ کے بیان سے مضامین میں دلچسپی کے نئے عناصر پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب جب کہ پارٹی میں ان کی عملی سرگرمیاں برائے نام رہ گئی ہیں وہ اپنے ادبی اور تنقیدی مشاغل کو زیادہ وقت دے سکیں گے۔

# ڈاکٹر راج بہادر گورادنی تناظر کے آئینے میں ایک جائزہ

حیدرآباد۔ فرخندہ بنیاد۔ وہ شہر جس کی بنیاد قلی قلیب شاہ کی محبت نے رکھی تھی۔ نظام تک آتے آتے ایک ایسا شہر بن گیا تھا جہاں اپنے وقت کا سب سے دولت مند شخص حکمراں تھا۔ وہ شہر تھا والی ریاست کی شان و شکوہ کے ناروا اظہار کا۔ وہ شہر تھا نظام کے نوکر شاہی اور نواز جنگوں کے تمول اور ان کے خوشامدائے مزاج کے فروغ کا۔ وہ شہر تھا جاگیرداریت کے عروج اور رعیت کے زوال کا۔ غریبوں کے استحصال اور مزدور پیشہ طبقہ کی بد حالی کی نمائش کا۔ وہ شہر تھا حساس طبقوں میں جو ہر غیرت پیدا کرنے کا۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ ملک میں عوامی تحریکیں مختلف پارٹیوں کی سرکردگی میں سر بلند کر رہی تھیں۔ مزدور اور کسان اپنا حق مانگ رہے تھے۔ مگر حیدرآباد۔ وہ نظام شاہی کے بوجھ تلے اس قدر دبا ہوا تھا کہ مزدوروں کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۶ء تک ادھر ادھر اضلاع میں چھوٹے چھوٹے پیمانے پر مزدوروں میں بیداری کی لہریں اٹھیں اور مزدوروں نے ہڑتالیں کیں۔ ہڑتال استحصال کرنے والی قوتوں کے خلاف مزدور کا پیرا من ہتھیار ہے۔ اس سے حکومتوں کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

گولہ بارود، ایم۔ ایم۔ فولاد و آہن ایک طرف  
اور ہڑتال کا عزم راسخ ایک طرف

آخر نظام شاہی کے قلعے میں پہلی دربارہ بڑی اور ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو آل حیدر آباد ٹریڈ یونین کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے صدر مقرر ہوئے شعلہ نوا شاعر مخدوم محی الدین جو اس وقت ۳۸ سال کے تھے اور جنرل سیکریٹری بنائے گئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ ایک ہر جوش نوجوان جن کی عمر اس وقت صرف ۲۸ سال تھی۔ ظاہر ہے اس وقت تک وہ عوامی تحریکوں میں جوش و خروش سے حصہ لے چکے تھے۔ اور ان کی فہم و فراست اور لیڈرانہ سوجھ بوجھ کا پتہ چا عام ہو چکا تھا۔

آج ہم اس با حوصلہ، با عمل، جوہر کامل اور بیکر علم و عمل کا پچھتر واں جشن سالگرہ منا رہے ہیں۔ جس نے عمر عزیز کا بہترین حصہ ملک کی آزادی، عوام کی فلاح، عوامی تحریکوں کے استحکام اور کئی نسلوں کی تربیت میں گزارا اور ساتھ ہی علم و ادب کے میدان میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیے۔ ڈاکٹر گوڑ آج ۵۵ سال کے ہو گئے ہیں۔ مگر ان کے عزم و استقلال، ہمت اور حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ وہ زندگی کے مختلف مورچوں پر کام کر رہے ہیں۔ اور اپنی بارغ و بہار شخصیت سے ہر شعبہ حیات میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ ان کے عمل کی جولان گاہ عوامی حلقے بھی ہیں اور پارلیمنٹ ہاؤس بھی۔ ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں ہوں، یا انجمن ترقی پسند مصنفین اور انجمن ترقی اردو کے حلقے۔ وہ ہر جگہ فعال نظر آتے ہیں۔

وہ زندگی کو مار کسی شعور کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں اس لیے ان کے مضامین گنجشک نہیں ہیں۔ فکری قلابازیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک صاف اور واضح نقطہ نظر ہے جو ان کی ہر تحریر میں نمایاں ہے۔ اپنی دیگر مصروفیات کے علاوہ انھوں نے اردو میں بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا میدان تحقیق نہیں۔ زندگی کی تفہیم ہے۔ اور یہی تفہیمی رویہ ان کی زیر نظر کتاب 'ادبی تناظر' میں جلوہ گر ہے۔ 'ادبی تناظر' میں مختلف نوعیتوں کے ۱۹ مضامین ہیں۔ ان سب مضامین میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے زندگی کی اعلیٰ اقدار پر یقین۔ بہتر زندگی کی تلاش اور نامساعد حالات کا مردانہ و امقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا جذبہ۔ ان مضامین سے لطف اندوز ہونے اور کچھ اخذ کرنے کے لیے انھیں اسی طرح پڑھنا ہوگا کہ یہ ایک مجاہد آزادی اور انقلابی شعور کے پروردہ شخص کے قلم سے نکلے ہیں۔ ان میں پیشہ ورانہ نقادوں جیسا رویہ نہیں ہے کہ بات چیا چیا



کر لی جائے۔ کہیں کنٹ نہ کیا جائے اور ابہامی کیفیت کو برقرار رکھا جائے۔ گوڑ صاحب نے جو کچھ کہا ہے کھل کر کہا ہے۔

اس کتاب کا سب سے پہلا مضمون سید سجاد ظہیر کی روشنائی پر ہے جو دراصل ترقی پسند تحریک کے پس منظر، اس کے پھیلاؤ اور اس کے نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ اور جو کچھ روشنائی میں نہیں لکھا گیا اس کی طرف بھی گوڑ صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ اور دراصل یہی وہ حصہ ہے جہاں گوڑ صاحب کا صاف ذہن روشنی دکھاتا ہے۔ انھوں نے بجا طور پر کہا ہے۔

”ترقی پسند ادبی تحریک و تنظیم فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو جس قدر اس تحریک نے آگے بڑھایا ہے اور لکھنے والوں کی ایک پوری پود کو کھڑا کر دیا ہے۔ ایسا ادبی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ہوا اور وہ بھی دور ہوں کے انتہائی مختصر عرصے میں — لیکن مسئلہ کے بعد اس تحریک کو بہت سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ اور اس زمانے کا صحیح اور مستند محاسب بھی تک شاید نہیں ہو سکا ہے۔“

اپنے اس مضمون میں گوڑ صاحب نے بہت صاف الفاظ میں کہلے کر اب ترقی پسند تحریک کو کیا کرنا چاہئے — لکھتے ہیں :

”فرد کو پھر سے ذہنی طور پر سماج سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ پھر فرد کو اس جمہول انفرادیت سے آزاد کرنا ہے جو سماج سے کٹ جانے اور اجنبی بن جانے پر اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور جس کا وہ آج اسیر ہے۔ فرد اپنے آپ کو بدلتا چاہتا ہے تو اسے سماج کو بدلتا ہو گا۔“

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا یہ مضمون ۱۹ جون ۱۹۷۸ء کا لکھا ہوا ہے اور آج جولائی ۱۹۹۳ء میں

عالمی سیاست اور انسانی سماج کا وہ منظر نامہ نہیں ہے جو اب سے پندرہ سال پہلے تھا۔ اس لیے گوڑ صاحب کے اس نظریہ پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے ان کی اپنی رائے بھی کسی قدر بدل گئی ہو اس کتاب کی روح دراصل خدمت والا مضمون ہے۔ عنوان ہے۔

خدمت ایک پہلو دار شخصیت : حیدرآباد کی سیاسی تحریکات کا پس منظر :

اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد اور مخدوم لازم و ملزوم ہیں اور خود راج بہادر گوڑ اس مثلث کا تیسرا ضلع ہیں، مخدوم کی زندگی، ان کے محرکات شاعری، ان کے سیاسی اہماک اور عوامی تحریکوں سے وابہانہ وابستگی کو گوڑ صاحب نے نہایت خوبی سے واضح کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود گوڑ صاحب اس جدوجہد اور مخدوم کے ہم قدم رہے ہیں۔ چاہے ہڑتالیں ہوں، قید و بند کی صعوبتیں ہوں یا انڈر گراؤ نذرہ کر میونسٹ پارٹی کے کام کرنے کی تفصیلات — ”مخدوم فہمی“ میں یہ مضمون کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری کے جو ادوار گوڑ صاحب نے مقرر کیے ہیں وہ بہت معنی خیز ہیں۔ بنگلہ شاعر قاضی نذر اللہ اسلام سے متاثر مخدوم —

آگ ہوں، آگ ہوں، ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ  
آگ ہوں آگ۔ بس اب آگ لگانے دے مجھے  
پھر گلی سڑی جاگیر داریت کی تمثیل۔ مخدوم کی نظم — ”تویلی“

اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام دور  
جس طرف دیکھو اندھیرا، جس طرف دیکھو کھنڈر

پھر ان کی نظم — ”جہان نو“ — اور پھر تلنگانہ تحریک۔

۱۹۴۷ء کو مسلح جدوجہد شروع ہونے کے بعد وجہ وارہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں پر ٹیالا کو آزاد کرانا — اور جمہوریہ پر ٹیالا — کا جھنڈا مخدوم کے ہاتھوں لہرایا جانا — ایک جوش و خروش پیدا کرنے والا واقعہ ہے۔ پھر مخدوم اور جیل کی سلاخیں۔ اور ۱۹۵۲ء میں اس عوامی ہیرو کی جیل سے رہائی۔ زبردست عوامی استقبال۔ پارلیمانی الکشن ہارنا۔ مگر ضمنی الکشن میں کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچنا — اور تھلکہ خیز تقریریں کرنا — یہ سب کچھ راج بہادر گوڑ نے بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ گوڑ صاحب نے ایک بہت اہم بات لکھی ہے کہ مخدوم نے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک ایک بھی شعر نہیں کہا۔ اور پھر میدان شاعری میں وارد ہوئے تو ہلکی پھلکی غزلیں لیکر۔ مخدوم کی شاعری میں یہ جمالیاتی موڑ ایک خاص ادبی اہمیت رکھتا ہے۔

گل ہیں قندیل حرم، گل ہیں کلیسا کے چراغ  
سوئے پیماں بڑھے دست دعا آخر شب

گوڑ صاحب کے ساتھ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مخدوم ہماری تاریخ میں اور ادب میں زندہ رہیں گے۔

راجندر سنگھ بیدی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے گوڑ صاحب نے بیدی کے فن کا خوب صورت تجزیہ کیا ہے۔ دراصل ان کا یہ تجزیہ نئی کہانی کا دستور قرار دیا جاسکتا ہے۔ پریم چند نئی کہانی کے رہنما ہیں، انھوں نے داستان کی تخیلی اڑان کی فضا سے کہانی کو زمین پر اتارا۔ اس سے دھرتی کی سوندھی خوشبو آنے لگی۔ دھرتی کے باسیوں کی معصوم لیکن نا آسودہ آرزوؤں کی تڑپ اور فرد اور سماج کی آویزشیں، افلاس کے کرب میں خوش حالی کے خواب، یہی کچھ تو نئی کہانی کا مواد ہے۔ کہانی نے داستان کے پھول پتوں کے جداؤ چمک دکھانے والے سہارے کو ترک کر دیا اور زبان میں بھی ارضیت اور اس کا روزمرہ آگیا۔

کہانی کے اس سفر کا ایک عظیم رہنما راجندر سنگھ بیدی ہے۔ اس کے پاس بھی وہی فرد اور سماج کی آویزش ہے۔ لیکن انداز دھیما اور رکاتھاسا کرشن چندر کی نہ گھن گرج ہے اور نہ ہی شاعرانہ نمکنت۔ راجندر سنگھ بیدی کے پاس ارضیت اور عصریت کے ساتھ وہ ڈرامائی خصوصیت بھی ملتی ہے جس میں کردار ابھرتے ہیں اور پڑھنے والے پر اپنا اثر پھوڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جلیل مانک پوری پر بھی ایک مضمون لکھا ہے۔ مگر اب میں داغ اور امیر مینائی زیادہ ہیں۔ اور جلیل بہت کم۔ گویا جلیل کے پس منظر پر نظر زیادہ گئی ہے اور جلیل سے ملاقات کم ہوتی ہے۔ ایک اشارہ کرتے ہوئے گزر گئے ہیں گوڑ صاحب۔

”جلیل درباروں میں رہے۔ شاہوں اور غنہ زادوں کو مشورہ سخن دیتے رہے۔“

اگر گوڑ صاحب جلیل کی دربارداری اور شاہوں کی استادی سے کچھ پردہ اٹھاتے تو واقعی لطف کی بات ہوتی۔ ”معلوم تو ہوتا کہ شاہوں اور غنہ زادوں نے کیا سلوک کیا استاد کے ساتھ۔ اور اس سے خود جلیل کی افتاد طبع پر روشنی پڑتی۔“

سرو جی نائیڈو پر مضمون معلومات کا ذخیرہ ہے۔ کچھ بڑے لوگوں کے مشورے بہت دلچسپ ہیں۔ گویا کرشن گوکھلے نے ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں سرو جی کی انگریزی تقریر سنی تو کہا۔

نرو جی کو سننا انتہائی اعلیٰ درجے کی ذہنی تفریح ہے۔

گاندھی جی نے نرو جی نائیڈو کو مشورہ دیا تھا۔

”غریب تک غریب ہی کی سوچ کی مدد سے پہنچنے کی کوشش کرو۔“

اور خود نرو جی نائیڈو نے ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے قتل کے بعد لکھنؤ سے جو تقریر نشر کی اس کی معنویت آج پہلے سے زیادہ ہے۔

”میں سوگ کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ بھاتیاں پیٹنے اور بال نوچنے کے دن بھی اب

نہیں رہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم کھڑے ہو کر ان لوگوں کو لٹکاریں جنہوں

نے ہمارا گاندھی کی نافرمانی کی ہے۔“

اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک مختصر مضمون ہے۔ جس میں ان کے پیام اتحاد کو سراہا

گیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر والے مضمون سے مولانا کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

مثلاً یہ کہ ان کی تشکیل میں ان کی بہادر ماں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اور وہ خود ایک جہاد آزادی

اور بے باک صحافی تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی۔ مگر خلافت تحریک پر

گوڑ صاحب نے کھل کر نہیں لکھا۔ اس لیے یہ مضمون بہت تشنہ محسوس ہوا۔

خواجہ احمد عباس کو گوڑ صاحب نے مناسب خرچ عقیدت پیش کیا ہے، عباس کی زندگی کا

خاکہ، ان کی ہر جہت مصروفیات، ان کی صحافت، افسانہ نگاری اور ناول نگاری۔ ہر چیز کا

احاطہ کر لیا ہے اس مختصر مضمون میں اور۔ یہی گوڑ صاحب کا کمال ہے۔

مرزا غالب پر گوڑ صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ مگر اس قلم میں دوسروں کی روشنائی زیادہ بھری

ہے۔ دیگر کئی نقادوں کے مضامین کے اقتباسات سے یہ مضمون مزین ہے۔ بہر حال مطالعہ

کا پہلو یہ ہے کہ غالب جدید ذہن کے مالک تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب پر بہت کچھ لکھا

جا چکا ہے مگر لکھنا تو ہے غالب پر صراحت

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

گوڑ صاحب نے پروفیسر محمد مجیب کے ایک سوال کو دہرایا ہے۔

”آخر غالب پر سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی اصلاحی تحریکوں کا اثر



کیوں نہیں پڑا۔

یہ سوال آج بھی جواب چاہتا ہے کیا اچھا ہوتا اگر گوڑ صاحب اس سوال کو ذہن میں رکھ کر غالب کا تجزیہ کرتے۔

... نئے لکھنے والوں پر لکھنا دراصل مستقبل کے درخشاں کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس نکتہ سے واقف ہیں۔ وہ عام زندگی میں بھی نئی نسل کے آدمیوں اور شاعروں سے گھل مل کر بات کرتے ہیں۔ اس کتاب میں کئی نئے ناموں کو گوڑ صاحب نے اعتبار کی سند دی ہے۔ مثلاً حیدر آباد کے نقاد مجیب الرحمان۔ بمبئی کے مزدور طبقے کا شاعر۔ ظفر گورکھ پوری۔ حیدر آباد کی نوجوان افسانہ نگار قمر جمالی، لکھنؤ کا شاعر۔ ڈاکٹر علی باقر زیدی۔ اس کے علاوہ ایک لالہ ابالی ترقی پسند شاعر نیاز حیدر پران کا مضمون خالص کی چیز ہے۔

نیاز حیدر بڑا جوشیلا شاعر تھا۔ ڈرامہ نگار تھا۔ اور ان سب چیزوں سے بڑھ کر وہ ایک رند مشرب شخص تھا۔ وہ خود پرست نہیں، خود شکن تھا۔ اپنے آپ کو طرح طرح سے مباحہ کرتا رہا مگر زندگی اس سے اپنا فن منواتی رہی اور وہ مختلف کیفیتوں میں لکھتا رہا۔ گوڑ صاحب کے مضمون سے یوں معلومات میں اضافہ ہوا۔

”۵۱-۵۲ء میں تو ہم نے نیاز حیدر کو اردو کی معیاری کتابوں کی گٹھری لیے، انھیں بیچتے دیکھا ہے۔“

اور یہ بھی کہ ”پہلے اس کا تخلص ناکام تھا بعد میں اسے ترک کر دیا۔“  
نیاز حیدر ایک سیماب پا شخص تھا۔ گوڑ صاحب نے بالکل صحیح کہا ہے کہ  
”نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری کا ارتقا صدی کی پانچویں دہائی سے آٹھویں نوں دہائی تک برابر ہوتا رہا ہے۔“

میرا خیال ہے کہ نیاز حیدر کو اگر کام کرنے کی صحیح سمت ملتی تو وہ سہلج اور ادب کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ اس کی زندگی اردو شاعری کا ایک المیہ ہے۔ اور اس کا تخلص ناکام صحیح تھا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے نیاز حیدر پر مضمون لکھ کر اس قرض کا بوجھ ہلکا کیا ہے جو اردو تنقید کے سر ہے۔ اتفاق سے کچھ ماہ پیشتر میں نے بھی نیاز حیدر پر ایک مضمون لکھا تھا۔ عنوان

ہے۔ ”مجھے ہم دلی سمجھتے۔۔۔۔۔“

ظفر گورکھ پوری کو گوڑ صاحب نے اردو غزل کا معبر شاعر کہا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ظفر کی غزلوں میں اس کی اپنی زندگی کا آہنگ ہے۔

”نئے ہندوستان میں ظفر نے گورکھ پور کی دیہاتی فضا کو پھوڑ کر روٹی کی خاطر بمبئی کا رخ کیا اور بمبئی ان کے لیے اتنی ہی خیرہ کر دینے والی ثابت ہوئی جتنا غالب کے لیے کلکتہ ثابت ہوا تھا۔ پھر بمبئی صنعتوں، مشینوں کا شہر تھا۔ یہاں انسان بھی مشین کا پرزہ بن گیا تھا، اب ظفر انسان نہیں اپنے آپ کو بلکہ محسوس کرنے لگے۔“

تو مرے جسم کا بلبلہ کر گیا کیا لے کر  
کہ اپنی روح تو میں دے چکا مشینوں کو

اور پھر مشینوں سے ذرا فرصت ملی تو۔۔۔

بے تحاشی ترے گھر کی طرف بھاگا ہوں      ان مشینوں نے ذرا دیر جو پھٹی دی ہے  
راج بہادر گوڑ کے مضمون کا یہ اقتباس ظفر گورکھ پوری کی زندگی اور فن کی جھلک پیش کرتا ہے۔  
اور مزید مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔

اجل کی قسط بھی دے کر چکا نہیں سکتی  
جناب قرض بہت ہے حیات پر میرا  
نودمرا زخم ہے یا تیرے بدن کا صندل  
جانے کیا شب کو جھکتا ہے مرے کمرے میں

علی باقر زیدی کے مجموعہ کلام ”شب درد“ پر راج بہادر گوڑ نے قلم اٹھایا ہے۔ اس کی زندگی کا اجمالی خاکہ بھی اس مضمون میں مل جاتا ہے کہ اس شاعر نے ٹریڈ یونین کے پرچم تلے زندگی بسر کرنا سیکھا۔ ملازمتیں کیں اور پھوڑیں۔ پنی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ اور شاعری بھی۔ گوڑ صاحب نے علی باقر کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں دکھاتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

”باقر نے شاعری کچھ دیر سے شروع کی۔ زندگی کا سارا کرب و غم، ہنگاموں کا تجربہ، سماج کی کشمکش، آزادی اور پھر وہ بھی داغ دار۔ محنت کشوں کی بد حالی

اور خوش حالوں کی بدستی، نظم و نسق کی معذوری اور عوام کی مجبوری — سبھی کچھ

ان کے وسیع اور عمیق تجربے میں گھل مل گئے ہیں۔

محقر الفاظ میں یہ بھرپور تجربہ ہے اور راج بہادر گوڑ کی مشاقی کی دلیل ہے — باقر کی غزلیوں میں پرانا پن ہے۔

حال پوچھا تھا ذرا مونس و ہمدم کی طرح

رخ بیمار پہ بیٹنے کی ادا لوٹ آئی

راز دل تم سے بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

تم نے ٹوٹا ہوا آئینہ بھی دیکھا ہوگا

عزل کی بہ نسبت باقر کی نظمیں زیادہ فکر انگیز ہیں۔ گوڑ صاحب نے لکھا ہے کہ ”عورت خدا کی عدالت میں“ باقر کی بہترین نظم ہے۔ لیکن اس کے جو اقتباسات دیے ہیں وہ عورت کی مطلوبیت پر عام نظموں جیسے ہی ہیں۔ دوسری نظموں میں بھی راست انداز بیان ہے — بہر حال ایک شاعر کا اضافہ ہوا۔

قمر جہالی حیدر آباد کی نئی افشاء نگار ہے۔ اور اس نے نئی اور چونکا دینے والی کہانیاں لکھ کر حیدر آبادی افشاء نگار خواتین کی روایت کو آگے بڑھایا ہے جن میں زینت ساجدہ، جیلانی بانو، واجدہ تبسم اور نجمہ نکہت جیسے نمایاں نام ہیں۔ گوڑ صاحب نے قمر جہالی کی زندگی کی جھلک پیش کی ہے۔ عسرت کی گود میں پٹی ہوئی یہ لڑکی درد کی انگلی پکڑے زندگی کے راستے پر ثابت قدمی سے چلتی ہوئی اور جدوجہد کے خارزار سے گزرتی ہوئی اب اس موڑ پر آئی ہے جہاں اس کا اپنا گھر ہے، شوہر ہے، بچے ہیں، ایک معقول ملازمت ہے۔ اور اس کا قلم کہانی کے لالہ زار میں نئے نئے پھول کھلا رہا ہے، اس کی کہانیوں میں اس کی زندگی ہزار زاویوں سے جھانکتی ہے۔ گوڑ صاحب نے قمر جہالی کے افانوی مجموعے ”شبیبہ“ پر لکھتے ہوئے اس کے کئی افانوں کا تجربہ کیا ہے۔ خود قمر کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے۔

”زندگی اس کا کل سرمایہ ہے اور وہ بھرپور زندگی گزارنے کی قائل ہے، وہ

افلاس اور مجبوری کو دیکھ کر مضحک ہو جاتی ہے۔“

اس ضمن میں انھوں نے قمر کی کہانی فاتح عالم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے۔  
 ”قمر جہالی کے نزدیک درد انسان کی تکمیل کرتا ہے اور اس کے بغیر وہ مکمل نہیں ہوتا۔“

گوڑ صاحب نے مضمون کے آخر میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے۔ اور میرے نزدیک وہ بڑی شاعرانہ ہے۔

”قمر کی کہانیوں میں ایک بات اور جو قاری کے ذہن میں خلش پیدا کر دے گی وہ قمر کا بارش سے لگاؤ ہے۔ روشنی میں قحط کے بعد خوشگوار بارش ہوتی ہے۔  
 ”فاتح عالم“ میں زبردست بارش ملتی ہے، ”چنگاری“ میں اسلم بارش میں منیندر کے گھر آتا ہے اسے لے جانے کے لیے۔ قمر کا بارش سے اس لگاؤ کا راز کیا ہے۔ کہانیوں سے اس کا یہ چلانا مشکل ہے۔“

میرے خیال میں یہ قمر کے شاعرانہ مزاج کی دلیل ہے۔ بارش جلتی ہوئی زمین پر آسمان سے رحمت کی طرح برستی ہے۔ بارش میں بھیگنا ذہن کے الجھاؤ اور تناؤ کو یک نخت ختم کر دیتا ہے۔ اور طبیعت میں روائی اور جولانی آجاتی ہے۔ بارش زندگی کی بھر زین میں نئی روح پھونکتی ہے، اس کی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔

عسرت اور تنگ دستی کی پٹھنی ہوئی زمین پر سکون اور خوش حالی کی بارش ہو تو دل توانا اور احساسات شاداب ہو جاتے ہیں۔ قمر جہالی سے زیادہ بارش کی جالیاتی کیفیت کو اور کون محسوس کر سکتا ہے۔ وہ ”شبیه“ کی مقبولیت کے بعد ”سوپہ بدست“ محفل ادب میں آئی ہیں، اور شہرت کی نئی بارشوں کو قمر کی تلاش ہے۔

حیدرآباد کے ایک پختہ عمر کے نثر نگار مجیب الرحمن۔ اپنے پہلے مجموعہ مضامین ”ماورائے شعور“ کے ساتھ اردو تنقید کے افق پر طلوع ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جو مجیب الرحمن کو بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ اور اتنا جانتے ہیں کہ ان کے متعلق ضروری اطلاعات ایک عام قاری تک پہنچاتی ہیں۔ ان کے مجموعہ مضامین کو کھنگالا ہے۔ شعور، لاشعور اور تحت الشعور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس طرف



اشارہ کیا ہے کہ عجیب الرحمن کے شعوری ارتقا میں کن عوامل کا حصہ ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ عجیب الرحمن کے ایک مضمون سے ہی اقتباس پیش کرتے ہیں جو دراصل گوڑ صاحب کے ذہن کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

’ادیب کی تخلیق کو سمجھنے کے لیے نقاد کو اس ماحول کو معلوم کرنا چاہیے جس سے مصنف کا خمیر اٹھا ہے۔ ان مضامین کی تہ تک پہنچنے کے لیے سماجی رشتوں اور ان سے بڑھ کر ان آدمیوں کی تفہیم ضروری ہے جنہوں نے مصنف کی شخصیت کی تعمیر، اس کے ذہن کی تربیت اور اس کے شعور کی رفعتوں پر اثر ڈالا ہے۔“

عجیب الرحمن کی تحریر کا یہ ٹکڑا اس غیر معروف نقاد کو ان نام نہاد نقادوں کا حریف بنا دیتا ہے جو ہر تخلیقی فن پارے کو ایک ہی ترازو میں تولتے ہیں۔ دراصل اس میکاکی تنقیدی رویے نے ہی لفظ ’نقاد‘ کی ساکھ کو بگاڑ دیا ہے، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے عجیب الرحمن کی کتاب پر اس انداز سے لکھا ہے کہ وہ اپنے ذہنی شعور کے ساتھ بڑھنے والوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

’آرٹ اور افواہ‘ کے حوالے سے گوڑ صاحب نے جو بات کمٹمنٹ کے بارے میں کہی ہے وہ آج کے دور میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

’بھیمڑی کانفرنس‘ نے جس تنگ نظری کو ہوادی اس سے ادب کو نقصان پہنچا اور انقلاب کو بھی کمٹمنٹ کے دائرے کو تنگ کر کے ادبی تخلیق پر پھرے بٹھا دیئے اس کا منفی رد عمل تو وہ ہے جو ہر قسم کی آئیڈیالوجی سے نفرت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس سے ادب نے اپنی جمالیاتی شناخت و ساخت کھودی۔ لیکن صحیح رویہ تو یہ ہے کہ عصری سماجی تقاضوں کے مطابق وسیع معنوں میں انسان دوستی کی قدروں سے وابستگی آج بھی تخلیق ادب کی روح ہے۔“

’ادبی تناظر‘ کے حوالے سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جو بنیادی طور پر ایک ٹریڈ یونیٹ ہیں۔ اور اپنی تعلیم کے اعتبار سے ادبیات کے ڈاکٹر — ان کا اردو سے شغف۔ اور اس درجہ شغف کہ وہ گاہے گاہے اردو میں مضامین لکھتے رہے اور ان کے مضامین کے مجوئے پھپھتے رہے۔ اردو زبان کے لیے خوش آئند بات ہے۔ بہ قول

سردار جعفری "مردہ سرداعظان کالج" ہی تنقید کو اپنی جاگیر کیوں بنائیں۔ تنقید کے لیے صرف تخلیق اور تخلیق کار سے ہی واقفیت ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے بھی واقفیت ضروری ہے جن کے لیے تخلیق کار لکھتا ہے۔ (چاہے وہ یہ بات ماننے یا نہ مانے) تخلیق کا رشتہ تخلیق کار سے ہوتا ہی ہے۔ مگر وہ رشتہ بے معنی ہے اگر تخلیق کو عام قاری قبول نہ کرے۔ اسی لیے تنقید لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ نقاد ادب کے قاری سے واقف ہو، عوام سے واقف ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ سماج آج کیا چاہتا ہے۔ اور انسانی برادری کے لیے آج کیسے ادب کی ضرورت ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو تنقید کرنے اور تخلیق کار کی لغزشوں کی گرفت کرنے کا پورا حق ہے۔ اس بکھراؤ کے دور میں زندگی کو ایک مرکز پر لانے کے لیے سماج کے مزاج شناسوں کی بے حد ضرورت ہے۔ اور بلاشبہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سماج کے مزاج شناس ہیں۔

---

## ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: مجاہد آزادی۔ محبتِ اردو

۳۱ جولائی ۱۹۹۳ء کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (۵۷ سال کے ہو گئے) یعنی انھوں نے اپنی پلاٹینم جوبلی منائی۔ اور اس کو حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ تقریباً ایک مہینہ پہلے حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی جس کے راج بہادر بھی ایک مایہ ناز سپوت ہیں، کی پلاٹینم جوبلی تقاریب کا بھی آغاز ہوا۔ اس موقع پر اس امر کا اظہار بے محل نہ ہو گا کہ ہماری دوستی کی بھی گوڈن جوبلی پوری ہو گئی اس قافہ کے دو اور ساتھی ڈاکٹر حسینی شاہد اور سری نواس لاہوٹی تھے جو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سات دہے کی ان کی زندگی میں پانچ دہے یعنی ان کی عمر کا دو تہائی حصہ تو ملک اور قوم کی خدمت کے نذر ہو گیا جس میں جیل کی زندگی کے تقریباً ڈیڑھ سال بھی شامل ہیں۔ یہ بھی ایک اتفاق کی بات ہے کہ راج بہادر اور میں ۲۹ نومبر ۱۹۴۶ء کو ایک ساتھ گرفتار ہوئے اور پانچ مہینے سے کچھ زیادہ عرصہ تک حیدرآباد سنٹرل جیل میں نظر بند رہے اور ۱۹۴۷ء کو ہم دونوں کو دو اخبار عثمانیہ لایا گیا جہاں سے ہم فرار ہو گئے اور تقریباً چار سال روپوش Under Ground رہنے کے بعد ۲۳ اپریل ۱۹۵۱ء کو دوبارہ گرفتار ہوئے جب وہ ہاتھ میں بندوق اٹھائے راج کٹھہ (ضلع تلنگنہ) کی پہاڑیوں میں ہتھیار بند لڑائی Armed Struggle میں حصہ لینے کے ارادہ سے جا رہے تھے۔

۱۹۵۲ء میں جب وہ حیدرآباد سنٹرل جیل میں تھے تو ڈاکٹر رادھا کرشنن جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ ہند اور صدر ریشم راجیہ سبھا تھے کی موثر مداخلت کی بنا پر انھیں جیل سے فوری رہا کر دیا گیا اور انھوں نے راجیہ سبھا کی کمر سی سنبھال لی جس پر وہ دس سال تک براجمان رہے۔ میں سمجھتا ہوں

کہ یہ ان کی زندگی میں بہت اہم موڑ Turning Point تھا جس کے بعد وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلسل ترقی کے منازل طے کرتے رہے اور شاید ہی کبھی تنزل اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ دکھ درد کی کچھ گھڑیاں تو ہر ایک کی زندگی میں آتی رہتی ہیں۔

۲۱ جولائی ۱۹۱۸ء کو جب پہلی عالمی جنگ ختم ہو رہی تھی اور اس کی تباہ کاریوں کے بطن سے ایک نیا نظام حیات اور غیر طبقاتی سماج جنم لے رہا تھا۔ راج بہادر شہر حیدرآباد کے ایک قدیم اور پچھڑے ہوئے محلہ گولی پورہ میں جنم لے رہے تھے۔ اور جب ہوش سنبھالا تو اسی سوشلسٹ سماج کے آدرشوں کو پروان چڑھانے ساری عمر جدوجہد کرتے رہے۔

رائے محبوب رائے اور شریعتی امرادتی گوڑ کے اس بڑے فرزند نے متوسط طبقہ کے ایک کالج گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دو دہوں میں مفیدالانام، دھرونت زفاہ عالم اور شاہ علی بندہ کے مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چادرگھاٹ ہائی اسکول سے ۱۹۳۶ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ جامعہ عثمانیہ سے دو سال میں انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی اور جب دوسری عالمی جنگ شروع ہونے والی تھی تو میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور ستمبر ۱۹۴۳ء میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کر لی اور برائے نام ڈاکٹر تو کہلانے لگے لیکن نہ کبھی کسی مریض کی نبض دیکھی، نہ کوئی نسخہ لکھا اور نہ کبھی Stethoscop کا استعمال کیا۔

آئیے اب ذرا ان کے حسب نسب پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ راج بہادر کا آبائی وطن کشن پور ہے جو گوسائی گنج تحصیل اور ضلع فیض آباد کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ امراد جان ادا کا وہی فیض آباد ہے جو حال ہی میں فرقہ داریت کے ایک شرمناک واقعہ کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہوا۔ ان کے حقیقی دادا شری ہری پرشاد گوڑ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ انیسویں صدی کے پھٹے دے میں یعنی ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت کے کچھ ہی برسوں بعد حیدرآباد آکر بس گئے۔ ایک اور بھائی کامتا پرشاد نے اپنا آبائی وطن نہیں چھوڑا۔ ان کی اولاد اب بھی وہیں سکونت پذیر ہے۔

ان کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ ان کی شخصیت میں ابتدا ہی سے دو نمایاں دھارے تقریباً ایک ساتھ ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک ادبی اور دوسرا سیاسی اسکول کے زمانہ میں وہ اردو کے استاد صدق جاسی سے متاثر ہوئے اور ان ہی کی بدولت راج میں



شعر و شاعری سے دلچسپی اور سخن فہمی کے شعور کی ابتدا ہوئی۔ پھر انھوں نے نیاز فتح پوری کا "نگار پابندی" سے پڑھنا شروع کیا جس کی وجہ سے ان میں حقیقت پسندی اور ترقی پسند خیالات پرورش پانا شروع ہوئے۔ اسی زمانے میں ایم۔ یں۔ رائے کی انقلابی تحریروں، اشوک ہتاکے رسالہ "کانگریس سوشلسٹ" اور الہ آباد سوشلسٹ بک کلب کی جانب سے شائع کی جانے والی کتابوں کے گہرے مطالعہ نے ان میں سوشلسٹ اور کرسٹ خیالات کی تخم ریزی کی۔ ایک اور واقعہ ان کے سیاسی رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق غالباً ۱۹۳۸ء میں انھوں نے گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد پر مضمون لکھا جس میں اس فلسفہ کی کامیابی پر اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔ قاضی عبدالغفار صاحب مدیر روزنامہ پیام نے یہ مضمون کس طرح اور کیوں کر کے زیر عنوان اپنے اخبار میں شائع کیا جس سے ان کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ ان کے ادبی ذوق کو بڑھاوا دینے اور جلا پیدا کرنے میں ان کے چچا محبوب نارائن گوڑ کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔

جب وہ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے تو ۱۹۴۱ء میں وہ نہ صرف کالج یونین کے نائب صدر چنے گئے بلکہ کالج میگزین کے ایڈیٹر بھی بنائے گئے۔ اسی بتدریج ابھرتے ہوئے ادبی ذوق نے ان کے اندر چھپے ہوئے ادیب کو بیدار کر دیا اور اب تو ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل تین جلدیں۔ "ادبی مطالعے" ادبی جائزے اور ادبی مناظر" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی میں بھی انھوں نے اس دور کے سیاسی حالات اور مسائل پر کئی پمفلٹ لکھے جن میں قابل ذکر یہ ہیں۔ "حیدرآباد پر ترنگا جھنڈا ہلے گا"۔

Tricolour shall fly over  
Hyderabad.

ملنگانہ کی انقلابی تحریک کے بارے میں ایک طویل اور مبسوط مضمون لکھا جو دوسرے مضامین کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ لکھنے، پڑھنے اور کتابوں سے ان کی گہری دلچسپی کا اظہار اس ریڈنگ روم سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۹۳۴ء میں اپنے گھر پر شروع کیا تھا اور یہی دلچسپی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ اور آج سینکڑوں اردو اور انگریزی کتابوں اور رسائل پر مشتمل ایک اچھی خاصی لائبریری ان کے گھر کی رونق بنی ہوئی ہے۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے آخری پانچ، چھ سال ریاست حیدرآباد میں سیاسی اور سماجی ہل چل کا زمانہ رہا ہے۔ آریہ سماج، گنیش آئو، اسٹیٹ کانگریس اور وندے ماترم تحریکات

ابھر رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ راج بہادر جیسا احساسِ نوجوانانِ تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ۱۹۳۹ء میں کمیونسٹ پارٹی اور ۱۹۴۰ء میں کامریڈز ایسوسی ایشن میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ ایک سرگرم اور اہم لیڈر بن گئے۔ لگ بھگ ان ہی دنوں مزدوم، عالم خوند میری، غلام حیدر، میں اور کئی دوسرے ساتھی بھی ان تحریکوں سے وابستہ ہو گئے۔ تقریباً اسی زمانہ میں مزدور تحریک کی جانب ان کا جھکاؤ بڑھنے لگا اور کچھ ہی عرصہ میں وہ زیارت حیدر آباد کی مختلف ٹریڈ یونینوں سے وابستہ ہو گئے۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں حیدر آباد میں جتنی بھی جمہوری اور ترقی پسند تحریکوں اور تنظیموں نے جنم لیا ان کا راج بہادر سے کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق رہا اور بعض تنظیموں کی بنیاد رکھنے والوں یا پھر ان میں کلیدی رول ادا کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

راج بہادر کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ ایک مشہور کمیونسٹ رہنما ہیں، پوٹی ٹکے ٹریڈ یونین لیڈر ہیں، اردو کے ایک جانے مانے انشا پرداز ہیں، مجاہد آزادی اور مجاہد اردو بھی ہیں، چنانچہ ان کی ان مجاہدانہ خدمات کے اعتراف کے طور پر حال ہی میں انھیں دلی اردو اکیڈمی کی جانب سے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے علاوہ بہار اردو اکادمی اور آندھرا پردیش اردو اکادمی نے بھی دو ایوارڈوں سے انھیں نوازا ہے۔ لیکن میرے اس مضمون کا مقصد راج بہادر کی ان تمام مجاہدانہ سرگرمیوں کا جائزہ لینا نہیں ہے اور نہ میرے لیے یہ ممکن ہے کیوں کہ اب میرا تعلق نہ عملی سیاست سے رہا، نہ ٹریڈ یونین تحریک سے اور نہ اردو ادب سے۔ یہ سب میدان چھوڑے ۳۵ برسوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اب میں صرف مجاہد آزادی ہوں، اردو ادب اور زبان سے گہری دلچسپی رکھتا ہوں، انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا ایک حقیر کارکن ہوں، کبھی کبھار چند مضامین لکھ کر اپنی ادبی اور سیاسی تشنگی کو بجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ راج بہادر کا ۵۰ سال سے زیادہ عرصہ سے بلا فصل دوست رہا ہوں اور کوئی ۳۴ برس سے ان کا ہم محلہ بھی ہوں۔ اس لیے انھیں بہت قریب سے دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کا خوب موقع ملا ہے اپنے دیرینہ مشاہدوں کی بنا پر ان کی نجی زندگی اور شخصیت کے روشن اور غیر روشن پہلوؤں کا صرف دوستانہ نہیں بلکہ ناقدانہ نقطہ نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔

اب تو کسی کو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ راج بہادر ایک دانشور ہیں اور میرے خیال میں ان کے دانشور بننے میں دو عوامل زیادہ کارفرما رہے ہیں، ایک تو ان کی غیر معمولی یادداشت اور حافظہ اور دوسرے کئی برسوں سے ان کا وسیع مطالعہ اور اس مطالعہ سے پورا استفادہ حاصل کرنے میں ان کی انتھک محنت اور جستجو۔ انھیں سیاسی اور ٹریڈ یونین مسائل سے اردو ادب کے مختلف موضوعات اور اردو زبان کی نشوونما، ترقی اور تحفظ سے نہ صرف گہری دلچسپی ہے بلکہ ان تحریکوں سے وابہانہ وابستگی ہے۔ اس لیے وہ ان مختلف النوع مسائل پر انگریزی اور اردو میں مسلسل مضامین، تبصرے اور خاکے لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ حالات حاضرہ پر ان کے بیانات اور تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا دماغ ایک پھوٹا سا دیسی کمپیوٹر ہے جس کے مختلف خالوں میں سیاست، ٹریڈ یونین، اردو ادب، زبان کے مختلف مسائل کو feed کر دیا گیا ہو اور حسب ضرورت اس کمپیوٹر کے سیاسی بٹن کو دبایا جائے تو حالات حاضرہ پر ایک موزوں اور مفید مضمون یا بیان تیار ہو جائے گا، یا پھر ٹریڈ یونین بٹن پر انگلی رکھی جائے تو مزید دوروں اور ان کی یونینوں کے مسائل پر یادداشتیں اور میمورنڈم کی کاہیاں آپ کو مل جائیں گی، اردو زبان کے بٹن پر ہاتھ رکھا جائے تو ادبی مضامین اور تبصروں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اس کمپیوٹر میں متفرقات کا بھی ایک خانہ ہے جس میں مذہبی، سماجی اور تہذیبی موضوعات اور معاشی مسائل پر ضروری مواد feed کیا ہوا تیار ملے گا۔ جو خواہش مند ہوں انھیں حسب ضرورت معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راج بڑے زود نویس واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ ان تمام موضوعات پر جس سے وہ ابھی طرح واقف ہیں۔ چل رہے خامہ بسم اللہ کا نعرہ لگامیز پر بیٹھ جائیں گے اور بہت کم وقت میں مطلوبہ مضامین، تبصرے، بیان اور قرارداد آپ کے ہاتھ میں تھما دیں گے۔

راج بہادر بڑے شاہ خرچ انسان ہیں۔ اگر انھیں کسی صبح اچھی خاصی رقم مل جائے تو رات ہونے تک ان کا ہاتھ خالی نظر آئے گا۔ وہ صحیح معنوں میں پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں اور ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ ہاتھ کی اس گندگی سے جتنا جلد ہو سکے پھٹکارا مل جائے۔ جب وہ

کسی مارکٹ میں سبزیاں اور گوشت وغیرہ خریدنے جاتے ہیں تو ہر سبزی فروخت کرنے والی اور دوکان دار یہ آواز دے گا کہ "صاب" ہمارے پاس آؤ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ شخص جو بھی مال خریدے گا اس کے بھاؤ نہیں چکائے گا۔ تول میں ڈنڈی مارنے پر کبھی نظر نہیں رکھے گا بلکہ مطلوبہ اشیا رکھا چھا خاصا ڈر دینے کے بعد صرف یہ پوچھے گا کہ کتنے پیسے ہوئے اور جملہ رقم سے کچھ زیادہ پیسے دے کر چلتا پھر تا نظر آئے گا۔ جب کبھی وہ آٹو یا سائیکل رکشا میں بیٹھیں گے تو رکشا والے اسے صرف یہی کہیں گے کہ بھئی فلاں مقام کو جانا ہے اور رکشا میں بیٹھ جائیں گے کرایہ کے تعلق سے، رکشا والے کے پوچھنے کے باوجود کوئی بات نہیں کریں گے اور منزل پر پہنچنے کے بعد اس سے دریافت کریں گے کہ کتنا کرایہ ہوا، وہ جو کچھ بھی کہے گا اس سے زیادہ ہی دے دیں گے۔

راج بہادر بڑے ہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ حیدرآباد میں کسی ادبی، تہذیبی اور سیاسی تقریب اور جلسے کے سلسلہ میں جب کوئی ادیب، شاعر اور سیاسی قائد آئے تو اس کی ایک شام راج بہادر کے گھر پر ضرور گزرے گی جہاں وہ پورے لوازمات کے ساتھ دعوت کا اہتمام کریں گے اور وہ بھی دعوت تر۔ چاہے انھیں ان دعوتوں کے اہتمام کے لیے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ان دعوتوں میں مجھے جن دانشوروں اور ممتاز شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔ فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، مجروح سلطان پوری، قمر رئیس، کیفی اعظمی، ظفر احسن، سی نارائن ریڈی، آئی۔ کے۔ جگرال، پی۔ شیو شنکر، مشہور فلمی اداکار ہنگل۔ ان شخصی دعوتوں کے علاوہ ان کے گھر پر عزیز احمد خاں واریٹی کی قوالی، وٹھل راؤ اور ان کے ساتھیوں کی محفل نغمہ کی کئی بیٹھکیں منعقد کی جاتی رہی ہیں۔

راج بہادر بہت مصروف آدمی ہیں۔ اس کے باوجود ان کی روزمرہ زندگی میں ایک نظم ضبط باقاعدگی اور نفاست پسندی کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ سیکڑوں کتابوں اور رسالوں کی ان کی لائبریری بڑی حد تک منظم کی جاسکتی ہے۔ وہ جن اداروں اور تنظیموں میں کام کرتے ہیں ان کی درجہ فائلیں اور کاغذات بڑی باقاعدگی سے محفوظ ہیں۔ ان کے مضامین، تبصرے اور بیانات وغیرہ جو مختلف رسائل اور اخباروں میں شائع ہوتے ہیں ان کے تراشے بڑی جتن سے فائل



کے ہوئے ہیں۔ مختلف مسائل میں شائع ہونے والے اہم اور کارآمد مضامین کی زیرکس کا بیڑوں کا بھی ان کے یہاں بڑا ذخیرہ ہے۔

شاید بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ راج بہادر بہت اچھے باورچی بھی ہیں اور یہ فن انھیں اپنے دادا سے ورثے میں ملا۔ وہ کوئی باقاعدہ اور تربیت یافتہ باورچی نہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر بریانی، ہر قسم کے سالن، اچار اور میٹھا وغیرہ تیار کر لیتے ہیں۔ ان کے پکوان کا ایک دلچسپ واقعہ سن لیجئے۔ غالباً ۱۹۴۶-۴۵ء کا زمانہ ہوگا۔ راج، مخدوم، مرزا حیدر حسین اور دوسرے کامریڈ گھاتس منڈی (سکندر آباد) کے پارٹی آفس میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن مخدوم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں بریانی اور میٹھا کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ اس زمانہ میں پارٹی کی خستہ مالی حالت کے پیش نظر مخدوم کی اس خواہش کو اس دور کے پورے لوازمات اور اہتمام کے ساتھ پورا کرنا ناممکن تھا۔ راج بہادر نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ تھوڑا بڑا گوشت، کسی طرح خرید لے آئے اور گڈی، بریانی کا بندوبست کر دیا۔ اب سوال تھا میٹھے کا۔ ان دنوں راکشن کاموٹا اور لال رنگ کا چاول ملتا تھا۔ جس کی بیج گاڑھی اور سرخ نکلتی تھی، راج نے اس گاڑھی بیج میں شکر ملا کر خوب ٹھنڈا کیا اور جب وہ قدرے سخت ہو کر جم گئی تو کاجو کاٹ کر اس کے اوپر پھیلا دیے اور اس طرح میٹھا بھی تیار ہو گیا۔

اب کچھ سخن گستاخانہ باتیں! لیکن مشکل یہ ہے کہ مشرقی تہذیب کی یہ قدیم روایات رہی ہیں کہ کسی شخص کی کھلم کھلا عیب جوئی نہ کی جائے اور دوسری طرف جدید سوانح اور خاکہ نگاروں کا یہ نظریہ ہے کہ کسی شخصیت کا بھرپور اور مکمل جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی نہ صرف اچائیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا جائے بلکہ اس کی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ آئیے اس جدید نقطہ نظر سے راج بہادر کی شخصیت کے کچھ غیر روشن پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے۔ راج بہادر بڑے چلبے، اور کبھی پھلا نہ بیٹھنے والے آدمی ہیں۔ اگر آپ کسی سنجیدہ محفل یا اہم جلسہ میں بیٹھے ہوئے ہوں اور راج بہادر وہاں قدم رنجہ فرمائیں تو آپ فوراً محسوس کریں گے کہ ان کی آمد نے محفل کا رنگ ہی بدل دیا وہ اپنی بلند آواز میں مزاحیہ جملوں، دل لگی، مذاق، بر محل اور بے محل، اور پھیڑ پھیڑ سے محفل کی خاموشی اور سنجیدگی کو ختم کر دیں گے۔ ان کے بعض احباب کا خیال ہے کہ وہ مذاق کی دویں

کبھی حد آداب سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ جب کسی تنظیم کی کاروباری میٹنگوں میں شریک ہوتے ہیں تو ابھٹنے کے تمام مسائل پر مسلسل اپنے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ نتیجتاً دوسرے شرکائے میٹنگ کو اپنے نقطہ نظر کو پیش کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ انھیں دوسروں کی باتیں سننے کی عادت کم اور اپنی ہی باتیں سننے کی عادت زیادہ ہے۔ خود انھوں نے اپنی ہی خصوصیت کے بارے میں کہا ہے۔

کہنے پہ جب آتا ہے تو پھر بس نہیں کرنا  
میٹنگ میں کبھی گوڑ کسی کی نہیں سنتا

راج بہادر گوڑ کی زندگی کے دو جزو اریان میں ایک تو کمیونٹ پارٹی اور دوسرے ٹریڈ یونین تحریک۔ وہ پارٹی کے انتہائی وفادار اور ڈسپلن کے پابند سپاہی ہیں۔ پارٹی کے ہر اعلان کردہ پالیسیوں اور پروگراموں کو چاہے وہ صحیح ہوں یا غلط — من و عن اور یقین محکم و عمل بیہم سے پورا کرنے کے قائل ہیں۔ وہ پارٹی پر کسی قسم کی اور کسی جانب سے موجودہ بددے ہوئے حالات میں بھی تنقید کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے اور جذباتی انداز میں براخود ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر وقت یہ طبقہ کو وہ اپنی رگ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس جذباتی لگاؤ کی بنا پر ان کی دانست میں مزدور اور ان کی ٹریڈ یونین کسی لغزش یا غلطی کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔ اگر بد قسمتی اور اتفاق سے ایسی کوئی بات ہو بھی جائے تو وہ اس کی بالکل ذمہ داری انتظامیہ اور یوروکریسی کے سر تقویٰ دیتے ہیں۔

بعض صاحبان علم و حکمت کا یہ بھی خیال ہے کہ دانشوروں میں عام طور پر کچھ نہ کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ جیسے لا وابالی پن، مئے نوشی، عشق و محبت کی داستانوں سے ان کی وابستگی وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا پھر راج بہادر کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے؟

راج بہادر اپنی (۵۵) سالہ کامیاب عوامی زندگی میں ہندوستانی کمیونٹ پارٹی، آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس، انجمن ترقی پسند مصنفین اور انجمن ترقی اردو ہند کے

پوٹی کے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور ان ہی تنظیموں کے نمائندہ کی حیثیت سے انھیں ایشیا، یورپ، انگلستان اور مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک کا سفر کرنے کا موقع ملا ہے۔

شہرت اور ترقی کے ان منازل کو طے کرنے کے باوجود گھمنڈ اور غور جیسی برائیاں ابھی تک ان کی زندگی کا حصہ نہیں بنی ہیں۔ وہ ایک سیدھے سادے اور منکسر المزاج آدمی ہیں۔ ان کا مکان ایک دربار کا منظر پیش کرتا ہے۔ جہاں مردور، مختلف محکموں اور بنکوں کے ملازمین ادبی اور تہذیبی انجمنوں کے کارکن، ان کے دوست احباب اور غرض مندوں کا سامنا بندھا رہتا ہے۔ بہر حال موجودہ حالات میں ان کی شخصیت بہت غنیمت ہے۔ اور آخر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ:

”تم سلامت رہو ہزار برس“

## ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ اردو کی ایک فعال شخصیت

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کے مشہور سیاست داں ہیں۔ انھوں نے عوام کے مسائل پارلیمنٹ میں ہدایت موثر انداز میں پیش کیے۔ چوں کہ ان کا رویہ ہمیشہ تعمیری رہا ہے اس لیے کامیاب بھی رہے۔ ان کی شخصیت میں کئی خوبیاں یکجا نظر آتی ہیں یعنی انتہائی کشادہ ذہن اور غیر معمولی سیکور انسان ہیں۔ ان تمام خوبیوں سے بالاتر ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور کچھ عرصے بعد ان کے ساتھ ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ذرا بھی جھوٹے برے کا فرق محسوس نہیں ہونے دیتے۔ طبیعت میں خوش مزاجی، نرمی، شگفتگی اور بذریعہ ان کی شخصیت کے اہم جزو ہیں۔

گوڑ صاحب کا آبائی وطن اتر پردیش میں کشن پور چھوٹا سا گاؤں ہے جو ضلع فیض آباد کی تحصیل گوسائی گنج میں واقع ہے۔ یہ مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" کا وہی فیض آباد ہے جہاں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء میں فرقہ واریت کا ایک شرمناک واقعہ وجود میں آیا تھا۔ ان کے حقیقی دادا ہری پرشاد گوڑ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ حیدر آباد میں آکر گولی پورہ میں آباد ہو گئے۔ تب سے ان کا خاندان حیدر آباد میں آباد ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گوڑ صاحب کی ادب سے دل چسپی سیاست کے بعد پیدا ہوئی۔ ان کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ادب سے دل چسپی طالب علمی کے زمانے ہی سے پیدا ہو گئی تھی۔ ابتدا میں وہ اردو کے استاد اور شاعر صدق جالسی سے بہت متاثر تھے۔ اور ان ہی کی بدولت گوڑ صاحب میں شعر و شاعری سے دل چسپی اور سخن فہمی میں شعور



پیدا ہوا۔ "نگار" اور بعض دوسرے معیاری رسالوں کی رہنمائی بھی ان کو حاصل رہی اور ان ہی کے مطالعے سے ان کی زندگی دو دھاروں میں بٹ گئی۔ ایک سیاسی اور دوسرا ادبی۔ اردو ادب کا غائر مطالعہ کیا اور قدیم و جدید ادب سے واقفیت حاصل کی۔ ان کی ابتدائی زندگی پریشانیوں اور مصیبتوں میں گزری۔ ۱۹۳۶ء میں چادر گھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد سے میٹرک کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور ستمبر ۱۹۴۳ء میں میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اسی زمانے سے وہ انگریزوں کے ظلم و ستم اور بے انصافیوں کے خلاف لڑتے رہے۔ پولیس ان کو پکڑنے میں لگی رہتی۔ مگر یہ پولیس کو چکے دیتے رہتے۔ تقریریں کرتے اور فرار ہو جاتے۔ خدا جانے فرار ہونے کی ٹریننگ حیدرآباد کے کس اسکول میں لی تھی۔ البتہ ایک دوبار فرار ہونے میں ناکامی ہوئی، گرفتار ہوئے اور جیل بھیج دیے گئے۔ ۱۹۴۰ء میں جب وہ زیر تعلیم تھے تو کارپیز ایسوسی ایشن کی تشکیل ہوئی اور جس کے وہ اہم اور فعال رکن تھے۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں سینٹرل کمیٹی اور صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں آزاد ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اڑھاکر شنن جو صدر راجیہ سبھا بھی تھے۔ ان کی مداخلت سے گورنر صاحب جیل سے رہا کر دیے گئے اور وہ راجیہ سبھا کے ممبر بنادیے گئے۔ گورنر صاحب راجیہ سبھا کے ممبر دس سال یعنی ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک رہے۔

مخدوم محی الدین، نیاز حیدر اور جواد رضوی کی دوستی اور صحبت سے انھیں مطالعے کے شوق کو جلا ملی۔ کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت اردو والوں میں کم ہوتی ہے لیکن گورنر صاحب ہمیشہ کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کتب بینی کی یہ عادت ابھی تک جاری ہے۔ ان کے تین تنقیدی مضامین کے مجموعے کے بعد دیگرے "ادبی مطالعے، ادبی جائزے، اور "ادبی تناظر" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں حسرت کی غزل گوئی، فراق گورکھپوری، "مخدوم کی زندگی اور شعر، کیفی اعظمی۔ سارے جہاں کا غم، جیلانی بانو کی کہانیاں، "روشنائی ترقی پسند تحریک کی آبِ ہیتی، غالب اور جدید ذہن" شروجنی نائیڈو کی سہمہ گیر شخصیت، آج کا ہندوستان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت، خواجہ احمد عباس، "راجندر سنگھ بیدی ایک عظیم فن کار، جلیل مانک پوری عہد اور کلام، نیاز حیدر زندہ ہے۔"

اور ایک گھر جو تقسیم ہو گیا۔ بڑے اہم مضامین ہیں جن میں علمی بصیرت اور گہری نظر کا اظہار ملتا ہے۔ ان مضامین میں شخصیت اور فن پر ان کی بے لاگ رائے ان کی گہری سوچ اور علمیت کا پتا دیتی ہے۔ ”ایک گھر جو تقسیم ہو گیا“ **A House Devided** امرت رائے کی انگریزی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں :

”اس طویل تبصرے کو ختم کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ امرت رائے کا مطالعو معلومات آفریں تو ہے لیکن مکمل نہیں اور جو نتائج انھوں نے اخذ کیے ہیں وہ ہماری زبانوں کی ارتقا کی تاریخ اور عصری ہندوستان اور اس کے ابھرتے ہوئے سائنس فکشن سے مستفاد ہیں۔“

اس کتاب کے مطالعے سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امرت رائے جو اردو کے سخت مخالفین میں سے ایک ہیں جبکہ اردو تحقیق اور اردو کی رفتار اور اس کو ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں یقین نہیں آتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ امرت رائے نے اس کتاب کے لکھنے میں کسی اردو کے محقق اور ناقد سے مدد لی ہو اور اس کو اپنا شریک کار بنایا ہو۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انتہائی سیکولر انسان ہیں۔ انھوں نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھا ہے کہ :

”عبدالحق ایک غیر سیاسی انسان تھے اور اردو کے انھیں مجنونا نہ عقیدت تھی۔ وہ اردو کی قدیم کتابوں کی تحقیق و تدوین کے بانیوں میں سے تھے۔ اردو زبان کی تعمیر میں صوفیوں کے رول پر عالمانہ مقالہ لکھا۔ انھیں بہت صدمہ تھا کہ پاکستان میں اردو کے ساتھ برا سلوک کیا جارہا تھا۔ انھوں نے تو اردو کو اس کے ہندوستانی روپ میں متحدہ ہندوستان کی رابطے کی زبان بنانے کے خواب بھی دیکھے تھے۔ اردو کو فرقہ پرست سیاست دانوں نے فرقہ وارانہ عصبیت کے پھیلانے کا ہتھیار بنایا۔ نظریہ پاکستان کا پرچار ہندوستان کی سبھی زبانوں اور خاص طور پر انگریزی میں بہت ہوا ہے۔“

یہ اس سیکولر انسان کے الفاظ ہیں جس نے حیدرآباد میں مولوی عبدالحق کی اردو خدمات

لے و ٹے ادبی تناظر۔ ص ۱۷۸۔

کے آثار چٹھاؤ اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ پاکستان کی تقسیم اگر اردو کی بنیاد پر ہوتی تو اردو پاکستان کی قومی زبان ہوتی اور وہاں اردو کا وہ حال نہ ہوتا جس کی طرف گوڑ صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق زندگی بھر اردو کو قومی زبان کا درجہ دلانے کے لیے کوشاں رہے لیکن ناکام رہے۔

گوڑ صاحب کی تحریر نہایت دلکش اور اثر آفریں ہے۔ اپنے دلائل نہایت استدلال، منطقی اور شیریں انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مزاج ان کی شخصیت کا خاص جز ہے۔ بات بات میں جملے بازی ان کی گفتگو کو موثر بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عام کے ممبر ۱۹۶۱ء سے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں جب انجمن کا دفتر دلی منتقل ہو گیا اس کے بعد وہ دو بار اس کے نائب صدر بھی رہے۔ ان کی دلاویز شخصیت کو دیکھنے کا موقع مجھے پہلی بار انجمن کی چوتھی آل انڈیا اردو کانفرنس کے موقع پر جے پور میں ملا۔ یہ کانفرنس ۲۰۲، اور ۴، اکتوبر ۱۹۷۴ء کو جے پور کے مسلم مسافر خانے کے وسیع میدان میں ہوئی تھی۔ اس کا افتتاح موهن لال سکھاڈیا نے کیا تھا جو اس وقت راجستھان کے چیف منسٹر تھے اور صدارت پنڈت آنندرائن ملّا نے کی تھی۔

گوڑ صاحب کو اردو کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے میں نے پہلی بار جے پور کی کانفرنس میں دیکھا۔ گرج دار آواز، سفید شير وانی اور چوڑی دار پانجامہ ان کے گھٹے ہوئے جسم پر اچھا لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں خاص قسم کی کشش اور شگفتہ انداز بیان نے ہر ایک کو اپنا گردیدہ بنا لیا۔ اس تقریر سے پہلے مجھے ان کا وہ صدارتی خطبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انھوں نے ۳ دسمبر ۱۹۶۰ء کو بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کانفرنس مظفر پور کے موقع پر دیا تھا۔ اس خطبے میں انھوں نے اردو زبان اور اس کے فروغ کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ وہ خطبے میں اردو کے بارے میں لکھتے ہیں :

” اردو بہر حال ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی بنیادیں یہیں ہیں اس

کا لوک ادھار یہیں ہے۔ اس کے بولنے والے یہیں رہتے بستے ہیں اور

وہ ان کی مادری زبان ہے۔ اس لیے انجمن ترقی اُردو (ہند) اور ہندوستان بھر میں اُردو بولنے والوں کو یو۔ پی اور بہار میں اُردو کے موقف اور مستقبل کے بارے میں گہری تشویش لاحق ہے۔

”اُردو کو آزاد ہندوستان کے آئین میں ایک قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے لیکن خود اس کے اپنے علاقے میں جو جائز مقام ملنا چاہیے ابھی تک نہیں ملا۔ اس مقام پر بہار باسی شاید خوش قسمت ہیں۔ اصل وقتوں کا سامنا تو اتر پردیش میں کرنا ہے۔ بہار اور یو۔ پی کے حالات کا بنیادی فرق یہ ہے کہ یو۔ پی میں اُردو کی جان بوجھ کر اور فرقہ وارانہ زاویوں سے مخالفت کی جاتی ہے اور ہندی بھاشائیوں کو اُردو بولنے کے خلاف صف آرا کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ریاست بہار میں اُردو بولنے والوں اور ہندی بولنے والوں کے درمیان صحت مند اور بھائی چارہ کے روابط ہیں۔ یہاں بہت سے ہندی پریمی اُردو کی اہمیت اور حیثیت کو مانتے ہیں۔“

گوڑ صاحب کا اُردو سے یہ جذبات کی محبت کا آئینہ دار ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو اُردو سے کس قدر محبت ہے۔

مئی ۱۹۷۴ء میں مجھے گوڑ صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب انجمن کا دفتر علی گڑھ سے دلی منتقل ہو چکا تھا۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا دفتر اس وقت ابے بھون میں تھا اور گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکرٹری تھے۔ انجمن کا دفتر ابے بھون سے بہت قریب ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا ہفت روزہ ”آرگن حیات“ یہیں سے نکلتا تھا۔ یہیں ڈاکٹر اجمل اجملی مرحوم اور بشیر احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حیدر آباد سے جب کسی کام سے دلی تشریف لاتے ہیں تو ان کا قیام ابے بھون ہی میں رہتا ہے اور انجمن کا دفتر قریب ہونے کی وجہ سے یہاں ضرور تشریف لاتے ہیں۔ اور ان کی بارگاہ بہار گفتگو سننے کے اکثر مواقع ملتے رہتے ہیں۔

اُردو کی بحالی اور اس کو جائز حق دلانے کے لیے گوڑ صاحب ہمیشہ کوشاں رہتے



ہیں۔ جتنا دل حکومت کے زمانے میں علی سردار جعفری صاحب کی صدارت میں ۱۶ کئی کمیٹی ۱۵ فروری ۱۹۹۰ء کو تشکیل دی گئی۔ پروفیسر نامور سنگھ اس کے نائب صدر تھے اور وزارت تعلیم کے مشیر جناب کے۔ کے۔ کھلڑا اس کے رکن معتمد بنائے گئے تھے۔ یہ کمیٹی گجرات کی سفارشات کا جائزہ لینے کے لیے حکومت نے بنائی تھی۔ کمیٹی نے مختلف ریاستوں میں اردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ذیلی کمیٹیاں بنائیں۔ مثلاً گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک اور آندھرا پردیش کے لیے جو سب کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اس کے کنوینر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بنائے گئے۔ گوڑ صاحب نے اردو کے سلسلے میں جو تاہر توڑ کام انجام دیے وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کا اعتراف کیا جائے۔ جعفری کمیٹی نے ۱۱ ریاستوں کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ ۱۸ ستمبر ۱۹۹۰ء کو حکومت کو پیش کر دی۔ یہ رپورٹ ۲۵ جولائی ۱۹۹۱ء کو راجیہ سبھا میں اور ۲۹ جولائی کو لوک سبھا میں پیش کر دی گئی۔ اس کمیٹی کے فعال ممبر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر ضلیق انجم، کنور مہندر سنگھ بیدی، امرتیا پرتم اور جناب رام لعل وغیرہ تھے۔ جعفری کمیٹی وی۔ پی سنگھ سابق وزیر اعظم کی حکومت (جتنا دل) کے دور حکومت میں تشکیل دی گئی تھی۔ اس کے بعد ابھی تک اس کمیٹی کے بارے میں حکومت ہند کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ چاہے ہندوستان کا اتر پردیش کا صوبہ ہو یا جنوبی ہند کی ریاستیں اردو کے مسائل کو حل کرنے میں گوڑ صاحب کو شاں رہتے ہیں اور زبان کی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کی شاخوں کی تنظیم بھی آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ انجمن کے دو نائب صدر رہے اور آج کل حیاتی ممبر ہیں۔ غرض اردو سے بے پناہ محبت ہونے کی وجہ سے اردو کی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ گوڑ صاحب نے اردو کی گذشتہ ۴۰ سال کی رفتار اور ترقی کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اعتراف کئی بار مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) کے جلسوں میں کیا ہے اور اب یہ بات دل کو لگتی ہے کہ حکومت کی نیت اردو کے معاملے میں کتنی ہی صاف ہو اور ارادہ کتنا ہی پختہ ہو، عوام کو چاہیے کہ اب اردو کا حل خود تلاش کریں، حکومت پر تکیہ نہ کریں۔ اس احتساب میں جتنی دیر لگے گی اردو کے لیے مزید مشکلات پیدا

ہو سکتی ہیں۔ اُردو کی جڑیں ابھی اتنی کمزور نہیں ہیں اور پیڑ کے پتوں میں ابھی ہریالی موجود ہے۔ لیکن اگر عوام اب بھی مل کر اُردو کی تہذیب کو نہ بچا سکے اور اُردو کے لیے کام نہیں کیا تو عین ممکن ہے کہ پیڑ کے پتے سوکھنے شروع ہو جائیں اور اُردو زبان کی حیثیت کلاسیکی بن کر رہ جائے۔ گوڑ صاحب حیدر آباد کی گنگا جمنی تہذیب کی شناخت ہیں۔ انھوں نے مرکزی انجمن ترقی اُردو کی طرف سے جنوبی ہند کے دورے کیے اور عوام کو بیدار کیا کہ وہ اُردو کا حل خود تلاش کریں۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں اور اُردو تعلیم کو گھر گھر پہنچانے میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور اُردو تحریک کو متحرک بنائیں۔ میر کا یہ شعر گوڑ صاحب کے کاموں کی یاد تازہ کرتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں  
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

# راج بہادر گوڑ کی پچترویں سالگرہ

(سوانحی خاکہ)

راج بہادر گوڑ جو آج ایک عظیم سیاسی رہنما ٹریڈ یونین لیڈر اور ایک معیاری ادیب و نقاد ہیں۔ گھروالے انھیں لڑپیارے راجن پکارتے ہیں دوست ا جا ب صرف راج سے مخاطب کرتے ہیں اور میں بھی اس مضمون میں انھیں راج ہی سے مخاطب کر رہا ہوں۔

وہ عمر میں مجھ سے پانچ یا چھ سال بڑے ہیں مگر رشتہ میں وہ میرے بھانجے اور میں ان کا ماموں ہوتا ہوں۔ عمر کی بزرگی اور رشتہ میں تعاون و رقرار رکھنے کی خاطر ہم نے یہ سمجھوتہ کر لیا کہ وہ میرے بھانجے اور میں ان کا ماموں یا رہے۔

راج سے میری رشتہ داری کا سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ راج کی حقیقی والدہ کا انتقال راج کی کمسنی میں ہو گیا اور راج کے والد جناب محبوب رائے صاحب گوڑ نے میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ سے بیاہ کیا۔ یہ کوئی لگ بھگ ساٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد جب راج شاہ علی بندہ وسطانیہ اسکول میں پڑھ رہے تھے مجھے بھی اسی اسکول میں شریک کیا گیا اس طرح اسکول آتے جاتے میرا ان کا سلام علیک ہو جایا کرتا تھا۔ میری کمسنی کے باعث اور میری جائیداد اور معاش کی حفاظت و صیانت کی خاطر راج کے والد محبوب رائے صاحب گوڑ میرے ہی ہاں ٹھہر کر میری سرپرستی فرماتے رہے ہیں اور آج بھی جب کہ وہ (۹۷) برس کے ہو چکے ہیں ان کا سایہ بزرگی قائم ہے۔ میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ کے بطن سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں جو راج کی بھائی بہنیں ہیں۔

راج ایک ذہین طالب علم رہے ہیں ہمیشہ امتحانات درجہ اول و دوم ہی میں پاس کرتے رہے ان کی اس کامیابی کے باعث انھیں اعلیٰ جماعتوں میں داخلہ نہ صرف آسانی سے مل جاتا بلکہ تعلیمی و تہذیبی

بھی ملا کرتا تھا۔ راج کوان کی طالب علماء زندگی میں ایک اچھا تعلیمی ماحول ملا۔ رائے محبوب نارائن صاحب جو راج کے چچا تھے۔ ایک اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کے انسان تھے اور وہ سماجی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے جس کے باعث راج میں کتب بینی اور مطالعہ کا ذوق بڑھتا گیا۔ راج کے چچا محبوب نارائن صاحب نے طلباء کے لیے دو مل گوڑہ میں ایک ہاسٹل قائم کیا جہاں راج بھی رہا کرتے تھے۔ بعد ازاں وہ اپنے چچا محبوب نارائن کے گھر گولی پورہ میں رہنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راج ہمارے گھر واقع لال دروازہ اپنے والد جناب محبوب رائے صاحب سے ملنے آنے جانے لگے تھے۔ راج کی ذہانت اور طبیعت کی خوش مزاجی کے باعث میری والدہ اور دیگر افرادِ خاندان ان سے بہت متاثر ہوئے اور بارِ فردہ سب کے چہیتے ہو گئے۔ میری تعلیم راج کے والد کی سرپرستی میں ہی ہوئی، ہی مگر والدہ محترمہ کا یہ خیال کہ مجھے کسی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ مجھے موروٹی معاش منصب و سلمداری ملا کرتی تھیں۔ مگر راج کی سفارش پر میری والدہ مجھے اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے پر راضی ہو گئیں۔ راج کے تعلیمی ماحول اور ان کے تعلیمی ذوق کا یہ اثر ہوا کہ میری دو بہنیں بھی جو پردہ کے باعث گھر سے باہر نہیں نکلا کرتی تھیں زنانی مدرسہ میں شرکت حاصل کر لیں۔

راج کے گولی پورہ کے قیام کے دوران میں تعطیلات میں وہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ اور اس وقت کی چند باتیں جو مجھے یاد ہیں وہ تحریر کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہ کہ راج کے چچا جناب محبوب نارائن گوڑ اور خود راج اور بسا اوقات بالا پرشاد صاحب گوڑ (ماہر ٹکری) کے درمیان آپس میں علمی مباحث چھڑ جاتے تھے اور گھنٹوں آپس میں بحث و مباحثہ ہوتا رہتا۔ مباحث کا زور و شور۔ ہاشمی مکان کے گلی کے کونے تک بھی سنائی دیتا تھا۔ منشی پریم چند کی ناول ہو یا پھر کانگریسی رہنماؤں کی سوانح یہ سب مولانا ابوالکلام آزاد کے رسالے کا مضمون چچا دیکھتے تھے مباحث کے بغیر ان کا مطالعہ نامکمل ہی سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں میں نے یہ دیکھا کہ بعض مرتبہ راج ہی کو کھانا بنانا پڑتا تھا اور وہ بہت لذیذ اور ذائقہ دار کھانے بناتے ہیں۔

راج کو بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق رہا ہے چنانچہ اپنے سکونتی مقام گولی پورہ میں انھوں نے ایک دارالمطالعہ قائم کر رکھا تھا۔ میں نے بھی اس کی رکینیت حاصل کر لی اور رکینیت کی ماہانہ فیس چار آنہ تھی راج کی حیثیت معتمد دارالمطالعہ ابینی دستخط سے رسید جاری کیا کرتے تھے اور یہ کوئی ۱۳۴۸ھ ۱۹۳۸ء



کی بات سہمہ دار مطالعہ کے علاوہ محلے کے نوجوانوں میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے تقریری مقابلے منعقد کئے جاتے تھے۔ اور ان مقابلوں میں کامیاب ہونے والے بچوں کو چھوٹی چھوٹی کتابیں بطور انعام دی جاتی تھیں چنانچہ مجھے بھی انعام حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوتا رہا۔

راج کی پہلی شادی موضع نظام آباد ضلع اعظم گڑھ (یوپی) میں شریعتی سو بھگتا سے رچائی گئی۔ اس میں میری والدہ کی زیادہ دلچسپی رہی اور وہ اپنے پورے پر پیار کے ساتھ یوپی کا سفر اختیار کیں اور بہو کو اپنے گھر بیاہ کر لائیں۔ راج کو سو بھگتا سے جو بعد میں کوکیلا کے نام سے پکاری جانے لگیں دو لڑکے پیدا ہوئے مگر سوتے قسمت کہ دونوں زندہ نہیں رہے۔

طالب علمانہ زندگی میں میں اور راج اس طرح ساتھ ساتھ رہنے لگے تھے کہ ہم دونوں کو اکثر لوگ بھائی بھائی سمجھتے رہے۔ پبلک میٹنگ یا سینما دیکھنے جانا ہو تو راج کی سفاک شہرہ ہی مجھے والدہ اجازت دیتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راج اور میں سائیکل پر ہی گھوما کرتے تھے۔

راج کی طبیعت میں خوش مزاجی بچپن ہی سے موجود ہے وہ جہاں بھی ہوتے اور جس محفل میں شریک ہوتے ان محفلوں میں ایک جان پڑ جاتی تھی۔

راج جب ہائی اسکول میں تعلیم پا رہے تھے تو وہ مضمون کی درسی کتب کے ساتھ ساتھ اُسی مضمون کی کئی اور انگریزی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا کرتے تھے۔ جن میں سے اکثر کتب وہ خرید بھی کرتے تھے اس طرح درسی کتب کے ساتھ ساتھ اُسی مضمون کی دیگر کتب کی ایک ملحدہ لائبریری بھی تھی۔

مجھے بھی اپنی تعلیم کے دوران ان کتب سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ راج ڈرامہ بینک اور خوش نویسی بھی اچھی کر لیا کرتے تھے۔ تحریر خوش خط اور پختہ ہے۔ ڈائریکٹریٹ پاس کر کے راج شروع میں آریہ سماجی تحریک سے متاثر ہوئے اس کے بعد کھادی تحریک سے جڑ گئے اور گھر گھر گھوم کر کھدر بیچا کرتے تھے اور خود بھی پہنا کرتے تھے اور اس طرح دوست احباب اور اپنے افراد خاندان کو بھی کھادی پہننے کی ترغیب دیتے رہے میں نے خود بھی ۱۹۴۰ء سے کھدر پہننا شروع کیا اور دلش کے آزاد ہونے تک کھدر پہنتا رہا۔

راج کا سیاسی رجحان ترقی کرنا ہوا سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور اس زمانے میں کامریڈز ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا جس کے روح رواں جناب عالم خوند میری مرحوم تھے۔ ایسوسی ایشن

کے بانیوں میں کامریڈ مخدوم محی الدین۔ جناب سید ابراہیم۔ جناب غلام حیدر صاحب اور مرزا حیدر حسن صاحب۔ جناب بھادر منوی صاحب اور دیگر ساتھی شامل ہیں۔ راج بھی اسی لہجہ سی آریشن کے رکن بن گئے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں راج کا کمیونسٹ پارٹی سے تعلق پیدا ہوتا ہے اور ۱۹۴۰ء سے راج کی اشتراکی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ راج کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی اور اشتراکی تحریک میں حصہ لینے کے باعث ان کے دوست احباب اور ان کے قریبی عزیز و اقارب راج کی اپنے گھروں پر آمد سے گھبرانے لگے۔ یہ ڈراؤ خوف اس لیے پیدا ہوا کہ اکثر کاتھ گھرانوں کو اس وقت کے حکمرانوں سے کچھ نہ کچھ مراعات بشکل وظیفہ منصب و معاش جاری تھیں۔ خوف تھا کہ کہیں یہ مسدود نہ ہو جائیں۔ میری والدہ بھی اس خیال سے کبھی کبھی گھبرا جاتی تھیں مگر میری والدہ کو میرے اطمینان دلانے پر تشفی ہو جاتی تھی۔

گھر کے چھوٹے بڑے گوراج کے سیاسی خیالات سے پوری طرح متفق نہ تھے مگر راج سے ہم مدد کی ضرورت کرنے لگے تھے۔ راج اپنی سیاسی زندگی میں کامیابی کی منہ زلیں طے کر رہے تھے مگر گھریلو زندگی میں انھیں سکون نہ ملا۔ اپنے دو لڑکوں کی موت کا غم دل میں چھپائے پھرتے رہے مگر ہمت و استقلال انھیں دلا سادیتے رہے۔

کمیونسٹ پارٹی پر امتناع کے بعد اور خاص طور پر ۱۹۳۸ء میں راج اور دیگر کمیونسٹ رہنما روپوش ہونے پر مجبور ہو گئے۔ انڈر گراؤنڈ رہ کر وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھے۔ روپوشی کے زمانہ ہی میں راج کی دوسری شادی برج رانی گوڑ سے ہوئی۔ ان کے بطن سے دو لڑکیاں متارا اور کلارا پیدا ہوئیں۔ راج ان دونوں لڑکیوں سے بیحد پیار کرتے ہیں۔ چھوٹی لڑکی کلارا جس کی منگولین Mongolian پیدائش ہے۔ راج اس کو بہت چاہتے ہیں اور اس کی ذرا سی بھی تکلیف انھیں برداشت نہیں ہوتی۔ کلارا کی شادی ستیش سے ہوئی اور اس کو ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام امروتا ہے۔ تمارا کی شادی شری بالاجی راؤ سے ہوئی اور انھیں اب دو لڑکے ہیں جن کا نام پروین اور پولن ہیں۔ راج نے اپنے نواسہ کے اصرار پر ہی ۱۹۹۰ء میں اپنی زندگی کے کچھ حالات بیان کئے جس کو ان کے نواسے نے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔

Nana - An interview with Dr. Raj Bah Gur Gaur

۱۹۳۸ء میں جب کہ راج روپوشی کے ہاسٹل میں مقیم تھے اس وقت ”وندے ماترم تحریک“

کا آغاز ہوتا ہے اور راج ایک روزہ احتجاجی ہڑتال میں شریک ہوتے ہیں وہ جس وقت میڈیکل کالج کے طالب علم تھے سیاسی میدان میں ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے اتر جانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے تعلیم ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے اس فیصلے سے خاص طور پر ان کے والد اور ہم سب کو بڑا دکھ ہوا ہم سب نے ان سے خواہش کی کہ وہ ڈاکٹری کی تعلیم پوری کر لیں اور ڈگری حاصل کر لیں اور پھر اس کے بعد سیاسی میدان عمل میں اتر جائیں۔ مگر راج اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ اس وقت ان کے والد جناب محبوب رائے گوڑ بمبئی روانہ ہوئے اور اس وقت کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کامریڈ پی سی بوشی سے ملاقات کی اور انھیں اپنی خواہش سے مطلع کیا اور راج کو اپنی تعلیم مکمل کر لینے کی ہدایت چاہی معلوم نہیں راج نے آیا کامریڈ پی سی بوشی کے کہنے پر یا میڈیکل کالج کے اساتذہ کے مشوروں پر ۱۹۴۳ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی۔

راج نے ہمیشہ ہی سے گھر کے معاملات اور بکھیروں سے اپنے آپ کو دور رکھا مگر جب کسی مسئلہ کی ذمہ داری ان پر عاید کر دی جاتی تو وہ نبھانا بھی خوب جانتے ہیں۔ چناں چہ میری والدہ کے انتقال کے بعد مجھ سے بڑی میری ہمیشہ محترمہ لیلادتی بی بی کی شادی کی فکر ہم سب کو کھائے جا رہی تھی۔ راج نے اس سلسلہ میں پہل کی اور ہم دونوں رشتہ کی تلاش میں اورنگ آباد پہنچے اور کامریڈ چندر گپت پودھری کے گھر قیام کیا۔ اورنگ آباد سے ہم تعلقہ دیجا پور روانہ ہوئے اور وہاں رائے لالہ بندو پرشاد سری داستوا سے ملاقات کی راج کی چوں کہ ان سے پہلے ہی سے جان پہچان تھی اس لیے رشتہ کی بات پھیر دی گئی۔ لالہ بندو پرشاد جی کا شمار اس وقت ہاراٹھر کے چوٹی کے کانگریسی لیڈروں میں تھا۔ وہ سوامی رامنند تیرتھ کے گرد پ سے وابستہ تھے۔ بہر حال ہمارے دیجا پور کے قیام کے دوران رشتہ کی بات چیت ثمر آور ثابت ہوئی اور میری ہمیشہ کی شادی لالہ جی سے ۱۹۴۵ء میں بلدہ حیدر آباد میں انجام پائی۔ اورنگ آباد کے اس مختصر قیام میں ہم دونوں نے ایلورہ اور اجنتا کی سیر بھی کی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم دونوں اورنگ آباد سے ایلورہ سائیکلوں پر ہی روانہ ہوئے۔ راج کو دل و دماغ پر قابو رکھنے میں کمال حاصل ہے مگر خاندان کی لڑکیاں جب بیاہی جاتی ہیں تو یہ وقت رخصتی قابو کھو بیٹھتے ہیں اور رو پڑتے ہیں۔

دیش کی آزادی سے قبل اکثر سیاسی رہنماؤں کے جلسوں کا مرکز حشمت گنج سلطان بازار ہوا

کرتا تھا۔ میں بھی راج کے ساتھ اور خود راج کو سننے کئی بار حشمت گنج جاتا رہا ہوں۔ حشمت گنج کا ایک دلچسپ واقعہ جو مجھے یاد آ رہا ہے وہ یہ تھا کہ روپوشی کے زمانے میں یعنی ادا ایل ۱۹۴۸ء میں جب کہ ان پر گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ ایک پبلک میٹنگ کا اعلان کیا گیا کہ راج بہادر گوڑ اس جلسہ کو مخاطب کریں گے۔ اس اعلان پر پولیس نے حشمت گنج کے میدان کے دونوں جانب کے گیٹ کو بند کر دیا اور جلسہ گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ اعلان کے مطابق راج بہادر گوڑ نے تقریر کی اور تقریر کے فوری اختتام پر روشنی بجھا دی گئی اور پھر تارکی میں جلسہ گاہ میں پبلک نے ایک اور صاحب راج ملیا جی کو گھیر کر راج بہادر گوڑ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ اور اس دوران راج دہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح پولیس کو بڑی ہنسی ہوئی۔

ایک اور واقعہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ تھا کہ ہمارا جہ کرشن پرشاد کا انتقال ان کی دیوڑھی واقع شاہ علی بندہ میں ۱۹۴۷ء میں ہوا اس وقت راج بہادر گوڑ ہمارے گھر ہی ٹھہرے تھے اس لیے میں اور راج ہمارا جہ کی ارٹھی کے جلوس میں شاہ علی بندہ سے پرانا ہل پیدل چل پڑے۔ مجمع اتنا کثیر تھا کہ حبشن کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بھجن اور اشوک فضا میں گونج رہے تھے۔ ڈھولک بھانج مہرے ایک خاص سما پیدا کر رہے تھے۔ بہر حال اس تاریخی جنازہ کے جلوس میں ہم اپنی شرکت کو بھول نہیں سکتے۔

راج کی روپوشی کے زمانے میں مختلف ناموں سے ہم میں خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ بسا اوقات مجھے تو کوریئر Courier کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ راج کی گرفتاری کے سلسلے میں کئی بار

ہمارے گھر پولیس کے دھاوے ہوتے رہے۔ اور تلاشی لی جاتی رہی۔ خفیہ پولیس کے عہدہ دار تلاشی کے دوران مجھ سے یہ کہا کرتے تھے کہ تمہارا گھر عجیب بھول بھلیاں ہے۔ کیا تمہارے آباؤ اجداد کمیونسٹوں کے روپوش ہونے اور پناہ لینے کے لیے ہی اس طرح کا مکان بنا رکھے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ میں نے وکالت شروع کر دی تھی۔ اور روپوش کمیونسٹ قائدین کی وکالت کرنے لگا تھا اور ان قائدین کی رہائی کے لیے جس کی درخواستیں ہائی کورٹ میں پیش کی جاتی رہیں۔ ان سیاسی مقدمات میں میری رہنمائی بیرسٹر عطاء الرحمن مرحوم اور غلام بخش صاحب کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ عدالت عالیہ کے اس وقت کے چیف جسٹس نے سرکاری وکیل کو اپنے اجلاس پر طلب کر کے یا استفسار



کیا کر کیا منو ہر راج سکینہ بحیثیت وکیل کمیونسٹ رہنماؤں کی بیرونی کر رہے ہیں اور اس لیے پولس ان کے گھر کی بار بار تلاشی لے کر انھیں اپنے فرض سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو آپ پولس کو آگاہ کریں کہ وہ سکینہ کو پریشان نہ کریں۔ روپوشی کے زمانے میں راج کبھی کبھار ہم لوگوں سے ملنے آیا جاتا کرتے تھے ایک بار ایسا ہوا کہ وہ پہنچے ہی والے تھے کہ پولس نے میرے مکان کو گھیرے میں لے لیا راج سائیکل پر آئے اور میرے آفس کی کھڑکی پر پیر بھی دھرنے نہ پائے تھے کہ میرا اشارہ پا کر گلی کے دوسرے سرے سے غائب ہو گئے اور پولس انھیں پہچان نہ سکی۔ راج کی روپوشی کے زمانے میں شاید فروری ۱۹۴۸ء میں ان کی بیوی کو کیلا کو انتہائی رازداری برتتے ہوئے دے دیا گیا جہاں راج روپوش تھے اور وہاں انھیں پھوڑ کر حیدر آباد لوٹ آیا۔

راج نے کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کے ساتھ ٹریڈ یونین تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کامریڈ مخدوم۔ کامریڈ وی۔ ڈی دیش پانڈے۔ کامریڈ ناگاپورکر۔ جناب جواد رضوی اور دیگر احباب کے ساتھ مختلف یونینوں سے وابستہ ہو گئے۔ ٹریڈ یونین تحریک بڑھتی گئی ہڑتال چلے جلوس ہونے لگے۔ حکومت کی طرف سے بار بار وارنٹ گرفتاری ان رہنماؤں کے خلاف جاری ہوتے رہے۔ اور گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ روپوش ہو جایا کرتے تھے۔ اسی زمانے کا ایک اہم واقعہ جو غالباً ۱۹۴۷ء کا ہے راج بہادر گوڑ جنھیں گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا تھا۔ جیل سے دانتوں کے علاج کے لیے عثمانیہ دواخانہ لائے گئے علاج کا بہانہ تھا اور فراری عین مقصد تھا اس لیے بڑی فوجی سے پلان بنایا گیا اور انتہائی ڈرامائی طریقہ سے راج کو دواخانہ کے مردہ خانہ کے احاطہ سے فرار کرا دیا گیا۔ اس ڈرامہ میں ڈاکٹر یس پراپنچے۔ جناب رفیع احمد۔ کامریڈ نظام الدین اور باسط نے بڑی فوجی سے اپنا کردار نبھایا۔

اسی زمانہ میں کمیونسٹ رہنماؤں کی قانونی مداخلت کے لیے ایک کمیٹی "پیروپلز ڈیفنس کمیٹی" Peoples Defence Committee کا قیام عمل میں آیا جس کا مجھے معتمد مقرر کیا گیا۔ بحیثیت معتمد ڈیفنس کمیٹی کمیونسٹ سیاسی قائدین سے ملاقات کے لیے مجھے اکثر جیل جانا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں ان رہنماؤں سے ملاقات کی شرائط بھی کافی کڑی تھیں۔ ملاقات کے لیے ہوم سکریٹری

سے اجازت کا لزوم تھا اور اجازت بھی بڑی مشکل سے ملتی تھی جیل میں ہماری ملاقاتیں عہدہ داران جیل کے بالمواہجہ ہوا کرتی تھیں ملاقات کے لیے ایک خاص میز بنوایا گیا تھا جس کے درمیان ایک جالی نصب کر دی جاتی تھی میز کی ایک جانب سیاسی رہنما دوسری طرف دکیل۔ انہی ملاقاتوں کے درمیان راج کو کچھ کتب اور کھانے پینے کی چیزیں پہنچائی جاتی تھیں۔ اور اسی دوران راز کی چھٹیاں بھی ان تک پہنچا دی جاتی تھیں۔

راج بہادر گوڑ تلنگانہ ہتھیار بند لڑائی میں اپریل ۱۹۵۱ء میں راج کٹھہ کی پہاڑیوں میں گرفتار ہوئے ان کی گرفتاری کو مقامی پولیس نے اپنا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا اور اس گرفتاری کی خبر کو آگ کی طرح پھیلا دیا۔ اس وقت ریاست حیدرآباد میں ملٹری حکومت کا دور دورہ تھا۔ کیونٹ تحریک کو بڑی طرح کچلا جا رہا تھا۔ اس ظلم استبداد کی حکمرانی میں راج کی زندگی کو خطرہ تھا۔ ہم سب ان کی گرفتاری سے بہت زیادہ فکر مند اور پریشان تھے۔ میں راج کے والد کو لے کر ورننگل پہنچا جہاں راج کو بے رحم ملٹری حکمران جس کا نام نجپا Nanjappa تھا۔ اپنے ملٹری ہیڈ کوارٹر میں قید کر رکھا تھا۔ راج کی رہائی کے لیے میں اور راج کے والد نجپا سے ملنے ان کے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ جب راج کے والد راج کی رہائی کی درخواست کی تو ملٹری آفیسر آگ بگور ہو گیا اور کہنے لگا کہ تلنگانہ کی تحریک کے سلسلہ میں جن لوگوں کا قتل ہوا ہے۔ اس کا ذمہ دار تیرا بیٹا ہے اور تو ایسے آدمی کو پھڑانے آیا ہے۔ تیرے بیٹے کو تو گرفتاری کے ساتھ ہی فوراً گولی مار دی جانی مگر چوں کہ اس کی گرفتاری کی اطلاع حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو پہنچ چکی تھی اور اخباروں میں بھی خبر شائع ہو چکی تھی اس لیے تیرے بیٹے کی جان بچ گئی غرض اس نے راج سے ملنے اور انھیں رہا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی دوران میں معلوم ہوا کہ راج کو تلنگانہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہم بھی ورننگل سے تلنگانہ پہنچے۔ راج تلنگانہ پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ پولیس اسٹیشن کے سلاخوں والی ایک کھڑکی سے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا میں نے فوری ڈسٹرکٹ ججسٹریٹ کے اجلاس پر ضمانت کی درخواست پیش کر دی۔ ججسٹریٹ نے درخواست ضمانت منظور کر دی مگر اسی دوران راج کو قانون نظر بندی کے تحت احکام نظر بندی تعمیل کر دیے گئے۔ اس وقت کے کلکٹر جناب ہادی جعفری تھے۔ اسی رات ان کے مکان پہنچ کر میں نے درخواست رہائی پیش کر دی۔ مگر کلکٹر صاحب کوئی فیصلہ صادر کئے بغیر رخصت حاصل کر کے بلدہ روانہ

ہو گئے۔ جب راج راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہوئے تو انھیں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ہدایت پر جو کہ اس وقت نائب صدر جمہوریہ ہند تھے راج کو ماہ مئی ۱۹۵۲ء میں نظر بندی سے رہا کر دیا گیا۔ گوراج کا انتخاب راجیہ سبھا کے لیے چار سالہ تھا مگر میعاد کے اختتام پر انھیں دوسری بار راجیہ سبھا کا ممبر چن لیا گیا۔ اس طرح وہ ۱۹۶۲ء تک راجیہ سبھا کے رکن رہے۔

راجیہ سبھا کی رکنیت کے زمانہ میں راج کا قیام کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹرس Windsor Place نئی دہلی میں رہا۔ اس زمانہ میں میں اور میری بیوی کا تینا کچھ دن ان کے ہاں ٹھہرے اور دیکھا کہ راج اپنی زندہ دلی کے باعث اپنے پارٹی کے ساتھیوں اور ممبران پارلیمنٹ میں کافی مقبول نظر آئے۔ چوں کہ راج میں خاموش رہنے کی عادت نہیں ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی خاموش نہیں رہنے دیتے تھے۔

جس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کانگریس اور دیگر سیاسی جماعتوں پر حکومت حیدرآباد کی جانب سے پابندی لگادی گئی تھی چند ترقی پسند احباب نے ایک نئی جماعت ”پپلز ڈیموکریٹک پارٹی“ Peoples' Democratic Party کے نام سے قائم کی اس پارٹی کی عاملہ کاریں

بھی ایک رکن تھا۔ بعد ازاں اس پارٹی کو وسیع بنیادوں پر ”پپلز ڈیموکریٹک فرنٹ“ Peoples' Democratic Front عوامی جمہوری محاذ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس

زمانے میں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے چناؤ کا اعلان کیا گیا۔ عوامی محاذ میں شامل رہنماؤں میں قابل ذکر ڈاکٹر جے سوریندر نائیڈو، جناب اختر حسن، جناب فرید حسن، جناب وی۔ ڈی دیش پانڈے ہیں۔ اس وقت کے انتخابی جلسوں میں کثرت سے عوام شریک ہوتے اور محاذ Front کے امیدواروں کی تائید کا اظہار کرتے تھے۔ انتخابات کے زمانے میں مجھے نظر بند رہنماؤں سے ملاقات کرنے جیل جانا پڑتا تھا۔ مرہٹواڑہ کے چند کمیونسٹ لیڈر اورنگ آباد جیل میں نظر بند تھے۔ ان کے پرچہ نامزدگی کی خانہ پری کے لیے اورنگ آباد جیل بھی جانا پڑا۔ ۱۹۶۲ء میں راج حلقہ شاہ علی بندہ کے امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ تمام لوگوں کا خیال تھا کہ راج اس حلقہ سے انتخاب جیت جائیں گے۔ مگر توقع کے خلاف راج کو شکست ہوئی۔ راج کے الکشن ہار جانے پر اس حلقہ کے بیشتر احباب الکشن آفس پہنچ کر اظہار افوس کرتے رہے۔ جس پر کامریڈ مخدوم محی الدین نے کہا کہ

جتنے لوگ اظہار افسوس کے لیے ہم سے مل رہے ہیں کاش وہی حضرات راج کو ووٹ دے دیتے تو راج جیت جاتے۔

۱۹۷۸ء میں پارلیمنٹ کے حلقہ سکندر آباد کے لوگ سبھا انتخابات کے لیے راج کو کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کیا گیا۔ اس زمانے میں مجھے راج کے ساتھ حلقہ سکندر آباد کی اکثر بستیوں میں گھومنا پھرنا پڑتا تھا۔ وکلاء برادری اور موکلین کے علاوہ میرے دوست احباب بھی اس حلقہ میں کافی تعداد میں موجود تھے۔ جس پر راج نے ایک بار تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میری جگہ منوہر راج کھڑے ہو جاتے تو انہیں اس حلقہ سے زیادہ ووٹ مل سکتے تھے۔

راج بہادر گوڑ اردو زبان کی بقا و ترویج میں ایک حصہ سے لگے ہوئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش سے آپ کی وابستگی لگ بھگ چار دہوں سے چلی آرہی ہے۔ اور آج اردو کی ہر مجلس اور محفل میں راج موجود نظر آتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے آپ ایک سرگرم رکن بھی ہیں اور رہنا بھی۔ راج انجمن ترقی اردو ہند کے حیاتی رکن ہیں۔ دو دفعہ نائب صدر منتخب ہو چکے ہیں اور وہ انجمن کی ادبی کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔

راج نے اردو زبان کی بقا و ترویج کے لیے اپنی ہمہ وقتی خدمات کا نہ صرف نذرانہ پیش کیا ہے بلکہ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بھی وقف کر دیا ہے۔ انھوں نے گجرات کمیٹی کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے سے متعلق امور کا جائزہ لینے والی سردار جعفری کمیٹی کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے اس کمیٹی کی رپورٹ کی تیاری میں اپنا زیادہ وقت اور تعاون دیا۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کا جائزہ لینے کے لیے جو کمیٹی جناب عزیز قریشی صاحب کی قیادت میں قائم کی گئی تھی۔ راج اس کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔ اردو یونیورسٹی کے قیام سے متعلق بہتر مواد اور اعداد و شمار بھی آپ نے فراہم کئے تھے۔

راج نے اپنی عمر اور صحت کا خیال کرتے ہوئے اب کمیونسٹ پارٹی کے کسی عہدہ کو قبول نہیں کیا بلکہ نوجوان فون کو آگے بڑھنے کا موقع عطا کیا اور اس طرح اپنی مصروفیت کا زیادہ حصہ ادبی مطالعہ پر صرف کرنے لگے ہیں۔ جس کے باعث وہ مختلف ادبی کتب اور شعری مجموعوں پر



تفہیم و تبصرہ فرماتے ہیں۔ راج کی تین کتابیں ”ادبی مطالعے“ ”ادبی مناظر“ اور ”ادبی جائزے“ شائع ہو چکی ہیں۔ راج کو چند سال پہلے دہلی اردو اکیڈمی کی جانب سے انعام سے نوازا گیا۔

ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کے پھوٹ پڑنے پر راج بہت بے چین ہو جاتے ہیں اپنی زبان و قلم سے فرقہ پرستی اور مذہبی منافرت کے خلاف آواز اٹھانے اور لڑنے نکل پڑتے ہیں۔ راج کو اپنے سیاسی مزاج ادبی ذوق سے ہٹ کر دستوری مسائل اور قانون سے بھی بڑی دلچسپی ہے وہ اکثر پارٹی سے ہمدردی رکھنے والے دکھلا رہا جان کی گروپ میٹنگ کو مخاطب کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے وکیل دوست اجاب سے پیریم کورٹ کے فیصلوں پر تبادلہ خیال بھی کرتے ہیں۔ دھرم شاستر اور شرعی مسائل پر ان کا اپنا علاحدہ نظریہ ہے ان تمام باتوں سے مجھے یہ لگتا ہے کہ راج اگر ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کی بجائے وکالت کی سند حاصل کر لیتے تو ایک کامیاب ترین وکیل ثابت ہوتے۔

آخر میں اتنا عرض کروں گا کہ میں راج کے طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کا ہم سفر رہا ہوں راج پچھترویں سال کی منزل پر پہنچ کر گوجرانی طور پر تھکن محسوس کرنے لگے ہیں۔ مگر ان کی زبان اور قلم کبھی تھکے ہیں نہ تھکیں گے۔ راج اس مقولہ پر اپنی زندگی بتا رہے ہیں۔

”زندگی زندہ دلی کا نام ہے  
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں“

## ہمارے گوڑ صاحب

برف کی طرح سفید بال، شام کی طرح سانولا رنگ، ذہین مسکراتی پیار بھری مشفق آنکھیں، درمیانہ قد، ہنستا ہوا چہرہ، یہ ہیں ہمارے گوڑ صاحب۔ ان کی ہمہ جہت، رنگارنگ اور باغ و بہار شخصیت کی تعریف کیا اور کیسے کروں۔ ان کی شخصیت میں اوصاف کی افراط اور زیرے پاس الفاظ کا فقدان۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ مگر حکم ہے کہ اختصار سے کام لوں۔

گوڑ صاحب سے پہلی ملاقات انجمن میں ہوئی، انھوں نے بے لوث محبت، خلوص اور بے تکلفی کی ایسی فضا قائم کی کہ مجھے ان سے ایک عقیدت سی ہو گئی۔ ان سے میرا یہ رشتہ تقریباً اٹھارہ سال پرانا ہے، لیکن میں اس رشتے کو آج تک کوئی نام نہیں دے سکی۔ کبھی وہ بزرگ، مشفق باپ کی طرح پیش آتے ہیں۔ کبھی بڑے بھائی کی طرح ہمت و حوصلہ بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی ہم عمر دوست کی طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے ماحول کو تہقہ زار بنا دیتے ہیں۔

اردو گھر کی لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ گوڑ صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہیں سے آواز لگاتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اسے خلیق! سنو، تمھاری لفٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ یا جو انھیں کہنا ہے، وہ لفٹ کے دروازے سے نکلے ہی کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ کمرے میں پہنچتے ہی کسی بھی موضوع پر گرما گرم بحث شروع، بحث کا موضوع اکثر وہ اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ لیکن گوڑ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ بحث کا موضوع خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو، تلخی پر ختم کبھی نہیں ہوتا۔

انجمن ترقی اُردو سے گوڑ صاحب کا تعلق صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس کے نائب صدر رہے اور اب مجلس عام اور مجلس عاملہ کے رکن ہیں بلکہ انجمن ترقی اُردو سے ان کا روحانی تعلق ہے، جیسا کسی عابد کا مسجد سے اور پجاری کا مندر سے ممکن نہیں کہ گوڑ صاحب دلی تشریف لائیں اور اُردو کے اس مندر میں حاضری نہ دیں۔

گوڑ صاحب اپنے مرتبے، علم اور اب عمر کے اعتبار سے بھی بزرگ کہلانے کے مستحق ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان کی عزت اور احترام اس طرح کیا جائے جیسے اپنے بزرگوں کا کیا جاتا ہے، لیکن وہ بندۂ خدا موقع ہی نہیں دیتے۔ ان کی سیما بی فطرت لمحہ بھر کے لیے بھی انھیں خاموش نہیں بیٹھنے دیتی۔ زندہ دلی انھیں بوڑھا نہیں ہونے دیتی۔ ان کی خوش مزاجی زندگی کی تمام کڑواہٹوں کو پی جاتی ہے۔ وہ اپنے قہقہوں میں ہر دکھ درد کو اس طرح اڑا دیتے ہیں جیسے سگریٹ کا دھواں۔ ایسا نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی غم نہیں کوئی دکھ نہیں۔ رنج و غم تو انسان کے پیچھے سارے کی طرح لگے رہتے ہیں۔ لیکن انھیں زندگی کو خوش سلو بی سے جینے کا ہنر آتا ہے۔ گوڑ صاحب خوشی بانٹتے ہیں، غم نہیں بانٹتے۔ اپنے غموں اور دکھوں سے وہ تنہا لڑنے کے قایل ہیں۔ زندگی میں اُن کا رویہ کچھ اس طرح ہے۔

ہم کو طوفان سے لڑنے کا ہنر آتا ہے

آپ ساحل پہ کھڑے ہو کے تماشہ دیکھیں

گوڑ صاحب کو میں نے کبھی خاموش یا اداس نہیں دیکھا۔ ماحول کتنا ہی سنجیدہ کیوں ہو وہ مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے لطیفے سنانے میں تنہا ہنستے اور ہنساتے ہیں کہ آداب محفل بھی بھول جاتے ہیں۔ ایک لطیفہ جو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں سنایا، آپ بھی سنیں: اُردو گھر میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے کمرے میں کچھ حضرات بیٹھے تھے۔ گوڑ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ بات چل رہی تھی عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کی۔ گوڑ صاحب نے عورتوں کی حمایت میں بولتے ہوئے یہ واقعہ سنایا: ”میں اور میری بیوی ایک پارٹی میں شریک تھے وہاں

یہی بحث چل رہی تھی۔ ایک صاحب کہنے لگے، بھئی! عورتیں چھوٹے موٹے کام تو کر سکتی ہیں کوئی بڑا کام کرنا عورتوں کے بس کا نہیں۔ کسی بڑی دعوت کا انتظام کرنا ہو تو مرد کرتے ہیں۔ اچھا اور زیادہ کھانا بنوانا ہو تو مردوں کو بلایا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سن کر ہماری بیوی نے جواب دیا۔ ایک دو بچہ پیدا کرنا ہو تو عورتیں کر دیں گی۔ اگر دس پانچ بچے پیدا کرنا ہو تو مرد خود کر لیں۔

میں نے ہمیشہ گوڑ صاحب کو کمزوروں کی حمایت میں بولتے سنا ہے۔ سماج میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور نا انصافیوں کے خلاف آواز اٹھاتے سنا۔ میں گوڑ صاحب سے نہایت مؤدبانہ طور سے معذرت کے ساتھ ایک سوال (جو مجھے دسمبر ۱۹۸۱ء سے پریشان کیے ہوئے ہے اور میرے سر میں ہمیشہ سراٹھاتا رہتا ہے) پوچھنے کی گستاخی کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اپنی ازدواجی زندگی میں بھی عورتوں کے ساتھ اپنے انصاف کے اٹھوٹوں پر عمل پیرا ہیں؟ اگرچہ یہ سوال بہت نجی قسم کا ہے اور جسے اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ لیکن گوڑ صاحب کوئی معمولی شخصیت نہیں ہیں اور بڑے لوگوں کی نجی زندگی میں جھانکنے کی روایت بہت پرانی ہے۔

راج فرق پرستی اور منافرت کے اس دور میں ہر شخص اپنی عیاری اور نفرت کو چھپانے کے لیے سیکولزم کا خول پہن کر بھائی چارے کا گیت الاپ رہا ہے۔ ملک و قوم کی خدمت کا نعرہ لگا رہا ہے۔ لیکن قول و فعل کا یہ تضاد چھپا نہیں ہے۔ پنڈت آنند زائن ملا صاحب کا یہ شعر ایسے ہی لوگوں پر صادق آتا ہے۔

نعرہ گرم انقلاب میں نے بھی ہاں سنا تو ہے

جام و سبکو کے آس پاس دار و رسن سے دُور دور

لیکن راج بہادر گوڑ صاحب ان چند لوگوں میں سے ہیں جو انسان دوستی اور سیکولزم

کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ انسانیت ان کا ایمان ہے۔ محبت ان کا مذہب۔ گوڑ صاحب انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے محافظ، ملک و قوم اور اردو زبان کے سچے مجاہد ہیں۔ انھوں نے جام و سبکو کی زندگی ترک کر کے دار و رسن کا راستہ اختیار کیا اور اپنی زندگی کا وہ خوبصورت



دور جب انسان دنیا کی ہر خوشی اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں سوچنے کی اسے کہاں فرصت ہوتی ہے، وہ تو بس اپنی خواہشات اور تمناؤں کی تکمیل چاہتا ہے۔ لیکن گور صاحب نے یہ وقت ملک و قوم اور ملک کے پس ماندہ اور ظلم کی جگہ میں پستے ہوئے غریب مزدور بھائیوں کی خدمت کرنے میں گزارا۔

”لنگانہ کسان مزدور تحریک کے سلسلے میں بارہا جیل گئے۔ روپوش رہے ہزار صوبہ بیتی برداشت کیں، لیکن یہ مردِ آہن اپنے موقف سے نہیں ہٹا۔ گور صاحب سیاست کے میدان میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ دوبار الیکشن بھی لڑا۔ لیکن اپنے علاقے میں انتہائی مقبول ہونے کے باوجود الیکشن ہار گئے۔ چوں کہ وہ ایک صاف پستے اور کھرے انسان ہیں (اور سچائی، ایمان داری کا سیاست سے جنم جنم کا بیر ہے) اس لیے سیاسی داؤں پیچ اور اوچھے سیاسی ہتھکنڈوں کا انھوں نے استعمال نہیں کیا ورنہ وہ بھی آج منظر ہوتے۔ گور صاحب دوبارہ راجیہ سبھا کے ممبر چنے گئے اور آج بھی سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ سرگرم اور فعال ہیں۔

اردو زبان ڈاکٹر صاحب کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس کی بقا اور فروغ کے لیے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ جب اردو تحریک کی تاریخ لکھی جائے گی تو گور صاحب اردو کے ان چند عاشقوں میں سے ہیں جن کے نام کے بغیر یہ تاریخ نامکمل ہوگی۔ اردو کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کے خلاف ان کی آواز ہندوستان کے کونے کونے میں سنی جاسکتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا اور قیمتی اثاثہ اردو کی کتابیں ہیں جنہیں وہ ہمیشہ خرید کر پڑھتے ہیں۔ گور صاحب جب بھی دلی شریف لاتے ہیں انجن کی بک ڈپو سے خاصی تعداد میں کتابیں خریدتے ہیں۔ شاید اب ان کا سب سے بڑا شوق یہی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مجھے اپنے بزرگوں کی محبت، شفقت اور پیار بے حساب ملا اور مجھے بھی بزرگوں کی عزت و احترام کرنے اور ان کی پیار بھری ڈانٹ کھانے

میں جو خوشی اور قلبی سکون حاصل ہوتا ہے، میں بیان نہیں کر سکتی۔ یہ ہمارے بزرگ ہی تو ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے ہمارا بچپن ہمیں لوٹا دیتے ہیں۔ گوڑ صاحب ان محترم ہستیوں میں سے ایک ہیں، جو نہایت سادگی، اپنے پن اور بے تکلفی سے کچھ بھی کہہ دیتے ہیں اور برا نہیں لگتا۔

ایک دن ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھے شمیم صاحبہ! کہہ کر کسی کام کے لیے بلایا، کہنے لگے: ”یہ کیا تم نے شمیم صاحبہ! صاحبہ! لگا رکھا ہے۔ یہ اپنی بچی ہے میں تو اسے کبھی صاحبہ نہیں کہوں گا“ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ گوڑ صاحب آتے ہی کہتے ہیں: شمیم آج میں تیرے ہاتھ کی چلے پیوں گا“ اور میں خود ان کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔

گوڑ صاحب کا بہت عرصے سے اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ حیدر آباد گھوم کر آؤں۔ یہ دسمبر ۱۹۸۸ء کی بات ہے۔ میں اردو گھر پہنچی دیکھا گوڑ صاحب بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے: ”میں طے کر کے آیا ہوں کہ اس مرتبہ تمہیں حیدر آباد لے کر جاؤں گا۔ موقع اچھا ہے۔ میری بیوی بھی ساتھ جا رہی ہیں۔ ایک دو لوگ اور ہیں۔ سفر اچھا رہے گا۔ اب ناکی گنجائش نہیں ہے۔ بس فوراً تیار ہو جاؤ۔ ذرا ہمارا حیدر آباد بھی دیکھو، تمہاری دلی سے اچھا ہے۔“ ان کے اصرار کے سامنے میں واقعی نا نہیں کہہ سکی اور رخت سفر باندھ لیا۔ کب حیدر آباد آ گیا، گوڑ صاحب کی پُر لطف باتوں میں سفر کا پتا ہی نہیں چلا۔ حیدر آباد پہنچ کر ایک دن گوڑ صاحب کے یہاں قیام کیا۔ اگلے دن انھوں نے مجھے حسینی شاہد صاحب مرحوم اور ان کی بیگم ساجدہ آپا کی تحویل میں دے دیا۔ اور مخدوم محی الدین صاحب کے صاحبزادے نصرت محی الدین صاحب کو اور اپنی بہن اودھیس رانی کو مجھے حیدر آباد کی سیر کرانے کا چارج دے کر خود غائب ہو گئے۔ اگرچہ ان صاحبان نے میری خاطر تواضع اور سیر کرانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن جنھوں نے حیدر آباد گھمانے کا دعویٰ کیا تھا، ان سے میری ملاقات چار دن بعد انجن ترقی اردو آندھر پریش کے دفتر میں ہوئی۔ گوڑ صاحب نے بتایا کہ وہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں حیدر آباد سے ماہر گئے ہوئے تھے اور کل پھر جا رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ حیدر آباد میں ان کی مہر و نیا

کچھ اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔

گوڑ صاحب عمر کی جس منزل میں ہیں اس عمر میں انسان کی دماغی اور جسمانی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ مزاج میں جڑ چڑا پن آ جاتا ہے۔ گویا زندہ رہ کر بھی انسان زندگی سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگ بیماری اور بڑھاپے کا رونا روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن گوڑ صاحب جو آج سے پندرہ بیس سال پہلے تھے وہی آج بھی ہیں۔ وہی سیاسی سماجی سرگرمیاں، محفلیں، وہی مسلسل سفر، وہی خوش مزاجی اور زندہ دلی۔ ڈاکٹر راج بہب در گوڑ صاحب صحیح معنوں میں زندہ دلاں حیدر آباد کی نائندہ شخصیت ہیں۔

میں گوڑ صاحب کی عقیدت مند ہوں، نیاز مند ہوں اور ان کی صحت و سلامتی کی خواہش مند ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔

---

## خواتین ادب اور راج بہادر گوڑ

راج بہادر گوڑ کی تنقیدی تحریروں کا ایک متواتر پہلو خواتین کی سماجی حیثیت ہے۔ انہوں نے بعض موقعوں پر سرسری طور پر اور بعض جگہ بطور خاص عورتوں کی تعلیم و ترقی کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل راج بہادر گوڑ ادب کو سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی پس منظر کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہیں۔ اور اس بات کے قائل ہیں کہ معاشرہ میں مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں، لیکن تاریخی حقیقتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دور کے فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے خواتین کے سماجی مرتبے، تعلیمی صورت حال، اور عام مسائل کو نظر انداز نہیں کیا۔ کسی ادیب پر لکھتے ہوئے کم از کم آزادی نسواں کے تعلق سے اس پر نظر ضرور ڈالی ہے۔ اور اپنی بے لاگ رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ کالی داس کی تخلیقات کے نسوانی کردار ہوں، خواتین کر بلا ہوں، حضرت محل ہوں، یا بلی اماں، گوڑ صاحب ایسے تاریخی نسوانی کارناموں پر عقیدت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اردو ادب کا دور نشاۃ الثانیہ ہو یا ترقی پسند تحریک کا ذکر ہو، اقبال کے فکر و فن پر بات ہو۔ سیدی کے افانے ہوں یا قمر جالی پر مضمون لکھ رہے ہوں۔ راج بہادر گوڑ آزادی نسواں اور سماجی انصاف کے نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے بطور خاص سروجی نائیڈو کے فکر و فن کو سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کی روشنی میں پرکھا ہے۔ منور مادرلو ان کی کتاب ”انقلاب زندہ باد“ پر بھی انہوں نے شاعرانہ تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی اکثر انگریزی اور اردو تحریروں میں صنف نازک پر اظہار خیال ملتا ہے۔ انگریزی میں بھی



انہوں نے خواتین پر لکھا ہے۔ انگریزی میں مسلم خواتین پر کئی ماہ پیشتر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو سردست سامنے نہیں ہے۔

بزرگ ادیب راج بہادر گوڑ کی تحریروں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ ادب پاروں کی نبض سے روح عصر کو شناخت کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ادب سے اس کے دور کا مزاج جہان کا نظر آتا ہے۔ کالی داس کے ڈراموں شکستلا اور وکرم اروشی کے متعلق ادیب کمار تنم کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

دشیت کا شکستلا کو پہچاننے سے انکار کر دینا اور اس کا واپس اپنی کٹیا میں آجانا اور بھرت کو ہال پوس کر بڑا کرنا یا وکرم اروشی میں شہزادی کا اپنی داسی سے کہنا کہ اس کا شوہر اس کی بیوی کی عزت کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ کہیں اور آنکھیں لٹا رہا ہے۔

اس سلسلے میں راج بہادر صاحب کا خیال ہے کہ کالی داس کے زمانے میں مرد بہت بزدل تھا۔ لیکن عورت کی انا بیدار تھی گویا کالی داس نے اپنے دور کی ایک سماجی حقیقت کو آشکار کیا جو عصری تو تھی لیکن یہ آج بھی صحیح ہے۔ اور اس وقت تک صحیح رہے گی جب تک کہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد کی برتری باقی رہے گی اور عورت شریک حیات تو ہوگی لیکن شریک کارزار حیات نہ ہوگی۔ گوڑ صاحب کا خیال بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آج شریک کارزار حیات ہونے کے باوجود بھی مرد کا کردار عورت کے مقابلے میں زیادہ مضبوط نہیں ہو سکا۔ یہ عظیم ادب کا ایک سماجیاتی پہلو ہی نہیں ہے بلکہ ایک دائمی حقیقت کا انکشاف بھی کرتا ہے۔ عورت ہمیشہ اپنے اشارے اپنی انا کی حفاظت کرتی رہی ہے۔ ہندوستانی عورت کے کردار میں یہ خصوصیت زمانہ قدیم سے تاحال دیکھی جاسکتی ہے۔ بات ماضی کی ہو یا حال کی طبقہ بنواں ہر سطح پر مرد و عورت کو سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے۔ اور زیادہ تر مرد و عورت کا ذخیرہ بنانے میں مرد پیش پیش ہوتا ہے اور پھر وہ خود بھی ان خود کردہ گناہوں سے آزرہ نظر آتا ہے۔ کبھی کبھار یہ تلخیاں ہمارے لوک گیتوں میں نظر آ جاتی ہیں۔ گیت انسان کی معصوم تمناؤں اور زندگی کی چھوٹی موٹی حقیقتوں کو جذبہ بانی سطح پر پیش کرتے ہیں۔ غیر مہذب تمدن میں مرد عورتوں کو مار تلے بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو

ان کی فوقیت یا برتری کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس مقدس ٹل کے فوراً بعد وہ اپنی بیوی کو مٹھائی کھلاتا ہے۔ اور ایسا ہونا کوئی غیر فطری بات بھی نہیں کہ ہر فتح اور عظیم کامرانی کے بعد انسان مٹھائی کھاتا اور کھلاتا ہے۔ راج بہادر صاحب نے دیوند ریتا رتھی کا "گاتاجائے ہندوستان" میں سے تامل پھیروں کے ایک گیت کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "فنی کشیدہ کاری ہی کو سب کچھ سمجھنے والے اس پر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن کیا اس گیت میں غریب محنت کش عورت کی زندگی کا کمر ہناک کھر دراہن پوری شدت سے ظاہر نہیں ہوتا؟" اس گیت میں یہ کہا گیا ہے کہ بیوی کو نہ مارنا "ورنہ رات میں آرام نہ مل سکے گا۔ اس پر گوڑ صاحب کا یہ سوال "کیا اس سے زیادہ سخت انداز میں مرد کو شرمندہ کیا جاسکتا ہے؟" عوامی سطح کو بلند کرنے کے لیے شاید تعلیم و تہذیب اور شائستگی کے لیے سینکڑوں سال چاہئیں۔ لیکن کسی گھر سے جو دہر ایک سوا لہ نشان لگا دینے سے حساس ذہن کو ٹھوکر تو ضرور لگتی ہے۔

گوڑ صاحب کے لکھنے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ کسی دور کے ادب کو اپنا موضوع بنائیں لیکن تقابلی سطح پر دنیا کے عظیم لکھنے والوں کی شع ضرور روشن رکھتے ہیں تاکہ مجموعی طور پر ادب کی عظمت بھی سامنے رہے اور وہ سیاسی سماجی حالات بھی جو ادب کی تخلیق کا نتیجہ ہوتے ہیں کوئی زمانہ ہو اور کوئی جغرافیائی خطہ ہو۔ عورتوں کی کمپرسی کی کہانیاں ادب کے حوالے سے کبھی کبھار ملتی رہی ہیں۔ اور وہ عام نسوانی کردار بھی جس میں حوصلہ، امنگ، تحمل، مشقت، ایثار اور نبرد آزمانی کی امتیازی قدریں ہوتی ہیں۔ اور بعض مرتبہ کردار بزم حیات کی تاریخ کو بھی متعین کرتی ہیں۔ خواتین کو بلا کی عظمت اور اہمیت کو انٹیس کی شاعری کے ذیل میں جس طرح گوڑ صاحب نے دیکھا ہے۔ اس انداز سے شاید نہیں دیکھا گیا۔ سترہویں صدی میں جاگیر دارانہ سماج عروج پذیر تھا۔ سماجی اور ریاستی سطح پر ہنگامے ہوا کرتے تھے۔ لیکن گاؤں کی زندگی میں ایسی اقلیت پھیل نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ دادی گنگا کے کنارے زندگی ایسے ہی خرا ماں خرا ماں گزرتی جیسے گنگا کا دھارا۔ لیکن اٹھارویں صدی میں برطانوی سامراجی لوٹنے نے ہندوستانی عوام کو جس طرح خالی کر دیا تھا اور ایک عظیم المیہ سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوشتی کے کنارے عزاداری حسین نے اس غم کو غلط کیا۔ نظیر نے بھی یہ تباہی دیکھی تھی اور انیس نے جس طرح حضرت شہر بانو اور حضرت

زینب کے کردار پیش کیے ہیں ان سے نہ صرف نسوانی ساریج کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ مرثیہ گو کی ندرت فکر اور عصری تقاضوں سے آگہی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ انیس کی عظمت بھی ہے۔ گوڑ صاحب نے اس پہلو پر جس رخ سے روشنی ڈالی ہے اس سے تحریک آزادی کے سلسلوں کو ملنا بہت آسان ہو سکتا ہے۔ حضرت زینب کم سن بچوں کو جنگ میں شامل ہونے اور ثابت قدمی سے جھے بہنے کے جو طریقے سمجھاتی ہیں۔ اس سے قوم کا نیا کردار ابھرنے میں مدد ملی ہے۔ رزمیہ روایات تازہ ہوتیں۔ اور چھاجانے والی اور ایک عمومی غم کو ہندوستانی سماج پر محیط کر دینے والی قوت سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ ملا۔ راج بہادر صاحب نے لکھا ہے کہ انیس کی عظیم شاعری کی سماجی افادیت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی عظیم جنگ آزادی میں حضرت محل کا ایک مضبوط زبردست کردار ابھرتا ہے۔ جس کی تعمیر میں حضرت زینب کو بھی دخل ہے۔ خواتین کو بلا سے حوصلہ ہمت اور حق و جہاد کی فضا بننے میں مدد ملی۔ گوڑ صاحب کا یہ تخمینہ غلط نہیں ہے۔ تحریک آزادی میں اردو شاعری کا اپنا ایک اثر انگیز ردل رہا ہے۔ دور جدید میں بوشش نے مرثیہ سے ایک نیا حوصلہ لینے کی مثال قائم کی۔ اسی طرح گوڑ صاحب انیس کی مرثیہ نگاری میں سماجی سطح پر معنی خیز اثرات کی کار فرمائی کو محسوس کر رہے ہیں۔

راج بہادر گوڑ نے بالعموم آزادی نسواں اور تحریک آزادی کے تقاضوں کے تعلق سے مختلف ادوار میں خواتین کی کارکردگی پر نظر کی ہے۔ انھوں نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ جاگیردارانہ سماج میں عورت یا تو طمع خانہ ہے یا بازار میں شمع محفل۔ سماجی کشمکش میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ البتہ صنعتی دور نے اسے آزاد تو کیا لیکن وسعت زنجیر تک۔ بورژوا جہالیات میں عورت کی طرف رویہ محض جنسیات کے تابع ہے۔ یہ تو ترقی پسند تحریک ہی ہے جس نے عورت کو انسان کے روپ میں دیکھا ہے۔

بزرگ ادیب نے کم و بیش بات صحیح لکھی ہے۔ لیکن ان کے اس خیال سے پوری طسرح اتفاق کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے انھوں نے عالمی حالات کے پیش نظر جاگیردارانہ عہد کو دیکھنے کی کوشش کی ہو۔ ہندوستان کے سیاسی سماجی حالات اور دنیا کے سماجی حالات میں فرق ہے۔ ہندوستان کا جاگیردارانہ عہد نسبتاً طویل ہے۔ اسی جاگیردارانہ عہد میں دور نشاۃ الثانیہ

بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا آغاز سرسید کے دور سے ہوتا ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی سے تحریک آزادی نسواں کی جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔ اس تحریک کے تحت بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ہندوستانی اور عالمی سطح پر رسائل کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ رسائل خواتین کے اچھے ہوئے مسائل تعلیمی جدوجہد اور آزادی سے متعلق بے چینیوں کے آئینہ دار ہیں۔ انگلستان میں عورتیں اپنے حقوق منوانے کے لیے پارلیمنٹ کے باہر ٹوٹ پھوٹ کرتی ہیں۔ اور یہ اطلاعات اخبارات میں چھپتی ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں خواتین جج کے عہدوں پر فائز نظر آتی ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں تحریک آزادی نسواں کا فروغ ہوتا ہے۔ جلسے کیے جاتے ہیں۔ آغاز بیسویں صدی میں اسکالرشپ لے کر عطیہ فیضی لندن میں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ ان سے پیشتر سروجی نائیڈو انگلینڈ میں قیام پذیر تھیں۔ یہ لوگ اپنے وطن سے باہر رہ کر دنیا کے حالات کا مشاہدہ اور تجربہ کرتی ہیں۔ اور وطن میں واپس آکر تحریک آزادی اور تحریک آزادی نسواں اور تعلیم نسواں کی سرگرم کارکن بن جاتی ہیں۔ سرسید کے قیام لندن کے دوران لکھے گئے خطوط میں خواتین کی بیداری کی اطلاع ملتی ہے۔ شبلی کے سفرنامہ سے اٹلی اور آس پاس کی خواتین کی بیداری اور تعلیم و ترقی کے متعلق خبریں ملتی ہیں۔ حالی جب چپ کی داد اور مناجات بیوہ لکھ رہے تھے تو اس وقت عالمی سطح پر حقوق نسواں کی تحریک چل رہی تھی۔ شروع بیسویں صدی اور اس سے پیشتر کے خواتین کے رسائل عالمی حالات کے کالم پیش کرتے تھے۔ منیر احمد اور سوا کے ناولوں کے نسوانی کرداروں سے لے کر پریم چند کے نسوانی کرداروں تک خواتین کی نئی تعلیم و تہذیب سے متعلق ایک نئی فضا تعمیر ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے پیشتر تحریک آزادی نسواں کئی مراحل سے گزر چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے بھی عورت کو مختلف حیثیتوں سے دیکھا۔ صرف جمالیاتی نقطہ نظر ہی سے نہیں دیکھا۔

گوڑ صاحب یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ نشاۃ الثانیہ کی ہر تحریک کا ایک لازمی جز خواتین کی آزادی ہونا چاہیے۔ لیکن اس اعتبار سے وہ بے لخت خیالات رکھنے والے ادیبوں شاعروں سے مایوس بھی نظر آتے ہیں۔ اقبال اور عورت کے ایک ذیلی عنوان کے تحت انھوں نے لکھا ہے۔

”خواتین کی آزادی کے بارے میں اقبال کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتے تھے۔ جو انھیں فرزند ان



تمدن کے غصے کا ہدف بنادیتی وہ چاہتے تھے کہ عورت خود اس کا فیصلہ کرے کہ زمرہ کا گلو بند یا آزادی نسواں دونوں میں کون سی چیز زیادہ زینت بخش ہوگی۔ یا نسوانیت زن کا نگہاں ہے فقط مرد۔۔۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے خیالات تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کی نفی کرتے ہیں۔ اقبال کو عورت کے مسائل کا رسمی طور پر احساس ہے۔ وہ دل سے آزادی نسواں کے حامی نہیں ہیں۔ اگرچہ تلخی حالات کو محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس عقدہ مشکل کی کشود ممکن نہیں ہے۔ گوڑ صاحب خواتین کی پیچیدہ مسائل اور ان کی رتودے آزدہ نظر آتے ہیں۔ معاشرہ کی ترقی اور صحت کا دار و مدار عورت اور مرد دونوں کی کارکردگی پر ہوا کرتا ہے۔ جو انسانی ذہن کو انقلابی سمت کی جانب مبذول کر دے۔ گوڑ صاحب ایسے ادب کو حقیقتاً عظیم ادب کے ذیل میں رکھتے ہیں گوڑ صاحب نے اپنے مضمون "بیدی ایک عظیم فن کار" میں یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے یہاں عورت کے کتنے روپ ہیں۔ اور کرب کے کتنے رنگ ہیں۔ بیدی کے نسوانی کرداروں پر گوڑ صاحب نے قدرے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ بیدی کی متعدد کہانیوں میں "عورت" اپنی تمام تر ناآسودگیوں، بربادیوں، آزدوؤں اور اربانوں کے ساتھ بار بار آتی ہے۔ بیدی کی عورت مجاہد بھلے ہی نہ ہو لیکن بے چین ضرور ہے۔ اس کی یہ بے چینی قارئین کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ راج بہادر گوڑ نے ایک موقع پر کہا تھا ادب میں زندگی اپنے تمام اچھے اور برے پہلوؤں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور ادیب اپنی تخلیق سے ان اقدار کو ابھارتا ہے جو انسانیت کا سراپا بن جاتی ہیں۔ اور زندگی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ یہ ارتقاء ادبی سے اعلا اور اعلا سے اعلا تر کی طرف ہوتا ہے۔ عظیم ادب کی بات ہو یا زندگی کے ایشا رطلب پہلوؤں کی بات ہو۔ راج بہادر گوڑ کے نوک قلم پر مخدوم کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اردو اور انگریزی میں ایک نہیں نہ جانے کتنے مضامین انھوں نے لکھے ہوں گے۔ جو کچھ شائع ہو چکے ہیں اور کچھ باقی ہیں۔ ان کی شاعری اور حیات پر لکھتے ہوئے ان کا خیال تھا کہ مخدوم کے یہاں عورت کا وہ تصور نہیں جو داغ کے یہاں ملتا ہے۔ مخدوم کے یہاں عورت مرد کی شریک بزم حیات ہی نہیں شریک رزم حیات بھی ہے۔ دراصل حیدرآباد اور اطراف حیدرآباد میں خواتین کی تعلیم و ترقی کی بات نئی نہیں ہے بلکہ بہت پرانی ہے۔ یہاں کی مستورات نے انیسویں صدی

کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں نکلنے والے رسائل میں متواتر مضامین اور شعری تخلیقات پیش کی ہیں۔ — سروجی نائیڈو کے والد نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنالیا تھا کہ وہ عورتوں میں تعلیم کو عام کریں۔ راج بہادر صاحب جن کا تعلق حیدرآباد سے رہا ہے اور جو نہایت روشن اور سیکولر مزاج رکھتے ہیں ان کے ناقدانہ خیالات میں خواتین کے سماجی مرتبوں اور سماجی کاموں اور تعلیمی وسعتوں کی تلاش توقع کے عین مطابق ہے۔

انگلینڈ میں ہندوستانی تہذیب کی نقیب اور تحریک آزادی کی سپاہی سروجی نائیڈو حیدرآباد کی سرزمین پر پیدا ہوئیں۔ اپنی تقریروں اور انگریزی شاعری کی وجہ سے بلبہ ہند کہلاتے ہیں ان کی حیات اور ذہنی ارتقاء پر راج بہادر گوڑ نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ ان کے کاموں اور زندگی کے تمام گوشوں کو روشن کیا گیا ہے۔ لیکن خواتین کی قیادت اور تعلیم نسواں سے متعلق ان کی سرگرمیوں کا پہلو نظر انداز ہو گیا ہے۔ راج بہادر صاحب نے ان کے والد کی تعلیم نسواں سے دلچسپی کا ذکر کیا ہے۔ بہر صورت نہ صرف اہل حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان کے مرد اور عورتیں ان کے کارناموں کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں۔

حیدرآباد کی ایک اور خاتون افسانہ نگار قمر جمالی کی کہانیوں پر انھوں نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے جو ہمیں ان کی حیات کے مختلف گوشوں سے متعارف بھی کرتا ہے۔ اور ان کے فکر و فن کی نزاکتوں کو پرکھنے اور انھیں شوق کے ساتھ پڑھنے پر آمادہ بھی کرتا ہے۔ راج بہادر صاحب کا خوب صورت مضمون پڑھنے کے بعد قارئین قمر جمالی کی تخلیقات کو شاید دوبارہ پڑھنا چاہیں۔ تنقید اگر لکھنے اور پڑھنے والوں کو تعمیری قدروں کا سبق دیتی ہے تو تبصرے اکتاہٹیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق بھی پیدا کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے گوڑ صاحب اپنی مضمون نگاری اور بعض مرتبہ تبصرہ نگاری میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

بی بی اماں کی شخصیت سے کون ناواقف ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر پر مقالہ لکھتے ہوئے گوڑ صاحب نے جس طرح بی بی اماں احمد ان کے مایہ ناز فرزند کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شاید ہی کسی نے اس انداز سے لکھا ہو۔ مولانا محمد علی کی شخصیت پر بہت لوگوں نے مضامین لکھے ہیں لیکن ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں یعنی اسلام اور حب الوطنی کو جس طرح انھوں نے سائنٹی فک

بنیاد پر ترتیب دیا ہے، وہ قابل قدر ہے۔ بی اماں کا کردار اور مسلمان ہند کے نام ان کا پیام پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک ضعیف خاتون کس طرح شوق جہاد سے سرشار ہے۔ لکھتی ہیں۔

”میں نے کہہ دیا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے۔۔ کوئی ایسی شرط قبول کر لیں گے جو اسلام کی شان کے خلاف اور مفاد ملک کے منافی ہوگی تو باوجود اس تمام محبت کے جو قدرتا مجھے اپنے بیٹوں سے ہے اس سے قبل کہ وہ مراط مستقیم سے ہٹ سکیں، اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی اگر کسی دن ہندوستان کے لیے ہوم رول کے جھنڈے کے نیچے ہم سب کو جمع کیا گیا تو انشا اللہ وہ اس ضعیف کو طالبان ہوم رول کی صف اول میں پائیں گے“

راج بہادر صاحب کا یہ اندازہ کہ بی اماں کی مندرجہ ذیل شخصیت اور حب الوطنی کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی شخصیتوں کی تعمیر میں بڑا دخل ہے، غلط نہیں ہو سکتا۔

”انقلاب زندہ باد“ راج بہادر گوڑ کے الفاظ میں منور مادیوان کی یادوں کی برات ہے جو ذہنوں میں آزادی کی جنگ کے نقشے کو ابھارتی ہے یا دیں۔ جو تقسیم کے المیہ کا فوجہ ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ گوڑ صاحب نے مخدوم اور فیض کی نظمیں بھی پیش کر دی ہیں کہ یہ بزرگ ادیب کے ذکر و فکر کا بیش قیمت سرمایہ بھی ہیں۔ انقلاب کی نیرنگیوں کو سمجھنے کے لیے اس سرمایہ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ راج بہادر خود اس انقلاب کا حصہ رہے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ راج بہادر گوڑ ایک ترقی پسند ناقد ہیں۔ ”لیکن ایسے انتہا پسند نہیں ہیں کہ صرف مقصدیت ہی کو بیش نظر رکھیں۔ انھوں نے جمالیاتی قدروں کو بھی عزیز رکھا ہے“ خاص طور سے ان مضامین میں جہاں خواتین کو موضوع بنایا گیا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گوڑ صاحب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کی تقریر و تحریر میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ جس طرح بے تکلفی کے ساتھ وہ باتیں کرنے کے عادی ہیں اسی طرح ان کی تحریریں بھی بے ساختگی اور سادگی کا لطف رکھتی ہیں۔ ان کی گفتگو عموماً گہرے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے ان کی علمی یا ادبی نثر میں کسی





## ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: ایک شخصیت منشورِ مثلثی

حیدرآباد، فرخندہ بنیاد، ہمیشہ سے اپنی گنگا جہنی تہذیب کے لیے ہندوستان تو کیا دنیا بھر میں اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ یہ بات تعجب خیز تو ضرور ہے کہ وہ خطہ زمین جس کا درحقیقت گنگا و جمن کے سنگم سے کوئی جغرافیائی علاقہ نہیں اور وہ تہذیب نو جس کی نو شہنشاہ اکبر نے کی تھی، وہ اپنی اصلی جغرافیائی حدود میں زندہ ہو کر نہ ہو۔۔۔ حیدرآباد کی فضاؤں میں ہواؤں میں، رودِ موسیٰ کے کنارے کنارے بے قطب و مشتری کے لالزاروں میں، یہاں کی اونچی اونچی عویلیوں میں، اور ان کے زیر سایہ بسی پھوٹی پھوٹی بستیوں میں۔۔۔ نہ صرف زندہ بلکہ پائندہ ہے۔ حیدرآباد اپنے اس خصوص کے لیے یہاں کے بایوں کے دل میں بسی محبت، سلیقہ، اظہارِ محبت، اور اس اظہار کے لیے اس خوب صورت واسطے، کامرہوں منت ہے جسے ہم ایک نازک سی بیل تصور کریں جو اگرچہ کہ قرض دار کی طرح سارے معاشرے سے لپٹی ہوئی ہے، جس کے بیل ڈوروں میں رودِ موسیٰ کی مٹھاس، گنگا و جمن کی جولانی، بنارس کی پاکیزگی، لکھنؤ کا لوچ اور گداختگی، اودھ کی شائستگی، کشمیر کی موسیقیت اور دہلی کا کھری کھانٹ کھر دہان رنگ برنگی پھولوں کی طرح ایک دوسرے میں اس طرح گتھم گتھا ہیں کہ جیسے یہ سارے مختلف النوع گل بوٹے ایک ہی جڑ کی افزائش کا نتیجہ ہیں۔۔۔ اور یہ سچ بھی ہے کیوں کہ ان سارے گلوں کے رنگ کچھ ہوں۔۔۔ ڈھنگ کچھ۔۔۔ مگر ان کی خوشبو سے جو عطر بیز فضا بنتی ہے اس سے یہ تجزیہ کرنا ناممکن ہے کہ کس گل نے کیا حق ادا کیا۔ اسی عطر بیز فضا کا نام ہے۔۔۔ 'تہذیبِ دکن'۔

ارض دکن کی اس عطر بیز فضا نے دنیا کو اپنے وقت کے مشہور دانشور، ادیب، شاعر، سخن ور اور سخن فروشوں کا تحفہ دیا، ماقبل آزادی بھی — اور آزادی کے بعد بھی۔

میں اپنی دانست میں خود کو اس بات کی اہل نہیں سمجھتی کہ ابوالفضل فیضی یا شاہنامہ اسلام کی روشنی میں اپنے مضمون کا متن پیش کروں۔ ہاں مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اگر ہم حیدرآباد کی اس گنگا جہنی تہذیب کی تاریخ مرتب کریں تو اس صدی کے ادائل میں کچھ نام ہمیں ایسے جگمگاتے ملیں گے کہ جن کی روشنی میں ہم ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کا تجزیہ کر سکیں گے۔ ایسے کچھ نام جنہیں حیدرآباد کا ہر چھوٹا بڑا جانتا ہے وہ ہیں، رائے جانی پرشاد، حبیب الرحمن مولوی عبدالحق، آغا حیدر حسن مرزا، رائے محبوب نرائن، ہارون خاں شہرانی اور مخدوم محی الدین، جن کے بارے میں یوں کہا جاسکتا ہے۔

ابھی بتوں پہ باقی ہیں جلے تنکوں کی تحریریں  
یہ وہ تاریخ ہے، بجلی گری تھی جب گلستاں پر (نور جلالوی)

ہندوستان کی تہذیب ایک زندہ تہذیب ہے، ایسی تہذیب جو تغیر پذیر ہے۔ زمان و مکاں کے حالات سے اثر قبول کرتی ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ کیوں کہ ایسی ہی تہذیب میں ایک 'زندہ قوم' پنپ سکتی ہے، اور زندہ قومیں جلے تنکوں کی تحریروں کو مرتب کر کے واویلا نہیں مچاتیں، کہ تغیر نظام فطرت ہے۔ جہاں ایک طاقت ناپید ہوئی کہ اس کی موزوں بدل ظہور میں آگئی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان ظہور میں آتی ہوئی طاقتوں کو محسوس کریں، اور اس کی شناخت اور سالمیت میں اپنا حق ادا کریں۔

ادب پر میں نے جن ناموں کی زنجیر باندھی ہے، اسی کڑی کو اور آگے کھینچیں تو ایک نام اور ملے گا، اتنا ہی جانا پہچانا اور اتنا ہی باوقار — اور یہ نام ہے — ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ جنہیں ہم ارض دکن کی گنگا جہنی تہذیب کا 'نک کا نک' کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا نام ہندوستان کے ہند بھٹے کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے، بلکہ حیدرآباد کی تو شناخت ہے۔ ان کا شمار ہندوستان کی ان گنی چنی شخصیتوں میں کیا جاتا ہے جو اپنی پہلو دار پہچان کی وجہ، اگر دکن کی تاریخ مرتب کریں تو اپنے تئیں ایک

باب کا اضافہ کر سکتی ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کے اس دور کی پودے جب ہندوستان انحطاط سے گزر رہا تھا۔ خون میں جوش اور جذبے میں سرفروشی تھی۔ شاید یہی بات ہے کہ اس دور کے جتنے بھی دانشور رہے وہ سارے کے سارے ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ بیک وقت ادیب بھی شاعر بھی، سیاسی مدبر بھی، ٹریڈ یونین لیڈر بھی۔ مزدور بھی اور استاد بھی۔ ڈاکٹر گوڑ کی شخصیت کو ہم ان ہی خصوصیات کی بنا پر منشور مثلثی کہہ سکتے ہیں۔ جو تین مختلف پہلوؤں سے رنگ و نور کی فضا باندھ رہی ہے۔ بحیثیت سیاسی مدبر، ٹریڈ یونین لیڈر اور — تنقیدی ادیب۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ارض دکن کی سبک خرام، چکیلی، پھیلی روڈ موسیٰ کے کنارے آباد محلہ گولی پورہ کے ایک کاستھ گھرانے میں جناب محبوب رائے گوڑ اور محترمہ امرادتی گوڑ کے گھر ۲۱ جولائی ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ ۱۸۵۷ء کے آس پاس گوشائیں گنج، فیض آباد، لکھنؤ سے ہجرت کر کے حیدر آباد آیا۔ اور یہیں بس گیا۔

ابتدائی تعلیم مفیدالانام، دھرمادانت، رفادہ عام اور شاہ علی بندہ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ مگر ساتویں جماعت میں انھوں نے اپنا ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی میں تبدیل کیا۔ اور چادرگھاٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں یہیں سے میٹرک امتیازی نشانات سے پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کیا، اور اسی سال ڈاکٹری کے لیے عثمانیہ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں وہیں سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے زمانہ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

میں اپنے تاریخ کے استاد سے بہت متاثر تھا جنھوں نے مجھ میں چھپے ادبی اور سیاسی رجحان کی نشاندہی کی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ میں پوری طرح ادب کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اپنے تعلیمی وظیفے سے رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا کتب خانہ چلاتا تھا۔ مطالعے کے شوق میں میں گھنٹوں اسٹیٹ لائبریری میں بیٹھا رہتا تھا۔ علاوہ ازیں اپنی ادبی زندگی کی ترویج کے لیے میں استاد

و مشہور شاعر جناب صدق جانی اور چچا جناب رائے محبوب زائن گوڑ کامرہون  
منت ہوں جنھوں نے مجھ میں شاعری اور ادب عالیہ کے مطالعے کا ذوق  
پیدا کیا۔

۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء کا دور حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کے لیے بڑا بد بخت ثابت  
ہوا۔ آندھرا پردیش خصوصاً حیدرآباد اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں جاگیرداروں اور  
دیش مکھوں نے اپنی سلطنتیں قائم کر رکھی تھیں۔ عام انسانوں کے سماجی حقوق ان مٹھی بھر جاگیرداروں  
اور دیش مکھوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس دور کے تمام طالب علم جو ذرا بھی حساس  
رہے ہوں اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔  
لہذا راج بہادر گوڑ بھی جن کی ابھی ابھی میس بیگ رہی تھیں، جو اپنی عمر کے اس دور سے گزر رہے  
تھے، جسے حیات کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ جب بساط ارض کی ہر شے پر حسن و جمال کا تسلط  
نظر آتا ہے، جب فکر فردا سے دور ساز زندگی کی ہر صحن مسرور کن محسوس ہوتی ہے۔۔۔۔۔  
بقول مخدوم۔

بلائے فکر فردا ہم سے کونوں دور ہوتی تھی      سرودِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی  
ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی      ملک بھولا بھلاتے تھے، لڑکیاں جو رہتی تھی

اس سرودِ سرمدی کے دور میں وہ شعوری طور پر سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ زمانہ شباب  
ان کے لیے باعث تسکین نشاط تو کجا باعث احساس شباب بھی نہ ہو سکا۔ اگرچہ جوانی کا  
شعور عام انسانوں کی طرح ان کے ہاں بھی اتنا ہی جذباتی تھا جس کا فیض پر مضمون لکھتے  
ہوئے انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

”اٹھارہ بیس سال کا بس تھا، جوانی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ ایسے میں  
چاند چڑھتا ہے تو اس کے انداز اور ہوتے ہیں۔ دل میں طوفان اٹھاتا ہے  
چاند کی کرنیں مضراب بن کر دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں۔ تو عشق گنگنا  
اٹھتا ہے۔“

میں نے انھیں کے الفاظ دہراتے ہوئے ان کی اپنی جوانی کی کسی ہوشربا کہانی کے بارے میں



پوچھا کہ جب وہ اپنے خیالوں سے سرشار، کسی پری جہال کے ساتھ بادلوں پہ سوار فضا میں تیرتے رہے ہوں، اور پیار کی قوس قزح ان پر رنگ و نور کی برسات کرتی رہی ہو۔  
 ”جوان۔۔۔ ہاں جوان تو ہم ہوئے تھے۔ مگر کب۔۔۔ اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔“

انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے  
 ”اگر تو مجھے کچھ وقت دیتی ہے تو میں اپنی یادوں کو آواز دوں؟“

ڈاکٹر گوٹ نے تو قہقہہ کے بیچ اتنی گہری بات کہہ دی اور پہلے سے نارمل دکھائی دینے لگے، مگر وہ لمحہ میرے لیے باعث فکر رہا کہ جو انسان اپنی ذات میں انجمن رہا ہے، اس کی خلوت میں جلووں کا تصور بھی مختلف رہا ہوگا۔ خصوصاً جس کا بچپن ہی سن رسیدہ رہا ہو۔۔۔ دراصل ڈاکٹر راج بہادر اپنے بچپن ہی میں بزرگ رہے ہیں۔

بقول شخصے

بزرگی از عقل است، نہ سال

تو نگر می بہ دل است، نہ بہ مال

۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء میں جب ریاستی کانگریس نے جاگیردارانہ نظام کے خلاف عام سماجی حقوق کی بحالی کے لیے ستیہ گرہ کی توجہ راج بہادر گوڑ باضابطہ اس تنظیم میں شامل ہو گئے، مگر وہ ستیہ گرہ گاندھی جی کے حکم پر درمیان ہی سے اٹھالی گئی۔ جس سے نہ صرف راج بہادر گوڑ بلکہ تمام جوان نسل دل برداشتہ ہو گئی اور کسی اور تنظیم کی تشکیل کی منتظر رہنے لگی۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۹۳۹ء کے اواخر میں کامریڈس اسوسی ایشن کی داغ بیل پڑی۔ بس ڈاکٹر گوڑ کے ساتھ اس وقت کے کئی ہونہار طالب علم، مخدوم عی الدین، سید براہیم، مانک لال گپتا، احسن علی مرزا، ناگوراؤ، غلام حیدر، مرزا حیدر حسن، عاقل رضوی سری نواس لاہوتی، جوادر رضوی اور ادتکار پرشاد، کامریڈس اسوسی ایشن سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء تک وہ باضابطہ سیاست میں داخل ہو چکے تھے اور کیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انھوں نے سیاست کے ساتھ ٹریڈ یونین ازم میں قدم رکھا، اور اس وقت سے ان کی زندگی کے یہ دونوں رخ ایک دوسرے سے متصل یوں چلتے رہے کہ ان کو الگ کر کے دیکھنا خود ڈاکٹر گوڑ کو بانٹ دینا، یا پھر انھیں ادھورا دیکھنے کے مترادف ہوگا۔

۱۹۴۱ء میں وہ کامریڈس اسوسی ایشن کے باقاعدہ رکن بن گئے، اور ۱۹۴۲ء میں اس تنظیم کے معتمد عمومی اور ۱۹۴۳ء میں صدر بن گئے۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۸ء اور پھر ۱۹۶۷ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۶۹ء میں وہ ریاستی نائب معتمد۔ اس سے قبل ۱۹۶۴ء میں C.P.I. کی ساتویں کانگریس میں پارٹی کے قومی کونسل کے لیے چنے گئے۔ ۱۹۶۵ء کو دسویں کانگریس وجے واڑہ میں سنٹرل ایگزیکٹیو کے ممبر چنے گئے۔ ۱۹۶۸ء میں C.P.I. کی سنٹرل ٹریڈ یونین ڈپارٹمنٹ کے انچارج مقرر ہوئے۔ تو ۱۹۸۸ء تک اسی عہدے پر قائم رہے۔ ۱۹۸۹ء میں پارٹی کانگریس کلکتہ میں اپنے عہدے سے دستبردار ہو گئے۔

اگرچہ ٹریڈ یونین ازم سے ان کا تعلق ۱۹۴۷ء سے رہا۔ جب مابعد جنگ کی بڑھتی قیمتوں کے خلاف ریٹوں سے مزدوروں نے ہڑتال شروع کی تھی۔ مگر حیدرآباد میں آل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کی داغ بیل ۱۹۴۶ء میں پڑی اور ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو تھرہ کمونڈ سکندرآباد میں منعقدہ ایک جلسے میں مخدوم محی الدین کو صدر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو معتمد عمومی مقرر کیا گیا۔ اپنی ٹریڈ یونین ازم کے دوران سپنگ ملز مزدور یونین، ٹکسٹائل مزدور یونین، شاہ آباد سمنٹ مزدور یونین اور نہ جانے کتنی ہی مزدور یونینوں سے وابستہ رہے۔ آج بھی بحیثیت صدر

1. A.P. Land Development Bank Employees' Union
2. N.M.D.C. Staff Union
3. A.P. Govt. Press Employees' Union
4. IDPL Employees Union

سے وابستہ رہے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو جب ریاست گیر  
Anni Depression Day منایا گیا تو

مخدوم محی الدین، جو ادرضوی اور راج بہادر گوڑ کے خلاف وارنٹ جاری کر دیے گئے، اور کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عاید کر دی گئی۔ اس وقت مخدوم محی الدین شاہ آباد میں تھے۔ جو ادرضوی اور ڈاکٹر گوڑ اگرچہ روپوش ہو گئے تھے، مگر چوں کہ پہلی بار روپوش ہوئے تھے۔ زیادہ دن چھپے نہ رہ سکے۔ لہذا نومبر ۱۹۴۶ء کو دھر لے گئے، اور حیدرآباد کی سنٹرل جیل میں مجبوس کر دیے گئے۔

۱۹۴۶ء کو جے پرکاش نرائن کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب کہ وہ کربلا میدان، سکندر آباد پر ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے والے تھے۔ تو شہر میں زبردست بد نظمی پھیل گئی۔ اس بد نظمی سے فائدہ اٹھا کر ڈاکٹر گوڑا اور جواد رضوی جیل سے فرار ہو گئے۔ اور اس طرح روپوش رہے کہ حکومت کے دانت کھٹے ہو گئے۔

۱۹۴۸ء کے اوائل میں حکومت نے ان کے خلاف ایک چال بچایا۔ اخباروں میں یہ جھوٹا اعلان کیا گیا کہ کامریڈ گووندو شراف، راوی نرائن ریڈی، مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑا کے خلاف وارنٹ منسوخ کر دیے گئے ہیں۔ اگرچہ حکومت کی یہ چال بازی ان لوگوں کی سمجھ میں آگئی تھی، پھر بھی اس ناپاک پالیسی کا پردہ فاش کرنے کے لیے انھوں نے ایک چال چلی۔ حشمت گنج پر ایک میٹنگ بلائی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ اس میٹنگ کو ڈاکٹر گوڑا مخاطب کریں گے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر گوڑا سائیکل پر سوار جلسہ گاہ پہنچے مگر جوں ہی وہ جلسہ گاہ کے اندر داخل ہوئے پولیس نے دروازے بند کرنے شروع کر دیے۔ کامریڈ اس چال کے لیے پہلے ہی سے تیار تھے۔ انھوں نے ایک مزدور راج لٹا کو اپنے حلقے میں لیا اور راج بہادر — زندہ باد، کے نعرے لگانے لگے۔ اس طرح پولیس کو غلط راہ پر لگا کر ایک بار پھر وہ سلطان بازار کو بٹھی کی راہ فرار ہو گئے۔ مگر ۲۳ اپریل ۱۹۵۱ء کو دیور کندہ تعلقہ کی راج کندہ پہاڑیوں پر گرفتار کر لیے گئے۔ پھر تو ۱۳ مئی ۱۹۵۲ء کو جب وہ راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہوئے تو ڈاکٹر ادھاکر شنن کی ایما پر رہا کیے گئے۔ ۱۹۵۶ء کو دوسری بار بھی راجیہ سبھا کے ممبر چنے گئے تو ختم میعاد تک قائم رہے۔

۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۸ء کو انھوں نے اسمبلی چناؤ میں حصہ لیا، مگر دونوں ہی اوقات اپنے حریف کے آگے شکست کھائی۔ پہلی بار شاہ بندہ اسمبلی حلقے سے جناب صلاح الدین اویسی اور مختصر معصوم بیگم سے، اور دوسری مرتبہ سکندر آباد پارلیمانی حلقے سے شیو شنکر سے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست سے کوئی رشتہ استوار نہیں رکھا۔ اب تو بس ایک طرف ٹریڈ یونین ازم سے رشتہ رہ گیا ہے جو انشا اللہ ان کی آخری سانس تک قائم رہے گا، تو — دوسری طرف ادب سے — بولان وال رہے گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ہمہ رخی شخصیت، بیک وقت تین خانوں میں بٹی ہے۔ جسے ہم تین پگڈنڈیاں تصور کر سکتے ہیں۔ سیاست، ٹریڈ یونین ازم اور ادب۔ مگر جہاں یہ تینوں پگڈنڈیاں ایک سرے پر آزادانہ طہر پران کی جات کی متوازی دوڑ رہی ہیں وہیں دوسرے سرے پر یہ ساری ایک پل سے منسلک ہیں۔

اردو گوڑ صاحب کی مادری زبان بھی ہے، اور معشوقِ دلنواز بھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک کالم نگار نے کے چشم و چراغ ہیں اور اردو ان کی گھنٹی میں پڑی ہے، بلکہ اس لیے کہ اردو زبان کی ناز برداریاں ڈاکٹر گوڑ کے زندہ رہنے کا ایک خوب صورت بہانہ ہے۔ یہاں میں اپنے ہی ایک مضمون ”ڈاکٹر راج بہادر گوڑ“ اور بہادر شاہ ظفر ایوارڈ برائے سال ۱۹۹۶ء“ بطع شدہ روزنامہ سیاست مورخہ یکم اپریل ۱۹۹۶ء کے ایک فقرے کو دہرانا چاہوں گی۔ جس طرح انگریزی کے مشہور محقق و دانشور ڈاکٹر جانسن کو ان کی ملی کچلی کنٹوپ، اور کھلے گریبان کے ہادڑ کوٹ میں بلوس، کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے بیٹھے رہنے کی وجہ انھیں

A Lion in the gun کہا گیا تھا، اسی طرح، آگے پیچھے، دائیں بائیں،

کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے بیٹھے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو ہم ایک ایسے اشارے تعبیر کر سکتے ہیں جو نہایت ادنیٰ سے گزرا ہے اور زمین پر قدم تک اطراف میں اپنی ٹھنڈک بکھیر رہا ہے۔

دن کے بارہ گھنٹوں میں سے تقریباً نو گھنٹے بشرطیکہ انھیں کسی کام سے جانا نہ ہو، وہ یا تو کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ یا پھر لکھ رہے ہوتے ہیں۔ کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے، گھومنے والی کرسی پر بیٹھے ننھے سے معصوم بچے کی مسکراہٹ لیے چمک دار آنکھوں سے وہ ہر آنے والے سروں ملتے ہیں جیسے وہ کسی انسان سے نہیں مل رہے بلکہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ باوجود ان کی فطری بذلہ سخی کے ان کی عین نگاہوں کی آندھی سلمے والے کے پیر اکھاڑ دیتی ہے۔ ہاں مگر جو کبھی کسی کو انھوں نے اپنوں میں شامل کر لیا ہو تو بس۔۔۔ ان کے اندر کا ”حیدر آبادی تہذیب کا نمک کانکر“ راج بہادر، مشہور دانشور، ادیب و ناقد، سیاسی مدبر و ٹریڈ یونین لیڈر سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے۔ اور اس وقت وہ صرف



ایک مشفق باپ، بزرگ — یا پھر دوست رہ جاتے ہیں۔ ہاں مگر بات حق و انصاف کی ہو تو کھری کھری سناتے ہوئے وہ آؤ دیکھتے ہیں، نہ تاؤ — حتیٰ کہ اگر کسی اجنبی کو ان کے اس موڈ میں شرفِ ملاقات حاصل ہو جائے، تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے۔

دو چار ٹانگے اور، لگے ہاتھ، ٹخیں گھر

دامن بھی کچھ پھٹا ہے، گرمیاں کے ساتھ ساتھ (مردِ جلالوی)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی قدآور شخصیت اسم بامسمیٰ ہے۔ ادنیٰ قدر، تھکے نقوش، چھریرا

بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، قید و بند کی صعوبتیں پہنے کے باوجود، چہرے کی وہ بے دارغ رنگت جسے دیکھ کر شمیم جے پوری کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آ جاتا ہے۔

گیا نہ قیدِ قفس میں بھی بانگین اپنا

اسی طرح سے رہے جس طرح چمن میں رہے

سفید کرتا پاجامہ، یا پھر شیروائی، اور ہاتھ میں آنسو سی چھری میں ان کی شخصیت بڑی جاذب

نظر معلوم ہوتی ہے۔ ادبی جائزے کے پبلشر جناب بشیر احمد صاحب نے انھیں جادو جگاتی شخصیت

کہا تو مجھے لگا کہ ڈاکٹر گوڑ کے سراپا کو سر پہنے کے لیے اس سے موزوں اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی۔

باوجود اپنی بڑائی کا لوہا منوانے کے ان کی شخصیت میں ایک ایسی کشش ہے کہ سامنے دالے کا

دل موہ لیتی ہے۔ گھنٹوں ساتھ رہ کے نکل آؤ، تب بھی دامن دل کا ایک کنارہ وہیں کہیں اٹکارہ جاتا

ہے۔ اور یادوں کے کنج سے نکلا ایک ہلکا سا بھونکا بھی تارِ نفس کھینچے لگتا ہے۔

بذریعہٴ اور برجستہٴ کلامی ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ سادگی کا یہ عالم ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا

کہ ہم ایک ایسے مرد مجاہد سے مل رہے ہیں جو ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف بادشاہ

وقت کے آگے صف آرا ہو گیا تھا۔ جس نے اپنی تنظیم و مقاصد کے حصول کے لیے جہینوں روپوشی کی

تکالیف برداشت کیں، جیل کی صعوبتیں سہیں، جو مسلسل دس سال راجہ سمجھا کا تمبر رہا ہے، اور بحیثیت رکن اور

سکرٹری کمیونٹس پارٹی آف انڈیا کے، نہ صرف ہندوستان کا چہرہ چہرہ انور دی کی ہے بلکہ دو مین

مرتبہ سودیت یو مین، بلغاریہ، منگولیا، چیکو سلواکیہ اور شمالی کوریا۔ جیسے ممالک میں ہندوستان کی

نمائندگی کی۔

اردو زبان اور دکنی تہذیب سے ڈاکٹر گوڑ کا رشتہ مادری یا پدری ہو کہ نہ ہو عاشقانہ ضرور ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات جب بھی چلے جائیے۔ آپ انھیں اپنی محبوبہ کی زلف گرہ گیر کے امیر پائیں گے خواہ وہ کسی ادیب پر مضمون لکھ رہے ہوں کہ کسی کتاب پر تنقیدی مقالہ، کسی مزدور مسئلہ کے سوزن گہری ہو کہ انتظامیہ کے خلاف رپورٹ۔ حتیٰ کہ تفریح طبع کے لیے بھی فیض، حسرت، کتنی، مخدوم یا پھر غائب کی کشیدہ شراب دواؤں کو گھونٹ در گھونٹ نہیں بلکہ قدح در قدح پی رہے ہوتے ہیں۔ اردو ضرورت، اردو تفریح، اردو کھانا، اردو پینا اور یہاں تک کہ اردو اوڑھنا بچھونا۔۔۔۔۔ اردو سے داہانہ عشق ہی کا نتیجہ ہے کہ موجودہ نظام میں اردو کے ساتھ جو نا انصافیاں کی جا رہی ہیں۔ اسے وہ محض محسوس کر کے چپ نہیں رہ سکے، بلکہ انجام و عواقب کی پرواہ کیے بغیر انھوں نے اردو کے حقوق کی بحالی کے لیے اپنی آواز اونچی رکھی۔۔۔۔۔ اور بحیثیت رکن 'گجرال کمیشن' اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ ڈاکٹر گوڑ کو کہ تخلیقی ادیب نہیں ہیں مگر مختلف ادب پاروں اور مختلف رسالوں میں پھیلے ان کے بیسیوں مضامین ان کے اندر چھپے تخلیق کار کی چغلی کھاتے ہیں اور بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اینٹی فوڈل وار Anti Fudual War کے اس مجاہد نے پتہ نہیں کیوں کوشش نہیں کی ورنہ میکسم گورکی کی ایک کہانی حیدرآباد اور نگل، ہمنکنڈہ، بڑودہ، بمبئی، بنگلور، جے پور اور جمبیلی کا منڈوہ کی دیواروں سے ضرور پیدا ہوتی۔

یہ محض اتفاق ہے یا وقت کی ضرورت کہ اردو کا بہت سارا انقلابی ادب شعری ہیئت میں ظہور پذیر ہوا۔ اگر ڈاکٹر گوڑ اس رجحان کی نثری طبع آزمائی کرتے تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو ادب میں ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوتا، کیوں کہ اس خصوص میں یہ بات تو طے رہی کہ۔۔۔۔۔ اگر ڈاکٹر گوڑ کہانی لکھتے تو ان کا کردار اپنی محبوبہ کے پہلو سے نکل کر یوں روپوش ہو جاتا کہ خود ڈاکٹر گوڑ نوکِ قلم سے پرت در پرت اسے کھو ج رہے ہوتے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ ایک نہ رکنے والا سلسلہ چل پڑتا جو زندگی سے تعبیر ہوتا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی پبلش کی ہوئی کتاب 'ادبی مناظر' کے حرف آغاز میں جناب خلیق انجم صاحب نے لکھا۔۔۔۔۔ "راج بہادر گوڑ نے پچھلے چند برسوں سے اردو لکھنا شروع کیا ہے۔ گویا وہ زندگی بھر پڑھتے رہے اور بخیدگی سے لکھنا زندگی کے آخری دور میں شروع کیا۔"

خلیق انجم صاحب نے یقیناً بڑے پتے کی بات کہی ہے، مگر کچھ رد و بدل کے ساتھ کیوں کہ ڈاکٹر گوڑ تو زندگی بھر لکھتے ہی رہے ہیں۔ اردو ہی میں نہیں انگریزی میں بھی۔ ہندوستان کے بیسیوں رسائل میں ان کے بے حساب مضامین گاہے گاہے پھٹتے رہے۔ مگر انھیں اپنے قد کی بلندی تسلیم کر دینے کی کبھی ضرورت ہی نہیں ملی یا پھر انھوں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی ذات اور اصولوں کو بے حساب کتابوں میں قید کر کے اپنا وزن بڑھواتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انھیں اپنے مضامین کو کتابی شکل دینے یا پبلشرز کو یہ خیال، منوذاب آ رہا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش حیدرآباد نے ادبی مطالعے کے نام سے ان کے (۱۳) مختلف مضامین کو ایک کتابی شکل دی، ۱۹۹۹ء میں دنیا پبلیکیشنز نئی دہلی نے ایک اور مجموعہ ادبی جائزے کے نام سے اجراء کیا، اور ۱۹۹۱ء میں انجمن ترقی اردو، ہند، نئی دہلی نے (۱۸) تنقیدی مقالے اور تبصرے جو انھوں نے مختلف کتابوں پر لکھے، ادبی تناظر کے نام سے مرتب کر کے جاری کیا۔ بد قسمتی سے ان مضامین کے آگے ان کی شان نزول اور تواریخ نہیں بتائی گئی، ورنہ کم از کم یہ اندازہ تو لگایا جاسکتا کہ کس موقع اور محل سے متاثر ہو کر ڈاکٹر گوڑ نے کس شاعر، ادیب، یا پھر کتاب کو چنا اور اس پر مضمون لکھا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان سارے مضامین میں وہ ایک ناقد کی طرح محض مشعل برداری نہیں کرتے بلکہ ایک خاموش تماشائی کی طرح اپنے ہاتھ میں دوہریں لیے روپوش ہیں اور وقفے وقفے سے دور بین کا رخ اور گیج Gauge کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہلا ڈلا کر تاکا جھانکی کر رہے ہیں۔ وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے چپ رہتے ہیں، ہاں آنکھیں دیکھتی ہیں اور قلم ان مناظر کو مرتب کرتا ہے۔

یہاں یہ بات ضرور کہنے کے لائق ہے کہ نظارہ کشی سے پہلے وہ اپنی 'وہ' عینک، ضرور چڑھاتے ہیں۔ جس کا ایک شیشہ ہمدردی سے بننا ہے تو دوسرا غلو ص سے۔ ان کے تنقیدی مقالوں میں ان کی روش بے حد ہمدردانہ رہتی ہے، کسی بے جگر ناقد کی طرح عامیانہ نہیں۔ اپنی رائے اور باتوں پر تقویٰ کر وہ خود کو ایک مستند ناقد ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ حق بات بھی منہ میں شکر رکھ کر کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تبصرے ہندوستان کے سبھی ترقی پسند ناقدین کے ہم رتبہ ہیں۔ جھفیں اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر گوڑ کے مضامین کی جو خاص رفت تھاری کا ذہن ضبط کر لیتی ہے وہ ان کی زبان کی شگفتگی اور فطری بذریعہ کسی بھی سنجیدہ پچھلیشن کو وہ اپنی ہلرز سے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

مضمون بھارت چند کھنہ، کتاب ادبی مطالعے

”حیدرآباد میں مخدوم کی سڑویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ فروری کی رات، ہلکی ہلکی خوشگوار خنکی تھی۔ اردو ہال میں بڑی گہما گہمی تھی۔ مخدوم کی عزلیں اور نظیں سنائی جا رہی تھیں اور ان پر رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس پروگرام کے ایک صدر تھے اور دوسرے صاحب مہان خصوصی۔ میرے بازو میں ایک دراز ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ — شہ نشین پر فنکاروں کے پیچھے دو حضرات دم بخود بیٹھے ہیں۔ ان میں وہ — آجوس کے بنے ہوئے بزرگ کون ہیں؟ میں نے کہا ایل سلاسی مرحوم کے ملک سے ابھی وارد ہوئے ہیں۔ انقلاب کے بعد زرعی اصلاحات کی وجہ سے کھانے پینے کو مل گیا ہے۔ اس لیے چہرے پر چکنائی آگئی ہے۔ آکیا گئی ہے — سر کی چکنائی چہرے پر پھیل گئی ہے“

یہ نقاشی تھی جناب سعید بن نقشب مرحوم کی۔ اسی مضمون میں ایک اور جگہ ”خاموش غمگین، شرمسار، لاچار، آنکھوں میں نیند کا غلبہ، آنکھیں اندر کودھنسی ہوئی، گالوں کی ہڈیاں اوپر کو ابھری ہوئی، بس ڈھانچے پر چڑی مرہ دی گئی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ کھانا جوڑ لیا ہے۔ یہ خرابی ہو رہی تھی جناب بھارت چند کھنہ صاحب کی۔“

ایک اور مضمون ”جیلانی بانو کی کہانیاں — میرے تاثرات“

”یہ ممکن تھا کہ جیلانی بانو نے اپنی نانی سے کہانی سن کر یہ تسلیم کر لیا ہو کہ راون کے دس سر تھے، اور وہ سیتا کو اڑن کھٹوے پر اڑا لے گیا تھا۔ لیکن یہی کہانی جیلانی بانو کی زبانی ان کی نواسی سنے گی تو بول اٹھے گی — گپ مت مارو، نانی جان! کہیں کسی کے دس سر بھی ہوتے ہیں۔ جیلانی بانو کی نانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی تھی، اس وقت انسانی معلومات کا جو اوسط معیار تھا۔ ماحول جن مسائل سے چٹا



پڑا تھا۔ اور جن آئندوں کے سہارے انسانی کارواں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سب جیلانی بانو کی نواسیوں کے لیے اجنبی قد میں ہوں گی۔ اس وقت نئے مسائل ہوں گے نئے معیار ہوں گے، نئی آرزوئیں، نئی امیدیں ہوں گی، جن سے کہانی اپنا مواد اپنا کس بل حاصل کرے گی؟

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو اپنی ٹریڈ یونین سرگرمیوں، اور ادبی سرگرمیوں کے بعد اگر کسی سے محبت ہے — تو وہ ہے — مخدوم۔ مخدوم محی الدین سے دوستی اور محبت کا حق انھوں نے خوب ادا کیا۔ اپنے پہلے مجموعہ 'مضامین ادبی مطالعے' میں منجملہ (۱۳) کے تین مضامین صرف مخدوم پر ہیں۔ اور دوسرا مجموعہ ادبی جائزے میں ایک، اور تیسرا مجموعہ ادبی تناظر میں پھر ایک مضمون پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

مخدوم سے ان کے جذباتی لگاؤ کا وہ خود اپنے ایک مضمون، 'مخدوم' میں اعتراف کرتے ہیں — 'مخدوم سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی اور کن حالات میں ہوئی تھی، یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ مخدوم ہماری زندگی میں کچھ اس طرح بس گئے تھے کہ یہ یاد ہی نہیں آتا کہ ان کے بغیر بھی زندگی گزری۔ مخدوم کیا تھے؟ یوں لگتا تھا مقناطیس کی ایک لاٹ کھڑی ہے — بس کشش ہی کشش، ہمہ تن کشش۔'

ایک طرف تو ڈاکٹر گوڑ کی زندگی ایک جگہ ہد کی زندگی ہے۔ آلام و مصائب سے پرہیز دوسری طرف ان کی آسودگی کا یہ عالم کہ دار و رسن کے قہے بھی اتنے ہی چٹخارے نے کر سنا تے ہیں گویا کہ آگ ان تک پہنچے پہنچے پھول بن جاتی ہے۔ بخدا یہ کوئی تلمیحی اشارہ نہیں۔ بلکہ کفر عاید نہیں ہوتا۔ یا پھر بقول فیض —

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے  
اگرچہ دل پہ خرابی، ہزار گزری ہے

یا پھر اقبال کے مطابق۔

مہر و مہانجم کا محاسب ہے قلندر  
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے مشق میں آبلہ پا کی مرہم پاشنی کے لیے ہم خیال وہم زبان ہم سفر کا  
 ساتھ انہیں اس قدر مطمئن، قانع اور آسودہ رکھا ہے۔ یہ ساتھ ہے محترمہ برج رانی گوڑ صاحبہ کا۔  
 صبر و شکر کی پتلی، ڈاکٹر گوڑ کی جیون ساتھی جنہیں بے حد پیار یا پھر بے حد پر یکٹیکل انداز میں  
 جب وہ بے حد تیزی سے 'برج رانی' پکارتے ہیں تو لگتا ہے 'نی جانی'۔ دکن کی سافلی  
 ایتار و محبت کی مورتی، جو زندگی کے ہر موڑ پر قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی ہیں۔ نوے کے  
 گھر و ندے میں بھی اور ٹٹی کے سائبان تلے بھی۔ اور اب چنبیلی کے منڈوے، تلے جہاں دو  
 بدن جل تو رہے ہیں مگر پیار کی آگ میں نہیں انسان دوستی کی۔

لکھنا چاہوں تو یہ قصہ اتنا طویل پکڑے کہ بحیثیت مضمون کسی رسالے میں کھپ نہ سکے۔ اس  
 لیے یہ قصہ نا تمام یہیں تمام کیے دینا ہی بہتر ہے۔ کیوں کہ ۔ ۔ ۔ ایک طرف تو ۔ ۔ ۔

ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے  
 سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

(غالب)

تو دوسری طرف !

اتر کر ناؤں سے بھی کب سفر تمام ہوا  
 زمیں پہ پاؤں دھرا کہ زمین چلنے لگی

(شکیب جلالی)

# ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی تحریکیں

- ۱۔ خطبہ صدارت بہار ریاستی اردو کانفرنس، مظفر پور
- ۲۔ خطوطِ گوڑ

## خطبہ صدارت بہار ریاستی اردو کانفرنس

(منظور پور۔ دسمبر ۳، ۱۹۶۰ء)

پروفیسر سر در صاحب، صدر استقبالیہ، بزرگو اور دوستو۔

یہ ریاست بہار کے اردو دوستوں کی کرم فرمائی ہے کہ آج میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میں اردو کا لکھنے والا نہیں صرف پڑھنے اور بولنے والا ہوں۔ اور ایک ایسی ممتاز مجلس میں جہاں بڑے بڑے بولنے والے اور ان سے بڑے لکھنے والے موجود ہوں میری یہ جسارت صرف اس لیے قابل معافی ہے کہ میں احباب بہار اور پروفیسر آل احمد سرور کی سازشوں کا شکار ہوں۔

ادھر کچھ برسوں سے دیس بھر میں زبانوں کا بہت چرچا ہے۔ ہر زبان آزاد ہندوستان میں اپنا مقام تلاش کر رہی ہے۔ صدیوں کی غلامی نے نہ صرف ہماری اقتصادی ترقی کی راہیں بند کر رکھی تھیں بلکہ ہماری زبانوں کے نشوونما کو بھی روک رکھا تھا۔ ہماری تہذیبی زندگی بھی پابند سلاسل تھی اور اس پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔

جب ملک آزاد ہوا تو ہمارے معاشی، اقتصادی اور انگریزیاں لینے لگے اور نیکیت و افلاس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کشمکش ہونے لگی۔ اسی کے ساتھ ہمارے تہذیبی سوتے بھی جاگنے لگے، ہماری زبانیں نئی بلندیوں کی طرف بڑھنے کے لیے نئی راہیں ڈھونڈنے لگیں۔ زنجیریں اب اور ناقابل برداشت ہو گئیں۔ دریا بند نہیں رہ سکتا تھا۔ بھوٹ نکلا۔

لسانی صوبوں کی انگ، نظم و نسق کی زبان کا سوال، ذریعہ تعلیم کا مسئلہ اور لسانی اتھارٹیوں کے مطالبات سب اسی وسیع اور محیط ملک پھیل کا حصہ ہیں۔ یہ عوامی سوال ہیں اور عوامی نقطہ نظر ہی سے انھیں حل کرنا ہے۔ یہ تہذیبی مسائل ہیں اور انھیں اسی انداز میں سیاسی اور فرقہ دارانہ گردہ



بندوں سے اونچا اٹھ کر دیکھنا ہے۔

چنانچہ ملک بھر میں جہاں جہاں اُردو بولنے والے خاصی تعداد میں بستے ہیں وہ اُردو کے موقوف اور مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں، کانفرنسیں کرتے ہیں، اس کے تہذیبی ورثے کا جائزہ لیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خداوندانِ نظم و نسق کا اس کے ساتھ معاندانہ رویہ دیکھتے ہیں اور تشویش محسوس کرتے ہیں۔

ہم اُردو بولنے والوں کی دقتیں اس لیے بھی زیادہ ہیں کہ ملک میں کوئی علاقہ ایسا نہیں جو بلا شرکتِ غیرے اُردو کا علاقہ قرار دیا جاسکے۔ حالانکہ مجموعی طور پر ملک بھر میں اس کے بولنے والوں کی تعداد کئی لسانی ریاستوں کی آبادی سے زیادہ ہے۔ مزہبی، کنٹری، تنگو، تامل، ملیالم، بنگالی، گجراتی، سمی زبانیں بولنے والے اگر دوسرے مقامات پر اقلیت میں ہیں تو کم سے کم ان میں سے ہر ایک زبان کی ایک ایک ریاست بھی ہے جہاں اس کو بلا کم و کاست ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ لیکن اُردو کا موقف یہ ہے کہ ہر جگہ اقلیت کی زبان ہے۔ کشمیر میں وہ سرکاری زبان تو ہے لیکن کشمیری عوام کی زبان کشمیری ہے اور جوں کے لوگ ڈوگری بولتے ہیں۔

اُردو بولنے والے عوام قریب قریب ہر شہر میں موجود ہیں لیکن اصل میں اس کا وطن بھی یوپی اور بہار کا ہی وسیع و عریض علاقہ ہے جو ہندی کی جنم بھومی بھی ہے، اُردو یہیں پیدا ہوئی، یہیں پر دان چڑھی، اس کی زمین یہی ہے، اس کی جڑیں یہیں ہیں۔

ذرا اُردو کے عہد طفولیت کا جائزہ لیجیے۔ اس دور کا خیال کیجیے جب اُردو پرداں چڑھ رہی تھی بارشاہوں اور ان کے محدود نظم و نسق کی زبان فارسی تھی اور دیہاتی عوام اپنی اپنی بولیاں بولتے تھے۔ مادی گنگ و جمن کی کوئی مشترکہ بولی نہیں تھی کہیں، ددھی بولی جاتی تھی تو کہیں برج بھاشا۔ کوئی کھر بولی سے کام نکالتا تھا تو کہیں بھوجپوری کا چلن تھا۔ کوئی ملکہھی کا علاقہ تھا تو کوئی منٹھلی کا۔ دربار کی زبان اور عوام کی بولیوں کے درمیان ایک خلیج تھی، ناقابلِ عبور۔

ایسے میں سماج بڑھتا رہا۔ سماج کی ضرورتیں بڑھتی رہیں۔ دعوائل تھے جو ساتھ ساتھ سرگرم عمل تھے۔ رودھارے تھے جو ساتھ ساتھ بیٹے تھے۔ ایک تصوف کا دھارا تھا، دوسرا تجارت کا۔

صوفیوں کی ضرورت تھی کہ عوام سے نااطہ جوڑیں۔ انھوں نے دربار سے بغاوت کی تھی، دولت و فردت سے منہ موڑ لیا تھا اور خدائی سے رجوع کیا تھا، انھیں عوام تک اپنا پیام پہنچانا تھا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے دکن میں، نانک نے پنجاب میں، کبیر نے یوپی میں اور

صوفیائے بہار شریف اور پھلواری شریف نے بہار میں اور دوسرے صوفیائے کرام نے اہم مقامات پر ایک ہی بات کہی اور قریب قریب ایک ہی زبان میں کہی۔ اس لیے تعجب کا کوئی مقام نہیں کر اردو نثر کی پہلی کتاب آج سے پانچ سو سال پہلے ایک صوفی نے تصنیف کی اور یہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین ہے۔

معراج العاشقین کی زبان کا تجزیہ کیجیے۔ یا حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے کلام کا۔ یا صوفیائے بہار کی تخلیقات کا آپ کو یہی محسوس ہو گا کہ ان کی زمین ایک ہی ہے۔ ان کی بنیادیں اسی پر ہیں بہار کے عیرتے ہیں کہیں برج یا ادھی کی جھلک ملے گی تو کہیں ہریاڑی کی، کہیں گدھی کی۔ صوفیائے کرام نے تصوف کے پرچار کے لیے یا پھر مخصوص بیماریوں کی دواؤں کو بتلانے کے لیے شاعری سے کام لیا۔ حضرت مخدوم بہاری نے بہار والوں کو آنکھ کا علاج بتلایا۔

لودھ، پھٹکری، مردارنگ

ہلدی، زیرہ، ایک ایک تنک

انیون چنا بھر، مرچیں چار

اور پھر موتھا اس میں ڈار

پوست کے پانی پوٹلی کرے

تیناں پیرا بیل میں ہرے

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے دکن نواسیوں کو دانستوں کی دوا بتلائی۔

زیرہ، مرچاں، سوڑ، سونٹھ

کستھا اجلا لے کر گھونٹ

نیلا تھوڑا، دھنیا بھون

اس میں بلا تو سیندھا لون

پان پلاس کی کانٹھیاں آن

جا پھل، لوچن اور لو بھان

جوں جوں لگا دے پادے سکھ

تھو دانستوں کا جادے دکھ

حضرت مخدوم بہاری کے جانشین حضرت بلخی نے فرمایا۔

جی مگن میں ہے کرائی ہیں سہانی رتیاں  
جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائی گتیاں

اور خواہر بندہ نواز نے دکن میں کہا —

پانی میں نمک ڈال لیاں، دیکھنا اے

جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کے

دیا گھول خودی اپنے خدا ساتھ مصطفیٰ

جب گھل گئی خودی تو خدا بولنا کے

کلام کے یہ نمونے آپ کے سامنے ہیں۔

پندرھویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام کی تخلیقات کے بعد سولھویں اور سترھویں صدی  
تک رسیختہ گو شعرا کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔ قلی قلیب شاہ کی مشہور غزل ”پیا باج پیا پیا جائے نا۔“  
سے آپ واقف ہیں، اور یہ اردو کا پہلا صاحبِ دیران شاعر ہے، جو سولھویں صدی میں گزرا ہے،  
غواہی اور دجہی نے اسی زمانہ میں شاعری کی۔ سترھویں صدی میں تانا شاہ کے دربار کا، ایک شاعر کہتا ہے۔

ملنا تم کا غیر سے کوئی جھٹ کوئی بیج بیج کتے،

کس کس کا منہ موندوں سبھ کوئی کچ کتے کوئی کچ کتے

اسی زمانہ میں بہار کا شاعر بیدل جب چٹنہ چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے تو اپنی دیہاتی منہ بولی ماں  
کے پاس جا کر کہتا ہے۔

سرا پر جب کوئی نہیں تب دشمن آپن کیس

پٹنہ نگر چھاڑ دیں اب بیدل چلے بدلیں

بہار کا ایک اور شاعر قاضی عبدالغفار کہتا ہے۔

تن کا تانا آگ مول پانی کرے جو کوئے

ڈارے بوٹی پریم کی تب جا کچن ہوئے

غرض پندرھویں عیسوی سے لے کر سترھویں صدی کے ختم، اٹھارھویں صدی کی ابتدا تک  
ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام ہوں کہ صوفی منش شعراء دہلی میں، لکھنؤ میں، بہار میں، رکن میں، غرض  
جہاں بھی وہ تھے ایک مقامی رسیختہ کی تخلیق کر رہے تھے۔

قریب قریب اسی زمانہ میں ہماری سماج پر دیہی معیشت کی تانگ بوز رہی تھی۔ تجارت

شروع ہو چکی تھی۔ بازار بھرنے لگے تھے۔ اور منڈیاں لگنے لگی تھیں۔ شہروں کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ بہار اور یوپی کے علاقوں ہی میں، پٹنہ، بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، میرٹھ، آگرہ جیسے شہر ابھرنے لگے۔ دہلی راجدھانی تھی۔ ان سب کا راجدھانی سے علاقہ لازمی تھا۔ سڑکیں بننے لگیں، جوان شہروں کو ایک دوسرے سے ملانی تھیں۔ وہی ریتھائیں جو ان شہروں میں پیدا ہو رہی تھیں اب ایک معیار کی زبان کا روپ دھارنے لگیں جو ان شہروں میں یکساں طور پر بولی جاتی تھی باوجود کہ ان میں سے ہر شہر کے اطراف ایک بڑا ہی علاقہ تھا جس کی اپنی الگ بولی تھی۔ پٹنہ کے اطراف مگدھی تھی تو بنارس بھوجپوری علاقہ میں واقع تھا۔ آگرہ برج کے علاقے کا شہر تھا تو لکھنؤ اردھی علاقے کا۔ یہ معیاری زبان دہلی کے اطراف دکناف کی کھڑی بولی تھی اور یہی اردو تھی۔

اس لحاظ سے عصری اردو اور عصری ہندی دونوں کی زمین ایک ہی ہے اور دونوں کا لوک آدھار ایک ہی ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک لوک آدھار ہوتا ہے۔ *Common base* ہوتا ہے اور زبان اپنا مزاج، اپنے الفاظ کا مشترکہ خیرہ اسی لوک آدھار سے حاصل کرتی ہے ہندوستان کی ہر قومی زبان کا اپنے علاقے میں ایک لوک آدھار ہے۔ اسی طرح عصری اردو اور عصری ہندی دونوں کا لوک آدھار اسی مادی گنگ دھن میں ہے۔ اسی لیے ادبی اسالیب کے تنوع کے باوجود دونوں کی قواعد ایک ہے اور دونوں کے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ مشترک ہے۔

کچھ نادان حضرات یہ کہتے ہیں کہ اردو پر فارسی اور عربی جیسی بیسی زبانوں کی چھاپ ہے اسی لیے اس کا مزاج بیسی ہے، اس کے برخلاف ہندی سنسکرت سے فیضان حاصل کرتی ہے اسی لیے وہ ٹھیک ہندوستانی ہے۔

مجھے اس استدلال سے سخت اختلاف ہے۔ اگر ملکی غیر ملکی کی بات کرنی ہے تو پھر سنسکرت بھی غیر ملکی زبان ہے کیونکہ یہ بھی تاریخ کے کسی دور میں سہی باہری سے ہندوستان آئی ہے، لیکن میں اس طرز بحث کو معقول نہیں سمجھتا۔ بہت سی ہندوستانی زبانوں کی طرح ہندی بھی انڈو آریہ زبان ہے اور اردو بھی۔ بنگالی بھی ہند آریائی زبان ہے اور مرہٹی بھی۔ اور ہندوستان کی کون سی زبان ہے جس کی سنسکرت سے جھٹک نہیں رہی ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں پراکرت اور اس سے پہلے سنسکرت اس علاقہ کی سرکاری زبان رہی ہے جو ملگو کا علاقہ کہلاتا ہے۔ پھر ملگو زبان میں ترجمے کیے گئے اور اب منتقل ہوا۔ ملگو نظم و نثر کی تخلیق ہونے لگی اور پھر ملگو بھی سرکاری زبان بنی۔ ایک بڑی تحریک ملگو کو سنسکرت کے اثر سے پاک کرنے اور کھری ملگو بولنے کی تاریخ میں چل چکی ہے۔ یہی بات اور زبانوں پر بھی صدق آتی ہے۔



اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر زبان میں ”تت سم“ دینی سنسکرت کے وہ الفاظ جو عربوں کے توں استعمال ہوتے ہیں) اور ”تد بھو“ دینی سنسکرت کے الفاظ اپنی بدلی ہوئی شکل میں) الفاظ ملتے ہیں۔ کہیں ”تت سم“ زیادہ ہیں تو کسی زبان کی ساخت میں ”تد بھو“ الفاظ کی فراوانی ہے جو عصری اردو میں کئی ”تت سم“ الفاظ ہیں۔ اور عصری ہندی کا یہ رجحان کہ اس میں ”تت سم“ الفاظ اور سنسکرت مشتقات ٹھونس دیے جائیں کوئی عام پسند رجحان نہیں ہے۔ اس کی مخالفت بڑھ رہی ہے اس کی وجہ سے عصری ہندی اپنے لوگ آدھار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

اسی قسم کا ایک تجربہ اردو کے تعلق سے جامعہ عثمانیہ میں ہو چکا ہے۔ اردو زبان میں فارسی اور عربی الفاظ ٹھونس کر اسے ایک ایسی جناتی زبان بنا دیا گیا تھا جو عام انسان کی فہم سے بلند ہو گئی تھی۔ الفاظ فارسی ہوں کہ عربی، سنسکرت ہوں کہ انگریزی، محض لسانی عصبیت کی بنا پر نہیں ٹھکرائے جاسکتے۔ زبان کے مزاج سے اگر وہ مطابقت رکھتے ہوں تو کھپ جائیں گے ورنہ متردک ہو جائیں گے یا پھر اں میں تبدیلی پیدا کر کے انھیں زبان کے مطابق ڈھال لیا جائے گا۔ یہی اردو کے معمار شاعروں اور ادیبوں نے کیا ہے، نظیر نے کئی الفاظ وضع کیے اور انھیں شعر میں نگینہ کی طرح جڑ دیا۔ غالب نے ع ”مجھے ڈر ہے کہ نہ چھینے تیرا لبر سہرا“ کہہ کر انگریزی لفظ ”نمبر“ کی تھینڈ کر ڈالی۔ آپ جانتے ہیں کہ عربی میں ”نقد“ کے معنے ”پرکھ“ کے ہیں۔ لیکن بول چال کی اردو میں اس کا مطلب بدل گیا اور وہ کیش کاوش کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ اور کبھی کبھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ زبان عوامی بول چال کی ٹکسال میں ڈھل کر ہی زبان بنتی ہے اور عوام الفاظ کے برتنے میں نصب سے نہیں فراخ دل سے کام لیتے ہیں۔

پھر فارسی الفاظ عصری ہندی میں بھی تو کثرت سے ملتے ہیں۔ اور کس زبان میں نہیں ملتے۔ ہنگامی میں، اڑیہ میں، مرہٹی میں، گجراتی اور راجستھانی میں سبھی زبانوں میں فارسی الفاظ ملتے ہیں۔ مرہٹی، گجراتی اور پنجابی زبانوں میں تو فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ سوال یہ ہے کہ انگریزی جسے اتنے زیادہ لوگ پڑھتے اور بولتے ہیں اور جو آج بھی ہماری سرکاری زبان ہے، اس نے ہماری قومی زبانوں کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ فارسی نے کیا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ فارسی بھی ایک آریائی زبان ہے اور ہماری چڑوسن ہے۔ قدیم فارسی اور سنسکرت تو بہنیں ہی ہیں۔ اس لیے کئی ایسے الفاظ جو ہماری زبانوں کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں ہماری بول چال میں آگئے۔ اب وہ اجنبی نہیں رہے۔ پھر بھی ہم اردو کے بولنے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ فارسی اور عربی الفاظ ٹھونس کر ہم اپنی

زبان کو اس کے اپنے سوک آدھار سے دور نہ ہونے دیں۔ فارسی زبان سے کینہ نہیں لیکن ان کا بے جا استعمال بھی جائز نہیں۔ ہمارے اچھے شاعروں نے ہمارے لیے یہی نقش چھوڑا ہے۔ مثلاً قلی قطب شاہ نے کہا۔

قطب شاہ نہ درونج درانے کو پند  
دورانے کو کچ پند دیا جائے نا۔

یہاں فارسی کا لفظ 'پند' اس خوبی سے استعمال ہوا ہے کہ کانوں پر گراں نہیں گزرتا۔ انیس نے کہا "ع" "شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے" اور یہ بھی کہا۔ "ع" "کھا کھا کے دس اور بھی سبز ہوا" "شبنم" فارسی ہے مگر نہایت موزوں۔ "داس" ہندی ہے اور لگنے کی طرح جڑا ہوا۔ میر نے فرمایا۔

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے  
جانے نہ جانے گل ہی نہ جلنے باغ تو سارا جلنے ہے

یہاں 'گل' بھی ہے اور 'باغ' بھی اور 'حال' بھی۔ یہ سب فارسی الفاظ ہیں لیکن اجنبی نہیں لگتے۔ اردو پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اردو نے اپنے ادبی اسالیب، اپنے استعارے، تشبیہات و تلمیحات سب فارسی سے حاصل کیے ہیں، جو اسے اجنبی بنادیتے ہیں۔

یہ اعتراض بھی نہ صرف غیر صحیح ہے بلکہ یہ بھی لسانی عصیت اور زبان کے ارتقاء کے طور طریقوں سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ عصری انگریزی پر لاطینی اور فرنچ زبانوں کا بہت اثر ہے۔ کئی ادبی اصطلاحیں، کئی تشبیہات، تلمیحات انگریزی نے ان "بدیسی" زبانوں سے حاصل کیے ہیں لیکن ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اسی طرح زبانیں ترقی کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے فیضیاب ہوتی ہیں اور ان کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے۔

اردو نے صرف "عدل نوشیرداں" اور "جام جمشید" ہی کو تو نہیں نظم کیا ہے بلکہ "صبح بنارس"، "شام اودھ"، "شب مالوہ"، "سحر بنگال" اور "زلف بنگال" کو بھی ابدی قدریں بخشی ہیں۔ یہ سب ہندوستانی تہذیب سے ماخوذ ہیں کہ پر دیسی درامدات ہیں۔

رانی کیتکی اور اودے بھان کی کہانی اودھ کے ادیب انشانے لکھی۔ راجہ رام اور کنو دی کے عشق کو بہار کے ایک شاعر شاہ آیت اللہ جوہری نے نظم کیا ہے۔ شیریں فرہاد، اور لیلیٰ مجنوں کے

ساتھ تل دینتی بھی اُردو ادب کے رومانی افق پر درخشاں نظر آتے ہیں۔ میرزا نجا اور مرزا صاحبان ہندوستانی تھے ایرانی نہیں۔ غلام نقشبند بہار کا اٹھارویں صدی کا شاعر جب یہ کہتا ہے کہ —

پرویز و نل و کوہ کن و دامن و مجنوں

جو ہے وہ میرزا بات کی تعلید کرے ہے

تو وہ تل کو قیس و فرہاد سے الگ اور اجنبی نہیں مانتا۔ جب نظیر عالم و جد میں بول اٹھتا ہے۔

”اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کرشن کنھیا کی“

تو معتقدین کے سر احترام سے جھک جاتے ہیں۔ جب مخدوم نیلے نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں اور ناچتے ہوئے ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو دیکھتے ہیں تو نیل قن کرشن کے پہلو میں بچلتی گویاں ”یاد آجاتی ہیں۔“

اردو نے اپنے ادبی خزانے کو ہندوستانی تہذیبی قدروں سے مالا مال کیا ہے۔ ہندوستانی صبح و شام، ہندوستانی دریا اور پہاڑ، ہندوستانی تہوار اور میلے سب پر اردو شاعروں و راویوں نے لکھا ہے۔ خوبانِ ہند کا حسن، ان کے حسن کا نور، ان کے زلفوں کی جھک، ان کی درخشاں جبین پر سرخ ٹیکے کی دمک، سبھی سے اردو شاعروں نے انسپرشن لیا ہے۔ اردو پر یہ اعتراض بھی لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

دوسرے یہ کہ اردو نے بعض اصنافِ ادب فارسی سے حاصل کیے ہیں تو بعض اسلوبِ ہندی سے بھی لیے ہیں۔ اردو میں اگر غزل ہے تو وہ ہے بھی ہیں۔ قصیدے ہیں تو گیت بھی ہیں۔ بلکہ اردو کی لچک کا اندازہ بھی ان ہی اصنافِ سخن کے تنوع سے ہوتا ہے۔ اور یہی نہیں ریڈیو کی ایجاد کے بعد ڈرامے کی ایک نئی صنف کی ضرورت لاحق ہوئی جس میں اداکاری کی گنجائش نہ تھی۔ محض مکالموں اور ان کے ادا کرنے کے انداز کی اہمیت ہے۔ اس میدان میں بھی اردو نے اپنا سکہ جمایا۔ مختصر افسانے، رپورٹاژ، نظم معرا، غرض کئی اصنافِ ادب کو اردو کے ادیبوں نے خوب ترقی دی۔

کچھ کرم فرما ارشاد فرماتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور تقسیم ہند کے بعد اسے پاکستان الاٹ ہو گیا۔

اردو نہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور نہ سب مسلمانوں کی۔ بنگال میں، مدراس میں، کیرا میں، آندھرا پردیش میں، میسور میں، بہار، اتر پردیش اور گجرات میں ایسے کسی مسلمان گھرانے میں گجر نہ صرف اردو کا بک خنڈا نہیں جانتے بلکہ جن کی مادری زبان بنگالی، تامل، لیلم، تلگو، کنڑی، مراٹھی،

یا گجراتی ہے۔ اس کے برخلاف اتر پردیش اور بہار میں کئی غیر مسلم ایسے بستے ہیں جن کی زبان اردو ہے۔ پھر اردو زبان کی تعمیر میں کئی غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کا حصہ ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور پاکستان میں اگر بعض ارباب کرم اردو کو زبان کیا، رکن ایمان بھی سمجھیں تو بھی ہر حالت میں اردو ہی حضرات کی مادری زبان ہوگی جو ہندوستان سے پاکستان گئے ہیں ورنہ دہاں کے غوام کی زبان تو سندھی، بلوچی، پشتو، پنجابی، اور سنگالی ہی ہے، پاکستان میں اردو کو وہ لوگ آدھا کہاں نصیب ہے جو اے یو، پی اور بہار میں میسر ہے۔ اردو کی نوعیت دہاں جس بے کار دہاں کی سی ہے۔ اردو ہر حال ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی بنیادیں یہیں ہیں۔ اس کا لوک آدھا رہا ہے۔ اس کے وسیع بولنے والے یہیں رہتے بستے ہیں اور وہ ان کی مادری زبان ہے۔ اسی لیے انجمن ترقی اردو ہند اور ہندوستان بھر میں اردو بولنے والوں کو یو، پی اور بہار میں اردو کے موتف اور مستقبل کے بارے میں گہری تشویش لاحق ہے۔

اردو کو آزاد ہندوستان کے آئین میں ایک قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن خود اس کے اپنے علاقے میں اسے جو جائز مقام ملنا چاہیے ابھی تک نہیں ملا، اس مقام پر بہار باسی شاید خوش قسمت ہیں۔ اصل دقتوں کا سامنا تو اتر پردیش میں کرنا ہے۔ بہار اور یو، پی کے حالات کا بنیادی فرق یہ ہے کہ یو، پی میں اردو کی جان بڑھ کر اور فرد دارانہ زاویوں سے مخالفت کی جاتی ہے اور ہندی بھاشا کو اردو بولنے والوں کے خلاف صف آراء کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ریاست بہار میں اردو بولنے والوں اور ہندی بولنے والوں کے درمیان صحت مند اور بھائی چارہ کے روابط ہیں۔ یہاں بہت سے ہندی پریمی اردو کی اہمیت اور حیثیت کو مانتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ یو، پی، اور بہار میں اردو کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے ان ریاستوں کے تعلیمی نظام میں اور نظم و نسق کے ڈھانچے میں موزوں مقام ملے۔ تسمانی درجوں میں ذریعہ تعلیم مادری زبان ہی ہو، یہ تو آئین نے تسلیم کر لیا ہے۔ ثانوی درجوں میں ذریعہ تعلیم کیا ہو، اس پر ہندوستان کی سبھی ریاستوں کے ذرائع تعلیم کی کانفرنس میں غور کیا گیا تھا جو ۱۹۵۴ء میں مولانا آزاد مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی، اس کانفرنس نے فیصلہ کیا تھا کہ ثانوی منزل پر بھی اگر کسی علاقہ میں ایسے طالب علموں کی معقول تعداد موجود ہو جن کی مادری زبان علاقائی یا ریاستی زبان سے مختلف ہو تو ان کے لیے الگ ثانوی تعلیم کا بندوبست ہوگا جہاں ذریعہ تعلیم اقلیتی زبان ہوگی۔ ریاستی تنظیم جدید کمیشن نے ۱۹۵۶ء میں رائے دی کہ تسمانی تعلیم کی



نوعیت الگ الگ ہے ثانوی تعلیم کے لیے آئین میں ذکر ضروری نہیں، البتہ حکومت ہند تفصیلات کا تعین کر سکتی ہے۔

اب حکومت کا ادر تعلیمی بورڈ کا یہ فیصلہ ہے کہ اقلیتی زبانوں میں ثانوی تعلیم کا بندوبست اقلیتی خود کریں سرکاریں، مدد دیں گی، مگر وہ خود اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتیں۔ یہ فیصلہ ظاہر ہے ۱۹۴۹ء میں وزرائے تعلیم کے فیصلہ کے برعکس ہے۔

آج کل بہار اشٹریس بھی قاضی اسکیم پر جو بحث چل رہی ہے اس کی بھی بنیاد یہی ہے۔ قاضی اسکیم کے مطابق اعلیٰ ثانوی مدارس میں ذریعہ تعلیم مراٹھی ہوگی اور اردو محض ایک زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے گی۔

سری ناقش رائے میں، جس ترقی اردو ہند ۱۹۴۹ء کے فیصلوں پر قائم رہے اور حکومت ہند سے مطالبہ کرے کہ اس برٹل ہونا چاہیے۔ یہ اعتراض کے اقلیتی زبان بولنے والے طلباء ریاستی زبان بولنے والے طلباء کے مقابل میں ریاستی زبان میں کمزور ہوں گے اور اس طرح سرکاری نوکریوں کے حاصل کرنے میں انھیں دقت ہوگی، معقول نہیں۔ سرکاری نوکریوں کے لیے یا پبلک سروس کمیشن کے یا دوسرے حکمہ جاتی امتحانات کے لیے سرکاری زبان خواہ ہندی ہو یا کوئی اور اس سے صرف اتنی واقفیت کافی ہے کہ کام چلایا جاسکے۔ اقلیتی زبان بولنے والے امیدواروں سے بہارت کا مطالبہ کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ اور جب اقلیتی زبان بولنے والا طالب علم تیسرے درجہ ہی سے ریاستی زبان سیکھنے لگے گا تو اعلیٰ ثانوی تعلیم ختم کرنے تک یہ تو امید کی جاسکتی ہے کہ اسے ریاستی زبان سے اتنی واقفیت ضرور ہو جائے گی کہ کام چلایا جاسکے۔ یو ڈی سی اور اس سے ادنیٰ نوکریوں کے لیے تو یا مدتی ڈگری لازمی ہے۔

اس کے سارہ نظم دست میں بھی مخصوص اغراض کے لیے اقلیتی زبان کو اس کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے مناسب معدوم ملنا چاہیے۔ انجمن ترقی اردو ہند نے اس ضمن میں معقول تجویزیں رکھی ہیں۔ اصولاً تو ان باتوں کو مان لیا گیا ہے کہ خاص خاص علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی معقول تعداد ہے، سرکاری اساتذات اردو میں بھی شائع کیے جائیں گے۔ بعض اہم قرائد میں بھی اردو میں ہی شائع کیے جائیں گے۔ سرکاری دہائی عوام کے لیے چلانا ہے کوئی وجہ نہیں کہ خود سرکاری لٹریچر عوام کو اپنی زبان میں نہ پہنچایا جائے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ یو ڈی سی، بہار کے علاقہ میں کم سے کم ایک اردو یونیورسٹی ہو، دوسری یونیورسٹیوں میں اردو کو بہ حیثیت ایک مشنوں کے پڑھایا جانے کا معقول انتظام ہو۔

میں پورے خلوص کے ساتھ یہ تجربہ رکھوں گا کہ یونانی اور بہار میں وہ طلباء جن کا ذریعہ تعلیم ہند ہے وہ بھی اردو نہ دے پڑھیں ان مدرسوں میں کم سے کم اختیاری زبان کی حیثیت سے اردو پڑھائی جائے۔

میری یہ شہرہ زد رائے ہے کہ اردو پڑھنے اور سیکھنے سے ہندی خود بھی ترقی کرے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اردو پڑھنے والے لڑکے، لڑکیاں ہندی لازمی سیکھ رہی ہیں اور ہندی پڑھنے لکھنے سے ان کی اردو میں ادزکھا آئے گا۔

میں پھر اس بات پر درود رکھتا ہوں کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا لوک ادھار ایک ہی ہے۔ دونوں کے الفاظ کا مشترکہ ذخیرہ وسیع ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے فیضیاب ہونا ہے۔ دونوں بہنیں ہیں۔ ازدواجی رشتہ ٹوٹ سکتا ہے لیکن بہنوں کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ رشتہ ماں کی کوکھ میں ڈھلا ہے اور اس کے دودھ سے استوار ہوا ہے۔

ہندی کے بعض کرم فرما اردو کے ساتھ انصافی کر رہے ہیں۔ لیکن ہندی پڑھنے اور بولنے والے وسیع عوام اس عصبیت سے درہیں۔ اسی لیے تو آپ دیکھتے ہیں کہ غالب کے ہندی نسخے بڑا دل کی تعداد میں شائع ہو کر فروخت ہوتے ہیں۔ اردو کے افسانہ نگار اردو کے شاعر اور اردو کے ادیب ہندی رسالوں میں خوب چھپتے ہیں اور ان کی تخلیقات بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ یہاں ان صحت مند تعلقات کو اور بھی استوار کرنا ہے۔ ہماری کانفرنسوں، ادبی محفلوں اور ہندی سرگزیل کو اس مقصد کی تکمیل کا آلہ بنانا ہے۔

حضرات! میں نے آپ کا بہت قیمتی وقت لیا۔ آخر میں آپ سب کا اور منتظرین کانفرنس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے یہ عزت بخشی کہ آپ کی محفل میں شریک ہو سکوں۔

# خطوط — راج بہادر گوڑ

بنام : صاحبہ عابد حسین

۲۳ ستمبر ۱۹۶۹ء

محترمہ صاحبہ بیگم صاحبہ

آداب عرض ہے

آپ کی کتاب ”گوری سوئے سیج پر“ پر میں نے تبصرہ کیا ہے۔ ”ہماری زبان“ میں کتابت کی نسخیوں نے اس کا بھر کس نکال دیا۔

۳۱ ستمبر کے روز نامہ سیاست حیدرآباد، میں بھی شائع ہوا ہے۔

اور ستمبر کے ماہنامہ ”کیونٹس جائزہ“ میں بھی شائع ہوا ہے۔ میں نے یہ آخر الذکر شمارہ ذریعہ ڈاک آپ کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔

آپ مجھ سے شخصی طور پر شاید واقف نہیں۔ کبھی بات چیت کا موقع نہیں ملا۔ ویسے میں آپ کو دور سے البتہ کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ آپ کی تصنیفات تو خیر دیکھتا ہی رہتا ہوں۔ اور کچھ تو میرے کتب خانے کی زینت بھی ہیں۔

البتہ عابد حسین صاحب مرحوم سے اچھی خاصی ملاقاتیں رہی ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں بھی اور یوں بھی مرحوم کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اور ان کا کرم میرے لیے ہمیشہ سرمایہ حیات رہے گا۔

انشاء اللہ چند ہی گڑھ میں انجمن کے جلسوں میں ملاقات ہوگی۔

نیازمند

راج بہادر گوڑ

# بنام: پروفیسر جگن ناتھ آزاد

حیدرآباد

۱۶ ستمبر ۱۹۸۴ء

مکرمی ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ بہت ممنون ہوں۔

"انگلیں ترستیاں ہیں" تو میں نے شروع سے آخر تک عرصہ ہوا پڑھ ڈالی۔ اس پر لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر صاحب اس میں حضرت کاتب نے وہی کمال دکھائے جو کاتب اذلی نے آپ کی کتابت کے وقت دکھایا تھا۔ پنجابی تو بنایا لیکن گیسو دراز نہیں بنایا۔ اگر یہ ہو جاتا تو بادہ خواری کے باوجود آپ کا شمار صوفیوں میں ہوتا۔

اقبال پر آپ کی کتاب آج کل میں اُجائے گی۔ انشاء اللہ آپ کو گلہ نہیں رہے گا۔ ادھر کیفی نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" — دوسرا اجلاس "نظم کہی ہے۔ اس پر تبصرہ غائب ۲۳ ستمبر کے 'حیات' میں شائع ہوگا۔ آپ کی رائے چاہوں گا۔ یہاں آپ سے معذرت کا طلب گار بھی ہوں۔ آپ نے 'اقبال اور مغربی مفکرین' کتاب میں 'اقبال اور دانے' اپنے مقالے میں اقبال کے جس ابلیس کا تصور پیش کیا ہے وہ دانے سے مختلف تو ہے، لیکن وہ اس ابلیس سے بھی مختلف ہے جو اقبال کی اردو نظموں سے ابھرتا ہے۔ یہاں وہ انسان کو راہِ مستقیم سے بھٹکانے والا ہے اور اقبال ابلیس سے کہلوانے میں نظام ابلیس کا اصل دشمن مسلمان ہے۔ یہاں بھی مومن کا اُن کا تصور بہت وسیع ہے۔ وہ جس میں آفاق گم ہوں۔ کہیں وہ مومن جن کا اقبال خواب دیکھ رہے تھے آپ اور ہم تو نہیں۔

دہلی جانے کے بعد آپ کے تاشقند کے دورے کے بارے میں بات کروں گا۔ کابل کی بات کا وعدہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن سلسلہ جنمائی کرچکا ہوں۔ ضرورت دوبارہ زنجیر کھٹکھٹانے کی ہے۔



آپ کا خط آتا ہے تو بڑی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ میں نے اپنے خطوط کے  
صندوق میں ایک گوشہ آزاد "الگ بنا رکھا ہے۔  
نیاز مند  
راج بہادر گوڑ

## بنام : پروفیسر گیان چند جین

حیدر آباد

۱۰ مارچ ۱۹۸۳ء

محترمی ڈاکٹر گیان چند صاحب  
تسلیمات

میری طرف سے ساہتیہ اکاڈمی کے ایوارڈ پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ ایک عرصے  
کے بعد ساہتیہ اکاڈمی کو اردو کا خیال ہوا ہے۔

میں آپ سے بل کر مبارکباد دینا چاہتا تھا۔ اور پھر تہنیتی جملے میں بھی شرکت سے  
اپنی غیر ادبی مصروفیتوں کی وجہ سے محروم رہا۔  
ویسے اوڈیشہ سے کہا تھا کہ آپ تک میرا پیام تہنیت پہنچا دے لیکن اس سے تشفی  
ممکن نہ تھی۔

کل ہی بمبئی سے حیدر آباد آیا۔  
آہید کہ آپ میری طرف سے تاخیر کو اپنی روایتی فراخ دلی سے معاف فرمائیں گے اور  
میری ناچیز مبارکباد قبول فرمائیں گے

راج بہادر گوڑ

## بنام : ڈاکٹر خلیق انجم

(۱)

۳۰ جولائی ۱۹۷۶ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

تسلیم و نیاز

آپ کے جواب کا انتظار ہی ہے۔ آخر میرے تبصرے کا کیا حشر ہوا؟ کچھ نہیں تو واپس ہی کر دیجیے۔ ویسے اس میں کیا قباحت کی بات اُٹنی ہے نہ تو آپ نے بتایا اور نہ میری سمجھ میں کچھ آ رہا ہے۔

ادھر روشنائی کا مقدمہ لکھنے کی تیاری میں خلیل الرحمن اعظمی کی کتاب میں نے دوبارہ پڑھی۔ ترقی پسند ادب پر۔ اب جب انجمن نے اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا طے کیا ہے میری رائے میں خلیل الرحمن صاحب سے درخواست بھی کرنی چاہیے کہ وہ اس میں ضروری تبدیلی کرنا چاہیں تو کر دیں۔ تبدیلی ضروری ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس میں بہت سی باتیں بڑھانی ہوں گی۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۹۵۷ء میں لکھی تھی۔ آخری بات ۱۹۷۱ء میں اور کتاب چھپی ۱۹۷۲ء میں۔ ۱۹۵۷ء میں جب وہ لکھ رہے تھے ان کے سلسلے حیدر آباد اردو کانفرنس میں سب سے بھائی کی تقریر تھی جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بجائے انجمن اردو مصنفین کی بات کی تھی۔ ان سے اس مسئلہ پر کئی ادیب متفق نہیں تھے اس وقت بھی۔ اور یہ بات خلیل الرحمن صاحب کے سامنے نہیں تھی۔ اردو زبان جس دور سے گزر رہی تھی اس کے لیے انجمن ترقی اردو تھی ہی۔ اردو مصنفین الگ سے کیا تنظیم بناتے؟ سویت یونین میں صرف انجمن سویت مصنفین ہے۔ سو تو ٹھیک ہے۔ سویت سماج میں طبقاتی آویزش نہیں ہے

ایک دوسرے سے متضاد اور متضارب طبقات نہیں۔ اس لیے ادب کے سامنے وہ مسائل نہیں ہیں جو ایک طبقاتی سماج کی ناکسودگیاں پیدا کرتی ہیں۔

اس بحث کے بعد انجمن کا اجلاس میں آیا اور کرشن چندر معتمد ٹوٹی تھے۔ پھر دلی کانفرنس ہوئی۔ اور اب تو باقاعدہ تنظیم قائم ہو گئی ہے۔ اب اسے فیڈریشن کی شکل دے دی گئی ہے۔ ہر زبان کی الگ تنظیم ہے جو ریاستی تنظیم ہوگی۔ اردو کی کل ہند تنظیم ہے جس کی کانفرنس حال ہی میں دہلی میں ہوئی تھی۔

خلیل الرحمن اعظمی صاحب یقیناً تاریخی اعتبار سے ان حقیقتوں کا ذکر کرنا چاہیں گے تاکہ کتاب Up to date ہو جائے۔ ورنہ کتاب ایک معنی میں out of date ہو کر رہ جائے گی ان کی اپنی رائے ہو سکتی ہے اور وہ اس پر قائم رہیں۔ "تحریر کی ادب" سے ان کی بدھنی باقی رہتے ہوئے ادبی تحریکیں باقی رہیں گی۔ اور آج کی دنیا میں کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی تنظیم بھی نہ ہو۔ یہ بغاوتوں کا نہیں انقلابات کا دور ہے۔ انقلاب کے پیچھے تنظیم ہوتی ہے، اس کے سامنے ممکن الحصول کا نقشہ ہوتا ہے، مستقبل کا ایک Blue Print ہوتا ہے۔ انقلاب گھونس کی طرح گھر نہیں کھود ڈالتا۔ یہ انارکسٹ آتا ہے۔ وہ معمار کی طرح کھودے گا، بنیاد ڈالے گا اور نئی عمارت بنائے گا جس کا وہ پہلے سے منصوبہ تیار کر چکا ہے میں بہت دور نکل گیا۔ منشاء صرف یہ ہے کہ خلیل صاحب کو نظر ثانی کا موقع دیا جائے۔ اضافہ کریں شاید۔ پھر ان کی مرضی۔

بہر حال آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ یوں بھی خط و کتابت سے مل لینے کا آدھا مزہ تو ابھی جاتا ہے۔

آپ کا  
راج بہادر گوڑ

(۲)

۱۹ فروری ۱۹۷۷ء

پیارے خلیق انجم  
بچی کی شادی کے موقع پر آپ کا پیام موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔

ابنہ 'روشنائی' کے مقدم کے سلسلے میں بڑی تشریحات لائی ہو گئی ہے۔ میں نے نوٹس ایک  
 نوٹ بک میں رکھے تھے اور وہ نوٹ بک غائب ہے۔ تلاش کر رہا ہوں۔ پھر یہ چناؤ کی گہما  
 گہمی الگ ہے۔ سوچ رہا ہوں کیا کروں؟ کیا کتاب بغیر مقدم کے ہی چھپ جائے؟  
 ختم مارچ تک بہر حال مصروف رہوں گا۔ لکھنا پڑھنا اپریل سے پہلے ممکن نہیں۔  
 آج صبح تو پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا۔ اردو کی ایک جید شخصیت سے ہم محروم ہو گئے صدر جمہوریہ کی  
 موت واقعی ہمارے لیے غنیمت تھی۔ وہ میرے شخصی دوست تھے۔ حمیدہ سلطانہ کو ایک خط  
 لکھ رہا ہوں۔

میں سوچ رہا تھا کہ رشید احمد صدیقی کی کوئی یادگار قائم کرنی چاہیے اور اب یہ نیا ظلم ہو گیا۔  
 آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہماری زبان یا اردو ادب کا کوئی شمارہ ان دونوں شخصیتوں کے لیے  
 نکالا جائے؟

'اردو گھر' میں کوئی ہال ان کے نام سے موسوم کیا جائے۔ کہیں ہم لوگ اردو کے محسنوں کو بھلا تو  
 نہیں رہے ہیں؟ بابائے اردو کو جلا وطن کر دیا۔ قاضی عبدالغفار کو بھلا دیا۔ رشید احمد صدیقی چل بے  
 اور ہم نے جی کھول کر آنسو بھی تو نہ بہائے۔

آپ کا  
 راج بہادر گوڑ

کچھ سوچنا ہوگا

(۳)

حیدرآباد

۲۶ فروری ۱۹۷۸ء

ڈیر خلیق انجم

بالوطہ ہرہ سعید، ہندستانی نژاد ایرانی ہیں۔ اور حیدرآباد کے برگینڈیر سعید کی اہلیہ ہیں۔ اردو،  
 فارسی اور انگریزی میں شعر کہتی ہیں۔ ان کا ایک اردو مجموعہ چھپ چکا ہے اور دوسرا زیر ترتیب ہے  
 انگریزی میں بھی کچھ نظمیں چھپی ہیں۔

میں نے کچھ انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ بھیج رہا ہوں۔ چاہو تو "ہماری زبان" میں



تمہارا  
راج بہادر گور

(۴)

۲ ستمبر ۱۹۷۸ء

مکرمی ڈکٹر خلیق انجم  
تسلیم و نیاز

پاکستان سے مرزا ظفر الحسن کا خط آیا ہے۔ ہم نے ان کی غالب لائبریری کو کتابیں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ انھوں نے اس کی یاد دلائی ہے۔  
اب چوں کہ فیض دہلی میں بل سکتے ہیں، ان کو اردو گھر مدعو کیا جائے اور کتابوں کا تحفہ دے دیا جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

میرے لیے حسب ذیل کتابیں فراہم کر دیجیے۔

”نیا ادب نئے مسائل“ از بشر نواز

آنگن۔ از خدیجہ مستور (ناول)

ٹیرھی لکیر۔ عصمت چغتائی

معصومہ

بغیب آدمی

شب گزیدہ۔ از قاضی عبدالستار

آگ۔ از عزیز احمد

میں اور پل اکتوبر میں دہلی آؤں گا۔ حاصل کر لوں گا۔

ایک بات اور

سنا ہے ’روشنائی‘ کا کوئی ایڈیشن سبط حسن کے مقدمہ کے ساتھ پاکستان میں بھی بچھا ہے اور شاید اس میں ایک اشارہ یہ بھی شامل ہے جس سے ان ناولوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ جن کا کتاب میں ذکر ہے۔ اور یہ نئی نسل کے پڑھنے والوں کے لیے ضروری ہے۔ وہ ان ادیبوں سے

واقف نہیں ہیں جن کا ذکر روشنائی میں ہے۔ آپ اس کتاب کا ایک نسخہ حاصل کر کے اس اثریہ کو ہمارے اڈیشن میں بھی شامل کر لیں تو اچھا ہوگا۔ سنسہ کہ یہ کتاب رضیہ سجاد ظہیر کے پاس ہے اور آپ ان سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اور کیا لکھوں؟

اردو کے تہذیبی اور آئینی موقف کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے اگست کے 'کیونسٹ جائزہ' میں شائع ہوا ہے۔ اس کا آف پرنٹ آپ کو ذریعہ ڈاک بھیج چکا ہوں۔ اس کے متعلق آپ کی رائے چاہوں گا۔ امید کہ آپ معالجہ ہوں گے۔ اور اردو کی ضرورت — !

نیازمند  
دلج بہادر گوڑ

(۵)

حیدرآباد

۱۵ ستمبر ۱۹۷۸ء

مجی خلیق انجم

کل ہی آپ کو ایک شکایتی ایجنس میں خط لکھ چکا ہوں۔ اور آج آپ کا عنایت نامہ موصول

ہوا۔

سیداب کی خبر دیے ہی بہت پریشان کن تھی۔ دہلی ٹرنک پر خبر لیتا ہوں۔ لیکن آپ کے خط سے پتہ چلا کہ آپ خود بھی سیلاب کی زد میں رہے ہیں۔ کاش میں اس دکھ میں آپ کا شریک ہوتا۔

فیض کا اردو گھر میں استقبال کیا اچھا کیا۔ کتابیں بھی دیں اور بھی اچھا کیا۔ جلسہ کی رویداد ہماری زبان میں شائع ہوئی ہے۔ اب تو لگتا ہے آپ تصویریں بھی چھاپنے کے موقف میں آگئے ہیں۔ بمبئی میں فیض کے ساتھ جاں نثار اختر کے لڑکے کے گھر ایک محفل میں شام گزارنے کا اتفاق ہوا۔ بیدی، سردار، مجروح، سلی، رامانند ساگر، زیدی، بہنیں، دلیپ کمار، جیا بھادری کیسے کیے

آتشیں پیغمبروں کا ساتھ تھا۔

یہاں حیدرآباد میں بھی فیض سے کافی نیاز رہا۔ میرے گھر پر بھی ایک تناؤں طعام کی حقیر محفل تھی۔ لیکن غیر اسلامی مشروبات کا بھی دور تھا۔ آپ اس نعمت سے محروم ہیں حالاں کہ ایک غیر مسلم کو مار رکھا ہے۔ روشنائی کب تک شایع ہو رہی ہے؟

میں ۲۴ ستمبر کو دہلی پہنچ رہا ہوں۔ انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔ ۵ اکتوبر تک تو رہنا ہی ہے۔  
باقی خیریت۔ انجمن کے سب کارکنوں کو اور سلام

آپ کا اپنا  
راج بہادر گوڈر

(۶)

حیدرآباد

۲۵ جنوری ۱۹۸۰ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

آپ کا خط مورخہ ۱۸ جنوری کو ملا اور آج 'ہماری زبان' کی مشاورتی کمیٹی کے اجلاس کی رویداد بھی ملی۔ اس سے قبل انجمن کے قواعد کا مسودہ بھی مل گیا تھا۔

"سہیل" پر مضمون تو لکھ سکتا ہوں لیکن محض دو شانہ روابط اور تاثرات ہی ہوں گے۔ ان کے فن پر مضمون لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں تو ان کی محض چند کہا نیاں برسوں پہلے پڑھی تھیں۔ پھر کسی رسالہ کے (غالباً شاہراہ) ناولٹ نمبر میں ان کا ناولٹ "بے جڑ کے پودے" پڑھا تھا۔ اس کے بعد ان کی کتاب "تین چہرے" پڑھی تھی اور اس پر تبصرہ بھی کیا تھا۔ جو شاید 'ہماری زبان' میں شایع ہو چکا ہے۔ اپنی کم مائیگی پر نادم اور آپ سے معذرت خواہ ہوں۔

'ہماری زبان' کی مشاورتی کمیٹی کو میں حسب ذیل مشورے دینا چاہتا ہوں۔ وہ غور کرے۔

(۱) معیاری کلام ضرور شایع ہو لیکن نوجوان شاعروں کی اہمیت افزائی بھی ضروری ہے۔ البتہ ان دونوں مقصدوں میں توازن کا خیال رہے۔

(۲) اردو کے تعلیمی اور اشاعتی اداروں کی خبریں شایع ہونی چاہیے۔ اس عرض سے انجمن کی





میں ۲۶ جولائی کو دہلی آ رہا ہوں۔ کتا میں حاصل کر لوں گا۔

نیازمند  
راج بہادر گوڑ

(۸)

حیدرآباد

۲ فروری ۱۹۸۳ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم  
تسلیمات

انجمن کی مجلس عام کا دعوت نامہ ملا۔ ادھر میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ خون میں شکر بڑھ گئی تھی۔ دوا خانہ میں شریک ہو گیا تھا۔ اب نسبتاً آرام ہے۔  
آج آنکھوں کا امتحان بھی کروایا ہے۔ غالباً عینک بدلنی ہوگی۔  
آواز میں بھی مستقل خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے کہ جلسوں میں تقریر نہ کروں اور ویسے بھی بلند آواز سے بات نہ کروں۔

پھر بھی میں مجلس عام کے اجلاس میں شرکت ضرور کروں گا۔ اور ممکن ہو تو ۱۱ فروری کی دوپہر تک ہی دہلی پہنچ جاؤں گا۔

اس جلسہ عام میں بجٹ کی پیش کش بھی ہو جاتی تو اچھا تھا۔ پھر تو مجلس عام کا اجلاس طلب نہیں کر پائیں گے۔

اور سب احباب کو سلام

آپ کا اپنا  
راج بہادر گوڑ

(۹)

۲۶ دسمبر ۱۹۸۳ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) ریاست کرناٹک کی ضلع واری شاخوں کی تفصیل اور ان کے عہدہ داروں

کے نام اور پتے منسلک ہیں۔ میں نے ان کے کام کی تفصیل مانگی تھی۔ سو تو وہ کچھ دنوں میں بھیج دیں گے۔ وہ وقت چاہتے تھے۔

انھوں نے حال ہی میں ایک کامیابی حاصل کی ہے۔ سرکار نے انتخابی مقابلوں میں کنٹری میں انٹرویو کی شرط لگائی تھی۔ اردو طلباء کے لیے یہ رعایت حاصل کرنی گئی ہے کہ سرکاری ملازمت کے لیے انٹرویو کے وقت ان سے کنٹری کا انٹرویو نہیں لیا جائے گا۔ لیکن ایک سال میں وہ زبان سیکھ لیں۔ اگر پھر بھی وہ نہ سیکھ پائیں تو انھیں انگریمنٹ نہیں ملے گا۔ لیکن ملازمت سے علیحدہ نہیں کیے جائیں گے۔

ان کے کچھ مطالبات بھی ہیں،

۱۔ وہ چاہتے ہیں کہ مولوی محمد علی صاحب کے انتقال کے بعد ان کا کوئی نمائندہ مرکز میں نہیں ہے۔ نامزدگی کی کوئی جگہ خالی ہو تو اس بار ان کو ترجیح دی جائے۔

۲۔ گجرات کمیٹی کی ایک رپورٹ چاہیے۔

۳۔ ان مختلف ریاستی اور مرکزی سرکاروں کے حکم ناموں کی نقل چاہیے۔ جن کی رو سے انھن کو گرانٹ ملتی ہے۔ تاکہ وہ اس بنیاد پر اپنی سرکار سے بھی گرانٹ حاصل کریں۔

۴۔ وہ ایک ماہنامہ نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ "ہماری زبان" ہی کا ایک ماہنامہ ایڈیشن بنگلور سے نکالا جائے۔ میں نے کہا شاید یہ ممکن نہ ہو سکے۔ تب انھوں نے کہا کہ مرکز ہی کوئی موزوں نام تجویز کر کے انھیں مطلع کرے۔ انھوں نے کچھ نام بھیجے تھے۔ لیکن رجسٹرار نے بھی نام منظور کر دیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کی مدد کریں۔

نیازمند

راج بہادر گوڑ

حضور، تسلیم

آپ کا حکم اور میں ٹانے کی ہمت کروں؛ آخرت میں کیا جواب دوں گا؟ آپ سر بلند کھڑے ہوں گے اور میں سر بسجود گنہگاروں کی صف میں ہوں گا۔ یہ مجھے منظور نہیں اور نہ اس کا الٹ ہی منظور ہے۔ تیار بھی کر دیا ہے، ملا ہو گا۔

میں ۲۵ اپریل کی صبح دہلی پہنچ رہا ہوں۔ شام میں عالمہ اور مجلس عام میں شریک ہوں گا۔ ۲۶ کے سمینار میں آپ کے حکم کے مطابق مقالہ پڑھ دوں گا۔ آپ نے اپنے پہلے خط میں جو نوٹس کی حیثیت رکھتا تھا، دونوں سمینار ۲۶ اپریل ہی کو رکھے تھے اور اب لکھا ہے کہ ایک ۲۶ کو اور دوسرا ۲۷ کو ہو گا۔

۲۷ اپریل کو ۳ بجے ایوان غالب میں دہلی کی انجمن ترقی اردو کا اجلاس ہے۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے شدت سے اصرار کیا ہے کہ میں وہاں حاضری دوں۔ اب انھیں ناراض کرنا کس کے بس میں ہے؟ میرے بس میں تو نہیں قدیم کرم فرما ہیں۔ اور لگتا تو یہ ہے کہ تہذیب مغلیہ کی باقیاتِ صالحہ میں ان کا شمار ہو گا۔ یقین نہ آتا ہے تو ثروت آرا بیگم ہی پڑھ لیجیے۔

اچھا تو خدا حافظ، شمیم کو پیارا، سب احباب اردو گھر کو مجتبیٰ  
اور آپ کو دشنام یار

راج بہادر گوڑ

حیدر آباد

(۱۱)

۱۱ جنوری ۱۹۸۷ء

پیارے خلیق انجم

”گجراتی زبان و ادب اور پتالال پٹیل“ مضمون حبیب صاحب کو دے آیا تھا۔ پتالال پٹیل کی تصویر بھیج رہا ہوں۔ مضمون پسند آئے تو چھاپ دینا۔ اس ادیب کو گیان بیٹھ ایوارڈ ملا ہے۔ اردو کے قارئین گجراتی سے ناواقف ہیں اس لیے گجراتی زبان و ادب کا مختصر پس منظر دیا ہے۔

میں اردو گھرایا تھا لیکن تم اسی وقت — جا چکے تھے۔

موہنی کا کیا حال ہے؟ میرا پیار کہنا

تمہارا اپنا  
راج بہادر گوڑ

(۱۳)

۱۹ اپریل ۱۹۸۷ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

آپ کا بھیجا ہوا رجسٹرڈ پوسٹ ملا جس میں Seminar کا اردو نمبر، آپ کا خط اور چیک بھی کچھ تھے۔

سمینار کے مضامین تو خیر جیسے کچھ میں لیکن آخر میں بھی ہوئی Bibliography اہم ہے۔ انگریزی میں کہاں اردو کے متعلق کیا بل سکتا ہے بھی کچھ ہے۔ مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اردو کے متعلق کیا کیا کچھ انگریزی میں لکھا ہے۔

کل ہی صبح میرے بڑے لڑکے کی بیوی کا آپریشن کروانا پڑا۔ اسے پیشاب میں رکاوٹ کی شکایت تھی، لیکن امتحان سے پتہ چلا کہ رحم میں ایک بڑا Fibroid ہے جس کی وجہ سے مثانہ پر وزن پڑ رہا تھا اور پیشاب کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔

آپریشن بخیر و خوبی ہو گیا۔ ایک ہفتے میں گھر آجائے گی۔ میں آج کل کچھ اسی چکر میں ہوں۔ پھر بھی ۲۳ اپریل کی صبح کلکتہ چلا جاؤں گا۔ اور وہاں سے ۲۸ یا ۲۹ اپریل کو کچھ دنوں کے لیے دہلی آؤں گا۔ انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔

خیر اندیش آپ کا  
راج بہادر گوڑ



# **URDU ADAB**

## **QUARTERLY**

**EDITOR**

**Khaliq Anjum**

**ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)**  
**NEW DELHI**